دل اک شہر جنوں

آسیہ مرزا

دل اک شہر جنوں

آسیہ مرزا

کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

دل اک شہر جنوں

اس کی گاڑی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں سے ہو کر اب طویل اور قدرے پختہ سڑک پر چل رہی تھی، دور ہی سے ''سرخ حویلی'' کو دیکھا جا سکتا تھا' جسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انسانوں کے ہجوم میں ایک دیو آ کھڑا ہوا ہو۔ اس کے لبوں کی تراش میں مدھم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے سوچا۔

'پتہ نہیں اس کے ذہن میں یہی تشبیہ کیوں آئی جبکہ وہ اس خوبصورت حویلی کی مناسبت سے کوئی بہترین تشبیہ بھی سوچ سکتا تھا۔ مثلاً سبک اور خراماں لہروں کے درمیان کھڑی مضبوط اور سبز چٹان۔

یا پھر...

جگمگ جگمگ کرتے ستاروں کے درمیان کھڑا مغرور چاند۔

مگر آس پاس کی آبادیاں‘ بے رونق اور اجڑے اجڑے مکان اپنی غربت اور افلاس کی از خود کہانی سناتے کم از کم کسی طرح جگمگاتے ستاروں کی تشبیہ کے قابل نہیں تھے نہ خراماں لہروں کی مثال ان کے لیے مناسب معلوم ہو سکتی تھی۔‘

چند منٹ بعد ہی اس کی گاڑی قدیم طرز کی اس حویلی کے سامنے رک گئی‘ جسے شاید نئے سرے سے نیا رنگ و روپ دے کر جدید طرز میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی اور یقیناً اس کی خوبصورتی برقرار رکھنے پر بھرپور توجہ دی جاتی تھی۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر ہی بیٹھے بیٹھے ناقدانہ سی نظروں سے جائزہ لیا۔ صرف خوبصورت اور جدید بنانے پر ہی زور نہیں دیا گیا تھا بلکہ حفاظتی انتظامات بھی زبردست دکھائی دے رہے تھے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اونچی دیواریں‘ خاردار چمکتی تاریں جن میں شاید کرنٹ دوڑانے کا بھی انتظام تھا‘ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرچ لائٹس وغیرہ‘ گیٹ بھی دیوہیکل مگر دیکھنے میں خوبصورت لگ رہا تھا‘ مجموعی طور پر یہ حویلی ایک خوبصورت قلعہ معلوم ہو رہی تھی۔

اس نے ہارن دیتے ہوئے رسٹ واچ پر ایک نگاہ ڈالی اور مطمئن ہو گیا۔

ہمیشہ ہی وہ وقت کا پابند رہا تھا‘ وہ پورے گروپ میں بہت پنکچوئل مشہور تھا۔ وہ پورا گروپ اس کا کالج فیلو تھا اور آج وہ اس گروپ کی ایک لڑکی آمنہ مردان علی شاہ کی دعوت پر اس حویلی میں آیا تھا جو وڈیرہ مردان علی شاہ کی تیسری اور چہیتی بیٹی تھی۔

اس کی گاڑی کو غالباً دیکھ لیا گیا تھا اور پہچان بھی لیا گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے گیٹ خودکار انداز میں کھلتا چلا گیا۔ اندر دونوں طرف دو مسلح گارڈ کھڑے تھے۔ گارڈ کے ہی اشارے پر اس نے گاڑی چکنے فرش کے پورچ میں لا کر روک دی۔ ایک ملازم استقبالیے سے اس طرف دوڑ کر آیا۔ اس نے دیکھا سامنے سرخ بجری کی روش کے آخری سرے پر گلاس ڈور کے پاس آمنہ علی نے ہاتھ ہلا کر وش کیا تھا‘ اس نے بھی گلاسز پیشانی پر ٹکاتے ہوئے جوابی مسکراہٹ سے نوازا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔

"مجھے یقین تھا تم ضرور آئو گے‘ تم وقت کے ہی نہیں وعدے کے بھی پابند ہو۔"

وہ سہج سہج چلتی اس تک آ پہنچی۔

سیاہ رنگ کے ایمبرائیڈری والے شلوار سوٹ میں کھلے بالوں اور ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ یوں تو وہ ہمیشہ ہی خود پر خاصی توجہ دیتی تھی مگر اس وقت خاص اہتمام دکھائی دے رہا تھا‘ یوں لگ رہا تھا کہ اس نے خاص محنت صرف کی ہے خود پر۔ وہ عام دنوں سے خاصی مختلف اور اچھی لگ رہی تھی۔

شانوں پر ریشم کے ڈھیر کی طرح پڑے بالوں کو وہ پیچھے جھٹکتے ہوئے اس کے شاندار‘ دراز سراپے کو ستائشی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"باباسائیں کا خیال ہے بزنس مین وقت کے ضرور پابند ہوتے ہوں گے مگر وعدے کے نہیں۔" وہ ہلکی شرارت سے گویا ہوئی۔

"ہو سکتا ہے انہیں اس معاملے میں کوئی تجربہ ہو چکا ہو‘ ظاہر ہے اتنی پر یقین بات تو کوئی اپنے تجربے کی بنیاد پر ہی کر سکتا ہے۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ میں ذاتی طور پر "بزنس

مین" نہیں ہوں اس لیے نہ صرف وقت کا بلکہ وعدے کا بھی پابند ہوں‘ سو یہاں نظر آ رہا ہوں۔" اس کے لہجے میں خوشگواریت تھی۔ اس کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ہو تو بزنس مین کے بیٹے‘ ساری ادائیں بزنس مینوں جیسی ہیں۔" اس نے اس کے سراپے پر نگاہیں دوڑائیں۔

"اوہ ہو یعنی خوب واقف ہیں آپ بزنس مینوں کی ادائوں سے۔" وہ برملا اور برجستہ بولا تو وہ خفیف سی ہو گئی۔

"کیسی ہوتی ہیں ان کی ادائیں۔ ذرا وضاحت فرمائیں گی۔" اس نے مزید کہا تو اس نے مصنوعی خفگی سے گھورنے پر اکتفا کیا پھر مسکرائی۔

"اب اندر تشریف لے آیئے جناب ولید حسن صاحب‘ کیا ساری باتیں یہیں کھڑے کھڑے ہو جائیں گی۔" اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا پھر پلٹ کر فاصلے پر مؤدب کھڑے ملازم کی طرف دیکھ

کر ولید حسن سے کہا۔

’’یہ گاڑی کی چابی الٰہی بخش کو دے دو‘ وہ لاک کر دے گا۔‘‘ وہ پھر الٰہی بخش کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

’’الٰہی بخش! صاحب سے چابی لے لو اور دیکھو پٹرول کی ٹنکی فل کر دینا اور اس پر اچھی طرح سے کپڑا وغیرہ پھیر دینا۔‘‘

بھاری بھر کم ڈیل ڈول‘ بڑی بڑی مونچھوں اور سندھی ٹوپی والا الٰہی بخش کسی روبوٹ کی طرح حکم کی تعمیل میں آگے آیا اور ولید حسن سے چابی لے لی۔

’’آیئے جناب آپ کے انتظار میں تو دن گنے ہیں۔ میں نے نہیں باباسائیں نے۔‘‘ اس نے گویا شرارتی انداز میں وضاحت بھی کی۔

’’یہ لڑکیوں کی پرانی عادت ہے‘ ایسے موقعوں پر وہ دوسروں کے کندھوں کا سہارا لیتی ہیں۔‘‘ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے‘ وہ اسے گھورنے لگی۔

’’کیا مطلب؟‘‘

’’مطلب یہ کہ یہ بھی ایک مشرقی ادا ہے جسے ظاہر ہے ہم مشرقی مرد جانتے ہیں‘ ویسے ایسا کرتی ہوئی وہ منافق نہیں بلکہ...‘‘ اس نے دانستہ جملے میں وقفہ دے کر اس پر ایک مسکراتی نگاہ ڈالی۔

’’بلکہ...‘‘ اس نے چلتے چلتے ذرا سا ٹھٹک کر ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔

’’ایسا کرتے ہوئے وہ اچھی لگتی ہیں بلکہ بہت اچھی۔‘‘ اس کے لہجے میں جانے ایسا کیا تھا آمنہ مردان علی کی پلکیں اس کے صبیح رخساروں پر جھک گئیں‘ اسے اپنے رخسار ایک انوکھی حدت سے تمتماتے محسوس ہونے لگے۔

ایک خوبصورت احساس دل کی دیواروں پر بکھر کر رہ گیا۔

ولید پالش شدہ فریم کے درمیان چمکتے گلاس ڈور کو پش کر کے اس کی ہمراہی میں لابی میں قدم رکھ چکا تھا۔

X...X...X

"چچا غالب کی جانشین ادھر آئو ذرا۔" وہ غسل خانے کے فرش پر وائپر کرتی صغریٰ کو کان پکڑ کر باہر نکال لائی۔

"اب بتائو تمہیں کچا چبا جائوں یا پھر اپنا ہی سر پیٹ لوں کہ ہضم تو تم مجھے ہو گی نہیں۔"

"کک... کیا ہوا بی بی۔" اس نے اپنی حد سے زیادہ بڑی اور کاجل سے اماوس کی رات کا منظر دن میں پیش کرتی آنکھوں کو پھیلا کر اسے دیکھا۔

وہ اس کی معصومیت پر فدا ہو گئی۔

"اپنا شاعرانہ' عاشقانہ شوق پورا کرنے کے لیے یہی جگہ ملی تھی۔"

"اس نے اپنے سوشیالوجی کے نوٹس کی حالت زار کو ترحم بھری نظروں سے دیکھا پھر صغریٰ کو عالم طیش میں گھورا۔

"اب ایسا کیا کر ڈالا ہے جی!" وہ کم سن بچوں کی طرح منہ پھلانے لگی۔

مرے محبوب نے وعدہ کیا ہے پانچویں دن کا

کسی سے سن لیا ہو گا کہ دنیا چار دن کی ہے

اس نے' اس کے اس کارنامے کو باآواز بلند سنایا ساتھ ہی پیپرز رول کر کے اس کے سر پر دے مارے۔

"اچھا ہے نا شہری بی بی' ایک بس میں لکھا ہوا تھا' اچھا لگا میں نے جھٹ پٹ یاد کر لیا اور بھول نہ جائوں جی! اس لیے یہاں پر لکھ لیا پر آپ نے تو تعریف بھی نہیں کی کہ کتنی اچھی رائٹنگ ہو گئی ہے میری۔"

"وہ اپنے کارنامے پر داد کی خواہاں تھی۔

"میاں چنوں جانے والی بس پر لکھا ہو گا۔" اس نے گھورا

"نہ جی' گھوٹکی جانے والی۔"

"صغریٰ کی بچی! ناس مار دیا میرے نوٹس کا۔" اس نے نوٹس رائٹنگ ٹیبل پر پٹخے۔

آج صبح سے ہی اس پر غصہ سوار تھا جو شدید قسم کی بوریت سے وجود میں آیا تھا مگر وہ صغریٰ ہی کیا جو اپنی اس خوبصورت نشیلی آنکھوں والی شہرینہ بی بی کے غصے سے ڈر جاتی۔

"اور یہ کون ہے تمہارا جس نے پانچویں دن کا وعدہ کر رکھا ہے تم سے۔" اچانک اس خیال پر اسے کڑی نظروں سے دیکھنے لگی، پھر ہنس دی۔

"سن ہی لیا ہوگا دنیا چار دن کی ہے اور اگر آج پانچواں دن ہوا تو سمجھ لو مر کھپ گیا ہوگا، ویسے اچھا ہی ہوا جو کم اذیت سے مرا ہوگا۔ ورنہ تمہاری ان کالی گھور آنکھوں کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار کر اندھوں کی طرح پٹخنیاں کھا کر مر جاتا، اف تصور کرو کس قدر خوفناک قسم کی موت ہوتی بے چارے کی۔"

"ہائیں شہرینہ بی بی! اب ایسے تو نہ کہو نا جی!" وہ فرش پر منہ پھلا کر بیٹھ گئی اور ادھر اس نے اپنا سر پیٹ لینے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں تحیر کے ساتھ غصہ بھی لہرانے لگا تھا۔

"اوئے ہوش میں تو ہے تو، اب اس وبا کی لپیٹ میں تم بھی آ گئیں، یااللہ۔" اس نے چھت کی طرف نگاہ اٹھائی اور ٹھنڈی سانس کھینچ کر پھر اسے گھورتے ہوئے بولی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"جانتی ہو یہ عشق کیسے کیسے ہوش مندوں کے ہوش چوپٹ کر دیتا ہے؟ انہیں نکما اور ناکارہ بنا ڈالتا ہے اور تم تو پہلے سے ہوش مند نہیں ہو، بلکہ قبل از وقت وہ ساری خوبیاں بھی موجود ہیں جو بعد میں بتدریج آنی تھیں۔"

"صغریٰ بیچاری ٹکر ٹکر دیکھنے لگی پھر یکدم لفظ "عشق" کے سہارے جیسے کسی حد تک بات کی تہ تک پہنچ گئی تو زور زور سے اپنے بھرے بھرے گال پیٹنے لگی۔

"توبہ توبہ بی بی، یہ کیا بات کر دی آپ نے، میں اور ای۔ شق، ہائے میرے ابا کی توبہ... میں آپ کو ایسی بیوقوف نظر آتی ہوں۔" وہ شکایتی انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

تو اس نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ چلو اتنی عقل تو ہے اس میں۔

"میرے ابا تو جی مجھے نچوڑ نچاڑ کر رسی پر سوکھا دیں گے۔" اس نے اپنے دھوبی باپ کی طرف سے خود ہی خوفناک قسم کی سزا کا تصور کر لیا، وہ ہنسنے لگی۔

"تو مرزا غالب کی چچی، یہ شاعری کا شوق تجھے کیسے ہو گیا، لگتا ہے سکندر بھائی کا اثر ہو گیا ہے۔"

"کیوں جی' میرے دل میں بھی ججبے (جذبے) ہیں' کیا غریبوں کے پاس دل نہیں ہوتا۔"

"یااللہ... جج بے... آہ۔" اس نے ایک سرد قسم کی آہ بھری۔

"اچھا بس بس اب زیادہ جذباتی ہیروئن بننے کی ضرورت نہیں ہے' پنجابی فلموں میں ابھی کوئی ویکینسی نہیں ہے تمہارے لیے' وہاں پہلے ہی کافی بھینسیں... میرا مطلب ہے ہیروئنیں موجود ہیں۔" اس نے ساری بکھری کتابیں ایک طرف رکھیں۔

"میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے پتا ہے؟" وہ رائٹنگ ٹیبل سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"اور تم آتے ہی شپڑ شپڑ باتھ روم دھونے لگیں۔" اس پر شدید قسم کی بوریت کا غلبہ پھر چھانے لگا۔

"نہ جی... مجھے کوئی غیب کا علم ہوتا ہے۔"

"صبح سے ٹہل ٹہل کر آدھی رہ گئی ہوں' ایک بار بھی نہیں پوچھا تم نے کہ بی بی آخر مسئلہ کیا ہے؟ کیوں اتنی اداس ہیں؟" اس نے گویا جھاڑ پلانے والے انداز میں کہا تو وہ کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔

"مجھے پتہ ہے آپ آج بور ہو رہی ہیں' صبح سے باغیچے سے اندر اور اندر سے باغیچے میں آ جا رہی ہیں' بڑی بیگم اور بھابی بھی چلی گئی ہیں نا جی' طوبیٰ اور طلحہ بھی نہیں ہیں۔"

"تمہیں کیا پتہ پانچ فٹ تین انچ سے قد پانچ فٹ دو انچ رہ گیا ہے میری ٹانگیں گھس گئی ہیں۔" اس نے سخت قسم کی بے چارگی سے کہا۔

"ہائے اماں اگر یونہی ٹہلتی رہیں تو پھر شہرینہ بی بی آپ تو پانچ فٹ کی رہ جائیں گی۔"

"ہشت خدا نہ کرے۔" وہ دہل کر جیسے پٹ سے دوبارہ کرسی پر گر گئی پھر صغریٰ کی ہنسی کے ساتھ خود بھی ہنسنے لگی۔

"بدتمیز' اچھا دیکھو آغا جی جاگ گئے ہیں یا ابھی تک نیند ہی لے رہے ہیں۔ اف ایک یہ آغا جی جانے ایسی کون سی نیندیں پوری کر رہے ہیں۔ ادھر میں بور ہو ہو کر مر رہی ہوں اور ان کی نیند پوری نہیں ہو رہی ہے۔"

"میں دیکھتی ہوں۔" صغریٰ فرش سے اٹھ کر کمرے سے جانے لگی کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"رہنے دو تم' میں خود ہی دیکھتی ہوں اور اب دیکھوں گی نہیں بلکہ انہیں جھنجھوڑ کر اٹھا کر رہوں گی۔ حد ہو گئی' ذرا بھی اکلوتی پوتی کا خیال نہیں ہے۔ تم ایسا کرو زبردست قسم کی چائے اور کچھ اسنیکس تیار کرو۔" اس نے اسے کچن میں چلتا کیا اور خود جارحانہ اور فیصلہ کن انداز میں بڑے بڑے قدم اٹھاتی آغا جی کے بیڈ روم کی طرف بڑھی کہ آغا جی خود ہی کمرے سے باہر نکلتے نظر آئے۔

گہری اور پرسکون نیند لینے کے بعد وہ نہا کر فریش بھی ہو چکے تھے۔ سفید رنگ کے شلوار سوٹ میں پیروں میں سادا سی چپل ڈالے' وہ اونچے لمبے اس عمر میں بھی سمارٹ اور چاق و چوبند دکھائی دیتے تھے۔ ہاتھوں میں اسٹک وہ اب بھی عادتاً رکھتے تھے۔ کوئی چار سال پہلے پیر کے فریکچر کے باعث ہونے والے آپریشن کے بعد چلنے پھرنے میں دشواری کے سبب سے ڈاکٹر نے انہیں اسٹک استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا اور وہ لگاتار سال بھر اسٹک کے استعمال کے اتنے عادی ہو گئے کہ اب بھی وہ اسے استعمال کر لیا کرتے تھے۔

آغا جی اس کے تیور دیکھ کر مسکراتے ہوئے وہیں ٹھٹک گئے۔

"یہ اتنی جارحیت سے کہاں پیش قدمی ہو رہی تھی؟"

"آپ کی خواب گاہ کی طرف' تاکہ آپ کو خواب غفلت سے... سوری خواب خرگوش کی دنیا سے نکال سکوں' حد ہوتی ہے آغا جی! پتا ہے آپ پورے تین گھنٹے سوئے ہیں' جبکہ قیلولہ کی حد بھی پار کر گئے۔ اتنا طویل قیلولہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں لکھا جانا چاہئے۔"

آغا جی نے ہنستے ہوئے اسٹک اس کے کندھے پر ماری۔

"تو تم بھی سو لیتیں' کس نے کہا تھا ساری دوپہر ٹامک ٹوئیاں مارتی پھرو۔"

"ایسی وحشت تو کبھی نہیں ہوئی آغا جی' پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے اوپر سے نیچے' نیچے سے باہر' باہر سے اندر۔ اف ممی پاپا اور بھابی تو چلو گئے سو گئے اس شخص کو بھی سیر سپاٹے ان ہی دنوں سوجھے تھے۔ کیا عیش ہیں... ادھر چھٹیاں آئیں ادھر سیر سپاٹے' آہ... سچ کہتے ہیں دنیا مردوں کی ہے۔" اس نے ایک طویل ٹھنڈی سانس بھری۔

"تو تمہیں کس نے روکا تھا چلی جاتیں اس کے ساتھ، پیشکش تو کی تھی اس نے۔" آغاجی لونگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں ایسی پیشکش کا سو بار شکریہ، عین رخت سفر باندھتے ہوئے اوپری دل سے کہہ دیا۔ "چلنا ہے تو چلو میرے ساتھ۔" اتنا حسین ہے ناوہ۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ لیتی اس کے پیچھے۔" وہ منہ پھلا کر صوفے پر گر گئی۔

"خیر حسین تو ہے وہ۔" آغاجی نے اس کی جھولتی براؤن بالوں کی لٹ کو کھینچا، اس نے اپنی بھوری بھوری آنکھیں گھما کر آغاجی کو دیکھا پھر ہولے سے بے اختیار مسکرادی۔

"آپ کی انہی تعریفوں نے انہیں بلا کا خوش فہم بنا ڈالا ہے موصوف خود کو پرنس آف ڈریم خیال کرنے لگے ہیں۔"

"بھئی اب اپنی بوریت کا بدلہ اس بچارے سے تو مت لو۔ چلو صغریٰ کو کہو چائے لے آئے۔"

"چائے حاضر ہے۔" صغریٰ کسی بوتل کے جن کی طرح ٹرالی گھسیٹتی حاضر ہو گئی۔ آغاجی بروقت چائے ملنے پر بچوں کی طرح خوش ہو گئے۔

"بچی، کام کی ہو گئی ہے شاباش۔" صغریٰ اس تعریف پر کھل اٹھی۔

"خدا کرے کام کی ہی رہے۔ اب تو شاعری فرمانے لگی ہیں۔" اس نے گویا صغریٰ کے کسی سربستہ راز کو طشت از بام کیا، آغاجی نے چشمے کی اوٹ سے چونک کر پہلے اسے پھر لہک لہک کر چائے بناتی صغریٰ کو دیکھا۔

"سب کے شعر تو فر فر یاد ہونے لگے ہیں اسے۔" اس نے مزید بتایا۔ "کیوں صغریٰ۔"

"آہو جی بالکل، سنائوں آپ کو۔" وہ چائے کے ہمراہ یہ ستم کرنے کو تیار تھی۔ ابھی آغاجی کچھ کہتے بلکہ قوی امکان تھا اسے اس اقدام سے باز ہی رکھتے کہ وہ پٹ سے بولی۔

ادھر بھی دیکھ اے ظالم! تمنا ہم بھی رکھتے ہیں
اگر تم ڈش رکھتے ہو تو کیبل ہم بھی رکھتے ہیں

"اور جی ایک اور ٹرک پر لکھا تھا۔"

سفر سے پہلے ڈیزل چیک کرنا ضروری ہے
مرنے سے پہلے ایک ظالم حسینہ پر مرنا ضروری ہے

"باس...بس... بس۔" آغاجی گویا کراہ کر رہ گئے۔ چائے ان کے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی جبکہ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ہنستی چلی گئی۔

"کمال ہے مجھے پتہ ہوتا اپنی صغریٰ کا ذوق اتنا بلند ہے تو میں پوری دوپہر بور کیوں ہوتی۔ اس غزل خواں سے مستفید نہ ہو جاتی' ایک مشاعرہ منعقد کروا ڈالتی۔"

اس بات پر صغریٰ کی باچھیں کانوں تک جا پہنچیں مگر جو نظر آغاجی کے چہرے پر گئی تو مزید اپنے ذوق کے نمونے پیش کرنے کا خیال ترک کر ڈالا۔ وہ خشمگیں نظروں سے ان دونوں کو ہی دیکھ رہے تھے پھر یکدم جلال میں آکر صغریٰ پر برس پڑے۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا' خبردار جو آئندہ بسوں اور ٹرکوں پر نظر بھی ڈالی تم نے۔"

انہیں یکدم غصے میں دیکھ کر صغریٰ بے چاری ہکا بکا رہ گئی پھر سرپٹ کمرے سے دوڑ لگا دی۔

"چچ... چچ... اس زمانے میں شاعروں کا یہ انعام' دو شعر پر دو جھڑکی' شکر ہے اس نے پوری غزل نہیں سنادی آپ کو ورنہ۔"

"بس کرو لڑکی تم بھی' تم نے ہی اسے اتنا بگاڑ ڈالا ہے' آ جائے تمہاری ماں اس کے کان کھینچے گی تو پھر پٹڑی پر آئے گی۔ چلو اٹھاؤ شطرنج۔ تمہاری بوریت کا بھی حل کرتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں' شطرنج وطرنج آج نہیں ہو گی۔" اس نے سموسہ پلیٹ میں ڈالتے ہوئے حتمی لہجے میں گردن ہلائی' پھر آغاجی کی اٹھتی سوالیہ نظروں پر بولی۔

"آج لوڈو کھیلیں گے آپ کا دل نہیں بھرتا آغاجی شطرنج سے۔ ساری عمر تو آپ شطرنج' بلیرڈ اور گولف کھیل کھیل کر ایویں شومارتے رہے ہیں۔"

آغاجی بے اختیار مسکراہٹ کو لبوں پر پھیلنے سے نہ روک سکے۔ وہ لوڈو اٹھا لائی تھی' انہوں نے اعتراض نہ کیا۔

"دیکھو لڑکی! بے ایمانی بالکل نہیں ہو گی۔"

"اب بے چارے لوڈو میں کتنی بے ایمانی ہو سکتی ہے آغاجی۔" وہ لوڈو کی بساط پر رنگ برنگی گوٹیں سجانے لگی۔

آغا جی اس شریر لڑکی کی ساری حرکتوں سے خوب واقف تھے۔انہوں نے پوری توجہ بساط پر جما رکھی تھی۔

"یوں گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہیں سوئیٹ آغا جی' ابھی چھکا تو آنے دیجئے۔"

اس نے کھٹ کھٹ کرنے کے بعد پانسہ پھینکا مگر دوسرے پل مایوسی سے برا سا منہ بنا کر گول ڈبے میں پانسہ ڈال کر آغا جی کو تھما دیا۔

X...X...X

یہ ایک وسیع مستطیل طرز کی لابی تھی جس میں ہلکا براؤن رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ سامنے بڑی سی کھڑکی کے عقب میں براؤن کلر کے شنیل کے وسیع صوفے کے وسط میں وڈیرہ مردان علی شاہ بیٹھا ہوا نظر آیا۔وہ موبائل پر کسی سے محو گفتگو تھا' اس کے صوفے کی پشت پر دو ملازم سندھی اجرک کندھوں پر ڈالے ایک طرف کندھے پر بندوق لٹکائے چوکس کھڑے تھے۔ان کے سر بلا ضرورت وڈیرہ مردان علی کے سر کے زاویے پر ہل رہے تھے' جیسے وہ بھی اپنے رئیس کے ساتھ موبائل پر کسی سے ہونے والی گفتگو میں شریک ہوں۔شاید یہ بھی فرائض منصبی میں شامل تھا۔

دیکھنے میں وڈیرہ مردان علی شاہ مخصوص روایتی زمیندار دکھائی دے رہا تھا۔چہرے پر کرختگی' رعب ودبدبہ تھا۔اونچی اور چوڑی ناک کے نیچے گھنی مونچھیں تھیں۔کلف لگے سفید شلوار قمیص میں تھا۔کندھوں پر خوبصورت کامدار چادر تھی' پیروں میں مضبوط مردانہ کھسے تھے اور ایک ہاتھ میں سگار تھا جسے باتوں کے درمیان وقفے وقفے سے لبوں کے درمیان دبا لیتا تھا۔

"باباسائیں!" آمنہ نے کچھ لمحے توقف کے بعد انہیں متوجہ کرنا چاہا تو انہوں نے سر ہلا کر اور ہاتھ اٹھا کر بیٹھنے کا اشارہ دیا۔

"بس یہی ہوتا ہے ادھر باباسائیں نے گوٹھ میں قدم رکھا ادھر ان کی کالز شروع ہو گئیں۔ پلیز..." اس نے دیوار سے لگے دوسرے صوفے کی طرف ولید حسن کو بیٹھنے کی پیشکش کی۔

"کبھی کبھی تو لگتا ہے ان کی اولاد ہم نہیں بلکہ سارے پاکستانی عوام ہیں۔سیاست میں آ کر تو باباسائیں نے اولاد ہی کو کیا خود کو بھی بھلا ڈالا ہے۔"

ولید حسن نے سن گلاسز سائیڈ ٹیبل پر رکھے اور گہری قدرے استہزائیہ سی سانس بھر کر وڈیرہ مردان علی شاہ کو دیکھا۔

اس کے لیے یہ چہرہ ناآشنا نہیں تھا تاہم ان سے باقاعدہ روبرو ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس کا ذہن ان کے بارے میں آمنہ علی کے جملے کے باوجود کسی طرح کی رائے دینے کو تیار نہ تھا۔ اس نے صرف آمنہ مردان علی کی طرف دیکھ کر مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

''ہاں تو بابا ولید! بھئی بڑا انتظار کروایا تم نے۔'' مردان علی موبائل بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا اور بے حد پرتپاک انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھا۔ وہ بھی مصافحہ کی غرض سے اپنی جگہ سے اٹھا مگر وڈیرہ مردان نے اس کے ہاتھ کو تھام کر پھر اسے خود سے لپٹا لیا۔ شاید یہ حملہ غیر متوقع تھا' یا پھر پذیرائی کا انداز حد سے زیادہ اپنائیت سے لبریز تھا وہ لحظہ بھر کو سٹپٹا گیا۔

بہر حال اس کے اعصاب پر خوشگواریت طاری رہی۔ جیسے اس کی بھی برسوں کی تمنا پوری ہوئی تھی ''وڈیرہ مردان علی شاہ۔'' سے روبرو ملنے کی۔

''ہماری بچڑی آمنہ نے تو تمہاری تعریفیں کر کر کے ہمیں تو غائبانہ ہی تمہارا اسیر بنا ڈالا ہے' ماشاءاللہ۔'' انہوں نے اس کے شاندار اور وجیہ سراپے پر بھرپور توصیفی نگاہیں ڈالیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک میں لحظہ بھر کو اضافہ ہو گیا۔

''جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا ہے۔'' وہ تعریف کرنے کے معاملے میں اتنے ہی کشادہ دل تھے یا واقعی وہ اس سے مل کر مسرور ہوئے تھے بہر حال ظاہر تو کچھ ایسا ہی تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں کو خفیف سی جنبش دے کر اس ستائش کو ایک مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لیا۔

یوں بھی اس کی شخصیت میں جو کشش تھی اور اس کی ذات میں سحر انگیزی تھی وہ خود بھی اس سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس کی شخصیت بڑی جاندار' مسحور کن اور مغلوب کر لینے والی تھی۔

شاید یہ اعتماد اسے ہر اٹھنے والی اور لحظہ بھر ٹھٹک کر مسحور ہو کر پلٹنے والی نگاہ نے بخشا تھا۔

یا پھر اس حقیقت کا ادراک اسے تعلیم کے دوران ہوتا رہا تھا' جہاں خوبصورت اور امیر کبیر لڑکیاں بھی اس کی راہ میں بلا مبالغہ آنکھیں بچھانے کو تیار رہتی تھیں۔

''سفر آسان رہا نا بابا! کوئی تکلیف تو اٹھانی نہیں پڑی حویلی تک آنے میں؟''

وہ اسے ساتھ لیے حویلی کے سب سے خوبصورت کمرے یعنی ایک آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

یہ مشرق اور مغرب کی آرائش کے امتزاج سے مزین تھا۔ جہاں جسم کو راحت اور آرام دینے کا عمدہ فرنیچر موجود تھا۔ مہنگا اور حسین ترین۔ کمرے میں جتنے بھی ڈیکوریشن پیس تھے سب امپورٹڈ تھے۔

اس نے سرسری انداز میں کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ متاثر نہیں مگر حیران ضرور ہو رہا تھا۔

ایک غریب ملک جہاں کے عوام بنیادی سہولیات سے بھی محروم تھے' جہاں غربت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا' مڈل کلاس طبقہ ختم ہوتا جا رہا تھا اور غربت کی نچلی سطح کی جانب عوام تیزی سے بڑھ رہے تھے' جہاں بیشتر گھر فرنیچر نام کی چیز سے بھی ناآشنا تھے' وہاں کے وزیروں کی صاحب اقتدار اور عالی مرتبہ لوگوں کی یہ آسودہ حالی' یہ عیاشیاں متاثر تو ہرگز نہیں البتہ متفکر اور رنجیدہ ضرور کر سکتی تھیں۔

وہ ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ گیا بلکہ تقریباً دھنس ہی گیا۔ عجیب روئی کے گالوں جیسے صوفے تھے' اگر اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا نہ ہوتا تو وہ ان صوفوں میں عجیب سا دکھائی دیتا۔

وڈیرہ مردان علی شاہ کوئی عام ادنٰی سا زمیندار نہیں تھا۔ ایک وسیع اراضی کا مالک ہونے کے علاوہ بطور "ایم پی اے" شہر میں اپنی شناخت اور شہرت رکھتا تھا۔

یہ شہرت اچھی کہلاتی ہے یا بری' بہرکیف یہ سوچنا عوام کا درد سر تھا' جبکہ بذات خود یہ ممبران اس شہرت اور شناخت پر نا صرف مطمئن تھے بلکہ کسی حد تک مغرور اور اپر کلاس ہونے کے زعم میں مبتلا۔

"آپ کا گوٹھ واقعی بہت خوبصورت ہے اور رہی تکلیف کی بات تو مردان صاحب! یہ اس وقت ہوتی جب جبراً بلایا جاتا' میں تو اپنی خوشی اور دیکھنے کی خواہش میں آیا ہوں اور جہاں خواہشات کا حصول مقصود ہو وہاں راہ کی تکلیفیں کہاں محسوس کی جاتی ہیں۔" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔

وڈیرہ مردان علی شاہ کچھ متاثر ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

"اچھا بول لیتے ہو۔" انہوں نے سگار لبوں سے نکالتے ہوئے فراخ دلی سے اسے سراہا۔

"خاصے ذہین معلوم ہوتے ہو' بزنس مین کی اولاد ہو' یوں بھی اب دو اور دو پانچ کا نہیں دو اور دو بائیس کرنے کا زمانہ ہے۔ اولاد کو والدین سے زیادہ ذہین ہی ہونا چاہئے۔" وہ شگفتگی سے گویا ہوئے اور اپنی بات پر جیسے خود ہی محظوظ ہو کر ہنس دیئے۔

"زمانہ تو خیر ہمارے یہاں ایسا ہے کہ دو اور دو پچاس سو بھی کر لیجئے تو بھی کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ اندھیر نگری شاید اسی خطے کے لیے کہا گیا ہے۔ کچھ مخصوص طبقے کے لیے تو ہر ناجائز ہی جائز ہے۔"

اس نے یہ کہتے ہوئے وڈیرہ مردان علی کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزرتے دیکھا۔ چہرے سے شگفتگی کے تاثرات یوں گم ہو گئے جیسے دھوئیں کا غول تیز ہوا کے جھونکے سے گم ہو جائے۔

وہ کسی احساس کے تحت سنبھل کر جلدی سے بولا۔

"آپ کی حویلی کی آرائش بہت خوبصورت ہے۔"

"بس بابا' یہ بھی بچوں کے شوق رہ گئے ہیں' تمہارے والد صاحب بھی ساتھ آتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی' اسی بہانے ملاقات ہو جاتی۔"

انہوں نے سگار ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور ملازم کا لایا ہوا تازہ حقہ گڑ گڑانے لگے تھے۔

"یہ بھی نہ آتے تو ہم کیا کر لیتے۔" ایک طرف خاموش بیٹھی آمنہ علی نے پہلی بار لب کشائی کی۔ گو کہ وہ خاموش بیٹھی تھی مگر اس کی نگاہیں مستقل ولید حسن کے سراپے میں الجھی ہوئی تھیں' یوں جیسے "ہمیں چہرے سے ہٹنا گوارا نہیں۔"

اس کا شکوہ اپنائیت کے لب و لہجے میں ہی تھا جس پر وڈیرہ مردان علی ہنس دیئے تھے جبکہ اس نے وضاحت کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے' شہر کی لائف کس قدر مصروف ہوتی ہے یہ تو آپ جانتے ہی ہیں' پہلے لگتا تھا تعلیم بندے کو مصروف رکھے رہتی ہے سر اٹھانے کی مہلت نہیں دیتی مگر پریکٹیکل لائف میں آکر یہ احساس ہوتا ہے کہ دوران تعلیم تو پھر بھی فراغت مل ہی جاتی ہے۔"

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے وڈیرہ مردان علی کی طرف دیکھتے ہوئے مزید کہا۔

"دراصل انہیں بالکل اچانک بزنس میٹنگ میں شرکت کے لیے اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا انہوں نے معذرت بھجوائی ہے اور سلام بھی۔"

"وسلام... یوں بھی آج کل ہر شخص بے حد مصروف ہو گیا ہے روزگار کی زنجیروں میں کچھ اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ سر اٹھا کر اپنے آپ کو بھی دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔"

آمنہ علی وہاں سے اٹھ کر ولید حسن کی خاطر مدارات کے لیے ملازمہ کے ساتھ بڑی سی میز پر لوازمات سجانے میں مشغول ہو گئی تھی۔ اسے یوں بھی اس رسمی سی گفتگو سے دلچسپی نہیں تھی۔

"آئے دن کی ہڑتالوں، ہنگاموں اور مہنگائی نے ہر طبقے کو بری طرح متاثر کیا ہے، یوں لگتا ہے پاکستانی شہری خواہ امیر ہو یا غریب اس کی زندگی سے سکون کی نعمت چھن چکی ہے اور وہ محض ڈپریشن اور ٹینشن کا ایک پتلا ہو کر رہ گیا ہے۔" اس نے یونہی گفتگو کو جاری رکھنے کی غرض سے حالات پر تبصرہ کیا۔

یہ محض زبانی جمع خرچ نہ تھا۔ وہ حقیقتاً پاکستان کے اقتصادی، سماجی اور اخلاقی انحطاط پر دل گرفتہ تھا، جبکہ ادھر وڈیرہ مردان علی حقہ تیز تیز گڑگڑانے لگے تھے۔

ان کی پیشانی پر خفیف سے بل پڑ گئے تھے پھر توقف کے بعد مدافعانہ انداز میں بولے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تمہاری باتیں اپنی جگہ درست ہیں، ظاہر ہے تم بھی عام سے شہری کی طرح ہی سوچو گے، پر بابا عوام کو کیا خبر ہے کہ حکومت چلانا، وہ بھی ایک غریب ملک میں کوئی آسان کام نہیں ہے، یہ کانٹوں سے بھرا صحرا ہے جو دور بیٹھے عوام کو نخلستان لگتا ہے، سو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ہزار جھمیلے ہیں جو دن رات چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ ایک طرف عوام کا خیال، دوسری طرف اپوزیشن اور کئی چھوٹی موٹی پارٹیوں کے نظریات، سب کو لے کر چلنا پڑتا ہے، ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ ہزار قربانیاں دینی پڑتی ہیں، اس پر بھی لوگ مطمئن نہیں ہوتے، پریس والے ہمیں رگیدتے رہتے ہیں، اب ہر چیز کا الزام حکومت کے سر تو نہیں لگنا چاہیے نا بابا۔ وہ بھی انسان ہیں ایک ہمدرد دل رکھنے والا حساس طبقہ۔ لوگوں کو تو بس اپنے اپنے مفاد عزیز ہوتے ہیں جبکہ ہمارے پیش نظر ادنیٰ سے ادنیٰ شہری کا مفاد ہوتا ہے۔

ہمیں تو آخرت میں بھی جواب دہ ہونا پڑے گا، ہم نے تو گھاٹے کا سودا ہی کر رکھا ہے۔ ہمارا کیا ہے ایک خاکی اور فانی انسان ہیں جو کسی کے کام آ جائیں۔"

وڈیرہ مردان علی شاہ کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی‘ انتہائی فکر مندی کی لکیریں تھیں‘ وہ اپنے چہرے کے تاثرات سے خود کو ایک فانی انسان ہی ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ولید حسن غیر ارادی طور پر خاموش ہی رہا۔ البتہ اس کا دل چاہ رہا تھا‘ وہ اس خوبصورت ڈائیلاگ پر جو در حقیقت ایک مدافعاتی کارروائی تھی دل کھول کر قہقہے لگائے۔ جہاں تک اس کا خیال تھا ہر حکومت عوام یا چھوٹی موٹی پارٹیوں کے نظریات تو نہیں البتہ اپنے مفادات لے کر ساتھ ضرور چلتی ہے اور اب تو اس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ اسے ”اپنے مفادات“ کے سوا کچھ دکھائی اور سنائی ہی نہیں دیتا‘ وہ طوفان بھی نہیں دکھائی دے رہا جو بہت تیزی سے اس ملک کو چاروں طرف سے گھیرنے آ رہا ہے مگر سوچا جائے تو یہ ان کے لیے واقعی سوچنے کی بات نہیں تھی کہ طوفان ہمیشہ صرف کچی آبادی اور غریبوں کو ہی روندتا ہوا گزرا ہے‘ محلوں اور حویلیوں کو آنچ بھی نہیں آتی۔

وہ یہاں کسی سیاسی دنگل پر نہیں آیا تھا۔ اسے آمنہ علی نے بہت خلوص اور اپنائیت کے احساس کے ساتھ اپنے گائوں اور حویلی میں مدعو کیا تھا۔ یوں بھی اس کا موضوع سیاست نہ رہا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تھا۔ اس نے بس ایک استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ وڈیرے کی باتوں پر سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”یہ سیاسی باتیں تو خیر ہوتی رہتی ہیں یہ بحثیں تو ہمارا درد سر ہیں۔ تم بتائو پھر کتنے دن قیام کرو گے ہمارے گوٹھ میں۔“

وڈیرہ مردان علی کو بھی اپنی گفتگو کا رخ بدلنے کا فوراً احساس ہو گیا تھا۔ انہوں نے موضوع بدلتے ہوئے پر یقین لب و لہجے میں استفسار کیا۔

”فی الحال تو دنوں کا تعین نہیں کیا ہے۔ میرا خیال ہے چند دن تو آپ کو میری مہمانی برداشت کرنی ہی پڑے گی۔“ اس نے خوشگواری سے کہا اور ٹیبل پر رکھے جوس کے گلاس کو اٹھا کر ہلکے ہلکے سپ بھرنے لگا۔

”نا آں‘ بابا! ایسی غیروں جیسی باتیں تو نہ کرو۔ تمہاری آمد زحمت نہیں رحمت ہے ہمارے لیے۔“ انہوں نے پیار بھری سرزنش کی۔

"روز روز تو نہیں آتے نا بابا! اتنے بلاووں کے بعد آئے ہو' اب اطمینان سے رہو' تم شہر کے پڑھے لکھے بچڑوں کو کیا پتہ گوٹھ کی آب و ہوا کتنی صحت مند ہوتی ہے۔ بابا بچڑی آمنہ!" انہوں نے اندر داخل ہوتی آمنہ کو پکارا۔

"یاد آیا تم نے تو بتایا تھا تمہارے کچھ اور بھی کلاس فیلو ہمارے گوٹھ آنے والے تھے' ان کا کیا ہوا۔"

"ہاں باباسائیں! آنے والے تو تھے' شاید کوئی مصروفیت آڑے آگئی ہو گی۔" اس نے جواب دے کر ایک جذبوں سے پر نگاہ ٹانگ پر ٹانگ جمائے اطمینان سے بیٹھے ولید حسن کے سراپے پر ڈالی۔

'خانہ دل کا مہمان تو آگیا ہے باباسائیں! اب کوئی اور آئے یا نہیں آئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'

یہ اس کی نگاہوں کی حدت تھی یا یونہی اس نے چہرہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا' نگاہوں کا لطیف سا تصادم ہوا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ خوبصورت احساسات کے زیر اثر تھی' اس تصادم نے اس کے رخساروں پر رنگ سا بھر دیا اور جانے کیوں ولید حسن کے لبوں کی تراش میں مدھم سی مسکراہٹ کی لہر آکر منجمد ہو گئی۔ ساتھ ہی اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

X...X...X

گھونگھٹ کی اوٹ سے دلبر کا

دیدار ادھورا رہتا ہے

جب تک نہ پڑے عاشق کی نظر

سنگھار ادھورا رہتا ہے

عامیانہ قہقہوں اور غلیظ گنگناہٹوں کی آواز نے لڑکی کو مزید پسینہ پسینہ کر دیا۔ اس نے سفید چادر اور بھی پیشانی پر کھینچ لی اور قدموں کو تیز کر دیا۔

بڑھتی ہی جاتی ہے صنم

یہ پیار کی بے خودی

دو پریمیوں کے نہ ملنے سے

سنسار ادھورا رہتا ہے

"اوئے پائلٹ کی اولاد! آہستہ گاڑی چلا کون سا وہ سکوٹر پر سوار ہے' اپنے نازک نازک پیروں کی سواری پر ہی تو بھاگ رہی ہے۔" یاسر نے کھڑکی سے منہ اندر کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نومی کو ٹوکا۔

"یار میں اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں' تیری تو اس پکار پر اس نے کان نہیں دھرے۔" نومی کی بات پر پچھلی سیٹ پر بیٹھے شہزاد اور آفتاب عرف تابی خباثت سے ہنسنے لگے۔

"لگتا ہے اسے سنگھار مکمل نہیں کرنا۔" یاسر کمال ڈھٹائی سے ہنسا۔ اس نے یہ جملہ شیشے سے باہر منہ نکالے نکالے ہی کہا تھا۔ اس لڑکی کو سنانا مقصود جو تھا۔

"بول دیکھنا چاہتا ہے قریب سے۔" وہ نومی کے جذبوں کو ہوا دینے لگا۔ نومی کسی نئی نویلی دلہن کی طرح شرما گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ یوں پھوٹ نکلا جیسے بھری دھوپ میں یکدم برسات۔ یاسر کا جملہ سیدھا دل کو گدگدا گیا تھا۔

"یار... وہ۔" وہ سر کھجانے لگا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس خواہش کو کون سے الفاظ میں پیش کرے یاسر کے سامنے۔

"بس... بس' پتہ ہے مجھے۔ تیرا میرا احمام کوئی الگ نہیں ہے۔" یاسر نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"شرم کس بات کی پیارے! ایک چھوڑ ہزار کے درشن کرا دیں۔ وہ دیکھ پورا غول کا غول نکل رہا ہے کبوتریوں کا... آخاہ...ہا۔" اس نے کالج کے گیٹ سے نکلتے نئے گروپ پر اپنی پر ہوس نگاہیں فٹ کر دیں۔ نومی بھی ادھر متوجہ ہو گیا۔

سفید یونیفارم میں' دوپٹے لاپرواہی سے گلوں میں لٹکائے بے فکری سے بھرپور قہقہے اچھالتی' گپیں لڑاتی لڑکیاں اس سڑک کی طرف آ رہی تھیں۔

"آئے ہائے اب صحیح والا گروپ آ رہا ہے' کم بخت ایسی چھوٹی موٹی سی لڑکیاں مجھے زہر لگتی ہیں۔" یاسر نے بدستور سامنے سے آتی لڑکیوں کو نگاہوں کے کیمرے میں فٹ کرتے ہوئے کہا۔ اس سمیت سب کی توجہ ہی اس لڑکی سے ہٹ کر اس نئے چلبلے گروپ پر تھی۔

وہ پورا غول قریب پہنچا تو نومی نے دانستہ گاڑی کی سپیڈ آہستہ کر دی۔ اتنی کہ گاڑی بس رینگنے لگی تھی۔

ادھر لڑکیاں بھی سفید مارگلہ دیکھ کر اور اس میں الٹرا ماڈرن چار لڑکیوں کو دیکھ کر اپنا رنگ بدلنے لگیں۔ چال ڈھال میں مزید ترنم پیدا ہو گیا تھا۔ قہقہے نقرئی اور کھنکتے ہوئے ہو گئے تھے' ان میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

''اوئے ہوئے' لش پش۔'' آفتاب نے ایک لڑکی پر جملہ فٹ کیا جو ایک ادا سے بالوں کو اونچا پونی ٹیل بنائے ہوئے تھی۔' آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا اور ہلکا پھلکا میک اپ کر رکھا تھا۔ لڑکی نے پلٹ کر اسے گھور کر دیکھا پھر ادا سے ''ہونہہ'' کر کے آگے بڑھ گئی۔

''پریاں ہی پریاں ہیں یار!'' نومی بولا۔ گو کہ اس کا دل بھی کسی نادیدہ خوف کے حصار میں تھا مگر ان سب کی طرح پہلو میں عجیب احساسات سے دھڑک رہا تھا۔

اس کی فطری ہوس' آکٹوپس کی طرح اس کے وجود کو جکڑے ہوئے تھی۔ وہ سب بے راہ روی کے عفریت کے چنگل میں گرفتار تھے۔

''پرستان میں تو پریاں ہی ہوں گی نا' تب ہی تو اپنے جیسے شہزادے ان خطوں پر منڈلاتے نظر آرہے ہیں۔ بلکہ دیکھو وہ پولیسیے بھی گرلز کالج کے آس پاس کیسی مستعدی سے ڈیوٹی انجام دینے پہنچ جاتے ہیں۔'' یاسر نے نیلے رنگ کی موبائل کی طرف اشارہ کیا۔

''چھوڑو یار یاسر! آج تو مزا نہیں آرہا۔ مجھے تو وہ پہلی والی بھائی تھی۔'' پیچھے بیٹھے شہزاد کی اکتائی اور بے زار سی آواز ابھری تو نومی بھی بے ساختہ اس کی تائید کرنے لگا۔

''ہاں یار اس میں کچھ تھا۔'' اس نے ان خوفزدہ قدموں کا تصور نگاہوں میں جمایا۔ یہاں وہاں خوف سے پڑتے قدم' کبھی چادر کا کونا آگے کھینچنا۔

یہ لش پش کرتی لڑکیاں اتنی چارم فل اسے محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔

''دیکھو دیکھو دیکھو! وہ سامنے کیا ٹائٹ قسم کی لڑکی آرہی ہے۔'' آفتاب نے ان سب کو متوجہ کیا۔

کالج کے اطراف ہجوم تیزی سے چھٹ رہا تھا۔ کالج ویز بھی طالبات سے بھر بھرا کر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو چکی تھیں۔ لڑکیوں کے کئی گروپس بسوں کے منتظر تھے۔ اب بس سٹاپ پر یہ گروپ کھڑا اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ کچھ ایک طرف سر ڈھانپے وقار کے

ساتھ اپنی مطلوبہ بس کی منتظر تھیں، کچھ ابھی لہرا لہرا کر کالج کے گیٹ سے برآمد ہو رہی تھیں۔ تقریباً اب اس سڑک پر سناٹا ہی پھیل گیا تھا۔

آفتاب نے جس لڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا وہ لڑکی بالکل تنہا تھی، مگر قطعی خائف نہیں تھی بلکہ بے حد اعتماد کے ساتھ قدم اٹھا رہی تھی۔ کندھے پر سیاہ بیگ لٹکا ہوا تھا جس کے سٹرپ آگے کھینچے ایک ہاتھ میں دبائے ہوئے تھی۔ منہ میں چیونگم تھا جسے وہ بے نیازی سے چبا چبا کر وقفے وقفے سے پٹاخے بنا کر پھوڑ رہی تھی۔

یاسر کو وہ خود بھی کسی پٹاخے سے کم نہ لگ رہی تھی۔ اس کی اس بے نیازی سے وہ فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔ اس کے لیے نگاہوں کی سیرابی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس نے نومی کو گاڑی اس کے پاس لے جا کر بالکل آہستہ کرنے کو کہا تو نومی نے اس کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”بس تو دیکھتا رہ۔ دیکھ جیسے ہی آفتاب پیچھے سے دروازہ کھول کر لڑکی کو کھینچے نا تو فل سپیڈ پر گاڑی چھوڑ دینا۔ سمجھ رہا ہے نا بات کو۔“ اس نے میکانکی انداز میں سر ہلا دیا مگر ہر مسام سے

پسینہ پھوٹ نکلا کسی برساتی ریلے کی طرح۔ اسے اپنے پورے جسم میں دل ہی دل دھڑکتا محسوس ہونے لگا۔

وہ نہیں جانتا تھا آفتاب اور یاسر اس کھیل کے کتنے ماہر کھلاڑی تھے۔ مگر وہ خود ابھی طفل مکتب تھا۔ بالکل نیا اور انجان کھلاڑی اور پھر پولیس موبائل دور کھڑی تھی گو کہ نگاہوں سے اوجھل تھی مگر اس کی موجودگی کا احساس تو تھا۔ تاہم اس کے اندر یاسر کے کسی حکم سے سرتابی کی ہمت نہیں تھی جس کے منحنی سے چہرے پر کسی عقاب کی سی سفاکی دکھائی دے رہی تھی، جو شکاری کو دیکھ کر آجاتی ہے۔

اس نے لڑکی کے قریب آنے پر گاڑی کی سپیڈ بالکل کم کر دی اور پھر بیک ویو مرر سے پیچھے بیٹھے آفتاب کو دیکھا جس نے کلک کے ساتھ اپنی طرف کا دروازہ کھولا تھا اور کسی گدھ کی طرح لڑکی پر جھپٹ کر اس کا بازو پکڑ لیا مگر برا ہو نومی کی بدحواسی اور پہلے پہل تجربے کی گھبراہٹ کا جس نے اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے۔ اس سے ایک فاش غلطی ہو گئی کہ پسینے سے بھیگے ہاتھ سے سٹیئرنگ ویل پھسل گیا اور پیر ایکسلریٹر پر زور سے پڑا۔ نتیجتاً گاڑی زن سے اچھل کر سڑک پر دوڑ گئی۔

اس افتاد سے آفتاب کے ہاتھ سے لڑکی کا بازو چھوٹ گیا' لڑکی وہیں جھٹکا کھا کر سڑک پر اوندھے منہ گر گئی مگر لمحہ بھر کی بدحواسی کے فوراً بعد حواس بحال کر کے چیخنے لگی۔

''دھت تیرے کی۔ ابے الو کے پٹھے مت روک گاڑی۔ اب بھگا' ورنہ دھر لیے جائیں گے۔''

یاسر کی گھن گرج اس کے کانوں کے پردے پر بم کی طرح پھٹی' اس نے گاڑی فل سپیڈ پر چھوڑ دی۔ پیچھے بیٹھا آفتاب اپنے حواس بحال کر کے اب پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

''کر دیا نا نشانہ خطا۔''

اس علاقے سے نکل کر جیسے اس کی بھی اٹکی سانسیں بحال ہوئی تھیں مگر بیک ویو مرر میں آفتاب کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

''وہ...وہ یار!'' اس نے جیسے یاسر کی طرف التجائیہ نظر ڈالی۔

''یار کے بچے! میں جو تیری اس حرکت پر سڑک پر لڑھک جاتا پھر۔'' آفتاب نے اس کے کندھے پر گھونسا رسید کیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''لڑکی جو ہاتھ آتی تو آتی' میرا کام تمام ہو جاتا۔ تو نے بھی یار یاسر! اس گائودی کو لے کر گاڑی پکڑا دی۔ اسے جب عقل آئے گی تو آئے گی تب تک ہم حوالات میں بیٹھ کر اپنی اپنی عقلوں پر ماتم کر رہے ہوں گے۔''

آفتاب کی اس کھلی ڈانٹ پھٹکار پر اس کا سفید چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کا دل تو چاہا پلٹ کر اس سے بھی تیز گھونسا آفتاب کے کھجور کی گٹھلی سے مشابہہ منہ پر دے مارے مگر اپنی بے اختیاری اور بے بسی پر دل ہی دل میں صرف اسے گالیوں سے نواز کر رہ گیا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ ہو جاتا ہے ایسا بھی کبھی کبھی۔ مٹی ڈالو اس حادثے پر۔'' یاسر نے ہاتھ اٹھا کر آفتاب کو ٹھنڈا کیا پھر نومی کے کندھے پر ہتھیلی جما کر اس کے کھنچے کھنچے چہرے پر شرمندگی اور خفت کو محسوس کرتے ہوئے تھپکنے لگا۔

''سیکھ جائے گا۔ ابھی بچہ واقعی پنگوڑے سے نکلا ہے۔ پہلے پیاں پیاں چلے گا پھر دوڑے گا۔''

سب کے مشترکہ قہقہوں میں نومی کی کھسیاہٹ بھری ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

X...X...X

یہ کس دیارِ عدم میں مقیم ہیں ہم تم

جہاں پہ مژدئہ دیدار حسن یار تو کیا

نویدِ آمدِ روزِ جزا نہیں آتی

یہ کس خمار کدے میں ندیم ہیں ہم تم

جہاں پہ شورشِ رندانِ میگسار تو کیا

شکستِ شیشہ دل کی صدا نہیں آتی

"آ گئے فیض کے جانشین۔" آغا جی اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ "بڑے دنوں بعد شکل دکھائی۔"

"کہاں آغا جی! یہ تو بس آمد سخن ہو گیا و گرنہ میرے اور فیض کے نظریات میں تو شدید اختلاف پایا جاتا ہے' کم از کم آپ مجھے فیض کا جانشین تو نہ کہیں ہاں حبیب جالب کا کہہ سکتے ہیں۔"

وہ جیکٹ صوفے پر ڈال کر خود بھی اسی صوفے پر بیٹھ گیا اور آغا جی کی طرف سے نوازے گئے اس خطاب پر احتجاج بلند کیا۔

"میرا تو خیال ہے آغا جی! آج اگر فیض زندہ ہوتے تو خود انہیں بھی اپنے نظریات سے ضرور اختلاف ہو جاتا' سوویت یونین کا نیا حشر دیکھ کر۔ جو کمیونزم کا حشر ہوا ہے وہ خاصا عبرت ناک ہے۔"

"غیر فطری اصول بہر حال اپنا وجود زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رکھ سکتے۔"

انہوں نے لوڈو کی بساط سے نظریں اٹھا کر سکندر رضا کی طرف دیکھا جس کی نظریں شہرینہ پر تھیں جو آغا جی کا دھیان بٹتا دیکھ کر اپنی گوٹ "لوڈو" کے خانے میں ڈال رہی تھی۔ وہ جانتا تھا آغا جی دیکھ بھی لیتے تو اکثر اس کی ایسی چھوٹی موٹی بے ایمانیاں در گزر کر ڈالتے تھے۔

"خیر نظریاتی اختلافات اپنی جگہ مگر رونا تو آج اس بات پر آ رہا ہے آغا جی کہ۔" وہ دوبارہ آغا جی کی طرف متوجہ ہوا اور خاصے متاسفانہ انداز میں گویا ہوا۔

"کہ امن اور ملک کے روشن مستقبل کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے والے ہوش مند انسانوں میں اختلافات نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کے باوجود اختلافات زوروں پر ہیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ امن کا تصور سب کے لیے ایک جیسا خوبصورت اور دلکش گلاب کے تروتازہ پھول کی مانند' آسمان پر چمکتے چاند کی مانند ہے۔ اس میں بھلا اختلافات کی گنجائش کہاں نکل سکتی ہے' مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے اس ملک میں امن لانے کے دعوے کرنے والی ہر پارٹی دوسری پارٹی سے عناد رکھے ہوئے اپنے اپنے مخصوص انداز سے کوشش کر رہی ہے۔" وہ یہ کہتے ہوئے استہزائیہ انداز میں سانس بھر کر ہنس پڑا۔

"امن اور ملک کی بقا کے لیے بھلا آپس میں بلکہ کسی سے بھی الجھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی... تو پھر۔"

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا

ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوانہ تھے

شہرینہ نے اس کے لیے چائے کا مگ بھرا اور اسے پیش کرتے ہوئے ایک شرارتی نظر اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ کو اس کی اشد ضرورت ہے تاکہ آپ کی ٹھنڈی ٹھنڈی آہوں میں کچھ کمی ہو۔" اس نے بھاپ اڑاتی چائے کے مگ پر ہلکے سے چمچہ مارا اور اس کی طرف بڑھایا۔

"ایک پرجوش صحافی' جو مقامی آقائوں کی غلامی سے اپنے عوام کو آزاد کرانے کے لیے سرگرم عمل ہے اسے اتنی مایوسی جچتی نہیں ہے۔"

اس کی بھوری آنکھوں میں شوخی تھی شفاف خوش نما چہرے پر شرارت رقصاں تھی۔

اس نے مگ تھامتے ہوئے اسے گھورا۔

"مایوس ہوں میرے دشمن' میں تو آج کل ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" اس نے گویا انکشاف کیا اور اس کی شوخ سی کھنکار کا قطعی نوٹس لیے بغیر آغا جی سے بولا۔

"افلاطون نے "یوٹوپیا" لکھا تھا جس میں ایک بے مثال شہر اور پرسکون معاشرے کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ میں بھی ایک ایسی ہی کتاب لکھنا چاہتا ہوں جو اس بدحال معاشرے اور بے وقوف' بددل عوام کی رہنمائی کر سکے۔ سچ کہہ رہا ہوں آغا جی! کسی دن یہ کارنامہ انجام دے ہی لوں گا' دیکھئے گا آپ' عوام کی سوچ کیسے بدلتی ہے۔" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا' وہ قطعی سنجیدہ تھا۔

"میرا خیال ہے ولید حسن ہوتا تو آپ کو اس کارنامے کی پیشگی مبارکباد ضرور دیتا۔ ہو سکتا ہے خود بھی اس کار خیر میں شامل ہو جاتا۔"

"کتنی اشتعال انگیز بات ہے۔ تم بجائے اس کے عزم کو سراہنے کے ہنس رہی ہو‘ مذاق اڑا رہی ہو اس کا۔" آغا جی نے مصنوعی خفگی سے اسے ڈپٹا۔

"یہی تو المیہ ہے آغا جی! ہمارے عوام سنجیدگی کے وقت غیر سنجیدہ ہوتے ہیں اور غیر سنجیدگی کے وقت پریشان۔ ہمارے یہاں کے لوگ اچھی نظر رکھنے کے باوجود اچھائی کو پہچانتے نہیں ہیں۔ حکمرانوں کی بچگانہ باتوں پر آنکھیں بند کرکے یقین کر لیتے ہیں اور جو اچھے واقعی ذہین‘ ہمدرد اور دانش مند لیڈر اٹھ کر آواز اٹھاتے ہیں تو عوام انہیں مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے‘ واقعی اشتعال کی بات ہے۔"

اس نے ٹھنڈی گہری سانس بھر کر شہرینہ کو گھورا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کہاں ہے ولید... اسے تو یہ خبر ضرور سنانی ہے۔" وہ محض اسے گھور کر پھر آغا جی سے مخاطب ہوا۔

"سوری وہ اس وقت آپ کو سراہنے کے لیے موجود نہیں ہیں اپنے سیر سپاٹے کے لیے گئے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "بلکہ پاپا اور وسیم بھائی بھی نہیں ہیں حتیٰ کہ طلحہ بھی نہیں ہے۔"

اس کے انداز میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آغا جی نے اپنی اسٹک اٹھائی تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

"لڑکی اب بہت پٹو گی میرے ہاتھوں۔" اپنا وار خالی دیکھ کر آغا جی نے صرف دور سے غصہ دکھانے پر اکتفا کیا۔

"ولید ہے نہیں تب ہی کہوں شہری بی بی! آپ کی زبان اتنی چل رہی ہے۔" سکندر رضا کے لبوں پر تبسم بکھر گیا۔

"جی نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ان سے دبتی وبتی بالکل نہیں ہوں۔ وہ تو بس کبھی کبھی احترام کر لیتی ہوں۔" اس نے جلدی سے اپنا دفاع کیا تو آغا جی اور سکندر رضا بیک وقت ہنس پڑے۔ پھر اچانک سکندر نے رسٹ واچ نکال کر نگاہ ڈال کر کسی خیال کے تحت سر پر ہاتھ مارا خالی مگ ٹیبل پر رکھا اور اپنی جیکٹ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے کیا ہوا‘ کہاں چل دیئے۔"

"آغا جی! بالکل یاد نہیں رہا‘ مجھے تو اس وقت بہت اہم مہم پر جانا تھا۔"

”کہاں سیاچن؟“ وہ درمیان میں بول پڑی۔

”اس سے بھی اہم مہم پر، پروفیسر زبیری کے گھر۔“ اس نے یوں بتایا گویا کوئی راز پراسرار انداز میں کھول رہا ہو۔ اس کے خوبصورت سانولے چہرے پر ایک چمک سی آگئی تھی۔

”ایں، پروفیسر زبیری خیریت!“ وہ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔

”ابھی تو خیریت ہی ہے، آغا جی!“ وہ آغا جی کی طرف مڑا۔ ”ہو سکتا ہے اس بار پروفیسر زبیری کی لاٹری نکل آئے۔“

”لڑکے یہ کیا پراسراریت پھیلا رہے ہو، کھل کر بتاؤ۔“ آغا جی کو دلچسپی پیدا ہو گئی۔ خود شہرینہ کے انداز میں بھی تجسس دکھائی دینے لگا مگر وہ مبہم سے انداز میں ان دونوں کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے صاحبو! ابھی مجھے خود کچھ خبر نہیں ہے، بہت جلد میرے کالم میں ایک سنسنی خیز سٹوری چھپے گی، اوکے اللہ حافظ۔“

اس نے سلیوٹ مارنے کے انداز میں سلام کیا اور پلٹ کر بڑے بڑے قدموں سے لونگ روم سے نکل گیا۔ تب اچانک شہرینہ کو کچھ یاد آیا۔ وہ اچھل کر صوفے سے اٹھ کے پیچھے لپکی۔

”سکندر بھائی! ذرا دو منٹ رکیے گا۔ اف فوہ، مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ تانی تو میری جان کو آ جائے گی۔“ وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں گئی، پھر رول کیے نوٹس لے کر پورچ میں آئی تو وہ زمانہ قدیم کی مگر وفادار بائیک کو سٹارٹ کرنے کے جتن کر رہا تھا۔ ”زوں زوں“ کی آوازوں سے پورچ کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔

”خدا کے لیے اب تو آپ اس کھٹارا پر رحم کیجئے، اچھے دوستوں کو اتنا بھی نہیں آزماتے، حد ہوتی ہے وفاداری نبھانے کی بھی۔“ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔

”آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے خانم کہ میں بزنس مین نہیں ہوں۔ ایک ادنیٰ سا صحافی ہوں وہ بھی سچا کھرا اور نہ بکنے والا۔ ظاہر ہے جو کسی سیاستدان کا معتبر گواہ نہ ہو اور ان کے کالے کارناموں پر سفیدی پھیرنے کا ہنر نہ جانتا ہو وہ ایسی کھٹارا ہی رکھ سکتا ہے اور شکر ہے یہ بھی کسی اچھے وقتوں میں آگئی تھی۔“

اس نے پیڈل پر زور سے پائوں مارتے ہوئے کہا۔ آخری ضرب کامیاب ثابت ہوئی اور اس وفادار نے ایک بار پھر وفا نبھانے کی ہامی بھر لی۔ اس کے چہرے پر چمک آ گئی۔

"شکر ہے میں تو ڈر رہا تھا آج یہ دغا نہ دے جائے۔ ہاں کہو کیا کام ہے۔ دانا کہتے ہیں پیچھے سے پکار کر نہیں روکنا چاہیے۔" وہ بائیک کی طرف سے مطمئن ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے ہاتھوں میں پکڑے رول کیے نوٹس اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"یہ دانا نہیں وہمی لوگ کہتے ہوں گے خیر یہ تانیہ کو دے دیجئے گا۔"

"اوہ..." نوٹس دیکھ کر اس نے سر پر ہاتھ مارا پھر خفیف سی شرمندگی سے بولا۔

"یاد ہی نہیں رہا' کل سے وہ لڑکی پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ شہرینہ سے نوٹس لے لوں مگر میں کس قدر بھلکڑ ہوتا جا رہا ہوں' تھینک یو سو مچ۔" اس نے وہ رول اس کے ہاتھ سے ممنونیت کے ساتھ لے کر کیریئر پر دبائے اور بائیک سنبھالنے سے پہلے اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔

"تانیہ کو سلام کہہ دیجئے گا' ویسے پرسوں تو ہونی ہی ہے ہماری ملاقات۔"

وہ اس کی نگاہوں کی بھرپور توجہ کو محسوس نہ کر پائی تھی۔

"اچھا یہ کبوتروں والے کام بھی مجھے کرنے پڑیں گے۔ اچھا اچھا کہہ دوں گا بلکہ تسلیمات' آداب اور سلامِ محبت تک پہنچا دوں گا۔" اس نے بائیک سٹارٹ کی اور گھرر گھرر کا شور مچاتا اڑن چھو ہو گیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر آئی تو آغا جی کو کڑے تیوروں کے ساتھ پایا۔

"لڑکی... یہ ہوم میں تمہاری گوٹ کیسے پہنچ گئی۔" انہوں نے سرخ گوٹ پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔

"لیجئے ہوم میں جانے میں کتنی دیر لگتی ہے اپنی ٹانگوں سے "یوں" کر کے۔" اس نے دوسری گوٹ کو جیسے ہی کھسکایا آغا جی کی سٹک اس کی انگلیوں کو دہکا گئی۔ وہ "آچ" کر کے اچھل پڑی۔

"یہ ٹانگوں سے نہیں تمہاری انگلیوں سے گئی ہے۔"

"بس جائیں میں نہیں کھیلتی' یہ تو کوئی گیم ہی نہ ہوا۔ آپ کی دو دو ہوم میں چلی جائیں اور میں ایک چھکے کے انتظار میں رہوں۔" اس نے لوڈو کی بساط اٹھا کر قالین پر الٹ دی پھر آغا جی کے چہرے کی طرف دیکھ کر بے اختیار ہنستی چلی گئی اور لاڈ سے ان کے کندھے سے لگ گئی۔

"سوئٹ آغا جی! آپ تو جانتے ہیں نا کہ میں ہار سے کتنا ڈرتی ہوں۔"

"گدھی لڑکی! جسے ہارنے کا خوف ہو وہ ضرور ہارتا ہے۔" انہوں نے ہلکی سی چپت اس کے سر پر ماری۔

X...X...X

وڈیرہ مردان علی شاہ اسے بے حد اہمیت دے رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک ممتاز بزنس مین کا بیٹا تھا' شاید اس لیے کہ وہ اپنی بیٹی کے جذبوں سے آگاہ تھے یا پھر اس کی اپنی شخصیت سحر انگیز اور متاثر کرنے والی تھی۔

بڑی سی ڈائننگ ٹیبل انواع واقسام کی چیزوں سے سجی ہوئی تھی گو کہ اسے بھوک کا بالکل بھی احساس نہیں تھا' چونکہ صبح وہ ناشتے میں صرف ملک شیک پی کر نکلا تھا اور اس وقت شام کے چار بج رہے تھے جبکہ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں کسی بھی معدے کی کمزوری کو باآسانی جگا سکتی تھیں۔

باوجود طلب نہ ہونے کے وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا' آداب مہمانی تو اسے بہرحال نبھانا تھے' یوں بھی وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا وہاں اس طرح کی فارمیلٹیز کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔

"مذاق چھوڑ یار! فی زمانہ ان جیسی لڑکیوں کا حصول مشکل نہیں رہا' ایک چھوڑ دس مل جاتی ہیں بس پاس مال ہونا چاہیے اور مال و دولت ہی تو پیارے مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔" اس نے ایک طویل اور ٹھنڈی سانس سینے کی تہ سے کسی دھوئیں کی طرح نکال کر فضا کے سپرد کر دی۔ "یاسر! نہ ڈگری نہ کوئی سفارش' اماں ایسے میں تو نوکری کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں اور کہاں تو کہہ رہا ہے دولت میرے گھر کی باندی؟ ایسے بڑے بڑے خواب تو نہ دکھا مجھے یار!"

وہ پھر اپنی خود ساختہ سوچوں اور حالات کا جائزہ لیتے ہوئے مایوسی کے پاتال میں اترنے لگا۔

"بس یہی تو تمہارا پرابلم ہے کہ مایوس جلدی ہو جاتے ہو۔ یار! ہم کس لیے بیٹھے ہیں۔"

یاسر نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کشن گود میں دبایا اور ایک کشن اس کی طرف پھینکا۔

”مایوسی کفر ہے۔“

”ہونہہ یہ تم اس لیے کہہ سکتے ہو کہ تم دولت کے ڈھیر پر بیٹھے ہو‘ تم نے کبھی مایوسی کا ذائقہ نہیں چکھا‘ دردر کی ٹھوکروں کی ذلت کو نہیں سہا۔ تم جدی پشتی امیر زادے ہو‘ تمہاری جیب میں نوٹوں کی گڈیاں ہیں اور نوکر تمہارے ایک اشارے...“

”ہر گز نہیں۔“ یاسر نے تیزی سے اس کی بات کاٹی تو وہ منہ بنا کر کشن کو گود میں بھینچ کر یاسر کو گھورنے لگا۔

”میں یا میرا باپ کوئی جدی پشتی رئیس نہیں ہیں۔ ہاں رئیس بننے کے تمام گروں سے ضرور واقف ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو میرے باپ نے ایک ہزار کی نوکری کرتے ہوئے اتنی جائیداد بنا ڈلی ہے ہاہا؟“

وہ پراسرار انداز میں ہنسا‘ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”ہمارے یہاں رزق حلال کمانے والا بندہ ساری عمر ایک ہی پٹری پر چلتا رہتا ہے پیارے! عقل کا استعمال کرو‘ دولت پانا چاہتے ہو تو جائز اور ناجائز کی باریکیوں میں نہ الجھو۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ دولت کی گڈیاں کیسے ملتی ہیں اور کس طرح سے۔“

وہ ایک آنکھ دبا کر مکاری سے مسکرانے لگا۔

نومی کا چہرہ قابل دید ہو گیا۔ شہزاد بھی ہونٹ دبا کر ہنسنے لگا۔

”نوٹوں کی گڈیاں؟“

وہ فرطِ حیرت سے ایک ٹک یاسر کا چہرہ تکنے لگا تھا جیسے وہیں اسے سرخ اور سبز نوٹوں سے لدی شاخیں دکھائی دے رہی ہوں۔

اتنی دولت یک مشت ہاتھ آ جانے کا تصور بڑا ہی دلفریب اور روح پرور تھا۔ اس کی آنکھوں میں یہ خواب جگنو کی طرح چمکتا دکھائی دینے لگا۔

”بولو منظور ہے؟“ یاسر نے اس کے کندھے کو ہلایا تو وہ یوں چونکا جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔

”ک... کیا۔“

”طریقے ناجائز ہوں گے۔“ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا اور بغور اس کا چہرہ ٹٹولا۔

"تو ابھی کون سے کام ہمارے جائز ہوتے ہیں۔" وہ کھسیا کر ہنس پڑا۔ پھر بولا۔

"تم بتاؤ تو سہی۔" اس نے بے تابی کا مظاہرہ کیا تو یاسر نے زبردست قہقہہ لگایا۔

"اب ایسی بھی کیا جلدی ہے۔"

اس نے ایک گہرا کش لے کر سارا دھواں تھرڈ کلاس عاشق کی طرح نومی کے چہرے پر اچھال دیا۔ نومی کا چہرہ بجھ گیا۔

"تو پھر کب...؟"

"چھوڑ یار!... یہ کیا تم لوگ بور ٹاپک لے کر بیٹھ گئے ہو۔"

افتخار بور سا ہو کر قالین سے اٹھ کر یاسر کے نرم گداز بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔

"نہ نیند پوری کرنے دیتے ہو نہ کوئی ڈھنگ کا پروگرام سیٹ کرتے ہو۔ کاروباری باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو۔ فار گاڈ سیک اس ڈیلنگ کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو یاسر! آج کی رات کا کوئی پروگرام ترتیب دیا؟"

اس کے لہجے میں بے پناہ اکتاہٹ تھی۔ وہ دونوں چپ ہو گئے پھر یاسر نے جیب سے والٹ نکال کر سو سو کے دو نوٹ نکالے۔

"چلو پروگرام بناتے ہیں۔ نومی توُ جا اور جا کر اپنے کالو' ارے اسی ویڈیو والا گیسو دراز سے ایک ٹائٹ سی ویڈیو لے کر آ۔"

اس نے نوٹ نومی کی طرف بڑھا دیئے۔ جسے تھامتے ہوئے نومی سخت حیران ہو کر یاسر کو دیکھنے لگا۔

"یہ اتنے پیسے؟"

"سنا ہے کچھ فلمیں یہ ویڈیو شاپ والے بڑی مہنگی دے رہے ہیں۔"

وہ خباثت سے ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا۔ نومی کی جھینپ پر شہزاد اور افتخار کی ہنسی بھی بکھر گئی۔

X...X...X

ناشتے کی بڑی سی مستطیل طرز کی میز پر تکلف کھانوں سے سجی ہوئی تھی۔

”گڈمارننگ۔“ آمنہ علی نے ٹوسٹ پر جیم لگاتے ہوئے اسے دیکھ کر تروتازہ مسکراہٹ اچھالی۔اس نے سر ہلا دیا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”حضرت علیؓ کا قول ہے سحر خیزی میں پرندوں کا سبقت لے جانا تیرے لیے باعث ندامت ہے۔“

مگر کتنے دکھ کا بلکہ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ہم پرندوں تو کیا بڑے بڑے جانوروں ہاتھی شیر کے اٹھنے کے بعد اٹھتے ہیں اور اس پر ذرا بھی ندامت محسوس نہیں کرتے بلکہ فخر سے ایک دوسرے کو ”گڈمارننگ“ کرتے ہوئے صبح کا احساس کری ایٹ کرتے ہیں۔اب دیکھو مارننگ کا تو نام ونشان مٹ چکا ہے۔“ اس نے ایک گہری متاسفانہ سانس بھری۔

”باس... بس... یہ صبح صبح اتنا گاڑھا اور ثقیل لیکچر ہضم نہیں ہو گا۔“

آمنہ علی ہنسی اور مکھن اور جیم لگا ٹوسٹ اس کے آگے رکھی پلیٹ میں رکھا۔

”یہ بتاؤ نیند کیسی آئی؟“

”اُف‘ اب شرمندہ تو مت کرو یہ پوچھ کر۔“

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ جیسے واقعی شرمندگی محسوس کر کے رہ گیا‘ پھر چونک کر بولا۔

”کیا بات ہے؟میز پر بڑی خاموشی ہے۔میرا مطلب ہے تمہاری فیملی ناشتے جیسی نعمت سے محروم رہتی ہے یا وہ ہم دونوں کی نسبت واقعی معقول لوگ ہیں اور پرندوں سے سبقت لے جاتے ہیں۔“

”جناب نہ وہ ناشتے کی نعمت سے محروم رہتے ہیں نہ پرندوں سے سبقت لے جاتے ہیں۔ دراصل بابا سائیں اور ادا توقیر سائیں صبح ہی کراچی کے لیے نکل گئے ہیں کسی ضروری کام کے سلسلے میں۔شام سے پہلے ہی آجائیں گے اور اماں ماسائیں کی طرف گئی ہیں۔“

”بس بس اتنی تفصیل بھی نہیں پوچھی تھی۔اب مزید ملازموں کے شیڈول بھی نہ بتانے لگ جانا۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکا تو وہ مسکرانے لگی۔

گلابی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کرنکل جارجٹ کے سوٹ میں ہلکے میک اپ اور کھلے بالوں کے ہمراہ وہ سج دھج میں تھی۔

نہ جانے ولید حسن کی موجودگی کے باعث خود پر اتنی توجہ دے رہی تھی یا پھر یہ اس کی عادت تھی۔

وہ چائے کا گھونٹ بھر کر جیسے کچھ یاد آ جانے پر چونکا۔

"ارے ہاں مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔" وہ چائے کا گھونٹ بھر کر جیسے کچھ یاد آ جانے پر چونکا۔

"تھینک یو آمنہ! تم نے میری برتھ ڈے یاد رکھی۔" بیلیو می میں تو بھول ہی گیا تھا ادر وائز میں سلیبریٹ کرتا نہیں ہوں' بس یونہی یار دوست وش کر کے اس دن کی اہمیت کا احساس دلا دیتے ہیں کہ میرا ابھی دنیا میں آنا یقینا کچھ اہمیت رکھتا ہے' تھینک یو فار دیٹ۔"

اس نے ممنونیت کے احساس سے اسے دیکھا' تو اس کے چہرے پر یکدم ہی شفق رنگ بکھر آئے۔ ایک دلفریب مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔

"دوسروں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہتی البتہ اتنا پتہ ہے کہ میرے لیے تمہارا یہ دن بے حد امپورٹنٹ ہے' اس لیے کہ تمہارا وجود میرے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو کنول کے لیے پانی' صحرا کے لیے بارش اور چاند کے لئے چاندنی۔"

اس کا لہجہ دھیما اور خوابناک سا ہو گیا' اس کے چہرے کے گرد جذبات کی حرارت کا ہالہ سا دکھائی دینے لگا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

یہ بالکل غیر متوقع سچویشن پیدا ہو گئی تھی ولید کے لیے۔ چنانچہ وہ لحظہ بھر کو چپ ہو گیا پھر دھیرے سے مسکرا دیا۔

ناشتہ دونوں ہی کر چکے تھے' بس آخری شغل چائے کا ہو رہا تھا۔

"مجھے کیا خبر تھی آج اتنا بھرپور ناشتہ ملے گا' خوبصورت جذبوں کے ساتھ۔" اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا' دھیمی مسکراہٹ ہنوز لبوں کی تراش میں زندہ تھی۔

آمنہ علی نے چائے کے کپ پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے دیکھا' دیکھنے کا انداز بڑا مدہوش کن اور دل نشین سا تھا جیسے وہ اس کے جملے سے محظوظ ہوئی ہو یا پذیرائی کے اس انداز پر۔

"اس وقت میرے ذہن میں کوئی شعر نہیں آ رہا حالانکہ شعر داغنے کے لیے یہ سچویشن خاصی موزوں ہے۔" وہ بولا تو وہ ایک ادا سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تمہیں نہ سہی مجھے یاد آ رہا ہے سناؤں۔"

"ارشاد... ارشاد..." اس نے کپ خالی کر کے دونوں ہتھیلیاں آپس میں ملاتے ہوئے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر گویا اجازت سے نوازا۔

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں

سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں

یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے آئینہ تمثال ہے جبیں اس کی

جو سادہ دل ہیں اسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

وہ جذبوں سے پر لو دیتی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ذرا سا رکی' وہ ہمہ تن گوش تھا۔اس کے لبوں کی تراش میں خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اسی خواب آگیں لہجے میں بولی۔

سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں

سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں

اب اس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

فراز آئو ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

وہ یکدم ہی جیسے ماحول سے کٹ کر گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔اس کی آنکھوں کے سامنے گہری دھند سی پھیل گئی تھی جس میں وہ جانے کیا اور کسے کھوج رہا تھا۔

آمنہ مردان علی نے غزل ختم کر کے اس کے آگے میز کی سطح پر ہولے سے انگلیاں بجائیں تو اس نے چونکتے ہوئے جلدی سے اپنی سوچ کے سحر سے خود کو آزاد کراتے ہوئے ایک گہری سانس بھری اور بھرپور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بہت خوب!" اس نے سراہا۔"اچھی غزل ہے۔" پھر ایک لمحہ توقف کے بعد بولا۔

"بعض حقیقتیں بارش کے قطروں کی مانند ہوتی ہیں جو دل کی خشک زمین پر گر کر دور دور تک مہک پیدا کر دیتی ہیں۔یہ مہک اٹھتی تو مٹی کے وجود ہی سے ہے مگر خود شاید مٹی بھی اس کے وجود سے بے خبر ہوتی ہے۔"

اس کا لہجہ دھیما اور سحر انگیز تھا' اس کی آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں' تاہم لبوں کی تراش میں ایک مبہم سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

آمنہ علی کا دل جیسے معمول سے ہٹ کر دھڑک اٹھا تھا‘ اسے یکدم اپنے دل کے شبستان میں پھول ہی پھول مہکتے محسوس ہوئے۔

یہ خیال اس کے لیے کسی فخر وانبساط سے کم نہ تھا کہ وہ پہلی لڑکی ہے جس نے ولید حسن کو متاثر کیا تھا‘ اس کے درِ دل پر دستک سے قفل کھولا تھا اور یہ سوچ کر وہ بے پناہ مسرت محسوس کر رہی تھی کہ متاثر ہونے کا یہ احساس دو طرفہ تھا یقینا۔

X...X...X

وہ ایک چار منزلہ بلڈنگ تھی جس کے کمپاؤنڈ میں سکندر رضا نے اپنی بائیک روکی تھی اور اسے کسی قسم کا لاک لگانے کا تردد نہ کیا اس کا اپنی نادر بائیک کے بارے میں خیال تھا کہ کوئی بھی چور اچکا‘ اٹھائی گیرا اتنا بدذوق ہر گز نہیں ہوگا جو اس کی زمانہ قدیم کی بائیک پر غلط نظر بھی ڈالے اور ڈال کر کم از کم اسے ہتھیانے پر توانائی خرچ نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے جیب سے ڈائری نکالی اس میں لکھے ایڈریس پر نگاہ ڈالی اور مطمئن ہو کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

”D.14 پروفیسر زبیری۔“

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس نے تیسری منزل پر پہنچ کر سفید گیٹ کے اوپر چسپاں نیم پلیٹ پر نظر ڈالی اور بیل ڈور پر انگلی رکھ دی۔

تیسری بیل پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔

”جی فرمایئے۔“ ان کا لہجہ شائستہ تھا۔ وہ خود بھی اپنے سراپے سے ایک پڑھی لکھی خاتون نظر آ رہی تھیں۔

”پروفیسر زبیری سے ملنا ہے۔“ اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ خاتون کی طرف بڑھا دیا جسے تھام کر انہوں نے اس پر نظر ڈالی پھر ذرا سا چونک کر یونہی اس پر نگاہ ڈال کر مبہم سے انداز میں مسکرائیں اور ایک طرف ہو کر اسے گویا اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

یہ جامعہ کراچی کے شعبہ سوشیالوجی کے پروفیسر زبیری کا گھر تھا جو تین کمروں پر مشتمل تھا۔ صاف ستھری مختصر سی لابی سے گزر کر وہ ایک چھوٹے مگر صاف ستھرے سادہ سے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ جہاں غیر ضروری آرائش کا سامان نہ سہی زندگی کی ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔

صوفہ سیٹ موجود تھا مگر کور سے پرانا معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے ٹرالی میں ٹی وی رکھا تھا جس پر خاتون خانہ کے ہاتھ کا سلا ہوا کور چڑھا ہوا تھا۔ کمرے کے ایک طرف بڑا سا شلف تھا جس میں کتابوں کا ڈھیر تھا مگر ترتیب سے رکھا ہوا تھا' وہ بجائے صوفے پر بیٹھنے کے کتابوں کا مطالعہ کرنے لگا' تب ہی ایک ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا۔

سفید شلوار سلوٹ میں ملبوس چہرے پر ذہانت اور نرمی کا دلکش امتزاج تھا۔ وہ شلف سے نکالی ہوئی کتاب واپس قرینے سے رکھ کر ان کی طرف بڑھا۔

”السلام علیکم سر!“ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ جسے پروفیسر زبیری نے تپاک کے ساتھ تھام لیا۔

”وعلیکم السلام۔ کہئے کیسے آنا ہوا' غالباً سکندر رضا ہیں آپ؟“

”جی مقامی اخبار کا ایک ادنی سا مگر سچا صحافی یہ ”سچا“ میں نہیں کہتا میری تحریریں ثابت کرتی ہیں۔“ سکندر نے شگفتگی سے باقی تعارف کرایا تو پروفیسر زبیری مسکرا دیئے۔

”برخوردار لگتا ہے ابھی صحافت کے میدان میں نئے نئے داخل ہوئے ہو۔“

وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ دے کر خود بھی ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

”یہاں سچائی اور خود کو ”سچا“ ثابت کرنے کے لیے آگ کا دریا پاٹنا پڑتا ہے۔ ایک عمر رائیگاں ہو جائے پھر بھی ”سچ“ گدلا نہ ہو' سچائی اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ قلم میں زندہ رہے تب ثابت ہوتی ہے اور از خود ثابت ہوتی ہے۔ خیر یہ بتایئے کیسے آنا ہوا؟“

”کچھ گرم نرم خبر سننے میں آئی ہے کہ ایک ایم پی اے آج کل اپنے بیٹے کے کسی امتحانی پرچے وغیرہ کے چکر میں آپ کے آگے پیچھے پھر رہا ہے' چونکہ اس سبجیکٹ کی کاپیاں آپ کے پاس ہیں۔“

سکندر کا انداز کریدنے والا تھا' ایک طرح سے اس نے اپنے آنے کا مقصد بھی واضح کر دیا۔ ایک لحظہ کے لئے پروفیسر زبیری سوچ میں پڑ گئے مگر دوسرے پل بلا تامل سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”بالکل مگر آگے پیچھے پھرنے کا جملہ کچھ غلط ہے یعنی افواہ پر مبنی ہے۔ اتفاق سے ابھی تک میری ملاقات اس ایم پی اے سے بالمشافہ ہوئی نہیں ہے۔ نہ اس کے کسی آدمی سے۔ ہاں

پرنسل صاحب بتا رہے تھے کہ کل کوئی مجھ سے ملاقات کرنے آیا تو تھا بصورت دیگر بھیجا گیا تھا مگر میری ملاقات ہو نہ پائی' میں دو دن سے لیو پر ہوں بیماری کے باعث۔"

"اوہ خیریت ؟"

"بس نزلہ زکام' خیر چلتی رہتی ہیں ایسی بیماریاں آپ بتایئے آپ کا تعلق اس ایم پی اے کی لابی سے ہے کیا؟"

"نہیں ! ہر گز نہیں۔" سکندر نے تیزی سے تردیدی انداز میں سر نفی میں ہلایا۔

"میں ایک غیر جانبدار صحافی ہوں اور بقول آپ کے ابھی نیا نیا ہوں۔ سو سچائی کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں حقائق کی تلاش میں ہوں اور سچ لکھنا چاہتا ہوں۔ یہ سب صرف میرے قلم کی رنگینی نہیں ہے۔ میں حقیقت میں اس قلم کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

سکندر کے چہرے پر سرخی سی تھی۔ وہ اپنے لب و لہجے سے ایک صاف اور کھرا صحافی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے باطن کی پاکیزگی اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ پروفیسر زبیری نے اسے درمیان میں نہیں ٹوکا وہ خود ہی چپ ہوا تو وہ بولے۔

"پہلے تو مجھے آپ صحافی لوگ یہ جواب دیجئے کہ آپ آدھی خبریں کیوں لگاتے ہیں یعنی آدھا سچ کہ کسی ایم پی اے یا ایم این اے کی کوئی خبر ہے تو اس کا نام واضح طور پر کیوں نہیں لیا جاتا۔ صرف یہ لکھا جاتا ہے کہ ایک قومی' ایک صوبائی اسمبلی کا ممبر فلاں فلاں کاروبار میں ملوث ہے' جس طرح ایک مقامی معروف اخبار کے پچھلے ماہ کے اداریہ میں بتایا گیا کہ شیخوپورہ میں ایک مقامی بااثر سیاسی رہنما کی حویلی پر چھاپے کے دوران بھاری مقدار میں اسلحہ پکڑا گیا' تو اس بااثر سیاسی شخصیت کا نام کیوں نہیں لکھا گیا۔ یہ عوام سے کیوں مخفی رکھا جاتا ہے؟ کیا یہ جانبداری نہیں ہے؟ کیا یہ ایک طرح سے عوام کے ساتھ دھوکا دہی نہیں ہے کہ جب انہیں خبر ہی نہیں ہوتی کہ ان کے بڑے بڑے دعوے کرنے والے اور خود کو شریف نیک اور محب وطن ظاہر کرنے والے' ملک سے غداروں کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے دعوے کرنے والے لیڈر در حقیقت خود ہی غدار ہیں۔ اگر ان غداروں کا نام عوام کے سامنے آئے تو وہ آئندہ اپنے حق رائے دہی پر غور ضرور کریں۔ ووٹ دیتے وقت سوچیں گے ضرور۔"

"بجا فرمایا آپ نے' میں تسلیم کرتا ہوں' کہیں کہیں کوتاہیاں سرزد ہو جاتی ہیں ہم صحافی حضرات سے مگر کچھ مجبوریاں بہر حال خامہ فرسائی میں رکاوٹ بن جاتی ہیں اور خود میں بھی

رکاوٹوں کو ختم کرنے کا عہد لے کر اس میدان میں اترا ہوں۔ زبیری صاحب میں بھی ذاتی طور پر ملک کے ہر غدار کو عوام کے سامنے بے نقاب کرنا چاہتا ہوں مگر عوام بھی تو ہمارا ساتھ دیں۔ کیا آپ خود بتانا پسند کریں گے اس ایم پی اے کا نام جو آج کل اپنے بیٹے کو پاس کرانے کے چکر میں آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے؟"

اس نے سمجھداری اور چالاکی سے پروفیسر زبیری کو گھیرے میں لیا اور اصل موضوع پر لے آیا۔

"بالکل' کیوں نہیں؟ بلکہ میں اس سے ملاقات کا من و عن حال بھی آپ کو بتاؤں گا مگر شرط یہ ہے کہ اس خبر کو آپ لوگ کسی مصلحت پرستی کے ریپر میں لپیٹ کر شائع نہیں کریں گے بلکہ..."

"آپ بے فکر رہیے۔" وہ جلدی سے بولا پھر درمیانی میز سے مشروب کا گلاس اٹھا لیا جو خاتون رکھ کر گئی تھیں۔

"آپ نام بتانا پسند کریں گے؟"

اس نے توقف کے بعد قدرے بے تابی سے پروفیسر زبیری کو دیکھا جو اپنا چشمہ اتار کر اس پر پھونکیں مار کر پھر کرتے کے کنارے سے رگڑنے لگے تھے۔

"وڈیرہ مردان علی شاہ۔" وہ بلاتامل بولے۔

"اوہ..." سکندر کے ہونٹ سیٹی کے انداز میں سکڑ گئے اس نے مشروب کا گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔

"مردان علی شاہ۔ اس کے اندر پھلجھڑیاں سی چھوٹ پڑیں۔ اب ایک نئی کہانی ایک نئی خبر اس کی تمام تر دلچسپیوں کا سامان بن گئی۔

"میرا اپنا ذاتی خیال ہے پروفیسر صاحب! کہ آپ ان سے بذات خود ضرور ملیے گا' ایسے قیمتی وڈیروں کی گوٹ اول تو بڑی مشکل سے پھنستی ہے اور جب پھنستی ہے تو۔"

وہ مبہم سے انداز میں مسکرایا۔

"ہو سکتا ہے ان سے ملنا آپ کے لیے خاصا فائدہ بخش ہو' کوئی نئی چمکتی کار' نیا ڈرائنگ روم فرنیچر' ہو سکتا ہے دل کا بادشاہ ہو تو نیا گھر بھی مل سکتا ہے۔ کہتے ہیں نا سو دن چور کے ایک

دن سعد کا' یعنی کبھی نہ کبھی شریف کی بھی بن آتی ہے۔" ڈرائنگ روم کی خستہ حالی کا جائزہ لیتے ہوئے ابرو اچکا کر وہ معنی خیز انداز میں ہنس پڑا۔

پروفیسر زبیری نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چشمہ کھٹاک سے درمیانی ٹیبل پر پٹخا تھا اور یکدم مشتعل ہو کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

"تم مجھے ضمیر فروش' بے ایمان اور کرپٹ انسان سمجھ رہے ہو؟ نکل جاؤ ابھی اور اسی وقت یہاں سے۔" ان کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی دہک اٹھی تھیں۔ سکندر رضا گڑبڑا کر یوں صوفے سے اچھل کر کھڑا ہو گیا گویا نیچے سپرنگ نے اچھال دیا ہو۔

"سر... سر... میرا مطلب تھا۔"

"You can go now" وہ غرائے اور ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر کا راستہ دکھایا' ان کے چہرے پر نرمی کی جگہ غصے کی سرخی نے لے لی تھی۔ ان کی پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں' ان کا ہاتھ ابھی تک دروازے کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

" اب تک کئی ایسے مواقع آچکے ہیں کہ میں ایسی کئی مراعات سے مستفیض ہو چکا ہوتا۔ کیا مشکل ہے سکون قلب' قناعت کی خوشی' غرور' عزتِ نفس' سماجی حقیقت اور حلال

رزق کا احترام سب کچھ بالائے طاق رکھ کر ایسی مراعات حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تم جا سکتے ہو اب۔" غصے سے ان کے منہ سے جھاگ اڑنے لگا تھا۔ سکندر نے گہری سانس بھری دونوں ہاتھ پہلو میں گرا لیے اور پروفیسر زبیری کے قریب سے گزرتے ہوئے "خدا حافظ" کہہ کر باہر نکل گیا۔

کھلی اور ہوادار سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس کے لبوں پر سکون اور قدرے گہری مسکراہٹ تھی۔

اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا اس کے خدشے رفع ہو چکے تھے۔ اس کی نظر میں "پروفیسر زبیری" بلند مقام پا چکا تھا۔

X...X...X

"آداب عرض' کہئے کیسے مزاج ہیں؟" بلیک ہاف سلیوز ٹی شرٹ میں دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر وہ اس کی راہ میں کھڑا ہو گیا۔ یہ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا' کئی بار ہو چکا تھا نیا سیشن شروع ہوا تھا فائنل کا' تب سے وہ اپنے چند چیلوں کے ساتھ ٹھٹھول کرتا کہیں نہ کہیں سے اس کی راہ میں آ جاتا تھا۔ اس کے اعصاب سخت قسم کی کشیدگی سے تن گئے۔

"اپنی حد میں رہو اکبر شاہ! زیادہ سمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔ یہ اپنا ہیرو پن اپنے اسی بے ہودہ گروپ کو دکھاتے رہو۔" وہ ترش روئی سے کہہ کر باقی ماندہ سیڑھیاں اترنے لگی مگر وہ ہنوز ڈھٹائی سے اپنی جگہ کھڑا رہا۔"Get out of my out way" اس نے چلچلاتی نظریں اس کے مکروہ چہرے پر پھیلی مسکراہٹ پر ڈالیں۔

اچھا خاصا خوشگوار موڈ غارت ہو گیا تھا۔

"ہٹ جاتے ہیں' ہٹ جاتے ہیں سائیں! اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے؟ ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں' ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہارے لگے۔" وہ شعر کو نثر کے انداز میں پڑھ کر اس کے سراپے کو تکنے لگا۔

ایسی حریصانہ نگاہوں نے شہرینہ کے اندر آگ لگا دی اور اسے اپنے جسم کا سارا خون چہرے پر دوڑتا ہوا محسوس ہوا اور گویا آگ بن کر تپنے لگا۔

تانیہ نے دو قدم اتر کر تیزی سے اس کے دائیں طرف آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے کے گرد خوف کا ہالہ سا تھا۔ وہ در حقیقت ایسے اوباش امیر زادے سے خوفزدہ تھی مگر شہرینہ کی کیفیت اس سے یکسر مختلف تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا رجسٹر اس

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کے سر پر دے مارتی اگر سرعت سے تانیہ نے وہ موٹی جلد والا رجسٹر اس کے ہاتھ سے نہ چھین لیا ہوتا تو۔

"تم اس طرح کی اوچھی حرکتیں کر کے میری راہ میں حائل ہو کر مجھے خوفزدہ کرنا چاہتے ہو' میں تمہارے لالچی چیلوں کی طرح تمہارے ٹکڑوں پر نہیں پل رہی کہ..."

"آں... ہاں' میں تو صرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہوں۔" اکبر علی شاہ نے اس کی بات کاٹ کر سینے سے بازو کھول کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا گویا یہ یقین ہی تو تھا کہ وہ تھام لے گی۔ وہ اس کی حرکت پر آگ بگولہ ہو گئی۔

"دوستی... تم سے؟ ایک اوباش' عیاش اور بے غیرت شخص سے دوستی تو کیا میں دشمنی کا تعلق بھی قائم کرنا اپنی توہین سمجھتی ہوں۔" وہ حقارت سے بولی' اس کی بھوری آنکھوں میں شعلے لپکتے دکھائی دے رہے تھے۔ لحظہ بھر اکبر شاہ کا چہرہ اہانت کے احساس سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ اس کا پورا گروپ اس کے گرد جمع تھا۔

"مس خان آپ میرے یار کی توہین کر رہی ہیں۔"

ایک چیلے نے آگے بڑھ کر اکبر شاہ کا دفاع کرتے ہوئے گویا نمک حلالی کا مظاہرہ کیا مگر اکبر شاہ نے اسے مزید بولنے سے پہلے پیچھے دھکیل دیا۔

”اونہہ توہین وہ لوگ محسوس کرتے ہیں جنہیں اپنی عزت کا پاس ہو‘ جو عزت دار اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتے ہوں۔“

وہ تمسخرانہ انداز میں ہنس کر آگے بڑھ گئی۔

”چلو یونہی سہی‘ میں تو تم سے بھلائی کرنا چاہتا تھا۔“ وہ بولا تو شہرینہ نے پلٹ کر اسے خاصی طنزیہ نظروں سے دیکھا۔وہ مسکرا رہا تھا گویا اس کی ساری باتیں شہد سمجھ کر پی گیا تھا۔

اس کی نگاہیں بڑی تحقیرانہ انداز میں تانیہ پر جا ٹھہریں۔

”تمہیں ایسی دو دو ٹکے کی مڈل کلاس لڑکیوں سے دوستی زیب نہیں دیتی۔یارانے ہمیشہ برابر کی سطح پر ہونے چاہئیں۔ایک ادنی صحافی کی بہن کچھ سوٹ نہیں کرتی تمہارے ساتھ۔“

اس کے لہجے میں اپنی امارت کا نشہ چھلک رہا تھا اور تانیہ کے لیے ایسی حقارت واہانت تھی کہ تانیہ گویا اندر ہی اندر پگھل کر رہ گئی۔

”اوہ یو شٹ اپ۔“ شہرینہ یوں بھڑک اٹھی گویا یہ تذلیل تانیہ کی نہیں اس کی کر دی گئی ہو‘ وہ دو قدم آگے بڑھی مگر تانیہ نے گھبرا کر جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چھوڑو تانی! آج میں بتاتی ہوں اسے۔“

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا مگر تانیہ کی گرفت مضبوط تھی۔اس کا فضا میں اٹھتا ہوا ہاتھ دیکھ کر ایک لمحہ کو اکبر شاہ بھی بھونچکا رہ گیا تھا‘ بڑی سرعت سے وہ پیچھے ہٹا تھا۔

”گھٹیا! کمینے انسان! تم نے مجھے اپنے باپ کے مزارعے کی بیٹی سمجھ لیا ہے جو تمہاری راہ میں آنے پر غریب بے چاریاں سہم کر ایک طرف کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں اور تم جیسے انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہو۔مگر میں مزارعے کی بیٹی نہیں ہوں‘ تمہارا منہ طمانچوں سے سرخ کر سکتی ہوں۔“

”دفع کرو شیری!“ تانیہ اسے دوسری طرف کھینچنے لگی۔

”یاد رکھو جسے ماں باپ ادب نہیں سکھاتے اسے زمانہ ادب سکھاتا ہے۔آئندہ میری راہ میں آنے کی کوشش مت کرنا۔“

اکبر شاہ کو بھی اس کے یار چیلے کھینچ کر لے گئے گو کہ وہ خود بھی وہاں سے کھسکنے کا ہی سوچ رہا تھا۔ اتنی کھلی پھٹکار کے بعد اس کا وہاں کھڑا رہنا دوبھر تھا۔ اطراف سے گزرتے سٹوڈنٹس دلچسپی سے یہ تماشا دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ مگر وہ مظاہرہ یوں کر رہا تھا جیسے دوست زبردستی کھینچ کر لے جا رہے ہوں، جب کہ اسے بھی تانیہ زبردستی گھسیٹ کر لے گئی۔

”حد کرتی ہو شیری! تم بھی، ایسے اوباشوں کے منہ لگنا ہی نہیں چاہئے۔“ وہ اسے کیفے ٹیریا میں لے گئی اور ٹھنڈا پانی جگ سے بھر کر اس کے آگے میز پر رکھا۔

شہرینہ نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے تانیہ کا چہرہ دھواں دھواں دکھائی دیا۔ واضح طور پر وہ اکبر شاہ کے جملوں پر ہرٹ ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

یوں بھی وہ اپنے مڈل کلاس کمپلیکس میں مبتلا رہتی تھی۔ اپنی کم مائیگی کا احساس اکثر اس کے اعتماد کو روند ڈالتا تھا۔

”تم نے میرا ہاتھ کیوں روکا؟ آج میں اسے مزا چکھا دیتی۔“ وہ ایک سانس میں گلاس خالی کر گئی۔

”جیسے وہ تمہاری مار کھا ہی لیتا نا۔“ وہ پھیکی ہنسی کے ساتھ بولی۔ ”اور پھر کچھ غلط تو نہیں کہا شیری۔ اس نے جو کہا سچ ہی کہا ہے کہ...“

”تمہارا مطلب ہے میں تمہیں چھوڑ کر اس اوباش سے دوستی کر لوں، جو اخلاق کردار میں انتہائی پست ہے مگر مالی اعتبار سے مضبوط ہے، صرف اس لیے؟ ویری سیڈ تانی! تم کب سے دوستی اور رشتوں کو دولت کے پیمانے سے ناپنے لگی ہو۔“

اس نے سخت متاسفانہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

”چھوڑو سب بکواس ہیں کردار وردار کی باتیں۔ دولت ہزار عیب چھپا لیتی ہے۔ اس کا اثر و رسوخ اسے ہزار رسوائیوں سے بچا لیتا ہے۔“

وہ دل گرفتگی سے سر جھٹک کر ہنسی۔

اکثر ہی ایسا ہوتا تھا وہ اپنے گھریلو مسائل کی مستقل کش مکش سے تنگ آ کر کبھی کبھی ایسی متاسفانہ باتیں کر لیا کرتی تھی۔

مگر آج وہ اکبر شاہ کے جملوں سے بری طرح دل شکستہ نظر آرہی تھی۔ شہرینہ اسے خفگی بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”کوئی عیب ویب چھپتے نہیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دولت کے نشہ میں بدمست ہو کر ایک عیب دار کو اپنے عیب دکھائی نہ دے رہے ہوں۔ گندگی کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے شخص کو کیا پتہ خوشبو کسے کہتے ہیں۔ بدبو اس کی ناک میں رچ بس گئی ہوتی ہے اس لیے اسے بدبو کی غلاظت کا احساس نہیں ہوتا۔“ وہ ڈپٹنے کے انداز میں اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”تم اس طرح کی طفل تسلیوں سے مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔“ تانیہ نیم مزاحیہ انداز میں ہنس کر اسے دیکھنے لگی۔

”فکر مت کرو۔ میں اکبر شاہ کی باتوں پر ہرٹ نہیں ہوئی۔ یوں بھی میں بے حد حقیقت پسند لڑکی ہوں، میں تو اس کی باتوں کو سچ ہی کہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے پھر میں تم سے دوستی چھوڑتی ہوں اور اس اوباش سے جا کر دوستی کا ہاتھ بڑھا آتی ہوں، یہی چاہتی ہو نا تم؟“ وہ کرسی دھکیل کر برہمی کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

”ارے رے...“ تانیہ نے جلدی سے اس کی چادر کا کونا کھینچا۔

”اب یہ بھی نہیں کہہ رہی میں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی اور اسے واپس کرسی پر پٹخ دیا۔

چادر کھینچنے سے اس کے بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول گئیں جنہیں تانیہ نے شرارت سے کھینچا۔

”چلو غصہ تھوک دو اس خبیث پر آیا ہوا بھی اور مجھ پر آیا ہوا بھی، بھئی میری توبہ جو آئندہ تمہارا ہاتھ روکا۔ میری طرف سے تم اس کی خوب ٹھکائی کرنا۔“

اس نے پلکیں جھپک کر اسے گھورا پھر بے اختیار ہنس پڑی۔

”غصہ مجھے زیادہ تمہاری بکواس پر آتا ہے۔“

”اگر انسان اپنے دل پر، اپنے محسوسات پر اتنا حاوی ہونے کے قابل ہو جائے تو اس دنیا کے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں۔“ وہ بے پروائی سے ہنس رہی تھی۔

اس کی کھلی اور تروتازہ مسکراہٹ اس بات کی غماز تھی کہ اس کے دل سے اکبر شاہ کے پھینکے گئے جملوں کے تیروں کی اذیت ناکی اپنی شدت کھو چکی تھی۔ وہ پہلے والی شگفتہ تانیہ دکھائی دے رہی تھی۔

X...X...X

گائوں کے اونچے نیچے ٹوٹے پھوٹے راستوں پر اس کی گاڑی بار بار ہچکولے کھا جاتی۔ گو کہ وہ ماہر ڈرائیور تھا مگر قصور اس کا نہیں تھا' ان راستوں کا تھا جنہوں نے کبھی تارکول کی شکل نہیں دیکھی تھی اور یوں کسی محبوبہ کے الجھے گیسوئوں کی طرح تھیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ولید! تم آخر دیکھنا کیا چاہتے ہو؟ جب کہ یہاں سوائے کچے مکانوں اور تنگ وتاریک راستوں کے کچھ نہیں ہے۔"

آمنہ علی کا ہچکولے کھا کھا کر ضبط آخر جواب دے گیا۔ اسے اپنی کمر میں اینٹھن سی محسوس ہونے لگی تھی اور راہ میں اٹھنے والے بدبو کے بھبکوں پر وہ نزاکت سے ناک پر رومال دھر

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

لیتی۔ اس کے لئے یہ سب ناقابل برداشت ہی تھا۔ وہ ناشتے کے بعد اس کے ساتھ نکل آیا تھا۔

"یہی تو دیکھنا چاہتا ہوں کچے اور تنگ وتاریک مکانات اور ان میں عسرت زدہ زندگی کے لمحات گزارنے والے مکین۔ تم نے کیا گائوں میں مجھے صرف حویلی دکھانے کے لیے مدعو کیا ہے؟"

اس نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے اس کی طرف سرسری نگاہ سے دیکھا تو اس نے منہ پھلا کر اسے دیکھا پھر بولی۔

"نہیں یہی تنگ وتاریک جھونپڑیاں دکھانے۔" آمنہ کی اس بات پر وہ برجستہ ہنسی کو نہ روک سکا۔

"دراصل بات یہ ہے امی! کہ حویلی میں تو میں تقریباً گھوم پھر کر دیکھ چکا ہوں مگر یہ تو زندگی کا صرف ایک رخ ہے نا جو خاصا خوبصورت ہے۔ میں دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہتا ہوں جسے ہماری اسی فیصد آبادی گزار رہی ہے۔ حویلیاں گائوں کی زندگی کا حصہ نہیں ہوتیں اور میں

گائوں دیکھنا چاہتا ہوں‘ قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے اس کے چہرے کے بگڑے زاویوں کو دیکھا اور گہری سانس لی۔

”تم شاید نہیں سمجھو گی۔“

اس کی نظریں ونڈ سکرین پر ٹھہر گئیں اس کی خوش نما آنکھوں کے پار سوچوں کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

”ضرور دیکھو میں کب روک رہی ہوں مگر بابا یہاں دیکھنے کو بہت اچھی جگہیں بھی ہیں۔اس فضول سے پس ماندہ علاقے کو کیوں چنا ہے تم نے۔“

”پس ماندہ‘ ہاہاہا۔“ وہ اس کی بات پر بے ساختہ ہنسا‘ جیسے خوب محظوظ ہوا ہو اور ہنستا ہی چلا گیا۔

آمنہ علی بدستور خفگی بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔اس کے چہرے کے زاویوں میں غصے کی شدت نہیں تھی مگر اس کے یوں قہقہے لگا کر ہنسنے پر ہلکا سا سبکی کا احساس ہوا تھا۔

”میں نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہے۔“

”لطیفہ ہاہاہا بالکل۔“ اس نے بلا تامل جواب دیا پھر گاڑی روک کر ہنسی کو کنٹرول کرتا ہوا بولا۔تاہم ابھی بھی لبوں کی تراش میں دھیمی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”اس سے بڑا لطیفہ اور کون سا ہو گا؟ سچ بتائو تمہارا گائوں اتنا ترقی یافتہ ہو گیا ہے کہ اس میں صرف ایک یہی حصہ پس ماندہ رہ گیا ہے۔“ اس کا انداز سادہ سادہ سا اور استفسارانہ تھا مگر اس کی تہ میں چھپا تمسخر اور طنز محسوس کرتے ہوئے آمنہ علی کی پیشانی جل اٹھی تاہم اس نے ناگواری کو حتمی الامکان ظاہر نہ کیا۔

”کہہ سکتے ہو جب سے باباسائیں یہاں سے منتخب ہوئے ہیں انہوں نے بہت کام کیا ہے یہاں کے لوگوں کے لئے۔ہاں۔ مگر تم کیوں یقین کرو گے تمہیں تو اخبار والے ہی سچے لگتے ہیں جو بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔“

وہ شاید زیادہ خفا ہو گئی تھی۔اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

ولید حسن کا دل چاہا وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ اونچے قہقہے لگائے‘ مگر وہ اس کی خفگی پر کچھ نرم پڑ گیا۔ بصورت دیگر مزید کسی دل سوز جملے سے خود کو باز رکھا۔اس کا مقصد اس کی دل

آزاری نہیں تھا۔یوں بھی وہ ڈیرہ مردان علی کو باپ کی حیثیت سے اور بیٹی کی نظر سے دیکھ رہی تھی جب کہ وہ اسے وڈیرہ مردان علی کے تناظر سے ناپ رہا تھا۔وہ اسے محبوب کے رشتے کی نگاہوں سے دیکھتی تھی اور وہ دنیادار کی نگاہ سے پرکھ رہا تھا۔

''آئی ایم سوری! میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔کم آن ایمی! میں تو بس یونہی ہنس پڑا دیکھو ہنستے مسکراتے ہی گھومنا پھرنا چاہیے نا۔بات سنو۔'' اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا اور چہرے پر مسکینیت طاری کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔وہ بے اختیار ہو کر ہنس پڑی۔

''بہت مکار ہو تم...'' اس نے لاڈلے انداز میں ہلکا سا گھونسا اس کے مضبوط شانے پر دے مارا۔

(مگر تمہارے باپ سے کم ہوں) وہ دل ہی دل میں بولا۔اس کا موڈ سابقہ انداز میں بحال ہوتا دیکھ کر اس نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو ہلکی سی جنبش دے کر اگنیشن میں لٹکتی چابی کو ہلکا سا گھما دیا۔لینڈ کروزر ایک بار پھر بے حد نرم روی کے ساتھ سٹارٹ ہو گئی۔

X...X...X

اس نے جہاں گاڑی روکی تھی وہ ایک پرائمری سکول تھا' جسے کم از کم عمارت کے حساب سے سکول نہیں کہا جا سکتا تھا' سکول کے نام پر ایک چبوترہ تھا جہاں کٹی پھٹی چٹائیوں پر بیٹھے ننھے منے معصو

کے جسموں کو دھوپ کی تیز کرنیں براہ راست جھلسا رہی تھیں مگر وہ شوقِ طلب میں ان کی تمازت سے بے نیاز تھے اور چلا چلا کر پورے شوق سے اپنا سبق رٹ رہے تھے۔

دس بارہ بچوں کی اس کلاس کا ماسٹر مقامی لڑکا تھا جو ایک درخت کی شاخ پر رسی سے لٹکائے گئے بلیک بورڈ پر جملہ لکھتا اور خود اسے با آواز بلند پڑھتا پھر سارے بچے اسے دہراتے۔

وہ گاڑی سے باہر آگیا۔دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر دروازے سے ٹیک لگائے طلب و شوق کے ان ننھے مسافروں کو دیکھنے لگا۔

''وڈن جی عزتء ننڈن سان پیار زندگی جو اصولء مول متو مقرر کری جد جانء

ماسٹر بلیک بورڈ پر لکھ کر باآواز بلند پڑھتا اس کے بعد وہ سب بھی پڑھنے لگتے۔

اس نے ایک گہری سانس بھری' رخ موڑ کر ذرا سا جھک کر گاڑی کے شیشے کے اندر منہ کیا اور بے اختیار امڈنے والی مسکراہٹ کو نہ روک سکا۔

آمنہ کے چہرے کے زاویوں میں سخت کھنچاؤ سا تھا۔

"باہر نہیں آؤ گی' کتنا اچھا سبق پڑھایا جا رہا ہے' حالانکہ یہ سبق بڑوں کو پڑھنے کی ضرورت ہے' مگر افسوس' خیر... آؤ تو سہی۔"

اس کے لہجے میں اپنائیت بھرا اصرار تھا۔ پھر وہ سیدھا ہو کر سکول کی طرف بڑھ گیا' وہ پیچ و تاب کھا کر گاڑی سے باہر نکلی تھی۔

ایک سوٹ بوٹ میں ملبوس شہری شخص کو دیکھ کر تمام بچے یک دم چپ ہو گئے۔ چبوترے پر یک دم سناٹا سا اتر آیا۔ ماسٹر کی نظریں اس پر سے ہوتی ہوئیں اس کی پشت کی طرف کھڑی گاڑی اور پھر آمنہ علی پر گئیں تو وہ جیسے بوکھلا کر رہ گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"السلام علیکم۔" ولید نے بے حد دوستانہ بلکہ مربیانہ انداز میں آگے بڑھ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے کیا' جسے سکول ماسٹر نے یوں تھام لیا گویا یہ ہاتھ کوئی بے حد قیمتی شے ہو۔

"وو... وعلیکم السلام' معاف کرنا سائیں! میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔" وہ جلدی سے صفائی پیش کرنے لگا۔

"سس... سلام سائنڑن۔" وہ آمنہ علی کے قریب آنے پر جلدی سے ہاتھ جوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا جو کچھ فاصلے پر جیسے بحالت مجبوری کھڑی تھی۔ ماسٹر کے سلام کو قابل توجہ نہ سمجھتے ہوئے وہ اپنے کٹے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہوا سے اڑنے والی لٹوں کو چہرے سے ہٹاتی دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظر میں نہ ماسٹر کی اہمیت تھی نہ اس کے سلام کی' وہ تو اپنی زندگی میں پہلی بار شاید اپنے گوٹھ کے اس علاقے میں آئی تھی۔

"سائیں کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا حویلی میں' سر کے بل چلا آتا۔"

ماسٹر' ولید سے مخاطب ہوا اور یوں عاجزانہ انداز میں بولا جیسے کوئی ادنیٰ سا نوکر بادشاہ کے دربار میں کھڑا ہو۔ وہ شاید آمنہ علی کو اور حویلی کی گاڑی دیکھ کر ہی اتنا بوکھلا گیا تھا کہ ولید نے

سوچا اگر وڈیرہ مردان علی شاہ خود اس کے سامنے آتا تو شاید وہ اس کے آگے سجدہ ریز ہی ہو جاتا۔ اس نے ''آقائیت اور محکومیت'' کی ایسی بہت سی داستانیں سن رکھی تھیں۔

''بھئی میں کوئی سائیں وائیں نہیں ہوں' میں تو صرف حویلی والوں کا مہمان ہوں اور میرا نام رئیس ہے نہ سرکار صرف ولید حسن ہے۔''

اس نے دوستانہ لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔

''یہ القابات دراصل مجھے ہضم نہیں ہوتے۔ میں سیدھا سادا انسان ہوں اور اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے تو تم اور میں برابر ہی ہیں' بلکہ آپ استاد ہونے کے ناتے مجھ سے اعلیٰ درجے پر ہیں' اسی لیے سر کے بل تو مجھے آنا چاہیے تھا۔ ایک لفظ سکھا دینے والا بھی استاد کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔ آپ تو ماشاءاللہ اتنے ننھے ننھے پودوں کی آبیاری کر رہے ہیں وہ بھی اتنے ناموافق حالات اور موسم میں۔''

اس نے سرسری نظر بچوں پر ڈالی اور پھر ماسٹر کو قابل تحسین نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی نظر میں حقیقتاً عقیدت تھی' سکول ماسٹر پر حیرت اور بے یقینی کا حملہ ہوا تھا' اس کی بوکھلاہٹ میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

اور ادھر آمنہ علی اسے اتنا مہربان دیکھ کر اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی' اس کے اندر کا اضطراب اس کے چہرے سے چھلکنے لگا۔ وہ اپنا سن گلاسز انگلیوں میں زور زور سے گھمانے لگی' ادھر وہ اس کے اضطراب سے بے خبر تھا' انجان... اس کی سمت پلٹا۔

''کیا خیال ہے سکول کا معائنہ نہ کر لیا جائے؟ کچھ کلاسز شاید اندر بھی ہیں' کیا بچے اور بھی ہیں۔'' اس نے پھر ماسٹر کی طرف رخ کر کے استفسار کیا تو وہ زور زور سے سر ہلانے لگا۔

''جی' جی بس ایک کلاس ہے اتنے ہی اور بچے ہوں گے۔''

''وہاٹ نان سینس! کیا کر رہے ہو ولید! یہ بھی کوئی سکول ہے' سکول کے نام پر دھبہ ہے' اس کا... معائنہ کرنا ہے تمہیں' ٹوٹی پھوٹی دیواریں' کٹی پھٹی چٹائیاں' شٹ۔''

اسے ولید کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ وہ تحیر سے اسے دیکھنے لگی۔

''یہ بات تو تمہارے باپ کو سوچنی چاہیے تھی' انہیں غالباً یہاں کے لوگوں نے ہی تو ووٹ دیئے ہیں۔'' وہ ہلکی سی شگفتگی سے چوٹ کرتا ہوا بولا تو وہ یکدم کچھ شرمندگی محسوس کرتے ہوئے خاموش سی رہ گئی۔ جبکہ وہ قدم اٹھاتا ماسٹر کے ساتھ اندر چلا گیا۔

کوئی پانچ منٹ بعد واپس آیا تو وہ گاڑی کی ڈگی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

”آئی ایم سوری مگر میرا خیال ہے مجھے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے۔“ اس نے ڈرائیونگ کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے اس پر نظر ڈالی اور اس کے تاثرات کا جائزہ لیا‘ پھر ایک گہری قدرے متاسفانہ سانس بھری۔

”مجھے تو کوئی شعر بھی نہیں سوجھ رہا جو خفا ہونے والے یار کو منانے کے لیے ہوتا ہے۔ اف کس قدر کوڑھ دماغ ہوں۔“ اس نے سر پر یوں ہاتھ مارا جیسے واقعی خود کو دوش دے رہا ہو۔

وہ پلٹ کر غصیلی نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ وہ سمجھ نہیں سکا یہ غصہ مصنوعی تھا یا اصلی۔

”پلیز پہلے ہی دھوپ بہت تیز ہے اب یہ گرم گرم کرنیں تو مت پھینکو۔ ایسا نہ ہو کھڑے کھڑے ہی چرغا بن جائوں اور تم اپنے باباسائیں کے ساتھ مل کر مجھے تناول فرما جائو۔“

”شٹ اپ تناول تو تمہیں میں چرغا بنا کر نہیں روسٹ بنا کر کروں گی۔“ وہ غرائی اور جھٹکے سے دروازہ کھول کر دھپ سے سیٹ پر جا بیٹھی پھر جارحانہ انداز میں دروازہ بند کیا۔

”یااللہ‘ میری مدد فرمانا۔“ اس نے آسمان پر نگاہ ڈال کر سانس بھری اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر سیٹ سنبھال لی۔

”ایک شعر عرض ہے بڑی مشکل سے یاد آیا ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دروازے سے بالکل یوں چپک کر بیٹھ گیا گویا وہ واقعی کوئی چیز اٹھا کر اسے دے مارے گی یا روسٹ بنانے کے لیے ابھی سے اس کا گوشت کاٹنے لگے گی۔

”نہیں سننا مجھے کوئی شعر ویر۔“ وہ ہنوز روٹھے پن سے بولی۔

”اوکے! نہ سہی پھر مت کہنا کہ سنائو۔“

اس نے سر ہلا کر اگنیشن میں چابی پھنسائی۔

”کسی اور حسینہ کو سنانے کے کام آجائے گا۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر دانت پیسنے لگی پھر بے اختیار ہو کر ہنس پڑی۔

”مائی گاڈ‘ تم کیا ہو ولید! میں کبھی کبھی الجھ جاتی ہوں۔ کبھی تو اتنے سنجیدہ اور ایسے فلسفی لگنے لگتے ہو‘ کبھی بے حد قریبی فرینڈ اور کبھی الجھے الجھے غائب دماغ پروفیسر۔“

"ماشاءاللہ اس سے اچھا تجزیہ آج تک میرا کسی نے نہیں کیا۔ اب یہ بتاؤ کب لکھ رہی ہو مجھ پر ایک مکمل جامع کتاب۔" وہ حیرت ناک خوشگواری سے بولا۔

"اف..." وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"کتاب تو لگتا ہے تمہیں لکھنی ہے گائوں کی زندگی پر' خاک تو یونہی چھان رہے ہو یہاں کی۔" آمنہ کی بات پر ولید کے چہرے پر موجود خوشگوار تاثرات پر سنجیدگی کی ایک لہر آ کر گزر گئی۔

"ہوں' ہو سکتا ہے یہ کام بھی کبھی کر ہی ڈالوں' اینی وے یہ بتاؤ سکول نما ڈربے یا ڈربے نما سکول کو دیکھ کر تمہیں کوئی رنج نہیں ہوا' کم از کم یہاں اعلیٰ نہ سہی غریبانہ سہولیات تو میسر ہونی چاہیے تھیں۔" اس کے چہرے پر قدرے سنجیدگی بلکہ قدرے اذیت کے تاثرات پھیل گئے تھے۔

"دفع کرو' اب ہمیں ان دو دو ٹکے کے لوگوں کے لیے اتنا پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ سب اپنی اپنی قسمت کا کھاتے اور پہنتے ہیں۔"

وہ بے زاری سے کہہ کر سن گلاسز آنکھوں پر جمانے لگی۔ ناگواری اور اکتاہٹ کے جذبات اس کے چہرے سے عیاں تھے' جو میک اپ کی تہیں بھی نہ چھپا پا رہی تھیں۔

ولید کو ایک لمحے کیلئے اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے مگر دوسرے پل وہ ایک متاسفانہ سی سانس بھر کر ونڈ سکرین پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے مسکرا دیا۔

"اس کے لیے آمنہ علی کی ایسی سوچیں اور خیالات کسی اچنبھے کا باعث ہرگز نہ تھے' یوں بھی وہ جس ماحول کی پروردہ تھی اور جس زعم میں مبتلا تھی وہاں کم از کم ایسے خیالات کا اظہار ایسا کوئی انوکھا نہیں تھا' نہ ہی حیرت انگیز۔

ہاں تاسف اسے اس بات کا ضرور ہوا تھا کہ کس تیزی سے ہمارے اندر بے حسی' بے رحمی' بے مروتی فروغ پا رہی تھی۔ ہم تیزی سے عاقبت نااندیش ہوتے جا رہے تھے اور اپنے ضمیر کی ندامتوں پر کان دھرنا بھی عبث خیال کرنے لگے ہیں۔

"تمہیں بھی ادا سائیں کی طرح لوگوں کے غم پالنے کی عادت معلوم ہوتی ہے؟"

وہ اس کی طرف دیکھ کر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ وہ چونکا۔

”ادا سائیں!“

”ہاں ادا توقیر شاہ' ان کے جگر میں بھی سارے جہاں کا درد ہے۔ ان کا بس چلے تو وہ کیا سے کیا کر ڈالیں۔“

”آ... چھا۔“ اس کے لیے یہ خاصا خوشگوار انکشاف ثابت ہوا تھا۔ اس نے قدرے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا سے کیا تو خیر یہاں اکثر ہی لوگ کر ڈالتے ہیں۔“ (اور حیرت کی بات ہے کہ بااختیار ہونے کے باوجود ابھی تک کچھ کیا کیوں نہیں ہے)۔

دوسرا جملہ اس نے صرف دل میں کہا تھا پھر یک دم اس کے پیر کا دباؤ بریک پر پڑا' اس کی نگاہیں ونڈ سکرین کے پار دیکھ کر ٹھٹکی تھیں' اس نے تیزی سے گاڑی روک کر بائیں ہاتھ سے آنکھوں پر جمے سن گلاسز ہٹائے تھے۔

X...X...X

”آخا۔ وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔“

وہ یونیورسٹی سے لوٹی تھی' لائونج میں اکٹھے سب کو دیکھ کر اس کی ساری تھکن ساری بیزاریت دور ہو گئی۔ طوبیٰ اور طلحہ اس سے لپٹ گئے اور وہ ان دونوں کو اٹھا کر مما کے پاس آ بیٹھی۔

”آئیں گے کیوں نہیں شہرینہ بی بی!“

وہ کیا ہیں آج ان کے فرشتے بھی آئیں گے

وعدے کی شب نہیں ہے یہ دن ہے حساب کا

صغریٰ نے بیچ میں اپنی شاعری کی ٹانگ توڑی کچھ کروفر کے ساتھ۔

”ہیں ہیں ہیں۔“ مما ازحد تحیر سے اچھل ہی پڑیں۔ بھابی کی ہنسی بھی بے ساختہ تھی۔

”واہ بھئی ہماری ہفتہ بھر کی غیر موجودگی میں اتنی تبدیلیاں۔“

مونا بھابی نے صغریٰ کو داد بھری نظروں سے دیکھا تو وہ شرما کر دوپٹے کے پلو کو انگلی میں لپیٹنے لگی۔

"بس یہی کچھ ہوتا رہا ہے تم لوگوں کے بعد' آخر لگ ہی گئے اسے بھی جراثیم ادبی لوگوں کے۔" آغا جی ٹھنڈی سانس کھینچ کر رہ گئے۔

"ابھی آپ کو پوری غزل سنادے گی صغریٰ۔" شہرینہ شرارت سے ممی کی طرف جھک کر بولی تو انہوں نے خفگی سے اس کا کان کھینچا۔

"یہ سب تمہاری حرکتوں کا نتیجہ ہے۔ حد ہو گئی۔ پہلے ہی یہ سب کم تھے کہ اب تم بھی شروع ہو گئیں۔" ممانے باقاعدہ صغریٰ کے لتے لئے۔

وہ یک بیک بوکھلائی کہاں۔ داد و تحسین کے ڈونگروں کی منتظر تھی' کہاں بڑی بیگم صاحبہ نے اپنے غصے کا بم بلاسٹ کر دیا۔

"وہ... جی' میں تو یونہی موج میں آکر بول لیتی ہوں۔" وہ منمناتی صفائی پیش کرنے لگی۔

"لگتا ہے ہماری غیر موجودگی میں خوب موجاں اڑائی ہیں اور اس احمق گدھی لڑکی نے تم پر بالکل بھی کنٹرول نہیں رکھا۔"

صغریٰ جھینپ کر اپنے کام میں لگ گئی۔

"ولید ابھی تک آیا نہیں ہے کیا؟ لگتا ہے اسے گائوں میں کچھ زیادہ ہی مزا آگیا ہے۔ کوئی اطلاع وغیرہ دی یا نہیں۔ یہ لڑکا اتنا لاپرواہ ہے تو نہیں۔"

مما اب آغا جی سے مخاطب تھیں۔

"ہاں اپنی خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع تو دی تھی' واپسی کا کچھ کہا نہیں ہے۔" آغا جی نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور چشمہ اتار کر رومال سے آنکھیں پونچھنے لگے۔

"آپ لوگ بغیر اطلاع کیسے آگئے۔" شہرینہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بھابی کے پاس آکر بیٹھ گئی اور طوبیٰ کو گود میں بٹھالیا۔

"سچ! میں تو بوریت سے فوت ہونے والی تھی پوچھ لیں آغا جی سے۔ کیوں آغا جی!" وہ طوبیٰ کی چھوٹی چھوٹی نرم گلابی ہتھیلیاں ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولی۔

"اتنی باذوق صغریٰ کے ہوتے ہوئے بھی۔"

بھابی ڈائننگ میز پر برتن رکھنے آتی صغریٰ پر نظر ڈال کر ہنسیں تو صغریٰ نے سن کر ایک ٹھنڈی اور طویل قسم کی سانس بھری۔

"رہنے دیں جی! یہاں کسی کو قدر ہی نہیں ہے میری۔" وہ منہ پھلا کر جلدی جلدی پلیٹیں رکھنے لگی' بھابی اور شہرینہ ہنسنے لگیں۔

"سکندر بھائی تو بڑی قدر کرتے ہیں تمہاری۔ پتہ ہے اس دن کہہ رہے تھے صغریٰ کو ایک عالمی مشاعرے میں بھیجنے کا سوچ رہا ہوں۔" شہرینہ کی بات پر اس کی کاجل سے بھری آنکھیں چمکنے لگیں۔

"کہہ رہے تھے گھوٹکی کی بس میں بٹھا دینا' ایک غزل تیار ہو جائے گی' میاں چنوں کے مشاعرے کے لیے۔" صغریٰ احتجاجاً وہاں سے واک آئوٹ کر گئی۔

"شیری نہیں سدھرو گی تم۔ تمہاری ان ہی حرکتوں نے اسے بھی بگاڑ دیا ہے۔"

مما ہنسی چھپاتے ہوئے اپنے لہجے میں غصے کا تاثر سموتے ہوئے اسے اپنی سنہری سنہری آنکھوں سے گھورنے لگیں۔

"اس کے تو باپ سے شکایت کروں گی تو ٹھیک ہو جائے گی مگر ہماری اس شتر بے مہار کے کان تو آپ کھینچیں۔" وہ آغا جی سے مخاطب ہوئیں جو اخبار میں گم تھے۔

"یہ کام عورتیں ہی عمدگی سے انجام دے سکتی ہیں' مجھے کیوں بلاوجہ کھینچ رہی ہو بیٹی!"

آغا جی فوراً دامن بچا گئے۔ شہرینہ نے مسکرا کر مکا لہرایا مگر دوسرے ہی پل مما کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر صوفے سے اٹھ کر جھپاک سے کمرے سے نکل بھاگی۔

X...X...X

وہ نہا کر ڈائننگ روم میں آئی تو صغریٰ کھانا لگا چکی تھی' وہ سب میز کے گرد بیٹھے تھے۔

"پاپا کیوں نہیں آئے مما! کیا کوئی میٹنگ شیٹنگ وغیرہ ہونا باقی ہے۔" وہ کرسی کھینچ کر گیلے بال پشت پر جھٹک کر بیٹھ گئی۔ پھر شانوں پر پڑا دوپٹہ سر پر ڈال لیا۔

"نہیں میٹنگ تو ان کی ایک دن کی ہی تھی' امی اور سلمان بھائی نے انہیں روک لیا تھا۔ وہ کل اسلام آباد سے وسیم کے ساتھ سنگاپور چلے گئے ہیں۔ پرسوں تک واپسی ہو گی غالباً۔"

"اوہو' وسیم بھائی بھی پہنچ گئے تھے اسلام آباد؟"

اس نے سیٹی کے انداز میں ہونٹ گول کیے اور بھابی پر شرارتی نظر ڈالی' جو طوبیٰ کی پلیٹ میں چاول ڈال رہی تھیں۔

"آخر سسرال کا معاملہ تھا۔"

"جی نہیں ان کا ننھیال ہوتا ہے سمجھ گئیں۔" بھابی نے چاول نکالنے والا چمچہ اس کے ہاتھ پر دے مارا جو میز کی سطح پر دھرا تھا۔ اس نے جھٹکے سے ہاتھ کھینچ لیا اور جھٹکنے لگی، ضرب زور دار تھی۔

"یہی تو مزے ہیں ان کے۔ دو طرح کے مزے لوٹتے ہیں ممانی ساس بن کر واری صدقے جاتی ہیں ان کے اور نانی جان کا تو پوچھنا ہی کیا، وسیم بھائی تو پہلے ہی ان کے آنکھ کا تارہ، دل کا نور، پھیپھڑوں کا سرور اور کلیجے کا غرور تھے، نانی ساس بن کر تو اور واری صدقے رہتی ہیں، ادھر ہم ہیں کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔" اس نے طویل قسم کی افسردہ سی سانس کھینچی۔

بھابی ہنسنے لگیں۔

"لوگ جیلس ہو رہے ہیں۔" وہ چہکیں۔

"ایسے ویسے۔" وہ بلا تامل سر ہلانے لگی۔

"شہری! ولید نے اپنے آنے کا کچھ بتایا ہے، کتنے دنوں کا پروگرام ہے اس کا۔" مما کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"جب سے آپ آئی ہیں، ولید ولید کی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔ بھلا مجھے ان کے شیڈول کا کیا علم، وہ کون سا مجھے بتا کر آتے جاتے ہیں، نہ میں خبریں رکھتی ہوں ان کی۔" وہ منہ بنا کر سلاد کھانے لگی، بھابی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

گویا اس سے بھی ناراضگی چل رہی تھی، پھر جھک کر سرگوشی سے بولیں۔

"اچھا تم اس کی خبریں نہیں رکھتیں، یہ انکشاف بالکل نیا اور حیرت ناک ہے میرے لیے۔"

اس نے سر اٹھا کر بھابی کو تیز نظروں سے گھورنا چاہا مگر جانے کیا تھا ان آنکھوں میں وہ فوراً نظریں چرا گئی۔ اس کے دھلے دھلے نکھرے چہرے کی شادابی میں ہلکی سی سرخی شامل ہو گئی۔ وہ پلیٹ میں جھک کر نوالہ بنانے لگی، بھابی کی دبی دبی سرگوشیانہ ہنسی سماعت سے ٹکرا کر اسے خفیف سی کر گئی، اس سے کچھ نہ بن پڑا تو اس نے اپنا پیر زور سے ان کے پیر پر رکھ کر دبا ڈالا۔

X...X...X

"خدا کے لیے تانی! لے جائو یہ بالٹی، دھوپ ڈھل گئی تو کپڑے کیسے سوکھیں گے۔"

نادیہ آپی مسلسل چلا رہی تھیں اب منت پر اتر آئیں۔ وہ سامنے تخت پر چڑھ کر اپنا سوشیالوجی کا جرنل مکمل کر رہی تھی۔

"کیا مصیبت ہے آپی! جب دیکھو ڈھیر سارے کپڑے دھو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ جانے دیں دھوپ کو، ہوا میں سوکھ جائیں گے۔ اب سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر اتنی دھوپ میں کپڑے سوکھانے جائوں۔ آپ نے تو میری ڈیوٹی ہی لگادی ہے۔"

وہ کتاب بند کر کے جھنجلاہٹ سے بولی۔

"جائو نا اچھی بہن! شام کو نومی اپنے شلوار سوٹ کے لیے اودھم مچادے گا کہ سوکھا نہیں ہے۔"

"بس یہ اسائنمنٹ پورا کر لوں۔" وہ ان کے لہجے کی التجا پر کچھ پگھل گئی۔

"لے کر صبح سے بیٹھی ہے، آگ لگادو میں تو کہتی ہوں اس نگوڑ ماری پڑھائی کو، سر ہی کھپانا ہے۔" اماں اچار کا مسالہ سنبھالے باورچی خانے سے برآمد ہوئیں اور تخت پر آکر بیٹھ گئیں، وہ صبح سے تانیہ کو کتابوں میں منہ دیئے بیٹھے دیکھ کر کڑھ رہی تھیں۔

"ایک دن چھٹی کا وہ بھی تم دونوں بہن بھائیوں کا ان کاغذوں پر سر کھپاتے گزر جاتا ہے۔"

"تعلیم کو ویسے ہی یہاں آگ لگ چکی ہے اماں جان! اب مزید کیا لگے گی؟ ناخواندگی کی شرح میں آپ کی دعا سے روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔"

سکندر اپنے کرتے کی فولڈ آستین کو کھولتا کمرے سے باہر آیا اور اماں کے جملے کے جواب میں ایک افسردہ سی سانس بھر کر بولا۔ اماں دہل گئیں۔

"چل ہٹ میں کیوں تعلیم کے خلاف ہونے لگی۔"

انہیں الزام خود پر نہ بھایا تھا۔

"میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ایک چھٹی کا دن ہوتا ہے اس میں بھی یہ لڑکی ان موٹی موٹی کتابوں میں سر دیئے رہے گی اور تم ہزار بکھیڑے اپنے آگے پھیلائے دن گزار دیتے ہو۔" اماں کو اس کے کاغذوں اور قلم سے چڑ ہو گئی تھی' وہ ہنس پڑا۔

نادیہ آپی نے نل پر لٹکے باقی ماندہ گیلے کپڑے اٹھا کر بالٹی میں ڈالتے ہوئے تانیہ کو دیکھا پھر بالٹی اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی جسے دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرا دی۔

"اچھا نا' جاتی ہوں' ویسے امی..." وہ اماں کی طرف مڑی۔ "اس صاحب بہادر کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں جو چھٹی کا سارا دن آپ کے تخت پر سوتے ہوئے گزار دیتا ہے اور کبھی کبوتروں کو دانہ ڈالتے ہوئے۔"

اماں نے اچار کے مسالے کو ملاتے ہوئے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔

"تو پیچھے پڑی رہتی ہے میرے اس بچے کے' اس کا آرام کرنا بھی تجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

"نہیں اماں! تانیہ کو اس کے کبوتر ایک آنکھ نہیں بھاتے جو دن بدن اپنے حجم میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔" نادیہ آپی ہنس کر وہیں سے بولیں۔

"سکندر بھائی! افلاطون کے پوٹوپیا میں کہیں ہمارے نعمان بھائی فٹ آتے ہیں۔" تانیہ اماں کی طرف شرارتی نظروں سے دیکھ کر سکندر سے گویا ہوئی۔

"نعمان تو نہیں البتہ اس کے کبوتر فٹ آتے ہیں چونکہ بے مثال' پر سکون' معاشرے میں آسودہ حال' صحت مند چیزیں ہی ظاہر ہے فٹ آسکتی ہیں۔"

اطمینان سے بول کر کرسی کی پشت پر ٹیک لگا لی پھر یک بیک سنجیدہ ہوتے ہوئے کچھ یاد آنے پر اماں کی طرف کرسی سمیت رخ کر لیا۔

"میں تو بتانا ہی بھول گیا نومی کے لیے ایک بہت اچھی جاب ہے پرائیویٹ کمپنی ہے ایک گارمنٹ کی' ہے کہاں نومی؟"

اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں' مگر نومی ہوتا تو نظر آتا نا۔

"تم بات کرو اس سے۔ اگر اس کا دل مانے تو بات بنے نا بیٹا! پتا نہیں کس قسم کی نوکری چاہتا ہے وہ۔ کوئی ایک جست میں لاکھوں کما لیتا ہے کیا؟"

اماں ایک گہری سانس بھر کر رہ گئیں۔

نادیہ آپی غسل خانہ دھو کر نکلیں تو بالٹی یونہی بھری دیکھ کر ان کی جان ہی جل گئی۔ وہ تانیہ کے سر پر آموجود ہوئیں۔

"سخت نکمی کاہل لڑکی ہو' اب پڑھائی نہیں ہورہی ہے' باتوں میں لگ گئی تو..." اسے اماں اور سکندر کی طرف متوجہ ان کی باتیں سنتے دیکھ کر ایک ہاتھ جڑ دیا۔ وہ کھسیا کر ہنس پڑی اور پین جرنل کے درمیان رکھ کر جرنل بند کر کے بے زاری سے تخت سے اتری۔

"میرے اللہ ایسی سگھڑ' محنتی آپا کسی کو نہ دے۔" اس نے آسمان کی طرف منہ کر کے جیسے دعائیہ انداز میں سانس بھری۔

"آپ کے ہونے والی سسرال کے لیے میں خود دعا کروں گی کہ اللہ کرے وہ آپ کو بستر پر بیٹھا کر کھلائیں' کپڑے دھونے کے لیے ایک رومال بھی نہ دیں۔ آپ کو باورچی خانے کے دروازے پر بھی نہ پھٹکنے دیں' آپ کام کو ترسیں اور کام نہ کرنے دیں۔" وہ دہائیاں دیتی بالٹی جھٹکے سے اٹھا کر چھت کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ نادیہ آپی کے چہرے کے نرم نقوش میں مسکراہٹ کی چاندنی بکھر گئی پھر وہ بے ساختہ ہنسی کو نہ روک سکی تھیں۔

X...X...X

"کیا ہوا ولید!" آمنہ علی اس کے یوں ٹھٹکنے اور گاڑی روکنے پر حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی' پھر اسے سامنے نگاہیں جمائے ایک گہرے جامد سناٹے میں دیکھ کر اس کا کندھا ہلانے لگی۔

"کسے دیکھ رہے ہو؟" یہ پوچھتے ہوئے اس نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا مگر الجھ کر رہ گئی۔

سامنے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے' ایک گھر کی دہلیز سے ایک بوڑھا سفید شلوار سوٹ میں لاٹھی سنبھالے اتر رہا تھا۔ ایک طرف گندے میلے کچیلے بچے مٹی اور کچرے کے مشترکہ ڈھیر پر کھیل رہے تھے۔ اس کے خیال میں تو کوئی ایسی قابل توجہ چیز نہ تھی جس نے ولید حسن کو یوں یک دم ہپناٹائز کر دیا تھا۔

اس پر عالم مدہوشی کا غلبہ بہت مختصر تھا وہ جلد ہی سنبھل کر گلاسز آنکھوں پر جمانے لگا۔

"اب خدا کے لیے اتر کر یہاں کا معائنہ کرنے کی خواہش کا اظہار مت کرنا۔"

وہ اسے اس کیفیت سے نکلتا دیکھ کر اور اس کے تیور بھانپ کر قدرے لجاجت سے بولی تو وہ غیر ارادی طور پر ایک دو لمحے خاموش ہی رہا۔ بس سر کو ہلکی سی تابعدار جنبش دے کر گاڑی

سٹارٹ کر دی۔ اس کے ذہن کے افق پر ایک نامانوس سی دھند چھا سی گئی تھی جسے اس نے جھٹکنے کی شعوری کوشش کی۔

اسے گاڑی ریورس میں لیتا دیکھ کر آمنہ علی نے سکون کا سانس لیا تو وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔

''اس کا مطلب ہے میں نے تمہیں ٹھیک ٹھاک بور کیا۔''

''نو ڈاؤٹ!'' اس نے بلا تامل سر ہلا دیا۔

وہ دونوں حویلی لوٹے تو سہ پہر ہو چکی تھی، ڈھلتی دھوپ پھاٹک سے لے کر لان میں پھیلی ہوئی تھی مگر جگہ جگہ خوش نما جھاڑیوں کے شیڈ کے باعث سائے کا احساس غالب تھا۔

''بابا سائیں آ چکے ہیں۔'' وہ گیراج میں مردان علی شاہ کی ذاتی استعمال کی پجیرو دیکھ کر بولی پھر چونکی۔

''ارے یہ تو ادی عابدہ کی گاڑی بھی ہے۔''

وہ ایک دوسری سفید رنگ کی گاڑی دیکھ کر پر مسرت انداز میں اس جانب بڑھی۔ یہ سیاہ شیشوں والی لمبی سی گاڑی تھی جو غالباً ان کے آنے سے قبل ہی آ کر حویلی کے گیراج میں رکی تھی کیونکہ اس میں سے ایک خالص گھریلو قسم کی تیس پینتیس سال کی عورت اتری تھی۔

''السلام علیکم ادی!'' وہ آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گئی۔

''ولسلام، مل گئی تجھے فرصت گوٹھ آنے کی؟'' وہ آمنہ علی کو بانہوں میں بھر کر پیار کرتے ہوئے بولیں۔

''بس ادی! پڑھائی ہی فرصت نہیں دیتی، ادا نہیں آئے ساتھ۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی ڈرائیور کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''شام تک کہا ہے آنے کو، ایک دو کام نمٹانے تھے کچھ کچہری وغیرہ کے اور تم سناؤ ہم تو تمہارے مہمان سے ملنے آئے ہیں۔''

انہوں نے ڈھلکتی چادر کو سر پر ڈال کر آمنہ کا چہرہ دیکھا پھر یک دم ان کی نظریں ذرا فاصلے پر رک جانے والے ولید حسن پر پڑیں تو ان کی آنکھوں میں توصیفی چمک لہرانے لگی۔

"یہ ولید حسن ہے۔" آمنہ علی نے گھوم کر ولید کی طرف دیکھ کر بہن سے تعارف کرایا۔

لامحالہ اسے آگے آکر سلام کرنا پڑا۔

سیاہ رنگ کے شلوار سوٹ میں اونچے قد اور چوڑے شانے والا خوبصورت چہرے، ذہین آنکھوں والا ولید حسن ایک مکمل سراپا تھا ایک سحر انگیز شخصیت تھی۔

عابدہ علی نے بہن کو دیکھا اور جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی پسند کو سراہا، پھر مسکراہٹ لبوں پر بھر کر بولیں۔

"بھئی میں تو منہ پر تعریف کرنے کی عادی ہوں اگر برا نہ لگے تو کہہ دوں کہ آپ مجھے بالکل انگلش فلموں کے خوبرو ہیرو لگ رہے ہیں۔"

ان کا انداز بڑا شگفتہ سا تھا۔ کسی عورت کے منہ سے تعریف کا یہ انوکھا انداز اس کے لیے انوکھی آزمائش ہی تھا، وہ جھینپ کر رہ گیا۔

"اس کا مطلب ہے آپ انگلش فلمیں بہت شوق سے دیکھتی ہیں۔" اس نے اپنے اعتماد کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ برجستہ شگفتگی سے بولا تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔

"صرف وہی جس میں ہیرو خوبصورت ہو۔"

وہ بھی بلا کی حاضر جواب تھیں پھر خود ہی ہنس پڑیں، ہنسنے سے ان کے کانوں کے بڑے بڑے سنہری آویزے جھلملانے لگے۔

آمنہ علی کے برعکس وہ ایک مکمل وڈیری کے روپ میں تھیں، بھاری بھرکم سونے کے زیورات میں لدی ہوئی سندھی کشیدہ کاری کے شلوار سوٹ میں بڑی سی ہم رنگ چادر اوڑھے ہوئے جس کے بارڈر پر دلکش کڑھائی کی گئی تھی، ننھے منے شیشے بھی جھملا رہے تھے، دونوں ہاتھوں میں ڈھیر ساری کھنکتی سنہری چوڑیاں تھیں، اسی طرح انگلیوں میں مختلف ڈیزائنوں کی انگوٹھیاں۔

"میرا خیال ہے باقی تعارف اندر ہو تو اچھا ہے۔" وہ مسکراتی آگے بڑھ گئیں اور وہ آمنہ علی کی ہمراہی میں چلنے لگا۔

"یہ میری سب سے بڑی ادی ہیں، ماماسائیں کے یہاں ہی بیاہی گئی ہیں، دس سال ہو گئے ہیں ان کی شادی کو، آٹھ سال کا بیٹا اور پانچ سال کی ایک بیٹی ہے۔"

وہ چلتے ہوئے تفصیل بتانے لگی۔ وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔ اندر داخل ہو کر وہ مردان علی شاہ کی طرف بڑھ گیا جو صوفے پر براجمان تھے جبکہ آمنہ اپنی ادی عابدہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

"ادی" شاہدہ کی کچھ خبر ہے' کیا وہ آئے گی۔" وہ دھیمے لہجے میں استفسار کرنے لگی' اس کے چہرے پر اضطراب کی خفیف سی لہر تھی۔

"آنا تو چاہیے اسے' یوں بھی وہ آج کل یہیں پر ہے اپنے سسرال آکر ٹھہری تو ہے' مگر پتہ نہیں اس کے موڈ کا وہ بھی اپنے گھر والے کی طرح ضدی ہے۔"

"ضدی ہی نہیں کم عقل بھی ہے' ورنہ کیا مجال کہ فدا حسین چند ٹکڑے زمین پر اکڑ دکھانے والا شخص اس پر حکومت کر سکتا۔"

آمنہ کے لہجے میں کھولن در آئی' وہ دانت یوں بھینچنے لگی جیسے ان کے درمیان اس کا بہنوئی فدا حسین آگیا ہو۔

"چھڈ دفع کر' لالچ کی پٹی بندھ گئی ہے اس حرام خور کی آنکھوں پر اور یہی پٹی وہ شاہدہ کی آنکھوں پر بھی باندھ رہا ہے کمینہ۔"

آمنہ علی کسی سوچ میں گم ہو گئی تو وہ اسے ٹہوکا مارتے ہوئے ولید حسن کا ایک بار پھر ستائشی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔

"منو' تیرا یہ مہمان تو پورا راجر مور لگ رہا ہے ایمان سے۔ ابھی پچھلے ہفتے تو "دی سینٹ" دیکھی تھی میں نے۔ سچ کہہ رہی ہوں' اتنا مل رہا ہے اس سے۔"

"اچھا۔" وہ لطیف سے انداز میں ہنس پڑی۔

"ادی تم فلمیں ذرا کم ہی دیکھا کرو۔" وہ ہلکے سے ہاتھ مار کر ان کے پاس سے کھڑی ہوئی اور مردان علی اور ولید حسن کی طرف بڑھ گئی جو ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف تھے۔

X...X...X

وہ کپڑوں سے بھری بالٹی اٹھا کر اپنی دھن میں کچھ بے زاری کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ چھت سے ذرا فاصلے پر آخری دو سیڑھیوں میں ٹھٹک گئی۔ سامنے دیوار سے لگا نومی' دوسری سمت کی چھت کی طرف کسی کو اشارہ کر رہا تھا' اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے' اشارے بازی ایک لڑکی سے ہو رہی تھی۔ اس کے اعصاب پر بھاری پتھر سا آ لگا۔ کتنے لمحے تو دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا۔

جو بات گمان میں بھی نہ ہو وہ حقیقت میں سامنے آ جائے تو شاید ایسی ہی سچویشن ہوتی ہو گی جو تانیہ کو درپیش تھی' وہ دو سیڑھیاں اوپر چڑھی اور آہستگی سے بالٹی اپنے پیروں کے قریب فرش پر رکھ دی۔

'تو کبوتروں کے بہانے وہ یہ سب تماشے کرنے آتا تھا' ساری کڑکتی جھلستی دوپہر کبوتروں کے نام نہیں بلکہ کبوتریوں کے نام کرتا تھا۔'

اسے اس لمحے نومی گرلز کالج کے اطراف گھومتے ان ہی آوارہ لڑکوں کی مانند لگا جنہیں وہ دل ہی دل میں ہزاروں کوسنے دیا کرتی تھی جو اس کی نظر میں انتہائی گھٹیا' بے راہ رو اور لچر قسم کے تھے۔

وہ تو شاید زندگی بھر اسے یوں رنگے ہاتھوں ایسی حرکتیں کرتے دیکھ کر نہ پکڑنے کا سوچتی مگر اب اتفاقیہ وہ پکڑ چکی تھی۔

برابر کی چھت پر کھڑی شائستہ اسے دیکھ کر تیزی سے پلٹ کر اپنی سیڑھیاں اتر گئی اور اس کے یوں بدحواس ہو کر بھاگنے پر بے خبر نومی' تانیہ کی موجودگی محسوس کر کے پلٹا تو سٹپٹا کر

رہ گیا۔ چہرہ یک دم یوں سپید پڑ گیا' جیسے رات کے مہیب اندھیرے میں گھر میں گھسنے والا نو آموز چور گھر کے مالک کے ہاتھوں یک دم پکڑا جائے۔

(یہ لڑکیاں بھی اس گندے کھیل میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔)

اس نے شائستہ کو جھک کر فرش سے دوپٹہ اٹھا کر کندھے پر ڈال کر سیڑھیاں پھلانگتے دیکھ لیا تھا۔ بظاہر شریف زادی نظر آنے والی' شائستہ کا یہ روپ حیران کر گیا۔ اس سے زیادہ نعمان کی شخصیت کے

اس گندے رخ سے پردہ ہٹنے پر وہ آزردہ سی کھڑی تھی۔

''بہت شرم کی بات ہے نومی' تم اس لیے چھت پر آتے ہو؟'' وہ ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی' وہ اپنا اعتماد بحال کر چکا تھا۔

''اس نے مجھے خود اشارہ دے کر بلایا تھا' میں تو کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا۔''

اس نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا' اس کے خیال میں اپنی صفائی میں اس سے بہتر جملہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ تانیہ کی ملامت کرتی نظروں میں رنج اور بے یقینی کی کیفیت پھیل گئی

”تم خود کو دیکھو نومی! اپنے کردار کی طرف دھیان دو۔ ایسی لوز کریکٹر کی لڑکیاں تو ہزار ہا راہوں میں بکھری ہیں، کیا تم ہر ایک کے اشارے پر بھٹکتے پھرو گے۔“ وہ لہجے کی تلخی کو نہ دبا سکی۔

”بکومت زیادہ۔“ وہ خجل سا ہو کر اس پر چڑھ دوڑا۔

”تم کون ہوتی ہو میری بازپرس کرنے والی۔“ وہ کبوتروں کے پنجرے کے پاس جا کر پنجرے کا دروازہ کھولنے لگا۔

”ہاں میں کون ہوتی ہوں بازپرس کرنے والی۔“ وہ تاسف سے سانس بھر کر بالٹی اٹھا کر کپڑے رسی پر پھیلانے لگی، پھر رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی جو اپنے کھسیاہٹ اور جھنجلاہٹ کبوتروں پر نکال رہا تھا، ہاتھ پنجرے کے چھوٹے سے دروازے میں ڈال کر ایک موٹے تازے کبوتر کو بلاضرورت پکڑنے کی سست سی کوشش کر رہا تھا جس سے سارے کبوتر ہراساں یہاں وہاں پھڑ پھڑا رہے تھے۔

”یاد رکھنا نومی یہ لڑکیاں بھی کسی کی بیٹیاں اور بہنیں ہیں۔“ وہ رسان سے بولی۔

”ہاں کسی کی بہنیں ہیں میری تو نہیں نا۔“ وہ بغیر پلٹے چیخ کر بولا اور زور سے پنجرے کا دروازہ بند کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھا کہ وہ بھاگ کر اس کی طرف آئی۔

”نومی میں بھی بہن ہوں تمہاری اور کوئی لڑکا میرے لیے بھی ایسا ہی سوچ سکتا ہے اس لیے کہ میں تو اس کی بہن نہیں ہوں نا۔“

”تانیہ... تم...“ وہ بھڑک کر ریلنگ پر ہاتھ ٹکا کر اس کی طرف مڑا، وہ اپنی جگہ ڈٹی رہی۔

”کچھ غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”کس کی ہمت ہے جو تمہیں ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھے، اس کی آنکھیں نکال کر رکھ دوں گا ہتھیلی پر، تم کسی کی نہیں نعمان قریشی کی بہن ہو سمجھیں۔“ وہ گرجتا برستا تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

”اونہہ، غیرت ہوتی تو دوسری لڑکیوں کی بھی عزت ہوتی تمہاری نظر میں۔“

وہ تاسف اور دکھ کے مشترکہ احساس کے ساتھ بے دلی سے رسی پر بقیہ کپڑے پھیلانے لگی، پھر خالی بالٹی جھٹک کر اٹھاتے ہوئے یونہی ایک نظر شائستہ کی چھت پر ڈالی۔

گھرے ملال رنج اور غصے کا ابال اس کے اعصاب پر طاری ہو گیا اور اس نے ایسے بارہا مناظر چھتوں پر دیکھے تھے۔

راہ چلتے۔

یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے باہر' ایسی لوز کریکٹر کی لڑکیاں اور لڑکے دیکھے تھے۔

کتابوں اور اخباروں میں ایسے قصے کہانیاں پڑھی تھیں مگر آج اپنے ہی گھر کے فرد کو اس کہانی کا کردار بنتا دیکھ کر دل دکھ کے پاتال میں اتر کر رہ گیا۔

وہ جانتی تھی ایسی حرکتیں محض جذبات کا وقتی ابال ہوتی ہیں۔

مگر وہ رستے' جوان کی طرف گئے ہیں۔

ازل سے لے کر ابد کی بے نام وسعتوں تک

گناہ کی منزل سے پھوٹتے ہیں۔

وہ خالی بالٹی لیے ڈھیلے ڈھالے قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

X...X...X

وڈیرہ مردان علی شاہ کی حویلی کے بڑے سے ڈرائنگ روم میں خوب رونق لگی ہوئی تھی' مردان علی شاہ کی کل آل اولاد ایک ساتھ جمع تھی' جس کا آمنہ علی نے فرداً فرداً ولید حسن سے تعارف کرایا تھا' وہ بے حد توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سب سے ملا تھا۔

ہدایت اللہ' مردان شاہ کا بڑا داماد تھا جو رشتے میں مردان علی کے سالے کا بیٹا تھا' وہ مخصوص زمیندارانہ سٹائل میں موجود تھا۔ کلف لگے شلوار سوٹ پر قیمتی سندھی اجرک کندھے پر ڈالے ہوئے' صوفے پر بیٹھنے سے زیادہ ڈھیر ہوا لگ رہا تھا۔

شکل وصورت میں وہ عام خوش شکل سا تھا مگر اس کے چہرے پر بکھری ہمہ وقت مسکراہٹ اسے ایک زندہ دل' پرکشش شخص ظاہر کر رہی تھی' وہ بے حد ٹھنڈے میٹھے لہجے میں بات کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

جبکہ مردان علی کا چھوٹا داماد ''فدا حسین'' اس سے متضاد حیثیت کا حامل تھا۔ اس کے اچھے بھلے نقوش پر بے زاری' تندی اور کرختگی غالب تھی۔ اس کے سر کے بال خاصے گھنے اور کھردرے تھے جو اس کی کرختگی میں اضافہ کر رہے تھے۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے صوفے

پر الگ تھلگ سے انداز میں یوں بیٹھا تھا جیسے بہت مجبوری سے آیا ہو یہاں تک کہ آمنہ علی کے تعارف کرانے پر بھی ولید سے بڑے روکھے پھیکے سے انداز میں مصافحہ کیا تھا۔

ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری شخصیت آمنہ علی کے بڑے بھائی یعنی مردان علی شاہ کے بڑے بیٹے "توقیر شاہ" کی تھی، جس کی شخصیت میں کوئی خاص بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ ایک جدی پشتی امیر زادہ اور وڈیرے کا بیٹا تھا، وہ عمر میں اپنی دو بہنوں سے چھوٹا مگر آمنہ علی سے بڑا لگ رہا تھا۔ بات بات پر بے ہنگم قہقہے لگاتے ہوئے وہ عجیب احمق معلوم ہوتا مگر خاموش یا ذرا سنجیدہ ہوتا تو اس کی شخصیت میں رعونت در آتی جو شاید اس کے ماحول کا حصہ تھی، اس کے علاوہ اس میں بلا کی خود اعتمادی اور بے خوفی تھی، یہ خود اعتمادی اور بے خوفی بھی یقیناً اس کے باپ کی دولت، اثر و رسوخ کی بخشی ہوئی تھی۔

"باباسائیں! اکبر کیوں نہیں آیا، بڑے دن ہوئے اس کی صورت نہیں دیکھی میں نے۔" عابدہ علی یاد آ جانے پر مردان علی سے پوچھنے لگی۔

"ہاں باباسائیں! آپ شہر تو گئے تھے اسے بھی ساتھ لے آتے۔" آمنہ علی بھی بولی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ہوں۔" مردان علی نے ہنکارا بھرا اور سگار لبوں سے آزاد کرتے ہوئے بیٹیوں کی طرف دیکھا۔

"اسے میں جان کر نہیں لایا، اسے پڑھنے دو یکسوئی کے ساتھ پہلے ہی اس کی تعلیم کا بہت حرج ہو چکا ہے اور یوں بھی اس چھورے نے مجھے۔" وہ بولتے بولتے یکدم چپ ہو گئے، پھر سگار لبوں میں دبا کر ولید حسن کی طرف متوجہ ہوئے جو گفتگو میں وقفہ آنے پر خاموش ہو کر ان کی طرف متوجہ تھا۔

"تو تم نے واپسی کا پروگرام بنا ڈالا ہے، بابا ابھی تو ہمارے گوٹھ میں دیکھنے کو بہت کچھ ہے۔" مردان علی پھر اس کی طرف خود بھی متوجہ ہو گئے۔

"یقیناً اور کچھ تو دیکھ لیا ہے۔" وہ مبہم سے انداز میں مسکرایا۔

"میرا خیال ہے مجھے دوبارہ آنے کا چانس رکھنا چاہئے ایسا نہ ہو آپ میری میزبانی سے پہلی بار ہی اکتا جائیں۔ آپ کا گوٹھ تو میرے لیے بے حد کشش کا باعث ہے۔"

وہ بولا اور یونہی آمنہ علی کی طرف دیکھا جس کے رخسار جانے کس خیال کے تحت تپ سے گئے، جبکہ اس کے لبوں کی تراش میں دھیمی پر سوچ سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔

"نہ پتر! مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔"

"ہاں اگر مہمان مہمان ہی رہے تو۔" وہ برجستہ بولا تو مردان علی شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کوند گئی' وہ اس کے جملے پر محظوظ ہوئے تھے۔ توقیر شاہ نے البتہ اپنی عادت کے مطابق جاندار قسم کا قہقہہ لگایا تھا۔

"بھئی تم آنا ہماری طرف بھی' آمنہ بجڑی کے یار دوست ہمارے بھی یار دوست ہیں' ہمارے گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔" مردان علی کا بڑا داماد ہدایت اللہ پرخلوص اور مربیانہ انداز میں اسے دعوت دینے لگا جسے اس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کیا۔

"ضرور کیوں نہیں' دراصل میری غیر موجودگی میں عاصم بھائی پر خاصا برڈن ہو جاتا ہے۔ وہ عموماً بزنس ٹورز پر رہتے ہیں تو ان کی غیر موجودگی میں مجھے سب دیکھنا پڑتا ہے۔" اس نے سہولت سے واضح کی۔

"ہاں یہ پھیلے ہوئے کاروبار بھی کسی بکھیڑوں اور عذابوں سے کم نہیں ہوتے۔ آدمی مرتے دم تک ان جھمیلوں میں پھنسا رہتا ہے۔"

مردان علی شاہ نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ اس نے دیکھا پہلی بار الگ تھلگ بیٹھے فدا حسین کی آنکھوں کی تہوں میں سرد مہری اور بے زاری کی جگہ ایک ہلکی چمک نے لی تھی۔ وہ پہلی بار دلچسپی سے ولید حسن کا نئے سرے سے جائزہ لینے لگا تاہم گفتگو میں کسی شمولیت کی کوشش نہ کی جبکہ ہدایت اللہ اپنی تمام تر دلچسپی کے ساتھ بولا۔

"یہ تم لوگ دو اور دو پانچ کیسے کر لیتے ہو' مجھے تو آج تک کاروبار کی الف ب' سمجھ نہیں آئی۔ یہ کھڑاک کیسے پال لیتے ہو تم لوگ' ایک پائوں ملک میں تو دوسرا ملک سے باہر' کبھی فائلوں میں سر کھپاؤ کبھی مزدوروں کے مسائل میں الجھو۔"

"ادا سائیں اسی لیے تو اللہ نے آپ کو زمیندار بنایا ہے بزنس مین نہیں۔" توقیر شاہ کی بات پر وہ ہنس پڑا۔

"ہاں اس کا شکر ہے۔"

"جبکہ میں سوچتا ہوں کہ یہ زمینداری اور جاگیرداری کا بار کیسے اٹھا لیتے ہیں آپ' ہم تو دو اور دو پانچ کرتے ہیں آپ لوگ تو ماشاءاللہ پانچ اور پانچ پچپن کر لیتے ہیں۔"

ولید کے لہجے میں شگفتگی تھی‘ باوجود اس کے وڈیرہ مردان علی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ سگار لبوں میں دبا کر زور سے کش لینے لگا جبکہ ہدایت اللہ کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی‘ اس نے ولید حسن کی بات کو مذاق کے رنگ میں ہی لے کر ہنسی میں اڑا دیا بلکہ مربیانہ اور متاثرانہ انداز میں اس کے کندھے پر اپنی وزنی ہتھیلی کا بوجھ رکھتے ہوئے بولا۔

”خاصے خوش مزاج اور ذہین معلوم ہوتے ہو‘ ایسے لوگوں سے مل کر میں واقعی بہت خوش ہوتا ہوں۔“

وہ اس ستائش پر خاموش ہی رہا۔

X...X...X

اس واقعہ نے تانیہ کو ذہنی طور پر خاصا ڈسٹرب کیا تھا۔ گو کہ براہ راست اس کی ذات متاثر نہ ہوئی تھی لیکن نعمان رضا قریشی اس کا سگا بھائی تھا جس سے اس کا تعلق بے حد گہرا اور اپنائیت کا تھا مگر جس طرح اس کے کردار کا یہ رخ اس کی نگاہوں کے سامنے آیا تھا وہ اس کے لیے کسی اذیت سے کم نہ تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کی اذیت کو اس کا دل ہی محسوس کر رہا تھا‘ اس نے دانستہ نادیہ آپا سے ذکر نہ کیا‘ یوں بھی جو کام ڈر کر چوری چھپے ہو رہا تھا وہ اگر کھل کر ایک بار سامنے آ جائے تو سارے خوف‘ ڈر اور مروت کے پردے چاک ہو جاتے ہیں اور وہ کام کھل کر ہونے لگتا ہے۔

جبکہ اس کی نظر میں نومی وہ نو آموز اور چھوٹا چور تھا جو خوف کی دیوار میں چھپ کر عزت کے پردے کی آڑ میں چھوٹی موٹی بے ایمانیاں کر لیتا تھا‘ گو کہ اس کی پکڑ ضروری تھی تاہم فی الحال وہ مصلحتاً اس بات کا گھر والوں سے ذکر کرنا مناسب نہ سمجھ رہی تھی ہاں البتہ اس نے شہرینہ کو ضرور بتایا۔

لحظہ بھر کو تو وہ ہکا بکا رہ گئی‘ پھر ہنسی تو ہنستی چلی گئی‘ وہ دونوں کہنیاں ٹیبل پر رکھے‘ ہتھیلیاں دائیں بائیں گال پر جمائے اسے گھورنے لگی۔

”میں نے لطیفہ نہیں سنایا تمہیں‘ ایک عبرت ناک داستان سنائی ہے۔“

”اب اتنی عبرت ناک بھی نہیں ہے۔ ویسے یہ شائستہ چیز کیا ہے؟ میرا مطلب ہے اس کا حدود اربعہ خاندانی پس منظر وغیرہ وغیرہ۔“ وہ ہنسی روک کر کرسی پر بیٹھ کر پوچھنے لگی۔

تانیہ کے چہرے کے نقوش میں بے زاری جھلکنے لگی۔

’’کم از کم میں کسی بھی صورت میں اسے بھا... بی بنانے کے حق میں نہیں ہوں۔‘‘

اس نے کچھ اس طرح کہا کہ وہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔

’’کم آن' تانی!... تم نے دل پر ہی لے لیا ہے نومی بے چارے کی اس حرکت کو۔ چھوٹی سی بھول سمجھ کر نظر انداز کر دو یار! ہو سکتا ہے ایسا فرسٹ ٹائم ہوا ہو۔‘‘

’’یہی تو المیہ ہے ہم سب بگاڑ کی پہلی سیڑھی کو نظر انداز کر دیتے ہیں جبکہ یہی آغاز تو خوفناک انجام بن جاتا ہے۔‘‘

وہ بیگ سے رومال نکال کر چہرے پر ملنے لگی پھر سر اٹھا کر کیفے ٹیریا کے پنکھے کو دیکھا جو ہمیشہ کی طرح یوں چل رہا تھا جیسے کوئی ہاتھ سے زبردستی چلا رہا ہو۔

’’مت دیکھو اس بے چارے پنکھے کو۔ تمہاری آنکھوں کی گرمی سے پگھل کر اتنا چلنا بھی بند کر دے گا' دم نکل جائے گا۔‘‘

وہ اس کی نظروں کے تعاقب میں اوپر دیکھ کر ہنسی۔

تانیہ ذرا سا مسکرائی اور گہری سانس بھر کر میز کی سطح پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

’’شیری' محبت اور ہوس میں بہت فرق ہوتا ہے' اور مجھے تو آج کا ہر نوجوان ہوس زدہ نظر آتا ہے۔‘‘

وہ پھر سنجیدگی بلکہ گہری یاسیت کا لبادہ اوڑھ کر بولی۔ شہرینہ نے اسے دیکھا' وہ سخت پژمردہ ہو رہی تھی۔

وہ اتنی ہی حساس لڑکی تھی' ہر بات کو حد سے زیادہ دل پر لے لیتی تھی' شاید اس کے ماحول اس کے کمپلیکسز نے اسے اتنا حساس بنا ڈالا تھا۔

’’اچھا چھوڑو' یہ بتاؤ نادیہ آپی کے پروپوزل کا کیا ہوا؟‘‘ وہ موضوع بدلنے کی غرض سے بولی۔

’’ہونا کیا ہے ایک نمبر کے ڈھیٹ ہیں۔ دہلیز پکڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ امی نے کہہ دیا کہ وہ اس صورت میں ہامی بھریں گی کہ شادی وہ کم از کم دو سال سے پہلے نہیں کریں گی۔ وہ لوگ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہ رہی ہیں ادھر ہم اقرار کریں ادھر وہ منگنی شنگنی کی رسم کر کے شادی کی تاریخ مانگ لیں۔‘‘

"اوئے ہوئے' جہاں محترم نے اتنا صبر کر ڈالا کہ ماں بہنوں نے لڑکیاں دیکھ دیکھ کر دو سال بتا ڈالے' یہاں اب چند ماہ صبر نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ محظوظ ہو کر رہ گئی تانیہ بھی بے ساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکی تھی۔

"نادیہ آپی کو دیکھ جو چکے ہیں ہے نا۔"

"ہوں تب ہی تو چوکھٹ پکڑ لی ہے۔" وہ مسکرائی۔

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی لائبریری سے باہر آ گئیں اور لان کے ایک نسبتاً سبز قطعے میں آ کر بیٹھ گئیں جہاں درخت کا سایا بھی تھا اور جرنل نکال کر مکمل کرنے لگیں۔

"شیری' سکندر بھائی بتا رہے تھے' ولید اندرون سندھ کے کسی گاؤں میں گئے ہیں؟"

"تانیہ نے کتاب کھول کر مطلوبہ چیپٹر پر بال پین رکھتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا' اس کے لبوں کی تراش میں معنی خیز تبسم تھا۔

"اپنی کسی کلاس فیلو' کسی وڈیرے کی دختر نیک اختر کی دعوت پر۔" آخری جملے پر اس کا تبسم مزید کشادہ ہو گیا۔

احتیاط سے پیپرز کو سمیٹ کر آل پن لگاتے ہوئے شہرینہ کا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ اس نے چہرہ موڑ کر بے ساختہ تانیہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی بات نے اس کے دل کے تمام تر احساسات کو یوں بیدار کر دیا تھا جیسے کسی نے ستار پر ہاتھ مار دیا ہو اور تمام تار بج اٹھے ہوں۔

"حیرت ہے تمہیں خبر نہیں؟"

اس کے یوں چونکنے اور پھر اس کی بھوری آنکھوں کی سطح پر حیرت اور کچھ الجھن بھرے تاثرات محسوس کر کے تانیہ کو حیرت ہوئی۔

تب اس نے گہری سانس بھر کر جلدی سے پلکوں کی باڑھ جھکالی' مگر غیر ارادی طور پر خاموش ہی رہی' شاید اس لیے کہ ابھی اپنی حیرت سمیٹ نہ پائی تھی۔

یا پھر

انکشاف کے اس جھٹکے سے ذہنی طور پر سنبھل نہ سکی تھی۔

خاموشی کا یہ وقفہ مختصر مگر بہت بوجھل تھا‘ اس کا یہ بوجھل پن صرف شہرینہ کا دل ہی محسوس کر رہا تھا جبکہ تانیہ دوبارہ کتاب میں منہ دیئے کہہ رہی تھی۔ ”ولید بھائی آئیں تو ذرا پوچھنا تو سہی انہیں‘ بڑے چھپے رستم نکلے۔“

”تم نے سکندر بھائی سے ہی مزید انویسٹی گیشن کروالی ہوتی۔“

وہ سنبھل کر پیپرز ایک بار پھر سمیٹنے لگی جو غیر اختیاری طور پر اس کی لانبی نازک انگلیوں کی گرفت سے پھسل کر بکھر گئے تھے۔

”اچھا تو جواباً مجھے دو عدد کرارے قسم کے تھپڑ کھانے کو ملتے۔“

وہ بال پین کا سرا دانتوں میں دبا کر ذرا سا سر اٹھا کر بولی۔ پھر ہنس پڑی۔

”معاملہ گڑبڑ ہوا تب بھی کم از کم سکندر بھائی کے ذریعے کچھ پتہ نہیں چلے گا مجھے‘ اس لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تم...“

”چینج دس ٹاپک... لاؤ یہ بک ادھر دو کل پروفیسر ہارون کا لیکچر مجھ سے مس ہو گیا تھا‘ تم دکھاؤ ذرا یہ اپنی فائل۔“ وہ یک دم گہری سنجیدگی کے ساتھ اسے ٹوک کر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اس کے لہجے میں کچھ تھا۔ تانیہ نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا‘ اس کے ہمہ وقت گلابی رہنے والے رخساروں میں خفیف سی سرخی کا عکس بھی جھلک گیا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ کا نچلا گوشت دانتوں میں دبائے ہوئے کتاب پر ہنوز جھکی ہوئی تھی۔

تانیہ کی الجھن بھری نگاہوں کی تپش اس نے محسوس ہی نہ کی یا پھر توجہ نہ دی۔

تانیہ خاموشی سے اپنے بیگ کی زپ کھول کر مطلوبہ فائل تلاش کرنے لگی۔

X...X...X

آج پھر ان کی گلی میں آ گئے

تیرگی سے روشنی میں آ گئے

ہم بھی کتنے سادہ دل ہیں دوستو!

ایک کافر کی ہنسی میں آ گئے

"واہ... واہ..."

اکبر شاہ نے لیٹے لیٹے اپنے چیلے کو داد سے نوازا یوں جیسے بادشاہ درباری مسخرے کی حرکتوں سے محظوظ ہو کر ایک تالی پیٹ دے اور مسخرہ مزید پھیل کر اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لا کر مزید داد وصولی کے لیے نت نئی حرکتیں کرنے لگے۔

ان کے جلوئوں کو ترستی ہے نظر

کس دیارِ اجنبی میں آ گئے

اس شعر پر اکبر شاہ کا خون گویا رگوں میں خمار بن کر دوڑنے لگا' اس کی آنکھوں میں نشہ سا اتر گیا۔

وہ سب جامعہ کے بغیر گھاس کے لان میں بے ہنگم اور قدرے غیر اخلاقی طرز سے نیم دراز ستا رہے تھے۔ اکبر شاہ ایک لڑکے کے زانو پر سر رکھے تھا' تنگ جینز اور ہاف سلیوس کی ٹی شرٹ میں وہ خود کو ہالی وڈ کا ہیرو ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا' بہر حال سمجھ ضرور رہا تھا'

بلکہ اس کے چار عدد خوشامدی دوستوں نے اس کا دماغ ہیرو اور پرنس جیسے خطابات دے کر خراب کر رکھا تھا۔

"آج پریڈ نہیں لینا کیا؟" ایک نے انگڑائی لے کر اٹھتے ہوئے کہا اور شرٹ سے تنکے جھاڑنے لگا۔

"اوئے زیادہ پڑھاکو نہ بنا کرو میرے سامنے' ایک ہاتھ دوں گا۔"

اکبر شاہ نے دائیں طرف کروٹ لے کر اسے گھورا۔

"ایسے رومینٹک موسم میں تیرا اس کبڑ پروفیسر کا خشک بے کار لیکچر سننے کا موڈ ہو رہا ہے' میرا بس چلے تو اسے گولی سے اڑا دوں۔"

اس کے لہجے سے زہر ٹپک رہا تھا' وہ گھاس کا تنکا یوں دانتوں میں چبانے لگا گویا تنکا نہ ہو پروفیسر زبیری ہوں۔

"اوئے ہوئے ہوئے' ادھر دیکھو آج تو شان ہی نرالی ہے۔"

ٹینا کا گروپ ہمیشہ کی طرح ٹھٹھول کرتا ہوا قریب سے گزرا تو ایک نے اکبر شاہ کو ٹہوکا مارا' مگر وہ بے دلی سے پڑا رہا اُس سے مس نہ ہوا۔ وہ دیکھ چکا تھا بلکہ اس کی نظریں تو گزرتی لڑکیوں کے جسموں سے چپک کر دور تک جا کر واپس آ جا رہی تھیں۔

"ارے ایسی ویسی تو بہت ہیں ہمارے ایک اشارے کی منتظر۔"

وہ تنکا تھوک کر جینز کی جیبیں ٹٹولنے لگا پھر سگریٹ کا پیکٹ نکالا کہ یک دم اس کی آنکھیں چمک اٹھیں' ان میں خمار کے شعلے دہک اٹھے' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس کے یار دوست بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ وہ سب ہی دیکھ چکے تھے وہ اپنی سیاہ ایمبرائیڈری والی مخصوص چادر میں تانیہ کی ہمراہی میں چلی آ رہی تھی۔ اس کا رخ اپنی گاڑی کی طرف ہی تھا۔

اس کے بھورے بالوں کی ایک لٹ چادر کے کنارے سے پھسل کر ہوا کی شرارت سے اس کے رخسار کو چھو کر ایک طرف ہو کر لٹک رہی تھی' پھر ایک جھونکے سے دوبارہ رخسار سے ٹکرانے لگتی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تانیہ کو دیکھ کر اکبر شاہ کے حلق تک میں کڑواہٹ کھل گئی تھی۔ وہ تانیہ کے بغیر کبھی نظر نہ آئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی تانیہ رضا اس کی چڑ بنتی جا رہی تھی۔

اے لو جی صنم ہم آ گئے آج پھر دل لے کے

اب اتنا بھی غصہ کرو نہیں جانی

یہ کھویا کھویا موسم' پون دیوانی

کہیں اڑا لے نہ یار اتجھے

وہ اٹھ کر ایک قریبی درخت پر بازو لپیٹ کر کھڑا ہو گیا' جلتی سگریٹ کا کونا لبوں میں دبا کر سطحی عاشقوں کی طرح اس کی راہ میں تھا' جسے شہرینہ خان نے اپنے دھیان سے نکل کر سخت احساس بے بسی اور اذیت کے ساتھ دیکھا تھا۔

X...X...X

اس کا اتنا مضبوط بیک گرائونڈ نہ ہوتا تو وہ کب کی پرنسپل سے شکایت کر کے اس کا دماغ ٹھکانے لگا چکی ہوتی، مگر وہ اچھی طرح جانتی تھی اس کے اثر و رسوخ کے سامنے پرنسپل یقیناً کوئی ٹھوس اور اس کی پسند کا قدم نہیں اٹھائیں گے۔

"تانیہ دیکھنا کسی دن یہ میرے ہاتھوں ہی قتل ہوگا۔" وہ دبے دبے غصیلے لہجے میں جیسے پھنکاری۔

"چلو پلٹ جاتے ہیں اس کمینے کا پورا گروپ ہی یہاں موجود ہے۔" تانیہ ہراساں ہو کر بولی۔ اکبر شاہ کو دیکھ کر اس کا دل ایک نادیدہ خوف کے پاتال میں اترنے لگتا تھا۔

"ہاں تاکہ وہ مجھے کمزور لڑکی سمجھ لے۔" اسے تانیہ کی عقل پر ماتم کرنے کا دل چاہا۔

"تمہارے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے، لڑکیاں تو یوں بھی کمزور ہوتی ہیں۔" اس نے گہری سانس بھر کر فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"کہتے ہیں نا چڑیا اڑتے ہوئے بھی بزدل ہوتی ہے اور عقاب سکرات کے عالم میں بھی گردن فراز رہتے ہیں۔" شہرینہ نے اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیا، اس کا دماغ تو اکبر شاہ کی ہوس

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

زدہ نگاہوں اور مسکراہٹوں سے کھول رہا تھا، اس کی گنگناہٹ اس کی سماعت سے ٹکرا کر اس کی رگوں میں دوڑتے لہو میں آگ بن کر دوڑ گئی۔

ماتھے پہ تو بل ہیں لبوں پہ مسکان

چھب ہے غضب کی میں تیرے قربان

لا محالہ قریب سے ہو کر گزرنا پڑا تھا، وہ بہکے بہکے انداز میں گویا اسے سالم نگل رہا تھا۔

"مس خان! کیا ہم اچھے دوست نہیں بن سکتے۔"

وہ بڑی بے خوفی سے اس کی راہ میں آ گیا۔ وہ رک تو گئی مگر جواباً سلگتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر غصہ تو گویا اکبر شاہ کے جذبوں کو ہوا ہی دے گیا۔ اس کی آنکھوں کے سلگتے بھورے کانچ چوم لینے کو دل چاہا اور وہ یہ جسارت بڑی بے خوفی سے کر جاتا اگر وہ شہرینہ خان کی بجائے اس کے باپ کے مزارعے کی کوئی ڈری سہمی بیٹی ہوتی۔

"دوستی کا مطلب سمجھتے ہو تم؟" اس نے طنز بھری ترچھی نظریں اس کے سراپے پر ڈالیں۔

"تم سے دوستی کر کے مطلب بھی سمجھ آجائے گا۔" وہ ڈھٹائی سے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی' وہاں ایک شوق کا عالم تھا' نہ شرم' نہ جھجک بلکہ بے خوفی اور دیدہ دلیری سے وہ ڈٹ کر کھڑا تھا' جو ایسے عیاش امیر زادوں کی ذات کا خاصا تھے۔

"یوں بھی دوستیاں اپنے سٹینڈر کی ہونی چاہئیں۔"

اس نے تانیہ پر ایک طنز بھری نگاہ چھینکی اور سگریٹ زمین پر پھینک کر اس پر اپنا جوگر میں مقید پیر رکھ کر یوں مسلا جیسے وہ سگریٹ نہ ہو تانیہ رضا ہو۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے' مگر مسٹر اکبر شاہ' میرا معیار دولت نہیں اچھا کردار ہے' میں اسی سے دوستی کر سکتی ہوں جس کا کردار صاف پاکیزہ ہو' جو باوقار ہو' نہ کہ اوچھا اور اخلاق باختہ۔" اس نے ہلکے سے ہنس کر گویا اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔

"اپنی دولت' اور اپنے حسب نسب پر فخر وہی کرتے ہیں جن کے پاس فخر کرنے کو کچھ اور نہیں ہوتا۔" وہ اس کے سراپے پر ایک تیز نگاہ ڈال کر انجان بنی تانیہ کا ہاتھ نہایت نرمی مگر مضبوطی سے پکڑ کر قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔

"مائی فٹ۔" وہ ہونٹ بھینچ کر' آنکھیں سکیڑ کر اس کی پشت کو گھورنے لگا' پھر غصے سے درخت کی لٹکتی ایک بے برگ شاخ کو کھینچ کر اس کے مزید دو چار ٹکڑے کر کے زمین پر پٹخ دیا۔

"حوصلہ رکھو پرنس! اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

ایک چیلے نے قریب آکر اس کے کندھے پر تھپکی دی تھی۔

"اتنی جلدی حوصلہ ہار دو گے۔"

اکبر شاہ نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک دیا اور گویا غرایا۔

"اکبر شاہ نے کبھی ہار کا لفظ نہیں سنا' اس کے حوصلے پہاڑ کی طرح جوان اور بلند رہتے ہیں' باباسائیں نے مجھے لفظ شکست سے ہمیشہ نفرت دلائی ہے۔ہاں مگر میں ان کی طرح معاملہ فہم نہیں ہوں کچھ جذباتی ہوں۔شاید اس لیے کہ آج تک کسی لڑکی نے میری انسلٹ نہیں کی جتنی شہرینہ خان نے کی ہے۔"

اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے پھر سلگنے لگیں۔

توہین کا احساس روح میں کچوکے لگانے لگا۔

''اسے بڑا گھمنڈ ہے شاید اپنے حسن پر ایسی حسین لڑکیاں تو میرے پیروں کی جوتی صاف کرتی ہیں، مگر...''

''مگر پرنس! یہ صرف حسین نہیں بااثر بھی ہے۔''

اس کا پورا گروپ اس کے گرد جمع ہو گیا، ایک نے بااثر کچھ اس انداز سے کھینچ کر کہا کہ وہ ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

''بس، یہیں تو میں بے بس ہو جاتا ہوں۔ ورنہ کیا نہیں کر سکتا، بکائو مال ہوتی تو کب کا خرید کر دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتا۔''

''بکائو مال ہوتی تو، تمہیں دو کوڑی کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔'' اس کے دست راست نے ہنس کر کہا پھر اس کے کندھے کو تھپکنے لگا۔

''چلو چھوڑو غصہ تھوک دو، ایک شعر عرض ہے کہ:

ہر گز قدم نہ روک کہ یہ دور کی منزل

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

نکلے گی کسی روز اسی گرد سفر سے

وہ سب اسے کھینچ کر واپس اسی خطے پر لے آئے۔

''بڑا فخر ہے اسے اپنی پارسائی پر اور اس دو ٹکے کی لڑکی کے بارے میں تو وہ ایک لفظ نہیں سن سکتی۔ اونہہ اخلاق، کردار، کتنا بلند کردار ہو سکتا ہے زیادہ سے زیادہ تانیہ شہزادی کا۔''

وہ گھاس نوچتے ہوئے بلبلا رہا تھا اب تک۔

''ارے کوئی کردار وردار نہیں ہے، بڑی دیکھی ہیں ہم نے ایسی پارسا بیبیاں، یہ تو ہم نے ہی لفٹ نہیں دی اسے ورنہ ابھی کھل کر آ جائے ہمارے سامنے اس کا سارا کردار۔ اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے نہ آئے اس کی اصلیت نہیں کھلتی۔''

وہ سب اس کی تسلی و تشفی کا معاملہ کر کے اپنی اپنی دوستی کا حق ادا کر رہے تھے یا پھر اپنی ذہنیت کی پستی کا عادتاً ثبوت دے رہے تھے۔

اکبر شاہ ہنکارا بھر کر گھاس پر دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرتا ہوا کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

X...X...X

وہ ہلکے گرے کلف لگے شلوار قمیص اور گہرے کلر کی واسکٹ میں تھا اور بڑی عجلت میں اپنی چیزیں بیگ میں بھر رہا تھا۔

چیزیں ہی کیا تھیں' دو تین کپڑوں کے جوڑے' چند بنیان' موزوں کی تین چار جوڑیاں' سگریٹ' لائٹر' ایک عدد کیمرہ' ڈائری' پین اور آمنہ علی کا گفٹ کیا ہوا کارڈ اور بوکے۔

"باباسائیں کا بھی خیال تھا کچھ اور ٹھہر جاتے۔" وہ بیگ کی زپ بند کر کے سیدھا ہو کر پلٹا تو وہ میز کی سطح پر انگلیاں پھیرتی اس سے مخاطب ہوئی۔ وہ بیگ بیڈ پر رکھ کر اس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

"لیڈی... وڈیری... اپنے آنے کا چانس رکھ کر جا رہا ہوں۔"

"کیا مطلب..." اس کی بات پر وہ اسے گھور کر دیکھنے لگی بلکہ باقاعدہ آنکھیں دکھائیں۔

"تم کوئی بن بلائے بلکہ بلائے جان مہمان تو نہیں ہو کہ جس کا زیادہ رہ جانا باعث زحمت ہو۔" وہ قریبی کرسی پر بیٹھ گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ ہلکے پھلکے ڈھیلے ڈھالے عبا نما ڈریس میں تھی۔ دوپٹے سے بے نیاز۔ کٹے ہوئے بال اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ پیروں میں سادی چپلیں تھیں جو وہ عموماً گھر میں ہی دن رات پہنے رہتی تھی۔

"ابتداء میں زحمت کوئی نہیں ہوتا' زحمت تو اسے وقت بنا دیتا ہے۔" وہ اسے چڑانے والے انداز میں بولا۔ "پھر کہیں یہ نوبت نہ آجائے کہ باورچی خانے سے ایک ایک کر کے پتیلے پھینکے جائیں اور خاتون خانہ پوچھیں ملازم سے کیا ہوا؟ وہ کہے جی بیگم صاحبہ قورمے کا پتیلا گر گیا ہے پھر دوبارہ کہے اب جی کوفتوں کا' ایک ایک کر کے سارے پتیلے گر جائیں آخر میں خاتون خانہ مہمان کی طرف رخ کر کے کہیں۔ "ہائے اللہ' اب تو آپ کے کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا ہے' یعنی آپ یا بھوکے رہیں اور وائز یہاں سے چلتے پھرتے نظر آئیں۔"

"اف... اوہ... ولید تم بھی۔" وہ ہنسنے لگی پھر دونوں ہاتھ لپیٹ کر اسے مصنوعی غصے سے دیکھنے لگی۔

"اول تو ہماری حویلی میں اتنے پھوہڑ ملازم نہیں ہیں۔ دوئم آپ جناب مہمان صرف "حویلی" کے نہیں ہمارے دل کے بھی ہیں۔"

وہ بغیر جھجکے اپنے فطری بے باک اور پر اعتماد لہجے میں اس کی آنکھوں میں جھانکتی نظریں ڈال کر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

یہ سچویشن ولید حسن کے لیے یقیناً سٹپٹا دینے والی تھی۔

بہر حال وہ تاثر تو یہی دے سکا تھا' سر پر ہاتھ پھیرتا کچھ خجالت سے مسکرا کر رہ گیا' پھر سر ہلاتے ہوئے بیگ کو دائیں ہاتھ میں لے کر کندھے پر ڈالا۔

"اوکے! زندگی رہی تو پھر ملیں گے' کہتے ہیں نا یار زندہ صحبت باقی۔"

آمنہ مردان علی نے یک دم الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"اپنی خوبصورت بات کا تاثر اس کے چہرے پر ڈھونڈنا چاہا۔ پھر اپنے جملے کے جواب میں اس کا پہلو تہی کر جانا اسے کچھ بدمزا کر گیا۔ وہ تو اس کی طرف سے کسی جوابی شگفتگی کے مظاہرے کی توقع کر رہی تھی۔ وہ کچھ بجھ سی گئی۔

"میں بھی بس اس ویک ہی یہاں ہوں' اب ہماری ملاقات شہر میں ہی ہو گی۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ اس کے ہمراہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولی پھر مسکرا کر اسے الوداعی نظروں سے دیکھنے لگی۔

ولید حسن کی گاڑی مردان علی شاہ کی حویلی سے نکل کر شہر کی طرف جانے والے راستے کی بجائے ایک کچے راستے کی طرف دوڑنے لگی۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا آس پاس کے علاقے پر بھی سرسری نظر ڈال لیتا تھا مگر اس کا ذہن مختلف خیالوں کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی پیشانی پر کسی سوچ کی لکیریں نمایاں تھیں اور مضبوط ہاتھ سٹیئرنگ پر جما ہوا تھا۔ مگر انگلیاں اضطرابی انداز میں وہیل کے کنارے وقفے وقفے سے تھرکنے لگتیں۔

کوئی پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وہ اسی مانوس علاقے میں تھا جہاں وہ آمنہ علی کے ساتھ آیا تھا مگر اس کی ناگواری اور بے زاری کو محسوس کر کے گاڑی واپس موڑ لی تھی۔

گو کہ علاقہ وہی تھا مگر اب منظر میں کچھ تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اس بڑے سے کچرے کے ڈھیر پر بے فکری سے کھیلتے بچے موجود نہیں تھے اور سامنے سفید گیٹ بند تھا' جس کی دہلیز

سے اس نے ایک باریش بوڑھے کو اترتے دیکھا تھا اور شاید اس وقت اس کی یہاں موجودگی کی ٹھوس وجہ بھی وہی باریش بوڑھا تھا۔

اس نے گاڑی ایک کنارے روکی اور نیچے اتر کر اطراف کا جائزہ لیا۔

یہ حقیقتاً ایک پسماندہ سا علاقہ تھا' جہاں کے لوگ شاید بنیادی سہولیات سے بھی ایک عرصے سے محروم تھے۔ کئی ایک گھروں کے دروازے تو اتنے خستہ تھے جنہیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا کہ ابھی ہوا کا تیز جھونکا ہی انہیں پردے کی طرح لہرا کر اندر باہر دھکیل دے گا۔ کئی گھروں پر ٹین کی چھتیں تھیں اور کچھ چھتوں پر ٹین ہی پر سیمنٹ اور ریت کا گارا ڈال دیا گیا تھا' اس کے باوجود دھوپ کی تپش کو کوئی مکمل طور پر نہیں روک سکا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر حویلی اور ان گھروں کا موازنہ کرنے لگا تو اسے بے اختیار حبیب جالب کے شعر کا وہ مصرعہ یاد آگیا:

دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے

اور حبیب جالب کا ہی وہ شعر جو سکندر رضا عموماً حد سے زیادہ ذہنی کشیدگی کی حالت میں گنگنا لیا کرتا تھا۔

وہ جس کی روشنی کچے گھروں کو جگمگائے گی

نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ دن اپنے بدلتے ہیں

اس نے ایک گہری' بوجھل اور قدرے پرملال سانس سینے کی تہ سے گویا کھینچ کر فضا کے سپرد کی۔ اور اس سفید گیٹ کی طرف بڑھ گیا جو نسبتاً بہتر حالت میں تھا۔ مکین باذوق معلوم ہوتے تھے۔ گھر کے اطراف کی دیوار کے کنارے چھوٹے چھوٹے پودے لگا کر انہیں قدرے بہتر اور خوبصورت بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ صاف ستھری دہلیز پر کھڑے ہو کر اس نے موٹا سا کنڈا بجایا۔

X...X...X

رات کے کھانے کے بعد وہ تانیہ کے کمرے میں آیا تھا' یہ کمرہ نادیہ آپی اور اس کا مشترکہ کمرہ تھا مگر اس وقت نادیہ آپی معمول کے مطابق باورچی خانے میں تھیں اور کھانے کے

جھوٹے برتن دھو رہی تھیں جبکہ تانیہ بیڈ کی چادر بدل رہی تھی۔اس نے کمرے میں داخل ہوتے نومی کو دیکھا۔

جس کے چہرے پر الجھن بکھری ہوئی تھی' اس نے بس ایک نظر دیکھا پھر دوبارہ سر جھکا کر چادر درست کرنے لگی۔تکیہ کا غلاف بدلنے کی غرض سے اٹھایا تو نومی بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا اور اس تکیے پر ہاتھ رکھ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تانی' خفا ہو مجھ سے؟"

"کیوں' کس وجہ سے؟" وہ اس کے ہاتھ کے نیچے سے تکیہ کھینچ کر اس کا میلا غلاف کھینچ کر اتارتے ہوئے لاپرواہی سے بولی۔

"یوں بھی تمہیں کب اتنی پرواہ ہے' ہم گھر والوں کی... یار دوستوں کی محفل کے بعد جو وقت بچتا ہے وہ کبوتروں کی نذر ہو جاتا ہے' اب پتا نہیں کبوتروں کی ہی نذر ہوتا ہے یا..." وہ طنز سے ہنس پڑی۔

نومی کے چہرے پر خفت کا رنگ آ کر گزر گیا' وہ کھڑا ہو گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تم نے وہ بات نادیہ آپی کو یا امی کو بتا تو نہیں دی۔" اس کے آنے کا اصل مقصد یہ تھا' وہ تکیہ دوبارہ بیڈ پر اس کی جگہ رکھ کر اس پر ایک دو ہاتھ مار کر ایک گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"ایک بات پوچھوں نومی! کیا شائستہ تمہیں واقعی اچھی لگتی ہے' تم اس میں انٹرسٹڈ ہو۔"

"وہاٹ؟" وہ یوں اچھلا جیسے پیروں کے نیچے بچھو آ گیا ہو' اس کے چہرے کے زاویوں میں تناؤ آ گیا۔

"اب میرا ٹیسٹ اتنا گھٹیا بھی نہیں ہے۔" وہ عجیب سی کڑواہٹ کے ساتھ بولا۔اس کا دل چاہا وہ شائستہ کے نام پر اس سے زیادہ برا منہ بنائے۔جیسے تانیہ نے اس کے منہ میں کونین ڈال دی ہو۔

"تو پھر... یہ سب..." وہ رنج سے اسے دیکھنے لگی۔

"دیکھو تانی! تم نا سمجھ نہیں ہو' یونیورسٹی جاتی ہو یقیناً وہاں بھی ایسی ہزاروں لڑکیاں ہوں گی جو بیک وقت کئی لڑکوں سے رومانس رچاتی ہیں' کچھ نہیں تو ان کی ادائیں ہر کسی کے لیے ہوتی ہیں' یعنی دعوت عام۔کم از کم میں اس دعوت کے چند نوالے کھا تو سکتا ہوں' اس دعوت عام کا خود نوالہ نہیں بن سکتا۔"

"یعنی، بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہو۔" وہ تڑخ سے بولی تو وہ ڈھٹائی سے ہنس پڑا۔

"آف کورس سسٹر، جب گنگا بہہ ہی رہی ہے تو..." وہ دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور دائیں بائیں ہاتھ پھیلا کر پیچھے کی طرف تھوڑا سا جھکتے ہوئے قدرے ڈھیلے انداز میں تانیہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم بتاؤ، کیا ایسی لڑکیوں سے شادی کا سوچا جا سکتا ہے۔"

تانیہ کا دل چاہا اس کا منہ تھپڑوں سے سرخ کر دے۔

بالکل بھی تو وہ اپنے رویوں اور حرکتوں پر نادم دکھائی نہیں دے رہا تھا، بلکہ ندامت کا ہلکا سا احساس بھی اسے چھو کر نہیں گزرا تھا۔

"تو ایسے مردوں سے بھی تو شادی کا سوچا نہیں جا سکتا۔" اس نے جھک کر میلی چادر اور غلاف اٹھالیا، پھر اس پر فہمائشی نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

"اگر نادیہ آپی اور امی کو خبر ہو تو انہیں کس قدر دکھ ہو گا، یہ تم نے سوچا ہے، کتنا فرق ہے تم میں اور سکندر بھائی میں۔" اس کا لہجہ ملامت کرنے والا تھا اور متاسف بھی۔

جبکہ وہ جھٹکے سے ناگواری سے کھڑا ہو گیا اور اپنی ٹرائوزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر بولا۔

"مجھے سکندر بھائی سے کمپیئر مت کیا کرو۔ وہ... وہ کیا ہیں؟ ایک قلم کار دو چار سچ کے الفاظ لکھ کر وہ خود کو سکندر اعظم خیال کرتے ہیں؟ چند وڈیروں کی پگڑی اچھال کر، اثر و رسوخ والوں کی نقابیں کھینچ کر وہ بہت با کردار، بہت بلند، اعلیٰ رتبہ ہو گئے ہیں کہ پورا گھر ہی ان کی عزت اور تکریم میں آنکھیں بچھائے پھرتا ہے، دو ٹکے کی نوکری پر وہ پورے گھر کو اپنا گرویدہ بنائے بیٹھے ہیں۔" وہ یک دم پرانے خستہ ڈھول کی طرح پھٹ پڑا تھا، کب کا دبا ہوا لاوا بہہ نکلا۔

تانیہ گنگ ہو کر رہ گئی۔

وہ جھلاتا بلبلاتا پیر پٹخ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ اسے زیادہ ہی پتنگے لگ گئے تھے۔ تانیہ کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے سگے بھائی کے لیے اس قدر بغض رکھے ہوئے ہے۔ اتنا زہر بھرا ہوا ہو گا اس کے اندر۔

یا پھر...

اپنی بے روزگاری کے ہاتھوں وہ کسی احساس جرم کا شکار رہتے رہتے آتش فشاں بن چکا تھا۔

مگر امی یا کسی نے آج تک اسے اس کی بے روزگاری کا طعنہ نہیں دیا تھا' حتیٰ کہ اس کی آوارہ گردی پر بھی امی اسے نہیں ٹوکتی تھیں۔ نہ سکندر بھائی نے اس پر معاشی بوجھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

یہ پورا گھر تو سکندر بھائی کی تنخواہ سے خوش باش زندگی گزار رہا تھا' اتنے قانع تھے کہ کبھی ناآسودگی کا رونا نہیں رویا تھا بلکہ امی تو خود اسے مزید تعلیم جاری رکھنے پر زور دیتی رہتی تھیں۔

اور سکندر بھائی نے اس کے لیے کتنی نوکریاں تلاش کی تھیں مگر وہ عجب اڑیل' ضدی اور سمجھ نہ آنے والا لڑکا تھا۔

بہرحال تانیہ کے لیے یہ صدمہ خاصا گہرا تھا' وہ وہیں میلی چادر کی گٹھڑی گود میں رکھے بیٹھی رہ گئی تھی۔

X...X...X

اس نے سفید گیٹ کا موٹا سا کنڈا دوسری بار بجایا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا' دروازہ کھولنے والا ایک بیس سالہ لڑکا تھا جو میلے کپڑوں اور بڑھی شیو کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔

''السلام علیکم! مجھے ولید حسن کہتے ہیں۔'' اس نے لڑکے کی استفہامیہ نگاہوں کے جواب میں کہتے ہوئے بے حد اپنائیت کے ساتھ مصافحے کے لیے ہاتھ آگے کر دیا۔'' لڑکا لحظہ بھر کو سٹپٹا گیا۔

مہنگے اور پریس شدہ شلوار سوٹ میں پیشانی پر گلاسز ٹکائے' ایک ہاتھ میں کار کی چابی' کپڑوں سے پھوٹتی مہنگے پرفیوم کی مہک' لیے ولید حسن اس کے سامنے امیر زادے کے روپ میں تھا اور اپنی غربت کا احساس کر کے وہ کچھ بوکھلا اٹھا۔

''کون ہے پت۔'' پیچھے سے کوئی دوسرا آدمی نمودار ہوا۔

یہ وہی باریش بوڑھا تھا' سفید شلوار قمیص اور میرون اجرک کندھے پر ڈالے۔

''دادا کوئی اجنبی آھی۔'' وہ ایک طرف ہو گیا اور اس بوڑھے' جسے اس نے دادا کہہ کر مخاطب کیا تھا' کے لیے جگہ بنائی۔

"السلام علیکم! آپ ماسٹر دین محمد ہیں؟" ولید نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے سر ہلاتے ہوئے آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجا سا بنا کر اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

"ہاں سائیں! پر آپ' معاف کرنا پت میں نے پہچانا نہیں۔" وہ کچھ خفیف سے ہو کر معذرت خواہانہ انداز میں بولے۔

"اندر آجائو' جب مجھے تم جانتے ہو پھر اجنبیت کیسی' آئو بابا آئو۔" وہ یک دم ہی روایتی سندھی مہمان نواز روایت کی پاسداری کرنے لگے۔

ولید بے تکلفانہ اندر آگیا۔

وہ ایک صاف ستھرا صحن تھا جہاں دو چار پائیاں رکھی تھیں' جن پر پرانی مگر صاف ستھری رلیاں بچھی ہوئی تھیں' وہ ایک پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

غربت اور عسرت کے باوجود گھر میں نفاست اور سلیقہ دکھائی دے رہا تھا۔

"آپ غالباً سکول ماسٹر رہ چکے ہیں۔" وہ چند لمحے توقف کے بعد خود ہی گویا ہوا۔

"ہاں' مگر سائیں آپ مجھ کیسے جانتے ہیں' جبکہ آپ خود اس گوٹھ کے تو نہیں لگتے۔" وہ اب بھی الجھن بھری نظروں سے ولید حسن کو دیکھے جا رہے تھے' جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں' مگر کوئی نقش مانوس محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"ہاں تو پت آپ نے بتایا نہیں... مجھے کیسے جانتے ہو۔" انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

"آپ ماشاءاللہ استاد ہیں' کتنے بچے آپ کے زیر سایہ علم کی منازل طے کر چکے ہیں' آپ کا گھر بچہ بچہ جانتا ہے' سو میں بھی پوچھتے پوچھتے یہاں تک آپہنچا ہوں۔"

وہ کچھ مبہم سے انداز میں بات کو ٹال گیا۔

"اب آپ غالباً ریٹائرڈ ہیں۔"

"ہاں تقریباً پانچ سال سے' اب آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ ہاں میرا ایک لڑکا یوسف سکول میں ماسٹر لگا ہوا ہے' پر کہاں اب علم کی وہ اہمیت ہے۔" ماسٹر دین محمد گہری سانس بھر کر فرش کو گھورنے لگے۔

”ایک زمانہ تھا لوگ جاہل تھے مگر ان کے دل میں علم کی قدر تھی۔ کتابوں کو وہ عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، خیر جاہل تو اب بھی ہیں لوگ۔“

وہ ہنس دیئے مگر ان کی ہنسی میں ایک اداسی گھلی ہوئی تھی، یاسیت کا رنگ جھلک رہا تھا۔

”یہی تو المیہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے علم کی قدر و منزلت گھٹانے کے لیے انہیں جاہل رکھا جا رہا ہے۔ لوگ اس لیے جاہل ہیں کہ انہیں علم حاصل کرنے کے مواقع فراہم نہیں کیے جا رہے ہیں۔ ورنہ میں نے آج بھی بچوں کے دلوں میں علم کی ایسی طلب دیکھی ہے جیسی پیاسے کو پانی کی۔“

ماسٹر دین محمد کے چہرے کی جھریوں میں ایک چمک سی لہرانے لگی، انہوں نے غور سے اور قدرے دلچسپی سے ولید حسن کو دیکھا، انہیں اب وہ ظاہری طور پر ہی نہیں باطنی طور پر بھی ایک خوبصورت اور سلجھا ہوا شخص دکھائی دینے لگا تھا مگر پھر یک دم دلچسپی مفقود ہو کر اس کی جگہ الجھن نے لے لی، وہ کتنی دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد پر خیال انداز میں بولے۔

”ایسا لگتا ہے جیسے میں نے تم کو کہیں دیکھا ہے، مگر کہاں؟ کچھ یاد نہیں پڑ رہا، اب تو حافظہ بھی ساتھ چھوڑ رہا ہے۔“

ان کی گہری جانچتی نظروں پر وہ خفیف سے اضطراب کا شکار ہوا مگر دوسرے پل پر اعتمادی کے ساتھ مسکرا دیا۔

”ہو سکتا ہے آپ نے مجھے وڈیرہ مردان علی کی گاڑی میں اس کی بیٹی کے ہمراہ دیکھا ہو، میں وڈیرہ مردان علی شاہ کا مہمان ہوں یہاں پر۔“ اس کا مقصد محض وضاحت کرنا اور ماسٹر دین محمد کی الجھن کو سلجھانا تھا مگر اس نے دیکھا اس کی بات پر وہ بجائے مطمئن ہونے کے یک دم سٹپٹا کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے تھے۔

”آ... آپ... سائیں، رئیس مردان شاہ کے مہمان ہو۔“

ان کا چہرہ سفید پڑ گیا، وہ تیزی سے ہاتھ جوڑتے اس کی طرف بڑھے۔

”معاف کرنا سائیں! مجھے خبر ہی نہ ہوئی کہ آپ بڑے لوگ ہو، ہم کمی کمین کے گھر آ کر بڑی عزت بخشی سائیں۔“

”ک... کیا کر رہے ہیں ماسٹر صاحب!“ وہ انہیں اپنی تعظیم میں یوں جھکتے دیکھ کر بوکھلا کر چارپائی سے کھڑا ہو کر دور ہٹ گیا، مگر وہاں تو خوف، حواس باختگی کا عالم تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ماسٹر دین محمد کو کہ وہ نئے سرے سے ولید حسن کا اس کے شایان شان کس طرح

استقبال کریں' اسے کس طرح عزت سے نوازیں' ان کے بوڑھے بدن پر ہلکا سا ارتعاش طاری تھا۔

"ماسٹر دین محمد! یہ کیا کر رہے ہیں آپ پلیز۔" اس نے رنج سے ان کے دونوں جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیئے' اس کے چہرے پر کرب پھیل گیا' اس کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ وڈیرہ مردان شاہ کا حوالہ دین محمد پر یوں بم کی طرح گر کر ان کے اعصاب کو یوں منتشر کر دے گا۔

اس تعظیم' عزت کے پیچھے کوئی سربستہ محبت کا چشمہ نہیں بہہ رہا تھا بلکہ ایک طرح سے "وڈیرہ شاہی" کا خوف تھا جو ان غریب لوگوں کے دلوں پر بھوت کی طرح مسلط تھا' اس کے اندر سے رنج اور تاسف کی ایک لہر ابھر کر چہرے کا احاطہ کر گئی' اس نے بے حد نرمی اور محبت سے ماسٹر دین محمد کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر انہیں چارپائی پر بٹھا دیا۔

"میں نہ سائیں ہوں نہ سرکار' نہ رئیس زادہ' میں بھی عام ہزاروں انسانوں کی طرح ایک انسان ہوں۔ آپ جیسا' اس گوٹھ کے لوگوں جیسا' آپ تو استاد کے مرتبے پر فائز ہیں۔ اصولاً تو مجھے آپ کے قدموں میں بیٹھ جانا چاہیے کہ آپ تو وہ سورج ہیں جو دنوں کو روشن کر

کے اجالے ہی اجالے بکھیر دیتا ہے' ذرے کو آفتاب بنا دینے والے ہیں' ننھے سے پودے کو تناور درخت بنانے والے ہیں اور یہ رتبہ یہ مرتبہ ہم جیسے حقیر انسانوں نے نہیں دیا' یہ درجہ تو خدا نے خود دیا ہے آپ کو۔"

ماسٹر دین محمد اطراف کے دیواروں کی طرح گنگ' تحیر اور... بے یقینی سے ولید حسن کو ٹکر ٹکر دیکھے جا رہے تھے۔ پھر یک دم ان کی آنکھیں جھلملا گئیں' ان میں پانی اتر آیا۔

شاید یہ پانی زندگی میں پہلی بار اس قدر عزت افزائی کی خوشی میں امڈا تھا۔

یا...

اپنی کسی احساس محرومی پر...

پھر وہ اپنے کندھے پر پڑی اجرک کے کنارے کو اٹھا کر اس سے آنکھیں رگڑنے لگے۔

"یہاں تو سب رتبے اور درجے پیسے سے حاصل ہوتے ہیں۔" وہ گہری سانس بھر کر کھوئے کھوئے لہجے میں بولے' پھر جیسے کسی خیال کے تحت چونک کر اپنی جگہ سے اٹھے۔

"میری بھی مت ماری گئی ہے، خیال ہی نہیں آیا کہ چائے پانی کا پوچھوں، تم بیٹھو پت میں ابھی اندر..."

"نہیں ماسٹر صاحب، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے جلدی سے ماسٹر دین محمد کو اس تکلفات سے باز رکھنا چاہا پھر رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"ابھی میرے پاس وقت نہیں ہے، میں پھر آئوں گا تو نہ صرف چائے بلکہ کھانا کھا کر جائوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ چارپائی سے کھڑا ہو گیا۔

"پرپت۔"

"ماسٹر صاحب! یار زندہ صحبت باقی، یہ تو سنا ہو گا آپ نے۔" اس کی آنکھوں میں اپنائیت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ سے مل کر ایسا لگا جیسے برسوں کی کوئی پیاسی زمین سیراب ہو گئی ہو، ابھی تو بہت سی باتیں کرنی ہیں آپ سے، آپ کی اور اس گوٹھ کی، کیا میں دوبارہ آسکتا ہوں آپ کے دولت کدے پر۔"

اس کا لہجہ التجائیہ تھا ماسٹر دین محمد کا سادہ بے ریا اور پر خلوص دل پہلو میں تڑپ گیا۔

"کیسی بات کرتے ہو پت، میرا غریب خانہ تمہارے لیے کھلا ہے اور ہمیشہ کھلا رہے گا پر تم نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہیں کہ..."

وہ اس کے چہرے کو ایک بار پھر الجھن بھری نظروں سے دیکھ کر بولے۔

"ایسا لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں پہلے بھی دیکھا ہے، کہاں کب، کچھ یاد نہیں پڑتا، مگر..."

وہ مسکرانے لگا اور دین محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کے ہمراہ دروازے تک جاتے ہوئے بولا۔

"ہو جاتا ہے کبھی کبھی یہ مغالطہ، کسی شخص کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ اس سے پہلے بھی ملے ہیں، اس کا چہرہ اس کی باتیں نامانوس اور اجنبی نہیں لگتیں۔ ذہن الجھ جاتا ہے، مگر اس گتھی کو سلجھا نہیں پاتا، یہ دراصل ایک نفسیاتی مسئلہ ہوتا ہے، اس پر زیادہ زور مت دیں، آپ مجھ سے بار بار ملیں گے تو یہ گتھی خود ہی سلجھ جائے گی۔"

وہ یوں تفہیمی انداز میں ان کے کندھے کو تھپک کر بولا گویا کسی کم سن، نادان بچے کو سمجھا رہا ہو، اسے کسی کام سے روکنا چاہ رہا ہو پھر سن گلاسز آنکھوں پر جمائے ان سے مصافحہ کیا اور چھوٹے قد کے دروازے سے جھک کر باہر نکل گیا۔

مگر ماسٹر دین محمد کو ایک نئی الجھن اور سوچوں کی گتھیوں کو سلجھانے کی مصروفیت دے کر۔

X...X...X

محبت کیوں ہو جاندی اے

کیوں دل نوں روگ لاندی اے

کیوں ساری رات تڑپاندی اے

کھلیاں اکھاں خواب دکھاوندی اے

کیوں محبت ہو جاندی اے

اھو، کیوں محبت ہو جاندی اے

"ادھر آئو تمہیں بتائوں میں کہ محبت کیوں ہو جاندی اے۔"

پیچھے سے مما نے کڑے تیوروں کے ساتھ اس کا کان پکڑا اور مروڑنے لگیں۔

"آں، آ... بیگم صاحبہ، پتا چل گیا، پتا چل گیا۔" صغریٰ کی سسکی نما چیخ برآمد ہوئی۔ اس کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر سنک میں جا گری۔

"کبھی محترمہ شاعری فرما رہی ہیں، تو کبھی گلوکاری کے شوق پورے ہو رہے ہیں، یہ جگہ مل گئی ہے سارے شوق تماشے پورے کرنے کے لیے۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر سنک کا نل بند کیا اور اسے خشمگیں نظروں سے گھورنے لگیں۔ وہ کان دبائے سر جھکائے مجرمانہ انداز میں قدرے کھسیاہٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔

بھابی ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھی تھیں اور کھیر کا پیالہ ہاتھ میں تھا جو طوبیٰ کو کھلا رہی تھیں۔ مما کو اٹھ کر کچن میں جاتا دیکھ کر ہی سمجھ گئیں کہ صغریٰ بی بی کی خیر نہیں مگر وہ بھی ڈھیٹ تھی، مما جو نہی کیبنٹ سے روح افزا کی بوتل نکالنے کو پلٹیں وہ بھابی کی طرف دیکھ کر منہ پھاڑ کر بتیسی کی نمائش کرنے لگی۔

"مت سدھر نا تم، مت سدھرنا۔" مما کی ایک دم نظر پڑ گئی انہوں نے ہاتھ بڑھا کر چپت اس کے سر پر ماری، پھر بوتل اس کی طرف بڑھا دی۔

"لو یہ بنا کر لونگ روم میں دے آئو آغا جی کو' اور سکندر کو کولڈ ڈرنک دے آئو۔" انہوں نے خاصی تاکید کی' کیونکہ آغا جی کولڈ ڈرنک نہیں پیتے تھے۔

"ہائیں سکندر بائو آئے ہیں۔" وہ روح افزا کی بوتل پکڑتے ہوئے چونک کر بولی مگر مما کی اٹھتی نگاہوں پر دبک کر جلدی سے منہ پھیر کر گلاس نکالنے لگی۔

"ایک بار تو اس کے باپ سے شکایت کرنا ہی پڑے گی۔"

مما کی سنہری آنکھوں میں جھنجلاہٹ تھی' وہ کچن سے بڑبڑاتی باہر نکلیں تو بھابی طوبیٰ کا منہ نیپکن سے پونچھتے ہوئے بولیں۔

"اس کے باپ سے کہہ کر اس کی شادی جلد ہی کر دیں کسی ہونہار انٹلکچوئل اور باذوق دھوبی سے' جو اس سے کپڑے دھلوانے کے بجائے غزلیں لکھوایا کرے اور اپنی دن بھر کی تھکن اس کا مشاعرہ سن کر اتارا کرے' کیوں کیا خیال ہے صغریٰ۔"

انہوں نے فریج سے آئس کیوب نکالتی صغریٰ کو چھیڑا تو اس نے کسی کم سن بچے کی طرح منہ پھلا کر چہرہ موڑ لیا' مما کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

وہ شربت بنا کر کچن سے برآمد ہوئی پھر ایک لحظہ بھابی کی طرف آ کر رکی اور بولی۔

"دھوبی سے شادی کرتی ہے میری جتی (جوتی)۔" پھر لہرا کر لونگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ بھابی اور مما آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"تو کس سے کرو گی' سکندر بائو سے۔" انہوں نے جاتی صغریٰ کو پھر چھیڑا۔

"ہشت بدتمیز۔" مما نے فروٹ کاٹتے ہوئے رک کر چھری ہلکے سے بھابی کے ہاتھ پر ماری۔

"ہائے پھوپھو اس کے تیور کچھ ایسے ہی خطرناک دکھائی دے رہے ہیں' دھوبی تو جوتی میں آ گیا' اب سر کے تاج کے لیے تو سکندر بھائی ہی جچتے ہیں۔"

"کیوں سکندر بھائی بے چارے نے کیا گناہ کیا ہے۔" شہرینہ کتابیں ٹیبل پر پٹختی فریج کی طرف بڑھی وہ ابھی کالج سے لوٹی تھی' دھوپ کی تمازت سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا' اس نے بوتل نکالی اور منہ سے لگا لی۔

"ویسے یہ کس کی شادی خانہ آبادی کا ذکر تھا' وہ بھی سکندر بھائی کے ساتھ۔" وہ مما کی ڈانٹ نظر انداز کر کے بھابی کی طرف دیکھنے لگی' اسی دم صغریٰ لونگ روم سے نکلی تھی' بھابی اسے دیکھتے ہی معنی خیزی سے ہنسنے لگیں۔

"اپنی صغریٰ کی شادی اور کس کی' بہت جلد ڈھولکی بجے گی۔"

"دیکھیں دیکھیں بڑی بیگم صاحبہ! سمجھا لیں بھابی جی کو' یہ کوئی چنگی بات نہیں ہے پھر کہوں گی کچھ تو آپ جی مجھے چپتیں ماریں گی۔"

"یہ کیا معاملہ ہے' سکندر بھائی اور صغریٰ کا؟" اسے اچھو لگتے لگتے رہ گیا تھا' اس نے بوتل ہاتھ میں پکڑے پکڑے فریج کا ڈور بند کیا اور اس طرف آئی۔

"کچھ نہیں یہ مونا یونہی بکواس کیے جا رہی ہے۔" مما کٹے ہوئے فروٹ سے بھرا باؤل اٹھا کر کھڑی ہو گئیں جو انہوں نے ٹرائفل بنانے کے لیے کاٹا تھا اور فریج میں رکھنے لگیں۔

"ہائیں' بھابی جی! یوں تو نہ کہیں سکندر بائو تو میرے سگے ویر جیسے ہیں' میرے ابادی قسم۔" صغریٰ بھابی کی شرارت کو سمجھ نہ سکی' اپنے گال پیٹنے لگی پھر چمک کر بولی۔

"ویسے بی بی جی! مجھے تو ولید بائو جیسے مرد اچھے لگتے ہیں۔" اس نے گویا انکشاف کیا اور ادھر شہرینہ کے ہاتھ سے بوتل چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی' بھابی کی بھی آنکھیں گویا ابل پڑیں۔

مگر وہ اپنی دھن میں بول رہی تھی۔

"کیسے سوہنڑے ہیں ولید بائو' یہ قد' اچا لمبا وہ انگریجی فلم کا ہیرو نہیں تھا' وہی والی فلم کا شہرینہ بی بی جو اس دن آپ دیکھ رہی تھیں' بالکل ویسے ہی ہیں ولید بائو۔"

"یا اللہ! یعنی گھر میں ہی نقب۔" بھابی کی ہنسی جو چھوٹی تو رکنے میں نہیں آئی۔

"کیا آئیڈیل ذہن ہے۔"

شہرینہ تو بوتل ٹیبل پر پٹخ کر وہیں کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

"شکر کیجیے وسیم بھائی قد میں ولید بائو سے کم ہیں ورنہ ان کی خیر نہیں تھی۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"چلیں آنے دیجیے ولید بائو کو بھابی ذرا ان سے ذکر تو کیجیے گا' صغریٰ بی بی آپ پر سو جان سے فدا ہو چکی ہیں' اب بچنے کے آثار نہیں ہیں' سارے دھوبی مایوس و نامراد رہ جائیں گے۔"

''کیا مطبل ہے آپ لوگوں کا۔'' صغریٰ فروٹ کے چھلکے اٹھاتے ہوئے چونک کر دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔

''مطبل یہ کہ:

''بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے

انہیں دل لگانے کی کوشش نہ کرنا''

بھابی' طوبیٰ کی بچی ہوئی کھیر مزے سے کھاتے ہوئے گویا اسے خبردار کرنے لگیں۔

شہرینہ نے بمشکل ہنسی روکی ہوئی تھی اور اب کہیں جا کر صغریٰ بی بی کی سمجھ میں آئی' وہ اتنی کم عقل بھی نہ تھی اور جب سمجھ آیا تو سخت برا مان گئی۔

''میرے رب کی توبہ' ولید بائو تو میرے سگے ویر سے بھی زیادہ ہیں' میں تو انہیں اپنا سچا سچا ویر سمجھتی ہوں' توبہ توبہ' جو ایسا کبھی خیال بھی آیا ہو۔'' وہ زور زور سے گال پیٹنے لگی (عموماً وہ ساری سزا اپنے گالوں کو دیتی تھی)۔

''کیوں تنگ کر رہی ہو تم اس بچی کو۔'' مما کا دل اب صغریٰ کے لیے پسیج گیا۔

''ہم کہاں تنگ کر رہے ہیں مما! آپ خود ان کی ''خیال پروازی'' ملاحظہ فرمائیے۔''

''ہاں تو کسی کی تریف (تعریف) کرنا گناہ ہے کیا۔'' وہ شرینہ کو شکوہ کرتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اپنے ویر کی ہی تریف کر رہی ہوں جی اور جو اچھا ہو اسے تو سب اچھا ہی کہیں گے نا۔''

''اچھا بس بس میرے بچے کو اب نظر نہ لگا دینا۔'' مما کا دل وہمی ہونے لگا۔

شہرینہ کے لبوں کی تراش میں مدھم سی مسکراہٹ کسی خوشگوار لہر کی طرح پھوٹی تھی۔

''لو جی کوئی اپنے ہی ویر کو نجر لگاتا ہوگا' اور یوں بھی میری نجر تو ویسے بھی خراب ہے۔'' وہ ڈسٹ بین اٹھا کر لہرا کر چلتی بنی' مما ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

"بہت تیز ہو گئی ہے یہ لڑکی۔"

"تب ہی تو کہہ رہے ہیں کہ اب مما

مکھڑے پہ سہرا ڈالے آ جائیو آنے والے

چاند سی بنو میری تیرے حوالے

شہرینہ ٹیبل پر دھن بجا کر لہک لہک کر گانے لگی' بھابی بھی تالیاں پیٹنے لگیں۔

ڈولی کہار لیے بنو' بنا تیرا آئے گا

صغریٰ نے احتجاجاً کچن کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا جبکہ مما نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں سمجھانا عبث جان کر وہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

X...X...X

"کیا بات ہے پیارے! لگتا ہے آج پھر مایوسی کا دورہ پڑا ہے۔"

یاسر کمرے میں آیا اور درمیانی میز سے سگریٹ اور لائٹر اٹھاتے ہوئے صوفے پر بیٹھے نومی کی شکل دیکھی اور ہنس دیا' جوابا نومی نے اسے خاصی مجروح نگاہوں سے دیکھا۔

"تنگ آ گیا ہوں میں اپنے ہی خوابوں سے اور خوابوں کے روز ٹوٹنے سے' سوچتا ہوں ملک سے باہر چلا جائوں۔" اس کے لہجے میں دل شکستگی تھی۔ یاسر موٹے موٹے نرم کشن کے درمیان اطمینان سے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے اسے بغور دیکھنے لگا۔

یہ یاسر کے بنگلے کا آراستہ پیراستہ وڈرائنگ روم تھا' ایسے ہی ایک گھر کا خواب' ایسی ہی عیاشی اور سہولیات کا خواب نعمان رضا قریشی کی آنکھوں میں ایک عرصے سے تھا مگر اس کا خیال تھا وہ کبھی یہ سب کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ اس کی ساری زندگی خوابوں کی نذر ہو جائے گی اور اس کا خیال تھا کہ یاسر بھی بس اس کی تشنہ کامی' شکستگی' مایوسی اور اس کے کمپلیکس سے کھیل کر لطف اندوز ہی ہوتا ہے۔

اس کے خوابوں میں مزید رنگ بھر کر شاید اس کی تڑپ اور اضطراب سے لطف اٹھاتا ہے۔ روز امیدیں جگاتا ہے اور پھر ان کے ٹوٹنے پر مزے لیتا ہے۔ ایسے میں وہ خود ہی امیدوں سے تنگ آ چکا تھا' اس کی امیدیں اس کے خواب اس کے لیے عذاب ناک ثابت ہو رہے تھے۔

اس کے اندر روز بروز بے زاری اور بد دلی کا غلبہ شدید ہو رہا تھا۔

پژمردگی مستقل ڈیرہ ڈالے بیٹھنے لگی تھی اور یہی پژمردگی اور بے زاری اس کی ''عیاشی'' بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جب بھی شہر میں گھوم پھر کر چند ہزار کی نوکریاں خود ہی ریجکٹ کر کے آتا تو اس کی ایسی ہی حالت ہوتی۔ بے زاری اس کے ایک ایک انداز سے ٹپکتی نظر آتی اور ایسے میں اس کا دل چاہتا وہ اس دنیا کو تہس نہس کر دے۔ ہر دولت مند کی کوٹھی کو آگ لگا دے' سڑکوں پر گھومنے والی گاڑیوں کو بم سے اڑا دے۔

''آخر... آخر وہ کیوں تشنہ ہے؟ وہ کیوں کسی کوٹھی یا بڑی سی کار اور بڑے سے آفس کا مالک نہیں ہو سکتا۔ ایسے میں اس کے منفی خیالات اسے اژدھے کی طرح گھیرے میں لے لیتے۔

اور یاسر ملک اسی آخری سٹیج کا منتظر تھا' جب اس پر شدید قسم کی شکستہ حالی کا دورہ پڑے' دل گرفتگی' بے زاری اس کی رگ رگ کو کاٹنے لگے۔

ہر شے کو تہس نہس کر ڈالنے کی لاشعوری خواہش ابھرے اور دولت کے حصول کی خواہش بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑنے لگے۔

وہ دھیرے دھیرے اسی سٹیج پر آ رہا تھا' اس کی ذہنی حالت بے حد خستہ ہو رہی تھی۔

پژمردگی کے دورے اب روز روز پڑنے لگے تھے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس نے سگریٹ کا سارا دھواں لبوں سے نکال کر اس کے مرغولے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''ملک سے باہر وہ لوگ جاتے ہیں جو اپنے ملک میں رہ کر کچھ نہیں کر سکتے' جنہیں دولت کی خواہش تو ہوتی ہے مگر اپنے ضمیر کے سامنے ہر وقت کھڑا رہنے کا شوق بھی ہوتا ہے۔ تمہیں ضمیر کی سرخروئی' اور دولت کی چمک دمک ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا' تم اپنے بھائی کی طرح اپنے ضمیر کی سرخروئی کو ترجیح دو گے یا...''

''نہیں' مجھے ہر حال میں دولت کا حصول مقصود ہے۔''

اس نے یاسر ملک کی بات کاٹتے ہوئے سخت قسم کے باغیانہ لہجے میں کہا۔

''ضمیر... ہونہہ... سکندر بھائی نے اپنے قلم کی راستی سے کیا حاصل کیا ہے؟ اور جن کے بارے میں لکھتے ہیں ان کا کیا نقصان ہوا ہے؟ وہ یونہی اربوں کھربوں میں کھیلتے ہیں' محلوں میں ان کی چھٹیاں گزرتی ہیں' آنچ تک نہیں آتی ان پر۔ تم بتائو یاسر! مجھے بتائو میں ایسا گھر ایسی گاڑی کیسے حاصل کروں' کس طرح دولت مند بن سکتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر یاسر کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا' اس کی آواز اور لہجے میں بے تابی سی چیخ رہی تھی۔

یاسر نے سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر اس کی آنکھوں میں دیکھا وہ اسے ایسا احمق کمسن "آھو" محسوس ہوا جو خوفزدہ یہاں سے وہاں بھاگتا ہوا از خود کسی شکاری کے جال کا نشانہ بننے والا ہو۔

اس نے ایک ہنکارا ابھرا اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل ڈالی۔

X...X...X

وہ پروفیسر زبیری کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ میز کے دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھے اس کا وزیٹنگ کارڈ دو انگلیوں کے درمیان دبائے اسے خاصی خفگی بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، گو کہ انہوں نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی تھی مگر یوں جیسے اس کا آنا انہیں ناگوار محسوس ہو رہا ہو۔ اس دن کے واقعہ کی ناگواریت تھی، جو سکندر رضا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پھر تازہ ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم سر!" وہ بڑے دوستانہ انداز میں ان کی طرف بڑھا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے کر دیا۔

"وعلیکم السلام، یقین کرو لڑکے! میں تم سے ملنے کی قطعی خواہش نہیں رکھتا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

انہوں نے کسی جوش کے بغیر اس کے سلام کا جواب دے کر اپنے آگے بکھرے کاغذوں پر سر جھکا لیا مگر وہ نہایت اطمینان سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور قدرے مدافعانہ انداز میں بولا۔

"سوری زبیری صاحب! میں جانتا ہوں آپ اس روز کے واقعہ پر خفا ہیں مجھ سے، مگر یقین کریں میرا مقصد وہ ہرگز نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں میں تو..."

"اس کا مطلب ہے تم مجھے ایک چغد اور احمق شخص ثابت کرنا چاہتے ہو۔"

پروفیسر زبیری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے قدرے کٹیلے لہجے میں کہتے ہوئے اس پر ایک تند نظر ڈالی حالانکہ وہ بہت ٹھنڈے، ملنسار اور خوش مزاج انسان تھے مگر اپنے کردار پر لگی چوٹ نے ان کی ساری خوبیوں کو اس لمحے پس پشت ڈال دیا تھا۔ وہ اپنی عزت، وقار، اپنے پاکیزہ کردار کو بہت سینت سینت کر رکھنے والے انسان تھے۔ معاشرے میں جابجا پھیلی غلاظت سے اپنا دامن بچا بچا کر وہ اس منزل تک پہنچے تھے اور اس پر ایک ادنیٰ سے صحافی کے الفاظ انہیں کیونکر برافروختہ نہ کرتے۔

’’توبہ کیجئے پروفیسر صاحب! میں آپ کے بارے میں ایسی غیر شائستہ رائے رکھ سکتا ہوں‘ یقین کیجئے میرے دل میں آپ کی عزت اور احترام تو پہلے ہی تھا‘ اس روز کی ملاقات کے بعد اس میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے میں مانتا ہوں‘ میرے الفاظ نے آپ کو ہرٹ کیا ہے‘ مگر میں نے کہا نا میرا مقصد آپ کو ان بے ضمیروں کی فہرست میں شامل کرنا ہر گز نہیں تھا۔‘‘

اس کا انداز مدافعانہ ہی نہیں وضاحت کرنے والا بھی تھا۔

پروفیسر زبیری چپ رہے‘ بس اس کی طرف عمیق نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ہاں اتنا تھا کہ ان کے چشمے کے پار چمکتی ذہین آنکھوں کی سطح سے ناگواری کا وہ تاثر معدوم ہو گیا تھا۔

’’دراصل‘ ایک صحافی ہونے کے ناتے میرے اندر ایک عام آدمی کی نسبت تجسس اور کھوج کے جراثیم کچھ زیادہ ہی ہیں‘ ہاں میں اس بات کا اعتراف ضرور کروں گا کہ میں آپ کو ٹٹول رہا تھا‘ آں دیکھیں دیکھیں...‘‘ اس نے تیزی سے ہاتھ اٹھا کر پروفیسر زبیری کو کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر روک دیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

’’زبیری صاحب! بچہ پاکیزہ فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے‘ مگر وقت کے ساتھ ساتھ کچھ تربیت کچھ اس کے اطراف کے حالات‘ مجبوریاں یا کچھ اس کی ذہنی خصلت ہی اسے چور‘

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ڈاکو‘ لٹیرا بناتی ہیں۔پارسائی کا تو یہاں کوئی دعویٰ کر ہی نہیں سکتا‘ ہاں جدوجہد عمر بھر کر سکتا ہے‘ مگر ایسے لوگ خال خال ہی ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے آپ ان ہی خال خال لوگوں میں شامل ہیں۔‘‘

سکندر نے اپنی بات کے اختتام پر پروفیسر زبیری کی طرف دیکھا‘ جنھوں نے اس کے آخری جملے پر ایک گہری سانس بھری اور چشمہ اتار کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

’’سکندر رضا‘ یہی نام ہے نا غالباً تمہارا۔‘‘

’’جی... جی۔‘‘

’’دیکھو میاں! میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہاں خود کو پارسا ثابت کرنے کے لیے آگ کا دریا عبور کرنا پڑتا ہے۔آگ کا دریا سے مطلب میرا‘ آگ کا دریا ہی نہیں بلکہ ہزار قربانیاں دینا پڑتی ہیں‘ خواہشات کا گلا گھونٹا جاتا ہے‘ نفس سے مستقل جہاد کیا جاتا ہے اور یہ سب ہمارے یہاں اس لیے مشکل ہے کہ ہمارے معاشرے میں قانون تو ہیں مگر ان پر عمل نہیں ہے‘ اور اگر اس کی گرفت میں آتے بھی ہیں تو وہی جن کی گردن کمزور ہے‘ یعنی معاشی طور پر کمزور ہیں اور اب یہاں کوئی بھی کمزور رہنا نہیں چاہتا‘ فطری بات ہے جب ساری پکڑ

کمزوری کی ہو گی‘ سارے قانون ان ہی پر لاگو ہوں گے تو‘ مذمت کی طاقت ان کے اندر بھی ابھرے گی اور یوں معاشرے میں بدحالی‘ بدامنی‘ کرپشن‘ نفرت اور جرائم جنم لیتے ہیں اور ایسے میں کمزور رہتے ہوئے دامن بچائے رکھنا ایک مشکل کام ہی نہیں ایک ”مہم“ بن کر رہ جاتی ہے اور یوں کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ کبھی مجبور ہو کر اس کرپشن‘ جرائم اور بدحال معاشرے کی دنیا میں قدم نہیں رکھے گا۔

مگر اس کے باوجود‘ میرا عزم ہے کہ میں نے آج تک جس طرح خود کو اپنے ضمیر کی عدالت میں شرمندہ نہیں پایا آئندہ بھی نہیں پاؤں گا‘ اب تم کہو کہ تم کیا چاہتے ہو۔“

وہ ان کی گفتگو بے حد عقیدت سے سن رہا تھا‘ ان کے استفسار پر مسکرایا۔

”پہلے تو اس بات کا شکریہ کہ آپ نے میری طرف سے دل صاف کر لیا ہے۔“

’آں... آں ایک منٹ۔“ پروفیسر زبیری نے تیزی سے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکا۔

”پہلے یہ بتاؤ کہ یہ اطلاع تمہیں کس نے دی کہ میں نے تمہیں دل سے معاف کر دیا ہے۔“

”جج... جی...“ سکندر رضا حقیقتاً سٹپٹا کر پروفیسر زبیری کا منہ تکنے لگا‘ تب وہ پہلی بار مربیانہ اور قدرے دوستانہ انداز میں ذرا سا مسکرائے‘ ان کا لہجہ بدل چکا تھا‘ اس میں ملائمت تھی جو ان کی ذات کا خاصا تھی‘ پھر یک دم کھل کر مسکرائے۔

”خیر خیر آگے کہو۔“ انہوں نے سر ہلاتے ہوئے اسے بولنے کی اجازت دی تو وہ ہولے سے ہنس دیا۔

”چلیں سر! آپ دل صاف نہیں کرتے تو نہ سہی‘ یوں بھی ہم صحافی برادری سے مشکل ہی سے کوئی خوش ہوتا ہو گا۔ آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ نے وعدہ کیا تھا‘ وڈیرہ مردان علی شاہ کے بیٹے کے کیس کی مجھے تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کرنے کا۔“

اس کی بات پر پروفیسر زبیری نے ایک ہنکارا ابھرا‘ پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر پرخیال انداز میں بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگے‘ پھر یک دم سیدھے ہوئے اور قدرے آگے جھکتے ہوئے سکندر رضا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

”وعدہ تو تم نے بھی کیا تھا سچ لکھو گے‘ من و عن۔“

”بالکل‘ میں اب بھی اس وعدے پر قائم ہوں۔“ وہ بلاتامل بولا۔

”سوچ لو' کسی ایم پی اے کے ذاتی معاملات کو اخباروں میں اچھالنے پر شہرت تو ٹھیک ٹھاک مل جائے گی مگر خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے دراصل ہمارے یہاں کی سیاست کی دنیا میں اب یہ طور سب سے مقبول ہے کہ جو شخص تمہاری رائے سے اختلاف کرے' اسے بری طرح روند ڈالو' ہر طرح سے اسے شکستہ کر ڈالو' مگر جو تمہارے سیاہ کارناموں کو اپنی خامہ فرسائی سے خوش نما بنا کر عوام کے سامنے پیش

کرے اس کی جھولیاں بھر دو' اس کا منہ اشرفیوں سے بھر دو' برخوردار بہت جلد ہمارے یہاں بادشاہت قائم ہونے والی ہے۔“

”یعنی ابھی قائم نہیں ہوئی۔“

سکندر نے کچھ اس طرح تعجب کا اظہار کیا کہ پروفیسر زبیری محظوظ ہو کر قہقہہ لگا بیٹھے۔ مگر دوسرے پل قدرے سنجیدہ بلکہ یاسیت میں آتے ہوئے بولے۔

”دیکھو! اب یہ مقام آگیا ہے کہ ہم خود پر ہنستے ہیں' محظوظ ہو کر قہقہے لگاتے ہیں شاید غالب نے ایسے ہی حالات پر کہا ہو گا کہ:

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

افسوس ہم بہت تیزی سے بے حس ہوتے جا رہے ہیں' ہم صرف انفرادی طور پر سوچتے ہیں' اپنے اپنے مسائل اور غموں میں الجھ گئے ہیں' اس لیے اجتماعی برائیاں نظر نہیں آتیں یا ان سے چشم پوشی اختیار کر رہے ہیں' اب احتجاج کا سلیقہ بھول گئے ہیں اور یہی المیہ ہے' خیر... ہاں تو تم اپنے اخبار کے لیے سٹوری چاہ رہے ہو سنسنی خیز۔“ وہ دوبارہ کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گئے۔

”دیکھو سکندر! میں ابھی کچھ کہوں گا تو یہ پیش از مرگ واویلا ہو گا۔“

”کیا مطلب؟ کیا مردان علی نے آپ سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔“ سکندر نے چونکتے ہوئے قدرے تحیر سے پوچھا' پروفیسر زبیری نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ہاں' میری طرف ان کی پیش قدمی نہیں ہوئی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ انہیں میری طرف آنا ہی ہو گا۔“

”اور منہ کی کھانا ہو گی۔“ اس نے ان کی بات اچک کر ٹکڑا لگایا تو وہ ہلکے سے مسکرا دیئے۔

”ہوں انشاءاللہ ظاہر ہے اس کے نالائق بیٹے کے سوشیالوجی کے پرچے میرے پاس ہیں' وہ میں تمہیں ضرور دکھاؤں گا' جس میں اس نے صرف دھمکیاں لکھی ہیں' اور بات یہاں

تک ہوتی تو چلو در گزر کر دیا جاتا' اس نے اپنے خاندانی حسب نسب کے زعم میں امتحانی مرکز میں ٹی ٹی نکال کر اپنی میز پر رکھ لی۔ اب تم بتاؤ کہ میں اسے کیسے اس پرچے میں ہنڈرڈ پرسنٹ مارکس دے دوں' حالانکہ اس نے تین نمبر حاصل کرنے کا بھی کام نہیں کیا ہے' میرا خیال تھا وہ اطمینان سے نقل کرے گا' اس نے تو یہ زحمت بھی گوارا نہیں کی' اب اتنا اندھیر بھی نہیں مچا۔ اس نے فوٹو کاپی کیے پرچے اپنی کاپی میں پن کر دیئے۔''

''کیا نام ہے اس لڑکے کا؟''

''اکبر شاہ' سخت اوباش قسم کا لڑکا ہے' صرف تعلیمی حساب سے وہ نالائق ہی نہیں ہے یونیورسٹی میں غیر شائستہ حرکتیں کرنا' لڑکیوں کو تنگ کرنا' اپنے چیلوں کو جمع کر کے تمام غیر اخلاقی حرکتیں کرتے رہنا اس کی ہابیز ہیں۔ کئی لڑکیوں نے براہ راست مجھ سے شکایات کی ہیں' میرا تو دل چاہتا ہے اسے تین سال کے لیے بلیک لسٹ قرار دے دوں مگر...''

وہ جیسے بے بسی کے شدید ترین احساس کے ساتھ لب بھینچ کر رہ گئے۔

''اس کا باپ نااہل ہونے کے باوجود ملکی اسمبلی میں موجود ہے' بس سکندر میں یہیں پر بے بس ہوں۔'' وہ پیپر ویٹ کو انگلیوں سے گھمانے لگے' اسی دم چپڑاسی ان کی اجازت سے

کمرے میں داخل ہوا وائس چانسلر کے احکام لے کر کہ وہ پروفیسر زبیری کو اپنے آفس میں طلب کر رہے ہیں' ان کا کوئی ملاقاتی آیا ہوا ہے۔

''میرا ملاقاتی ان کے آفس میں۔'' انہوں نے چپڑاسی کو چلتا کیا پھر لحظہ بھر کے لئے سوچ میں پڑ گئے۔

پروفیسر زبیری اپنے آنے والے ملاقاتی کے بارے میں کچھ سوچتے رہے پھر جیسے ہنکارا بھر کر کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے سکندر رضا کو دیکھا۔

''سوری ینگ مین! حالانکہ میرے پاس ابھی تمہیں دینے کو وقت تھا مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر تم چاہو تو انتظار کر سکتے ہو۔'' ان کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔

''مجبوری ہے سر!'' سکندر نے کندھے اچکا دیئے اور احتراماً خود بھی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

''او کے۔'' پروفیسر زبیری نے ٹیبل سے اپنا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر جمایا اور کمرے سے نکل گئے۔

X...X...X

تانیہ نے اس کے منہ میں پورا گلاب جامن ٹھونستے ہوئے اسے یہ خوش خبری سنائی کہ نادیہ آپی کا رشتہ طے کر دیا گیا ہے۔ انہی لوگوں میں جو مہینہ بھر سے ان کی دہلیز پکڑے بیٹھے تھے۔

”بڑی بدتمیز ہو۔ یہ خبر ایسے سناتے ہیں۔“ وہ آدھا گلاب جامن دانتوں سے کاٹ کر بقیہ آدھا ہاتھ میں پکڑ کر اسے گھورنے لگی۔

”ایسے“ سے کیا مطلب ہے، پورے گلاب جامن کے ساتھ سنا رہی ہوں، اب کیا فتح حلوائی کو ساتھ پکڑ کر لاتی۔“

اس کی بات پر شہرینہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

”گدھی! میرا مطلب تھا گھر آ کر سناتیں نا۔ سچ بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ نادیہ آپی کو میری طرف سے بہت بہت مبارک دینا۔“ وہ دونوں اب راہداری میں دھیرے دھیرے چل رہی تھیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”جی نہیں مبارک باد دینے تمہیں خود بہ نفس نفیس آنا پڑے گا۔ اسی ہفتہ منگنی کی چھوٹی موٹی رسم بھی ہو گی۔ آئو گی نا؟“ تانیہ کے چہرے پر مسرت ستاروں کی طرح چمک رہی تھی۔

وہ رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اسے گھورنے لگی۔

”کیا مطلب ہے آئو گی نا... میرے بغیر آپی بھلا منگنی کریں گی؟“

اس کی بات پر تانیہ ہنس پڑی، اسی دم دونوں کی نظریں سامنے سے آتے سکندر رضا پر پڑیں۔

”اے تانی! خیریت تو ہے یہ محترم یہاں کیوں پائے گئے ہیں؟ کہیں ڈیٹ ویٹ پر تو...“

اس نے سکندر کے قریب آنے سے پہلے تانیہ کو ٹھوکا مار کر مشکوک انداز میں پوچھا تو تانیہ نے اس کے بازو پر چٹکی کاٹ لی۔

”بدتمیز تمہیں میرے بھائی ایسے نظر آتے ہیں۔“

سکندر بھی ان دونوں کو دیکھ چکا تھا۔ ٹرائوزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے خراماں خراماں چلتا ہوا ان تک آ پہنچا۔

"خیریت تو ہے آپ اور یہاں' کس کی شامت آئی ہے' کون آپ کے اخبار کی زینت بننے والا ہے۔" وہ اپنی عادت کے مطابق شرارت سے باز نہ رہ سکی۔

"تم دونوں کس خوشی میں ٹہل رہی ہو یہاں' کوئی پریڈ نہیں ہے کیا۔"

وہ بجائے اپنی یہاں موجودگی کا جواز بتانے کے ان سے باز پرس کرنے لگا اور اسے ڈپٹنے کے سے انداز میں دیکھنے لگا۔

ہلکے پیازی رنگ کے شلوار سوٹ اور ہم رنگ کلف کے دوپٹے میں وہ اس نوشگفتہ پھول کی طرح مہکی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جو شب رفتہ کی تمام خوب صورتیاں سمیٹنے کے بعد اوس میں نہا چکا ہو۔ اس کی شرارتی آنکھوں میں ستاروں کی سی جگمگاہٹیں تھیں۔

سکندر رضا نے اس کے چہرے کو دیکھتے دیکھتے یکدم چونک کر جیسے اپنے ہی کسی چور جذبے کی شدت سے گھبرا کر نگاہیں ہٹا لیں۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم کتابی کیڑے نہیں ہیں' سو فری پریڈ میں ذرا موجاں اڑا لیتے ہیں۔ ویسے آپ لوگوں نے بالکل اچھا نہیں کیا۔ یہ تانی کی بچی نے بھی مجھے

نادیہ آپی کی منگنی کی خبر یہاں دی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ اسے لے کر ہمارے گھر آتے مع مٹھائی کے پورے ڈبے کے ساتھ۔"

"اوہ..." وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"اب اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں' یہ تو تمہاری اس دوست کو ہی اتنی جلدی تھی یہ خبر سنانے کی ورنہ میرا ارادہ تو شام کو گھر آکر پورے ڈھول کے ساتھ یہ خبر سنانے کا تھا۔" اس نے وضاحتی بیان دیا تو وہ تانیہ کو پلٹ کر گھورنے لگی۔

"تم سے اچھے تو یہ ہیں۔"

"وہ تو ہیں ہی۔ اس سے کس کو انکار ہے' آخر ہیں کس کے بھائی۔" تانیہ نے گردن اکڑائی۔

"بات یہ ہے ڈیئر کہ ہمارا ارادہ تھا گھر جا کر ہی یہ خوشخبری سنائی جائے مگر تم خود سوچو ابھی میں کچھ نہ بتاتی تو شام کو تم میری یہ نازک گردن پکڑتیں اور کہتیں کہ صبح جامعہ آئیں تو بھاپ تک نہ نکالی منہ سے یعنی آگے کنواں پیچھے کھائی۔ کہہ کر بھی پچھتائی نہ کہہ کر بھی پچھتانا پڑتا۔"

''بس بس میرے سامنے یہ محاروے نہ بولا کرو۔'' وہ تانیہ کے انداز پر بے ساختہ امڈنے والی ہنسی کو نہ روک سکی تھی۔

بڑی بے فکر' آزاد اور تروتازہ ہنسی تھی۔ سکندر رضا کو لگا جیسے اس کے دل کے تاروں پر کسی نے ہولے سے ہاتھ مار دیا ہو اور ہر تار جھنجھنا اٹھا ہو اور اس میں خوب صورت موسیقی بجنے لگی ہو۔

جیسے کوئی تازگی بخش مہک اس کے پور پور کو چھو گئی ہو۔

اس نے بے اختیارانہ سی مگر مہکتی نظریں اس پر ڈالیں پھر جیسے اندر ہی اندر خفیف سا ہو کر ان دونوں کو وہیں باتوں میں مصروف چھوڑ کر آگے بڑھ کر سیڑھیاں اتر گیا۔

وہ اکثر اپنے جذبوں کے آگے بے بس ہو کر رہ جاتا تھا مگر پھر یہ چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں اسے اندر ہی اندر شرمسار کرتیں' اسے سرزنش کرنے لگتیں۔

یوں بھی ہر نوجوان آدمی کی طرح اس پر بھی سٹوڈنٹ لائف میں عشق و محبت کے حادثے گزرے تھے مگر بے حد عام سی نوعیت کے جن کا اثر دیرپا کبھی نہیں رہا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

لیکن اب اس کا خیال تھا یہ واردات کچھ مختلف اور سنجیدہ نوعیت کی تھی جو براہ راست اس کے قلب کو متاثر کرتی تھی۔

''ارے یہ سکندر بھائی کہاں چل دیئے۔اب یہاں آ گئے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ میں پوائنٹ کی خواری سے بچ جائوں گی۔''

تانیہ کو اچانک خیال آیا اس نے پلٹ کر یہاں وہاں نظریں دوڑائیں مگر سکندر غائب ہو چکا تھا۔

''رہنے دو میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔اسی بہانے نادیہ آپی سے بھی مل کر انہیں مبارکباد دے دوں گی۔'' اس نے کلائی پر بندھی سنہری ڈائل والی نازک سی گھڑی میں نظر ڈال کر اپنا پروگرام واضح کیا۔تانیہ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور سر ہلا دیا۔

''چلو اس بہانے تم میرے غریب خانے کو رونق بخشنے تو آئو گی۔''

تانیہ نے کچھ اس طرح گہری سانس بھر کر کہا کہ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا جرنل اس کو دے مارا۔

"میں تو روز تمہیں ڈراپ کرنے کی آفر کرتی ہوں مگر تم ہی اپنے بھائی کی طرح اکڑ دکھاتی ہو' جیسے ساری خودداری تو تم پر ختم ہوتی ہے۔"

"آف کورس سسٹر!" تانیہ نے کندھے اچکائے پھر گویا دھیان آنے پر بولی۔

"چلو پھر چلتے ہیں ہمارا اگلا پریڈ بھی فری ہی ہے۔" آج تو شکر ہے کالی بلی نے بھی راستہ نہیں کاٹا۔"

"کون کالی بلی۔" اس نے چلتے ہوئے چونک کر اسے دیکھا تو تانیہ ہنسنے لگی۔

"اکبر شاہ اور کون' لگتا ہے آج یونیورسٹی آیا ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک بھی چیلا نظر نہیں آیا۔"

"تمہیں اس ذلیل کو یاد کرنا ضروری تھا کیا۔"

اکبر شاہ کے ذکر پر اس کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔ ناگواری اور نفرت کی لہر جیسے اندر سے اٹھی اور چہرے پر پھیل گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

'پتہ نہیں کیسے ماں باپ ہوتے ہیں جو بچے پیدا تو کر لیتے ہیں مگر ان کی تربیت کی طرف سے آنکھ بند کر کے انہیں کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور وہ خودرو جھاڑیوں کی طرح اگتے چلے جاتے ہیں۔' اس نے تپ کر سوچا پھر خود ہی اس کے خیال کو جھٹک دیا۔

X...X...X

وہ تانیہ کے ساتھ اس کے گھر آئی تو نادیہ آپی ہمیشہ کی طرح سو بکھیڑے لیے بیٹھی تھیں۔ آج بھی گھر کی دھلائی ہو رہی تھی۔ صحن میں شیلٹر کے نیچے رکھے تخت پر نومی لیٹا آسمان کی وسعتوں میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ تانیہ نے اندر داخل ہوتے ہی کھنکارا تو وہ چونکا' پھر شہرینہ کو دیکھ کر جھینپتا جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ارے نہیں تم اپنا یہ شغل جاری رکھو' ہم تو ویسے ہی اندر جا رہے ہیں۔" شہرینہ اس کے جھینپ کر اٹھنے پر خود بھی خفیف سی ہو گئی۔

"ارے رہنے دو اس کا تو کام ہی یہی ہے کبھی آسمان پر ریسرچ ہوتی ہے کبھی کبوتروں پر۔"

تانیہ اس پر نگاہ ڈال کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ نومی بھی بلا کا ڈھیٹ تھا جیسے کچھ سنا ہی نہیں اور اطمینان سے اپنی سابقہ حالت میں چلا گیا' گویا شہرینہ کی اجازت ہی کافی تھی جبکہ وہ دونوں اندر داخل ہو گئیں۔

"یا اللہ' آپی! کبھی تو آپ مجھے اطمینان سے کہیں بیٹھی نظر آ جائیں۔ ایمان سے اس دن آپ کا منہ چوم لوں گی۔"

تانیہ نے جلدی سے پائنچے اوپر کر لیے تھے۔ پورا فرش جھاگ سے بھرا پڑا تھا اور ایک طرف نازک سی نادیہ آپی جھاڑو ہاتھ میں پکڑے چھپاک چھپاک کر رہی تھیں۔

تانیہ کی یہ دہائی تو خیر ان کے لیے نئی بات نہیں تھی کہ وہ اپنا جاری کام ترک کرتیں' ہاں البتہ شہرینہ کو دیکھ کر خوشگوار حیرت کے ساتھ کام روک کر اس کی طرف بڑھیں۔

"ارے شہری تم آئی ہو... یہ آج چاند کہاں سے نکل پڑا؟" انہوں نے بے حد محبت سے اسے خود سے لپٹا لیا۔

"ابھی چاند نکلنے کا ٹائم نہیں ہوا۔ ابھی سورج نکلنے کا وقت ہے اور سورج مشرق سے ہی نکلتا ہے' آج بھی وہیں سے نکلا ہے آپ بتایئے آپ کا وہ بڑی بڑی مونچھوں والا اکاؤنٹینٹ چاند بابو کہاں سے طلوع ہوا ہے۔"

وہ شرارت سے بولی۔ اس کا اشارہ ان کے ہونے والے منگیتر کی طرف تھا۔ انہوں نے یکدم کسی سکول گرل کی طرح جھینپ کر اس کے بازو پر چپت رسید کی۔

"بے شرم! یہ چاند بابو بھلا کیا ہوتا ہے۔"

"مجھے کیا پتہ بابو وغیرہ تو ہماری فلموں کی پیداوار ہیں' شہری بابو' چاند بابو وغیرہ وغیرہ۔"

نادیہ آپی ہنستی ہوئی اسے کمرے میں لے آئیں۔

"تم بیٹھو یہاں' میں بھی فرش دھو لیتی ہوں پھر باتیں ہوں گی۔"

"کس کی' چاند بابو کی؟" وہ برجستہ بولی تو انہوں نے جاتے جاتے دروازے کے قریب رکھی پانی سے بھری بالٹی سے ذرا سا پانی چلو میں بھر کر اس کی سمت اچھالا۔ شہرینہ نے سائڈ

پر ہو کر خود کو بچانے کی کوشش کی مگر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اس کے چہرے کو بھگو گئے۔

تانیہ دو گلاس شربت بنا کر لے آئی۔ ایک گلاس اسے تھمایا اور دوسرا خود لے کر اطمینان سے بیٹھ کر چسکیاں بھرنے لگی۔

”امی نظر نہیں آ رہیں آپی!“ اس نے بالٹی اور کپڑا لیے اندر داخل ہوتی نادیہ آپی سے پوچھا۔

”باہر گئی ہیں صفیہ آپا نے بلوایا تھا' اپنے بچے کو بھیج کر' معلوم کرنا ہوگا انہیں آٹے دال کا بھاؤ اماں سے۔“ وہ پانی ڈالتے ہوئے تیزی سے فرش دھوتے ہوئے بولی۔

”کیوں اماں نے کیا دکان کھول لی ہے آٹے دال کی۔“

”اوہو بھئی محلہ بھر کی خبریں سننی ہوں گی اور سنانی ہوں گی۔ یوں بھی ہماری اماں جان کو بڑا شوق ہے صفیہ آپا کا خبرنامہ سننے کا' دیکھا جائے تو اماں کی بھی یہی واحد عیاشی تو رہ گئی ہے۔ اس طرح ٹائم پاس کر لیتی ہیں۔“

انہوں نے پنکھا فل کھول دیا اور کپڑا لے کر فرش پر پھیرنے لگیں۔ ان کے نازک خوب صورت ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے پھر تانیہ سے بولیں۔

”تم نومی کو ذرا کھانا دے دو۔ بے چارا کب سے بھوکا بیٹھا ہے۔“

”اوہو اس کی فکر ہے آپ کو اور ہم جو دونوں بھوکے پیاسے آئے بیٹھے ہیں۔“

”خیر تانی! پیاسے تو اب نہیں رہے' ہاں بھوکے ضرور ہیں۔“

شہرینہ نے شربت کا خالی گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

”اور آج نادیہ آپی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا میں ضرور کھاؤں گی۔“

تانیہ ہنسنے لگی' جبکہ نادیہ آپی اس کی بات پر یکدم کچھ پریشان سے ہو گئیں۔ یہ نہیں تھا کہ کھانا موجود نہیں تھا مگر ان کے خیال میں جو آج دوپہر کو پکایا تھا وہ شہرینہ جیسی امیرزادی کے شایان شان نہیں تھا۔

”کیا پکایا ہے آپی۔“ تانیہ بیڈ سے اترتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"بگھارے بینگن اور روٹی۔" انہوں نے کپڑا بالٹی میں نچوڑتے ہوئے یوں آہستگی سے بتایا گویا کوئی بڑے جرم کا اقرار کر رہی ہوں۔ تانیہ بے فکری سے سر ہلا کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"تم ٹھہرو تانی! میں ابھی نومی کو بازار بھیج کر نہاری منگوا دیتی ہوں اب کہاں تم لوگ بینگن وینگن کھاؤ گی۔" وہ جھینپے جھینپے لہجے میں بولیں اور اٹھنے لگیں۔

تانیہ نے پلٹ کر ان کی شکل دیکھی۔ جس پر دلی کیفیت رقم تھی۔ وہ چپ ہو گئی مگر شہرینہ ان کی جھینپ یا خفت سے بے نیاز تھی۔ بیڈ سے اتر کر پیروں میں شوز ڈالتے ہوئے بولی۔

"کوئی نہاری وہاری نہیں کھانی' باہر ہی کا کھانا تھا تو ہماری کینٹین میں کیا کمی تھی۔ میں تو بگھارے بینگن کھاؤں گی۔" وہ تانیہ کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

"یہ نادیہ آپی حد سے زیادہ تکلف کرتی ہیں' ان کے خیال میں بگھارے بینگن کھانے کے لیے پیدا نہیں ہوئی ہوں۔ مجھے تو بس چکن تکے' مرغ مسلم ہی کھاتے رہنے چاہئیں۔ بڑی دشمن ہیں یہ میری اسمارٹنس کی۔"

وہ تانیہ کے ساتھ اس کے چھوٹے سے باورچی خانے میں کھڑی بگھارے بیگن کی دیگچی میں منہ ڈالے اس پر نظر ڈال کر کہہ رہی تھی۔

تانیہ نے ہنس کر پلیٹیں نکالیں' پھر نومی کو آوازیں دینے لگی۔

نومی کے کھانے کی تیاری اس نے باہر اماں کے تخت پر ہی کر دی تھی اور وہ دونوں کچن کے اندر بیٹھ کر کھانے لگیں۔

نومی چپل گھسیٹتا آیا اور تخت پر بیٹھ کر جو ڈونگے میں سبزی دیکھی تو اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"کیا مصیبت ہے' ساری غربت اور کفایت شعاری اس گھر میں آ گئی ہے۔ ڈھنگ کا کھانا نصیب ہو گا یا نہیں۔" اس نے پلیٹ اٹھائی اور واپس تخت پر پٹخ دی۔

"کیا ہوا؟" نادیہ آپی سرعت سے کمرے سے باہر نکلی تھیں جبکہ تانیہ نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے ایک نظر شہرینہ پر ڈالی پھر ہونٹ بھینچ کر صرف بڑبڑا کر رہ گئی۔

"اونہہ کہیں کا لارڈ ہے نا کہ روز اس کے لیے بکرے دنبے قربان ہوں گے۔"

"آپ کبھی تو ڈھنگ کی چیز پکا لیا کریں۔" وہ نادیہ آپی سے الجھ رہا تھا۔

”کیا بدتمیزی ہے نومی روز توڑ ھنگ کا کھاتے ہو بس شکر نہیں کرتے تم۔“

وہ آہستہ آواز میں اسے سرزنش کرنے لگیں وہ شہرینہ کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے پزل سے ہو رہی تھیں۔

”گوشت ہی تو پکتا ہے زیادہ تر‘ کہاں بناتی ہوں میں اب سبزیاں۔“ وہ دبی زبان میں بولیں۔

”میں نے کہا تھا کباب بنایئے گا۔“

”ہاں تو جمعہ کو بناؤں گی نا۔“

”اونہہ جمعہ یعنی اب کباب کھانے کے لیے جمعہ کا انتظار کیجیے۔“ اس کی استہزائیہ ہنسی ابھری۔

”واہ ری قسمت چھوٹی چھوٹی خواہشات پوری ہوتی نہیں ہیں۔ بڑی اور مہنگی خواہش کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اس گھر میں۔“

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر حقارت سے نوالہ حلق سے اتارنے لگا۔

اس گھر میں ایسا کوئی افلاس بھی نہیں تھا جتنا نعمان رضا نالاں رہتا تھا۔ بس یوں تھا کہ اس کے خواب اپنے گھر کی چہار دیواری سے کچھ بلند ہو گئے تھے کہ اسے یہ دیواریں زیادہ چھوٹی دکھائی دینے لگی تھیں جبکہ اس گھر میں سب کچھ تھا۔

تین وقت کا کھانا۔

محبتیں۔

راحتیں۔

قہقہے‘ رشتوں کا تقدس۔

شہرینہ کو نومی کی ذہنیت اور رویوں نے خاصا دکھ پہنچایا تھا۔ وہ تانیہ کی طرح اپنے ماحول سے محض افسردہ نہیں تھا بلکہ متنفر دکھائی دیتا تھا۔

اس کے لہجے میں مایوسی افسردگی یا بے بسی نہیں نفرت اور حقارت تھی۔

وہ تانیہ کے گھر سے نکلی تو نومی کے رویوں پر اس کا دل خاصا افسردہ اور متاسف تھا مگر جونہی گھر میں قدم رکھا لونگ روم میں پاپا‘ وسیم بھائی کے ساتھ ولید کو دیکھ کر اس کی ساری

کلفت گویا رم جھم پھوار میں اڑتی گرد کی طرح بیٹھ گئی۔ خوشگواریت کا احساس رگ رگ میں اتر گیا۔

X...X...X

پروفیسر زبیری نے اپنے آفس میں قدم رکھا تو سکندر رضا کو ہنوز موجود پا کر ذرا سا چونکے شاید اس سے کچھ دیر پہلے والی ملاقات ان کے حافظے سے نکل گئی تھی مگر جلد ہی انہیں یاد بھی آ گیا کہ انہوں نے خود ہی اسے یہ آفر دی تھی کہ وہ ان کی واپسی کا انتظار یہاں بیٹھ کر کر سکتا ہے۔

انہوں نے خود کو کرسی پر گرایا اور چشمہ اتار کر پٹخنے کے انداز میں سامنے میز پر رکھ دیا۔

"خیریت تو ہے سر!"

"مردان علی شاہ نے اپنا بندہ بھیجا تھا۔"

وہ ایک ہنکارا بھر کر بولے۔ ان کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ذرا سا پھیل کر منجمد ہو گئی۔

"بن... وہ' بندے تو صرف خدا کے ہو سکتے ہیں مگر یہ لوگ شاید آدمیوں کو اپنا بندہ کہہ کر خدا کی برابری کرنا چاہتے ہیں۔ خیر میں منتظر ہی تھا کہ کب پیش قدمی ہوتی ہے۔"

وہ آگے ہو کر میز پر دھیرے دھیرے پیپر ویٹ کو انگلیوں سے گھمانے لگے۔

"اس طرح... اس طرح نچانا چاہتے ہیں وہ اپنی دولت اور اثر ورسوخ کے بل بوتے پر ہر شخص کو' ہر کمزور کو۔" انہوں نے پیپر ویٹ کو زور سے گھمایا پھر اس پر ہتھیلی کا دباؤ ڈال کر سکندر رضا کو دیکھا۔

سکندر رضا خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا ان کے بولنے کا منتظر رہا مگر کئی لمحے خاموشی سے گزارنے کے بعد بھی وہ کچھ نہ بولے تو وہ بولا۔

"المیہ یہ نہیں ہے کہ وہ نچاتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ لوگ ناچتے ہیں۔ لوگ خود کو ان کے سامنے کمزور سمجھتے ہیں۔ کوئی آقا اس وقت تک آقا نہیں بنتا جب تک کوئی غلام پیدا نہ ہو۔ پتھر کے بت خدا اس وقت بنتے ہیں جب کوئی کمزور ایمان ان کے آگے سجدہ ریز ہوتا ہے' آپ پتھر کو پتھر ہی سمجھتے رہیں اسے خدا نہ بنائیں آپ انسان کو انسان ہی سمجھیں آقا نہ سمجھیں۔"

اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ بھی تھی اور افسردگی بھی۔ پروفیسر زبیری بھی لحظہ بھر اسی کیفیت سے دوچار ہوئے پھر گہری سانس بھر کر ذرا سا مسکرائے۔

"پتہ نہیں یہ باتیں ہمارے معصوم لوگ کب سمجھیں گے۔"

ان کے انداز اور مسکراہٹ میں ملال کا رنگ تھا۔ پھر یکدم چونک کر ریسٹ واچ پر نگاہیں ڈالیں اور اوہ کر کے اپنے آگے بکھری فائلوں اور رجسٹروں کو بند کرنے لگے۔ سکندر کو بھی یکدم وقت گزرنے کا احساس ہوا۔

"سوری سر! میں نے آپ کا بہت وقت برباد کیا ہے' کیا آپ مجھے نہیں بتائیں گے کہ مردان علی شاہ کے آدمی سے آپ کی کیا باتیں ہوئیں میرا مطلب ہے انہوں نے کیا پیغام بھجوایا ہے۔"

وہ اس کھوج پر مجبور تھا۔ پروفیسر زبیری کے لبوں کی تراش میں بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مگر دوسرے پل وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

"برخوردار ابھی تو صرف مجھ سے خواستگارانہ انداز میں التماس کی گئی ہے کہ میں ان کے نالائق بیٹے کو بہترین نمبرز سے پاس کردوں یعنی اے ون گریڈ۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ان کی بات پر سکندر کے لب سیٹی کے انداز میں سکڑ گئے۔

"مگر میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ میرے جیتے جی تو ایسا ہو نہیں سکتا۔ اسے کہیے کہ وہ دوبارہ پرچہ دے پوری تیاری کے ساتھ' تو جانتے ہو اس کے "بندے" نے کیا کہا۔"

"سوچ لیجئے پروفیسر صاحب! ابھی تو التجا وہاں سے ہے' ایسا نہ ہو کہ کل آپ ملتجی ہو کر ہمارے سائیں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی جاب کی بھیک مانگ رہے ہوں۔"

"اونہہ خدا سمجھ بیٹھے ہیں خود کو وہ حقیر ذرے۔"

وڈیرہ مردان علی کے بھیجے آدمی کے آخری الفاظ دہراتے ہوئے ان کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ ان کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اپنا رجسٹر اور چشمہ اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ سکندر رضا بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بھی تاسف اور ملال کی لہر ابھر آئی تھی۔ پھر وہ پروفیسر زبیری کے قیمتی وقت کا احساس کرتا ان سے مصافحہ کر کے ان کے آفس روم سے باہر آ گیا۔

فضا میں ہلکی ہلکی خنکی کا احساس غالب تھا مگر اسے اپنے دل پر ایک عجیب سی گرم گرم تپش کا احساس ہو رہا تھا۔

X...X...X

وسیم بھائی سے باتیں کرتے ہوئے ولید اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی طرف ایک خوشگوار مسکراہٹ اچھالی جسے وہ نظر انداز کرتی صغریٰ کے ہاتھ میں بیگ اور جرنل تھما کر پاپا کی طرف بڑھ گئی۔

اس کا انداز کسی کم سن سے ناراض بچے کی طرح تھا' جو محض اس لیے روٹھے کہ اسے منایا جائے۔اس کے لبوں کی تراش میں سجی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"دیکھیں شیری بی بی! گھر کیسا بھرا بھرا ہو گیا پھر سے' اب تو آپ کی ساری بوریت ختم ہو گئی نا جی!"

صغریٰ یوں چہک کر اس سے بولی گویا یہ بھی اس کا کوئی کارنامہ ہو۔

"کیوں خیریت؟" پاپا صغریٰ کی بات سن کر اس کی طرف دیکھنے لگے تو آغا جی ہنس دیے۔

"مت پوچھو... اس لڑکی نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا' چونکہ اس پورے گھر میں ایک میں ہی واحد فارغ انسان بچا تھا اس کی بوریت دور کرنے کے لیے۔لوڈو کھیلا ہے میں نے اس کے ساتھ۔"

آغا جی کچھ اس درد بھرے انداز میں بتانے لگے کہ لونگ روم میں سب کے بے ساختہ قہقہے اُمڈ پڑے۔وہ خجل سی ہو گئی۔

"غلط بیانی سے کام لیتے ہیں آغا جی! کوئی بوریت ووریت دور نہیں کی انہوں نے میری۔سارا سارا دن تو کتابیں پڑھتے رہتے تھے یا پھر نیند لیتے رہتے تھے۔"

"ہاں بھئی اس کی بوریت تو صغریٰ نے دور کی ہو گی بسوں ویگنوں کے شعر سنا سنا کر۔"

بھابی چہک کر بولیں تو ممی اور شہرینہ بے ساختہ ہنس دیں۔کمرے سے نکلتی صغریٰ نے بھابی کی طرف گھور کر دیکھا۔

"یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے گاؤں جانے کی کیا سوجھی۔"

وسیم بھائی، ولید کی طرف متوجہ ہو گئے اور کمرے سے باہر نکلنے کا ارادہ کرتی شہرینہ ٹھٹک سی گئی اور بے اختیار صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھ کر پلٹ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا مگر وہ مکمل وسیم بھائی

کی طرف متوجہ تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے زانو پر ہولے ہولے ہاتھ مارتے ہوئے سنجیدگی سے ہنس دیا۔

"بس یہ دیکھنے کہ گاؤں کیسے ہوتے ہیں؟"

پاپا نے روتھ مین کا پیکٹ سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر اس میں سے ایک سگریٹ نکالتے ہوئے بغور اس کا چہرہ دیکھا اور کچھ دیر دیکھتے رہے پھر پر خیال انداز میں بولے۔

"مردان علی شاہ کے مہمان بنے تھے۔"

"جی۔"

"اوہو یہ عیش ہیں۔" وسیم بھائی چونک کر پھر ہنس پڑے۔ خاصے متعجب بھی ہو رہے تھے۔

"کیا رسپانس رہا، میرا مطلب ہے کیسا پایا؟"

پاپا بدستور سنجیدہ تھے اور گہری سوچ سے پوچھ رہے تھے۔ آغا جی کوئی کتاب اٹھا کر اس میں مگن دکھائی دے رہے تھے مگر ان کا دھیان ولید حسن اور جہانگیر احمد (پاپا) کی طرف ہی تھا۔

"اچھا رہا ٹور۔"

"تم شاید اس کی بیٹی کے کولیگ کی حیثیت سے گئے تھے۔"

"ہوں۔" اس نے سر ہلایا۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ یوں کھیل رہی تھی جیسے وہ کسی تصور یا خیال سے محظوظ ہو رہا ہو۔ پھر ذرا سا چونکا شہرینہ دروازے سے باہر نکلتی صغریٰ کو زور سے ایک طرف دھکیل کر قدرے جارحانہ انداز میں لونگ روم سے باہر نکلی تھی۔

اس کا یہ طرز عمل کسی نے دیکھا تھا یا نہیں اور دیکھا بھی تھا تو محسوس نہیں کیا تھا۔ سوائے ولید حسن کے۔ یوں بھی کچھ باتیں اور کچھ رویے صرف محسوس کیے جاتے ہیں اور مقابل ولید حسن جیسا شخص جس کی Sense خاصی شارپ تھی۔

وہ اٹھ کر خود بھی کمرے سے نکل گیا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھا کہ اسے وہ راہداری میں صغریٰ کی کسی بات پر برستی دکھائی دی۔

"کیا حال ہے اور یہ کس بات کا غصہ ہے جو اس غریب پر نکل رہا ہے۔" وہ اسی طرف آ گیا اور اس کی بھوری بھوری آنکھوں میں برہمی کے تاثرات دیکھ کر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"سوری مجھے پتہ ہوتا کہ تم میرے جانے سے یوں شدید اداس اور ملول ہو جائو گی تو میں اپنا قیام وہاں مزید مختصر کر لیتا۔"

اس کا انداز شرارتی تھا وہ پوری اس کی سمت گھوم گئی۔

"کیا خوش فہمی ہے کوئی میں آپ کے بغیر مر نہیں رہی تھی۔ وہ تو بھابی اور مما بھی چلی گئی تھیں اس لیے۔" وہ دوسری سمت گھومی ہی تھی کہ ولید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ اس کے لمس کی شدت اس کے پور پور میں کرنٹ کی طرح دوڑ گئی تھی۔

"چلو ناراضگی ختم کرو۔ دوستی کر لیتے ہیں' یوں بھی اچھے دوستوں سے اتنی دیر خفا نہیں رہنا چاہیے بڑی محرومی ہے یہ۔"

اس نے اپنی سمت اشارہ کیا تھا۔ وہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اسے گھورنے لگی پھر مسکرا دی۔

"بڑے اچھے دوست ہیں اکیلے اکیلے سیر سپاٹے ہوتے ہیں' ارے ہاں آپ کو پتہ چلا نادیہ آپی کی بات طے ہو گئی ہے۔ عنقریب منگنی کی رسم ہونے والی ہے۔"

وہ یکدم ہی ساری ناراضگی بالائے طاق رکھ کر اسے انفارم کرنے لگی۔ ادھر صغریٰ موقع پا کر نکل بھاگی تھی۔

"نادیہ!" وہ ذرا سا چونکا۔

"سکندر بھائی کی سسٹر' تانیہ کی آپی۔"

"اوہ اچھا' اچھا کیا آیا تھا سکندر پھر۔" وہ اپنے کمرے کا دروازہ دھکیلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"جی بڑے دھماکے کر گئے ہیں۔"

وہ بھی اس کے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہو کر ہنستے ہوئے بولی تو وہ پلٹ کر استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"موصوف ایک کتاب لکھنا چاہ رہے ہیں' افلاطون کی یوٹوپیا سے انسپائر ہو کر کتنے دور کی کوڑی لائے ہیں یہ سکندر بھائی بھی۔ بہت Ambitious ہیں۔"

وہ تھری ڈور والی الماری کے آخری ڈور سے لگ کر اسے دیکھنے لگی۔

"اچھی بات ہے یہ تو کہ اب بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو مایوس نہیں ہیں بلکہ ہوپ فل ہیں اور شعاع امید لے کر دوسروں کو بھی روشنی دکھا رہے ہیں۔" وہ اپنی وارڈروب میں منہ دیئے بولا۔ اس کے لہجے

میں ہمیشہ کی طرح سکندر رضا کے لیے ستائش اور حمایت ہی تھی۔

"ہمیں ایسے لوگوں کی قدر کرنی چاہیے نہ کہ ان کے ارادوں اور عزم کا مذاق اڑانا چاہیے۔"

وہ شلوار سوٹ نکال کر اس کی طرف پلٹا تو وہ جو بہت غور سے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے پلٹنے پر نگاہوں کا تصادم ہوا' تصادم گو کہ خفیف سا تھا مگر وہ یوں گڑبڑا گئی جیسے جرم کر رہی ہو' نگاہوں کا زاویہ بدل کر پیچھے ہٹی تھی۔ اس کے خوب صورت رخساروں پر جانے کیوں خفت کی سرخی پھیل گئی۔ جو ولید نے پتہ نہیں محسوس کی یا نہیں۔

اسی دم صغریٰ نے کمرہ کا دروازہ بجا کر کھانے کی اطلاع دی اور الٹے قدموں واپس ہولی۔

"چلیں آپ بھی اب شاور کا ارادہ ترک کریں پہلے لنچ کریں۔ مجھے تو شدید بھوک لگ رہی ہے آنتیں قل شریف پڑھ رہی ہیں۔"

وہ اسے باتھ روم کی طرف بڑھتے دیکھ کر جلدی سے بولی اور پھر سرعت سے کمرے سے نکل گئی۔

وہ بھی شاور کا پروگرام ملتوی کرتا شرٹ کی آستین فولڈ کر کے ریسٹ واچ پر سرسری نظر ڈال کر کمرے سے باہر آگیا۔

X...X...X

عظمیٰ کو بڑے دنوں بعد دیکھ کر تانیہ بڑی خوش ہوئی۔ وہ اس کی پڑوسن تھی اور بے حد اچھے گھرانے کی پیاری سی لڑکی تھی۔ تانیہ کے علاوہ اماں اور نادیہ آپی بھی اسے بہت پسند کرتی تھیں۔

"آج کیسے راستہ بھول گئیں۔" وہ اسے لیے اندر کمرے میں چلی آئی۔

"میں تو پھر بھی آجاتی ہوں مگر تمہیں توفیق نہیں ہوتی' کون سا دور ہے گھر۔ صرف ایک گلی کا تو فاصلہ ہے اور پھر تمہارا بھائی نعمان تو اکثر اس طرف سے گزرتا ہے اسی کے ساتھ آجایا کرو۔"

"ارے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"میں اکیلی بھی آسکتی ہوں اسے دم چھلا بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں اگر تم چاہو تو اسے لا سکتی ہوں۔" وہ اس کی سمت جھکتے ہوئے شرارت سے بولی۔ تو عظمیٰ نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا۔

"ایسی فضول لڑکی سمجھ رکھا ہے مجھے' ارے ایسے نعمانوں کو تو پوچھتی ہے میری جوتی۔"

"اچھا بس بس زیادہ غصہ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے' میں آج ہی تمہاری طرف آنے کا سوچ رہی تھی نادیہ آپی کا جو رشتہ آیا ہوا تھا وہ منظور کر لیا ہے اماں اور سکندر بھائی نے۔ وہی خبر دینے آتی میں۔ اچھا ہوا تم آگئیں اب منگنی میں بھی آنا۔"

"ارے سچ یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔ ہیں کہاں نادیہ آپی۔" وہ اس خبر پر خوش دکھائی دینے لگی۔

"لگتا ہے صفیہ آپا کے علم میں آئی نہیں ہے یہ بات ورنہ پورے محلے میں نشر ہو چکی ہوتی۔"

وہ محلے کی رپورٹر صفیہ خالہ کی بابت بولی پھر دونوں ہنس پڑیں۔

"کہاں' ابھی کل ہی کی تو بات ہے' پہنچ جائے گی یہ خبر صفیہ آپا کو بھی۔"

"اے اپنی یہ صفیہ آپا ہیں بڑی جاسوسہ قسم کی خاتون۔ پڑوس کی ایک دیوار ہونے کے باعث سب سے زیادہ ہم ہی متاثر ہوتے ہیں ان کی جاسوسی سے' ابھی کل ابو بڑی آپا کے بیٹے کے لیے دو سوٹ لائے تھے پتہ نہیں کیسے صفیہ آپا کو خبر ہو گئی شام کو اماں سے کہنے لگیں مصطفی بھائی تو ماشاءاللہ نواسوں تک کا بھی دم بھرتے ہیں۔ کیا دام سے ملے سوٹ؟" پھر کھی کھی کرتی ہنس کر کہنے لگیں۔

"دراصل مجھے بھی اپنے نواسے کے لیے خریدنے ہیں نا اس لیے پوچھ رہی ہوں۔"

"نواسہ...؟" تانیہ' عظمیٰ کے انداز پر ہنستے ہوئے یکدم چونک کر بولی۔

"جی نواسہ' جن کی آمد اگلے مہینے متوقع ہے۔ انہیں علم ہو گیا ہے کہ نواسہ ہی ہو گا۔"

"اوہ مائی گاڈ پوری ڈرامہ ہیں صفیہ خالہ۔" وہ قہقہہ نہ روک سکی تھی۔

”سکندر بھائی سے کہوتانی کہ اخبار میں خبریں لگانے کا تردد کرنے کے بجائے اپنی صفیہ آپا کے کانوں میں ڈال دیا کریں' پورے شہر میں نشر ہو جایا کری گی ان کی خبریں۔ ایسا پاور فل میڈیا ہے۔“

”ہاں اب لگتا ہے یہی کرنا پڑے گا۔“

وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں کہ نومی یکدم اندر داخل ہوا پھر عظمیٰ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ عظمیٰ نے جلدی سے سر پر دوپٹہ کھینچ لیا تھا۔ وہ تو پلٹ کر باہر نکل گیا مگر جاتے جاتے ایک بھرپور نظر اس پر ڈال گیا تھا۔

”شاید کوئی کام ہو گا تم سے' بے چارے گھبرا کر نکل بھاگے۔“ عظمیٰ مسکرائی۔

”ہوں شاید۔“ تانیہ کھڑی ہو گئی گو کہ وہ جان گئی تھی کہ نومی جان بوجھ کر اندر آیا تھا حالانکہ عظمیٰ جہاں بیٹھی تھی وہ دروازے کے باہر سے بھی دیکھی جا سکتی تھی پھر کیسے نعمان کی نظر نہ پڑتی اور وہ بے خیالی میں اندر آ جاتا۔

”کوئی کام تھا کیا۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر باہر آئی تو نومی کو کولر کے پاس کھڑا دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”نہیں' نادیہ آپی سے کام تھا۔ سوری مجھے خیال نہیں رہا کہ اندر تمہاری سہیلی آئی بیٹھی ہے۔“

”نہیں کوئی بات نہیں۔ آپی تو نہارہی ہیں۔“

وہ واپس کمرے کی طرف پلٹنے لگی کہ عظمیٰ کی دلخراش چیخ سنائی دی۔ وہ بدحواس ہو کر بھاگ کر اندر آئی تو عظمیٰ صاحبہ تھر تھر کانپتی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیوار کو گھور رہی تھیں۔ جہاں ایک موٹی تازہ چھپکلی پر سکون انداز میں کسی مصور کے پورٹریٹ کی طرح چسپاں تھی۔ عظمیٰ کی دل دوز چیخ پر بھی گویا مطلق اثر نہ ہوا تھا۔

”یہ' یہ میری اس کرسی پر تھی ابھی' ہائے تانی میں مر گئی۔“ وہ مارے خوف کے بمشکل آواز کھینچ کر بولی۔ تانیہ اس کے وحشت زدہ چہرے کو دیکھ کر ہنسنے لگی۔ ادھر نومی بھی لپک کر اندر آ گیا تھا۔

”ارے چھپکلی سے کیا ڈرنا ابھی مار ڈالتا ہوں۔“

وہ بہادر ہیرو بننے کا ایسا گولڈن چانس کیسے مس کر دیتا۔ چپل اٹھائی اور چھپکلی کی طرف پیش قدمی کی۔ وہ دونوں گھبرا کر تیزی سے پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد تڑپتی ہوئی چھپکلی کے پاس نومی فاتحانہ انداز میں کھڑا تھا۔

"ہاہائے مر گئی یہ تو۔" عظمیٰ کو جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ نومی اتنا ماہر نشانہ باز بھی ہو سکتا ہے۔ پھر سکون کی گہری سانس بھر کر کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

"توبہ ہے لڑکی ایک چھپکلی نے جان ہی نکال دی تمہاری' شکر کرو سر پر نہیں چڑھ گئی تمہارے' ورنہ یہ نشانہ نومی کو تمہارے سر کا لینا پڑتا۔"

تانیہ کے ساتھ نومی بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ عظمیٰ' تانیہ کو گھورنے لگی۔

"چھپکلی سے زیادہ معصوم کوئی کیڑا نہیں ہوتا۔ اس بے چاری سے اتنا کیا ڈرنا۔" نومی چپل کھڑکی سے باہر برآمدے میں اچھال کر ان دونوں کی طرف آگیا۔

"جی اتنا ہی اس کی معصومیت پر پیار آرہا ہے تو اسے جیب میں لے کر گھومیں۔ آپ کو کون روکتا ہے۔"

عظمیٰ جل کر قدرے روانی میں کہہ گئی مگر دوسرے پل جھینپ کر تانیہ کو دیکھنے لگی۔

"مجبوری ہے کہ ہر پیاری لگنے والی شے کو جیب میں لے کر نہیں گھوما جا سکتا نا۔"

وہ اس پر ایک بھرپور نظر ڈال کر معنی خیز تبسم کے ساتھ بولا اور سرعت سے کمرے سے نکل گیا۔

عظمیٰ کے چہرے پر یکدم خفیف سی سرخی امڈ آئی۔ جبکہ تانیہ اس کی نگاہوں اور معنی خیز تبسم کو دوسرے لمحے سنبھل کر نظرانداز کرتے ہوئے۔ مردہ چھپکلی کو یہاں سے فوری اٹھانے کا سوچنے لگی۔

"پتہ نہیں مرد چھپکلیوں سے کیوں نہیں ڈرتے۔" وہ جھینپ کر کہہ رہی تھی۔

"شکر کرو نہیں ڈرتے۔ ورنہ آج یہ چھپکلی یہاں وہاں اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی ہوتی' تمہیں خوب ستاتی' ہو سکتا ہے تمہارے کپڑوں میں گھس کر..."

"ہائے تانی... میں تو مر جائوں۔"

اس نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔تانیہ نے جو نقشہ کھینچا تھا اس سے تو اس کی روح ہی فنا ہونے لگی تھی۔

”فکر مت کرو تم، اتنی آسانی سے نہیں مر سکتیں، نومی بھائی جو ہیں چپل سنبھالے۔“

تانیہ نے اسے چھیڑا پھر زبردست قہقہہ لگایا۔

”اوئے ہوئے ایک چھپکلی کیا مار لی نومی بھائی ہیرو ہو گئے۔“ اس نے منہ بنا کر مذاق اڑایا۔

تانیہ نے ڈسٹ بن میں جھاڑو سے چھپکلی کی لاش ڈال کر ڈسٹ بن جھٹکے سے اس کے آگے کیا تو وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹی۔

”مجبوری ہے گھریلو ہیرو تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔اب شیر تو گھروں میں آتے نہیں ورنہ میرا جی دار بھائی وہ بھی مار کر تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دے اور پھر اس کے سینے پر اپنا ایک پیر رکھ کر گھٹنے پر کہنی ٹکا کر جھک کر یہ گانا گائے۔

کیا ہے جو پیار تو پڑے گا نبھانا

رکھ دیا قدموں میں شیر نذرانہ

قبول کر لو، ہائے ہائے قبول کر لو

”ویسے ملاحظہ کیجئے یہ چھپکلی بھی شیر کے بچے سے کم نہیں ہے۔“

تانیہ ڈسٹ بن میں پڑی چھپکلی کا معائنہ کرنے لگی۔ عظمیٰ بے تحاشہ ہنستی ہوئی کمرے سے نکل بھاگی پھر صحن میں کھڑے ہو کر باآواز بلند بولی۔

”میں جا رہی ہوں بے ہودہ لڑکی! تم دفناتی رہو اپنے ہیرو بھائی کے کارنامے کو۔“

”اچھا سنو سنو۔“ وہ باہر نکلی پھر ہنستے ہوئے بولی۔

”پرسوں ضرور آنا۔آپی کے سسرال والے آ رہے ہیں نارسم کرنے منگنی کی، دیکھو آنا ضرور... ورنہ یہ چھپکلی بھی تمہیں معاف نہیں کرے گی۔“

تانیہ نے چیخ کر کہا تو وہ سر ہلا کر دروازے سے نکل گئی۔نادیہ آپی غسل خانے سے نکلتے ہوئے حیرت سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھیں۔

"کتنے دنوں کا اکٹھا نہار ہی تھیں آپی! میرا تو خیال تھا اب آپ رات کو ہی برآمد ہوں گی۔ گھریلو سوئمنگ پول سے۔" وہ بیسن میں ہاتھ دھو کر تولیہ نادیہ آپی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ وہ جھینپ گئیں۔

"ابھی عظمیٰ آئی تھی۔" اس نے اطلاع فراہم کی۔

"وہ تو میں نے بھی دیکھا مگر یہ تم دونوں کیا الٹی سیدھی ہانک رہی تھیں۔ کیا معاملہ ہے۔"

انہوں نے گیلے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا اور پیروں میں چپل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

تانیہ نے ایک گہری سانس لی۔

"معاملہ خاصا گڑبڑ ہے پیاری آپی!" اس کے تصور میں نومی کا چہرہ لہرا گیا۔ اس کا معنی خیز تبسم اس کی آنکھوں کی وارفتگی، تانیہ کو محسوس ہوا کہ نومی کی آنکھوں میں جذبوں کی شدید لپک تھی۔ اسے نومی کی یہ حرکت پہلی بار بری نہیں لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس نے اس کے چہرے سے سچائی جھلکتی دیکھ لی تھی اور دوسرا عظمیٰ خود اسے بہت پسند تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ گہری سانس بھر کر مسکراتی چل دی۔ نادیہ آپی نے اس پر ایک نظر ڈالی اور قطعاً دلچسپی نہ لیتے ہوئے سر جھٹک کر گیلا تولیہ سوکھانے کے لیے پچھلے برآمدے کی طرف پلٹ گئیں۔

X...X...X

وڈیرہ مردان علی شاہ کا چہرہ غیض وغضب سے مسخ ہو رہا تھا۔

کڑکڑاتے شلوار قمیص میں، کندھے پر چادر ڈالے، ہاتھ میں سگار پکڑے، مشتعل سا ادھر ادھر چک پھیریاں کھا رہا تھا۔ جیسے کچھار میں بھوکا غصہ سے بھرا شیر۔

پھر رک کر سگار لبوں میں دبا کر نکالا اور ناگواری سے بھرپور آواز میں بولا۔

"ایک معمولی سا کام تم لوگوں سے ہوتا نہیں ہے صرف حرام کا کھا کھا کر کاہل، سست اور عقل سے پیدل ہو چکے ہو۔ بولو کیا اب میں خود اس احمق، گاؤدی، دو ٹکے کے پروفیسر کے پاس چل کر جاؤں جس کی حیثیت میرے نزدیک ایک چیونٹی سے بھی زیادہ نہیں ہے۔ بابا توقیر! تم کیا کھڑے منہ تک رہے ہو۔ یہ سب تمہارے پالے ہوئے حرام خور ہیں جو کسی کام کے نہیں ہیں۔ اس دن کے لیے پالا تم نے انہیں؟"

ایک طرف کھڑا توقیر شاہ کا منیجر وڈیرہ مردان علی شاہ کی پھٹکار سر جھکائے سن رہا تھا جس کا رخ اب اپنے ہی بیٹے توقیر شاہ کی طرف ہو گیا تھا۔

"یہ سمجھتے ہیں تعلیم ان کی عقلیں ٹخنوں سے نکال کر سر میں ڈال دے گی۔اب کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو' جائو دفع ہو جائو۔"

وہ آگے آئی چادر کا کونا غصے سے کندھوں پر ڈال کر دھاڑا۔

"سائیں وہ بڑا ضدی پروفیسر معلوم ہوتا ہے۔آج وائس چانسلر کے آفس میں بلا کر بھی میں نے اس سے بات کی۔ مگر وہ اس موضوع پر بات کرنے کے حق میں ہی نظر نہیں آتا۔خود چانسلر صاحب

بھی میری حمایت کر رہے تھے مگر وہ تو ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ میں اصول پر سودے بازی نہیں کرتا۔اپنے سائیں سے کہہ دو کہ لڑکے نے جو کام کیا ہے ویسے ہی نمبر بھی ملیں گے۔"

اس نے پروفیسر زبیری سے ہونے والی گفتگو کا مختصر احوال بتایا جس نے مردان علی شاہ کے چہرے کو مزید مسخ کر دیا۔اس نے ہاتھ اٹھا کر منیجر کو قہر برساتی نظروں سے دیکھتے ہوئے جانے کا اشارہ کیا پھر توقیر شاہ کی طرف مڑا۔

"اس... پروفیسر کو شاید خبر نہیں ہے کہ اکبر شاہ کس کا بیٹا ہے۔"

"خبر تو ہے باباسائیں... مگر شاید اچھی طرح خبر نہیں ہے۔"

توقیر شاہ کے مونچھوں تلے لب خفیف سے پھیل گئے۔پھر وہ الجھن بھرے انداز میں بولا۔

"باباسائیں!آپ نے ویسے بھی اکبر شاہ کو بہت زیادہ کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔اسے ذرا کنٹرول کیجیے اس کا روز نیا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے ہمارے سروں پر۔"

"تم کیا اس پروفیسر کی حمایت کر رہے ہو۔"

مردان علی نے بیٹے کو طیش کے عالم میں دیکھا تو وہ جلدی سے نخوت سے سر جھٹک کر بولا۔

"توبہ کیجیے باباسائیں!ابھی پاگل کتے نے نہیں کاٹا' مگر میں یہ بات اس لیے کر رہا ہوں کہ اکبر شاہ کی حرکتیں اس کی نادانیاں ہمارے سیاسی کیریئر پر اثر انداز ہوتی ہیں۔وہ ناسمجھ ہے

اسے اتنی آزادی دینا نقصان دہ ہو سکتی ہے اور پھر گوٹھ میں سب چل جاتا ہے مگر شہر میں شہروں کے اپنے کچھ قاعدے اصول ہیں۔ صحافی برادری الگ جان کو آجاتی ہے' ابھی ہفتہ بھر پہلے کی بات ہے اس نے ہوٹل میں ہلا گلا کر کے توڑ پھوڑ مچائی تو وہ خبر میں نے معاملہ دبا دیا مگر یہ اچھا تو نہیں ہے نا بابا سائیں! اب وہ بچہ بھی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے بابا! میں اسے سمجھا دوں گا مگر پہلے یہ مسئلہ تو حل کرو۔ اگر وہ اپنے اس پرچے میں رہ گیا تو بڑی شرمندگی اور بدنامی کی بات ہے۔ دوسرے پرچوں کی تو خیر ہے پتہ نہیں یہ بے وقوف اڑیل پروفیسر کہاں سے سر دکھانے چلا آیا۔"

مردان علی شاہ صوفے پر بیٹھ گیا' وہ سخت جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔

"اس معاملے کو آپ مجھ پر چھوڑ دیں بابا سائیں!"

"مگر میں چاہتا ہوں یہ سب افہام و تفہیم سے ہو جائے۔" وہ الجھ کر بولا۔

" ہو جائے گا ایسے ہی ہو جائے گا' پیسے میں بڑی طاقت ہے بابا سائیں! ابھی ہم نے آفر ہی کہاں دی ہے اسے۔ یوں بھی جب پیسہ بولتا ہے تو بڑے بڑے اصول' قانون خاموش ہو جاتے ہیں ان کی زبانوں پر قفل لگ جاتے ہیں۔"

توقیر شاہ کے لبوں کے ساتھ آنکھوں میں بھی مکروہ سی مسکراہٹ چمک رہی تھی۔

"سائیں! ماسٹر دین محمد کا بیٹا آیا ہوا ہے۔"

کمدار نے اندر جھانک کر اطلاع دی۔ توقیر شاہ نے چونک کر مردان علی شاہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں اسے بھیجو اندر۔" مردان علی شاہ نے سگار سلگاتے ہوئے کمدار کو جواب دیا۔

"ماسٹر دین محمد کے بیٹے کو آپ نے بلوایا ہے؟ خیریت؟" توقیر شاہ نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"ہوں خیریت ہی ہے آئو آئو یوسف۔" وہ اندر داخل ہوتے ہی دین محمد کے بیٹے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"سلام سائیں آپ نے یاد فرمایا تھا مجھے۔"

وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر وڈیرہ مردان علی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے لہجے میں کچھ خوف تھا۔

"بیٹھو بابا بیٹھو۔"

"سائیں کوئی خطا تو نہیں ہو گئی ہم سے۔" اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر جھجک کر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اپنا خدشہ ظاہر کیا تو مردان علی شاہ...دوستانہ انداز میں مسکرا دیا۔

"نہ سائیں خطا کوئی نہیں ہوئی' بس چند باتیں کرنی ہیں تم سے۔ یہ بتاؤ آج کل تمہارا روزگار کیا ہے۔ بابا پڑھے لکھے لڑکے ہو ہاری کی طرح کام کرنے میں شرم محسوس کرتے ہو گے۔"

"نہ سائیں محنت میں شرم کیسی۔" وہ جلدی سے بولا۔

"بس جی ماسٹری ہی میرا روزگار ہے آپ تو جانتے ہیں سکول میں سہولیات کا فقدان ہے اس لیے بچے بھی چند ایک ہیں۔"

وڈیرہ مردان علی نے ایک ہنکارا بھرا اور صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

"دیکھ یوسف پٹ یہ سکول وسکول کا چکر چھوڑو کیوں خود کو چند بچوں کے لیے خوار کر رہے ہو اور میں نے تمہیں اسی سلسلے میں بلوایا ہے کہ یہ سکول خالی کروانا ہے۔"

"جی جی۔"

یوسف بے چارا ہکا بکا مردان علی شاہ کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"مگر سائیں یہ بچے کہاں جائیں گے جو..."

"کیا ان سب کا ٹھیکہ تم نے لے رکھا ہے۔"

توقیر شاہ بھبک کر بولا تو وہ بے چارہ دہل گیا جبکہ مردان علی شاہ نے توقیر شاہ پر ایک نظر ڈالی انہیں اس کا یوں بے موقع بھبکنا کچھ ناگوار محسوس ہوا تھا۔ تاہم کسی قسم کی سرزنش کی کوشش نہ کی اور اپنے سابقہ لہجے میں بولا۔

"ہم اس گوٹھ کے بڑے ہیں' یہ ساری باتیں سوچنے کی ہماری ہیں اور ہم سوچتے ہیں۔ فی الحال تم فارغ کرو بچوں کو۔ ہم اس سے بہتر جگہ چاہتے ہیں سکول کے لیے جہاں ہر سہولت ہو۔"

" وہ جی ولید صاحب نے بھی۔"

یوسف نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بے اختیار بولتے ہوئے زبان دانتوں میں دبالی۔ پھر گھبرا کر انگلیاں چٹخانے لگا۔

مردان علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

’’ولید کون ولید؟‘‘

’’وہ... آپ کے مہمان جی! وہ بھی آئے تھے سکول کا معائنہ کرنے۔‘‘ یوسف کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مردان علی شاہ نے ایک گہری سانس بھری‘ اس کے چہرے کے زاویوں میں تحیر تھا۔اس نے آنکھیں سکیڑ کر یوسف کو دیکھاتاہم کچھ کہنے پوچھنے سے گریز کیا۔

’’ٹھیک ہے تم جائو اور ہاں کل یہ سکول کھلا نظر نہ آئے۔‘‘ وہ سگار سلگاتے ہوئے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

یوسف سر جھکا کر باہر کی راہ لیتے ہوئے ذرا سا جھجک کر بولا۔

’’سائیں نیا سکول اندازاً کب تک کھلے گا‘ میرا مطلب ہے۔‘‘

’’ہاں ہاں بہت جلد۔‘‘ وہ گہری سوچ سے نکل کر بولا تو وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

’’ولید حسن کو جا کر سکول کا معائنہ کرنے کی کیا ضرورت تھی باباسائیں! یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘ یوسف کے باہر نکلتے ہی توقیر شاہ بگڑے لہجے میں بولا۔

’’سمجھ میں تو میری بھی نہیں آئی خیر ہمیں تردد کی ضرورت نہیں ہے اور تمہیں بھی یہ فکریں پالنے کی ضرورت نہیں ہے۔پہلے تم اکبر کے پرچے کا کچھ کرو‘ پھر سے پروفیسر سے معاملہ طے کرو اور پھر دوسرا کام یہ کرنا ہے کہ اپنے چند آدمیوں کو کہو کہ اس سکول پر فی الوقت اپنا قبضہ کر لیں۔‘‘

مردان علی شاہ صوفہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

’’میرا خیال ہے باباسائیں! میں ذاتی طور پر اس پروفیسر سے مل لیتا ہوں۔دوٹوک بات ہو جائے۔مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے جب معاملہ ربڑ کی طرح کھنچنے لگتا ہے۔ڈور کاٹ دو یا کھینچ لو۔میں تو اس کا قائل ہوں۔‘‘

مردان علی شاہ مبہم سے انداز میں مسکرا دیئے۔

’’جوانی میں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔عمر کے ساتھ ٹھہرائو آتا ہے مزاج میں۔جب رگوں میں خون بھی ٹھہر ٹھہر کر دوڑتا ہے۔‘‘ وہ اس کا کاندھا تھپک کر باہر نکل گئے۔

X...X...X

"افوہ آخر تم لوگ مجھے حسین بنانے پر کیوں تل گئی ہو' میں جو ہوں' جیسی ہوں کی بنیاد پر ہی پسند کریں تو ٹھیک ورنہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔"

"خیر خیر' جو ہیں جیسی ہیں کی بنیاد پر ہی پسند کر گئے ہیں وہ لوگ احمق آپی مگر منگنی شنگنی میں تو بندے کو ذرا مختلف اور سب سے منفرد نظر آنا چاہئے نا یعنی حسین ترین۔ آخر حرج ہی کیا ہے کہ کوئی آپ کی

چکا چوند سے خوش ہو رہا ہے تو؟ آپ ایک ساتھ اتنے دل تو نہ توڑیں۔"

نادیہ آپی نے بے بسی اور خفگی کے مشترکہ احساس کے ساتھ شہرینہ کو گھور کر دیکھا جس کی آنکھوں میں گویا ان کے لیے شہد ہی ٹپک رہا تھا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑیں۔

"یہ ایک میرے پارلر نہ جانے سے بھلا دل کیوں ٹوٹنے لگے۔ سچی شیری مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے پارلر والر جانے سے۔ گھنٹہ بھر بیٹھو اور کوئی آپ کے منہ پر اپنی مرضی سے ڈیزائننگ کرتا رہے' پلاسٹر ملتا رہے۔"

تانیہ کا تو دل اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا۔ شہرینہ کے حوصلے اور ضبط کی داد دینے کو دل چاہا جو گھنٹہ بھر سے بلکہ صبح سے ان کی ناقص العقل آپی سے الجھ رہی تھی۔

شہرینہ کو تانیہ نے صبح بلوایا تھا ایک تو نادیہ آپی کو مہندی سے کوفت ہوتی تھی مگر جب مونا بھابی مہندی والی کو پکڑ کر ساتھ ہی لے آئیں تو وہ مجرموں کی طرح سر جھکا کر ایک کونے میں دبک کر مہندی لگوانے بیٹھ گئیں۔ دونوں ہاتھوں میں اب تک لگ چکی تھی اب ان کے دونوں شفاف پیر پٹائی پر دھرے تھے جن پر مہندی والی فرش پر بیٹھ کر کون سے دلکش ڈیزائن بنا رہی تھی۔

یہ ان کے گھر کی پہلی خوشی تھی تانیہ کی بڑی پھوپھو اور خالہ صفیہ اماں کے ساتھ دوسرے بکھیڑے سمیٹ رہی تھیں۔ باہر سکندر ولید کے ساتھ مل کر کل کے فنکشن پر ڈسکس کر رہا تھا۔ گھر میں گنجائش کم ہونے کے باعث گلی میں شامیانے لگانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے کئی چھوٹے موٹے کام تھے جو وہ صبح سے نمٹا رہے تھے۔ اندر ان لوگوں نے رونق لگا رکھی تھی۔ تانیہ نے ٹیپ فل آواز میں کھول رکھا تھا' مونا بھابی بھی یہیں تھیں اور اپنی مہندی پنکھے کے نیچے کھڑی سوکھا رہی تھیں۔ ان کا کہنا تھا وہ بچوں والی ہیں اس لیے جلدی مہندی سوکھا کر انہیں واپس بھی جانا ہے اور اپنے جانے کی ذمہ داری انہوں نے ولید پر ڈال رکھی تھی۔

"میں تو کہتی ہوں اسے بھوتنی بن کر بیٹھا رہنے دو' دولہا لگے گا اپالو اور یہ لگے گی بالکل چغد۔" مونا بھابی نے کہا۔

"ایویں اپالو لگے گا' دیکھا ہوا ہے میرا۔" نادیہ آپی منہ بنا کر بولیں تو وہ تینوں ہنسنے لگیں۔

"اللہ رے! کہاں سے دیکھ لیا؟ ابھی تو سات پردے حائل ہیں درمیان میں' اسے کہتے ہیں چھپا رستم۔"

"جی نہیں تصویر دیکھی ہے۔" وہ جھینپ کر جلدی سے مونا بھابی کو وضاحت پیش کرنے لگیں تو وہ ابرو کو جنبش دے کر معنی خیز تبسم سے اسے دیکھنے لگیں۔

ہوں تو تصویر رکھی ہوئی ہے پھر تو یہ گانا بھی گاتی ہو گی کہ:

ذرا تصویر سے تو نکل کر سامنے آ

میری محبوبہ میری محبوبہ

بھابی ترنم میں گانے لگیں۔ وہ جھینپ کر سر جھکا کر اپنے پیر کے ڈیزائن دیکھنے لگیں۔

مہندی والی جیسے ہی نادیہ آپی سے فارغ ہوئی شہرینہ نے جھٹ سے اپنے ہاتھ آگے کر دیئے۔ جس پر تانیہ نے اسے دھپ رسید کی جبکہ بھابی چیخنے لگیں۔

"دیکھو دیکھو اس بے صبری کو ابھی مجھے کہہ رہی تھی کہ میں مہندی تھوپ کر بیٹھ گئی ہوں تاکہ کام نہ کرنا پڑے۔ اب جو تم تھوپنے لگی ہو۔ چلو ہٹو پہلے مجھے ذرا اس ہاتھ کو پورا کروانے دو۔ بس ذرا سا رہتا ہے۔"

"کتنا تھوپیں گی' وسیم بھائی کے کام کیا صغریٰ کرے گی۔"

وہ جس طرح پھیل کر بیٹھی تھی ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ نادیہ آپی ہنسنے لگیں جس پر شہرینہ انہیں دیکھ کر بولی۔

"زیادہ ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے' بس اب کل آپ کو ہر حال میں پارلر لے جائوں گی' کوئی چوں چرا نہ ہو گی آپ کو پتہ ہے میں نے اپائنٹمنٹ بھی لے لیا ہے۔"

"کیا آ۔" نادیہ آپی نے جزبز ہو کر کچھ کہنا چاہا کہ اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر ان کے منہ پر رکھ دیا۔

"باس... فکر مت کریں چہرے پر کوئی لیپا پوتی نہیں ہو گی صرف چہرہ بدل جائے گا۔ یہ خوب صورت چہرہ اور خوبصورت ہو جائے گا اور مووی شووی اچھی آ جائے گی اور زیادہ سے زیادہ کچھ لوگوں کے دل پہلو میں خوش ہو جائیں گے۔"

نادیہ آپی سر پکڑ کر رہ گئیں۔ اپنے بچاؤ کے سارے ہتھیار ناکارہ ہو گئے تھے۔

تانیہ کی پھوپھی زاد اور صفیہ خالہ کی بیٹیاں آئیں تو تانیہ ڈھول لے کر بیٹھ گئی۔

"یااللہ اب یہ بھی برداشت کرنا ہو گا مجھے۔" نادیہ آپی یوں بوکھلا کر پھر ٹھنڈی سانس بھرنے لگیں کہ تانیہ انہیں گھور کر رہ گئی جبکہ شہرینہ اپنی بے ساختہ اٹھنے والی ہنسی کو نہ روک سکی اور پھر مہندی سے فارغ ہو کر اسی طرف آ گئی اور ڈھول پر ایک ہاتھ سے دھپ مارتے ہوئے بولی۔

"اب تو بہت کچھ برداشت کرنا ہو گا۔ آپ کی ڈور ہمارے ہاتھ میں ہے۔"

"اوں ایسے ہی ڈور ہاتھ میں ہے۔ بس یہ پاؤں کی مہندی سوکھ جانے دو۔"

انہوں نے بے بسی سے پیروں کی طرف دیکھا تو وہ انہیں مزید چڑانے کے لیے عظمیٰ کی تھاپ پر لہک لہک کر گانے لگی۔

یہ محفل جو آج سجی ہے اس محفل میں

ہے کوئی ہم سا' ہم سا ہو تو سامنے آئے

اس کا انداز بے حد خوب صورت تھا۔ نادیہ آپی بجائے چڑنے کے دلچسپی سے اسے دیکھنے لگیں۔ سیاہ جارجٹ کے سرخ ایمبرائیڈری والے سوٹ اور سرخ اور سیاہ ٹائی اینڈ ڈائی کے دوپٹے میں اس لمحے وہ بے انتہا دلکش اور دل موہ لینے والی دکھائی دے رہی تھی۔

کانوں میں ہیروں کے سیاہ اور سفید نگوں کے ٹوپس دمک رہے تھے' اس کے بھورے بال لمبی چوٹی کی صورت میں تھے جس سے ایک لٹ نکل کر رخسار کو چھو رہی تھی۔

آنکھ اٹھا کر ہم جو دیکھیں پتھر کا بھی دھڑکے سینہ

آنچ ہمارے حسن کی پا کر شعلوں کو آتا ہے پسینہ

کمرے میں داخل ہوتا ولید دروازے پر ہی ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

دھیمے دھیمے بجتے ڈھول کی لے کے ساتھ اس کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی، آنکھوں میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی جو نادیہ آپی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ وقفے وقفے سے کشادہ ہو جاتی۔

وہ دلچسپی کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔

پھول سے ہم نے خوشبو چھینی، سیپ سے ہم نے موتی پائے

ہے کوئی ہم سا، ہم سا ہو تو سامنے آئے

"تو لو آگئے سامنے، بلکہ مقابلہ پر۔" تانیہ کی نظریں یک بیک ولید پر گئی تھیں، کچھ ولید کی محویت بھی اس نے چپکے سے نوٹ کی تھی پھر مسکرا کر شہرینہ کو دیکھا۔

ولید جلدی سے سنبھل گیا تھا۔ شہرینہ نے رخ موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور جھینپ کر جلدی سے خاموش ہو گئی سب کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

"لیجئے سنبھالیے اپنی دختر نیک اختر کو۔" وہ ان سب کی ہنسی کو نظر انداز کر گیا اور طوبیٰ کو بھابی کی سمت بڑھایا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ارے اسے کہاں سے پکڑ کر لے آئے۔ میں تو اسے گھر چھوڑ آئی تھی۔" بھابی طوبیٰ کو دیکھ کر چکرا گئیں۔ اس پر مستزاد ولید نے کچھ اس بے ہنگم انداز میں ڈیڑھ سالہ طوبیٰ کو اٹھا رکھا تھا بلکہ اٹھایا کیا تھا اسے اپنے ایک ہاتھ سے لٹکایا ہوا تھا جس پر وہ رو رہی تھی بھابی کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

"گھر گیا تو وسیم بھائی اسے لیے ٹہل ٹہل کر چپ کرانے کی کوشش فرما رہے تھے پھر لامحالہ اسے میرے ہمراہ کر دیا۔ یہ کہہ کر اس بلا کو لے جائو۔"

"بلا تو نہیں کہا ہو گا انہوں نے اسے۔" وہ اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

"تو پھر آپ کو کہا ہو گا شاید کہ بلا کے پاس لے جائو۔"

اس نے اطمینان سے کسی بیٹ کی طرح طوبیٰ کو لہرایا تو بھابی کے ساتھ شہرینہ کی بھی چیخ نکل گئی، اس کی تو جان تھی طوبیٰ۔

"کیا کر رہے ہیں یہ آپ، ابھی دیوار سے ٹکرا جاتی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بے ساختہ طوبیٰ کو لپک کر اٹھا لیا۔

دوسرے پل طوبیٰ تو ہاتھ میں تھی مگر اپنے ہاتھ کی درگت دیکھ کر اس کی لپکتی جھپکتی ساری محبت دم توڑ گئی۔ بھابی نے جلدی سے منہ پھیر کر اپنی امڈنے والی ہنسی کو روکنے کی کوشش کی اور وہ طوبیٰ کو غصے میں نادیہ آپی کے برابر ان کے بیڈ پر پٹخ کر ہاتھ کا حشر انتہائی آزردگی سے دیکھنے لگی۔

"اسے کہتے ہیں شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار۔"

ولید کی بات پر وہ جل کر رہ گئی۔ وہ سب الگ کھی کھی کر رہی تھیں۔

"یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔" وہ مارے غصے کے احتجاجاً کمرے سے واک آؤٹ کر گئی۔

"شیری! بات تو سنو' دھو نامت ہاتھ۔"

بھابی کا دل پسیج گیا وہ چلائیں۔ تانیہ بھی اسے آواز دینے لگی۔

"اب اتنا زیادہ نقصان بھی نہیں ہوا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کی بھاری آواز پشت سے ابھری۔ اس کے تپے تپے چہرے کو دیکھ کر وہ خاصا محظوظ ہو رہا تھا اور دروازے سے باہر نکل کر دیکھا وہ آنسو بہاتے ہوئے بیسن پر ہاتھ دھو رہی تھی۔

"اب ہٹو کیا کھڑے ہنس رہے ہو' بجائے تسلی دینے کے مزید چڑا رہے ہو۔"

مونا بھابی اسے دروازے میں پھیل کر کھڑے کسی دلچسپ فلم کی طرح اس منظر کو دیکھتے ہوئے کلس کر رہ گئیں اور اسے ایک طرف دھکیل کر باہر نکلیں۔

"خدا تم جیسا کٹھور دیور کسی کو نہ دے' میری بچی کی جان ایک کر دی اور اب اس بے چاری کے رونے پر محظوظ ہو رہے ہو۔" روتی بلکتی طوبیٰ کو بھابی بغل میں دبائے ہوئے تھیں۔

"لیجئے میرے اتنے قصور نکل آئے۔ اپنے مجازی خدا کو جا کر کہئے جس سے ایک بچی نہیں سنبھل سکتی۔"

وہ ان کے لگائے گئے الزام پر تڑپنے کی مصنوعی ایکٹنگ کرنے لگا۔

"آخر وہ بھی تمہارا ہی سگا ہے نا تمہاری صنف کا۔ دونوں بے درد کٹھور۔"

وہ جھنجھلا کر شہرینہ کی طرف آئیں جو مہندی دھوئے جارہی تھی اور آنسو بھی بہائے جارہی تھی۔

تانیہ اور عظمیٰ بھی اس کے پیچھے آئیں۔

چند لمحوں بعد وہ اپنے پھیکے پھیکے ہاتھ میں ابھرنے والے ڈیزائن کو دیکھتے ہوئے سب کے جلو میں اداس حسینہ بنی کمرے میں داخل ہوئی تو ولید بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ کو نہ روک سکا تھا جبکہ اس نے کھا جانے والی نظروں سے اس کے خوبصورت متبسم چہرے کو دیکھا۔

وہ صوفے پر اطمینان سے بیٹھا ہوا اس لمحے اسے سخت زہر لگا۔ یکدم دماغ میں نہ جانے کیا سمائی اس نے آئو دیکھا نہ تائو جھک کر فرش پر رکھی پلیٹ سے ایک مہندی کا کون اٹھایا اور اسے مٹھی میں دبا کر پریس کرتے ہوئے اس کا رخ ولید کی طرف کر دیا۔ مہندی کی لمبی پتلی سے دھار فضا میں بلند ہوئی اس کی طرف اڑی یہ حملہ بالکل اچانک ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتا نعمان گھبرا کر الٹے پیروں مڑ گیا جبکہ ولید ایک جھٹکے سے یوں کرسی سے اٹھا جیسے اس کے نیچے کسی نے انگیٹھی جلا دی ہو۔

”شیری!... شیری! یہ کیا بدتمیزی ہے۔“ مونا بھابی زور سے چلائیں۔

تانیہ اور دوسری لڑکیاں فضا میں اڑاڑ کر گرنے والی مہندی سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں جبکہ اس کا نشانہ صرف ولید حسن تھا جو اس افتاد پر گھبرا کر دھاڑا۔

”شیری کیا کر رہی ہو۔“

”اور ہنسئے... خوب ہنسئے۔“ وہ اس کے شفاف بے داغ کرتے پر مہندی کے چھینٹے اور اسے بدحواس دیکھ کر کھلی جارہی تھی کہ یکدم وہ یہاں سے وہاں بچنے کے لیے بھاگنے کے بجائے اس کی طرف بڑھا اور دوسرے پل اس کے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں کے مضبوط شکنجے میں تھے۔ کون اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ جسے نادیہ آپی نے جلدی سے اٹھا لیا۔

کمرے میں پھیلی افراتفری میں یکدم ٹھہرائو آگیا۔ وہ بے قابو اب ولید کے شکنجے میں تھی۔

شہرینہ خود کو چھڑانے کی بھرپور جدوجہد کرنے لگی۔

”جاہل لڑکی! تمہیں تو بورڈنگ میں بھیجنا چاہیے۔ ابھی تربیت کی ضرورت ہے۔“

اس کا ہاتھ پشت کی طرف لے جا کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے ولید نے ترشی سے اسے گھورا۔ اس جھٹکے سے اس کی چیخ نکل گئی۔

"اف... چھوڑیں میرا ہاتھ آپ کو ہو گی بورڈنگ کی ضرورت۔ فار گارڈ سیک چھوڑیں میرا ہاتھ ہائے امی... اوف۔" وہ چلانے لگی۔

"اب بتاؤ کرو گی ایسی فضول حرکت۔"

وہ اسے گھورتے ہوئے غرایا اور اسے دیوار سے لگا کر ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط کر دی۔

اس کی بھوری بھوری آنکھوں میں مارے تکلیف کے آنسو آ گئے تھے جو ٹپ ٹپ کرتے رخساروں پر پھسل پڑے۔ یوں جیسے کرسٹل کے موتی نرم مخمل پر بکھر جائیں۔

تکلیف اور بے بسی کے احساس سے رخسار الگ لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔ "بتاؤ اب کرو گی ایسی بدتمیزی؟" وہ اس کے بالکل قریب ہی کھڑا تھا اور اپنی خشمگیں نگاہوں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ تب وہ ضدی لہجے میں اپنے اندر کا خوف چھپانے کے لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلائی۔

"کروں گی... کروں گی۔ کیا کرلیں گے آپ؟"

آنسوؤں سے لبریز روشن آنکھیں ولید کو گھورتی ہوئی نگاہوں سے ٹکرائیں تو جانے کیوں اس نے یکایک گھبرا کر نظریں تپتے تپتے چہرے سے ہٹا کر دیوار پر جما دیں۔

اسے لگا جیسے کسی احساس کی چٹان سے کوئی ٹکڑا ٹوٹ کر دل کے تالاب کی پرسکون سطح میں گرا ہو اور پانی منتشر ہو کر پھیل کر چاروں کناروں سے جا ٹکرایا ہو۔ اس کا وجود بھی پانی کی مانند سا گیا۔ وہ یکدم اسے دیوار پر دھکیل کر پیچھے ہٹ گیا اور ادھر وہ اس کی گرفت سے نکل کر تیزی سے بھاگی جیسے پکڑ لیے جانے کا ڈر ہو۔

"بدتمیز جنگلی لڑکی۔" وہ بڑبڑاتا ہوا پیشانی پر شکنیں ڈالتا کمرے سے نکل گیا تھا۔

بھابی نے بھی ایک سکون کی سانس لی اور مسکراتی اس کی طرف آئیں اور اسے ایک ہاتھ رسید کیا۔

"کسی دن تم ولید کے ہاتھوں بری طرح پٹو گی شیری! اپنی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے' اس بار تو معاف کر دیا اس نے۔"

مگر وہ لاپرواہی سے کندھے اچکا کر ہاتھ ہلاتے ہوئے نادیہ آپی کے برابر بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ کندھا اس بری طرح دکھ رہا تھا جیسے کوئی منوں بوجھ اس پر لاد دیا گیا ہو۔

X...X...X

"آج مجھے وڈے سائیں نے حویلی بلایا تھا۔"

ماسٹر دین محمد کے بیٹے یوسف نے چنگیز سے روٹی نکالتے ہوئے ماسٹر دین محمد کو بتایا جو چارپائی پر چت لیٹا خلا میں گھور رہا تھا۔

"ہوں... خیر تو ہے اختر رسول بتا رہا تھا مجھے کہ یوسف کو وڈے سائیں نے بلایا ہے۔ خیر تو ہے کیا خطا ہو گئی ہم لوگوں سے۔"

وہ ہنکارا بھر کر بیٹھ گیا۔ لہجے میں ایسی ہنسی در آئی جیسے وہ خود پر ہنس رہا ہو۔

"اس بار خوش خبری لے کر حویلی سے آیا ہوں، پہلے پہل تو میں بھی یہی سمجھا کہ جانے کیا قصور ہو گیا مجھ سے جس کی بازپرس ہوئی ہے پر ایسا کچھ نہیں تھا۔"

خوشخبری کیسی خوشخبری۔" ماسٹر دین محمد کی بہو شوہر کی بات پر چونک کر موڑھا کھسکا کر قریب آ گئی۔

"کیسی خوش خبری یوسف!"

"تو چپ کر۔" اس نے آنکھیں دکھائیں تو وہ دبک کر دھاگوں میں الجھ گئی مگر فطری تجسس کے مارے کان ادھر ہی رکھے جبکہ وہ ماسٹر دین محمد سے کہہ رہا تھا۔

"تم سن رہے ہو بابا!"

"ہاں ہاں سن رہا ہوں بلکہ حیرت میں گنگ ہوں کہ حویلیوں سے بھی ہم کمی کمین کے لیے خوشخبریاں آتی ہیں، چل بتا کیا خیر کی خبر سنانے تجھے وڈیرے نے بلوایا تھا۔ کیا کوئی اراضی کوئی پلاٹ تیرے نام کر دیا ہے۔ خوش تو تو یوں ہی دکھائی دے رہا ہے۔"

وہ چارپائی پر پیر لٹکا کر بیٹے کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"تم نے تو بابا مجھے ہمیشہ یہ سبق پڑھایا ہے کہ اپنے ذاتی دکھ سکھ اجتماعی دکھ سکھ سے استوار رکھو۔ وہ مجھے پلاٹ ولاٹ دیتا تو اتنی خوشی نہ ہوتی۔"

پانی کا گلاس اٹھا کر اس نے لبوں سے لگایا تین سانس میں خالی کر کے پھر ہاتھ پونچھتا چارپائی کی طرف آیا۔

"وڈیرہ سائیں یہ سکول بند کر کے دوسرا اسکول کھولنا چاہ رہا ہے۔"

”کیا آ... یہ سکول بند کروا دیا ہے۔“ ماسٹر دین محمد چارپائی پر اچھل کر رہ گیا۔

”اوہو بابا پہلے پوری بات تو سن لو یوں بھی یہ سکول کوئی سکول ہے' وہ باقاعدہ بڑی جگہ پر بڑی سی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اب بتا بابا! ہے نا حیرت اور خوشی کی بات۔ ایسا سکول جس کی چھتیں ہوں' میزیں' کرسیاں ہوں' جہاں ٹھنڈا پانی ہو' پنکھا ہو' بڑا سا گھنٹہ ہو اور... بابا! ایسا سکول ہی تو خواب ہے نا ہمارا۔ اور وڈیرہ...“

”اوہ وڈیرہ یہ خواب پورا کرنے والا ہے یہی کہنا چاہتے ہو نا۔“

ماسٹر دین محمد ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں چھپا طنز واضح تھا۔ وہ بیٹے کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہ بے حد بچکانہ بات کر رہا ہو اور اسے اپنا یہ چھ فٹ کا بیٹا وہ بچہ ہی لگا جو کھلونے سے بہلا دیا گیا ہو۔

”یہ وڈیرہ لوگ ہمارے ایسے خوابوں کو مسمار ضرور کر سکتے ہیں انہیں تعمیر نہیں کرتے' دیکھ رہے ہو میرے یہ بال' میری یہ عمر' اتنے سال گزر گئے مجھے یہ خواب دیکھتے ہوئے۔ ان کی تعبیر پانے کی حسرت لیے۔ ایسی خوشخبریاں سنتے سنتے۔ یوسف پٹ ہم جیسے لوگوں کے ہاتھ خوابوں کی صرف راکھ آتی ہے' تعبیر کی تتلیاں نہیں۔“

”پر بابا! انہوں نے بڑی سنجیدگی سے یہ بات کی ہے بھلا انہیں مذاق کی کیا سوجھی۔“

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

یوسف الجھ گیا' کچھ دل باپ کی باتیں ماننے کی طرف مائل تھا کچھ اپنی دلیلیں دے کر جیسے خود کو تسلی دینا چاہتا تھا۔ ماسٹر دین محمد کے لبوں پر مسکراہٹ تھی' ایسی مسکراہٹ جو ایک شکستہ سپاہی کے چہرے پر میدان جنگ کے بعد آتی ہے۔ شکستہ' خالی' کھوکھلی سی اور خود آزار سی مسکراہٹ۔

”تم تو بس مایوسی کی بات ہی کرنا۔“

ماسٹر دین محمد کی بیوی گاجروں کا تھال اٹھائے فرش پر بیٹھ کر انہیں کاٹتے ہوئے منہ بگاڑ کر بولی۔

”میرے پٹ کی خوشی تجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔“

”نہ اماں بات تو بابا کی بھی غلط نہیں۔“ یوسف جلدی سے بولا اور ماسٹر دین محمد کی طرف دیکھا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے اتنے برسوں میں اس گائوں میں سکولیں بند ہی ہوئی ہیں تعمیر نہیں ہوئیں۔ تو کیا بابا یہ سکول بھی بند ہو جائے گا ہمیشہ کیلئے۔

وہ چند بچے جو شوق اور لگن سے بستہ لٹکائے علم کی محبت میں آتے تھے۔ وہ پیاسے رہ جائیں گے۔ یہ کنواں بھی ان سے چھین لیا جائے گا۔"

"ہاں... ہاں یوسف پٹ... ہاں۔ کیونکہ ان وڈیروں' جاگیرداروں عالی رتبہ لوگوں کا کام تعلیم پھیلانا نہیں بلکہ ناخواندگی' افلاس' ظلمت اور تاریکی پھیلانا ہے تاکہ ان کے قدم ہی نہیں نقش قدم بھی یہ بے شعور لوگ چومتے رہیں۔ ان کی انانیت کی تسکین کے تنور میں وہ ایندھن بنتے رہیں' ان کا منشور غلاموں کی تعداد میں اضافہ ہے تاکہ ان کی آقائیت برقرار رہ سکے اور کوئی بھی باشعور غلامی گوارا نہیں کرتا کہ بہر حال غلامی ایک بدترین شے ہے۔ کوئی بھی باشعور' عاقل غلامی کی بجائے بھوک اور آزادی کو قبول کرے گا۔"

ماسٹر دین محمد کے لہجے میں آزردگی تھی۔ وہ چارپائی پر جیسے تھک کر لیٹ گیا۔

اب یہی آزدگی' پژمردگی اس کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔

"آزادی تو شعور سے مشروط ہے نا۔ شعور تعلیم سے اور یہاں تعلیم کا ہی سب سے پہلے گلا کاٹا جاتا ہے' تعلیم کے سہارے کو چھین کر عوام کے قدموں سے زمین اور سر سے آسمان کھینچ کر انہیں جہالت کی ظلمت کی فضا میں معلق کر دیا گیا ہے۔ اب ہم ایسی کٹی پتنگ ہیں کہ یہ پیشوا۔

عالی مرتبت لوگوں کے حکموں کی ہوائیں جہاں ہمیں اڑائیں اڑتے چلے جاتے ہیں' ہمیں اپنے وجود پر خود اختیار نہیں۔"

ماسٹر دین محمد کی تھکی تھکی بوجھل سانسیں چھوٹے سے آنگن کو مضمحل کر گئیں۔ یوسف سامنے دیوار کو گھورتا رہا پھر جیسے چیخ کر کھڑا ہو گیا۔

"بے بس اور بے آسرا کرنے کی بھی حد ہوتی ہے۔"

ماسٹر دین محمد کی سچی باتوں نے اس کی ساری خوشی کا قطرہ قطرہ نچوڑ لیا تھا۔ اس کا دل مرجھا گیا تھا جیسے اگنے والے ننھے پودوں کو پیروں سے روند دیا جائے۔ پھر وہ ملول سا چارپائی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

X...X...X

وہ ابھی اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ اس نے خود کو بیڈ پر گراتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر رکھے بلیک ٹیلی فون سیٹ کو اٹھا کر گود میں رکھتے ہوئے ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف آمنہ مردان علی تھی۔

"کہاں سے بول رہی ہو۔" اس کی آواز سن کر اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر تقریباً نیم وا ہوتے ہوئے بیڈ سے ٹیک لگا لی۔

"اپنی گاڑی میں ہوں اور موبائل پر بات کر رہی ہوں۔"

"اچھا کب پہنچیں شہر۔" ولید نے دریافت کیا تو اس کی ہنسی اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"اس سے کیسے ثابت ہوا کہ میں شہر میں ہوں خیر خیر میں واقعی شہر میں ہوں آج صبح ہی آئی ہوں۔"

"جب مرغا بانگ دے رہا تھا۔" اس نے شرارت بھرا لقمہ دیا۔

"مرغے ورغے کا تو پتہ نہیں البتہ میرا ٹائم پیس ضرور بانگ دے رہا تھا۔" وہ دوبدو بولی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ہاں اب مرغے تو بیچارے آؤٹ آف ڈیٹ ہو گئے ہیں اب جدید زمانہ ہے ٹائم پیس بانگ دینے لگے ہیں۔ اینی وے یہ بتاؤ مجھے یاد کرنے کا سبب۔"

"تم بس بے سبب یاد آئے۔" وہ ہولے سے گنگنائی پھر قہقہہ مار کر بولی۔

"میں تم سے Immediately ملنا چاہتی ہوں یعنی جلد از جلد ملو مجھ سے۔ کہو تو گاڑی تمہاری طرف ہی کر کے تمہیں پک کر لوں۔ ابھی۔" اس کے لہجے میں بے تابی تھی وہ لحظہ بھر کے لئے حیران ہوا پھر ریسیور کو گھور کر گہری سانس بھری۔

"خدا خیر کرے ایسی کیا آفت آ گئی ہے۔ سنجیدگی سے بتاؤ کہ بے حد ضروری کام ہے یا مجھے چیٹ کر رہی ہو۔"

"بھئی کام آ پڑا ہے نا' جلدی سے بتاؤ آ رہے ہو خود یا آپ' عزت مآب' عالم پناہ کو لینے مجھ کنیز کو خود چل کر آنا پڑے گا۔" اس کا انداز خاصا شگفتہ سا تھا وہ ہنس دیا۔

"اس وقت تو لنچ کا ٹائم ہے اور میرا خیال ہے ہمیں کسی کیفے ریسٹورنٹ میں ہی ملنا چاہئے۔" اس نے آستین پلٹ کر کلائی میں بندھی گھڑی پر نظریں ڈالیں۔

"بہت ان رومینٹک قسم کے بندے ہو۔ میں تو کسی پر فضا اور رومینٹک جگہ کا انتخاب کر رہی تھی۔ اینی وے آجائو پھر کسی ریسٹورنٹ میں۔" وہ مصنوعی مایوسیانہ سی سانس بھر کر بولی۔

"محترمہ آمنہ علی! بھری دوپہر جب آسمان آگ اگل رہا ہو تو کوئی مقام پر فضا اور رومینٹک نہیں ہو سکتا۔ چلو میں آرہا ہوں مگر..." اس نے کچھ کہنا چاہا مگر دوسری طرف آمنہ علی ریسٹورنٹ کا نام بتا کر لائن ڈسکنیکٹ کر چکی تھی۔

وہ ایک دو پل ریسیور کو گھورتا رہا پھر اسے کریڈل پر رکھ کر ایک گہری سانس لے کر بالوں میں ہاتھ پھیرتا بیڈ سے اتر گیا۔

اس کے خیال میں ایک آدھ گھنٹہ وہ آمنہ علی کو دے سکتا تھا پھر اسے سکندر کی طرف جانا تھا۔ آج نادیہ آپی کی منگنی تھی۔ یوں تو یہ رسم خالص زنانہ تھی مگر سکندر رضا کو ذہنی سہارے اور اس کی تسلی اور تقویت کے لیے وہ اپنی موجودگی ضروری سمجھتا تھا۔

ہلکے نیلے رنگ کے کلف لگے شلوار قمیص پر پڑی سلوٹوں پر اس نے سرسری نگاہ ڈالی اور آئینے میں اپنے سراپے کو دیکھا۔ اس کے خیال میں اس قدر نامعقول حلیہ بھی نہیں تھا۔ یوں بھی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس وقت اس کا ذہن یہ سوچ رہا تھا کہ یوں اچانک آمنہ علی کو اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ اسی الجھے ذہن کے ساتھ اس نے پیروں میں لیدر کی چپلیں ڈالیں سائیڈ دراز سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور کمرے سے باہر آ گیا۔

بہت سی سوچیں اس کے خالی ذہن میں ابھر ابھر کر دم توڑ رہی تھیں اور انہی سوچوں کے تانے بانے میں الجھا وہ اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں پہنچا تو وہ اسے پارکنگ لاٹ میں ہی نظر آ گئی۔

بلیو جینز اور ڈھیلی ڈھالی سکرٹ میں تھی۔ چھوٹا سا بیگ کندھے پر جھول رہا تھا۔ اپنی ذاتی استعمال کی ریڈ سیوک سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ آنکھوں پر سن گلاسز دھرے تھے اور اس کے کٹے ہوئے شانوں تک آئے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

ولید حسن نے اپنی گاڑی اس کی گاڑی کے قریب ہی پارک کی اور نیچے اترا۔ وہ اسے دیکھ کر گلاسز اتار کر پیشانی پر ٹکاتے ہوئے اس کی جانب بڑھی۔

"بھئی مان گئے کہ پنکچوئل تو تم ہو ہی اور اب تو یہ بھی یقین کر لینا پڑے گا کہ وعدے کے پابند بھی ہو' تھینک یو ولید! تھینک یو سو مچ!"

''تھینک یو وینک یو تو ایک جگہ رہنے دو۔ پہلے یہ بتاؤ ایسی کون سی مہم آپڑی ہے جو میری ہیلپ کے بغیر سر نہیں ہو سکتی۔ سارے راستے سوچ سوچ کر دماغ ہل گیا مگر کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ بس یونہی منہ اٹھائے بھاگا چلا آیا ہوں۔''

وہ گاڑی لاک کر کے اس کی طرف آگیا جو اس کی گاڑی کے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔

اس کی بات قطعاً سنی ان سنی کرتی اس کے سراپے پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولی۔

''بن اہتمام بھی اپالو کے کزن لگ رہے ہو۔ خدا جانے اہتمام کر کے آتے تو کیا لگتے۔'' وہ خاصی بے تکلفی سے اس کے سراپے پر نگاہیں گاڑے اس کو سراہنے لگی۔ لحظہ بھر اس کی اس بے باکی پر ولید حسن جھینپ کر رہ گیا۔ شاید اسے توقع نہ تھی کسی لڑکی کے منہ سے اس طرح کی تعریف کی۔ تاہم وہ اس کے لہجے کے خمار پر قطعی غور کیے بنا اسے ہلکے سے گھورتے ہوئے بولا۔

''طنز کر رہی ہو۔ بس وقت ہی نہیں ملا حلیہ درست کرنے کا۔''

گو کہ وہ جانتا تھا آمنہ علی نے طنز نہیں کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں توصیف کی پر شور لہریں واضح طور پر دکھائی دے رہی تھیں اور وہ اپنی شخصیت کی اسی سحر انگیزی سے آگاہ تھا۔ یوں

بھی اسے احساس تھا کہ صبح کے ہلکے شکن آلود ان کپڑوں میں بھی اس کی شخصیت کی دلکشی ماند نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی یہ لاپرواہی اور سادگی اس کی شخصیت میں ایک انوکھا حسن پیدا کر رہی تھی۔

''میری آنکھوں میں جھانک لو خود پتا چل جائے گا میں طنز کر رہی ہوں یا تعریف۔'' اس کا لہجہ ہنوز لو دیتا ہوا تھا۔ اس کی ساری حسیات ولید حسن کو دیکھ کر شوریدہ سر جذبوں میں بدل گئی تھیں۔

ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں میں ولید حسن کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھر آئے تھے' اس کی ہلکے آئی شیڈز سے سجی آنکھیں بوجھل اور بھاری ہو رہی تھیں۔

وہ غیر محسوس طور پر چونکتے ہوئے رخ بدل کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے ہمیں شریفوں کی طرح اندر بیٹھ کر باتیں کرنی چاہئیں۔''

اس کے رخ بدلنے پر وہ اس کے چہرے پر ابھرتے تاثرات کا جائزہ نہ لے سکی۔ ہاں اس کا رخ بدلنا اور کچھ سنجیدگی کے ساتھ قدم اٹھا دینا اسے برا نہیں لگا تھا۔ یہ بھی شاید اس کی ادا تھی۔ اس کے ڈارک لپ سٹک سے سجے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ دونوں باتیں کرتے

ہوئے سنہری زنجیروں سے بنے ہوئے جنگلے کے درمیان سے گزر کر ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے۔

''تمہارے خیال میں میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے۔'' وہ دونوں ایک میز منتخب کر کے بیٹھ گئے اور وہ اطمینان سے دونوں کہنیاں میز کی سطح پر جما کر کچھ اس کی جانب جھکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''اب مجھے غیب کا علم تو نہیں آتا یہی تو تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔''

اس نے اس کی طرف بغور دیکھا اور جیسے ٹھٹک سا گیا۔ اس کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''آمنہ... یو۔''

''آں...آں۔'' اس نے تیزی سے ہاتھ اٹھا کر گویا اسے کسی اقدام سے باز رکھنا چاہا اور کھل کھلا کر ہنس پڑی' وہ اسے دانت پیس کر گھورنے لگا۔

''اس کا مطلب ہے تم نے مجھے چیٹ کیا ہے۔''

''بھئی چیٹ ویٹ نہیں کیا بس تم سے ملنے کی سبیل نکالی ہے۔'' وہ ہنسی کے درمیان بولی۔

وہ ہنوز اسے گھورے جا رہا تھا۔

''محبت اور جنگ میں تو سب جائز ہے نا۔'' وہ آگے آئے بالوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے ادا سے بولی اور کہنیوں کو گرا کر میز کی سطح پر دونوں ہتھیلیاں جما کر اسے دلچسپ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اب اس طرح مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں لنچ کی جگہ نوش فرمائو گے یا اور کچھ بھی کھائو گے۔'' پھر مینیو اٹھا کر لنچ کا آرڈر دینے لگی۔ وہ یکدم سنجیدہ نظر آنے لگا۔

''یہ جوک تم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتیں۔ آج تو کم از کم بخش دیتیں' آج سکندر کی بہن کی منگنی ہے اور میرا جانا کتنا ضروری ہے تمہیں خبر نہیں۔''

''کون سکندر؟'' وہ اس کی سنجیدگی کا خاطر خواہ نوٹس نہ لیتے ہوئے بے پروائی سے جوس کا گلاس اٹھا کر اس کی ہلکی ہلکی چسکیاں بھرنے لگی۔

''بھئی ایک ہی تو سکندر رضا ہے جو۔''

"آآ...' اچھا وہی جرنلسٹ۔"

وہ لبوں سے گلاس ہٹا کر پر خیال انداز میں بولی پھر منہ سکیڑ کر بولی۔

"جس کے پاس کھٹارا سی بائیک ہے اور جو بدرنگ سی جینز میں خود کو جیمز بانڈ کا جانشین ثابت کرنے پر تلا نظر آتا ہے اور جس کے کندھوں پر اپنی ٹائم ایک فضول سی جیکٹ یوں جھولتی رہتی ہے جیسے شکاری کے کندھے پر بندوق اور جو خود کو عہد جدید کا صحافی کم اور افلاطون زیادہ سمجھتا ہے۔"

اس کے لہجے میں ایسی تحقیر اور کڑواہٹ تھی جیسے وہ اورنج کا جوس پینے کی بجائے کونین کا سیرپ پی رہی ہو۔

"ہاں وہی جرنلسٹ ایک سچا کھرا جرنلسٹ۔" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے نیم وا سی آنکھوں سے نہایت پرسکون انداز میں اس کے چہرے کے اتار چڑھائو کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ آمنہ علی کے چہرے کے تاثرات یکدم استہزائیہ ہو گئے اور لبوں پر مدھم مگر قدرے نخوت زدہ مسکراہٹ لہرانے لگی جیسے سکندر رضا اس کے لیے کوئی مکروہ سی شے ہو۔

"سچ سب ڈھکوسلا ہے' اسی سچائی سے وہ مخالف پارٹیوں سے خاصا وصول کرتا ہو گا۔ اب یہی تو ٹرینڈ چل نکلا ہے کہ ایک دو سیاست دانوں کی کمزوریاں پکڑ کر اس پر کالم لکھو۔ گویا ایک طرح سے اپنے کالم کی قیمت لگائو جتنا جملوں پر گرفت ہو گی قیمت اتنی اچھی ملے گی۔"

"سوری آمنہ مردان علی! I think you are not informed وہ تمہارے باپ جیسوں کے خریدے ہوئے صحافیوں میں سے نہیں ہے' وہ ایک غیر جانبدار' اصول پرست اور قلم کی آبرو کو سنبھالا دینے والا صحافی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک ایک آدھ کوٹھی نہیں تو دو تین ہزار گز کا ہی بنگلہ ضرور ہوتا اس کے پاس۔ اس کی بہن کی شادی بہت پہلے ہو چکی ہوتی اور وہ خود کو افلاطون سمجھنے کے بجائے

اپر کلاس کے بی ایم ڈبلیو میں گھومنے والے مخنچو لڑکوں کی طرح خود کو پرنس آف ڈریم اور رومینٹک فلموں کا ہیرو ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔"

وہ قدرے روانی اور سختی سے اس کے جملوں کی نفی کرتا ہوا بولا تھا۔ ذکر سکندر رضا کا ہو' اس کے پاک صاف کردار کر کردار کشی کا معاملہ ہو اور ولید حسن مشتعل نہ ہو جاتا مگر سامنے بھی آمنہ علی بیٹھی تھی جو عورت ہونے کے ناتے زیادہ محترم تھی۔ وہ اپنا اشتعال دبا گیا تاہم لہجے

میں ہلکی کاٹ در آئی تھی۔ آمنہ علی نے قدرے چونک کر اور کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کے خوبصورت نقوش میں ناگواری جھلکتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گہری سانس بھر کر بولی۔

"آئی ایم سوری مجھے پتہ نہیں تھا تم اس کے اتنے بڑے Admirer ہو۔"

وہ ماحول میں یکدم پھیلنے والی کشیدگی کو رفع کرنے کے لیے خوشگواری سے ہنسی۔

"میں ہمیشہ سے سچوں اور اصول پرستوں کا Admirer رہا ہوں۔"

وہ بلاتامل بولا۔ پھر نیپکن گود میں رکھ کر لنچ کے لوازمات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کس قدر ندیدے ہو ولید پوچھا بھی نہیں کہ کس خوشی میں یہ لنچ ہے۔"

وہ تیزی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے چکن پر ہاتھ صاف کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے چلائی۔

"کیا مطلب؟" اس نے سر اٹھا کر تعجب سے اس کی طرف دیکھا تب وہ خفگی سے بھرپور انداز میں کسی ناراض بچے کی طرح اسے گھورنے لگی۔

"تم نے شاید گھر سے نکلتے ہوئے ٹائم دیکھا تھا کیلنڈر نہیں۔ آج ٹوئنٹی ففتھ ہے میری برتھ ڈے ہے۔ میں تو انتظار ہی کرتی رہ گئی تم مجھے سرپرائز دو گے' مگر آہ... یہ نہ تھی ہماری قسمت۔" اس نے اتنی طویل اور ٹھنڈی سانس بھری کہ وہ شرمندہ سا ہو گیا اور سیدھا ہو کر کرسی کی پشت سے لگتے ہوئے معذرت خواہانہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"آئی ایم سوری' سوری فار دیٹ ایمی! بس ذہن ہی سے نکل گیا۔"

اس نے رسٹ واچ میں لگی تاریخ پر نظریں دوڑائیں اور سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکوڑ لیے۔

"اوہ آج تو واقعی ٹوئنٹی ففتھ ہے یعنی تمہاری برتھ ڈے۔ یار! مجھے فون پر مطلع کر دیتیں میں کوئی گفٹ ہی لے آتا۔ چلو یہ لنچ میری طرف سے اور گفٹ ڈیو۔"

"کوئی ڈیو ویو نہیں لنچ کے بعد چلو گے میرے ساتھ شاپنگ سنٹر اور اچھا سا گفٹ لے کر دو گے۔ میرا خیال ہے والٹ تو جیب میں ہی ہو گا یا جلدی میں وہ بھی بھول آئے۔"

"بس یہی غلطی سے جیب میں پڑا رہ گیا۔" اس نے معصومیت اور مسکینیت سے سر ہلا کر کہا تو وہ اسے گھورتے ہوئے ہنس پڑی پھر اس کے کندھے پر ہلکا سا مکا مارتے ہوئے بولی۔

”ولید... ولید حسن تمہاری یہی ادائیں تو میری جان لے لیں گی۔“ اس کا لہجہ آنچ دیتا ہوا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق اسے ایک بار پھر سٹپٹانے پر مجبور کر گئی۔

وہ اتنا اونچا لمبا مرد باوجود پر اعتماد اور بے تکلف ہونے کے لحظہ بھر کے لئے اس کے کھلے جملوں پر گڑبڑا کر رہ جاتا۔ اس کے خیال میں وہ حد سے زیادہ نڈر' بے باک تھی یا پھر شاید ساری لڑکیاں اپنی چاہت کے محور کے گرد یونہی پروانوں کی طرح نثار ہوتی ہوں گی اور جملوں کے آگے یونہی برف کی طرح پگھل جاتی ہوں گی۔ ایسا ہی ہوتا ہو گا مگر... مگر اس کا دل اس بات کو بھی نہ مان سکا کہ اس کی نگاہوں میں ایک حیا سے گھبرایا چہرہ لہرا کر رہ جاتا۔

X...X...X

میرے خیالوں پہ چھائی ہے

اک صورت متوالی سی

نازک سی شرمیلی سی

معصوم سی بھولی بھالی سی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

رہتی ہے وہ دور کہیں

اتا پتہ معلوم نہیں

کوکو کوری نا

”یا وحشت نومی کے بچے! ایک وقت میں ایک کام کر گاڑی چلاؤ یا زبان چلاؤ۔“ نادیہ آپی درد سے پھٹتے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے غرائیں۔

”ہشت چپ میک اپ خراب ہو جائے گا اور بھئی اتنا اچھا گانا گا رہا ہے نومی' واہ بھئی نومی تمہاری آواز تو بڑی اچھی ہے۔“

شہرینہ نے انہیں ڈپٹ کر نعمان کو داد دیتے لہجے میں گویا مزید ستم جاری رکھنے پر شہ دی۔

”بس اب اسے زیادہ سر پر مت چڑھاؤ۔“ تانیہ چہک کر بولی۔

مگر وہ یہ سمجھ ہی نہ سکی تھی کہ نومی کی تمام تر توجہ کا مرکز گاڑی کی پچھلی سیٹ پر نادیہ اور شہرینہ کے ساتھ بیٹھی عظمیٰ تھی جو پارلر دیکھنے کے شوق میں ان کے ساتھ چلی آئی تھی۔

وہ سب نادیہ آپی کو زبردستی پارلر لے کر گئی تھیں اور اب واپسی پر نادیہ آپی برائڈل میک اپ میں تھیں۔ ان کا ہمیشہ سادہ نظر آنے والا روپ اس وقت بے حد چمک رہا تھا مگر وہ سفید چادر میں خود کو تقریباً ڈھانپے ہوئے تھیں تاکہ آس پاس سے گزرتی نظریں ان پر نہ پڑیں۔ انہیں بڑی شرم آ رہی تھی اپنے اس روپ سے۔

بقول تانیہ کے یہ چندا سا روپ چاند بابو ہی دیکھے گا اور لگتا ہے مووی والے بیچارے کو اس کفن پوش حسینہ کی ہی مووی بنانا پڑے گی۔ اس پر نادیہ آپی نے کھسیا کر اس کے کندھے پر چٹکی کاٹی تھی۔ وہ آگے کی سیٹ پر نومی کے برابر بیٹھی تھی اس لیے نہ جان سکی کہ بیک ویو مرر میں نومی نے عظمیٰ کو فوکس کیا ہوا تھا۔ خود نادیہ آپی اپنی الجھن میں تھیں بس یہ چوری تو شہرینہ نے ہی پکڑ رکھی تھی جبکہ نومی خود بے خبر تھا۔ شہرینہ کی اس باخبری سے۔

''ارے اتنا اچھا سنگر ہوں مگر گھر والے سخت ناقدرے ہیں' جوہری تھوڑی ہی ہیں کہ ہیرے کی پہچان ہو۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر مصنوعی دل گرفتگی سے بولا تو شہرینہ ہنسنے لگی۔

''اللہ رے ہیرے۔'' تانیہ نے اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا پھر '' ہوں'' کر کے رخ پھیر لیا۔

جھیل سی گہری آنکھیں جس کی' پھول سا نازک چہرہ

ناگن جیسی کالی زلفیں دیتی ہیں اس پر پہرہ

پوچھو گے مجھ سے دنیا بھر میں کون ہے ایسا حسین

کوکو کوری نا کوکو کوری نا

وہ پھر شروع ہو گیا اور بیک ویو مرر کو ہلکے سے چھیڑا تو شہرینہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''اتا پتا معلوم کر رہے ہو کیا؟'' اس کا یہ شرارتی حملہ بالکل اچانک ہوا تھا۔ وہ اپنے دل کے چور کے باعث سراسیمہ سا ہو گیا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے واپس سٹیئرنگ پر آ ٹکا۔

''یہ اتے پتے بعد میں معلوم کرتے رہنا خدا کے لیے نومی! اب پلیز اپنی آواز کا جادو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو اور جلد از جلد گھر پہنچاؤ۔ مجھے تو ان کپڑوں میں وحشت ہو رہی ہے

اور یہ اتنا سارا منہ پر تھوپا ہوا ہے کہ بندہ رومال سے منہ رگڑ بھی نہیں سکتا سر الگ بھاری بھاری ہو رہا ہے۔ خدایا بالوں کے گجرے کو بچاؤں' ہیر سٹائل کو یا پھر اپنی دکھتی گردن کو دیکھوں۔ ہائے شیری! ذرا اپنا کندھا ادھر کرنا کم از کم سر ہی ٹکالوں۔''

نادیہ آپی کی دہائیاں سن کر تانیہ ہنس رہی تھی جبکہ شہرینہ انہیں اپنا کندھا پیش کرنے کے بجائے انہیں گھورتے ہوئے بولی۔

''ابھی تو صرف منگنی کا راؤنڈ ہوا ہے۔ شادی ہو گی تو کیا کریں گی؟ پارلر میں چھ گھنٹے اسٹیچو بن کر بیٹھنا ہو گا۔ پھر رسمیں ہوں گی وہ الگ اور رخصتی سے پہلے چاند بابو کی بہنوں کو جب تک نیگ نہیں ملے گا اس کا انتظار الگ رہا۔'' وہ دل دوز نقشہ کھینچ کر ہنسنے لگی۔

نادیہ آپی دانت کچکچا کر رہ گئیں اور اسے بے حد سنگدل ظالم کے خطابات سے نواز کر عظمیٰ کی طرف قدرے جھک کر اس کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔

''شادی کے لیے جاتی ہے پارلر میری جوتی۔ یہ تو تم لوگوں نے آج مجھے گھیر لیا اب تو میری سات پشتوں کی توبہ جو تم لوگوں کی میں باتوں پر آ کر احمق بنوں۔''

ان کا چہرہ قابل رحم تھا بلکہ وہ خود کو اس وقت انتہائی لاچار' بے بس اور قابل رحم خیال کر رہی تھیں۔ اس چڑیا کی طرح جو بے دھیانی میں جال میں آ کر اب پھڑ پھڑا رہی ہو۔

کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے

چپ رہ کے بھی نظر میں ہیں پیار کے اشارے

کچھ لوگ روٹھ کر بھی

یہ شان بے نیازی' یہ بے رخی کا عالم

بے بات ہو گیا ہے ان کا مزاج برہم

اک پل میں ہم نے دیکھے کیا کیا حسین نظارے

کچھ لوگ روٹھ کر بھی

نومی نے اپنی آواز کا جادو جگانا ترک کر کے ٹیپ کھول دیا اور حسب حال گانے کے بول گونجے تو سب بے اختیار ہنس پڑی تھیں۔ جبکہ نادیہ آپی نے ان کی ہنسی سے جھلس کر کسی کم

سن ناراض بچے کی طرح اپنے ہیئر سٹائل کا خیال ایک طرف ڈال کر عظمیٰ کے کندھے سے باقاعدہ سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

تانیہ نے گہری سانس بھر کر ان کے ہیئر سٹائل اور ان کی گردن میں پھنس جانے والے موتیے کی لڑیوں پر دل ہی دل میں ان اللہ پڑھ لیا تھا۔

شہرینہ کو بھی ان پر رحم آ گیا تھا سو انہیں مزید نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کا ارادہ ترک کرتے ہوئے کھڑکی میں منہ دیئے باہر کے نظاروں کو تکنے لگی۔

یہ اس کے اپنے استعمال کی ذاتی گاڑی تھی جسے نعمان ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ مصروف شاہراہ سے گزر رہے تھے جہاں بے پناہ رش نے مختصر فاصلے کو طویل کر دیا تھا۔ ایک کروڑ سے بھی زائد آبادی والے شہر میں اب شاذ و نادر ہی کوئی وقت اور سڑک تھی جہاں ٹریفک کا اژدھام نہ ہوتا تھا اور وہ جہاں پھنسے تھے اس کے دونوں اطراف مشہور شاپنگ سنٹر تھے جن کا رش بھی قابل دید تھا۔

وہ دلچسپی سے لوگوں کو اور کاروں کی قطاروں کو دیکھتے دیکھتے یکدم چونک گئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک بے یقین سا جھٹکا لگا تھا۔ وہ حیرت زدہ نگاہوں سے پارکنگ لاٹ کی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

جانب بڑھتے اس جوڑے کو دیکھ رہی تھی۔ لڑکی گو کہ اس کے لیے اجنبی تھی مگر مرد کوئی غیر یا اجنبی نہیں بلکہ ولید حسن تھا۔

سگنل کھلنے پر نومی نے گاڑی آگے بڑھا دی مگر اس کی نگاہیں گویا اسی جگہ ٹھہر گئی تھی۔ ذہن میں ایسا سناٹا اتر آیا جیسے ہوا سے محروم چاند پر ہوتا ہوگا۔ یہ کیفیت کچھ لمحے رہی پھر اس نے سر آہستگی سے اندر کرتے ہوئے سیٹ کی پشت پر ٹکا دیا۔

قربان جائیں اے دل! ہم ان کی اس ادا پر

خود بھی سلگ رہے ہیں ہم کو جلا جلا کے

ہیں کتنے خوبصورت اس آگ کے شرارے

کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے

"نومی پلیز ٹیپ بند کر دو سر کچھ بھاری سا ہو رہا ہے۔"

وہ آہستگی سے بولی تو نومی کے ساتھ تانیہ نے بھی ذرا سا ترچھا ہو کر اس کی طرف دیکھا پھر نومی نے ٹیپ کا بٹن بند کر دیا۔

"کیا بات ہے شیری! طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

تانیہ نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے تشویش سے پوچھا تو وہ زبردستی بے مقصد مسکرانے لگی۔

"بالکل ٹھیک ہے بس ذرا سفر کی طوالت نے بور کر ڈالا ہے۔ تھینکس گاڈ! ہم اب کھلی سڑک پر تو آئے۔" وہ گہری سانس بھر کر تانیہ کو مطمئن کرتے ہوئے بولی اور سیٹ پر سر ٹکاتے ٹکاتے ذرا سا چہرہ موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

ضروری تو نہیں اس نے جیسا دیکھا جو سوچا' ویسا ہی ہو۔ وہ اس کی جان پہچان کی کوئی لڑکی ہو سکتی ہے' محض رسمی تعلق ہی ہو اس سے... اور اس کی سوچیں محض وہم سے پراگندہ ہو رہی ہوں۔ یوں بھی بہت سے وہم و گمان آدمی کی اپنی نظر کا فتور ہوتے ہیں' کبھی کبھی آنکھیں اپنے ہی اندر کے خلفشار' وہموں اور اندیشوں سے مشروط ہو جاتی ہیں۔

وہ اپنی سوچوں سے خود اپنے ہی واہموں کی نفی کرنے لگی پھر آنکھیں کچھ دیر کے لیے موند لیں۔

X...X...X

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پروفیسر زبیری کے سادہ سے ڈرائنگ روم کا توقیر شاہ نے خاصا استہزائیہ جائزہ لیتے ہوئے ایک کرسی سنبھال لی۔ عام سی سادہ لکڑی کی کرسی پر یوں سمٹ کر بیٹھا جیسے کسی غلیظ شے پر بیٹھنا پڑ گیا ہو۔

پروفیسر زبیری کا بارہ سالہ بیٹا میزبانی کا یہ فرض ادا کر کے چپکے سے وہاں سے نکل کر باپ کو مہمان کے آنے کی اطلاع کرنے چلا گیا۔

پروفیسر زبیری باتھ روم سے نکلے تھے "توقیر شاہ" گو کہ ان کے لیے اجنبی تھا مگر مردان علی شاہ اور اکبر شاہ کے توسط سے یہ نام اجنبی نہیں تھا۔ وہ چونکے ضرور تھے پھر قدرے خراب موڈ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

"آپ بڑے لوگوں نے کیوں تکلیف کی مجھے بلا لیا ہوتا۔" مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے کرتے ہوئے پروفیسر زبیری کچھ طنز سے بولے۔

ابھی مردان علی شاہ کے منیجر سے ہونے والی گفتگو ان کے حافظے میں فٹ تھی اور اسے نامراد کرنے کے بعد انہیں یقین تھا کہ اب اگلا ملاقاتی مردان شاہ خود ہو گا یا اس کا دست راست... بہر حال مردان شاہ کے بیٹے کو دیکھ کر پروفیسر زبیری کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔

”نہ سائیں! آپ بڑے علم والے لوگ ہو۔ آپ کو بلانے کی ہتک ہم نہیں کر سکتے۔ ہمارے دل میں استادوں کی بڑی عزت ہے' تبھی تو خود چل کر آئے ہیں۔“

توقیر شاہ مجسم اپنائیت سے بولا۔

کلف لگے شلوار قمیص میں سندھی اجرک کندھے پر ڈالے وہ روایتی زمیندار خاندان کا فرد ہی دکھائی دے رہا تھا۔

”بڑی مہربانی' فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ پروفیسر زبیری خشک لہجے میں بولے۔

”نہ نہ سائیں! خدمت لینی نہیں بلکہ آپ ہمیں خدمت کا موقع دیجئے۔“

اس کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے یہ کہتے ہوئے اپنے پیروں کے قریب رکھا سیاہ بریف کیس اٹھا کر درمیانی میز پر رکھا تو پروفیسر زبیری کی آنکھوں میں تشویش لہرائی انہوں نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”میرا خیال ہے توقیر شاہ آپ جس مقصد کے لیے آئے ہیں پہلے وہ واضح کر دیجئے' میرا مطلب ہے جو کہنا ہے کہہ دیں' اس لئے کہ میرے پاس وقت کم ہے میرے کچھ سوڈنٹس آنے والے ہیں۔“

توقیر شاہ نے سر اٹھا کر پروفیسر زبیری کو دیکھا پھر پر خیال انداز میں ہنکارا بھرتے ہوئے مبہم سے انداز میں مسکرایا۔

”سائیں ہم نے اپنے منیجر کو بھیجا تھا اس سے آپ کی بالمشافہ گفتگو ہوئی تھی مگر شاید آپ نے اسے قابل اعتنا نہ جانا تھا تو مجھے چل کر خود آنا پڑا ہے آپ کے گھر۔ سائیں آپ ہمیں اچھی طرح جانتے تو ہیں نا... وڈیرہ مردان علی شاہ کو۔“

اس کا لہجہ گو کہ نرم تھا مگر اس میں بلا کا غرور تھا۔ پروفیسر زبیری خاموش ہی رہے تو وہ بولا۔

”اکبر شاہ' مردان علی شاہ کا بیٹا یعنی میرا چھوٹا بھائی ہے۔ بہت محبوب ہے مجھے وہ اور میرا خیال ہے آپ میرے آنے کا اور اس تعارف کا مطلب تو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔“

پروفیسر زبیری لمحے کی خاموشی کے بعد کندھے اچکا کر دھیمے لہجے میں بولے۔

”آپ اگر یہ بھی وضاحت فرمادیں تو مہربانی ہوگی۔“

وہ صوفے پر بیٹھ گئے اور چشمہ اتار کر کرتے کے کنارے سے رگڑنے لگے۔ توقیر شاہ کے لیے یہ انداز شاید خاصا ضبط آزما ثابت ہوا وہ ایک دو پل پروفیسر کو گھورتا رہا تاہم لبوں کی مسکراہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے سر ہلا کر گویا ہوا اب کے لہجے میں حفیف سی تپش اتر آئی تھی۔

”آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اکبر سوشیالوجی کے پرچے میں رہ گیا ہے اور سوشیالوجی کی کاپیاں آپ کے پاس ہیں... بس ہم چاہتے ہیں کہ...“

”ایک منٹ۔“ پروفیسر زبیری نے ہاتھ اٹھا کر توقیر شاہ کو بولنے سے روک دیا۔ ان کے چہرے پر ناگواری جھلک آئی تھی۔

”تو آپ چاہتے ہیں میں آپ کے نالائق بھائی کو بے حد اچھے نمبروں سے کلیئر کردوں جبکہ آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس نے امتحان گاہ میں نازیبا حرکت کی تھی۔ اس وقت میرا تو دل چاہا اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر کے کلاس روم سے باہر کردوں مگر محض اس لیے ضبط کر لیا کہ مجھے نوجوانوں سے دشمنی نہیں ہے بلکہ میں انہیں بہترین قوم کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اکبر شاہ‘ ناقابل اصلاح ہے اور جب تک اس کی

پشت پر آپ جیسے باپ اور بھائی ہوں گے وہ اصلاح کی طرف تو کیا مزید بگاڑ کی طرف گامزن رہے گا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ اس کے پیپر کلیئر نہیں کریں گے۔“

توقیر شاہ پروفیسر زبیری کے اس لیکچر کو ذرا بھی قابل توجہ نہ جانتے ہوئے بولا۔ مگر اب اس کے لبوں کی تراش میں پھیلی مسکراہٹ مفقود ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں شعلوں کی سی لپک دکھائی دینے لگی تھی مگر پھر جلد ہی وہ خود کو کنٹرول کرتا ہوا خلاف توقع نرم لہجے میں بولا۔

”سوچ لو پروفیسر!“

اس نے انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے کھٹ سے بریف کیس کھولا۔

”میں تو معاملہ افہام و تفہیم سے طے کرنے آیا ہوں گو کہ میرے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے اور نہ ہی مجھے اس چھوٹے سے کام کے لیے تمہارے اس چھوٹے سے گھر میں آنا پڑتا۔ چاہوں تو ابھی کھڑے کھڑے تمہاری معطلی کے آرڈر آجائیں... اور رہا اکبر شاہ کے پاس ہونے کا

سوال تو کاپیاں تم سے لے کر کسی اور کو پہنچا دی جائیں گی مگر سائیں! ہم استادوں کی بڑی عزت کرتے ہیں، مگر شاید استادوں کو اپنی عزت کروانے کا زیادہ شوق معلوم نہیں ہوتا۔ سوچ لو پروفیسر! ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم کفِ افسوس ملتے رہو۔"

اس نے باتوں کے درمیان چیک بک نکالی اور پین نکال کر اس سے تھوڑی کھجاتے ہوئے مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ پروفیسر زبیری کو دیکھا پھر چیک بک اور پین میز کی سطح پر رکھ کر اسے آگے کھسکایا۔

"اس پر چاہو تو اپنی مرضی کی رقم لکھ لو۔"

"توقیر... شاہ!" پروفیسر زبیری یکدم جلال میں آکر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ توقیر شاہ کا جملہ انہیں اپنے وقار پر طمانچہ لگا تھا۔ ان کا چہرہ احساس تذلیل اور غصے سے لال ہو گیا۔ انہیں اپنی رگوں میں خون کی جگہ آتشیں سیال دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"میرا خیال ہے اب آپ یہاں سے جا سکتے ہیں اور آپ بے کار میں رقم کا زیاں کر رہے ہیں۔ اسے سنبھال کر رکھئے اور الیکشن میں جن جن غریبوں سے وعدے کیے تھے ان پر یہ رقم خرچ کیجئے اور میرا خیال ہے اسے تعلیم کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ موروثی سیاست دان

ہے اور سیاست میں کامیابی کے لیے ہمارے یہاں تعلیم سے زیادہ منافقت اور پیسے کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے پاس بدرجہ اتم موجود ہے۔"

پروفیسر زبیری چپ ہوئے تو کمرے میں لحظہ بھر سکوت چھا گیا۔ توقیر شاہ، پروفیسر کی طرف دیکھتا رہا پھر چیک بک اور پین بریف کیس میں ڈال کر بریف کیس بند کر کے کندھے اچکا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"میں تمہیں ایک عقل مند پروفیسر سمجھتا تھا مگر تم شاید عقل سے پیدل اور نادان پروفیسر ہو اور ان جذباتی اور کم عقل لوگوں میں شامل ہو جن کو ہم جیسے بااثر، طاقتور ہانکتے ہیں اور تم جیسے فرض شناس، باضمیر پیسے کو خودداری اور غیرت کے جوش میں لات مار کر خود ہمیں یہ موقع دیتے ہو۔ یاد رکھو پروفیسر! طاقت لفظوں سے نہیں پیسے سے آتی ہے۔ میں تو تمہیں طاقت دینے آیا تھا اور یہاں جو طاقتور ہے وہی کامیاب ہے۔" توقیر شاہ نے یہ کہتے ہوئے بریف کیس پر ہاتھ مارا۔

"مگر تم شاید بے روزگاری کی زندگی کو ہی چننے کے موڈ میں ہو' بے روزگاری بڑی بری چیز ہے پروفیسر زبیری! یہ میرا کارڈ رکھ لو کل تک میں شہر میں اپنی کوٹھی میں ہی ہوں کل تک انتظار کروں گا۔"

"میرا خیال ہے میں آپ کو کل تک انتظار کی زحمت نہیں دوں گا۔"

پروفیسر زبیری نے ہاتھ بڑھا کر وہ چھوٹا سا وزٹینگ کارڈ لے کر اس پر ایک نگاہ ڈالی اور اس کے دو ٹکڑے کر کے میز پر رکھی ایش ٹرے میں کسی کچرے کی طرح ڈال دیا۔

توقیر شاہ کے چہرے پر شعلوں کی سرخی رقص کرنے لگی۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے۔

"تم میرے اندازے سے زیادہ احمق ثابت ہوئے ہو۔" وہ بریف کیس اٹھا کر پلٹا اور تیر کی تیزی سے پروفیسر زبیری کے گھر سے نکل گیا۔

اپارٹمنٹ کے پورٹیکو میں اس کی پیجرو کھڑی تھی' جس میں اس کے تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

پروفیسر زبیری نے بالکونی سے جھانکا وہ بے حد ریش انداز میں پجیرو نکال کر لے گیا تھا۔

پروفیسر زبیری اپنے اس فیصلے اور رویے سے قطعاً مطمئن تھے۔

زندگی میں پہلے بھی مشکل مقام آئے تھے لیکن انہوں نے آج تک کوئی فیصلہ ضمیر کی آواز کے خلاف نہیں کیا تھا۔ وہ ایک گہری سانس بھر کر صوفے پر تقریباً نیم دراز ہو گئے گو کہ دل پر کوئی بوکھ نہیں تھا مگر اس ناخوشگوار واقعہ کا اثر ذہن پر بھاری پتھر کی طرح پڑا تھا۔

X...X...X

گھر کے باہر بڑا سا شامیانہ لگ چکا تھا۔ سکندر رات کے فنکشن کی مناسبت سے صبح ہی سے سیٹنگ کروا رہا تھا۔ کبھی لائٹنگ کا کبھی ڈیکوریشن کے دوسرے سامان کا معائنہ کر رہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی اس کا ذہن رہ رہ کر ولید کی طرف جا رہا تھا۔ "خان ہاؤس" فون کیا تو آغا جی سے پتہ چلا ولید لنچ سے پہلے ہی گھر سے نکل گیا ہے۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ اب تک یہاں کیوں نہیں آیا۔

اس نے آخری بار لائٹوں کا معائنہ کیا۔ بڑی بڑی لائٹیں شام سے ہی جھلمل جھلمل کرنے لگی تھیں۔ وہ کسی بھی طرح کی کمی نہیں رکھنا چاہتا تھا یہ اس کے گھر کی پہلی خوشی تھی اور باپ کے انتقال کے بعد اس گھر کے سربراہ کی حیثیت سے پہلی بڑی ذمہ داری جسے وہ احسن طریقے سے پوری کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اسے اپنی دونوں بہنیں بہت عزیز تھیں اور وہ ان کی خوشی کی خاطر اپنے محدود وسائل اور آمدنی کے باوجود ان کے ہر شوق کو مد نظر رکھے ہوئے تھا۔

خاندان کے لڑکے سارے اسی کے ہمراہ تھے اور باہر ہی تھے' پتہ چلا اندر تو لڑکیوں کا راج ہے' کل تین ہی تو کمرے تھے' جن میں دو پر لڑکیوں کا قبضہ تھا۔ باقی ایک میں گھر کا آدھے سے زیادہ سامان بھرا ہوا تھا اور جو جگہ بچی کچھی تھی اس پر بڑی بوڑھیوں کا ڈیرہ تھا۔ یعنی مردوں کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ وہ بس یہاں وہاں منتشر ہی تھے۔

''اللہ کی شان ہے چڑیلوں کو بھی میک اپ کا سینس آگیا ہے۔'' نومی آتے جاتے کبھی کوئی فقرہ اچھال جاتا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

شہرینہ میک اپ کٹ بند کرتے ہوئے دیوار گیر الماری میں لگے آئینے میں منہ دیئے عظمیٰ کو دیکھ کر مسکرائی۔

''عظمیٰ! نومی تمہیں چڑیل کہہ رہا تھا۔''

''اے۔اے اے یہ زیادتی ہے۔'' نومی جاتے جاتے اس کے جوابی جملے پر گویا کرنٹ کھا کر پلٹا تھا اور پردہ کھینچ کر اسے گھورنے لگا۔

''میں نے کسی کا نام نہیں لیا۔'' وہ اس بہانے آدھے سے زیادہ اندر گھس آیا تھا۔

اس کی بے ساختہ وضاحت پر شہرینہ کے ساتھ ثانیہ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور صوفے پر بیٹھی نادیہ آپی کے لبوں پر بھی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

انہیں تو خوشی ہو رہی تھی اس بات پر کہ ہمیشہ کھنچا کھنچا سا رہنے والا ناک بھوں چڑھائے رکھنے اور ماحول سے متنفر رہنے والا نومی بالکل بدلے روپ میں نظر آرہا تھا۔

صبح سے اس کی شوخیاں عروج پر تھیں۔ وہ انہیں چند سال پہلے والا کھلنڈرا' شرارتی اور ہنس مکھ نعمان دکھائی دے رہا تھا جو ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دیا کرتا تھا۔

ان کی محبت لٹاتی نظریں نومی پر تھیں جبکہ نومی سب سے آنکھ بچا کر عظمیٰ کو دیکھ لیا کرتا تھا۔

"چڑیلوں کو تو میک اپ کا سینس چلو آگیا ہے مگر حیرت تو اس بات پر ہے کہ بھوتوں کو بھی پرفیوم استعمال کرنا آگیا ہے۔" شہرینہ نے آنکھیں گھما کر ایک گہری سانس بھری۔

"کہاں سے ماری ہے؟ لگتا ہے سکندر بھائی کی ہاتھ لگ گئی ہے۔"

"جی نہیں یہ امپورٹڈ ہے تمہیں خوشبو سے نہیں لگ رہا۔ سکندر بھائی کی... ہا' وہ محب وطن کہاں امپورٹڈ چیزوں پر نظر کرم کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں ایک وہ نظر کرم نہیں کریں گے تو باہر کی اشیاء کی منڈی گر جائے گی۔"

"اے اے لینگویج پلیز۔" شہرینہ نے اسے گھورا۔ "باہر کی اشیاء کی منڈی گرے نہ گرے ان کا جذبہ اگر یہی ہے تو بہر حال لائق تحسین ہے اور اب تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

اس نے آگے بڑھ کر اسے دھکیلا اور پردہ ہٹا کر دروازہ دھاڑ سے بند کر دیا۔

"ایویں شو مارتا رہتا ہے۔" تانیہ اونہہ کر کے اپنی جیولری پہننے میں مصروف ہوگئی... اسی دم صفیہ خالہ اندر داخل ہوئیں اور لڑکیوں کو گھرکنے لگیں۔

"لگتا ہے تم لڑکیوں کی تیاریاں ختم نہیں ہوں گی اور لڑکے والے آکر شامیانے میں بیٹھ جائیں گے بلکہ کھا پی کر رخصت ہو جائیں گے۔ اے میں کہتی ہوں اب آگ لگاؤ ان میکپوں کو اور آئینوں کو۔ اے ماشاءاللہ تم سب تو یوں بھی حسین و جمیل ہو ان نگوڑے رنگوں کی کیا ضرورت ہے۔"

صفیہ خالہ کی بات پر لڑکیاں مارے خوشی کے کھل اٹھیں۔

"آہم... یہ خالص میرے لیے کہا ہے نا آپ نے... ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ناصفو خالہ۔" عظمیٰ نے چمک کر کہا تو تانیہ نے زور سے کھنکارا۔

"اسے کہتے ہیں آنکھ نہ ناک' بنو چاند سی۔" اس نے عظمیٰ کو چڑایا۔ حالانکہ اس وقت وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ کرنکل جارجٹ کے کام والے سوٹ میں اور ہلکی کرن لگے دوپٹے میں اس پر میچنگ جیولری اور ہلکا سا میک اپ۔

"جی نہیں اسے کہتے ہیں جل ککڑی۔" وہ دوبدو بولی پھر ہنسنے لگی۔

صفیہ خالہ دونوں کو گھورنے لگیں۔

"آئے ہائے یہ کیا لڑنے لگیں۔اے میں تو تم سبھی کو کہہ رہی ہوں چلو اب یہ لڑائی جھگڑا بند کرو اور باہر شامیانے میں آکر بیٹھ جائو۔دولہا والے آتے ہی ہوں گے۔" وہ تاکید کر کے کمرے سے لوٹ گئیں۔

X...X...X

دولہا والوں کے آنے کے بعد شامیانے کی رونق بڑھ گئی تھی۔ڈیک کی آواز کے ساتھ سب کی ملی جلی آوازوں کا بھی ایک شور تھا۔

ہنسی کی جھنکاریں بھی تھیں اور یہ جھنکاریں خالص لڑکیوں کی تھیں۔

مترنم

شوخ

البیلی

بے فکری

سی گرین لانگ شرٹ اور شرارے میں نادیہ آپی حد سے زیادہ پیاری اور شرمائی لجائی دکھائی دے رہی تھیں۔یہ پہلا پہلا تجربہ تھا دل کو گدگدا دینے والا' خوفزدہ کر دینے والا۔

شہرینہ انہیں تھام کر کمرے سے باہر نکال لائی۔

"شہری... سب ٹھیک تو ہے نا۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے ٹشو ناک پر تھپتھپانے لگیں۔شہرینہ ہنس پڑی۔

"نا صرف ٹھیک بلکہ آفت' قیامت' غضب ڈھا رہی ہیں آپی! ہائے کاش وہ چاند بابو بھی آ جاتے۔" وہ شرارتی انداز میں بولی... نادیہ آپی اسے گھورنے لگیں پھر یکدم ان کی نگاہوں میں توصیفی رنگ لہرا گئے۔

"خیر میں تو کیا غضب ڈھائوں گی تم البتہ قاتلہ لگ رہی ہو۔خدا خیر کرے کتنے گریں گے کتنے تڑپیں گے اور۔"

"جی ہاں جی ہاں لاشوں کا انبار لگ جائے گا۔ شامیانہ میدان کارزار بن جائے گا۔ یہی یا اور کچھ۔" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور ان کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔

مگر حقیقت تھی سادہ سے کپڑوں میں بھی حسین دکھائی دینے والی شہرینہ خان ذرا سی تیاری میں اتنی نمایاں اور دلکش دکھائی دے رہی تھی کہ ایک نظر دیکھنے پر آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔

سواتی کام کے سیاہ پشواز اور بڑے سے چائنا سلک کے دوپٹے میں اس کا متناسب جسم بے حد جچ رہا تھا۔ اس پر لائٹ سی جیولری پہن رکھی تھی اور میک اپ کے نام پر صرف مسکارا اور لائنر کا استعمال کیا تھا۔ ہاں مگر جو سب سے زیادہ توجہ کا مرکز تھا وہ اس کے بھورے سلکی دراز بال تھے جو اس نے پشت پر کھلے چھوڑ رکھے تھے جو ذرا سی جنبش پر ریشم کے لچھوں کی طرح پھسل پھسل جاتے تھے۔ یوں گمان ہوتا جیسے سنہری تاروں کا آبشار ہے جو نیچے تک بہہ رہا ہے۔

"اب مجھے گھورتی رہیں گی یا چلیں گی بھی۔ دولہا والے رسم کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو شامیانے سے نکل کر یہیں پر آ جائیں۔ پوری چھ نندیں ہیں آپ کی اور ایک سے ایک پٹاخہ... پٹاخہ سمجھتی ہیں نا جو عموماً ہمارے ملک کے نامعقول لڑکے شب برات کے دن

چھوڑتے ہیں اور خود تو گناہ گار ہوتے ہی ہیں دوسروں کے دماغوں کی چولیں بھی ہلا ڈالتے ہیں۔"

"شہری کی بچی... مجھے ڈرائو تو مت۔" نادیہ آپی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ان کی چھ نندوں کا جو نقشہ شہرینہ نے کھینچا تھا انہیں ہولانے کو کافی تھا۔ وہ یوں خوفزدہ دکھائی دینے لگیں گویا واقعی وہ بارود والے پٹاخے ہوں اور ان کے شامیانے میں پہنچتے ہی پھٹ پھٹ قدموں کے پاس پھٹنے لگیں گے۔

"ارے تم ابھی یہیں ہو۔" سکندر تیزی سے اندر آ رہا تھا۔ دونوں کو کامن روم میں گرِل کے پاس کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ایک نظر سجی سنوری نادیہ آپی پر ڈالی پھر بے اختیار ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جائو جائو شاباش گھبرائو مت کچھ نہیں ہو گا۔" وہ تسلی دینے کے انداز میں بولا۔

"کچھ تو ہو گا... یعنی رسم۔" شہرینہ چمک کر بولی تو وہ اس کی موجودگی کا احساس کر کے اس کی سمت دیکھنے لگا۔ اسے یکدم اپنی آنکھیں خیرہ ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ یوں جیسے جھلمل

جھلمل ڈھیر ساری روشنیوں پر نگاہیں ٹھہر گئی ہوں... وہ چاہنے کے باوجود ایک دو پل اس کے دمکتے چہرے سے نگاہیں نہ ہٹا سکا تھا۔

پہلی بار وہ اتنی سج دھج کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔ یوں بھی دل کے اندر چور جذبے نہ ہوتے تو شاید وہ حسین سے حسین چہرے پر بھی ایسی بے ایمان نظریں نہ ڈالتا۔ وہ ایسا دانستہ نہیں کر رہا تھا مگر نادانستگی میں سرزد ہونے والی حرکت پر فوراً ہی خفیف سا ہو کر پیچھے ہٹا تھا۔

عجیب سا احساس دل پر وحشت بن کر چھا گیا۔ وہ اپنے اندر سے اٹھنے والے احساسات سے خود ہی یوں گھبرا اٹھا جیسے کوئی جرم کرتے ہوئے دیکھ لیا گیا ہو۔

پتہ نہیں وہ بزدل تھا یا مصلحت اندیش کہ اپنے احساسات و جذبات خود سے بھی چھپاتا پھر رہا تھا۔

"چلیں آپی!" شہرینہ اس کے دل کی حالت سے بے خبر نادیہ آپی کو تھام کر آگے بڑھ گئی جبکہ نادیہ آپی نے سکندر کی وہ "چوری" بہت چپکے سے پکڑ لی تھی۔ انہوں نے اس کی آنکھوں کا شہرینہ کی طرف اٹھنا اور لحظہ بھر کے لئے جھپکنے کے عمل کے بھول جانے کو بہت واضح شدت سے محسوس کیا تھا۔ پسندیدگی کے وہ رنگ جو بس پل بھر کو چمکے... تھے اور

معدوم ہو گئے تھے یا پھر اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا تھا' نادیہ آپی سے چھپے نہ رہ سکے تھے۔

انہوں نے چلتے ہوئے ایک نظر شہرینہ پر ڈالی اور جانے کیا سوچ کر مسکرا دیں... اگر سامنے عورتوں سے بھرا شامیانہ نہ ہوتا تو وہ یقیناً ابھی بہت کچھ سوچتیں اور خوشگوار خیالات کی رو میں بہک کر کہیں سے کہیں جا پہنچتیں... مگر یکدم ان کی ساری توجہ اپنے استقبال میں پھینکی جانے والی گلاب کی پتیوں کی طرف ہو گئی۔

X...X...X

عجب اس کا رنگِ جمال ہے
کہ چمک اٹھا ہے مکان بھی
عجب اس حسیں کا خیال ہے
کہ مہک رہا ہے گمان بھی

وہ دونوں ہتھیلیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکائے بظاہر شامیانے کی طرف سے آتی روشنیوں کو گھور رہا تھا مگر ذہن پر ایک رنگین سی دھند چھائی ہوئی تھی جس میں سے ایک ہی چہرہ جھانک رہا تھا۔

مہکتا ہوا

خوشبو لٹاتا

معصوم

سادہ بے ریا اور ہنسی بکھیرتا ہوا

اس کا دھیما دھیما خیال ذہن کی سطح پر کسی نرم کنول کی طرح تیر رہا تھا۔ اسی دم کمرے کا دروازہ دھاڑ سے کھول کر ولید اندر آیا تھا اور جیسے اس کے روپہلے خیالات کا تسلسل ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

وہ پلٹا۔

"سوری سکندر! ایکسٹریملی سوری یار!" وہ جلدی سے ہاتھ اٹھا کر سرعت سے بولا اور سکندر کو جارحانہ انداز میں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر دونوں ہاتھ حفظ ماتقدم کے طور پر آگے کر دیئے۔

"یقین کرو، میں انتہائی شرمندہ ہوں۔" وہ شرمندگی اور ندامت کے احساس سے لبریز ہو کر بولا۔ سکندر خفگی بھری نظروں سے اسے گھورے جا رہا تھا۔

"کوئی سوری ووری نہیں چلے گی، جواز بتاؤ وقت دیکھ رہے ہو اور یقینا باہر دیکھ کر ہی آ رہے ہو کہ کھانا لگ چکا ہے۔" وہ اسے کسی قسم کی بھی رعایت دینے کو تیار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ولید صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا، کچھ ڈھیٹ تو وہ بھی واقع ہوا تھا اور کچھ سکندر کے نقوش میں بھی اتنی بے رحمی نہیں تھی۔

اس نے ایک گہری سانس بھر کر روتھ مین کا پیکٹ جیب سے نکالا اور اس میں سے ایک سڈول سگریٹ نکال کر اسے لائٹر کا شعلہ دکھایا۔

"ایک مصیبت میں پھنس گیا تھا یار!" اس نے ایک کش لے کر دھواں فضا کے سپرد کیا اور سر صوفے کی پشت پر ٹکا دیا۔

"کیسی مصیبت؟" سکندر نے اسے گھورا پھر باقاعدہ جانچتی نظروں سے دیکھا۔

تبھی عقب سے نادیہ آپی کے ساتھ اندر داخل ہوتی شہرینہ کی آواز ابھری۔

"سکندر بھائی! ذرا اس "مصیبت" کا نام بھی پوچھ لیجئے گا اگر بتانا پسند کریں تو۔" اس کا لہجہ معنی خیز ہی نہیں قدرے تلخ اور چبھتا ہوا بھی تھا۔ ولید چونک کر اس کی سمت گھوما اور جیسے لحظہ بھر ٹھٹک کر نگاہوں کا زاویہ بدلنا بھول گیا۔

"آپ بیٹھئے آپی! یہاں اطمینان سے' آپ کی نندوں نے تو آپ کو تھکا ڈالا۔ میں عظمیٰ یا کسی لڑکی کے ہاتھ آپ کو کچھ کھانے کے لیے بھیجتی ہوں۔"

وہ اس کی اٹھنے والی نگاہوں سے یکدم بے نیاز بن کر نادیہ آپی سے مخاطب ہوئی۔ یوں بھی اسے یقین تھا کہ اس کے جملے کا جواب اس سے بن نہ پڑے گا۔ وہ جس سرعت سے اندر آئی تھی اس سے بھی

زیادہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

کمرے میں اس کے جانے کے بعد بھی چند لمحے سکوت سا چھایا رہا۔ شاید یہ سکوت ولید اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔

مگر دوسرے پل اس کے اندر سے کہیں اضطراب کی لہر پھوٹ پڑی تھی۔ اس کا لہجہ شگفتہ ہر گز نہیں تھا بلکہ اس کے مزاج اور عادت کے خلاف معنی خیز اور چبھتا ہوا تھا۔

"یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی نا ولید بھائی آپ تو بالکل غیروں کی طرح آئے ہیں۔" نادیہ آپی اس سے شکوہ کر رہی تھیں۔

"بلکہ غیر بھی کب کے آچکے ہیں آپ کو تھوڑی شرم ضرور آنی چاہئے تھی۔"

"ساری مصیبت تو یہی ہے نادیہ سسٹر کہ اس لڑکے کو شرم نہیں آتی۔"

سکندر نے اس کی انگلیوں میں دبی سگریٹ جھپٹ کر ایش ٹرے میں رگڑ ڈالی اور اسے گھورنے لگا۔

""شرم کس چڑیا کا نام ہے یہ شخص اس سے نابلد ہے۔سچ سچ بتاؤ اس مصیبت کا نام کیا ہے جو تمہارے گلے پڑ گئی تھی آناً فاناً اچانک۔""

""تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مصیبت یوں آناً فاناً اور اچانک ہی آتی ہے۔اسی لئے مصیبت کہلاتی ہے' وہ کپڑوں کو جھاڑنے کے انداز میں ہاتھ پھیرتا کھڑا ہو گیا۔

""اب جا کہاں رہے ہو۔بات تو سنو۔"" اسے دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر سکندر نے پکارا۔

""اب اکٹھی ہی باتیں ہوں گی پہلے فرض تو نبھالوں بلکہ قرض چکا دوں۔"" وہ دروازے کے فریم پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا پلٹا۔

""کوئی ضرورت نہیں ہے انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہونے کی۔""

""تو انگلی کون کٹا رہا ہے میں تو لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہو رہا ہوں۔"" وہ قہقہہ مار کر باہر نکل گیا۔سکندر رضا ملتے پردے کو گھورتا رہ گیا۔

X...X...X

شامیانے میں ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ہر شخص کھانے پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔اس نے شامیانے کے داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر سرسری جائزہ لیا غیر محسوس طور پر اس کی نگاہیں یہاں وہاں جیسے کسی کو کھوجنے لگیں پھر ایک جگہ جم گئیں۔

وہ تین چار لڑکیوں کے ساتھ کھڑی کسی بات پر ہنس رہی تھی... وہ کچھ دیر وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔اس کی خوبصورت آنکھوں میں ایک مدھم سی چمکیلی مسکراہٹ آئی تھی۔پھر وہ چونکا وہ ان لڑکیوں سے ہٹ کر دوسری طرف جا رہی تھی شاید اس میز پر جہاں کراکری کا سامان اور پانی سے بھرے جگ اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔وہ کچھ سوچ کر تیزی سے اسی حصے کی طرف بڑھنے لگا اور پھر آہستگی سے اس کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔تب وہ گلاس پانی سے بھر کر پلٹی تو اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔گلاس سے پانی چھلک کر اس کی سیاہ پشواز کو ذرا سا بھگو گیا۔کئی چھینٹے اس کے کلف لگے کرتے پر بھی گر کر اس کے سینے پر ٹھنڈک کا احساس پیدا کر گئے۔

''اب خوبصورت لوگوں کو دیکھ کر اس طرح بھی حواس نہیں کھو دینے چاہئیں۔'' وہ اس تصادم پر اسے سرعت سے قدرے بوکھلاہٹ سے پیچھے ہٹتے دیکھ کر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''کیا آ... کیا اتنے ہی حسین ہیں نا آپ۔'' جواب اس کے اندازے کے عین مطابق ہی آیا۔ وہ سر سے پیر تک سلگ گئی۔

''یہ لیجئے اور پونچھ لیجئے دو چھینٹے ہی گرے ہیں۔'' اس نے دائیں طرف ہو کر میز پر رکھی پلیٹوں کے نیچے سے ٹشو کھینچ کر اسے تھما دیا۔

''وہ اور ہوں گی جو حواس کھوتی ہوں گی اور وہی لڑکیاں آپ کی قربت پر خوش ہوتی ہوں گی۔''

اس نے گویا دل کا پھپھولا بھی پھوڑ ڈالا۔ وہ چونک کر نئے سرے سے باقاعدہ اسے دیکھنے لگا۔

خوبصورت چہرے پر خوبصورتی کے علاوہ ناراضگی اور ہٹیلا پن دکھائی دے رہا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''اوہو... تو یہ غم منایا جا رہا تھا۔'' اس کے ہونٹوں کی تراش میں بے ساختہ مسکراہٹ چمکی جو اسے خفیف سا کر گئی۔

''میں ایسے فضول غم نہیں پالتی۔'' اس کا لہجہ ہٹیلا ہو گیا مگر وہاں تو اطمینان ہنوز قائم تھا۔ وہ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ تلاش کر رہا تھا۔ پیکٹ نکال کر اس سے سگریٹ نکالتے ہوئے اس کی سمت معنی خیزی سے دیکھا اور اپنے تراشیدہ ہونٹوں میں سگریٹ پھنسا کر اسے لائٹر کا شعلہ دکھاتے ہوئے بولا۔

''تو اتنے اچھے فنکشن میں اتنا چڑنے کی وجہ کیا ہے' شاید میں نے تمہیں سراہا نہیں ہے اس لیے۔ ہوں محنت تو خاصی کر ڈالی ہے۔''

اس نے بغور اس کے سراپے پر نگاہیں دوڑائیں اور جیسے توصیفی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''واقعی مجھ سے زیادتی ہو گئی۔ مجھے کیا خبر تھی۔''

وہ ایک قدم آگے آیا اور سگریٹ کو ہونٹوں سے ہٹا کر مسکراتے ہوئے مزید کچھ کہنا چاہا۔ وہ احساس تذلیل سے سلگ گئی آئو دیکھا نہ تائو ہاتھ میں پکڑا ہوا پانی سے بھرا گلاس جھپاک سے اس کی سمت اچھال دیا۔

یہ حملہ اس قدر غیر متوقع اور اچانک تھا کہ ولید حسن سنبھل بھی نہ سکا اور نتیجتاً ٹھنڈے یخ پانی سے بھیگ گیا۔

لحظہ بھر کے لئے اس کے اعصاب بھی ٹھٹھر گئے۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ سرعام اس طرح کی کوئی جوابی کارروائی کرے گی۔ مگر دوسرے پل اس نے ہاتھ میں پکڑی سگریٹ زمین پر پھینکی اور اس پر پیر رکھ کر غصے کے شدید ترین احساس کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

”اوہ... یو۔“

وہ اپنی اس بے ساختہ حرکت پر اب خود بھی سراسیمہ تھی گھبرا کر پیچھے ہٹی مگر پشت پر دھری بڑی سی میز کی وجہ سے بھاگنے کا راستہ بھی نہیں تھا۔

اس کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر یکدم امڈنے والی سرخی نے اس کی ساری طراری دھوئیں کے غول کی طرح اڑا دی۔ اس سے پہلے کہ وہ ادھر ادھر بچائو کے لیے راستہ تلاش کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کرتی اس نے غصے کے عالم میں اس کی کلائی ایک جھٹکے سے پکڑ کر کھینچی۔

کئی ایک سیاہ کامدانی چوڑیاں کرچی کرچی ہو گئیں۔

”ارے ولید بھائی! آپ کب آئے۔“

تانیہ کی کچھ فاصلے سے چہکتی آواز ابھری تو اس نے سرعت سے اس کی کلائی چھوڑ دی اور اس پر ایک تند نگاہ ڈال کر آواز کی سمت رخ موڑا اور بس یہی لمحہ اس کے لئے نجات دہندہ ثابت ہوا۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح اس کے دائیں طرف سے ہو کر بھاگی۔

”ارے شہری... لو اسے کیا ہوا۔“

تانیہ قریب آئی پھر جھٹکے سے بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے اس سے ٹکرائی مگر رکی نہیں۔

ولید نے ایک گہری قدرے بھنچی بھنچی سی سانس بھر کر اس کے لہراتے بالوں کے آبشار کو دیکھا۔ یوں جیسے کوئی نامراد شکاری جال توڑ کر بھاگنے والے ہرن کو دیکھتا ہے۔ پھر تانیہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو خود شہرینہ کے یوں حواس باختہ بھاگنے پر متحیر سی کھڑی تھی۔

"یہ اسے کیا ہوا؟" اس نے چہرہ ولید حسن کی طرف کیا اور بے ساختہ معنی خیزی سے ہنس پڑی۔

"کہیں آپ نے کوئی فلمی ڈائیلاگ تو نہیں مارا تھا۔ ویسے آج شیری لگ بھی بہت پیاری رہی تھی، میری کئی جاننے والیاں تو اسے اپنے بھائی بیٹوں کے لیے پسند کر چکی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی مگر اس کے لبوں میں مدھم سی مسکراہٹ بھی نہ جاگی۔

"ارے یہ آپ کے کپڑے۔" وہ اچانک اس کے کپڑوں کو دیکھ کر چونکی۔

"نومی کہاں ہے؟" اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کا لہجہ اس قدر روکھا اور دوٹوک سا تھا کہ تانیہ سنبھل سی گئی۔

"ابھی تو ادھر ہی تھا۔ ٹھہریئے میں بلاتی ہوں۔"

"نہیں رہنے دو میں خود دیکھ لیتا ہوں۔" وہ میز پر رکھے ٹشو بکس سے ایک ساتھ کئی ٹشو نکالتا ہوا بولا اور قدم اٹھاتا وہاں سے ہٹ گیا۔

X...X...X

وہ زور زور سے منہ رگڑ رگڑ کر دھوتے ہوئے دل ہی دل میں اسے کوسنوں سے بھی نواز رہی تھی۔ وہ سب اس کے ارد گرد کھڑی چیخ رہی تھیں۔

"آخر ہوا کیا کچھ بتاؤ تو گدھی لڑکی؟ کیوں دھو رہی ہو منہ۔"

"شیری! کم از کم مہمانوں کو رخصت تو ہونے دیتیں۔"

"ایسی ویسی۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا پھر چٹکی بجا کر بیڈ سے اتر کر گھومنے لگا۔

ہر شے میں صورت تمہاری ہے
نظاروں میں تم بہاروں میں تم
چاروں طرف دیکھتے ہیں تمہیں
اس میں خطا کیا ہماری ہے

"فی الحال تو تم مجھے نشے میں دکھائی دے رہے ہو۔" اب اس کی برداشت جواب دینے لگی تو اسے پکڑ کر دھکا دیا۔ وہ لہراتا ہوا بیڈ پر گر گیا پھر اس کے چڑنے اور کمر پر ہاتھ رکھ کر گھورنے پر زور سے ہنس دیا۔

"ایمان سے امی تم اسے دیکھو گی تو مجھے داد دیئے بغیر نہیں رہو گی۔ تم بھی کہو گی کہ کیا فنٹاسٹک لڑکی چوز کی ہے مگر ایک مسئلہ ہے امی سسٹر!" وہ سر کھجانے لگا۔

"ہے بڑی خرانٹ قسم کی' پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی۔ اپنی وے بہت دیکھی ہیں ایسی خرانٹ بھی۔" وہ خود ہی غیر سنجیدگی سے سر جھٹک کر بولا۔

"اکبر شاہ نام ہے میرا۔ وڈیرا امر دان علی شاہ کا بیٹا۔" وہ ہنکارا بھر کر کھڑا ہو گیا اور پہلو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"چھوڑو ان باتوں کو وہ رقم دو جو اداسائیں بطور امانت تمہیں دے گئے ہیں۔"

"پکے خبیث ہو۔ تمہاری امانت کہاں سے ہو گئی۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس نے ایک تیز نظر ڈالی اور وہیں بیٹھے بیٹھے ذرا سا آگے ہو کر جھک کر دراز کھولی اور اس میں سے نوٹوں کی گڈی نکال کر اس کی پھیلی ہتھیلی پر پٹخ دی۔

"ایسی کون ہے جو پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہی ہے۔" وہ سنجیدگی کے ساتھ قدرے بدمزہ ہو کر بولی۔

"یہی سمجھ لو نخرہ ہی دکھا رہی ہے' ویلیو ہی بڑھا رہی ہے۔ ویسے اداسائیں نے یہ بہترین کام کیا ہے۔" اس نے نوٹوں کی گڈی کو کنارے سے پکڑ کر لہرایا پھر اسے چوم لیا۔

"بس اپنے پاس یہ ہونا چاہئے ہزار اپنی آنکھوں کے ساغر پلانے والیاں مل جاتی ہیں۔" وہ ایڑیوں کے بل گھوم کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"تو پھر اس نخریلی کے پیچھے خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

وہ برش اٹھا کر بالوں میں پھیرتے ہوئے نخوت سے بولی۔

"ہر شراب نشہ آور ہوتی ہے مگر ہر شراب کا نشہ مختلف ہوتا ہے۔ سو ہر نشے کا ذائقہ چکھ لینا چاہیئے کیا خیال ہے۔" وہ آنکھ دبا کر ہنس پڑا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اس پر ہاتھی دانت کے ہینڈل والا برش کھینچ مارا تھا مگر وہ جھکائی دے گیا اور کمرے سے نکل بھاگا۔

X...X...X

بہت دن رہ لیے ناراض اب من جائیں ہم دونوں

چلو اک بار پھر سے آشنا بن جائیں ہم دونوں

وہ باتھ روم سے نکلا اور بیڈ پر پڑا تولیہ اٹھانے جھکا کہ بیڈ کے عین وسط میں پنکھے کے زور سے پھڑ پھڑاتا ہوا پرچہ اس کی نظروں میں آیا۔ جس پر شعر لکھا ہوا تھا۔ اسے سمجھنے میں قطعی دیر نہ لگی کہ یہ حرکت سراسر شہرینہ کی تھی اس نے پرچہ اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا جو ادھ کھلا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس بھر کر فضا میں ایک مخصوص خوشبو محسوس کی جو شہرینہ عموماً استعمال کرتی تھی۔ کمرے کی فضا میں مدھم خوشبو کا احساس ابھی تک باقی تھا۔ اس کا مطلب ہے اسے یہاں سے گئے چند منٹ ہی ہوئے تھے۔ بے اختیار اس کے لبوں کی تراش میں

مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے پرچے پر دوبارہ نظر ڈالی اور تولیہ ایک طرف ڈال کر پیروں میں سلیپر ڈال کر کمرے سے باہر آ گیا۔

ڈرائنگ روم میں ناشتے کی میز پر شاید اس کا انتظار ہو رہا تھا۔

آغا جی اور پاپا کی ہمیشہ کی طرح ملکی مسائل پر گفتگو جاری تھی۔ وسیم بھائی ان کی گفتگو میں گاہے بگاہے شامل ہو رہے تھے۔ اخبار کے مختلف صفحات ان تینوں کے ہاتھوں میں تھے۔

اس نے نظریں مونا بھابی کے برابر کرسی پر ڈالیں جہاں وہ اسے دیکھ کر نوالے جلدی جلدی حلق سے اتارنے لگی تھی۔ اس پر یکدم گھبراہٹ کا حملہ ہوا تھا۔ شاید وہ اس کے یونیورسٹی نکل جانے سے پہلے یہاں قدم رکھ چکا تھا۔

سادہ سے نیلے شلوار قمیص اور سفید سیاہ کلف کے دوپٹے میں وہ شبنم سے نہائے ہوئے پھول کی طرح تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔ بیگ کندھے پر جھول رہا تھا۔

"ارے لڑکی کچھ بھی بھاگا نہیں جا رہا ہے۔ اطمینان سے کھاؤ جلدی کس بات کی ہے۔" مما نے اسے ٹوکا۔ وہ اس کی بدحواسی محسوس کر کے دل ہی دل میں مسکراتا ہوا کرسی کھینچ کر عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"صبح بخیر۔" وہ باآواز بلند بولا۔

"کیا بات ہے آج کچھ دیر سے جاگے ہو۔" آغا جی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ہاں بس کل سکندر کے گھر ہی گپ شپ میں دیر ہو گئی اور آپ کو تو پتہ ہے نیند کا ٹائم نکل جاتا ہے تو پھر بہت مشکل سے اور دیر سے نیند آتی ہے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے ناشتے کی میز پر رکھے لوازمات پر نظریں دوڑائیں۔

"شہری تم کس کے ساتھ آئی تھیں۔" ممانے آملیٹ کی پلیٹ صغریٰ کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھتے ہوئے اس کی سمت دیکھا جو چائے کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے ٹھٹک گئی۔

وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا پرچہ کھول کر میز پر اپنے آگے پھیلا کر بڑے مزے سے اس کے اوپر آملیٹ کی پلیٹ رکھ رہا تھا۔ اس کا دل سینے میں گویا دھک سے رہ گیا۔ وہ بالکل آغا جی کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اسے لگا وہ ابھی کل کی اس کی حرکت کی رپورٹ پیش کرنے کی تیاری کر رہا ہو۔

"وہ... وہ میں خود اپنی گاڑی میں آئی تھی۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ایں... اتنی رات تم تنہا آئیں خود ڈرائیونگ کر کے۔" ممانے حیرت اور قدرے ناراضگی کے ساتھ اسے گھور کر دیکھا۔

"نن... نہیں نا... اتنی رات کہاں میں تو جلدی آ گئی تھی۔" وہ جلدی سے وضاحت کرنے لگی۔

"کیوں... خیریت... تانیہ نے تمہیں جلدی کیسے آنے دیا۔"

اف مما کو بھی ابھی انویسٹی گیشن کرنی تھیں۔

"کون سا یہ تانیہ سے پوچھ کر آئی تھی۔ چپکے ہی چپکے وہاں سے بھاگ نکلی۔ نادیہ اور تانی تو اسے کوسنے دیتی رہ گئیں۔" بھابی بھی اسے گھور رہی تھیں۔

"میں تھک گئی تھی تانی کو بتا کر تو آئی تھی۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ تھکن کچھ اچانک غالب نہیں آ گئی تم پر۔" ولید نے پلیٹ کے نیچے سے وہی کاغذ نکالا اور نیپکن کی طرح فولڈ کر کے اس سے بالائی ہونٹ پونچھے پھر چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا کر

اسے معنی خیزی سے دیکھنے لگا۔اس کے چہرے پر خاصی سنجیدگی تھی۔اس کا دل حلق میں پھنسنے لگا۔اس کی سنہری آنکھوں میں یکدم التجا سی کروٹیں لینے لگی۔

"میرا تو خیال ہے کہ تم وہاں سے اس لیے چل دیں کہ۔"

"ارے آغا جی آج میں نے ایک مفکر کی بڑی اچھی بات پڑھی ہے۔" وہ تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کرسی پر ہاتھ جماتے ہوئے اس پر نگاہ ڈال کر آغا جی سے بولی۔ تو آغا جی نے اخبار سے نظریں اٹھائیں اور قدرے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"بڑی اچھی بات کہی ہے کہ۔ معاف کر دینا انتقام لینے کا سب سے کامیاب طریقہ ہے۔ اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو کامیابی کے اس راز کو جانتے ہیں۔"

ولید نے جلدی سے چائے کا کپ لبوں سے ہٹایا تھا اسے اچھو سا لگتے لگتے رہ گیا۔ وہ کھانس کر رہ گیا۔

"ہے نا آغا جی کتنی عمدہ بات۔ میرا خیال ہے ہم سب تو اب اس راز کو جان ہی گئے ہیں تو عمل بھی کرنا چاہئے۔یعنی معافی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔یوں بھی معافی کو تو اللہ بھی پسند کرتا ہے۔"

آغا جی نے اخبار ترک کر کے ایک طرف رکھا اور اسے بغور دیکھا۔

"یہ تم مفکروں کو کب سے پڑھنے لگی ہو اور خدانخواستہ ہمارے کون سے دشمن پیدا ہو گئے ہیں۔"

وہ آغا جی کی بات پر کچھ کھسیا کر کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رگڑتے ہوئے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔"میں نے تو ایک اچھی بات پڑھی ہے سو سنا دی آپ لوگوں کو۔"

"اگر دشمن نے اس مفکر کی یہ اچھی بات نہ پڑھی ہو پھر یا پڑھ کر عمل کرنے کا ارادہ نہ ہو پھر۔" وہ دوبارہ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا اور نہایت پر سکون انداز میں اس کا جائزہ لینے لگا۔

شہرینہ کا دل چاہا میز کے درمیان رکھا کرسٹل کا بڑا سا یہ گلدان اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے اور سارا ڈر خوف بالائے طاق رکھ کر اس سے لڑ پڑے۔

مگر میز پر صرف آغا جی ہی نہیں تھے اس نے خاصی شکایتی نظر اس پر ڈالی مگر وہ اب اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔اس معافی نامے کو دیکھ رہا تھا جسے دے کر اب وہ پچھتا رہی تھی۔

"کیا ہے اس پرچے میں آخر کہ تم نیپکن کی جگہ بھی اسے ہی استعمال کر رہے ہو۔" وسیم بھائی سے آخر رہا نہیں گیا۔انہوں نے نیپکن اٹھا کر اس کی طرف پھینکا اور پرچے کی سمت ہاتھ بڑھایا۔

شہرینہ کا دل حلق میں آگیا۔اس نے جلدی سے اب یہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت سمجھی اور وہاں اپنے شوز تلاش کرنے لگی۔حالانکہ وہ سامنے ہی پڑے تھے پھر اسی بدحواسی میں ڈھونڈ کر اس میں پیر پھنساتے ہوئے یونہی میز پر نگاہ ڈالی۔

وسیم بھائی کے ہاتھ کی پہنچ سے ولید نے وہ پرچہ دور کر دیا تھا۔

"یہ بہت قیمتی ہے۔" اس نے ساتھ ہی وسیم کو آنکھ ماری تو انہوں نے اوہ کے ساتھ ہونٹ سکیڑ کر بے اختیار ہلکی سی سیٹی بجائی۔وہ زور سے ہنس پڑا۔

"افوہ... کتنا قیمتی ہے۔ذرا قیمت بتائیے گا۔" مونا بھابی کی بھی ساری توجہ کھٹ سے ادھر ہی ہو گئی۔

ولید نے ایک نظر ادھر ڈالی جہاں وہ بھاگنے کی تیاری میں تھی۔مما گرل کے پاس جا کر ڈرائیور کو اپنا کوئی کام سمجھا رہی تھیں۔

"قیمتی چیزوں کی قیمت نہیں ہوتی احمق بھابی۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

"اوئے ہوئے تو بے قیمت ہے یہ کہو نا۔"

"نہیں' بے بہا ہے۔" اس نے اطمینان سے پرچہ اپنے کرتے کی اوپری جیب میں ڈالا اور مسکراہٹ کی بے پناہ لطافت کے ساتھ اس پر نگاہ ڈالی۔ "مما جب بھی میرا یونیورسٹی جانا ہو گا آپ کو ڈرائیور سے ہزاروں کام یاد آجائیں گے۔" وہ جھنجھلا رہی تھی۔

"دو منٹ سے کیا ہوتا ہے شہری تمہاری اپنی گاڑی کہاں ہے۔" مما نے اس کی جھنجھلاہٹ کو خفگی بھرے انداز سے دیکھا۔

"جہنم میں... چلو صولت خان۔" وہ گرل جھٹکے سے کھول کر باہر نکل گئی۔اس کا موڈ بری طرح خراب ہو گیا تھا اور ولید جانتا تھا آج کا سارا دن اس کے جلنے کڑھنے اور اسے کوسنے میں ہی گزرے گا۔اس کے خیال میں اس کے لیے یہ ہی سزا کافی تھی۔

X...X...X

وہ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد آغا جی کے کمرے میں چلا آیا۔ جہانگیر احمد (پاپا) بھی وہیں تھے اور بریف کیس کھولے کاغذوں میں الجھے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر چشمہ ٹکا ہوا تھا۔ وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔

"انکل میں نے ایک کام کہا تھا آپ سے۔" جہانگیر احمد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر سر ہلاتے ہوئے مطلوبہ فائل نکال کر یہاں وہاں بکھیرے کاغذات اس میں رکھتے ہوئے ایک لمحے گہری سوچ میں پڑ گئے۔ تفکر کی لکیریں ان کی پیشانی پر ابھر آئیں۔ چشمہ اتار کر انہوں نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے آنکھیں رگڑیں۔

"ولید!" آغا جی نے اپنی چیئر سے اٹھ کر اس کی پشت کے پاس آکر اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"کیا یہ جان بوجھ کر آگ میں کودنا نہیں ہے۔" ان کا لہجہ نادیدہ خوف سے پھیکا پھیکا سا تھا اور آواز میں ہلکی لرزش۔ جیسے سایہ روشنی سے لرزتا دکھائی دیتا ہے۔ جہانگیر احمد نے سر ہلاتے ہوئے ولید کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ہاں ولید! آغا جی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم ہمیں بہت عزیز ہو اور میں کبھی کبھی بہت خوفزدہ ہو جاتا ہوں ایسا لگتا ہے جیسے تم اپنے چاروں طرف آگ دہکا رہے ہو۔ جان بوجھ کر آگ کو چھو رہے ہو۔ کہیں جل نہ جائو ولید!" انہوں نے کب کا دبا خوف زبان سے ادا کر دیا۔ اپنے اندیشے باہر نکال کر رکھ دیئے اور وہ ہلکے سے ہنس دیا۔

"تو کیا ہو گیا مجھ سے پہلے بھی تو بہت قیمتی لوگ جل چکے ہیں۔ ان کے سامنے میری کیا حیثیت۔ ایک میں اور سہی۔"

"نہیں ولید وہ دانستہ نہیں جلے تھے۔ وہ بے خبری میں اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور تم، تم جان کر آگ میں کود رہے ہو۔" جہانگیر احمد مضطرب سے کھڑے ہو کر ٹہلنے لگے پھر پلٹ کر اضطراب سے بولے۔

"میں تمہیں اچھے کاموں سے نہیں روک رہا تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارا کام نہیں کرنا چاہتا یا تمہاری راہ میں رکاوٹ ڈال رہا ہوں جو تمہارا خواب ہے میرا بھی خواب ہے۔ ہر محب وطن کا خواب ہے مگر تم صرف یہاں تک محدود رہو گے یہ وعدہ کرو تو مطمئن ہو جائوں۔ مجھے اور آغا جی کو تسلی ہو جائے کہ تم۔"

"پلیز انکل۔" وہ یکدم ہونٹ بھینچ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں اس طرح کے کسی بھی وعدے کی زنجیر میں خود کو نہیں جکڑ سکتا۔ باہر کی آگ سے زیادہ اندر کی آگ تباہ کن ہوتی ہے اور مجھے اس آگ کو نکالنے دیجئے پلیز آغا جی! نکالنے دیجئے اس آگ کو جو میری رگوں کو کاٹتی رہتی ہے، پلیز!"

شدید کرب کے عالم میں اس نے دیوار پر ہاتھ کا مکا بنا کر دے مارا۔ اس کا چہرہ اندرونی خلفشار سے دھیرے دھیرے یوں دہکنے لگا جیسے کوئی آتش دان میں لکڑیاں ڈالتا جا رہا ہو۔"

اسے لگا جیسے اس کی ذات کی گہرائیوں میں مدفون شعلوں کو کسی نے یکدم ہوا دے دی ہو۔

"چلو چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ جگہ تو تم نے پسند کر لی ہے نا۔ میں بات کر لیتا ہوں، کام تو منٹوں کا ہے بس سجاد صاحب کسی پرسنل وزٹ پر اسلام آباد گئے ہوئے ہیں، میں آج ہی بات کرتا ہوں، پھر تم جب چاہو چیک کیش کرا کے وہاں کنسٹرکشن شروع کروا دو۔ او کے اب خوش۔"

انہوں نے بے حد محبت سے اس کا کندھا تھپکا۔ ان کے چہرے پر سارے جہاں کا پیار تھا جو ولید حسن کی رگوں میں سرشاری، ممنویت اور طمانیت کا احساس بھر گیا۔

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں یوں جیسے بجھتے ہوئے دیے میں کسی نے بہت سا تیل ڈال دیا ہو اور وہ پوری آب و تاب سے جھلملا گیا ہو۔

تشکر کی احساس سے اس نے جہانگیر احمد کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ یکدم بچوں کی مانند خوش دکھائی دینے لگا۔

"آئی ایم تھینک فل ٹو یو۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں انکل! جن سے میں آپ کی محبتوں کا اعتراف کر سکوں۔"

اس کے چہرے پر سرخی میں جذبات کی حرارت کا ہالہ سا تھا۔ وہ جس قدر مسرور تھا اس قدر ظاہر کرنے سے گریز کر رہا تھا مگر باوجود اس کے اس کا چہرہ اس کے دلی جذبات کی غمازی کر رہا تھا۔

"والدین اول تو جو کچھ اولاد کے لیے کرتے ہیں جوابا وہ اولاد سے لفظوں سے اعتراف کی تمنا نہیں رکھتے اور دوسرا اولاد کی آنکھوں سے وہ اپنی محبت کا جواب اس سے بھی زیادہ خوب

صورت پا لیتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ لفظوں کی اہمیت یوں بھی ختم ہو جاتی ہے۔" جہانگیر احمد شگفتگی سے ہنسے۔

"او کے تم کل ایسا کرنا گیارہ بجے آفس آ جانا میرے۔" اس نے سر ہلا کر گہری سانس بھری۔ بے غرض محبت بھی ایک عجیب ہی ٹانک ہے۔

اسے لگا جیسے اس کی روح کی تھکن پر شگفتگی کی پھوار سی پڑ گئی ہو۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔ اس کے کمرے سے جاتے ہی جہانگیر احمد سگریٹ نکال کر اسے لائٹر کا شعلہ دکھانے لگے اور پھر ایک طویل اور گہرا کش لے کر سارا دھواں جیسے اندر بھرتے ہوئے پہلی بار اس کی تلخی کو محسوس کرنے لگے۔

"کیا یہ ٹھیک ہے جہانگیر!" آغا جی نے بڑے مضمحل سے انداز میں اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ان کا چہرہ دیکھا جو دھوئیں کے غبار سے دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ انہیں لگنے لگا جیسے یہ سارا دھواں صرف باہر ہی نہیں جہانگیر اور خود ان کے اندر بھی اتر رہا ہو۔

"بہت ضروری ہے آغا جی اس نے جو ٹھان لی ہے وہ کر کے رہے گا۔ آپ تو اسے مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔" انہوں نے آغا جی کی طرف دیکھا اور جھولتی کرسی پر خود کو گرا دیا۔

"میں نہیں چاہتا کہ وہ دوہری اذیت میں گرفتار ہو جائے۔ اپنے اندر کے بکھرے وجود کو سمیٹے وہ بہت حوصلے کے ساتھ بڑھ رہا ہے میں کیسے یکدم اس کے حوصلوں کو بکھیر دوں۔" وہ افسردگی کے سحر میں گرفتار سے کرسی پر جھولنے لگے۔

"اس نے آج تک مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ کوئی فرمائش نہیں کی۔ بے حد ضدی ہونے کے باوجود مجھ سے کبھی ضد نہیں منوائی۔ پہلی بار ہی تو اس نے ایک خواہش کی ہے مجھ سے۔ پہلی بار ہی تو ضد کر رہا ہے۔"

"مگر جہانگیر! اگر وہ ایسی ضد کر رہا ہے جو اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے تو ایسی ضد پوری کرنا دانائی نہیں ہے۔" آغا جی کے چہرے پر تشویش کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ جہانگیر احمد خود کو سخت بے بس محسوس کر کے رہ گئے پھر ارد گرد بکھرے کاغذات بریف کیس میں بھرنے لگے۔

"اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں ولید کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔ میں اس کے چہرے پر خوشی دیکھنا چاہتا ہوں' اس کے لبوں پر مسکراہٹوں کی بہار دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تو تمہارے خیال میں ایسا کرتے ہوئے اسے وقتی خوشی دے کر کسی بڑے دکھ' بڑے نقصان کا در نہیں کھول رہے تم؟" آغا جی دکھ اور افسردگی سے ہنس پڑے۔

"خدا نہ کرے آغا جی!" بریف کیس بند کرتے ہوئے جہانگیر کا ہاتھ لرز گیا۔ انہوں نے بڑے مضطرب انداز میں آدھی سے زیادہ جلی ہوئی سگریٹ ٹرے میں مسل ڈالی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کا جوش دھیما پڑ جائے اور پھر ہمارے خدشات محض ہمارے وہم ہی ثابت ہوں۔" وہ پر خیال انداز میں دھیمایوں بولے جیسے خود کو بھی تسلی دینا چاہتا ہوں اور آغا جی کی طرف دیکھے بنا بریف کیس اٹھا کر کمرے سے نکل گئے۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" آغا جی نے قدرے پژمردہ سی سانس بھری اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

X...X...X

"بابا سائیں! بس اب آپ اس احمق پروفیسر کے معطلی کے آرڈر بھجوا دیجئے۔ اسے بھی ہماری طاقت کا اندازہ تو ہو۔" توقیر شاہ آج صبح ہی پہنچا تھا اور اب جلد از جلد پروفیسر زبیری کو سبق سکھانا چاہ رہا تھا۔

"بے روزگاری سے بڑا کوئی عذاب نہیں ہے۔ اس سے بڑی کوئی آزمائش نہیں ہے۔ تم نے اسے ٹھیک سے یہ سبق نہیں پڑھایا۔" مردان علی شاہ البتہ بے حد سکون سے صوفے پر براجمان تھے۔

"سائیں دو چار جماعتیں پڑھ کر لگتا ہے دماغ آسمان پر چڑھ گیا ہے۔" کمدار ان کے کندھے دباتے ہوئے درمیان میں کودا اور مسکرانے لگا۔ (بڑی پیشہ ورانہ اور خوشامدانہ مسکراہٹ تھی)۔

"کتنی دفعہ کہا ہے ہم بات کر رہے ہوں تو بیچ میں مت بولا کرو۔" توقیر شاہ کو ملازموں کی مداخلت سخت بری لگا کرتی تھی۔ اس نے تیغ صفت نظروں سے کمدار کو دیکھا تو وہ دبک گیا اور سر جھکا کر مردان علی کے کندھے پر زور زور سے ہاتھ چلانے لگا۔

"ایک پروفیسر کو معطل کرنا میرے لیے منٹوں کا کام ہے' مگر میں تو چاہتا تھا یہ کام افہام و تفہیم اور کچھ دے دلا کر ہو جائے۔ تم نے اسے اچھی طرح سمجھایا تھا کہ نہیں اسے انجام سے باخبر کیا تھا۔" مردان علی شاہ بالآخر اپنی جگہ سے اٹھے اور پشت پر ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگے۔

"وہ سمجھانے کی حد سے نکل چکا ہے باباسائیں! اسے اپنے انجام کی فکر نہیں ہے تو ہم کیوں کریں۔ بہت گھمنڈ ہے اسے اپنی ڈگریوں پر۔"

توقیر شاہ کے لہجے میں زہر ہی زہر تھا۔ اس نے بریف کیس سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکالا اور میز پر رکھ دیا۔

"آپ خود سن لیجئے یہ شخص کس قدر ضدی ہے' اس کے لہجے میں کیسا غرور ٹپک رہا ہے جیسے کہیں کا بادشاہ ہو۔"

"یہ کیا ہے ٹیپ کی ہیں تم نے اس کی باتیں۔"

وڈیرہ مردان علی شاہ نے چونک کر اور قدرے حیرت سے بیٹے کو دیکھا۔

"ہوں میں یہ گفتگو ٹیپ کرنا نہیں چاہتا تھا میرا خیال تھا وہ سیدھے سادے طریقے سے مان جائے گا اور میری آفر قبول کرلے گا اور اسی دن معاملہ نمٹ جائے گا دے دلا کر اور یوں میرے پاس احتیاطاً ثبوت رہے گا مگر۔"

توقیر شاہ نے ہونٹ بھینچ کر اپنی گھنی مونچھوں کو سہلایا۔ اس کی آنکھوں سے گویا چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔

ٹیپ سے نکلنے والی آواز وڈیرہ مردان علی شاہ کچھ دیر سنتے رہے۔ پل پل ان کے چہرے کے زاویوں میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ جب توقیر شاہ نے ٹیپ کا بٹن بند کیا تو وہ بھی جیسے گہری سوچ سے بیدار ہوئے اور پھر ہنکارا بھر کر دبیز قالین پر کسی زخمی شیر کی طرح ٹہلنے لگے۔

اس دوران توقیر شاہ خاموش رہا۔ بس باپ کا چہرہ دیکھتا رہا۔ جو تھوڑی کھجاتے ہوئے کچھ سوچ کر کمدار کی طرف پلٹے تھے اور موبائل کی طرف اشارہ کیا۔ کمدار نے مشینی روبوٹ کی طرح لپک کر صوفے کے درمیان میں رکھی شیشے کی چمکتی گول میز پر رکھا موبائل اٹھایا اور مردان علی شاہ کو پیش کر دیا۔

موبائل کے نمبر پش کرتے ہوئے انہوں نے توقیر شاہ کو دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ "اب اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔" پھر دوسری طرف ابھرنے والی آواز کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ان کے چہرے پر یک بیک زمیندارانہ کرختگی سمٹ آئی تھی اور آنکھوں میں سفاکی کچھ دیر وہ موبائل پر کسی سے بات کرتے رہے پھر بٹن پش کر کے موبائل قریبی صوفے پر پھینک کر

توقیر شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "میرا خیال ہے کل تک اسے معطلی کے آرڈر مل جائیں گے۔ یوں بھی میں مخالفانہ رویوں کو زیادہ دیر برداشت نہیں کرتا۔ نہ کسی کو سر پر چڑھانے کا عادی رہا ہوں۔"

توقیر شاہ کے بھینچے ہوئے لب مسکرا دیئے۔ اس نے ٹیپ سے کیسٹ نکالی اور اس کی ربن کھینچ کر دونوں چیزیں کمدار کی طرف اچھال دیں جسے وہ اٹھا کر خوب صورت شو پیش کی مانند دکھائی دیتے ڈسٹ بن میں ڈال آیا۔

"اب دیکھئے گا بابا سائیں! کتے کی طرح دم ہلاتا ہوا آئے گا۔"

اس کے دل کے اندر دہکتے شعلوں پر گویا ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ اس کا انتقامی جذبہ سکون میں بدل گیا۔ وہ ڈھلتی شام میں پر سکون ہونے والے ساحل کی مانند پر سکون ہو گیا۔ اس نے آدھی سے زیادہ جلی ہوئی سگریٹ ایش ٹرے میں یوں مسل ڈالی جیسے سگریٹ نہ ہو پروفیسر زبیری ہوں۔ اس کی نظر میں وہ اس سگریٹ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

X...X...X

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تانیہ کی بچی! تو ہنس رہی ہے۔" وہ دونوں کلاس روم کی طرف جانے والے راستے پر چل رہی تھیں اور وہ مسلسل تانیہ کی ہنسی پر چڑ رہی تھی۔ بالا خر ہاتھ میں پکڑا ہوا جرنل اس کو دے مارا۔

"ہنسوں نہیں تو کیا کروں تم نے صبح صبح لطیفہ ہی ایسا سنا دیا ہے۔ ایمان سے تو خود پوری لطیفہ ہے اور عقل تو تمہاری ٹخنوں میں ہے ٹھیک کہتے ہیں لوگ لمبوں کی عقل ٹخنوں میں ہوتی ہے۔"

وہ مسلسل ہنس رہی تھی پھر اس کی سمت ترچھی نظروں سے دیکھ کر ذرا دور ہوتے ہوئے بولی۔

"ہو سکتا ہے تیری ٹخنوں سے بھی نکل چکی ہو' آں' دیکھو دیکھو بندے کو سچ سننے کا حوصلہ رکھنا چاہیے۔ اب زندگی کوئی سیدھی سڑک تو نہیں ہے نا کہ آپ اپنی مرضی اور منشاء سے اپنے وجود کی گاڑی بھگاتے جائیں۔ بھئی کہیں کہیں جھٹکے بھی آتے ہیں' اونچائی نیچائی ٹیڑھے میڑھے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے یعنی میرے جیسے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے اپنے دونوں

ہاتھ جلدی سے آگے کر دیئے تھے۔ وہ سب سے موٹی جلد والی کتاب فضا میں بلند کر چکی تھی۔

"دیکھو دیکھو شہری! لوگ کیا کہیں گے اتنی بڑی لڑکیاں بچوں کی طرح لڑ رہی ہیں۔"

"بکومت زیادہ اور شرافت سے بیٹھو ادھر۔"

اس نے اسے آنکھیں دکھائیں اور اس کا ہاتھ کھینچ کر وہیں راہداری کی نیچے والی دیوار پر بیٹھ گئیں۔

"میں نے تمہیں قطعی کوئی لطیفہ نہیں سنایا ہے جس پر تم کھی کھی کرتی رہو۔"

"اچھا بابا نہیں ہنستی۔ ویسے کل یہ سب کچھ ہو گیا اور مجھے کانوں کان خبر نہ ہو سکی تھی۔ تمہارے یوں بھاگ جانے پر سب کو ہی تشویش لاحق ہو گئی۔ بڑی مشکلوں سے سب کو مطمئن کیا اور ہاں دیکھو ذرا ولید بھائی کو جو ذرا بھی چہرے پر کوئی تاثر آیا ہو۔ بہت گھنے ہیں۔"

تانیہ کے آخری جملے پر وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔

"گھنا ہی تو ہے کمینہ۔" پھر وہ کتابیں ایک طرف پٹخ کر گھٹنے اٹھا کر اس پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بولی۔ "تانی! پتہ نہیں مجھے اس وقت اتنا غصہ کیوں آ گیا تھا میں اتنی چڑچڑی کیوں ہو گئی تھی اسے دیکھ کر۔"

اس کی آنکھیں کیاریوں میں لگے موسم کے ننھے ننھے پودوں پر ٹھہر گئیں جن کے سائے دیوار پر بڑے بے ہنگم سے بن رہے تھے۔ پھر وہ یکدم ہولے سے مسکرا کر سر اٹھاتے ہوئے بولی۔

"ویسے پانی تھا بھی ایک دم ٹھنڈا یخ۔ پورا گلاس بھرا ہوا تھا۔ سچ تانیہ یہ میری بالکل غیر اختیاری حرکت تھی۔ میں تو ایسا خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ یوں بھرے شامیانے میں ان کے چمچماتے کپڑے بھگو دوں گی۔ اک ذرا سی بات پر۔"

وہ جیسے کل کے واقعے کا تصور کرتے ہوئے مسکرا بھی رہی تھی اور خود پر حیران بھی ہو رہی تھی۔

تانیہ نے اسے گھورا۔ ”محترمہ! تم عموماً حقیقت میں ایسی ہی حرکتیں کر جاتی ہو، جس کا خواب میں بھی تصور نہیں کرتیں، یاد ہے اس دن کون سے مہندی ان پر اڑائی تھی۔“ تانیہ نے اسے یاد دلایا۔

”اس طرح کے رویے ان کو پورا دشمن بنا ڈالیں گے تمہارا۔“

اس نے تانیہ کی بات پر چہرہ موڑ کر اسے دیکھا پھر کندھے جھٹک کر دونوں پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

”تو انہوں نے کیا کیا تھا میرے ساتھ وہ بھول گئیں تم۔“

”خیر وہی کیا، وہ تو تمہاری حماقت پر ہم سب ہی ہنس رہے تھے، مگر ان کا ہنسنا تمہیں شاید زیادہ ہی ناگوار گزرا تھا۔ بائی دے وے ایسا کیوں؟“

تانیہ آخری جملہ کہتے ہوئے شرارتی انداز میں اس کی سمت جھکی تو اس نے اس کے بازو پر چٹکی کاٹ لی۔

”ایسا اس لیے۔“

”آئوچ جنگلی بلی!“ وہ چٹکی کھا کر بلبلا کر کھڑی ہو گی تھی۔ ”خدا کرے تم گھر جائو تو ولید بھائی مزید انتقامی کارروائی کریں۔“

”ارے جائو جائو۔ انتقامی کارروائی۔“ وہ کھل کھلا کر اسے چڑاتی کلاس روم کی جانب بھاگی۔

ہونٹ عنابی آنکھیں شرابی

چاند سا چہرہ مکھڑا گلابی

اور اس پہ تیرا۔

اور اس پہ تیرا مسکرانا۔ مر جائوں گا او جان جاناں مر جائوں گا۔“

اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے تھے۔ مسکراتے لب یوں سکڑ گئے جیسے کسی نے نغمہ ساز کا گلا دبا دیا ہو۔ وہ اگلی رو میں حسب معمول اپنے چیلوں کے ہمراہ موجود تھا۔

کلاس آدھی سے زیادہ بھر چکی تھی۔ یہ واحد کلاس ہوتی تھی جس میں تقریباً سارے ہی سٹوڈنٹ آتے تھے۔ پروفیسر زبیری ہردلعزیز پروفیسر تھے۔

ظالم نظروں سے تم نہ مجھ کو دیکھو

مر جائوں گا

اس کی نظریں اس کے سراپے کے گرد حصار تنگ کئے ہوئے تھیں۔تانیہ اس کے پیچھے روم میں داخل ہوئی تھی۔"اکبر شاہ" کو اپنے جون میں دیکھ کر اس کا موڈ بھی غارت ہو چکا تھا۔

"ہیلو تانیہ!" وہ دونوں آگے پیچھے خاموشی سے پچھلی رو کی طرف بڑھیں کہ وہ اپنی کرسی دھکیل کر کھڑا ہو کر ان دونوں کے سامنے آ گیا۔اس کی مخاطب تانیہ رضا تھی۔

تانیہ ٹھٹک گئی۔حیرت فطری تھی۔پہلی بار وہ اسے باقاعدہ مخاطب کر رہا تھا۔

شہرینہ کا دل چاہا تانیہ کو کھینچ لے مگر تانیہ بچاری مروتاً کھڑی رہ گئی۔

"آپ نے اپنی سسٹر کی منگنی بڑے چپ چپاتے کر ڈالی ہمیں انوائٹ تک نہیں کیا۔اب ایسی بھی کیا بے مروتی۔دوست نہ سہی کلاس فیلو تو ہیں۔"

اس کی نظریں تانیہ کے ہاتھوں پر جم گئیں جہاں ڈھیر ساری مہندی کے نقش و نگار واضح تھے۔یہ حملہ بڑا اچانک اور غیر متوقع تھا۔تانیہ سٹپٹا گئی۔

"وہ بس کچھ جلدی میں ہو گیا۔"

"جلدی میں آپ کو آپ کی فرینڈ تو ضرور یاد رہی ہوں گی۔" اس نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا پھر ایڑیوں کے بل ذرا سا گھوم کر شہرینہ پر مسکراتی نگاہیں ڈالیں۔جو رخ موڑے اپنی سیٹ پر اپنی بکس وغیرہ رکھ رہی تھی۔چادر سے بھورے بالوں کی ایک دو لٹیں نکل کر جھول رہی تھیں۔رخسار ہمیشہ کی طرح گلابی ہو رہے تھے۔

"ہاں بھئی تانیہ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔" ثمرین اور مہناز وغیرہ بھی گروپ کی شکل میں ادھر ہی چلی آئیں اور یکدم تانیہ ان سب کے گھیرے میں آ گئی۔

"ہم لوگ تو دعائیں مانگتے ہیں کہ کہیں سے ایسی رنگا رنگ تقریب میں انوائٹ کیے جائیں۔ ذرا بھی خیال نہ کیا ہمارا۔" واجدہ دل گرفتگی سے بولی۔

"کیا فنکشن کسی کلب میں ہوا تھا' کسی بینڈ وینڈ کو بھی بلوایا تھا کیا؟" ٹینا گروپ بھی ادھر ہی آ گیا۔ہر طرف سے اشتیاق سے بھرے سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

"ارے ارے بھئی تم سب نے تو اس بچاری کو پریشان ہی کر ڈالا اب اس کا کیا قصور۔" اکبر شاہ نے ہنستے ہوئے پھر تانیہ کی طرف متوجہ ہو کر اپنائیت سے اس کا دفاع کیا اور اپنی سیٹ پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تم سب پیٹو لوگوں کو انوائٹ کر ڈالتیں تو بھی ان کا تو بجٹ فیل ہو جاتا۔ یوں بھی مڈل کلاس سفید پوش لوگوں کے لیے یہ رسمیں کسی آزمائش سے کم نہیں ہوتیں۔ ہم تو مذاق کر رہے تھے مس تانیہ! کیا ہم نہیں جانتے آپ کے گھریلو حالات۔"

"دھڑ دھڑ دھڑ۔" تانیہ کو لگا جیسے اکبر شاہ نے اس پر ڈھیر سارے پتھر لڑھکا دیئے ہوں۔ اس کی بیچ بازار چادر کھینچ لی ہو۔ عزت آبرو کی چادر' ہمدردی کے ریپر میں تذلیل کے کنکر لپیٹ کر جیسے اس کے منہ پر دے مارے ہوں۔

"اوہ سوری تانی!"

"سوری ہم تو یونہی مذاق کر رہے تھے۔"

لڑکیاں ادھر ادھر ہو کر اپنی اپنی سیٹوں پر پھر سے جمنے لگیں۔ شہرینہ نے اسے پکڑ کر سیٹ پر بیٹھا دیا تھا اور اس سے پہلے کہ کچھ کہتی پروفیسر زبیری کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

تانیہ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ سر جھکائے بیگ کی زپ کھول کر اپنی اسائنمنٹ ڈھونڈنے لگی۔ اس کی انگلیوں کی لرزش بے حد واضح تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پہلی بار شدتوں سے اپنی کم مائیگی کا احساس روح میں کچوکے لگانے لگا۔

پروفیسر زبیری لیکچر شروع کر چکے تھے مگر وہ ایک دم بجھ سی گئی تھی اور ایک ٹک کتاب کو گھور رہی تھی۔ بعض حقیقتیں خود کانٹوں کی طرح آپ کے دامن سے چمٹ جاتی ہیں اور انہیں الگ کرنے کی کوشش میں دامن تار تار ہونے لگتا ہے۔

شہرینہ کا دل چاہا وہ فوراً سے پیشتر تانیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کلاس روم سے باہر لے جائے اور کہیں سے ریوالور لے آئے اور اکبر شاہ کے سینے پر داغ دے۔

اس کے اندر اکبر شاہ کے لیے نفرت کا سمندر جھاگ اڑانے لگا۔

اسی دم پروفیسر زبیری نے اپنا لیکچر روک کر دروازے پر آ کے چپڑاسی کے ہاتھ سے پرچہ لیا اور چشمہ اتار کر پڑھنے لگے پھر پرچہ تہ کیا اور چاک ڈائس پر رکھ کر سٹوڈنٹس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آپ لوگ ذرا اچھے بچوں کی طرح بیٹھ کر میرا تھوڑا سا انتظار کیجئے میں ابھی چانسلر صاحب کے پاس سے ہو کر آتا ہوں۔ نجانے انہیں اچانک کیا کام پڑ گیا ہے۔" وہ پچکارنے والے انداز میں بولے پھر خود ہی مسکرا پڑے اور کلاس روم سے نکل گئے۔

"چلو چھٹی ہوئی۔" اکبر شاہ سب سے پہلے اپنی سیٹ سے اٹھ کر ہاتھ جھاڑنے لگا اور روسٹرم پر آ کر اس پر ایک دو ہاتھ مار کر بولا۔

"لیڈیز اینڈ جینٹلمین! سوری عزیز ساتھیو! آپ لوگوں کو بالکل بھی اچھے بچوں کی طرح بیٹھ کر پروفیسر صاحب کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ اب واپس نہیں آئیں گے۔ مے بی وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو کیا کہنے۔" اس کے ایک چیلے نے اٹھ کر گہری سانس بھر کر کہا اور پہلی رو میں بیٹھے وہ چار پانچ لڑکے ہنسنے لگے۔

کلاس روم میں پروفیسر زبیری کے جاتے ہی سب اپنی اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

تانیہ بے حد خاموشی سے کتاب بند کر کے بیگ میں رکھنے لگی اور شہرینہ کی طرف دیکھا جسے ثمرہ نے موقع پا کر گھیر لیا تھا۔

"پلیز شہرینہ اپنی ڈائری دو یار کل کا لیکچر مس ہو گیا ہے مجھ سے۔" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ڈائری کو للچائی نظروں سے دیکھ کر بولی جس میں عموماً شہرینہ لیکچر نوٹ کرتی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اور سنو پلیز!" اپنی کتاب کھول کر اس کے آگے ڈیسک پر پھیلاتے ہوئے اپنا بال پوائنٹ سنبھالتے ہوئے بولی۔

"ذرا رائٹ اینڈ رونگ پر جواب کے گرد نشان لگانے ہیں بتا دو یار۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔" اور نہ چاہتے ہوئے بھی شہرینہ کو رکنا پڑا۔

"ہاں بتاؤ۔"

"مندرجہ ذیل چیزیں ہماری ثقافت کا ثقافتی نمونہ ہیں۔"

"الف' موٹر گاڑی' ب زراعت کا نظام اور ج شادی کی سب رسمیں۔"

"شادی کی سب رسمیں۔" اکبر شاہ نے اطمینان سے جواب سے نوازا۔ وہ قریب ہی آ کھڑا ہوا تھا بلکہ عین پشت پر مگر وہ بدستور سر جھکائے سنجیدگی سے ثمرہ کی کتاب پر نشان لگانے لگی نمبر ٹو پر۔

مندرجہ ذیل۔ چیزیں پاکستان میں متبادل ثقافتی خصوصیات رکھتی ہیں۔

شلوار قمیص یا پینٹ شرٹ۔

بیک وقت دس بیویاں رکھنا۔

"بس بس دس بیویاں رکھنا۔" وہ پھر بولا۔ "ویسے میرے لیے تو ایک بھوری آنکھوں والی ہی بہت ہے۔" اس نے زور سے پین کتاب پر رکھا اور پلٹی پھر گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

وہ نہایت اطمینان سے اس کے بالکل پیچھے قریب ہی آدھا ڈیسک پر چڑھا ہوا تھا۔ ایک پیر لٹک رہا تھا' دوسرا ثمرہ احسان کے ڈیسک پر رکھا ہوا تھا۔ چست ٹراؤزر میں اس کا انداز نشست کم از کم اخلاقی ضابطوں کے منافی تھا۔

"یقیناً تمہارے باباسائیں نے دس شادیاں کر رکھی ہوں گی۔" وہ اس پر چلچلاتی نگاہ ڈال کر اپنا بیگ اٹھانے لگی۔

"دس تو نہیں دو ضرور کی ہیں اور مزید دو کی گنجائش رہتی ہے ابھی۔" وہ کمال ڈھٹائی کے ساتھ یہ کہہ کر ہنس پڑا۔

"ویسے میرا دو کا قطعی کوئی پروگرام نہیں ہے' میرے لیے تو ایک ہی ظالم بنی ہوئی ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ اسے بھرپور نگاہوں سے پوری شدتوں سے محسوس کرتے ہوئے جذب سے بولا۔ اس کے لہجے کی تپتی آنچ نے اس کو گویا بھسم کر ڈالا۔

تم سا کوئی پیارا' کوئی معصوم نہیں ہے

کیا چیز ہو تم خود تمہیں معلوم نہیں ہے

وہ کرسی پر انگلیاں بجانے لگا۔

اسے شاید سارے ہی تھرڈ کلاس گانے ازبر تھے اور شہرینہ خان نے سوچا خامشی میں ہی عافیت ہے اور اس مقولے پر عمل بہتر ہے۔

"Answer the ignorant with silence"

وہ پہلے ہی تانیہ کو کلاس روم سے غائب پا کر پریشان ہو گئی تھی۔ وہ اسے مصروف دیکھ کر دانستہ چپکے سے نکل بھاگی تھی اور تانیہ کی ذہنی حالت کے پیش نظر اسے اس کی زیادہ فکر تھی۔ سو اکبر شاہ کی تمام تر بدتمیزیوں کو نظر انداز کرتی خود بھی سرعت سے کلاس روم سے نکل گئی۔

پندرہ منٹ کی بھاگ دوڑ میں اس نے تمام ممکنہ جگہوں کو چھان مارا جہاں تانیہ اسے مل سکتی تھی مگر وہ تو دھوئیں کے مرغولے کی طرح جیسے فضا میں تحلیل ہو گئی تھی۔

وہ تھک کر رنجیدگی اور دل گرفتگی کے ساتھ بیٹھ گئی۔اس کی آنکھوں کی زمینیں نم ہو کر چمکنے لگیں۔

X...X...X

پروفیسر زبیری وائس چانسلر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں ٹہلتے ہوئے پایا۔ انہوں نے پروفیسر زبیری کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور اپنی کرسی پر جا کر بیٹھتے ہوئے انہیں بھی بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ان کے چہرے پر کچھ غیر معمولی پن دکھائی دے رہا تھا جو پروفیسر زبیری کو چونکا گیا۔

"خیریت ہے سر! آج سے پہلے تو کبھی آپ نے مجھے کلاس کے دوران اس طرح طلب نہیں کیا۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بغور وائس چانسلر کے چہرے کے تاثرات سے کچھ اخذ کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"آج سے پہلے کبھی آپ نے اتنی ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ بھی تو نہیں کیا۔" وہ ابرو اچکا کر پروفیسر زبیری کو بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

"میں سمجھا نہیں سر!"

"دیکھئے زبیری صاحب! میں جانتا ہوں آپ ایک اونسٹ استاد ہیں' ہمیشہ آپ کے مد نظر طالبہ کی بہتری رہی ہے آپ انہیں ایک اچھا انسان' بہترین معمار کا روپ دینے کیلئے کوشاں رہے ہیں۔ہم سب... آپ کے خلوص' پیشہ ورانہ ذہانت اور سینیارٹی کی قدر کرتے ہیں مگر..."

چانسلر صاحب نے پھر توقف کیا تو پروفیسر زبیری بولے۔

"مگر کوئی غلطی ہو گئی ہے مجھ سے۔"

"کہہ سکتے ہیں۔" وہ آہستگی سے یوں بولے جیسے کہنا بھی نہ چاہتے ہوں اور کہنا چاہتے بھی ہوں پھر سر اٹھا کر گہری سانس بھرتے ہوئے بولے۔

"زبیری صاحب! میں آپ کو فوری طور پر Suspend کر رہا ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی' بے حد مجبوری کے عالم میں کیونکہ مجھے یہ احکامات اوپر سے ملے ہیں۔ میں یہ آرڈر آپ کو دکھا نہیں سکتا چونکہ یہ سب مجھ سے Verbally کہا گیا ہے' آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟ میں بہت بے بس ہوں آپ کے مخالفین کو ان کی پشت پناہی حاصل ہے جو صاحب اختیار اور اقتدار ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟"

پروفیسر زبیری کتنی ہی دیر اطراف کی دیواروں کی مانند گنگ رہ گئے تھے۔

اس نوبت کا تو تصور بھی نہیں تھا ان کے پاس۔ کمرے میں کئی لمحے سکوت چھایا رہا۔ وائس چانسلر نظریں چرائے اپنے آگے رکھی فائل کو گھور رہے تھے' در حقیقت وہ بھی اندر سے سخت قسم کی شرمندگی اور دکھ محسوس کر رہے تھے۔

پروفیسر زبیری ایک سینئر استاد ہی نہیں تھے ایک محنتی اور مخلص انسان بھی تھے۔ سٹوڈنٹس ان سے محبت کرتے تھے' مگر وہ ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پنجرے میں بند مفلوج پرندے کی طرح خود کو تصور کر رہے تھے جو پر ہونے کے باوجود اڑان نہیں رکھتا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میں سمجھ گیا سر! یہ سب مردان علی شاہ نے کیا ہے اس کی ایماء پر ہوا ہے۔" کئی لمحوں کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد پروفیسر زبیری گہری سانس بھر کر بولے۔

"وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے نالائق بیٹے اکبر شاہ کو بہترین نمبرز دے کر کامیاب کر دوں جو قطعی اس قابل نہیں ہے کہ اسے ایک نمبر بھی دیا جائے کجا بہترین نمبرز۔" وہ سر جھٹک کر بولے پھر ابرو اچکا کر وائس چانسلر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"میرا خیال ہے دوسرے پیپرز میں بھی اس نے انتظام کر لیے ہوں گے اسے کلیئر کرنے کے۔"

"دیکھئے زبیری صاحب!" چانسلر صاحب نے ہاتھ اٹھایا اور چشمہ آنکھوں سے اتار کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولے۔

"آپ نے یونہی ذرا سی ضد میں اپنے حال اور مستقبل کو داؤ پر لگا دیا۔ خود سوچئے آپ کی جگہ کوئی اور آ جائے گا اور ان کا کام تو ہو ہی جائے گا۔ آپ تو ماشاءاللہ جہاندیدہ ہیں اور پھر آپ کا مضمون بھی عمرانیات ہے۔ آپ کو تو مجھ سے زیادہ خبر ہو گی کہ حالات اب وہ نہیں ہیں جو کئی

سال پہلے تھے۔ پھر آپ نے وہ مقولہ تو سنا ہوگا کہ اکیلی لکڑی کیا آنچ دے۔ ایک تنہا انسان معاشرے میں پھیلی کرپشن یا برائی کو نہیں مٹا سکتا۔ چہرے بدل جاتے ہیں مگر پالیسی وہی رہتی ہے نظام وہی رہے گا۔"

"سوری چانسلر صاحب! بجا فرمایا آپ نے مجھ سا اکیلا شخص کرپشن کے اس منہ زور سیلاب کو نہیں روک سکتا مگر کم از کم میں اپنا ایمان تو بچا سکتا ہوں کہ مجھ پر پہلا فرض اپنے ایمان کی حفاظت ہے۔ Honesty is the best policy یہ سبق میرے والد مرحوم نے بچپن میں مجھے پڑھا دیا تھا۔ صرف رٹا لگانے کے لیے نہیں عمل کرنے کے لیے۔"

پروفیسر زبیری کرسی دھکیل کر کھڑے ہو گئے۔

"مجھے دکھ ضرور ہے مگر تاعمر کوئی پچھتاوا نہیں رہے گا۔ مردان علی نے مجھ سے صرف نوکری چھینی ہے۔ وہ مجھ سے میرا علم نہیں چھین سکتا اور مجھے یقین ہے کہ آج کا ووٹر باشعور ہے وہ آزمائے ہوئے کو اب آزمانے کی سنگین غلطی نہیں کرے گا۔ ایسے عیاش' بے غیرت اور بے ایمان لوگوں کو ووٹ دے کر گناہ گار نہیں ہوگا۔ بہت لوٹ لیا ان جیسے سیاستدانوں

نے اس قوم کو' بہت بے وقوف بنا چکے ہیں۔ اب یقیناً انہیں بہت جلد بساط سمیٹنی پڑے گی۔"

وائس چانسلر نے پروفیسر زبیری کو بولنے سے نہیں ٹوکا وہ خود ہی خاموش ہوئے تو وہ گہری سانس بھر کر دھیرے سے بولے۔

"کاش کہ آج کا بچہ بچہ باشعور ہو جائے۔ آزمائے ہوؤں کو نہ آزمائے۔ بہر حال یقین کیجئے زبیری صاحب میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔ میں ذاتی طور پر آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں۔"

ان کے لہجے میں حقیقی دل گرفتگی اور بے بسی تھی۔ پروفیسر زبیری دھیرے سے ہنس دیئے۔ پتہ نہیں یہ ہنسی انہیں چانسلر صاحب کی بے بسی پر آئی تھی یا خود کو تقویت دینے کے لیے ہنسے تھے۔ پھر ٹیبل سے اپنا چشمہ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

دل سے پیہم خیال کہتا ہے

اتنی شیریں ہے زندگی اس پل

ظلم کا زہر گھولنے والے

کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

جلوہ گاہ وصال کی شمعیں

وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا

چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

X...X...X

دوسرے روز بھی تانیہ کو یونیورسٹی میں نہ پا کر شہرینہ نے ملول سی ہو کر اس کے پاس جانے کا سوچا۔ تانیہ نے جس بات کا اتنا گہرا اثر لیا تھا وہ بات اتنی معمولی بھی نہیں تھی۔ اسے اکبر شاہ سے انتہائی نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ تو تانیہ ہی اتنی باظرف تھی کہ اس نے پلٹ کر اکبر شاہ کو آج تک جواباً کوئی سخت بات نہ کہی تھی' ورنہ وہ حق رکھتی تھی۔ غربت کوئی جرم نہیں ہے کہ اس سے لبوں پر قفل لگ جاتے۔ نہ دولت مندی بادشاہت ہے کہ وہ سب کو رعایا سمجھتا۔ وہ واپسی پر دل گرفتہ سی تانیہ کی طرف چلی آئی۔

X...X...X

شہرینہ' تانیہ کے گھر آئی تو دیکھا اماں تخت پر بیٹھیں دوپہر کے کھانے کے لیے سبزی کاٹ رہی تھیں۔ وہ انہیں سلام کر کے نادیہ آپی سے تانیہ کا پوچھنے لگی۔ وہ معمول کے مطابق کپڑے مشین سے نکال رہی تھیں' انہوں نے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوپر چڑھی بیٹھی ہے۔ دو دن سے یونیورسٹی بھی نہیں جا رہی ہے۔ پوچھتی ہوں تو سر درد کا بہانہ بنا دیتی ہے۔ تم جا کر ذرا پوچھو تو کیا بات ہے چپ چپ سی ہے۔"

"اس کی چپ تو میں توڑتی ہوں ابھی۔ آپ فکر مت کریں میں آئی اسی لیے ہوں۔" وہ انہیں متفکر دیکھ کر بولی اور تیزی سے چھت کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

وہ سامنے کبوتروں کے پنجرے کے پاس کھڑی تھی۔ کبوتر کو پکڑے اس کے سفید پروں کو بے دردی سے کھول اور پھیلا رہی تھی جس پر کبوتر احتجاجاً پھڑ پھڑا رہا تھا۔

"پتہ نہیں کیوں ہم انسانوں پر آیا ہوا غصہ جانوروں پر نکالتے ہیں۔"

وہ اس کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ تانیہ میں ہلکی سی جنبش ہوئی اس نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا تو پنجرے کے کھلے دروازے سے کبوتر کو اندر ڈال کر دروازہ بند کر دیا۔

"ایسی قطعی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو یونہی دل بہلا رہی تھی۔" وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی اور ایڑیوں کے بل پلٹی۔ "تم یونیورسٹی نہیں گئیں۔"

"یہی ملے تھے دل بہلانے کو انسانوں کا کال پڑ گیا ہے کیا یا انسانوں سے دل بھر گیا ہے۔"

"انسان کب دل بہلانے کا ہنر جانتے ہیں وہ تو صرف دل توڑنا' انہیں شکستہ کرنا جانتے ہیں۔" وہ پنجرے کی جالی پر انگلیاں پھیرنے لگی پھر سر جھٹک کر بولی۔ "چھوڑو یہ بتاؤ یونیورسٹی کیوں نہیں گئیں۔"

"گئی تھی وہیں سے آ رہی ہوں' تمہیں نہ پا کر۔ بس اتنا حوصلہ تھا تانی! اتنی ہی کمزور نکلیں تم۔" شہرینہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا جہاں اب سرخی اڈنے لگی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ مسلسل اس واقعہ کو بھلانے کے جتن کر رہی تھی۔ اس کی شدت کو کم کرنا چاہ رہی تھی۔ پھر اسی تذلیل کا احساس روح پر کچوکے لگانے لگا۔ اس نے اس کا ہاتھ کسی ناراض بچے کی طرح جھٹک دیا۔

"میں نے کبھی خود کو باحوصلہ اور بہادر نہیں کہا یوں بھی یہ سچ ہی تو ہے کہ چڑیاں اڑتے ہوئے بھی بزدل ہی ہوتی ہیں اور..."

"بکواس ہے یہ سب۔" اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر اس کے چہرے پر پھیلی افسردگی کو بغور دیکھا۔ "آدمی کمزور اس وقت ہوتا ہے جب وہ خود کو کمزور سمجھنے لگے۔"

تانیہ خود آزاری کی کیفیت میں ہنس پڑی اور چھت کی دیوار پر کہنیاں ٹکا کر گلی میں جھانکنے لگی مگر درحقیقت وہ اپنے اندر جھانک رہی تھی۔ وہ اسے کیسے سمجھاتی کہ وہ تذلیل وہ تحقیر کوئی پوشاک نہیں تھی جسے وہ اتار کر مطمئن ہو جاتی۔ وہ تو اس کے وجود کے اندر خون میں اتر گئی تھی' کھال بن کر اس کے جسم سے لپٹ گئی تھی۔

زندگی میں پہلی بار اسے شدتوں سے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا تھا۔ شہرینہ کی گاڑی میں سفر کرتے ہوئے' اس کے عالیشان بنگلے اور فرنشڈ کمروں میں اور لان میں ٹہلتے ہوئے بھی کبھی

اپنا مڈل کلاس کمپلیکس نہیں جاگا تھا۔ محرومی کا احساس نہیں چٹخا تھا مگر اب کے وہ بری طرح ٹوٹی تھی۔

اسے لگا جیسے اکبر شاہ نے اسے بہت اونچائی سے نیچے پھینکا ہو۔ اسے اس کی اوقات بتادی ہو۔ اسے وہ آئینہ دکھایا ہو جس میں اس کی غربت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

اسے پہلی بار ہی تو احساس ہوا تھا کہ دولت کتنی بڑی اور طاقتور چیز ہے۔ دولت مند ہونا کتنے عیب چھپا ڈالتا ہے اور انسان کا وقار کس طرح بلند کرتا ہے۔ اسے کتنا پراعتماد بنا ڈالتا ہے۔

”تانیہ!“ شہرینہ نے انتہائی دل گرفتگی اور رنجیدگی کے گہرے احساس کے ساتھ اس کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا وہ جانتی تھی وہ اسی طرح سے اپنے آپ کو اذیت دیتی رہے گی۔

”تانی! میرے پاس ایسے کوئی الفاظ نہیں ہیں جو تمہاری اذیت کو کم کر سکتے ہیں۔ یوں بھی آدمی کو اپنے جملوں کی کم مائیگی اور بے وقعتی کا احساس ہو تو لفظ گرفت میں نہیں آتے۔ میں جانتی ہوں ہزار دلیلوں کے باوجود میں تمہارے دل پر لگی چوٹ کا زخم مندمل نہیں کر سکتی مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ اکبر شاہ اور اس جیسے لوگوں کی زبانوں کے کانٹے ہمیں بے حوصلہ

بنانے کے بجائے جینے کا ہنر سکھاتے ہیں اور کتنی احمقانہ بات ہے کہ دوسروں کی غلطیوں کا انتقام ہم خود کو اذیت دے کر خود سے لیں۔“

تانیہ کی آنکھوں سے اچانک ہی وہ لاوا بہنے لگا جو اس کے دل کے آتش فشاں میں پک رہا تھا۔ شہرینہ نے اسے خود سے لپٹا لیا اور اسے جی بھر کر رونے دیا۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ رو کر اپنے اندر کا غبار نکال لے۔ وہ ساری کڑواہٹ باہر انڈیل دے جو اندر ہی اندر اسے کھا رہی تھی۔ زہر کا جسم سے نکل جانا ہی بہتر ہوتا ہے اور پھر یہ تو اکبر شاہ جیسے اژدہے کے ڈسے کا زہر تھا۔

بہت دیر تک فضا بوجھل سی رہی۔ تانیہ کو اپنے رونے کا یکدم احساس ہوا تو اسے لگا جیسے وہ بڑی دیر سے حماقت کا ثبوت دے رہی ہے حالانکہ ایسا بھی نہیں تھا مگر وہ جھینپ کر شہرینہ سے الگ ہوئی اور گہری سانس بھرتی رخ موڑ کر دوپٹے سے چہرہ پونچھنے لگی۔

”میں بھی کتنی بے وقوف ہوں شیری! اتنی سی بات کا غم لیے بیٹھی تھی اور تمہیں بھی پریشان کر ڈالا۔“

"خیر بے وقوف تو تم ہو۔اس میں کوئی شک نہیں۔ہاں مجھے پریشان کرنے والی بات ذرا وضاحت طلب ہے۔" وہ اپنی بھوری آنکھوں میں شرارت بھر کر اسے دیکھنے لگی۔تو وہ ہنس پڑی۔بھیگی بھیگی بے ساختہ ہنسی نے ماحول میں پائی جانے والی اور خود اس کے اندر پھیلی اداسی کو کسی حد تک ختم کیا۔

"پریشان مجھے تو تم نے کیا کرنا تھا البتہ نادیہ آپی کچھ مشکوک ہو رہی ہیں' تمہارا یہ روپ ان سے ہضم نہیں ہو رہا ہے۔"

"تمہیں کچھ کہا انہوں نے؟" شہرینہ کی بات پر اس نے گھبرا کر اسے دیکھا تو وہ سر ہلانے لگی اور چھت کی دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تمہاری یہ خاموشی' بے وقت کبوتروں سے سلام دعا بقول شاعر:

یہ اداس اداس چہرہ یہ لٹا لٹا تبسم

کسی گل کی بے رخی کا یہ شکار تو نہیں ہے

اور ایسا نہ ہو کہ وہ اس "گل" کو ڈھونڈنے نکل پڑیں اور کچھ گل کھلا دیں کہ..."

"باس... بس..." اس نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ ساری تمہاری لن ترانیاں اور فضول سوچ ہے۔وہ اس طرح نہیں سوچ سکتیں۔"

"تم موقع تو دے رہی ہو انہیں "اس طرح" سوچنے کا۔" وہ ترچھی نظروں سے اسے دیکھنے لگی اور وہ ہنس پڑی۔

"ویسے یہ ساری علامات عموماً جذبہ محبت کے حملہ آور ہونے کی ہیں خاص کر یہ کبوتر یعنی کبوتروں کے پاس آکر تم نے بلاوجہ اس شک کو ہوا دینے کی پوری کوشش کی ہے۔تم نے دیکھا نہیں فلموں میں عموماً غمزدہ ہیروئن کبوتروں کے ارد گرد ہی گھومتی دکھائی دیتی ہے وہ کیا گانا تھا ہاں یاد آیا:

"واسطہ ای رب دا توں جائیں وے کبوترا"

اور وہ گانا۔

کبوتر جا جا جا کبوتر جا

پہلے پیار کی پہلی چٹھی ساجن کو دے آ

تانیہ بے تحاشا ہنسے جا رہی تھی پھر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"تو نہیں سدھرے گی شیری! ولید بھائی ٹھیک کہتے ہیں تجھے بورڈنگ میں بھیج دینا چاہئے۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"تمہیں زیادہ اس کی ہمنوا بننے کی ضرورت نہیں ہے سمجھیں اور سنو! جا کہاں رہی ہو؟" وہ ہاتھوں کو جھٹکنے لگی جو چھت کی سفیدی کے رنگ سے بھر گئے تھے پھر اس کے پیچھے آئی۔

"کل یونیورسٹی آ رہی ہو نا پھر؟" وہ زینے کی ریلنگ سے لگ کر بولی۔ تانیہ نے پلٹ کر اسے دیکھا اور اسے چڑانے کو مسکرانے لگی۔

"سوچوں گی کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"سوچوں گی کی بچی! بہت مار کھاؤ گی اب تم میرے ہاتھوں سے۔" وہ سچ مچ چڑ گئی۔

"ان ہاتھوں سے۔" وہ اس کے خوبصورت گداز نرم ملائم ہاتھوں کو دیکھنے لگی پھر لاپرواہی سے کندھے جھٹک کر بولی۔

"کھالوں گی ماریوں بھی قلبی چوٹ سے جسمانی چوٹ قدرے بہتر ہی ہوتی ہے۔" وہ یہ کہہ کر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ کر اترنے لگی مگر آخری سیڑھی پر ٹھٹک گئی۔

سارا صحن نادیہ آپی نے ڈٹرجنٹ سے بھگو رکھا تھا ہر طرف سفید جھاگ ہی جھاگ تھے۔ یہ ان کی عادت میں شامل تھا۔ کپڑے دھونے کے بعد وہ سارا صحن دھونے لگتیں تانیہ کا موڈ بگڑ گیا۔

"سمجھ نہیں آتا میری' آپ کو صاف ستھری زمین میں کہاں سے میل کچیل نظر آ جاتا ہے۔ آپ کو تو سڑکوں کی دھلائی کا ٹھیکہ مل جانا چاہیے۔" وہ پائنچے اوپر اٹھا کر سنبھل سنبھل کر چلتی جا کر تخت پر بیٹھ گئی۔

"ہائے تانی! کہاں اس قدر تو گندا ہو رہا تھا تمہیں تو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ سکندر کی بائیک کے ٹائر سے سارے صحن میں گند پھیل جاتی ہے اوپر سے مانی ساری گلی محلے کی مٹی اپنے جوگرز میں بھر کر لے آتا ہے۔"

’’ارے رے سنبھل کر شیری! ہڈیاں نہ تڑوالینا اپنی۔‘‘ انہوں نے تانیہ کو جواب دیتے ہوئے جلدی سے شہرینہ کو لپک کر پکڑا تھا جو ذرا سا لڑکھڑائی پھر سنبھل کر نادیہ آپی کے ہاتھ سے جھاڑو لے لیا۔

’’آج یہ صحن میں دھوئوں گی۔‘‘

’’دماغ تو درست ہے تمہارا۔‘‘ نادیہ آپی نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو جھپٹ لیا۔

’’جاکر وہاں تانیہ کے پاس بیٹھو آج صحن میں دھوئوں گی۔‘‘ انہوں نے جیسے اس کی نقل اتاری مگر وہ بھی گویا مصمم ارادہ کر بیٹھی تھی۔ فرش پر رکھا پائپ کا کونا اٹھالیا اور جاکر نل کھول دیا۔

’’ارے رے شہرینہ! کیا کر رہی ہو افوہ۔‘‘ نادیہ آپی پانی کی بوچھاڑ سے گھبرا کر پیچھے ہٹی تھیں ورنہ پوری بھیگ جاتیں۔ تانیہ نے بھی جلدی سے دونوں پیر سمیٹ کر اوپر کر لیے۔ وہ تو پانی کا پائپ ہاتھ

میں لے کر خوب موج میں آگئی تھی۔ یہاں وہاں فوارے کی طرح پانی اڑانے لگی۔ نادیہ آپی گرل کے پاس کھڑی بے بسی سے اسے ڈپٹنے لگیں۔ مگر وہ کہاں سن رہی تھی ان کی مہین سی چیخ وپکار کو مزید دبانے کے لیے گنگنانے لگی:

یہ موسم یہ مست نظارے

پیار کرو تو ان سے کرو

کرتے ہیں یہ تم کو اشارے

پیار کرو تو ان سے کرو

’’خدا کے لیے شیری! بھیگ جائو گی خود بھی اور اتنا پانی کب صاف ہوگا۔‘‘ نادیہ آپی اس کی شرارت پر ہنس بھی رہی تھیں اور پانی ہی پانی دیکھ کر پریشان ہو کر اسے روک بھی رہی تھیں۔ تانیہ البتہ خوب مزے لے رہی تھی اور اس کی گنگناہٹ کے ساتھ اسی ٹون پر تالیاں بجائے جا رہی تھی۔

یہ موسم یہ مست نظارے

ادھر کھلے صحن میں بائیک اندر گھسیٹ کر لاتا سکندر اچانک خود پر گرنے والی بوچھاڑ پر سٹپٹا گیا ابھی تو باہر شدید دھوپ سے تپاتپا آیا تھا اور اندر اتنی تیز بارش اس نے چونک کر دیکھا تو جیسے اسے لگا دل ٹھہر گیا۔

لمحے رک گئے

گھڑیاں تھم گئیں

وہ اس کی آمد سے بے خبر تھی اس کی جانب چونکہ پشت تھی۔ دوپٹہ کندھے پر جھول رہا تھا ساتھ میں وہ خود بھی پانی کی بوچھاڑ میں جھوم رہی تھی۔

گورے گورے پیر اونچے پائنچے کر دینے کے باعث نمایاں تھے۔ تلوے اس قدر سرخ ہو رہے تھے گویا جسم کا سارا خون یہیں اتر کر جم گیا ہو۔

اسے دھوپ میں تپتہ ہوا اپنا صحن یکدم بہار میں بھیگا بھیگا کوئی باغ دکھائی دینے لگا جس میں ایک نوشگفتہ پھول تمام تر خوبصورتیاں سمیٹے اوس میں نہایا ہوا اپنی مہک سے پورا باغ معطر اور رنگین کر رہا ہو۔

وہ ایک لطیف سے احساس کے ساتھ اسے تکنے لگا۔ وہ یکسر ماحول سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ تانیہ تو شہرینہ کی طرح اس کی آمد سے بے خبر تھی البتہ نادیہ آپی اسے دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی روک رہی تھیں۔

”ہو ہو یہ مست مست نظارے“

وہ ایڑیوں کے بل اسی لمحے پلٹی تھی اور جیسے سکندر کسی خواب سے بیدار ہوا تھا۔ پائپ سے نکلتی موٹی دھار اس کی سمت اڑی جس پر اس نے گھبرا کر فوری بچائو کے لیے دونوں ہاتھ آگے کر دیئے۔

”اے اے کیا کر رہی ہو۔“ اس کی بوکھلاہٹ اور موجودگی نے شہرینہ کو بھی بوکھلا دیا۔ وہ اسی سمت پائپ کا منہ کیے بدحواسی میں اسے مزید بھگو رہی تھی۔ تب نادیہ آپی بھاگ کر نل کی طرف دوڑیں اور نل بند کر کے آ کر اس کے ہاتھ سے پائپ چھین لیا۔

سکندر تقریباً بھیگ چکا تھا اور اب اپنے حلیے کو بے بسی اور بے چارگی سے تک رہا تھا۔ وہ شرمندہ سی جلدی سے دوپٹہ سر پر ڈال کر کھسیانی ہو کر تخت کی طرف بڑھی جہاں تانیہ منہ پھاڑے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"نظارے کچھ زیادہ ہی مست ہو گئے اور تم نظاروں سے زیادہ۔ ذرا سوچ ان کی جگہ ولید بھائی ہوتے تو تمہارا کیا حشر ہوتا۔"

"چپ کرو بد تمیز!" اس نے ایک مکا اس کے کندھے پر جڑ دیا۔

"اس وقت ولید کا کیا ذکر... سوری سکندر بھائی رئیلی ویری سوری۔" وہ ندامت سے جھینپ کر بولی۔

سکندر نے ایک گہری سانس بھری اور کندھے ڈھیلے انداز میں لٹکاتے ہوئے بولا۔

ہمیں کیا پتہ تھا ہمیں کیا خبر تھی

بھری دھوپ میں آج برسات ہو گی

اس نے اپنے حلئے کی طرف دیکھا پھر بے اختیار مسکرا دیا۔

"اٹس آل رائٹ۔ یہ بھی لکھا تھا تقدیر میں۔" اس نے اسے مزید شرمندہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور بائیک گھسیٹ کر اندر لے آیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"آج کیا ہفتہ صفائی منایا جا رہا تھا؟" اس نے چابی، جا کر کی بورڈ پر لٹکائی اور صحن میں یہاں وہاں پھیلے پانی پر نگاہ ڈالی اور جا کر بیسن پر ہاتھ دھونے لگا۔

"یہ موقع ہی کب آنے دیتی ہیں ہماری نادیہ آپی۔ یہ تو ہفتہ صفائی نہیں گھنٹہ صفائی مناتی ہیں۔"

"تو بولے بغیر نہ رہنا، میری صفائی کی دشمن۔" نادیہ آپی نے شپڑ شپڑ جھاڑو لگاتے ہوئے وہی جھاڑو تانیہ کے پیر پر دے مارا۔ پھر سکندر کی طرف رخ کرتے ہوئے بولیں۔

"کھانا لگا دوں۔"

"اوں ہوں ابھی تو شرابور ہو رہا ہوں، اس حلئے میں صرف پکوڑے کھائے جا سکتے ہیں لنچ نہیں کیا جا سکتا۔" اس اس نے مسکراتی نظر شہرینہ پر ڈالی۔

"اب اتنے زیادہ بھی نہیں بھیگے۔ میں نے تو دھوپ کی تمازت کم کر دی آپ کی۔ ساری گرمی دور کر دی آپ کو تو احسان مند ہونا چاہیے میرا۔" وہ دفاعی ہتھیار استعمال کرنے لگی۔

وہ پلٹ کر تولیہ کھونٹی سے اٹھاتے ہوئے یکلخت خوشگوار احساس سے دوچار ہو گیا۔

واقعی اس نے اس کی دن بھر کی تمازت، تھکن اور گرمی ہی تو دور کر دی تھی۔ اپنے مہکتے وجود کی موجودگی کے باعث اور پھر اسے بے حد اچھا لگا تھا وہ منظر جب وہ اس کے آنگن کو ہی نہیں اس کے وجود کو بھی پانی کی بوچھاڑ سے ٹھنڈا کر گئی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ انہی بھیگے کپڑوں میں صحن میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ کر کچھ دیر اس خوشگواریت کو محسوس کرتا رہے مگر دوسرے ہی پل اپنی سوچوں پر جھینپ کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

X...X...X

ولید بے حد مسرور اور مطمئن سا جہانگیر احمد (پاپا) کے آفس سے نکلا تھا۔ وہ اب بہت جلد اپنے پروجیکٹ پر کام شروع کروانا چاہتا تھا جس کا اجازت نامہ اسے مل چکا تھا اور ساتھ میں جہانگیر احمد نے اسے چیک بھی کاٹ کر دے دیا تھا۔

وہ آفس سے نکل کر اپنے ایک دو کام نمٹانے کی غرض سے سوک سنٹر کی طرف آیا تھا اور پارک کی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسے کسی نے پکار لیا۔ یہ پکار خاصی نامانوس تھی تاہم اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا یہ چہرہ نامانوس بہرحال نہیں تھا۔

یہ آمنہ علی کا منجھلا بہنوئی یعنی مردان علی شاہ کا داماد ''فدا حسین'' تھا۔ اس وقت اس کے سرد کرخت چہرے پر نرمی اور خوشگواریت تھی۔

''سائیں مجھے غلط فہمی نہیں ہو رہی تو آپ ولید ہی ہو نا۔'' وہ ولید حسن کے چونکنے اور آنکھوں میں ابھرتے تحیر کے تاثر پر کچھ سٹپٹا کر بولا۔

''جی... صحیح پہچانا آپ نے اور آپ غالباً آمنہ کے بہنوئی فدا حسین ہیں۔'' اپنی حیرت سمیٹتے ہوئے خاصے دوستانہ انداز میں مسکرا کر اس کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے کیا جسے اس نے پرتپاک انداز میں تھام لیا۔

''سائیں! آپ سے دوبارہ ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں نا ایسے جو اپنے پیچھے اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔''

وہ اس کا ہاتھ ہنوز تھامے لگاوٹ سے بولا تو ولید نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا اور قدرے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے ہنس پڑا۔

"ذرہ نوازی ہے آپ کی... آپ نے ایسا محسوس کیا۔ میں تو بہت عام سا انسان ہوں۔ میرا تو خیال تھا آپ مجھے بھول بھال گئے ہوں گے۔ ویسے بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔"

"ہاں سائیں بالکل رکھا یاد اور دوبارہ ملنے کی تگ ودو بھی کی۔" اس کے لفظ تگ ودو پر وہ ذرا سا چونکا تاہم اپنی یہ کیفیت ظاہر نہ ہونے دی بس مسکرا دیا۔

"پھر چلو نا سائیں ہمارا غریب خانہ زیادہ دور نہیں ہے یہیں قریب ہی ہے۔"

"اچھا... آپ اسی شہر میں رہتے ہیں۔" ولید نے حیرت کا اظہار کیا گو کہ اسے مردان علی کے دامادوں کے بارے میں زیادہ انفارمیشن نہیں تھی تاہم اتنی ضرور تھی کہ "فدا حسین" شہر میں رہائش پذیر تھا۔ مستقلاً اور یہ کہ اس کے تعلقات مردان علی شاہ سے کشیدہ تھے۔

"شہر اور گوٹھ کا کیا ہے دونوں ہی ہمارے ہیں۔ ملک کے ہی حصے ہیں۔ آئو نا بابا آج ہمیں اپنی میزبانی کا شرف بخشو۔ مٹھل!" اس نے قریب کھڑی پجارو میں بیٹھے باوردی ڈرائیور کو پکارا۔

"بابا! صاحب کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولو۔"

"ارے نہیں میرے پاس اپنی گاڑی ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ فدا حسین کے محبت بھرے اصرار کے آگے اس نے انکار مناسب نہ سمجھا اور پھر وہ خود بھی فدا حسین کی رہائش گاہ پر جانے کے لیے دلی طور پر آمادہ تھا۔ فدا حسین نے اس کی گاڑی کو دیکھا پھر سر ہلا دیا اور اس کے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد خود بھی اپنی پجارو میں بیٹھ گیا۔ دھیرے دھیرے پجارو سڑک پر چلنے لگی تو ولید نے بھی اس کے پیچھے اپنی گاڑی ڈال دی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ایک خوبصورت بنگلے کے پورٹیکو میں اپنی گاڑی کے ہمراہ موجود تھا۔ گاڑی سے اتر کر اس نے سرسری نظروں سے پورٹیکو سے لے کر دائیں بائیں مہکتے ہرے بھرے لان کا بھی جائزہ لے لیا اور سن گلاسز اتار کر فدا حسین کی طرف دیکھا جو پجارو سے اتر کر اپنی اجرک کندھے پر ڈالے ملازم کو کچھ ہدایت دے رہا تھا پھر اس کی طرف متوجہ ہوا اور اسے لیے رہائشی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

یہ سادہ اور پروقار انداز میں سجا سٹنگ روم تھا گو کہ ہر چیز قیمتی تھی مگر سادگی کو ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا۔ یہ شاید فدا حسین کی نیچر کی غمازی تھی۔

آمنہ علی کی بہن شاہدہ علی اسے دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور مسرور بھی اور خاصی فدویانہ انداز میں اس کی آئو بھگت کرنے لگی۔ اس کا خیال تھا آمنہ کے دوست کی حیثیت سے وہ دونوں اسے پروٹوکول دے رہے ہیں مگر بہت دیر بعد اسے احساس ہوا کہ فدا حسین اس میں ذاتی طور پر دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ شاید خود بھی فدا حسین میں اس قدر دلچسپی لے رہا تھا وہ اس کے رویے کو اور اس کی ذاتی دلچسپی کو بہت دیر بعد محسوس کر سکا۔

اس کے آگے رکھی کانچ کی چمکتی گول میز مختلف خوشبو اڑاتے لوازمات سے سج گئی تھی۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔

''یہ سب تکلفات رہنے دیں فدا صاحب! ان کی کیا ضرورت ہے۔''

''نہ سائیں یہ تکلفات نہیں ہیں میرے جذبات ہیں۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔''

اسے قدرے حیرت ہوئی اس قدر اکھڑ، غیر مہذب سا انسان نظر آنے والا شخص اندر سے اس قدر شائستہ تھا بہر حال اس نے بھوک اور طلب نہ ہونے کے باوجود بھی ایک چکن رول اٹھا لیا اور کولڈ ڈرنک کی بجائے چائے کا مگ تھام لیا۔

''کیسا لگا میرا غریب خانہ آپ کو۔'' ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان فدا حسین صوفے پر تقریباً پھیل کر بیٹھ گیا اور کولڈ ڈرنک کی چسکیاں بھرتے ہوئے اس سے پوچھنے لگا۔ وہ شاید مروتاً اس عالیشان بنگلے کو ''غریب خانہ'' کہہ رہا تھا جبکہ ولید حقیقتاً اسے غریب خانہ ہی خیال کرتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے بولا۔

''آپ کی حیثیت اور رتبے کے حساب سے تو یہ غریب خانہ ہی ہے فدا صاحب!'' اس کے انداز اور لہجے میں مذاق کا شائبہ تک نہیں تھا بلکہ گہری سنجیدگی تھی۔

دونوں میاں بیوی نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''کیا مطلب... میں سمجھا نہیں۔''

''مطلب یہ فدا صاحب کہ ایک ایم پی اے اور وڈیرہ مردان علی شاہ کے داماد ہونے کے ناتے یہ بنگلہ آپ کے کچھ شایان شان نہیں ہے۔'' وہ فدا حسین کے چہرے پر پھیلنے والے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولا پھر شاہدہ علی کی طرف ایک نظر ڈال کر ہنوز اسی سنجیدگی کے ساتھ بولا۔

"دو بہنوں کے مابین فرق نہیں ہونا چاہئے۔انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ برابر درجہ ملنا چاہیے۔اس طرح کی چھوٹی چھوٹی ناانصافیاں چاہے رویوں سے ہوں یا مالی طور پر کی جائیں احساس محرومی اور نفرتیں پیدا کرتی ہیں۔" اس نے چائے کا مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ذرا سا رک کر دونوں میاں بیوی کے چہروں کا جائزہ لیا جو حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے پھر سیدھا ہو کر صوفے پر پشت ٹکا کر بولا۔

"یوں تو یہ آپ کے خاندان معاملات ہیں مجھے مداخلت نہیں کرنی چاہیے مگر مجھے کچھ عادتاً ناانصافی برداشت نہیں ہو پاتی۔آپ اور عابدہ سگی بہنیں ہیں ناغالباً۔" اس نے شاہدہ علی کی طرف دیکھا جو شاید بات کچھ کچھ سمجھ گئی تھی گہری سانس بھر کر اپنی کلائیوں میں سجی سنہری چوڑیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سر کو اثبات میں ہلانے لگی جبکہ فدا حسین اپنی عادت کے مطابق فوراً جذباتی ہو کر بولا۔

"ہاں سائیں سگی بالکل سگی' ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہیں۔"

"تو پھر حویلی میں عابدہ علی کا اتنا پر تپاک خیر مقدم کیوں کیا جاتا ہے۔اس کی کوٹھی گائوں میں ہونے کے باوجود اس بنگلے سے کہیں زیادہ بڑی' خوش نما اور سہولیات سے مزین ہے اور

معاف کیجئے گا فدا صاحب آپ کے مقابلے میں ہدایت اللہ کو مردان علی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ہو سکتا ہے یہ محض میری کم فہمی ہو میرا خیال ہے ایسا نہ ہو مگر..."

"ایسا ہی ہے سائیں! یہ آپ کا خیال نہیں ہے یہ درست اندازہ ہے۔" فدا حسین نے کڑے جھلسے ہوئے لہجے میں گویا حقیقت کو کھولا۔اس کے وجود کے اندر تلخی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

نفرت سے اس کی آنکھیں سلگنے لگیں اور وہ پہلے جیسا فدا حسین ہی دکھائی دینے لگا۔اکھڑ' تند خو اور ایک جذباتی قدرے کم عقل۔

"یہی تو رونا ہے کہ باباسائیں کا رویہ ہمارے ساتھ غیر منصفانہ ہے۔ہدایت بھائی کو وہ سب مراعات حاصل ہیں مگر میرے شوہر کو نہیں۔اسے حویلی میں جو عزت بخشی جاتی ہے وہ انہیں نہیں دی جاتی۔"

"اوہ۔" ولید نے چونک کر پوری دلچسپی سے شاہدہ علی کو دیکھا جو بولتے بولتے رک گئی تھی پھر چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔

''صرف اس لیے کہ ہدایت اللہ اماں کا بھانجا ہے۔ وہ جدی پشتی رئیس کہلاتے ہیں اب چاہے جاگیریں ہوں یا نہ ہوں بس نام تو ہے ناں۔''

''مگر سائیں اولاد تو برابر ہی ہوتی ہے ناسب کی۔'' فدا حسین قدرے تڑخ کر درمیان میں بول پڑا اور بیوی کی طرف ایک نظر ڈال کر ولید حسن کی طرف دیکھا۔

''ہماری شہر میں رہائش کی وجہ بھی یہی ہے میں غصے والا آدمی ہوں۔ مارنے مرنے پر تل جانے والا۔ کیا فائدہ روز ان سے منہ ماری ہو۔ بس جب تک وہ ہمارے حصے کی رقم ہمیں نہیں دیں گے ہم ان سے کسی قسم کا دوستانہ تعلق نہیں رکھیں گے۔''

''رقم؟'' اس نے قدرے چونکتے ہوئے فدا حسین کی طرف دیکھا۔ شاہدہ فون کی بجتی گھنٹی پر اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھی جبکہ فدا حسین اپنی جگہ سے اٹھ کر ولید کے قریب صوفے پر بیٹھے ہوئے بولا۔

''میں بزنس کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے رقم چاہیے۔ زیادہ تو نہیں یہی کوئی ساٹھ ستر لاکھ مگر وہ شخص دولت پر سانپ بن کر بیٹھا ہے۔ ایک دمڑی بھی نکالنے کے حق میں نہیں

ہے۔'' اس کا اشارہ مردان علی کی طرف تھا۔ اس کی آنکھوں اور لہجے میں گویا نفرت کی چنگاریاں پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔

ولید کے اعصاب پر ایک ہلکا سا جھٹکا ضرور لگا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ''فدا حسین'' ایک اکھڑ جذباتی ہی نہیں ''لالچی'' بھی ہے مگر وہ خود کو حق پر ثابت کرنے کے لیے دلائل دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''آخر بیٹی کے لیے ہر ماں باپ کرتے ہی ہیں۔ غریب سے غریب بھی کرتے ہیں پھر یہ تو کروڑوں اربوں میں کھیل رہے ہیں اتنا تو بیٹی کو تحفتاً دینا چاہیے تھا۔ میں نے آج تک سوائے رقم کے اور کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا ان لوگوں سے' حالانکہ میں زمینوں پر بھی حق رکھتا ہوں آخر کو شاہدہ کا بھی ان زمینوں پر حق ہے مگر نہ سائیں میں اتنا لالچی اور کم ظرف نہیں ہوں۔'' اس نے بات کے اختتام پر یوں منہ بنایا گویا لالچی ہونا اس کے نزدیک گناہ کبیرہ ہو۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ولید ایک سانس بھر کر دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"مگر فدا صاحب آپ کو بزنس کا تجربہ تو نہ ہوگا پھر کہیں اتنی بڑی رقم ڈوب نہ جائے۔"
اسے فدا حسین کی رقم کے ڈوبنے یا پار لگنے سے قطعاً دلچسپی نہ تھی مگر وہ کسی اور خیال کے تحت اسے محض کرید نا چاہ رہا تھا۔

"نہ سائیں! اب... اب اتنا چریا بھی نہیں ہوں کہ بے سوچے سمجھے رقم لگا دوں گا۔ سائیں! آپ سے کس لیے ملنا چاہتا ہوں۔" یکدم اس کی آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ کاروباری آدمی ہو اور ذہین اور مخلص بھی۔ کیا آپ سے میں اس سلسلے میں امید رکھوں۔" وہ اب اصل مقصد پر آتا نظر آرہا تھا۔ ولید اس زبردست جھٹکے سے جلد ہی سنبھل کر گہری سانس بھر کر الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگا اور اس سے پہلے کہ کچھ کہتا فدا حسین جلدی سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"چھوڑیں سائیں یہ باتیں تو ہم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ ہوتی رہیں گی یہ باتیں تو۔" گویا وہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"ابھی تو آپ مہمان ہیں میرے' یہ کھائیے۔ ہمارا کک بڑے اچھے کھانے بناتا ہے۔" وہ اس کی پلیٹ میں مختلف چیزیں بھرنے لگا مگر ولید نے معذرت کرتے ہوئے دوبارہ اپنا چائے کا مگ اٹھا لیا جس میں فدا حسین نے گرم گرم چائے بھر دی تھی پھر چائے کے چار پانچ بڑے بڑے گھونٹ بھر کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہئے۔"

"پھر کیا سوچا سائیں آپ نے؟" فدا حسین بھی اس کے ہمراہ ہی کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ سٹنگ روم سے نکلتے ہوئے بولا۔

اس نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"کس سلسلے میں۔" اس کا ذہن حقیقتاً بہت سی سوچوں میں گھر گیا تھا مگر وہ فی الوقت تمام سوچوں کو جھٹکنا چاہ رہا تھا اور بالکل نارمل انداز میں رہنا چاہتا تھا۔

"یاری دوستی کے سلسلے میں۔" فدا حسین کے جبڑے خوشامدانہ مسکراہٹ سے کھلے پڑے تھے۔

"کیوں نہیں آپ ایسا کیجئے۔" اس نے ٹرائوزر کی جیب سے والٹ نکال کر اس میں سے اپنا وزٹینگ کارڈ نکال کر فدا حسین کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ رکھ لیجئے آپ مجھ سے یہاں رابطہ کر سکتے ہیں بلکہ خود تشریف لا یئے گا سیکنڈ فلور پر میرا آفس ہے وہیں میں آپ کو ملوں گا اور یہ میرا موبائل نمبر ہے۔" اس نے اپنا موبائل نمبر بھی اسے دے دیا جسے پا کر فدا حسین کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمکنے لگا۔

"ایک بات ہے سائیں آپ اس ملاقات کا ذکر آمنہ سے یا کسی سے بھی نہ کرنا۔" وہ اسے پورٹیکو تک چھوڑنے آیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بے آواز دروازہ بند کر کے ولید نے سر ہلا دیا اور ڈیش بورڈ سے سن گلاسز اٹھاتے ہوئے جانے کیوں اس کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔ شاید یہی بات وہ خود بھی فدا حسین سے کہنے والا تھا۔

اس کی گاڑی فدا حسین کے پرٹیکو سے نکل کر شفاف سڑک پر دوڑنے لگی مگر اس سے کہیں زیادہ رفتار سے اس کا ذہن دوڑ رہا تھا۔

X...X...X

پروفیسر زبیری بے حد خاموشی سے اس درس گاہ سے رخصت ہو گئے تھے۔ جہاں انہوں نے زندگی کے قیمتی پندرہ برس گزارے تھے اور کتنا بڑا المیہ تھا کہ جس نے پندرہ برس اپنی صلاحیتوں' لیاقت کا لہو قوم کے نوجوانوں کی رگوں میں انڈیلا تھا آج انہیں بلا تقصیر ایک اسلامی آزاد ملک میں ایمان اور ضمیر کو زندہ رکھنے' اس کے خلاف کام نہ کرنے پر نکال دیا گیا تھا۔ وہ چاہتے تو تمام طلباء کو اپنی بے گناہی کی داستان سنا کر انہیں جذباتی کر کے وائس چانسلر کے آفس پر پتھراؤ کروا سکتے تھے۔ اس درس گاہ میں ہنگامہ کروا سکتے تھے مگر وہ "درس گاہ" کو اور طلب علم کے مسافروں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کوئی سیاسی لیڈر نہیں تھے کہ ذاتی مفاد کے لیے نوجوانوں کے جوان اور امنگوں سے بھرے گرم خون کو پانی کی طرح بہا ڈالتے' انہیں ایموشنل کر کے کھلونوں کی طرح توڑ پھوڑ ڈالتے وہ امن کے خواہاں تھے۔ ان نوجوانوں کی زندگیوں سے انہیں پیار تھا۔ وہ انہیں سیاست دانوں اور لیڈروں کے کھلونے نہیں بلکہ پاکستان کا ایک مضبوط ستون بنانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

ان کا دل ٹوٹا تھا' سخت قسم کی مایوسی' افسردگی اور دل گرفتگی سے ان کی آنکھوں نے کئی آنسو بہا ڈالے تھے مگر وہ اب بھی یہ سوچ کر مطمئن تھے کہ ان کا دل ضرور ٹوٹا تھا' ان کا اعتماد لہو لہو ہوا تھا۔ ان کے اعصاب کو جھٹکا لگا تھا مگر ان کا سر اٹھا ہوا تھا وہ اپنے ضمیر کے آگے سرخرو ہو کر تن کر کھڑے تھے۔ پچھتاؤں کی اذیت نہیں تھی۔ خدا کے آگے وہ نادم نہیں تھے۔

انہوں نے سکندر رضا کو فون کر کے بتایا تو وہ کتنے ہی لمحے سناٹے میں رہ گیا۔ پھر سخت قسم کی بے یقینی اور دل گرفتگی سے بولا۔

"سر... یہ... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں ینگ مین یہاں تو یہی ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔"

"بجا فرمایا اور جس کا نوٹ اس کا ووٹ۔" وہ دھیرے سے بولا۔ اس خبر نے اسے بڑا سخت قسم کا ذہنی دھچکا لگایا تھا۔

"میں آتا ہوں سر وقت نکال کر آپ کی طرف۔ آپ کہاں ملیں گے مجھے' گھر یا..." اس کی بات پر پروفیسر زبیری کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"برخوردار... اب تو گھر پر ہی ملوں گا اینی وے۔

گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا

یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں"

پھر جیسے وہ خود ہی خود محفوظ ہو کر دھیرے سے ہنس دیئے۔

"آج تم کس وقت آرہے ہو۔"

"یہی کوئی چار پانچ کے درمیان۔" اس نے رسٹ واچ پر نظر ڈال کر وقت متعین کیا۔

پروفیسر زبیری نے اوکے کہہ کر فون رکھ دیا اور ڈھیلے انداز میں وہیں قریبی کرسی پر بیٹھ گئے۔

X...X...X

اس نے دو دن بعد یونیورسٹی میں قدم رکھا تو لبوں پر یہی دعا تھی کہ "اکبر شاہ" کا سامنا نہ ہو جبکہ شہرینہ اس کے دل کی حالت سے بے خبر پروفیسر زبیری کی یوں اچانک معطلی کی خبر پر حیران پریشان تھی

بلکہ کسی حد تک دل گرفتہ۔ کئی دوسرے سٹوڈنٹس کی طرح پروفیسر زبیری اس کے بھی پسندیدہ پروفیسر تھے۔

"جانے نئے پروفیسر کیسے ہوں گے۔اس طرح اچانک وہ معطل کیوں کر دیئے گئے' کوئی وجہ تو ہو گی' کبھی سر نے بھی سرسری بات نہیں کی۔"

"اب تمہارے افسوس کرنے سے کچھ ہونے سے تو رہا۔پروفیسر زبیری اگر اس طرح واپس آ جاتے تو یقین کرو میں بھی تمہارے ساتھ نہ صرف افسوس کرتی بلکہ آٹھ آٹھ آنسو بھی بہانے کو تیار ہوتی۔" تانیہ اطمینان سے بولی اور بیگ کے اندرونی کسی چور خانے سے چیونگم نکال کر اس کا ریپر اتارنے لگی۔ وہ دراصل اس طرح اپنے اندر بکھرتے اعتماد کو سنبھالا دے رہی تھی۔

شہرینہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تمہیں بالکل بھی افسوس نہیں ہوا تانی! سر کے اس طرح چلے جانے کا۔"

"ہوا کیوں نہیں مگر یہی کہہ رہی ہوں نا کہ افسوس کرنے سے وہ واپس تو نہیں آ جائیں گے۔" اس نے ریپر سے نکال کر ایک چیونگم کی سٹک اپنے منہ میں ڈالی اور دوسری اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔

"چلو اٹھو یہاں سے۔" وہ بیگ کی زپ بند کر کے بولی تو شہرینہ نے منہ چلاتے ہوئے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب' چلو یہاں سے' پریڈ نہیں لینا کیا۔"

"نہیں میرا موڈ بالکل نہیں ہو رہا ہے کم آن یار۔اٹھو بھی اب کیا گھور گھور کر مجھے دیکھ رہی ہو۔" اس کی نظریں دروازے سے ہو کر دوبارہ شہرینہ پر آئیں اور جلدی سے جھک گئیں اور بے مقصد وہ بیگ کو تھپتھپانے لگی۔

"اٹھو بھی شیری!"

"تانی!" اس نے تانیہ کی کلائی پکڑ کر اسے دوبارہ اپنے قریب کھینچ دیا۔

’’یہ اچانک تمہیں ہو کیا گیا ہے‘ دو دن تو صاحبہ نے چھٹی منالی اور اب پریڈ نہیں لینا۔ کتنا نقصان ہو گیا ہے کچھ اندازہ ہے۔‘‘

تانیہ نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور جیسے ہارنے والے انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر گہری سانس لی۔

’’اندازہ کر کے کیا کرنا ہے۔‘‘

دروازے سے اکبر شاہ اپنے مخصوص انداز میں اپنے چیلوں کے ہمراہ داخل ہوا تھا۔ جینز کی چست جیبوں میں زبردستی انگلیاں پھنسائے لبوں پر ہنسی دبائے آنکھوں کو طائرانہ انداز میں گھماتا۔

’’ہیلو ہیلو لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔‘‘ آتے ہی اس نے روسٹرم پر دو تین ہاتھ مارے مگر یہاں وہاں بکھرے سٹوڈنٹس میں سے کوئی بھی متوجہ نہ ہوا اور اپنی کارروائیوں میں مصروف رہے۔

’’جیسا کہ آپ جانتے ہیں بلکہ نہیں جانتے کہ پروفیسر زبیری کو نکال دیا گیا ہے ان کا انجام بہر حال وہی ہونا تھا کہ۔‘‘

’’وہاٹ انجام سے کیا مطلب ہے۔‘‘ کئی سٹوڈنٹس بے ساختہ چونکے تھے اور ان میں سر فہرست شہرینہ خان تھی۔ اس کی آواز پر اکبر شاہ نے اس کی طرف دیکھا پھر جیسے گڑ بڑا کر مسکرا کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

’’بھئی میں تو ایک عام سی بات کر رہا ہوں۔ سنا ہے کسی بات پر اپنے چانسلر صاحب سے ان کی ان بن ہو گئی تھی۔ اینی وے تفصیل تو میرے علم میں نہیں ہے بہر حال جو ہوا بہت برا ہوا۔ بیچ بیچ بے چارے بڑے درویش صفت تھے کیا لمبے لمبے اسلامی لیکچر دیتے تھے۔‘‘ وہ افسوس سے سر ہلاتا گیا۔ شہرینہ نے ہونٹ بھینچ کر اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔

اس کی اس گفتگو سے اسے ہی کیا کسی کو بھی دلچسپی نہیں تھی مگر وہ اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔

’’تانی وائس چانسلر صاحب سے پروفیسر زبیری کا کیا جھگڑا ہو سکتا ہے۔‘‘ شہرینہ کی سوچوں کی سوئی پروفیسر زبیری پر ہی اٹک گئی تھی۔

’’اوہو اب تم اس فضول شخص کی بات پر کیا سوچنے لگیں۔ خدا کے لیے اب سکندر بھائی کی طرح کھوجی مت بنو۔‘‘ تانیہ نے سر پر ہاتھ مار کر کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ اسے خفگی سے گھورتے گھورتے بے ساختہ ہنس پڑی۔

"میرا خیال ہے کلاس ہو گی نہیں سب جا رہے ہیں۔" تانیہ نے تیزی سے کلاس روم خالی ہوتے دیکھ کر اس کی توجہ دلائی تو اس نے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی پر نگاہ ڈال کر پر خیال انداز میں سر ہلایا۔

"لگتا ہے اب کئی دنوں تک یہ پریڈ فری ملیں گے او کے چلو۔"

وہ بھی اپنی کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہو گئی اور چادر دوبارہ ترتیب سے سر پر جمائی اور دروازے کی طرف بڑھی مگر اسے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ اکبر شاہ اور اس کا گروپ دروازے کو گھیرے کھڑا تھا۔ تانیہ نے گھبرا کر شہرینہ کے چہرے کی طرف دیکھا جو اکبر شاہ کی اس حرکت پر تپنے لگا تھا۔

"پلیز آپ لوگ راستے سے ہٹئے۔" اس نے دانستہ اس کی بجائے اس پورے گروپ کو ہی جیسے مخاطب کیا تھا۔ مگر جواب لازماً اس کی طرف سے ہی آنا تھا وہ جو گرز میں مقید پیر مزید پھیلا کر کھڑا ہو گیا

اور پورا گھومنے کی بجائے چہرہ موڑ کر نگاہوں کے زاویے میں اسے فٹ کرتے ہوئے ایک گہری سانس بھری۔

گدائے عشق کے کاسے میں ایک نظر بھی نہیں

یہ کہہ کر اس نے فلمی ہیرو کی طرح سانس بھری پھر اطمینان سے جیب تھپتھپا کر اس سے قیمتی امپورٹڈ سگریٹ کا گولڈن گرین کمبنیشن کا پیکٹ نکالا اور اس سے ایک سگریٹ نکال کر لبوں پر لگائی اور اس کی طرف مکمل گھوما۔

"مس خان کیا یہ زیادتی نہیں کہ جامعہ کا سب سے خوبصورت جدی پشتی امیر زادہ' تمہاری راہ میں بار بار آئے اور تم اسے نظر انداز کر دو۔ مجھ پر تو ہزار مرتی ہیں ایک نگاہ کی طلب گار ہیں لاکھوں مگر یہ دل... اف یہ دل تمہاری راہ کا مسافر بنا ہوا ہے اور تم ہو کہ اس پر ایک نظر ڈالنا گوارا نہیں کرتیں۔ اتنی توجہ سے تو پتھر بھی پگھل جاتے ہیں۔"

اس کی اس طویل ڈائیلاگ بازی نے شہرینہ کی رگ رگ کو آتشیں کر دیا مگر وہ اپنے اعصاب کو کنٹرول میں رکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ایسے عامیانہ اور فلمی ڈائیلاگ کسی اور کے سامنے بولو اکبر شاہ میں پہلے بھی تمہیں آگاہ کر چکی ہوں کہ مجھے ایسے امیر زادے اور حسین شہزادے متاثر نہیں کرتے۔ یہ طبع آزمائی تم اب کسی اور پر کرو۔ یوں بھی یہ درس گاہ ہے محبت گاہ نہیں جہاں صبح و شام تم اس مہم جوئی میں

لگے رہو۔ اگر اتنی توجہ اور محنت اپنی تعلیم پر کرتے تو کم از کم کسی پرچے میں رہ تو نہ جاتے۔"
اس کی استہزائیہ مسکراہٹ اس کے سرخ ہونٹوں پر مزید کشادہ ہو گئی۔ پھر وہ یک لخت ہونٹ سکوڑ کر اس کے قریب سے تیزی سے گزر کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

اکبر شاہ کو اپنی کنپٹیوں پر تپش کا احساس ہونے لگا تاہم مسکراہٹ اس کے لبوں کی تراش میں برقرار رہی اس نے شہرینہ کے پیچھے بدحواس ہو کر لپکتی تانیہ کے آگے ہاتھ پھیلا کر اس کا راستہ روک لیا۔

"مس تانیہ! اب آپ ہی سمجھایئے نا اپنی فرینڈ کو۔" وہ کسی بچے کی طرح چہرے پر معصومیت اور قدرے مسکینیت طاری کرتے ہوئے بولا اور یوں سینے کی تہ سے سانس کھینچ کر فضا کے سپرد کی گویا ساری فضا کو افسردہ کر دے گا۔ تانیہ اس کے یکدم یوں سامنے آجانے اور مخاطب کرنے پر ساری جان سے لرز گئی اور اوپر سے اس کی نگاہیں اس کے وجود پر ٹکی بلکہ چکرا رہی تھیں۔ وہ خواہ مخواہ دوپٹہ درست کرنے لگی۔ تب شہرینہ پلٹ کر اس کی طرف آئی اور اس کا ہاتھ کھینچا۔

"کیوں فضول بکواس سننے کھڑی ہو گئی ہو۔" اس کا انداز ڈپٹنے والا تھا۔ وہ تیزی سے ایک طرف ہو گیا تھا اور تانیہ آگے کھنچتی چلی گئی۔

"بے وقوفوں کی طرح وہیں جم کر کھڑی ہو گئیں۔" وہ اکبر شاہ کا غصہ گویا اس پر نکالنے لگی۔

تانیہ اس کی گرفت سے ہاتھ کھینچ کر وہیں دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی اور اسے شکوہ کناں نظروں سے دیکھنے لگی۔

"جان کر کھڑی ہو گئی تھی یا وہ ہی راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا میرا۔" اس نے خفگی سے منہ پھلا کر چہرہ موڑ لیا۔

"سوری۔" شہرینہ کو یکدم اپنے لہجے اور رویے کا احساس ہوا۔

"آج یہ میرے ہاتھ سے بچ گیا تانی مگر دیکھنا اب اگر کسی دن میرا راستہ روکا' میری راہ میں آیا تو میں اسے بخشنے کی نہیں ہوں۔" وہ عزم سے بولی۔ تانیہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"تانی، تانی۔ آئی ایم سیریس۔" تانیہ کے یوں ہنسنے پر اسے پتنگے لگ گئے۔ وہ وہیں دیوار پر بیٹھ گئی اور کتابیں اپنے آگے پٹخ دیں۔

"مثلاً کیا کرو گی تم؟" وہ اس کے غصے کو انجوائے کرتے ہوئے اسے ستانے کو ذرا سا آگے جھکی۔

"سر پھاڑ دوں گی اس کا اور ساتھ تمہارا بھی۔" وہ غرائی۔

"ارے واہ میرا کس خطا پر، ویسے شری کہیں اکبر شاہ تم سے "سچ چا" قسم کا پیار نہ کرتا ہو۔ آئی مین وہ بیچارا ہو سکتا ہے سیریس ہو تمہارے سلسلے میں... آں آں دیکھو دیکھو نادل ہی تو ہے۔" وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی تھی اس نے اپنی نازک سادہ سینڈل جھک کر پیر سے اتار لی تھی پھر دوبارہ پیر اس میں ڈال کر دیوار سے اتر گئی۔

"سچا، پیار، محبت اونہہ محبت سمجھتی ہو کسے کہتے ہیں۔" اس نے تانیہ رضا کی مسکراتی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑ دیں۔ جس کے بھورے کانچ پر سنجیدگی رقم تھی پھر سر جھٹک کر ہنسی۔

"اسے محبت نہیں کہتے یہ راہ چلتے دھوکے اور سراب ہیں جو دانستہ اور نادانستہ اس کے جال میں پھنسنے والی لڑکیوں کے لیے سوائے تباہی و بربادی کے کچھ نہیں لاتے۔ لفظ "محبت" دھوکا دینے کا سب سے آسان اور پرفریب راستہ ہے۔" وہ دونوں لان میں آکر بیٹھ گئیں۔

"عزت بہت قیمتی متاع ہوتی ہے تانی! یہ ایسے دھوکے اور سراب میں لٹانے کی چیز نہیں ہے۔" تانیہ نے دھیرے سے سر ہلا دیا گویا اس کی باتوں سے اتفاق ہو۔

"اور اب تو یوں بھی میرے دل میں کسی اور کی گنجائش ہی نہیں رہی۔" وہ ایک دو لمحے کے توقف کے بعد دھیرے سے کسی خیال کے تصور میں ڈوبی بولی۔ اس کا لہجہ دھیما اور غیر معمولی پن لیے ہوئے تھا۔

تانیہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ گھاس کے تنکے توڑ رہی تھی۔ اس کے دھوپ سے تپتے رخساروں پر ایک خوشگوار سی چمک لہرانے لگی تھی۔

"ہونٹوں پر اداسی سی، دھیمی شرمیلی مسکراہٹ رقصاں تھی گویا کسی سرخ پھول کو کوئی بھنورا دھیرے سے چھیڑ کر بھاگ جائے اور وہ آب و تاب سے کھلنے والا پھول جھینپا جھینپا شرمایا شرمایا سا محسوس ہو۔

تانیہ کے لیے یہ انکشاف ہی تھا۔ پتہ نہیں اس نے ہی ایسا محسوس کیا تھا یا حقیقت میں یہی کچھ تھا۔

"شیری! وہاٹ ڈو یو مین؟ یہ کسی کے لیے اب گنجائش نہیں رہی۔' اس سے تو کئی مطالب اخذ کیے جا سکتے ہیں۔" وہ بغور اس کا چہرہ جانچتے ہوئے معنی خیز تبسم کے ساتھ بولی۔

شہرینہ نے پلکیں اوپر اٹھا کر بس ایک نظر اس کے متجسس چہرے پر ڈالی اور جھکا دی۔ "کئی مطالب اخذ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس کا سیدھا سادا مطلب نکلتا ہے کہ..." اس نے تپتا ہوا چہرہ کچھ اور جھکا لیا۔

"تانی... کوئی میرے دل میں رہتا ہے پوری آب و تاب کے ساتھ کہ اس کے بعد اب کسی بھی "اور" کی گنجائش نہیں رہتی۔" اس نے گویا دھماکہ ہی کیا تھا پھر سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھنے لگی کہ تانیہ نے اس کی کلائی گرفت میں لے کر جھٹکا دیا۔ وہ دوبارہ اٹھتے اٹھتے گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

"شیری!... شیری کی بچی!... یہ... یہ اب بتا رہی ہو؟ کون ہے وہ... جلدی سے بتاؤ ورنہ۔" وہ اس پر چڑھ دوڑی۔

"ابھی نہیں تانی!" وہ ہونٹ دبا کر مسکرانے لگی' تانیہ کو اس کا چہرہ چاند کی طرح دمکتا محسوس ہونے لگا وہ بے قراری سے بولی۔

"تو... تو پھر کب۔"

"وقت آنے پر۔" اس نے گہری سانس بھر کر گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا دی۔

"اس کا مطلب ہے۔"

بہت کچھ سعد کہنا ہے
بہت کچھ دل میں رکھنا ہے
بہت سی خاص باتیں ہیں
جنہیں اب عام کرنا ہے

اس کے لبوں پر دھیما دھیما کسی تصور سے محفوظ ہوتا تبسم بکھرا ہوا تھا۔ وہ تانیہ کی شرارتوں پر قطعی برا نہ منا رہی تھی۔

X...X...X

ولید نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا صغریٰ نے اسے اطلاع دی۔ اطلاع کیا قدرے منہ بگاڑ کر فرمایا۔

"ولید بائو! آپ کے صبح سے کئی فون آچکے ہیں جی! پتہ نہیں کون لڑکی ہے؟ ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہر بار کہتی ہے میں ولید کی "دوست" ہوں لو جی۔ لڑکیاں بھی دوست ہوتی ہیں کبھی۔" وہ کہہ کر کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔

"لڑکیاں تو سہیلیاں ہوتی ہیں ناجی!" اس نے ولید کی طرف دیکھ کر جیسے تصدیق چاہی۔

ولید نے قدرے بے زار ہو کر اسے گھور کر دیکھا۔

"تم نے کیا کہا اس سے پھر۔"

"بس جی' میں نے کیا کہنا تھا' میں نے کہا ولید بائو تو اس وخت گھر پر نہیں ہوتے' آپ ان کے موبائل پر بات کر لیں موبائل پر بندہ جہاج (جہاز) میں بھی بیٹھ کر بات کر سکتا ہے نا جی۔"

"جہاج کیا ہوتا ہے۔" ولید نے قدرے حیرت سے استفسار کیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"لو جی جہاج نہیں پتہ آپ کو۔" اسے جیسے ولید کی حیرت پر حیرت ہوئی پھر یکدم جیسے اسے اہم معلومات بہم پہنچانے کی غرض سے بولی۔

"وہ... وہ جو بڑی سی گاڑی جیسا جو...اوہو ولید بائو! وہ جس پر اتنے سارے بندے بیٹھتے ہیں اور جو آسمان پر اڑتا ہے یوں کر کے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر چلایا گویا ہوائی جہاز چلنے کی وڈیو بھی پیش کی۔

"آپ سمجھ گئے نا میری بات؟" اور ولید نے یہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت جانی۔ اسے ہنسی بھی آئی مگر تھکن کے باعث وہ ہنس بھی نہ سکا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ فون کی بیل بج اٹھی۔ صغریٰ لپک کر آئی اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا جبکہ اسے کمرے سے نکل جانے کا اشارہ بھی دیا تو وہ کچھ کھسیا کر واپس لائونج کی طرف پلٹ گئی جہاں وہ کچھ دیر پہلے سپر نٹنڈنٹ بنی ماسی خیراں اور نور دین سے دیواروں کے جالے صاف کروا رہی تھی۔"

"یس ولید اسپیکنگ۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں ریسیور اٹھالیا۔

وہ اس وقت گہری نیند لینے کی خواہش میں اپنے بیڈروم میں آیا تھا مگر دوسری سمت آمنہ علی کی آواز نے اس کی نیند بھک سے اڑا دی۔

"تھینکس گاڈ! تمہاری آواز تو سنائی دی ہے۔تپتی سماعتوں پر پھوار سی پڑ گئی۔" اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"اچھا تو آپ ہیں وڈیری آمنہ۔" وہ اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے خوشگواریت سے مسکرانے لگا اور فون اٹھا کر صوفے پر جا کر بیٹھ گیا اور فون سیٹ کو زانوں پر رکھ کر اطمینان سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"یہ تم مجھے وڈیری مت کہا کرو۔ایسا لگتا ہے جیسے طنز کر رہے ہو۔" وہ بولی۔

"کیوں وڈیری ہونا طنز یا شرم کی بات ہے؟ جبکہ سنا ہے یہ رتبے اور مرتبے تو باعث فخر ہوا کرتے ہیں۔" اس نے مصنوعی حیرت سے جیسے دریافت کیا تو وہ ہلکی ہنسی میں فخر سمیٹتے ہوئے تفاخر سے بولی۔

"آف کورس اس میں کوئی شک نہیں مگر جب تم کہتے ہو نا تو لگتا ہے طنز کر رہے ہو۔اینی وے یہ بتاؤ تم نے گھر میں کیا چیزیں پال رکھی ہیں۔"

"اے اے ایک منٹ... ایک منٹ ذرا تصحیح کر لو۔" وہ جلدی سے بولا۔

چیزیں "پالی" نہیں جاتیں رکھی جاتی ہیں۔ہاں جانور پالے جاتے ہیں ویسے انسان بلکہ بندے قسم کی چیزیں حویلیوں میں شوقیہ اور ضرورتاً پالی جاتی ہیں۔"

"تم طنز سے باز نہیں آؤ گے۔" وہ احتجاجاً غرائی پھر جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں بولی بلکہ دھاڑی۔

"صبح سے بیسیوں فون کر چکی ہوں مگر ہر بار ایک ہی قسم کی آواز سنائی دی۔"جی ولید بائو تو نہیں ہیں۔" مائی گاڈ۔کم از کم ولید! ملازم تو ڈھنگ کے رکھ لیا کرو۔اس قدر غیر ذمہ دار' تمہیں میسج تک نہیں دیا گیا۔آواز سے ہی غائب دماغ اور بے وقوف قسم کی چیز لگتی تھی۔ولید بائو۔"

وہ غالباً صغریٰ کی نقل اتار رہی تھی۔ولید بے ساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکا تھا۔

"میں تو ایسے ملازموں کو دو منٹ سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ تنفر سے بولی۔

"بھئی اس بیچاری کو کیوں لتاڑ رہی ہو وہ تو بہت معصوم' بے ضرر سی بچی ہے۔ میں ہی ابھی گھر میں وارد ہوا ہوں اور رہی برداشت کرنے کی بات تو ہم فیوڈل لوگ نہیں ہیں اس لیے ہم میں برداشت بہت زیادہ ہے۔"

"اف... آج کل کیا طنز کا کورس پورا کر رہے ہو۔" وہ مصنوعی خفگی سے غرائی جواباً ولید کا خوبصورت قہقہہ بکھر گیا۔

"پتہ نہیں میرے سیدھے سادے جملوں کو تم مسلسل طنز پر کیوں محمول کر رہی ہو؟ حالانکہ..."

"جی ہاں' جی ہاں! حالانکہ آپ جناب کے منہ سے تو ہیرے موتی جھڑ رہے ہیں مگر افسوس... میں یہ موتی چننے نہیں آسکتی۔" وہ یہ کہہ کر طویل قسم کی ٹھنڈی سانس بھرنے لگی۔

"میرا خیال ہے میں اپنا اے سی بند کر دیتا ہوں۔"

وہ شرارت سے بولا تو وہ زور سے ہنس پڑی۔

"چلو شکر ہے اس کا مطلب ہے میری ٹھنڈی سانس براہ راست تم تک پہنچی ہے۔" اس کا لہجہ یہ کہتے ہوئے ذو معنی اور دھیما ہو گیا۔ ولید لمحہ بھر چپ رہا پھر بولا۔

"کیسے یاد کر لیا اور بیسیوں بار فون کرنے کی وجہ؟ خیریت تو ہے مجھ حقیر پر تقصیر کی یاد کیونکر آ گئی۔"

"یاد تو نہیں کیا جاتا ہے ولید حسن صاحب! جنہیں بھلا دیا جائے اور میں نے تمہیں بھلایا کب ہے۔" وہ خاصے پرانے گھسے پٹے جملے کا سہارا لیتے ہوئے اسی لہجے میں بولی۔

حسن سے دل لگا کے ہستی کی
ہر گھڑی ہم نے آتشیں کی ہے

پھر ایک ٹھنڈی سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر آزاد کی۔

ولید یوں تو آمنہ علی کی بے باک' نڈر فطرت سے آگاہ تھا مگر جانے کیوں عموماً اس طرح کے حملوں پر وہ کوئی جوابی رد عمل ظاہر کرنے سے ہمیشہ قاصر رہا تھا۔

یہ اس کی فطرت کے خلاف تھا یا پھر وہ دانستہ گریز کرتا تھا۔

جبکہ آمنہ علی جوابًا شدید قسم کے جذباتی رد عمل کی خواہشمند نظر آتی۔اس بار بھی وہ اس کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکا۔موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

”تمہارے باباسائیں اور باقی سب حویلی میں کیسے ہیں۔“

”ہاں اچھے ہیں۔تمہیں یاد کرتے ہیں۔“ وہ بولی تو اس کی آواز دھیمی تھی گویا خواہش کے برخلاف کچھ ہو جائے مگر پھر جلد ہی لہجے میں بشاشت بھرے ہوئے بولی۔

”ولید! تم مجھ سے کہیں مل سکتے ہو اگر کہو تو میں تمہیں پک کر لوں‘ ایک خبر سنانی ہے۔“

”ضرور جناب! سر کے بل آئوں گا‘ تمہیں زحمت نہیں دوں گا خود آجائوں گا‘ مگر خبر کیا ہے وہ تم مجھے فون پر بھی سنا سکتی ہو۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔یوں بھی وہ خود بھی اس سے ملنے کا خواہش مند تھا۔اپنی ڈھیر ساری مصروفیات کے باوجود وہ اس سے ملنے کے لیے وقت نکال سکتا تھا۔

”خبر تو خیر تمہیں سنا دیتی ہوں بلکہ اطلاع کہوں گی کہ دادا سائیں کی برسی ہے اسی مہینے کے اینڈ میں یعنی ٹھیک اکتیس تاریخ کو اور میں تمہیں انوائٹ کر رہی ہوں آئو گے نا۔“ وہ اشتیاق

بھرے انداز میں استفسار کرنے لگی۔وہ فوری طور پر کچھ نہ کہہ سکا سیدھا بیٹھ کر جیسے ریسیور کو بغور دیکھا پھر ہلکی ”ہوں“ کے ساتھ ذہن میں آنے والے خیال کو جھٹک کر بولا۔

”برسی... برسی میں میرا کیا کام... میرا مطلب ہے یہ برسی وغیرہ تو سادگی سے ہی منالینی چاہئے۔“

”ہاں سادگی سے ہی ہر سال منائی جاتی ہے مگر اس بار باباسائیں اور اداتوقیر بڑے پیمانے پر اور شاندار طریقے سے منانا چاہ رہے ہیں۔یوں سمجھو اس سلسلے میں ایک بڑی دعوت ہو رہی ہے۔مختلف شہروں سے بھی مہمان آرہے ہیں۔رشتہ داروں کے علاوہ سیاسی اور سماجی شخصیات بھی ہوں گی‘ بس مل بیٹھنے کا بہانہ ہے۔“

”اتنے بڑے بڑے لوگوں میں میری کہاں جگہ بن رہی ہے‘ میں نہ سیاسی لیڈر ہوں‘ نہ سماجی شخصیت نہ وڈیرہ لابی سے تعلق ہے اور نہ اخباری رپورٹر۔“

”کم آن ولید! ڈونٹ ٹیزمی۔“ وہ جیسے جھنجلا کر اسے ڈپٹنے لگی پھر دھیمے لہجے میں بولی۔

”تمہاری جگہ کہاں ہے کیا تمہیں خبر نہیں؟“ اس نے پھر اچانک حملہ کیا تھا۔وہ خفت سے ہنس دیا۔

"ارے ہاں رپورٹر سے یاد آیا پریس والوں کو بھی دعوت نامے دیئے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے تم اپنے اس لچر' بے وقوف اور افلاطون قسم کے صحافی فرینڈ کو بھی لے آنا۔ کیا نام ہے اس کا... شاید سکندر رضا۔ یوں بھی ایسے مواقع چھوٹے قسم کے صحافیوں کے نصیب میں کم ہی آتے ہیں۔ اسے کہنا یہ گولڈن چانس ہے مس نہ کرے۔" وہ یہ کہہ کر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ جیسے اپنی باتوں سے خود ہی محظوظ ہو رہی ہو۔

"میں تمہارا پیغام من و عن اسے پہنچادوں گا آگے اس کی مرضی۔ ویسے پریس والوں کا برسی میں کیا کام۔" اس نے جیسے چونک کر پوچھا پھر خود ہی سانس بھر کر مسکرانے لگا۔

"ہاں بھئی پریس والوں کے بغیر تو آج کل سیاسی لوگوں کا چھوٹا موٹا فنکشن بھی نہیں ہوتا کجا اتنے وسیع پیمانے پر ارینج کی گئی دعوت۔ اب تھوڑی بہت تشہیر تو حق بنتا ہی ہے۔"

"لگتا ہے آج تم نے طنز کے سارے تیر چلانے کا ارادہ کر لیا ہے۔"

وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔ "میرا خیال ہے کچھ بچا کے رکھو برسی والے روز کام آئیں گے۔"

"سوری میں تو مذاق کر رہا تھا۔" وہ جلدی سے بولا تو وہ پھنکاری۔

"اچھا مذاق کر لیتے ہو فضول انسان! مصیبت تو یہ ہے کہ میں تمہارے آگے بے بس ہو جاتی ہوں ورنہ' ورنہ تم دیکھتے۔"

"اوہو اب ڈرائو تو مت۔" وہ اس کے غرانے پر مصنوعی گھبراہٹ کے ساتھ بولا اور ہنس پڑا۔ وہ بھی ہنس دی۔ "کیا کیا جائے کہ:

ایک تو اس کی نگاہوں نے کیا بے دست و پا

اس پہ یہ مشکل کہ اپنا دل بھی من مانی کرے

اینی وے پھر مل رہے ہو نا مجھ سے کل؟"

وہ یاد آنے پر جلدی سے بولی۔

"اور ہاں دادا سائیں کی برسی میں تو تمہیں لازماً گوٹھ آنا ہے۔ میں کوئی ایکسکیوز نہیں سنوں گی۔" اس کی بات کے اختتام پر ولید حسن کے چہرے کے زاویوں میں ایک کھنچاؤ سا آ گیا۔ آمنہ علی اس وقت اس کے سامنے موجود نہیں تھی ورنہ اسے شاید اپنے تاثرات مخفی رکھنے کے لیے فوری تردد کرنا پڑتا مگر اب وہ ایسی کوئی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ بظاہر خوشدلانہ انداز

میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اور جب ریسیور کریڈل پر رکھا تو دل کے اندر ایک عجیب سی چبھن ہونے لگی تھی مگر اس نے فوری طور پر سر جھٹک کر جیسے ان خیالات کو ذہن سے ہٹایا جو اس کے دل میں چبھن پیدا کر رہے تھے پھر فون سیٹ پر دونوں ہتھیلیوں کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر مسکرانے لگا۔

سیاسی فائدے

شہرت

اس برسی سے یہی کچھ وابستہ ہو سکتا تھا۔ان سیاسی وڈیروں کا برسی کا کھانا فقرائی' غرباو مساکین کے لیے نہیں بڑے بڑے سماجی' سیاسی پیٹ بھرے ہوئوں بلکہ بڑھے ہوئوں کے لیے ہو گا۔

"آ... ہا... وڈیرہ مردان علی شاہ! مردوں پر بھی اچھی سیاست ہو سکتی ہے۔" دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر صوفے کی پشت سے لگا کر آنکھیں موند لیں۔اس کے چہرے کے تنے ہوئے نقوش میں دھیمی مسکراہٹ لہرا کر منجمد ہو گئی تھی۔

X...X...X

یاسر آج نومی کو دولت کے حصول کے طریقے بتانے والا تھا۔

"دولت میرے گھر کی باندی۔"

یہ بڑا ہی خوش کن تصور تھا بڑا ہی پر لطف احساس۔

بڑی سی گاڑی۔

وسیع و عریض آراستہ پیراستہ کوٹھی۔

کلائی میں سوئس کی گھڑی اور

"اف' یاسر! یاسر! میری بے قراری کو ہوا نہ دو میرے خوابوں سے مت کھیلو۔" اس کی تڑپ اور بے قراری پر سارے یار دوست قہقہہ لگا بیٹھے۔

یاسر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا اسے دلاسہ دیا پھر کانچ کی ٹیبل سے اپنی گاڑی کی چابی اٹھائی اور اس کے کندھے پر دباؤ ڈالا۔

"چلو میرے ساتھ۔"

"کک... کہاں۔" نومی قالین سے اٹھتے ہوئے یاسر کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہاں جہاں پیارے دولت کی برسات ہوتی ہے۔یوں چھن چھن چھن۔" افتخار مزاحیہ انداز میں ہاتھ ہلا کر بولا اور قہقہہ لگایا۔نومی پلٹ کر افتخار کو دیکھنے لگا۔وہ حقیقتاً غائب دماغ ہو رہا تھا تب یاسر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"تم تو چلو یہ سب تو بکواس کرتے رہیں گے۔"

سانوں اک پل چین نہ آوے

سانوں اک پل چین نہ آوے

او سجناں تیرے بنا

ان سب کی بکواس واقعی جاری تھی یاسر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

یہ گلشن اقبال کا قدرے سنسان علاقہ تھا جہاں یاسر اپنی گاڑی میں اسے بٹھا کر لے آیا تھا۔ دائیں طرف ون یونٹ بنگلوں کی قطار تھی۔مشکل سے پانچ بنگلے ہوں گے جبکہ سامنے کی

طرف خالی پلاٹ تھے جن پر برائے فروخت کے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے۔یاسر نے گاڑی جہاں روکی تھی وہ خالی پلاٹ ہی تھا۔اس نے ایک دو لمحے کے بعد نومی کی طرف دیکھا۔

"ریوالور چلانا آتا ہے تمہیں میرا مطلب پسٹل وغیرہ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگائی اور ایک کش لے کر دھواں کھڑکی سے باہر اڑا کر نومی کی طرف دیکھا جو اس کی بات پر اچھل کر رہ گیا تھا۔

"کک... کیا مطلب ری ری وال ور۔ مگر کیوں۔"

"گھبراؤ مت۔" اس نے ہنستے ہوئے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور سیاہ گیٹ کی طرف اشارہ کیا جو بنگلوں کی قطار کا آخری بنگلہ تھا۔

"یہ گیٹ دیکھ رہے ہو۔"

"ہاں۔" وہ کسی سعادت مند بچے کی طرح سر ہلاتے ہوئے گیٹ کو گھورنے لگا۔

"تمہیں صرف تین گولیاں اس سیاہ گیٹ پر چلانی ہیں کسی انسانی جان کو ضائع نہیں کرنا صرف نشانہ دیکھنا ہے تمہارا۔"

نومی ہکا بکا رہ گیا۔ پیشانی سے پسینہ یوں پھوٹ نکلا جیسے کسی پہاڑ کی کھوہ سے چشمہ پھوٹ نکلے۔ اس نے یاسر کی طرف قدرے الجھن بھرے انداز میں دیکھا۔

"یہ... یہ مذاق کا کون سا وقت ہے۔" اس کی آواز پست تھی جیسے وہ بھی سمجھ رہا ہو کہ یاسر مذاق نہیں کر رہا ہے۔

"مذاق کون کر رہا ہے پیارے! تمہیں صرف اتنے سے کام کے بیس ہزار روپے ملیں گے۔ بولو کیا گھانے کا سودا ہے؟ یار ایک تو تم بزدل بہت ہو۔ لڑکیوں کی طرح گھبرا جاتے ہو۔ ہماری ساتھی لڑکیاں بھی تم سے بہادر ہیں۔"

"یا... یاسر! بیس ہزار؟" وہ اس کی ڈانٹ پھٹکار سے بے نیاز بیس ہزار کی رقم کے نشے کو گویا دل و دماغ پر طاری کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ پھر الجھن بھرے انداز میں یاسر کو تکتے ہوئے بے یقین لہجے میں بولا۔

"مگر... مگر یاسر! کیوں، کس لیے؟ کون دے گا مجھے بیس ہزار صرف اتنے سے کام کے اور کیوں دے گا؟ تم تم بے وقوف بنا رہے ہو مجھے۔"

"بے وقوف تو تم پیدائشی ہو اب کون وقت ضائع کرے۔"

یاسر نے سگریٹ کے دو تین گہرے گہرے کش لے کر کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔

"میں تو تمہیں بہادر بے خوف بنا رہا ہوں اور پیسہ کون دے گا اس کی فکر مت کرو۔ بس سودا طے کرو، کل یہ کام ہو گا اور اس دن تمہاری ہتھیلی پر بیس ہزار کے سبز سبز نوٹ ہوں گے۔" یاسر نے گویا سبز باغات کا نقشہ ہی کھینچ دیا تھا۔

اس کا دل حلق سے ٹکرایا پھر سینے کی دیواروں سے کسی دیوانے کی طرح ٹکرانے لگا۔ ذہن نوٹوں کے سبز باغوں میں الجھنے لگا۔ آنکھوں کے آگے خواب کی تعبیر ہنستی، مسکراتی دکھائی دینے لگی۔ بھلا یہ کون سا مشکل کام ہے اتنے ویرانے میں چند گولیاں برسا کر گاڑی بھگا کر لے جانا۔

"اس کا ذہن آمادگی ظاہر کرنے لگا مگر وہیں کہیں دل پہلو میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

"تم ساری رات سوچ سکتے ہو۔" یاسر نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

X...X...X

نومی کے لیے وہ رات بہت بھاری تھی۔ یاسر نے اسے سوچنے کو پوری رات دی تھی اور وہ پوری رات ہی سوچتا رہا کروٹیں بدل بدل کر، کبھی خوش آئند تصورات اس کے ذہن کی سطح پر بخارات بن کر چھا جاتے تو کبھی خوف کی زرد رات دھند کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

مگر

خوش آئند تصورات کا پلڑا بھاری تھا چونکہ اس نے زندگی کا مقصد ہی دولت کا حصول بنا رکھا تھا۔ دولت کو اہمیت دے دی تھی اور دوسرا وہ اپنے خوابوں کی لگاتار شکستگی سے تنگ آ چکا تھا اور یاسر اسے اپنی

منزل کے اس نشان کی طرح لگا تھا جو اسے اس کی منزل تک پہنچا سکتا تھا اور وہ اب اسے کھونے سے خوفزدہ تھا جیسے کسی ویران جنگل میں گم ہو جانے والے شخص کو یکدم کوئی دوسرا ذی روح نظر آ جائے جو اسے اس کی منزل کا پتہ بتا سکتا ہو۔

ایک فیصلہ کرنے کے بعد وہ بڑی بے قراری سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔

اس صبح کا جو اس کی قسمت بدلنے والی تھی۔ وہ یوں مضطرب اور مسرور ہو رہا تھا جیسے صبح کی سنہری چمکیلی چھڑی گھومے گی اور وہ ایک امیر کبیر شخص بن جائے گا۔

صبح وہ یاسر کے پاس موجود تھا۔ اس کی رضامندی پر یاسر صرف ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ اس کے لیے نومی کی رضامندی غیر متوقع نہیں تھی گویا وہ پہلے ہی جانتا تھا کہ جواب یہی ملنا تھا۔

''یاد رکھنا نومی! آج دنیا کے ہاتھ میں جو ترازو ہے اس میں اس کا پلڑا بھاری ہے جو دولت مند ہے۔ دولت سے طاقت آتی ہے، عزت ملتی ہے، شہرت ملتی ہے۔''

یاسر اس کے ہاتھ میں کافی کا مگ پکڑاتے ہوئے کسی ناصح کی طرح اسے سمجھانے لگا۔ وہ ایسی باتوں سے تو پہلے ہی متفق تھا اب بھی سر ہلا رہا تھا۔

اور پھر ایک مزے دار لنچ کے بعد یاسر اسے لے کر چل پڑا۔ یہ وہی علاقہ تھا جہاں وہ اسے کل بھی لے کر آیا تھا۔ بھری دوپہر تھی ہو کا عالم تھا۔ ورکنگ ڈے کے باعث مرد گھروں میں نہیں تھے اور عورتیں نیند کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ بس ملازم ہی ہوں گے تو ہوں گے جو کام نمٹا کر اب کہیں بیٹھے اونگھ رہے ہوں گے۔

نومی نے پہلی بار یہ خوفناک کھلونا تھاما تھا۔اس کی انگلیاں ٹرائیگر پر کانپ رہی تھیں مگر بیس ہزار کا خوش کن تصور اسے حوصلہ بخش رہا تھا۔

اتنی رقم یک مشت آجانے کا خیال بڑا دلفریب اور حوصلہ افزا تھا۔وہ بھی یاسر کی طرح زندگی کے سارے مزے لوٹنے کا خواہشمند تھا۔

"شاباش چلاؤ گولی۔" یاسر نے اس کی پیٹھ تھپکی۔اس کے ساتھ ہی بے آواز اپنا ریوالور بھی جیب سے نکال لیا تھا۔

نومی کی انگلی ٹرائیگر پر دبی اور تڑاتڑ گولیاں سیاہ گیٹ کو چھیدنے لگیں۔

گہری پرسکون خاموشی میں گولیوں کی آواز نے خوفناک فضا تان دی اور اس فضا میں ایک معصوم بچے کی بھی چیخ شامل تھی جو کسی گیٹ سے باہر اپنی فٹ بال اٹھانے نکلا تھا مگر نومی اپنے حواسوں میں ہوتا تو اس طرف متوجہ ہوتا اور یوں بھی اس کی تین گولیاں سیاہ گیٹ پر ہی لگی تھیں اور اس نے پوری تین گولیاں ہی برسائی تھیں۔دوسرے پل یاسر فراٹے سے گاڑی بھگا لے گیا تھا۔

یاسر نے وعدے کے مطابق اس کی ہتھیلی پر بیس ہزار روپے رکھے تو وہ کتنی دیر بے یقین سا بیٹھا رہ گیا۔اس کی نظریں یوں ہرے نوٹوں پر جم گئیں جیسے پیاسے کی نگاہیں خالی کنوئیں پر جس سے یکدم پانی نکل آیا ہو۔

اور اسے لگا جیسے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ پھیل کر اس کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا ہو۔اس کی ساری وحشت جو اس کے ہر مسام سے پسینے کی صورت بہہ رہی تھی یوں بیٹھنے لگی جیسے اڑتی ہوئی دھول رم جھم پھوار سے بیٹھ جائے۔

"صبح کا اخبار پڑھو گے تو یقین آجائے گا کہ تم نے آج کارنامہ انجام دیا ہے۔" یاسر ریوالور پر پھونک مار کر اس کے بے یقین چہرے پر نگاہ ڈال کر ہنس پڑا اور ریوالور دراز میں ڈال دیا۔

نومی کی ہتھیلی یکدم خوف اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے کپکپانے لگی۔یوں لگا نوٹوں کی یہ گڈی مہکتا پھول بھی ہو اور دہکتا انگارہ بھی۔

‘کہیں دہکتا انگارہ ہی نہ ہو جائے۔’

دل کے کسی گوشے سے خوف کی سرد لہر اٹھی مگر دوسرے پل ذہن نے جیسے ہر صدا کا راستہ بند کرتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

'انگارہ ہی کیوں مہکتا پھول بھی تو ہو سکتی ہے۔ جو اس کے مستقبل کو مہکا دے گی۔' مستقبل جو اس کے آگے ویران بے آب و گیا صحرا کی مانند تھا اب یکلخت اسے گلستان دکھائی دینے لگا۔ اس نے تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے اپنی آنکھیں پھیلا کر یاسر کی طرف دیکھا۔

''باس، تم سے بہت خوش ہے۔'' یاسر نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

''باس' کون باس؟'' اس نے تحیر سے پلکیں پٹپٹائیں۔ بقول آفتاب کے اگر نومی کی آنکھوں کی معصومیت ختم ہو جائے تو وہ پکا خبیث لگے۔

یاسر اس کی معصوم ادا پر اسے گھورنے لگا۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے یہ رقم میں نے تمہیں دی ہے اپنی پاکٹ منی سے؟ یار بالکل الو کے پٹھے ہو' یہ ہم جو دولت میں کھیل رہے ہیں تو کہاں سے آئی دولت پیارے' اوپر والے... آں ہاں' وہ اوپر والا نہیں بلکہ اس ملک کی باا ثر شخصیات' ہاہا' سمجھ رہے ہو نا باا ثر۔''

''باا ثر کہلوانے کے لیے ہم بھی تو تگ و دو کر رہے ہیں۔'' یاسر صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گیا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے اس کی کھلی کھلی سمندر صفت آنکھوں میں مسکراتی نگاہیں گاڑتے ہوئے بولا۔

''جانو! یہ باا ثر طبقہ ہے نا جوان کی سمجھ نہیں آتی ہمیں۔ خوش ہو جائیں تو خزانے کے منہ کھول دیتے ہیں کسی بات پر برہم ہو جائیں تو خزانے کے منہ بند کر دیں اور ساتھ ہم جیسوں کو بھی ''خلاص'' کروادیں۔'' نومی نے آنکھیں جھپکائیں تاہم دل نامانوس خوف سے لرزا بھی تھا۔

''خلاص'' یاسر نے سر ہلایا پھر سگریٹ کو لائٹر کا شعلہ دکھاتے ہوئے بولا۔ ''خلاص'' کا مطلب بھی سمجھ آجائے گا فی الحال تم گھر سدھارو۔ صبح کا اخبار پڑھو' پھر ادھر دوڑے دوڑے آئو' یہ بیس ہزار بھی بھلا کوئی رقم ہے؟ ایک رات کی عیاشی کے لیے بھی پوری نہیں ہے' اس پر تکیہ مت کر بیٹھنا۔ ابھی تمہیں بہت آگے جانا ہے۔ کار' کوٹھی اور بہت کچھ اور یاد رکھو یہاں جو جتنا باا ثر ہے اتنا ہی قانون اس کا رکھوالا ہے؟۔ یہ چھوٹے موٹے قتل' چوریاں تو جان گنوانے کے مترادف ہیں۔ بڑے چوروں کا ہی قانون رکھوالا ہے تمہیں پتہ نہیں بڑے چور اسمبلیوں میں ہوتے ہیں اور چھوٹے چور جیلوں میں سڑتے ہیں۔''

"اور کیا تم پڑھتے نہیں ہو' چند پڑیاں منشیات سپلائی کرنے والا پکڑا گیا جبکہ بڑے بڑے مافیا ایجنٹ عیش سے زندگی گزار رہے ہیں۔ محلوں میں رہتے ہیں اور B.M.W میں گھومتے ہیں۔" شہزاد نے بھی لب کشائی کی۔

"اے آنکھیں کیا پٹپٹا رہا ہے الوئوں کی طرح' ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں یہ۔" افتخار نے اس کی شکل دیکھی اور قہقہہ لگایا۔ یاسر اور شہزاد بھی ہنسنے لگے۔

"شاید تم جیسی شکلوں کے لیے ہی شاعر نے کہا ہے۔

خوبصورت' اداس' خوفزدہ

وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح"

شہزاد کی شاعرانہ رگ بھڑک گئی۔ ساتھ ہی سب کی ہنسی بکھر گئی اور اس میں نومی کی جھینپی جھینپی ہنسی شامل تھی۔ وہ اب اتنا نادان اور کم فہم بھی نہیں تھا جتنا وہ سب محض اس کی شکل سے اسے سمجھ رہے تھے۔ یاسر کے لفظوں میں وہ کیونکر الجھتا یہ باتیں تو اب کھلی پڑی تھیں زبان زد عام تھیں۔ ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈی کے لمس نے یکدم ہی اس کے اندر طاقتور

ہونے کا احساس پیدا کر دیا۔ وہ یاسر کے بنگلے سے نکلا تو اپنے اندر ایک سرشاری اترتی محسوس کر رہا تھا۔ ایک نئی ترنگ سے اس کے لب گنگنا رہے تھے۔

وہ ایک بجلی کے کھمبے سے لگ کر سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کا کھیل دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں تو اب آنے لگا کہ صبح و شام ہر شخص کی جدوجہد کا کیا مقصد ہے اور دنیا میں غریب ہونا کیوں جرم بن گیا ہے' دولت ہاتھ آنے کے احساس میں کیسا نشہ ہے۔

ابھی تو صرف بیس ہزار کی رقم تھی اس کی جیب میں اور جیب بھاری بھاری محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ خوشگواری سے سوچنے لگا کہ ایسی اور بھی کئی گڈیوں کا بوجھ اس کی یہ بدرنگ ٹرائوزر کی جیبیں سنبھال سکیں گی یا نہیں۔ پھر وہ خود ہی ہنس پڑا اپنی سوچ پر۔

"کیا کریں بے چاری جیبیں ابھی نیا نیا بوجھ اٹھانے کا تجربہ ہوا ہے نا۔ کہاں پانچ دس روپے زیادہ سے زیادہ پچاس سو کا بوجھ اٹھانے والی جیبیں بیس ہزار کی رقم اٹھائے ہوئے تھیں۔

سانوں اک پل چین نہ آوے

سجنا تیرے بنا

وہ جیب تھپتھپاتا ہوا سیٹی پر شوخ دھن بجاتا گھر کی طرف چل دیا۔اس کا وہ خفیف سا خوف بھی اب زائل ہو چکا تھا۔

X...X...X

"سیانے کہتے ہیں کہ اتنا نہ روٹھو کہ منانے والا خود روٹھ جائے۔" ولید نے کہتے ہوئے محدود فاصلے پر بیٹھی آمنہ علی کو مربیانہ انداز میں دیکھا تو وہ اپنے ایک دوسرے سے لپٹے بازو کھول کر درمیانی میز کی شفاف سطح پر پھیلا کر ایک ابرو چڑھائے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر یکدم ایک ٹھنڈی سانس لے کر ہنس پڑی۔

"چلو اس بہانے تم بھی روٹھو گے تو منانے کا ایک مرحلہ مجھے بھی طے کرنا پڑے گا مگر ایسے نہیں جیسا تم کر رہے ہو۔" یہ کہہ کر وہ کرسی کی پشت سے لگ کر ایک اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"پتہ نہیں ہم مرحلوں کے محتاج کیوں ہوتے ہیں؟ تمام مرحلے ایک ہی جست میں طے کیوں نہیں کر لیتے؟" کہتے ہوئے اس کی نگاہیں بوجھل سی ہو کر ولید حسن کے چہرے پر جم گئیں۔کتاب سے

پڑھا ہوا بلکہ رٹا ہوا جملہ جبکہ ولید اس کے موڈ کی تبدیلی پر گویا اطمینان بھری سانس بھر کر بولا۔

"تھینکس گاڈ' تمہاری ناراضگی اور شکوئوں کا پریڈ تو ختم ہوا۔یقین کرو میں مسلسل پندرہ منٹ سے خود کو نالائق قسم کا شاگرد تصور کرتے ہوئے تمہاری پھٹکار پر ندامت محسوس کر رہا تھا۔"

اور جواباً وہ اسے گھورنے لگی۔

وہ دونوں ایک خوبصورت ریستوران میں بیٹھے تھے جہاں آس پاس' دائیں بائیں اوپر نیچے روشنیاں جھلملا رہی تھیں جو پورے فرش کو بھی جھلمل کر رہی تھیں۔

نازک کراکری کی ہلکی ہلکی آوازیں اور قدموں کی خفیف سی چاپ کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی جیسے سب ہی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہوں۔

"تمہارے پاس میرے لیے بالکل بھی وقت نہیں ہے ولید! لگتا ہے تم مجھے بھول گئے ہو۔" وہ گویا پھر شکوے کا در کھول بیٹھی۔

"میں نالائق شاگرد ضرور ہوں مگر تم کورس کی کوئی کتاب ہرگز نہیں جسے پڑھ کر بھول جائوں۔ ویسے کچھ سبجیکٹس میں، میں خاصا ذہین مانا گیا ہوں مثلاً۔"

"ہاں یقیناً پولیٹیکل سائنس میں، مجھے پتہ ہے۔" وہ جیسے چڑ کر بولی اور پھر مینیو اٹھا کر کھول کر اس پر نظریں دوڑانے لگی۔

"اچھا، پولیٹکس میں، اس کی تو مجھے خبر نہیں۔" وہ انجان بنا حیرت کا اظہار کرنے لگا کہ اس نے مینیو کارڈ بند کر کے ٹیبل پر پٹخا۔

"فار گاڈز سیک ولید! میں، بالکل سنجیدہ ہوں۔ ڈونٹ ٹیزمی۔" وہ مصنوعی خفگی سے اسے گھورنے لگی۔ حالانکہ ولید حسن کے لبوں پر کھیلنے والی دھیمی دھیمی مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں میں تیرنے والی شرارت سیدھی اس کے دل پر لگ رہی تھی اور اس کا دل موہ رہی تھی۔

کالج کا سنجیدہ اور ریزرو سا رہنے والا ولید حسن صرف اسی سے تو بے تکلف تھا اور اس کی شرارتیں، یہ بذلہ سنجیاں اس کے لیے ہی تھیں۔ یہ احساس اسے مغرور بنائے رکھتا۔

کسی کو نہ چاہنے والا، کسی پر نگاہ التفات نہ کرنے والا، کالج میں ہارڈ سٹون کے لقب سے نوازا جانے والا یہ شخص اس کی ذات میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کے آگے گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ اپر کلاس کی ہزار ہانت نئی حسین تتلیوں میں وہی چنی گئی تھی تو کوئی خاص بات ہو گی اس میں، جس نے ولید حسن کو اپنا اسیر کیا تھا۔

"ہاں تو تم کچھ کہہ رہی تھیں اپنے گرینڈ پاپا کی برسی کی بابت۔"

وہ یکدم سنجیدگی کا لبادہ اوڑھتے ہوئے بولا تو اس نے گہری سانس بھری۔

"شکر ہے کہ تم نے کوئی معقول موضوع تو چنا۔" پھر اس پر نظر ڈال کر کھلکھلا کر ہنسی اور ایک ادا سے دائیں رخسار اور گردن پر آئے بالوں کو پیچھے جھٹکا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ خاصے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ جدید تراش کے کپڑوں اور نفاست سے کیے گئے میک اپ میں وہ خاصی چارمنگ لگ رہی تھی۔

گلے میں موٹی سی گولڈن زنجیر تھی جس میں اس کے اپنے نام کا پینڈنٹ جھول رہا تھا جس میں چھوٹے چھوٹے ڈائمنڈ جڑے ہوئے تھے وہ اس پینڈنٹ سے کھیلتے ہوئے بولی۔

”دادا سائیں نے ملک و قوم کی بہت خدمت کی ہے‘ وہ ایک اچھے سیاسی لیڈر ہی نہیں بہترین انسان تھے۔انہوں نے خود کو عوام کے لیے وقف کر دیا تھا‘ دن رات انہی کی فکر رہتی تھی انہیں۔“ وہ لہجے میں دلچسپی اور اپنے دادا کے لیے محبت سموتے ہوئے جیسے کوئی سربستہ راز سے ولید حسن کو واقف کرانے لگی اور وہ بھی سریوں ہلا رہا تھا گویا سو فیصد متفق ہو۔

”توقیر بھائی تو بالکل دادا سائیں کا پرتو ہیں ان کے دل میں بھی انہی کی طرح ہر وقت قوم کا غم رہتا ہے اور انہیں گھلاتا رہتا ہے۔“ وہ اپنی بات مزید جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”اور ایک ادا اکبر ہے‘ میرا چھوٹا بھائی‘ تم تو شاید اس سے ملے نہیں ہو۔“ وہ چونکتے ہوئے پوچھنے لگی۔ولید نے نفی میں سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

”دیکھو مجھے خیال ہی نہیں آیا وہ یہیں شہر میں ہوتا ہے میرے ساتھ کوٹھی میں ہی ہے‘ کبھی ملوائوں گی۔بہت شریر مگر ذہین ہے اور کچھ لاڈ پیار نے اسے ضدی بنا دیا ہے۔اس کا رجحان

پولیٹکس کی طرف بالکل نہیں ہے وہ تمہاری طرح کاروباری مائنڈ رکھتا ہے۔وہ انوسٹمنٹ کا قائل ہے۔اس کا رجحان صنعت و تجارت کی طرف ہے۔“

”تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔باپ سیاست دان ہو تو بیٹا کامیاب صنعت کار بن سکتا ہے۔“ اس کے ذہن میں بڑی تیزی سے یہ فقرہ پھسلتا ہوا زبان سے بے ساختہ ادا بھی ہو گیا۔آمنہ علی لحظہ بھر چپ سی ہو گئی پھر سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے اب کھانے کو اولیت دینی چاہیے۔بے حد بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ مینیو کارڈ اٹھا کر اس پر نگاہیں دوڑانے لگیں۔

ولید نے بے ساختہ ریسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر میز پر انگلیاں بجاتے ہوئے ریستوران کے ڈائننگ ہال کے داخلی دروازے پر نگاہ ڈالی پھر ادھر ادھر نظریں گھمانے لگا۔اس اثنا میں آمنہ علی نے ویٹر کو بلا کر اپنی پسند کے کھانے کا آرڈر دے دیا۔

”یہ بتائو تم آتو رہے ہو نا‘ پھر دادا سائیں کی برسی میں۔“ اس نے نیپکن اٹھا کر اسے ہلکا سا جھٹک کر کھولتے ہوئے ولید کی طرف دیکھا۔

"آنا ہی پڑے گا۔" اس نے جیسے اسے چڑانے کو گہری سانس بھر کر گردن کو ڈھیلے انداز میں ہلایا۔

"کیا مطلب' آنا ہی پڑے گا۔" وہ اسے گھور کر دیکھنے لگی۔

"ایکس کیوزمی' میں یہاں تشریف رکھ سکتا ہوں۔" یک دم عقب سے ابھرنے والی آواز پر دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا مگر اجازت طلب کرنے والا نہایت اطمینان کے ساتھ کرسی کھینچ کر اس پر براجمان ہو چکا تھا۔ وہ سکندر رضا تھا۔ بلیو جینز' وہائٹ شرٹ میں ملبوس اور حسب عادت اس کے کندھے پر بدرنگ جیکٹ جھول رہی تھی جسے وہ یوں لیے لیے گھومتا گویا وہ اس کا کوئی قیمتی اور موروثی اثاثہ ہو۔ ولید حسن نے اسے خفیف اور خوشگوار حیرت سے دیکھا اور زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ کون سا طریقہ ہے' اجازت ملنے کا انتظار تو کر لیتے۔"

"مجھے یقین تھا دوست! تم انکار تو کرو گے نہیں ویسے بائی داوے میں اس گوشہ عافیت میں مخل تو نہیں ہوا۔" اس نے براہ راست آمنہ علی کو مخاطب کیا جس کا خوشگوار موڈ سکندر کو

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

دیکھ کر اور اب یوں کرسی پر براجمان دیکھ کر انتہائی بگڑ چکا تھا' جس کی غمازی اس کے چہرے کے نقوش کر رہے تھے اور پیشانی پر پڑی آڑھی ترچھی لکیریں تھیں۔

اس نے صرف نظریں اٹھا کر سکندر کا اوپر سے لے کر نیچے تک جائزہ لیتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے۔

"آمنہ! یہ میرا دوست سکندر رضا ہے۔" ولید اس کے چہرے کے بگڑے زاویوں کو نظر انداز کر گیا تھا اور تعارف کرانے لگا۔

"جانتی ہوں' بہت اچھی طرح۔" وہ خاصی ترشی سے گویا ہوئی اور بالوں کے کنارے کو انگلی میں لپیٹتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگی جیسے اسے اس تعارف سے نہ خوشی ہوئی تھی نہ ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

"تھینک یو' ویسے ولید بھی فارمیلٹی ہی پوری کر رہا ہے۔ مجھے تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ یقیناً آپ بھی پڑھتی ہوں گی میرے سفاک حقیقت پر مبنی کالم وغیرہ۔" سکندر نے سر ہلاتے ہوئے جیسے پر یقین سے لہجے میں کہا تو وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اس کی طرف دیکھنے لگی پھر ناک سکیڑ کر بولی۔

"اتنا فالتو وقت تو نہیں ہوتا میرے پاس کہ میں ایسے دو دو ٹکے کے کالمز پڑھوں۔"

"جبکہ ان دو دو ٹکے کے کالمز میں تو بڑے بڑے عالی رتبہ وڈیروں اور عزت ماب سیاسی مداریوں اوہ سوری! سیاست دانوں کا ذکر خیر ہوتا ہے۔" وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"یہ دو دو ٹکے کالم در حقیقت "لاکھوں" کے ہوتے ہیں۔" اس کی مسکراہٹ کچھ کشادہ ہو گئی پھر جیسے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"ہاں مگر میرے کالم دو ٹکے کے ہی ہیں کہ اس میں ایسے عزت داروں کو سلام پیش نہیں کیا جاتا۔ ان کے سیاہ کارناموں کو سفید کر کے بلکہ سنہری کر کے پیش نہیں کیا جاتا۔"

وہ خاموشی اور گہری سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتی بلکہ اسے گھورتی رہی اور جونہی وہ خاموش ہوا اس کے چہرے پر استہزائیہ تاثرات آ گئے وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ایک دو ٹکے کے کالم نگار کو اتنے مہنگے ریستوران میں ڈنر کا خیال کیونکر آ گیا۔ ایسے ڈنرز تو عالی مرتبہ اور عزت ماب سیاست دانوں کے خاندان ہی افورڈ کر سکتے ہیں' آپ یہاں کہاں۔" اس کا لہجہ انتہائی زہریلا تھا۔

ولید سر جھکائے جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگائے دھیرے دھیرے چسکیاں بھر رہا تھا۔ وہ خود کو ان دونوں کی گفتگو سے دانستہ الگ رکھے ہوئے تھا۔

"بجا فرمایا مس آمنہ مردان علی آپ نے۔" وہ بغیر برا منائے اطمینان سے سر ہلانے لگا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"واقعی اتنا مہنگا ڈنر میں کہاں افورڈ کر سکتا ہوں ایک سچا' کھرا' ایماندار اور محب وطن صحافی ایسے ریستورانوں کے خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ یہ تو ان عالی مرتبہ لوگوں کی عنایت ہے جنہوں نے مجھے آج اس ڈنر پر مدعو کیا ہے۔" اس نے ولید حسن کی طرف اشارہ کیا جس پر ولید کے حلق میں پھندا سا لگ گیا۔ اس نے جھٹکے سے جوس کا گلاس منہ سے ہٹایا تھا۔ ایسی مایا سیال شے بھی کسی سخت ٹھوس شے کی طرح حلق میں پھنستی محسوس ہوئی تھی جبکہ آمنہ علی نے چونک کر ولید کی طرف دیکھا دوسرے پل اس کے چہرے پر برہمی جھلکنے لگی۔ اس کے خون میں گویا ابال سا آ گیا تھا۔ اس نے گود میں رکھا نیپکن کھینچ کر میز پر پٹخا۔

''تو تم نے انہیں بھی انوائٹ کرر کھا تھا۔ میرا خیال ہے ولید تم آج انہی کی خاطر مدارات کرلو تو اچھا ہے۔'' وہ بولی تو لہجے میں شعلے دہک رہے تھے۔اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے شولڈر بیگ کی گولڈن زنجیر کھینچی تو میز کی سطح پر رکھا چمکتا سیاہ بیگ گود میں آ گرا۔

''بات تو سنو آمنہ !'' ولید اس کے یوں جھٹکے سے کھڑے ہو جانے پر سکندر کو گھورنے کا سلسلہ موقوف کرکے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''پلیز، پلیز مس آمنہ !آپ تشریف رکھئے میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' سکندر اب خفیف سی بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا پھر سنبھل کر کرسی کھینچ کر اپنے کاغذوں کے رول جو ٹیبل پر رکھے تھے اٹھا کر اس کی طرف بڑھا۔

''پلیز آپ بیٹھ جایئے یوں بھی میں آج کل پرہیزی کھانا کھا رہا ہوں اتنا سپائسی فوڈ کھا بھی نہیں سکوں گا اور ولید کے پیسے ضائع ہو جائیں گے۔ آپ کھائیں گی تو کم از کم ضائع تو نہیں ہوں گے۔'' یہ

کہتے ہوئے معنی خیز تبسم کے ساتھ ولید کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی جس پر ولید نے اسے گھور کر دیکھا۔

وہ جھٹکے سے پلٹی تھی اور دانت پیس کر اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہنے کو منہ کھولا کہ ولید کی آواز ابھری۔

''پلیز آمنہ !میرا خیال تھا تم میں سینس آف ہیومر تو ہوگا ہی اتنا' بہرحال سکندر کو میں نے آج انوائٹ نہیں کیا۔وہ اسی ہوٹل میں کسی اہم شخصیت سے ملاقات کے لیے ڈیٹ پر آیا ہے۔''

''اور ظاہر ہے وہ اہم شخصیت آپ دونوں میں سے کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔'' بقیہ جملہ سکندر نے پورا کیا تھا اور رول کیے کاغذوں کو ہولے ہولے اپنی ران پر مارتے ہوئے معذرت خواہانہ سی نظروں سے آمنہ علی کو دیکھنے لگا جو اس کی طرف سے جھٹکے سے چہرے کا رخ موڑ کر دوبارہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔

اس کے چہرے کے زاویوں میں ابھی تک برہمی کے تاثرات تھے۔بے زاری تھی۔اس کا موڈ حد سے زیادہ خراب ہو چکا تھا اور یہ غصہ اس خیال کی وجہ سے موجود تھا کہ ولید حسن اس سے قطعاً جھوٹ بول رہا ہے۔اس نے یقیناً سکندر کو انوائٹ کیا تھا۔

''ویسے مس آمنہ علی! آپ نے مجھے اپنے دادا سائیں کی برسی پر بھی تو انوائٹ کیا ہے ولید کے تھرو' کیا وہاں میرا وجود برداشت کر لیں گی ایک سچے دو ٹکے کے صحافی کا۔'' وہ جاتے جاتے یاد آنے پر پھر اس کی سمت آیا اور جھک کر متانت سے پوچھنے لگا اور اس کے بولنے سے پہلے خود ہی بول اٹھا۔

''ویسے یہ دعوت مجھے آپ کی طرف سے ملنے سے پہلے ہی مل چکی تھی۔ آپ کے بابا سائیں کی طرف سے۔ ہم ''غیر اہم'' لوگوں کو بے حد مخلصانہ دعوت نامہ موصول ہوا ہے۔ ظاہر ہے ایسی تقاریب کی ہم ہی لوگوں نے تشہیر کرنی ہے۔ یہ دعوت نامہ کئی مضامین کے ہمراہ آیا ہے جو اخبار میں شائع کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے اور ہمیں تو خصوصی گاڑیاں بھیجیں جائیں گی اینی وے میرا خیال ہے آپ لوگ سکون سے ڈنر تناول فرمایئے اللہ حافظ۔''

وہ ایڑیوں کے بل گھوم گیا جبکہ آمنہ علی ہونٹ باہم دانتوں میں دبائے دونوں کہنیوں تک ہاتھ ٹیبل پر پھیلائے اپنے آگے رکھی کراکری کو گھورتے ہوئے گویا اپنے وجود کے اندر سے اٹھتے ابال کو دبا رہی تھی۔ اس کے جاتے ہی بارودی دھماکے کی طرح پھٹی۔

''اگر یہ شخص تمہارا دوست نہ ہوتا تو میں اسے دو منٹ میں ٹھیک کر دیتی۔ میں نے بہت برداشت کیا ہے ولید!''

''میرا خیال ہے تم بلا وجہ اپنا ٹمپر لوز کر رہی ہو۔ اس میں اس قدر ایموشنل ہونے کی کیا بات ہے۔'' ولید نے نہایت اطمینان سے اس کی طرف نظریں ڈالیں اور چکن کارن سوپ کا بائول اپنی طرف کھسکایا۔ اس کے چہرے کے زاویوں میں اس واقعہ کی بدمزگی کا قطعاً کوئی اثر نہیں تھا۔

''وہاٹ' وہاٹ ڈو یو مین یہ میں بلا وجہ ایموشنل ہو گئی تھی۔'' اس نے کٹیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس کی بکواس بھی میں نے صرف اور صرف تمہاری وجہ سے برداشت کی ہے۔''

''میں تمہارا ممنون ہوں۔'' وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو آگے کی طرف ہلکی جنبش دے کر بولا تو اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں وہ یہاں کسی اہم سماجی شخصیت سے ملنے آیا ہوا ہے۔'' وہ قدرے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"اونہہ، اہم شخصیتوں سے ہی تو فائدے اٹھائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ تو اپنے قلم کو کیش کرانا خوب جانتے ہیں۔ بس موقع ملنا چاہئے۔" وہ حقارت بھری سانس بھر کر اپنی پلیٹ میں چاول نکال کر کھانے لگی۔

"بس یہی تو اس کی خوبی ہے کہ وہ ایسے مواقع کی گرد سے خود کو بچائے ہوئے ہے اور ارد گرد پھیلنے والی دھند کو جھاڑتا آیا ہے۔" ولید ابھی مزید جاری رہتا وہ ہاتھ اٹھا کر جیسے جل کر بولی۔

"پلیز اب اس کے قصیدے پڑھنے مت بیٹھ جانا۔ ورنہ میرا ٹمپر پھر لوز ہو جائے گا۔" اس نے جیسے احتجاجی التجا کی کہ وہ بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ نہ روک سکا تھا۔ نیپکن سے ہونٹوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے نیپکن واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی طرف خاص دل آویز نگاہیں ڈالیں۔ "تم کہو تو تمہارا قصیدہ پڑھنا شروع کر دوں۔"

اس کی بات پر وہ پلکیں جھپک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر چمچہ پلیٹ میں رکھا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ دونوں ہتھیلیاں کہنیوں کے سہارے اٹھا کر اس پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے قدرے تشنہ لہجے میں بولی۔

"ایسی کہاں قسمت ہماری کہ ولید حسن کے منہ سے ہمارے لیے قصیدہ بر آمد ہو۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اب اتنا مایوس ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے ایک آدھ شعر تو تمہاری شان میں سنا ہی سکتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا تو وہ کھل اٹھی اور اشتیاق بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ اس کا موڈ سابقہ حالت میں آچکا تھا اور خاص کر ولید کی رومینٹک حس کا بیدار ہونا اس کے لیے کسی ایکسپنسیو لمحے سے کم نہیں تھا مگر دوسرے پل اس کے چہرے پر کھلنے والے گلاب مرجھانے لگے۔ وہ شرمندہ سا معذرت خواہانہ انداز میں سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"بس یہی میرے ساتھ مشکل ہے کہ مجھے شعر ویر بالکل یاد نہیں رہتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے شاعری خود مجھ سے دور بھاگتی ہے۔ حالانکہ میں ایسا بدذوق بھی نہیں ہوں اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں بسوں اور ویگنوں میں سفر نہیں کرتا ورنہ دیکھتیں مجھے کیسے فر فر شعر یاد ہوتے۔"

"تو اب بسوں میں سفر شروع کر دو۔" وہ جیسے چڑ کر بولی تو وہ ہونٹ دبا کر اسے دیکھنے لگا اور سر ہلا کر بولا۔ "میرا بھی خیال ہے اب مجھے یہی کرنا پڑے گا۔ ویسے راز کی بات ہے۔" وہ ذرا سا اس کی سمت جھکا۔

"بسوں کے اشعار میں ہمیشہ کسی پری پیکر کا ذکر ہوتا ہے شعر کیا ہوتا ہے پورا قصیدہ ہوتا ہے۔"

"کم آن، اب فضول بکو مت، اب ظاہر ہے کہ کسی دیو پیکر کا ذکر تو ہونے سے رہا اشعار میں، تم بہت بے ایمان ہو ولید!" وہ دبی دبی ہنسی کے ساتھ اسے گھورنے کا عمل ترک کر کے پلیٹ سے چمچہ اٹھا کر دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گئی۔

"یوں بھی بسوں اور ویگنوں میں سفر کرنے کی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے تم قصیدہ اپنے اون ورڈز میں بھی سنا سکتے ہو۔" وہ چمچہ بھر کے چاول منہ میں لے جاتے ہوئے اس کی طرف شکایتی انداز میں دیکھ کر بولی۔

"ہاں اگر سنانا چاہو تو۔" ولید نے ایک گہری سانس بھری اور کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا۔

"ان فیکٹ، میرے نزدیک لفظ اتنی اہمیت نہیں رکھتے موٹے موٹے ثقیل اجنبی الفاظ کسی بھی رشتے کی پائیداری کا پیمانہ نہیں ہوتے۔ ہمارے رویے از خود بہترین اظہار ہوتے ہیں۔" وہ قدرے سنجیدگی سے گویا ہوا تو آمنہ علی نے اس کی طرف دیکھا اور دھیرے سے مسکرائی۔

"مگر کہتے ہیں نا کہ محبت پھول ہے اور اظہار اس کی خوشبو۔" اس کا انداز دھیما اور لو دیتا ہوا تھا۔

"یہ جس نے بھی کہا ہو گا یقیناً خوش نما باغیچے میں بیٹھ کر فلسفہ جھاڑا ہو گا۔" وہ اس کی نگاہوں سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے بولا اور کف ہٹا کر ریسٹ واچ پر نظریں ڈال کر بے ساختہ سر پر ہاتھ مارا۔

"مائی گڈنس، لڑکی! تمہیں اندازہ ہے تم نے میرا کتنا وقت برباد کر دیا ہے۔ بہت اہم میٹنگ میں شرکت کرنی ہے مجھے۔"

"اس وقت، دس بجے بھلا کون سی میٹنگ ہوتی ہے۔" اس نے حیرت کے ساتھ قدرے جھنجھلا کر اسے دیکھا۔ اسے اس خوبصورت موضوع کے ختم ہو جانے پر حقیقتاً کوفت ہوئی تھی۔

ولید حسن کی ہمراہی میں یوں تو ہر لمحہ حسین ہوتا مگر ایسے حسین تر اور جاں فزا لمحے کم ہی میسر آتے تھے مگر وہ کیا کر سکتی تھی اس شخص کو بات بدلنے اور بنانے کا ہنر بھی خوب آتا تھا۔

"آغا جی کے ساتھ، گھر پر ہے میٹنگ اور بلیو می آمنہ! وہ مجھ سے زیادہ پنکچوئل ہیں وقت کے معاملے میں۔ دیکھنا تم لان میں ٹہل رہے ہوں گے۔ دو منٹ اوپر ہونے پر ٹھیک ٹھاک کلاس لیں گے۔" اس نے عجلت بھرے انداز میں اپنی جیب تھپتھپا کر اس سے والٹ نکالا

"میں تم سے کہہ رہا ہوں لڑکی! یہ مذاق نہیں ہے میری عزت کا سوال ہے۔"

"اوکے اوکے' اب یہ اتنا سارا کھانا کون کھائے گا جو منگوالیا ہے۔" وہ اطمینان سے کھاتے ہوئے بولی۔

"تم کھاؤ گی اور کون۔"

"تو جب یہ سارا کچھ مجھے ہی کھانا ہے تو اطمینان سے بیٹھو۔" وہ ابرو چڑھا کر اسے دیکھنے لگی اور زور سے ہنس پڑی۔

"اچھا بابا' اب یوں گھورو تو مت بس یہ سوئٹ ڈش کھالوں۔یوں بھی تمہارا وقت میں نے نہیں تمہارے اس لچر صحافی دوست نے آکر برباد کیا۔" وہ کھانے کے بعد اطمینان سے نیپکن سے ہونٹ پونچھنے لگی اور اس پر ایک تفصیلی نگاہ ڈال کر اپنے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

"چلو' تم بھی کیا یاد کرو گے یوں بھی مجھے تمہیں پٹوانے کا قطعی شوق نہیں ہے آغا جی کے ہاتھوں۔" وہ جیسے احسان کرنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر دھیرے سے

مسکرائی۔ولید نے قریب آتے ویٹر کو ٹپ دی اور والٹ دوبارہ جیب میں ڈال کر عجلت بھرے انداز میں اس کی ہمراہی میں قدم اٹھاتا داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

X...X...X

میں تیرے سنگ کیسے چلوں سجنا

تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

تو میرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کے چلے

مہربانی تیری

تیری آہٹ سے دل کا دریچہ کھلے

میں دیوانی تیری

میں دیوانی تیری

اس نے کھڑکی کی سلائڈ کھولی تو لان کے راستے سے آنے والی خوشگوار ہوا رخساروں سے ٹکرائی تو ایک گہری سانس اس کے سینے کی تہ سے خارج ہو گئی۔

اسے لگا جیسے تپتے رخساروں پر کسی نے ہلکے سے برف کیوب مل دی ہو۔ وہ وہیں دونوں بازو لپیٹ کر اس ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کو گہری سانس کے ساتھ اندر اتارنے لگی جیسے فضا میں پھیلی ساری خنکی اور طراوت کو اپنے اندر اتار لینا چاہتی ہو۔ حقیقتاً اسے اپنے پھیپھڑوں میں روشنی سی اترتی محسوس ہونے لگی۔ اس نے دیوار سے پشت لگائی تو خود بخود آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔

تیری آہٹ سے دل کا دریچہ کھلے

میں دیوانی تیری

یہ آواز مین گیٹ سے آ رہی تھی۔ چوکیدار ریڈیو کھولے بیٹھا تھا وہ گانوں کا بڑا رسیا تھا مگر اسے لگا جیسے یہ آواز ریڈیو سے نہیں خود اس کے اندر سے اٹھ رہی ہو۔

میں دیوانی تیری، میں دیوانی تیری

تو غبار سفر میں خزاں کی صدا

تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

میں تیرے سنگ کیسے چلوں ساجنا

اس نے آنکھیں کھول دیں اور چہرے کا رخ موڑ کر اپنی رائٹنگ ٹیبل پر رکھے سنہری جیولری بکس کو دیکھا جسے اس نے آج کئی مہینوں بعد نکالا تھا اور جسے وہ کسی متاع کی طرح سنبھال کر رکھتی تھی۔ وہ بکس کھلا ہوا تھا اور اس وقت خالی تھا۔ اس لیے کہ اس کے اندر محفوظ قیمتی شے باہر تھی۔

وہ ڈائمنڈ کی رنگ تھی اور اس وقت اس کی سیاہ جلد والی ڈائری کے اوپر رکھی تھی۔ باوجود کوشش کہ وہ اسے ہمیشہ کی طرح چوم کر انگلی میں نہ ڈال سکی تھی۔ پہنتے پہنتے پھر اتار کر وہیں رکھ دی اور ایک اضطراب کے عالم میں وہاں سے ہٹ کر کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

تو بہاروں کی خوشبو بھری چھائوں ہے

میں ستارا تیرا

زندگی کی ضمانت تیرا نام ہے

تو سہارا میرا

اس کا دل چاہا کوئی ریڈیو کی آواز اونچی کر دے اتنی اونچی کہ خود اس کے اندر کی اٹھتی آوازیں دب جائیں۔

تو سہارا میرا

میں نے ساری خدائی میں تجھ کو چنا

تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

تم چلو تو ستارے بھی چلنے لگیں

آنسوئوں کی طرح

خواب ہی خواب آنکھوں میں جلنے لگی

آرزو کی طرح

تیری منزل بنے میرا ہر راستہ

تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

تیری منزل بنے میرا ہر راستہ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تیری منزل بنے میرا ہر راستہ

جانے اس کے اندر کتنی دیر یہ گانا بجتا رہا۔یہی گردان ہوتی رہی۔کسی نے بے حد نرمی سے اس کے کندھے کو چھوا تھا اور اس کی سوچوں کی طغیانی میں جیسے یکدم ٹھہراؤ آگیا۔ساری حسیات ایک جگہ رکیں۔وہ لمس آغا جی کا تھا' وہ پلٹی۔

''ارے آغا جی! آپ؟ میں بس باہر آ ہی رہی تھی۔'' وہ پلکیں جھپک کر لبوں کی تراش میں مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔اس کے انداز میں خفیف سی گھبراہٹ بھی تھی اس گھبراہٹ کا منبع وہ انگوٹھی تھی جو اس کی رائٹنگ ٹیبل پر پڑی تھی۔

''دو بار تو صغریٰ بی بی تمہارا دروازہ بجا گئی اور آ کر کہا کہ شہرینہ بی بی جواب نہیں دے رہی ہیں شاید سو گئی ہوں گی۔میں نے سوچا اس وقت تو یہ لڑکی کبھی سو ہی نہیں سکتی۔یہ تو سوتوں کو بھی جگاتی پھرتی ہے۔پھر خود کہاں سے سو گئی۔'' آغا جی ہلکی شرارت سے بولے تو وہ منہ پھلا کر انہیں دیکھنے لگی پھر ہنس پڑی۔

''صرف ایک بار جگایا ہے آغا جی! اب اتنا ریکارڈ تو مت لگائیں۔'' آغا جی مسکرانے لگے۔

"آج موسم بہت اچھا ہو رہا ہے نا' کیوں نہ آغا جی کہیں باہر چلیں' آئوٹنگ پر۔" وہ ایک نظر رائٹنگ ٹیبل پر ڈال کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

آغا جی سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "لڑکی! اسی لیے تو تمہیں اس حبس زدہ کمرے سے باہر بلا رہا تھا کہ اتنے اچھے موسم میں اندر بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ طوبیٰ اور طلحہ تو آئس کریم کھانے کی ضد کر رہے ہیں کیا خیال ہے آئس کریم پارلر چلتے ہیں۔"

"بالکل' نیکی اور پوچھ پوچھ۔ میرا تو خود شدت سے آئس کریم کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔"

وہ کھل کھلائی تو آغا جی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کیوں انہیں یہ کھلکھلاہٹ شہرینہ کی نہ لگی۔ بڑی مصنوعی کچھ اجنبی سی محسوس ہوئی۔ یا پھر ان کا وہم تھا وہ سر ہلا کر پلٹے تو ان کی نظریں رائٹنگ ٹیبل پر جا پڑیں۔ وہ انگوٹھی ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔

وہ سٹک پر ہاتھ جمائے یک دم اس کی سمت گھومے۔

"یہ یہاں کیا کر رہی ہے۔" ان کے لہجے میں تحیر سا تھا۔ وہ جلدی سے پلٹ کر اپنی وارڈ روب بند کرنے لگی اور انجان بن کر بولی۔

"کیا چیز' کیا کر رہی ہے۔"

"یہ' یہ انگوٹھی یہاں اتنی لاوارثوں کی طرح کیوں پڑی ہوئی ہے تمہاری رائٹنگ ٹیبل پر۔" انہوں نے انگوٹھی احتیاط سے اٹھائی اور اس کی طرف گھوم کر اسے دکھائی۔

"کس قدر لاپرواہ لڑکی ہو۔" ان کے انداز میں فہمائش تھی۔

"پتہ نہیں اس کا وارث کون ہے۔" وہ وارڈروب سے لگ کر آہستگی سے بولی۔

"کیا مطلب؟" آغا جی نے حیرت کے ساتھ اسے گھورا تو وہ ہنس پڑی پھر سر جھٹک کر ان کے ہاتھ سے انگوٹھی لینے کی غرض سے آگے آئی۔

"یہ بیچاری اپنے وارث کی منتظر ہے۔"

"تو پھر اسے اپنی انگلی میں پہنے رکھا کرو۔ اس کی اہمیت کم مت کرو۔"

"کسی چیز کو وقتی طور پر فراموش کر دینے سے اس کی اہمیت ختم تو نہیں ہو جاتی۔ بھول جانے سے یا انگلی سے اتار دینے سے' حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔ یہ غیر اہم تو نہیں ہو جائے گی۔ کیا یہ ممکن ہے آغا

جی؟" اس کا لہجہ دھیما اور کچھ عجیب سا تھا۔ اس کی نظریں انگوٹھی پر جمی تھیں جیسے جواب وہیں سے آنا ہو۔

آغا جی اب خاصی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے اس کے چہرے کی کتاب سے کچھ پڑھنا چاہ رہے ہوں مگر... اس نے بہت تیزی سے وہ ورق الٹ دیا جو اس کے چہرے پر رقم تھا۔

"اہمیت مادی چیز کی نہیں ہوتی نا آغا جی! اہمیت تو تعلق کی ہوتی ہے۔ اس تعلق کی جو دل سے جڑا ہوتا ہے۔ دل میں اگر اہمیت ہو تو وقت اسے غیر اہم نہیں کر سکتا اور تعلق دل سے نہ ہو تو یہ چھوٹی موٹی چیزیں اس تعلق کو پائیدار نہیں کر سکتیں۔

اس کا خیال تھا اس نے وہ ورق الٹ دیا ہے اور اب خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ خود کو شگفتہ ظاہر کرنے کی بھی کوشش کر رہی ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آغا جی کو اپنے اندر ہلکی چنگاری سی جلتی محسوس ہوئی تھی۔ کہتے ہیں افسردگی کا ایک عجیب ہی سحر ہوتا ہے جو اچانک آپ کے گرد مکڑی کی طرح جال بن ڈالتا ہے اور پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کسی جال میں مقید ہے۔ آغا جی کو بھی وہ ایسے ہی کسی سحر میں گرفتار محسوس ہوئی۔

"بے شک تعلقات دلوں سے جوڑے جاتے ہیں مگر یہ چھوٹی موٹی بظاہر غیر اہم دکھائی دینے والی چیزیں درحقیقت اتنی غیر اہم نہیں ہوتیں۔ یہ تو تعلقات کی مضبوطی کا اظہار ہوتی ہیں۔ ہم کسی کو تحفہ اسی لیے نہیں دیتے کہ وہ چیز دوسرے شخص کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ وہ تحفہ دینے والے کے جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے دل میں کیا ہے مقابل کے لیے اپنائیت' محبت... یہ راز کھولتی ہے۔" انہوں نے بڑے نپے تلے انداز میں کہا تو وہ سر جھٹک کر بولی۔

"میں نہیں مانتی' کچھ تحفے رسماً بھی دیئے جاتے ہیں ایک دوسرے کو۔ محض فارمیلٹی پوری کرنے کو اور کچھ تحفے غرض کی بنیاد پر بھی دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح آپ بھلا تحفہ دینے والے کے دل میں کیسے جھانک سکتے ہیں کہ اس کے دل میں اپنائیت کا جذبہ ہے' کوئی غرض ہے یا وہ محض فارمیلٹی پوری کر رہا ہے۔" وہ ان کی بات کو رد کر رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں' حالانکہ اس نے آج تک آغا جی کی کسی سنجیدہ بات کو رد نہیں کیا تھا' اس سے اختلاف نہیں کیا تھا' بحث نہیں کی تھی۔

ادھر آغا جی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگے تو وہ یک دم اندر ہی اندر مضطرب ہو گئی۔ مگر بظاہر جلدی سے لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

''چلیں، آج میں یہ پہن ہی لیتی ہوں۔ میرا خیال ہے اسے پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے آخر آپ نے اتنی محبت سے ''کسی کے نام'' کی پہنائی ہے۔'' وہ انگوٹھی اپنی تیسری انگلی میں پہننے لگی۔

''شاید یہی غلطی ہو گئی مجھ سے کہ میں نے پہنادی اسی لیے تم شک میں پڑ گئی ہو۔'' آغا جی نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور گہری سانس بھر کر رہ گئے۔ وہ یک دم نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر تیزی سے باہر جانے کے لیے گھوم گئی تھی۔

X...X...X

پروفیسر زبیری بیڈ پر بے دلی سے لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے ذہن پر ابھی تک مردان علی شاہ سے ہونے والی بات چیت کی تلخی کا اثر چھایا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب وہ اپنی من پسند کتاب پڑھ رہے تھے تبھی ان کی بیوی نے انہیں فون کی طرف متوجہ کیا تھا یہ کہہ کر کہ ''مردان

علی شاہ'' کا فون ہے۔ یہ نام چونکہ ان کے لیے نامانوس نہیں تھا۔ انہوں نے بے دلی سے نہ چاہتے ہوئے بھی ریسیور کان سے لگا لیا۔

''کیسے ہو پروفیسر!'' گو کہ مانوس شخص تھا مگر قطعی اجنبی اور نامانوس آواز تھی۔

''اللہ کا بڑا کرم ہے۔'' انہوں نے جواب دیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی کتاب ''احیاء العلوم'' احتیاط سے ایک طرف رکھ دی اور چشمہ آنکھوں سے اتار کر اسی کتاب کے اوپر رکھ دیا۔

''ہاں اللہ کی رحمت تو بہانہ ڈھونڈتی ہے مگر بندہ ہی ناقدرا ہو تو کوئی کیا کرے۔'' مردان علی کی استہزائیہ ہنسی ابھری تو وہ لحظہ بھر ہونٹ چبا کر رہ گئے پھر بولے۔

''بے شک اللہ کی ''رحمت'' تو بہانہ ڈھونڈتی ہے مگر آپ جسے ''رحمت'' کہہ رہے ہیں وہ رحمت نہیں تھی بلکہ وہ آپ جیسوں کی طرف سے ایک طوق تھا جسے میں نے پہننے سے انکار کر دیا۔''

''چلو طوق ہی سہی مگر اسے نہ پہننے کا انجام بھی اب تمہارے سامنے ہے۔'' مردان علی شاہ کی گونج دار ہنسی ریسیور میں گونج کر رہ گئی۔

پروفیسر زبیری کی پیشانی پر قطرے چمک اٹھے وہ شدید قسم کی ہتک کے احساس سے دوچار ہوئے مگر اس احساس کے خول سے خود کو نکالتے ہوئے اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولے۔

"بے شک آپ مجھ سے نوکری چھین سکتے ہیں مگر مجھ سے میرا علم نہیں چھین سکتے' آپ کے خیال میں' میں نے آپ کی پیشکش کو ٹھکرا کر کفران نعمت کی ہے تو یہ آپ کا خیال ہے' آپ کی سوچ ہے' ایک جاگیردار وڈیرے کی' ایک کرپٹ سیاستدان کی جبکہ میرا قلب بے حد مطمئن ہے۔ میرا ضمیر پرسکون ہے کہ میں اس کے سامنے اور لوگوں کے سامنے' اپنے خدا کے سامنے سرخرو کھڑا ہوں۔ غربت میرے نزدیک اتنی بری چیز نہیں ہے جتنی ولایتی شراب جیسی زندگی ہے جو بدمست' عاقبت نااندیش اور بے اوسان کر دیتی ہے۔ جس میں دین' ایمان سب داؤ پر لگا کر محض دنیا کی رنگینی خرید لی جاتی ہے۔ جو

بہرحال فانی ہے۔ زندگی چار دن کی ہو یا چار سو سال کی گزر ہی جاتی ہے۔"

"بہت خوب' بہت خوب۔" پروفیسر زبیری چپ ہوئے تو مردان علی شاہ داد دینے والے لہجے میں بولا۔ "تقریر اچھی کر لیتے ہو زبیری مگر افسوس کہ سننے والا مجمع نہیں ہے۔ یوں بھی اس طرح کے لیکچر تم عموماً اپنے شاگردوں کو وقتاً فوقتاً دیتے رہتے تھے اب تو وہ بھی نہیں

رہے ہیں۔" اس نے جیسے گہری سانس بھر کر افسوس کا اظہار کیا پھر لمحے کے توقف کے بعد مردان شاہ کی آواز ابھری تو اس میں مخصوص گونج اور کرختگی تھی۔

"اینی وے' میں نے یہ فون تمہاری کسی علمی تقریر سننے کے لیے نہیں کیا۔ صرف یہ تاکید کرنے کے لیے کہ تم اخبارات میں بیان بازی سے باز آ جاؤ۔ ابھی تو صرف نوکری گئی ہے کیوں جان گنوانا چاہتے ہو۔ اس طرح کی بیان بازی' حقیقتوں سے پردے چاک کرنا یہ سب وقت کا زیاں ہے تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ زیادہ سے زیادہ لوگ افسوس کا اظہار کر دیں گے اور بس' میرا خیال ہے تم سمجھ رہے ہو نا میری بات۔"

"بہرحال سن ضرور رہا ہوں۔" پروفیسر زبیری اس کے لہجے میں چھپی دھمکی کو خاطر اعتناء نہ سمجھتے ہوئے رسان سے بولے اور کتاب اٹھالی گویا انہیں فون رکھنے کی جلدی ہو۔

"ہاں سنو بھی اور سمجھ بھی جاؤ تو اچھا ہے۔ یہ چھوٹے موٹے دو دو ٹکے کے صحافیوں سے اپنی مظلومیت کی سٹوری لکھوا کر تم لیڈر نہیں بن جاؤ گے۔" وہ ہلکی ہنسی کے ساتھ بولا اور پروفیسر زبیری نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا پھر اپنے اعصاب کو سنبھالتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے۔

”میرا خیال ہے مردان علی شاہ! آپ نے جس مقصد کے لیے فون کیا تھا وہ پورا ہو چکا ہے اب مزید باتیں وقت کا زیاں ہیں اور آپ جیسے بڑے لوگوں کو وقت کی قدر کرنی چاہیے کہ آپ کا ایک ایک لمحہ ملک و قوم کی خدمت میں صرف ہونا چاہیے نا کہ ذاتی جھگڑوں کی نذر۔“

پروفیسر زبیری کی بات پر مردان علی شاہ کے اعصاب ضرور چٹخے تھے۔ اس نے ریسیور جس انداز سے پٹخا تھا اس سے پروفیسر زبیری کو ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ وہ بھی ریسیور رکھ کر دوبارہ کتاب اٹھا کر بیڈ پر آ کر بیٹھ گئے اور چشمہ آنکھوں پر چڑھاتے ہوئے کتاب کھول لی مگر کتنی دیر کتاب پر نظریں رکھنے کے باوجود ایک لفظ نہ پڑھ سکے پھر گہری سانس بھر کر ذہن پر چھائے تلخ کلامی کے اس اثر کو سر جھٹک کر اڑا دینا چاہا اور کتاب بند کر کے اسے سرہانے رکھ کر لیٹ گئے۔

دل گرفتگی، شکستگی کا احساس جیسے ہر رگ سے پھوٹنے لگا۔ وہ سوچنے لگے کہ وہ کیا تھے؟ ایک معمولی انسان، جن کا نہ بینک بیلنس تھا نہ کوئی اثر ورسوخ۔

آخر وہ سچائی کے بل بوتے پر کب تک اپنا دفاع کر سکیں گے۔ اخبارات والے کب تک انہیں کوریج دیں گے۔ آج یہ خبر فرنٹ پیج کی زینت بنی ہے تو کل مختصر ہو کر پچھلے صفحات کی

www.pakistanipoint.com

خبروں کے سیلاب میں گم ہو جائے گی۔ ان کے لاشعور میں دو متضاد سوچیں ٹکرانے لگیں۔ ایک یہ کہ خاموشی سے نوکری ڈھونڈنے لگیں اور اپنی زندگی میں مصروف ہو کر حالات سے سمجھوتہ کر لیں۔ اسے خوفناک خواب سمجھ کر بھول جائیں۔

یا پھر۔

اپنے حق کے لیے بر سر پیکار ہو جائیں۔

آخر انہیں ان کے جائز حق سے محروم کیا گیا تھا۔ ان کی سچائی، راست بازی کو سر عام رسوا کیا گیا تھا۔ سچ کے مقابلے میں جھوٹ اور کرپشن کو تقویت دی گئی تھی اور اگر وہ بھی بے حس لوگوں کی طرح چپ ہو کر بیٹھ جائیں گے تو عوام کو حق اور باطل کا فرق کون سمجھائے گا۔ انہیں کون بتائے گا کہ جنہیں وہ اپنا رہنما سمجھ کر چن لائے ہیں وہ اب صرف رہنما نہیں ان کے خدا بن بیٹھے ہیں۔ یہ صرف ان کا ذاتی نہیں اجتماعی معاملہ بھی تھا کہ عوام کے سامنے ان کے اصل روپ کو اجاگر کریں وہ پھر کیسے قنوطی ہو کر بیٹھ جاتے۔ ان کے اندر دل گرفتگی کا جال کٹنے لگا۔

ایک بار پھر توانائی رگوں میں دوڑنے لگی۔ وہ چپ ہو کر نہیں بیٹھ سکتے تھے کہ ایسے کرپٹ دھاندلی مچاتے رہیں۔ اپنے اثر ور سوخ اور طاقت کے بل بوتے پر سچ کی آواز کا گلا گھونٹتے رہیں۔

سکندر رضا نے انہیں بتایا تھا کہ مردان علی شاہ اپنے والد کی برسی بڑے پیمانے پر تقریب کی صورت میں منا رہا ہے۔ سو ایسے وقت وہ اپنے تمام حریفوں کے منہ ہر قیمت پر بند کرنے کی کوشش بھی کرے گا اور یہ تقریب محض شہرت' عزت اور نام کمانے کا ذریعہ ہے۔

اور پروفیسر زبیری' مردان علی شاہ کو حریف سمجھ کر نہیں مگر اپنے حق کے لیے ضرور آواز اٹھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے دراز سے رول کیے ہوئے پیپر نکالے اور وہ ادھورا مضمون پورا کرنے میں مصروف ہو گئے جو سکندر رضا کو کل کی تاریخ میں دینا تھا۔

X...X...X

"دنیا کی سب سے بڑی غریبی بے عقلی ہے۔ بالکل ٹھیک کہتے ہیں اور تم اس لحاظ سے غریب ترین لڑکی ہو۔" آغا جی کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرائے۔

وہ شرمندہ سی ہو گئی' اسے شرمندگی "بے عقلی" کے ملنے والے خطاب پر نہیں تھی بلکہ آغا جی کے سامنے اپنے احساسات اور آزردگی کے عیاں ہو جانے پر تھی۔

آغا جی نے اپنی پسند کا آئس کریم فلیور منگوایا۔ طوبیٰ اور طلحہ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ طوبیٰ کو اس نے گود میں بھر لیا اور اس کے سر پر اپنا چہرہ ٹکاتے ہوئے میز کی چمکیلی شفاف سطح کو دیکھتے ہوئے کچھ کھسیاہٹ سے بولی۔

"ایسی بات نہیں ہے آغا جی! میں تو بس یونہی کہہ بیٹھی اور پتہ نہیں کیا کیا اول فول بک گئی۔" پھر اس نے نگاہیں اپنی انگلی پر جما دیں۔

"میں واقعی بے وقوف لڑکی ہوں پتہ نہیں کیا سوچ کر اور کیوں یہ سب کہہ بیٹھی۔"

"تم ہی نہیں۔ بقول گوئٹے' محبت کے معاملے میں ہم سب یکساں بے وقوف ہیں۔" آغا جی یہ کہہ کر ہنس پڑے۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا پھر جھکا دیا۔ یک دم اسے اپنے رخسار تپتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ وہ بلا ضرورت طوبیٰ کے نرم ریشم بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

آغا جی اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ ویٹر کی طرف متوجہ تھے۔ جو آئس کریم سے بھرے کرسٹل کے خوبصورت کپ ان کے آگے میز کی سطح پر رکھ رہا تھا۔ اس کے جانے کے

بعد آغا جی نے ایک کپ طلحہ کو دیا۔ دوسرا اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے بھی طوبٰی کو دے کر اپنا کپ آگے رکھ لیا۔

”آج موسم بہت غضب کا ہو رہا ہے نا آغا جی!“ وہ بڑی سی کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولی جہاں سے خوشگوار ہوا کے جھونکے آ رہے تھے جس کی وجہ سے گملوں میں لگے آرائشی پودے لہرا رہے تھے۔

”ہوں بہت اچھا ہے۔ بس دل کا موسم خوشگوار ہونا چاہیے تو ہر موسم خوشگوار ہو جاتا ہے۔ یاد رکھنا لڑکی! جہاں محبت کی حکمرانی نہ ہو وہاں خوف کی حکمرانی ہوتی ہے۔ سارے خوف نکال دو، سارے اندیشے باہر پھینک دو۔ یاد رکھو محبت کی کشتی میں پہلا سوراخ شک کا ہوتا ہے۔ یہ کسی سیانے نے ہی کہا ہے اور بالکل بجا کہا ہے۔ آئندہ میں تمہیں کسی شک وشبہ میں پڑتا ہوا نہ دیکھوں۔“ آغا جی نے ٹشو سے ہونٹ پونچھتے ہوئے بے حد آہستگی سے اپنا دایاں ہاتھ آگے کر کے اس کے سر پر رکھا۔

ایک پل کے لئے اس کا دل گداز سا ہو گیا۔ سر جھک گیا اور آئس کریم جیسی سیال شے حلق میں اٹکنے لگی۔ اس کا دل چاہا وہ کہے کہ ”کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں آغا جی! کہ محبت جتنی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پرانی ہو جائے اسے تائید تازہ کی ضرورت رہتی ہے۔ یقین کی آخری حد تک دلوں میں لہلہاتی ہو، نگاہوں سے ٹپکتی ہو اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے۔“ اس نے سر اٹھایا تو آغا جی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ ہنس دی اور چمچہ آئس کریم بائول میں ڈال کر سر جھٹکتے مسکراتے ہوئے لاپرواہیانہ انداز میں بولی۔

”آپ تو سنجیدہ ہو گئے آغا جی! یہ سنجیدگی آپ کو بالکل سوٹ نہیں کرتی۔“

”اچھا، مجھے سنجیدگی سوٹ نہیں کرتی، شرم کرو لڑکی اس عمر میں سنجیدہ نہیں ہوں گا تو کیا مخول اور ٹھٹھا کرتا ہوا اچھا لگوں گا۔“ وہ مصنوعی خفگی سے اسے گھورنے لگے۔

”کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی مگر یک دم اس کی ہنسی بند ہو گئی۔ اس نے لبوں کو دانتوں میں بے ساختہ دبایا تھا۔

اکبر شاہ دو لڑکوں کی ہمراہی میں آئس کریم پارلر میں داخل ہوا تھا۔ وہ داخل ہوتے ہی شہرینہ خان کو دیکھ چکا تھا اور دیکھ کر خوشگواریت کے احساس کے ساتھ سیدھا اس میز کی طرف آ رہا تھا۔

بلیک جینز اور بلیک ہی ہاف سلیوز کی ٹی شرٹ میں وہ اچھا خاصا سمارٹ اور مہذب نظر آتا اگر اس کے انداز و اطوار اس قدر غیر شائستہ نہ ہوتے تو۔ اس کی چال میں دولت مندوں کا سا غرور اور تکبر جھلک رہا تھا۔ منہ میں چیونگم تھی جسے وہ زور زور سے چباتے ہوئے اس کے پوری طاقت سے پٹاخے بنا کر پھوڑ رہا تھا۔ ایسا ہی ایک پٹاخہ بنا کر پھوڑتے ہوئے وہ اس کی طرف آیا اور خالی کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ جما کر خوشگوار لہجے میں بولا۔

"آخاہ' مس خان! کیسی ہو' ایسے ہی کسی موقع کے لیے کہا گیا ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ موسم اچھا ہو تو ہر خوبصورت شخص آئس کریم بار کا ہی رخ کرتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اطمینان سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ گویا ان دونوں کے درمیان ایسی بے تکلفی کی فضا ہمیشہ رہی ہو جبکہ شہرینہ اس کی طرف سے رخ پھیر کر اسے قطعی غیر اہم سمجھتے ہوئے طلحہ کی طرف متوجہ ہو گئی اور ٹشو سے اس کا منہ پونچھنے لگی اور اس کی شرٹ پر گری آئس کریم صاف کرنے لگی۔

جبکہ آغا جی' اکبر شاہ کی طرف متوجہ تھے اور خاصی کڑی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ناخوشگوار لہجے میں بولے۔ "بچے آئس کریم بار کا رخ تو تم کر چکے ہو مگر شاید ان جگہوں کے آداب اصول سے ناواقف ہو۔ بیٹھنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔"

اس نے یک دم سٹپٹا کر آغا جی کی طرف بیٹھے بیٹھے ہی رخ موڑا۔ ایک لحظہ کے لئے اس کا چپ چپ چلتا منہ بند ہوا پھر وہ ہنس پڑا۔ "سوری' میں نے آپ کو دیکھا نہیں' ویسے کیا آداب ہوتے ہیں انکل۔" وہ بے تکلفی سے گویا ہوا۔

"حالانکہ اصولاً تو تمہیں پہلے میں دکھائی دیتا' بہرکیف پہلا اصول تو اجازت کا ہے۔ تم بلا اجازت اس کرسی پر آ کر بیٹھ گئے ہو۔" انہوں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا اور دزدیدہ نظروں سے شہرینہ کی طرف دیکھا جس کی توجہ ادھر ہی تھی مگر وہ ظاہر نہ کرتے ہوئے طوبیٰ اور طلحہ کی طرف لگی رہی۔ اس کے چہرے کے زاویوں میں اکبر شاہ کے لیے کسی قسم کی پذیرائی نہیں تھی اور یہی بات آغا جی کو کھٹک گئی تھی

بلکہ انہیں تو "اکبر شاہ" پورا ہی کھٹکنے لگا تھا۔

وہ اپنی پرائیویسی میں اس طرح غیر اخلاقی مداخلت قطعاً برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم تحمل کا مظاہرہ کر رہے تھے۔۔

"چلیں! اس اصول پر اب عمل کر لیتا ہوں۔" وہ لہرا کر کرسی سے اٹھا پھر آغا جی کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

کین آئی سٹ ہیئر؟" (کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟)

"ناٹ ایٹ آل (نہیں بالکل نہیں)۔" آغا جی جواباً برجستہ بولے تو شہرینہ نے سر اٹھا کر اکبر شاہ کی طرف دیکھا اور بے اختیار بھرپور انداز میں ہنس پڑی جبکہ اکبر شاہ کی ساری خوشگواریت فضا میں دھوئیں کے غول کی طرح غائب ہو گئی۔ اسے اپنی کنپٹیاں سلگتی محسوس ہوئیں۔ اس نے کرسی کی پشت پر مضبوطی سے ہاتھ جما کر اس کی مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے آغا جی کی طرف دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے آپ اجازت مانگنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں۔" اس کا لہجہ ہلکا سا چٹخا ہوا تھا۔ آغا جی قطعی برا منائے بغیر سر ہلاتے ہوئے اس کی طرف رخ کرتے ہوئے اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"دیکھو بچے! میں تمہیں جانتا تک نہیں، کوئی بھی دو اشخاص کی مجلس میں بلا اجازت آ کر بیٹھنے والے تیسرے شخص کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کیا جانا چاہیے مگر میرا خیال ہے میں اتنا سخت گیر نہیں ہوں اور دوسرا اس لیے بخش رہا ہوں کہ تم شاید شہرینہ کے کلاس فیلو ہو۔" انہوں نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف سے رخ موڑ کر شہرینہ کو دیکھا جو کبھی اکبر شاہ اور کبھی آغا جی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے زاویوں میں بے زاری رقم ہو چکی تھی۔

"ویری گڈ، اس کا مطلب ہے تعارف کا مرحلہ تو خود بخود طے ہو گیا۔ چلیں اتنا تو ہے کہ شہرینہ نے میرا غائبانہ تعارف تو کرا رکھا ہے۔" وہ پھر اسی بے تکلفانہ خوشگوار انداز میں واپس آ گیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور گاڑی کی چابی کو میز کی سطح پر ہلکے ہلکے بجاتے ہوئے بولا۔

"باقی تعارف میں کرائے دیتا ہوں مجھے اکبر شاہ کہتے ہیں۔"

"جی ہاں آغا جی! اسے اکبر شاہ کہتے ہیں، جس کا تعلیمی ریکارڈ تو گھٹیا ہے ہی مگر اخلاقی اعتبار سے بھی یہ محترم دیوالیہ ہیں۔" وہ اپنے اندر کے اٹھتے ابال کو زیادہ دیر نہ دبا سکی تھی۔ کانچ کی طرح چیخ پڑی۔

اکبر شاہ کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ یکسر مفقود ہو گئی۔

"ہوں، میں بھی کہوں، شہرینہ کے گروپ میں ایسے کم فہم لوگ کیسے شامل ہو سکتے ہیں۔" آغا جی اس کی بات سن کر گہری ہوں کے ساتھ سر اٹھا کر بولے پھر ٹشو سے ہونٹ پونچھنے لگے۔

اکبر شاہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں شہرینہ پر تھیں مگر وہ کرسی کے ہتھے پر دونوں ہتھیلیاں مضبوطی سے جماتے ہوئے آغا جی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"کم فہم نہ سہی، ان کے گروپ میں کم تر، کم حیثیت اور کم صورت لوگ ضرور شامل ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ استہزائیہ انداز میں نیم وا ہوئے تھے۔

شہرینہ نے سختی سے لب دانتوں میں دبا لیے اور چمچہ آئس کریم باول میں پٹخ دیا۔ اس کے اعصاب پر کوڑا سا لگا تھا۔ وہ یہاں بھی تانیہ کی ذات کی تحقیر سے باز نہیں آیا تھا۔ شاید وہ اس کی کمزوری سے واقف ہو چکا تھا کہ وہ تانیہ کے لیے کس قدر سینسٹو تھی۔

"میرا خیال ہے آغا جی! اب ہمیں چلنا چاہیے۔" وہ اس کی مسکراہٹ کو نظر انداز کر کے آغا جی کو دیکھ رہی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"آں، آں، میرا مقصد یہ تو نہیں تھا۔ آپ لوگ بیٹھیں میں ہی چلا جاتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا پھر آغا جی کی کرسی پر ہاتھ رکھ کر ان کی طرف جھک کر انتہائی خوشدلانہ لہجے میں بولا۔

"میرا کیا ہے میں تو یہاں آتا ہی رہتا ہوں۔ ان فیکٹ یہ میرے بابا سائیں کا ہی پارلر ہے، آپ بھی اپنا ہی سمجھئے کہئے تو دوسری آئس کریم منگواؤں۔"

اس کی بات پر آغا جی اور شہرینہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس نے کچھ کہنا چاہا کہ آغا جی ہاتھ اٹھا کر گویا اسے روکتے ہوئے اکبر شاہ کی طرف چہرہ ذرا سا اٹھا کر بولے۔

"بچے یہ آئس کریم پارلر کس کا ہے؟ اس کا مالک کون ہے؟ اس سے ہمیں کیا سروکار؟ ہر بار کا کوئی نہ کوئی مالک ہوتا ہی ہے۔ آنے والے تو یہاں کھانے کی قیمت چکا کر جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ہلکی سی سانس لی پھر طوبیٰ، طلحہ اور شہرینہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

"چلو بچو! میرا خیال ہے اب چلنا چاہئے۔"

شہرینہ تو اٹھنے کے لیے پر تول ہی رہی تھی کرسی چھوڑ کر طوبٰی کو اٹھا کر کھڑی ہو گئی اور طلحہ کی انگلی تھامتی سنبھل کر میز کے ایک طرف سے ہو کر داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

آئس کریم پارلر سے نکل کر آغا جی نے گہری سانس بھری اور جھک کر گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

''تم نے کبھی ذکر نہیں کیا اس لڑکے کا۔''

''ذکر' ان جیسوں کا کیا کرنا آغا جی! ایسے تو جامعہ میں ہزاروں بھرے پڑے ہیں۔'' وہ بے دلی سے بولی اور طوبٰی اور طلحہ کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خود فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور سیٹ کی پشت سے لگ کر اس

ناخوشگوار واقعہ کی بدمزگی کو دور کرنے کے لیے گہری سانس بھر کر آنکھیں موند لیں۔

X...X...X

نومی کھلے دروازے سے اندر آیا۔ آج تو اس نے مٹی سے اٹے جوگر بھی نادیہ آپی کی خاطر صحن ہی میں اتار ڈالے تھے پھر اندر آکر سیٹی بجاتا ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو ایک کونے میں

مشین سنبھالے نادیہ آپی نظر آئیں جو اس کی سیٹی کی آواز پر چونک کر اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

وہ سلام کر کے فریج کے پاس آیا وہاں سے پانی کی بوتل نکالی اور عادت کے مطابق بوتل کا کیپ کھول کر منہ سے لگا لی اور ایک سانس میں آدھی کر ڈالی۔

نادیہ آپی کہنیاں مشین پر ٹکا کر اسے گھورنے لگیں وہ ان کی طرف گھوما اور انہیں اپنی طرف گھورتے دیکھ کر ہنس پڑا اور بوتل سے چند چھینٹے نکال کر ان کے چہرے پر اچھالے۔

''اس طرح مت گھوریں' سویٹ آپی! میں بالکل بھی متاثر نہیں ہو رہا۔ خواہ مخواہ میں اتنی پیاری آنکھوں کو دُکھا رہی ہیں۔''

''بد تمیز ہو تم' مت سدھرنا۔'' وہ چھینٹے دوپٹے سے پونچھنے لگیں اور ادھ سلی قمیص چھوڑ کر کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئیں۔ ''کھانا لگاؤں۔''

''نہیں' صرف چائے دے دیں۔ یہ اماں اور تائی دکھائی نہیں دے رہیں۔'' وہ گھر میں خاموشی محسوس کرتے ہوئے بولا اور تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لی۔

"اماں نہا رہی ہیں اور تانی، عظمیٰ کی طرف گئی ہے۔اس کے بھائی کی شادی ہونے والی ہے نا اس سلسلے میں، تانیہ کو زبردستی پکڑ کر لے جاتی ہے۔ کبھی مارکیٹ تو کبھی جوڑے پیک کرنے۔" وہ چائے چولہے پر رکھ کر دوبارہ مشین کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں اور اپنی قمیص پوری کرنے لگیں جو کئی دنوں سے کاٹ کر رکھی تھی۔

"یہ عظمیٰ کون؟ وہی لڑکی تو نہیں جو اس روز چھپکلی سے ڈر گئی تھی۔" وہ دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے رکھ کر تقریباً نیم وا لیٹ گیا۔

اس کے تصور کے پردے پر اس خوفزدہ ہرنی جیسی آنکھوں والی لڑکی کا سراپا لہرانے لگا۔ نادیہ آپی بے اختیار ہنس پڑیں۔تانیہ نے بڑے مزے لے لے کر وہ واقعہ انہیں سنایا تھا۔

"ہاں وہی عظمیٰ بڑی پیاری سی لڑکی ہے۔آج کے دور میں ایسی معصوم، سیدھی سادی لڑکیاں کہاں ہوتی ہیں۔" انہوں نے دھاگا توڑتے ہوئے اس پر نظر ڈالی۔ایک طرح سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا مگر کچھ اخذ نہ کر پائیں۔وہ سامنے کی دیوار کو گھور رہا تھا۔وہ اٹھ کر کچن میں جا کر چائے بنانے لگیں۔

اس گھر میں سب کی مشترکہ خواہش تھی کہ عظمیٰ اس گھر کی بہو بنے۔اماں نے سکندر سے بات کی اس کا عندیہ لیا اس سلسلے میں مگر وہ سختی سے انکار کر چکا تھا اور اس کے انکار میں معمولی سی بھی لچک نہ دیکھ کر اماں نے نومی پر تکیہ کر لیا تھا مگر مسئلہ نومی کی نوکری کا تھا۔ایک طرف یہ دھڑکا تھا عظمیٰ کے کئی رشتے آ چکے تھے اور اس کے والدین کوئی بھی رشتہ قبول کر سکتے تھے جبکہ اماں کسی طور عظمیٰ کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔وہ تو بس اس انتظار میں تھیں کب نومی کو جاب ملے اور وہ ادھر عظمیٰ کو مانگ لیں۔

"تمہیں عظمیٰ اچھی لگتی ہے۔" انہوں نے چائے کا مگ اسے پکڑاتے ہوئے لگے ہاتھوں اس کے دل میں جھانک لینا چاہا۔ایک طرح سے اس کا ارادہ معلوم کر لینا چاہا۔

گرم گرم مگ سے لب لگاتے ہوئے نومی کے ہونٹوں سے حلق تک جیسے شہد سرایت کر گیا۔لڑکیاں کسے اچھی نہیں لگتیں۔

روپہلی

تروتازہ

جوان، نوخیز کلیوں جیسی لڑکیاں۔وہ آپی کی معصومیت اور اپنی خباثت پر ہنس دیا۔

"کبھی غور سے نہیں دیکھا وہ تو سات پردوں میں چھپی پھرتی ہے۔" معصومیت کی آڑ میں اس نے عظمیٰ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کر دی۔

یوں بھی کئی دن ہو گئے تھے اس معصوم حسینہ کو دیکھے ہوئے' نادیہ آپی کی منگنی کے دن والا سراپا اب تک اس کی نگاہوں میں تھا۔

"اس کے بھائی کی شادی میں چلے جانا' وہاں تو وہ پردہ تھوڑی ہی کرے گی۔" وہ روانی میں بولیں پھر یک دم چونک کر جیسے اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

"بے ایمان اتنی بار تو دیکھا ہے اسے۔ میری منگنی میں بھی تو وہ صبح سے یہیں تھی اور تم..."

"توبہ توبہ آپی' قسم لے لیں جو میں نے اسے اس نظر سے دیکھا ہو۔ مجھے کب دھیان رہتا ہے کون گھر آتا ہے کون جاتا ہے اور تانی کی تو اتنی سہیلیوں کا آنا جانا رہتا ہے۔ میں ہر ایک سے واقف تھوڑا ہی ہوں۔"

وہ کمال ڈھٹائی سے جھوٹ بولتا ہوا نادیہ آپا' محبت کی ماری کو انتہائی معصوم لگا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ "ہاں' یہ تو ہے' چلو پھر دیکھ لینا جا کر' اس کے بھائی کی شادی میں... مگر" وہ اس کے قریب بیٹھ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

گئیں۔

"نومی وہ بہت حیادار اور دین دار خاندان ہے دھیان رکھنا۔ صرف اس نیت سے ایک نظر دیکھنا۔ اماں چاہتی ہیں عظمیٰ کو بہو بنا لیں۔" وہ سنجیدگی سے بولیں پھر اس کے چہرے پر نظر پڑی تو ہنسنے لگیں۔

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے ان کے کہے ہوئے آخری جملے کو گویا ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ابھی تو بڑے مچل رہے تھے اسے دیکھنے کو' اس کے ذکر پر گلاب کھل اٹھے تھے اور اب کیوں بارہ بج رہے ہیں۔ اے نومی' میں سچ کہہ رہی ہوں اماں کا پکا پکا ارادہ ہے بلکہ وہ تو کمربستہ ہیں جونہی تمہاری جاب شروع ہو اور وہ..."

"اور وہ میرے گلے میں پھندا ڈال دیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کمربستہ ہونے کی۔" اس نے چائے کا مگ تخت پر پٹخا اور شدید جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گیا۔

"اماں تو بس..."

نادیہ آپی نے قدرے مایوسانہ انداز میں اس کو دیکھا۔

"کیا مطلب، تمہیں عظمیٰ پسند نہیں ہے یا پھر کوئی اور۔"

"پسند کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگیں۔ وقت آئے گا تو دیکھ لیا جائے گا۔ اب اتنی جلدی کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"ہاں تو تمہیں کون سی ابھی نوکری بھی مل گئی ہے۔" نادیہ آپی جلدی سے بولیں۔ ان کے اندر اطمینان کی خفیف سی لہر اتر گئی تھی کہ وہ عظمیٰ کو ناپسند نہیں کرتا تھا نہ اس کی جھنجھلاہٹ میں انکار تھا۔

"نوکری؟" وہ زیر لب مسکرانے لگا۔ یک دم اس کی آنکھیں چمکنے لگیں ٹراؤزر کی جیب کا وزن خوشگوار انداز کے ساتھ پھر محسوس ہونے لگا۔

"نوکری تو سمجھئے مل گئی۔" وہ پاؤں سمیٹ کر تخت سے اترتے اترتے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو نادیہ آپی نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ غیر معمولی پن محسوس کرتے ہوئے چونک کر اور غور سے دیکھنے لگیں۔

"کیا مطلب، کیا جاب مل گئی، کب، کون سی۔"

"جاب سے کیا مطلب ہے آپ کا۔" وہ گردن موڑ کر انہیں دیکھ کر ہنس پڑا۔

"انسان کسی کی مخصوص وقت تک غلامی کیے بنا بھی پیسہ کما سکتا ہے فائلوں اور کاغذوں میں سر کھپائے بنا بھی۔"

"بس فضول ہی بکواس کرتے رہنا۔ میں سنجیدہ ہوں ادھر تمہیں فضول باتوں کی پڑی رہتی ہے ہر وقت۔ ہونہہ بڑا آسان ہے ناپیسہ کمانا۔ بس تم تو بنا مشقت کے ڈھیروں روپیہ حاصل کر لینا چاہتے ہو۔ اب محترم نعمان رضا ان خوابوں کی دھند سے باہر آ جایئے۔"

وہ تخت سے چائے کا خالی کپ اٹھاتے ہوئے اسے ناراض نظروں سے دیکھنے کے بعد کچن کی جانب چل پڑیں۔ اچھے خاصے موڈ کا ناس مار دیا اس نے۔

"اماں بہو لانے کی خواہش میں ادھ موئی ہوئی جا رہی ہیں اور ادھر تم دونوں بھائیوں کو اپنی اپنی پڑی ہے۔"

"سوئٹ سسٹر! اماں حضور سے کہہ دیجئے کہ خدا کے لیے میرے لیے ایسا کوئی احمقانہ قدم نہ اٹھائیں۔ پہلے سکندر بھائی کے لیے حور شمائل ڈھونڈ لیجیے۔ میری تو باری بعد میں آتی ہے۔ اب اتنی پتلی گردن بھی نہیں ہے میری کہ اماں کے پھندے میں فٹ آجائے۔" وہ صحن کی بیسن کے اوپر لگے آئینے کے سامنے منہ کر کے باقاعدہ گردن کا معائنہ کرتے ہوئے ہاتھ پھیرنے لگا۔ نادیہ آپی اس کی اس حرکت پر مسکراتے ہوئے سوچنے لگیں۔ سکندر کے لیے تو حور شمائل ہی ڈھونڈی ہے' ان کے تصور کے پردے میں شہرینہ خان کا سراپا اتر آیا اور سکندر کی وہ وارفتہ نگاہیں۔

وہ چھوٹی سی بے ایمانی جو وہ چپکے سے نادانستگی میں پکڑ چکی تھی۔

"دونوں بھائیوں کو ایک ساتھ ہی نمٹائیں گی اماں' بے فکر رہو۔" وہ بولیں تو وہ ہاتھ سر کے اوپر لے جا کر نفی میں ہلاتا ہوا رسی سے تولیہ اٹھا کر کمرے میں گھس گیا۔

نہانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر نکل گیا اور جب لوٹا تو گھر کے سب ہی افراد موجود تھے۔ رات کے کھانے کے لیے دستر خوان بچھ گیا تھا۔

سکندر اماں کے پاس تخت پر بیٹھا تھا جبکہ تانیہ دستر خوان پر لوازمات چن رہی تھی وہ تیزی سے کمرے میں گیا اور واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی وہی گڈی تھی جو یاسر نے اسے دی تھی۔ اس نے وہ ساری رقم اماں کی گود میں ڈال دی اور خود قریبی موڑھا کھینچ کر بیٹھ گیا۔

نوٹوں پر اماں اور سکندر کی نظریں ایک ساتھ گئیں پھر یک بیک نومی کی جانب اٹھیں۔

اٹھنے والی نگاہوں میں حیرت بھرا سوال چھپا تھا۔ ایسا سوال جس کے پیچھے خوف کی آہٹیں گونج رہی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟" اماں کے کچھ کہنے سے پہلے سکندر نے وضاحت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ان دونوں کے تشویش زدہ چہروں کو دیکھتے ہوئے محظوظ ہو کر ہنس پڑا۔

"یہ رقم ہے۔ میری محنت کی کمائی ہے۔ کوئی ڈاکہ مار کر نہیں آیا۔"

"مگر اتنی ساری رقم ایک ساتھ۔" اب کے اماں نے گود میں پڑی نوٹوں کی گڈی اٹھائی۔ ان کے لہجے میں خوف تھا۔

"اماں آپ ہی تو کہتی ہیں "رحمت حق بہانہ می جوید" خدا کی رحمت بہانہ تلاش کرتی ہے۔ بس یہ رحمت ہے خدا کی طرف سے بلکہ نعمت ہے اور نعمت کو ٹھکرانا کفران نعمت ہے' بس رکھ لیجئے۔ دراصل میں مٹھائی لانا ہی بھول گیا۔ اصولاً مجھے رقم دینے سے پہلے آپ کا منہ میٹھا کروانا چاہیے تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! مگر کچھ بتاؤ تمہیں کہاں نوکری ملی' کب ملی' لو تم نے تو دھماکہ ہی کر ڈالا ہے۔ دیکھو ذرا سکندر' بائولا ہی تو ہے نا لڑکا۔ میرا تو دل دہلا جارہا ہے اور یہ کہ ہنسی ٹھٹھول کر رہا ہے۔" اماں نے سکندر کی طرف دیکھا پھر دوبارہ اسے تکنے لگیں۔

سکندر بالکل چپ ہوگیا تھا' بس اس کی نظریں نومی پر جمی تھیں اور اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ نہیں تھا کہ اسے خوشی نہیں ہورہی تھی بلکہ خوشی کو دل میں ابھرنے والے اندیشے کاٹ رہے تھے۔

"اچھا' اچھا بتاتا ہوں۔" نومی اماں کی گھبراہٹ پر یک بیک سنجیدہ ہوگیا۔ موڑھا آگے کھسکا کر ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سر جھکا کر بولا۔

"میرا دوست یاسر ہے نا اس کے باپ کا شاپنگ سنٹر ہے۔ ڈھیر ساری دکانیں ہیں جو بکتی رہتی ہیں' کرائے پر دی جاتی ہیں۔ میں نے وہیں سروس کرلی ہے اور مہینہ بھر سے خوار ہو رہا تھا ان کی ایک دس لاکھ کی دکان بیچنے کو اور کل ہی یہ دکان سیل کی ہے میں نے جس پر دو فیصد کمیشن پر بیس ہزار ملے ہیں مجھے۔ بس اب تو خوش۔" اس نے تفصیل سے وضاحت کرتے ہوئے اماں کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔

جھوٹ بولتے ہوئے بھی اس کا لہجہ مضبوط ہی رہا البتہ اسے اپنے گھٹنوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ محسوس ہورہی تھی۔

دل میں بے نام سی وحشت بھی سرایت ہوتی محسوس ہورہی تھی۔

اس کی وضاحت سے ماحول میں بکھرنے والا خوف یکدم غائب ہوگیا۔

سکندر نے ایک گہری سانس لی یوں جیسے کب سے شکنجے میں کسے ہوئے دل کو اب رہائی ملی ہو۔ اماں کا چہرہ بھی کھل اٹھا۔ انہوں نے بے اختیار نومی کا چہرہ تھام کر پیشانی چوم ڈالی۔

"پاگل کہیں کے، پہلے بتانا چاہیے تھانا۔ ڈرا کر ہی رکھ دیا۔" تانیہ اور نادیہ آپی بھی جو اسی طرف آکر کھڑی ہوگئی تھیں یکدم ماحول کے اس سکوت اور گمبھیرتا سے نکل آئیں۔ نادیہ آپی نومی کے پیچھے جا کر اس کو پیٹھ پر ایک دھموکا رسید کرتے ہوئے بولیں۔

"بے ایمان! شام سے یہ خوشخبری دل میں لیے گھوم رہے ہو تبھی کہوں گھر میں آتے ہی گنگنا رہے تھے۔ مجھے ہوا تک نہیں لگنے دی۔ اب جلدی سے بھاگ کر مٹھائی لے کر آئو۔ ایسے ہی خوش نہیں ہوں گے ہم۔"

"ہاں تو اور کیا کل تک تو برے برے منہ بنا رہے تھے۔" تانیہ نے بھی اسے چھیڑا۔

"سکندر بھائی! آپ کچھ نہیں کہیں گے کوئی مٹھائی کا مطالبہ، کوئی دھپ، کوئی..." وہ سکندر کی طرف موڑھے سمیت مڑ گیا۔ اس کی بات پر سب بے ساختہ ہنس پڑے۔ سکندر نے پیار بھرے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے اپنے لیے کوئی راہ تو متعین کی۔ ہاں اگر جاب کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا اس میں ترقی کے چانس تھے بہرحال آئی وش یو گڈ لک۔"

اس نے پیار اور ملائمت سے اس کے سر کے سنورے بال بگاڑے اور تخت سے کھڑا ہو گیا اور اپنی بائیک کی چابی جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"تانی کو لے جائو اور اس کی پسند کی مٹھائی لے کر آئو۔ یہ خبر بغیر مٹھائی کے کچھ پھیکی پھیکی سی لگ رہی ہے۔ کیا خیال ہے اماں۔"

"وائو۔" تانیہ نے تالی پیٹی۔

"یہ ہوئی نا بات چلو نعمان صاحب! میری پسند کی مٹھائی خریدنے۔"

وہ فوراً ہی دوپٹہ سر پر جمانے لگی۔ نومی نے بائیک کی چابی لیتے ہوئے اپنی آنکھوں کے آگے چابی لہرائی۔

"اس بائیک میں جائوں گا میں... آہ۔" اس نے طویل قسم کی سرد سانس کھینچی تو پیچھے سے نادیہ آپی نے اس کے کندھے باقاعدہ نوچ ڈالے۔

"شکر کرو ناشکرے، تم تو ایسی بائیک سے بھی محروم ہو۔"

"ڈونٹ وری سسٹر بہت جلد میرے پاس نئے ماڈل کی ہنڈا ہو گی۔ دو نہیں چار پہیوں والی۔"

وہ موڑھے سے اٹھا اور نادیہ آپی کی طرف ایڑیوں کے بل پلٹ کر کالر جھاڑے' تانیہ کھانس کر رہ گئی جبکہ نادیہ آپی اوں ہوں کہہ کر ہنس پڑیں۔

"بس بیٹا! ہماری ضرورتیں پوری ہوں اتنا ہی بہت ہے ہمارے لیے' آبرو جگ میں رہے تو بادشاہی جانئے عزت بادشاہت کے برابر ہے۔" اماں بڑی سنجیدگی سے بولیں۔

انہیں یوں بھی' کبھی اپنی ضرورتوں سے زائد کی خواہش نہیں رہی تھی۔ وہ تو ایک صابر اور شاکر عورت تھیں۔

"یہ تو آپ کا پوائنٹ آف ویو ہے نا اماں حضور! عزت تو دولت سے ملتی ہے اور آج تو بادشاہ وہی ہے جس کے پاس بہت سا پیسہ ہے۔ وہی کنگ ہے' وہی طاقتور ہے' وہی سب سے زیادہ عزت دار۔" اس نے چابی سے کھیلتے ہوئے جیسے اماں کو چڑایا۔

"چل ہٹ نری بکواس ہے۔" اماں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"سب چار دن کی بادشاہت ہے' ملے بھی تو کیا اور نہ ملے بھی تو کیا۔ ایک لمبی عمر ہے جو آخرت کی گزارنی ہے اور اس سے پہلے قبر کا مرحلہ ہے۔ پھر حشر کا پچاس ہزار سال کا ایک دن ہے۔ کیسے گزاریں گے یہ کنگ۔"

سکندر' اماں اور نومی کی نوک جھونک پر دھیمے انداز میں مسکراتا ہوا آستین فولڈ کرتا بیسن پر جا کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔

نومی اس وقت شرارتی اور نٹ کھٹ سا لڑکا نظر آ رہا تھا اس کے انداز میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی جو اس کی ذات کا خاصا ہوا کرتی تھی۔ پھر وہ تانیہ کو لیے باہر نکل گیا۔ نادیہ آپی چیختی رہ گئیں کہ کھانا تیار تھا پہلے کھانا تو کھا لو مگر دونوں سنی ان سنی کر گئے تھے۔

X...X...X

وہ اپنے شاندار آفس میں بیٹھا تھا۔ اسے اس چیئر پر خالی خالی بیٹھے کتنی دیر ہو چکی تھی لیکن کسی بھی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ فائل بھی اس کے سامنے کھلی پڑی تھی جو وسیم بھائی کو فرسٹ فلور پر ان کے آفس بھجوانی تھی۔ مگر اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر وہ کیا سوچ رہا تھا یا کیا سوچنا چاہ رہا تھا۔

شاید وہ فرار چاہ رہا تھا۔ ہر سوچ ہر خیال سے مگر اس کا خیال تھا وہ فرار بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ بہت کچھ سوچنا چاہ رہا تھا مگر شاید ہر سوچ گڈ مڈ ہو گئی تھی۔ اس نے بے دلی سے اپنے آگے کھلی ہوئی فائل بند کی اور کرسی دھکیل پر اٹھنا چاہا کہ آفس کے بھاری شیشے کے خوب صورت تاریک دروازے کو دھکیل کر کوئی اندر داخل ہوا۔ داخل ہونے والا ایک دم جھجک سا گیا اور قدرے مرعوب ہو کر رہ گیا۔ خنک ہوا اور ایئر فریشنر کی بھینی بھینی مہک نے اس کا استقبال کیا تھا۔

وہ ماسٹر دین محمد کا بیٹا یوسف تھا۔

“سلام سائیں!”

“ارے یوسف! آئو آئو وعلیکم السلام بھئی بہت موقع پر آئے ابھی میں اٹھ کر جانے والا تھا۔” یوسف کو دیکھ کر ولید حسن خوشگوار مسرت کے ساتھ ریوالونگ چیئر سے اٹھ کر میز کے دائیں طرف سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

“آپ نے بابا کے پاس اپنا کوئی آدمی بھیجا تھا' انہوں نے کل شام مجھے پیغام دے دیا تھا اس پتے کے ساتھ کہ آپ نے مجھے بلوایا ہے۔ آپ سے رابطہ کروں۔” اس نے ہاتھ میں پکڑا پرچہ دوبارہ کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔

“ہاں آئو بیٹھو' تمہیں مشکل تو نہیں ہوئی میرا آفس ڈھونڈنے میں۔” اس نے دیوار سے لگے صوفوں کی طرف اشارہ کیا' جس پر یوسف بیٹھ گیا تو اس نے جگ سے ٹھنڈا پانی بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔

“ہوئی جی مشکل تو بڑی ہوئی سائیں! یوں تو میں شہر آتا رہتا ہوں مگر صرف چھوٹے اور پسماندہ علاقوں سے ہی واقفیت ہے۔ میرے کچھ دوست برادر اور دور پرے کے رشتہ دار رہتے ہیں' یہ اتنے مہنگے خوب صورت اور بڑے علاقے میں آ کر کچھ تلاش کرنا مشکل تو ہے نا مگر اتنی زیادہ پریشانی بھی نہیں ہوئی۔ ماشاءاللہ اتنی مشہور بلڈنگ ہے آپ کے دفتر کی۔” اس نے یہ کہہ کر گلاس لبوں سے لگا لیا اور ایک ہی سانس میں خالی کر کے تپائی پر رکھتے ہوئے کمرے میں نگاہیں دوڑاتے ہوئے قدرے مرعوبیت سے بولا۔

"ولید صاحب! آپ کا آفس تو بڑا ہی خوب صورت ہے بلکہ پوری عمارت ہی شاندار ہے۔ میں تو قدم قدم پر حیران ہوتا آرہا ہوں اتنی اونچی اونچی دیواریں اور اس قدر خوب صورت۔" وہ سادگی سے تعریف کر رہا تھا' ولید کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ بکھر آئی۔ وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اونچی عمارتوں سے مرعوب ہو جاتے ہو تم! حالانکہ یہ اونچی اونچی دیواریں تو انسان کو بہت پست کر دیتی ہیں ان کے قد گھٹا دیتی ہیں۔"

"نہ سائیں! ایسا تو نہیں ہے۔" یوسف پتہ نہیں اس کی بات کی گہرائی کو نہ سمجھ سکا یا پھر اپنے نقطہ نظر سے رد کر رہا تھا۔ وہ صرف اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ حقیقتاً یہاں آکر خاصا مرعوب لگ رہا تھا اور قدرے جھجکا ہوا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ صوفے پر یوں سکڑ کر بیٹھا تھا جیسے بادشاہ کے دربار میں کوئی درباری فریادی' حکم سننے کا منتظر ہو۔

ولید نے اپنائیت بھرے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "آرام سے بیٹھو یوسف اپنا ہی آفس سمجھو۔ ایسی فانی اور انسانوں کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے مرعوب نہیں ہوا

کرتے۔ مرعوب ہونا ہی ہے تو اس ذات سے ہو جس نے ان ہاتھوں کو بنایا ہے اور عقل و شعور دیا ہے تاکہ یہ سب وجود میں آسکے۔"

اس کی بات پر یوسف پیچھے ہو کر سنبھل کر بیٹھ تو گیا مگر ایک پھیکی سی ہنسی اس کے لبوں کی تراش میں لہرا کر منجمد ہو گئی۔

"ہم نے تو جب سے آنکھیں کھولی ہیں انسانوں کو انسانوں سے ہی مرعوب ہوتے دیکھا ہے۔ دو طبقے ایک بادشاہ ایک رعایا' ایک حاکم ایک محکوم' ایک برتر ایک کمتر' ایک حاکم ایک غلام۔"

ولید ایک لمحے کو خاموش رہ گیا۔ بس یوسف کے چہرے پر دم توڑتی مسکراہٹ کو دیکھتا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر سنجیدگی سے بولا۔

"ہماری سوچیں ہی ہمیں محکوم اور غلام بناتی ہیں یوسف! یہاں کوئی اعلیٰ کوئی برتر اور کوئی حاکم نہیں ہے۔ یہاں سب صرف انسان ہیں ایک اللہ کے محکوم بندے' اس کی بادشاہت کے آگے سرنگوں۔"

"مگر گوٹھ میں ایسا سب نہیں ہے سائیں! وہاں یہ فلسفہ غلط ثابت ہوتا ہے۔" وہ سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کا اعتماد دھیرے دھیرے لوٹ رہا تھا۔

"مجبور ہونے کا مطلب جانتے ہو کیا ہے یوسف! محکوم ہو جانے کا مطلب سمجھتے ہو؟ ایک اپنے ہی جیسے انسان سے بہت آسانی سے شکست کھا جانا۔ بزدل مجبور ہوتے ہیں' زندگی کو ہمیشہ بہادری سے گزارنا سیکھو۔ ذہنی طور پر شکست کھا جانے والا آدمی جسمانی طور پر کبھی مضبوط نہیں ہوتا۔" وہ اس کے سامنے میز پر بیٹھ گیا اور گلدان میں سجے پھولوں کو ہولے ہولے سہلاتے ہوئے اپنے مخصوص پر اعتماد اور مضبوط لہجے میں بولا۔

"لوہے کا کلہاڑا لکڑی کے جنگل سے ایک چھلکا تک نہیں اتار سکتا' جب تک اس کے ساتھ خود لکڑی کا دستہ شامل نہ ہو' یہ بات حکیم لقمان نے کہی ہے اور خوب کہی ہے' تم دراصل گوٹھ کے لوگ اپنی قدر و منزلت سے اپنی اہمیت سے بے خبر ہو اور بے خبری کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ عموماً لوگ بے خبری میں ہی بڑے بڑے نقصان اٹھاتے ہیں اینی وے۔" اس نے یکدم میز کی سطح پر ہاتھ مارا اور ایک گہری سانس بھر کر کھڑا ہو گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"چھوڑو یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی میں نے تمہیں خاص پیغام دے کر بلوایا ہے جانتے ہو کیوں؟" وہ دوبارہ اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"نہ سائیں البتہ حیران ضرور ہوں سائیں! بابا پر تو آپ نے جانے کیا جادو کر دیا ہے جب سے گئے ہیں آپ ان سے مل کر' تب سے وہ آپ کے نام کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں۔ جیسے ہی آپ کا آدمی ان کو پیغام دے کر گیا وہ میرے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے کہ جلدی جائو۔ ولید صاحب نے بلایا ہے جانے کیا کام ہو' وہ تو خود آنے پر کمربستہ تھے' بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں روکا ہے۔" یوسف مسکرا کر شگفتہ انداز میں بتانے لگا وہ بھی محظوظ ہو کر ہنس پڑا۔ پھر یک بیک سنجیدہ ہو کر جیسے کسی خیال میں گم ہوتے ہوئے بولا۔

"ماسٹر صاحب تو خود اتنے اچھے' اتنے پیارے انسان ہیں کہ میں ان سے ملنے کو خود بے چین ہوں وہ کیا ہیں میرے لیے؟ تم کیا جانو۔ ارے ہاں تمہارا اسکول کیسا چل رہا ہے بھئی بڑی محنت سے پڑھاتے ہو تم۔" وہ میز کی سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یکدم دوسرا موضوع لے آیا۔

یوسف اٹھ کر اس کے سامنے رکھی میز کے دوسری طرف والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔اس موضوع پر اس کے اندر تک اداسی دوڑ گئی تھی، جس کا عکس چہرے پر بھی سمٹ آیا۔

”اب کہاں سکول ولید صاحب! اسے تو وڈیرے نے بند کروا کر اپنے آدمی بٹھا دیئے ہیں۔ مہمان خانہ بنالیا ہے انہوں نے۔ دو چار بچے آتے تھے وہ بھی محروم ہو گئے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

ولید کے لیے یہ خبر خاصی غیر متوقع اور آزار دینے والی تھی۔ وہ ایک دو لمحے غیر ارادی طور پر کچھ نہ بول سکا پھر دوسرے پل اس کے اندر تاسف ابھر آیا۔ ایک دو لمحے کمرے کی فضا میں بوجھل سا سکوت چھایا رہا پھر وہ میز کی چمکتی ہموار سطح پر دونوں کہنیاں ٹکا کر ذرا آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

”گو کہ ہے تو بہت بری خبر مگر فکر مت کرو۔ اس گوٹھ میں بہت جلد ایک شاندار سکول کھل جائے گا۔ ایسا سکول جس کا ماسٹر دین محمد، تم، میں اور ہم جیسے بہت سے لوگ خواب دیکھتے ہیں۔“

”کیا، کیا مطلب سائیں!“ آ... آپ... یوسف اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ اس کا منہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ولید حسن دھیرے سے ہنس دیا اور کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا۔ یوسف پہلے ہی سنبھل کر بیٹھا تھا اور مزید سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”تو، تو وہ جو کنسٹرکشن ہو رہی ہے وہ سکول کے لیے ہو رہی ہے۔“ اس نے چونک کر خوشگوار حیرت سے استفسار کیا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔

”کچھ کچھ اڑتی خبر گوٹھ میں گردش کر رہی تھی۔ مگر اسے بھی محض افواہ سمجھ کر یقین کرنے کو دل نہیں چاہا یہ بھی دھوکا ہی محسوس ہوا۔“ اس کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔

”یہ تمہارا ہی نہیں ہم سب کا المیہ ہے کہ اب سچ سے بھی اعتبار اٹھ گیا ہے، درصل ہمارے خوابوں کو اس بری طرح سے ہر صاحب اقتدار لیڈر نے نوچا کھسوٹا ہے کہ اب عوام اپنے ہی خوابوں سے تنگ آ

چکے ہیں۔تاہم کہتے ہیں نا کہ خواب انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں خواب دیکھنا' اپنے آپ سے آگے ہونا ہے۔خواب نہ دیکھنا ایک طرح کی بے حسی ہے اور بے حسی اذیت ناکی سے زیادہ سنگین نتائج لاتی ہے۔''

''ولید صاحب! آپ باتیں بڑی اچھی کرتے ہیں۔سیدھی دل پر لگتی ہیں۔'' یوسف بحر عقیدت میں ڈوب کر ولید حسن کو دیکھنے لگا۔اس کے لہجے میں حقیقی تعریف اور توصیف تھی جس پر ولید ولید ذرا سا جھینپ کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''خیر گفتار کا غازی ہونا کوئی کمال نہیں ہے۔اچھا یہ بتاؤ تم اس خبر سے خوش ہوئے۔'' اس نے مسکرا کر یوسف کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا۔گویا وہیں سے دل کا حال جان لینا چاہا ہو' اس کے قلبی احساسات محسوس کر لینے چاہے ہوں۔

''کیسی بات کرتے ہیں آپ' خوابوں کی تعبیر دکھائی دے تو کون خوش نہیں ہوگا' مگر یہ سب ممکن کیسے ہے وڈیرہ تو اس کی مخالفت کرے گا یوں بھی۔''

''اس کی تم فکر مت کرو کوئی مخالفت نہیں ہوگی۔یہ کام کوئی نہیں روک سکے گا۔تمہارا سائیں صرف ایک وزیر ہے اس کا سارا طنطنہ گوٹھ کے لوگوں پر نکل سکتا ہے اپنی وے' یہ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

بتاؤ آج کل تو تمہارا وڈیرہ مردان شاہ اپنے باپ کی برسی کی تیاریوں میں لگا ہوا ہے۔بڑی رونق ہوگی گوٹھ میں' یا صرف حویلی میں ہی رونق ہے۔''

وہ دھیرے دھیرے اپنے اصل موضوع پر آیا تھا۔یوسف نے چونک کر پھر قدرے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔

''آپ کو کیسے خبر ہے؟ ہاں سن تو رہے ہیں ہم بھی۔'' وہ یوسف کی سادگی پر دھیرے سے ہنس دیا' اس کی خوب صورت آنکھوں میں بھی ہنسی کی دھیمی پر اسرار سی چمک لہرا گئی پھر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کرسی پر ہلکے سے جھولتے ہوئے بولا۔

''خبر کسے نہیں ہے اخبار بھرے پڑے ہیں۔بڑے بڑے پوسٹر چھپوائے جا رہے ہیں۔مرحوم شاہ صاحب کے کارناموں کے ان کی حب الوطنی اور عوام محبت کے چرچے کیے جا رہے ہیں اخباروں میں مضامین چھپوانے کو بھیجے گئے ہیں۔بصد اصرار صحافی برادری کو مرعوب کیا جا رہا ہے۔بڑے نادان ہو یوسف! تمہارا سائیں سیاسی آدمی ہے جو لاشوں پر بھی خوب سیاست کرتے ہیں۔پتہ نہیں مرحوم نے یہ کارنامے کبھی انجام دینے کا سوچا بھی ہوگا کہ نہیں۔بہر حال یہاں تو اسے دنیا کا عظیم انسان بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔''

وہ ابرو اچکا کر استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ بول رہا تھا پھر یکدم کرسی کو جھولانا بند کر کے میز پر ہتھیلیاں جما کر یوسف کی طرف جھکا۔ ''یوسف میں تم پر کتنا اعتبار کر سکتا ہوں؟'' وہ ایک ٹک اسے نگاہوں کے حصار میں لیے استفسار کرنے لگا تو لحظہ بھر کو یوسف سٹپٹا گیا پھر جیسے سنبھل کر اس کے چہرے میں کچھ اخذ کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ''مکمل، سو فیصد کر سکتے ہیں ولید صاحب!''

''ہوں۔'' وہ گہری سانس بھر کر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر میز پر بے آواز انداز میں انگلیاں مارنے لگا پھر دھیرے سے بولا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ میں تم پر مکمل اعتماد کر سکتا ہوں اور اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔ مجھے تم ایک سمجھدار انسان لگے ہو۔ یوں بھی بیٹا باپ کا پرتو ہوتا ہے اور ماسٹر دین محمد پر میں آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتا ہوں اور میرا خیال ہے تم پر بھی کر سکتا ہوں۔''

''بالکل، بالکل۔'' یوسف نے جذباتی انداز میں گردن زور زور سے اثبات میں ہلائی۔

''تو تم میرا کام کرو، مجھے گوٹھ کے حالات سے باخبر کرتے رہو۔ گوٹھ سے میری مراد ہے حویلی اور...''

''حویلی والے۔'' یوسف نے اس کی بات اچک کر پوری کی تو وہ گہری سانس بھر کر مسکرانے لگا۔ یوسف کی سمجھداری پر اس کا دل خوش ہو گیا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہوں اس کا مطلب ہے تم واقعی انڈر سٹوڈ ہو گڈ۔'' پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''تم چاہو تو اس کام کا معاوضہ میں تمہیں دے سکتا ہوں۔''

''کیسی بات کرتے ہیں ولید صاحب!'' وہ یکدم کچھ برا مان گیا۔

''معاوضے کی بات کر کے آپ نے خود بے اعتباری کی بات کر ڈالی۔''

''ارے نہیں یوسف... بخدا میرا مطلب تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ یوسف حقیقتاً برا مان گیا تھا۔

''چلو سوری کر لیتا ہوں۔ میں نے معاوضے کی بات صرف تمہاری آج کل نوکری چھوٹ جانے کی وجہ سے کی تھی۔ تمہارے اعتبار و اعتماد کی قیمت نہیں لگائی۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر یوسف کی کرسی کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔

"میں چاہتا تو پیسہ دے کر کسی سے بھی یہ کام کروا سکتا تھا۔ معاوضہ لے کر تو ہر کوئی کر سکتا ہے مگر مجھے صرف اور صرف بااعتماد شخص کی تلاش تھی جواب ختم ہوئی۔"

اس نے ہولے سے اس کے کندھے پر دباؤ ڈالا پھر دوبارہ اپنی کرسی پر آکر ایک بٹن دبایا۔ جس سے باہر موجود چپڑاسی سرعت سے اندر آیا اس نے چائے کا آرڈر دیا اور یوسف کی طرف دیکھا۔

"یہ معاوضہ مت سمجھ لینا یہ صرف مہمانی ہوگی۔" یوسف دھیرے سے ہنس پڑا۔

ولید نے بے حد تکلفات کر ڈالے تھے وہ بے چارا کھانے پینے کی اشیاء سے بھری ٹرالی دیکھ کر شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔

"بے تکلف ہو کر کھاؤ یوسف! تمہاری جگہ ماسٹر صاحب ہوتے تو میں خود انہیں نوالے بنا بنا کر کھلاتا اپنا دل نکال کر ان کی پلیٹ میں رکھ دیتا۔" وہ گہری اور قدرے بھاری آواز میں دھیمے لہجے میں بولا۔ پھر دوسرے پل سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے چائے کا مگ اٹھا کر پیتے ہوئے یوسف کو مزید کچھ باتیں سمجھانے لگا۔

X...X...X

"تانیہ! خدا کے لیے یہ اخبار ایک طرف ڈالو اور جلدی جلدی ناشتہ کر لو۔ پھر مت کہنا سکندر نے زمانہ قدیم کی بائیک کا خطرناک ہارن بجانا شروع کر دیا اور بقول تمہارے محلے والے تمہاری جان کو آجائیں گے۔" نادیہ آپی نے اس کے ہاتھ سے اخبار جھپٹنا چاہا مگر اس نے جلدی سے ہاتھ دور کر دیا۔

"اوں ہوں ابھی خود سکندر بھائی نے کہاں ناشتہ کیا ہے' ابھی تو وہ واش روم میں ہی ہیں۔" اس نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر کہا اور چائے کا مگ اٹھا کر پیتے ہوئے پھر کسی خبر کو دلچسپی سے پڑھنے لگی۔

"اسے ناشتے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے' وہ کھاتا ہی کیا ہے دو سلائس اس پر ذرا سا جیم چپڑ لیا اور گرم گرم چائے حلق میں انڈیل لی۔" اماں پراٹھے لیے کچن سے باہر آئیں اور دستر خوان پر بیٹھتے ہوئے ایک پراٹھا نعمان کے آگے رکھا جو ابھی آکر بیٹھا تھا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آج کی نسل کو ایسے سوکھے کھانے ہضم کیسے ہو جاتے ہیں۔ انڈے سے اسے الرجی ہے' پراٹھے سے اسے اپنا وزن بڑھتا محسوس ہوتا ہے' مکھن سے اسے ابکائی آتی ہے' ارے میں کہوں پھر کھانا کسے کہتے ہیں۔"

"اماں جی! آج کی نسل صرف کھانے کے لیے زندہ نہیں ہے زندہ رہنے کے لیے کھاتی ہے۔" تانیہ نے سلائس پر جیم لگاتے ہوئے ہنس کر کہا تو اماں اونہہ کر کے رہ گئیں۔

"دیکھیئے اماں! میں تو کھانے کے لیے زندہ ہوں۔" نومی نے پراٹھے کا نوالہ منہ میں لے جاتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا اور مسکرانے لگا۔ پھر تانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کوئی تازہ خبر آج کی، ایسی چپک کر رہ گئی ہو اخبار سے، ایسا کیا ہے اس میں۔"

"ارے چھوڑو روز... ایک ہی خبریں ہوتی ہیں، وہی دہشت گردی، فائرنگ، قتل و غارت، ڈکیتی، ہڑتال۔" اماں نے اخبار کی طرف انتہائی ناگوار قسم کی نگاہ ڈالی تو نادیہ آپی ان کے کپ میں چائے بھرتے ہوئے ان کی اخبار سے بے زاری پر ہنس دیں۔

جس کا بیٹا ہی صحافی ہو دن رات، انہی کاموں میں سر کھپائے انہیں تو لازماً چڑنا ہی تھا، انہیں تو جیسے یہ اخبار رقیب ہی لگتا تھا بقول ان کے۔

"نرے کالے کاغذ تو میرے بیٹے کو دو گھڑی میرے پاس بیٹھنے بھی نہیں دیتے۔"

"کل سماجی رہنما کی رہائش گاہ گلشن اقبال پر نامعلوم افراد کی فائرنگ جس کے نتیجے میں پڑوس کے عبدالمجید کا آٹھ سالہ بیٹا ہلاک۔"

تانیہ نومی کو باآواز بلند خبریں پڑھ کر سنانے لگی جو اس کی عادت تھی اور اماں بھی متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ پائیں۔ اس خبر پر تاسف کا اظہار کرنے لگیں مگر ادھر نومی کے حلق میں گرم گرم چائے اتر گئی۔ اس نے جھٹکے سے بھاپ اڑاتی چائے کا کپ دستر خوان پر رکھا۔ تانیہ کی طرف دیکھا۔

"کیا کہا... بب بچہ ہلاک... مگر کیسے؟ دکھانا، دکھانا ذرا مجھے۔" اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

"صبح کا اخبار پڑھنا۔" یاسر کا جملہ اس کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔ اس نے تانیہ کے ہاتھ سے اخبار چھین لیا اور وہی خبر خود پڑھنے لگا۔ اس سیاہ گیٹ کی تصویر تھی جس پر گولیاں برسائی گئی تھیں۔ پورے تین سوراخ تھے اور ساتھ ہی دوسری تصویر میں ایک صحت مند بچے کی لاش تھی جو نامعلوم افراد کی گولی سے ہلاک ہوا تھا۔

"یہ' یہ بچہ مگر وہاں تو کوئی بچہ نہیں تھا۔" اسے اپنے اعصاب روئی کی طرح اڑتے محسوس ہونے لگے' ہاتھ پیروں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

"بس بیٹا' خدا غارت کرے ظالموں کو جو ماں باپ کے جگر کے ٹکڑوں کو یوں اپنی سفاکی کا نشانہ بناڈالتے ہیں' جانے کیسے دل جگر لے کر آتے ہیں۔" اماں دکھ اور تاسف کے احساس کے ساتھ تبصرہ کرنے لگیں مگر نومی تو جیسے اس ماحول سے یکدم کٹ گیا تھا۔اس کے اندر ایک بے نام سی وحشت اتر رہی تھی۔جواب وجود میں چبھن بن کر کھٹکنے لگی تھی۔اس نے جیسے سب سے نظریں بچا کر اخبار رول کیا اور کھڑا ہو گیا۔

"ارے کیا ہوا' یہ کیوں چھوڑ رہے ہو۔" اماں اسے اٹھتے دیکھ کر چونک گئیں مگر اس نے' بس کھالیا' کہہ کر تیزی سے باہر کا رخ کیا۔

"لو ابھی کہہ رہا تھا کھانے کے لیے زندہ ہوں اور یہ آدھا پراٹھا یونہی پڑا ہے۔"

"کیا ہوا نومی نے ناشتہ نہیں کیا۔" سکندر آستین فولڈ کرتا آکر دسترخوان پر بیٹھا۔نومی کو نہ دیکھ کر پوچھا۔

"بس اب نوکری کی دم لگ گئی اس کے پیچھے بھی۔اب یہ بھی یونہی چند نوالے کھا کر بھاگے گا۔"

"توبہ ہے اماں! آپ کا بس چلے تو پکڑ پکڑ کر سب کو کھلا کھلا کر پہلوان بنا دیں۔" تانیہ اماں کی پریشانی پر کھل کھلا کر ہنسی۔

"سچ سکندر بھائی! آج آپ یہ سوکھے سوکھے سلائس مت کھایئے گا وگرنہ اماں دلبرداشتہ ہو کر کچھ کر بیٹھیں گی۔" اس نے جیسے انہیں خبردار کیا۔

"بس ہانکے جانا۔" اماں نے اس کی بکواس پر اسے ایک ہاتھ جڑ دیا۔

"خدا نہ کرے جو میں کچھ کر بیٹھوں۔"

"تو کچھ کرنے میں کیا ہے اماں کچھ "اچھا" بھی کیا جا سکتا ہے۔مثلاً ڈانس وانس۔"

"تانی بد تمیز اٹھو' میرا خیال ہے تم نے ناشتہ کر لیا ہے۔" نادیہ آپی نے برتن سمیٹتے ہوئے اسے آنکھیں دکھائیں تو وہ کھڑی ہو گئی۔

"اخبار دینا ذرا۔" سکندر نے کہا اور پھر فلمی صفحہ ایک طرف ڈال دیا۔

"فرنٹ کے پیجز دینا۔"

"ابھی یہیں تو رکھا تھا' نومی پڑھ رہا تھا۔" اس نے میگزین اور فلمی صفحے والا اخبار اٹھا کر دیکھا پھر یاد آنے پر بولی۔" وہ تو شاید وہ ساتھ ہی لے گیا ہے۔"

"کیا لے کر چلا گیا کیوں بھئی؟ اتنی جلدی تھی اسے کہ بیٹھ کر اخبار بھی نہیں پڑھ سکا۔" اس نے تعجب سے بھنویں اچکائیں۔

"ارے چھوڑو بیٹا گولی مارو اخبار کو۔ سارا دن انہی کاغذوں میں تو گھرے رہتے ہو۔ کون سی خبر تمہاری نظر سے رہ جاتی ہے۔"

"ارے نہیں اماں تانی کو بتانی تھی ایک خبر۔" اس نے نادیہ آپی کے ہاتھ سے جیم لگا سلائس لے لیا اور ایک نوالہ کھا کر چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تانی تمہارے پروفیسر زبیری معطل کر دیئے گئے ہیں یہ تو علم ہو گا۔"

"ہاں! دیکھیں ذرا! بڑی حیرت ہوئی ہمیں تو سن کر۔ شہرینہ تو باقاعدہ آٹھ آٹھ آنسو بہانے پر تیار تھی۔ ویسے وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔" اس نے شوز پہنے بیگ اٹھا کر اس میں کتابیں ڈالتے ہوئے اسی خبر پر تبصرہ کیا پھر چونک کر بولی۔

"اس سلسلے میں کوئی خبر آئی ہے کیا۔"

"ہوں' خود پروفیسر زبیری کا مضمون چھپا ہے اور اسی سلسلے میں میرا کالم بھی پڑھنا۔" یہ کہتے ہوئے سکندر نے ریسٹ واچ پر نگاہیں ڈالیں پھر جلدی جلدی نوالے حلق سے اتارتے ہوئے بولا۔"اوہو' بہت دیر ہو گئی آج تو' تم تیار ہو تانی؟"

"جی بالکل۔" وہ بولی پھر ایک گہری سانس بھرتے ہوئے نادیہ آپی کی طرف دیکھ کر ہنسی۔
"اتفاق سے آپ سے پہلے ہو گئی تیار۔" نادیہ آپی نے صرف اسے گھور کر دیکھا اور کام میں جت گئیں۔

X...X...X

نومی حواس باختہ سا یاسر کے بنگلے پر پہنچا اور سیدھا اس کی خواب گاہ میں گھسا چلا آیا۔ وہ اپنے جہازی سائز بیڈ پر دراز تھا۔ کمرے میں ام الخبائث (شراب) کی بو رچی ہوئی تھی۔ خالی بوتل اور ٹوٹا گلاس اس کے پیروں میں آیا مگر وہ ہر چیز سے بے نیاز مختل ہوتے حواس کے ساتھ اس کے بیڈ تک آیا اور سر سے پیر تک چادر تانے یاسر کی چادر کھینچ لی۔

"یاسر' یاسر اٹھو یاسر!"

"اوہو کون؟ کون ہے؟ کیا مصیبت ہے؟"

"یاسر یہ فائرنگ تو سمجھ میں آتی ہے مگر یہ قتل... یہ تو بچہ ہلاک ہو گیا ہے جبکہ ہم نے تو صرف سیاہ رنگ کے گیٹ پر فائرنگ کی تھی۔" وہ اخبار میں ہلاک ہونے والے بچے کی تصویر دیکھ کر حواس کھو رہا تھا۔ سماجی رہنما کے بنگلے کے گیٹ کی بھی تصویر تھی جس پر گولیوں کے نشانات تھے۔

"مجھے پتہ تھا تم صبح ہی صبح نازل ہو گے۔ دکھاؤ اخبار۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اخبار اس کے ہاتھ سے لے کر اس پر ایک نظر ڈالی پھر اسے ایک طرف ڈال کر لمبی جمائی لیتے ہوئے بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"پیارے نومی! پہلی بات تو یہ کہ فائرنگ ہم نے نہیں صرف تم نے کی تھی۔ دوسری بات یہ کہ بچہ واقعی تمہاری گولی سے ہلاک ہوا تھا۔ میں نے اسے وہاں گرتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"کیا؟" نومی کا تو گویا ایک ایک اعصاب سن ہو گیا۔ اس نے یاسر کو یوں دیکھا جیسے وہ ابھی تک نشے میں ہو۔

"ہاں پیارے! مگر اس میں کیا ہوا اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ ایک بچہ ہی تو مرا ہے نا کوئی آفت تو نہیں آ گئی۔ ایک گولی یہاں سے وہاں چلی گئی۔"

"نن' نہیں یاسر اس بچے کو میں نے ہلاک نہیں کیا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو۔ میں نے صرف تین گولیاں ماری تھیں وہ بھی گیٹ پر۔"

"اوہو یار! تم تو یوں حواس کھو رہے ہو جیسے ایف آئی اے والے تمہیں ابھی دھر لیں گے' کم آن یار! ڈونٹ وری یہ کوئی پریشان کن بات نہیں ہے ہو جاتا ہے ایسا اور تم کیا سمجھتے ہو۔ کیا صرف گیٹ اور دیواروں پر ہی گولیاں برساتے رہو گے۔" یاسر نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا پر زور سے ہنس دیا۔

"اچھا ادھر بیٹھو لگتا ہے بریک فاسٹ بھی نہیں کیا ہے' تبھی دماغ کی چولیں ہل رہی ہیں۔" اس نے خوفزدہ نومی کا ہاتھ کھینچ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

"مگر مگر ایسا نہیں ہونا چاہیے یاسر! میں تو مارا جائوں گا۔اب' اب کیا ہوگا۔" اس کی تسلی کسی طور پر نہیں ہو پا رہی تھی' اس کی آنکھوں کے تلے پھانسی کا پھندا لہرانے لگا تھا۔

"ارے کچھ نہیں ہوگا' کوئی کیس نہیں بنے گا۔ابے گائودی ہم تو کارندے ہیں' یوں سمجھو بساط کی مہریں ہیں'ہمیں چلانے والے بااثر لوگ ہیں اور میں نے تمہیں بااثر لوگوں کی خصوصیات بتائی تھیں نا' قانون ان کا رکھوالا ہے' پیارے کیوں فکر میں مرے جا رہے ہو۔" یاسر نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا' پھر زور زور سے تھپکتے ہوئے مزید بولا۔

"یہ خبر اخبار میں آئی ہے بس سمجھو رات گئی بات گئی' ختم ہو جائے گی۔تم پورا اخبار پڑھو' کتنے قتل' اغوا اور کتنی ڈکیتیاں ہوئی ہیں۔اگر یوں ہی ذرا سی فائرنگ اور ایک آدھ قتل پر مجرم کی تلاش شروع ہو جاتی تو اس ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔یہ بااثر شخصیات جیلوں بلکہ پھانسی کے پھندوں پر لٹکی لاشیں ہوتیں اور ہم تم جیسے نوجوان نہایت شریفانہ زندگی گزار

رہے ہوتے۔" یاسر یہ کہہ کر کھل کر ہنسنے لگا۔وہ اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر خاصا محظوظ بھی ہو رہا تھا۔

"چلو آئو ناشتہ کرتے ہیں' آئو میرے قاتل! میرے دلدار! میرے دہشت گرد! ابے یہ تو فخر کی بات ہونی چاہیے اب تمہارے لیے۔" یاسر اسے تھپک کر واش روم میں گھس گیا۔

"فخر؟ کس بات پر فخر؟" اس نے سر گھما کر واش روم کا ادھ کھلا دروازہ دیکھا۔پھر چہرہ جلدی سے موڑ لیا۔اس کی سمجھ میں قطعی نہیں آ رہا تھا کہ یہ بچہ اس کی گولی سے کب اور کیسے ہلاک ہو گیا' اس نے تو پورے دھیان سے تین گولیاں اس سیاہ گیٹ پر ہی ماری تھیں' پھر یہ چوتھی گولی کس کے ریوالور سے نکلی' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے باس کو تمہاری شکل سے محبت ہو گئی ہے جو تمہیں نوٹوں کی گڈیاں دے دے گا۔ارے گیٹ پر گولیاں برسانے کے لیے تو بارہ بارہ اور پندرہ پندرہ سال کے لڑکے بھی مل جاتے ہیں' چند ہزاروں میں' جانو! تمہیں تو لاکھوں کمانے ہیں تو لاکھوں جانیں بھی ضائع کرنی ہوں گی۔" یاسر تولیے سے منہ رگڑتا باہر نکلا پھر تولیہ ایک طرف اچھال کر اس کی اٹھنے والی خوفزدہ نظروں میں نگاہیں ڈال کر زیر لب مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگا۔

"ہاں شروع شروع میں اسی طرح ہو گا پھر یہ دل ہے ناوہ برف تلے دب جائے گا۔نوٹوں کے برفیلے تودوں کے نیچے گہری بے خبری نیند سو جائے گا پھر تمہارے ہاتھ کانپیں گے نہ دل دھڑکے گانہ رگوں میں دوڑتالہو متوحش ساہو کر پریشان کرے گا۔چلو' چلوشاباش یار! قہقہے لگائو' جام لنڈھائو' زندگی کو گزارنا سیکھو یار!" اس نے ایک دھپ رسید کی پھر اسے گردن سے پکڑ کر کھڑا کیااور کھینچتاہواڈائننگ ہال میں لے آیاجہاں ملازم ناشتے کی میز سجا رہے تھے۔

X...X...X

کچھ تو نازک مزاج ہیں ہم بھی

اور یہ چوٹ بھی نئی ہے ابھی

اس کی زبان کے ساتھ ہنسی بھی تھم گئی۔شہرینہ نے اسے جما کر مارا تھامگر پھر بھی آنکھوں اور لبوں پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔

"اب ہنسوں بھی نہیں' ایسی مزے مزے کی خبریں دیتی ہو پھر کیااب اس پر روئوں۔ایمان سے یہ اکبر شاہ چیز کیا ہے؟"

تانیہ بوگن ویلیاکی باڑھ کے نیچے بینچ پر بیٹھ گئی۔وہ شہرینہ کے یہاں آئی تھی۔آج چھٹی کادن تھااور شہرینہ نے اسے لنچ کے بعد بھی جانے نہیں دیاتھا۔اترتی شام میں وہ دونوں کمرے سے نکل کر لان میں ٹہل رہی تھیں تب شہرینہ نے آئس کریم پارلر میں اکبر شاہ سے ہونے والی مڈبھیڑ کاقصہ اس کے گوش گزار کیاتھا۔

"مجھے کیا خبر تھی یہ آئس کریم بار بھی اس خبیث کے باپ کا ہو گا۔مجھے تو ابھی تک قلق ہے وہاں آئس کریم کھانے پر۔"

"خیر خیر' یہ تو مت کہو' کئی بار کھاچکی ہو وہاں سے بلکہ وہ تو تمہارافیورٹ آئس کریم پارلر ہے۔" تانیہ نے اسے چھیڑا پھر ہنستے ہوئے بولی۔

"ویسے اس میں آئسکریم کا کیاقصور' یہ تو خالص دودھ کی بنی ہوتی ہے۔کون سااس میں اکبر شاہ یااس کے باپ کو گھولا جاتاہے۔" تانیہ کی اس بات پر وہ بے ساختہ امڈنے والی ہنسی کو نہ روک سکی پھر بوگن

ویلیا کے گلابی کاغذ نما پھول اس پر اچھال کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور گہری سانس بھرتے ہوئے بولی۔ ”کاش، اسے بھی گھول کر مشین پر چڑھادیا جاتا۔ جان تو چھوٹ جاتی۔“ پھر قدرے جھنجھلا کر بولی۔

”تانیہ! تانی! آخر یہ شخص چاہتا کیا ہے؟“

”بھئی بظاہر تو ایسا لگتا ہے تمہیں چاہتا ہے اب میں اس کی پرسنل سیکرٹری تو ہوں نہیں کہ...“

”اسے چاہنا، کہتے ہیں۔“ وہ تڑخ کر بولتے ہوئے تانیہ کو گھورنے لگی مگر تانیہ جیسے اس کی خوب صورت آنکھوں میں ابھرنے والے ملائم غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کندھے اچکا کر بولی۔

”سب کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے اظہار کا، اب اسے اپنی محبت کے اظہار کا یہی طریقہ مناسب لگا ہوگا تبھی تو۔“ تانیہ بولتے بولتے جھٹکے سے کھڑی ہوگئی تھی۔ شہرینہ نے پیروں کے قریب رکھا چھوٹے سائز کا پھولوں سے بھرا گملا اٹھالیا تھا۔

”ارے ارے، یہاں تو قتل وغارت گری ہورہی ہے۔“ سکندر رضا کی آواز پر دونوں پلٹیں۔ وہ اور ولید ایک ساتھ چلتے ہوئے لان میں داخل ہوئے تھے۔

”یہ کیا ہورہا ہے، رکھو گملا نیچے۔“ ولید نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس نے کھسیا کر جلدی سے گملا دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

”اسے کہتے ہیں، مارا جو تو نے پھول وہ پتھر سے کم نہیں۔ یعنی اگر شہرینہ بی بی اتنے سارے پھول مارے محبت کے مارتیں تو ظاہر ہے تانیہ نے تو زندہ رہنا نہیں تھا۔ گملے کا نہ سہی پھولوں کا تو وزن ہوتا ہی ہے نا۔“ سکندر خوشگوار انداز میں قدرے شرارتی... نگاہ اس پر ڈال کر بولا۔

ولید مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے دیکھنے لگا بلکہ جائزہ لینے لگا۔ اس کی کھسیاہٹ میں کچھ اضافہ ہوگیا تھا۔

”آپ کی بہن ہے ہی اس قابل کہ اسے گملے سمیت پھول مارے جائیں۔“

”ویسے میری طرف سے اجازت ہے، تم اپنی محبت کا اظہار جس طرح کرنا چاہو۔“ سکندر برجستہ بولا تھا۔ شہرینہ نے تانیہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر دونوں محفوظ ہوکر بے ساختہ ہنسنے لگیں۔

"کیا خیال ہے تانی! اظہار کا سب کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔" وہ دھیرے سے بولی تھی تانیہ اسے گھور کر رہ گئی پھر چلتی ہوئی اس کے قریب ہی آ گئی۔

"بائے دی وے' تم گھر کے علاوہ ہر جگہ پائی جاتی ہو' کتنے دنوں سے ہو یہاں پر۔" سکندر اب تانیہ سے مخاطب تھا جس پر تانیہ احتجاجاً چلائی۔

"اف اتنا جھوٹ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو آئی ہوں۔"

"ہاں تمہاری "ابھی کچھ دیر پہلے" صبح نو بجے ہوئی تھی شاید جب نومی گھر سے نکلا تھا تمہیں لے کر جب میں ناشتہ کر رہا تھا۔" اس نے ابرو اچکا کر اسے گھورا۔

"نو تو خیر نہیں بجے تھے گیارہ بج رہے تھے۔" وہ کھسیا کر بولی۔

"اگر نو بجے بھی آ جاتی تو کوئی قباحت نہیں تھی۔" شہرینہ اس جرح پر فوراً تانیہ کا ساتھ دیتے ہوئے بولی۔

"الحمدللہ ہم پرندوں کے ساتھ ہی اٹھ جاتے ہیں۔" اس کے اس طرح کہنے پر ولید نے بے ساختہ ابھرنے والی ہنسی کو ہونٹوں تلے دبایا تھا اور پلٹ کر کین کی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور گاڑی کی چابی درمیانی ٹیبل پر رکھے اخبار کے اوپر پھینکنے کے انداز میں ڈال دی۔

"ماشاءاللہ آپ کے گھر کے پرندوں کو بھی انسانوں کا اثر ہو گیا ہے۔ انہیں بھی ٹائم پیس ہی گیارہ بجے اٹھاتی ہے تو اٹھتے ہیں بیچارے انگڑائیاں لیتے ہوئے۔" وہ ہنستے ہوئے ولید کی طرف آ گیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ولید اس نوک جھونک سے محظوظ ہو رہا تھا پھر شہرینہ سے بولا۔

"چلو فٹافٹ' چائے بنا کر بھیجو۔" اور سکندر کی طرف منہ کرتے ہوئے بولا۔

"چائے کے ساتھ کچھ چلے گا۔" اس کی بات پر سکندر نے کرسی کی پشت سے لگ کر نیم وا آنکھوں سے شہرینہ پر ایک نگاہ ڈالی اور سر ہلا دیا۔

"اگر چائے بھی مل جائے تو بہت ہے۔" اس کے انداز میں شرارت تھی۔ یہاں آتے ہی اسے اپنی ساری تھکن اترتی محسوس ہوئی تھی جیسے کوئی نرمی سے کندھے دبا کر سارا بوجھ نکال دے۔

"ارے کیوں نہیں ملے گی چائے' ابھی صغریٰ کو کہتی ہوں۔" وہ اپنا کلف والا بڑا سا سیاہ اور سبز کنٹراسٹ کا دوپٹہ سنبھال کر پلٹی تو ولید فوراً بولا۔

"صغریٰ بے چاری کو بخش دو۔ کبھی خود بھی کچھ کر لو' خود بناؤ چائے اور پیش کرو کچھ مہمان داری بھی سیکھو۔" وہ رک کر پلٹی تھی' وہ سیاہ شلوار قمیص میں دونوں ہتھیلیاں گردن پر جمائے کرسی کی پشت سے لگا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔اس نے کچھ کہنے کے ارادے سے منہ کھولا پھر کچھ سوچ کر لب بھینچ لیے اور پلٹ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔تانیہ بھی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ ولید پر ایک نگاہ ڈال کر شہرینہ کے پیچھے چلی آئی۔ان دونوں کے جاتے ہی ولید' سکندر کی طرف متوجہ ہوا۔

"پھر کیا خیال ہے چل رہے ہو آمنہ کے دادا سائیں کی برسی ورسی میں۔"

"ہوں ہاں چلیں گے' دیکھیں باپ کی برسی سے مرادن علی شاہ کیا سیاسی فائدے اٹھاتا ہے۔" وہ سانس بھرتا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"کئی بار فون آ چکے ہیں۔ کہتا ہے وزیر اطلاعات بنا دوں گا کیا خیال ہے بن جاؤں۔" اس نے ولید کو دیکھا' جس پر ولید نے اس کی شرارتی مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا اور کندھے اچکا دیئے۔

"لگ جاؤ تم بھی اسی لائن پر جس پر کسی اور کو بہر حال لگنا ہے۔"

اور جواباً سکندر کا قہقہہ گونج اٹھا۔دوسرے ہی پل وہ قدرے ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"آں' ہاں' یار! کبھی کبھی سوچتا ہوں یہ دنیا کیا ہے ایک طرف زندگی رقص میں ہے' ایک طرف ٹھہری ہوئی' منجمد' لوہے کی مانند ایک ایک پل کو توانائی خرچ کر کے گزارنا پڑتا ہے۔بس ذرا ان کی حمایت میں دو لفظ لکھ دو بادشاہ کی طرح منہ اشرفیوں سے بھر دیں گے۔منٹوں میں سارے مسائل حل کر کے رکھ دیں گے اور کچھ خلاف لکھ دو تو آسان زندگی کو مشکل کر کے رکھ دیتے ہیں۔

آہ' ہا بہت مشکل ہے نفس کی لگا میں کھینچ کر رکھنا بہت مشکل ہے ولید!

نفس کو آنچ پر اور وہ بھی عمر بھر رکھنا

بڑا محال ہے ہستی کو معتبر رکھنا

"کیا بات ہے تھک گئے ابھی سے جبکہ تم نے اپنے قیمتی ماہ و سال امید کی لو کو بڑھانے میں گزارے ہیں۔ تمہیں تو ابھی یاسیت کے اندھیرے کو کاٹنے کا کام کرنا ہے اور تم..." ولید نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ لہجے میں خود بخود ہلکی چبھن در آئی تھی جیسے اسے سکندر کے لہجے میں یہ شکستہ سی لہر کچھ بھائی نہیں تھی۔

سکندر نے موندی پلکیں کھول کر اس کی طرف دیکھا کچھ دیر اسی سنجیدگی سے دیکھتا رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ "اجتماعی اور غیر ذاتی معاملوں کے تعلق کی بات الگ ہے' اس جگہ میں اب بھی پرامید ہو کر لکھنا چاہتا ہوں مگر میں اپنے ذاتی معاملات میں اب بہت زیادہ ناامید ہوتا جا رہا ہوں۔"

اس کا لہجہ اور بھی دھیما ہو گیا اور نگاہیں کین کے سوراخوں والی میز پر ٹھہر گئیں۔ وہ اس کے سوراخوں میں بائیک کی چابی گھمانے لگا۔

"کیا بات ہے سکندر! یہ آج اتنے اداس اور مایوس کیوں لگ رہے ہو۔ کوئی فنانشل مسئلہ ہے۔" ولید بے حد تشویش سے اب اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہوں' معاشی مسئلہ کب نہیں ہوتا ہم جیسوں کے لیے۔" وہ سر اٹھا کر ہولے سے مسکرایا جیسے خود پر ہنس رہا ہو عجب خود استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔

"نادیہ کی شادی کے لیے پریشان ہو۔"

"ہوں۔" وہ چونکا پھر گہری سانس بھری۔

"نہیں یار! بس یونہی کبھی ذہن بہک جاتا ہے تو چھوٹے چھوٹے مسائل جیسے ہر دیوار سے سانپ کی طرح منہ کھولے نکل آتے ہیں۔ نظریں چرا لیں تو بڑے بڑے مسائل بھی گم ہو جاتے ہیں دراصل نومی کی طرف سے بڑا پریشان ہوں۔ آج کل عجیب و غریب نوکریاں کرتا پھرتا ہے۔"

اس نے چابی میز پر پھینکی اور دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے رکھ کر ڈھیلے انداز میں کرسی سے ٹیک لگا لی۔

"کیوں عجیب و غریب کی کیا بات ہے' ٹھیک ٹھاک بروکر بن گیا ہے۔ ٹھیک ہے یہ ہوائی روزی ہے مگر ہے تو حلال راستہ۔ کرنے دو' اسے اپنے شوق پورے۔ ہو سکتا ہے اسی میں اللہ برکت دے اور اس بے وقوف کے خواب بھی پورے ہو جائیں۔"

”خواب ہا خواب۔“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

صاحبو! خواب پرندوں کی طرح ہوتے ہیں

چھونا چاہو تو یہ اڑ جاتے ہیں

اور پھر ہاتھ نہیں آتے

اڑتی خوشبو کی طرح قید نہیں ہو سکتے

کبھی منزل، کبھی رستوں کی طرح ہوتے ہیں

صاحبو! خواب پرندوں کی طرح ہوتے ہیں

ولید نے سوچا وہ شاید واقعی بہک گیا ہے تاہم اس نے اس کے اس خوب صورت تسلسل کو توڑا نہیں بلکہ دلچسپی اور دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھنے لگا جبکہ وہ اسی کھوئی کھوئی کیفیت میں جاری رہا۔

کس قدر رنگ بہم ہوں تو بنے گل دستہ

ایک لمحے میں بکھر جائیں کسی بات پہ وہ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

آنکھ جھپکیں تو پھسل جائیں وہیں ہاتھوں سے

گمشدہ آگ کے شعلوں کی طرح ہوتے ہیں

صاحبو! خواب مکانوں کی طرح ہوتے ہیں

بولتے بولتے یکدم اس کی نظر ولید پر پڑی تو اسے مکمل دلچسپی سے اپنی طرف ہی متوجہ دیکھ کر جھینپ کر ہنس پڑا۔

”تم سوچ رہے ہو گے میں بہک گیا ہوں۔“

”ہاں ثبوت تو پیش کر رہے ہو۔“ ولید نے ایک گہری سانس کھینچی پھر چونکتے ہوئے جیسے کچھ یاد آنے پر بولا۔ ”ارے ہاں خواب پر مجھے یاد آیا میں نے رات بڑا عجیب وغریب خواب دیکھا تھا۔“

”خدا خیر کرے یعنی تم بھی خواب دیکھتے ہو۔“ سکندر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھوٹی تو اس نے بھنویں اچکا کر اسے گھورا۔

''کیوں؟ میرے خواب دیکھنے پر پابندی ہے کیا' یوں بھی خواب نہ دیکھنے والا کہتے ہیں نیم انسان ہوتا ہے اور۔''

''اور تم نیم انسان کہلانا کسی طور پسند نہیں کرو گے۔'' وہ مسکرادیا اور لاپرواہی سے کندھے اچکا کر سامنے کے درخت پر نظریں مرکوز کر دیں۔

''میں ہی کیا کوئی بھی ''نیم انسان'' کہلانا کسی طور پسند نہیں کرتا۔ خواب ہی تو ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں... اینی وے۔'' اس نے جیسے کسی خیال کو سر سے جھٹک کر گہری سانس بھری اور سکندر کی طرف دیکھا۔

''میں جاگتے میں دیکھنے والے خواب کی بات نہیں کر رہا تھا۔ نیند والے خواب کی بات کر رہا ہوں۔ یار سکندر! کچھ عجیب ساخواب دیکھا تھا حالانکہ اتنے برس گزر گئے مجھے یاد نہیں پڑتا میں نے کبھی کوئی خواب دیکھا ہو۔''

''چچ' چچ اس کا مطلب ہے تم ابھی تک اتنی بڑی سعادت سے محروم تھے۔'' سکندر درمیان میں لقمہ دینے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔ وہ ہولے سے مسکرادیا۔

''پتہ نہیں میں اور بھی کن کن سعادتوں سے محروم ہوں۔ اچھا چھوڑو اس ذکر کو تم کون سے خوابوں کی تعبیر جانتے ہو کہ میرے خواب کی تعبیر بتاؤ گے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا تو پکا پروگرام ہے نا مرحوم شاہ صاحب کی برسی میں جانے کا۔''

''اوئے ہوئے مرحوم شاہ صاحب... کس قدر احترام سے پکارے جا رہے ہیں۔''

''سکندر! بی سیریس۔'' اس نے ہاتھ کا مکا بنا کر اسے ڈرایا۔ تب اس نے ہاتھ اٹھا کر مسکراہٹ ہونٹوں پر روکتے ہوئے اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا پھر گہری سانس بھر کر بولا۔

''میرا تو خیال تھا تم ان خوابوں کا ذکر کرو گے' جن میں مجھے ابھی تک شریک نہیں کیا۔'' اس کا لہجہ شرارتی تھا اور جس طرف اشارہ تھا ولید حسن سمجھ رہا تھا۔ تاہم ضبط کرتے ہوئے اسے ایک ٹک گھورتے ہوئے بولا۔

''مثلاً کن خوابوں کا ذکر۔'' اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا پھر اس کی نظریں کانچ کے سلائڈ ڈور کی طرف گئیں جہاں سے شہرینہ' تانیہ کے ہمراہ ٹرالی کھینچتی ہوئی آ رہی تھی۔

''بھئی کسی ماہ وش' پری وش کے خواب۔''

"اچھا وہ بھلا کیسے ہوتے ہیں۔" وہ گہری سانس بھر کر قطعی انجان بن گیا۔

جواباً سکندر نے اسے سر سے پیر تک جانچتی نظروں سے دیکھا۔ "بڑے شرم کی بات ہے حسینوں' مہ جبینوں کے ساتھ ڈنر اور لنچ تناول فرمائے جاتے ہیں اور فرمایا جارہا ہے وہ کیسے ہوتے ہیں۔" سکندر نے متاسفانہ انداز میں اسے گھورا۔ اور گہری سانس بھرتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"پردہ داری تو خود اپنا بھرم کھولتی ہے۔"

"سکندر کسی دن پٹ جاؤ گے میرے ہاتھوں۔" اس نے ٹیبل سے اس کی بائیک کی چابی اٹھائی اور اس پر اچھال دی جسے اس نے فوراً سے پیشتر کیچ کر لیا۔ چابی گو کہ بے ضرر اور چھوٹی تھی مگر اس کے

ساتھ لٹکتی چین خاصی وزنی تھی۔

"تم اس قدر لچر اور فضول گفتگو بھی کر سکتے ہو آج پتہ چلا۔" وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے اب دیکھ رہا تھا جس کا اس پر مطلق اثر نہ ہو رہا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس سے بھی زیادہ لچر اور فضول گفتگو کر سکتا ہوں اگر سننا چاہو تو۔"

"یہ کم از کم مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ طنز سے ہنسا۔ سکندر یونہی کرسی سے پشت ٹکائے ٹکائے آنکھوں میں شرارت بھر کر اسے دیکھتا رہا۔

لاکھ پردوں میں رہوں بھید مرے کھولتی ہے

شاعری سچ بولتی ہے

وہ ولید کے چہرے پر اڈنے والی سرخی سے محظوظ ہو رہا تھا سو جاری رہا۔

یہ بھی کیا بات کہ چھپ چھپ کے تجھے پیار کروں

گر کوئی پوچھ ہی بیٹھے تو میں انکار کروں

وقت کی بات کو دنیا کی نظر تولتی ہے

شاعری سچ بولتی ہے

شہرینہ ٹرالی کے ساتھ قریب آچکی تھی اور سکندر کے یہ شرارتی الفاظ اس کی سماعت میں اتر کر اس کے دل پر یوں گرے جیسے کوئی ساکت جھیل کی سطح پر اٹھا اٹھا کر کنکر پھینکنے لگے اور سطح منتشر ہو جائے اس نے ٹرالی سے مگ اٹھاتے ہوئے یونہی ولید کی طرف دیکھا مگر دوسرے پل بوکھلا کر جلدی سے جھکا بھی دیا وہ اسی طرف انہماک سے دیکھ رہا تھا۔

دراصل وہ سکندر کی بکواس کو نظرانداز کرنے کے لیے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ پتہ نہیں اس نے شہرینہ کی بوکھلاہٹ اور انگلیوں کی کپکپاہٹ کو محسوس کیا بھی یا نہیں اپنی ہی دھن میں اس نے اس کے ہاتھ سے چائے سے بھرا مگ تھام لیا مگر اس کی نظروں سے شہرینہ کے ہاتھ کی نازک انگلی میں چمکتی ہیروں کی انگوٹھی مخفی نہ رہ سکی تھی تاہم اس کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر رقم نہ ہوا وہ تانیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"تمہارے بھائی نے کیا ناشتے میں شاعری کو گھول کر پیا تھا یا اشعار کا جیم کھایا تھا۔"

تانیہ بے چاری سٹپٹا کر رہ گئی' وہ فوری طور پر سمجھ ہی نہ سکی جبکہ سکندر کا قہقہہ بلند ہو گیا۔ وہ ٹرالی سے مگ اٹھا کر بس ولید کو دیکھ کر رہ گیا۔ پھر اطمینان سے کپ لبوں سے لگا یا ہلکی سی

چسکی بھری پھر شہرینہ کی طرف دیکھا جبکہ ولید بھی ایک گھونٹ بھرنے کے بعد اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"کیا کسی حلوائی سے بنوائی ہے چائے؟ یا شکر کی بہتات ہو گئی ہے؟"

"کیا ہوا۔" وہ درمیانی میز پر اسنیکس کی پلیٹیں رکھتے ہوئے چونکی پھر مسکرائی۔ "حلوائی سے تو خیر نہیں بنوائی مگر اپنی مونا بھابی کم ہیں کیا' بڑی محبت احترام و عقیدت سے بنائی ہے انہوں نے۔"

وہ سمجھ تو گئی ان دونوں کے چہرے دیکھ کر کہ چائے میں شکر یقیناً زیادہ ہو گئی ہے۔ پھر اپنا مگ اٹھا کر ایک گھونٹ بھر کر پیا تو گویا تصدیق ہو گئی۔

"کچھ زیادہ ہی عقیدت و احترام سے بنا ڈالی ہے۔" سکندر کھانسا۔

"دراصل ہماری مونا بھابی ہیں نا وہ غلطی سے شوگر مل کے مالک کی دختر نیک اختر ہیں۔ ان کے والد بزرگوار نے رخصتی کے وقت ان کے دوپٹے کے پلو میں یہ تاکید باندھی تھی کہ بیٹی شکر کی تم بالکل پرواہ مت کرنا' چاہے زبان میٹھی رکھو نہ رکھو' میٹھی مسکراہٹ سے کام لو نہ

لو بس شکر سے جی بھر کر کام لو دل کھول کر خرچ کرو۔'' ولید کچھ اس سنجیدگی سے کہہ رہا تھا کہ وہ سب ہی بے اختیار ہنسنے لگے۔

''دراصل وسیم بھائی کو میٹھی چائے پسند ہے' وہ چائے سے زیادہ اسے شربت کے طور پر پیتے ہیں۔'' شہرینہ ہنسی روک کر بولی۔

''بے چاری ابھی تک وہ معدے سے دل میں پہنچنے کا راستہ اپنائے ہوئے ہیں حالانکہ سیدھا سیدھا دل پہلے آتا ہے۔''

''کیا باتیں ہو رہی ہیں۔'' مونا بھابی بھی اسی طرف چلی آئیں۔ کچھ باتیں ان کے کانوں میں پڑ چکی تھیں۔ ولید کا آخری جملہ بھی انہوں نے بخوبی سنا مگر سمجھنے سے قاصر رہیں کہ اصل موضوع کیا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

''یہ چائے آپ نے بے حد عمدہ بنائی ہے اور اگر اسی طرح عمدگی سے بناتی رہیں تو آئندہ دو سالوں کے اندر اندر وسیم بھائی کو دوسری شادی ذیابیطس سپیشلسٹ سے کرنی ہو گی تا کہ توازن رہے۔''

ولید نے چائے کی طرف اشارہ کیا تو وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئیں۔

''کیا بہت میٹھی ہو گئی ہے۔'' انہوں نے کیٹل کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا گویا شکر ڈھونڈنی چاہی۔

''نہیں اتنی زیادہ بھی نہیں ہے بس شربت اور چائے کا فرق ختم ہو گیا ہے۔'' اس نے بلا تامل تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

تانیہ اور سکندر اس چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہو کر مسکرائے جا رہے تھے۔

''دراصل یہ وسیم بھائی کو اس لیے اتنی میٹھی میٹھی چائے پلواتی ہیں تا کہ وہ سر سے پیر تک میٹھے ہو کر ان سے شہد آگیں' سوری شکر آگیں لہجے میں باتیں کریں۔'' شہرینہ کے شریر جملے پر بھابی جھینپ گئیں۔ ان کے چہرے پر سرخی سمٹ آئی اور سب کی دبی دبی مسکراہٹوں نے انہیں اور بھی خجل کر ڈالا۔

''بدتمیز لڑکی! میں نے جان کر تو اتنی شکر نہیں ڈالی' وہ تو بس... لاؤنج میں خود پی کر دیکھتی ہوں۔ یوں بھی تم لوگ رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہو۔'' انہوں نے شہرینہ کا مگ اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا اور پینے لگیں ایک گھونٹ لینے کے بعد شرمندہ سی ہو گئیں تاہم چہرے کے نارمل تاثرات رکھتے ہوئے بولیں۔

’’اب ایسی زیادہ میٹھی بھی نہیں ہے‘ اتنی تو ہر باذوق پیتا ہی ہے۔‘‘

’’مگر یہاں کوئی وسیم بھائی جتنا باذوق موجود نہیں ہے۔‘‘ سکندر نے بے ساختہ کہا۔

’’کیا کیا جائے وسیم کی تو مجبوری ہے سسر کی شوگر مل ہے‘ اب وہ بھی استعمال ترک کر دے گا تو کاروبار تو ٹھپ ہو ہی جانا ہے۔‘‘

ولید کی بات پر بھابی نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

’’تمہارا کیا خیال ہے میرے باپ کی مل تم لوگوں سے چل رہی ہے۔‘‘

’’نہیں نہیں یہ میں نے کب کہا ہے۔‘‘ وہ جلدی سے سر نفی میں ہلانے لگا۔

’’ہم میں اتنے ایثار اور قربانی کی سکت کہاں‘ یہ تو وسیم بھائی ہی ہیں۔ ماشاءاللہ تن تنہا یہ بوجھ اٹھائے ہوئے۔‘‘

’’بڑے بدتمیز ہو۔‘‘ بھابی بری طرح کھسیا گئیں پھر یکدم مذاق بھول کر سنجیدگی سے بولیں۔ ’’آپ لوگ ایسا کریں یہ سنیکس وغیرہ کھائیں تب تک میں دوسری چائے بنا کر لاتی ہوں۔‘‘ وہ کرسی دھکیل کر اٹھ گئیں مگر سکندر جلدی سے بولا۔

’’ارے نہیں بھابی! ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ اچھی خاصی چائے ہے بس میٹھی ہے تو کیا ہوا‘ نمکین تو نہیں ہے نا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنس پڑا پھر چائے کا مگ رکھ کر ریسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر بولا۔

’’آپ تکلف رہنے دیجئے پھر کبھی سہی‘ ابھی مجھے جلدی ہے۔‘‘

’’کیوں کہاں جانا ہے۔‘‘ ولید نے چونک کر اسے دیکھا۔

’’فی الحال تو گھر جاؤں گا‘ وہاں سے نہا دھو کر اپنے پیر صاحب کی طرف جانا ہے۔‘‘ اس نے سابقہ ایم این اے کی طرف اشارہ کیا اور ولید کی طرف شرارتی انداز میں آنکھ دبائی۔

’’ہم غریب صحافی لوگوں کو انوائیٹ کیا ہے اپنے محل نما گھر میں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے تانیہ کو بھی اٹھنے کا کا اشارہ کیا۔

’’اوہو تو یہ عیش ہیں آپ لوگوں کے۔‘‘ مونا بھابی مسکرائیں اور رشک سے دیکھنے لگیں جس کے جواب میں سکندر کے منہ سے گہری سانس برآمد ہو گئی۔

”عیش نہیں ہیں محترم بھابی ! یہ مستقل درد سری ہے‘ چند نوالوں کے عوض دو گھنٹے مسلسل ناقابل برداشت باتیں سننا پڑتی ہیں اور ان باکمال بیانوں کے کارنامے جو انہوں نے کبھی انجام ہی نہیں دیئے ہوتے نہ کبھی دیں گے‘ ان کے منہ سے سن سن کر دماغ کی رگیں تن کر پھٹتے پھٹتے بچتی ہیں۔ بقول غالب۔“

ہمیں کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اس نے پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈی قدرے طویل سانس کھینچی پھر خود ہی ہنس پڑا اور کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ ”عیش تو آپ کے دیور صاحب کے ہیں جب چاہا گوٹھ نکل گئے تفریحاً۔“ اس نے معنی خیز تبسم کے ساتھ ولید کو دیکھا مگر اس نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ صرف اسے دیکھتے ہوئے خود بھی اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

تانیہ بھی چل دی جبکہ مونا بھابی بھی اٹھ کر اندر چل دیں۔ بس شہرینہ ہی اکیلی بیٹھی رہ گئی۔ سکندر کے آخری جملے نے اس کے اعصاب پر عجیب سی ضرب لگائی تھی۔

اس کی معنی خیز... مسکراہٹ نے اس کے دل کو ہولے سے مسلا تھا۔

وہ بھلا ولید کو گائوں کے نام سے کیوں چھیڑ کر گیا تھا گو کہ یکدم یوں مضطرب ہو جانے کی کوئی بنیاد نہیں تھی مگر جب کوئی خوب صورت جذبہ دل کی سرزمین پر اگ آئے تو ساتھ ہی واہموں اور خدشوں کی جھاڑیاں بھی اگ آتی ہیں۔ ”محبت“ کبھی تنہا نہیں آتی‘ خدشوں کی آہٹیں اسے تنہا کسی دل میں جمنے بھی نہیں دیتیں۔ وہ چائے کے خالی مگ کو اٹھا اٹھا کر ٹرالی میں ترتیب سے رکھتی گئی مگر ذہن بے ترتیب ہوا جا رہا تھا۔ اسے کتنی دیر ہو گئی احساس تک نہیں ہوا کہ ولید آ کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے درمیان نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ یکدم چونکی اور مگ پر جمی انگلیاں لرز گئیں جب کہ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے ہر کپ اپنی جگہ درست رکھا ہوا ہے۔ مزید ترتیب سے بے ترتیب ہو جائے گا۔“ وہ اس کی غائب دماغی کو واضح طور پر محسوس کر چکا تھا۔ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی پھر لب دانتوں تلے دبا کر پلکیں جھپک لیں اور یوں چور سی بن گئی جیسے وہ اس کے دل میں جھانک کر اس کے محسوسات جان چکا ہو۔ اس کی سوچوں کو پڑھ چکا ہو۔ حالانکہ ایسا بھی نہیں تھا۔ وہ بہرحال اس کے دل میں ابھرتے واہموں اور خدشوں سے لاعلم تھا۔

"چلے گئے سکندر بھائی۔" وہ بے مقصد مسکرانے لگی اور اس وقت خود کو انتہائی چغد خیال کرنے لگی۔ شاید یہ اس کی محویت کا قصور تھا کہ وہ ایک ٹک مسلسل اسے دیکھ رہا تھا اور وہ بے نیاز بن کر بھی بے نیاز نہیں ہو پا رہی تھی۔ جبکہ ولید حسن کی نگاہیں اب اس کے خوبصورت ہاتھ کی انگلی میں چمکتی ہیرے کی انگوٹھی کی طرف ہو گئیں۔ پھر وہ عجیب سے انداز میں دھیمے سے مسکرایا اور سگریٹ گھاس پر پھینک کر پیر سے مسلا۔ اس کی سمت جھک کر یکدم اس کا وہ صاف ستھرا نرم ملائم ہاتھ پکڑ لیا۔

ایک بجلی سی کوندی تھی شہرینہ کے دل پر وہ سر اٹھا کر حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی جبکہ وہ اس کے ہاتھ پر نگاہیں مرکوز کیے ہوئے بولا۔

"اچانک تمہیں 'یہ' پہننے کا خیال کیسے آ گیا۔"

پتہ نہیں وہ استفسار کر رہا تھا' یا طنز کر رہا تھا وہ سمجھ نہ پائی۔ یوں بھی کچھ سمجھنے کے تو وہ اس وقت قابل بھی نہیں تھی۔ اسے تو لگ رہا تھا کوئی طوفان اس کے وجود کو چھوتا ہوا گزرا ہے اس کی نگاہیں اپنے ہاتھ پر جمے' اس کے ہاتھ پر جم گئیں۔ اس کی مضبوط انگلیوں کے درمیان

اس کا ہاتھ کسی حد تک چھپا ہوا تھا مگر اس میں ہونے والی لرزش اور ارتعاش وہ خود محسوس کر رہی تھی۔

ولید کچھ دیر اس کا یہ ہاتھ تھامے دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں وہ ہاتھ کو دیکھ رہا تھا یا انگوٹھی کو پھر نرمی سے ہاتھ چھوڑ کر یکدم کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

شہرینہ کو لگا جیسے کوئی طوفان اس کے وجود کو چھوتا ہوا گزر گیا ہو۔ اس کی نگاہیں اپنے ہاتھ پر جم گئیں جن میں خفیف سی لرزش اب بھی باقی تھی۔

"آغا جی کی چوائس تو واقعی بہت عمدہ ہے۔ کمال ہے میں نے تو اب غور سے دیکھا ہے۔" وہ ایک گہری دبی دبی سانس بھر کر دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس کا لہجہ سادہ سا تھا تاہم اس نے وضاحت طلب نظروں سے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس قسم کی وضاحت چاہ رہی تھی مگر وہ بے نیاز سا جھک کر ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اور چابی اٹھا کر پھر پلٹ کر اندر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اور اس نے بس دور تک اس کے حاوی ہو جانے والے سراپے کو دیکھا پھر عجیب کھنچے کھنچے اعصاب کے ساتھ کرسی کی پشت سے لگ کر گہری سانس بھری۔ بس یونہی دل لمحہ بھر کو خوش فہم ہوا تھا اب ہنسی آئی تھی۔

’ٹھیک ہی کہا ہے کسی نے کہ صحرا ہی انسان کو سراب میں مبتلا نہیں کرتا ہے بلکہ آپ ہر جگہ اور کسی بھی لمحے سراب کے جال میں مقید ہو سکتے ہیں۔“ اس نے سوچا وہ یہ تعریف صرف ”انگوٹھی“ کے حوالے سے ہی کر رہا تھا اور نہ بھی کر رہا ہو تو۔ شیکسپیئر کے اسی قول کے مطابق دنیا ایک سٹیج ہے تو پھر درست ہی تھا۔ وہ بھی ایک اعلیٰ درجے کا کردار تھا اور ہو سکتا ہے اپنا کردار ادا کر رہا ہو۔

اس کی سوچوں میں اداسی در آئی اور اپنی ان سوچوں اور اداسی سے وہ یکدم خفا سی ہو گئی۔ آخر وہ اس قدر منفی انداز میں ہی کیوں سوچتی ہے؟ ضروری تو نہیں کہ محبت میں اندیشوں کو اتنی اہمیت دے دی جائے کہ وہ چاروں جانب سے آپ کو گھیر کر زخمی کرنے لگیں۔ انہیں تو اگتے ہی جڑ سے کاٹ دینا چاہیے نہ کہ ان کی آبیاری کی جائے۔

اسے آغا جی کی بات یاد آ گئی۔ ”محبت کی کشتی میں پہلا سوراخ شک کا ہوتا ہے۔“ وہ سر جھٹک کر اپنے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے چمکنے لگیں۔ ایک دھیمی سحر انگیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل کر منجمد ہو گئی۔

”واقعی آغا جی کی چوائس بہت عمدہ ہے۔“ اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا اور سر دوبارہ کرسی کی پشت سے لگا کر آنکھیں موند لیں۔

X...X...X

نومی کی سمجھ میں اب آ گیا تھا کہ دولت حاصل کرنے ‘امیر کبیر بننے کے اور پر آسائش زندگی حاصل کرنے کے کون سے طریقے ہیں۔ کیا راستے ہیں‘ اور کہاں کہاں ان پر عمل کرنا ہے۔ اور دولت کے حصول‘ بے حساب دولت کے ڈھیر پر بیٹھنے کی سرکش زہریلی خواہشات نے اسے عقل‘ شعور اور ضمیر کی آنکھ بند کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا ڈر خوف بہت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ اس کا سہرہ بھی یاسر کے

سر جاتا تھا۔

اس نے سوچا اس نے آج تک جو کچھ کتابوں میں پڑھا۔ درس گاہوں میں پڑھا اس کے کچھ کام نہ آیا مگر صرف سال بھر کی دوستی نے اسے کیا سے کیا سکھا ڈالا۔ اس کے اندر طاقتور ہونے کا احساس بیدار کر دیا۔ یاسر کے بقول "آج زندہ رہنے کے لیے طاقتور ہونا ضروری ہے۔"

اور وہ بس طاقتور ہونا چاہتا تھا۔ اتنا طاقتور کہ اسے کوئی نہ پچھاڑ سکے۔ ان طاقتور لوگوں کی طرح جو ملک میں دھاندلی مچاتے ہیں' اپنی مرضی سے انسانوں کو ہانکتے ہیں مگر ان کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ان کے بچے جب چاہیں یورپ کے ٹور زیوں کرنے چلے جاتے ہیں جیسے کوئی اندرون ملک گھوم آئے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک۔ ان کی بیویاں یورپ کے مہنگے شاپنگ سنٹرز میں شاپنگ کرتی پھرتی ہیں۔ یہ سارے اور اس جیسے دوسرے امراء اس کے آئیڈیل بن گئے تھے۔ اب اس نے جو جوا کھیلا تھا گو کہ وہ بے یقینی کے صحرا سے گزرتا تھا مگر اس کے بعد یقین کا نخلستان تھا۔

کامیابی

عزت

دولت اس کی منزل ہو گی اور منزل کا امکان بہت روشن اور واضح ہو چکا تھا۔

اسے تو صرف یاسر کے اشاروں پر چلنا تھا کون سا عقل استعمال کرنی تھی اور وہ "عقل کے استعمال نہ کرنے" پر خوش تھا نہ "اشاروں پر چلنے پر" وہ تو بس بعد میں ہاتھ آنے والی رقم پر خوش تھا بلکہ خوشی کا لفظ تو اسے بہت چھوٹا لگتا تھا وہ بے پناہ بے حد و حساب مسرور تھا۔

آج یاسر کے ساتھ ایک دو کام نمٹا کر وہ آ رہا تھا کہ گلی سے پہلے والے روڈ پر بڑا سا شامیانہ لگا ہوا دکھائی دیا جو یقیناً شادی کی تقریب کے سلسلے میں تھا۔ وہ تو آج کل اپنے محلے سے بھی بے نیاز ہو چکا تھا۔ ذرا حیرت تو ہوئی کہ آخر یہ تقریب کس کے گھر منعقد ہے پھر لاپرواہی سے کندھے جھٹک کر اندر کی گلیوں سے گزر کر گھر جانے لگا کہ سید صاحب کے گھر پر نظر پڑی۔ بڑی بڑی روشنیاں جگمگا رہی تھیں مگر وہ روشنیوں سے زیادہ اس خیرہ کن حسن کو دیکھ کر ٹھٹکا تھا جو گھر کے دروازے سے نکل کر شامیانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

وہ عظمیٰ تھی فان کلر کا لہنگا سوٹ زیب تن کیے' دونوں کلائیوں میں میچنگ کی چوڑیاں چھنک رہی تھیں۔ ساتھ ہی موتیے کے کنگن بھی تھے۔ گلی میں گندگی کی وجہ سے لہنگا ذرا سا اٹھا کر چل رہی تھی جس سے اس کی نازک سینڈلوں میں مقید مہندی سے سجے پیر دکھائی

دے رہے تھے۔ گولڈن پازیب بھی نظر آ رہی تھی جس کے چھوٹے چھوٹے گھنگرو ہلکی آواز پیدا کر رہے تھے۔

اپنی دھن میں چلتی ہوئی وہ نومی کے یکدم سامنے آ جانے پر ٹھٹکی تھی۔ وہ بڑی آہستگی سے اس کی راہ میں آ گیا تھا اور بے حد سراہتی نگاہوں سے اس کے سراپے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے ہی دوپٹہ میں اچھی طرح لپٹی ہوئی تھی کچھ نروس سی ہو کر اور بھی سمٹنے لگی۔

”سنگھار بچاری دلہن کے لیے بھی رہنے دیا ہے یا سبھی کر ڈالا ہے تم نے؟“

وہ بڑی بے تکلفی سے گویا ہوا تھا اور وہ جو کبھی اتنی بے تکلف نہ تھی اس سے‘ یکدم سٹپٹا گئی۔ ادھر ادھر دیکھا گلی میں سناٹا تھا۔ مگر سامنے شامیانے میں رونق لگی ہوئی تھی اور خود اس کے گھر سے بھی کوئی نکل سکتا تھا اس لیے کہ شامیانے میں آنا جانا جاری تھا۔

وہ اسے بڑی والہانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا‘ اس کے سراپے کو تک رہا تھا بلکہ جذب کر رہا تھا۔

”تت‘ تانیہ کو ساتھ نہیں لائے‘ میرا مطلب ہے آئی نہیں تانیہ ابھی تک۔“ وہ اپنے حواس سنبھال کر یہی کہہ پائی۔

”کیوں میں کیوں لاؤں‘ میں کون سا دعوت میں آیا تھا۔ میں تو اپنی جاب سے واپس آ رہا تھا۔ شامیانے کی وجہ سے گلی بدل کر آنا پڑا۔ سارا راستہ ہی تم لوگوں نے بند جو کر رکھا ہے۔ مجھے کوئی اور راستہ ملا ہی نہیں۔ اب کیا کیا جائے کہ میرا راستہ ہی یہاں سے ہو کر گزرتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ بڑے معنی خیز انداز میں ہنس پڑا۔ پھر اس سے بے تکلفانہ انداز میں شکایت کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تو تم نے یوں بھی انوائٹ ہی نہیں کیا۔“ وہ شاید ان لمحات کو طول دینا چاہتا تھا۔ اس کے دل موہ لینے والے سراپے سے نگاہ و دل سیراب کرنا چاہتا تھا۔

”کیوں؟ انوائٹ کیوں نہیں کیا‘ کارڈ تو بھیجا ہے۔ آپ نے کھول کر پڑھا نہیں مع اہل و عیال لکھا ہوا ہے۔“ وہ سمجھ تو گئی کہ وہ فضول کی ہانک رہا تھا اور یوں اس کے چتون بھی ذرا بگڑ گئے۔ اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا اس کا یوں سرِ راہ روک کر بے تکلفانہ گفتگو کرنا۔

اس کی ناگواری قطعی واضح تھی مگر نومی کو ان باتوں کی پروا کب تھی کہ کوئی دیکھ لیتا‘ کوئی کہانی یکدم بن جاتی۔ بلکہ اسے تو ایسی کہانیاں بڑی دلچسپ لگتی تھیں۔ تاہم عظمیٰ یہ سب افورڈ

نہیں کر سکتی تھی محض لڑکی ہونے کے ناتے ہی نہیں اپنے حسب نسب' خاندانی شرافت کے پیش نظر بھی۔

''مگر میرا کارڈ تو علیحدہ نہیں تھا نا۔'' وہ کیا جتانا چاہ رہا تھا' وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

''کیوں آپ الگ ہیں کیا اپنے گھر والوں سے۔'' وہ قدرے تڑخ کر بولی تھی' اس کا خیال تھا وہ کھسیا کر ایک طرف ہو کر اب اپنی راہ لے گا مگر وہ تو اس جملے سے محظوظ ہو کر قدرے اس کی سمت جھکتے ہوئے مخمور دھیمے اور لو دیتے لہجے میں بولا۔

''کیا میری حیثیت الگ نہیں ہے۔''

اس کی پیشانی گرم ہو کر تپنے لگی۔ وہ اٹھی پلکیں تیزی سے جھکا گئی' اب کسی کے آجانے کے خوف سے زیادہ نومی کے انداز اور بولتی آنکھوں کا خوف حاوی ہو گیا تھا۔ اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ سائڈ سے ہو کر یوں سرعت سے بھاگی جیسے اب اگر رک گئی تو شاید پگھل کر پانی بن کر بہہ جائے گی۔

نومی ہنستے ہوئے ایڑیوں کے بل پلٹ کر اسے شامیانے کے داخلی حصے سے اندر گم ہوتے دیکھتا رہا پھر دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ گھر کی طرف چل دیا۔

X...X...X

وہ ابھی آفس سے اٹھنے ہی والا تھا کہ موبائل بج اٹھا۔ اس نے کار کی چابی میز سے اٹھانے کے ساتھ موبائل بھی اٹھا لیا۔ دوسری طرف فدا حسین تھا جو اپنے مخصوص لب و لہجے میں اس کی آواز پہچان کر بولا۔ ''سائیں کیسے ہو آپ؟''

وہ فدا حسین کو پہچان کر اٹھتے اٹھتے پھر چیئر دھکیل کر بیٹھ گیا اور چابی میز پر پھینکی۔

''جی فدا صاحب! کیسے یاد کر لیا۔ اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیے اور ادی شاہدہ کیسی ہیں؟'' وہ بھی آمنہ علی کی طرح غیر ارادی طور پر ادی کا لفظ استعمال کر گیا تھا۔

''ٹھیک ہیں۔ بڑا یاد کرتی ہیں وہ آپ کو۔ جب سے گئے ہیں آپ کی تعریفوں سے منہ بند نہیں ہوتا ان کا۔'' وہ شاید زیادہ ہی مبالغہ آرائی کر گیا۔ ولید کے لبوں کی تراش میں دھیمی مسکراہٹ لہرا گئی۔

''پھر تو آپ یقیناً جیلس ہوتے ہوں گے۔'' شگفتگی سے بولا تو فدا حسین کا چھت پھاڑ قہقہہ گونج اٹھا۔

"یہی تو خوبی ہے آپ کی سائیں کہ میں بالکل جیلسی فیل نہیں کرتا۔ آپ تعریف کے قابل ہیں تو وہ کرتی ہے نا بابا!" وہ لگاوٹ سے بولا۔

ولید نے ایک گہری سانس بھر کر موبائل کو ایک نظر گھورا پھر بولا۔ "یہ تو ان کا حسنِ نظر ہے' اینی وے آپ نے مجھ سے رابطہ کر لیا اچھا کیا' میں خود بھی آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔"

"بس سائیں سوچا اتنے دن ہو گئے ہیں۔ آپ تو پھر پلٹ کر آئے ہی نہیں میرے غریب خانے اور جو بقول آپ کے واقعی غریب خانہ ہی ہے۔"

فدا حسین اور اس قدر شگفتہ مزاج اسے ذرا جھٹکا تو لگا' تاہم وہ اس کی اس شگفتگی سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنس دیا۔

"میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔" وہ قطعاً شرمندہ نہ ہوتے ہوئے بولا۔ پھر یاد آنے پر بولا۔ "اوہ ہاں' آپ گوٹھ نہیں جا رہے' میرا خیال ہے اسی ہفتے تو مردان علی شاہ کے والد کی برسی ہے۔ جو خاصے بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے ذی مرتبہ لوگ مدعو ہیں پریس سمیت۔"

ولید کی بات سن کر فدا حسین کے لبوں سے ایک گہری سانس پھنکار کی طرح برآمد ہوئی۔ لمحے کے توقف کے بعد بولا تو ولید کو ایسا لگا جیسے کوئی زہر سے بھرا جام الٹ گیا ہو۔

"ہمارا وہاں کیا کام' ان عزت مآب اور ذی مرتبہ لوگوں میں۔ ہم چھوٹے اور کم حیثیت لوگوں سے ان کی عزت کیا بڑھ سکتی ہے۔ انہیں ہی مدعو کیا گیا ہو گا جن سے مفاد وابستہ ہو گا۔"

"تو کیا آپ کو انوائٹ نہیں کیا گیا؟" اس نے انتہائی حیرت سے دریافت کیا۔

"نہیں خیر' انوائٹ تو کیا گیا ہے۔" وہ یوں بولا جیسے اعترافِ جرم کر رہا ہو۔

"ایک بات کہوں فدا صاحب! ہے تو آپ کے ذاتی معاملات میں داخلت ہی مگر۔"

"نہیں' نہیں سائیں! آپ بولو۔" وہ جلدی سے بولا۔

"آپ وہاں نہ جا کر نادانی کا ثبوت دیں گے۔ دیکھئے عزت آپ کو ٹرے میں سجا کر پیش نہیں کی جائے گی' اسے حاصل کیجئے' اسے چھینئے کہ یہ آپ کا حق ہے اس طرح پیچھے ہٹ جانا تو

بزدلی ہے اور بزدل تو اپنے جائز حق سے بھی محروم رہتا ہے۔ آپ نے سنا نہیں زندگی بہادروں کے آگے گھٹنے ٹیکتی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" وہ خاصے سٹپٹائے انداز میں اور قدرے الجھ کر بولا تھا۔

"آپ کے خیال میں کیا مجھے جانا چاہیے۔"

"جی بالکل۔" ولید نے زور دے کر کہا۔ "آپ نہ جا کر ان کے لیے آسانیاں پیدا کر رہے ہیں۔ اس طرح تو وہ آہستہ آہستہ آپ کو بالکل سائیڈ لائن کر دیں گے اور آپ کا جو پیسوں کا مطالبہ ہے وہ بھی

از خود قصہ پارینہ ہو کر رہ جائے گا۔"

"خیر اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ میرے پاس اور بھی طریقے ہیں رقم نکلوانے کے۔" فدا حسین تڑخ کر اور قدرے رعونت سے بولا تھا۔ یہ وہی رعونت تھی جو عموماً ایک سطحی ذہن کے آدمی کے دماغ میں ہوتی ہے "عورت" کے حوالے سے اور وہ پھر شاید یہی جتانا چاہ رہا تھا اور اس پر اب تک اکڑ رہا تھا کہ مردان شاہ کی بیٹی اس کی بیوی تھی جسے وہ ذہنی اذیت دے کر اور روایتی حربے استعمال کر کے اپنا کام پورا کر سکتا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ولید ایک دو لمحے اس کی ذہنی پستی پر تاسف کرتا رہا پھر دھیرے سے بولا۔ "میرا خیال ہے دھونس اور دھمکی کے طریقے نا صرف آپ کی عزت کو خراب کر سکتے ہیں بلکہ آپ کے گھر کا سکون بھی برباد کر دیں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جو کام خوب صورتی سے ہو سکتا ہے اس میں بدصورتی کی آمیزش کی جائے۔"

وہ شائستگی سے ہی بولا تھا مگر فدا حسین بری طرح جھینپا تھا۔

"میں بھی کب چاہتا ہوں سائیں کہ میرے گھر کا سکون برباد ہو' مگر وہی لوگ اپنی بیٹی کے گھر کا سکون برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ خود ہی دیکھو نا' میرا مطالبہ ایسا کوئی ناجائز بھی نہیں ہے۔" وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"کیا کیا جائے فدا حسین صاحب کہ کچھ لوگ اولاد سے زیادہ دولت پر جان دیتے ہیں' میں تو سو فیصد متفق ہوں آپ سے۔ اسی لیے تو آپ سے مجھے ہمدردی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کے گھر کا ماحول خراب نہ ہو۔ آپ اپنے جائز حق سے محروم نہ رہیں اور میں تو کہتا ہوں فدا صاحب آپ کاروبار کرنے کا خیال چھوڑ دیں اور سیاست کے میدان میں آ جائیں جتنا نام

اور پیسہ سیاست میں ہے وہ بزنس میں نہیں۔ بزنس میں تو پیسہ ڈوبتا ہی ہے سیاست کے کاروبار میں کم از کم رقم نہیں ڈوبے گی بس نام ہی ڈوبتا ہے اور نام کا کیا ہے۔"

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔"

وہ شگفتگی کا سہارا لیتے ہوئے اپنا نقطہ نظر بھی واضح کر گیا اور فدا حسین کو نئی گائیڈ لائن پیش کی جس پر فدا حسین ہکا بکا رہ گیا پھر الجھن بھرے انداز میں بولا۔

"سیاست... مگر سیاست میں تو میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ہاں اس سے پہلے یار دوستوں نے بھی مجھے اس طرف دھکیلنے کی کوشش کی تھی مگر میں... نہ سائیں نہ' میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔" اس کے لہجے میں گھبراہٹ اتر آئی مگر اس گھبراہٹ میں بے لچک انکار بھی نہیں تھا جیسے وہ انکار محض اپنی خود اعتمادی کے فقدان کے باعث کر رہا ہو۔

"ارے فدا صاحب سب سے زیادہ نااہل ہی تو حکومت کرتے ہیں' بڑے بڑے اہل کار تو سیاست کے باہر صرف کڑھتے رہتے ہیں۔"

"مگر... مگر پھر بھی سائیں! یہ کوئی مذاق تو نہیں ہے نا۔" ولید زیر لب مسکراتے ہوئے گاڑی کی چابی سے میز کی سطح کھرچتے ہوئے ہلکی استہزائیہ سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"ہمارے یہاں بدقسمتی سے اب سیاست مذاق ہی بن کر رہ گئی ہے' مگر صرف اسی خاص طبقے کے لیے جبکہ عام طبقے کے لیے زندگی مذاق بن کر رہ گئی ہے۔ اینی وے آپ میری بات پر غور کیجئے بلکہ ہمت کیجئے' آپ تو ماشاءاللہ دیکھنے میں ہی سیاستدان لگتے ہیں اور پھر آپ کے اطراف کچھ ماحول بھی سیاسی ہی ہے تجربہ نہ سہی مشاہدہ تو آپ کا خاصا وسیع ہی ہو گا اس کھیل میں... میرا مطلب ہے سیاست میں۔"

"آپ نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے سائیں!"

"بس ذرا سی ہمت کیجئے' ذرا آگے تو آیئے پھر میں آپ کو سنبھال لوں گا۔"

"آ... آپ کیا... کیا مطلب؟"

جواباً ولید ہنس دیا جبکہ دل چاہ رہا تھا یہی موبائل فدا حسین کے خالی سر پر بجا دے' اس قدر احمق اور کوڑھ مغز شخص سے پہلی بار واسطہ پڑا تھا اس کا اور اس کی سمجھ میں اب آیا کہ بے وقوفوں پر بڑے بڑے فلاسفر جو باتیں کر گئے ہیں بالکل ٹھیک ہیں۔

حضرت علیؓ کے قول کے مطابق "دنیا کی سب سے بڑی غریبی بے عقلی ہے۔" اور اسے فدا حسین انتہائی غریب انسان ہی محسوس ہوا وہ ان لوگوں میں تھا جنہیں آپ ہر وقت بے

وقوف بنا سکتے ہیں‘ بہرحال اس کا خیال تھا دنیا میں توازن قائم رکھنے کے لیے یہ بھی ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔

"ایسا ہے فدا صاحب کہ یہ باتیں وقت طلب ہیں۔ اتنے دور بیٹھ کر کرنے میں کچھ مزا بھی نہیں ہے۔ ہم انشاءاللہ روبرو مل کر سوچتے ہیں میں خود آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔"

"کب؟ کہاں پر؟" وہ بے صبری سے بولا تو ولید نے بے ساختہ ہنسی کو دبانے کے لیے مائوتھ پیس پر انگلیاں رکھ لیں پھر بولا۔

"فدا صاحب! ٹھنڈا کر کے کھانے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔ آپ ابھی سے صبر اور استقامت کی عادت پیدا کیجئے یہ تو سیاست میں ناگزیر ہے۔" جواباً فدا حسین کی جھینپی جھینپی اور پھیکی ہنسی ریسیور میں بکھر گئی۔ فدا حسین سے رابطہ منقطع ہونے کے بعد بھی ولید کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر چیئر کو ہولے ہولے گھماتے ہوئے کسی خیال میں گم ہو گیا۔

چونکا اس وقت جب موبائل بج رہا تھا ایک گہری سانس بھر کر چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے موبائل اٹھانے کے ساتھ خود بھی کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"یس۔"

"ولید بھائی! اب آپ ہی سمجھائیے نا اس احمق لڑکی کو۔" دوسری طرف تانیہ کی آواز ابھری‘ اس نے جھک کر میز سے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کون سی احمق لڑکی کو۔"

"اوہو‘ کتنی احمق لڑکیوں کو جانتے ہیں آپ؟"

"سٹوپڈ لڑکی! میرا مطلب ہے‘ کس احمق لڑکی کی طرف اشارہ ہے‘ ایک تو تم ہو گئیں اور دوسری۔"

"جی دوسری کی ہی بات کر رہی ہوں اور میں احمق کب سے ہو گئی۔" وہ چلائی۔

"بھئی ظاہر ہے جو احمقوں سے دوستی کرتا ہے وہ سب سے زیادہ احمق ہوتا ہے۔" وہ بات کرتا ہوا آفس سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدم تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھنے لگے۔

"توبہ آپ سے کوئی نہیں جیت سکتا۔" تانیہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"کوشش بھی مت کرنا‘ اینی وے کیا مسئلہ در پیش ہے۔"

”مسئلہ‘ نہایت سنگین ہے۔ میں اس وقت آپ کے گھر سے ہی بات کر رہی ہوں اور شہری کے پاس ہی بیٹھی ہوں۔ سوری کھڑی ہوں۔“

”اوکے‘ اوکے‘ میں گھر ہی آ رہا ہوں‘ اب وہیں آ کر تمہارا سنگین مسئلہ سنوں گا۔“

اس کا رخ لفٹ سے نکل کر پارکنگ لاٹ کی طرف تھا۔ اس نے موبائل کا بٹن آف کر دیا۔ وہ جانتا تھا معاملہ کوئی خاص نہیں ہو گا۔ لڑکیوں کی نفسیات سے وہ اچھی طرح آگاہ تھا۔ چیونٹی بھی انہیں اچانک اندھیرے میں سانپ نظر آنے لگتی ہے اور اکثر تیز روشنی میں سامنے نظر آنے والی چیز بھی نظر نہیں آتی۔ اس کا خیال تھا عورت کی زیادہ تر پریشانیاں بلکہ مسائل جسے وہ سنگین کہتی ہے اس کے خود ساختہ پیدا کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لطیفے کی طرح کہ:

”میری بیوی اس قدر پریشان رہتی ہے کہ اس کے بال سفید ہو گئے ہیں۔“

”آپ کی بیوی! آخر اسے کیا غم یا پریشانی ہو سکتی ہے۔“

”بس یہی کہ وہ اپنے بالوں کو سنہرا رنگ کروائے یا سرخ رنگ۔“

تاہم اس کی یہ سوچ اور نظریہ آسودہ حال طبقے کی عورت کے لیے تھا۔

X...X...X

تانیہ ریسیور کریڈل پر ڈال کر پلٹی تو شہرینہ کشن گود میں دبائے اسے گھورے جا رہی تھی۔ اس کے پلٹتے ہی وہی کشن اس کی طرف اچھال دیا۔

”کس نے کہا تھا ولید کو فون کرو۔ اس کا اس معاملے سے کیا تعلق۔“ اسے تانیہ کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہا اور کچھ وہ جھنجھلا سی گئی تھی۔

”اس لیے کہ اب وہی تمہیں سیدھا کر سکتے ہیں۔“ تانیہ بے پروائی سے بولی اور اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے اسے قدرے ناراض نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کس قدر بدتمیز‘ وعدہ خلاف اور بے مروت لڑکی ہو مجھے تو آج پتہ چلا۔“

”میں عظمیٰ سے ایکس کیوز کر لوں گی۔“ وہ رخ پھیر کر بیٹھ گئی تانیہ نے اسے ایک ہاتھ جڑ دیا۔

"ایکسکیوز تو بعد میں کرو گی وعدہ خلافی تو ہو گئی نا۔اس بے چاری نے کتنے پیار سے تمہیں آنے کو کہا تھا۔وہ تو یہی سمجھے گی نا کہ دولت مند باپ کی بیٹی ہے بھلا ہم جیسے مڈل کلاس طبقے میں آکر ہماری تقاریب کیونکر اٹینڈ کرنے لگی۔"

"تانی، تانی! بدتمیز سٹوپڈ لڑکی!" اس نے جھٹکے سے رخ تانیہ کی طرف کیا اور کچھ مارنے کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔تانیہ حفظ ماتقدم کے تحت صوفے سے اٹھ کر دور کھڑی ہو گئی پھر وال کلاک پر نظر پڑی تو بولی۔

"دیکھو میں کب سے خوار ہو رہی ہوں تمہارے پیچھے۔ تمہیں بالکل احساس نہیں ہے نومی بھی آگیا ہے مجھے لینے۔وہ بیچارا الگ انتظار میں سوکھ رہا ہے۔کچھ احساس ہے تمہیں کہ نہیں۔تمہارا نخرہ ہے کہ ختم نہیں ہو رہا۔" وہ دوبارہ اس کے قریب آ بیٹھی پھر لجاجت سے بولی۔

"چلو نا شیری! مزہ آجائے گا عظمیٰ کی فیملی سے بھی مل لینا اور ذرا اپنا اوپینین بھی دینا نا۔"

"اوپینین تم نومی سے ہی لیتی رہنا۔" وہ ہنسی اور صوفے سے کھڑی ہو گئی پھر قدرے معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔"تانیہ پلیز یقین کرو میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا جانے کو۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

یہ کہہ کر وہ بالوں میں برش پھیرنے لگی پھر برش بے زار سے انداز میں پھینک کر صوفے پر پائوں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

"پتہ نہیں کیوں میں آج کل قنوطی ہوتی جا رہی ہوں۔میں خود اپنی یہ کیفیت سمجھ نہیں پائی کہ کبھی کبھی مجھے کیا ہو جاتا ہے۔" اس کی بھوری آنکھوں کے کانچ پر ایک بے زاری اور کچھ دھندلاہٹ سی سمٹ آئی تھی۔

"یہی تو وجہ معلوم کرنا چاہتی ہوں میں بھی کہ یہ یکایک تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ابھی پرسوں تک تو تم ٹھیک ٹھاک تھیں بلکہ عظمیٰ کے بھائی کی شادی میں نہ صرف جانے پر راضی تھیں بلکہ کپڑے تک منتخب کر لیے تھے۔" تانیہ نے اسے بغور دیکھا پھر کچھ سوچ کر معنی خیز تبسم کے ساتھ اس کی سمت جھکتے ہوئے بولی۔

موسمِ عشق کی آہٹ سے ہی ہر اک چیز بدل جاتی ہے

راتیں پاگل کر دیتی ہیں دن دیوانے ہو جاتے ہیں

تانیہ کی شرارتی ہنسی میں ایسی جھنکار تھی کہ وہ خواہ مخواہ بلش ہو کر رہ گئی۔اسے اپنی کانوں کی لوئیں تک گرم ہوتی محسوس ہونے لگیں۔"تم غلط سمجھ رہی ہو تانی کی بچی!" اس نے کشن اٹھا کر اس کے منہ پر پھینکا جسے اس نے سنبھال کر ایک طرف رکھ دیا۔

وہ تانیہ کو مارنے اٹھی کہ ٹھٹک گئی دروازے پر ولید ایستادہ تھا۔وہ سیدھا یہیں آیا تھا۔تانیہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گھوم کر دیکھا اور سنبھل گئی۔شہرینہ' ولید کو دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔اسے یہ خوف دامن گیر ہوا تھا کہ تانیہ کی بکواس اس کے کانوں میں تو نہیں پڑی مگر وہ کچھ اخذ نہ کر پائی کہ اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔

"ہوں' کیا سنگین مسئلہ درپیش ہے۔" وہ اندر چلا آیا۔شہرینہ نے لب بھینچ کر تانیہ کو گھورا مگر تانیہ اس سے بے نیاز ولید کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔"کل تک یہ عظمیٰ کے بھائی کی شادی میں جانے پر راضی تھی بلکہ وعدہ تک کر چکی تھی مگر آج یکا یک فیصلہ بدل دیا اس نے۔اب دیکھئے میں کب سے آئی ہوں۔اسے منا رہی ہوں' منتیں کر رہی ہوں مگر محترمہ کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"یہ یکا یک فیصلے بدلنے والی عادت تو خاصی خطرناک ہوتی ہے۔" وہ تانیہ کی بات سن کر اس کی سمت گھوما۔وہ بے پرواہی سے کندھے اچکاتی چہرہ جھکا کر کشن کے بٹن سے کھیلنے لگی۔

"بس دل نہیں چاہ رہا' ضروری تو نہیں کہ کل تک آپ کا دل اگر کہیں جانے کو چاہ رہا ہو تو دوسرے دن بھی دل کی یہی کیفیت ہو۔"

ولید نے ذرا سا چونک کر اسے دیکھا پھر باقاعدہ استہزائیہ انداز میں اس کا جائزہ لیا۔اس کے لبوں کی تراش میں بے ساختہ مسکراہٹ چمکی تھی۔

"کسی پر نہ سہی کم از کم اپنے پر تو آدمی کو اختیار ہونا چاہئے۔"

اس کی بات پر اس نے سر اٹھایا تھا مگر وہ تانیہ کی طرف پلٹ کر کہہ رہا تھا۔

"تم جاؤ تانی! باہر نومی انتظار کر رہا ہے۔اسے میں خود لے کر آرہا ہوں۔مجھے ویسے بھی سکندر کی طرف آنا ہی تھا۔یہ میرے ساتھ آئے گی اور فنکشن وغیرہ اٹینڈ کرے گی۔میں سکندر کے پاس بیٹھوں گا اور اسے واپسی پر لے آؤں گا۔" وہ کہہ تانیہ سے رہا تھا مگر سنا اسے رہا تھا۔تانیہ تو سر ہلا کر باچھیں پھیلا کر اسے دیکھنے اور اسے بگڑے موڈ کے ساتھ کشن پھینک کر اٹھتے دیکھ کر سرعت سے کمرے سے نکل بھاگی۔

”اچھی زبردستی ہے۔ میری مرضی ہے میں جائوں یا نہ جائوں۔ آپ کون ہوتے ہیں حکم صادر کرنے والے۔“ اسے سچ مچ طیش آگیا تھا مگر جس جھٹکے سے وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی اسی جھٹکے سے ولید نے اسے دوبارہ صوفے پر پھینک دیا تھا۔

”مرضی اس وقت تمہاری چلتی جب تم عقل سے کام لیتیں۔“ اس کی سمت جھک کر اس نے باقاعدہ اسے تنبیہی نظروں سے گھورا تھا۔

”زندگی صرف اپنی مرضی سے ہی نہیں گزارنی چاہیے۔ یہ کبھی کبھی دوسروں کے لیے بھی ہوتی ہے۔ اس پر دوسرے بھی تھوڑا بہت حق رکھتے ہیں ہاں' اگر سمجھو تو۔“ وہ صوفے کے ہتھے سے ہاتھ اٹھا کر سیدھا ہو گیا۔

وہ عجیب ضدی' خودسر اور اپنی بات منوانے والا آدمی تھا۔ شہرینہ نے اس کے مقابل ہمیشہ خود کو بے بس ہی محسوس کیا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں وہ چہرہ جھکا کر اپنے اندر کے اٹھتے ابال کو دبانے کے سوا کچھ نہ کر پائی۔

”فٹافٹ دس پندرہ منٹ میں تیار ہو جائو اتنی دیر میں' میں بھی کچھ کھا پی لوں۔ آج تو لگتا ہے بے وقوفوں سے الجھنے کا دن ہے۔“

ایک گہری سانس بھر کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے زور سے کشن دیوار پر دے مارا اور دونوں پیر سمیٹ کر اس پر چہرہ جھکا لیا۔ وہ اپنی اس کیفیت سے خود بھی ناآشنا تھی۔ آخر اسے ہو کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی دل یونہی ہر شے سے اچاٹ ہو جاتا۔ زندگی یکدم ٹھہری ہوئی کوئی بے کار شے محسوس ہونے لگتی۔

ایک گہری سانس بھر کر وہ اٹھ کر بے دلی سے تیار ہونے لگی اور جب تیار ہو کر باہر نکلی تو وہ راہداری میں ہی فون سٹینڈ کے پاس کھڑا وسیم بھائی سے باتیں کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ریسیور اٹھائے نمبر بھی ڈائل کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی سمت ذرا سا گھوما اور بولا۔

”ہاں تم بیٹھو گاڑی میں میں بس دو منٹ میں آتا ہوں لو یہ چابی پکڑو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے گاڑی کی چابی اس کی طرف اچھال دی۔ وہ خود بھی نہا کر سادہ سا شلوار قمیص اور ہم رنگ واسکٹ میں خاصا فریش دکھائی دے رہا تھا۔

وہ اس مختصر ٹائم میں کھانا بھی کھا چکا تھا اور نئے سرے سے ڈریس اپ بھی ہو چکا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی چاق وچوبند رہتا تھا اور شاید اس پر مغرور بھی تھا۔

وہ باہر آیا تو وہ اس کی گاڑی سے لگی کھڑی تھی۔اس کا رخ مین گیٹ کی طرف تھا اور وہ اس کی آمد سے بے خبر تھی۔اس کے بال زرد اور سیاہ رنگ کے خوب صورت ہیر بینڈ میں جکڑے ہوئے تھے۔گولڈن براؤن سوٹ ہی زیب تن کیا ہوا تھا۔بڑا سا ٹشو کا ہلکی ایمبرائیڈری کا دوپٹہ اس کے بالوں کے ساتھ ہوا سے اڑتا ہوا گاڑی کے فرنٹ ہڈ پر پھیلا ہوا تھا۔اس نے ہلکے سے دوپٹے کا کونا کھینچ کر اسے متوجہ کیا۔وہ پلٹی تو پلکیں جھپک کر نظروں کا زاویہ بدل کر چابی اس کی طرف بڑھا دی۔

"سیانے کہتے ہیں کہ جل کر کباب ہونے سے بہتر ہے آدمی کھل کر گلاب ہو جائے۔" وہ اس کی بے زاری اور بے دلی کو محسوس کرتے ہوئے خاصا محظوظ ہوا تھا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے اشارہ کیا۔

"کسی سیانے کو کبھی آپ نے اپنی کہی ہوئی بات پر عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔اس نے بے ساختہ ہنسی کو لبوں کو باہم بھینچ کر روکا تھا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ پکڑ کر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"مجھے اپنا شوفر سمجھ لیا ہے چلو آگے آکر بیٹھو۔" اس کے انداز میں تحکم تھا اور دروازہ کھول کر یوں کھڑا تھا کہ اسے باہر نکلتے ہی بنی پھر فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے غرائی۔

"آپ بحیثیت شوفر ہی آرہے ہیں میرے ساتھ۔"

"تم نے کبھی اتنے خوب صورت، چارمنگ، سمارٹ شوفر دیکھے ہیں۔" اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اپنی طرف کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی۔

"کیوں شوفر انسان نہیں ہوتے۔جو خوب صورت، چارمنگ، سمارٹ نہیں ہو سکتے۔" اس کے لبوں کی تراش میں پھیلی مسکراہٹ کشادہ ہو گئی۔اگنیشن میں چابی ڈال کر گھماتے ہوئے بولا۔"میں نے تو صرف یہ پوچھا ہے کہ تم نے کبھی اتنے خوب صورت شوفر دیکھے ہیں۔یہ تو نہیں کہا کہ نہیں ہوتے۔"

وہ رخ موڑ کر اسے بگڑے تیوروں سے دیکھنے لگی مگر وہ نہایت معصومیت سے نگاہوں کا رخ موڑ کر گاڑی پورٹیکو سے نکال کر شفاف سڑک پر بھگانے لگا۔وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی، پھر خود بھی ونڈ سکرین کو گھورنے لگی۔

"بائی دی وے کل تک تمہاری کیفیت جانے کی' انجوائے کرنے کی تھی' یہ ایک دن میں فیصلہ کیسے بدل گیا۔ کوئی بات ہو گئی ہے کیا؟"

وہ اب سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا مگر وہ اس کی بات سنی ان سنی کر گئی اور رخ موڑے بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھتی رہی۔ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف نگاہ ڈالی' پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی سمت گھما دیا۔

"کیا بات ہے کوئی مسئلہ ہے کیا' اتنی روڈ تو تم بہر حال نہیں ہو۔"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی ورنہ میں روڈ تو آپ ہی کی نظر میں ہوں۔ مجھے تو بورڈنگ میں بھی بھجوانے کا سوچ چکے ہیں آپ۔" وہ خواہ مخواہ میں چڑ گئی اور اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

وہ بے ساختہ یوں ہنس پڑا جیسے انتہائی ناراض اور کم سن بچے کی حرکت پر کوئی ہنستا ہو۔

"ہاں بورڈنگ میں تو تمہیں واقعی بھیجنا چاہیے۔"

"آپ مجھ سے بات مت کیجئے۔" وہ غرائی۔

"حالانکہ میرا دل چاہ رہا ہے تم سے ہی باتیں کروں۔ گاڑی میں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔" وہ ونڈ سکرین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ لب بھینچ کر بے ساختہ مسکراہٹ دور کی تھی' وہ ڈیش بورڈ کھول کر شاید کوئی کیسٹ ڈھونڈ رہی تھی پھر سخت برا منہ بنا کر بولی۔

"کس قدر بدذوق ہیں آپ' کوئی کیسٹ رکھ لیتے میں وہی لگا دیتی تاکہ آپ کو تیسرے کی موجودگی کا احساس خود بخود مل جاتا۔"

"خیر اب اتنا بدذوق بھی نہیں ہوں' ریڈیو کبھی کبھی سن لیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک چھوٹا سا بلیک بٹن دبا دیا۔ دوسرے پل سرخ بتی جلنے کے ساتھ ہی گانے کی آواز گونج اٹھی۔

ٹھہرا ہے سماں ہم تم ہیں جہاں

آنکھوں سے کہو' آنکھوں سے سنو

دھڑکن سے کہو' خاموش رہے

دنیا سے کہو آواز نہ دے

ولید نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا تھا مگر پھر جانے کیوں سٹپٹا کر نگاہیں دوبارہ ونڈ سکرین پر جما دیں۔ شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت ریڈیو پر فرمائشی گانوں کا پروگرام چل رہا ہو گا۔

دیکھا جب سے تمہیں پورے ہوئے گیت میرے

چاہوں یونہی تمہیں شام و سحر میت میرے

دن شب میں ڈھلے

شب دن میں ڈھلے

ساون برسے

صدیاں گزریں

ہاتھوں میں سدا یہ ہاتھ رہے

دنیا سے کہو آواز نہ دے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

گاڑی کی خاموشی میں یہ آواز اور بھی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ شہرینہ کو اپنا دل عجیب سی اتھاہ میں ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ مضطرب انداز میں گود میں رکھے ہاتھوں کو حرکت دینے لگی۔

ولید نے کچھ دیر بعد ترچھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور اس نے محسوس کیا وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی بلکہ اضطراب کا بھی شکار تھی۔ اس کے رخساروں پر سرخی اڈ رہی تھی جس سے اس کی قلبی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ مارے شرم کے اس کی نظریں اپنے ہاتھوں ہی پر جمی تھیں۔ نازک' نازک سبک لانبی انگلیاں جن میں ہلکا سا ارتعاش تھا یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ہرنی اپنی ساری شرارت' چوکڑی بھول کر ہراساں ہو کر رہ گئی ہو۔

ولید کے لیے اس کا یہ روپ خاصا دلچسپ تھا۔ تاہم اس نے نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کا بٹن آف کر دیا اور یکدم ہی ہونٹ بھینچ کر گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی۔ ریڈیو بند ہونے پر شہرینہ کو بھی جیسے اپنے اعصاب پر سے کوئی وزنی بوجھ سرکتا محسوس ہوا۔ وہ کھڑکی کی طرف منہ کر کے باہر روشنیوں اور جلتے بجھتے سائن بورڈز کو دیکھتی رہی۔ گاڑی جس

تیزی سے دوڑ رہی تھی ہر چیز اسی تیزی سے پیچھے کی سمت بھاگ رہی تھی۔ بس ایک دل تھا جو جہاں رکا تھا وہیں رکا تھا۔ ایک مانوس سی کیفیت میں دوچار جس میں شدت سی آ گئی تھی۔

گاڑی تانیہ کے گھر کے سامنے رکی تو جلدی سے اترنے کے لیے اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا پھر گھوم کر ولید کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ہلکے سے مسکرایا اور جانے کون سے بٹن کو چھوا تھا۔ کلک کے ساتھ دروازے کا لاک کھل گیا۔

"کہاں تو جانے پر تیار نہیں تھیں اور اب اتنی جلدی ہے اترنے کی۔" وہ اگنیشن سے چابی نکال کر اس پر چوٹ کرتا ہوا بولا۔ وہ اپنی اس جلد بازی کے مظاہرے پر جھینپ تو گئی تاہم ظاہر نہ کرتے ہوئے دروازہ کھول کر اترتے ہوئے بولی۔

"بہر حال میں گاڑی میں ہی بیٹھے رہنے تو نہیں آئی تھی۔"

"ہاں ظاہر ہے یہ اتنی تیاری تم نے میرے لیے تھوڑی ہی کی ہے۔" ڈیش بورڈ سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے وہ اسی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ وہ دروازہ یونہی کھلا چھوڑ کر پلٹ گئی تھی جیسے اس کی بات سنی ان سنی کر گئی ہو اور گاڑی سے اتر کر دروازہ لاک کرتے ہوئے ولید حسن کے لبوں کی تراش میں مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

X...X...X

حویلی میں خاصی رونق نظر آ رہی تھی۔ حویلی کی نئے سرے سے آرائش کی گئی تھی۔ لان میں نئے پودے مالی لگوا رہا تھا۔ ٹرک کھڑا تھا جس سے ملازم گملے اتارتے جا رہے تھے اور مالی کی ہدایت کے مطابق رکھتے جا رہے تھے۔

فدا حسین اسے باہر ہی سے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ حویلی آ کر اس کے اعصاب خواہ مخواہ ہی کشیدہ ہو جاتے تھے۔

آمنہ بھی آئی ہوئی تھی اور اسی کی پہلی نظر بہن پر پڑی تھی۔

"ارے ادی شاہدہ، کب آئیں۔" وہ اورنج جوس کا گلاس لیے اس کی طرف چلی آئی پھر بہن کی انگلی پکڑے بھانجے کے رخسار پر پیار سے چٹکی کاٹی۔

"فدا بھائی نہیں آئے اندر۔" اس نے شاہدہ کے پیچھے نگاہیں ڈالیں پھر شاہدہ کے چہرے پر جہاں اس کے سوال پر ناگواریت سمٹ آئی تھی۔

"نہیں اور ان کے نہ آنے سے کون سا حویلی کی رونقوں میں کمی آ جائے گی۔ ہاں ہدایت بھائی نہ آتے تو اور بات تھی۔" وہ بیٹے کی انگلی چھوڑ کر چلتی ہوئی لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ کر چادر اتارنے لگی۔ آمنہ نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا مگر فوراً ترک بھی کر دیا اور اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"چلو اچھا ہے آپ تو آ گئیں بڑی خوشی ہوئی آپ کو یہاں دیکھ کر۔" وہ بولی تو شاہدہ نے ذرا سا رخ موڑ کر استہزائیہ انداز میں اسے دیکھا تھا مگر وہ گلاس پر لب ٹکائے جوس کی چسکیاں لیتی ہوئی اس کی نگاہوں کے اس انداز سے انجان رہی اور بولی۔

"میں تو خود حویلی کم ہی آتی ہوں اور شہر میں آپ میرے پاس آتی نہیں ہیں۔ سجاول اور احمد کو ہی بھیج دیا کریں میرے پاس۔" اس نے بھانجوں کی بابت کہا۔

شاہدہ کو پیار بھرا لہجہ بڑا مصنوعی سا لگا۔ وہ چادر تہہ کر کے اپنے بیگ کے اوپر رکھتے ہوئے دوپٹہ اوڑھنے لگی‘ یوں جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ کلائیوں میں بھری سنہری چوڑیاں کھنکھنا رہی تھیں۔ کانوں کے آویزوں کے ہلکے ہلکے گھنگرو بھی وقفے وقفے سے بج رہے تھے۔

اس کی پیشانی پر پڑی آڑی ترچھی لکیریں اور لبوں پر لگی چپ کی مہر نے آمنہ کو مزید بولنے سے روک دیا۔ بہن کا یہ روکھا رویہ اسے برا تو بہت لگا۔ سو خاموشی سے اٹھ کر وہیں رکھے ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر کاؤچ پر ڈھیر ہو گئی۔

"ارے شاہدہ آئی ہے‘ کب آئی دھی۔ مجھے خبر نہیں دی آ کر۔" اماں کی خوشگوار آواز ابھری وہ اپنے بھاری بھر کم سراپے کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں۔ پیچھے مردان علی شاہ‘ توقیر شاہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔

حویلی میں واحد اماں تھیں جن سے شاہدہ پر تپاک انداز میں ملتی تھی۔ اماں کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور ان سے لپٹ گئی۔

"جیتی رہو‘ ابھی آئی ہو کیا؟" انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"ہاں بس ابھی آئی ہوں‘ سلام بابا سائیں۔ سلام ادا۔"

وہ مردان شاہ کو دیکھ کر احتراماً بولی تو انہوں نے پائپ پیتے پیتے سر ہلا دیا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ دیا اور خود بھی سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ توقیر شاہ ان کے بغلی صوفے پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر لاؤنج میں خاموشی طاری رہی۔ بس ٹی وی کی ہلکی آواز آ رہی تھی جو آمنہ لاؤنج کے دوسرے کونے پر کھولے بیٹھی تھی اور بیٹھنے سے زیادہ لیٹی ہوئی تھی۔

"اب تو ٹھہرو گی نا' داداسائیں کی برسی تک۔" خاموشی کا سینہ توقیر شاہ کی آواز نے چیرا تھا جوابا کلائیوں میں پڑی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"فدا بھائی آئیں گے۔"

"پتہ نہیں، شام کو احمد کو چھوڑنے آئیں گے تو تم خود ہی پوچھ لینا۔"

"پھر بھی کچھ کہا تو ہو گا۔" توقیر شاہ نے جیسے کریدا۔

"ان کا پروگرام تو آپ لوگوں کے رویوں پر منحصر ہے۔ جو محسوس کریں گے اس کے مطابق ہی فیصلہ کریں گے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی تھی مگر لہجے میں ہلکی چنگاریاں محسوس ہوئی تھیں۔

توقیر شاہ چپ سا ہو گیا جبکہ مردان علی شاہ نے بس ایک نظر اس پر ڈالی پھر پائپ پیتے ہوئے توقیر شاہ کی طرف رخ کرتے ہوئے اس سے برسی کے انتظامات کی تفصیلات پوچھنے لگے اور توقیر شاہ انہیں مزید انتظامات کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

دونوں باپ بیٹے یکدم ہی جیسے شاہدہ سے غافل ہو گئے اور یہ بات شاہدہ نے شدت سے محسوس کی۔

"اخبار والوں سے کنفرم تو کر لیا ہے نا جنہیں مضامین بھجوائے تھے۔" وہ پوچھنے لگے۔

"جی میں خود ذاتی طور پر اخبار کے دفاتر گیا ہوں اور ایڈیٹرز سے ملاقات کر کے برسی پر آنے کے لیے کہا ہے اور ایک دو اخبارات کے علاوہ تقریباً سب میں ہی مضامین بھی چھپ رہے ہیں۔" توقیر شاہ مطمئن انداز میں بولا۔

"دیٹس ویری گڈ اور پریس والوں کے انتظامات بھی مکمل ہیں نا۔ بابا ان کے انتظامات میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ بے فکر رہیے بابا سائیں ان لوگوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔"

"ہوں' دینا بھی چاہیے۔ایسے موقعوں پر ہماری ذرا سی کوتاہی ہمارے حق میں زہر ثابت ہوتی ہے۔یہ پریس والے ہیں تو معمولی کیڑے مکوڑے مگر کاٹنے پر آتے ہیں تو ان کے ڈنک بڑے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔" مردان شاہ کی بات پر توقیر شاہ ہنس دیا اور سر ہلانے لگا۔

"یہ تو ہے' آپ کی بات سو فیصد درست ہے۔اب دیکھ لیجیے اس پروفیسر زبیری کو جسے اخبارات والے بلکہ چند اخبار والے تو خواہ مخواہ ہی سپورٹ دے رہے ہیں حالانکہ ایسا کیا کیا ہے ہم نے اس کے ساتھ وہ خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی مار کر واویلا کر رہا ہے۔"

"ارے ہاں' اس پروفیسر سے یاد آیا' اس اخبار کے دفتر کا ذرا نمبر تو ملائو۔ بابا اس بچے سے کیا نام ہے سکندر رضا۔ مجھے ذاتی طور پر بات کرنی ہے بڑا ہی تیز جا رہا ہے۔تم نے اسے دعوت دی؟"

انہوں نے پائپ میں نئی تمباکو ڈالتے ہوئے اس پر انگلی سے تہ جماتے ہوئے پوچھا تو توقیر شاہ نے سر نفی میں ہلا دیا اور اپنی اس کوتاہی پر شرمندہ بھی ہو گیا۔

"لائو یہ موبائل دو ادھر مجھے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"لگتا ہے بابا سائیں یہ برسی آپ دادا سائیں کی محبت میں نہیں صرف اپنی شہرت کے لیے منا رہے ہیں۔" شاہدہ جو خاصی دیر سے چپ چاپ باپ بھائی کی گفتگو سن رہی تھی تمسخر سے ہنس کر بولی۔تب آمنہ علی جو ریموٹ سے ٹی وی بند کر کے اٹھ کر بال سہلا رہی تھی اس کی تمسخرانہ ہنسی پر بھبک سی گئی۔

"شٹ یور مائوتھ شاہدہ اس بدتمیزی سے کیا مطلب ہے تمہارا۔" اس کا بولنا قیامت ہی ہوا۔ شاہدہ بھی ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"تم چپکی بیٹھی رہو۔میں بابا سائیں سے بات کر رہی ہوں تمہیں زیادہ ان کی فیور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔جس طرح تم بیٹی ہو میں بھی بیٹی ہوں۔"

"بیٹیاں ایسی نہیں ہوتیں تمہاری جیسی' آخر سمجھتی کیا ہو خود کو۔اس طرح کے بی ہیویئر سے تم اور فدا بھائی بابا سائیں کو ٹریپ نہیں کر سکتے۔" وہ اس کا مذاق اڑانے والے انداز میں بولی اور شاہدہ کے پتنگے لگ گئے۔

وہ غصے سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔اس کا چہرہ آگ کی طرح دہکنے لگا تھا۔

''اسے سمجھالیں باباسائیں!'' وہ مردان علی شاہ کی طرف دیکھ کر جیسے غرائی مگر مردان علی شاہ نہایت خاموشی سے پائپ ہونٹوں کے کنارے میں دبائے بیٹھے رہے اور ان کی موجودگی کے باعث اماں اور توقیر شاہ کو تو اس معاملے میں مداخلت کا حق ہی نہیں بنتا تھا البتہ اماں آمنہ کو آنکھیں دکھا رہی تھیں۔

''دو چار جماعتیں پڑھ کر وہ خود کو حویلی کا جانشین سمجھ بیٹھی ہے' زیادہ ہی سر چڑھا دیا ہے آپ نے' اسے تمیز چھو کر نہیں گزری۔ بہنوں سے بات تک کرنے کی تمیز نہیں رہی کیا فائدہ اس چار کتابوں کے چاٹنے کا۔''

''تم بھی چار کتابیں چاٹ لیتیں تو یہ فرق خود سمجھ آجاتا۔''

''میرے منہ نہ لگ آمنہ۔'' وہ جیسے پھنکاری۔ ''تم لوگوں کے یہی رویے تو ہمیں حویلی میں قدم رکھنے نہیں دیتے۔ یہی چاہتے ہو تم لوگ۔ ہم آئیں ہی نہیں۔''

''یہ تمہارے اپنے چھوٹے ذہن کی سوچ ہے۔''

''کیا کہا' چھوٹا ذہن ہے میرا؟'' وہ آگ بگولا ہو کر آمنہ کی طرف بڑھی تھی کہ مردان علی شاہ کی گونجدار آواز ابھری۔ ''بس کرو تم دونوں۔ ادھر بیٹھو تم۔'' انہوں نے شاہدہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھوں میں غصہ لہرانے لگا تھا۔

آمنہ کو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر جانے کا اشارہ دیا پھر شاہدہ سے بولے۔ ''بابا دماغ کو ٹھنڈا رکھا کرو' تمہاری اسی فطرت کی وجہ سے فدا حسین فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔ وہ تمہیں ہمارے خلاف بھڑکاتا رہتا ہے اور تم ٹھہریں جذباتی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے باباسائیں!'' وہ تیزی سے ان کی بات رد کرتے ہوئے احتجاجاً بولی۔

''انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ مجھے آپ کے خلاف بھڑکائیں۔ کیا میرے پاس آنکھیں نہیں ہیں۔ میں خود دیکھتی ہوں میرے ساتھ اور میرے شوہر کے ساتھ حویلی والوں کا برتاؤ کیا ہے۔ ابھی

آپ نے خود دیکھا نہیں یہ آمنہ مجھ سے چھوٹی ہونے کے باوجود کس طرح مجھ سے لڑنے کھڑی ہوگئی۔ یہی عزت ملنی ہے مجھے حویلی میں تو میں کیوں آنے لگی۔" وہ یکدم ہی رونے لگی۔

"ایسے چھوٹے موٹے جھگڑے تو بھائی بہنوں میں چلتے رہتے ہیں تو دل پر نہ لے۔ چل بے وقوف نہ بن۔" اماں اس کی پیٹھ سہلاتیں اسے بازو سے پکڑ کر زبردستی کھڑا کر کے اپنے ساتھ لیے لائونج سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

X...X...X

سکندر رضا ابھی دفتر آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ چپڑاسی نے آ کر فاروقی صاحب (ایڈیٹر) کا پیغام دیا۔ اس نے رسٹ واچ پر نظریں ڈالیں پھر ٹیبل سے کچھ کاغذات اٹھا کر فاروقی صاحب کے کمرے میں چلا آیا۔

"آئو سکندر! بھئی یہ فون ہے تمہارا۔" انہوں نے اپنے آگے بڑی سی میز پر رکھے ریسیور کی طرف اشارہ کیا پھر اسے اٹھا کر مائوتھ پیس پر ہتھیلی رکھتے ہوئے دبی زبان میں بولے۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ ایم پی اے مردان علی شاہ کے صاحبزادے کا دعوت نامہ ملا ہے۔ اب یہ خود مردان علی شاہ کا فون ہے خصوصی تمہارے لیے۔ بڑے اوپر اڑ رہے ہو۔" انہوں نے ہلکی ہنسی کے ساتھ ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ارے فاروقی صاحب! بس ایسے ہی موقعوں پر تو ہم جیسوں کی عزت افزائی ہو جاتی ہے۔" وہ سر جھٹک کر ریسیور تھامتے ہوئے کرسی کو پیروں سے ذرا سا دھکیل کر بیٹھ گیا۔

"ہیلو' سکندر سپیکنگ۔"

"جی بس... آپ کی دعائوں سے سب خیریت ہے۔"

فاروقی صاحب نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر فائلوں کی الماری کھول کر اپنی مطلوبہ فائل ڈھونڈنے لگے۔

"جی جی' دعوت نامہ تو مل چکا ہے۔"

اس نے پیپر ویٹ کو اٹھا کر گھماتے ہوئے مردان علی شاہ کی شگفتہ سی آواز سنی پھر مسکرا دیا۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں شاہ صاحب ضرور آئیں گے، سر کے بل آئیں گے۔ آخر آپ نے اتنی محبت سے بلوایا ہے اور یوں بھی کسی مرحوم کے لیے دو سپارے پڑھ کر بخش دینا نیکی بھی تو ہے۔"

فاروقی صاحب نے پلٹ کر چشمہ کے اوپر سے سکندر رضا کو متبسم نگاہوں سے دیکھا مگر وہ پیپر ویٹ گھماتے ہوئے مردان شاہ کی طرف متوجہ تھا۔

"ارے نہیں اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنی سواری میں آجائیں گے۔ ہاں اگر سارے ہی اخبارات والوں کو آپ یہ سہولت دے رہے ہیں تو میں انکار نہیں کروں گا مگر میرے لیے ذاتی طور پر آپ پلیز یہ تکلیف نہ کیجئے میں حاضر ہو جائوں گا۔ آپ کا دعوت نامہ بلکہ محبت نامہ مل گیا یہی بہت ہے۔"

پھر اس نے اچانک ہلکے سے قہقہہ لگایا تھا۔ جانے مردان شاہ نے کیا کہا تھا پھر ہنسی سمیٹتے ہوئے بولا۔ "بس جی ہم اخبار والوں کا کام تو صفحات سیاہ کرنا ہی ہے۔ ہاں بس میں یہ چاہتا ہوں کہ صفحات سچ کی سیاہی سے سیاہ کیے جائیں، آخر عوام ہم پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے کچھ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

روپے ہر روز خرچ کرتے ہیں تو کس لیے سچ سننے پڑھنے کے لیے ہی نا۔ آخر ہم میں اور سیاست دانوں میں فرق ہی کیا رہ جائے کہ ہم بھی عوام کے اعتماد کو مجروح کریں۔"

"ارے رے... نہیں، نہیں میں ایک عام سی بات کر رہا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا تھا اور پیپر ویٹ دھکیل کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"جی! بہتر ہم وقت پر حاضر ہو جائیں گے۔ عنایت آپ کی۔ جی! اللہ حافظ۔" اس نے کان سے ریسیور ہٹایا پھر اسے آگے ہو کر کریڈل پر ڈال کر ایک قدرے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے دوبارہ کرسی سے لگ کر ڈھیلے انداز میں بیٹھ گیا۔

"کیا کہہ رہا تھا۔" فاروقی صاحب فائل اٹھا کر کرسی پر بیٹھ گئے اور فائل میز پر رکھتے، چشمہ اتار کر اسے پونچھتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔

"کہہ رہے تھے موصوف کہ سکندر صاحب آپ کے کالم تو ماشاءاللہ ایک جہان پڑھتا ہے اب آپ کہاں ان چھوٹے چھوٹے مسائل پر قلم اٹھانے لگے ہیں۔ ملک میں بڑے بڑے مسائل ہیں ان پر لکھئے۔"

"کیا مطلب... کون سے مسائل؟ اچھا پروفیسر زبیری کی طرف تو اشارہ نہیں تھا۔" فاروقی صاحب پہلے تو چونکے پھر فوراً ہی دھیان آنے پر بولے تو سکندر رضا کے لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ کشادہ ہو گئی۔ وہ سر اثبات میں ہلانے لگا۔

"جی درست سمجھے' دل تو چاہا کہوں کہ شاہ صاحب بڑے بڑے مسائل تو آپ لوگوں کے جانے سے ہی حل ہوں گے۔ کم از کم جب تک آپ جیسے ہیں تب تک تو ان کے سائز میں اضافہ ہی ہو گا' اپنی وے بہت اصرار کر رہے تھے برسی میں آنے پر۔ کیا کریں بیچارے مجبوری میں تو گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔" خوش مزاج ایڈیٹر فاروقی صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ پھر اسے گھورتے ہوئے بولے۔

"لڑکے! ہاتھ ذرا ہولا رکھا کرو' پھر میں سنسر لگاؤں گا تمہارے کالمز پر' تو تم احتجاج کرو گے۔ مستعفی ہونے کا مجھے ڈراوا دو گے۔ سمجھو لڑکے! یہ صحافت ابھی آزاد نہیں ہے۔ اسے آزادی سے مرنے کی اجازت تو دی جائے گی مگر آزادی سے جینے کی نہیں۔"

"میرا خیال ہے آپ مجھے یہ بات کوئی چھبیسویں بار کہہ رہے ہوں گے مگر افسوس میں بھی اس قدر ڈھیٹ مٹی سے گندھا ہوا ہوں کہ کچھ اثر ہی نہیں ہوتا پھر بھی اٹھائیسویں بار کہتا

ہوں کہ میں کوشش کروں گا۔" اس نے فاروقی صاحب کی شکل دیکھی پھر کندھے اچکا کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"تم قریشی کے بیٹے نہ ہوتے تو پھر میں دیکھتا۔"

"میرا خیال ہے آپ مجھے قریشی کا بیٹا نہ سمجھتے ہوئے دیکھ ہی لیجئے۔" اس نے ایک آنکھ دبائی پھر ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔

"قریشی کی طرح تم بھی ضدی ہو۔ اس وقت حالات اور تھے اب حالات اور ہیں اور..."

"حالات کو اپنے تابع کرنا چاہیے انکل! نہ کہ خود حالات کے تابع ہو جائیں' آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ میں آپ کے مرحوم دوست کا پر تو ہوں۔ آپ کو اپنے دوست کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتا۔"

اس نے رخ موڑ کر شرارت سے کہا پھر انہیں گھورتے دیکھ کر جیسے گھبرانے کی ایکٹنگ کرتا ہوا سرعت سے کمرے سے نکل بھاگا۔

X...X...X

کچھ تو بولو کہ یہ خاموشی کا جادو ٹوٹے

یونہی چپ چاپ سلگنے سے بھی کیا ہوتا ہے

کچھ نہ کہنے سے تو دکھ اور سوا ہوتا ہے

کیا ستاتی ہیں بہت آج کسی کی یادیں

وہ تانیہ کی بکواس سنتی رہی پھر پلٹ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا جرنل اسے دے مارا۔

"کر چکیں بکواس؟ بول چکیں؟" اس نے مزید ایسا ہی کرارا وار کرنا چاہا کہ تانیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور جرنل اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ہنس پڑی۔

"میں تو بول چکی... بک بھی چکی مگر مسئلہ تمہارا ہے۔ یہ یکایک تمہیں خاموشی کا دورہ کیوں پڑا ہے۔" پھر اس نے دیوار پر بیٹھ کر جرنل گود میں رکھ لیا اور متبسم نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ جواب تانیہ کی بجائے دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

سفید کلف لگے ملتانی کڑھائی والے سوٹ میں سفید ہی ہلکی ایمبرائیڈری کا کلف والا دوپٹہ سر پر جمائے وہ آج خلاف معمول گم صم سی نظر آ رہی تھی۔ تانیہ کو اس کی بھوری آنکھوں کی چمک بھی کچھ ماند ماند سی محسوس ہوئی تھی۔ پھر وہ پلٹ کر تانیہ کو گھورتے ہوئے بولی۔

"چلو اٹھو اب فضول بکواس رہنے دو۔ کیفے چلو سر بھاری بھاری سا ہو رہا ہے۔ سٹرونگ سی چائے پیوں گی تو تمہاری بکواس بھی برداشت کر سکوں گی۔" وہ ذرا سا مسکرائی تھی مگر اس کی آنکھیں تب بھی اس کا ساتھ نہ دے سکی تھیں۔

"آہا میری بکواس یعنی میں صرف بکواس ہی کر رہی ہوں۔" وہ جرنل پر ہاتھ مار کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی پھر بڑے شرارتی انداز میں ہنسنے لگی اور جرنل پر انگلیاں بجاتے ہوئے گانے لگی۔

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں

اور بال بناؤں کس کے لیے

وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا

میں باہر جاؤں کس کے لیے

"آہ جاؤں کہاں؟ وہ شخص تو گاؤں چلا گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے؟" وہ جھٹکا کھا کر پلٹی تھی۔ بیگ کی زنجیر اس کی انگلیوں سے پھسلی تھی۔ اس نے تانیہ کی طرف دیکھا جو سر دائیں بائیں دھننے کے انداز میں ہلاتی اپنی ہی بنائی میوزک کے ساتھ گائے جا رہی تھی پھر یکدم رک کر اس کی تھکی تھکی حیران پریشان سی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے بولی۔

"بے وقوف سمجھ لیا ہے؟ احمق، پاگل، کم عقل، نادان اور کم فہم، کیا سمجھتی ہو تم مجھے؟ ہیں ذرا بتانا۔"

"کیا بکواس ہے یہ میں سمجھی نہیں۔" تانیہ کی نگاہوں میں غیر معمولی پن تھا۔ جسے محسوس کرنے کے باوجود نظر انداز کرتے ہوئے جھڑک دیا۔

"مگر میں سمجھ گی۔" وہ کندھے اچکا کر جرنل پر دونوں ہتھیلیاں جما کر مسکرانے لگی۔

"کیا سمجھ گئیں۔" وہ گھرکنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی مگر باوجود کوشش کے بھی لہجے میں غراہٹ پیدا نہ کر سکی۔

تانیہ نے ایک طویل قسم کی سانس بھری تو وہ خواہ مخواہ میں ہی کھسیا کر اس کی گود سے جرنل چھینتے ہوئے بولی۔ "تانیہ کی بچی پٹ جاؤ گی میرے ہاتھ سے۔"

تانیہ اپنی شریر مسکراہٹ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ اسی کی سمت ایک ٹک دیکھے بھی جا رہی تھی پھر جان بوجھ کر زور سے کھنکار کر بولی۔

"ادھر دیکھو شہرینہ! آج میں انکشاف کر رہی ہوں کہ میں اتنی بھی احمق نہیں ہوں جتنی تم سمجھتی ہو۔ تمہاری آنکھوں میں اتنا موٹا موٹا جلی حروف میں لکھا ہوا ہے ولید... ولید حسن... کہو جھوٹ ہے بلکہ ثبوت کے ساتھ بتاؤ کہ جھوٹ ہے۔"

وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی سیڑھیوں پر اترتے چڑھتے سٹوڈنٹس کو یونہی خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہ گئی پھر ہلکی سی سانس بھر کر تانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”مسئلہ سارا یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے بے حد نزدیک ہوتے ہیں ان سے ہم باوجود کوشش کے چھپ نہیں سکتے۔“ اس نے کسی بحث، حیل و حجت کے بنا جیسے ہتھیار ڈال دیئے اور آج تو پتہ نہیں کیوں دل بڑا اداس اور بوجھل سا ہو رہا تھا۔اس نے تانیہ کی طرف دیکھا مگر زیادہ دیر نہ دیکھ سکی اور جلدی سے رخ موڑتے ہوئے بولی۔

”واقعی تم اتنی احمق نہیں ہو جتنی میں سمجھتی آ رہی تھی مگر خدا کے لیے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے مزید سوالات سے مجھے بچا ہی رہنے دو۔سچ کہہ رہی ہوں تانی! میرا سر بہت دکھ رہا ہے۔ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ہتھوڑے سے کوٹ رہا ہو۔“

اس کے لہجے میں التجا تھی۔تانیہ مزید کسی شرارت کا ارادہ فی الوقت ترک کرتے ہوئے اچھل کر دیوار سے نیچے اتری۔

وہ تیزی سے کیفے ٹیریا میں داخل ہو گئی تھی۔تانیہ اس کے پیچھے لپکی مگر ثمرہ اور واجدہ علی نے آواز دے کر اسے روک لیا تھا۔

شہرینہ نے ایک خالی میز کے اندر پھنسی کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھتے ہوئے گہری سانس بھری۔بیگ میز پر رکھا اور دوپٹہ گردن سے ذرا سا ہٹا کر چھت کے پنکھے کو دیکھا تو ایک

چڑچڑاہٹ کی خفیف سی لہر اندر تک اتر گئی (بقول تانیہ کے اس پنکھے پر بیٹھ کر جھولا کھایا جا سکتا ہے ہوا نہیں کھائی جا سکتی۔)

وہ کھڑکی سے باہر نظر آتی تانیہ کو دیکھنے لگی جو اپنے بیگ سے کتاب نکال کر ثمرہ کو جانے کیا بتا رہی تھی وہ سوچنے لگی۔

کیا تانیہ نے واقعی اس کے دل میں جھانک لیا ہے اتنا صحیح اندازہ اس نے کیسے لگا لیا۔کیا ولید کا نام واقعی اس کے چہرے پر لکھا ہوا ہے؟اس کا عکس اس کی آنکھوں سے جھلکتا ہے؟

بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر گیا اور ابھی وہ مزید سوچتی کہ چونک سی گئی۔اس کی میز کی سطح پر دو مضبوط وزنی ہتھیلیاں آ کر جمی تھیں پرفیوم کی تیز مہک اس کے ناک سے ٹکرائی۔

اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔اکبر شاہ اس کی طرف قدرے جھکا ہوا تھا۔اسے اس قدر نزدیک دیکھ کر اس کے حواس بری طرح جھلسے تھے۔اس نے سرعت سے اپنی کرسی پیچھے کی تھی، چہرے پر ناگواری کا ایک جال خود بخود تن گیا۔

”صبح سے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں مس خان! بس یہ گانے کی کسر رہ گئی تھی کہ:

کہاں کہاں چھپو گے تم آنکھوں سے

کبھی چھپا ہے چاند بھی تاروں سے

یہ کہتے ہوئے وہ اس کی سمت اور ذرا سا جھکا تھا۔ شہرینہ کو اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ جھٹکے سے کرسی دھکیل کر کھڑی ہوئی تو وہ بھی سنبھل کر میز کی سطح سے ہتھیلیاں اٹھا کر سیدھا ہو گیا۔

"میں تمہیں کہہ چکی تھی اکبر شاہ کہ آئندہ تم میری راہ میں آئے تو۔"

"ارے ارے مس خان! میں تو صرف یہ دینے آیا ہوں۔"

اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ میرے گرینڈ پا کی برسی کا دعوت نامہ ہے۔ آپ شامل ہوں گی تو ان کی روح بے حد خوش ہو گی۔" اس نے ہاتھ آگے کر کے دعوت نامہ چھیننے کے انداز میں اس کے ہاتھ سے لیا پھر اس پر ایک نظر ڈالے بنا اس کے دو ٹکڑے کر کے اس کے منہ پر اچھال دیئے۔

"یہ دعوت نامے تم اپنے ہی جیسوں میں بانٹتے پھرو، میرا تم سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہے، میں پہلے بھی تمہیں کہہ چکی ہوں کہ دوستی میرے نزدیک دولت کی بنیاد پر نہیں کردار کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔" اس نے ایک چلچلاتی نگاہ اس پر ڈالی اور میز سے اپنا بیگ اٹھانا چاہا کہ اکبر شاہ نے اس پر اپنا ہاتھ دباؤ کے ساتھ رکھ دیا۔

"کردار کی جانچ میں غلطی بھی ہو سکتی ہے مس خان! ضروری نہیں جس کا کردار بظاہر بے داغ نظر آتا ہو حقیقت میں پاک ذہن ہی ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہیں دروازے کی طرف اٹھیں جہاں تانیہ خراماں خراماں چلتی نظر آئی۔

شہرینہ بھی اس کے نگاہوں کے تعاقب میں تانیہ کو دیکھ چکی تھی، اس کے جملے کے پس منظر کو بھی۔ اس نے استہزائیہ انداز میں لب بھینچ کر اکبر شاہ کو دیکھا اور بولی۔

"شکر ہے کہ میرے پاس وہ آنکھیں ہیں جو اچھائی اور برائی کو پرکھ سکتی ہیں۔"

"کبھی کبھی ان پر پردہ بھی آ جاتا ہے اتنا زعم بھی ٹھیک نہیں مس خان!" وہ دھیرے سے مسکرایا پھر قدرے اس کی سمت جھکتے ہوئے عجیب دبے دبے لہجے میں بولا۔

”تمہیں بڑا ناز ہے اپنی پاک باز دوست تانیہ رضا پر' ارے ان جیسوں کو تو ابھی ہم نے چھوا ہی نہیں ہے۔ تبھی پاکیزہ ہیں دیکھنا۔ ذرا چھو لیں تو پکے پھل کی طرح آغوش میں آ گریں گی۔“

اس کی سکڑی آنکھوں میں مکروہ سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ وہ سیدھا ہو کر پیچھے ہٹا ہی تھا کہ شہرینہ کا ہاتھ سرعت سے فضا میں بلند ہو کر چٹاخ کے ساتھ اس کے مسکراتے مکروہ چہرے پر آ پڑا۔

شہرینہ کے تن بدن سے نفرت اور غصے کی ایک گرم لہر اٹھی تھی۔ اس کا رواں رواں اس جملے کی آگ سے دہک اٹھا تھا۔

”کمینے! ذلیل!“ وہ جنونی انداز میں بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی اور ایک اور طمانچہ اس کے منہ پر مار دیا پھر اس کا شرٹ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

”سمجھتے کیا ہو تم؟ اوباش! بدکردار! سب کو اپنے جیسا سمجھ لیا ہے۔“

”شیری! شیری کیا ہوا؟ کیا کر رہی ہو یہ؟“ تانیہ لپک کر آئی تھی اور اسے پکڑ لیا۔

کیفے ٹیریا میں یکدم افراتفری مچ گئی تھی۔ سب اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھ کر شہرینہ اور اکبر شاہ کے گرد جمع ہونے لگی۔

اکبر شاہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے اعصاب سن ہو گئے تھے۔ وہ دو طمانچے کھا کر حواس باختہ ہو گیا تھا اور ٹھٹھرے اعصاب کے ساتھ کھڑا تھا کہ فوری طور پر اس کے ہاتھ سے اپنی شرٹ بھی چھڑا نہیں سکا تھا۔

”مجھے چھوڑو تانی! میں اس شخص کا دماغ درست کر دوں گی۔ میں آج اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ پلیز تانیہ پلیز مجھے چھوڑو' ہٹ جاؤ تم درمیان سے۔“ وہ چلائی اور تانیہ کی گرفت سے خود کو چھڑانے لگی۔

اس کی آنکھوں کے بھورے کانچ دہکتے ہوئے انگارے ہو رہے تھے اور چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ دوسری لڑکیاں بھی اسے پکڑے ہوئے تھیں جبکہ اکبر شاہ کے چیلے اکبر شاہ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ اب اپنے حواس میں لوٹ آیا تھا۔ تذلیل کے احساس سے اس کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا مگر وہ کسی قسم کی جوابی کارروائی کرنے کے قابل بہرحال نہیں تھا بس

دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اپنی شرٹ جھٹک کر اپنے ارد گرد جمع دوستوں کو دھکا دے کر ہٹاتا ہوا کیفے ٹیریا سے باہر نکل گیا۔

شہرینہ کو بھی بہلا پھسلا کر تانیہ کیفے ٹیریا کی ایک کونے والی میز کے پاس لے گئی۔ وہ اسے ابھی باہر لے جانے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ مبادا دوبارہ اکبر شاہ سے تصادم نہ ہو جائے۔ اکبر شاہ جس طرح ایک جھلساتی نگاہ اس پر ڈال کر گیا تھا اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی تک میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔ اسے لگا وہ نگاہیں شہرینہ پر اٹھی تھیں مگر ساتھ اسے بھی چھید کر گئی ہوں۔ اسے خود اپنے ہاتھ پیروں میں کپکپاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی تاہم اس نے خود کو سنبھال کر ٹھنڈے پانی کا گلاس اسے تھمایا۔

”کول ڈاؤن شیری لو پانی پی لو۔“

اور اس نے خاموشی سے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر لبوں سے لگا لیا اور ایک سانس میں آدھا پانی پی کر گلاس میز پر پٹخ دیا اور بیگ کے اوپری حصے سے ٹشو نکال کر چہرہ پونچھنے لگی۔

”آج یہ میرے ہاتھ سے یقیناً قتل ہو جاتا تانی!“ وہ ایک بار پھر اسی احساس سے سلگنے لگی۔ تانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اسے اپنا دل ایک کرب کی اتھاہ میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس

نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر درد سے پھٹتے سر کو سنبھالا دینے کے لیے جیسے چند لمحوں کے لیے آنکھیں موند لیں۔

”اسی بات سے ڈرتی تھی میں‘ اسی دن سے خوفزدہ تھی۔ اکبر شاہ کو دیکھ کر جس طرح تم ٹمپر لوز کر دیتی ہو اس پر مجھے پریشانی رہتی تھی۔ ہوا کیا تھا‘ کیا کہہ دیا ایسا اس نے۔“ تانیہ کی تشویش اس کے چہرے سے بھی جھلک رہی تھی۔ وہ فکر مندی سے بولی۔

”بہرحال‘ جو ہوا بہت برا ہوا شیری!“

”نہیں‘ جو ہوا بہت اچھا ہوا بلکہ اس کی تو آج لاش جانی چاہیے تھی یہاں سے۔“

وہ آنکھیں کھول کر کڑوے اور زہر بھرے لہجے میں بولی پھر کسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے بولی۔

”چلو اٹھو یہاں سے مجھے اس واقعہ کا سوگ نہیں منانا یہاں بیٹھ کر۔“ وہ اپنا بیگ اور جرنل اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی بے زاری اور وحشت واضح تھی کہ تانیہ بغیر حیل و حجت اٹھ گئی۔ یوں بھی سب کی نگاہیں گاہے بگاہے ان ہی پر اٹھ رہی تھیں اور پھر آپس میں کھسر پھسر ہو رہی تھی۔

"کچھ بتاؤ گی کہ ہوا کیا تھا آخر اس نے کیا کر دیا تھا کہ تم اتنی ایموشنل ہو گئیں۔" اس نے تانیہ کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے دوسری طرف دیکھ کر سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں، یوں ہی عادت کے مطابق بکواس کر رہا تھا اور مجھے غصے آ گیا۔ بس میں ایک بار اسے سبق سکھا ہی دینا چاہتی تھی۔"

وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتی ادھر ادھر دیکھے بنا کیفے ٹیریا سے باہر آ گئی۔ اب اس کا رخ بجائے کلاس رومز کے باہر گیٹ وے کی طرف تھا۔ تانیہ بھی فی الوقت خاموشی ہی کو مناسب سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے لگی۔

X...X...X

مردان علی شاہ کی حویلی بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ خوب چہل پہل اور رونق تھی۔ مہمانوں کے لیے تمام تر سہولیات کے ساتھ بڑے بڑے ٹینٹ نصب تھے۔ ایک طرف بڑا سا سٹیج بنایا گیا تھا جس کے بیک گراؤنڈ میں مرحوم شاہ صاحب کے بڑے بڑے پوسٹر نصب تھے۔ ایسے ہی پوسٹر زعلاقے کے تقریباً ہر دیوار، کھمبوں پر دکھائی دے رہے تھے۔ سڑکوں اور راستوں کے درمیان بینر بھی لگے ہوئے تھے۔ بینروں پر مقررین کی فہرست درج تھی۔

اس کے علاوہ مردان علی شاہ اور توقیر شاہ کے بھی بڑے بڑے پوسٹر دکھائی دے رہے تھے جن کے نیچے "خادم ملت" لکھا ہوا تھا۔

تقریباً سارے مہمان شرکاء آ چکے تھے بس "مہمان خصوصی" کا انتظار باقی تھا یعنی انتظار کی روایت کو یہاں بھی برقرار رکھا گیا تھا۔ مردان علی شاہ اپنے دونوں بیٹوں کے ہمراہ خود مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ایک طرف آمنہ علی کھڑی ان سب کی بیگمات کا استقبال کر رہی تھی۔ ولید حسن کو دیکھ کر وہ یوں سرعت سے اس طرف بڑھی کہ جیسے اب اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہے گی مگر اس کے ہمراہ سکندر رضا کو دیکھ کر اس کے حلق تک میں کڑواہٹ یوں گھل گئی جیسے شہد کے بعد نیم پلا دی گئی ہو۔ اس کے قلبی احساسات سخت برے ہو گئے تاہم وہ ایک دلفریب مسکراہٹ لبوں پر سجا کر اس طرف چلی آئی اور سکندر رضا کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی۔

"یہ وقت ہے آنے کا؟" اس کے انداز میں اپنائیت بھرا شکوہ تھا۔ وہ آج خاصے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کسی ماہر بیوٹیشن نے اسے سنوارا ہوا اور اس پر چمکتے ہیروں کا

نیکلس، ہاتھوں میں گولڈ اور نگوں والے کڑے۔ ولید کو گمان گزرا وہ برسی میں نہیں کسی شادی کی تقریب میں شامل ہے۔

"ہم تو وقت سے پہلے آ چکے ہیں ابھی تو آپ کے مہمان "خصوصی" بھی نہیں پہنچے۔"

جواب سکندر کی طرف سے آیا تھا جس پر وہ صرف اسے دیکھ کر رہ گئی پھر رخ موڑ کر ولید کو دیکھنے لگی۔ جو گرے شلوار سوٹ اور ہلکی ایمبرائیڈری کی گہرے گرے کلر کی واسکٹ میں اپنے خوبصورت سراپے کے ساتھ بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔

یوں تو سکندر رضا بھی آج اہتمام سے تیار ہو کر آیا تھا بلیک ٹراؤزر اور وہائٹ شرٹ میں اس کی شخصیت بھی خاصی متاثر کن لگ رہی تھی مگر آمنہ علی کی نگاہیں تو ولید حسن کے گرد طواف کر رہی تھیں۔

"مہمان خصوصی تو بس پہنچنے والے ہیں مگر تمہیں یوں غیروں کی طرح نہیں آنا چاہیے تھا میں تو کل سے ویٹ کر رہی ہوں میرا خیال تھا تم برسی سے ایک دن پہلے تو ضرور آؤ گے۔"

وہ ناز بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ولید مسکرایا اور اس سے پہلے کہ کچھ کہتا سکندر بہت زور سے کھانس کر پھر بولا۔

"کیوں آپ کو کیا سارا انتظام اسی بیچارے سے کروانا تھا یا شاہ صاحب کی روح سے خصوصی ملوانا تھا۔ بڑے بوڑھوں سے سنا ہے برسی سے کچھ دن پہلے مرحومین کی روحیں آتی ہیں گھر والوں کو ڈائریکشن دینے۔"

یہ خالص اس کی اپنی بھونڈی بکواس تھی جو وہ بزرگوں کے سر ڈال رہا تھا۔ ولید بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپانے کی غرض سے چہرہ موڑ کر داخلی دروازے کی طرف داخل ہونے والی گاڑی کو دیکھنے لگا جس سے کوئی پارلیمنٹ کا رکن اترا تھا۔ مع دو باڈی گارڈز کے' جو بڑی بڑی مونچھوں والے اور گن بردار تھے (یوں بھی اس طرح کے باڈی گارڈ رکھنا اب اسٹیٹس سمبل بن چکا تھا)

آمنہ علی نے کھانے والی نظروں سے سکندر کو دیکھا تھا اس کے خوبصورت چہرے پر ناگواریت سمٹ آئی پھر وہ تڑخ کر بولی۔

"برائے مہربانی آپ اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھئے۔"

اور جواباً وہ سر کو تسلیم خم کرتے ہوئے بولا۔ "جی ضرور مگر آپ ہماری سیٹ کی رہنمائی تو کریں گی۔"

"آپ کے لیے کوئی سپیشل سیٹ نہیں ہے کہ میں آپ کی وہاں تک رہنمائی کروں کہیں بھی بیٹھ جائیے جہاں جگہ ملے۔" وہ اسی لہجے میں بولی۔

"چلیں یہ تو بہت اچھی بات ہے پھر تو میں وہاں بیٹھ جاتا ہوں۔" اس نے سٹیج کے اوپر رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر آمنہ علی کے بھینچے ہوئے لبوں کے کھلنے سے پہلے ہی خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی آمنہ علی نے یوں سانس بھری جیسے کسی قید سے رہائی ملی ہو۔ کوئی بوجھ اترا ہو۔ کوئی بڑی بلا سر سے ٹلی ہو۔ اس کے چہرے کے زاویے دھیرے دھیرے ڈھیلے پڑ گئے وہی خوشگوار مسکراہٹ لبوں پر رقص کرنے لگی۔

"آئو بابا سائیں سے مل لو وہ تمہارا کئی بار پوچھ چکے ہیں۔"

اور ولید حسن اس کی ہمراہی میں چلنے لگا' ساتھ ساتھ وہ اطراف کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ ایک عجیب سا سحر تھا جس میں وہ خود کو اچانک ہی گرفتار محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ سحر بیرونی ماحول کا نہیں تھا بلکہ اس کے اپنے اندر سے اٹھا تھا جو اسے آکٹوپس کی طرح جکڑ گیا تھا۔ اس کی نظریں بڑے بڑے پوسٹروں پر جمی تھیں جن پر مرحوم علی شاہ صاحب کی تصویریں تھیں اور ہر تصویر کے نیچے ایک شعر رقم تھا:

گمان آباد ہستی میں یقین مرد مسلماں کا

بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

اس طرح سے دوسرا شعر دوسری تصویر کے نیچے لکھا تھا:

کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا

شعلہ گردوں نورد اک مشت خاکستر میں تھا

"ولید اس سے ملو یہ میرا چھوٹا بھائی اکبر ہے۔" آمنہ علی اس سے کہہ رہی تھی۔ اس نے چونک کر ذرا سا نگاہوں کا زاویہ بدلا تو ایک خوش شکل لڑکا بلیو جینز اور لائٹ بلیو شرٹ میں آمنہ کے قریب کھڑا تھا۔ چہرے پر رسمی مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں میں حقیقی توصیف کی چمک۔

اس نے ولید کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔

''تم ملے نہیں تھے نا اس سے' اسے بھی بڑا شوق تھا تم سے ملنے کا۔'' آمنہ علی بولی۔وہ خوشدلی سے آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے ہلکے سے خود سے لگا لیا۔

''نائس ٹو میٹ یو۔''

''می ٹو۔'' اس نے آنکھوں کو جنبش دے کر سر سے پیر تک جائزہ لیتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔کچھ لاپرواہ' کھلنڈرا قدرے مغرور اور کسی حد تک امیری کے زعم میں مبتلا لڑکا محسوس ہوا تھا۔

''امی نے جو آپ کی تعریف کی تھی آپ تو اس سے بھی زیادہ گڈ لکنگ نکلے۔'' وہ بڑے بے ساختہ پن سے بولا تھا۔اس کی نظریں ولید کے شاندار سراپے پر جمی تھیں۔

اس ستائش پر ولید نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے آمنہ علی کو دیکھا۔

''اس کا مطلب ہے آمنہ نے میری تعریفیں کرنے میں تھوڑی کنجوسی دکھا دی۔''

''اوہ نو' تعریفیں تو خیر بہت تھیں مگر اسے شاید وہ الفاظ نہیں ملے ہوں گے جو آپ کی تعریف پر پورے اترتے۔'' اس کی بات پر ولید محظوظ ہو کر بے ساختہ ہنس دیا اور ایک بار پھر اس کا جائزہ لیا۔

وہ شکل سے اتنا حاضر جواب اور عقلمند نہیں دکھائی دیتا تھا مگر ولید کو محسوس ہوا بے وقوف بھی بہر حال نہیں تھا۔وہ کندھے پر ہلکا سا تھپکنے کے انداز میں ہاتھ مار کر آمنہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا جہاں مردان شاہ اور توقیر شاہ کھڑے تھے۔اور کوئی آدھے گھنٹے بعد وہ گھوم پھر کر اپنی کرسی کی طرف آیا اور سکندر کے برابر آکر بیٹھتے ہوئے گہری سانس بھری تو سکندر نے چہرہ موڑ کر اسے بغور دیکھا۔

''ولید میں سخت جیلس ہو رہا ہوں۔''

''ہاں ہیں محسوس کر رہا ہوں۔'' وہ پلٹ کر گھور کر اسے دیکھنے لگا جب کہ وہ بے چارگی کے لہجے میں بولا۔

"آج تو میں بھی اچھا خاصا نظر لگنے کی حد تک حسین لگ رہا ہوں، لاکھوں نہ سہی، ہزاروں تو مجھ پر بھی مرتی ہیں۔" ولید نے بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ کو ہونٹوں کے گوشوں میں ہی دبالیا اور قدرے ملائمت سے تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

"کیا کیا جاسکتا ہے سمجھو کہ وہ مرنے والی "ہزاروں" میں کوئی بھی یہاں ہے ہی نہیں یہاں۔لاکھوں میں سے ایک والی ہیں۔"

"اوئے ہوئے۔" وہ برجستہ سیٹی بجا گیا۔ پھر یکلخت اگلی پچھلی سیٹوں پر موجود لوگوں کا خیال کرتے ہوئے ہونٹ سکوڑ لیے اور لہجہ دھیما کر لیا۔ "صاف صاف تعریف کیوں نہیں کر ڈالتے کہ دل پہلو میں مچل مچل کر قصیدہ خوانی پر اکسا رہا ہے اور یہ گانے کو چاہ رہا ہے۔

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات

"بی سیریس سکندر!" اس نے جواباً گھور کر اسے دیکھا۔

"ہم یہاں برسی میں آئے ہیں۔" اس نے جیسے یاد دلایا تو سکندر زور زور سے سر ہلانے لگا۔

"ارے ہاں، مجھے تو یاد ہی نہیں رہا، تبھی تم غم واندوہ کی تصویر بنے ہوئے ہو، بائی دی وے یہ اہتمام آپ نے مرحوم کی روح کو مسرت بخشنے کے لیے ہی کیا ہوگا یقیناً۔" اس نے اس کے سراپے پر نظریں دوڑائیں۔

"میرا خیال ہے تمہیں یہاں کی روداد لکھنی ہے، میری سرگزشت نہیں۔" وہ لفظ چبا کر بولا پھر سامنے دیکھنے لگا جہاں سٹیج پر مقررین جمع ہو کر اپنی اپنی کرسیاں سنبھال رہے تھے۔

"اور تم ٹھہرے سچے صحافی اور سچ لکھنے کے لیے یقیناً تمہیں اپنی آنکھیں استعمال کرنی ہوں گی تو از راہ مہربانی کان اور آنکھیں کھول کر سامنے دیکھو آنکھیں اور کان بند کر کے تو میں بھی لکھ سکتا ہوں۔"

سکندر نے فوراً ہی اپنا قہقہہ نہ دبایا ہوتا تو شاید اسے اچھی خاصی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ولید نے ٹھیک ٹھاک پھٹکارہ تھا۔ وہ لاجواب سا ہو کر رہ گیا پھر اس کی نظریں بھی سامنے مرکوز ہو گئیں جہاں مردان شاہ کی پارٹی کارکن اور صوبائی وزیر "مرحوم" کی شان میں لکھی ہوئی تقریر کسی سکول بوائے کی طرح پڑھ رہا تھا۔ مووی کے کیمرے آن تھے۔ صحافی حضرات کے قلم تیزی سے چل رہے تھے۔

''مرحوم کی جدوجہد کا محور ہمیشہ سے ہر طرح کے استحصال کا خاتمہ' مظلوم طبقات کے حقوق کا حصول رہا ہے۔ گائوں کے مکینوں کے حقوق کی جدوجہد ہمیشہ ان کا مشن رہا ہے۔ وہ گائوں کے چپے چپے میں تعلیم عام کرنے کے خواہشمند تھے۔'' پھر اس طرح اٹکتے ہوئے شعر پر اختتام کیا۔

کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا

شعلہ گردوں نورد اک مشتِ خاکستر میں تھا

پھر چند مقررین کے بعد مردان علی شاہ خود ڈائس پر آئے پہلے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بھاری بھاری آواز میں بولنے لگے۔ وہ مرحوم کی سیاسی اور قائدانہ خوبیوں سے ہٹ کر ان کی ذاتی زندگی پر روشنی ڈال رہے تھے۔ ''مرحوم اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں ایک صاف ستھرے اور پاکیزہ سیرت انسان تھے۔ ان کے ساتھی' ان کے رفقاء آج

بھی گواہی دیتے ہیں کہ ان جیسا صبر و تحمل کا پیکر سیاسی لیڈر مشکل سے ملے گا۔'' سکندر نے لکھتے لکھتے اچانک ولید کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔

''مرحوم میں دنیا جہاں کی بلکہ تمام آفاقی خوبیاں بھی تھیں تو بیٹے میں ایک آدھ بھی منتقل کیوں نہ ہو پائی۔''

''بیٹا مرحوم ہو جائے گا تو خود بخود ساری خوبیاں بلکہ جو بیان ہونے سے رہ گئی ہیں وہ بھی اس میں منتقل ہو جائیں گی۔'' جواباً سکندر کی دبی دبی ہنسی بکھر گئی۔ اس نے بال پین کا سرا دانتوں میں دبا کر بھنویں اچکا کر اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''اپنے مستقبل کے خسر کی شان میں خود گستاخی کر رہے ہو۔ میں عرض کروں گا تو شکایت ہو گی۔'' اس نے بے ساختہ لب بھینچ کر چہرہ اس کی جانب موڑا تھا پھر دھیمے اور پرسکون لہجے میں گویا ہوا۔

''میں سفاکی کی حد تک حقیقت پسند ہوں تم جی بھر کر ''سچ'' لکھ سکتے ہو۔ میں ہر رشتہ' ہر تعلق الگ الگ خانوں میں رکھتا ہوں اور ہر انسان کو اس کے بیک گرائونڈ کے تناظر میں نہیں

اس کی اپنی شخصیت، گفتگو اور اس کے رویوں میں دیکھتا ہوں۔" وہ خاصا سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا پھر گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"از راہ مہربانی سکندر! تمہیں میرے مستقبل کے ساتھ کسی سے اور کسی طرح کے رشتے جوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو نظر آرہا ہے وہ دیکھو، وہی لکھو، مستقبل کی پیش گوئی تمہارا کام نہیں ہے تم بھول رہے ہو کہ تم ایک صحافی ہو، نجومی نہیں۔"

اس کے لبوں کی تراش میں دھیمی مسکراہٹ تھی مگر لہجہ تنبیہی تھا۔ سکندر محظوظ ہو کر مسکرانے لگا اور دوبارہ بال پین پرچے پر چلانے لگا۔ کچھ لمحے توقف کے بعد سر اٹھا کر ولید کی طرف دیکھا جو مردان شاہ کی موجودہ پارٹی کے رکن کی تقریر سن رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے اسے پھر ٹہوکا مارا تو ولید نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

در حقیقت وہ تقریر سن نہیں رہا تھا بلکہ اس کا ذہن کسی اپنے ہی خیال میں گم تھا اور تسلسل ایک چھناکے سے ٹوٹا تھا جبکہ سکندر اپنی ہی دھن میں نہایت سنجیدگی سے بلکہ الجھن بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"یار ولید! میں سوچ رہا ہوں کہ کیا مرحوم شاہ صاحب واقعی ایسے ہی تھے جیسا بیان کیا جا رہا ہے یا یہ مردہ پرستی ہے جو ہمارے یہاں کی روایت ہے یا پھر کسی سیاسی..."

ولید کے اندر اضطراب کی ایک لہر جیسے پھوٹی تھی۔ اس نے کچھ چونک کر پھر قدرے خالی خالی نظروں سے سکندر کو دیکھا تھا جیسے کوئی بچہ بہت ہی انوکھا لمحہ بھر کو سوچ میں دھکیلنے والا سوال کر دے۔

وہ خود اپنی اس سوال پر ہونے والی کیفیت پر حیران رہ گیا پھر گہری سانس یوں کھینچ کر مسکرایا جیسے کوئی ناسمجھ کم فہم کی بات سن کر مسکراتا ہے۔

"تمہیں تو صرف برسی کا احوال لکھنا ہے، مرحوم کی سوانح عمری پر مضمون تو نہیں۔"

"ہوں، تجسس تو بہر حال ایک صحافی ہونے کے ناتے ہے مجھ میں۔ آخر اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ تو معلوم ہونا چاہیے۔"

سکندر کندھے اچکا کر بولا تھا۔ ولید اسے دیکھ کر رہ گیا پھر یکلخت نگاہوں کا زاویہ بدل کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنے سامنے کرسی کی پشت کر گھورنے لگا۔

ایک بے نام سا تناؤ رگوں میں محسوس ہو رہا تھا بلکہ اسے اپنے سارے اعصاب پر ایسا ہی اثر ہوتا محسوس ہوا تھا جیسے لوہے کے تنے ہوئے تاروں پر کسی نے کھٹ سے ہاتھ مار دیا ہو۔

X...X...X

"ارے رہنے دیجیے آغا جی! اسے بس بستر پر لیٹنے کا شوق چرایا ہے۔ بخار شخار کچھ نہیں ہے۔ یونیورسٹی کی خوب چھٹیاں ہو جائیں' پڑھائی سے جان چھوٹے بس ڈرامے ہیں۔"

تانیہ آغا جی کے ساتھ اس کے کمرے میں بولتی ہوئی داخل ہوئی۔ سنانا اسے ہی مقصود تھا۔ وہ تکیوں کے سہارے بیٹھی تھی۔ مونا بھابی اسے سوپ پلا رہی تھیں' پلٹ کر تانیہ کو دیکھ کر مسکرائیں اور چمچہ باؤل میں رکھ کر باؤل سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

"دیکھا' یہ تانیہ تمہیں بالکل ٹھیک سمجھتی ہے' آخر دوست جو ٹھہری۔" اسے پتہ تھا آغا جی تانیہ کو پکڑ کر لے آئے ہوں گے اس کی دل جوئی کے لیے۔ وہ یوں ہی پریشان ہو جاتے تھے اس کی معمولی بیماری پر بھی۔

"لاؤ دیکھوں تو کتنا بخار ہے آغا جی کی تو ممتا تڑپ گئی ہے۔"

وہ اس کے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی اور اس کی کلائی پکڑی تو اسے لگا جیسے اس کا ہاتھ دہکتے ہوئے تندور پر جا پڑا ہو۔ یوں انگلیاں دہکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس نے لب بھینچ کر شہرینہ کا چہرہ دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کے چہرے پر کسی نے سرخ رنگ کا برش پھیر دیا ہو۔ چہرے کے ساتھ بھوری آنکھیں بھی سرخ اور انگارہ سی محسوس ہو رہی تھیں۔

"معمولی بخار ہے بس آغا جی تو یوں ہی پریشان ہو گئے ہیں۔" وہ نرمی سے تانیہ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔

"معمولی ہے تو پھر بستر پر پڑی کیا کر رہی ہو۔ نیچے اترو' بھاگو' دوڑو۔" تانیہ نے اسے آنکھیں دکھائیں مگر وہ مسکرا بھی نہ سکی اور پشت پر رکھے تکیے پر دھیرے سے سر رکھ کر تھکے تھکے انداز میں لیٹ گئی۔

"کبھی کبھی انسان دوڑتے دوڑتے تھک بھی تو جاتا ہے یوں ہی سستانے کو بھی تو جی چاہتا ہے۔"

"ارے واہ!" تانیہ بیڈ سے اتر کر آغا جی کی طرف منہ کرتے ہوئے بولی۔ "دیکھیں آغا جی! دو دن کے بخار نے فلسفی بنا دیا ہے آپ کی پوتی کو۔ اس کا مطلب ہے فلاسفر حضرات بخار میں ہی فلسفہ جھاڑتے ہوں گے۔"

"بچے میں سوچ رہا ہوں کہ آخر اسے بخار ہوا کس بات پر ہے۔" آغا جی اس کے سرہانے کھڑے ہو کر اس کا بغور جائزہ لینے لگے تو وہ پلکیں اٹھا کر انہیں ناراض انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا دنیا میں صرف میں واحد ہوں جو بیمار ہوئی ہوں۔ آپ کسی بھی ڈاکٹر سے پوچھ لیجئے وہ بخار کی وجہ وائرس ہی بتائیں گے۔ کمال کرتے ہیں آپ بھی آغا جی۔"

"بھئی تو اس وائرس ہی کی تو کھوج ہے جس نے تم پر حملہ کر دیا ہے۔" آغا جی کی اس بات پر تانیہ اور مونا بھابی بھی بے ساختہ ہنس دیں پھر مونا بھابی لائونج میں رکھے فون کی بجنے والی گھنٹی پر باہر نکل گئیں۔

"بالکل، جس وائرس نے بھی حملہ کیا ہے اسے ہی کھوجنا ہے ہمیں۔" تانیہ بھی آغا جی کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے تانیہ کو گھور کر دیکھا۔

"کیوں، اسے کھوج کر گولی سے اڑانا ہے کیا؟"

"ہاں، گولی سے ہی اڑانا ہے مگر تم اڑائو گی، اپنے اندر مدافعت پیدا کرو، وہ خود بخود مر جائے گا بغیر گولی کے۔"

آغا جی نے جھک کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اس کے چہرے پر تفصیلی نگاہ ڈالی تو وہ جانے کیوں پلکیں جھپکا گئی۔

"تانیہ بچے! اس کا بخار اب تمہیں ہی اتارنا ہے۔" وہ سیدھے ہو کر تانیہ سے بولے اور کمرے سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد شہرینہ کے بیڈروم میں کتنے ہی لمحے بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ وہ آنکھیں موندے پڑی رہی جبکہ تانیہ اس کا چہرہ ٹٹولتی رہی پھر ایک گہری سانس بھر کر اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر بولی۔

"یاد ہے شیری! ایک بار تم ہی نے مجھے کسی سیانے کی بات سنائی تھی کہ کتنی احمقانہ بات ہے کہ دوسروں کی غلطیوں کا انتقام ہم خود کو اذیت دے کر خود سے لیں۔ تم تو بہادر ہوا کرتی تھیں شیری!"

تانیہ کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

بھورے کانچ کے اطراف کی سفیدی میں پھیلی سرخی میں گویا مزید اضافہ ہو گیا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے ان آنکھوں میں سورج ڈھلنے کا منظر اتر آیا ہو۔

"مگر لگتا ہے تم مجھے بزدل ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہو۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"کیا مطلب..." تانیہ نے اسے گھورا۔

"میں آج بھی بہادر ہوں، تم سمجھ رہی ہو میں اکبر شاہ کی وجہ سے پریشان ہوں۔"

"تو پھر ٹینشن کس بات کی ہے؟" تانیہ نے الجھ کر اسے دیکھا پھر سر نفی میں ہلاتے ہوئے خود ہی بولی۔

"کوئی بات ضرور ہوئی ہے، اس نے تمہیں ایسا کچھ ضرور کہہ دیا ہے جس پر تم بری طرح ہرٹ ہوئی ہو اور اتنا ٹینشن لیا ہے اور تم کم از کم اس پر ہاتھ نہ اٹھاتیں۔"

"ربش، تمہارا مطلب ہے اس میں اتنی ہمت ہے کہ وہ مجھ سے کوئی ان ڈیسنٹ بات کر سکتا ہے۔" تانیہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی جیسے اس کے چہرے سے کچھ کھوجنا چاہ رہی ہو۔

"وہ مجھے اپنے دادا کی برسی کا دعوت نامہ دینے آیا تھا اور حسب عادت فضول گوئی بھی کرنے لگا اور تمہیں تو پتہ ہے اس دن میری طبیعت بھی کچھ مکدر تھی۔ بس ٹمپر لوز کر گئی۔ تم میرے مزاج سے اچھی طرح واقف تو ہو۔ اسے دیکھ کر میں کتنی جلدی ایموشنل ہو جاتی ہوں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے تانیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اپنی آنکھوں میں رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

"میں نے آج تک کبھی کچھ چھپایا ہے تم سے۔" تانیہ اپنے ہاتھ کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی کھینچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز تبسم کے ساتھ بولی۔

"چھپایا تو ہے۔"

"کیا؟" وہ چونکی مگر دوسرے پل اس کی آنکھوں کے شریر رنگوں نے اسے پلکیں جھپکنے پر مجبور کر دیا۔ ایک شرمگیں مسکراہٹ اس کے دہکتے سرخ ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"وہ اور بات ہے یہ بات تو میں خود سے بھی چھپاتی آئی تھی۔" اس کا لہجہ دھیما ہو گیا۔

"جی ہاں مگر یہ تو مجھ بے عقل میں تھوڑی عقل تھی جو جان گئی ورنہ تو محترمہ تاقیامت چھپاتیں۔" تانیہ کے جملے پر وہ بے اختیار ہنسی تھی۔ ایک خوشگوار اور لطیف سا احساس جیسے بوجھل دل پر چھایا تھا۔ وہ ذرا سا تکیہ اونچا کر کے بیٹھ گئی۔

"تم تھوڑی نہیں میرے اندازے سے کہیں زیادہ عقل مند نکلیں۔" اس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ جواباً تانیہ مصنوعی خفگی سے گھورنے لگی پھر ایک طویل قسم کی سانس خارج کرتے ہوئے پیچھے ہو کر کرسی سے لگ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

وہ کسی شاعر نے کہا ہے نا کہ آنکھوں کو ابھی خواب چھپانے نہیں آتے۔

تو جناب آپ اس کی تفسیر ہیں۔ میں ہی کیا کوئی کم عقل بھی اگر تمہارے اتنا قریب ہو تو وہ بھی جان جائے۔ میرا تو ماتھا اسی روز ہی ٹھنکا تھا جب نادیہ آپی کی منگنی والے روز ولید بھائی کے نہ آنے پر تمہارا خوش باش چہرہ اتر گیا تھا۔ تم جھنجلائی جھنجلائی پھر رہی تھیں۔ اس سے ایک دن پہلے ولید بھائی کا مذاق اڑانا تمہیں کچھ زیادہ ہی کھلا تھا اور..."

"اچھا بس نا۔" وہ خواہ مخواہ ہی شرمندگی محسوس کرنے لگی۔ تانیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ بھی ہلکے سے ہنس دی اور دائیں طرف جھک کر دراز سے ایک میرون جلد والی ڈائری نکالی اور دراز بند کر کے ڈائری اپنی گود میں رکھ کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر تانیہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ کیا ہے؟" تانیہ کی توجہ ڈائری کی طرف ہو گئی۔ وہ شہرینہ کا چہرہ دیکھنے لگی جس پر بڑے خوبصورت رنگ بکھر آئے تھے۔ اس نے ڈائری پر نرمی سے یوں ہاتھ پھیرا جیسے وہ سخت جلد والی ڈائری نہ ہو'

کوئی گداز بدن ہو جس کا لمس انگلیوں میں مہک اتار دیتا ہو پھر اس نے یہ ڈائری تانیہ کی طرف بڑھائی۔

"تانی! اس میں میرے جذبوں کا بڑا کھلا اظہار ہے جو میں کبھی اس شخص کے سامنے نہیں کر پائی اور شاید نہ کر پاؤں۔

تانی اس میں ایسا طلسم ہے کہ وہ موجود ہوتا ہے تو میرا دل منجمد ہو جاتا ہے۔ جذبے ٹھٹھر کر دل کے کسی گوشے میں دبک جاتے ہیں۔ بس وہی حاوی سا رہتا ہے مگر جب تنہا ہوتی ہوں اس ڈائری کے پاس ہوتی ہوں تو لگتا ہے جیسے آس پاس' اوپر نیچے' ہر جگہ' وہ اور مہکتے

جذبے بول رہے ہوں۔ وہ مجھے خود سے قریب' اتنا قریب اتنا قریب محسوس ہوتا ہے تانی کہ اس کے کھو جانے کا ڈر لگنے لگتا ہے۔

جو بہت قریب ہوتے ہیں تانی وہ کبھی کبھی بہت دور کیوں نظر آنے لگتے ہیں۔"

وہ یوں بولی جیسے خود سے پوچھ رہی ہو۔ اس کا لہجہ بے حد دھیما تھا۔ اس کے چہرے پر جذبات کی سرخی تھی۔

تانیہ نے ڈائری تھام کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا۔

"تانیہ..." وہ اس کی طرف دیکھنے لگی مگر دھیان کی رو کہیں اور ہی بہہ رہی تھی۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہیں میں تنہا ہی تو آرزوؤں کے یہ ایوان نہیں سجا رہی۔ کہیں یہ یکطرفہ خواب ہی نہ ہوں۔ یکطرفہ خواب تو عذاب ہوتے ہیں نا۔" وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اپنے ہاتھ دیکھنے لگی۔ اور تانیہ' شہرینہ کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

کسی سربستہ راز سے واقف ہو رہی ہو۔

اتنی شوخ وشنگ لاپرواہ سی لڑکی اور اس قدر شدت پسند بھی ہو سکتی ہے۔

وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ولید سے بات بات پر جھگڑنے والی اسے اس قدر چاہتی ہے کہ اس کے کھو جانے کا ڈر بھی شدت سے حاوی تھا۔

بے نام اندیشے اس کے دل کے گرد مکڑی کی طرح جال بن چکے تھے۔ واہموں اور خوف کی شدت در حقیقت "محبت" کی شدت کو ظاہر کرتی ہے۔ آپ جس سے جتنی زیادہ محبت کریں گے اس کی کم توجہی' اس کی دوری' اس کے کھو جانے کا خوف اتنا ہی زیادہ ہو گا۔

بہر حال یہ دن اندیشوں اور واہموں میں گزارنے کے تو نہ تھے۔ ابھی تو اپنی محبت کے سرسبز کھلیانوں میں ناچنے' مسرور ہونے کے دن تھے اور بھلا ولید حسن کو کون چھین سکتا تھا شہرینہ جیسی پیاری' معصوم' دلربا لڑکی سے۔

تانیہ سر جھٹک کر یوں ہنس پڑی جیسے کسی نادان کی نادانی پر ہنسا جائے۔ پھر ڈائری پر ہاتھ مار کر ماحول پر چھا جانے والی گمبھیر وحشت کی دھند کو جھاڑنے کی غرض سے بولی۔

"اس کا مطلب ہے یہ ڈائری مجھے ولید بھائی تک پہنچانی پڑے گی تاکہ تمہارے جذبات ان تک..."

"نہیں نہیں تانیہ! بے وقوف! ایسامت کرنا۔" وہ تانیہ کے مذاق کو اس کے شریر لہجے کو سمجھ نہ سکی اور سٹپٹا کر جلدی سے ڈائری پر اپنی گرفت مضبوط کرلی پھر گھورتے ہوئے بولی۔

"اب اتنی عقل مندی کا ثبوت دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ تو یونہی، تمہیں بھی جذبات میں آکر دے دی جانے میں کس دھیان میں تھی۔"

"ارے واہ... اب تو پڑھے بغیر نہیں دوں گی۔" تانیہ نے جھٹ سے ڈائری اس کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچ لی اور دونوں ہاتھ اونچے کر دیئے۔

"جذبات کا کچھ تو نقصان اٹھانا ہی پڑتا ہے نا اور تم نے سنا نہیں کہ حسن اور کم عقل اکثر یکجا ہوتے ہیں تو محترمہ تم نے کم عقلی کا ثبوت دیا ہے تو ہم جیسے عقل مند فائدہ اٹھائیں گے ہی نا۔"

وہ ہونٹ دبا کر اسے دیکھ کر رہ گئی پھر قدرے لجاجت سے بولی۔

"تانی! پلیز یہ ولید کو مت دینا۔" اس کے چہرے پر بڑی بے چارگی رقم تھی۔ تانیہ کو ہنسی کے ساتھ رحم آگیا وہ کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے بولی۔

"خیر، خیر میں پاگل تھوڑی ہی ہوں خواہ مخواہ اس شخص کو اتنا سر چڑھا دوں۔ یہ بتا کر کہ ایک خوب صورت حسینہ انہیں دل میں چھپائے ان کی محبت میں گھٹنوں گھٹنوں ڈوبے بیٹھی ہے۔ وہ محترم پہلے ہی کچھ کم مغرور نہیں ہیں کہ انہیں مزید ساتویں آسمان پر پہنچا دوں۔"

"اوہ" اس نے قدرے پرسکون ہو کر گہری سانس بھری تانیہ کی عقل، پر آج اسے واقعی اس کے عقل مند ہونے کا گمان ہوا تھا۔

X...X...X

"شیکسپیئر کے بقول مرد محبت میں موسم بہار کی طرح ہوتا ہے اور شادی کے بعد موسم سرما کی طرح ہوتا ہے۔" مگر تم تو ابھی سے موسم سرما دکھائی دے رہے ہو۔ مان جائو یار اتنے پیار سے روک رہی ہے تمہیں۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو ایک دن کیا عمر بتا دیتا یہیں پر مگر اف ہائے... وہ اک بار پیار سے روکے تو سہی۔"

ولید ایک ٹک اسے گھورتا رہا پھر کرسی سے اس کا لیدر کا چھوٹا بیگ اٹھایا اور زور سے اسے تھماتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے تم فوراً سے پیشتر یہاں سے روانہ ہو جائو۔اسی میں تمہاری عافیت ہے۔" اور جواباً سکندر نے ہنستے ہوئے تھینک یو کے ساتھ بیگ کسی قیمتی متاع کی طرح سینے سے لگالیا اور سر کو خم کرتے ہوئے بولا۔

"میں تو روانہ ہو ہی رہا ہوں مگر تمہیں یہی سمجھا رہا ہوں کہ تم کہیں میری محبت میں پیچھے پیچھے مت چلے آنا۔" ولید کی تیغ صفت نگاہوں کا اس پر کوئی اثر ہی نہ ہو رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا آمنہ علی کو آتے دیکھ کر کھسک جانا ہی مناسب سمجھا۔ہاں جاتے جاتے ایسی لمبی پر سوز آہ کھینچی کہ باوجود غصے کے ولید کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹ کوند ہی گئی۔

اس کے اخبار کا یونٹ شامیانے کے باہر ہی کھڑا تھا۔اس نے پلٹ کر ولید کی جانب کو ہاتھ ہلایا اور ان کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔ولید نے ایک گہری قدرے پر سکون سانس بھری اور کف اٹھا کر رسٹ واچ پر نظریں ڈالیں کہ آمنہ علی نے آگے بڑھ کر اس کی سلور چمکتی گھڑی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے ٹائم دیکھنے کی۔ تمہیں یہیں رہنا ہے آج رات یہ میرا ہی نہیں بابا سائیں کا بھی حکم ہے۔"

اس نے بے حد اطمینان سے اس کے ہاتھ کی اس رکاوٹ کو دیکھا پھر اس کا ہاتھ ہٹا کر سرسری نگاہ گھڑی پر ڈال کر ہاتھ پہلو میں گراتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

"نہیں آمنہ آج میں بالکل نہیں رک سکتا۔ کل بہت ضروری میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔"

"کیا وہ میٹنگ مجھ سے بھی زیادہ اہم ہے۔" وہ اس کے ہمراہ حویلی کے پھاٹک میں داخل ہوتے ہوئے ذرا سا ٹھہر کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

اس کی آنکھیں خوابناک سی ہو گئی تھیں۔ پتہ نہیں یہ اس کی حقیقی کیفیت تھی یا وہ زبردستی ان میں یہ تاثیر پیدا کر رہی تھی۔

ولید پھاٹک کے اطراف کی گرل پر ہاتھ رکھ کر اسے متبسم نگاہوں سے تکتے ہوئے بولا۔

"میں تمہارا موازنہ بھلا ایسی چیزوں سے کیسے کر سکتا ہوں' انسانوں اور کاموں کی علیحدہ علیحدہ اہمیت اور حیثیت ہوتی ہے۔" پھر آنکھوں کو ہلکے سے جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"بہر حال وہ تم سے اہم نہیں ہو سکتی مگر کچھ غیر اہم کام بھی وقت پر ہی نمٹانے پڑتے ہیں۔"

"تمہیں لفظوں سے بہلانا خوب آتا ہے ولید مگر میں بہلنے والی نہیں ہوں۔" وہ محظوظ ہو کر ہنسی تھی اور آگے بڑھ گئی۔ اس یقین اور اعتماد کے ساتھ کہ وہ اس کے پیچھے چلا ہی آئے گا۔

اس کے تمام ایکس کیوز دھرے رہ جائیں گے مگر ولید حسن وہیں جما رہا' اس کے چہرے پر اب الجھن اتر آئی تھیں۔ اس کا ذہن تیزی سے گزرتے وقت کی طرف تھا' فضا میں پھیلا سکوت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ حالانکہ حویلی کے ملازم ادھر ادھر بھاگتے کاموں میں مصروف دکھائی دے رہے تھے اور برسی کے بعد بکھرے ہوئے فرنیچر کو سمیٹ رہے تھے۔

آمنہ علی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تم مجھے نظرانداز کر کے چلے جاؤ گے۔" وہ کچھ مایوس سی ہونے لگی۔

"نہیں اس لیے کہ مجھے خبر ہے تم ناراض نہیں ہو گی اور پھر اچھے دوستوں کو یوں بھی آزمانا نہیں چاہیے' ایسا نہ ہو کہ تم ایک اچھے دوست سے محروم ہو جاؤ۔" اس نے انگوٹھا اپنے سینے کی طرف کر کے کہا تھا۔ پھر دو قدم آگے بڑھ کر دلکشی سے مسکرایا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بھرپور تھی یوں لگا جیسے ہر شے ہی مسکرا اٹھی ہو۔

آمنہ علی کو اپنا دل پہلو سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ مخمور انداز میں سینے پر ہاتھ لپیٹ کر اسے دیکھنے لگی پھر اس کے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

"تم سے میں نہیں جیت سکتی۔ تم بہت بڑے جادوگر ہو۔"

اس کی بات پر ولید نے ایک گہری سانس بھری اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

"آج تک اتنے برے لفظوں میں میری کسی نے تعریف نہیں کی' جادوگر... مائی گڈ نیس۔" پھر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"تمہاری تعریف کے لیے تو میرے پاس اس سے بھی برے الفاظ ہیں کہو تو کروں۔"

وہ بھی محظوظ ہوتے ہوئے شرارتی انداز میں بولی تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"بالکل' بالکل نکال لو جتنی بھڑاس ہے دل میں اور میرے سامنے ہی نکال دو' پیٹھ پیچھے کرو گی تو غیبت میں شمار ہو گی۔"

"اچھا بکو مت یہ بتاؤ بابا سائیں کا بھی حکم نہیں مانو گے۔" وہ ایک بار پھر اسے ہر طریقے سے روکنے کی سعی کرتے ہوئے بولی۔

"ان کا حکم سر آنکھوں پر مگر مجبوری کبھی کبھی محترم ہستیوں کے حکم سے بھی سرتابی پر مجبور کر دیتی ہے۔"

"اچھا۔" اس نے ایک خفیف احساس شکست کے ساتھ گرل سے ٹیک لگاتے ہوئے اسے دیکھا پھر سر ہلا دیا۔

"پھر کب آئو گے۔"

"زندگی رہی تو کئی بار آئوں گا بلکہ بار بار آئوں گا' یہ گوٹھ صرف تمہارا تو نہیں ہے میرا بھی ہے۔" وہ بڑے ٹھہرے گمبھیر لہجے میں بولا پھر ہنس دیا۔

"ہے نا۔"

"ہاں اگر سمجھو تو۔ اینی وے میں کل شہر آ رہی ہوں چلو کوٹھی تو آئو گے نا' اور ہاں کل رات میں تمہارے ساتھ ڈنر کرنا چاہتی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے آج رات نہ رکنے کی سزا سنا رہی ہو۔" وہ سر کھجا کر رہ گیا تو آمنہ نے اسے گھورتے ہوئے قریبی درخت کی شاخ توڑ کر اسے دے ماری۔

"یہ سزا ہے کیا۔" اس نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا تو وہ سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں بالکل نہیں! بلکہ عین راحت ہے میرے لیے۔ ہاں اگر خرچ تمہاری جیب سے ہو تو۔" یہ کہہ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

وہ مصنوعی غصے سے اسے گھور رہی تھی پھر یکدم کھل کھلا کر ہنس پڑی اور محظوظ ہونے کے انداز میں بولی۔

"میں ڈنر تمہیں اپنے گھر میں دے رہی ہوں۔ بے فکر ہو کر آ جانا۔ ایک پائی کا بھی خرچ نہیں ہو گا کنجوس انسان!"

"کیا کروں حلال کمائی کا پیسہ دونوں ہاتھوں سے تو نہیں لٹایا جا سکتا نا۔ خون پسینے کی کمائی کا ہے۔"

"ولید میرا دل چاہتا ہے یہ گملا اٹھا کر تمہیں دے ماروں۔" وہ مصنوعی غصے سے غرائی تھی اور پیروں کے پاس رکھے سفید موزائک کے گملے کی طرف اس طرح دیکھا تھا گویا اٹھا کر دے مارے گی۔

"بصد شوق۔" وہ سر خم کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ہاتھ کے پتھر بھی پھول کی طرح لگیں گے۔"

وہ بے ساختہ ہنسی تھی اور آنکھیں گھما کر اس کا سر تا پا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"بڑا تجربہ ہے کتنے کھائے ہیں ایسے پھول؟"

"ہر چیز کا تجربہ بھی ضروری نہیں ہوتا۔ مشاہدہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ گلی گلی محلے محلے ایسے ہیرو بکھرے پڑے ہیں جو ایسے پھولوں کو تمغہ جرات کی طرح سروں اور سینوں پر سجائے پھرتے ہیں۔"

"تو آج تجربہ بھی کر لو ناں تمہارا نام بھی ان ہیروز کی فہرست میں آجائے۔"

اس کی بات پر وہ گہری سانس بھر کر اسے دیکھنے لگا پھر فرش سے اپنا چھوٹا بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اگر جلدی میں نہ ہوتا تو یہ سعادت بھی ضرور حاصل کر لیتا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا۔ آمنہ علی زور سے ہنسی تھی اور اس کے ساتھ اس کی پارک کی ہوئی گاڑی کی طرف آگئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوا تب تک کھڑی رہی پھر اندر چلی آئی۔

ملازم ابھی تک مصروف نظر آرہے تھے۔ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتی گلاس ڈور کھول کر لابی میں داخل ہوئی اور تھکے تھکے انداز میں جمائیاں لیتی اپنے بیڈ روم کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگی کہ اکبر شاہ کے کمرے کے کھلے دروازے پر یونہی نظر گئی۔ اس کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا اور اکبر شاہ اپنے بیڈ پر بیٹھا اپنے آگے رکھے بیگ میں اپنی ضرورت کی چیزیں بھر رہا تھا پھر جھک کر جو گرز سے موزے نکال کر پہننے لگا وہ اندر آگئی۔

"کیا واپس جا رہے ہو؟" وہ آواز پر چونکا اور سر اٹھا کر آمنہ کو دیکھا پھر سر ہلا دیا اور جو گرز میں پیر ڈال کر جو گرز سمیت پیر اٹھا کر تسمے کسنے لگا۔

"آخر رات کو جانے کی کیا ضرورت ہے کل ساتھ ہی چلیں گے۔" وہ بولی تو وہ مسکرایا اور بیڈ سے اتر کر ڈریسنگ سے اپنی رسٹ واچ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "او نو سسٹر صبح مجھے

یونیورسٹی جانا ہے اور بہت ضروری جانا ہے۔" اس نے برش اٹھا کر بالوں میں پھیرا پھر پرفیوم اٹھا کر سپرے کرنے لگا۔

"او ہو اتنے پڑھاکو کب سے ہو گئے ہو جو اتنی ایجوکیشن کی فکر پڑ گئی۔"

وہ آئینے میں اپنا سراپا تک رہا تھا اس کی بات کے جواب میں اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "ایجوکیشن کی فکر کس کافر کو ہے یونیورسٹی صرف پڑھنے ہی تو نہیں جایا جاتا۔"

"تو پڑھانے کے لیے جا رہے ہو۔" وہ معنی خیز تبسم کے ساتھ اسے دیکھنے لگی۔ "تیاری تو بتا رہی ہے کہ ابھی سیدھے وہیں اترو گے۔"

وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور زور سے ہنسا۔

"ہاں پڑھانے ہی سمجھ لو بلکہ سبق سکھانے زیادہ موزوں رہے گا۔" یہ کہہ کر اس نے بیگ کی زپ بند کی اور اسے اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔

"اکبر بات سنو!" وہ جلدی سے بولی تھی۔ وہ پلٹتے پلٹتے رکا تھا اور دوبارہ اس کی طرف مڑا جو کچھ تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"معاملہ گڑبڑ لگ رہا ہے کیا بات ہے میں صبح سے نوٹ کر رہی ہوں تم آج پورا وقت فریش نظر نہیں آئے بلکہ کچھ کھنچے کھنچے اور ناراض سے نظر آتے رہے۔"

اکبر شاہ نے ایک طویل سانس کھینچ کر فضا کے سپرد کرتے ہوئے اسے دیکھا اور پھر دھیرے سے مسکرا دیا۔

"میرا خیال ہے سسٹر! تم کو ٹھی آؤ گی تو پھر بات ہو گی۔" وہ رخ پلٹتے ہوئے بولا۔

"اگر دادا سائیں کی برسی بیچ میں نہ آجاتی تو معاملہ گڑبڑ بلکہ بگڑ ہی گیا ہوتا۔ اینی وے اب میرے خون میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ مجھے اب پتہ چلا کہ جذبات سے زیادہ دماغ سے کام لیا جائے تو بہتر اور حسب منشاء نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اب میں بھی ادا تو قیر کی طرح ٹھہر ٹھہر کر ٹھنڈا کر کے کھاؤں گا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا وہ لپک کر آئی۔

"مگر کسے میرا مطلب ہے کیا۔" اس کے لہجے میں تجسس ابھر آیا۔

وہ دروازے کے فریم میں ایک ہاتھ جما کر ذرا سا پلٹا پھر آنکھیں سکیڑ کر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"شہرینہ خان کو۔" پھر رکا نہیں اور تیر کی طرح دروازے کی کمان سے نکل کر سیڑھیاں پھلانگ گیا۔

"اوہ۔" آمنہ علی ہونٹ بھینچ کر رہ گئی اور جیسے بے زاری سے سر جھٹک کر کمرے سے نکل کر اسے لابی میں دیکھ کر سوچنے لگی۔

"آخر اس میں ایسا کیا ہے جس نے تمہیں، مردان علی شاہ کے بیٹے کو اتنا دیوانہ بنا ڈالا ہے... شٹ کیا شہر کی دوسری ساری لڑکیاں مر کھپ گئی ہیں جو اس کے پیچھے اتنا خوار ہوا جائے۔"

مگر وہ یہ بات اکبر شاہ کو سمجھا نہیں سکتی تھی کہ وہ کون سا سمجھ جاتا اور یوں بھی اسے اپنی ذات کے علاوہ کسی سے کوئی ایسی زیادہ دلچسپی بھی نہ تھی۔

X...X...X

ولید حسن کو اپنے دروازے پر دیکھ کر ماسٹر دین محمد بے طرح خوش ہوا تھا۔ وہ اپنے صحن میں کم روشنی کے باوجود اسے اچھی طرح پہچان گیا تھا اور ایک طرف ہو کر اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

"آئو آئو پت خیر تو آھی؟ یوں تو میں آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کر رہا ہوں پر اتنی رات کوئی پریشانی تو پیش نہیں آگئی نا سائیں!" وہ جلدی جلدی صحن میں رکھی چارپائی کی چادر درست کرتے ہوئے بولا۔

"کوئی پریشانی نہیں ہے ماسٹر صاحب! اور اب اتنی رات بھی نہیں ہوئی۔ شہر میں تو اس وقت عموماً رات کا کھانا کھایا جاتا ہے۔"

وہ چارپائی پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ ماسٹر دین محمد ہنس دیا اور لالٹین ایک طرف رکھ کر ایک بند دروازے کو بجانے لگا۔ "یوسف او یوسف اٹھ پت ولید سائیں آھیو آھی۔"

"ارے رے اسے کیوں اٹھا رہے ہیں؟ سونے دیں ماسٹر صاحب!" وہ جلدی سے انہیں روکتے ہوئے بولا۔

"نہ سائیں اسے خبر ہو گی کہ آپ آئے تھے اور ملے بغیر چلے گئے تو مجھ پر ناراض ہو گا۔"

"تو میں کون سا ابھی جا رہا ہوں، میں آج رات یہیں ٹھہروں گا۔ کیا ٹھہر سکتا ہوں؟" اس نے یہ کہہ کر جیسے اجازت چاہی۔

ماسٹر دین محمد کو پہلے تو اپنی سماعت پر جیسے یقین نہ آیا ہو' یوں وہ ولید کو دیکھنے لگا' پھر صحن کے در و دیوار پر نگاہیں ڈال کر الجھے الجھے بے یقین سے لہجے میں بولا۔

"یہاں اس گھر میں میرا مطلب ہے میرے اس چھوٹے سے گھر میں آپ..."

"ماسٹر صاحب!" ولید نے خاصی شاکی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے ان کی بات پوری نہ ہونے دی۔

"آپ انسانوں کو ان کے گھروں کی اونچی دیواروں اور چھتوں سے ناپتے ہیں مگر میرے نزدیک دیواریں اہمیت نہیں رکھتیں ان میں رہنے والے انسان اہمیت رکھتے ہیں۔ مجھے اونچی خوشنما دیواروں کے اندر ہی اطمینان بھری نیند آتی تو میں اس وقت حویلی میں ہی کیوں نہ رہ جاتا۔ وہیں سے تو آ رہا ہوں۔"

ماسٹر دین محمد شرمندہ سا ہو گیا۔ لالٹین ایک طرف رکھ کر خالی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ولید پتر! تم دل برا مت کرنا تم یہاں رہو ایک دن دو دن جتنے دن چاہو۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے پر میں تو تمہاری بے آرامی کا احساس کر کے کچھ پریشان ہو گیا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تھا۔ نیچی اور چھوٹی دیواروں میں تو بہر حال چھوٹے لوگ ہی رہتے ہیں۔" ان کا ٹھنڈا میٹھا لہجہ دھیما سا ہو گیا۔

ولید نے ناتمام روشنی میں ان کا جھریوں والا چہرہ دیکھا جس میں عجیب سی نورانی جاذبیت تھی۔ ایک روشنی نکل رہی تھی مگر یہ روشنی یہ نور صرف دیکھنے والی محسوس کرنے والی آنکھ ہی دیکھ پاتی ہے۔ دل کی آنکھیں جو حق اور باطل میں' ظلمت اور روشنی میں تمیز کر سکتی ہیں۔

اس نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے جوتے اتار کر چارپائی پر رکھے اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم والیٹ گیا۔

"بہت دکھ ہوتا ہے ماسٹر صاحب! جب آپ بھی یوسف کی طرح ہمارے اسی فیصد نادان لوگوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔" مجھے یاد ہے ایک بار آپ نے کہا تھا کہ ہر سوچ ہمارے اپنے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔"

اس نے گاؤ تکیے پر بازو اور کہنی جما کر ان کی طرف لیٹے لیٹے ہی رخ کیا اور بولا۔

"اور کہا تھا کہ کمزور سوچ کا انسان ایک کمزور سی شاخ توڑتے ہوئے بھی ڈرے گا کہ جانے وہ کتنی مضبوط ہو گی اور ٹوٹے گی بھی یا نہیں جبکہ ایک باحوصلہ مضبوط سوچ کا انسان مضبوط اور

تناور درخت کو بھی کسی شاخ کی طرح توڑ دے گا۔" یہ کہہ کر وہ ماسٹر دین محمد کو دیکھنے لگا جس نے اپنے سر کو اٹھا کر اسے دیکھا تھا پھر کتنی دیر بعد اس کی آواز ابھری جو ہلکی مرتعش تھی۔

"یہ بات میں نے کہی تھی؟" وہ ولید کو بغور دیکھ بھی رہا تھا۔

اس نے دھیرے سے مسکرا کر سر کو خفیف سی جنبش میں اثبات میں ہلایا۔ پھر یکدم سیدھا ہو کر تکیے پر سر رکھ کر چھت کے اکھڑے پلاستر کو تکنے لگا اور ہلکی آواز میں بولا۔

"ہاں یہ آپ ہی نے ایک بار کہا تھا۔"

X...X...X

"پیاری آپی! جلدی سے ایک کپ چائے دے دیں۔" وہ بالوں کی چٹیا بناتے ہوئے کمرے سے نکلی اور ربڑ بینڈ ڈال کر' چٹیا پشت پر پھینک کر برش سے ٹوٹے بال نکالنے لگی۔ نادیہ آپی نے ناشتہ چنتے ہوئے اسے دیکھا۔

"تم جا رہی ہو یونیورسٹی' رات تک تو ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا جانے کا۔" انہوں نے کپ اٹھایا اور کیتلی میں سے چائے انڈیلنے لگیں۔

وہ بیسن پر ہاتھ دھو کر پھر آئینے میں چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجبوری ہے اس لڑکی نے تو لمبی چھٹیاں کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اب میں بھی نہ گئی تو بڑا ہی حرج ہو جائے گا۔ جو کتاب ایشو کرائی تھی وہ بھی دینی ہے اور اسائنمنٹ بھی مکمل کرنے ہیں۔ تین تین ٹیسٹ دینے ہیں۔"

"اب کیسی طبیعت ہے شہرینہ کی۔" اماں بچھے ہوئے دستر خوان پر آ کر بیٹھتی ہوئی پوچھنے لگیں۔

"پہلے سے تو بہتر ہے مگر ابھی تھوڑی کمزوری ہے۔" وہ نادیہ آپی کے ہاتھ سے چائے لے کر تخت پر بیٹھ گئی۔

"یہ خالی خولی زہر کیوں اتار رہی ہو ناشتہ نہیں کرو گی کیا؟" اماں اسے چائے پیتے دیکھ کر بولیں۔ ان کے زہر کہنے پر وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

''بس اماں پیاری بہت دیر ہو گئی ہے اور میرے پاس زہر پینے کے لیے ہی وقت رہ گیا ہے۔ یہ نومی کدھر ہے میرا خیال ہے میں نومی کے ساتھ ہی چلی جاتی ہوں۔ سکندر بھائی تو ابھی شاید تیار نہیں ہوئے۔''

''نومی تو بہت سویرے ہی نکل گیا تھا۔'' نادیہ آپی نے دستر خوان پر بیٹھتے ہوئے اطلاع فراہم کی تو اماں کے ساتھ کمرے سے نکلتا سکندر بھی چونک اٹھا۔

''اتنی سویرے کیوں خیریت؟'' اس نے کف اٹھا کر کلائی میں بندھی گھڑی پر نظریں ڈالیں۔

''پتہ نہیں' میں فجر کی نماز پڑھ کر ابھی سونے ہی پائی تھی کہ اس کا کوئی دوست آ گیا تھا اسے بلانے' اتنی سخت نیند آ رہی تھی مجھے کہ اٹھ کر بس اس کے جاتے ہی دروازہ ہی بند کر سکی کچھ پوچھنے کا خیال ہی نہیں رہا۔''

نادیہ آپی یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں تو کمرے میں ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ سکندر کی پیشانی پر الجھن بھری لکیریں سی بن گئیں۔

''یہ بھلا کیسی نوکری ہے سکندر! اتنی صبح صبح بھلا کیا کام۔'' کئی لمحے کے سکوت کو اماں کی آواز نے توڑا تھا۔ سکندر ایک گہری سانس بھر کر کی بورڈ سے بائیک کی چابی اٹھاتے ہوئے بس اماں کو دیکھ کر رہ گیا پھر تانیہ سے بولا۔

''چلو تمہیں میں چھوڑ آئوں۔''

تانیہ نے چائے کا مگ خالی کر کے رکھا۔ تخت کے نیچے رکھے سینڈل پیروں میں ڈال کر اپنا جرنل اور بیگ اٹھا لیا پھر سکندر کو اپنے انتظار میں کھڑا دیکھ کر پریشان ہو کر بولی۔

''آپ ناشتہ تو کر لیں۔''

''نہیں میں واپس آ کر کر لوں گا۔ تمہیں ڈراپ کر کے مجھے آفس نہیں جانا بلکہ ایک دو کام نمٹانے ہیں اچھا اماں بس میں آدھے گھنٹے میں واپس آتا ہوں۔'' وہ یکدم بے حد سنجیدہ سا نظر آنے لگا تھا بلکہ کسی حد تک متفکر بھی۔

''مصیبت یہ ہے کہ شہرینہ صاحبہ نے مجھے سخت بور کر کے رکھ دیا ہے میرا موڈ یونیورسٹی جانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر اب پڑھائی بھی اپنی جگہ۔ اس کے بغیر دل نہیں لگے گا وہاں۔''

وہ بائیک پر سنبھل کر بیٹھتی ہوئی بول رہی تھی۔ سکندر نے پیڈل پر پائوں مار کر بائیک سٹارٹ کرتے ہوئے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کیوں؟ وہ یونیورسٹی کیوں نہیں آرہی؟“ اس کا اشارہ شہرینہ کی طرف ہی تھا۔

”آپ کو نہیں پتہ۔ دو تین دن سے وہ بیمار ہے۔ سخت بخار ہو گیا ہے محترمہ کو۔“

وہ اپنا بیگ کیریئر میں پھنساتے ہوئے بولی تھی۔ سکندر کے چہرے کے زاویوں کو محسوس ہی نہ کر سکی جن میں یکایک تشویش سی جھلکنے لگی تھی۔

”دوا وغیرہ لی یا یونہی پڑی ہے۔“

”کہاں؟ دوا کی تو وہ بہت چور ہے یہ تو آغا جی ڈانٹ ڈپٹ کر پلاتے ہیں‘ بہت ضدی ہے بس ولید بھائی سے ہی ذرا دبتی ہے۔“

بائیک گنجان سڑک پر لاتے ہوئے سکندر یکدم ہی کچھ بوجھل سا ہو گیا تھا۔ یوں بھی گائوں سے آنے کے بعد وہ خاصا لیٹ سویا تھا‘ نیند بھی پوری نہ ہو سکی تھی اور نیند کا تو وہ عادی ہو چکا تھا جس قسم کی جاب تھی اس میں اکثر ہی نیند پوری نہیں ہوتی تھی مگر نومی کے اس طرح

سویرے نکل جانے پر اور اب شہرینہ کی بیماری کا سن کر وہ پریشان سا ہو گیا تھا۔ طبیعت میں ایک بوجھل پن سمٹ آیا۔

”ولید بھائی کیا گائوں میں ہی ٹھہر گئے ہیں۔“ بائیک رکی تو تانیہ نے اترتے ہوئے یونہی پوچھ لیا۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”ولید بھائی کے گائوں جانے پر جانے کیوں شیری بڑی اپ سیٹ ہو جاتی ہے۔ بڑی بے وقوف لڑکی ہے اتنا سا تو دل ہے۔“ وہ بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے یہ کہہ کر ہنسی تھی اور خدا حافظ کہہ کر قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی۔ جبکہ سکندر کتنی دیر اس کی پشت کو گھورتا رہ گیا۔

X...X...X

کلاس روم کی جانب بڑھتے ہوئے تانیہ کے پیر ایک نادیدہ سا بوجھ محسوس کرنے لگے۔ اسے اپنا دل عجیب سے خوف کی اتھاہ میں ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ یہاں آنے تک تو اکبر شاہ کا خیال بھی نہ آیا تھا اور اب جیسے یکایک اس روز کا واقعہ نگاہوں میں لہرا گیا۔

اکبر شاہ کی وہ نگاہیں اسے اپنے وجود کے اندر پھر سے اترتی محسوس ہونے لگیں۔ یکدم وہ خود کو اتنے لوگوں کے ہجوم میں بھی تنہا محسوس کرنے لگی۔

اسے تو آج احساس ہوا کہ شرینہ کا وجود اس کے لیے کسی قدر تقویت کا باعث رہا ہے۔ وہ بظاہر نازک سی لڑکی اپنے اعتماد اور مضبوط کردار کے باعث اس کے لیے کتنی بڑی ڈھال رہی ہے۔

اس نے سوچا اسے ابھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ ابھی تو اکبر شاہ وہ چرکا بھی نہیں بھولا ہو گا جو شہرینہ نے لگایا تھا۔

’مگر، مگر بھلا اس میں میرا کیا قصور؟ وہ تو شہرینہ اور اس کا معاملہ تھا اور پھر وہ کسی تنہا جنگل یا بیاباں میں تو نہیں آ گئی ہے کہ وہ اسے درندے کی طرح چیر پھاڑ کھائے گا اف کس قدر کم ہمت اور بے وقوف ہو تانیہ تم۔‘

وہ خود کو سرزنش کرنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ وہ چہرے مہرے سے بھی اس وقت انتہائی چغد لگ رہی ہو گی۔ اس نے خود کو گھرکا اور اپنے تمام حوصلے سمیٹ کر قدم تیز تیز اٹھانے لگی کہ عقب سے اکبر شاہ کی آواز ابھری۔

”مس تانیہ رضا!“

تانیہ کو لگا اس کا کچھ دیر پہلے تنکا تنکا جمع کیا ہوا اعتماد یوں بکھر گیا ہو جیسے ساحل پر محنت سے بنایا ہوا ریت کا گھروندا ایک تند لہر کے آتے ہی بکھر جائے۔

”ایکسکیوز می مس تانیہ! بات سنئے گا پلیز۔“ وہ شاید اس کے پلٹنے کا منتظر رہا مگر اس کے بدن میں کوئی جنبش نہ ہوتی دیکھ کر خود قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا۔

اس نے ہاتھوں میں پکڑا ہوا جرنل سینے پر رکھ کر اس کے گرد سختی سے اپنے دونوں بازو حمائل کر دیئے۔ جیسے بے ہنگم دھڑکتے دل کو سہارا دینے کی کوشش کی ہو۔ اسے یوں ہی لگ رہا تھا کہ اس کا سینے کی دیواروں سے کسی دیوانے کی طرح ٹکراتا ہوا دل کہیں باہر ہی نہ آ گرے۔

”کیسی ہو؟“ خلاف معمول لہجہ تھا۔ وہ تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے پلکوں کے ساتھ ذرا سا چہرہ بھی اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

خلاف معمول لہجہ ہی نہیں، حلیہ بھی بدلا ہوا تھا۔ کلف لگے شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ سیدھی مانگ نکالے چمکیلے ریشمی بالوں کو یوں ہی بکھرانے کے بجائے سلیقے سے جمائے ہوئے تھا۔ چہرے پر بھی کسی قسم کی استہزائیہ مسکراہٹ تھی نہ ہی ایسا کوئی تاثر۔ وہ خاصے مہذب روپ میں کھڑا تھا، وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے گئی۔

”جج، جی میں ٹھیک ہوں۔“

”کیا تم اپنا تھوڑا سا وقت مجھے دے سکتی ہو۔ مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔“

وہ تو بس خیر خیریت کے آگے کا سوچ ہی نہ پائی تھی کہ اس نے گویا اس کے اعصاب پر پتھر ہی دے مارا۔ یوں بھی اس کے اعصاب ابھی سمندر کی موجوں کی طرح منتشر تھے' ایک پل ٹھہراؤ نہیں تھا۔ اب یہ خود ایک بڑی موج بن کر حملہ آور ہوا تھا۔

''وہ... مگر' میرا پیریڈ ہے۔''

''پلیز میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' وہ تیزی سے مگر شائستگی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا تھا۔ وہ چپ سی رہ گئی۔ یوں بھی اس میں اتنا حوصلہ ہی کب تھا کسی کی بات رد کرنے کا اور یہاں تو اکبر شاہ سامنے کھڑا تھا۔ مارے خوف کے اور نادیدہ سی دہشت نے اسے کھل کر انکار نہ کرنے دیا بلکہ وہ کسی روبوٹ کی طرح سر ہلانے لگی۔

''جی...''

''یہاں نہیں' بات اتنی مختصر بھی نہیں ہے کہ یہاں کھڑے کھڑے ہو جائے۔ یوں بھی ہم راستے میں کھڑے ہیں آئو پلیز' تانیہ مجھ پر ٹرسٹ کرو۔''

اس نے اس کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالی اور پلٹ کر چلنے لگا وہ بھی بادل نخواستہ اس کے پیچھے چل پڑی مگر پھر ٹھٹک گئی اس کے قدم کیفے ٹیریا کی جانب تھے۔

''میرا خیال ہے اکبر شاہ! بات یہاں بھی ہو سکتی ہے۔'' وہ ایک نسبتاً خاموش گوشہ تھا۔ اس نے ایک بڑے درخت کی طرف اشارہ کیا تو وہ رخ موڑ کر مسکرا دیا۔

''پلیز تانیہ مجھ پر اعتماد کرو میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' وہ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی چپ چاپ اس کے ہمراہ چلنے لگی۔

کیفے ٹیریا میں زیادہ رش نہیں تھا' اس نے ایک کونے والی میز کی کرسی کھینچ کر اسے بیٹھنے کے لیے پیش کی پھر خود اس کے مقابل دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''یار منور دو کپ گرما گرم چائے کے تو دے جائو۔''

اس نے لڑکے سے کہا پھر تانیہ کی طرف دیکھنے لگا جو مضطرب سی بیگ کو گود میں رکھے اس پر دونوں ہاتھ ٹکائے یوں بیٹھی تھی جیسے وہ اپنی بات کہہ دے اور وہ سن کر بھاگ اٹھے گی۔

تانیہ کا خیال تھا کہ وہ شہرینہ کے بارے میں اس سے استفسار کرے گا مگر وہ اسے اس کی بیماری کا نہیں بتائے گی بلکہ یہ کہہ دے گی کہ وہ شہر سے باہر گئی ہے اس لیے نہیں آ سکی ہے۔

اس کی بیماری کا سن کر تو وہ یہی سمجھے گا نا کہ وہ خوفزدہ ہو کر بیمار پڑ گئی ہے اور وہ شہرینہ کو ہرگز اس کے سامنے کمزور کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ ابھی اپنی ہی سوچ کے تانے بانے بن رہی تھی، خود کو اس کے سوال کے جواب کے لیے تیار کر رہی تھی کہ اکبر شاہ کی آواز ابھری۔ وہ اس کے آگے چائے کا مگ رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تانیہ میں اس روز کے واقعہ پر بے حد شرمندہ ہوں۔ یقین کرو میں ٹینشن کے باعث ڈھنگ سے سوچ بھی نہیں پایا بلکہ دل پر پڑے بوجھ نے میری بھوک پیاس بھی اڑا دی ہے۔ آئی ایم سوری تانیہ میں حقیقتاً بہت شرمندہ ہوں۔"

وہ اپنے مگ کے کنارے پر انگلی پھیرتا ہوا بے حد شرمسار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ چھلکنے والی رعونت کی جگہ ندامت ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ تانیہ کو دیکھنے سے گریز کر رہا تھا یا چائے سے نکلتی بھاپ کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔

تانیہ اس کی جانب سے کم از کم ایسے کسی جملے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔

معافی اور اکبر شاہ۔

اس کی زندگی کی ڈکشنری میں تو شاید اس طرح کا کوئی لفظ تھا ہی نہیں۔

ہاں بھلا ستارے اور سورج ایک ساتھ کبھی نکلتے ہیں؟

جھلتی دھوپ میں بارش ہوئی ہے؟

وقت کا پہیہ الٹا چلا ہے؟

اس نے ایک گہری سانس بھر کر تحیر و بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا پھر پلکیں جھکا دیں۔ وہ اب اس کی طرف دیکھتے ہوئے لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

"تانیہ! غلطیاں تو انسانوں سے ہی ہوتی ہیں نا۔"

"غلطی تو ایک بار ہوتی ہے بار بار ہونے والی تو عادت کہلاتی ہے۔" وہ بے اختیار کہہ گئی۔ شاید اس کا اعتماد لوٹ رہا تھا۔

وہ لحظہ بھر کو چپ ہو گیا پھر دھیرے سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "چلو عادت ہی سہی مگر عادتیں بدل بھی تو جاتی ہیں، نئی عادت بھی تو پڑ سکتی ہے۔" وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی اور بے اختیار بولی۔

"مثلاً۔"

وہ ذرا سا مسکرایا پھر کپ اٹھا کر لبوں تک لے جاتے ہوئے بولا۔

"معافی کی' نادم ہونے کی' پشیمان ہونے کی۔"

وہ پے در پے جھٹکے دے رہا تھا۔ وہ حیرت کے مارے گنگ سی رہ گئی۔

اسے اپنے سامنے بیٹھا یہ اکبر شاہ تو نہیں لگا بلکہ اس کا ہمزاد محسوس ہوا' پھر گھبرا کر بولی۔

"میرا خیال ہے' میں اب چلوں گی۔"

"تانیہ!" وہ اسے جرنل اور بیگ سنبھالتے دیکھ کر جلدی سے روکنے والے لہجے میں بولا۔ تو وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں نے تم سے ایکسکیوز کیا تھا۔ تم نے جواب نہیں دیا۔"

"مم' مگر میرا اس واقعہ سے کیا تعلق۔ وہ تو تمہارا اور شہرینہ کا معاملہ تھا۔ ایکسکیوز تو تمہیں اس سے کرنا چاہیے میں تو وہاں موجود بھی نہیں تھی اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے تو علم بھی نہیں

ہے کہ وہ ناخوشگوار واقعہ کیونکر رونما ہوا تھا۔" وہ کچھ سٹپٹا کر بولی تھی' اکبر شاہ غیر محسوس طور پر چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر دوسرے پل اپنی نگاہوں کے تحیر کو سمیٹ کر بولا۔

"نہیں تانیہ! یہ بات صرف اس روز کے واقعہ کی نہیں ہے۔ میں نے کئی بار تمہیں ہرٹ کیا ہے۔ میرا بی ہیویئر بہت ان ڈیسنٹ رہا ہے تمہارے ساتھ۔ جذبات میں آکر میں بلا سوچے سمجھے تمہیں کیا کچھ کہہ چکا ہوں مگر تم نے کبھی پلٹ کر کچھ نہیں کہا' کوئی الزام نہیں دیا' کبھی برا بھلا نہیں کہا اور شاید یہی بات' یہی بات مجھے اندر سے چبھن دے رہی ہے۔ مجھے جھنجھوڑ کر ندامت کے سمندر میں غرق کر رہی ہے۔ تانیہ' تانیہ! میں خود کو تمہارے سامنے سخت نادم محسوس کر رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بڑا سا بوجھ قرض کا مجھ پر تمہارا ہے جسے میں اتار نہیں پا رہا۔"

تانیہ کی حیرت اور بے یقینی حد سے سوا ہو گئی۔ وہ ہونقوں کی طرح بس اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی اور جب وہ اسے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ سٹپٹا کر چہرہ جھکاتے ہوئے بولی۔

"نہیں' اکبر شاہ! ایسی' ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بھلا ندامت کی کیا بات ہے' ہم آپس میں کلاس فیلو ہیں۔ ہو جاتی ہے کبھی اس طرح کی مس انڈرسٹینڈنگ۔"

وہ میز کی سطح پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اٹھنے لگی کہ اس نے گویا احساس ممنونیت سے لبریز ہو کر بے اختیارانہ اس کے صاف ستھرے نرم ہاتھ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

"او تھینک یو تانیہ! آئی ایم' آئی' آئی تھینک فل ٹو یو۔ تم واقعی بہت سلجھی ہوئی اور گڈ نیچر کی لڑکی ہو۔"

اس کا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ کے دباؤ کے نیچے کانپ کر رہ گیا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے کچھ ایسی نظروں سے تانیہ کو دیکھا بھی تھا کہ تانیہ کو اپنی رگوں میں بھاگتا ہوا خون جمتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اس نے گھبرا کر پلکوں کی باڑھ جھکا دی اور ایک وحشت زدہ انداز میں کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا سر دھوتا ہاتھ کھینچ کر کھڑی ہو گئی پھر اس کی سمت دیکھے بنا پلٹ کر کیفے ٹیریا سے باہر نکل آئی۔

باہر نکل کر اس نے سینے کی تہ سے یوں سانس خارج کی جیسے ایک عرصے سے روکے ہوئے ہو۔ کھلی فضا میں اسے اپنے تپتے ہوئے رخساروں پر ہوا خنک خنک سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے عجیب دھڑکتے اور خوفزدہ دل کے ہمراہ کیفے ٹیریا کے داخلی دروازے کو دیکھا پھر لب

بھینچ کر تیزی سے قدم اٹھاتی کلاس روم کے بجائے پیاس محسوس کرتے ہوئے کولر کی طرف بڑھ گئی۔

X...X...X

دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہے

تیری آواز کے سائے

تیرے ہونٹوں کے سراب

دشت تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے

کھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور گلاب

دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہو رہی تھی مگر وہ یوں ہی صوفے پر دونوں پیر اٹھائے' صوفے کی پشت سے سر ٹکائے' آنکھیں موندے بے حس و حرکت پڑی رہی۔

اس قدر پیار سے' اے جان جہاں رکھا ہے

دل کے رخسار پہ اس وقت تیری یاد نے ہاتھ

یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبح فراق

ڈھل گیا ہجر کا دن' آ بھی گئی وصل کی رات

"شہرینہ بی بی!" صغریٰ دروازہ کھولے جھانک رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر ذرا سا چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔

"کتنی مرتبہ کہا ہے صغریٰ بے وقت مجھے مت ڈسٹرب کیا کرو۔" اس کے لہجے میں بے زاری تھی۔ صغریٰ جلدی سے بولی۔

"وہ جی باؤ سکندر آئے ہیں نا آپ کی طبیعت کا پوچھنے' یہ بتانے چلی آئی تھی۔"

"اچھا' سکندر بھائی آئے ہیں۔" اس نے ہلکے سے سانس خارج کی اور دونوں جڑے ہوئے پیر نیچے کیے اور سلیپر پہننے لگی پھر کسی خیال کے تحت بولی۔

"مگر وہ تو گاؤں گئے تھے آ گئے کیا' مگر ولید..." پھر اس نے صغریٰ کی طرف دیکھا اور بولی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اچھا تم جاؤ نہیں چائے' ٹھنڈا وغیرہ دو' میں آ رہی ہوں۔" وہ صوفے سے اتر کر دوپٹہ اٹھا کر سر پر جمانے لگی۔

"ہاں جی چائے ٹھنڈا تو بڑی بیگم صاحبہ نے پہلے ہی دے دیا ہے۔ وہ وہیں لاؤنج میں ہی بیٹھے ہیں۔" صغریٰ نے اسے دروازے کی طرف آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ کر اسے باہر نکلنے کا راستہ دیا پھر قدرے رازدارانہ انداز میں بولی۔

"شہرینہ بی بی! بیگم صاحبہ نے ان سے آپ کی خوب شکایتیں کی ہیں کہ آپ وخت پر دوائی نہیں لیتیں' پرہیز بالکل نہیں کرتیں اور بہت ستاتی ہیں انہیں اور آغا جی کو۔" وہ صغریٰ کی بات پر بس مسکرا دی۔

لاؤنج میں آئی تو سکندر رضا' مما سے باتیں کر رہا تھا۔

"کیسے ہیں سکندر بھائی! ہمیشہ اکیلے ہی چلے آتے ہیں' نادیہ آپی کو کبھی لے آئیں۔ تانیہ ہی آ جاتی۔"

"تانیہ کو ابھی یونیورسٹی ڈراپ کر کے ہی ادھر آیا ہوں' امی سے تمہاری بیماری کی اطلاع ملی ہے مجھے۔ یہ یکایک تمہیں بیمار ہونے کا خیال کیونکر آ گیا۔" "پڑیئے بیمار مگر ہوں تیماردار کیا تیار

دار... بہت مل گئے ہیں۔“ وہ اپنی عادت کے مطابق بذلہ سنجی سے گویا ہوا۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرادی۔

گولڈن براؤن لینن کے سوٹ میں خاصی کمزور بجھی بجھی سی مگر پیاری لگ رہی تھی۔ کپڑوں سے ہم رنگ بالوں کی ایک دو لٹیں کان کے قریب جھول رہی تھیں جنہیں وہ کان کے پیچھے ڈالتے ہوئے بولی۔

”مجھے تو کچھ ایسا لگتا ہے جیسے مجھے معمولی بخار نہیں بلکہ کوئی بڑی بیماری لگ گئی ہے۔یوں اتنے بہت سے تیمار دار جمع ہوگئے ہیں۔“ اس نے مما کی طرف دیکھ کر شرارت سے کہا تھا پھر رومال منہ کے آگے رکھ کر کھانستے ہوئے بولی۔

”بس موسمی بخار ہے اب تو قدرے بہتر ہوں۔“

”سکندر! یہ لڑکی حد سے زیادہ لاپرواہ ہے۔مجھے تو اب پتہ چلا کہ یہ بیمار ہوکر کتنا ستاتی ہے۔یہ آغا جی ہی ہیں جن کا بس چلتا ہے اس پر اور ایک ولید ہے۔مجال ہے جو اس کے سامنے چوں چرا کرسکے۔ہمیں تو یہ خاطر میں ہی نہیں لاتی۔“ مما شکایتی نظریں اس پر ڈال کر سکندر سے کہنے لگیں۔وہ سر جھکا کر مسکراتی رہی‘ ان کا یہ شکوہ بھی بجا تھا۔اس نے دو دنوں میں ہی

انہیں اتنا تھکا اور ستاڈالا تھا کہ حد نہیں۔پتہ نہیں وہ اس قدر چڑچڑی‘ ضدی اور خود سر کیوں ہوتی جارہی تھی۔مما اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

”موسمی بخار اپنی جگہ سکندر! مگر یہ تو کمرہ بند کرکے پڑی رہتی ہے۔ہنسنا بولنا بند کردیا ہے کمرے میں پڑے پڑے تو بندہ اور زیادہ بیمار ہوجاتا ہے۔اس کے ماموں کہہ رہے ہیں کچھ دنوں کے لیے اسلام آباد چلی آئو۔مگر کہاں اس نے کسی کی ماننی ہے بس اپنی چلانی ہے۔“

”میرا خیال ہے آنٹی گلے شکوے باقی بھی رہنے دیجئے۔“ سکندر ہلکی ہنسی کے ساتھ انہیں مزید بولتے دیکھ کر جلدی سے بولا۔”ولید کے آنے تک‘ باقی اس کے گوش گزار کیجئے گا۔ ادھر میرا ابھی کیا رعب

چلنا ہے آپ کی دختر نیک اختر پر۔“ مما جھینپ کر ہنس پڑیں اور بولیں۔

”تم سے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تانیہ سے کہو کہ اس کے خوب کان کھینچتی رہے۔“

پھر دھیان آنے پر بولیں۔”تم لنچ کرکے ہی جانا سکندر! آغا جی بھی بس آتے ہی ہوں گے۔ وسیم کے ساتھ صبح بنک جانے کے لیے نکلے تھے کہہ کر گئے تھے بارہ بجے تک آجائیں گے۔“

"نہیں آنٹی لنچ ونچ کا تکلف رہنے دیجئے پھر کبھی سہی۔ میں تو بس ذرا عیادت کا فرض نبھانے آگیا تھا۔" اس نے شہرینہ کی طرف دیکھا۔

"تانیہ بتا رہی تھی تم اپ سیٹ ہو۔"

"بیماری میں تو بندہ اپ سیٹ ہو ہی جاتا ہے۔" وہ اس کی جائزہ لیتی نگاہوں کو جیسے نظر انداز کرتے ہوئے سادہ سے لہجے میں بولی۔ پھر کمرے سے باہر جاتی مما سے بولی۔

"مما پلیز صغریٰ سے کہیں مجھے ایک کپ کافی کا دے دے۔" پھر کمرے میں داخل ہوتی طوبیٰ کو پکڑ کر گود میں بٹھایا اور سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"سکندر بھائی! مجھے تو لگتا ہے جیسے میں نے بیمار ہو کر بڑا جرم کر ڈالا ہے۔ شرمندگی الگ ہوتی ہے۔ ہر کوئی پریشان نظر آرہا ہے میرے لیے۔"

"لڑکی! جن سے محبت ہوتی ہے نا جو دلوں میں بستے ہیں ان کی معمولی تکلیف بھی گوارا نہیں ہوتی۔ ان کے آنسو، ان کی بے چینی، ان کا معمولی درد بھی ان کے چاہنے والوں کو کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔" وہ طشتری میں سے انگلیوں میں سونف کی چٹکی بھر کر منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

شہرینہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر پلکیں جھکا کر کسی خیال میں ڈوبتے ہوئے بولی۔

"کیا یہ دل میں ہونے کی دلیل ہے کہ جس کے دل میں آپ ہوں وہ آپ کی تکلیف پر پریشان ضرور ہو گا۔" اس کے سوال پر سکندر نے پورے زور و شور سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"بالکل، بالکل۔"

اور اس کا ہاتھ طوبیٰ کے ریشمی بالوں کی گہرائیوں میں ساکن رہ گیا۔ اس کے دل کے آس پاس وہی مانوس سا درد جاگنے لگا جسے وہ کبھی خوش فہمیوں، کبھی تسلیوں اور بہلاوئوں کی تھپکیاں دے کر سلاتی تھی۔

"آپ گائوں سے کب آئے۔" وہ سنبھل کر اپنی سوچوں کے حصار سے نکلتے ہوئے بولی۔

"کل رات ہی آگیا تھا، ٹھہرنے کا تو کوئی جواز ہی نہیں تھا۔" وہ بولا پھر چونک کر اس کی شکل دیکھی تو وہ طوبیٰ کو گود سے اتارتے ہوئے صغریٰ کے ہاتھ سے کافی کا مگ تھامتے ہوئے کچھ بے کل سی نظر آنے لگی تھی پھر مگ تھام کر اس میں سے اٹھنے والی بھاپ پر اس کی نظریں مرکوز ہو گئیں۔

"کیا تم ولید کو مس کر رہی ہو۔" وہ بے اختیار ہی پوچھ بیٹھا۔ دراصل اس کے ذہن کی سطح پر تانیہ کی کہی ہوئی بات کسی لہر کی طرح اُمڈ کر آئی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جانے کیا ڈھونڈنا چاہا تھا۔ اس نے کپ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں دبا کر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر اطمینان سے کافی کی چسکی بھرتے ہوئے بولی۔

"کیا نہیں کرنا چاہیے۔"

اور سکندر ایک لحظہ خفیف سا ہو کر رہ گیا۔ اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس نے شاید بہت ذاتی سا سوال پوچھ لیا تھا۔

"بالکل کرنا چاہیے' گھر کا ایک فرد کم ہو جائے تو نیچرل بات ہے اس کی کمی محسوس تو ہو گی اور میرا خیال ہے آغا جی کو تو بہت ہو رہی ہو گی۔"

"کچھ کہا ہے کتنے دن رہنے کا پروگرام ہے ان کا۔" وہ دھیرے سے بولی اور حتیٰ الامکان لہجے کو سادہ بنانے کی کوشش کی مگر اس کی تہ میں ایک خفیف سی بے قراری سکندر سے مخفی نہ رہ سکی تھی۔

وہ اس کی طرف دیکھنے کی بجائے رسٹ واچ کی طرف نگاہیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"تمہارے پاس اس کا موبائل نمبر تو ہے پتہ کر لو۔"

"اوہ ہاں' آں' نمبر تو ہے میرے پاس اور موبائل تو وہ اپنے ہمراہ لے گئے ہیں۔" وہ یکدم سٹپٹا کر خفت سے ہنس پڑی۔ "آپ کافی تو لیجئے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"یوں بھی وہ کسی جنگل یا بیاباں میں تو ہے نہیں اچھے خاصے گائوں میں ہے بلکہ گائوں میں کیا شاندار حویلی میں وی وی آئی پی گیسٹ ہے۔" اس نے کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے کہا تو گرم گرم کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے شہرینہ کو اپنے اندر کافی کے ہمراہ ایک سلگتا احساس حلق سے روح تک میں اترتا محسوس ہوا۔

اس کے اعصاب پر پتھر پڑا تھا' اسے یکدم کافی کی بھاپ پوری کی پوری اپنی آنکھوں میں گھستی محسوس ہوئی۔

"کچھ لوگ بڑے ہی خوش نصیب ہوتے ہیں' ہر جگہ وی آئی پی ہوتے ہیں' یہ اپنا ولید بھی ان ہی لوگوں میں ہے۔ اب دیکھ لو' مردان علی شاہ کی لاڈلی صاحبزادی' رئیس زادی' انتہائی مغرور' اکھڑ اور کسی حد تک روڈ ہونے کے باوجود ولید کے سامنے دھوپ میں رکھی

برف کی طرح پگھل کر بہنے لگی ہے۔ آہ، ہا کچھ لوگ واقعی پیدا ہی محبتیں، عنایتیں، توجہ سمیٹنے کے لیے ہوتے ہیں۔" اس نے رشک بھری طویل سانس لی پھر بے اختیار ہنس دیا۔

"بندہ واقعی ہے ہی ایسا۔ اگر میں بھی لڑکی ہوتا تو بری طرح اس پر فدا ہو جاتا۔ آمنہ کا بھی قصور نہیں ہے۔" وہ کافی کے دو تین بڑے بڑے گھونٹ بھر کر اپنی جیکٹ کی جیب ٹٹولنے لگا۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا کہ شہرینہ یکدم ہی افسردگی کی زد میں آچکی ہے۔

کافی کا مگ اس نے آہستگی کے ساتھ ٹیبل پر رکھ دیا اور ایک خفیف سے احساسِ شکستگی سے جیسے صوفے کی پشت سے لگ کر بیٹھ گئی۔ سکندر جیکٹ اٹھا کر اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں اب چلوں گا۔" پھر کف اٹھا کر رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر ہونٹ سیٹی کے انداز میں سکیڑ لیے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اوکے اپنا خیال رکھو، خوش رہا کرو، ہنستی رہا کرو، تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔" اس کا لہجہ دھیما لو دیتا ہوا تھا مگر وہ اپنے ہی کسی خیال سے چونک کر خود بھی اٹھتے ہوئے یکسر بے کیفیت لہجے میں بولی۔

"لنچ کر کے جاتے تو اچھا تھا۔"

"پھر کبھی سہی، ابھی ایک دو کام نمٹانے ہیں۔ آغا جی کو میرا اسلام کہنا۔ اوکے اللہ حافظ۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا جبکہ وہ خالی خالی ذہن کے ساتھ دل پر ایک نادیدہ سا بوجھ لیے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

کبھی کبھی کچھ جملے کسی سفاک حقیقت کو بے نقاب کرتے ہوئے روح میں کسی گرم گرم سلاخ کی طرح گھس جاتے ہیں۔

وہ بھی اپنے جسم کو ایسی ہی اذیت میں محسوس کرنے لگی جیسے کئی سلاخیں اس کے اندر بھی جا گھسی ہوں۔ وہ وہمی نہیں تھی مگر اب خود بخود ہی ہزار اندیشے، واہمات اس کے گرد مکڑی کے جال کی طرح بننے لگے تھے۔ یکدم اس کا دل بہت سا رونے کو چاہا مگر اس نے آنکھوں کو زور سے میچ کر اندر کے سیلاب کو اندر ہی اتار لیا۔

اس نے سوچا اگر وہ آج روئے گی تو پھر شاید عمر بھر صرف روتی ہی رہے گی۔

آنسو دکھ کو صیقل ہی کرتے ہیں۔ کبھی دکھوں کا تدارک نہیں کرتے۔ اس نے سلگتی آنکھیں کھول کر ایک گہری سانس سینے کی تہ سے جیسے کھینچ کر آزاد کی اور بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

اکیلے کس سے اٹھا ہے تعلقات کا بوجھ

اگر وہ یاد نہ رکھے تو بھول جانا اسے

X...X...X

ماسٹر دین محمد اور یوسف دونوں حیرانگی سے ولید حسن کا منہ تک رہے تھے پھر دونوں ہی رفتہ رفتہ اپنی حیرت سمٹنے لگے۔ یوسف بولا۔

"مگر فدا حسین تو مردان شاہ کا داماد ہے۔ توقیر شاہ کا بہنوئی۔ وہ بھلا اپنی پارٹی بنا کر توقیر شاہ کی سیٹ پر کیسے لڑ سکتا ہے۔"

ولید نے سر سے سندھی ٹوپی اتاری جو اسے فجر کی نماز کے لیے یوسف نے دی تھی پھر اسے ہاتھ میں گھماتے ہوئے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ باپ' بیٹے کی حیرانگی رفع کرنے کی غرض سے بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"سیاست میں کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا۔ باپ' بیٹا بھی آمنے سامنے ہوتے ہیں یہ تو پھر سالے' بہنوئی کا رشتہ ہے۔ قطعی بے رحم' ناپائیدار' بظاہر بڑا نازک احساس اور رسپیکٹڈ مگر اندر سے انتہائی کھوکھلا' نفرت انگیز اور کمزور کم از کم توقیر شاہ اور فدا حسین کا رشتہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔"

یوسف اور ماسٹر دین محمد چپ رہے۔

"فدا حسین کو آپ لوگوں نے سپورٹ کرنا ہے۔ توقیر شاہ نے آج تک اس گائوں کے لیے کیا کیا ہے۔ پکی سڑک صرف اس کی حویلی کے اطراف ہے' روشنیاں اس کی حویلی کے اندر جگمگاتی نظر آتی ہیں' صاف اور بے تحاشا پانی صرف حویلی اور اس کی فصلوں کے لیے ہے۔ وہ سہولیات جو گائوں کے گھر گھر میں ہونی چاہئیں وہ ساری سمٹ کر صرف حویلی میں محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ وہ یہاں سے جیتا ہے آپ لوگوں کے ووٹ حاصل کر کے اب بادشاہ بنا پھرتا ہے۔ ان کی اولادیں مہنگی گاڑیوں میں گھومتی ہیں اور ان کے سیاہ شیشوں سے باہر انہیں آپ جیسے لوگ کیڑے مکوڑوں کی مانند نظر آتے ہیں۔ شہر میں کوٹھیوں میں ٹھہرتے ہیں۔ ان کے باتھ رومز تک لگژری ہیں۔ ان کے قدموں کے نیچے مہنگے ترین اور نرم قالین ہمہ وقت

بچھے رہتے ہیں۔انہیں بھلا سخت اور کھردری زمینوں پر چلنے والوں کی تکلیف کا احساس کیونکر ہو۔وہ جھلستی دھوپ کو بھی اپنے قیمتی سن گلاسز کے پار دھکیل دیتے ہیں۔

اور آپ لوگ اس قدر بے سروسامانی کی حالت میں بھی عقل کے دروازے بند کیے پڑے ہیں۔یوسف' یوسف! لوگوں کو بتائو انہیں سمجھائو کہ جنہیں ووٹ دیتے آئے ہیں وہ دو چہرے رکھتے ہیں۔وہ ان کے پاس جلسوں جلوس میں کچھ اور ہوتے ہیں اور جیتنے کے بعد کچھ اور بن جاتے ہیں۔وہ خادم کہہ کر ووٹ حاصل کرتے ہیں اور فتح کے بعد مخدوم بن جاتے ہیں۔

کہتے ہیں' دبے پائوں تو چیونٹی بھی کاٹ کھاتی ہے مگر افسوس کہ ہم تو چیونٹی سے بھی گئے گزرے نکلے۔''

ماسٹر دین محمد خود استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔''یہاں کے لوگوں کو سمجھانا بڑا مشکل کام ہے سائیں! برسوں سے جمی ایک ہی تصویر ذہنوں پر نقش ہے۔ووٹ دینے کا وقت آئے گا تو وہ پچھلی ساری

باتیں فراموش کرتے ہوئے پھر اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مارنے نکل کھڑے ہوں گے۔''

ماسٹر دین محمد کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔یوسف نے ذرا ناگواری سے باپ کی طرف دیکھا تاہم بولا کچھ نہیں۔

''کوشش تو بڑے بڑے پہاڑوں کو اس کی جگہ سے ہلا سکتی ہے ماسٹر صاحب! دلوں کا کیا ہے۔اب دوسری تصویر آئے گی تو یقیناوہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔میں یہ نہیں کہتا کہ فدا حسین کو ہر حال میں جیتنا چاہیے میں تو بس چاہتا ہوں کسی طرح توقیر شاہ کے ووٹ ٹوٹیں اور یہی ضروری ہے' آپ کسی کو بھی ووٹ دیں ایرے غیرے کو مگر آزمائے ہوئوں کو ہرگز نہ دیں بلکہ ان کے ووٹ توڑیں۔''

ولید کی طرف دیکھتے ہوئے ماسٹر دین محمد کے ذہن کی سطح پر کئی دھندلے منظر لہرانے لگے پھر یکایک خفیف سی مایوسی اس کے بدن کو اپنی لپیٹ میں لینے لگی وہ جیسے کراہ کر بولا۔

''پٹ' بہت سال پہلے کوشش کی گئی تھی' ایسی ہی ایک کوشش' بڑے توانا جذبوں' بھرپور امنگوں کے ساتھ اٹھا تھا ایک جوان۔تمہاری طرح ہی باتیں کرنے والا' غریبوں

کے حقوق کی ان کی تعلیم کے لیے جدوجہد کرنے والا‘ ایسے دو چہرے رکھنے والوں کو بے نقاب کرنے کا عزم لے کر مگر‘ مگر...“

ماسٹر دین محمد بولتے بولتے اچانک گہری خاموشی میں اتر گیا مگر ولید نے اس کی یہ خاموشی توڑنے کی کوشش نہ کی بلکہ اس کے بولنے کا منتظر رہا پھر وہ بڑی آزردہ سی کیفیت میں بولا۔

”بکھر گیا سب کچھ‘ سب خواب‘ ساری امنگیں راکھ ہو گئیں‘ جل گیا سب کچھ‘ راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ اس توانا بھرپور جوان کو راستے کے پتھر کی طرح ہٹا کر قبر میں سلا دیا گیا۔“

ماسٹر دین محمد کا لہجہ اتنا دھیما تھا جیسے وہ خود سے بول رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر مرکوز تھیں۔ وہ یکدم ماحول سے کٹ گیا تھا۔ ولید کو لحظہ بھر اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ایک عجیب سی افسردگی کا حملہ اس پر بھی ہوا تھا۔ افسردگی کا اپنا ہی ایک سحر ہوتا ہے جو کھینچ کر اپنے جال میں سب کو جکڑ لیتی ہے۔ ماسٹر دین محمد کے چہرے سے ٹپکتی افسردگی‘ مغمومیت‘ اس کے لہجے کی کاٹ پورے ماحول پر پھیل گئی تھی۔ ولید بہت غور سے اور قدرے متاثر نظروں سے ماسٹر دین محمد کو دیکھ رہا تھا۔ جس واقعہ کا براہ راست ماسٹر

دین محمد کی اپنی ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اس واقعہ کی عبرت اور اذیت کو ان کا دل شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

”بابا‘ ضروری تو نہیں ہے نا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے۔ وہی کچھ خدانخواستہ ولید صاحب کے ساتھ بھی ہو۔“ یوسف کو باپ کی مایوسی بالکل نہ بھائی تھی۔

”ٹھیک ہے ہم بڑے بڑے خواب نہیں دیکھتے۔ دلوں میں سرمستی نہیں جگا سکتے‘ امنگیں نہیں پیدا کر سکتے مگر امید کی رمق تو جگا سکتے ہیں۔ ایک نئی امید کی شمع تو اپنے اپنے دلوں میں جلا سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے‘ ہو سکتا ہے وہی روشنی کا کام دے کر اندھیروں کو کاٹ دے۔“

ولید جو عجب ملول سی قدرے اداس کیفیت میں ایک زاویے پر بیٹھا ہوا تھا چونک کر اور پھر خاصی خوشگوار اور تحسین بھری نظروں سے یوسف کو دیکھنے لگا مگر ماسٹر دین محمد یوں ہی دل گرفتہ سا بیٹھا رہا جیسے اسے اب بھی کسی بہت بڑے نقصان کا اندیشہ لاحق ہو۔ اس کی نظریں رہ رہ کر ولید کے خوبصورت چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور جب جب یہ نظریں اس کے چہرے پر اٹھتیں تو دل کے اندر نامعلوم سے اندیشے سر اٹھا کر رہ جاتے۔

"آپ فکر نہ کریں ولید صاحب! ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔" یوسف کا لہجہ باحوصلہ تھا۔

ولید مسکرا دیا اور جب وہ ماسٹر دین محمد کے چھوٹے سے گھر سے نکلا تو خود کو ایک عجیب سی کیفیت میں محسوس کرنے لگا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کی بیک سے سر ٹکا کر کچھ دیر یوں ہی ونڈ سکرین کو خالی خالی نظروں سے ایک ٹک گھورتا رہا پھر اگنیشن میں چابی ڈال کر گھما دی۔ دوسرے پل گاڑی کچے پکے راستوں پر رینگنے لگی۔

مگر اس کی نگاہیں اس پجیرو کو نہ دیکھ پائیں جس میں توقیر شاہ انتہائی حیرت سے اس کی گاڑی کو شہر جانے والی سڑک پر جاتے دیکھتا رہ گیا تھا۔

X...X...X

سکندر پروفیسر زبیری سے ملنے کے بعد خاصا افسردہ ہو گیا تھا۔ پروفیسر زبیری نے اب کسی قسم کا بیان دینے سے انکار کر دیا تھا اور کالم لکھنا بھی ترک کر چکے تھے۔ پروفیسر زبیری نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اب اس باب کو بند ہو جانا چاہیے' اسی میں بہتری ہے۔"

"مگر اس طرح تو آپ پیچھے ہٹ کر مردان شاہ جیسے کرپٹ اور ظالم لوگوں کے حوصلوں کو توانا کر رہے ہیں سر!" اس کی بات پر پروفیسر زبیری دل گرفتگی سے ہنس پڑے۔

"ان کے حوصلے کب توانا نہیں ہیں۔" انہوں نے آنکھوں سے چشمہ اتارا اور اپنے کرتے کے کنارے سے اس کے موٹے موٹے شیشے رگڑنے لگے۔

سکندر رضا کو ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی محسوس ہوئی جیسے کسی نے چاندنی کے آگے دھوپ کی چادر ڈال دی ہو۔

"سکندر! میں جاں کے زیاں تک بھی جا سکتا ہوں۔ بھوک اتنی نہیں ڈراتی جتنا عزت پر لگنے والے چھینٹے' اس کے پارہ پارہ ہو جانے کا خوف مار ڈالتا ہے اور میں بہت کمزور سا انسان ہوں سکندر! بہت ڈراوے دیئے گئے مجھے' زبان بند رکھنے کی قیمت دینے کی پیشکش بھی ہوئی اور دھمکایا بھی گیا مگر اب کے ملنے والی دھمکی میرے سارے مضبوط ارادوں کی دیوار کی ایک ایک اینٹ ہلا چکی ہے اور اس سے پہلے کہ دیوار گر جائے میرا بھرم رہنے دو' رہنے دو سکندر میرا بھرم۔"

سکندر کو لگا جیسے ان کی آنکھوں میں تیرنے والی نمی میں یکلخت اضافہ ہو گیا ہو۔

"ایک عزت دار شریف باپ کے لیے کیا یہی کم گالی ہے کہ اس کی بیٹی پر بھیڑیے نگاہ ڈالیں' اسے اٹھانے کی دھمکی دیں اور..." وہ جیسے کرب کی اتھاہ میں ڈوب کر چپ ہو گئے۔

کمرے میں یکلخت سکوت سمٹ آیا تھا مگر اس سکوت میں بڑی شکستگی تھی۔

دل گرفتگی اور آزردگی تھی۔

"میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں دائر کر دیا ہے۔ سکندر یوں بھی سارے حساب کتاب دنیا میں پورے نہیں ہوتے اگر ہوتے تو یہ بڑے بڑے کرپٹ سیاست دان ہی کیا ہم جیسے ادنیٰ لوگ بھی پکڑ میں آتے۔"

وہ ایک بار پھر چپ ہوئے تو ویسا ہی سکوت چھا گیا مگر اب کے اس سکوت کو سکندر نے ہی توڑا تھا۔ وہ پروفیسر زبیری پر گزرنے والی اس اذیت کو خود بھی محسوس کر رہا تھا۔

"یہ دھمکی آپ کو کب ملی؟"

پروفیسر زبیری نے چشمہ اٹھایا اور آنکھوں پر لگاتے ہوئے اسے غور سے دیکھا پھر اٹھ کر کتابوں کے شیلف کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"پرسوں شام۔"

"اوہ۔" وہ جیسے کسی سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔ "کیا خود مردان علی شاہ نے ہی دی تھی یہ دھمکی۔ میرا مطلب ہے خود اسی نے فون کیا تھا یا۔" وہ چپ سا ہو گیا۔ پروفیسر زبیری شیلف سے کتاب اٹھا کر واپس کرسی کی طرف آتے ہوئے اسے خاصی چبھتی اور ناگوار نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ ان کی کشادہ پیشانی پر چند لکیریں ابھر آئی تھیں۔

"کیا رکھا ہے اب ان باتوں میں' تم اخبار والوں کو بس اپنے صفحات سیاہ کرنے ہیں' چاہے اس میں کسی کی عزت جائے یا رہے۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں سر!" اس نے تیزی سے دفاعیہ انداز میں پروفیسر زبیری کی بات کاٹی۔

"میں بحیثیت صحافی آپ سے کچھ نہیں پوچھ رہا۔" پھر قدرے ملول سی کیفیت میں بولا۔

"کیا یہ زیادتی نہیں ہے کہ آپ مجھے ہر وقت ایک اخباری نمائندے کے تناظر میں ہی دیکھیں۔ میں اس سے ہٹ کر ایک انسان بھی ہوں جو اپنے سینے میں ہمدرد اور دوستانہ دل بھی رکھتا ہے۔"

پروفیسر زبیری نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کتاب سینے پر رکھ لی اور ایک گہری قدرے افسردہ سی سانس بھرتے ہوئے بولے۔

"مگر اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں رہا ہے۔ میں ان سارے واقعات کو خواب سمجھ کر بھلا دینا چاہتا ہوں۔ ہاں خواب۔" انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

"بعض اوقات جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کی سزا کچھ یوں ہی ملتی ہے۔ میں قنوطی اور یاسیت زدہ آدمی کبھی نہیں رہا مگر اب جو حقیقت سامنے آئی ہے بہت خلاف توقع ثابت ہوئی ہے۔ مجھ جیسے مثالی معاشرے کے خواب دیکھنے والے، کرپٹ لوگوں کو نیچا دکھانے اور نئی نسل کے دلوں میں جاں فزا امیدوں کی تخم ریزی کرنے والے لوگوں کے ساتھ شاید ایسا ہی ہونا چاہیے۔" وہ خود آزار سی کیفیت میں ہنس پڑے۔

سکندر بڑی گم صم نظروں سے انہیں کچھ دیر دیکھتا رہا۔ اس کے پاس شاید کوئی الفاظ نہیں تھے یا پھر اپنے لفظوں کی کم مائیگی کا احساس تھا کہ وہ پروفیسر زبیری کے اس دکھ کے احساس کو کم نہیں کر سکیں گے۔ یا پھر

اس کے پاس ایسا حوصلہ نہیں تھا۔ یوں بھی کہتے ہیں کہ آدمی کے پاس کئی الفاظ طوطے کی طرح رٹے ہوئے ہوتے تو ہیں مگر انہیں دہرانا حوصلے کا کام ہوتا ہے اور وہ شاید خود میں ایسا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔

وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ آیا۔ اپنے دل میں گرفتگی کسی بوجھ کی طرح سمیٹے ہوئے۔ وہ یوں ہی سڑکوں پر بے مقصد بائیک دوڑاتا رہا۔

اس کا خیال تھا آج صبح سے ہی وہ بے نام سی اداسی کے جال میں مقید ہے۔ اب اس میں اضافہ ہو چکا ہے۔

ہم کہ ہیں کب سے درِ امید کے دریوزہ گر

یہ گھڑی گزری تو پھر دستِ طلب پھیلائیں گے

کوچہ و بازار سے پھر چن کے ریزہ ریزہ خواب

ہم یونہی پہلے کی صورت جوڑنے لگ جائیں گے

اس نے بائیک ایک سنسان دھوپ سے تپتے ویران جھلستے ہوئے پارک کے کنارے روک دی اور برگد کے درخت کے سائے میں بنے سیمنٹ کے بنچ پر بیٹھ گیا۔

سامنے سڑک تھی جہاں معمول کا ٹریفک تھا۔ وہ بے توجہی سے سڑک پر وقفے وقفے سے گزرتی گاڑیوں‘ ویگنوں کو دیکھنے لگا جیسے اب یہی کرنے کو رہ گیا ہو۔ تب ہی اس کی توجہ یکدم فراٹے بھرتی گاڑی کی طرف ہو گئی جس میں موجود چار لڑکوں میں ایک چہرہ اس کی تمام حسیات بیدار کر گیا۔ وہ نومی تھا جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا جبکہ برابر کی سیٹ پر ایک لڑکا اور دو لڑکے پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ان میں دو کے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھا رہ گیا۔ گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ چند منٹ کی تاخیر سے پولیس موبائل فراٹے بھرتی اس کی ساکت نگاہوں کے سامنے سے گزر گئی۔ اس طرح کے واقعات اس کے لیے کوئی نئے نہیں تھے۔ ایک صحافی ہونے کے ناتے وہ بڑے بڑے مجرموں کو سامنے سے بھی دیکھ چکا تھا اور دہشت گردی کے واقعات کو بے حد قریب سے دیکھا تھا۔ اسلحہ سے لیس لڑکوں کا کسی جگہ فائرنگ کر کے بھاگنا‘ پیچھے پولیس کی موبائلوں کا دوڑنا۔ اب تو جیسے یہاں کا معمول ہی بن گیا تھا مگر نومی کی اس گاڑی میں موجودگی اس کے دماغ کو

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

جھنجھوڑ گئی تھی۔ ایک نادیدہ خوف جو اس کے دل کی تہوں میں لپٹا رہتا تھا وہ اتنی خوفناک صورت میں سامنے آئے گا اس نوبت کا تو اس کے پاس تصور بھی نہ تھا۔

اس کی نظروں تلے نوٹوں کی گڈیاں آ گئیں جو وہ اماں کی گود میں ڈال جاتا تھا۔ اس نے اپنی جیکٹ اٹھائی اور جھٹکے سے بنچ سے اٹھ کر بائیک سنبھال لی۔

X...X...X

توقیر شاہ سیدھا ڈیرے پر پہنچا تھا اور اب اضطرابی انداز میں کمرے کے چکر کاٹ رہا تھا پھر اس نے کندھے کی چادر کا کونا جھٹک کر دوبارہ کندھے پر ڈالا اور بندوق بردار کھڑے ملازم کی طرف مڑا۔

’’بچل! ماسٹر دین محمد کو جانتے ہو نا اسے بلا کر لائو یہاں ڈیرے پر اور سنو اسے کہنا رئیس توقیر شاہ نے بلوایا ہے۔ وہ جوتی پہننے میں بالکل بھی تاخیر نہ کرے۔‘‘

’’بہت بہتر سائیں!‘‘ بچل تیر کی طرح ڈیرے سے نکل گیا اور واقعی توقیر شاہ کا پیغام ملتے ہی ماسٹر دین محمد نے جوتی پہننے میں تاخیر نہ کی۔ یوسف بھی اس کے ہمراہ آیا مگر وہ ڈیرے کے باہر چبوترے پر ہی بیٹھ گیا جبکہ ماسٹر دین محمد‘ بچل کے ہمراہ ایک نادیدہ سا خوف سمیٹے اندر چلا

آیا۔ جوتیاں اس نے ایک طرف اتاریں اور کمرے میں بچھے قالین سے ذرا فاصلے پر ہاتھ جوڑتے ہوئے سلام کیا۔

توقیر شاہ، بچل کے جاتے ہی کمرے میں مسلسل چکر کاٹ رہا تھا۔ ماسٹر دین محمد کو دیکھ کر اس کے قدم حرکت کرنا رک گئے۔ اس نے ایک ہنکارا ابھرا اور صوفے پر بیٹھ کر، سر ہلا کر سلام کا جواب دیا۔

"آپ نے مجھے بلوایا ہے سائیں!"

"ہوں۔" اس نے سر ہلایا پھر آنکھیں سکیڑ کر ماسٹر دین محمد کو سر سے پیر تک جائزہ لیتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہمارا ایک مہمان آج صبح تمہارے گھر سے نکلا، ماسٹر دین محمد! یہ کیا چکر ہے اس رئیس زادے کا تمہارے جیسے غریب غربائ، کمی کمین سے کیا تعلق بنتا ہے بھلا۔" اس کے لہجے میں ہلکا تمسخر سمٹ آیا، تاہم تندی بلا کی تھی۔ ماسٹر دین محمد پر گھبراہٹ کا حملہ ہوا تھا۔

"کک، کون مہمان سا، سائیں!"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ماسٹر، زیادہ استاد بننے کی ضرورت نہیں ہے، میں ولید حسن کی بات کر رہا ہوں سویرے تمہارے گھر سے نکلتا ہوا نظر آیا ہے مجھے، جبکہ میری دانست میں وہ رات ہماری حویلی میں نہیں ٹھہرا تھا اور اس وقت شہر کے لیے روانہ ہوا تھا مگر اب اتنے سویرے تمہارے گھر سے نکلنا تعجب خیز بات ہے۔"

وہ صوفے کے ہتھے پر اپنی وزنی مضبوط ہتھیلی کا دباؤ ڈال کر اٹھ گیا اور چلتا ہوا ماسٹر دین محمد کے بے حد نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھ غریب سے بھلا ان کا کیا تعلق، کیا رشتہ داری سائیں! میں انہیں ذاتی طور پر نہیں جانتا، بس جی رات وہ میرا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آ گیا تھا اور مجھ سے کہنے لگا کہ ماسٹر میں یہاں رات گزارنا چاہتا ہوں اور سائیں مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں نا۔ میں بھلا انکار کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ ایک چارپائی اور چادر ہی تو دینی تھی۔ میں غریب اور کیا خاطر مدارات کر سکتا تھا ان کی۔"

ماسٹر دین محمد سنبھل کر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بتانے لگے۔ توقیر شاہ اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کرکے کھڑا رہا پھر لب بھینچ کر متفکرانہ انداز میں انگلیوں سے پیشانی سہلاتے ہوئے رخ موڑ لیا۔

"حیرت ہے ولید حسن کو کیا ضرورت پڑی تمہارے گھر میں رات ٹھہرنے کی۔" وہ رخ پلٹ کر ایک بار پھر ماسٹر دین محمد کو کھوجتی اور تیغ صفت نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"دیکھو ماسٹر! مجھ سے غلط بیانی کرو گے تو بہت پچھتاؤ گے۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو میں دھوکا دینے والے' جھوٹ بولنے والے کا کیا حشر کرتا ہوں۔"

"سائیں میں جھوٹ نہیں بول رہا' بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ خود ہی آیا تھا بنا رشتہ داری سے اور بس رات نیند لے کر صبح سویرے چلا گیا۔ روٹی مانی بھی نہیں کھائی سائیں!" ماسٹر دین محمد نے پھر ہمت سے جھوٹ بولا۔

"آپ کو یقین نہ آئے میری زبان پر تو سائیں آپ خود اپنے مہمان سے پوچھ لیجئے گا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے تم سے صلاح مشورہ نہیں مانگ رہا کوئی' جاؤ تم۔" توقیر شاہ پر جھنجلاہٹ سوار ہو گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اس سے پوچھنا یا نہیں پوچھنا ہمارا کام ہے۔ تم جاؤ۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا اور کمرے میں چک پھیریاں کھانے لگا اور ماسٹر دین محمد تو جوتیاں ہاتھوں میں ہی اٹھا کر دھڑکتے دل کے ساتھ یوں ڈیرے کی سیڑھیاں پھلانگ کر باہر نکل آیا جیسے قید سے رہائی نامہ مل گیا ہو۔

X...X...X

توقیر شاہ جیپ دوڑاتا ہوا حویلی آیا تو لان میں ہی اس کی مڈ بھیڑ فدا حسین سے ہو گئی۔ رک کر اس نے بحالت مجبوری سلام کیا تو جواب ایسا کڑکتا ہوا ملا کہ توقیر شاہ کے وجود پر انگارے دوڑ گئے مگر وہ یہ آگ تحمل سے اتار گیا۔

"اپنے باپ کو سمجھا دینا توقیر شاہ کہ سیاست اس کے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔ یہ کھلا میدان ہے' اس میں ہر کوئی اتر سکتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" توقیر شاہ گڑبڑا گیا۔ حملہ ہی اتنا اچانک تھا۔ یوں بھی اس کا دماغ ولید حسن کی طرف الجھا ہوا تھا۔

"سمجھ جاؤ گے بہت جلد۔" وہ نتھنے پھلا کر ہنسا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ توقیر شاہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور بڑے بڑے قدم اٹھا کر اندر آیا تو لابی میں مردان علی شاہ اور ہدایت اللہ بیٹھے نظر آئے۔ فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کی بو رچی ہوئی تھی، اس نے مردان شاہ کو دیکھا وہ تیز تیز سگار کے کش لے کر دھواں کبھی لبوں سے، کبھی ناک سے نکالتے جا رہے تھے جو پریشانی اور کسی اضطراب کی علامت تھی۔

"فدا حسین کیوں آیا تھا بابا سائیں!" اس نے انگوٹھے سے داخلی دروازے کی طرف اشارہ کیا اور چلتا ہوا مردان شاہ کے قریب آ گیا۔

مردان علی شاہ کے ناک کے نتھنے استہزائیہ انداز میں پھیل گئے۔

"ہمیں ڈراوا دینے آیا تھا۔ ہماری جدی پشتی سیٹ پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہا ہے۔"

"اوہ..." توقیر شاہ جیسے بات کی تہ تک پہنچ کر ایک ہلکی سی سانس لے کر رہ گیا۔

"میں تو کہتا ہوں خالو جان! اسے یہ شوق پورا کر لینے دیجئے۔"

ہدایت اللہ جو خاصی دیر سے خاموش بیٹھا تھا ہلکی ہنسی کے ساتھ بولا اور اپنی بیوی عابدہ علی کی طرف دیکھا۔

"ابھی ساحل پر بیٹھ کر وہ بڑے بڑے ارادے باندھ رہا ہے جب اس سمندر میں کودے گا تو خود بخود سمجھ آ جائے گی کہ ساحل میں ہی عافیت تھی۔" توقیر شاہ کے بھنچے ہوئے لب ذرا سے وا ہوئے۔ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا ایک آرام دہ صوفے پر گر سا گیا۔

"ویسے حیرت کی بات ہے فدا حسین کو یکلخت یہ سیاست میں آنے کی کیا سوجھی۔" پھر لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد وہ مردان شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا بگڑے بگڑے لہجے میں بولا۔

"شاہدہ پر دباؤ ڈالیں بابا سائیں کہ وہ اپنے شوہر کو لگام دے۔ وہ بہت بڑھ چڑھ کر ہمارے منہ آنے لگا ہے جو تھوڑی بہت عزت میں اس کی کرتا رہا ہوں، اب اس کی حرکتوں اور رویوں کے باعث وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ اس سے پہلے کہ ہمارے درمیان دشمنی کا رشتہ جنم لے اسے سمجھا لیں۔"

اسے یکدم فدا حسین کا وہ رویہ یاد آگیا تھا۔ اس کے لہجے کی کڑواہٹ اور چہرے کے تاثرات میں جھلکنے والی حقارت... وہ اس کا بہنوئی نہ ہوتا تو شاید لان میں کھڑے کھڑے ہی اسے اپنے آدمیوں سے اچھی طرح پٹوا دیتا۔

"اس کم عقل عورت کی وجہ سے تو ہم بھی کمزور ہو کر رہ گئے ہیں۔" مردان شاہ برہم تیوروں کے ساتھ صوفے سے اٹھ کر لابی سے نکل گئے۔

"تم بہن ہو، تم اسے نہیں سمجھاتیں۔" ہدایت اللہ بیوی سے بولے جو کلائیوں میں پڑی سونے کی چوڑیوں پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ شوہر کی بات پر ایک گہری سانس ان کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

"ہدایت بھائی! وہ بہن تو ہے ہماری مگر ذرا "اور" قسم کی ہے۔" آمنہ علی کندھے پر اپنا شولڈر بیگ لٹکائے اندر داخل ہو گئی تھی اور ٹشو سے ہاتھوں پر لگی کریم صاف کرتے ہوئے عابدہ کی جگہ خود جواب

دیتے ہوئے ہنس پڑی۔

"اس کے پاس عقل ہوتی تو آج بابا سائیں کو رونا کس بات کا تھا۔ اینی وے، اچھا ادی میں چل رہی ہوں۔ تم شہر آئو تو کوٹھی ضرور آنا۔" وہ عابدہ کے پاس آکر رکی تو عابدہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

"ضرور آئوں گی۔ اب تمہاری پڑھائیاں ختم ہوں تو ہم بھی حویلی میں کوئی رونق شونق لگائیں۔" وہ دلار سے بولیں۔ آمنہ علی اپنے کٹے ہوئے بالوں کو شانوں سے اٹھا کر جھلاتے ہوئے دھیرے سے ہنسی اور توقیر شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"اداسائیں یہ بیٹھے ہیں۔ انہیں آپ لوگ کیوں نہیں گھیرتے، اب تو بے چاری مہرالنساء کی بھی آس ٹوٹنے لگی ہے۔ ممانی نے تو جہیز کی ایک ایک چیز تیار کر کے رکھی ہے بس ہماری طرف سے بارات لے جانے کی دیر ہے۔ فٹ سے مہرالنساء ڈولی میں بیٹھ جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"بس بس زیادہ بکواس نہ کر۔" توقیر شاہ بھی زیر لب مسکراتے ہوئے مصنوعی خفگی آنکھوں میں سمیٹتے ہوئے اسے گھورنے لگا پھر یکدم کچھ خیال آگیا تو اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ

ہلا کر لابی کا دروازہ پش کر کے باہر نکلتی آمنہ کے ساتھ خود بھی باہر نکل آیا اور اسے روک کر بولا۔

"آمنہ کل تم نے ولید کو روکنا چاہا تو وہ کیوں نہیں رکا حویلی؟" یہ سوال غیر متوقع تھا یا کچھ عجیب سا' سر جھکائے اپنے شولڈر بیگ سے گاڑی کی چابی ڈھونڈتے ڈھونڈتے آمنہ نے سر اٹھا کر توقیر شاہ کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے شہر جانے کی اتنی جلدی کیوں تھی۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" وہ ہلکی حیرانی سے دھیرے سے بولی اور چابی کے ساتھ اپنے سن گلاسز بھی نکال کر ایک ہاتھ سے جھٹک کر آنکھوں پر چڑھائے۔

"آپ کو اچانک ولید کا خیال کیوں آگیا۔" اس نے توقیر شاہ کی طرف دیکھا جس کی نظریں جیسے خلاء میں مرکوز تھیں۔ اس کے سوال پر اس کی طرف چہرے کا رخ کیا۔

"اس لیے کہ صبح میں نے اسے اس گوٹھ میں دیکھا ہے۔ ماسٹر دین محمد کے گھر سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی طرف واپس جاتے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"وہاٹ!" وہ حیرت سے اپنی جگہ اچھل کر رہ گئی تھی۔

"ہاں میں نے ڈیرے پر ماسٹر دین محمد کو بلا کر معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ وہ رات اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر بولا کہ وہ یہاں رات قیام کرنا چاہتا ہے۔ ہے نا حیرت کی بات۔"

توقیر شاہ اس کی حیرت میں مزید اضافہ کرتے ہوئے پراسرار انداز میں مسکرایا۔

"تم ذرا اپنی طرف سے پتہ کرنے کی کوشش تو کرنا۔" اور جیسے وہ غائب دماغی کی کیفیت میں سر ہلا کر رہ گئی۔

X...X...X

"شہرینہ بی بی! وہ ولید بائو آگئے ہیں۔" صغریٰ اس کے استری شدہ کپڑے لیے اندر داخل ہونے کے ساتھ اسے یہ بھی اطلاع فراہم کر رہی تھی وارڈروب کھول کر اس کے کپڑے ہینگر کرنے لگی۔

"ہاں مجھے پتہ ہے۔" اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر رخ موڑے بغیر صغریٰ کو جواب دیا۔ وہ اس کی گاڑی کو پورٹیکو میں داخل ہوتے دیکھ چکی تھی۔

آغا جی نے اسے لان میں ہی گھیر لیا تھا۔ پاپا اور مما بھی وہیں تھے سو وہ بھی وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ بالوں پر ہاتھ پھیرتا' کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کچھ تھکا تھکا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید لمبی ڈرائیونگ کی تھکاوٹ تھی۔

"آپ نہیں آئو گی باہر' وہ باہر باغیچے میں ہی ہیں۔ آغا جی ان کی خوب ٹھکائی کریں گے۔ ان کے نہ ہونے سے گھر میں بڑی ویرانی سی ہو جاتی ہے ناجی! آغا جی تو انہیں بڑا ہی یاد کرتے ہیں اور آپ بھی تو ان کے بغیر بڑی مرجھائی مرجھائی سی نظر آتی ہیں نا۔"

"صغریٰ تم بہت بولتی ہو کام ختم ہو گیا ہو تو جائو یہاں سے۔" اس نے پردہ سرکا دیا اور پلٹ کر اسے ذرا غصیلی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں جی میں زیادہ بولتی ہوں' پر اس سے پہلے تو کبھی آپ نے ایسا نہیں کہا' میری گلاں تو آپ کو۔" وہ کاجل بھری آنکھیں پھیلا کر بولتے بولتے کھسیا کر چپ ہو گئی۔ وہ اسے تنبیہی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ہلا جی۔" وہ کھسیا کر وارڈروب بند کر کے باہر نکل گئی۔

جبکہ اس نے لب بھینچ کر وہیں دیوار سے پشت ٹکالی۔ رات ڈنر پر وہ جان بوجھ کر کمرے سے باہر نہ نکلی۔ اسے پکا یقین تھا آغا جی نے اس سے ضرور اس کی ناساز طبیعت کا کہا ہو گا۔ وہ اسے دیکھنے اس کی خیریت معلوم کرنے اس کے کمرے میں ضرور آئے گا اور ایسا ہی ہوا۔ اسے ڈنر پر موجود نہ پا کر وہ اس کے کمرے میں چلا آیا۔

دروازہ ہلکے سے بجایا مگر کوئی جواب نہ پا کر خود ہی دھکیل کر اندر آیا مگر وہ پروگرام کے تحت سوتی بن گئی تھی۔ سر سے پیر تک چادر اوڑھے بے جنبش پڑی رہی۔ وہ کچھ دیر اس کے بیڈ سے ذرا فاصلے پر کھڑا رہا پھر یوں ہی سرسری نگاہ کمرے میں دوڑا کر کندھے اچکا کر باہر نکل گیا۔

وہ جا چکا ہے 'اس کا اطمینان کرنے کے بعد اس نے چہرے سے چادر ہٹائی' کمرے کا دروازہ بند کیا اب وہ تنہا تھی مگر اس کی پرفیوم کی مہک کا احساس رہ گیا تھا۔

اس نے لمبی لمبی گہری سانسیں لے کر جیسے اس خوشبو کو اپنے اندر اتارا پھر یکلخت اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔

بدن سے چادر نوچنے کے انداز میں پھینک کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر روپڑی۔ اپنے پاگل پن پر اسے غصہ آنے لگا۔

کیوں اس نے ایسی حرکت کی' وہ آتا تو وہ اس سے خوب لڑتی' شکوہ شکایتیں کر لیتی' یوں ہی دل کی بھڑاس نکال لیتی۔ اسے تو بہلانے کا فن آتا تھا اسے ضرور بہلا لیتا۔

مگر' مگر کیا وہ بہل جاتی؟ واقعی بہل جاتی؟' اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے ٹشو بکس سے ایک ساتھ کئی ٹشو نکالے اور ناک رگڑنے لگی۔

X...X...X

وہ لائبریری چلی آئی تھی اور کتاب ایشو کرا کے اپنی ادھوری اسائنمنٹ مکمل کرنے لگی۔

جھنجھلاہٹ تو اس پر یونیورسٹی آتے ہی سوار ہو گئی تھی۔ آج پھر شہرینہ نہیں آئی تھی جبکہ سکندر بھائی سے معلوم بھی ہوا تھا کہ وہ اب ٹھیک ہے۔

'کس قدر بدتمیز ہو شیری تم۔' وہ دل ہی دل میں اسے کوسنے بھی دیئے جا رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ آج اس کی طرف جا کر اچھی طرح سے اس کی خبر لے گی۔ محترمہ کے مزاج درست کر دے گی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ کتاب کا صفحہ پلٹنے والی تھی کہ ایک مردانہ ہاتھ اس کی کھلی کتاب پر آن ٹھہرا' دوسرے ہاتھ سے میز پر آہستگی سے آنے والے نے کتاب اٹھائی اور الٹ دی اور دونوں ہتھیلیاں میز کے کنارے جما کر اس کی طرف قدرے جھکا۔ وہ یوں ہی دم سادھے بیٹھی رہ گئی تھی۔

آنے والا اکبر شاہ تھا' وہ بخوبی پہچان گئی تھی۔ چند لمحے کے بعد سر اٹھایا تو وہ اس کو دیکھ رہا تھا جیسے اس کے وجود میں ہونے والی اسی جنبش کا منتظر ہو۔

نگاہیں ملنے پر اس کے لبوں پر تبسم پھیل گیا جبکہ اس نے سٹپٹا کر نگاہیں دوبارہ جھکا لیں۔

''کیسی ہو؟ میں تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔'' وہ بڑے دوستانہ انداز میں کہتا ہوا دوسری میز کے آگے رکھی چیئر اپنی طرف کھینچ کر اس کے قریب ہی رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے کپڑوں سے اٹھتی تیز پرفیوم کی مہک اس کے ارد گرد پھیل گئی۔

اسے یکدم اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ گہری سانس کھینچنے سے یہ ساری مہک اندر اتر جاتی اور سانس وہ زیادہ دیر روک نہیں سکتی تھی مگر ٹھہر ٹھہر کر بحالت مجبوری لینے لگی۔

جامعہ میں قدم رکھتے ہی وہ اس سے تصادم نہ ہونے کی دعائیں مانگنا نہ بھولی تھی مگر وہ تو جیسے اس کی ہر دعا کو کاٹ کر آن پہنچا تھا۔

وہ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں آج بھی نظر آرہا تھا‘ اس میں نظر آنے والی یہ تبدیلیاں اسے الگ حیران‘ پریشان کیے دے رہی تھیں۔

”تم پوچھو گی نہیں‘ میں تمہیں کیوں ڈھونڈ رہا تھا۔“ وہ اس کی متواتر خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے گویا ہوا تو اس نے پین کا کیپ لگایا اور یوں ہی اسے انگلیوں میں گھماتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”یہ بھی تم ہی بتادو۔“ ایک بھنچی بھنچی سانس لے کر اس نے ساری ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے اس پر نظریں ڈالیں۔

”تم سے باتیں کرنا چاہ رہا تھا‘ تمہیں دیکھنا چاہ رہا تھا۔“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواباً گویا ہوا تو جیسے اسے اپنے اعصاب ٹھٹھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے یک بیک پلکیں جھپک کر نگاہوں کا زاویہ سامنے کتابوں کے شیلف کی طرف کر دیا۔

”کیوں؟ کیا باتیں کرنا چاہ رہے تھے۔“ اسے اپنا دل عجیب سی کیفیت میں دوچار محسوس ہوا تاہم لہجے میں خود بخود ہلکی ناگواریت سمٹ آئی۔

”کیوں کا جواب بہت طویل ہے اور رہی کیا باتیں تو‘ بہت سی باتیں ہیں۔ ایسا کرتے ہیں ہم کہیں بیٹھ کر پہلے کوک اور برگر کھاتے ہیں اور۔“

”پلیز اکبر شاہ!“ اس نے جھنجھلاہٹ کے ساتھ پین جرنل پر مار کر اس کی طرف بے چارگی سے دیکھا۔ ”تم چاہتے کیا ہو؟ میں نہ تم سے دوستی افورڈ کر سکتی ہوں اور نہ...“

”نہ...“ وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ سٹپٹا گئی اور پلکیں جھکاتے ہوئے بولی۔

”نہ کسی قسم کا مذاق۔“

”تانی۔“ وہ جیسے یکدم سنجیدگی بلکہ قدرے رنجیدگی کی کیفیت میں آگیا تھا۔

”میں تم سے مذاق کروں گا کیا تم مجھے اب بھی ماضی والے اکبر شاہ کے تناظر میں دیکھتی ہو۔ اگر ایسا ہے تو پلیز یہ زیادتی مت کرو۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میرے اندر سے ایک نئے اکبر شاہ نے جنم لیا ہے اور یہ سب کیسے ہو گیا‘ کب ہوا میں خود بھی نہیں جانتا۔ بس ایک پردہ تھا‘ ایک نقاب تھا جو یکدم ہٹ گیا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ پردہ تم نے ہٹایا ہے۔ تاریکی کا وہ پردہ تمہارے روشن اجلے وجود نے کاٹا ہے۔“

"اکبر شاہ!" وہ دبی زبان میں چلائی تھی اور کرسی دھکیل کر اٹھنے لگی کہ اکبر شاہ بھی کھڑا ہو گیا اور اس کے وحشت زدہ چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

"ایک شخص اگر چپکے سے کسی کے دل میں اتر جائے، اس کا عضو جاں بن جائے تو دوسرا کیا کرے۔ اس کا اختیار چھن جاتا ہے نا۔"

تانیہ کو اپنا بدن لرزتا ہوا محسوس ہوا۔ اکبر شاہ کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جس کی روشنی نے تانیہ کی آنکھوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنے پورے جسم کو دل کی طرح دھڑکتا محسوس کرنے لگی۔ اسے لگا جیسے رگوں میں خون نہیں دل دوڑنے لگا ہو پھر یکدم وہ کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی اور میز پر رکھی کتاب پر نگاہیں جما کر مرتعش آواز میں بولی۔

"پلیز اکبر شاہ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

اکبر شاہ نچلے ہونٹ کا گوشہ دانتوں میں دبا کر اس کے جھکے سر کو دیکھنے لگا پھر ایک ہاتھ اس کی کرسی پر اور ایک ہاتھ میز کی سطح پر جما کر اس کی سمت جھکتے ہوئے بڑی لجاجت سے بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اوکے، مگر مجھے یقین ہے کہ تم مجھے تنہا نہیں چھوڑو گی۔ اس لیے تانیہ کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے، تمہاری گائیڈنس کی، تمہارے ساتھ کی، زندگی گزارنے کے لیے مجھ اب تمہاری ہر قدم پر ضرورت ہے۔"

"میں نے کہا نا اکبر شاہ! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" وہ جیسے کراہ کر بولی تھی۔

"اوکے، اوکے۔" وہ سٹپٹا کر سیدھا ہو گیا اور ہونٹ بھینچے کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر پلٹ کر بڑے بڑے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

جبکہ تانیہ نے کسی مفلوج پرندے کی طرح سر اسی کتاب پر گرا لیا تھا۔

X...X...X

"شیکسپیئر کے قول کے مطابق دنیا ایک سٹیج ہے تو تم بھی اس ڈرامے میں اپنا کردار ایکٹ کر رہی ہو۔" ولید اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر نہ صرف اندر آ گیا تھا بلکہ کرسی کھینچ کر اس کے بیڈ کے بے حد نزدیک رکھ کر اس پر بیٹھ گیا پھر ایک جھٹکے سے اس کے منہ پر پڑی چادر کھینچ لی۔

”آپ چند لوگوں کو ہر وقت بے وقوف بنا سکتے ہیں اور بعض لوگوں کو بعض وقت مگر تمام لوگوں کو ہر وقت بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ چلو شاباش فٹافٹ آنکھیں کھول کر اس ڈرامے کا ڈراپ سین کرو۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں شیری!“

اور اس کے پاس آنکھیں کھولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

بے شک شیکسپیئر کے بقول دنیا ایک سٹیج ہے اور ہر شخص اداکار بھی نہیں ہو سکتا اور اگر وہ اداکارہ تھی بھی تو انتہائی بری۔ وہ ولید حسن کی طرح کامیاب اداکارہ نہیں بن سکتی تھی۔

اس کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یوں اس کے سر پر چڑھ آئے گا۔ وہ چادر کا کونا ہلکے ہلکے کھینچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”سنو تمہیں پتہ ہے تم کتنی بری ایکٹر ہو۔“ اس کی آواز میں ہلکی ہنسی بھی تھی جو اسے سراسر تمسخر اڑاتی محسوس ہوئی۔

اس نے ساری شرمندگی ایک طرف ڈالی اور جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کڑوے لہجے میں بولی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”مجھے پتہ ہے اور یہ بھی پتہ ہے کہ آپ بہت کامیاب اداکار ہیں۔“

وہ بے ساختہ ہنسا تھا پھر آنکھوں کو ہلکی سی جنبش دے کر اسے دیکھتے ہوئے کندھے اچکائے۔

”اچھا کمال ہے‘ مجھے تو پتہ ہی نہیں جبکہ میں تو خود کو تم سے بھی برا اداکار سمجھتا آ رہا ہوں۔“

”یہ بھی آپ کی کامیاب اداکاری کی دلیل ہے۔“ وہ استہزائیہ ہنسی پھر جیسے ہی نگاہ دروازے پر گئی جہاں آغا جی دبی دبی مسکان لیے سٹک پر ہاتھ جمائے کھڑے تھے اس کا غصہ گویا مزید بڑھ گیا۔ اس نے آغا جی کی طرف خاصی شاکی نظروں سے دیکھا اور رخ موڑ لیا۔

”کیا میری شکل اتنی ڈرائونی ہے کہ تم دیکھنے سے کتراتی پھرتی ہو۔ حالانکہ گائوں کی آب و ہوا نے مجھے اور نکھار دیا ہے۔“ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا پھر آغا جی کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

”کیوں آغا جی؟“

”ولید! بس اب میری بچی کو تنگ کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔“ آغا جی اپنے ہونٹوں کے گوشوں میں پھیلی مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے مصنوعی خفگی سے ولید کو گھورنے لگے۔ پھر شہرینہ سے بولے۔

”چلو بچے شاباش۔ جلدی سے بستر سے نیچے اتر کر باہر آئو میں چائے پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ سٹک پر ہاتھ جما کر دروازے سے ہی واپس ہو لیے۔

ولید حسن ایک گہری سانس بھر کر اس کے چہرے کو بغور تکتے ہوئے ان پر ہتھیلی کا دبائو ڈال کر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”ایک بات تو بتائو شیری! میرے گائوں جانے پر تم اس قدر ڈس پلیزڈ کیوں ہو جاتی ہو؟ وہ گائوں ہی ہے خدانخواستہ...“ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے دانستہ ذرا سا رکا تھا۔ وہ جانے کیوں جھینپ کر، رخ موڑ کر دوسری طرف سے بیڈ سے نیچے اتر گئی اور بالوں کو سمیٹنے لگی۔

”کسی دن تمہیں بھی لے جائوں گا گائوں۔“ اس کا انداز جیسے پچکارنے والا تھا۔

”جی نہیں، مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔“ وہ پلٹ کر ناگواری سے بولی پھر ٹھہر کر استہزائیہ ہنسی کے ساتھ گویا ہوئی۔

”یوں بھی جو وی وی آئی پی ٹریٹ آپ کو وہاں ملتی ہے وہ مجھے تو ملنے سے رہی۔“

”اوہ۔“ وہ یکدم سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکوڑ کر اسے دیکھتا رہ گیا۔

آنکھوں میں خفیف سی حیرت جھلکی تھی پھر دوسرے پل وہ ہونٹ سکوڑے ٹرائوزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اس کی طرف آیا۔

وہ یکدم خجل ہو کر رہ گئی تھی اسے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا کہ اسے یہ سب اور اس لہجے میں نہیں کہنا چاہیے لیکن وہ تو بس ایک طرح کی بے اختیاری تھی جو کچھ اس نے محسوس کیا وہ زبان سے نکل ہی چکا تھا۔ اب اس کی نگاہیں اسے مضطرب کرنے لگیں۔

”کیا سکندر آیا تھا؟“ ایک لمحے کی خاموشی سے وہ اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد کسی خیال کے تحت پوچھنے لگا تو وہ پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی پھر رخ موڑ کر بولی۔

"ہاں آئے تو تھے مما کے پاس ہی بیٹھے تھے آغا جی تو تھے نہیں۔" وہ اپنی وارڈروب کی طرف بڑھنے لگی کہ وہ زور سے ہنسا تھا۔ یوں جیسے کوئی اپنی بات کی تہ تک پہنچ کر یا کسی احمقانہ خیال پر ہنستا ہے بے ارادہ۔ وہ ٹھٹک کر پلٹی تھی۔ اس کے رخسار ہلکے سے سرخ ہوئے تھے۔

"شیری! زندگی گزارنے کا ایک نہایت آسان سانسخہ ہے کہ کسی کے بارے میں کم سے کم معلومات رکھی جائیں۔ آگہی ضروری نہیں ہر دفعہ مفید ہی ہو۔ یہ بسا اوقات الجھاوے بھی لاتی ہے۔" وہ اپنی وارڈروب کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر کے لیے جیسے سن سی' خفت زدہ کھڑی رہ گئی پھر دوسرے پل ہلکے سے سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"بے شک آگہی الجھاوے لاتی ہے مگر یہی آگہی خود فریبی کے جال کو کاٹتی بھی ہے۔ آنکھیں بند رکھے نامعلوم راستے پر بھاگتے رہنا بھی تو کم عذاب نہیں ہوتا۔"

ولید نے بے حد چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے سنہری بال چوٹی سے نکلے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان اس کے پھول جیسے چہرے پر اداسی کی دھند چھائی ہوئی تھی جیسے چاندنی چٹکی ہوئی ہو۔ مضمحل اور اداس چاندنی۔

اس کی آواز میں ہلکی خود آزار سی کیفیت در آئی تھی۔

بات بات پر بھڑک کر بچکانہ حرکتیں کرنے والی اس پر جھپٹ پڑنے والی۔ اس سے شکوے شکایتیں کرنے والی شہرینہ کا یہ بجھا بجھا سا روپ ولید کے اعصاب کو خاصا متاثر کر گیا۔ اس کے ہمہ وقت مسکراتے چہرے پر ایک ٹھہراؤ تھا۔ خود آزاری کی کوئی کیفیت تھی جیسے کوئی غم دھیرے دھیرے زہر بنتا جا رہا ہو۔

اس نے زور سے سر جھٹکا اور سوچا شاید یہ وہم ہی ہو۔ کہتے ہیں نا کہ یوں بھی بہت سے وہم و گمان آدمی کی اپنی نظر کا فتور بھی تو ہوتے ہیں۔

تاہم اس کا لہجہ اسے ضرور مضطرب کر گیا تھا۔ وہ سنبھل کر اس کے قریب آیا اور ایک ہاتھ اٹھا کر اس کے وارڈروب پر رکھ کر اس کی طرف جھکا اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ پر شگفتہ لہجے میں بولا۔

"کمال ہے چند دن کے بخار نے تمہیں تو بالکل بدل ڈالا ہے۔ میں تو سوچ رہا تھا تم چیخ و پکار مچاتی پھرتی ہو گی۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹختی ہو گی اور مجھے دیکھ کر تو گلدان اٹھا کر مرنے مارنے پر تل جاؤ گی۔ ویری سرپرائز... یہ بخار تو بڑا کارآمد ثابت ہوا ہے اس پورے گھر کے لیے۔"

اس نے لب بھینچ کر کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور ایک جھٹکے سے وارڈروب کا دروازہ کھول دیا۔ وہ سرعت سے پیچھے نہ ہٹتا تو یقینی تھا وارڈروب کا مضبوط اور نقشین دروازہ اس کے خوب صورت چہرے کا حلیہ بگاڑ جاتا۔

وہ اس کی اس حرکت پر ایک لمحے کے لئے ششدر رہ گیا مگر دوسرے پل ہونٹ باہم سختی سے جوڑ کر اسی جھٹکے سے کھلے ہوئے دروازے کر دھماکے سے بند کر دیا ہاں یہ اور بات کہ اس کا بازو پکڑ کر اسے

ایک طرف ہٹایا تھا پھر اس کے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس کا رخ جھٹکے سے اپنی طرف کر دیا۔

وہ اس جوابی کارروائی کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی وہ بھی اس قدر فوری۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہ گئی۔ تب وہ ہلکے سے ہنسا اور اس کے منتشر بالوں کو اور منتشر کرتا ہوا بولا۔

”تم وہی ہنستی مسکراتی' بات بات پر ہنگامہ کرتی ہی اچھی لگتی ہو۔“

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کے وجود میں جیسے پھر ابال سا آ گیا اور اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑانا چاہا مگر کوشش ناکام رہی سو مزید جھلس گئی۔

”مجھے پاگل کتے نے نہیں کاٹا کہ میں ہر وقت ہنستی رہوں۔“

لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا مگر وہاں مطلق اثر نہ ہوا بلکہ ہونٹوں پر رقصاں مسکراہٹ کچھ اور کشادہ ہو گئی۔

”میرا خیال ہے تمہیں آئس کریم کھلا لائوں۔ گرمی تو ہم نے بہت کھالی ہے بلکہ دکھا بھی دی ہے۔ اب تمہیں کسی ٹھنڈی شے کی ضرورت ہے۔“ وہ اسے لیے دروازے کی طرف بڑھا تو وہ مچل گئی۔

”نہیں مجھے نہیں کھانی آئس کریم وائس کریم۔ چھوڑیں میرا ہاتھ۔“ وہ اس کی گرفت سے ہاتھ کھینچنے کی جدوجہد کرنے لگی مگر گرفت ڈھیلی تو کیا پڑنی تھی اور مضبوط تر ہو گئی وہ اس کی معمولی طاقت پر بھی کسی نرم لچکدار شاخ کی طرح کھنچی چلی جا رہی تھی۔

”تمہیں پتہ تو ہے میں ”نہ“ سننے کا عادی نہیں ہوں اور جو کہتا ہوں کر گزرتا ہوں۔“ وہ اطمینان سے کہتا یوں چل رہا تھا جیسے وہ بخوشی اس کے ہمراہ چل رہی ہو۔ راہداری میں کوئی

نہیں تھا لابی بھی خالی پڑی تھی۔ البتہ کچن کے دروازے سے صغریٰ نے... حیرت سے آنکھیں پٹپٹا کر یہ منظر دیکھا پھر خود بخود پر اسرار انداز میں مسکرانے لگی اور جھٹ پٹ مونا بھابی کی طرف دوڑ گئی جو کچن کے پچھلے دروازے کے پاس کھڑی تھیں۔

پورٹیکو میں چوکیدار اور اس کے لڑکے کو دیکھ کر شہرینہ جھینپ کر جلدی سے بولی۔

"پلیز ولید میرا ہاتھ چھوڑیں میں بیٹھ جاتی ہوں گاڑی میں۔"

"ویری گڈ... یہ فرمانبرداری تو تمہیں کمرے میں ہی دکھانی چاہیے تھی۔" وہ خوش ہو کر بولا تو وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی اور دروازہ کھول کر سیٹ پر بیٹھ کر ایک دھماکے سے بند بھی کر دیا۔ کوئی چھوٹی موٹی گاڑی ہوتی تو یقیناً اس دھماکے سے ہل کر رہ جاتی۔

وہ سیٹی پر ہلکی دھن بجاتا شرٹ کی اوپری جیب میں لٹکتے سن گلاسز اتار کر آنکھوں میں چڑھاتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کر چکا تھا۔

X...X...X

"نادیہ کی ساس کا فون آیا تھا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سکندر کمرے کے دروازے سے سر جھکائے آستین کے کف بند کرتے ہوئے نکلا تو اماں تخت کی چادر پر ٹانکا لگاتے ہوئے اس سے بولیں۔ وہ قریب ہی رکھے سٹول پر بیٹھ گیا۔

"اچھا کیوں خیریت؟"

"وہی شادی کی تاریخ مانگنے کے لیے۔ میں نے کہہ دیا ابھی سال بھر تو رہنے ہی دیجئے۔"

"کیوں سال بھر کیوں، جب مانگ رہی ہیں تو کوئی تاریخ دے دیں۔" اس نے ابرو اچکا کر حیرت سے استفسار کیا پھر جیب سے رسٹ واچ نکال کر کلائی میں ڈالنے لگا۔

اماں نے سوئی دھاگے کی ریل میں پھنسائی اور ادھر ادھر نگاہیں ڈالیں۔ یہ اطمینان کیا کہ نادیہ آپی کہیں قریب نہیں ہیں تو دھیرے سے بولیں۔

"ہم نے کون سا ڈھیر سارا خزانہ رکھا ہوا ہے جو پٹ سے بیاہ دیں گے اور پھر... نادیہ کے سسرال والے بڑے ہی لالچی قسم کے ہیں جو چیزیں انہیں چاہئیں وہ کم از کم ایک سال میں ہی جمع ہو پائیں گی۔" سکندر کی نگاہیں رسٹ واچ پر جیسے جم گئیں تب اماں جلدی سے بولیں۔

"یوں بھی ایک دو سال تو منگنیاں رہتی ہیں۔ ہم کون سا دس سال رکھنے کو کہہ رہے ہیں۔ اچھا ہے تسلی سے کام ہو اور دیر میں ہی خیر ہے تم یہ بتاؤ کہ تمہارے کیا ارادے ہیں۔ میں نادیہ کو رخصت کرنے کے ساتھ بہو لانا چاہتی ہوں۔ کب تک تم مجھے ٹالتے رہو گے۔"

"کیا... یہ میری شادی کا ذکر کہاں سے آ گیا بیچ میں۔" وہ بری طرح چونکا تھا بلکہ جھنجلایا بھی تھا۔ اماں نے جواباً اُسے گھور کر دیکھا اور چشمہ اتار کر تکیے پر رکھا اور چادر سمیٹتے ہوئے بولیں۔

"اصولاً تو تمہارا ہی ذکر پہلے آنا چاہیے تھا۔ بچیاں الگ جان کو آ گئی ہیں کہ بھابی آنی چاہیے۔"

"بالکل سو فیصد بھابی بھی آنی چاہیے۔" نادیہ آپی چھت سے خالی بالٹی لیے نیچے اتری تھیں۔ اماں کا جملہ کانوں میں پڑا تو لپک کر ادھر چلی آئیں پھر چٹکی بجا کر شرارت سے گنگنانے لگیں:

آج نہیں تو کل اس گھر میں چاند سی بھابی آئے گی

دیکھ کے بھیا کی صورت وہ

گھونگھٹ میں شرمائے گی

آج نہیں تو......

اماں ہنسنے لگیں جبکہ سکندر کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہ ابھرا۔

"یہ مذاق نہیں ہے لڑکے!" اماں ذرا خفا ہو کر بولیں۔ پھر یکدم یاد آنے پر بولیں۔

"میں کل سید صاحب کے یہاں گئی تھی تو باتوں باتوں میں عظمیٰ کے رشتے کی بات بھی کر دی۔"

اور اب کے سکندر یوں اچھلا جیسے کسی نے اس کی سٹول کے نیچے بم رکھ دیا ہو۔

"کیا مجھ سے پوچھے بغیر آپ نے۔"

نادیہ آپی کا سانس بھی جیسے اوپر کا اوپر رہ گیا تھا۔ وہ سٹپٹا کر اماں کی طرف دیکھنے لگیں تب اماں اطمینان سے بولیں۔

"تمہاری نہیں نومی کی بات کر رہی ہوں۔ اس لڑکے کی مجھے تم سے زیادہ فکر کھائے جا رہی ہے۔ جانے کیا کرتا پھرتا ہے؟ کوئی ترتیب ہی نہیں ہے اس کی زندگی میں۔ بڑا ہی بے سدھرا اور غیر ذمہ دار لڑکا ہے۔ میں نے سوچا اس کی نکیل ڈال ہی دوں تھوڑا ذمہ دار ہو جائے گا اور

یوں بھی عظمیٰ کے دو رشتے پہلے ہی آئے ہوئے ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ اتنی اچھی لڑکی ہم کھودیں۔" وہ ذرا دیر رکیں پھر گہرا سا سانس بھر کر بولیں۔

"تم نے تو عظمیٰ کے لیے صاف لفظوں میں منع کر دیا تھا اب بھی اگر تم چاہو تو۔"

سکندر سٹول سے یکدم کھڑا ہو گیا اور جیسے اس ساری گفتگو سے یکسر بے نیاز بن کر نادیہ سے بولا۔

"نومی ہے کہاں؟" نومی کے ذکر پر اس کے ذہن کی سطح پر جیسے پتھر لڑھکا تھا۔ بھاگتی گاڑی اور پولیس موبائل کا بجتا سائرن ذہن میں گونجنے لگا۔

"آپ کے آنے سے دس منٹ پہلے ہی باہر گیا تھا کہہ رہا تھا بس ابھی آتا ہوں۔" نادیہ آپی بتانے لگیں پھر تخت پر اماں کے پاس بیٹھ کر ان کے قریب ہو کر بولیں۔

"سچ کہہ رہی ہیں اماں آپ نے عظمیٰ کے لیے بات کی ہے۔" نادیہ آپی کے اندر خوشی کے جھانجھر بجنے لگے تھے۔ انہیں نومی کے عظمیٰ کی طرف جھکاؤ کا خوب اندازہ تھا۔

اماں نے سر ہلا دیا۔

"آپ نے بتایا بھی نہیں میں بھی چلتی۔"

"لو میں کوئی پروگرام کے تحت تھوڑا ہی گئی تھی وہ تو وہیں جا کر ان کی زبانی پتہ چلا کہ عظمیٰ کے رشتے آئے ہوئے ہیں اور ایک طرف ان کا جھکاؤ بھی ہے۔ وہ لڑکے کی چھان بین کر رہے ہیں۔ سو میں نے بھی فوراً ہی نومی کے لیے کہہ دیا۔ بے چاری پہلے تو ہکا بکا رہ گئیں پھر مسکرانے لگیں۔

مجھے لگتا ہے نادیہ! سید صاحب کی بیگم نومی کے رشتے کا سن کر دل ہی دل میں بڑی خوش ہوئی ہیں۔" وہ نادیہ کے ہاتھ پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر جیسے رازداری سے بولیں۔

سکندر پیروں میں چپل پھنسا کر کی بورڈ سے بائیک کی چابی اٹھاتے ہوئے ایک کھنچی کھنچی سانس بھر کر رہ گیا پھر باہر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"نادیہ! نومی آئے تو اسے روکے رکھنا میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔"

"مگر تم کہاں چل دیئے۔" اماں پکارتی رہ گئیں پھر سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"مجھے تو ان دونوں بھائیوں کی سمجھ نہیں آتی ایک آتا ہے تو دوسرا جاتا ہے۔ کبھی ٹک کر نہیں بیٹھیں گے۔"

"اماں نومی تو اب کمانے بھی اچھا لگا ہے۔ کل کہہ رہا تھا بہت جلد میں گاڑی لے لوں گا۔ مجھے تو لگتا ہے اماں ہمارے واقعی دن پھرنے والے ہیں۔"

نادیہ کی آنکھوں میں یہ کہتے ہوئے چمک سی لہرانے لگی تھی۔

اماں نے انہیں ایک نظر دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔ بس پیشانی پر چند تفکر کی لکیریں ابھر آئیں۔ انہوں نے دھاگے کی ریل سے سوئی نکالی اور دوبارہ چادر سینے لگیں تو نادیہ آپی تخت سے اٹھتے ہوئے

بولیں۔

"آپ رہنے دیں اماں تانیہ سی دے گی۔"

"ارے کب سیئے گی۔ صدیاں بیت جائیں گی۔ ارے ہاں یہ تانی ہے کہاں یونیورسٹی سے آکر نظر نہیں آئی مجھے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کہہ رہی تھی تھک گئی ہوں سوؤں گی۔ شاید کوئی ٹیسٹ وغیرہ تھا اس کا۔ کھانا بھی کہاں کھایا ہے اس نے۔" وہ جواب دیتیں کچن میں غڑاپ ہو گئیں اور اماں چادر اٹھا کر سینے لگیں۔

X...X...X

سب کا خیال تھا وہ تھک کر دن بھر سوتی رہی ہے مگر دن تو کیا اس کی تو رات کی نیندیں بھی اڑ گئی تھی۔ وہ کمرے کی بجائے چھت پر بے کل ٹہلتی رہی تھی۔

ڈھلتی شام رات کا آنچل اوڑھنے لگی۔ درخت بڑھتی ہوئی تاریکی میں چھپتے گئے مگر وہ یونہی چھت پر ٹہلتی رہی پھر تھک کر دونوں گھٹنے سمیٹ کر ان کے گرد بازو ڈال کر یوں بیٹھ گئی جیسے کوئی ٹھٹھرتی سردی میں آتش دان کے پاس بیٹھا ہو۔

اچھی بھلی سیدھی سادی آسان سی زندگی گزار رہی تھی کہ اکبر شاہ نے جیسے پر سکون جھیل میں پتھر ڈال کر منتشر کر ڈالا تھا۔

اسے تو اب کل یونیورسٹی جانے کے نام سے ہی خوف آرہا تھا۔ مگر کل بہت ضروری ٹیسٹ بھی تھا اور پھر اس کا خیال تھا وہ اک دن نہیں جائے گی، دو دن نہیں جائے گی، آخر اس کے

ڈر سے کب تک نہیں جائے گی۔اس نے تھک کر دیوار پر کمر کے ساتھ سر بھی ٹکالیا۔کچھ سوال اسے بے چین کر رہے تھے۔

آخر اکبر شاہ چاہتا کیا ہے۔

یکدم انقلاب کیونکر آگیا اس کے اندر اور اگر اس طمانچے سے ہی آیا ہے تو پھر اسے تو شہرینہ کا ممنون اور مشکور ہونا چاہیے۔

اس کے جنون کا' دیوانگیوں کا رخ اس کی طرف کیسے ہو گیا' کیوں ہو گیا اور بقول اس کے کہ ایک لمحہ تھا جس نے اس کی زندگی بدل ڈالی۔

اس کا دل اس کا یعنی تانیہ رضا کا طلب گار ہو چکا ہے۔وہ چپکے سے اس کے دل میں اتر چکی ہے۔

کب؟

کیسے؟

وہ خود نہیں جانتا تھا۔

اوہ... وہ اتنے بہت سے مضطرب سوالات کے آکٹوپس میں جکڑی ہوئی سخت پراگندہ ہو رہی تھی۔اسے یکدم ہی کسی ہمدرد' غمگسار کی طلب ہونے لگی اور اس کی ایک واحد ہمدرد دوست شہرینہ ہی تو تھی مگر جانے کیوں وہ ان واقعات کو اس سے شیئر کرنے سے گریزاں نظر آرہی تھی۔

شاید لاشعور میں یہ خوف دامن گیر تھا کہ وہ ساری باتیں سن کر بھبک کر پھر اکبر شاہ سے نہ الجھ پڑے۔یوں بھی تانیہ ڈری سہمی' ہنگاموں اور فتنوں سے خوفزدہ رہنے والی لڑکی تھی۔

اکبر شاہ سے شہرینہ کی نفرت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔اب ہمت ہی نہ پا رہی تھی کہ خود ان تین دنوں کی روداد اس کے گوش گزار کر ڈالتی اور کرتی بھی تو کن الفاظ میں' کس لہجے میں۔

کہیں شہرینہ یہ نہ سمجھ لے کہ درپردہ اس نے ہی اکبر شاہ کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

اور کہیں... کہیں یہ سچ ہی نہ ہو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول کر ایک گہری سانس بھری۔

اسے لگا جیسے اس کا چہرہ تپنے لگا ہو۔رخسار گرم محسوس ہونے لگے۔

"تو کیا اس کے کسی رویے نے اکبر شاہ کی واقعی حوصلہ افزائی کی ہے۔"

"نہیں یہ کیسے ممکن ہے میں نے تو ہر طرح کی سختی کی ہے۔"

وہ مضطرب سی کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی اور سوچنے لگی کہ اب وہ سختی سے کوئی قدم اٹھائے گی۔ اسے بری طرح جھڑک دے گی۔ اس کی شکایت پرنسپل سے کر دے گی۔

رات بھر وہ اسی طرح کی باتیں سوچ سوچ کر اپنے ارادوں کو مضبوط کرتی رہی۔ نئے نئے ارادے باندھتی رہی۔ خود کو حوصلہ دیتی رہی کئی سخت جملے یاد کرتی کہ کس طرح اسے جھڑکے گی اور کن الفاظ میں اسے شرمندہ کرے گی۔ مگر صبح یونیورسٹی میں قدم رکھتے ہی اس کی نظریں پیپل کے درخت سے ٹیک لگائے اکبر شاہ پر پڑیں تو سارا اعتماد دھویں کی طرح جیسے فضا میں تحلیل ہو گیا۔

وہ کسی اداس ہیرو کا سا پوز بنائے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر تیر کی طرح اس کی راہ میں آ گیا اور پھیل کر اس کے آگے بڑھنے کی راہیں مسدود کر دیں۔

ایک لمحہ کو اس نے جیسے اذیت کے ساتھ آنکھیں میچ لیں۔

جیسے آنکھ کھولنے پر وہ خواب کی طرح گم ہو جائے گا مگر جب آنکھیں کھولیں تو وہ سامنے کھڑا تھا۔ سفاک حقیقت کی طرح۔

اس نے سوچا اسے اپنے قدم روکنے ہی نہیں چاہئیں اگر وہ ایک بار رک گئی تو پھر شاید بکھر جائے گی۔

ریت کی دیوار کی طرح ڈھے بھی جائے گی۔

اور

اور شاید دھوپ میں رکھی برف کی طرح پگھل ہی نہ جائے۔

بے شک اکبر شاہ کا وجود ہمیشہ کانٹے کی طرح اس کے وجود میں گھسا رہا تھا۔ اس کے لیے بے نام چبھن کا باعث رہا تھا۔ مگر اس کا سراپا یوں یکدم نظر انداز کر دینے والا بھی نہ تھا۔ اس پر مستزاد اب اس کا یہ بدلا ہوا روپ' اس کا مضبوط بیک گراؤنڈ اور اب اس پر وار فتانہ' دیوانہ وار التفات وہ بھی ایک بشر ہی تھی۔ کمزور فطری جذبوں اور بشری کمزوریوں سے بھری ہوئی کوئی لمحہ بھی شکست بن سکتا تھا۔

وہ مذمت کرتے کرتے دفاع کرتے کرتے تھک سکتی تھی اور تھکن کا دوسرا نام شکست ہی تو تھا۔ وہ اپنے اندر کے خوف سے' اپنی بشری کمزوریوں سے خوفزدہ ہو کر تیزی سے قدم اٹھانے لگی کہ وہ بے تابانہ لہجے میں بولا۔

''تانیہ پلیز یوں غیریت مت برتو میں کب سے کھڑا تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

اکبر شاہ اور ایسا منت بھرا لہجہ وہ بھی تانیہ رضا کے لیے؟ اسے اپنے دل میں کچھ ہوتا ہوا محسوس ہوا' خود بخود قدم سست پڑ گئے اور وہ پھر اس کی راہ میں آ گیا۔ بلیک ٹراؤزر اور وہائٹ شرٹ میں تیز پرفیوم کی مہک میں بسا وہ تانیہ کے اتنے نزدیک آر کا کہ تانیہ کو اپنے دل پر آنچ سی پڑتی محسوس ہونے لگی۔

اسے اپنا وجود ایک انوکھی آگ میں جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی جہاں صنف مخالف کی ذرا سی توجہ دل میں پھول کھلا دیتی ہے۔

رنگین دھند سی آنکھوں اور روح پر جال کی طرح پھیل جاتی ہے۔

وہ ایسی ہی کسی دھند کے جال میں قید ہونے سے بچنا چاہ رہی تھی مگر وہ اس کی ہر تدبیر' اس کے تمام تر دفاعی ہتھیار ناکارہ بنانے پر تلا ہوا تھا۔

''تانیہ! پلیز دیکھو یہ زیادتی ہے۔'' عجیب بے تابیاں تھیں۔ پھر اس نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے اٹھنے والے قدم کو روک دیا اور اسے لگا کسی نے اسے یخ بستہ پانی میں دھکیل دیا ہو۔ دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

اس نے لرزتی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا اور سرعت سے ہاتھ اس کی گرفت سے یوں کھینچ لیا جیسے غلطی سے کسی گرم گرم دہکتے تنور پر جا پڑا ہو۔ پھر پاس کی دیوار سے ٹیک لگا کر انتہائی بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''صرف تمہارا ساتھ عمر بھر کے لیے۔'' وہ جیسے جواب پہلے سے ہی تیار رکھے ہوئے تھا۔ یوں برجستہ بولا تھا۔ وہ چپ سی ہو گئی۔ پھر قدرے سنبھل کر ایک استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم بھول رہے ہو کہ میں تانیہ رضا ہوں۔ شہرینہ نہیں۔ وہی تانیہ رضا جو تمہارے سٹیٹس سے میل نہیں کھاتی تھی' جس سے دوستی تو کجا اس کی طرف دیکھنا بھی تمہیں کبھی گوارا نہیں تھا۔ جو تمہارے خیال میں شہرینہ سے بھی دوستی کے قابل نہیں تھی۔ تمہاری برابری

کے قابل نہیں تھی۔اب تمہارا اسٹینڈرڈ اتنا لو کیسے ہو گیا کہ مجھ جیسی سفید پوش' مڈل کلاس لڑکی کے لیے تمہارا دل کشادہ ہو گیا۔ تم اپنے معیار سے اس قدر نیچے کی لڑکی کے لیے خوار ہونے لگے۔ میں تو آج بھی وہی تانیہ ہوں عام سی شکل وصورت کی سفید پوش لڑکی۔"

رات بھر کی قطرہ قطرہ جمع کی ہوئی ہمتیں بالآخر کام آگئیں۔ وہ دل کی بھڑاس بے اعتبار لہجے میں نکالتی رہی اور اسے بے یقین نظروں سے دیکھتی بھی رہی مگر وہ کمال حوصلے سے کھڑا سنتا رہا اس کے چپ ہونے پر دل گرفتگی سے مسکرایا۔

"ہاں تم یہ سب کہنے میں حق بجانب ہو کہو اور بھی کچھ کہو جی بھر کر مجھے لعن طعن کرو' اچھا ہے اپنے دل کی بھڑاس نکال لو اور پھر ٹھنڈے دل سے میری بات سنو۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا۔" وہ اس کے اتنے تحمل پر بالکل بھی حیران نہ ہوئی اور پلٹنے لگی مگر اس نے دیوار پر ہاتھ رکھ دیا۔

"شہرینہ میری محبت نہیں ضد بن گئی تھی۔ میں نے زندگی میں کبھی نہ نہیں سنی تھی۔ لڑکیوں کو ہمیشہ خود پر مرتے ہی پایا تھا۔ سو شہرینہ خان کی بے اعتنائی میری ضد بن گئی۔ مجھے اسے تنگ کرنے میں لطف

آنے لگا تھا۔ میں اسے جھکانا چاہتا تھا مگر یکایک۔ میرے اندر کے شیطان نے دم توڑ دیا۔ اس رات میں نے اپنا احتساب کیا تو مجھے اپنے تمام رویوں پر سوائے شرمندگی کے کچھ نہ ملا میں رات' رات بھر خود کو ملامت کرتا رہا اور جب میرے اندر ایک نئے اکبر شاہ نے سر اٹھایا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اسے صرف تانیہ رضا کی طلب ہونے لگی۔ اس کے اندر ایک شرمیلی ڈری' سہمی' معصوم ہرنی جیسی لڑکی براجمان ہے۔

تانیہ میرا اعتبار کرو' میں تمہارے سنگ چل کر اپنے اندر اور بہتری پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو' دیکھو۔" وہ اسے بولنے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر روکتا ہوا بولا۔

"میں جانتا ہوں محبت زبردستی حاصل نہیں کی جاسکتی مگر دوستی تو زبردستی اور بھیک مانگ کر حاصل کی جاسکتی ہے نا۔" وہ ذرا سا مسکرایا تانیہ کو اپنا دل عجیب سی حرارت سے پگھلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ قطرہ قطرہ خود کو جوڑنے کا عمل ایک بار پھر بکھر گیا۔

اس کے اعصاب پر بڑا بھاری حملہ ہوا تھا وہ انتہائی دل گرفتگی سے کہہ رہا تھا۔

"تم دوستی تو کر سکتی ہو نا مجھ سے۔ محبت میرا مسئلہ ہے اور اگر کوئی تمہیں دل کی گہرائیوں سے خاموشی سے چپکے چپکے چاہتا رہے تو تمہارا کیا جائے گا۔

خطا تو جب ہے کہ ہم حال دل کسی سے کہیں

کسی کو چاہتے رہنا کوئی خطا تو نہیں

وہ اسے دیکھتے دیکھتے یکدم نگاہیں ہٹا کر سامنے درخت کو اضطرابی انداز میں جیسے گھورتی رہ گئی۔ اس کے اعصاب یکدم منتشر ہو کر یوں بکھر گئے تھے جیسے وجود کے اندر ہی کہیں بم بلاسٹ ہوا ہو اور اس دھماکے کے بعد ہر شے بکھری بکھری نظر آئے اور اسی اعصاب شکن احساس نے اسے شدید ترین بے بسی میں مبتلا کر دیا۔ اس نے اکبر شاہ کو پلٹ کر جاتے ہوئے دیکھا۔

اونچا لمبا سیاہ ٹراؤزر شرٹ میں اس کا سراپا بہت شاندار نہ سہی مگر ایک عام سی لڑکی کے مقابلے میں وہ کئی گنا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔

اس کے ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیاں مکھیوں کی طرح اس امیر کبیر فلمی ہیرو جیسے لڑکے پر فدا ہوتی تھیں۔ وہ بڑی سی گاڑی سے اترتا تو کتنے احساس کمتری میں مبتلا دل کچھ حسد کچھ رشک کی آگ میں جلنے لگتے مگر ایسی آگ میں وہ کبھی نہیں جلی تھی مگر آج جانے کیوں اپنے اندر کی تشنگیاں جیسے کسی دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح بھڑکنے لگیں۔

ٹھیک ہے دنیا میں جنت کا وجود ناممکن ہے مگر ہم اپنے لیے ایک چھوٹا سا آسودہ حال خوشگوار خطہ تو بنا سکتے ہیں۔ اس کے تو خواب دیکھ سکتے ہیں۔ آسودگی کے خواب بھلا کون آنکھ نہ دیکھتی ہو گی۔

وہ یکدم ہی مضطرب ہو کر رہ گئی۔ دل پر ایک بھاری بوجھ محسوس ہونے لگا۔

سارے کومپلیکسز چنگاریوں کی طرح اڑ اڑ کر بھڑکنے لگے۔

نادیدہ سا خوف روح پر چھانے لگا وہ آہستگی سے کلاس روم کی طرف بڑھی تو خود کو اندر سے خالی خالی شکست خوردہ سا محسوس کر رہی تھی۔

X...X...X

"دانا کہتے ہیں اچھے مزاج کی بہترین علامت یہ ہے کہ آدمی برے مزاج کو برداشت کرے۔" وہ اسے ایک آئس کریم بار میں لے کر آیا تھا اور ایک میز منتخب کر کے اس کے لیے کرسی کھینچتا ہوا اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے ہلکے سے ہنسا تھا جبکہ اس کی یہ ہنسی اس کی چڑچڑاہٹ میں اضافہ کر گئی۔

"چلیں نہیں کرتے۔" اس نے ذرا سا جھک کر سرِ تسلیم خم کر دیا اور پھر خود ہی کرسی کھینچ کر اطمینان سے بیٹھ کر مینیو کارڈ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ دزدیدہ نگاہوں سے اسے بھی دیکھتا رہا جو دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر سامنے بڑے کانچ کے سفید گلدان کو گھورے جا رہی تھی۔ تب اس نے آہستگی سے وہ گلدان درمیان سے اٹھا کر اسے اپنے دائیں طرف کونے میں یوں رکھ کر اس کی طرف دیکھا جیسے خدانخواستہ وہ یہ گلدان اٹھا کر اسے دے مارنے والی تھی۔

ولید کی اس حرکت اور چہرے کے تاثرات سے وہ سلگ گئی اور شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھنے لگی تو وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

"دیکھو نا احتیاط تو ضروری ہے نا۔"

"کیا آپ مجھے اتنا ال مینرڈ سمجھتے ہیں۔"

اس نے جیسے انتہائی دل گرفتگی اور شکایتی انداز میں پوچھا تو وہ کندھے اچکا کر مینیو کارڈ کا رول بنا کر میز کی سطح پر ہولے ہولے مارتے ہوئے بولا۔

"اتنا تو خیر نہیں۔" پھر اس کی بھوری بھوری آنکھوں میں جھانکا اور اس کے دائیں رخسار پر جھولتی بالوں کی ریشمی لٹ کو ہولے سے چھو کر جھٹکا دیا۔

اس کی اس حرکت پر وہ خواہ مخواہ ہی سٹپٹا کر کرسی کی پشت سے لگ کر لٹ کانوں کے پیچھے ڈالنے لگی۔

"بہر حال ال مینرڈ ہونا اب اتنی بری بات بھی نہیں ہے۔" وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا پھر کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا۔

"یوں بھی اس پر کوئی قانونی سزا نہیں ہے کوئی مقدمہ نہیں بن سکتا سو بے فکر رہو۔" اب وہ کیونکر تاؤ نہ کھاتی اس نے بڑی بے بسی سے اس گلدان کو دیکھا جو اس نے اس کی دسترس سے دور کر کے اپنے حق میں یقیناً اچھا ہی کیا تھا۔

"آپ مجھے یہی سب بتانے لائے تھے یہاں۔"

"نہیں، نہیں آئس کریم بھی کھلاتا ہوں۔" وہ شاید جی بھر کر اس کے چہرے کے پل پل بدلتے تاثرات سے محظوظ ہونا چاہتا تھا۔ پھر یکایک اسے چھیڑنے اور تاؤ دلانے کا ارادہ ترک کر کے ذرا سا اچک کر ٹراؤزر کی جیب ٹٹول کر اس سے ایک خوب صورت میوزیکل ڈبیا نکالی اور اسے میز پر رکھ کر اس کی طرف کھسکائی اور خود بھی اس کی طرف ذرا سا جھکتے ہوئے بڑی محبت سے بولا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو شیری!"

وہ اپنے دونوں ہاتھ میز کی سطح پر دھرے اس کی طرف بڑے شکایتی انداز میں دیکھ رہی تھی اب یکدم اس کی طرف سے برسنے والی خوشگوار پھوار پر دنگ سی رہ گئی۔

وہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے رخساروں پر خوشی سے یکدم امڈ آنے والی سرخی کو اس نے بے حد دلچسپی سے دیکھا' یہ اس کے لیے بڑا دلچسپ تجربہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے سبز ہرے بھرے پتوں کے درمیان سے یکدم سرخ گلاب پڑا ہوا نکل آیا ہو۔

دھوپ میں یکدم ٹھنڈی چاندنی بکھر آئی ہو۔

وہ پلکیں جھپک کر کچھ دیر یونہی اس ڈبیا کو دیکھتی رہی پھر دھیرے سے سر اٹھا کر بولی۔

"کتنی بے وقوف ہوں میں۔ اپنی برتھ ڈے تک یاد نہیں رہی۔"

"وہ تو تم ہو' کوئی شک نہیں۔" اس نے ایک ہلکی سانس بھر کر ڈبیا اٹھالی اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تمہیں پتہ ہے نا مجھے ہمیشہ ایسے دن یاد رہتے ہیں۔ اس لیے کہ میری میموری بہت اچھی ہے۔" وہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی وہ کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔

پتہ نہیں وہ کیوں اسے اتنا "بے حس" بے مروت اور یکسر اپنی ذات میں مست رہنے والا سمجھ بیٹھی تھی جبکہ اس نے ہمیشہ اسے وش کیا تھا' اچھے دنوں میں' اچھے موقعوں پر اور بات صرف میموری کی نہیں ہوتی۔ بات دوسروں کی خوشیوں کو شیئر کرنے کی ہوتی ہے۔ انہیں احساس دلایا جاتا ہے کہ تمہاری خوشیاں ہمارے بغیر ادھوری ہیں۔ اسے لگا جیسے اس کے اندر کی ساری بدگمانیاں' ساری اداسیاں چھٹتی جا رہی ہوں کندھے پر دھرا بوجھ ہولے سے سرک کر ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اس نے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھی خوش نما ڈبیا کو دیکھا اور اٹھاتے ہوئے بولی۔

"تھینک یو اس میں کیا ہے۔"

"اس میں۔" وہ کرسی کی پشت سے لگ کر اسے دیکھنے لگا پھر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
"کھولو تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔ اس میں تھرکتی ہوئی زندگی ہے۔"

وہ اس کے تروتازہ مسکراتے چہرے کو نیم وا آنکھوں سے تکنے لگا۔ اس کے ذہن میں ایک خوب صورت سی دھند چھانے لگی وہ بڑے دنوں بعد اسے غور سے اور اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔

''میری خواہش ہے کہ میری روح میں ایک کھڑکی ہوتی جس سے تم میرے احساسات دیکھ سکتیں۔''

اس نے ہلکی سی سانس خارج کرتے ہوئے تمام تر دلچسپی سے اسے دیکھا۔ اس نے اشتیاق بھرے انداز میں ڈبیا کو دیکھتے ہوئے اس کا ڈھکن اٹھایا تو مسرت کے احساس کی بجائے ایک چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوگئی تھی۔ ڈبیا سے چھوٹا سا مینڈک پھدک کر نکلا تھا اور میز پر کودا تھا۔

''آئوچ۔ اوہ مائی گاڈ۔'' وہ ڈبیا پھینک کر کرسی سمیت پیچھے ہٹی تھی اور دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر بھاگتے مخبوط الحواس مینڈک کو دیکھنے لگی، پھر ولید کی طرف دیکھنے لگی جو اب کھل کر ہنس رہا تھا۔ یہ سین اس کی توقع کے عین مطابق ہوا تھا۔ وہ منتظر ہی تھا کہ وہ ڈبیا کا ڈھکن اٹھاتے ہی چیخ مارے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

''اسی لیے آپ آغا جی کو ساتھ نہیں لائے تھے۔'' اس کی دہشت کم ہوئی تو شکایتی انداز میں وہ اسے گھورنے لگی۔ بہرحال اس کی دلچسپی پھر بھی مینڈک کی طرف ضرور تھی۔ اس کے انداز میں ناگواری یا غصہ نہیں تھا۔

ولید نے ہاتھ مار کر مینڈک کو اور ہراساں کیا تو وہ اچھل کر شہرینہ کی طرف آیا وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔

''کیا کر رہے ہیں، ہٹائیں اسے یہاں سے، کہیں یہ میری گود میں ہی نہ آپڑے۔ ویسے میری سالگرہ میں اس بیچارے کا کوئی قصور نہیں تھا۔ کہاں سے پکڑ لائے ہیں اسے۔''

''مجھے کہاں سے پکڑنا تھا۔ اس نے خود ہی میرا دامن پکڑ کر التجا کی کہ اس بے وقوف احمق لڑکی کی سالگرہ میں کیا میں بطور گیسٹ شامل ہو سکتا ہوں اور مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔''

وہ مصنوعی خفگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی پھر ہنس پڑی۔ کتنے دنوں بعد کھل کر ہنسی تھی۔ اس کی ہنسی میں ایسی تازگی اور کھنک تھی کہ ولید بے اختیار اس کی طرف دیکھتا رہا۔

آئو پھولوں سے جھولیاں بھر لیں

لوگ ہنستے ہیں بار بار کہاں

پھر جلدی سے نگاہوں کا زاویہ بدل کر ویٹر کو بلا کر مینڈک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے یہاں سے اٹھالو۔" اور ویٹر حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مینڈک کو گھورنے لگا پھر ولید حسن کی طرف دیکھنے لگا۔

"یس سر! یہ یہاں کیسے آگیا۔"

"یہاں سے۔" ولید نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا تو ویٹر خفیف سا ہو گیا اور جھٹ پٹ یہاں وہاں بھاگتے مینڈک کو دبوچا اور معذرت خواہانہ سی نگاہ ولید پر ڈال کر بولا۔

"سوری سر! حالانکہ اس سے پہلے کبھی کوئی مینڈک آیا نہیں ہے پتہ نہیں کیسے آگیا۔ عجیب سی بات ہے۔" پھر وہ تعجب خیز نظروں سے کھڑکی کو گھورتا ہوا چلا گیا۔

"آج سے پہلے تمہیں کبھی اتنا زبردست گفٹ ملا ہے۔" وہ اب دوبارہ شہرینہ کی طرف متوجہ ہوا۔ جس نے اس جوک کو بہر حال انجوائے کیا تھا۔ اس کے لبوں کی تراش میں اب

بھی مسکراہٹ بھری ہوئی تھی۔ وہ بڑے مطمئن انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر نگاہوں کا زاویہ ذرا سا بدل دیا۔

"نہیں' اتنا برا گفٹ آپ کے علاوہ کون دے سکتا ہے۔"

ولید اسے ایک دو لمحے دیکھتا رہا پھر نرمی اور ملائمت سے اس کے بالوں کو منتشر کرتے ہوئے بولا۔

"خوش رہا کرو شیری! اسی طرح ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہو۔ تمہیں پتہ ہے تمہاری معمولی پریشانی پر بھی آغا جی کتنے پریشان ہو جاتے ہیں۔"

'اور آپ؟' اس کا دل چاہا وہ پوچھ لے مگر یہ سوال اندر ہی کہیں مچل کر رہ گیا۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

پھر اس نے جیب سے ایک گولڈن زنجیر نکالی جس میں ایک پینڈنٹ جھول رہا تھا۔ اس نے اسے شہرینہ کی طرف بڑھا دیا۔

''اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں کہ اتنی اچھی لڑکی کو مینڈک پر ٹرخا دوں۔'' اس نے انگلی میں وہ چین گھمائی۔

ویٹر آئس کریم باؤل ان کی میز پر رکھتے ہوئے معنی خیز نظروں سے اس جوڑے کو دیکھتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ خوب صورت زنجیر میں لٹکتا دل نما پینڈنٹ ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہا تھا۔ اس نے لرزتی انگلیوں سے اسے تھام لیا اسے لگا جیسے اس کے اندر پھول ہی پھول مہک اٹھے ہوں۔

اہمیت قیمت کی نہیں تھی اہمیت اس جذبے کی تھی جس کا ترجمان یہ لاکٹ تھا۔ اس نے ممنون نگاہیں اٹھائیں پھر نادیدہ بوجھ سے لبریز ہو کر جھکا دیں۔

وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شفق کا پرتو تھا' قوسِ قزح کھل رہی تھی۔ کچھ عجیب سے انداز میں دمک رہا تھا اس کا چہرہ۔ وہ اس وقت شاید ہمیشہ سے زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی ولید حسن کو۔ وہ شاید بے خود سا ہو رہا تھا پھر یکدم ٹھٹک گیا۔ اس کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹ کر اس کی پشت کی طرف کی کھڑکی کے باہر راہداری

پر اٹھیں جہاں اسے آمنہ علی نظر آئی۔ پتہ نہیں وہ اسی وقت یہاں سے گزرتے ہوئے ٹھٹکی تھی یا خاصی دیر سے کھڑی تھی۔

اور اب وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ ولید نے بے ساختہ داخلی دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے وہ اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ داخل ہو گئی تھی چونکہ اس نے ولید حسن کو دیکھ لیا تھا سو اس کی نظریں یہاں وہاں کسی میز کو منتخب کرنے کے لیے بھٹکنے کے بجائے اسی گوشے کی طرف اٹھی تھیں۔

اس کی دونوں سہیلیاں داخلی دروازے کے قریب کی میز سنبھال چکی تھیں جبکہ وہ اپنے شانوں پر پڑے بالوں پر ہاتھ پھیر کر اسی طرف چلی آئی۔

X...X...X

رات کے کھانے کے وقت دستر خوان پر نومی کو غائب پا کر سکندر نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں پھر نادیہ آپی سے پوچھا۔

"نومی نظر نہیں آ رہا اس کی واپسی کیا دس بجے تک بھی نہیں ہوتی۔"

"پتہ نہیں' اب تک تو آ جانا چاہیے۔" نادیہ آپی' سکندر کے بگڑے لہجے پر سٹپٹا کر رہ گئیں۔ ان کا انداز بازپرس کرنے والا تھا۔

"کمال ہے صبح وہ نظر نہیں آتا' دن میں وہ ملتا نہیں' رات وہ غائب۔"

"تم دونوں بھائیوں کو نوکریاں بھی تو ایسی ملی ہیں تمہیں اپنی خبر نہیں' نہ دن میں چین نہ رات کو چین اسے اپنی خبر نہیں آئے تو ہوا کے گھوڑے پر سوار اور جانے کا تو پتہ ہی نہیں چلتا اس کے۔"

اماں نے نومی کے ساتھ اسے بھی سنایا تو اس نے ایک نظر ان پر ڈالی پر سر جھکا کر نوالہ منہ میں لے جاتے ہوئے بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میری نوکری کا تو آپ کو پتا ہے مگر نومی تو بروکر ہے اس کا تو لا بندھا ٹائم ہونا چاہیے۔ کون سے شاپنگ سنٹر آدھی آدھی رات تک کھلے رہتے ہیں۔ خیر وہ آئے تو اسے میرے کمرے میں بھیجنا۔"

وہ گلاس اٹھا کر پانی پیتے ہوئے دستر خوان سے کھڑا ہو گیا۔ پھر بیسن پر ہاتھ دھو کر کھونٹی سے تولیہ کھینچتے ہوئے بولا۔

"تانیہ دکھائی نہیں دے رہی۔"

"اس نے کھانا کھا لیا ہے کہہ رہی تھی تھکن ہو رہی ہے سو جلدی سو گئی ہے۔"

"ہوں۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا کہ اماں کی آواز آئی۔

"میں تو سوچتی ہوں نادیہ بیاہ کر چلی جائے گی تو مجھے کون پوچھنے والا ہو گا۔ تم دونوں بھائیوں کے پاس تو دو گھڑی ٹک کر بیٹھنے کا بھی وقت نہیں ہے۔ تانیہ الگ پڑھائی میں جتی رہتی ہے۔ دن میں تو گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔"

وہ دروازے کے فریم پر ہاتھ رکھ کر اماں کو دیکھنے لگا۔ وہ ان کی باتوں کا بیک گرائونڈ اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ نادیہ آپی کے لبوں کی تراش میں بھی دبی دبی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"لوگ کیا کہیں گے بڑے بیٹے سے پہلے چھوٹے کی کر دی کیا بڑے میں خدانخواستہ کوئی عیب ہے۔ کوئی بیٹی نہیں دے رہا تھا۔ اے بیٹا کچھ تو عقل کے ناخن لو۔ نوکریاں تو دنیا میں سبھی کرتے ہیں ہر طرح کی مگر گھر بھی سب بساتے ہیں۔ تمہاری طرح شادی کے نام پر کسی کو بچھو کے ڈنک نہیں لگتے۔ ادھر شادی کا ذکر کیا ادھر لپک کر غائب ہو گئے۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں تم سے کہہ رہی ہوں سکندر؟"

وہ کمرے میں جانے کی بجائے وہیں تخت پر آ کر بیٹھ گیا۔ اماں بری طرح ناراض دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ان کا دل دکھانا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

"میں نے شادی سے انکار تو نہیں کیا نا اماں! بس وقت مانگا ہے۔"

"لو تو میں کون سا ہتھیلی پر سرسوں جما رہی ہوں بیٹے' تمہارے منہ سے رضامندی کا لفظ تو نکلے۔ بس پسند کی لڑکی ڈھونڈنے لگوں اور جھوٹ کیوں بولوں' کون سا ہمیں طشتری میں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سجا کر کوئی لڑکی دے رہا ہے۔ چھان بین کر کے اچھی خاندانی لڑکی ڈھونڈنے میں تھوڑا وقت تو یونہی نکل جائے گا اور پھر..."

"بس کریں اماں!" اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید بولنے سے روکا تھا اور مسکراتے ہوئے تخت پر پڑے گائو تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"میں یہی ساری زحمت تو آپ کو دینا نہیں چاہتا' کہاں آپ جوتیاں گھسائیں گی' کہاں گلی گلی محلہ محلہ خوار ہوں گی۔ بس تھوڑا صبر کریں آپ کی پسند کی لڑکی کا پتہ میں خود بتا دوں گا؟" یہ کہہ کر اس نے نچلے لبوں کو زور سے دانتوں میں دبا کر ہنسی روکی تھی۔

اماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا پھر یکدم ان کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ انہوں نے پلیٹ دور کھسکائی اور اسے متبسم نگاہوں سے دیکھا۔

"لڑکے تو یہ کہو نا کہ اپنی پسند سے کرنی ہے۔ لو دیکھو ذرا میں بھی کتنی باؤلی ہوں نادی! اس لڑکے سے آج تک پوچھا نہیں کہ کوئی پسند ہو تو بتائو۔" وہ یہ کہہ کر زور سے ہنس دیں۔

نادیہ آپی معنی خیز تبسم سے سکندر کو دیکھے جا رہی تھیں۔

پھر اماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شرارت بھرے لہجے میں بولیں۔

"میں بتاؤں اماں سکندر کی پسند کون ہو سکتی ہے۔" وہ کہہ اماں سے رہی تھیں اور دیکھ سکندر کی طرف رہی تھی۔

سکندر نے جھٹ سے تکیہ دور دھکیلا اور سیدھا ہو کر انہیں گھورنے لگا۔

"کیا مطلب ہے؟" اسے یکلخت اپنی حماقت کا احساس ہو گیا کہ اس نے شاید کچھ جلد بازی اور بے اختیاری کا مظاہرہ کر ڈالا ہے۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے اور نادیہ تم خواہ مخواہ میں ایکسائیٹڈ مت ہو۔" وہ اسے گھورتا ہوا تخت سے اتر گیا۔ وہ کھلکھلانے لگیں۔

"اماں دیکھیں، دیکھیں اپنے چہیتے سپوت کو اب زبان سے پھر رہے ہیں کہتے ہیں کہ قول مرداں جاں دارد۔" (مرد اپنی زبان سے نہیں پھرتے۔)

اس نے کمرے کی طرف جاتے جاتے نادیہ کو باقاعدہ آنکھیں دکھائیں مگر وہ جواباً انگوٹھا دکھا کر اماں سے مزید بولیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"بس امی! اب نومی کے ساتھ ان کو بھی نمٹانے کا سوچ ہی لیں بلکہ قصد کر لیں اور خوبصورت کھونٹے سے باندھ دیں۔ بھلا میرے ہیرو جیسے بھائی میں کوئی کمی ہے کہ حسین سے حسین لڑکی بھی انکار کرے۔"

سکندر اس کی شرارتوں پر مسکرا کر کمرے میں چلا آیا مگر اندر آ کر دروازے سے سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرتے ہوئے اس کے لبوں سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ پیکٹ سے سگریٹ نکال کر اسے شعلہ دکھاتے ہوئے اس کی سوچوں میں اضطراب سمٹ آیا تھا۔

شہرینہ کا ہنستا مسکراتا شبنم میں نہایا ہوا تروتازہ پھول جیسا سراپا۔ آنکھوں تلے آ کر جم گیا۔

اور وہیں کہیں دل کے کسی گوشے میں چبھن سی ہونے لگی۔

اس نے سوچا ضروری تو نہیں نا کہ ہر خوب صورت ہر ٹھنڈی چھاؤں ہر موسم بہار آپ ہی کے لیے ہو۔

ہاں! حسن کو بھلا کون ناپسند کرتا ہے۔ اس کا کون طلب گار نہیں ہوتا۔

خواہش ننھی ننھی کونپلوں کی طرح بھلا کس دل کی سرزمین سے نہیں پھوٹتی اور کون بھلا ان کونپلوں کی شعوری آبیاری نہیں کرتا۔

ہر دل جذبوں اور خواہشوں سے بھرا پڑا ہے۔

ہر خون میں محبت پا لینے کی تمنا دوڑتی بھاگتی پھر رہی ہے۔

ہر آنکھ میں خوابوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

آرزوئیں تابندہ ستاروں کی طرح روح میں جھلملاتی ہیں۔

مگر

ضروری تو نہیں کہ شوق کا نکلا ہوا قافلہ سر منزل بھی پہنچے۔

پھیلے ہوئے دامن دل میں پھول ہی مہکیں۔ گھاؤ بھی تو کسی کا حصہ بنتے ہیں اور کبھی کبھی تو پا لینے کی سرحد کے قریب پہنچ کر ہی اکثر تقدیر اپنا وار کرتی ہے اور کسی سخت کڑی دھوپ کی طرح سر پر آ ٹھہرتی ہے۔

بہر حال وہ ناامید نہیں تھا مگر نادیہ کی طرح بلا کا خوش فہم بھی نہیں تھا۔ اس نے زندگی کی اتنی تلخیاں اور سفاک حقیقتوں کو برتا تھا کہ آنکھیں بند کر کے خوابوں اور خواہشوں کے محل کی تعمیر کم از کم نہیں کر سکتا تھا اور پھر اس کا دل تو چاند کا تمنائی تھا۔ وہ خواب دیکھنے کے ساتھ انہیں صبح ہوتے ہی حقیقتوں کی آندھی میں گم ہوتے بھی دیکھتا رہتا تھا۔ اب تو دن رات ایک کھٹک سی تھی جو تانیہ نے بخشی تھی اس جملے کے ساتھ کہ۔

''ولید کے گائوں جانے پر شہرینہ اپ سیٹ ہو جاتی ہے۔'' اور وہ یہی دیکھنے گیا بھی تھا اور واقعی اس کی اجاڑ صورت نے اس کے اندر کے خوشگوار موسموں کا بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔

بہر حال امید تو وہ چراغ ہے جسے جلانے والا شاید عمر بھر نہیں تھکتا۔ چاہے وقت کی ہوا اسے بار بار بجھاتی رہے۔

X...X...X

فدا حسین کا سیاست کے میدان میں کودنا مردان شاہ کے لیے بے حد پریشان کن بات ثابت ہوا تھا اور توقیر شاہ تو حد سے زیادہ جلا تھا۔

"اسے اچھی طرح سمجھالیں باباسائیں! یہ ہماری جدی پشتی سیٹ ہے یہاں سے آج تک کوئی جیتا ہے نہ ہم نے جیتنے دیا ہے بہت سورما آئے اور بری طرح مات کھا کر گئے ہیں۔"

مردان علی شاہ نے صوفے کی پشت پر باادب کھڑے کمدار کو ٹھنڈا پانی لانے کو کہا اور پھر ایک ہلکی سی سانس خارج کرتے ہوئے بیٹے کو قالین پر یہاں سے وہاں غصے سے چک پھیریاں کھاتے دیکھنے لگا۔

"شاہدہ کو بھی بلا کر اچھی طرح اس کا دماغ درست کریں ورنہ..."

مردان علی شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا اس کی پیشانی پر موٹی موٹی لکیریں اس کے ذہنی خلفشار کی غمازی کر رہی تھیں۔ وہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اور ایک ہاتھ سے تلوے کو یونہی بے ارادہ دباتے ہوئے پر خیال انداز میں بولا۔

"میں سوچ رہا ہوں توقیر آخر یہ بیٹھے بٹھائے فدا حسین کو سیاست میں آنے کی کیا پڑی۔ اس کا ذہن اس طرف کیونکر آیا اور وہ بھی ہماری ہی سیٹ پر اور اس نے جس انداز سے کل چند لوگوں کو اکٹھا کر کے تقریر جھاڑی ہے میں بہت حیرت میں ہوں۔"

توقیر شاہ نے مردان شاہ کا چہرہ دیکھا پھر کندھے سے ڈھلکی چادر کا کونا دوبارہ کندھے پر ڈال کر درمیانی صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آپ کا خیال ہے فدا حسین کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ ہے۔" وہ باپ کا خیال پڑھتے ہوئے بولا تو مردان شاہ چپ رہا بس سامنے دیوار کو گھورتا رہا پھر بھنچی بھنچی آواز میں بولا۔

"ہاں لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے میں فدا حسین سے اس طرح کی توقع نہیں کر سکتا۔ بہر حال اس نے جس کی بھی خدمات حاصل کی ہیں، جس کے ایما پر وہ یہ سب کر رہا ہے وہ کوئی انتہائی شاطر معلوم ہوتا ہے وہ ایک جذباتی اور کم عقل انسان ہے مگر اب جو کچھ کر رہا ہے اور کرنا چاہتا ہے وہ کسی سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت ہو رہا ہے اور میں نہیں مان سکتا کہ یہ پلاننگ فدا حسین کی ہو سکتی ہے۔"

توقیر شاہ لب بھینچے باپ کا چہرہ دیکھتا رہ گیا پھر اچانک اس کے ذہن میں کوئی خیال سرعت سے آیا وہ بولا۔

"باباسائیں! وہ جو سکول کے لیے بڑی عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ بڑی تیزی سے کام جاری ہے کہیں وہ بھی اسی سازش کا حصہ تو نہیں۔"

"کون ہو سکتا ہے ہمارا دشمن؟"

"جو بھی ہوگا کبھی نہ کبھی تو سامنے آئے گا ہی۔" توقیر شاہ کے نتھنے پھولنے اور سکڑنے لگے۔ اس کا تنفس معمول سے تیز ہو گیا۔ وہ جھٹکے سے صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

"اور جب سامنے آئے گا تو کتے کی موت مرے گا۔ اسے شاید ہماری طاقت کا ابھی اندازہ نہیں ہوا۔ ہماری راہ میں آئی بڑی سے بڑی دیوار بھی ریت کی دیوار ثابت ہوتی ہے۔"

توقیر شاہ کے لہجے میں نفرت اور غصے کا آتش فشاں ابل پڑا۔ یوں جیسے وہ اپنے دشمن کا تصور کر رہا ہو اور اسے کچا چبا جانے کے لیے پر تول رہا ہو۔

یوں بھی اس پر کئی دنوں سے جھنجلاہٹ سوار تھی۔ وہ اس سکول کی کنسٹرکشن کو رکوانے کی سر توڑ کوشش کر چکا تھا مگر اسے ناکامی کا سامنا ہوا تھا اور دوسرا فدا حسین کا اب اس کے مقابل آنا اور اب تو کھلے عام اس کے آدمی اسی گاؤں میں اس کے ووٹرز کو اپنی پارٹی سے آگاہ کرتے پھر رہے تھے۔ چھوٹے موٹے جلسے جاری تھے اور خود وہ بھی زیادہ تر اپنے آبائی گھر میں آکر ہی رہنے لگا تھا اور توقیر شاہ یوں بلبلاتا پھر رہا تھا جیسے کسی نے اس کی دم پر پاؤں رکھ دیا ہو۔

X...X...X

ولید حسن کو دیکھ کر آمنہ علی کے دل کی لپک اور لبوں کی مسکراہٹ اس کے میز تک آتے آتے اور شہرینہ پر نظر پڑتے ہی ٹھنڈی پڑ گئی۔

ایک حسین و جمیل اور خوبصورت لباس میں ملبوس بہار کے تروتازہ پھول کی مانند نظر آنے والی اس لڑکی کو ولید کے ہمراہ دیکھ کر اس کو جھٹکا لگا تھا۔

ولید بھی چونکہ اسے دیکھ چکا تھا' اس لئے غیر محسوس طور پر اس کی آمد کا منتظر ہی تھا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ ہوٹل میں داخل ہوتے ہی سیدھی اس کی میز تک آئے گی۔

اس نے کرسی سمیت رخ اس کی طرف کرتے ہوئے دلکشی سے مسکرا کر سر کو ہلکی جنبش دی۔

"ہیلو آمنہ!"

وہ نظریں شہرینہ پر سے دانستہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھ کر درشتی سے بولی۔

"تمہیں شاید اپنا وعدہ یاد نہیں رہا۔ کل رات میں نے ڈنر پہ انوائٹ کیا تھا۔" اس کا غصہ مصنوعی تھا یا حقیقی ولید بہر حال فیصلہ نہیں کر سکا تاہم معذرت خواہانہ تاثیر اس کے چہرے پر سمٹ آیا۔

"آئی ایم سوری' میں ایکسکیوز کرنے ہی والا تھا تم بیٹھو تو سہی۔" اس نے چیئر کی طرف اشارہ کیا۔

"ویسے بائے دی وے میں نے "وعدہ" کب کیا تھا... ہاں تم نے دعوت ضرور دی تھی وہ مجھے یاد ہے۔"

وہ کرسی پر بیٹھنے کی بجائے اسے گھورتی رہی پھر میز پر رکھا ہوا اس کا موبائل اٹھا کر دوبارہ پٹختے ہوئے بولی۔ "اس کھلونے کو تم پھینک ہی دو' کل سے کنٹیکٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر یہ بند پڑا ہے۔ میں تو کہتی ہوں اسے ساتھ لیے لیے پھرتے کیوں ہو؟"

"اسے ساتھ رکھنے کی بھی کئی وجوہات ہیں۔ اسے بند رکھنے کی بھی' تم گلے شکوے بعد میں کر لینا پہلے ان سے ملو۔" اس نے ایک پل رک کر پھر شہرینہ کی طرف دیکھا۔ جو بڑی بے آرامی کی سی کیفیت میں ایک ٹک آمنہ مردان علی کو تک رہی تھی۔

بلیو جینز اور ڈھیلی ڈھالی جرسی میں ملبوس کٹے ہوئے بالوں کو شانوں پر پھیلائے' ولید حسن سے اس قدر بے تکلفی بلکہ استحقاقی انداز میں ملنے والی یقیناً اس کے اعصاب پر پتھر بن کر لگی تھی۔

وہ اسے تکے جا رہی تھی۔ ولید سے نظر ملتے ہی اس نے سر جھکا لیا۔

"شیری! یہ آمنہ علی ہیں۔" اس نے بڑا محتاط سا مختصر تعارف کروایا تو شہرینہ نے سر اٹھا کر لبوں پر مسکراہٹ سموتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

آمنہ علی نے کچھ وضاحت طلب نظروں سے ولید کی طرف دیکھا تھا مگر اس کی طرف سے خاموشی پا کر بظاہر ملنسار انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا مگر ولید حسن نے محسوس کیا اس کی آنکھوں کی تہوں میں ایک سرد مہری تھی۔

"نائس ٹو میٹ یو۔" اس کا لہجہ بھی سرد مہری کی لپیٹ میں آ کر خاصا کھوکھلا سا تھا۔ دراصل اس کا ملائم مکھن جیسا ہاتھ تھامتے ہوئے اس کی دلکشی کا احساس خود بخود بڑھ جاتا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ بس چھو کر چھوڑ دیا تھا اور اس کی طرف دوبارہ دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے ولید حسن کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”دس از مائی کزن شہرینہ۔“

”اوہ...“ آمنہ علی کے لبوں سے بے اختیار ہلکی سی سانس خارج ہو گئی پھر یکدم وہ بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ شہرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کبھی آیئے گا ناہماری کوٹھی میں ولید کے ہمراہ' ولید تو اکثر آتا رہتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بڑی دل آویز اور فدویانہ نظریں ولید پر ڈالیں اور جیسے تائید چاہنے والے انداز میں بولی۔

”اب آئو تو اپنی اس کزن کو لے آنا۔“ بظاہر وہ گرم جوشی اور اپنائیت کا مظاہرہ کر رہی تھی مگر اس کی گرم جوشی کی تہ میں کہیں سرد مہری تھی۔ شاید وہ اندر سے کہیں مضطرب بھی تھی اور اس کے اضطراب کی وجہ شاید شہرینہ کا بے پناہ حسن بھی ہو سکتا تھا۔

اس سارے عرصے میں شہرینہ ہونٹ سیئے خاموش رہی۔ اس کی فطری مسرت یوں ختم ہو گئی تھی جیسے جلتی لو کو ہوا کا زوردار جھونکا بجھا دیتا ہے۔ اب وہ ایک عجیب نامانوس سی افسردگی سے بجھ کر بس کبھی آمنہ علی کو' کبھی ولید حسن کو اور کبھی اپنے سامنے رکھے آئس کریم کپ کو دیکھتی رہ جاتی۔

ولید کا رویہ بظاہر ویسا ہی تھا وہ لہجے اور چہرے پر خوشدلی کا تاثر سموئے ہوئے تھا اور آمنہ علی سے باتیں کیے جا رہا تھا۔

اس کے دل پر ایک چبھن اور کھٹک سی ہونے لگی تھی۔ ولید نے آمنہ علی سے اس کا تعارف بڑا ڈپلومیٹک سا تعارف کروایا تھا اور شاید یہی بات یہی چبھن دل شکستگی کا باعث بن کر اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔

کچھ دیر پہلے کی ساری خوش فہمیوں کی لوئیں بجھ کر رہ گئی تھیں۔

اسے اپنے سامنے بیٹھا ہوا ولید حسن بہت بڑا اداکار لگا۔

آمنہ علی کے جاتے ہی وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ نیپکن سے ہونٹ پونچھتی کرسی دھکیل کر اٹھ رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

”میرا خیال ہے اب گھر چلنا چاہیے آغا جی انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ اپنی ساری شوخی و طراری بھول چکی تھی۔ اس کا چہرہ بے حد سپاٹ تھا اور شاید اس کی شعوری کوشش تھی کہ اس کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہ آنے پائے۔ ولید نے نہایت اطمینان سے آئس کریم کھاتے ہوئے اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر ہاتھ پر بندھی گھڑی پر نظریں ڈالیں اور بولا۔

"بیٹھ جاؤ آغا جی کو تم سے کسی قسم کی میٹنگ نہیں کرنی جو تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

اس کا لہجہ دبنگ تھا' لامحالہ اسے بیٹھنا پڑا۔ اس نے اس کا آئس کریم سے بھرا ہوا کپ اس کے آگے کھسکاتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اس کی تمہیں اشد ضرورت ہے اسے پورا کرو' نعمتیں ضائع ہونے کے لیے نہیں ہوتیں۔" اور اس نے کسی فرمانبردار بچے کی طرح کپ ہاتھ میں اٹھا لیا اور رخ موڑ کر دھیرے دھیرے بحالت مجبوری کھانے لگی۔ دونوں کے درمیان مکمل خاموشی تھی پھر ولید نے ویٹر کو اشارے سے بلا کر جیب سے والٹ نکال کر اسے پیسے پکڑائے اور اس کے آئس کریم ختم کرتے ہی کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

دونوں گاڑی میں بیٹھے تو ولید نے یونہی ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے کھڑکی کے راستے باہر شام کے ملگجے اندھیرے کو گھور رہی تھی۔

"تمہیں میرا گفٹ پسند نہیں آیا یا گفٹ دینے کا انداز۔"

گاڑی ریورس کر کے شفاف سڑک پر ڈالتے ہوئے وہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ونڈ سکرین کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی ساکن پلکیں لرزیں' اس نے رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور بے مقصد مسکرا دی۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر وہ لاکٹ پہن لو۔"

'کیا یہ پہن لینے سے تعلق مضبوط ہو جائے گا' انگوٹھی بھی تو ایک عرصے سے پہن رہی ہوں۔ کیا یہ بے مایا چیزیں رشتوں کی پائیداری کی ضمانت بن سکتی ہیں۔'

وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی پھر سر جھکا لیا۔

" کیا بات ہے؟"

وہ دھیرے سے بولا تو وہ جلدی سے سر نفی میں ہلا کر رخ موڑ کر باہر بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھنے لگی۔

"یہ آمنہ علی' مردان علی شاہ کی بیٹی ہے' میری کلاس فیلو ہے۔اس کے دادا کی برسی میں ہی میں گائوں گیا تھا دراصل بہت اصرار کیا تھا خود مردان علی شاہ نے بھی۔"

"میں آپ سے کچھ پوچھ تو نہیں رہی' کوئی وضاحت تو نہیں مانگ رہی۔" وہ نہایت دھیمی آواز میں بولی تو ولید نے ابرو اچکا کر اس پر نگاہیں ڈالیں' وہ اب سائیڈ کھڑکی بجائے ونڈ سکرین پر نگاہیں مرکوز کیے ہوئے سامنے دیکھ رہی تھی پھر سر جھکا کر اپنی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔

وہ ایک دو لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ہلکے سے ہنسا اور اس کے بالوں کو ایک ہاتھ سے ہلکے سے ہوئے منتشر کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں یہ تو بہت اچھی بات ہے۔دانا کہتے ہیں یوں بھی زندگی گزارنے کا آسان نسخہ یہی ہے کہ انسان کم سے کم سوال کرے اور کم سے کم جواب چاہے۔"

"سب کا اپنا اپنا فلسفہ حیات ہوتا ہے اور زندگی گزارنے کے اپنے اپنے نسخے... اور فائدہ ہی کیا ایسے سوالات کا جن کے جواب آپ کو مطمئن نہ کر سکیں۔"

اس نے آہستگی سے اس کے سر سے ہاتھ ہٹا لیا تھا اور چوکیدار کے گیٹ کھولنے پر گاڑی ڈرائیو وے پر ڈالتے ہوئے بس اس پر ایک نظر ڈال کر رہ گیا۔

سیاہ ماربل پر گاڑی رکی تو وہ گاڑی سے اترنے سے پہلے اس کی طرف رخ کر کے بولی۔

"آئی ایم تھینک فل ٹو یو' آپ نے میری برتھ ڈے یاد رکھی' مجھے وش کیا۔" پھر قدرے معصومانہ سنجیدگی کے ساتھ بولی۔

"کیا میں آپ کا گفٹ آغا جی کو دکھا سکتی ہوں۔"

ولید کے محسوسات پر ایک عجیب سی لہر آ کر گزر گئی اس کے لب خود بخود مسکرا اٹھے۔تو وہ تھینک یو کر کے دروازہ کھول کر اتر گئی اور اندر کی جانب بڑھ گئی مگر وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔جب تک وہ گلاس ڈور کھول کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی پھر ایک گہری سانس بھر کر آنکھیں موند کر کھولیں تو چوکیدار کھڑکی سے ذرا فاصلے پر مودب کھڑا کہہ رہا تھا۔

"صاحب میں گیٹ بند کر دوں یا آپ باہر جائیں گے۔"

وہ گاڑی میں ابھی تک اس کی موجودگی کے باعث پوچھ رہا تھا اس نے ایک دو پل بس چوکیدار کا چہرہ دیکھا پھر سر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولا۔

''اوہ ہاں ہاں ابھی رہنے دو کھلا۔'' اس نے سر کو خفیف سا جھٹکا اور اگنیشن میں چابی لگا کر گاڑی تیزی سے ریورس کرتے ہوئے کھلے گیٹ سے باہر نکال لے گیا۔

X...X...X

سکندر کمرے سے باہر آیا۔ اس کا خیال تھا اب تک نومی گھر آچکا ہوگا۔ اس نے باہر نکل کر کچن کی طرف رخ کیا۔ کچن کی لائٹ جل رہی تھی۔ نادیہ آپی کچھ بچے ہوئے جھوٹے برتن دھو رہی تھیں۔ اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''نومی آگیا کیا؟''

اتنے گہرے سناٹے میں اور اپنے کام میں مگن ہونے کی وجہ سے سکندر کی آواز نے نادیہ آپی کو سہما دیا۔ ان کے بدن میں ہلکا سا جھٹکا لگا وہ پلٹیں پھر سکندر کو دیکھ کر ہلکے سے سانس خارج ہوئی۔

''ہاں وہ تو کب کا آچکا ہے۔ میں نے اسے تمہارا پیغام دیا تو کہنے لگا کہ اتنی نیند آرہی ہے صبح بات کرلوں گا اور اپنا تکیہ اور چادر اٹھا کر چھت پر چلا گیا سونے۔ بہت نیند میں لگ رہا تھا اس لیے میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔''

''ہوں۔'' وہ صرف ہنکارا بھر کر رہ گیا پھر پلٹ کر بجائے اپنے کمرے میں واپس جانے کے چھت کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

وہ اسے نیند سے اٹھا کر بھی ہر حال میں بات کرنا چاہتا تھا اپنی تسلی چاہتا تھا۔

چھت کے کونے میں وہ سر سے پیر تک چادر اوڑھے گہری نیند میں تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا گو مگو کی کیفیت میں رہا کہ اسے اٹھایا جائے یا نہیں پھر جھک کر چادر کا کونا کھینچا تو اسے اپنی کنپٹیوں میں جیسے کوئی سلاخ گھستی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہاں نومی کی بجائے دو موٹے تکیے ترتیب سے رکھے تھے اور ان پر چادر ڈال کر کچھ اس طرح رکھی گئی تھی جیسے دیکھنے والا سمجھے کوئی آدمی سو رہا ہے۔

اس نے جھٹکے سے پوری چادر کھینچی اور رول بنا کر ایک طرف پھینک دی۔

اس کی پیشانی پر تشویش کی لکیریں امڈ آئیں نومی کو آخر ضرورت کیا تھی اس طرح کی دھوکا دہی کی۔اس نے بے اختیار رسٹ واچ پر نظریں ڈالیں۔

ہزاروا ہمے' تمام تردبے خدشات امڈ امڈ کر اس کے اضطراب میں اضافہ کرتے چلے گئے۔

نومی کے روز وشب' اس کی مصروفیات اور اس کے انداز واطوار پہلے ہی اسے قدم قدم پر ٹھٹکاتے اور مضطرب کرتے رہے تھے۔

مگر اب اس کی اس حرکت نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔''ہو سکتا ہے معاملہ عشق ومحبت کا ہو اور وہ کسی کی زلف کا اسیر ہو کر اس کی طرف گیا ہو۔'' پہلی سوچ تو یہی ابھری مگر اس کا ذہن نفی کرنے لگا۔

نومی اس حد تک سست اور نیند کا رسیا تھا کہ کم از کم عشق ومحبت میں بھی وہ اتنی مشقت نہیں سہہ سکتا تھا۔وہ اس کی عادت سے واقف تھا۔

ہاں دولت کا حصول اس کی اولین ترجیح تھی۔امیر کبیر بننے کی خواہش اس کی رگ رگ سے یوں لپٹی ہوئی تھی جیسے آکاس بیل ہرے بھرے پودے سے چمٹ کر دھیرے دھیرے اس کا خون چوس رہی ہو اور یوں بھی وہ اس کی جاب اور ملنے والی رقموں سے مطمئن نہیں تھا۔

اس نے چھت پر رکھا ٹوٹا پھوٹا اسٹول دیوار سے لگا دیا اور وہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔اس کی آنکھیں تھکن اور نیند کے غلبے کے باعث بند ہونے لگیں کہ اچانک کھٹر کا سا ہوا۔اس نے سرعت سے موندی آنکھیں کھول دیں۔

ہلکی ہلکی روشنی میں اسے نومی کا سراپا دکھائی دیا' جو نہایت اطمینان سے ٹنکے سے جڑے نیچے تک جاتے لوہے کے مضبوط پائپ سے اوپر چڑھا تھا مگر چھت پر کودتے ہی وہیں تھم گیا تھا۔

بستر کے قریب اسٹول پر سکندر کو بیٹھے دیکھ کر اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔اس کے تو خواب میں بھی نہیں تھا کہ وہ آج رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا۔

سکندر کی نگاہوں کی چبھتی کاٹ نے اس کی پیشانی عرق آلود کر دی۔

سکندر کو اسٹول سے اٹھتے دیکھ کر وہ بھی ڈھیلے ڈھیلے قدم اٹھا کر اپنے بستر تک آیا۔

''اس کا مطلب ہے یہ تمہارا روز کا معمول ہے۔'' سکندر نے آگے جا کر پائپ کو دیکھا پھر نیچے جھانکا۔وہ جس مہارت سے پائپ کے ذریعے اوپر چڑھا تھا' سکندر کے اعصاب کو دھچکا لگا تھا۔وہ اب تک بے خبر ہی رہا بلکہ پورا گھر۔یہ ضرب اس کے لیے بہت بڑی تھی۔

اس نے نومی کا چہرہ ٹٹولا پھر اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جاتے ہو؟ کون سی دکان کا سودا کرنے گئے تھے؟''

وہ سر جھکا کر اپنے جوگرز کو گھورنے لگا پھر بولا۔ ''دوستوں میں گیا تھا اور وہیں سے آ رہا ہوں۔''

سکندر نے اسے دیکھا۔ استہزائیہ انداز میں اس کے لب وا ہوئے۔

''ایسے کون سے دوست ہیں اور کیسی محفلیں ہیں جن کے لیے تمہیں اتنا کٹھن راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو تم سیدھے راستے سے بھی جا سکتے ہو۔ نومی! میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش مت کرو۔ تم میرے سامنے جوان ہوئے ہو۔ تمہارا ہر رنگ میری آنکھوں نے دیکھا ہے مگر اس وقت' اس وقت تمہارا چہرہ وہ نہیں ہے جو ہمیشہ دیکھتا آیا ہوں۔ تمہارے چہرے کی معصومیت میں ایک فریب کار کا چہرہ دکھائی دے رہا ہے۔ ادھر دیکھو میری طرف۔''

''کیوں' کیوں دیکھوں۔ کیا حق پہنچتا ہے آپ کو مجھ سے بازپرس کرنے کا۔'' وہ یکدم بھبھک کر دور جا کھڑا ہوا پھر فرش پر بیٹھ گیا اور جوگرز اتار کر ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔

''میں نے کبھی آپ سے کسی قسم کا سوال کیا ہے؟ آپ کے روز و شب کا حساب مانگا ہے؟ پھر آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے سوالات کرنے والے' میرے روز و شب کا حساب رکھنے والے۔''

سکندر اس کے لب و لہجے پر دنگ رہ گیا۔ وہ انتہائی منہ پھٹ' بدگو اور بدزبان دکھائی دے رہا تھا۔

اس کے چہرے پر حقارت' نفرت اور انتہائی بے زاری ٹپک رہی تھی۔

سکندر کو اس حیرت کے دھچکے نے کچھ دیر تک کسی بھی رد عمل کے اظہار سے باز رکھا۔

فضا میں کتنی دیر بوجھل پن سا چھایا رہا پھر نومی بولا۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ وہ سب کچھ جان گئے ہیں جو میں نے چھپانا چاہا۔ بہرحال اگر آپ کے علم میں ہے تو مجھے قطعاً پرواہ نہیں ہے۔ میری زندگی اپنی ہے' میں اسے جس طرح چاہوں گزاروں۔ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے جو بھی راستہ اپناؤں۔ میرے فعل سے آپ لوگوں کو بہرحال کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔'' وہ اس نروٹھے پن سے بولا تو سکندر نے اسے مجروح نظروں سے دیکھا۔

اس کا دل رنج سے شق ہو گیا۔ وہ چلتا ہوا اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

”تکلیف تو ہمیں بہر حال پہنچ رہی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ امی یا اس گھر کی ترجیح صرف پیسہ ہے۔ وہ رقم ہے جو تم اماں کی گود میں ڈال جاتے ہو مگر ان کی راتوں کی نیندیں اڑا دیتے ہو۔ دن وسوسوں کی زد میں گزرتے ہیں اور اب جبکہ ان کے علم میں آئے گا کہ تم غلط راستے پر چل رہے ہو، انہیں تکلیف نہ ہو گی۔“

وہ مجروح انداز میں ہنسا۔ ”نومی! میرے لیے تم اب بھی وہی چھوٹے پیارے سے معصوم سے نومی ہو جس کی صاف ستھری، نکھری نکھری باتیں اور پاکیزہ ذہن و دل مجھے پسند ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے نومی! اسی لیے تو تمہارے روز و شب کا حساب رکھنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں چاہیے مجھے کسی کی محبت۔ برائے مہربانی، میں اب بچہ نہیں رہا کہ آپ کا تا عمر محتاج رہوں۔“ وہ انتہائی بے مروت لہجے میں چیخ کر بولا۔

سکندر کو یوں لگا جیسے تلخی سے بھرا جام الٹ گیا ہو اس کے اوپر اور وہ پورا اس میں بھیگ گیا ہو۔

نومی جھٹکے سے کھڑا ہو گیا تھا اور اپنا جیکٹ اٹھاتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”عزت، پاکیزگی، آپ کے خوابوں کی دنیا اور آپ کا معیار اور ترجیح رہی ہوں گی، میرے نہیں۔ شرافت اور پاکیزگی کے بلند مینار پر چڑھ کر آپ کی واہ واہ نہیں ہو گی۔ بھوک آپ کی رفیق ہی رہے گی اور چھوٹی چھوٹی خواہشات پر ترسنا پڑے گا۔“

”تو کیا اس مینار سے گر کر، پستی میں اتر کر سب مل جائے گا۔“

وہ دل گرفتگی سے اسے دیکھنے لگا۔ تو وہ پلٹ کر ہنسا۔ ”بالکل دولت سے طاقت بھی آتی ہے اور طاقت آ جانے کے بعد خود بخود عزت آپ کے قدموں میں آ گرتی ہے۔“

”قدموں میں یا...“ اس نے گہری تھکن کے ساتھ نومی کو دیکھا پھر اس کی طرف بڑھا۔

”نومی، میری بات سنو۔“ مگر وہ رکا نہیں اور سیڑھیوں کی طرف آیا تو ٹھٹک گیا۔ ایک سیڑھی پر نادیہ آپی کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ جیسے کسی ناقابل برداشت درد کو ضبط کر رہی ہوں۔ اس نے ایک نظر ان پر ڈالی۔ خفت اور تشویش کی لہر

چہرے پر اداسی مگر دوسرے پل معدوم ہو گئی۔ وہ ان کے قریب سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اتر گیا۔

سکندر انتہائی کرب سے ہونٹ بھینچے نادیہ کو دیکھتا رہ گیا۔

دونوں بہن بھائی کے دل پر ایک ہی رنج شدت سے ہلکورے لے رہا تھا اور آنکھوں میں جیسے اس بڑے نقصان کا حساب لہو کی صورت بکھر آیا تھا۔

X...X...X

The Stars Shine Down

and watch Us Live

Our Little Lives

.and weep for us

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ آسمان کی سیاہی میں ٹمٹماتے ستاروں کو کھڑکی میں کھڑے دیکھ رہا تھا جو اپنا سفر دھیرے دھیرے کر رہے تھے۔ تب دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔ آغا جی اندر داخل ہوئے تھے۔ دبیز قالین نے ان کے قدموں اور اسٹک کی چاپ کو اپنے اندر جذب کر لیا۔

وہ انہیں اتنی رات کو دیکھ کر چونکا تھا۔ شاید وہ کافی دیر سے اس کے کمرے کے دروازے کے عین وسط میں کھڑے اسے ہی دیکھ رہے تھے بلکہ ایک طرح سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔

''خیریت؟'' اس کے لب مسکراہٹ کو چھو گئے۔

''میں دیکھ رہا ہوں جب سے تم گاؤں سے لوٹے ہو، دیر دیر تک تمہارے کمرے کی بتی جلتی رہتی ہے۔'' وہ اسے ہی نگاہوں کے حصار میں رکھے اندر آ گئے۔ وہ مسلسل کئی راتوں کا جاگا ہوا تھا مگر اپنے اعصاب کو پُر سکون رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا مگر پھر بھی چہرے سے اثرات جھلک ہی آئے تھے جو آغا جی کی نظروں سے مخفی نہ رہ سکے تھے۔

سچ ہی ہے ہمارے اندر تک جھانک لینے والوں کا یہی تو مسئلہ ہوتا ہے کہ آپ لاکھ چہرے اور آنکھوں کو تاثرات سے عاری رکھنے کی سعی کریں۔ وہ آپ کے دل کے گھر کا ہر منظر دیکھ لیتے ہیں۔ وہ بھی اسے یوں ہی دیکھ رہے تھے جیسے اندر تک جھانک رہے ہوں۔

وہ سر جھکا کر بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

”میں آپ کی بات کو رد نہیں کر سکتا۔ ایسا ہی ہے شاید۔ اور کیوں ہے ایسا، میرا خیال ہے آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“

اس کا لہجہ دھیما تھا اور اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب سے ہٹ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”جانتا ہوں تب ہی تو خوفزدہ ہوں۔“ آغا جی نے جیسے کھڑکی کے باہر تاریکی پر نگاہیں دوڑائیں جو فضا میں بھوت کی طرح مسلط محسوس ہو رہی تھیں پھر پلٹ کر اسٹک کے سہارے چلتے ہوئے اس کی طرف آ گئے۔

اس کے بیڈ پر فائل کھلی پڑی تھی اور کچھ کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ بال پین ایک صفحے پر پڑا ہوا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا ولید کہ جو زندگی گزر رہی ہے، وہی ٹھیک ہے۔ اسے اسی طرح گزار دو، گزرنے دو یہ سب کچھ اسی طرح۔“

”آغا جی! یہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ سب ٹھیک ہے۔“

وہ ہلکے سے ہنسا۔ اس کی خوشنما آنکھوں میں ہلکا سا دھواں اٹھا تھا اور چہرے کی سفیدی میں سرخی بڑھنے لگی۔ وہ کاغذات سمیٹ کر فائل میں ڈال کر فائل بند کر کے دراز میں پھینکتے ہوئے بولا۔

”ظاہری طور پر تو سب ٹھیک ہے مگر ٹھیک اسے تو نہیں کہا جا سکتا نا کہ۔“ اس نے لبوں کو بے اختیار دانتوں میں دبا کر چھوڑا پھر دل گرفتگی سے آغا جی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”آغا جی! جس کے اندر بہت حدت ہو، گھٹن ہو، بہت حبس ہو تو باہر کی چھائوں بھی کیا کر سکتی ہے۔ گھنی سے گھنی چھائوں بھی اندر کی حدت کو کم نہیں کر سکتی ہے۔“

آغا جی کا ہاتھ بے اختیار اس کے شانے پر پڑا۔ وہ اسے کسی ننھے معصوم بچے کی طرح اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتے تھے مگر یوں ہی کھڑے دکھ کے... احساس کے ساتھ اسے دیکھتے رہے اور اس کا کندھا دباتے ہوئے بولے۔

"ہاں مجھے احساس ہے۔ یقیناً میں تمہارے اندر جھانک نہیں سکتا اور نہ اس طرح محسوس کر سکتا ہوں۔ جس طرح تم کرتے ہو۔ ظاہر ہے ایک شخص جو کانٹوں میں الجھا ہوا اور ایک دور کھڑا کانٹوں کی ہیبت صرف دیکھ کر اپنے طور پر محسوس کر رہا ہو۔ دونوں میں بہت فرق ہو گا۔ میں کانٹوں کی ہیبت محسوس کر سکتا ہوں، اس کی اذیت نہیں اور تم اس کی اذیت... میں گرفتار ہو مگر ولید! یہ راستہ کہیں اذیت طلبی کا نہ ہو جائے۔" ان کی آواز مرتعش ہو گئی۔

ولید نے ان کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"آپ کیوں جاگ رہے ہیں ابھی تک۔ آپ کو تو ڈاکٹر پرویز نے دس بجے سو جانے کا کہا ہے۔" وہ نرمی سے ان کا ہاتھ تھپکنے لگا۔ آغا جی اسے دیکھ کر رہ گئے۔

وہ ضدی تو چھوٹی عمر سے ہی تھا۔ جو سودا سر میں سما جاتا، وہ مشکل سے ہی نکلتا تھا۔

"نیند بھی ہمارے ذہن سے مشروط ہوتی ہے شاید۔ ذہن مختلف خیالوں کا جال بننے لگتا ہے تو نیند اس میں مکھی کی طرح الجھ کر رہ جاتی ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"آپ پریشان نہ ہوا کریں آغا جی! میں بہت فریش ہوں۔ بس یوں ہی کوئی موومنٹ ہونی چاہیے لائف میں، سو دانستہ خود کو الجھا رکھا ہے وگرنہ... میں سچ کہہ رہا ہوں آغا جی! بلیو می، میں۔"

وہ آغا جی کی اٹھتی نظروں پر اپنے لہجے میں زور پیدا کرنے لگا وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے اس کی کوشش ناکام بناتے ہوئے بولے۔

"یہ آنکھیں ہیں نا احمق لڑکے! یہ ہمارے اندر کے حال سے مشروط ہوتی ہیں۔"

اس کے رگ و پے میں جیسے پھر سے وہی جلن ہونے لگی۔ تاہم وہ نگاہوں کا زاویہ بدل کر بولا۔

"کبھی کبھی بہت سے وہم و گماں آدمی کی اپنی نظر کا دھوکا بھی ہوتے ہیں۔"

"تمہارا خیال ہے تم مجھے بہلا دو گے۔ نہیں ولید! تم نہیں جانتے میں اور جہانگیر تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔" آغا جی صوفے پر بیٹھ گئے۔

"کہتے ہیں کہ بچھو کی دم میں، سانپ کے دانت میں اور مچھر کے سر میں زہر ہوتا ہے لیکن برے انسان کے سارے وجود میں زہر ہوتا ہے۔ مردان علی شاہ بہت برا آدمی ہے۔ ولید! وہ زہریلا جانور نہیں، زہریلا انسان ہے اور انسان کے اندر زہر بھرا ہو تو وہ تمام موذی جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔"

"ہاں، یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔" وہ آغا جی کو بس دیکھ کر رہ گیا اور گہری سانس بھری مگر اسے لگا جیسے فضا میں ڈھیر ساری کڑواہٹ ہو جو سانس کے ذریعے پھیپھڑوں تک میں اتر گئی ہو۔

کمرے میں کتنی دیر سکوت طاری رہا پھر یکدم ولید کی نظریں اپنے نیم وا دروازے کے باہر گئیں۔ وہ چونکا۔ آغا جی بھی شہرینہ کو دیکھ چکے تھے۔

"شیری! کیا بات ہے، اندر آئو۔ آغا جی نے اسے فوراً سے پیشتر پکار لیا تھا۔ وگرنہ وہ سرعت سے گزر جاتی۔ وہ جھینپی جھینپی سی اندر چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا جو وہ اپنے کمرے میں لے جانے کے لیے جا رہی تھی مگر شاید ولید حسن کے کمرے کی بتی جلتی دیکھ کر اور آغا جی کی آواز سن کر وہ دانستہ رک گئی تھی۔

ہلکے پنک کلر کے ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں دوپٹہ شانوں پر ڈالے۔ پورے بال شانوں سے لے کر پشت پر پڑے تھے۔ جیسے سنہرا آبشار بلندی سے نیچے کی طرف جا رہا ہو۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا اور رخسار بے حد سرخ ہو رہے تھے۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اندر آ کر آغا جی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی:

"میں یہ ... یہ دودھ دینے آئی تھی آپ کو مگر آپ وہاں تھے ہی نہیں۔" اس نے کہا تو آغا جی اس کے معصوم جھوٹ پر زیر لب مسکرائے۔

"میں تو دودھ دس بجے پی لیتا ہوں بچے! ہاں یہ دودھ تم ولید کو دے دو۔ یوں بھی اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔" انہوں نے ولید کی طرف اشارہ کیا تو وہ اس کی طرف پلٹی۔ وہ ہونٹوں کا ایک کونا دانتوں میں دبائے مسکراہٹ دبا رہا تھا۔ اس کے رخسار دہک اٹھے۔

"تھینک یو۔ واقعی مجھے اس کی شدید طلب ہو رہی تھی۔" اس نے اس کی سبک سبک مومی انگلیوں کے گھیرے سے نازک لمبا سا گلاس تھام لیا اور اس سے پہلے کہ آغا جی کچھ کہتے، وہ جھپاک سے کمرے سے نکل بھاگی۔

آغا جی نے ولید کی طرف دیکھا اور بے اختیار مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر آئی مگر دوسرے پل ان کے چہرے پر سنجیدگی در آئی۔ وہ کچھ سوچنے لگے۔ جیسے جو کہنا چاہ رہے تھے، اس کے لیے لفظ تلاش کر رہے ہوں پھر صوفے سے اٹھ کر ولید کی طرف بڑھے پھر اپنی اسٹک پر دونوں ہتھیلیوں کا دبائو دیتے ہوئے بولے:

''ولید! کبھی کبھی میں خوفزدہ ہو جاتا ہوں کہ کبھی تم نے میرے فیصلے کو رکاوٹ تو نہیں سمجھا۔ محض میرا دل رکھنے کو تو قبول نہیں کیا۔ میں نے کوئی جلد بازی تو نہیں کر دی۔ میں بہت ڈرتا ہوں۔ دل بڑے نازک اور ضدی ہوتے ہیں، ان کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں، ان میں جذبے پلتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت بن جاتے ہیں پھر ان درختوں کو جڑ سے اکھاڑنا ممکن نہیں رہتا اور زبردستی کاٹ دیا جائے تو پھر وہ زمین بنجر ہو جاتی ہے۔ رہ جانے والی جڑوں میں پھر کبھی کوئی کونپل نہیں پھوٹتی پھر سیرابی نہیں آتی، کوئی پودا نہیں اگتا جو تناور درخت بن کر کسی کے لیے چھائوں بنے۔''

''آغا جی!'' ولید نے دودھ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور ان کے اسٹک پر جمے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ان کا سر جھکا ہوا تھا اور بدن میں ہلکی کپکپاہٹ تھی۔

ولید ان کے جملوں کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ ہونٹ بھینچے شاید ولید سے نظریں ملانے سے گریزاں تھے جبکہ وہ افسردہ ہو گیا۔

''آغا جی! آپ تو آنکھوں سے میرے اندر کا حال جھانک لیتے ہیں۔ میں نے جو کچھ چھپانا چاہا، آپ سے چھپ نہ سکا۔ اب آپ اپنی ہی محبت کی طاقت کا اعتبار کھو رہے ہیں۔ میں بہت ہرٹ ہو رہا ہوں آغا جی!''

اس کی نظریں آغا جی کے سر پر جمی تھیں، تب انہوں نے بے اختیار سر اٹھا کر اس کے اجلے چہرے کو دیکھا اور کچھ دیر دیکھتے رہے۔

وہ ہلکی سی سانس خارج کرتے ہوئے رسانیت سے بولا۔

''کچھ پتھر تراش کر یقیناً خوشنما اور وقتی توجہ کا مرکز بنتے ہوں گے مگر پتھر اور ہیرے میں بہر حال واضح فرق ہوتا ہے۔'' اس کے چہرے کے زاویے میں مبہم سی مسکراہٹ جھلکی تھی پھر ان خوبصورت آنکھوں میں بڑے ہی خوبصورت رنگ جھلکے۔

"شہرینہ جیسی لڑکیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں آغاجی! سیپ میں بند موتی جیسی پاکیزہ، انمول، بے انتہا قیمتی اور قیمتی چیزوں سے کون دستبردار ہو سکتا ہے۔ گھاٹے کا سودا تو کوئی نہیں کرتا نا۔ کم از کم مجھ جیسا باہوش تو نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ دلکشی سے مسکرایا تھا اور سائڈ ٹیبل سے دودھ کا گلاس اٹھا کر بے حد لذت کے ساتھ اور خوشنما تصور کے ساتھ پینے لگا۔

آغاجی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بے ساختہ ہنس دیئے۔ جیسے کوئی بھاری بوجھ لڑھک گیا ہو۔ آنکھوں کے سامنے سبزہ ہی سبزہ پھیل کر اندر تک تازگی اتار گیا ہو پھر وہ اس کا کندھا تھپک کر کمرے سے چلے گئے، جاتے جاتے اسے جلدی سو جانے کی تاکید بھی کر گئے۔

X...X...X

آمنہ کو کسی پل قرار نہیں تھا۔ جب سے وہ ولید حسن کی کزن شہرینہ سے ملی تھی، اس کے اندر برچھیاں سی چل رہی تھیں۔

گو کہ ولید نے اس کا تعارف بہت سرسری انداز میں محض کزن کے حوالے سے کرایا تھا مگر اس کی آنکھوں میں اپنائیت کا جو احساس وہ محسوس کر چکی تھی، وہ اس کے دل پر ضربیں لگا رہا

تھا پھر وہ گولڈن دل کے پینڈینٹ والی زنجیر بھی اس کی نگاہوں سے مخفی نہ رہی تھی، جو ولید بے حد مسکراہٹ کے ساتھ اپنی اس کزن کو پیش کر رہا تھا۔ اس لمحے اس کے خوبصورت چہرے پر ایسے رنگ تھے جو اسے کبھی اپنے لیے دکھائی نہ دیئے تھے۔

وہ جب سے اب تک انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ اس کا رواں رواں زہر بھری آگ سے سلگ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ شہرینہ کو گولی سے اڑا دے، اس دنیا سے ہی اٹھا دے۔

کسی خیال کے تحت اس نے اپنے سرہانے رکھا موبائل اٹھایا اور ولید کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

بکھرے بالوں کو سمیٹ کر اس نے تکیہ اٹھا کر گود میں دبایا اور دوسری طرف ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ ولید کی آواز ابھری تو لمحہ بھر کے لئے اس کے لب آپس میں باہم بھینچ گئے پھر وہ دھیرے سے بولی:

"شکر ہے اس کھلونے کا بھی تم نے استعمال کیا ورنہ میرا تو خیال تھا اسے تو محض شو آف کے لیے لیے لیے گھومتے ہو۔"

"شو آف۔" وہ بے ساختہ کھل کر ہنس پڑا۔

"کیا یہ شو آف کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ نئی بات بتائی۔" اس نے تعجب کا برملا اظہار کیا۔

"بکومت، یہ بتاؤ اس وقت کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو۔" اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ ولید نے چونک کر اپنے موبائل کو دیکھا۔ اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن در آئی۔ تاہم وہ لہجے میں بشاشت بھرتے ہوئے بولا۔

"اس اِن ویسٹی گیشن کا مقصد۔"

"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں، ابھی اور اسی وقت۔ تم کوٹھی آجاؤ تو زیادہ بہتر رہے گا۔"

"خیریت، کیا افتاد آپڑی ہے؟"

"آپڑی ہے، تب ہی تو بلا رہی ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"پھر تو تمہیں میرے بجائے اپنے باپ کے بندوں کو بلانا چاہیے۔ آخر پال کس لیے رکھے ہیں۔" وہ ہلکے سے ہنسا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"یہ کچھ مختلف افتاد ہے۔ ان بیوقوفوں کا کام نہیں۔" وہ جواباً بولی اور پہلے سے زیادہ طویل اور ٹھنڈی سانس بھری۔ "آرہے ہو یا نہیں، بلکہ آ ہی جاؤ، آئی ایم ویٹنگ فار یو۔"

یہ کہہ کر اس نے لائن ڈسکنکٹ کر دی اور موبائل بیڈ پر پھینک کر بیڈ سے اتر کر واش روم میں گھس گئی۔

کوئی پندر منٹوں کے بعد وہ خود کو ہر طرح سے آراستہ کیے نیچے لابی میں ولید حسن کی منتظر تھی۔

پرپل کلر کے ہاف سلیوز کی منی شرٹ اور بلیک جینز میں پرم کیے بالوں کے خوشنما لچھوں کو شانوں پر سجا رکھا تھا۔ ہلکے میک اپ اور لائٹ جیولری میں وہ خود سے ہر طرح سے مطمئن ہو کر اب بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ جب ولید حسن نے ملازم کی ہمراہی میں لابی کا گلاس ڈور کھول کر دبیز قالین پر قدم رکھا تھا۔

"وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

وہ فدویانہ اس کی طرف بڑھی۔

"یہ شعر کچھ زیادہ پرانا ہے۔" وہ اس کی وارفتگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اندر چلا آیا۔

"بے شک شعر پرانا ہے مگر جذبات بالکل نئے نکور ہیں۔" وہ اٹھلائی اور اس کا بازو تھام لیا۔

"آئو بیٹھو۔"

"تھینک یو۔" وہ سنبھل کر ایک اونچی کرسی پر جم گیا پھر اس کے سراپے پر ناقدانہ سی نگاہ ڈال کر بولا۔

"یہ تیاری تو کسی افتاد کا پتہ نہیں دے رہی ہے۔" اس کی بات پر وہ کھلکھلائی تو وہ قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔

"آمنہ! تمہیں پتہ ہے میں کتنے اہم اور ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"کیا وہ کام مجھ سے بھی ضروری تھے۔" وہ بے پرواہی سے بولی۔

"ہماری زندگی بہت سے خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر خانہ اپنی جگہ ضروری اور مستحکم ہے۔" اس کا انداز ناصحانہ تھا۔

مگر وہ اس کی فہمائش پر قطعی متاثر نظر نہ آئی بلکہ دونوں ہاتھ باندھے مسکرانے لگی پھر سر ہلاتے ہوئے بولی

"ضرور ضرور۔ تمہارا وجود اگر کاموں میں بٹا رہے تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔ ہاں اگر انسانوں میں بٹنے لگا تو۔" وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

ولید نے بے ساختہ ترچھی نگاہ اس پر ڈالی۔

وہ کم فہم ہرگز نہیں تھا، نہ سادہ لوح کہ اس کے جملے کا مفہوم نہ سمجھ پاتا، اس کے لہجے کی ہلکی چبھن محسوس نہ کر سکتا۔ تاہم وہ کسی بحث یا سوالات اور وضاحتوں کے چکر میں پڑنے کی بجائے بولا۔

"تمہاری معلومات بہت ناقص ہیں، انسانی زندگی کے بارے میں۔ اس روئے زمین پر کوئی خاکی جسم ایسا نہیں جس کا وجود انسانی رشتوں میں بٹا ہوا نہ ہو۔ ہر رشتہ اپنی جگہ مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔ وہ تعلقات کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ تعلقات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ جذبات کا بہائو کہیں تیز کہیں سست ہو سکتا ہے۔" وہ جانے کب چلتی ہوئی اس کی کرسی تک آ پہنچی تھی۔ پھر وارفتانہ اس کے کندھوں پر ہتھیلیاں جما کر اس کے چہرے

کی طرف جھکی۔ ”میں چاہوں گی کہ میرے لیے تمہارے جذبات کا بہاؤ بہت تیز رہے، کسی طوفان کی طرح۔“ وہ شاید اپنے نفس کے آگے تنکے کی طرح بہنے کو تیار تھی مگر ولید حسن نے بے حد نرمی سے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے کندھے سے ہٹادیا اور کرسی سے اٹھ کر اس کی سمت گھوما۔

”طوفان کا مطلب سمجھتی ہو۔“ اس کے لبوں کی تراش میں بڑی دیر کے بعد مسکراہٹ رینگی تھی شاید اپنے اعصاب کو کنٹرول کرنے کے بعد۔

”طوفان بڑی تباہیاں لے کر آتا ہے اور تباہیاں اس کے گزر جانے کے بعد دکھائی دیتی ہیں۔“

”مجھے تو تباہیاں بھی منظور ہیں۔“ وہ شاید کسی اور ہی جہاں میں پہنچی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں چھلکتا خمار اور لہجے کا نشہ، ولید سٹپٹا گیا۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

”تم نے کیا یہی سب بتانے کے لیے مجھے بلایا تھا اور اگر مطلع کر چکی ہو تو میرا خیال ہے مجھے واپسی کی اجازت ملنی چاہیے۔“

وہ لہجے کی شگفتگی کو برقرار رکھے ہوئے تھا پھر قدم دروازے کی طرف بڑھائے کہ وہ جلدی سے بولی:

”جا کہاں رہے ہو، ادھر بیٹھو۔“ اس نے جلدی سے دیوار پر لگے بٹن کو پش کیا تو ملازم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

”رحیم بخش! مہمان کے لیے کچھ چائے پانی کا انتظام کرو۔“ اس نے ملازم کو چلتا کیا اور خود ایک آرام دہ صوفے پر تقریباً نیم دراز ہو کر ولید کو دیکھنے لگی جو اسے خفگی سے تک رہا تھا پھر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

لابی کے خنک ماحول میں چند لمحے خاموشی رہی پھر آمنہ علی کی آواز ابھری۔

”تم دادا سائیں کی برسی میں آئے اور میرے اصرار کے باوجود حویلی میں نہ ٹھہرے مگر ایک ماسٹر کے چھوٹے گندے سے گھر میں رات ٹھہرنے کو ترجیح دی۔ میں نے یہ بات بہت فیل کی ہے ولید۔“

وہ ذہنی طور پر اس طرح کے حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ اس کے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ آمنہ علی کے منہ سے اس طرح کی بات نکلے گی۔ وہ لمحہ بھر چپ سارہ گیا۔

اس کے انداز میں بظاہر لاڈ بھری خفگی تھی مگر کھوج کی چبھن وہ اس کی آنکھوں میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ بات تمہیں کس نے بتائی۔" وہ اب سنبھل چکا تھا۔

اور براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ اب سٹپٹانے کی باری اس کی تھی۔ پیر صوفے سے اتار کر بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گڑبڑا کر بولی۔

"یہ بات تو کسی کے ذریعے سے بھی مجھ تک پہنچ سکتی ہے۔"

"میں اسی "کسی ذریعے" کا نام ہی تو پوچھ رہا ہوں جو میری جاسوسی پر مامور ہے اور جو میرے روز و شب کا حساب رکھنے کا حق رکھتا ہے۔" وہ یکدم برہم ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

آمنہ اس کے یک دم بھبھک اٹھنے پر گڑبڑا گئی۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کے سوال پر یوں برہم ہو جائے گا۔ وہ تپنے ناز و ادا سے اگلوانا چاہ رہی تھی۔

"میرا مقصد انوسٹیگیشن نہیں تھا۔ میں تو یوں ہی کانوں تک آئی بات پوچھ بیٹھی۔" وہ پیروں میں سینڈل پھنسا کر کھڑی ہوتی اس کی طرف لپکی۔ وہ ہلکے سے ہنسا۔

"بہر حال جس نے بھی کانوں تک پہنچائی ہے، اس سے کہہ دینا آمنہ کہ میرے روز و شب اور اٹھنے بیٹھنے پر نظر رکھنے کی بجائے اپنی بہتری کی طرف نگاہ رکھے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ میں اپنے کسی بھی فعل پر کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔" اس نے جھک پر صوفے پر رکھا اپنا موبائل اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

آمنہ بھونچکا سی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اسے روکنے کی فوری تدبیر بھی نہ کر سکی کہ اسے کبھی ناز اٹھانے کا تجربہ نہ تھا۔

اسے تو ہمیشہ قدموں میں جھکانا پسند تھا۔ کسی کے قدموں میں جھک جانے کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ولید کا یہ رویہ اس کے اندر آگ لگا گیا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کچھ دیر ٹہلتی رہی۔

"کوئی راز تو ہے جس پر تم۔ اپنے غصے اور برہمی کا پردہ ڈال گئے ہو۔ ورنہ کوئی ماسٹر دین محمد کے چھوٹے تنگ و تاریک گھر میں رات کیوں بسر کرنے لگا جبکہ متبادل حویلی موجود ہو۔"

غصے سے اس کا تنفس تیز ہو گیا پھر صوفے پر ڈھے گئی۔ یکدم اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے ناحق اتنے خوبصورت لمحات ضائع کر دیئے۔

اس نے لوازمات سے سجی ٹرالی کو نظر بھر کر دیکھا جو ملازم گھسیٹ کر اندر لا رہا تھا پھر جھٹکے سے صوفے سے اٹھ کر قدموں کی وزنی دھمک کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ گئی۔

X...X...X

شہرینہ کی اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد اس کی یونیورسٹی آمد نے جہاں تانیہ کو خوشی بخشی، وہاں وہ ایک اضطراب کا بھی شکار ہو گئی۔ ایک بے کلی اس کے اندر اتر آئی تھی۔

اس کی نظریں بار بار اِدھر اُدھر بھٹک جاتیں۔ اس کا ذہن باتوں کے درمیان کہیں اور اُڑنے لگتا۔

کلاسز لینے کے دوران بھی شہرینہ نے واضح طور پر محسوس کیا کہ تانیہ ذہنی طور پر وہاں موجود نہیں ہے۔ وہ کھٹکے پر یا کسی گروپ کے کلاس میں داخل ہونے پر، اپنی سیٹ کے پاس کسی کے گزرنے کی آہٹ پر یوں چونک پڑتی جیسے کسی کی منتظر ہو۔ اس کی نگاہیں بظاہر کتاب پر یا باتوں کے دریان شہرینہ پر ہوتیں مگر انگلیوں کا اضطراب اور نگاہوں کا بار بار بھٹک جانا اسے ذہنی طور پر اپ سیٹ ظاہر کر رہا تھا۔

راہداری سے گزرتے ہوئے اسے ہلکی سی ٹھوکر لگی تو شہرینہ نے جلدی سے اسے تھام لیا پھر قدرے الجھ کر اسے دیکھا۔

”کیا بات ہے تانی! کس سوچ میں ہو۔ کوئی پریشانی ہے کیا۔“ اس کے لہجے میں کھوج کی بجائے تشویش تھی جبکہ وہ سٹپٹا گئی۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دزدیدہ نگاہوں سے سیڑھیوں کی طرف دیکھا، جہاں ”اکبر شاہ“ اپنے گروپ کے ساتھ کھڑا تھا اور اسے عجیب بے قرار اور پیاسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں ملنے پر ایک شکایتی نظر ڈالی۔

”شیری! ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم برگر وغیرہ کچھ لے آئو۔ میں یہیں بیٹھ جاتی ہوں۔ بس اب چلا نہیں جا رہا مجھ سے۔“

وہ کیفے کی طرف جانے کی بجائے وہیں بینچ پر بیٹھ گئی۔ وہ خود بھی سمجھ نہ پائی کہ کیا چاہتی ہے۔ بس بے ارادہ ہی اس نے کہہ دیا تھا۔ شہرینہ نے اسے تشویش کے عالم میں دیکھا۔

”کیوں، کیا ہوا۔ چلا کیوں نہیں جا رہا۔“ پھر جھک کر اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے بولی:

"تانی! پلیز کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے ضرور شیئر کرنا۔ پتہ ہے تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے کہ پورا ہفتہ بھر میں نہیں بلکہ تم بیمار رہی ہو۔"

تانیہ کا دل بے قرار ہو کر پھڑکنے لگا۔ وہ نگاہیں چرا گئی اور زور سے ہنسی۔

"ہاں نا۔ تمہارے نہ آنے کا سوگ مناتے مناتے ان حالوں کو پہنچی ہوں۔" پھر اس کی شہد رنگ آنکھوں کی سطح پر چمکتی تشویش کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اعتماد کو بحال کرتے ہوئے بولی۔

"اب جاؤ اور جلدی سے کچھ کھانے کو لے آؤ۔ ناشتا بھی نہیں کیا ہے میں نے۔ حتیٰ کہ وہ زہر بھی پی کر نہیں آئی۔" اس نے خود کو بھرپور طریقے سے ہشاش بشاش ظاہر کیا تو وہ قدرے مطمئن ہو کر اپنی کتابیں اس کی گود میں ڈال کر چلی گئی۔

وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر گہری سانس بھر کر دیوار سے پشت لگا کر سر ٹیک لیا۔

اس کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا۔ وہ دانستہ اِدھر اُدھر نگاہیں ڈالنے سے گریز کر رہی تھی مگر دو آنکھوں کی تپش اتنی دور سے بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یکدم عجیب سی خفت محسوس کرنے لگی۔

اسے لگا جیسے وہ خود اپنی نظروں میں گر گئی ہو۔ اکبر شاہ کوئی کم فہم یا نادان نہیں تھا کہ نہ سمجھتا کہ اس نے جان کر شہرینہ کو وہاں سے ہٹایا ہے، محض اس کی خاطر۔

اور وہ جو کسی ایسے ہی موقع کا منتظر تھا، ایک دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ہر بڑھتے قدم کے ساتھ اسے اپنا دل ایک اتھاہ میں ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔

مگر جانے کیوں۔ اسے اچھا لگ رہا تھا کہ کوئی فدویانہ اور وارفتانہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

کوئی بیقراری سے اس کا منتظر رہا ہے۔ شکوہ کر رہا ہے اور اس کی ذرا سی توجہ کے لیے یوں خوار ہو رہا ہے۔

"تھینک یو تانیہ!" وہ اس کے نزدیک آ چکا تھا۔ مانوس پرفیوم کی مہک کے ساتھ اس کے قرب کی آنچ اس کے دل تک اتر گئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں پھر جھکا دیں اور ساتھ میں سر بھی ذرا سا جھکا دیا اور نگاہیں گود میں رکھی فائل پر کر دیں۔

یہ نگاہیں جن کو دیکھنے کی تاب نہ تھی، اس کے دل کے ویرانے میں بہار بن کر اتر جاتی تھیں۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار

اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنادیتے ہیں

وہ کسی پجاری کی طرح یکدم اس کے آگے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور تانیہ کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز کر رہ گیا۔اس نے اکبر شاہ کی طرف دیکھا اور کچھ کہنا چاہا مگر زبان ٹھٹھر کر رہ گئی۔

وہ اس کے ضبط اور ارادوں کی تمام تر دیواروں کو گراتا ہوا آگے' بہت آگے اور بہت آگے بڑھ رہا تھا۔اس کے تمام تر مدافعتی ہتھیاروں کو ناکام بناتا ہوا،کسی فاتح جرنل کی طرح اس کے دل کے کمزور

دروازے کو کھول کر اس میں داخل ہوتا ہوا۔

درودیوار لرز رہے تھے۔اس کی محبت کی تندی سے،اس کے قدموں کی اس تیزی رفتاری سے۔

دلوں کی جگمگاتی بستیاں تاراج کرتے ہیں

یہی جو لوگ لگتے ہیں نہایت عام سے پہلے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس نے ایک شکست خوردہ سی نظر اکبر شاہ پر ڈالی،جو بظاہر اس کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا۔تشنہ اور امید افزا نگاہوں سے تکتا ہوا مگر درحقیقت فاتح تھا۔اس کی دل کی مسند پر براجمان تھا۔

اس کی تمام تر امیدوں اور آرزوئوں کا مرکز۔

"کچھ لوگ بے شک محفل پر چھا جانے کا ڈھنگ نہیں جانتے مگر دلوں کو مسخر کر دینے کا فن خوب جانتے ہیں۔" وہ بینچ پر ہتھیلیاں جما کر اٹھتے ہوئے بولا۔

"جی؟" اس نے اپنے دھیان سے نکل کر الجھ کر کہا۔

"جی۔" اکبر شاہ کے لبوں کی تراش میں مدہم سی مسکراہٹ سمٹ آئی پھر اس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا۔

"بس یہی انداز پاگل کر دینے کو کافی ہے تانیہ رضا!"

خوبصورت،اداس،خوفزدہ

وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

وہ بے اختیار پلکوں کی جھالریں جھکا گئی۔

پتہ نہیں اکبر شاہ کو دل جیتنے کا فن آچکا تھا یا وہی اپنے نفس کے آگے تنکے کی طرح بہنے لگی تھی پھر یکدم اس پر گھبراہٹ نے حملہ کر دیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گزرتے اسٹوڈنٹس سے زیادہ شہرینہ کے آجانے کا خوف ہو گیا۔

''پلیز اکبر شاہ! شیری آتی ہی ہو گئی ابھی اور میں، میں نہیں چاہتی کہ اسے کچھ۔''

''خبر ہو جائے کہ تانیہ محبت کے خوبصورت جال میں مقید ہو چکی ہے اور مقید اسے اکبر شاہ نے کیا ہے۔'' وہ اس کی بات اچک کر شرارت سے اس کی سمت جھک کر بولا تو وہ اسے بس دیکھ کر رہ گئی۔ کچھ کہنے کی کوشش اندر ہی دم توڑ گئی۔

پھر پلکیں جھکا دیں۔

وہ اس کی بات کو جھٹلانے کے باوجود جھٹلا نہ پائی۔ بودا سا احتجاج بھی اس کے لبوں کی دیواروں سے باہر نہ آسکا۔

''تانی مگر میرا دل چاہتا ہے کہ یہ بات سب کو معلوم ہو جائے کہ میں اور تم ایک خوبصورت ان دیکھی مگر مانوس زنجیر میں بندھ گئے ہیں۔'' اس کے لہجے میں جذبوں کی آنچ تھی۔ وہ وارفتگی سے اسے تک رہا تھا پھر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ایک سانس بھر کر بولا۔

''اوکے اوکے۔ ڈونٹ وری۔ تم نہ چاہو تو یوں ہی سہی۔''

اس نے جھک کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا پھر یکدم سیدھا کھڑا ہو گیا۔

تانیہ بھی سٹپٹا گئی تھی۔ شہرینہ آتی دکھائی دے رہی تھی۔

''اوکے تانی!'' وہ پلٹ کر قدم اٹھاتا دوسری طرف نکل گیا اور تانیہ خود کو سنبھالنے لگی۔ دھڑکنوں کو معمول پر لانے لگی۔

''تانی! یہ، یہ اکبر شاہ ہی تھا نا۔'' شہرینہ نے آتے ہی ڈسپوزبل پلیٹوں میں رکھے برگر اور سلاد بینچ پر رکھے اور جاتے اکبر شاہ کو دیکھ کر تانیہ کو دیکھا جو خوامخواہ میں اپنے بیگ کی زپ بند کرنے میں مصروف تھی پھر عجیب ڈھیلے انداز میں سر ہلا دیا۔ ''کیوں آیا تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟'' اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ وہ تانیہ کو دیکھنے لگی جبکہ تانیہ نے نگاہیں چرا لیں۔

""سرزیدی نے کل جو لیکچر دیا تھا اسے چاہیے تھا' بس وہی لینے آیا تھا۔ یہ تم کیا اٹھالائی ہو۔ مجھے تو چائے کی بھی طلب ہو رہی تھی۔"" وہ بات آئی گئی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پلیٹوں کو دیکھنے لگی۔

""اکبر شاہ اور سرزیدی کا لیکچر؟ کمال ہے۔"" شہرینہ کی ہنسی سراسر تمسخرانہ تھی پھر وہ اپنی پلیٹ اٹھا کر وہیں بیٹھ گئی۔

""کچھ حیرت انگیز اور بے یقین سی بات نہیں ہے تانی! اکبر شاہ اور نوٹس۔"" وہ کھلکھلائی مگر اس کی ہنسی میں تانیہ شامل نہ ہو سکی بلکہ بیزاری سے بولی۔

""یقین نہ کرنے والی بات بھی نہیں ہے۔ کسی کے دل کا حال ہم اور تم تھوڑا ہی جان سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اسے احساس ہو گیا ہو اور وہ پڑھائی کے معاملے میں سنجیدہ ہو گیا ہو۔""

""کتے کی دم سو سال بھی نلکی میں رہے تو ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے، کہاں ہو تم؟ اکبر شاہ اور سنجیدہ، پڑھائی کے معاملے میں۔"" وہ اس کی بات کا مذاق اڑانے لگی۔ تانیہ کا دل اندر سے بدمزہ ہو گیا۔

اسے زندگی میں پہلی بار ""اکبر شاہ"" کے خلاف کوئی بات انتہائی بری لگی تھی۔

اس کا دل چاہا وہ شہرینہ کو بولنے سے ٹوک دے اور اکبر شاہ کا دفاع کرے مگر چاہنے کے باوجود ایک لفظ بول نہ پائی۔

X...X...X

فدا حسین کی گائوں میں بڑھتی ہوئی مقبولیت نے ولید کو قدرے مطمئن کر دیا تھا۔ ابھی ابھی یوسف نے اسے کچھ اہم خبروں کے بعد یہ خبر دی تھی کہ فدا حسین کا کل کا جلسہ بے حد کامیاب رہا ہے۔ علاقے میں ہلچل مچ گئی ہے اور زیر تعمیر اسکول بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہا ہے۔

وہاں کے سادہ لوح ناآسودہ لوگوں کے لیے یہ زیر تعمیر اسکول ایک خوشگوار کرن ہی ثابت ہوا تھا۔

ولید فدا حسین کی کارکردگی سے خوش تھا کہ وہ جس طرح اور جو کروا رہا تھا وہ کسی تابعدار شاگرد کی طرح کیے جا رہا تھا۔ اپنی نام نہاد عقل کو اس نے کسی موقع پر بھی زحمت دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ آنکھ بند کر کے ولید حسن کے ہر نئے پلان پر عمل کرتا جا رہا تھا۔ اور یہ بات ولید کے لیے طمانیت بخش تھی۔ جیسے وہ چلاتا وہ چلا جاتا۔

ادھر توقیر شاہ بلبلایا پھر رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اپنی رائفل اٹھا کر فدا حسین کو اڑا دے۔ اس کی ساری پریشانیاں، بلبلاہٹیں یوسف کے ذریعے ولید تک پہنچ رہی تھیں اور وہ یوسف کی کارکردگی سے بھی خاصا مسرور تھا۔

موبائل آف کر کے وہ مسرور سے انداز میں کرسی کی پشت سے لگ کر کرسی کو دائیں بائیں گھمانے لگا۔ پھر یکلخت اسے سکندر کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے میز پر انگلیاں ٹکا کر جھولتی کرسی کو روکا اور سکندر کو دیکھا جو اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ نظریں ملنے پر بولا۔

”مجھے سمجھ نہیں آتا کہ آخر ان تمام باتوں کا اور اتنی مشقت کا مقصد کیا ہے۔“

وہ مبہم سے انداز میں مسکرانے لگا، جیسے اس کی بات سے محظوظ ہوا ہو پھر دوبارہ کرسی جھلاتے ہوئے بولا۔

”کبھی کبھی بے مقصد بھی مشقت کی جاسکتی ہے۔“

سکندر نے اسے گھور کر دیکھا بلکہ ایک طرح سے سر سے پیر تک جائزہ لے کر لتاڑا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”تم جیسا شخص تو شاید ”محبت“ بھی بے مقصد نہیں کر سکتا، کجا مشقت۔“

اس کے مسکراتے لب لمحہ بھر کو آپس میں جڑے تھے پھر وہ ہلکے سے سانس خارج کرتے ہوئے سکندر کو دیکھنے لگا۔

”تمہارے خیال میں، میں اتنا مفاد پرست انسان ہوں۔“

”نہیں، بامقصد۔“ سکندر کا جملہ اور قہقہہ دونوں ہی برجستہ تھے۔

اس نے پیپر ویٹ اٹھایا اور مارنے کے انداز میں اس کی طرف اچھالنے کی ایکٹنگ کی۔

”دل چاہتا ہے اس سے تمہارا سر پھاڑ ہی ڈالوں مگر صحافت پر رحم آگیا۔ کہاں ایک محب وطن اور سچے کھرے صحافی سے قوم کو محروم کردوں، حالانکہ فاروقی صاحب تو میرے اس نیک کام کو یقینا سراہیں گے۔“

سکندر نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ سے پیپر ویٹ لے لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"ٹالنے کی کوشش مت کرو۔ یہ بتائو، آخر یہ سب کیوں کر رہے ہو۔ جہاں تک میری ناقص عقل کا خیال ہے کہ آمنہ علی کو پانے کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے کی ضرورت تو پیش نہیں آسکتی۔ وہ تو یوں بھی بے چاری تمہیں دیکھ کر برف کی طرح پگھل جاتی ہے کہ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہیں رہتی۔"

"اور تم حسد کی آگ میں جل جل کر مر جاتے ہو۔" اس نے جملہ جوڑا۔ جواباً وہ بغیر برا منائے زور زور سے سر ہلانے لگا۔

"بالکل۔ تو اور کیا نہیں۔ دو چار کبھی میرے لیے بھی چھوڑ دیا کرو۔ شمع محفل بن کر ہر جگہ کو دپڑتے ہو۔ ہمارے حصے میں تو نثار لاشیں ہی آتی ہیں۔" اس نے یہ کہہ کر طویل پر سوز آہ بھری۔

"سکندر! یہ زیادتی ہے۔" ولید احتجاجاً چلایا۔

ہم تو بدنام ہیں عدم یوں ہی

لوگ دنیا میں کیا نہیں کرتے

جواباً سکندر کے گھورنے پر ہنس پڑا۔

"کچھ غلط کہہ رہا ہوں۔"

"نہیں، نہیں تم نے کبھی غلط کہا ہے۔ غلط تو ہم کہتے ہیں۔"

"اچھا یار! معاف کر دو۔" اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے اور ہلکی سی سانس بھری۔ "ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے، مختاری کی۔ آہ۔ آں بس بس۔ میرا خیال ہے میں نے آج تک تم سے کبھی کچھ مخفی نہیں رکھا۔ ہاں بس وقت آنے پر ہی بتایا ہے تو یہ میرا اصول رہا ہے۔ اب کیا کرنا ہے۔" اس نے سکندر کو بولنے سے پہلے ہی ٹوک دیا تھا اور وضاحت کے بعد اسے دیکھتے ہوئے کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

سکندر اسے بس دیکھ کر رہ گیا پھر خود بھی اٹھ گیا۔

" جہاں تک میرا خیال ہے تم اپنی کسی پریشانی کا ذکر کر رہے تھے۔"

اس نے دراز میں چابی لگا کر چابیاں جیب میں ڈالیں اور کرسی کی پشت سے اپنی واسکٹ اٹھائی اور پہننے لگا۔

سیاہ شلوار سوٹ اور سیاہ واسکٹ میں وہ اسمارٹ اور جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے پر بشاشت کے رنگ تھے۔

یوں بھی وہ اندر کے خلفشار چہرے سے ظاہر کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ ہمہ وقت مطمئن دکھائی دیتا تھا اور یہی خوبی اس میں اور کشش پیدا کرتی تھی۔

"آیا تو اپنے ہی کام سے تھا مگر یہ بتاؤ فارغ ہو۔" سکندر نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔

"ایسا ویسا۔" پھر اس کی طرف آکر اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں چل کر پہلے لنچ کرتے ہیں، اس دوران باتیں بھی کر لیں گے۔ یار اتنی بھوک لگی ہے کہ دماغ کی ساری رگیں ہاضمہ کی طرف دوڑ رہی ہیں۔ ذہن بالکل ناکارہ ہو چکا ہے۔"

وہ بولتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا پھر ٹھٹھک کر سکندر کو دیکھا تو بے اختیار لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اسے خاصی تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا پھر یوں سانس بھری جیسے اس کے جھوٹ پر اسے لتاڑا ہو۔

"یار! تم مجھے جیمز بونڈ کیوں سمجھتے ہو۔ میں انسان ہوں بھائی، ایک کمزور بشر۔ جس کا ذہن کمپیوٹر ہر گز نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی بند اور ناکارہ ہو سکتا ہے۔"

"جی ہاں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ اس کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ خالی پیٹ اور ناکارہ ذہن کے ساتھ کیا کیا مشورے دیئے جا رہے تھے، کیا پلاننگ کی جا رہی تھی۔"

"سکندر! سکندر! کسی دن تم میرے ہاتھوں پٹو گے نا تو ایک ہڈی نہیں بچے گی۔" وہ اسے گھسیٹ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"تمہاری سزا یہ ہے کہ تمہیں لفٹ کی بجائے سیڑھیاں اترنی پڑیں گی۔" اور سکندر لاکھ احتجاج کرتا ناچار اسے سیڑھیاں ہی پھلانگنی پڑیں۔

X...X...X

وہ چھت سے تارکول کی سڑک پر رواں دواں ٹریفک کو خالی خالی نظروں سے تک رہی تھی۔ ہلکی ہلکی خوشگوار ہوا کے جھونکے بدن سے ٹکرا کر لطیف سا احساس جگا رہے تھے یا اسے ہی محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے پلٹ کر ایک طرف رکھی اپنی کتابیں دیکھیں۔ نیچے سب کا خیال تھا وہ چھت پر بیٹھی اپنے ٹیسٹ کی تیاری کر رہی ہو گی، اس لیے نادیہ آپی نے صبح سے اسے آواز نہیں دی تھی۔ وہ دیوار کی سطح پر

ہاتھ ٹکا کر وسیع خوشنما، نکھرے نکھرے آسمان کو تکنے لگی پھر ایک گہری سانس اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

مسلسل روکتی ہوں اس کو شہر دل میں آنے سے

مگر وہ کوہ کن رکتا نہیں دیوار ڈھانے سے

وہ خود پر حیران اور متاسف تھی کہ اسے یہ کیا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اتنی کمزور کیوں ہو گئی کہ وہ اس کے ذہن و دل پر چھاتا چلا گیا۔

اس نے تو اپنی پر سکون زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا پھر اب یہ دل کیوں کسی ایسے انقلاب کا خواہاں تھا جو اس کے نزدیک کبھی معتبر نہیں رہا تھا۔ یہ کیسے شوریدہ سر جذبے ساحل دل پر سر اٹھا رہے تھے جس کا تصور بھی اس کے پاس نہیں تھا۔

وہ کبوتروں کے پنجرے کے پاس چلی آئی۔ جہاں سفید سفید... کبوتر اپنے آپ میں مگن دکھائی دے رہے تھے۔

"بہر حال، یہ سراسر آگ ہے جو اکبر شاہ تم نے میرے ارد گرد دہکا دی ہے۔"

اس نے تھک کر پنجرے کے پاس کی دیوار سے سر ٹکا لیا پھر ہلکے سے ہنس پڑی۔

"یہ کسی آگ ہے جو میرے ویران کھنڈر دل میں لگ گئی مگر اسے جلا کر بھسم کرنے کی بجائے دل کو ایک نئی اور انوکھی لذت سے ہمکنار کر رہی ہے۔ اس کی تپش کتنی خوشنما اور پراسرار سی ہے جو دل و جاں کو مہکا رہی ہے۔"

وہ پنجرے کی جالی پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ انگلیوں سے دائرے بناتے ہوئے میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ سوچنے لگی۔

شاید اسے ہی محبت کہتے ہیں کہ کوئی یک دم آپ کو بہت اچھا لگنے لگے۔اس کے بارے میں رات جاگ جاگ کر سوچنا اچھا لگے۔نیند سے آنکھ بوجھل ہوں مگر، مگر آنکھوں کو میٹھی اذیت دے کر نیند سے دور رکھ کر بس اس کا تصور کرتے کرتے صبح کر دیں۔

یا پھر کسی کا خیال ہمارے خوابوں کو منتشر کر دے۔جس طرح باد صر صر چمن میں طوفان لے آتی ہے۔ہمارے وجود کی بنیاد تک ہلا ڈالے۔دل کی زمین کی جڑوں کو ہلا دے۔

یا پھر

پھر ایک عجیب سی بے سکونی قلب وروح میں سما جائے۔یوں دل پگھل جائے جیسے دھوپ میں رکھی برف کی سل چشمے کی طرح ایک بالکل نئی سمت انجانی راہوں پر بہنے لگے، جہاں کچھ دکھائی نہ دے مگر بدمست۔

الھڑ

چنگھاڑتی لہر کی طرح دوڑتا رہے

بہتا رہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

انجانی راہوں پر، ہے نا۔اس کا نام محبت ہے کہ کوئی یکدم اپنے وجود کو ہمارے اندر یوں آشکارہ کرے۔جیسے سیاہ تاریک رات میں ستارہ نکل کر جگمگانے لگے۔

اس نے جیسے کبوتروں سے تائید چاہی اور کبوتر غٹر غوں، غٹر غوں اپنی آوازوں میں تائید کرنے لگے۔

اسے یکدم ہوا میں نغمگی کا احساس ہونے لگا۔اپنے تپتے رخساروں پر یہ جھونکے خنک محسوس ہونے لگے۔اس نے ایک گہری سانس بھری اور مست البیلے جھونکوں کو سانسوں کے ذریعے پھیپھڑوں میں کسی روشنی کی طرح اتار لیا۔

وہ اب خود کو قطعی دھوکا نہیں دے رہی تھی کہ اکبر شاہ اس کے ذہن ودل پر حاوی ہو گیا ہے۔وہ ہار چکی ہے اور ہارنا کوئی اتنی بری بات بھی نہیں ہے۔جب ہار کسی خوبصورت مسرت کی طرح آپ کا حصہ بن رہی ہو۔

وہ مسرور سی ٹہلنے لگی تب اسے اچانک نادیہ کی پکار سنائی دی، جو وقفے وقفے سے کئی بار آئی تھی۔اس نے سیڑھی کے پاس جا کر جھانکا تو نیچے ہلچل کا احساس ہوا پھر اسے دوبارہ نادیہ آپی کی آواز آئی۔

"بے وقوف! بے خبر لڑکی! نیچے اترو۔ چھت پر آوارہ گردی بعد میں کرتی رہنا' اتر کر مٹھائی کھالو۔"

اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

مٹھائی؟

وہ دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتی نیچے اتری تھی۔

نادیہ آپی کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ تانیہ کو دیکھ کر وہ ڈبہ کھول کر مٹھائی نکالنے لگیں۔

"یہ مٹھائی کس خوشی میں؟ پتہ بھی تو چلے۔" اس نے اماں کی طرف دیکھا جو مسکراتے ہوئے بدن سے چادر اتار رہی تھیں۔ ایک طرف نومی کھڑا تھا۔ عام دنوں سے بالکل مختلف شرمایا' لجایا۔

"تمہاری بے خبری پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ لو کھاؤ بے وقوف! اپنے نومی کا رشتہ عظمیٰ کے ساتھ طے پا گیا ہے۔" یہ بتاتے ہوئے نادیہ آپی نے پورا گلاب جامن اس کے منہ میں ٹھونس دیا اور وہ جلدی سے آدھا منہ سے نکال کر مارے خوشی کے چیخی۔

"واؤ' یہ ہوئی نا بات۔ ویسے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ چپکے چپکے چلی گئیں' مجھے بتایا تک نہیں۔"

وہ بقیہ گلاب جامن کا پیس منہ میں ڈال کر انگلیاں چاٹتے ہوئے اماں تک آئی۔

"لو دیکھو ذرا۔ بتایا تک نہیں۔" اماں نے ایک ہاتھ جڑ دیا۔

"بتایا تو تھا تمہیں کہ شام سید صاحب کی طرف جانا ہے جواب لینے۔ اب تم اپنے آپ میں مگن ہو تو کوئی کیا کرے۔" نادیہ آپی نے بھی ایک ہاتھ اسے جڑ دیا۔ وہ ذرا سی جھینپی پھر ان کے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبہ لے کر نومی کی طرف بڑھی۔

"بڑے گھنے ہو۔ اماں کو چپکے چپکے راضی کر لیا' ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔" اس نے ڈبے کا ڈھکن ایک طرف پھینکا اور اس میں سے سب سے اچھی مٹھائی اٹھائی اور نومی کے کچھ کہنے سے پہلے اس کے کھلے منہ میں گھسیڑ دی۔

نادیہ اور اماں ہنسنے لگیں جبکہ نومی احتجاج کرنے لگا۔

"اماں! اسے بتائیں، مجھے کہاں کچھ خبر تھی۔ یہ تو آپ اور نادیہ آپی نے ہی بالا بالا کیا ہے سب۔ مجھے تو یہ سب اتنا جلدی کرنا بھی نہیں تھا بلکہ پریشان ہو گیا ہوں۔"

"اوے ہوئے، پریشان۔ ذرا پھر سے کہنا۔ ایسی ہوتی ہے شکل پریشانی میں۔" نادیہ آپی نے اس کے گال پر چپت ماری تو وہ کھسیا کر سر جھکا گیا پھر مٹھائی حلق سے بمشکل اتار کر پانی کے کولر کی طرف بڑھ گیا۔

ایک پر کیف احساس اس کے دل پر ہلکورے لے رہا تھا۔ گو کہ وہ حیران تھا، کچھ پریشان بھی کہ اتنی جلدی یہ سب کچھ اس نے نہیں چاہا تھا جتنی جلدی اماں اور نادیہ آپی کر چکی تھیں۔ تاہم یہ خیال کہ ایک لڑکی اس کی ذات سے منسوب ہو چکی ہے، لڑکی بھی وہ جو اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ گئی تھی۔ بڑا ہی روح کو گدگدانے والا احساس تھا۔

ایک سرمستی اس کے اندر اتر گئی تھی۔ ایک خوش رنگ کیفیت اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ پانی بھرتے ہوئے کولر کو دیکھا۔ جیسے وہ کولر نہیں عظمیٰ ہو اور حقیقتاً وہ تصور میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ جب گلاس سے پانی چھلک کر پیروں پر گرا تو اسے احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے کولر کی ٹوٹی سے ہاتھ ہٹا دیا۔

تانیہ اور نادیہ آپی کی قل قل ہنسی اسے سنائی دی۔ وہ جھینپ گیا۔

اس میں اسی کا عکس دکھائی دیا مجھے

نظروں کے سامنے جو تصور کی جھیل ہے

وہ پلٹا۔ اس سے پہلے کہ تانیہ مزید کوئی شرارت کرتی، اس نے پانی کے چند گھونٹ بھر کر باقی پانی اس پر اچھال دیا۔

تانیہ اس افتاد کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ اس کی چیخ بھی ٹھٹھر گئی۔

"ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے ببلو نہائے گا۔" نومی اس کی حالت سے محظوظ ہو کر اسے مزید چڑانے لگا۔ وہ بھی اس ٹھنڈے حملے کے طلسم سے نکل کر میدان میں کود پڑی اور گلاس اٹھایا اور نلکے سے پورا بھر کر اس کی جانب لپکی۔

بس پھر کیا تھا' کچھ ہی دیر میں ہر جگہ پانی ہی پانی تھا۔

ادھر نادیہ آپی چیختی رہ گئیں مگر کس نے سننا تھا۔نومی نے بھی پورا کولر اٹھایا ہوا تھا اور ڈھکن اتار کر با قاعدہ پانی انڈیلے جا رہا تھا اور وہ گلاس بھر بھر کر اچھال رہی تھی۔

X...X...X

شہرینہ اور تانیہ کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جانے پر بالآخر نومی انہیں ٹریٹ دینے پر راضی ہوا تھا۔

"کیوں نہ عظمیٰ کو بھی ساتھ لے لیں۔اصل حق تو اس ٹریٹ پر اسی کا بنتا ہے۔" راستے میں نومی نے بظاہر شرارت سے کہا مگر دل کی یہ خواہش بڑی شدت سے چہرے سے عیاں تھی۔

"ایویں ہی عظمیٰ کو لے لیں۔ان کے ابا میاں تمہارے سر پر توپ داغ دیں گے۔" تانیہ نے اس کے چہرے پر جھلکنے والی خواہش کی لو کو تقریباً بجھا ہی ڈالا۔

"خیر وہ کیا توپ داغیں گے' ان کی بیٹی ہی داغے گی۔" شہرینہ ہلکے سے ہنسی۔

"وہ تو داغ چکی ہے یہاں۔" نومی نے بے ساختہ کہہ کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔وہ سب اوئے اوئے کرنے لگیں۔پھر نادیہ آپی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔

"دشت پڑتا ہے میاں عشق میں' گھر سے پہلے"

وہ زور سے ہنس پڑا پھر کندھے اچکائے اور بے ساختہ شعر پڑھا۔

تم سختی راہ کا غم نہ کرو' ہر دور کی راہ میں ہم سفر و
جہاں دشتِ خزاں وہیں وادی گل' جہاں دھوپ کڑی وہاں چھاؤں گھنی

اس نے بڑی تیزی سے گاڑی ریورس کر کے عظمیٰ کے گھر کی طرف ڈالی تھی۔نادیہ آپی نے اس کا ارادہ بھانپ کر پریشان ہو کر اس کا کندھا تقریباً نوچ ڈالا۔

"کیا کر رہے ہو نومی! خبر دار جو وہاں گاڑی لے گئے۔پٹنا ہے کیا تمہیں امی سے؟"

"امی سے پہلے ساس' سسر اور سالے یعنی سارے "س" مل کر حلوہ بنا دیں گے۔" تانیہ نے بھی خوف ناک نقشہ کھینچا مگر وہ بے پرواہی سے ہنس دیا۔

"ارے جاؤ بڑے دیکھے ہیں حلوہ بنانے والے۔میرے جیسے داماد کی تو وہاں تعظیم ہو گی۔"

""شرافت سے گاڑی موڑلو نومی صاحب! یہ کوئی فلمی اسٹوری نہیں ہے مسٹر کہ آپ ہیرو بن کر میدان میں کود پڑیں اور آپ کی ایک دھاڑ سے دبک کر ہیروئن آپ کے حوالے کر دیں گے۔""

شہرینہ نے اس کا مذاق اڑایا۔

اس نے ہنستے ہوئے گاڑی موڑلی اور مرر سے پیچھے بیٹھی نادیہ آپی کو دیکھا۔

""اب خوش۔"" اوران کے پریشان چہرے پر اطمینان اتر آیا۔وہ درحقیقت گھبرا گئی تھیں۔

نومی سے کچھ بعید بھی تو نہ تھا۔ عجیب اکھڑ' ضدی سالڑکا تھا۔

وہ ایک خوبصورت ریسٹورنٹ کے خنک ماحول میں بیٹھ کر بھی ہلکی پھلکی ہنسی مذاق کے ساتھ مینو پر نگاہیں دوڑانے لگیں' تب اکبر شاہ کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔

""ہیلو تانیہ!"" وہ بڑی اپنائیت سے تانیہ سے مخاطب تھا۔

شہرینہ نے مینیو سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔اس کی آمد ہمیشہ کی طرح یہاں بھی غیر متوقع اور بے موقع تھی۔اس کے اندر تک ناگواری کی ایک لہر اتر گئی۔اس نے اپنی تمام تر توجہ مینو

کارڈ پر کر ڈالی اور وہ دیکھ ہی نہ پائی کہ اکبر شاہ کو دیکھ کر تانیہ کے رخساروں پر کیسی شفق پھوٹی تھی۔

ہونٹوں کی تراش میں استقبالیہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں اپنائیت بھری چمک امڈ امڈ رہی تھی۔

ہاں مگر تانیہ کی آواز پر وہ ضرور چونک کر سر اٹھانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اس کی آواز خوشگواریت اور مسرت آمیز احساس سے کھنک دار ہو گئی تھی۔وہ جواباً اکبر شاہ سے ہیلو ہائے کے بعد نومی اور نادیہ آپی کا تعارف کرانے لگی تھی جبکہ شہرینہ لب بھینچے اسے دیکھتی رہ گئی۔

اکبر شاہ کو دیکھ کر خوفزدہ ہو کر اپنے خول میں سمٹ جانے والی تانیہ رضا' آج انوکھی چہکار سے اسے ویلکم کرتے ہوئے اسے اس دعوت میں شامل ہونے پر اصرار کر رہی تھی۔یہ خاصی بھاری ضرب تھی جو شہرینہ کو اپنے اعصاب پر محسوس ہوئی تھی۔

"سوری تانیہ! میں تم لوگوں کے ساتھ ضرور انجوائے کرتا مگر میرے ساتھ کچھ گیسٹ بھی ہیں میرے اور فیملی ممبرز بھی۔" وہ تانیہ کی اپنائیت بھری دعوت کے جواب میں قدرے افسوس اور بے حد شائستگی سے معذرت کر رہا تھا۔

ایسا لہجہ اور اتنی مٹھاس تانیہ کے لیے اکبر شاہ کے لہجے میں محسوس کر کے شہرینہ ورطہ حیرت میں ہی تھی اور دوسرا اسے تانیہ کے انداز پر حیرت کے ساتھ شاک بھی لگا تھا۔

نومی اور نادیہ آپی تو تانیہ کے کلاس فیلو ہونے کے ناتے... اکبر شاہ سے خاصے مروت برت رہے تھے بلکہ نومی تو اکبر شاہ کی ظاہری آن بان سے خاصا متاثر دکھائی دے رہا تھا۔

"تانی! تم نے مائنڈ تو نہیں کیا نا۔" وہ ٹیبل کی سطح پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھک کر تانیہ سے مخاطب تھا۔ تانیہ نے اس کی طرف اپنائیت بھری نظروں سے دیکھا پھر مسکرا دی اور سر نفی میں ہلا دیا۔

"اوکے۔ سی یو اگین۔" وہ نومی سے مصافحہ کر کے اپنی کی رنگ گھماتا ہوا چلا گیا۔ ہاں جاتے جاتے ایک اچٹتی سی نگاہ شہرینہ پر ڈال گیا تھا اور اسے مجسم حیرت میں دیکھ کر اس کے لبوں کی تراش میں مبہم سی مسکراہٹ چمک کر معدوم ہوئی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کسی بڑے باپ کا بیٹا معلوم ہوتا ہے۔" نومی نے پلیٹ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے پہلا تبصرہ کیا۔ وہ اب تک متاثر دکھائی دے رہا تھا اور اسے اکبر شاہ کے دعوت قبول کر کے ان کے درمیان نہ بیٹھنے پر جیسے قلق سا ہوا تھا۔

"تم اس سے متاثر ہو یا اس کے باپ کے امیر ہونے سے۔" وہ بظاہر نومی سے بولی تھی مگر دیکھا اس نے تانیہ کی طرف تھا پھر ہلکے سے ہنسی۔

"لگ رہا ہے تم دونوں بھائی بہن اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے ہو۔ جبکہ میرے خیال میں اس کے پاس سوائے دولت کے اور متاثر کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

تانیہ دھک سے رہ گئی۔ اس کا ہاتھ اپنی پلیٹ پر ہی جم کر رہ گیا۔ شہرینہ کی موجودگی کو وہ یکسر ہی بھلا بیٹھی تھی اور اکبر شاہ کو دیکھ کر جس طرح وہ عقل کھو بیٹھی تھی اس کا احساس اسے اب ہوا اور بڑی شدت سے ہوا۔

پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔

اس کا ذہن تو اکبر شاہ کے جذبے لٹاتی نگاہوں کے سحر میں جکڑا ہوا تھا۔ مگر شہرینہ کی آواز نے جیسے دھنک کے لہراتے موسموں سے اسے یکدم دھوپ میں کھینچ لیا تھا۔

اپنی بے اختیار حرکت پر وہ اب سراسیمہ سی ہو کر رہ گئی اور دزدیدہ نظروں سے دائیں سمت دیکھا۔

مگر وہ اس کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی اس کے رخساروں کی رنگت سے ظاہر تھا وہ بہت کچھ ضبط کر رہی تھی۔

شاید نادیہ اور نومی موجود نہ ہوتے تو وہ اکبر شاہ کو اس میز تک آنے ہی نہ دیتی۔ اور تانیہ کی اچھی طرح خبر لیتی وہ یکدم پریشان دکھائی دینے لگی۔ نوالہ حلق میں یوں اٹک اٹک کر اترنے لگا جیسے وہ نرم نرم نوڈلز نہ ہوں لوہے کی سخت تاریں ہوں۔

”دولت سے متاثر ہونا کوئی اتنی بری بات بھی نہیں ہے۔ آخر انسان ظاہری طور پر پہلے سامنے آتا ہے اور ظاہری آن بان اور حسن تو دولت سے ہی جنم لیتا ہے۔“

نومی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اس نے چائینز سوپ کا چمچہ بھر کر نومی کو دیکھا اور چمچہ دوبارہ بائول میں رکھ کر ٹشو سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”یہ تو تم سوچ سکتے ہو۔ بلکہ ہر سطحی سوچ رکھنے والے کا خیال ہو سکتا ہے۔ دولت سے کردار، اخلاق، تہذیب اور شائستگی نہیں خریدی جاسکتی۔“ اس نے سختی سے اس کی بات کی نفی کی مگر نومی کندھے اچکا کر ہنس دیا۔

”نہ سہی مگر گاڑی، بنگلہ اور شاندار کپڑے پرفیومز تو خریدے جا سکتے ہیں۔“

”نہ صرف نومی کا بلکہ نادیہ آپی مجھے تو تانیہ کا بھی دماغ کچھ خراب ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔“ اس نے تانیہ کی طرف دیکھا پھر چمچہ اس کی پلیٹ پر مار کر ہنس پڑی۔

”کیوں تانی! تمہارا کیا خیال ہے نومی کے ان نادر خیالات پر۔“

تانیہ نے جھکے سر کے ساتھ بس ذرا سی پلکیں اوپر اٹھائیں۔

”ضروری تو نہیں ہر دولت مند اوباش اور بدکردار ہی ہو۔ اس میں خوبیاں موجود ہی نہ ہوں اور یوں بھی ہم کسی کے دل کا حال تو نہیں جان سکتے نا۔ کچھ وقتی طور پر راہ سے بھٹک جاتے ہیں مگر انہیں خیال آجائے تو سیدھا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔“ اس نے یہ کہہ کر ہلکے سے سانس خارج کرتے ہوئے سر اٹھایا پھر پلیٹ دور کھسکا کر پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

"صبح کا بھولا اگر شام گھر واپس آ جائے تو اسے بھولا تو نہیں کہتے۔"

"نہیں اسے آوارہ کہتے ہیں۔" نادیہ آپی نے جل کر کہا پھر چلائیں۔

"بس کرو نا اس فضول ٹاپک کو۔"

نومی اور نادیہ بے خبر اور قطعی انجان تھے کہ شہرینہ کے جملوں کا بیک گراؤنڈ کیا تھا اور تانیہ کس بات کی وضاحت اپنے طور پر کر رہی تھی۔

شہرینہ یکدم ہی چپ ہو کر کھانے میں مصروف ہو گئی تھی تانیہ بھی باوجود کوشش کے اپنے موڈ میں واپس نہ آ سکی۔

X...X...X

تانیہ لگاتار تیسرے روز بھی یونیورسٹی نہ گئی۔ اس کے سامنے ایک سخت مرحلہ تھا شہرینہ کی نگاہوں کا سامنا کرنا اور وہ خود کو اس مرحلے سے گزرنے کے لیے شعوری طور پر تیار کر رہی تھی۔

اس کا فون بھی آیا تو وہ نادیہ آپی کی پکار پر سوتی بن گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پتہ نہیں اندر کا چور تھا جو سراسیمہ کیے ہوئے تھے یا اس کی نگاہوں سے جھلکتے استعجاب سے وہ کترا رہی تھی۔

وہ تو خود بھی نہ جان سکی کہ کب اکبر شاہ اس کے دل کے بند دروازے کو یوں توڑ کر اندر آ جائے گا۔ وہ جو محبت اور عشق کو محض آوارہ گردی خیال کرتی رہی تھی آج خود اس حال میں مکھی کی طرح الجھ کر رہ گئی تھی۔

فون کی تیز گھنٹی نے اس کے خیالات کو توڑا تھا۔ اس نے گھبرا کر فون کو دیکھا۔ پھر دوسرے پل اپنے بکھرتے اعتماد کو سمیٹتے ہوئے ریسیور اٹھالیا۔

کوئی پیغام نہ دعا کوئی

اس قدر ہم سے ہے خفا کوئی

دوسری طرف اکبر شاہ تھا جو اس کی آواز پہچان کر ترنگ میں بولا تھا۔

اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ دوسری طرف اکبر شاہ کی آواز سننے کو ملے گی۔

دل کی دھڑکن میں یکدم اضافہ ہو گیا اور وہیں اعتماد دھواں بن کر اڑنے لگا۔

"ہیلو تانی! یہ تم ہی ہو نا۔ آئی مین میں نے غلط جگہ تو ٹرائی نہیں کی نا۔" اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا پھر وہ زور سے ہنس پڑا۔

"شاید میں نے تمہیں حیرت زدہ کر دیا ہے یوں فون کھڑکا کر... اے ہیلو۔ تم ہوش میں تو ہو نا۔" اس نے ماؤتھ پیس پر انگلیاں بجائیں۔

"کبھی تھی اب نہیں رہی۔" وہ بے ساختہ بول گئی۔ دوسری سمت محظوظ ہو کر زبردست قہقہہ پڑا۔ تو اسے جلد ہی اپنی اس بے اختیاری کا احساس ہو گیا وہ سنبھل کر بولی۔

"تمہیں میرا نمبر کیسے ملا۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے یہ کون سا مشکل ہے۔" وہ اس کی حیرت پر حیران ہوا تھا۔ پھر وہ لپک کر بولا۔

"ارے ہم تو وہ ہیں اپنے جذبوں کے بل بوتے پر تمہیں بھی ڈھونڈ لیں لاکھ تم چھپ جاؤ۔ محبت بڑا پاورفل جذبہ ہے تانیہ رضا! یہ سمندر سے موتی نکال لاتا ہے تم ایک نمبر پر متعجب ہوئیں۔" اس کا لہجہ دھیما لو دیتا ہوا ہو گیا تھا۔

یہی لہجہ تو آگ بن کر تانیہ رضا کو پگھلا ڈالتا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کے تمام ارادوں کو دھواں بنا کر اڑا دیتا تھا۔ اسے اپنے اطراف' اپنے ارد گرد کے لوگ' ماحول اپنی مجبوریاں دکھائی نہ دیتیں۔ وہ کسی اور جہاں میں پرواز کرنے لگتی' چاہے جانے کا احساس نشہ بن کر اس کی رگوں یں مچل مچل کر اسے سرشار کر ڈالتا۔

"تانی! کس بات کی سزا دے رہی ہو۔" کئی لمحے پر کیف خامشی کے بعد اکبر شاہ کی آواز بعبھری جس میں بے تابیاں اور ایک کرب بھرا شکوہ مچل رہا تھا۔

"جی؟" وہ سمجھ نہ پائی یا کچھ کہہ ہی نہ پائی۔

"نہ تم آ رہی ہو نہ مجھے اپنے پاس آنے دیتی ہو۔ پلیز یہ ستم تو مت کرو۔" وہ کہہ رہا تھا اور تانیہ رضا خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگی۔

یہ تین دن کی جدائی کتنی اہم تھی کہ وہ پل پل اس کی جدائی محسوس کر رہا تھا۔

شاید اسی لیے کہتے ہیں۔

"فاصلے قرب کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں۔"

اس نے سرشار انداز میں فون سیٹ اٹھایا اور بیڈ پر نیم دراز ہو کر تکیہ کہنیوں کے نیچے دبا لیا اور ریسیور سے نزدیک منہ کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے یاد کیا تھا تم نے؟"

پتہ نہیں محبت میں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ دل دوسروں کے دل میں اپنی موجودگی کا بار بار ثبوت مانگتا ہے ذہن پر چھایا رہنے کا تمنائی رہتا ہے۔

"یاد... ہاتمہیں بھلایا ہی کب ہے' ہاں کمی محسوس کی ہے بلکہ اب تو ہمہ وقت ایک کمی سی سینے کے اندر محسوس ہوتی رہتی ہے۔ سنو جان اکبر! کہیں ملو نا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا تو وہ اس تخاطب پر بلش ہو کر رہ گئی۔

اس کی ہتھیلی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ یوں شرمائی جیسے اکبر شاہ سامنے ہی کھڑا اسے محبت پاش نگاہوں سے تک رہا ہو۔

"تانیہ سن رہی ہونا۔" اس کی خاموشی پر اس نے ریسیور بجایا۔ "تم اپنے گھر کے نزدیک جو پارک ہے وہاں شام تک آجائو۔ میں تمہیں وہاں سے پک کر لوں گا۔" وہ پروگرام سیٹ کرتا ہوا بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"نن' نہیں اکبر شاہ! یہ بہت مشکل ہے میں اس طرح تم سے باہر کیسے مل سکتی ہوں۔"

اس نے سٹپٹا کر احتجاج کیا مگر اس کا احتجاج خاصا بودا تھا اور جسے اکبر شاہ نے قطعی مسترد کر دیا۔

"کوئی مشکل نہیں ہے۔ سنا نہیں تم نے۔

اتنی مشکل بھی نہیں دشت وفا کی تسخیر

سر میں سودا بھی تو ہو' دل میں ارادہ بھی تو ہو

"ارے۔" تانیہ بے ساختہ ہنس دی۔ "تمہیں یہ اتنے بہت سے شعر یاد کیسے رہ جاتے ہیں۔"

"یاد کرنا پڑتا ہے۔ اچھا سنو۔ پورے پانچ بجے میں تمہارا منتظر رہوں گا۔"

"مم' مگر ہم جامعہ میں بھی تو مل سکتے ہیں۔"

"ہاں ملنے کو تو ہم وہاں بھی مل سکتے ہیں۔ اگر مس خان موجود نہ ہوں تو۔ اس کے ساتھ تو تم یوں جڑی جڑی گھومتی ہو جیسے خدانخواستہ اس سے ایک پل ہٹ گئیں تو جادو کے دھوئیں کی طرح تمہیں کوئی گم کر دے گا۔"

اور جواباً تانیہ زور سے ہنسی تھی۔ اسے ہنسی زیادہ اکبر شاہ کے بولنے کے انداز پر آئی تھی۔

"ایمان سے تانی! مجھے تو مس خان اب رقیب لگنے لگی ہیں۔"

"اوہو۔ کبھی اسی رقیب کے پیچھے خوار رہتے تھے۔"

"نہیں تانی! میں نے کہا ناوہ محض میری ضد بن گئی تھی۔" وہ یکدم سنجیدگی کی لپیٹ میں آکر بولا تھا۔ پھر قدرے دھونس جمانے والے لہجے میں بولا۔

"آئندہ تم میرے ماضی کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرو گی تانی! تمہیں نہیں پتہ میری دل آزاری ہوتی ہے۔ میں اپنی ماضی کی غلطیوں پر حقیقتاً نادم ہوں تانیہ! بیلیو می بس یہ ہے کہ میں تمہیں اپنا دل چیر کر نہیں دکھا سکتا۔" وہ یکدم آزردہ ہو گیا تھا۔

اس کے لہجے میں تھکن سی اتر آئی۔

تانیہ نادم سی ہو گئی۔

"سوری۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔"

"اوکے۔ اچھا آرہی ہو نا۔" وہ ذرا سا ہنس دیا۔ پھر اس کے کچھ بولنے سے پہلے بول اٹھا۔

"آنا تو پڑے گا ہی جناب دیکھتے ہیں صرف ہم ہی دیوانے ہیں آپ کے یا آپ کو بھی اس غریب کی کچھ پرواہ ہے۔"

اس نے ریسیور رکھا تو اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں کی مسکراہٹ میں نیا پن سا تھا۔

اس کی روح انوکھی مسرت سے تھرکتی محسوس ہو رہی تھی۔

محبت آگ کی صورت

بجھے سینوں میں جلتی ہے تو دل بیدار ہوتے ہیں

محبت کی تپش میں کچھ عجب اسرار ہوتے ہیں

کہ جتنا یہ بھڑکتی ہے' عروسِ جاں مہکتی ہے

دلوں کے ماحول پر جمع ہوتی اور بکھرتی ہے

محبت' جھاگ کی صورت

محبت آگ کی صورت

وہ شام کی تیاری کرنے لگی۔

X...X...X

ولید اپنے آفس سے فدا حسین کو رخصت کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ نومی اندر داخل ہوا۔اس کے تیور بگڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سے جھگڑ کر آیا ہو اور اب محض ولید کے سامنے ضبط کرنے پر مجبور ہو۔

"آؤ نومی! خیریت آج ادھر کا رخ کیسے کر لیا۔" وہ اسے دیکھ کر خوشدلی سے بولا اور اپنی کرسی پر بیٹھنے کی بجائے اس کی طرف ہی آ گیا۔

"ولید بھائی! آپ سکندر بھائی کو سمجھائیں کہ وہ میری راہ میں نہ آیا کریں۔" اپنی ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے وہ اکھڑ پن سے بولا۔

ولید نے چونک کر اسے بغور دیکھا۔

"ادھر آ کر بیٹھو۔کیا ہو گیا۔" اس نے نرمی سے کہتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا مگر وہ یونہی کھڑا رہا۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا مگر اب ہو سکتا ہے۔"

"ادھر آ کر بیٹھو۔کھڑے کھڑے یا تو حکم صادر کیے جا سکتے ہیں یا پھر فیصلے۔تفصیل سے کسی مسئلے پر کم از کم بات نہیں ہو سکتی۔" ولید کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔اس نے کرسی پر ہاتھ رکھ کر وہ اسے پیچھے دھکیلا اور اس پر دھپ سے بیٹھ گیا۔جیسے ناچار بیٹھنا پڑ رہا ہو۔

ولید بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ہاں اب کہو۔کیا سکندر سے جھگڑا کر کے آئے ہو۔"

"آپ انہیں بس اتنا سمجھا لیں کہ وہ بڑے ہیں اور ضرور ہوں گے مگر ہر وقت اپنا بڑا پن دکھانے کی کوشش نہ کریں۔میں ان کا لحاظ ایک حد تک کر سکتا ہوں وہ میرے ہر معاملے میں انٹرفیئر کرتے رہتے ہیں جو میری برداشت سے باہر ہے جبکہ میں ان کے..."

"ایک منٹ۔"اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے بلکہ زہر اگلنے سے روک دیا اور سخت متاسفانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس کے چہرے پر ایسا کھردرا پن تھا اور لہجے میں اتنی کڑواہٹ جیسے وہ اپنے بڑے بھائی کی نہیں کسی دشمن کی بابت بات کر رہا ہوں۔

”تم نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے نومی! وہ تباہی کی طرف جاتا ہے اور تباہی کے راستے سے بھائی تو کیا تمہارا دوست بھی تمہیں روکنے پر حق بجانب ہو گا۔“

”کیا، کیا غلط راستے کا انتخاب کیا ہے میں نے۔“ وہ بھڑک کر کھڑا ہو گا۔ ”پیسہ کمانا کیا بری بات ہے۔“ ولید نے سر سے پیر تک اسے دیکھا اور سر نفی میں ہلایا۔

”تو بس میں بھی پیسہ کما رہا ہوں۔ آپ بزنس کرتے ہیں۔ سکندر بھائی صفحے سیاہ کر کے کماتے ہیں اور میں۔“ وہ ایک پل رکا۔

”اور... اور تم...“ ولید کرسی دھکیل کر اٹھ کر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

اس کے چہرے پر سرخی جھلکی اور نگاہیں جوتوں پر جم گئیں۔

”یہاں ہزاروں لوگ ہیں جو سفید کو سیاہ کرتے ہیں ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ بڑے بڑے کرپٹ سیاستدان عزت مآب کہلائے جا رہے ہیں، کرپٹ عیاش بیوروکریٹس اعلیٰ حضرات ہیں۔ عزت اور تکریم کی جاتی ہے ان کی اور ایک ہم چھوٹے لوگ جب کمانے نکلتے ہیں۔ اک ذرا سی چوری سے عزت اور وقار پر حرف آنے لگتا ہے۔ ہمیں ہی برا بھلا کہا جاتا ہے ڈرایا جاتا ہے۔“

وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ولید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں یہی المیہ ہے اس لیے تمہیں میں اور سکندر سمجھا رہے ہیں کہ تم کبھی بھی بڑے کرپٹ نہ بن سکو گے، ہمیشہ چھوٹے کرپٹ رہو گے اور چھوٹے چوروں کی جگہ نہ اسمبلی ہے نہ محل نہ پیلس بلکہ ان کی جگہ جیل ہوتی ہے۔ تم جس پارٹی میں شامل ہو جانتے ہو اس میں تمہاری کیا حیثیت ہے محض کیڑے کی۔“

” میں کسی پارٹی وارٹی میں نہیں ہوں۔“ وہ نگاہیں کترا کر اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک کر دور ہٹ گیا اور کرسی کی پشت پر ہاتھ جما کر بولا۔

”پیسہ ہو تو جیل بھی محل بن جاتے ہیں ولید بھائی! ہم نے تو یہی دیکھا ہے۔ نہ اختیار نہ وقار نہ عزت کام آتی ہے۔ کام آتی ہے تو دولت، پیسہ ہو تو آپ کو کلاس میں اے کلاس کی مراعات مل سکتی ہیں۔“

”ہاں اگر پیسہ ہو تو۔“ ولید نے جیسے اس کی بات کی تائید کی پھر ہلکے سے ہنسا۔

”کتنا پیسہ بنا لو گے تم ایک ادنیٰ سے کارکن بن کر؟ نہیں نومی! جو خواب تم دیکھ رہے ہو وہ اس طرح پورے نہیں ہوتے۔ یہ جو مراعات کی باتیں کر رہے ہو نا تم یہ چند ہزار سے نہیں

ملتیں۔یہ کروڑوں سے ملتی ہیں۔تم دس بیس پچاس ہزار کے نوٹ پر خوش ہو کر سمجھ رہے ہو کہ تم جہان کو اپنے قدموں پر جھکا لو گے ہاں تمہاری آئندہ نسل ضرور یہ مراعات پالے گی۔ مگر تم کبھی بھی بڑے کرپٹ نہیں بن سکو گے۔کہ بہر حال اس کے لیے بھی مدت درکار ہے۔"

اس کے چہرے پر خفت کے رنگ بکھر گئے۔وہ ہونٹ بھینچ کر کرسی جھلانے لگا اور بے پرواہی سے بولا۔

"بہر حال، یہ میرا ہیڈک ہے، میں جن راستوں پر چل رہا ہوں اس پر مطمئن ہوں تو دوسروں کو قطعی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میری راہ میں خواہ مخواہ آئیں۔"

"سکندر تمہارا بھائی ہے وہ مکمل حق رکھتا ہے، سرپرست ہے۔تم اس کی محبتوں اور شفقتوں کو فراموش نہیں کر سکتے۔" ولید نے ترش نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں محبت۔"اس نے کرسی جھلانا بند کر دی اور ولید کی طرف دیکھا اس لمحے اس کی نگاہوں میں تمسخرانہ ہنسی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میں نے نہیں مانگی تھیں ان سے محبتیں، میں بنا محبت کے بھی پروان چڑھ سکتا تھا کیا ضرورت تھی انہیں اتنی توجہ دینے کی، جان فشانی کی۔بہر حال وہ اب اپنی تمام تر محبتوں کا حق وصول کرنا چاہتے ہیں مجھ سے۔"

"شٹ اپ نومی شٹ اپ۔" اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اس کی خوبصورت آنکھوں میں غصے کے ساتھ تاسف اور دکھ اتر آیا۔

وہ اس حد تک بدلحاظ اور بے مروت بھی ہو سکتا تھا۔وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"بولنے دو ولید اسے مت روکو۔جب جنم دینے والی عورت کا اسے پاس نہیں ہے تو بھائی کی اس کی نظر میں کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔"

سکندر اندر داخل ہوا تھا۔وہ بہت دیر سے کھڑا تھا۔ہاتھ میں پکڑے کاغذات کا رول اس نے ٹیبل پر پٹخا اس کے چہرے پر یاسیت بکھری ہوئی تھی۔

مضمحل قدموں سے چلتا ہوا وہ دیوار سے لگے صوفے پر گرسا گیا اور بالوں میں ہاتھ پھنسا کر قالین کو گھورنے لگا۔

ایک تکلیف دہ رنگ اس کے چہرے پر بکھرا ہوا تھا۔

وہ ضبط اور دکھ کے جس مرحلے سے گزر رہا تھا اس کا احساس ولید کو شدت سے ہوا۔ اس نے متاسفانہ نگاہوں سے نومی کی طرف دیکھا پھر سمجھانے والے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”نومی! اب بھی وقت ہے تم آگے نہیں گئے۔ پلٹ سکتے ہو یاد رکھو نومی کہ قسمت لکھی جا چکی ہے۔ رزق ہر شخص کا لکھا ہوا ہے اتنا ہی ملے گا جتنا مقدر میں ہے۔ اب چاہے ہم جائز راستے سے حاصل کریں یا ناجائز راستہ اختیار کریں ملے گا اتنا ہی۔“

”میں نہیں مانتا اس فلسفے کو۔“ اس پر جیسے مطلق اثر نہ ہوا تھا۔

سکندر کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ تاہم وہ بولا کچھ نہیں یا شاید اس کے پاس اب بولنے کو کچھ رہا ہی نہیں تھا۔

”تمہارے نہ ماننے سے قرآن کا لکھا بدل نہیں سکتا۔ زندگی کی حقیقت یہی رہے گی۔“ ولید کے انداز میں سرزنش تھی۔ وہ تحقیرانہ انداز میں مسکرانے لگا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”آپ ایسے ہر فلسفے پر یقین لا سکتے ہیں اس لیے کہ آپ دولت کے انبار پر بیٹھے ہیں، مطمئن اور شاد ہیں۔ ہر خواہش لبوں سے نکلتے ہی پوری ہو سکتی ہے۔ سو لمبے لمبے لیکچر بھی دے سکتے ہیں۔“ اس کی مسکراہٹ میں زہر اتر آیا۔

ولید ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ اکثر یوں ہوتا ہے جب کوئی خلوص دل سے کسی کو سمجھانا چاہ رہا ہو تو اسے ایسی ہی باتیں سننے کو ملتی ہیں اور ایسی ہی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

وہ بھی ولید حسن کو تنفر اور حقارت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ولید کے خیال میں اب سمجھانا عبث تھا۔ وہ مکمل طور پر باغی دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے ماحول سے متنفر، کبیدہ۔ تاہم وہ اس کی بات پر اذیت محسوس کر کے دھیرے سے بولا۔

”یہ تمہارا خیال ہے کہ دولت سے ہر طرح کی طمانیت اور آسودگی نصیب ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تمہیں یہاں صرف ایک فیصد آبادی مطمئن اور ہنستی مسکراتی نظر آتی۔ باقی سڑکوں پر ہوٹلوں، اسکولوں اور کالجوں میں روتے بسورتے چہرے ہی نظر آتے۔ تم کیا جانتے ہو میرے بارے میں؟“ اس نے یکدم نومی کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں گاڑ دیں۔ لحظہ بھر

نومی جز بز ہو کر رہ گیا۔ سکندر نے بھی چونک کر اسے دیکھا تو پہلی بار اس کے چہرے کی بشاشت اور شگفتگی میں نامانوس سے دکھ کا عکس ابھرا تھا۔

وہ ہونٹ بھینچے نومی کو تک رہا تھا پھر ہلکے سے سانس خارج کی۔

"ہر دل کے اندر ناآسودگی، دکھ، اذیتیں رقم ہیں نومی! ہر شخص اپنی کسی نہ کسی محرومی کا کرب سمیٹے ہوئے ہے تم پیسے کی محرومی کو رو رہے ہو۔ یہ تو تم اپنے توانا اور جوان بازوئوں سے حاصل کر سکتے ہو۔ مگر کچھ ایسی محرومیاں بھی ہوتی ہیں کچھ ایسے دکھ بھی ہوتے جن کا ازالہ ناممکن ہوتا ہے۔ جو کانٹے کی طرح تاعمر آپ کو چبھن دیتے رہتے ہیں۔

کچھ ناآسودگیاں گاڑیوں میں گھومتے ہوئے بھی، بڑے بڑے محلوں اور بنگلوں میں رہتے ہوئے بھی کاٹتی اور چھیدتی رہتی ہیں۔ بہر حال ہنسی اور سکھ صرف ڈھیر ساری دولت میں ہی پنہاں نہیں ہے۔" اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر جیسے تاثرات کو جھٹکا تھا۔ کسی اذیت کو ٹالا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"یاد رکھو نومی! یہ راہ پھانسی کے تختے تک جاتی ہے، کتنے تمہارے جیسے بڑے بننے کی خواہش میں ریت بن کر پیروں کی دھول بن گئے ہیں، یہاں تو بڑا بھی مرتا ہے تو لوگ بھول جاتے ہیں۔"

"میں دوسروں کے لیے نہیں اپنے لیے جینا چاہتا ہوں، مجھے اس سے سروکار نہیں ہے کہ کوئی مجھے یاد رکھتا ہے یا نہیں۔ بلکہ زندہ ہوں تب بھی مجھے کم توجہ ہی قبول ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے سکندر کی طرف بدتمیزی سے دیکھا تھا۔

ولید کا دل چاہا اس کے منہ پر ایسا تھپڑ مارے کہ وہ الٹ کر میز کے دوسری طرف جا کر گرے۔

شاید اس کا ہاتھ اٹھ بھی جاتا اگر سکندر درمیان میں نہ آجاتا۔

"تم جائو نومی! آج کے بعد کوئی تمہاری راہ میں نہیں آئے گا۔ تمہیں کوئی سیدھا راستہ دکھانے کی غلطی نہیں کرے گا۔" اس کا لہجہ مغموم تھا۔ نومی نے توجہ ہی نہیں دی بلکہ کسی حد تک ممنونیت سے اسے دیکھا اور سر کو جنبش دے کر بولا۔

"نوازش، کرم، مہربانی اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ یقین کریں میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے بس اس عزت کو قائم رہنے دیجیئے خدا حافظ۔" وہ مسکراتی نگاہ سکندر پر ڈال کر سرعت سے آفس سے نکل گیا۔ ولید نے رنج وغصے سے ایڑیوں کے بل پلٹ کر نومی کو جاتا دیکھا پھر سکندر کو دیکھنے لگا۔

نومی اس حد تک بداخلاق، بدلحاظ ہو چکا تھا اس کے تو گمان میں بھی نہیں تھا۔

"جب سیلاب کا زور ہو تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس کے راستے میں ہر آنے والا طاقتور درخت بھی اکھڑ جاتا ہے، ہماری نصیحتیں اور سمجھانے کا اثر تو اس سیلاب کے سامنے ننھے پودے کی مانند ہے ولید!" سکندر کی آواز آزردگی اور دل گرفتگی کے باعث بے حد دھیمی تھی۔ پھر وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔

وہ دونوں ہی خاموش ہو کر بس ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے بہر حال یہ خامشی بہت ہی اذیت ناک تھی۔

X...X...X

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ولید حسن کی طرف سے مسلسل خامشی نے آمنہ علی کو بے حد مایوس کیا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ اپنی حرکت پر نادم ہو کر اس سے ایکسکیوز کرنے ضرور آئے گا۔ مگر اس کی طرف کی خامشی نے اسے بدمزہ اور کسی حد تک تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ وہ سوچتی اور کڑیاں ملاتی تو اسے لگتا کہ ولید اس سے غیر محسوس طور پر دور ہوتا جا رہا ہے یا پھر وہ کبھی خود سے اتنا قریب آیا ہی نہیں تھا وہی اس کی طرف بڑھتی رہی تھی۔

مگر۔

اس کے بڑھتے قدموں کو اس نے کبھی روکا بھی تو نہیں تھا یہ ایک نقطہ بہر حال اس کی مایوسی اور یاسیت زدہ سوچوں میں روشنی بن کر اترتا تھا۔

اس نے خود سے کئی بار رابطہ کرنے کا سوچا مگر اس کی فطری رعونت اور غرور آڑے آجاتا۔ اس کی تربیت کچھ اس ڈھنگ سے ہوئی تھی کہ اس کے اندر لچک ذرا کم ہی تھی۔ وہ فطرتاً حاسد اور خود غرض قسم کی

لڑکی تھی اور کسی حد تک خود پسندی میں مبتلا۔

اس کا خیال تھا کہ اگر وہ ولید حسن کی طرف مائل ہے تو صرف اس لیے کہ ایک تو وہ اس کے اسٹیٹس سے میل کھاتا تھا۔ دوسرا وہ خود بھی اسے توجہ دیتا تھا اور ایک آئیڈیل قسم کے شخص کا اس کی طرف ملتفت ہونا بھی کچھ کم غرور کی بات نہیں تھی۔

وہ مسلسل ولید کی خاموشی سے کچھ اُکتا کر گاؤں چلی آئی۔ یوں بھی اماں اسے حویلی بلا رہی تھیں۔ توقیر شاہ کی شادی طے پا گئی تھی۔ اماں اور عابدہ کا کہنا تھا کہ اب حویلی میں رونقیں لگنی چاہئیں۔ آخر مردان علی شاہ کے بیٹے کی شادی ہو گی۔ کسی کمی کمین کی تو نہیں نا۔

حویلی کی نئے سرے سے تزئین و آرائش جاری تھی۔ دل کھول کر پیسہ خرچ کیا جا رہا تھا۔ لمبی لمبی فہرستیں تیار ہو رہی تھی۔ میراثنوں کو بلا کر اماں روز گیت سنگیت کی محفلیں لگاتی تھیں۔

''چلو تمہیں بھی ہماری یاد تو آئی۔'' توقیر شاہ اس کے پاس لائونج میں آکر بیٹھا تو وہ مسکرا دی۔

''اداسائیں! آپ پرائے جو ہو رہے ہیں۔ سوچا اب جو دن ہیں آپ کے ساتھ گزار لوں۔''

اس کا انداز شرارتی تھا۔ توقیر شاہ اپنا بھاری قہقہہ نہ روک سکا۔ پھر یکلخت سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''ہوں۔ شہر میں سب حالات کیسے ہیں، میرا مطلب ہے تمہاری پڑھائی وغیرہ اور دوسری ایکٹیوٹیز۔''

''ایک دم فائن۔'' اس نے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا۔

''ہوں۔ ولید حسن سے ملاقات ہوتی ہے؟'' وہ ایک ہنکارا بھر کر پوچھنے لگا۔ اس نے ریموٹ سے کھیلتے ہوئے سر ہلا دیا۔

''ہاں مگر کئی دنوں سے ہوئی نہیں، اب آپ کی شادی کی خبر دوں گی تو اسے آنے پر اصرار کروں گی۔'' وہ پر خیال لہجے میں بولی۔

توقیر شاہ کے لب ایک لمحے کو سکڑے پھر ذرا سا پھیل گئے۔ اس نے کندھے پر پڑی چادر کا ڈھلکتا کونا کندھے پر ڈالا اور اس کے ہاتھوں میں حرکت کرتے ریموٹ پر نظریں ٹکاتے ہوئے بولا۔

''گوٹھ تو وہ تین بار آچکا ہے۔''

''وہاٹ؟'' وہ اچھلی اور پورا رخ دائیں طرف کر دیا۔

"وہ حویلی آچکا ہے تین بار، کمال ہے اور مجھے پتہ تک نہیں چلا۔ کب آیا وہ اتنی بار؟"

توقیر شاہ نے ایک ہنکارا ابھرا اور اندر داخل ہوتے مردان علی شاہ کو دیکھا۔

"اس نے مجھے بتایا تک نہیں۔" وہ ابھی تک حیران تھی پھر مسکرانے لگی۔

"بتایا تو اس نے ہمیں بھی نہیں مگر حیرت ہے تمہارے علم میں بھی نہیں ہے۔"

مردان شاہ کی آواز ہلکی تھی مگر کچھ عجیب سی سر سراتی محسوس ہوئی، اس کا سر حیرت سے اٹھا ہوا رہ گیا۔ تب توقیر شاہ بولا۔

"وہ حویلی نہیں آیا، گوٹھ میں آیا تھا، دوبارا سے میں نے خود دیکھا اور ایک بار میرے آدمیوں نے۔ مجھے تو بس وہ شہر جاتی سڑک پر ہی اپنی گاڑی میں دکھائی دیا البتہ میرے آدمیوں کو وہ فدا حسین کی کوٹھی سے نکلتا دکھائی دیا تھا۔" یہ کہہ کر توقیر شاہ نے آمنہ علی کو دیکھا جس کا چہرہ اس خبر کے ساتھ باپ اور بھائی کے لہجوں اور انداز پر بھی متعجب سا ہو گیا تھا۔

یہ جھٹکا ہی تھا جو اسے لگا تھا، کئی لمحے خاموشی طاری رہی پھر وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔

"کچھ عجیب سی بات ہے یہ تو بابا سائیں!"

"چلو چھوڑو۔ یہ بتاؤ اب تمہارے کیا ارادے ہیں۔"

مردان علی شاہ نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے بیٹی کو دیکھا۔ وہ استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"بھئی شادی وادی کا پوچھ رہے ہیں۔" توقیر شاہ نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھیں پھیلا دیں اور مردان شاہ کو دیکھا۔

"کیا مطلب، یہ اداسائیں کی شادی کے ساتھ میری شادی کا ذکر کہاں سے نکل آیا۔"

"اصولاً تو تمہارا ہی پہلے نکلنا چاہیے تھا خیر میں چاہتا ہوں توقیر کی شادی کے ساتھ تمہارا معاملہ بھی سیٹ ہو جائے منگنی ہی سہی، ولید حسن سے اس سلسلے میں بات ہوئی تمہاری کوئی۔"

وہ بڑی سنجیدگی سے اس موضوع کو لے آئے۔ اس نے قریب رکھا ریموٹ اٹھا کر دوبارہ اسے ہاتھوں میں حرکت دیتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا۔

"نہیں ابھی تک تو نہیں ہوئی۔"

"تو کرو نا بابا! کیا عمر ساری اسی طرح گزار دینی ہے۔" توقیر شاہ بولا۔ اس نے ایک سانس بھری مگر بولی کچھ نہیں۔

"تم اس سے کہو کہ مردان علی شاہ اس کے پیرنٹس سے ملنا چاہتے ہیں۔ اب اس دوستی کو مضبوط ہونا چاہیے۔ یوں ہے کہ میں اس لڑکے کو کھونا نہیں چاہتا۔"

مردان شاہ صوفے سے اٹھ کر ٹہلنے لگے پھر رک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ "اس سے کنٹیکٹ کرو۔ میں اس ہفتے اسلام آباد جا رہا ہوں، کراچی میں بھی دو دن رہنا ہو گا۔ ان دو دونوں میں اس کے پرنٹس سے مل لینا چاہتا ہوں۔"

ان کا انداز و لہجہ حکمیہ تھا اور اس سلسلے میں وہ خاصے بیتاب نظر آ رہے تھے۔

آمنہ نے سر ہلا دیا۔

"ہوں، میں کرتی ہوں اس سے کنٹیکٹ۔" اس نے ریموٹ سے پھر ٹی وی کھول کر نگاہیں اسکرین پر جما دی۔ مگر ذہن ان تھرکتی تصویروں کی بجائے ولید حسن کی طرف ہی لگا رہا۔

وہ تین بار گائوں آ چکا تھا یہ بات کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹک رہی تھی۔

ماسٹر دین محمد کے گھر رات ٹھہرنا اور پھر اس سے دریافت کرنے پر برہم ہو کر چلے جانا اس کے ذہن پر مسلسل ضربیں لگانے لگا۔

اسے یکدم ہی ولید حسن کوئی پر اسرار کہانی کا کردار محسوس ہونے لگا۔

اس نے بے دلی سے ٹی وی سے نگاہیں ہٹا لیں اور اٹھ کر لائونج سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

X...X...X

کس نام سے پکاروں

کیا نام ہے تمہارا

کیوں تم کو دیکھتے ہی

دل کھو گیا ہمارا

کس نام سے پکاروں

''غالباً اس کا نام... بلکہ یقیناً اس کا نام ''ولید حسن'' ہے۔''

مونا بھابی کی مداخلت پر اپنی وارڈروب کے ہنڈل پر دوپٹہ لٹکاتے ہوئے شہرینہ کی گنگناہٹ یوں بند ہو گئی۔ جیسے کسی نے گلوکار کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ اس کے اس طرح جھینپ کر چپ ہو جانے پر مونا بھابی کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

''نہیں، نہیں گائیو گائیو۔ بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ میں تو صرف نام بتا رہی تھی۔'' وہ اس کے بیڈ پر آرام سے چڑھ کر بیٹھ گئیں۔

''دراصل صبح سے صغریٰ یہ ہی گانا گائے جا رہی تھی سو میرے بھی منہ میں رہ گیا۔''

وہ اپنی ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر اپنے گھنے سنہری بالوں کے دو حصے کر کے آگے کرتے ہوئے وضاحت کرنے لگی پھر بیڈ کے کنارے ہی بیٹھ کر ان پر برش پھیرنے لگی۔

''بے چاری صغریٰ کے ناتواں کندھے پر بندوق کیوں رکھ رہی ہو میں تمہیں گنگنانے پر منع تھوڑا ہی کر رہی ہوں۔ بلکہ میرا تو خود آج گنگنانے کو دل چاہ رہا ہے۔'' بھابی کھلکھلا کر ہنس دیں پھر تکیہ گود میں دبوچ کر اس کے قریب کھسک آئیں اور اس کی سمت ذرا سا جھکیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''گائیو۔''

''جیسے آپ ہمیشہ مجھ سے پوچھ کر ہی تو گاتی رہی ہیں۔'' اس نے اپنی شرمیلی ہنسی چھپانے کے لیے رخ موڑ لیا۔ بھابی اس کے بالوں کی ریشمی لٹ اپنی انگلی میں لپیٹنے لگیں۔

''آج تم سے پوچھ کر گانے کو دل کر رہا ہے۔''

اس نے جواباً انہیں گھور کر دیکھا تو وہ ہونٹ دباتے ہوئے مسکراہٹ روک رہی تھیں پھر اس کی لٹ کو کھینچا اور اس کی سنہری آنکھوں میں جھانک کر گنگنانے لگیں۔

ان کی نظروں سے محبت کا جو پیغام ملا

دل یہ سمجھا کہ چھلکتا ہوا ایک جام ملا

بھابی کی آنکھوں میں کچھ ایسا تاثر تھا اور معنی خیزی کہ اس کا دل بے ہنگم ہو کر دھڑک کر اسے ہراساں کر گیا۔ اس نے ان سے بال چھڑائے اور نگاہوں کا رخ پھیر لیا۔

زندگی ڈوب گئی ان کی حسین آنکھوں میں

یہ میرے پیار کے افسانے کو انجام ملا

ان کی نظروں

"کیا مشکل ہے آپ کو، یہ گانا وسیم بھائی کو ہی جا کر سنائیے نا۔" وہ اُٹھنے لگی مگر بھابی نے اس کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔

"ان کو تو روز ہی سناتی ہوں آج تمہیں سنانے کو دل چاہ رہا ہے۔"

اس نے گہری سانس بھر کر بھابی کو یوں دیکھا جیسے ان کی عقل پر رحم کر رہی ہو مگر وہ اپنی ترنگ میں رہیں۔

غم کی راہوں میں بھٹکتی تھی ہواؤں کی طرح

ان کی بانہوں...

اس نے سٹپٹا کر جلدی سے بھابی کے منہ پر ہاتھ رکھا تھا مارے شرم کے اس کا چہرہ لال ہو گیا اس نے سخت تنبیہی نظروں سے انہیں گھورا۔

"کس قدر بیہودہ ہو گئی ہیں آپ۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

بھابی نے اس کا شرم سے گلنار چہرہ دیکھ کہ قہقہہ لگایا پھر اس کا یہی ہاتھ پکڑ کر ہنستے ہوئے اسے زور سے کھینچ کر اپنے پاس گرا لیا۔

"پوچھوں گی تم سے بھی پھر۔"

"جی نہیں۔ آپ کی طرح نہیں ہوں میں۔" وہ ان کا مطلب سمجھ کر احتجاجاً بولی اور ان کی گرفت سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"ارے جاؤ دیکھتے ہیں... اچھا سنو۔" انہوں نے تکیہ ایک طرف پھینکا اور پورا رخ اس کی طرف کر کے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اس روز ولید تمہیں کھینچ کھانچ کر کہاں لے کر جا رہا تھا شیری!" انہوں نے اس کی شہد رنگ آنکھوں میں جھانک کر حملہ کیا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ رگوں میں مچلتا سارا کا سارا خون یکلخت رخساروں پر سمٹ آیا۔

اس نے بس ایک نظر بھابی پر ڈالی اور سر جھکا دیا۔

"کب... کب کی بات کر رہی ہیں۔" اور رخ موڑ کر برش سے ٹوٹے بال نکال کر لپیٹنے لگی۔

"اوئے ہوئے، کب... جب چاند عین چیت کا تھا۔ دلوں میں دیپ جل رہے تھے۔ ادھر دیکھو میری طرف۔" بھابی نے ہاتھ سے اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف کیا تو ایک شرمگیں مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آکر ٹھہر گئی۔

"آپ کیا Expect کر رہی ہیں کہ وہ مجھے کہاں لے جا سکتے ہیں۔"

"آہا۔ میری Expectations خاصی اوپر جا سکتی ہیں۔" بھابی نے کچھ اس انداز سے سانس بھری کہ وہ ہنس پڑی۔

"مثلاً۔"

"دھنک کے اس پار' ندیا کنارے، نیلے امبر پر بادلوں کے بیچ۔"

"کیا وسیم بھائی کے ساتھ آپ ان جگہوں پر جا چکی ہیں۔" وہ ہنسی روک کر پوچھنے لگی تو بھابی نے اسے گھور کر دیکھا پھر اس کے ہاتھ سے برش لے کر اسے ایک جڑ دیا۔

"تمہارے بھائی تو سڑو قسم کے انسان تھے، انہوں نے کب میرے نازک جذبوں سے پر دل پر ایسا کوئی احسان کیا تھا۔ پتھر فٹ کرا کر آتے تھے۔ جب بھی سامنے آتے۔ آہا۔ حسرت ہی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

رہ گئی۔" وہ ایک طویل قسم کی متاسفانہ اور قدرے حسرت بھری سانس بھرنے لگیں پھر سنبھل کر بولیں۔

"مگر ولید تو کم از کم وسیم جیسا نہیں لگتا۔ سچ سچ بتائو، کہاں گئے تھے میں اتنے دنوں سے انتظار کر رہی تھی کہ تم خود بتائو گی۔ وہ تو خیر سے پکا گھنا ہے مگر تمہیں بھی اس کا رنگ چڑھنے لگا۔"

"آپ تو یوں کہہ رہی ہیں۔ جیسے ہم ہنی مون منانے چلے گئے ہوں۔" وہ بال سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"اوئے ہوئے۔ ہنی مون... یہ آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔"

"اف۔" وہ جھینپ کر رخ بدلنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ بے ساختہ بات نے خفت زدہ کر کے رکھ دیا تھا۔

(کیا ہو گیا ہے بھابی کو آج) وہ وارڈروب کھول کر نچلی دراز سے تولیہ نکالنے لگی۔

"اس روز تمہارا برتھ ڈے تھا ناشیری! میری عقل دیکھو کیسی پرواز کر گئی تھی۔ مجھے تو دوسرے دن خیال آیا اور ولید دیکھو کیسا چالاک ہے۔ بہانے سے تمہیں نکال لے گیا۔ آغا جی کو بھی چکما دے گیا۔ وہ بے چارے چائے پر انتظار ہی کرتے رہ گئے۔"

بھابی نے تکیہ ایک طرف ڈال کر اس کی طرف کروٹ لی۔ "ادھر منہ کرو گھنی۔ کچھ گفٹ وفٹ تو دیا ہو گا۔"

وہ تولیہ نکال کر وارڈروب بند کرنے کے بجائے بے مقصد کپڑوں کو اِدھر اُدھر کرنے لگی۔ بھابی کی نگاہوں سے نظریں ملانے کا یارانہ تھا۔

وہ خوبصورت لمحے تو آن واحد میں تتلی بن کر بس رنگ چھوڑ گئے تھے۔ اس نے گلے میں جھولتے دل نما پینڈینٹ کو دیکھا۔

رنگ مگر مہکتے ہوئے تھے

البیلے

چمکتے اور بڑے نشیلے تھے

ایک لحظہ آنکھیں موند کر اس نے ان خوبصورت لمحات کا تصور کیا تو جیسے اندر تک مہک ہی مہک اتر گئی۔

مگر یہ لمحات امر کیوں نہیں ہو جاتے؟ ٹھہر کیوں نہیں جاتے اس کی بے کیف زندگی میں، وہ کھو جانا چاہتی تھی، ان رنگوں میں ہمیشہ کے لیے۔ رنگوں کے اس سمندر میں ڈوب جانا چاہتی تھی کبھی نہ ابھرنے کے لیے۔

ساحل اس کی منزل نہیں تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی موجوں کا یہ لمس تو تشنگی بڑھا ہی جاتا تھا۔

ان کی نظروں سے محبت کا جو پیغام ملا

دل یہ سمجھا کہ چھلکتا ہوا اک جام ملا

بھابی اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اس کے چہرے پر جھکیں تو وہ خوبصورت تصورات سے نکل کر چہرہ اونچا کر کے انہیں دیکھنے لگی پھر وارڈروب بند کر کے کھڑی ہو گئی۔

"مجھے لگتا ہے آج آپ کچھ پی کر آئی ہیں۔"

"شیری! تم دو تین دن سے اتنی زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔ یہ کسی کا اعجاز ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"آپ کو فضول بد تمیزیاں سوجھ رہی ہیں۔ یہ بتائیے میرے ساتھ بازار جانا ہے یا نہیں۔ نومی کی منگنی عنقریب ہونے والی ہے۔ تانیہ کو بھی پک کر لیں گے ساتھ۔"

وہ بھابی کی مسکراتی نظروں کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی بلکہ آئینے کے سامنے سے بھی ہٹ گئی تھی کہ مبادا اس کے چہرے کے بدلتے رنگ ان کو دکھائی نہ دے جائیں۔

بھابی اس کی پشت پر پھیلے بالوں کے آبشار کو دیکھنے لگیں۔ یکدم ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ دروازے کے پاس سے گزرتے ولید پر ان کی نگاہ گئی تو وہ فوراً اسے پکار بیٹھیں۔

"ولید! بات سننا۔"

ولید کے نام پر وہ سٹپٹا کر پلٹی تھی۔

"جی فرمایئے۔" وہ تیزی سے کوریڈور سے گزرتا ہوا ٹھٹکا اور کمرے کے دروازے کے فریم پر دائیں بائیں ہاتھ جما کر اندر جھانکا۔

پہلی نگاہ سامنے بھابی پر ہی گئی مگر دوسری نگاہ دائیں طرف گئی اور ذرا سی دیر جم گئی۔

سنہری بالوں کا آبشار جو اس کے پلٹنے پر لہرا کے آگے بکھر آیا تھا اور اس کے درمیان اس کا چہرہ گلاب کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

وہ کبھی وسیم بھائی کے سامنے بھی یوں کھلے بالوں اور بنا دوپٹے نہ آئی تھی۔ ولید کو کمرے کے اندر قدم رکھتے دیکھ کر جیسے چونکی اور جلدی سے وارڈروب کے ہنڈل پر اپنا لٹکا ہوا دوپٹہ کھینچ لیا۔

"کہاں ہوتے ہو آج کل؟ دکھائی ہی نہیں دیتے۔" بھابی اس سے مخاطب تھیں۔ وہ اندر آگیا۔ ذرا سا چونک کر بھابی کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ کی معنی خیزیت کو محسوس کر لیا۔

"یہ شکوہ خالص آپ کا ہے یا کسی کے لیے محض اپنا کندھا پیش کر رہی ہیں۔" وہ چوکنے والا نہیں تھا۔

بھابی بے ساختہ امڈنے والی ہنسی کو نہ روک پائیں۔ جبکہ وہ جز بز ہو کر رہ گئی اور رخ موڑ کر بلا ضرورت ڈریسنگ کی شفاف سطح پر موجود چیزوں کو اِدھر اُدھر کرنے لگی۔ اس کا خیال تھا بھابی

بھی اپنے جملے کی وضاحت میں ضرور بولیں گی مگر وہ تو اسے اور ہراساں کر گئیں۔ ولید سے کہنے لگیں۔

"تمہیں خبر ہوئی شہرینہ کی برتھ ڈے آکر گزر بھی گئی۔"

وہ ہولے سے ہنس دیا۔ اب اتنا سادہ لوح یا کم سن نہیں تھا کہ بھابی کی کچھ اگلوانے والی اس کوشش کو نہ سمجھ پاتا۔ ایک اچٹتی سی نظر اس نے شفاف آئینے پر ڈالی، جہاں اس کا جھکا ہوا مگر تپا تپا گلابی چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

"آپ کو افسوس اس کی برتھ ڈے گزر جانے پر ہو رہا ہے یا میری بے خبری پر۔" وہ دروازے سے لگ کر سینے پر بازو لپیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ بھابی اس روز کے تمام واقعات سے لاعلم ہیں۔ سو وہ ان کے تجسس کو ہوا دینے لگا۔

اور ایسا ہی ہوا، ان کے چہرے پر بے چینی سمٹ آئی۔ "ظاہر ہے۔ افسوس تمہاری بے خبری پر ہی ہو سکتا ہے۔"

"چچ... چچ۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ شیری تم ہی مجھے مطلع کر دیتیں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر شہرینہ کو دیکھنے لگا۔ بھابی سے مزید ضبط نہ ہو سکا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

"تم دونوں مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔"

"ظاہر ہے جو کام وسیم بخوبی کر چکا ہے، ہم اس پر اب محنت کیا صرف کریں۔" اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ شہرینہ کو بڑے زور کی ہنسی آ گئی۔ اس نے رخ موڑ کر بھابی کو دیکھا اور کچھ کہنا چاہا مگر بھابی اس کی طرف دیکھ کہاں رہی تھیں۔ ولید ہی سے مخاطب تھیں۔

"تم نے شہرینہ کو وش تو کیا ہو گا۔ اتنے بھولے تو نہیں ہو۔"

"بالکل کیا۔" اس نے بغیر حیل وحجت سرزور سے اثبات میں ملایا۔

بھابی کے چہرے کی چمک جیسے لوٹ آئی۔ ادھر شہرینہ کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔ اسے بے طرح شرم آ رہی تھی۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ بھابی ولید سے پوچھ گچھ کرنے لگیں گی۔ وہ تو یونہی انہیں چھیڑ رہی تھی پھر انہیں بتا دینے کا ارادہ تھا مگر اب معاملہ ہی چوپٹ ہو گیا تھا۔

"آپ کو پتہ تو ہے میری میموری بہت اچھی ہے۔ مجھے ہمیشہ سب کی برتھ ڈے یاد رہتی ہے۔"

"خیر سب کی تو یاد نہیں رہتی۔" بھابی نے جلدی سے اس کی بات رد کی اور مسکراتی نگاہ شہرینہ پر ڈالی، پھر یکدم اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ اس حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ لڑکھڑا کر بھابی سے لگ گئی۔ بال لہرا کر دوپٹے کی قید سے نکل آئے۔

"تم دونوں بہت گھنے ہو۔ ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ یہ بتائو، کیا گفٹ دیا تم نے اسے۔"

کس قدر احمق تھیں وہ کہ ابھی تک ان کی نگاہ شہرینہ کے گلے میں جھولتے ہوئے لاکٹ پر نہیں گئی تھی۔ وہ ہولے سے ہنس دیا اور ایک گہری سانس بھر کر شہرینہ کے چمکتے روشن چہرے کو دیکھا اور دھیرے سے بولا۔

"جتنے اختیارات حاصل تھے اس کی حدود میں رہ کر ہی گفٹ دیا ہے۔" اس کا لب و لہجہ معنی خیز تھا۔ بھابی پتہ نہیں کس مفہوم کے مطابق خاصی محفوظ ہو کر ہنسیں۔

"اوہ ہو۔ بڑے اونچے اڑ رہے ہو، ہمیں کیا پتہ حدود و قیود کیا رکھی ہیں تم نے اور کتنے اختیارات حاصل ہیں تمہیں۔ ہمارے خیال میں تو ابھی تمام تر اختیارات سے محروم ہونا چاہیے تھا۔"

وہ شاید بے اختیاری میں جو کہہ گیا اس پر پچھتا کر رہ گیا تھا۔ بھابی کی بات نے اسے حقیقتاً سٹپٹا کر رکھ دیا۔ وہ بڑی چالاکی سے اسے گھیر کر بات کہاں سے کہاں لے جا رہی تھیں۔

وہ چونک کر سنبھل گیا۔

شہرینہ بھی مارے شرم کے کٹ کر رہ گئی۔ اچھی خاصی شوخ و طرار لڑکی حیا کی پوٹلی بن کر رہ گئی تھی۔ بھابی کے برملا قہقہے پر وہ سر پر ہاتھ پھیرتا انہیں گھور کر رہ گیا۔

"وسیم نے بہت ڈھیل دے رکھی ہے آپ کو۔ اسے مجھے ہی کچھ ورغلانا پڑے گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"میرا خیال ہے آپ کے پاس فراغت کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔ کچھ کام نہیں ہوتا کرنے کو۔ چلیں میرا تولیہ ہی ڈھونڈ دیجئے۔ وارڈروب میں ایک بھی نہیں ہے۔" وہ رعب سے بولا۔

”یہ اس طرح کے کام اسی سے کرائو تم۔ مستقبل قریب میں اسے ہی کرنے ہیں۔“ وہ شہرینہ کی طرف اشارہ کرکے دوبارہ بیڈ پر چڑھ کر بیٹھ گئیں اور کچھ منہ پھلا لیا۔ شہرینہ نے تپ کر انہیں دیکھا۔

”صغریٰ بی بی ہے کہاں؟ ایک تولیہ بھی میرے وارڈروب میں نہیں رہنے دیتی۔ آدھے گھنٹے سے خوار ہو رہا ہوں۔ جا کر صغریٰ کو ہی ڈھونڈ لایئے۔“ اسے یاد آگیا کہ ابھی نہا کر اپنے ضروری کام سے جانا تھا۔

”اسی لیے کہتی ہوں خواری سے بچنے کا آسان نسخہ شادی خانہ آبادی ہے۔“

”مگر اس شادی خانہ آبادی کا وسیم کی زندگی پر تو کوئی خاص اچھا اثر نہیں پڑا۔“ وہ پلٹتے ہوئے بولا، بھابی بھی جھینپ کر ہنس دیں۔

”آپ یہ لے جایئے۔ میں صغریٰ سے کہتی ہوں آپ کے ٹاول آپ کے وارڈروب میں رکھ جائے۔“ شہرینہ نے جلدی سے اپنا نیا نکالا ہوا تولیہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”تھینک یو۔“ ولید نے صاف ستھرا تہہ کیا ہوا ٹاول اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور بھابی کی معنی خیز کھانسی کو نظر انداز کرتا کمرے سے نکل گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کے کمرے سے جاتے ہی شہریانہ نے سر سے دوپٹہ کھینچ کر پھینکا۔ آستینیں چڑھائیں اور بھابی کی طرف بڑھی، بھابی نے اس کے تیور جان کر حفظ ماتقدم کے طور پر جلدی سے تکیہ اٹھا کر اپنے آگے کر لیا اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

”بہت زبان چل رہی تھی، اب بچ کر دکھائیں مجھ سے۔“ وہ بیڈ پر چھلانگ لگا کر آ بیٹھی تو بھابی تکیہ آگے کرکے اس کے چہرے پر جھکیں۔

”شیری! مگر... مگر مجھے پتہ تو چلے اس نے محدود واختیارات کا فائدہ اٹھا کر کیا گفٹ کیا ہے اور کس طرح۔“

”یہ گفٹ کیا ہے یہ اور... اور اس طرح۔“ وہ ان پر مکے برسانے لگی۔ جبکہ بھابی اِدھر اُدھر بھاگ کر اپنا بچائو کرنے لگیں۔

X...X...X

”مجھے ڈر لگتا ہے اکبر شاہ!“ تانیہ نے دونوں بازو لپیٹتے ہوئے میز کی سطح پر ٹکا کر جیسے لحظہ بھر کو آنکھیں موند کر کھولیں۔ ریسٹورنٹ کا خوابناک ماحول اس کے اندر میٹھا خوف بھر رہا تھا۔

”کس سے ڈر لگتا ہے۔“ مینیو کارڈ ویٹر کو پکڑاتے ہوئے اکبر شاہ اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ہلکے سبز رنگ کے سیاہ ایمرائیڈری والے سوٹ میں وہ نکھری بہار کی اولین شام محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے جواں تروتازہ رخسار اس کی نگاہوں کی حدت سے تپ رہے تھے۔

”اپنے آپ سے۔“ وہ دھیرے سے بولی اور اپنے پرس کی گولڈن زنجیر پر انگلی لپیٹنے لگی۔

”میرے ہوتے ہوئے بھی۔“ اس نے جذبوں سے پر لہجے میں کہا اور اپنے گرم ہاتھ سے اس کا یخ بستہ ہاتھ تھام لیا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی تک سنسناہٹ دوڑ گئی۔ پلکیں بوجھل ہو کر رخساروں پر جھک آئیں۔

”تمہارے ہوتے ہوئے ہی تو ڈر لگتا ہے۔ تم قریب آتے تو دل تمناؤں کے سیل شوق میں بہنے لگتا ہے۔ اپنے آپ سے اختیار اٹھنے لگتا ہے اور ساری سوچیں، سارے واہمے ان دیکھی دھند کے غبار میں چھپ جاتے ہیں۔“

وہ اعتراف کر رہی تھی اپنی شکست کا اور اس لمحے وہ انتہائی معصوم اور ایک خوفزدہ پرندہ محسوس ہو رہی تھی جو شکاری کے جال کے پاس کھڑا اسے ملتجیانہ اور مہربان نگاہوں سے تک رہا ہو۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

اس جال میں، میں قید تو از خود ہو رہا ہوں مگر تم مجھے خوش تو رکھو گے نا۔

اس کا دل واقعی کسی چڑیا کی مانند دھڑک رہا تھا۔ جبکہ اکبر شاہ عقاب کی طرح گردن فراز کیے اسے تک رہا تھا۔ اس نے بڑی لاچاری سے اکبر شاہ کو دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کے رخسار دہک اٹھے۔ وہ اسے ہی محبت پاش نظروں سے تک رہا تھا۔

”کبھی نہ ٹوٹنے والا حصار بن جاؤں

وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے“

نگاہوں کے تصادم پر وہ اس کے دل پر بجلیاں گراتا اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتا ہوا بولا تو وہ اس کا چہرہ تکتی رہ گئی پھر ایک گہری سانس بھر کر کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

ریسٹورنٹ کے ماحول سے لے کر اس کے اندر تک ماحول خوابناک ہو گیا تھا۔ باہر سے کہیں زیادہ اندر کا ماحول جگمگا رہا تھا۔

دھیمی دھیمی میوزک اور چینی کے برتنوں کی کھنکتی آوازیں اس کے اندر کی موسیقی سے مدغم ہو رہی تھیں۔

یکدم اسے ہر شے کا حسن اور بھی بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ہولے ہولے چکن کارن سوپ کا سپ لیتے ہوئے اکبر شاہ کی نگاہیں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں پھر خاصی دیر تک اسے کھویا ہوا پا کر اس نے ہلکے سے اس کے باؤل کے کنارے پر اپنا چمچہ مارا۔

''کہاں گم ہو گئیں تانی؟''

''نہیں، یہیں ہوں۔'' اس نے سنبھل کر اکبر شاہ کی مقناطیسی مسکراہٹ سے نظریں چرا لیں۔

خدایا یہاں تو ہر چیز ہی مبہوت کر دینے والی ہے۔

''تانیہ! میں محبت میں اظہار کا قائل ہوں۔ بھلا جب تک اظہار نہ کیا جائے کیسے پتہ چلے کہ آپ مقابل کے دل میں موجود بھی ہیں یا نہیں اور آپ کے دل میں وہ کتنی شدتوں سے ہے۔''

وہ اس کی سمت جھکا خواب آگیں لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ خوف کے بادل چھٹ گئے اور دل نئے احساسات اور جذبوں کا قیدی بن کر تمام خوف سے آزاد ہو کر نئے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرنے لگا۔

''ہاں محبت اظہار کی محتاج ہوتی ہے۔'' اس نے سر ہلا دیا۔ اسے امجد اسلام امجد کی وہ نظم یاد آ گئی جو اس نے شہرینہ کی ڈائری میں پڑھی تھی۔

محبت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے

کہ جتنی بھی پرانی اور یہ مضبوط ہو جائے

اسے تائید تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے

یقین کی آخری حد تک دلوں میں لہلہاتی ہو

نگاہوں سے ٹپکتی ہو

لہو میں جگمگاتی ہو

ہزاروں طرح کے دلکش حسین ہالے

بناتی ہو

اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے

وہ واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھی تو جیسے سب کچھ پا لینے کا نشہ اس کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔اس کے دل کے آسمان پر ساتوں رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

اکبر شاہ نے اس کے آنچل کا کنارا پکڑ کر کھینچا۔وہ اس کی جانب دیکھنے لگی۔تب اکبر شاہ نے اس کا آنچل چھوڑ کر اس کا ہاتھ تھاما اور لبوں سے لگایا تو تانیہ کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔وہ خود میں سمٹ گئی۔چہرے پر یکلخت سارے جسم کا خون چھلک آیا۔

ناگواری کے باوجود وہ اسے ٹوک سکی نہ اس کی حرکت پر اسے سرزنش کر سکی۔بس سمٹ کر اپنے اندر کے شور کو سنتی رہی۔

وہ گاڑی بہت دھیمی رفتار سے چلا رہا تھا۔شاید اس کی رفاقت کے ان لمحات کو طول دینا چاہتا تھا اور تانیہ خود بھی ان کیف آگیں لمحات کا قطرہ قطرہ اپنے اندر اتار کر سیراب ہو جانا چاہتی تھی۔

اس کے ان چھوئے دل پر پہلی بار اکبر شاہ نے زقند لگائی تھی۔

اور اس کا دل کوئی سرائے نہیں تھا کہ کوئی آتا،ذرا دیر ٹھہر کر چلا جاتا۔نہیں،یہ تو ایک عورت کا حساس نازک جذبوں سے پر دل تھا،جس میں داخل ہونے والا تمام تر شدتوں سے براجمان تھا۔

محبت کا پہلا پہلا لمس شاید اتنا اثر انگیز ہوتا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اس کے عوض سارا جہاں بھی دے دیں۔

وہ گاڑی اب اس کے گھر کے راستوں پر ڈال چکا تھا۔

X...X...X

بھابی کے ساتھ اس نے شاپنگ پر جانے کا پروگرام بنالیا۔ بھابی نے کہا: ''تم !تانیہ کو لے آئو۔ تب تک میں بچوں سے فارغ ہو کر خود بھی تیار ہو جائوں۔''

وہ چادر اوڑھ کر چابی لینے کے لیے کی بورڈ کی طرف بڑھی تھی کہ فون کی بجنے والی گھنٹی نے اسے روک دیا۔

گھنٹی ولید کے کمرے میں رکھے موبائل کی محسوس ہوئی۔ اس نے ادھ کھلے دروازے سے جھانک کر دیکھا، وہ غالباً واش روم میں تھا۔ اس نے اندر آکر موبائل اٹھالیا۔

''ہیلو ولید۔'' دوسری طرف سے آمنہ علی تھی جس نے بڑی بے تابی سے پکارا تھا۔

شہرینہ کے لیے یہ آواز غیر متوقع ثابت ہوئی۔ وہ فوری طور پر کچھ کہہ ہی نہ پائی۔

''ہیلو ولید۔''

''وہ تو نہیں ہیں، آپ کون ہیں؟'' وہ سنبھل کر بولی۔ اس کا لہجہ خود بخود سرد سا ہو گیا۔ وہ آمنہ علی کو اس کی آواز سے زیادہ اس کے استحقاقی انداز سے زیادہ پہچانتی تھی۔

''اوہ۔'' دوسری طرف شاید اس سے زیادہ شاک لگا تھا۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر آواز ابھری تو اس میں رعونت اور جھنجلاہٹ کی آمیزش تھی۔

''میں آمنہ ہوں، ولید ہے کہاں؟ موبائل اس کا ہے، کمال ہے اور ریسیو کوئی اور کر رہا ہے۔''

''وہ باتھ روم میں جب تک ہوتے ہیں ان کا موبائل باہر رہتا ہے۔ آپ ان کے اوقات کار کی معلومات بھی رکھ لیا کریں تو ایسی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ کڑوا اور بے مہر ہو گیا۔ اس نے C.L.I پر نگاہیں ڈالیں۔ نمبر اجنبی تھا اور شہر سے باہر کا معلوم ہو رہا تھا۔

اس نے سرسری نظر ڈالی۔

''اس شخص کو دن میں بیسیوں بار نہانے کی بھی تو بیماری ہے۔ اوکے، اسے کہنا کہ پہلی فرصت میں آمنہ مردان شاہ سے کنٹیکٹ کرے، میرے موبائل پر۔'' دوسری سمت سے حکمیہ انداز میں کہا گیا اور جواب سنے بغیر لائن ڈس کنیکٹ کر دی گئی۔

وہ موبائل تھامے کتنی دیر اس کے لہجے کی استہزائیہ چبک اپنے اندر آگ کی طرح گرتی محسوس کرتی رہی۔

دھونس اور رعب تو وہیں دکھایا جاتا ہے، جہاں اپنائیت کی فضا قائم ہو۔ جہاں تعلقات کی مضبوطی اور اس کی نزدیکی کا پر مغرور احساس غالب ہو۔

اور یہ احساس اسے یقیناً ولید حسن کا بخشا ہوا ہی ہو سکتا تھا۔

سوچیں اگر منفی رخ اختیار کر لیں تو آگ بن کر اعصاب تک کو جھلسا کر رکھ دیتی ہیں۔

اسے لگا جیسے وہ بھی یکدم کھڑے کھڑے ان دیکھی آگ میں جھلسنے لگی ہو۔

اس نے موبائل واپس رکھتے ہوئے بے ارادہ مگر عجیب تھکی تھکی نگاہ باتھ روم کے بند دروازے پر ڈالی پھر بے سکونی سی محسوس کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔

دل کی پرسکون جھیل میں بڑے زور کا پتھر پڑا تھا۔ منتشر دائروں کا کھیل جانے کب تک رہتا۔ بھابی نے اس کے کمرے میں جھانکا تھا اور اسے بیڈ پر دونوں پیر ٹکائے بیٹھے دیکھ کر بولیں۔

"ارے، تم ابھی تک گئی نہیں۔ لو میں سمجھ رہی ہوں کہ تم تانیہ کی طرف جا بھی چکی ہو۔"

اس نے آنکھوں کے گوشوں میں سمٹ آنے والی نمی کو ٹشو سے پونچھا اور پھر پلٹی۔

"ہاں، بس جا ہی رہی ہوں، چابی مل نہیں رہی۔ سوچ رہی تھی کہاں رکھی ہے۔" اسے بروقت بہانہ سوجھ گیا۔

بہرحال یہ اس کے اپنے دل کی شکستگی، آزردگی اور کبیدگی تھی جسے وہ خود تک ہی محدود رکھنا چاہتی تھی۔

"کی بورڈ پر دیکھا۔"

"ہوں، دیکھتی ہوں۔ میرا خیال ہے وہیں پر ہونی چاہیے۔" وہ پیروں میں چپلیں پھنسا کر چادر اوڑھ کر کمرے سے نکل آئی۔

چابی اس کی مٹھی میں دبی ہوئی تھیں، اس نے مٹھی کھول کر چابی کی بجائے ہتھیلی کو دیکھا۔ گلابی ہتھیلی پر کی چین کا ڈیزائن ابھر آیا تھا۔

ولید کی گاڑی پورچ سے غائب تھی۔ جس کا مطلب تھا وہ جا چکا تھا۔

آمنہ علی کالب ولہجہ پھر ذہن کی سطح پر ضربیں لگانے لگا۔وہ چوکیدار کو گیٹ کھولنے کا اشارہ دے کر گاڑی میں بیٹھ کر رش انداز میں گاڑی پورچ سے باہر نکال لے گئی۔

کوئی دل کے کھیل دیکھے کہ محبتوں کی بازی

وہ قدم قدم پہ جیتے میں قدم قدم پہ ہارا

اس نے سگنل پر روک کر بیک ویو مرر ٹھیک کیا۔اس میں اپنی آنکھیں دیکھیں جو اندر کے خلفشار کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔

سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے اپنے گلے کی جھولتی زنجیر پر ہاتھ پھیرا۔

خوبصورت لاکٹ جیسے اس کا منہ چڑانے لگا۔اس کا دل یکدم سلگتا ہوا پھوڑا بن گیا۔اس نے جھٹکے سے لاکٹ کھینچا تو پن کھل گئی۔پینڈینٹ زنجیر کے ساتھ اس کے ہاتھ میں آگیا۔جسے دیکھے بغیر اس نے ونڈ اسکرین پر دے مارا۔ہلکی سی چھن کے ساتھ وہ ونڈ اسکرین سے ٹکرا کر لہرا کر ایک طرف گر گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی اور اپنے سامنے پھیلے گاڑیوں کے ہجوم کو تکنے لگی۔سگنل کھلا تو ہجوم سیلاب کی صورت بہنے لگا۔ہر طرف سے ہارن بجنے لگے۔پیچھے کھڑی منتظر گاڑیاں زور زور سے اسے متوجہ کرنے لگیں۔

اس نے یکدم خود کو سنبھالا اور جلدی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔تانیہ کے مانوس علاقے میں آتے ہوئے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور ٹشو سے چہرہ پونچھتے ہوئے جیسے ہی موڑ کاٹا بے اختیار پیر بریک پر پڑا تھا گاڑی اچھل کر رک گئی۔

اس کی آنکھیں حیرت کا جہاں لیے سفید سوک پر جم گئیں۔اعصاب کو منتشر کر دینے والا منظر تھا۔

وہ اکبر شاہ کی گاڑی تھی جس کو وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔اس کی فرنٹ سیٹ سے تانیہ اترتی ہوئی دکھائی دی، مسکراتے گلرنگ چہرے کے ساتھ پھر وہ اکبر شاہ کی طرف آئی۔جانے اس نے کیا کہا۔وہ شرما کر ہنس دی پھر ہاتھ ہلاتی اسے رخصت کرتے ہوئے اپنی گلی میں مڑ گئی۔

وہ کتنی دیر تو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتی رہی۔اس کا ذہن یہ سب قبول نہیں کر رہا تھا مگر آنکھیں بھی دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔

یہ ضرب بہت بھاری تھی۔ پہلے ہی ذہن اپنے خلفشار اور شکستگی کے درد سے چور تھا۔ اس ضرب نے اس کے اعصاب کو بالکل ڈھیلا کر دیا۔

اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی مگر اسے لگا اس کی انگلیاں صرف لرز کر رہ گئی ہیں۔ اسے اپنے پورے وجود میں لرزش محسوس ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بے اختیار سر تھام لیا اور کندھوں کو ڈھیلا چھوڑ کر سراسٹیرنگ وہیل پر جھکا دیا۔

کوئی اسے کند چھری سے ذبح کرتا، تب بھی وہ اتنا نہ تڑپتی جتنا تانیہ کو اکبر شاہ کے ساتھ دیکھ کر اذیت محسوس ہو رہی تھی اور اس سے زیادہ تانیہ کا اسے دھوکا دینا۔

تانیہ میں تبدیلی تو اسے کئی دنوں سے محسوس ہو رہی تھی مگر اس تبدیلی کا محرک اس قدر ہیبت ناک اور خوفناک نکلے گا اس کا تو تصور بھی اس کے پاس نہ تھا۔

اس کا دل چاہا وہ گاڑی یہیں چھوڑے اور بھاگ کر تانیہ کے پاس جائے مگر اسے اپنے وجود پر اپنا کنٹرول اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس میں اتنا دم بھی نہیں تھا کہ وہ گاڑی سے نیچے اترتی۔ بس وہیں سر رکھے بلک بلک کر رونے لگی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''تم ! تم یہاں کیا کر رہی ہو۔'' ولید کی آواز بے حد قریب سے سنائی دی۔ وہ اپنی گاڑی اس کی گاڑی کے ساتھ روک کر پوچھ رہا تھا مگر جو نظر اس پر پڑی اور اسے بے حال دیکھ کر اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔

وہ سکندر کی طرف آ رہا تھا۔ شہرینہ کی گاڑی دیکھ کر چونکا تھا۔ وہ پھرتی سے اپنی گاڑی سے اتر کر فرنٹ ڈور کھول کر اس پر جھکا۔

''شیری ! کیا ہوا۔'' اس نے اس کے کندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

آنسوؤں سے لبریز وہ سلگتی آنکھیں اس کی پر تشویش آنکھوں سے ٹکرائیں۔

وہ سخت نڈھال ہو رہی تھی۔ آنسو تواتر سے ستاروں کی طرح آنکھوں سے گر گر کر رخساروں پر ٹوٹ رہے تھے۔

وہ خالی خالی نظروں سے ولید کو دیکھ رہی تھی جیسے پہچان رہی ہو۔

''کیا پاگل پن ہے یہ ؟ کیا ہوا ہے بتاؤ ؟ اچھا چلو اترو میری گاڑی میں بیٹھو۔''

اس نے کندھوں پر نرمی سے اپنا بازو پھیلایا اور ذرا سا اسے اپنی طرف کھینچا مگر وہ پژمردہ اور نڈھال سی سیٹ پر جمی رہی۔ بس ذرا سا جھکاؤ اس کی طرف ہو گیا۔

شاید وہ اس وقت مکمل حواسوں میں نہیں تھی۔

بظاہر تو کوئی ایکسیڈنٹ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ولید کی پیشانی پر پریشانی اور تشویش کی لکیریں ابھر آئیں۔ کچھ سوچ کر اس نے کندھے چھوڑ دیے اور خود گاڑی سے اتر کر اپنی گاڑی کی طرف آیا۔ اور اسے ایک طرف پارک کر کے لاک کر دی اور دوبارہ اس کی طرف آیا۔ پھر اسے تھام کر آگے پسنجر سیٹ کی طرف دھکیلا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر جگہ بنا کر اس پر بیٹھ گیا۔

”شیری ۃ شیری! سنبھالو خود کو پلیز ہوش میں آؤ۔“ اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اس کے رخسار پر ہلکے سے تھپتھپانے لگا۔

اس نے جھکی ہوئی گردن اٹھائی۔ پھر بے اختیار اس کے کندھے پر پیشانی ٹکا کر رو پڑی۔

ولید کے سینے سے سانس بمشکل آزاد ہوئی تھی۔ وہ دم سادھے ونڈ اسکرین کو گھور کر رہ گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اسے اپنا کندھا یوں جلتا ہوا محسوس ہوا جیسے اس پر آتشیں سیال گر رہا ہو۔

”تانیہ سے جھگڑا ہو گیا ہے کیا؟“ اس نے کندھے کو تھپک کر سر اونچا کر کے چہرے کو بغور دیکھا تو وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھنے لگی، پھر یکدم جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوتے ہی کوئی خوفزدہ کرنے والا منظر دیکھ لیا ہو۔

بہتے آنسو ٹھٹھر کر رک گئے۔

ولید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ رخ موڑے ہتھیلی کی پشت پر چہرہ رگڑ رہی تھی۔

وہ ایک دو پل یونہی بیٹھا رہا پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے بھگانے لگا اس حالت کے پیشِ نظر وہ سیدھا گھر ہی آیا۔

پورٹیکو میں گاڑی روک کر اس کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے تھامنے کو ہاتھ بڑھایا۔ مگر اسے سخت ذہنی جھٹکا لگا تھا جب وہ اس کا ہاتھ ترش روی سے جھٹک کر بولی۔

"میں ٹھیک ہوں مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ یا پھر رونے کے بعد بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ یا پھر وہ اس شخص کے سامنے تماشہ بننا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی حالت بہر حال کسی حد تک بہتر تھی۔

"میرے سہارے کی ضرورت نہیں ہے تو کس کے سہارے کی ضرورت ہے۔ کہو تو وہ مہیا کر دیتا ہوں۔" اس نے اپنی مقناطیسی پر شوق نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔ لبوں کی تراش میں مدہم سی مسکراہٹ لہرا کر منجمد ہو گئی تھی۔

اس نے سخت براماں کر نگاہوں کو جھپکایا اور پیر نکال کر کھڑی ہونے لگی کہ لڑکھڑا گئی۔

اچانک ہی اسے کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ جیسے سارا بدن بے جان ہو گیا ہو۔

پے در پے ناگوار واقعات نے اس کی توانائیوں کو ختم کر دیا تھا۔

"سہاروں پر انحصار آدمی کو اعتماد سے محروم کر دیتا ہے۔ مجھے کسی کے بھی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے دروازے کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

ولید یوں ہنسا جیسے کوئی بچگانہ سی بات سن لی ہو۔ پھر اسے سر سے پیر تک جانچنے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دروازے سے ہاتھ ہٹا کر اس کے بازو کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"یقیناً یہ بات سننا تمہارے لیے تکلیف دہ ہو گی مگر سہاروں کی ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے۔ خصوصاً ایک عورت کے لیے۔ آں' آں۔" وہ بولا پھر اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔

"یہ علیحدہ بحث ہے پھر کریں گے۔ اس وقت تمہیں میرے سہارے کی ضرورت ہے چلو۔"

دل راکھ کا ڈھیر کیوں نہ بن جاتا۔

وہ اس کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئی یہ شخص اسے اپنی حیات کی سب سے بڑی آزمائش ہی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی ناراضگی کی اسے قطعی پرواہ نہ تھی۔ بلکہ اس کے حیل وجحت پر اس پر خفگی بھری نگاہ ڈالی۔

" چھوڑیں مجھے' کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے آپ کے سہارے کی۔ میں چل سکتی ہوں مجھے اپنا محتاج بنانے کی کوشش مت کریں۔ یہ ساری ہمدردیاں اور عنایتیں کہیں اور استعمال کیجیے۔ جنہیں ان کی ضرورت ہو۔"

وہ غصہ میں بالکل آئوٹ ہو رہی تھی۔ اس کا لمس۔ اس کا استحقاق بھرا انداز' اس کے دل پر ٹھنڈی خوشگوار پھوار برسانے کی بجائے۔ سلگتے الائو میں جیسے تیل چھڑک رہا تھا۔

تھکن اور اضمحلال نے اسے پہلے ہی نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اس کی مضبوط گرفت سے خود کو چھڑا نہ پا رہی تھی۔ بس زبان سے ہی احتجاج کر سکتی تھی۔

ولید نے قدم نہیں روکے بس چہرہ گھما کر نگاہیں اس کے چہرے پر جمائیں۔

" تمہیں ضرورت نہیں ہے کیا؟"

اس کی نظروں نے اس کے چہرے پر ہیٹر کا کام دیا۔ وہ تپ اٹھا اس کی لرزتی پلکیں آنکھوں پر جھک گئیں۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹ کر سر نفی میں ہلانے لگی۔ وہ لب بھینچ کر اسے تکنے لگا پھر یکدم مسکراہٹ اس کے لبوں سے گم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں سختی در آئی۔ خود بخود انگلیاں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کے نرم بازو پر سخت ہو گئیں۔ وہ اسے اندر لے آیا۔ بھابی لائونج سے نکل رہی تھیں۔ اسے ولید کے سہارے آتے دیکھ کر

پریشان سی لپک کر آئیں۔

"کیا ہوا ہے اسے۔" انہوں نے شہرینہ کو دیکھ کر پھر ولید کی سمت دیکھا۔ جس نے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ کوئی جواب دینے کی بجائے اس نے کمرے کا دروازہ ٹھوکر سے کھولا اور اسے اندر لا کر بیڈ پر پٹخ دیا۔

"کک' کیا ہوا' بتائو تو' یہ تو تانیہ کی طرف گئی تھی۔" بھابی ولید کے چہرے کے تاثرات سے کچھ گھبرا کر دروازے پر ہی رک گئیں۔

"یہ اس سے پوچھ لیجیے گا کہ سڑک کے کنارے گاڑی روک کر رونے کا کون سا کورس پورا کر رہی تھی۔"

ایک غصہ بھری نگاہ ڈال کر وہ پلٹا۔ بھابی جلدی سے ایک طرف ہو گئیں وہ ہوا کے تند جھونکے کی طرح ان کے قریب سے گزرتا ہوا باہر نکل آیا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے کر رو رہی تھی۔

پتہ نہیں اسے رونا کس بات پر آرہا تھا۔اپنی اس بے اختیارانہ حرکت پر' اس کے رویے پر یا دل کے لہو لہو ہو جانے پر۔

"شیری کیا ہوا؟ کچھ تو بتاؤ خدا کے لیے۔" بھابی اس کے قریب بیٹھ کر تشویش سے پوچھنے لگیں۔

اس کے بہتے آنسو ذرا سی دیر رکے۔اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا پھر ہتھیلی سے چہرہ رگڑا۔

"میرے ساتھ کسی نے اچھا نہیں کیا۔میرے اعتماد کو دھوکہ دیا گیا ہے' مجروح کیا گیا ہے' مجھے اندھیرے میں رکھا تانیہ نے بھی۔" وہ اٹھی اور بھاگ کر جا کر باتھ روم میں بند ہو گئی۔

X...X...X

کوئی ہم نفس نہیں ہے کوئی رازداں نہیں ہے

فقط ایک دل تھا اپنا سو وہ مہرباں نہیں ہے

وہ آنکھوں پر بازو دھرے بیڈ کی بجائے زمین پر چت لیٹی تھی۔

کسی زلف کو صدا دو کسی آنکھ کو پکارو

بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

بھابی نے کوئی دوسری بار اندر جھانکا۔پھر کچھ سوچ کر اندر آکر آہستگی سے دروازہ بند کر دیا اور قالین پر بے آواز چلتی سی ڈی پلیئر کی طرف گئیں۔اور

میری روح کی حقیقت میرے آنسوؤں سے پوچھو

سی ڈی پلیئر کا بٹن آف کیا تو کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔اس کے ساکت پڑے بدن میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔اس نے بازو آنکھوں سے ہٹائے تو بھابی پر نگاہ پڑی۔وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔

"کیا ہو گیا ہے شیری! کل تک تو اچھی بھلی تھیں۔" انہوں نے اس کا بازو پکڑ لیا جو وہ دوبارہ چہرے پر رکھنے لگی تھی۔

وہ لب دانتوں میں دبا کر چھت کو گھورنے لگی۔پھر ایک سانس بھر کر بھابی کی طرف دیکھا۔جو غایت درجے کی تشویش سے اس کے چہرے پر نگاہیں ٹکائے بیٹھی تھیں۔

اس کا دل بھر آیا ایک ہمدرد' غمگسار کی طلب شدت اختیار کر گئی۔

"ولید دو بار تمہارے کمرے میں جھانک گیا مگر تمہیں سوتا سمجھ کر واپس چلا گیا۔ کچھ پریشانی اس کے چہرے سے بھی ظاہر تھی۔"

ولید کے ذکر پر اس کے دل میں وہی مانوس سا درد اٹھا جو پورے بدن میں سرائیت کر گیا۔ جلتی آنکھوں کو اس نے موند کر کھولا۔

"ولید کہہ رہا تھا کہ تم کل تانیہ کے گھر سے دور اپنی گاڑی میں بیٹھی رو رہی تھیں۔ کیا تانیہ سے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔"

"جھگڑا۔" اس نے بھابی کی طرف دیکھا۔ ایک ہلکی سی افسردہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھوٹی۔

"جھگڑا ہو جاتا تو اتنا دکھ نہ ہوتا جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔" بلکہ شاعر تو کہتا ہے۔

جن سے موانست ہو ہمدم

ان سے جھگڑا ضرور ہوتا ہے

وہ زور سے ہنسی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے بال سہلاتے سہلاتے یکدم بالوں میں ہاتھ پھنسا کر چہرہ جھکا کر بولی۔

"میرا دل ٹوٹ گیا ہے بھابی۔ بہت شدت سے ٹوٹا ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی بھابی حیران رہ گئیں اور اس کے کندھے کو تھاما تو وہ ٹوٹی شاخ کی طرح ان کے سینے سے آلگی۔

"پتہ نہیں کیوں ہم کسی کے دل میں رہنا ہی اپنی زندگی سمجھتے ہیں اور جب یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی کے اندر نہیں رہے تو جانے کیوں ہم مر جاتے ہیں۔ ہم اپنے اندر ہی کیوں جی نہیں سکتے۔ ہمارا دل ہمارے سینے میں ہوتا ہے۔ مگر ہم کیوں اسے کسی اور کے اندر دھڑکتا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

بھابی کا ہاتھ اس کے گرد حمائل ہو کر اسے خود سے اور قریب کر گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ اپنی کبیدگی خود تک محدود رکھنا چاہتی تھی مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ تنہا روتے روتے تھک گئی تھی۔ اسے کسی کندھے کی ضرورت تھی۔

"پاگل تو تو سب کے دل میں جی رہی ہے' سب تمہیں بے پناہ چاہتے ہیں۔"

بھابی نے کتنی دیر اسے رونے دیا۔ پھر محبت سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی پیشانی اور رخساروں سے بالوں کی لٹیں ہٹائیں اور اس کے نرم نرم رخسار پر انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"کس نے تمہارا دل توڑا ہے۔ بتاؤ ذرا۔"

وہ ان سے الگ ہو کر بیڈ کی پشت سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"ہر درخت کی طرح ہر آدمی کی چھاؤں یکساں نہیں ہوتی ہے۔ جس طرح کچھ درختوں کی نہیں ہوتی کبھی دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔ قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ اتنی سی چھاؤں کے لیے اتنا طویل سفر طے کیا۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں سامنے دیوار گیر الماری کو گھورنے لگی۔ پھر یکدم سر کو ہلکے سے جنبش دے کر ہنس پڑی اور بھابی کی طرف دیکھنے لگی۔

"شاید مطمئن زندگی گزارنے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ لوگوں سے کم سے کم توقعات رکھی جائیں۔ بلکہ رکھی ہی نہ جائیں۔"

"مجھے نہیں بتاؤ گی کیا بات ہے۔" بھابی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ یوں چونکی جیسے ابھی تک خواب کے عالم میں ہو اور اب جاگی ہو۔ کچھ دیر بھابی کے پر تشویش چہرے کو تکتی رہی جس سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میں تانیہ کی وجہ سے اپ سیٹ ہوں۔" ایک ملول سی سانس اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

"کیا ہوا اسے خدانخواستہ۔"

"میں نے اکبر شاہ کے بارے میں تو آپ کو اکثر بتایا ہے نا۔ وہی اکبر شاہ۔"

"ہاں، ہاں مجھے یاد ہے۔ کیا، کیا اس نے پھر کوئی فضول حرکت کرنے کی کوشش کی تمہارے ساتھ۔" بھابی بے چین ہو کر بول پڑیں۔

اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"میرے ساتھ تو خیر نہیں مگر تانیہ کو اس نے اپنے جال میں قید کر لیا ہے۔ بھابی میں نے کل خود تانیہ کو اس کی گاڑی سے اترتے دیکھا۔ آئی ڈونٹ بیلیو اٹ بھابی میں اب تک خود کو یہی یقین دلاتی رہی ہوں کہ کیا وہ سچ تھا جو میری آنکھوں نے دیکھا اور اگر سچ ہے تو، تو تانیہ نے مجھے دھوکے ہیں کیوں رکھا۔ میری غیر موجودگی میں وہ کس طرح، کس طرح اس خبیث کے جال میں جکڑی گئی۔"

بھابی بھونچکا سی رہ گئیں۔بے یقینی سے شہرینہ کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔

"کئی دنوں سے مجھے اس میں کچھ تبدیلی تو محسوس ہورہی تھی مگر میں نے اگنور کیا' جب نومی نے ٹریٹ دی تھی ہمیں اس روز اکبر شاہ کی آمد پر تانیہ کو اتنا مسرور دیکھ کر میرا ذہن اپ سیٹ ضرور ہوا مگر اس نوبت کا تو تصور بھی میرے پاس نہیں تھا۔آئی کانٹ بیلیواٹ کہ وہ اس شخص کے ساتھ انوالو ہوسکتی ہے جس کے سائے سے بھی وہ پناہ مانگتی تھی۔یا پھر' یا پھر وہ شروع ہی سے اس سے امپریس تھی اور میں اسے اس کا خوف سمجھتی رہی ہوں۔"

وہ پرخیال انداز میں بھابی کی طرف دیکھنے لگی۔جو خود کو اس دھچکے سے سنبھالنے میں مصروف تھیں۔بڑی افسردہ سی سانس ان کے لبوں سے نکل گئی۔

"تم نے بات کی تانیہ سے اس سلسلے میں۔"

"نہیں قطعی نہیں اور نہ کروں گی۔اس نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے۔"

" پاگل ہوگئی ہو شیری!" بھابی نے جلدی سے ٹوکا۔

" وہ غلط راستے پر چل نکلی ہے تو تم بجائے اس سے باز پرس کرنے کے۔اسے سمجھانے کے یوں سر لپیٹ کر بیٹھ گئی ہو۔یہ کہاں کی دوستی ہے۔" ان کا انداز فہمائشی تھا۔وہ بے بسی سے لب کاٹنے لگی۔

" جب اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے اس نے مجھے بے خبر رکھا تو کیا اب مجھے بتادے گی۔نہیں بھابی وہ تو اب بھی اس راز کو راز ہی رکھے گی۔"

"مگر جب تمہارے علم میں آگئی ہے تو تم پر فرض بنتا ہے کہ تم اس سے بات کرو' اس سلسلے میں' بلکہ ہر ممکن حد تک اسے سمجھاؤ اسے روکو۔ہوسکتا ہے وہ اتنی انوالو نہ ہوئی ہو۔یہ وقتی اٹریکشن ہو جو تمہاری کوشش سے ختم ہوجائے۔"

وہ جواباً کچھ نہ کہہ سکی۔بھابی کی بات معقول ہی تھی۔یہ دوستی تو نہ تھی کہ اسے راہ سے بھٹکتا دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ جائے۔

" اس سے پہلے کہ وہ بہت آگے بڑھ جائے کہ واپسی کا راستہ گم کردے' اسے ہر طرح سے سمجھانا ہوگا۔یہ عمر بڑی نازک ہوتی ہے اس عمر میں ہر چمکتی شے سونا دکھائی دیتی ہے۔آگ بھی مہکتا پھول لگتی ہے۔" بھابی کی آواز دھیمی تھی۔انہیں بے حد افسوس ہوا تھا۔

"شیری!" انہوں نے کوئی خیال آجانے پر اس کی طرف دیکھا اور کچھ دیر دیکھتی رہیں جیسے اس کے چہرے پر کچھ کھوج رہی ہوں پھر اس کے کندھے پر بکھرے بالوں کو پیار سے سمیٹتے ہوئے بولیں۔

"تم ولید کو کہہ دینا کہ میں تانیہ کی وجہ سے اپ سیٹ تھی وہ بڑا پریشان اور بے کل سا ہے۔"

اس کی پلکیں سرعت سے رخساروں پر جھک گئیں۔

"وہ کوئی پریشان وریشان نہیں ہوتے۔' انہیں فرصت ہی کب ہوتی ہے بے کل ہونے کی۔"

بھابی نے اسے غور سے دیکھا اور پھر ہنس دیں۔

"تانیہ کا سارا غصہ تم نے اس بیچارے پر نکالا ہے۔ یہ تو شکر ہے وہ اتفاق سے وہاں آگیا تھا خدا جانے تم رو رو کر کب تک وہاں پڑی رہتیں۔"

وہ لب بھینچ کر اپنی جگہ سے ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی اور غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"کیا مجھے تانیہ سے اس سلسلے میں بات کرنی چاہیے۔"

"بالکل کرنی چاہیے۔" بھابی بھی کھڑی ہو گئیں۔

"تمہاری اس خاموشی سے اکبر شاہ خوب فائدہ اٹھا سکتا ہے اور وہ تو ہے نری پاگل۔"

"پتہ نہیں کیوں۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا کہ تانیہ... تانی' اکبر شاہ جیسے شخص کے پھیلائے ہوئے جال میں بھی آسکتی ہے اکبر شاہ تو..." اس نے کرب سے دانت پیسے اکبر شاہ کا تصور کرتے ہی اسے اپنا سارا خون ہی کڑوا محسوس ہونے لگا۔

نفرت سے آنکھیں تمتمانے لگیں۔

"تانیہ اتنی احمق تو نہیں ہو سکتی۔" اس نے بالوں میں ہاتھ پھنسا کر دکھ کے گہرے احساس کے ساتھ ہلکی سی سانس بھری اور بیسن پر جا کر منہ پر ٹھنڈا پانی بہانے لگی۔

X...X...X

خود اپنے آپ سے شرمندگی سی ہوتی ہے

کبھی کبھی تو بڑی بے دلی سی ہوتی ہے

وہ بے مقصد بال پوائنٹ سے کاغذ پر لکیریں کھینچتے ہوئے مسلسل شہرینہ کے بارے میں سوچے جارہا تھا۔

کبھی اس کا خیال تھا وہ سب کے لیے معمہ بنتا جارہا ہے مگر اب اسے لگتا تھا شہرینہ اس کے لیے معمہ بنتی جارہی ہے۔

یا پھر وہ ہی نالائق، کند ذہن ثابت ہورہا ہے کہ یہ معمہ حل نہیں کر پارہا۔ وہی ناقابلِ تسخیر ثابت ہورہی ہے۔

وہ سلگتی، سنہری آنکھیں اس کے ذہن کی سطح پر چپک سی گئی تھیں جن میں اپنے لیے ایک چبھن، ایک اجنبیت محسوس کر کے وہ سخت بے چین ہو گیا تھا۔

اس نے قلم روک کر کاغذ اٹھا کر دیکھا جس پر جابجا لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ ایک ہلکی سی سانس اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

یوں تو زندگی نے اسے ہمیشہ نئے تجربات سے ہی دوچار کیا تھا مگر اس بار بالکل ہی انوکھا تجربہ رہا تھا ایک احمق سی لڑکی کا سامنا، عجب قسم کی الجھن تھی۔ وہ نہیں جانتا کہ یہ الجھی ہوئی زنجیر کتنی طویل ہے اور کتنی الجھے گی اور اس کا سرا کہاں پر جا کر ختم ہو گا۔ اس نے کاغذ کے کئی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن کی نذر کر دیے اور خود کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

یکدم وہ عجیب طرح کی یاسیت کا شکار ہو چکا تھا۔ ایسی یاسیت جو اذیت بن کر دل پر چمٹ رہی تھی۔

ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ مگر آج جانے کیوں سوچنا نہیں چاہتا۔ مگر خود بخود بہت سی سوچیں ناگ کی طرح سر اٹھا اٹھا کر ڈس رہی تھیں۔

وہ اپنی اس وحشت ناک کیفیت سے گھبرا کر آفس سے نکل گیا مگر گاڑی کی طرف آنے کی بجائے ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر پیدل ٹہلنے کے انداز میں چلتا ہوا پارکنگ لاٹ سے نکل کر سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

دھوپ تقریباً ٹھنڈی ہو چکی تھی اب اس کی نرم نرم کرنیں ہی رہ گئی تھیں۔

آئس کریم پارلر، برگر اسپاٹ ہر جگہ اچھا خاصا رش نظر آرہا تھا اس کے دائیں طرف گاڑیاں شور کرتی گزر رہی تھیں اس نے سوچا وہ کتنے عرصے بعد یوں پیدل چل رہا ہے۔ سٹوڈنٹ

لائف میں وہ خوب پیدل چلا کرتا تھا۔اس کے گروپ کے سارے ہی صحت مند لڑکے اس کے اس شوق سے خار کھاتے تھے۔

ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

کتنی مخمور ہیں تمہاری آنکھیں

دل کا سرور ہیں تمہاری آنکھیں

تجھ کو ہے میری قسم اب تو آجا

آنکھوں کے ساغر سے آکر پلا جا

نشے میں چور ہیں تمہاری آنکھیں

دل کا سرور ہیں تمہاری آنکھیں

وہ چلتے چلتے یکدم ٹھٹکا تھا۔وہ آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو سیدھی دل پر لگی تھی۔اس نے چہرہ موڑ کر دیکھا وہ ایک بڑی آڈیو شاپ تھی آج تک وہ کبھی آڈیو شاپ پر نہیں رکا تھا۔نہ کسی طرح

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کے گانوں سے دل بہلایا تھا۔مگر اچانک ہی اسے اس لمحے یہ گانا متوجہ کر گیا وہ بے ارادہ ہی شاپ کی دو تین ڈور اسٹیپ چڑھ کر دکان کے اندر چلا آیا۔

کئی لڑکے، لڑکیاں بڑے سے شوکیس پر جھکے اپنی من پسند کیسٹیں ڈھونڈ رہے تھے۔

"جی سر! حکم کیجیے۔" ویڈیو شاپ کا مالک چہرے پر پیشہ وارانہ مسکراہٹ سجائے اس کی طرف متوجہ ہوا۔وہ اپنے کسی خیال سے... اور اطراف میں نگاہیں دوڑاتے ہوئے یکدم چونک گیا۔پھر سر کو خفیف سی جنبش دے کر دھیرے سے بولا۔

" یہ جو کیسٹ بج رہی ہے وہی چاہیے۔"

ویڈیو شاپ کے مالک نے اس پر ایک نظر ڈالی پھر مسکرایا۔

" جی ضرور ابھی دیتا ہوں۔اس کے تو جی سارے ہی گیت غزلیں زبردست ہیں۔" وہ اس کیسٹ کی تعریفوں میں لگ گیا اور جھک کر گلاس ریک سے ایک چمکتے ریپر میں بند کیسٹ اس کے آگے رکھ دی۔

"صرف تیس چالیس روپے میں آپ کو آپ کے ذوق کے مطابق چیز سننے کو مل رہی ہو تو کیا برا ہے سر!" وہ شاید بہت باتونی تھا یا پھر دکانداری کا یہ بھی کوئی طریقہ ہوتا ہوگا۔ ولید نے صرف ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ والٹ نکال کر پے منٹ کی اور کیسٹ اٹھا کر شاپ سے باہر آ گیا۔ کیسٹ پر نظریں ڈال کر وہ یکدم جھینپ کر ہنس دیا۔

"کمال ہے یہ کیا حرکت سرزد ہو گئی مجھ سے۔" اسے اپنے آپ سے خفت محسوس ہونے لگی۔ اسے لگا اس کا چہرہ ہلکا تپ رہا ہے۔ بے ساختہ ہاتھ چہرے پر پھیر کر کندھے جھٹک کر

ہلکے سے سانس

بھری اور واپسی کے لیے قدم اٹھانے لگا۔

پارکنگ لاٹ میں اس کی گاڑی جوں کی توں کھڑی تھی۔

اس نے جیب سے چابی نکال کر گاڑی کا لاک کھولا اور اندر بیٹھ کر کیسٹ کے اوپر سے پلاسٹک ریپر کو پھاڑنے لگا اور گانوں کی دی ہوئی فہرست پر نظریں ڈال کر اسے کیسٹ پلیئر میں ڈال کر بٹن آن کر دیا۔ گلاسز جیب سے نکال کر آنکھوں پر چڑھائے اور گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکال کر سڑک پر بھگانے لگا۔

کتنی مخمور ہیں تمہاری آنکھیں

دل کا سرور ہیں تمہاری آنکھیں

تجھ کو ہے میری قسم اب تو آجا

آنکھوں کے ساغر سے آکر پلا جا

نشے میں چور ہیں تمہاری آنکھیں

دل کا سرور ہیں تمہاری آنکھیں

کتنی مخمور ہیں تمہاری آنکھیں

ہجر کی راتوں میں میں تم کو ڈھونڈوں

غم کی رتوں میں میں تم کو ڈھونڈوں

ایسے میں دور ہیں تمہاری آنکھیں

دل کا سرور ہیں تمہاری آنکھیں

وہ گاڑی بے مقصد سڑکوں پر دوڑا رہا تھا۔ذہن و دل کی سطح پر ایک خوبصورت سی دھند پھیل رہی تھی۔ایک محجوب چہرے کا تصور بن اور ٹوٹ رہا تھا۔

تو جس کو دیکھے وہ تاب نہ لائے

پلک جھپکتے ہی وہ تیرا ہو جائے

جلوہ نور ہیں تمہاری آنکھیں

دل کا سرور ہیں تمہاری آنکھیں

کتنی مخمور ہیں تمہاری آنکھیں

اس کی جیب میں رکھا موبائل بجنے لگا تو یکدم دل اچاٹ ہو گیا خوب صورت احساس ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

” ہیلو۔“ اس نے گاڑی کی اسپیڈ سلو کر دی دوسری طرف آمنہ علی تھی۔

”بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے

کہیں دل لگانے کی کوشش نہ کرنا“

ولید کی آواز سنتے ہی وہ ایک طویل آہ کے ساتھ بولی تھی۔

” اطلاع دے رہی ہو یا اب اس پر عمل پیرا ہونے کا بھی ارادہ ہے۔“ اس نے ٹیپ کا بٹن آف کیا اور اپنے مخصوص فریش لہجے میں بولا۔

”فی الوقت تو انکشاف کر رہی ہوں کہ حسن والے بڑے بے مروت ہوتے ہیں۔“ وہ دانت پیس کر بولی تھی پھر اسی لہجے میں بولی۔

” یہ بتائو کہاں ہو اس وقت۔“

” سفر میں ہوں انگریزی والے۔“ اس نے ایک سانس بھری۔

وہ زور سے ہنسی۔مگر دوسرے پل گھائل کرنے والے لہجے میں بولی۔

” مجھے قریب آنے دو، ساری تکلیفیں سمیٹ لوں گی۔“ پھر یکدم یاد آجانے پر جیسے چلائی۔

” ولید تمہیں میرا میسج نہیں ملا۔“

” کون سا میسج؟۔“ وہ چونکا۔

"تمہارا موبائل شاید کل کسی اور کی دسترس میں تھا غالباً تم اپنے پرانے مرض میں مبتلا تھے آئی مین کہ باتھ لے رہے تھے۔" وہ کہہ کر ہنسی۔ "کسی لڑکی نے ریسیو کیا تھا اسے ہی میں نے میسج دیا تھا۔"

" صغریٰ ہو گی۔"

" اونو نو' وہ اسٹوپڈ لڑکی نہیں تھی' میرا خیال ہے تمہاری کزن شہرینہ تھی۔" وہ سوچتے ہوئے بولی تو ولید کے لبوں سے بے ساختہ گہری سانس خارج ہو گئی پھر سوچتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

" کیا باتیں ہوئیں تمہاری اس سے۔" سیٹ کی پشت سے ڈھیلے انداز میں کمر ٹکا کر وہ ونڈ اسکرین کو گھورنے لگا۔اس کی آنکھوں میں الجھن اتر آئی۔

" باتیں کیا ہونی تھیں میں تو ڈھنگ سے اسے جانتی بھی نہیں ہوں میں نے میسج دیا کہ ولید سے کہنا مجھے کال بیک کرے مگر میرا خیال ہے تمہیں یہ میسج نہیں دیا گیا۔"

اس کے لہجے میں کاٹ سی تھی مگر شاید ولید محسوس نہ کر سکا' اس کا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا شاید اس الجھن کا سرا ہاتھ آیا تھا۔اسے یکدم شہرینہ کے بگڑے ہوئے موڈ کی سمجھ آگئی۔

" حویلی سے بول رہی ہو تم۔" وہ سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

" ہاں تم سے دل برداشتہ ہو کر حویلی چلی آئی۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ بولی۔

" کیوں؟ مجھ سے دل برداشتہ سے کیا مطلب۔" وہ حیران ہوا اور آمنہ علی کلس کر رہ گئی۔

پتہ نہیں وہ اتنا ہی انجان تھا جتنی حیرت ظاہر کر رہا تھا یا پھر محض ایکٹنگ تھی۔

" باباسائیں دو روز کے لیے کراچی آرہے ہیں ولید! وہ تمہارے پیرنٹس سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔" وہ خفیف سے توقف سے بولی۔" انہوں نے تاکید کی ہے کہ میں تمہیں انفارم کروں اور تم سے اس سلسلے میں پروگرام سیٹ کروں۔"

" میرے پیرنٹس سے۔" یہ جملہ خاصا اچانک تھا جس کے لیے وہ قطعی تیار نہیں تھا۔مگر بے حد سرعت سے اس نے اپنے ذہن پر لگنے والی ضرب سے ہونے والے منتشر اعصاب کو سنبھالا۔

ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے بھنچے ہوئے لبوں پر بکھر آئی۔

''یہ تو میری بھی آرزو ہے کہ تمہارے باباسائیں کو میں اپنے والدین سے ملوائوں۔ بہت خوش ہوں گے میرے والدین مگر پتہ نہیں تمہارے باباسائیں خوش ہوں گے یا نہیں۔''

آمنہ علی کے دل میں گویا پھلجھڑیاں سی چھوٹ پڑیں' یقیناوہ سامنے ہوتا تو دیکھتا اس کے چہرے پر کیسی مغرور مسکراہٹ بکھر آئی تھی۔

'' باباسائیں تو بہت بے چین ہیں ولید! وہ کیوں خوش نہ ہوں گے۔''

''اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہو گی کہ وہ خوش ہوں گے مگر میرے پیرنٹس یہاں موجود نہیں ہیں۔'' اس کی آواز دھیمی تھی اور چہرے کے تاثرات میں ایک کھنچائو آ گیا تھا۔

'' کیا مطلب وہ ملک سے باہر ہیں۔''

'' ہوں۔''

''کمال ہے' تم نے مجھے بتایا نہیں کبھی۔ کس ملک میں ہوتے ہیں باباسائیں کے تو بیرون ملک دورے ہوتے رہتے ہیں اور پھر ان سے فون پر بھی تو...''

''میرا خیال ہے ابھی یہ ممکن نہیں ہے ہاں مگر مردان شاہ میرے گھر ضرور آئیں' آغاجی بھی بہت بہتر محسوس کریں گے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ بولی۔

''اچھا یونہی سہی۔'' اس کے لہجے کی کھنک پھیکی پڑ گئی تھی اور لہجہ بھی ڈھیلا ڈھیلا سا تھا۔ پھر چند ادھر ادھر کی باتوں کے ساتھ اس نے توقیر شاہ کی شادی کی خبر بھی دی جسے اس نے خاصے اشتیاق سے

سنا بلکہ دن اور تاریخ بھی معلوم کی اور مبارک باد دی اور جب موبائل آف کیا تو اس کے ذہن پر کثیف سی فضا چھائی ہوئی تھی۔

موبائل ڈیش بورڈ پر ڈال کر وہ رش انداز میں گاڑی سڑکوں پر بھگانے لگا۔

بہت کچھ دھند میں لپٹا اس کی آنکھوں کے سامنے واضح ہو گیا تھا اس کے خون کی گردش معمول سے ہٹ کر تیز تھی۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظریں ڈالیں اور کچھ سوچ کر گاڑی کا رخ فدا حسین کے گھر کے راستوں کی طرف کر دیا۔

X...X...X

شہرینہ نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ نادیہ آپی نے کھولا وہ سیاہ رنگ کی لیلن کی چادر اوڑھے ہوئے کھڑی ہوئی تھیں اور کندھے پر بیگ جھول رہا تھا۔ شہرینہ کو دیکھ کر وہ بے حد محبت سے اس سے لپٹ گئیں۔

" آج صبح سے میں تمہارے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔ تانیہ سے بھی تمہارا ہی پوچھ رہی تھی آئو اندر آئو۔"

" آپ لوگ کہیں جا رہی ہیں۔" وہ اندر آئی تو تانیہ کی امی کو بھی چادر اوڑھے دیکھ کر بولی۔

" ہاں ہم لوگ ذرا مارکیٹ تک جا رہے ہیں۔"

" اچھا نومی کی منگنی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔" وہ مسکرادی۔

" منگنی نہیں نکاح۔" نادیہ آپی نے نئی اطلاع فراہم کی پھر اس کی حیرت دور کرتے ہوئے بولیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

" پروگرام تو منگنی کا ہی تھا مگر اس کے سسر سید صاحب نے کہا کہ ان کے خاندان میں منگنیاں کئی ٹوٹی ہیں۔ سو ان کی بیگم اور وہ خود منگنی کرا چھا نہیں سمجھتے۔ وہ منگنی کی بجائے نکاح کرنا چاہتے ہیں بھلا ہمیں کیا اعتراض تھا۔"

" چلیں یہ تو اچھی بات ہے۔ نومی صاحب تو ہوائوں میں اڑ رہے ہوں گے۔" وہ بہت مسرور ہوئی یہ سن کر۔

" عظمیٰ کو بھی لے کر ہی جا رہے ہیں' ہم نے سوچا شاپنگ ہی عظمیٰ کے لیے کرنی ہے تو پھر اس کی پسند کی ہونی چاہیے۔"

وہ مسکرادی۔ بات معقول تھی پھر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

" تانیہ گھر پر ہے یا..."

" ہاں ہاں اسے کہاں جانا ہے گھر پر ہی ہے وہ ساتھ نہیں جا رہی ہے ہمارے' تم دونوں بیٹھ کر آرام سے ہماری واپسی کا انتظار کرو۔" نادیہ آپی شوز پہننے لگیں۔

" چلیں امی دیر ہو رہی ہے۔" وہ وہیں سے اماں کو پکارنے لگیں۔

" سنو شیری! نومی آئے تو تانیہ سے کہنا اسے کھانا دے دے اور ہاں فریج میں' میں نے کباب بنا کر رکھے ہیں تل کر کھانا۔ یہ تانیہ نری نکمی ہے پتہ نہیں کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہے کل بھی اس نے چاول سارے جلا دیئے تھے۔"

وہ نادیہ آپی کو دیکھتی رہ گئی۔

" نومی کے نکاح کی خوشی نے باؤلا کیا ہوا ہے اسے' آخر بہن ہے خوشیوں پر حق تو ہے نا۔" اماں ہنس کر بولیں اور باہر کی طرف بڑھ گئیں۔

" ایسی بھی کیا خوشی کہ بندہ غیر ذمہ دار ہی ہو جائے۔ اچھا شیری دیکھو! تم جانا مت ہماری واپسی دو گھنٹے میں ہو جائے گی۔"

"آپ جائیں گی تو واپسی ہو گی نا۔" وہ بولی تو نادیہ آپی جھینپ کر ہنس پڑیں اور اماں کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ وہ دروازہ بند کر کے تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔

تانیہ کو اس کی آمد کا علم نہیں تھا وہ چھت کی سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتری تو تخت پر شہرینہ کو بیٹھے دیکھ کر حیرت بھری مسرت کے ساتھ اس کی طرف لپکی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اوئے تو کب آئی' امی اور باجی چلی گئیں کیا۔" اس نے بند گیٹ پر نظر ڈالی۔

"ہوں تبھی انہوں نے مجھے آواز نہیں دی۔"

" نادیہ آپی کے خیال میں تو تم آج کل کھوئی کھوئی رہنے لگی ہو۔" وہ اسے بغور دیکھنے لگی۔

تانیہ نے بے پرواہی سے ہنس کر اس کے پاس ہی تخت پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

" ان کی تو عادت ہے فضول بکنے کی۔ تم سناؤ آج تم یونیورسٹی نہیں آئیں۔"

" تم نے میری کمی محسوس کی۔" اس کے استفسار پر اس نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھ ڈالا۔ تانیہ سٹپٹا گئی اس کے چہرے کے تاثرات میں بڑی سرد مہری سی تھی۔ اس کے لگاتار دیکھنے پر وہ پلکیں جھکانے پر مجبور ہو کر انگوٹھے کا ناخن چھیڑتے ہوئے بولی۔

" کیا مطلب؟ تمہیں مس کیا تبھی تو پوچھ رہی ہوں کہ تم آج کیوں نہیں آئیں۔"

شہرینہ ہلکے سے سانس بھر کر رخ موڑ کر فرش کو گھورنے لگی۔

" نہیں تانیہ! تم جھوٹ بول رہی ہو۔ اب میں تمہارے لیے غیر اہم ہو گئی ہوں۔" وہ ہولے سے ہنسی تھی۔ تانیہ نے چونک کر اسے دیکھا پتہ نہیں اس کے دل کا اپنا چور تھا یا شہرینہ

کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات نے ہی اسے سراسیمہ کر ڈالا۔ تڑپ کر اپنی محبت جتا نہ سکی بس آہستگی سے بولی۔

" کیا بے وقوفی کی بات کر رہی ہو؟۔ تم غیر اہم کیوں ہونے لگیں؟"

اس کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹ لہرا کر منجمد ہو گئی وہ سخت تاسف سے بولی۔

" اس لیے تانی کہ اب اکبر شاہ نے اہمیت اختیار کر لی ہے۔" یہ یقیناً دھماکہ ہی ثابت ہوا تھا تانیہ کے لیے۔ اس کے اعصاب پر گویا پتھر پڑ گئے تھے۔ وہ سن سی بیٹھی رہ گئی۔ شہرینہ کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں پھر افسردگی کا دھواں اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔

تانیہ کے رخسار دہکنے لگے تھے۔ اس کی یک بیک جھک جانے والی نظریں اور چہرے کی رنگت یہ ثابت کر رہی تھی کہ اس نے جو دیکھا ہے وہ سچ تھا۔ دھوکا نہیں تھا۔ وہ شاید مدافعت کے لیے لفظ تلاش کر رہی تھی مگر لفظ یا تو اس کی گرفت میں نہیں آپا رہے تھے یا اس کو آنکھوں کے اعتماد سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہے تھے۔

" تانیہ!" اس نے نرمی سے اس کے گھٹنے کو چھوا تو تانیہ نے پلکیں ذرا سی اوپر اٹھائیں پھر جھکا دیں۔ ان میں نمی کی ہلکی ہلکی دھند پھیلتی دکھائی دے رہی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

" ایسا کیوں ہوا تانی! کیا تم اکبر شاہ کو جانتی نہیں تھیں اس کی..." وہ دکھ اور حیرت کے مشترکہ احساس سے لب کاٹنے لگی۔

" اس کی... اس کی ریپوٹیشن تمہارے سامنے ہے۔ اس کا کریکٹر کھلا پڑا ہے تمہارے سامنے پھر بھی... پھر بھی تانیہ تم نے ایک ایسے شخص پر اعتماد کر لیا جو کسی طرح قابل اعتماد نہیں ہے۔"

" نہیں شیری! تم نے... میرا مطلب ہے ہم نے' اسے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔" وہ اپنی ہمت جمع کرتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں میں نمی چھٹنے لگی وہ جرات مند بننے کی پوری کوشش کر رہی تھی اپنے لہجے کو پھر اس نے حتی الامکان مضبوط بنا لیا۔

شہرینہ نے مجروح نظروں سے اسے دیکھا تو وہ نظریں چرا کر تخت سے اتر گئی اور رخ پھیر کر بولی۔

" ضروری تو نہیں کہ راہ سے بھٹکا ہوا عمر بھر بے راہ ہی رہے اور زاہد عابد عمر بھر متقی رہ سکیں۔"

"یہ دھوکا تم خود کو ضرور دے سکتی ہو مجھے نہیں۔" وہ اٹھ کر اس کے پیچھے آ رکی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بہت دکھ سے بولی۔

"تم اتنی احمق ثابت ہو گی مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میری غیر موجودگی میں اس شخص نے تمہیں اپنا نوالہ بنا لیا اور..."

"شیری لینگویج پلیز۔" وہ بل کھا کر پلٹی وہ دم بخود رہ گئی اس کے لہجے اور انداز نے اسے بے حد دکھی کر دیا۔

"میں تمہاری دوست ہوں تانیہ! تمہیں اس مہیب اندھیرے کی طرف کیسے جاتا دیکھوں جہاں کھائیاں ہی کھائیاں ہیں۔" وہ دل گرفتگی سے بولی اور اس کی آنکھوں کی سطح نمی سے چمکنے لگی تانیہ کرب سے ہونٹ کاٹنے لگی پھر یکدم دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ ڈھانپ کر رو پڑی۔

"شیری اگر انسان اپنے دل پر اپنے محسوسات پر حاوی ہو جانے کے قابل ہو جائے تو دنیا میں مسئلے ہی پیدا نہ ہوں۔"

اس کی آواز میں عجیب شکستگی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کیا دیکھا ہے تم نے اس میں تانیہ! کہ وہ اتنا قریب آ گیا تمہارے۔" وہ دل سے اٹھتی کرب کی شدت کو دباتے ہوئے پوچھنے لگی۔ پھر تانیہ کو تھاما تو وہ اس سے لپٹ کر رو دی اس نے رونے دیا۔ خود اس کے آنسو بھی اس کے کندھے پر گر رہے تھے۔ بہت رونے کے بعد وہ چہرہ اٹھا کر دوپٹے سے رگڑتے ہوئے بولی۔

"میں نے خود ایسا نہیں چاہا تھا مگر خود بخود ایسا ہوتا چلا گیا۔ محبت تو حادثہ ہے نا' حادثے تو ہو جاتے ہیں نا۔ بس سمجھو میں بھی اس حادثے کا شکار ہو گئی۔"

شہرینہ اس کی تاویل پر دھیرے سے ہنسی۔

"تم جانتی ہو حادثے کبھی خوشگوار نہیں ہوتے۔ حادثے تباہیاں لے کر آتے ہیں۔ تانی! تانی! میں خوفزدہ ہوں ان چند لمحوں کے عوض تمہیں عمر بھر کے لیے کوئی اذیت نہ مل جائے۔ کوئی غم جھولی میں نہ آ گرے۔"

"پتہ نہیں محبت میں سود و زیاں کا حساب کون لگاتا ہے۔" وہ بے پرواہی سے کندھے اچکا کر کولر سے پانی بھرنے لگی۔

شہرینہ نے محسوس کیا کہ اکبر شاہ نے جو جال پھینکا ہے تانیہ اس میں مکمل طور پر جکڑ چکی تھی اور یہ جال اس قدر مضبوط تھا کہ شاید اس کی نصیحتیں اس کے ایک تار کو بھی نہیں کاٹ سکی تھیں۔

"میرا دل چاہتا ہے اس کمینے انسان کو شوٹ کر دوں۔" وہ غصے سے مٹھیاں بھینچنے لگی۔

تانیہ نے پلٹ کر اسے ناگواری سے دیکھا پھر اسی ناگواریت کے ساتھ بولی۔

"شیری پلیز! آئندہ تم اکبر شاہ کے لیے ایسی زبان استعمال نہیں کرو گی۔ میں نہیں چاہوں گی کہ ہماری دوستی کے درمیان دراڑ پڑ جائے۔" اس کی آواز میں ہلکی سی بے زاری تھی۔

شہرینہ نے بے حد عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔ لہو کر دینے والی نظریں تھیں پھر ان میں ہلکی سی نمی اتر آئی۔

"دوستی... ہا... تم دوستی میں دراڑ خود ڈال رہی ہو تانیہ اکبر شاہ کو درمیان میں لا کر۔"

"ہرگز نہیں۔ وہ میرا پرسنل افیئر ہے۔" تانیہ بدستور اس کی بات رد کرتے ہوئے بولی۔

"کیا میں نے کبھی ولید کو ہماری دوستی کے درمیان سمجھا ہے۔"

"وہاٹ... ولید۔" شہرینہ کو جیسے اس جملے کی توقع نہیں تھی پھر حیرت اور دکھ سے زور سے ہنسی۔

"تم، تم تانی تم اکبر شاہ کو ولید سے کمپیئر کر رہی ہو۔ پاگل ہو گئی ہو کیا۔"

تانیہ سخت بے آرامی کی کیفیت میں آ گئی، اس نے ایک ہلکی سی سانس بھری دونوں بازو سینے سے لپیٹ کر دیوار سے لگ کر بولی۔

"میں کمپیئر نہیں کر رہی ہوں۔ صرف اتنا کہنا چاہ رہی ہوں کہ جس طرح ولید کی حیثیت تمہارے دل میں ہے اسی طرح اکبر شاہ کی میرے دل میں ہے، ولید حسن تمہیں دنیا کا حسین ترین، بلند ترین، عظیم انسان لگتا ہے نا۔ تم اس کے خلاف کچھ نہیں سن سکتیں اسی طرح میں بھی..."

"تانیہ... اکبر شاہ ولید کبھی نہیں بن سکتا۔" اس نے پرزور انداز میں احتجاج کیا۔

تانیہ ہنس پڑی پھر اس کی طرف چہرے کا رخ کر کے اسی ہنسی کے ساتھ بولی۔

" یہ محض تمہارے اپنے احساسات اور جذبات ہیں جو تم ولید کے لیے اپنے دل میں رکھتی ہو' وگرنہ ولید بھائی فرشتہ نہیں ہیں۔ان پر ٹرسٹ تم صرف اس لیے کرتی ہو کہ تم ان سے محبت کرتی ہو۔ورنہ ضروری تو نہیں کہ وہ تم سے عمر بھر وفا کریں گے۔ تمہیں تمہاری طرح چاہیں گے۔اس کی کیا گارنٹی ہے۔"

" شٹ اپ تانیہ شٹ اپ۔"

تانیہ تحقیرانہ انداز میں مسکرائی۔مگر دوسرے پل اس کی مسکراہٹ گم ہو گئی۔

" بس شیری کچھ ایسی ہی محبت مجھے اکبر شاہ سے ہے۔"اب اس کی آنکھوں میں سرخی امڈنے لگی اور سرخی کے عقب میں ان گنت سلگتی خواہشوں کا دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا اس نے شہرینہ کے چہرے سے نگاہیں ہٹالیں اور ایک گہری سانس بھر کر دیوار سے سر لگا کر تھکے تھکے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

شہرینہ نے اپنا شولڈر بیگ تخت سے اٹھایا اور اس کی طرف دیکھے بغیر داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

" شیری۔شیری پلیز بات سنو۔" تانیہ اس کے پیچھے لپکی مگر وہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر باہر نکل گئی۔تانیہ بے بسی کے احساس کے ساتھ اس کی گاڑی سے اڑنے والی دھول کو دیکھتی رہ گئی۔

X...X...X

دوسرے روز تانیہ' شہرینہ کی خفگی دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی لگاتار دو پیریڈ فری تھے وہ دونوں لان میں اپنے مخصوص گوشے میں بیٹھی تھیں۔

" شیری پلیز! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہماری دوستی کے درمیان یہ موضوع زیر بحث نہ رہے' ہم اسے دو الگ الگ خانوں میں رکھ سکتے ہیں' میری ذات کا یہ گوشہ سمجھو تمہاری نظر سے مخفی ہے۔"

اس کا لہجہ ملتجی تھا جبکہ شہرینہ اسے دیکھ کر رہ گئی پھر سانس بھر کر سوکھی زمین پر تنکے سے لکیریں کھینچتے ہوئے بولی۔

" تانی! تم اس سفر میں ابھی نووارد ہو۔ تمہیں نہیں پتہ یہ بڑا تکلیف دہ سفر ہوتا ہے' بہت اذیت اور صبر آزما بکھر کر جڑنے کے عمل سے بار بار گزرنا پڑتا ہے۔تانی جذبے کھیل نہیں

ہوتے ان میں دل خرچ ہوتا ہے۔خون خرچ ہوتا ہے۔یہ محبت سب فریب ہے۔مردوں کا پھیلایا ہوا جال‘ جس میں ہم لڑکیاں کبھی دانستہ کبھی نادانستہ پھنس کر بہت کچھ گنوا دیتی ہیں‘ اچھی بھلی زندگی تم نے کانٹوں کی نذر کر دی

تانی!“

اس کی آواز ٹوٹے ہوئے کانچ کی طرح تھی۔تاینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹھوڑی اوپر کی طرف اٹھائی۔

”کبھی ولید بھائی نے تمہارا اعتبار توڑا ہے شیری!“ وہ پتہ نہیں کھوج رہی تھی یا اپنا دفاع کر رہی تھی۔

اس نے پلکیں جھکاتے ہوئے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنی ٹھوڑی سے ہٹا دیا۔

”پتہ نہیں۔ابھی تک تو میں اپنے ہی اعتبار پر جی رہی ہوں۔“ ایک گہری سانس لے کر اس نے تانیہ کی طرف دیکھا تو تانیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”شیری! میں سچ کہہ رہی ہوں اس دن میں دانستہ اکبر شاہ کے ساتھ نہیں گئی تھی۔وہ تو بس مجھے سڑک پر نظر آ گیا میں رکشہ ڈھونڈ رہی تھی اس نے مجھے لفٹ کی آفر کر دی اور میرے ہاتھ میں ڈھیر سارے شاپر تھے میں انکار بھی نہ کر سکی۔میں سچ کہہ رہی ہوں شیری!“

”خدا کرے ایسا ہی کچھ ہو۔“ وہ ہلکے سے مسکرا دی‘ تانیہ خفیف سی ہو کر نظروں کا زاویہ بدل کر بولی۔

”چھوڑو اس ٹاپک کو۔یہ بتاؤ نومی کے نکاح میں تو آ رہی ہو نا۔“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلا دیا۔” ظاہر ہے بھائی ہے وہ میرا‘ تمہاری شادی میں آؤں یا نہ آؤں اس میں تو ضرور آؤں گی۔“ وہ جرنل سے مٹی جھاڑنے لگی۔تانیہ کو زور سے ہنسی آ گئی۔

”کیوں‘ میری شادی میں کیوں نہیں آؤ گی۔“ جواباً شہرینہ نے اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ نظریں کترا کر اپنی کتابیں بھی سمیٹنے لگی پھر کھسیاہٹ دور کرتے ہوئے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولی۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح

کوئی چارہ ساز ہوتا' کوئی غمگسار ہوتا

" یہ دوستی ہی تو ہے تانی! کہ میں تمہیں ان راستوں کی طرف جاتا نہیں دیکھ سکتی' ان وعدوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے نہیں دینا چاہتی جن کی بنیاد ہی فریب پر رکھی گئی ہو۔" وہ دونوں کلاس روم کی طرف بڑھ گئیں۔

X...X...X

ولید دروازہ ہلکے سے بجا کر اندر داخل ہوا تو وہ اپنے کپڑوں پر آئرن پھیر رہی تھی۔ گیلے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے جس کے کناروں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ عجیب ٹھنڈک اور طراوت کا احساس دلا رہے تھے۔ سنہری بالوں کا یہ ٹھنڈا ٹھنڈا آبشار نیچے تک جا رہا تھا۔

" تم ابھی تک ڈریس اپ نہیں ہوئیں۔" ولید نے کچھ برا مان کر کہا۔ اس کی نظریں اس کے بالوں پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ اپنے خیالات سے نکل کر اس کی آواز پر سٹپٹا کر پلٹی۔

" شیری! اتنی لیزی کیسے ہو گئی ہو تم؟" اس نے اپنی کلائی پر بندھی سلور واچ پر نگاہیں ڈالیں۔

" اصولاً تمہیں تو سب سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا تم مہمان نہیں میزبان ہو۔"

" ہاں جی تانیہ بی بی کے بھی دو فون آ چکے ہیں۔"

صغریٰ اس کے باتھ روم سے برآمد ہوئی اور گیلے ہاتھ اپنی چادر کے پلو سے پونچھتے ہوئے عادت کے مطابق بیچ میں بولے بغیر نہ رہی۔

" شاید یہ بھی اہمیت جتانے کا کوئی طریقہ ہوتا ہو گا۔" وہ اس پر تفصیلی نگاہ ڈال کر ذرا سا مسکرایا مگر وہ ہمیشہ کی طرح بھڑکی نہیں۔

" اب اتنی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ بھابی بھی کہاں تیار ہوئی ہیں۔" وہ کپڑے ہینگر کرنے لگی پھر دوپٹہ کھول کر اطمینان سے اس پر آئرن پھیرنے لگی۔

" تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے بھابی اور آنٹی جا چکی ہیں۔"

" کیا آ... " وہ پلٹی پھر جھینپ کر دوپٹہ جلدی سے کندھے پر ڈالا اور کنارا سر پر کھینچ لیا۔

"امی بھی چلی گئیں؟ کب گئیں وہ لوگ۔"

"مجھے تو نہیں پتا' اینی وے تم دس منٹ میں تیار ہو جاؤ میں لاؤنج میں ہی ہوں فوراً آ جاؤ۔" وہ باہر نکلنے لگا کہ اس کی حیرت بھری آواز ابھری۔

"آپ' آپ بھی جائیں گے۔"

"کیا مطلب؟ میں کیوں نہیں جاؤں گا؟" اس نے ایڑیوں کے بل پلٹ کر اسے تعجب سے دیکھا تو وہ ہلکے سے ہنس پڑی۔

"آپ کے مہمان جو آرہے ہیں بہت دور سے اور بہت خاص۔"

خاص' پر اس نے کچھ اس طرح زور دیا کہ وہ اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گیا پھر سر ہلا کر بولا۔

"ہاں مہمان تو آرہے ہیں مگر وہ لیٹ آئیں گے۔ ایک دو گھنٹے میں میں واپس آجاؤں گا سکندر سے میری بات ہو چکی ہے۔"

"چند گھنٹوں کے لیے جانے کی ضرورت کیا ہے یا پھر آج مہمانوں کو آنے سے روک ہی دیتے۔" وہ سر جھکا کر دوپٹے کے کناروں پر آئرن پھیرنے لگی۔

ولید نے ترچھی نظر اس پر ڈالی۔

"بہت دور سے آئے مہمانوں کو منع بھی تو نہیں کیا جا سکتا نا۔ چلو بھئی بہت پھیر لیا آئرن' جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" وہ اس کے دوپٹے پر نظر ڈال کر بولا۔

"دور رہنے والے دل سے زیادہ قریب بھی تو ہوتے ہیں نا شاید اس لیے۔" وہ دوپٹہ اٹھا کر ہینگر میں جمانے لگی۔

"کہتے ہیں نا کہ دوریاں محبت کو شدید کرتی ہیں۔" آگے آئی لٹ کو اس نے کان کے پیچھے ڈالا اور ایک معنی خیز نظر اس پر ڈال کر رخ موڑ لیا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا بڑے غور سے دھیمی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آکر پھیل گئی۔

"کہتے تو یہ بھی ہیں کہ محبت میں قرب کی آمیزش ہو تو وہ اسے بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے قربت تو جذبوں کو جلا بخشتی ہے۔" وہ اس کے بالکل نزدیک آکر کھڑا ہو گیا اتنا کہ اس کے

قرب کی آنچ اس کے حواس کو جھلسانے لگی۔اس کے مخصوص پرفیوم کی مہک نتھنوں سے ٹکرا کر دل میں شور مچانے لگی۔

اس پر اس کا لودیتا سرگوشیانہ لہجہ۔

اس کی نگاہوں کی تپش۔

وہ سٹپٹا کر پلکوں کی باڑھ جھکا کر ہینگر صغریٰ کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

" صغریٰ یہ واش روم میں رکھ دو۔"

ولید کو کمرے میں یکدم صغریٰ کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ سنبھل کر پیچھے ہٹا اور اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر باہر نکل گیا۔

شہرینہ نے بے ساختہ لب دانتوں میں دبا کر اضمحلال کے ساتھ ہلتے پردوں کو دیکھا۔

پتہ نہیں ایسا کیوں تھا اپنی غیر موجودگی میں یہ شخص دل کے بے حد نزدیک محسوس ہوتا اتنا کہ اسے کھو دینے کا خوف اذیت بن کر دل کا لہو کرنے لگتا اور قریب آنے پر دور بہت دور دکھائی دیتا۔

یا تو وہ خود اپنے خول میں سمیٹ جاتی یا پھر... درد دیتی سوچیں فاصلوں کا احساس دلانے لگتیں۔

X...X...X

وہ گاڑی میں بیٹھی تو اسی بے آرامی کی کیفیت میں تھی۔وہ گویا' اس کا منتظر ہی تھا۔اس کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

" بھابی بتا رہی تھیں تانیہ سے تمہاری کچھ مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔" وہ اس روز کے واقعہ کی بابت کہہ رہا تھا۔

اس نے یوں ہی بے ارادہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔

" تو پھر میرا قصور کہاں نکلتا ہے۔" اس نے شفاف سڑک پر گاڑی بھگاتے ہوئے براہِ راست اس کی کھلی آنکھوں میں جھانکا اور ہلکے سے ہنسا۔

اس نے لب باہم دبا لیے اور پلکیں جھکا لیں۔

" تو میں نے کب آپ کے قصور نکالے ہیں۔" اس کا انداز کسی کم سن ناراض بچے کی طرح تھا۔

اس خود سر شخص کے آگے وہ خود کو انتہائی کمزور محسوس کرنے لگتی تھی۔

اس قدر کمزور ہونے کے باوجود خود کو مضبوط ظاہر کرنے کا کھیل کوئی آسان بات تو نہ تھی۔

" مجھے تو یہی لگ رہا تھا کہ تانیہ سے ناراضگی کا نزلہ بھی مجھ پر گر رہا ہے۔"

پتہ نہیں وہ اسے زچ کر رہا تھا یا شکایت۔ وہ چڑ سی گئی اپنا قصور تو اس شخص کو کبھی دکھائی ہی نہ دیتا تھا اس کے رویے ہی برے لگتے تھے۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے وضاحت ضروری سمجھی مگر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ گاڑی ایک طرف روکے جیب سے لاکٹ نکال کر اس کے آگے لہرا رہا تھا۔

" یہ کیا ہے؟ میرے گفٹ کی یہ توہین تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یا تو گفٹ پسند نہیں آیا یا گفٹ دینے والا۔"

اس کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔

" یہ' یہ آپ کے پاس کیسے آگیا۔" اس کا لہجہ جھینپا ہوا تھا۔ ولید نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر لاکٹ کو مٹھی میں جکڑ کر اس پر نگاہیں جما دیں۔

" تمہاری گاڑی میں اس روز بہت بے دردی سے پڑا ہوا دکھائی دیا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس کھینچی اور ہتھیلی کھول کر اس کے آگے کر دی۔

" کیا کیا جائے' تحفے کبھی کبھی ناپسند ہونے کے باوجود وصول کرنے پڑتے ہیں اور ناپسند لوگوں کے بھی۔"

اس نے خفت کے ساتھ اپنا ہاتھ لاکٹ کی طرف بڑھا دیا۔ جیسے ہی اس کی انگلیاں اس کی ہتھیلی سے مس ہوئیں ولید نے مٹھی بند کر لی۔ اس کی انگلیاں اس کی گرفت میں آکر لرز گئیں۔

ولید نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گلابی ہو گئی۔ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے رخساروں پر یکدم اترنے والی سرخی کا کھیل دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بری طرح ہرٹ ہو گئی اور ناگواری کے ساتھ اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

" میرا ایک اصول رہا ہے کہ میں دی ہوئی چیز کبھی واپس نہیں لیا کرتا اور... " وہ ذرا سا رک کر اس کی طرف جھکا اور لاکٹ اس کی گود میں پھینک دیا۔

" میں اپنی چیزوں سے کبھی دستبردار نہیں ہوا کرتا۔ چاہے کیسے بھی ناموافق حالات رہے ہوں۔" اس کے لہجے میں عجیب بے عنوان سی سرد مہری اتر آئی تھی۔

شہرینہ کا دل چاہ رہا تھا' وہ گاڑی سے اتر کر بھاگ جائے' عجیب احساس سے آنکھیں سلگنے لگیں۔ اس نے لاکٹ اپنا پرس کھول کر اس میں پھینکنے کے انداز میں ڈال دیا۔

" گاڑی چلائیے پلیز' تانیہ انتظار کر رہی ہو گی۔ ہم پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔"

وہ اس کی طرف سے رخ موڑ کر شیشے کے باہر نیون سائن کو تکنے لگی۔ اسے اپنے دل کی حالت بھی ان ہی سائن بورڈز کی طرح محسوس ہو رہی تھی' جل رہی تھی' بجھ رہی تھی۔

اس نے اگنیشن میں لٹکی ہوئی چابی کو گھماتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ گود میں رکھے ہوئے بلیک پرس پر دونوں ہاتھ لپیٹے رخ موڑ کر یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی کم سن بچہ مطلوبہ چیز نہ ملنے پر روٹھ کر بیٹھا ہو۔ اس کے لبوں کی تراش میں بے ساختہ سی مسکراہٹ کوندی تھی۔

گاڑی سکندر کے محلے میں بندھے ہوئے شامیانے کے قریب رک گئی' وہ تیزی سے نیچے

اتری' تانیہ شامیانے کے داخلی دروازے پر ہی مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے دل کے اندر چھایا ہوا ایک خوف جو بوجھ کی طرح رکھا ہوا تھا' اتر گیا' وہ بے حد خوشگواریت کے ساتھ اس کی جانب لپکی' پھر شرارت سے چہک کر بولی۔

" ٹھہریے ٹھہریے' پلیز آپ دونوں یہیں رکیے۔ میں ذرا مووی میکر کو بلا لوں یقین کریں آپ دونوں اس وقت بے حد زبردست کپل دکھائی دے رہے ہیں۔"

" کیا بدتمیزی ہے تانی!" وہ تانیہ کے قریب آ کر اسے گھرکنے لگی اور دزدیدہ نظروں سے ولید کی طرف دیکھا۔

بلیک شلوار قمیض میں وہ ہمیشہ کی طرح اسمارٹ اور چارمنگ لگ رہا تھا۔ تانیہ کی شرارت کا برا ماننے کی بجائے وہ سر خم کرتے ہوئے بولا۔

" چلو یہ شوق بھی پورا کر لو تم۔" وہ شہرینہ کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔ اتنا کہ اس کے وجود کی آنچ اس کے حواس جھلسانے لگی۔ ایک بے نام سا اضطراب دل پر رقم ہو گیا۔ وہ قدم اٹھانے لگی کہ ولید نے اس کی کلائی پکڑ کر اس کے بڑھتے قدم کو روک دیا۔

"کتنی بری بات ہے' اتنے خلوص سے وہ مووی میکر کو بلا رہی ہے اور تم اس کی اتنی سی خواہش پوری نہیں کر سکتیں۔"

"او کے تانیہ! وی آر ریڈی۔"

تانیہ محظوظ ہو کر ہنسی اور پلٹ کر جلدی سے مووی والے کو بلانے لگی۔ جبکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس شخص کا منہ نوچ لے۔ اسے دل کھول کر برا بھلا کہے۔ وہ اس کی گرفت سے کلائی چھڑانے لگی کہ اس نے گرفت اور مضبوط کرتے ہوئے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا پھر اس کی طرف جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"لوگ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے کہ ہم دونوں اس وقت بہت چارمنگ دکھائی دے رہے ہیں۔ ویسے ایک بات ہے۔" اس نے اس کی کھلی کھلی آنکھوں میں جھانکا اور بھوئوں کو ہلکی سی جنبش دی۔

"میں تو ہر وقت ہی اتنا چارمنگ نظر آتا ہوں۔"

"تانیہ کی تو بکواس کی عادت ہے۔" اس نے رخ موڑ لیا۔ "آپ یہ شوق کسی اور کے ساتھ پورا کر لیجیے گا۔"

"مثلاً۔" جواباً وہ اطمینان سے بولا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی مووی کی تیز روشنی یکلخت دونوں کو چمکا گئی۔ وہ سٹپٹا کر تانیہ کو گھورنے لگی' پتہ نہیں تانیہ نے مووی میکر کو کیا کہا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے دونوں کے پوز بنانے لگا۔

"اوہو تو یہاں فوٹو سیشن جاری ہے' کیا کہنے بھئی۔" مونا بھابی بھی چلی آئیں۔

"کیا کیا جائے' میری بہت ہی اچھی سی بہن کی خواہش تھی' پوری تو کرنا ہی تھی۔" ولید نے مسکرا کر تانیہ کو دیکھا پھر مووم میکر کو ہاتھ کا اشارہ دے کر مزید مووی بنانے سے روک دیا۔

"اوہو بہن کی خواہش' ہائے بہن بیچاری کا ناتواں کندھا۔" مونا بھابی کا جملہ بھی برجستہ تھا اور قہقہہ بھی۔

وہ پلٹ کر جواب دینے کی بجائے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا دیا اور سکندر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سکندر اسے دور ہی سے دیکھ چکا تھا اور شہرینہ کے ساتھ مووی بناتے دیکھ کر اس کے قدم جانے کیوں آگے بڑھنے کی بجائے وہیں تھم گئے تھے۔ وہ شلوار سوٹ میں اونچا لمبا مسکراتا ہوا

اپنی سحر انگیز شخصیت کے ساتھ اس خوب صورت دل موہ لینے والی لڑکی کے ساتھ کھڑا بے حد پیارا الگ رہا تھا۔اس کے دل پر عجیب سا احساس رقم ہو گیا۔تاہم اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر پورے خلوص اور محبت سے اپنے بازو کھول کر اسے خود سے لپٹا کر کمر پر دھپ ماری۔

" اتنی دیر لگا دی' میں نے فون کیا تھا تو آغا جی نے بتایا ان دونوں کو گھر سے نکلے گھنٹہ بھر ہو چکا ہے۔یہ گھنٹہ کہاں لگا دیا۔میرے گھر کا راستہ تو دس پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہیں ہے۔"

" بس یار! راستے میں رکنا پڑا تھا۔ہوا نکل گئی تھی۔" وہ بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہونٹ دبا کر مسکراہٹ روک رہا تھا۔

سکندر نے اسے گھور کر دیکھا۔

" کس کی ہوا نکل گئی تھی۔" جواباً اس کا قہقہہ بکھر گیا۔اس نے داخلی دروازے کی طرف دیکھا اور برملا کہا۔

" اس لڑکی کی۔اس کی ہوا ہی بھر رہا تھا۔کبھی کبھی یہ پھولے ہوئے غباروں کی طرح ہو جاتی ہے۔ذرا سوئی چبھی اور ساری ہوا نکل گئی۔"

سکندر اس جملے کی گہرائی میں اتر ہی نہ سکا۔صرف مسکرا کر اسے لیے نومی کے سسر سید صاحب کی طرف چلا آیا اور اسے متعارف کرانے لگا۔

X...X...X

نومی سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس چہرے پر بشاش مسکراہٹ کے ساتھ سب کو ویلکم کرتے ہوئے خود بھی سب کی توجہ کا مرکز تھا۔سید صاحب کی نظریں بھی اپنے ہونے والے داماد پر جمی ہوئی تھیں۔ایک چمک ان کے باریش چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ان کا ہر جاننے والا ان کے ہونے والے داماد کو سراہتے ہوئے انہیں مبارکباد دے رہا تھا جسے وہ ایک عاجزانہ مسرت کے ساتھ وصول کر رہے تھے۔

ادھر عورتوں میں رنگ و بو کا ایک سماں تھا۔نادیہ آپی ساڑھی میں اپنے متناسب سراپے کے ساتھ بے حد خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ان کا نازک سراپا ادھر ادھر متحرک تھا۔ان کی زیادہ تر توجہ سسرال والوں کی طرف تھی۔شہرینہ بار بار انہیں چھیڑ رہی تھی۔

" آپی! باری باری سب نندوں کو گلے لگا لیں۔آپ جیسی نہ سہی تھوڑی بہت تو اسمارٹ ہو جائیں گی۔"

"آہستہ بول بدتمیز لڑکی! سن لیں گے تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔" وہ اسے دھپ لگا کر بولیں۔

" موٹے لوگ اونچا سنتے ہیں۔ بے فکر رہیے۔"

عظمیٰ آئی تو ہر آنکھ دلہن پر اٹھ گئی۔ نازک سراپے والی موٹی موٹی معصوم ہرن جیسی آنکھوں والی عظمیٰ پر ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔

" شیری! عظمیٰ کتنی پیاری لگ رہی ہے نا۔ نومی کے ساتھ کتنی سوٹ کرے گی۔" تانیہ کی نظریں عظمیٰ پر ہی جمی تھیں۔ گویا اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔

" ارے ایسی ویسی، نومی بے چارے کی تو خیر نہیں، بجلیاں گرائے گی اس پر۔"

" بجلیاں تو خیر تم نے بھی ولید بھائی پر خوب گرائی ہوں گی آج۔" وہ پلٹ کر شہرینہ کو شرارت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ جواباً شہرینہ نے اسے گھورا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ایمان سے شیری! تم دونوں اندر داخل ہوتے ہوئے اس قدر پیارے لگ رہے تھے کہ میں نے بے ساختہ ہی یہ سب کروا ڈالا۔ ایسا ہے نایادگار رہے گا۔ تم نومی کی مووی دیکھو گی تو اس سین کو بار بار ریوائنڈ کر کے دیکھتی رہنا۔"

" دماغ خراب نہیں ہو گیا میرا۔" وہ چڑ گئی۔" بہر حال تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس نے ہلکے سے کہا۔ ایک حزن اس کی آنکھوں میں آکر ٹھہر گیا۔ بلا ارادہ اس کی نظریں داخلی دروازے کی طرف گئیں۔ جہاں ولید، سکندر کے ساتھ نظر آرہا تھا پھر وہ سکندر کو خدا حافظ کہتا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے دل میں کانٹا سا گڑھ گیا۔

اسے آغا جی سے پتہ چلا تھا کہ مردان علی شاہ ان سے ملنے آرہے تھے۔ اس نے تفصیل اس لیے نہ پوچھی کہ وہ مردان علی شاہ سے اچھی طرح واقف تھی کہ وہ آمنہ علی کا باپ تھا۔

ولید سے ان سب کی اتنی قربت اس کے لیے بہت بڑی آزمائش تھی۔

کبھی کبھی دل چاہتا اس شخص سے ہر تعلق توڑ لے۔ ایک اضمحلال اس کی روح تک میں اتر گیا۔

'تمہارا ہاتھ تھام کر لہر لہر ڈوبنے سے بہتر ہے ایک بار گہرائی میں ڈوب جائوں۔ بار بار پانے کی خواہش اور کھو دینے کے احساس کی اذیت سے چھٹکارا تو مل جائے۔'

اس نے دھواں دھواں نگاہوں سے اس کی گاڑی کو اوجھل ہوتے ہوئے دیکھا۔ یکلخت سارا ماحول ہی اسے بدصورت دکھائی دینے لگا۔

اس کا دل چاہا' سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی کونے میں جا کر بیٹھ جائے اور اتنا روئے' اتنا روئے کہ آنسو خشک ہو جائیں۔

وہ تانیہ کی امی کے قریب رکھی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہاں نسبتاً شور و غل کم تھا۔

وہ اس سارے ماحول سے کٹ کر اسی احساس سے سلگنے لگی تھی جسے بڑی مشکل سے بجھایا تھا مگر وہ جسم پر پہنا کپڑا نہیں تھا جسے وہ اتار دیتی۔ وہ تو کھال کی طرح لپٹ گیا تھا۔

تیری اس ادا سے ہوں آشنا

تجھے اتنا جس پر غرور ہے

میں جیوں گا تیرے بغیر بھی

مجھے زندگی کا شعور ہے

میں نکل کے اب ترے دام سے

نہ گروں گا اپنے مقام سے

میں قتیل تیغ وفا سہی

مجھے تجھ سے پیار ضرور ہے

وہ اپنی سلگتی سوچوں کے ہمراہ کتنی دور نکل گئی۔ چونکی جب مونا بھابی اس پر جھکیں سرگوشیانہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

" شیری! تمہیں تانیہ بلا رہی ہے اور سنو' وہ گھر کے اندر گئی ہے۔"

اس نے سر اٹھا کر بھابی کو حیرت سے دیکھا۔

" اندر' کیوں خیریت؟"

" دعا کرو' خیریت ہی رہے۔" ان کے لبوں سے ہلکی سانس کے ساتھ یہ جملہ نکلا۔

وہ بھابی کے چہرے پر کچھ غیر معمولی پن محسوس کرتے ہوئے جلدی سے کرسی دھکیل کر کھڑی ہو کر وہاں سے چلی گئی۔

" کیا بات ہے تانی! خیریت تو ہے؟ تم لوگ یہاں؟" گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑکا تھا۔ اندر نادیہ اور تانیہ دونوں ہی تھیں اور سامنے کھلے کمرے میں سکندر بے چینی سے ٹہلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ تانیہ کے پاس آئی جو تخت پر بیٹھی لب دانتوں میں دبائے فرش کو گھور رہی تھی۔ اس کا کامدانی دوپٹہ ذرا سا اس کے کندھے پر اٹکا ہوا تھا' باقی فرش پر بے دردی سے بکھرا ہوا تھا۔ وہ اس کا دوپٹہ سمیٹ کر تخت پر ڈال کر اس کے نزدیک بیٹھ گئی اور نرمی سے اور محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"مجھے بتائو تانیہ! کیا بات ہے؟ خدانخواستہ کیا ہو گیا؟" اس کے الفاظ ابھی حلق میں ہی رہ گئے۔ تانیہ اس کے کندھے سے لگ کر رو پڑی۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔

اس نے نادیہ آپی

کی طرف دیکھا' جو ایک کرسی پر دونوں ہاتھوں کو بالوں میں پھنسائے بیٹھی تھیں۔

" تانیہ!"

" شیری! نومی پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے بتائے بنا اور باہر نکاح کے لیے اس کا انتظار ہو رہا ہے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔"

" کیا... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہیں کہیں ہو گا۔ آپ لوگوں نے دیکھا ادھر ادھر۔"

" ادھر ادھر کیا دیکھنا۔" نادیہ آپی نے ناک پونچھتے ہوئے سر اٹھایا۔

" طارق بتا رہا ہے کوئی پجارو آئی تھی۔ گلی کے نکڑ پر آکر رکی تھی' اس میں دو لڑکے تھے جو نومی کے پاس شامیانے میں آئے تھے پھر نومی ان سے سرگوشیوں میں کچھ باتیں کرتا ہوا ان کے ہمراہی باہر نکلا تھا۔ اور پجارو کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ پریشانی بھی تھی۔ بس اس کے بعد طارق کو کسی نے آواز دے کر اندر بلا لیا تھا۔ اس سے آگے نہیں پتہ کہ ..."

نادیہ آپی کی آواز اتنی دھیمی اور لرزتی ہوئی تھی جیسے روشنی سائے سے ڈر کر لرزتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ ہلکی سسکی لے کر چپ ہو گئیں تو صحن میں سناٹا چھا گیا۔ ایسا سناٹا جو حبس آلود فضا پر چھایا ہوتا ہے۔

” یہ کیسے ہو سکتا ہے۔نومی اس طرح کی حرکت کیوں کر' کر سکتا ہے۔“

شہرینہ کا دماغ اس افتاد پر ماؤف ہو رہا تھا۔اس نے نادیہ آپی کی طرف دیکھا پھر اٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھی۔

ضبط گریہ سے ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔لبوں کو دانتوں میں دبائے وہ اپنے اندر کے سیلاب کو روک رہی تھیں اور جس اذیت سے گزر رہی تھیں اس کا اندازہ شہرینہ کو بخوبی ہو رہا تھا۔

اس نوبت کا تو تصور بھی نہ تھا ان خوش باش گھر والوں میں کسی کے پاس۔تانیہ منہ دھونے چلی گئی تاکہ فریش ہو کر باہر مہمانوں میں واپس جا سکے۔

” آپی !آپ فکر نہ کریں۔سکندر بھائی انہیں ڈھونڈ کر ہی لائیں گے۔“

اس نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا' مگر اسے لگا اس کے الفاظ ٹوٹ کر گرے ہوں۔یوں بھی اپنے جملوں کی کم مائیگی کا احساس ہو تو زبان لکنت کھا جاتی ہے۔الفاظ یا تو گرفت میں نہیں آتے یا بہت کھوکھلے ہوتے ہیں۔

”نادیہ' تانیہ' بھئی کہاں ہو؟“ کسی نے منہ اندر کر کے جھانکا تھا۔نادیہ آپی جھٹکے سے ساڑھی کے پلو سے آنکھیں پونچھتی کھڑی ہو گئیں۔

وہ ہاشم بھائی تھے' ان کے کوئی رشتہ دار۔

” سکندر کہاں ہے بھئی' اور نعمان کو جلدی سے بلائیے۔باہر ان کے سسر صاحب انتظار کر رہے ہیں۔نکاح کی رسم ہو تو کھانا بھی شروع ہو سکے۔“

نادیہ آپی نے شہرینہ کی طرف دیکھا اور کرب سے لب بھینچ لیے۔جبکہ شہرینہ خود ہی جلدی سے آگے بڑھ کر کمرے کی دیوار کے پاس رک کر بولی۔

” جی بس آ رہے ہیں نعمان بھائی۔“

” اچھا اچھا۔ذرا جلدی بھیج دیجیے گا۔پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔نیک کام جتنی جلدی ہو جائے تو اچھا ہے۔“ وہ سر ہلا کر دروازے ہی سے لوٹ گئے۔

”آپی ! پلیز اس طرح ہمت نہیں ہارتے۔دیکھیے تانی بھی تو حوصلے سے باہر مہمانوں میں ہے نا اور آنٹی بھی۔“

شہرینہ نے انہیں تھام لیا۔ وہ ضبط چھوڑ بیٹھی تھیں۔

سکندر سرعت سے اندر آیا تھا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تھی۔ نادیہ آپی کے آنسو ٹھٹھر کر رک گئے۔ شہرینہ نے بھی بڑی آس سے اس گھنٹی کو محسوس کیا' پھر دونوں لپک کر کمرے کے دروازے تک آئیں۔ سکندر فون اٹھا چکا تھا۔ دوسری طرف غالباً نومی تھا اسی وقت سکندر چلایا۔

" نومی! تم... تم... دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ کدھر چلے گئے ہو تم۔ یہاں نکاح کے لیے انتظار ہو رہا ہے تمہارا۔"

" کیا...آ... ہوش میں تو ہو تم۔ ابھی نہیں آسکتے؟"

سکندر اور زور سے چلایا۔

" نومی! نومی فون مت رکھنا۔ بات سنو' کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

" کیا موبائل... موبائل پر ہو مگر ہو کہاں؟" جھنجلاہٹ اور شدید اشتعال سے سکندر کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

" وہاٹ... نکاح ہو رہا ہے نومی تمہارا۔ کوئی کھیل ارینج نہیں کیا ہم نے کہ پھر کر لیں گے۔ تماشا بنانا چاہتے ہو ہماری عزتوں کا۔"

" شٹ اپ' کیا سنبھال لوں میں تمہاری جگہ کسی اور سے نکاح پڑھا دوں کیا۔ مذاق بنا رکھا ہے تم نے زندگی کو۔"

" ہیلو' ہیلو۔ نومی' نومی۔"

لائن کٹ چکی تھی۔ سکندر ریسیور کو گھورتا رہ گیا پھر اتنے زور سے ریسیور کریڈل پر پٹخا کہ اس میں اسکریچ پڑ گئے اور وہیں کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

" کک... کیا کہہ رہا تھا نومی' کہاں سے بول رہا تھا؟"

نادیہ آپی بے تابی سے کمرے میں آکر سکندر کے پاس فرش پر بیٹھ گئیں۔

سکندر نے جھکے سر کے ساتھ ان پر نگاہ ڈالی پھر ایک سانس بھر کر بال مٹھی میں دبا کر سر کرسی کی پشت سے لگا لیا۔

" پلیز سکندر بھائی! بتائیے نا۔ نومی کیا کہہ رہا تھا۔ وہ آ تو رہا ہے نا؟"

اس کی اس خاموشی سے شہرینہ کو بھی وحشت ہونے لگی تھی۔

" نہیں، وہ نہیں آرہا۔ کہہ رہا ہے میں کسی طرح معاملہ سنبھال لوں اور نکاح ملتوی کر دوں۔"

یہ کہہ کر سکندر ہنس پڑا۔ یوں جیسے ٹوٹے ہوئے برتن ہولے سے آپس میں ٹکرا جائیں۔ نادیہ آپی انگلیاں دانتوں میں دبا کر رہ گئیں۔

" اسی دن سے میں ڈر رہا تھا۔ وہ جن کاموں میں لگا ہوا ہے وہاں رات دن کچھ نہیں دیکھا جاتا، ان کے اپنے شیڈول ہوتے ہیں، ان کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ ان کے حکم ہوتے ہیں اور نومی جیسوں کے جھکے ہوئے سر۔

چند نوٹوں کے عوض، غلامانہ زندگی، مائی فٹ۔ میرا دل چاہتا ہے میں اسے قتل کر دوں۔" وہ غصے کے عالم میں کرسی کے ہتھے پر مکے مارنے لگے پھر اسی وحشت کے عالم میں کھڑا ہو کر اپنی پیشانی کی ابھری رگوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا۔

" خدایا کیا کروں۔ کس طرح معاملہ سنبھالوں۔ کیسے سامنا کروں گا سید صاحب کا۔ کیا کہوں گا ان سے۔"

اس لمحے شہرینہ کو ولید کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی، مگر اس احساس کے ساتھ ہی دکھ کی لہر اسے کاٹنے لگی۔ تاہم وہ دل ہی دل میں ولید کو کوسنے کا ارادہ ملتوی کر کے پر خیال لہجے میں بولی۔

" سکندر بھائی! تھوڑا حوصلہ کیجیے اور ایسا کیجیے کہ آپ! آپ اندر ہی بیٹھیے۔ ہم لوگ باہر جا کر کہہ دیتے ہیں کہ نومی کی طبعیت اچانک بگڑ گئی ہے اور سکندر اسے ہاسپٹل لے کر گئے ہیں۔"

نادیہ آپی نے سر اٹھا کر شہرینہ کو دیکھا پھر سکندر کو۔ انہیں لگا بات تو کچھ معقول تھی۔

یوں بھی اب سر پکڑ کر بیٹھے رہنے یا رونے سے وہ اس تیزی سے بڑھتے طوفان کو روک نہیں سکتی تھیں۔ اس کے لیے بہت حوصلے اور ہمت کی ضرورت تھی اور یہ حوصلہ اپنے اندر ہی سے کھینچ کر لانا تھا۔

" مگر، مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ کس طرح ممکن ہے۔" سکندر سخت بے آرامی کی کیفیت میں بولا۔ بات دل کو لگ بھی رہی تھی اور الجھن بھری بھی تھی مگر اس وقت اس کا ذہن اس افتاد پر اس قدر مائوف ہو چکا تھا کہ وہ خود کوئی بہتر راہ بہرحال نہیں سوچ سکتا تھا۔

" ہو کیوں نہیں سکتا۔آپ کچھ دیر بعد آجایئے گا اور کہہ دیجیے گا کہ نومی کو ہاسپٹلائز کر دیا گیا ہے۔اسے فوڈ پوائزننگ ہو گئی ہے اور نادیہ آپی عظمیٰ کو منگنی کی رنگ پہنا دیں گی۔ نکاح نومی کی طبیعت سنبھلنے کے بعد سادگی سے ہو جائے گا۔بس منگنی کی رسم کے بعد کھانا ہو جائے گا۔"

اس کی بات کے اختتام تک سکندر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔کوئی اور وقت اور حالات ہوتے تو شاید وہ اس کی حسن کی تابانیوں سے نگاہ ہی نہ ہٹا سکتا۔تمام تر جذبوں سے اسے تکتا رہتا مگر اس وقت وہ اسے بس ممنون نظروں سے دیکھ رہا تھا۔جیسے اس نے بجھتے دیے میں تھوڑا سا تیل ڈال دیا ہو۔

فضا میں کچھ دیر بوجھل پن محسوس ہوتا رہا پھر نادیہ آپی بولیں۔

" چلو شیری!اسی طرح کرتے ہیں۔بہر حال کوئی قدم تو اٹھانا ہی ہے۔اب مکمل اس طوفان سے بچ نہیں سکیں گے۔کچھ تو گرد دامن پر گرے گی۔بس اتنی عزت رہ جائے کہ نگاہ اٹھا سکیں۔"وہ ایک نئے حوصلے کے ساتھ شہرینہ کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکل کر گلی کے کنارے لگے شامیانے کی طرف بڑھ گئیں۔

X...X...X

مردان علی شاہ کی لینڈ کروزر بڑی تمکنت خاموشی اور وقار کے ساتھ " جہانگیر ولا" کے پورچ میں رکی تھی اگلی سیٹ پر سفید وردی والے ڈرائیور کے ساتھ کرخت نقوش اور تنومند جسامت والا گن مین بیٹھا ہوا تھا۔اسی نے نیچے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا جس سے مردان علی شاہ ایک روائتی سیاستدان کی طرح اترے مگر جہانگیر احمد اور آغا جی نے انہیں بے حد سادہ انداز میں خوش آمدید کہا۔ایک ملنسار مسکراہٹ کے ساتھ جیسے عموماً مہمانوں کا استقبال کیا جاتا ہے۔یہ بات مردان شاہ اور توقیر شاہ دونوں ہی کو بہت کھلی تھی شاید اس لیے کہ وہ اس طرح کے استقبال کے عادی نہیں تھے۔ہار' پھولوں اور خوشامدانہ مسکراہٹوں کے ساتھ ہر جگہ پذیرائی کروانے والے اپنی عادت سے مجبور تھے۔

جہانگیر ولا کے پر وقار ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھنے تک کوئی بات نہ ہوئی۔بس مسکراہٹوں کا ہی تبادلہ ہوا تھا۔

مردان علی شاہ کچھ بے چینی محسوس کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔پھر بولے۔

" میرا خیال تھا ولید میرا منتظر ہو گا۔ دراصل میں اپنے دیے گئے وقت سے کچھ لیٹ ہو چکا ہوں۔" انہوں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔

" بس آتا ہی ہو گا۔" آغا جی بولے۔

" انتظار تو کئی طریقوں سے کیا جاتا ہے مردان صاحب!" ولید ان کا جملہ سن چکا تھا کمرے میں داخل ہو کر ان سے مصافحہ کرنے کر آگے بڑھا۔ مردان علی اٹھ کر اس سے بغلگیر ہو گئے۔

" مثلاً کبھی آپ خاموشی سے ایک جگہ بیٹھ کر سگریٹ پھونکتے ہوئے انتظار کرتے ہیں، کبھی ٹہل ٹہل کر سخت کوفت میں مبتلا ہو کر، کبھی سڑکوں پر خاک چھانتے ہوئے اور کبھی اپنے دوسرے کام نمٹاتے ہوئے کہ انتظار کی کیفیت تو بہر حال دل پر رقم ہوتی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ آخری والا طریقہ سب سے بہتر اور مناسب ہے کہ نہ وقت کا ضیاع نہ انتظار کی کوفت اور کام بھی ہوتے رہتے ہیں۔ میں بھی دراصل اپنے کچھ کام نمٹا رہا تھا۔"

آغا جی کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ بکھر آئی۔ انہوں نے پہلے ولید کی طرف دیکھا پھر مردان شاہ کی طرف۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

مردان علی شاہ ولید کی بات پر محظوظ ہوئے تھے یا نہیں بہر حال ایک بڑا سا قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر صوفے پر پھیل کر بیٹھ گئے۔

" آپ کے پوتے میں وہ ساری کوالٹیز ہیں حیات صاحب جو کسی لیڈر میں ہونی چاہئیں۔" وہ آغا جی سے بولے۔

ان کے لب و لہجے میں ولید حسن کے لیے ستائش تھی۔ جسے آغا جی بڑی تمکنت کے ساتھ وصول کرتے ہوئے مسکرا دیئے۔

" سیاسی لیڈر یا سماجی لیڈر آپ نے وضاحت نہیں کی۔" جہانگیر احمد نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے سگریٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے مردان شاہ کو دیکھا۔

"بھئی ہم تو سیاسی کہیں گے چونکہ خود سیاست سے تعلق جو ہے۔" مردان علی شاہ برجستہ بولے پھر قدرے تمسخرانہ ہنسی کے ساتھ بولے۔

" سماجی لیڈر کہاں ہوتے ہیں، جہانگیر صاحب! ان کی بھی کسی نہ کسی طرح سیاست میں انوالومنٹ ہوتی ہے۔ پس پردہ وہ بھی کسی نہ کسی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"نہیں میں آپ کی بات سے مکمل طور پر متفق نہیں ہوں۔" آغا جی جلدی سے بولے۔

"یہ الزام آپ سب پر نہیں لگا سکتے۔ کئی سماجی رہنما ہیں جن کا کسی بھی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں، وہ صرف عوام الناس کے لیے کام کرتے ہیں اور حقیقی اجر و ثواب کما رہے ہیں۔ ہاں کچھ سیاسی پارٹیاں انہیں بہکانے کا کام ضرور کرتی رہتی ہیں۔"

آغا جی کی بات پر مردان شاہ ہنکارہ بھر کر رہ گئے۔ انہیں شاید آخری جملہ چھید کر گزر گیا تھا۔ تاہم صرف سر ہلا کر سگار کے کش لگانے لگے۔

"میرا خیال ہے ہم یہاں سیاسی یا سماجی پارٹیوں کے اغراض و مقاصد پر بحث کرنے یا ان کا موازنہ کرنے نہیں بیٹھے۔" توقیر شاہ اس موضوع سے اکتا کر بولا تو سبھی نے سر ہلا دیا۔

"بھئی یہ تو ہے، اس طرح کی باتوں کے لیے ہم ہر گز جمع نہیں ہوئے۔ ولید بچے! تعارف تو کراؤ۔" آغا جی نے ولید کو دیکھا۔ جواباً ولید نے مردان علی شاہ کا تعارف آغا جی اور جہانگیر احمد سے آمنہ علی کے باپ کے رشتے سے کروایا پھر توقیر شاہ کا تعارف کروایا۔ تب مردان شاہ بولے۔

"اکبر شاہ میرا چھوٹا بیٹا ہے۔ وہ یہیں شہر میں پڑھتا ہے اور رہتا بھی شہر میں ہی ہے۔ یوں بھی آج کے لڑکے کہاں گوٹھ ووٹھ میں رہ پاتے ہیں چاہے کسی طرح بھی کی فسیلٹیز انہیں دے دی جائیں اور ہے بھی سچ، شہر جیسی رنگینی گائوں، گوٹھ میں کہاں۔" وہ خود ہی ہنس پڑے۔

"بھئی بڑی تعریفیں کرتی رہتی ہے آمنہ بچڑی تو ولید کی، سوچا اب تو ولید کے پیرنٹس سے ملنا ہی پڑے گا۔ بس مصروفیت نے اتنا عرصہ نکال دیا۔ مگر ولید کو دیکھ کر اس کے باپ سے ملنے کی تڑپ ہر بار بڑھتی جاتی ہے۔ کہتے ہیں بیٹا باپ کا پرتو ہوتا ہے۔"

ولید نے بے ساختہ توقیر کی طرف دیکھا اور سر ہلا دیا واقعی بیٹا باپ کا پرتو ہوتا ہے ایک دھیمی مسکراہٹ اس کے لبوں پر سجی تھی۔ جو اس کی شخصیت کی سحر انگیزی میں اضافہ کر رہی تھی۔

"کہاں ہوتے ہیں آپ کے بیٹے اور بہو، میرا مطلب ہے کس ملک میں۔" مردان شاہ، آغا جی سے مخاطب تھے وہ اب اصل موضوع پر آتے دکھائی دیئے۔

" میرا اکثر ملکوں میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔" وہ جھک کر سگار میں تمبا کو کی سطح کو ہموار کرتے ہوئے بولے۔"

"ولید کے والدین حیات نہیں ہیں۔" آغا جی کی آواز نے گویا فضا کی پر سکون سطح پر ہلکا سا ارتعاش پیدا کیا تھا۔

مردان شاہ کی انگلیاں جوں کی توں تمبا کو کی سطح پر ٹھہر گئیں اور نگاہیں آغا جی سے گھوم کر ولید پر آکر ٹھہر گئیں۔ توقیر شاہ کا حال بھی باپ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔

" بہت چھوٹا تھا ولید جب اس کے ماں باپ کا انتقال ہوا۔" آغا جی دکھ کے گہرے پاتال میں گویا نئے سرے سے اترے تھے۔

" مگر نا سمجھی کی عمر میں بہر حال نہیں تھا۔" ولید کی آواز ابھری۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کم ہو گئی تھی وہ ہلکی سی سانس بھر کر صوفے کے ہتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خود ہی بولا۔

" سمجھ کا تعلق یوں بھی عمر سے نہیں ہوتا' کوئی نا سمجھی کی عمر میں ہی سمجھدار ہو جاتا ہے اور کوئی سمجھ بوجھ کی عمر میں بھی نا سمجھ ہی رہتا ہے' مگر میں سمجھتا ہوں وقت سے پہلے آنے والی سمجھ بوجھ کسی نہ کسی حادثے یا واقعہ کی دی ہوتی ہے۔"

" اوہ۔" مردان شاہ اس دھچکے سے نکل کر گہری متاسفانہ سانس بھر کر ولید کو دیکھنے لگے۔

" کیسے ہوا یہ افسوس ناک حادثہ۔"

" دولت جب رشتوں اور محبتوں کے درمیان آجائے تو پھر افسوسناک حادثے جنم لیتے ہیں' سچ کا قتل ہو جاتا ہے' جھوٹ پھلنے پھولنے لگتا ہے۔" وہ دھیرے سے بولا اور چابی کی نوک سے صوفے کے ہتھے کو کھرچنے لگا۔

کمرے میں ایک مغموم سی فضا بن گئی تھی جس کا سحر سب کو جکڑے ہوئے تھا۔

مردان شاہ کی نگاہیں سلگار پر تھیں۔ مگر ایک بے نام سی بے چینی میں وہ مبتلا نظر آرہے تھے۔

" کوئی خاندانی رنجش وجہ موت بنی تھی۔" توقیر شاہ ذاتی تجسس کے ہاتھوں پوچھنے لگا۔

" رنجش کبھی وجہ موت نہیں بنتی۔رنجشیں تو صرف پیدا ہوتی ہیں اصل محرک یہ نہیں ہوتیں ان کے پیچھے نفرت' انتقامی جذبہ' دولت کا حصول یا کسی اور چیز کا حصول ہوتا ہے خیر... '' ولید نے یکدم رک کر سر جھٹکا پھر آغا جی کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔

" پلیز آپ یہ تو لیجیے۔یہ سب تو پڑے پڑے ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' آغا جی نے ملازم کی لائی ہوئی لوازمات سے بھری ٹرالی کی طرف سب کو متوجہ کیا اور پھر خود ہی مردان شاہ کی پلیٹ بھرنے لگے۔

ولید کا موبائل بجا تو وہ موبائل اٹھا کر معذرت کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔تب مردان شاہ' آغا جی کی طرف ذرا سا کھسک آئے اور کافی کا مگ ہونٹوں سے ہٹا کر بولے۔

" ولید کی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ لوگوں نے۔بھئی ظاہر ہے اب تو اس کے سرپرست آپ ہی ہیں اور خیر سے اکیلا اپنی جائداد کا وارث ہو گا۔شادی وغیرہ تو کرے گا ہی۔'' یہ کہہ کر وہ ہولے سے ہنس دیے۔

آغا جی بڑے پرسکون انداز میں سر ہلانے لگے۔ان کے لیے مردان شاہ کی بات غیر متوقع نہیں تھی وہ اسی سکون سے بولے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

" ولید پر ہم نے کبھی اپنے فیصلے مسلط نہیں کیے۔وہ بہت چھوٹی عمر کا تھا جب ہمیں ملا گو کہ چھوٹا تھا مگر اپنی عمر سے کئی گنا بڑا اور سمجھدار تھا۔اسی چھوٹی سی عمر میں اپنے فیصلے خود کرنے کا اسے شعور تھا اور مجھے تو فخر ہے اس نے آج تک کوئی فیصلہ غلط نہیں کیا۔'' یہ کہتے ہوئے آغا جی کے لب و لہجے میں ولید کے لیے مٹھاس کا دریا بہہ رہا تھا مگر مردان شاہ یہ محسوس کرنے کی بجائے ٹھٹکے تھے۔ان کے چہرے پر تردد کی لکیریں امڈ آئیں۔

" آپ نے ابھی کیا کہا کہ ولید آپ کو " ملا " تھا اس سے کیا مطلب ؟''

" جی ہاں میں گفٹ آف گاڈ ہوں آغا جی کے لیے۔'' ولید کمرے میں آچکا تھا۔مردان شاہ کے حیرت بھرے استفسار پر خود ہی بول پڑا۔گو کہ اس کا لہجہ شگفتہ تھا مگر چہرے پر شگفتگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

جہانگیر احمد نے کچھ گھبرا کر آغا جی کو دیکھا۔اشاروں میں آغا جی سے کچھ کہا مگر آغا جی ولید کو ٹوک نہ سکے۔وہ اس کے تیور جان گئے تھے کہ وہ جو کہنے والا ہے کہہ کر رہے گا۔

مردان علی شاہ اور توقیر شاہ دونوں ہی الجھن بھرے انداز میں ولید کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آغاجی میرے لیے موجود تمام انسانوں سے بڑھ کر ہیں اور جہانگیر احمد کو میں اپنے باپ سے بڑھ کر سمجھتا ہوں۔ مگر میرا ان سے حقیقی خونی تعلق کوئی نہیں ہے۔ میں کون ہوں کیا ہوں؟ بڑی الجھی ہوئی کہانی ہے کبھی فرصت سے آپ کر ضرور سنائوں گا۔ بس ابھی یہ سمجھ لیں کہ میں انسانوں کی اس سفاک بستی میں یقیناً خود کو گم کر دیتا' کبھی اپنی ذات کو پہچان بھی نہ پاتا' اور شاید متحرک دنیا کا بے کار سا عضو ہوتا' اگر یہ لوگ نہ ہوتے۔ اس حقیر ذرہ کو انہوں نے ہی تراشا ہے محترم! میری انگلی پکڑ کر مجھے میری ذات کی منزل تک یہی لوگ لے کر آئے ہیں۔ ورنہ میں راہ بھی گم کر چکا تھا۔"

اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا مگر آنکھیں آغاجی پر عقیدت مندانہ انداز میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ خاموش ہوا تو کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا لیکن اب اس سکوت میں مغموم سی اداسی کے ساتھ بے نام سا اضطراب بھی شامل تھا۔ جو مردان شاہ کی طرف سے تھا۔ وہ ولید کو ایک ٹک دیکھ رہے تھے۔ ان کے ذہن کے گوشے میں شاید کہیں بھی یہ بات نہ تھی۔

ولید بھی ان کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مبہم سے انداز میں مسکرایا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"دولت کی محبت دل میں اتر جائے تو خون کی محبت کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگتی ہیں۔ یہ سیم و تھور کی طرح دل کی زمین کو بنجر کر دیتی ہے اور بنجر زمین میں دولت کی کھردری جھاڑیاں تو اگ سکتی ہیں سچی بے غرض رشتوں کی محبتوں کی کونپلیں نہیں آہ۔ہا... یہ کیسی محبت ہے مردان علی صاحب کہ انسان اپنے خونی رشتوں کا خون کرنے سے نہیں جھجکتا۔" اس نے براہِ راست مردان شاہ کو مخاطب کیا تھا۔ وہ اپنی ہی سوچ میں تھے یا انکشاف اور حیرت کے اس فشار میں حواس بھلائے بیٹھے تھے چونک کر سر ہلانے لگے۔ مگر یک دم انہیں اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔

وہ بالکل چپ تھے۔ شاید ان پے در پے جھٹکوں سے وہ خود کو سنبھال رہے تھے یا کسی اضطراب کا شکار ہو گئے تھے۔

X...X...X

سکندر کا دل چاہ رہا تھا وہ اس دم کھڑے کھڑے نومی کو گولی سے اڑا دے۔ وہ سب کل جس ذہنی آزار اور اذیت سے گزر چکے تھے اور اب تک گزر رہے تھے نومی کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت اور وقعت نہیں تھی۔ عزت کی چادر کو اُدھیڑنے سے بچنے کے لیے ایک ایک ٹانکا

سنبھالا تھا کل اس پورے گھر نے۔ روح گھائل تھی۔ سینے پر رکھے بوجھ سے ایک ایک اعصاب دکھنے لگا تھا مگر وہ کتنے آرام سے کہہ رہا تھا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں امی! نوکری جو ٹھہری۔ اب مٹی ڈالیں جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب ایسی کوئی قیامت بھی نہیں آگئی' منگنی تو ہو گئی نا نکاح بھی ہو جائے گا۔"

اس نے جوگر اتار کر تخت کے نیچے پھینکے اور ٹھنڈے پانی کی بوتل منہ سے لگالی۔

اماں کا ہاتھ پوری قوت سے اٹھا تھا اور اس کے چہرے پر پڑا۔ بوتل اس کے دانتوں سے ٹکرائی اور اچھل کر دور جا گری' پانی چھلک کر اس کے کپڑوں پر گرا تھا۔ وہ دم بخود رہ گیا۔ نادیہ آپی نے دل پر ہاتھ رکھ کر پلکیں جھکالی تھیں۔

"بے غیرت! یہاں ہمارا خون پانی ہو گیا۔ قیامت آتے آتے رہ گئی' کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے اور تو کہہ رہا ہے مٹی ڈالیں' یہ کیسی نوکری ہے جس میں نہ عزت کا پاس ہے نہ ماں کا' بھرے مجمع میں ماں کے سر سے چادر کھینچ لیتے تم تو۔ پھر بھی یہ ہی کہتے مٹی ڈالیں۔ اب گھر گھر کی انگلیاں ہم پر اٹھیں گی' اور تم یہی کہتے رہنا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

زندگی میں پہلی بار اتنا جلال آیا تھا اماں کو۔ ان کی آنکھیں رات بھر جاگنے سے ویسے ہی سرخ ہو رہی تھیں۔ غصے اور دکھ نے ان میں دھواں سا بھر دیا' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑیں۔

"ہمیشہ میں نے سکندر کو روکا کہ وہ تمہیں کچھ نہ کہے۔ کوئی روک ٹوک نہ کرے۔ کیا خبر تھی میرے لاڈ کا آج یہ نتیجہ میرے سامنے ہو گا۔"

نادیہ آپی اماں کے قریب آکر ان کے کندھے کو تھپکنے لگیں۔

"دکھ تو اس بات کا ہے نومی کہ تمہیں کل کے واقعے پر اپنی کوتاہیوں پر افسوس اور ندامت نہیں ہے۔" سکندر تاسف سے نومی کو دیکھتے ہوئے بولا تو وہ بھنا کر کھڑا ہو گیا۔

"افسوس کیوں نہیں ہے مگر اب سارا دن بیٹھا اماں کی طرح' آپ لوگوں کی طرح دکھ تو نہیں مناتا رہوں گا۔ کہہ تو رہا ہوں مجبوری ہو گئی ہے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"کیسی مجبوری؟ دس جگہ فائرنگ کرنے کی مجبوری؟ کسی سیاسی لیڈر یا سماجی رہنما کے گھر پر گولیاں برسانے کی مجبوری؟ راہ چلتے لوگوں کو لوٹنے کی مجبوری۔"

"سکندر بھائی!" اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔اس نے سکندر کو ایسے دیکھا جیسے اس کا خون پی جائے گا' مگر سکندر کڑے تیوروں سے اسے دیکھتا ہوا اس کے قریب آیا اور ایک متاسفانہ سانس بھر کر بولا۔

"مجھے تو اماں کے فیصلے پر اب پچھتاوا ہو رہا ہے کہ ایک شریف گھرانے کی اچھی لڑکی کو اماں برباد کرنے پر تلی ہیں جس کے قابل تم ہر گز نہیں ہو۔"

"ہاں ہاں ساری اچھی نیک لڑکیوں کے قابل تو صرف آپ ہی ہیں۔" وہ بدتمیزی سے ہاتھ ہلا کر ہنسا۔اماں کے آنسو ٹھٹھر کر رک گئے تھے۔وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے نومی کو دیکھ رہی تھیں۔پھر ان کی آواز ابھری جو لرزتی ہوئی تھی۔

"تو' تو حرام کمائی میرے ہاتھوں میں دیتا رہا ہے نومی!"

ان کی آواز غم سے پھٹ گئی۔نادیہ آپی نے جلدی سے انہیں تھاما تھا وہ لرز رہی تھیں۔

"خدا کے لیے نومی! کچھ تو احساس کرو' اماں کو کتنی اذیت دو گے کچھ احساس ہے کہ نہیں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میں نہیں دے رہا اذیت' لیکن یہ دے رہے ہیں محترم نیک پارسا' سات گنگا میں نہائے ہوئے۔" وہ سکندر کو دیکھ کر نخوت سے بولا۔

"یہ میرے خلاف کرتے رہتے ہیں اماں کو' میری جاسوسی پہ لگے رہتے ہیں۔اپنی ساری توانائیاں اخبار کی بجائے مجھ پر خرچ کرتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو نومی۔" نادیہ آپی جلال میں آگئیں۔

"ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔کل سکندر نے ہی تمہاری لاج رکھ کر اس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے جتن کیے ہیں۔انہوں نے تمہاری حرکتیں اماں سے اب تک چھپائے رکھیں یہ ان کی بڑائی تھی۔مگر تم ناقدر شناس' تمہیں دولت کی ہوس نے اندھا کر دیا ہے۔اگر کل سید صاحب تمہاری انکوائری کروائیں تو میں آگے آکر کہوں گی کہ ہاں میرا بھائی اس قابل نہیں ہے' میں کسی کی بیٹی کو برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔"

"ارے جائو جائو' میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ عظمیٰ جیسی ہزاروں لڑکیاں میری جوتی پر ہیں۔" وہ تمسخر سے ہنسا پھر نادیہ پر ایک نظر ڈال کر عجیب سرد سرد سے لہجے میں بولا۔

"سید صاحب کو میری انکوائری کروانے والی حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔"

" نومی خدا کے لیے چپ ہو جائو۔دفع ہو جائو یہاں سے۔" اماں درد سے پھٹتے سر کو تھام کر بے بسی سے چلائیں۔

" میں تو سمجھ رہی تھی تم میں ابھی بچپنا ہے۔لاپرواہ طبیعت ہے مگر خبر نہیں تھی تم اخلاق و تہذیب کی حدوں سے نکلے ہوئے ہو۔کوئی ایسا قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا اس گھر میں تمہاری دو بہنیں بیٹھی ہیں۔"

نومی دروازہ دھاڑ سے کھول کر باہر نکل گیا۔

اماں تو وہیں دل تھام کر بیٹھی رہ گئیں' جو گماں میں بھی نہ تھا وہ حقیقت بن کر سامنے پہاڑ کی طرح کھڑا تھا جس سے نظریں چرا سکتی تھیں نہ قبول کرنے کا یارا تھا۔

" سکندر!" انہوں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سکندر کی طرف دیکھا۔

" تم نے مجھ سے کیوں چھپایا مجھے پہلے ہی بتا دیتے میں کسی لڑکی کا نصیب کیونکر پھوڑتی میری بھی بیٹیاں ہیں' خدا ہر بیٹی کے نصیب اچھے کرے۔یہ داغ کیسے لگ گیا میرے دامن پر سکندر ایسا کچھ تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا' کہاں کوتاہی ہو گئی میری تربیت میں' کہاں چوک ہو گئی مجھ سے؟"

وہ نادیہ آپی کے بازوئوں میں نڈھال سی ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

X...X...X

" کمال ہے اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے کسی نے بتایا نہیں۔" ولید نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے شکوں کناں نظروں سے بھابی کو دیکھا پھر شہرینہ کو۔

" بڑے افسوس کی بات ہے۔"

وہ چائے کا مگ لبوں سے لگائے بیٹھی تھی اس کی بات پر نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔

" نومی کی بات کہہ رہے ہو نا۔" بھابی بھی اس کے لیے چائے بناتے ہوئے بولیں۔

" نہیں کل جو کچھ ہوا اس کی بات کہہ رہا ہوں۔" اس کی نظریں اب بھی شہرینہ پر جمی تھیں پھر لب بھینچ کر نظروں کا رخ بھابی کی طرف کیا۔

" ہاں بس کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ نومی اس قدر لاپرواہ ثابت ہو گا' اس کی ذرا سی غفلت نے سب کو کتنا پریشان کیا۔آنٹی کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی تھی۔"

بھابی تاسف سے اسے بتانے لگیں۔

"سکندر بھی بیچارہ ٹینشن میں آگیا۔ خود سوچو نکاح سے پہلے ہی دلہا بنا بتائے غائب ہو جائے تو کیا گزرتی ہے گھر والوں پر‘ یہ تو شیری کو بر وقت بہانہ بھی سوجھ گیا اور اس نے ہینڈل بھی کر لیا۔ ورنہ سمجھو‘ ہاتھ پر ہاتھ دھرے سب کسی معجزے کے رونما ہونے کے منتظر تھے۔"

ولید نے ان کے ہاتھ سے مگ تھامتے ہوئے بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ شہرینہ کی طرف دیکھا تھا۔ سراسر تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔

"کمال ہے اس کا ذہن بھی بر وقت حل نکال سکتا ہے۔"

وہ چائے کے مگ سے اٹھتی بھاپ سے نظریں ہٹا کر جلبلا کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپ لوگوں کو کم از کم مجھے فون ہی کر دینا چاہیے تھا بھابی۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"فائدہ۔" وہ اپنا مگ رکھ کر ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"آپ آتو سکتے نہیں تھے اپنے خاص الخاص گیسٹ کو چھوڑ کر۔" پھر ہلکی سانس بھر کر کندھے اچکا کر بولی۔

"ظاہر ہے جب اتنے خاص مہمان نہ ہوتے تو آپ جاتے ہی کیوں۔ سو مجھے یقین تھا آپ آ نہیں سکیں گے اس لیے آپ کو پریشان نہیں کیا۔" اس کے لہجے میں جو کاٹ تھی وہ ولید کو ہی نہیں محسوس ہوئی بھابی بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"اپنی طرف سے فرض کر لینے میں تم خاصی ماہر معلوم ہوتی ہو۔" وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے بس ذرا سا اس کی طرف جھکا۔ اور اس کی آنکھوں میں نظریں گاڑے ہوئے دبی مسکراہٹ کے ساتھ مزید گویا ہوا۔

"مگر اتنی عقل مند تم ہو نہیں کہ تمہارے مفروضے ہر وقت درست ہی ثابت ہوں۔"

"میں نے کبھی خود کو عقل مند نہیں کہا۔" اس نے تیکھے پن سے نظروں کا رخ پھیر لیا بات سیدھی دل پر لگی تھی وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

"کہہ بھی کیسے سکتی ہو‘ اتنی سی بھی تو عقل نہیں ہے تمہارے پاس۔" یہ کھلم کھلا اہانت تھی۔ وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ کر چیخی۔

"ہاں شاید بے وقوف ہی تھی جو سچ اور جھوٹ میں کبھی امتیاز نہ کر سکی، اوپری سطح سے اندر کا گدلا پن نہ دیکھ پائی۔" وہ کرسی سے یکدم کھڑی ہو گئی۔ ولید نے کچھ حیرت اور تاسف سے اسے دیکھا۔ مگر وہ اپنے چٹخنے ہوئے اعصاب کے ساتھ بولی۔

"سکندر سے آپ کی بے تحاشا محبت کا پول بھی کھل گیا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ آپ کی نظر میں اہمیت کس کی ہے۔ ہاں ظاہر ہے ہر شخص اپنے جذبات کو اولیت دیتا ہے۔ بے چارے سکندر بھائی دوست ضرور ہیں مگر قلبی لگاؤ تو ان سے آپ کو ہو ہی نہیں سکتا۔" اور اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

اس نے انتہائی مشتعل انداز میں اس کے قریب آ کر اس کا بازو دبوچا تھا اور اسے دیوار پر دھکیل دیا تھا۔

"کہنے کو تو یہ میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ سکندر کے لیے تمہارا اتنا موشنل ہونا خاصی معنی خیز بات ہے۔" وہ دیوار پر ہاتھ رکھ کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"کیا؟ کیا آپ... آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں؟ اتنا گھٹیا الزام؟" وہ بھنا کر اس کی گرفت میں مچلی پھر اسے زور سے دھکا دے کر چلائی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی آپ، آپ مجھ پر اس طرح کا الزام لگائیں گے۔"

"اور جو خود مجھ پر الزامات کی بھرمار کیے جا رہی ہو یہ کچھ نہیں... بڑے رنگین، خوب صورت الزامات لگائے جا رہی ہو میں تو بڑا خوش ہوں۔" وہ آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورنے لگا پھر ہلکی سانس بھر کر سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

"بڑے دکھ کی بات ہے۔ کئی لوگ خوبصورت آنکھیں رکھنے کے باوجود اچھائی کو نہیں پہچان سکتے۔ جھوٹ سچ میں تمیز نہیں کر سکتے، مگر خیر اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے کہتے ہیں نا کہ بینائی کا کام آنکھ نہیں کرتی بلکہ آنکھ کی پشت پر دماغ ہے جو اس فعل کو سرانجام دیتا ہے اور تم شاید اس سے محروم ہو۔" اس نے مایوسی کے اظہار کے طور پر اسے دیکھا اور متاسفانہ سانس بھری۔

اہانت کے احساس سے اس کی سنہری آنکھیں گہری سنہری ہو گئیں۔

"ہٹ جائیں میری نظروں سے میں آپ کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتی پلیز۔ لیو می الون۔"

وہ اس کے پہاڑ جیسے وجود کے سامنے خود کو بری طرح بے بسی میں مبتلا محسوس کرنے لگی۔

کہتے ہیں وجود میں غم وغصے اور تلخی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو اور آدمی کچھ نہ کر سکے تو وہ بے بسی اسے اندر ہی اندر جھلسانے لگتی ہے سو وہ بھی جھلس رہی تھی۔

بھابی ان دونوں کو یوں آتش گیر مادے کی طرح پھٹتے دیکھ کر دم بخود رہ گئیں۔ شہرینہ کے رویے نے تو انہیں چکرا کر رکھ دیا تھا۔ پھر انہوں نے اٹھ کر ولید کو ایک طرف دھکیلا جو اس کی بے بسی سے شاید حظ اٹھا رہا تھا۔ اور شہرینہ کو تھام کر بولیں۔

"کیا ہو جاتا ہے تم دونوں کو ایک دم سے۔"

"ہم دونوں کو نہیں صرف ان محترمہ کو۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ اچانک اس کی بجلی فیل کیوں ہو جاتی ہے۔" ولید نے ٹرائوزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر لبوں پر پھیلنے والی کشادہ مسکراہٹ کو دبایا تھا۔ اس نے چلچلاتی نظر اس پر ڈالی اور پلٹ کر تقریباً بھاگ کر لونگ روم سے نکل گئی۔ ولید نے بے ساختہ ایک گہری سانس بھری اور صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"میرا خیال ہے اب یہ اپنے کمرے کے بیڈ پر لیٹ کر کسی فلمی ہیروئن کی طرح رونے کا کورس پورا کرے گی۔ تیور تو یہی بتا رہے تھے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"شرم تو تمہیں آتی نہیں ہے نا۔" بھابی نے گھور کر اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ چائے کے ساتھ رکھے بسکٹ کی طرف بڑھے تو انہوں نے ایک ہاتھ جڑ دیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے یہاں پھیل کر بیٹھنے کی۔ اب جا کر اسے منائو' روئے گی تو ضرور' تم نے اچھا خاصا ٹارچر کیا ہے اسے۔"

"میں منائوں جا کر اسے۔" اس نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلا کر بھابی کو دیکھا پھر بھابی کو گھورنے پر بے ساختہ ہنس پڑا اور چائے کا مگ اٹھا کر صوفے پر بیٹھ کر ان سے بولا۔

"کیا کروں۔

سر سے پائوں تک وہ گلابوں کا شجر لگتا ہے

باوضو ہو کے بھی چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے"

پھر بھابی کی سمت آگے کو جھکا۔

"کیا اتنے اختیارات مجھے حاصل ہیں کہ منانے کا یہ مرحلہ سر کر سکوں۔ پھر آپ کو ہی شکایت ہو گی کہ بنا پرمٹ کے تم..."

" فضول مت بکو' منانے کے کئی طریقے ہیں تمہیں اس میں پرمٹ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔" بھابی بمشکل ہنسی روک کر مصنوعی خفگی سے اسے گھور رہی تھیں۔

" سوری میڈم! مجھے تو منانے کا ایک ہی طریقہ آتا ہے۔" اس نے کندھے اچکا کر گویا معذوری ظاہر کی اس کی خوب صورت آنکھوں میں شرارت مچل رہی تھی۔

بھابی جھینپ کر رہ گئیں۔

" تم سے تو بات کرنا ہی مشکل ہے' بہت اونچا اڑنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس کی اجازت تو بہر حال نہیں مل سکتی۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئیں۔

" کہاں اونچا اڑ رہا ہوں۔ میرے تو دونوں پر ہی کٹے ہوئے ہیں ورنہ یہاں نظر آتا آپ کو؟" اس کے لبوں اور آنکھوں میں معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ بھابی نے ہنسی چھپانے کے لیے منہ پھیر لیا۔ اس دم اس کا موبائل بج اٹھا وہ اسی طرف متوجہ ہو گیا۔ دوسری طرف سکندر تھا وہ اس سے باتوں میں لگ گیا۔ بھابی ٹرالی گھسیٹ کر باہر نکل گئیں۔ ان کا دھیان شہرینہ کی طرف ہو گیا۔ انہوں نے صغریٰ کو آواز دے کر ٹرالی پکڑائی اور خود شہرینہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ انہیں اس کے مزاج کی تبدیلیاں لمحہ بہ لمحہ حیران کرتی جا رہی تھیں۔

X...X...X

وہ پورا گھر اذیت سے دوچار تھا اور تانیہ بھی ان میں سے ایک تھی۔ ایسے میں اکبر شاہ کا دم اسے بہت بڑی تقویت دے رہا تھا۔ وہ اس کے پاس بھی کھل کر روئی تھی اور اپنا غم گویا بہا بیٹھی وہ بڑی نرمی اور اپنائیت سے اس کی دل جوئی کر رہا تھا۔

" بی ریلیکس تانیہ! شکر کرو سب خیر و عافیت سے معاملہ سلجھ گیا۔" وہ ایک فائیو سٹار ہوٹل کے کافی شاپ میں بیٹھے تھے۔

" کہاں سلجھا ہے' نومی نے تو سب کو پریشان کیے رکھنے کی قسم کھا رکھی ہے اور میں تو دوہرے عذاب میں ہوں' ایک طرف نومی کا دیا ہوا ٹینشن تو دوسری طرف شہرینہ خفا ہے مجھ سے' اس نے مجھے تم سے ملنے سے روکا ہے۔" وہ بے دھیانی میں بول گئی۔ اکبر شاہ ٹھٹکا۔

" کیوں؟ کیوں منع کرتی ہے وہ۔"

" پتہ نہیں۔" وہ نظریں کترا کر میز کی سطح پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

"اسے کیا حق پہنچتا ہے۔ یہ تمہارا پرسنل افیئر ہے۔ تم کوئی نا سمجھ تو نہیں ہو' نہ اس کے انڈر میں ہو۔ اسے قطعاً کوئی حق نہیں پہنچتا تمہیں پریشرائز کرنے کا۔"

اکبر شاہ کے لہجے میں ناگواری اور غصہ تھا۔ تانیہ نے میز کی سطح پر انگلیاں پھیرنے کا عمل ترک کرتے ہوئے اکبر شاہ کو دیکھا پھر ایک گہری سانس بھر کر بولی۔

"پتہ نہیں اکبر شاہ کیوں میں سوچتی ہوں کہ کچھ پا کر کھو رہی ہوں یا کچھ کھو کر پا رہی ہوں اور جو پا رہی ہوں وہ کھونے سے زیادہ ہے یا جو کھو رہی ہوں وہ پانے سے زیادہ ہے۔" وہ ایک پل رکی پھر مغموم سی اداسی سے ہنس پڑی۔

"کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے مہکتے لمحوں سے دامن بھرا بھرا ہو مگر دل کہیں پارہ پارہ ہو رہا ہے اور کبھی لگتا ہے ہر طرف خاردار جھاڑیاں ہیں مگر دل کے اندر نرم نرم مہک ہی مہک پھیلی ہوئی ہے اور بس میں اس مہک میں گم ہو جانا چاہتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا اکبر شاہ! خواب دہکتے انگارے ہیں یا حقیقت۔ خواب مہکتے پھول ہیں یا حقیقت۔" وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر میز کی سطح پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اکبر شاہ ایک دو پل اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"یہ سب تمہارے وہم ہیں' خوف ہیں جو شہرینہ وقتاً فوقتاً تمہارے اندر انڈیلتی رہتی ہے۔ سب بکواس ہے۔ حقیقت تمہارے سامنے ہے نا' خوب صورت۔" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا اور بے حد محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔

"ادھر دیکھو میری طرف تانی! میں ہوں نا' حقیقت بھی اور خواب بھی' بس میرا ہاتھ تھامے رہو میں تمہیں دہکتے الاؤ سے بھی نکال لے جاؤں گا۔ آئی لو یو ود آل مائی فیلنگز۔ تم شہرینہ کی باتوں میں مت آؤ وہ... وہ تو..." اس نے جیسے لب بھینچ کر نخوت سے سر جھٹکا۔ پھر تانیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرسراتے لہجے میں بولا۔

"وہ دراصل تم سے جیلس ہوتی ہے۔"

تانیہ کی پلکیں جھپک کر ٹھہر گئیں۔

"جیلس؟"

"ہاں۔" وہ ایک گہری سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے پیچھے ہو کر کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس کے لبوں کی ترش میں مسکراہٹ بکھر آئی۔

" ان فیکٹ' اس کے لیے یہ بہت بڑا شاک ثابت ہوا ہے کہ کہاں میں اس کے پیچھے خوار ہو رہا تھا۔اب اسے یکدم نظر انداز کرتے ہوئے تمہارا ہاتھ تھاما ہے۔وہ یہ بات برداشت نہیں کر پائی۔دراصل خوب صورت لڑکیوں میں حسد اس لیے زیادہ ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت ہر شخص کو اپنا تابع دیکھنا چاہتی ہیں' ان کے کان اپنی مداح سرائی کے منتظر رہتے ہیں۔وہ خود دوسرں کو ٹھوکر مار دیں مگر کوئی انہیں نظر انداز کر دے یہ برداشت نہیں کر سکتیں سو اسی لیے۔"

" نہیں نہیں اکبر شاہ! شیری اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے۔" وہ اس کے خیالات کی نفی کرنے لگی۔

" اسے بھلا کیا ضرورت ہے مجھ سے حسد کرنے کی اس کے پاس تو سب کی۔بے انتہا چاہتیں ہیں اور سب سے بڑھ کر ولید حسن جیسا شجر سایہ دار ہے۔" وہ بے ساختہ بول گئی پھر سٹپٹا کر جلدی سے لب دانتوں میں دبا کر اپنا بیگ اٹھانے لگی۔

" میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔بہت دیر ہو گئی ہے۔" اس نے کلائی میں بندھی گھڑی پر نظریں ڈالیں مگر اکبر شاہ یونہی بیٹھا رہا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

" تانی یہ ولید حسن کون ہے؟" اس نے چند لمحے توقف کے بعد تانیہ کو ایک ٹک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

" تانیہ کو اچانک ایک بڑی حماقت سرزد ہونے کا احساس ہوا۔بے دھیانی میں اس نے ولید کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔

" وہ کزن ہے شہرینہ کا... آئو چلیں۔"

" صرف کزن؟" اس کے لبوں کی تراش میں عجیب سی مسکراہٹ بکھر آئی۔وہ تانیہ کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔تانیہ کی نظریں کترانے اور سٹپٹانے سے وہ جان گیا کہ وہ مزید معلومات فراہم کرنے سے گریزاں ہے۔تب وہ آگے جھک کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دل آویز نظروں سے دیکھنے لگا۔

" تم مجھ سے لاکھ چھپانے کی کوشش کرو مگر یہ جو تمہاری ہرنی جیسی آنکھیں ہیں نا' انہیں ابھی ایسی چوریاں نہیں آئیں ان میں بہت معصومیت ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹھوڑی سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

تانیہ کی پلکیں لرز کر رخساروں پر جھک آئیں۔اس کا دل اس کے لمس سے معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔اس نے اکبر شاہ کا ہاتھ ہٹانا چاہا تو اس نے اس کے دوسرے ہاتھ پر بھی اپنی گرفت کرلی۔

" مجھے تمہارا یہ بے ریا چہرہ ہی تو پسند ہے تانی! تمہاری ان معصوم آنکھوں اور صاف گوئی نے ہی تو مجھے لوٹ لیا ہے۔ مجھ سے اب کچھ بھی چھپانا تمہارے لیے بہت مشکل ہے میں تو تمہارے دل میں رہتا ہوں۔"

اس کے الفاظ نرم نرم جھونکوں کی مانند تانیہ کے تپتے دل پر گر کر ٹھنڈک کا احساس اجاگر کر رہے تھے۔وہ بھول گئی کہ شہرینہ کا راز اسے طشت از بام نہیں کرنا چاہیے۔اس کے سامنے تو بس اکبر شاہ تھا۔اس کے سحر انگیز جملے تھے اس کی مقناطیسی نگاہیں تھیں۔

" بتائو نا تانی! کیا وہ بھی اپنے اس کزن کو اتنا ہی چاہتی ہے جتنا تم مجھے۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ گریز کے سارے دروازے ہی بند ہو گئے۔اس نے پلکیں اٹھا کر پھر جھکا دیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

" ہاں یا شاید اس سے بھی زیادہ۔" یہ کہہ کر وہ ہنسی۔اکبر شاہ کے لبوں سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ مگر اس نے بر وقت اپنے کھنچے اعصاب کو سنبھالا اور ہلکے سے مسکرایا۔

" بس پھر تو اس کے پاس کوئی جواز ہی نہیں بنتا کہ وہ تمہیں روکے۔ مجھ سے ملنے پر کسی طرح کی پابندی عائد کرے۔اچھا کیسا ہے اس کا کزن؟ کیا بتایا تھا ہاں ولید ہے نا۔"

" ہوں بہت زبردست ہیں۔مجھے تو وہ بس کسی انگریزی فلم کے خوبرو اور ذہین ڈیٹکٹو ہیرو لگتے ہیں۔"

" اے اے اے یو آر ناٹ فیئر۔ میں جیلس ہو رہا ہوں۔" اکبر شاہ نے اسے گھورا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

" جیلس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔وہ میرے بھائی ہیں۔پکے پکے بھائی۔ مگر ہے زبردست پرسنالٹی ان کی چارمنگ' اسمارٹ' ڈیسنٹ اینڈ مچ مور۔"

"ہوں تبھی مس خان نے ہمیں کبھی گھاس نہیں ڈالی۔" اس نے دانتوں میں لب دبا کر ٹھنڈی سانس بھری۔

"افسوس ہے کیا ابھی تک۔" تانیہ نے اس کی شکل دیکھی۔ لحظہ بھر دل پہلو میں کچھ بے ترتیب ہوا پھر وہی اعتماد سے محروم لڑکی اندر سے سر اٹھانے لگی۔

"افسوس... ارے میرا تو دل چاہتا ہے اس کے قدموں کو چوم کر اس کا شکریہ ادا کروں کہ اس کی کم توجہی کے باعث تو مجھے تم ملیں۔ ایک اچھی فیئر اور پاکیزہ سی لڑکی جس پر جتنا فخر کروں کم ہے۔" وہ آنکھوں میں خمار بھر کر تانیہ کو دیکھنے لگا۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے

تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

ہمسفر چاہیے ہجوم نہیں

اک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے

تانیہ کی پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئیں۔ وہ اس کی نگاہوں کی محویت توڑنے کی غرض سے جلدی سے بولی۔

"ارے ہاں۔ نومی کی منگنی کی تصویریں بھی تو لائی ہوں میں۔ شیری کو دکھانی تھیں مگر وہ تو آج آئی نہیں۔" اسے بیگ میں رکھی تصویروں کا خیال آگیا۔ جلدی سے بیگ کی زپ کھول کر ایک سفید لفافہ نکالا۔

"ابھی البم میں سیٹ نہیں کیں۔ صبح ہی تو اسٹوڈیو سے پک کی ہیں۔ مووی آئے گی تو میں دکھاؤں گی ولید بھائی اور شیری کی خصوصی اتروائی ہے۔ بڑے زبردست پوز بنوائے ہیں۔ اس روز وہ دونوں لگ بھی بہت پیارے رہے تھے۔ مجھے تو لگتا ہے دونوں کو ہی خدا نے فرصت سے بنایا ہے اور ہم جیسوں کو تو بس۔"

اکبر شاہ کی تمام تر توجہ تصویروں پر مرکوز تھی۔

"یہ دیکھو یہ ہیں ولید بھائی۔ کیا زبردست فوٹو آیا ہے ان کا' اوہ یہ بھی دیکھو۔ شیری! کے ساتھ اس کا مطلب ہے نادیہ آپی نے مووی بنتے ہوئے فوٹو بھی کھینچ لیے تھے۔ یہ اچھا کیا۔" تانیہ کی نظریں تصویروں پر جمی تھیں وہ ولید اور شہرینہ کی تصویریں خود بھی دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہوئے اسے بھی دکھا رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اکبر شاہ کے اعصاب پر بڑی بھاری ضربیں پڑ رہی ہیں۔

اس کی نظریں ولید حسن پر جمی تھیں اور وہ دھوکہ نہیں کھا رہا تھا۔ یہ وہی تھا جسے اس نے اپنی حویلی میں V.I.P مہمان کے طور پر بھی دیکھا تھا اور آمنہ کے ساتھ بھی کئی جگہوں پر۔

" اچھی ہیں نا۔" تانیہ بے حد معصومیت سے پوچھ رہی تھی جبکہ اسے اپنے اعصاب مستقل کھنچے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ایک عجیب سی تلخی رگ رگ کو کاٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ بڑی دیر بعد اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر کشادہ مسکراہٹ پھوٹی تھی۔ مگر تانیہ محسوس نہ کر سکی کہ اس کی مسکراہٹ میں پسندیدگی نہیں بلکہ ایک کثیف سی سرد مہری تھی۔

X...X...X

سکندر' ولید کے پاس آیا تو بہت پراگندہ اور پژمردہ سا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ پژمردگی تو اب اس کا نصیب بنتی جا رہی تھی' اس کی ہنسی' کھلکھلاہٹ جانے کن گزرے زمانوں کی باتیں ہو کر رہ گئی تھیں۔ ولید کو اس کے ذہن کے آزار سے بہت اذیت تھی۔

اب ایک نیا مسئلہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

صبح ہی سید صاحب عظمیٰ کے والد یہ دھماکہ کر گئے تھے کہ وہ نومی کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں۔ وہ اب کچھ وقت طلب کر رہے تھے جس میں وہ نومی کے سلسلے میں انکوائری کروانا چاہ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

رہے تھے' انہوں نے صاف لفظوں میں یہ بھی کہا کہ ان کے کانوں میں کئی باتیں پڑیں ہیں جو ان کے لیے تشویش کا باعث ہیں۔ اگر وہ مطمئن ہو جاتے ہیں تب تو ٹھیک ہے وگرنہ وہ اس رشتے کو ختم کر دیں گے۔

ولید کے لیے بھی یہ خاصی تشویش ناک خبر تھی۔

" یہ سب تمہاری بے جا نرمی کا نتیجہ ہے سکندر! تمہیں نومی پر شیر کی نگاہ رکھنی تھی۔"

" ہونہہ..." سکندر ہنس پڑا۔ یہ سراسر وہ خود پر ہنس رہا تھا۔

" دیکھا نہیں اس روز تم نے وہ کتنی بدتمیزی سے بات کر رہا تھا میرے سامنے' کسی لحاظ' کسی رشتے کے احساس کے بغیر۔ تمہارے اسی آفس میں اسی جگہ مجھ سے کس درجہ نفرت اور بے زاری کا اظہار کر رہا تھا۔" ولید متاسفانہ سانس بھر کر کرسی پر جھولنے لگا پھر رک کر سکندر کو دیکھا۔

" اس سلسلے میں نومی خود کیا کہتا ہے۔"

" اسے کیا کہنا ہے۔اسے تو کسی کی پرواہ نہیں۔بس دولت دولت' اور دولت کا حصول اس نے زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔" وہ عجیب دل شکستگی کے ساتھ کرسی سے لگ کر چھت کو گھورنے لگا۔

" ولید مجھے اس رشتے کا ٹوٹنے کا اتنا غم نہیں ہو گا۔ عظمیٰ بیچاری کا بھی کیا قصور ہے بلکہ ایک لحاظ سے وہ تو خوش نصیب ہی کہلائے گی۔ مگر بات' عزت' رسوائی کی ہے انگلیاں صرف نومی پر نہیں اس گھر پر اٹھیں گی۔اماں تو پہلے ہی رو رو کر بدحال ہو چکی ہیں۔"

" اگر رونے سے مسئلے حل ہو جاتے تو شاید میں بھی بہت رو چکا ہوتا۔" ولید کی آواز دھیمی تھی۔سکندر نے اس کی طرف دیکھا۔

" خیر ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو ہوتا ہی ہے۔" وہ یکدم منہ پر ہاتھ پھیر کر پیپر ویٹ سے کھیلنے لگا۔

" تم تو سکندر جس فیلڈ میں ہو وہاں تو زندگی کو بہت قریب سے دیکھتے رہتے ہو۔ تلخ اور بے رحم رخ بھی۔" وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کر فریج سے سیون اپ کے ٹن نکالنے لگا۔

" دوسروں کے دکھوں پر قلم روتا ہے دل کے آنسو نہیں ہوتے' وقتی ملال اور رنج کی فضا رہتی ہے مگر انسان جب خود کسی افتاد کا حصہ بنتا ہے تب لفظ جیسے خود پر ہنستے ہوئے محسوس ہوتے ہیں' اپنی لفاظی پر رونا آتا ہے۔"

وہ اس کے ہاتھ سے ٹن لے کر یکسر بے کیف لہجے میں بولا۔ولید نے اسے دیکھا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

" اماں نے کچھ جلدی ہی مچائی۔نومی کی بجائے پہلے تمہارے سر پر سہرا سجانے کا سوچ لیتیں تو اچھا تھا۔" اس نے شاید ماحول کے تناؤ اور اس میں پھیلی رنجیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

سکندر نے ابرو اچکا کر اسے گھورا پھر بڑا سا گھونٹ بھر کر ٹن میز پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا"

ولید محظوظ ہو کر ہنس پڑا اور میز سے گاڑی کی چابی اور موبائل اٹھا کر بولا۔

"" چلو آئو۔ ذرا تازہ ہوا کھالیں۔ تمہیں اس کی اشد ضرورت ہے۔"" وہ دونوں آفس سے باہر نکل آئے۔

"" ہوں۔ کہاں چلیں بتائو۔"" ولید گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکال کر سڑک پر بھگاتے ہوئے سکندر سے بولا جو سیٹ کی آرام دہ پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موندے بالکل ڈھیلے انداز میں بیٹھا تھا۔

"" سکندر مسائل کس گھر میں اور کس شخص کو پیش نہیں آتے' بس بات حوصلے کی ہے۔ حوصلہ بند لوگ جدوجہد سے ڈوبی شکستہ نائو کو بھی کنارے پر لے آتے ہیں اور پست حوصلے والے مضبوط کشتی کے باوجود ڈوب جاتے ہیں۔""

اس نے گاڑی کی اسپیڈ ہلکی کرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

سکندر نے ذرا سا چہرہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے کناروں پر سرخی اُمڈنے لگی تھی۔

"" نہیں ولید کچھ لوگوں پر شروع سے ہی خدا مہربان ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ناموافق حالات کی گرد انہیں چھو کر بھی نہیں گزری۔ وقت ان کے چہرے پر بہار کے لطیف

جھونکوں کی طرح ٹکرا کر گزر جاتا ہے۔"" وہ بہت غور سے ولید کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے لہجے اور جملوں کا مفہوم سمجھ کر ولید' ایک دو پل چپ ہو کر رہ گیا پھر ایک سانس بھر کر ذرا سا ہنسا۔

"" جو سمندر کی لہروں سے نبرد آزما ہوتے ہیں نا انہیں ساحل پر کھڑے ہر شخص پر ہی رشک آتا ہے مگر وہ نہیں جانتے کہ ساحل پر کھڑا شخص بھی کبھی اسی کی طرح لہروں سے نبرد آزما رہ چکا ہے۔ یا آنے والا وقت انہیں اسی طرح کی کسی پریشانی میں مبتلا کر سکتا ہے۔ بات یہ ہے سکندر کہ... ""

اس نے اسٹیرنگ پر ہلکے سے دبائو ڈال کر سکندر کو دیکھا۔

"" ہر شخص دراصل خود کو تو آئینے میں دیکھتا ہے بے حد نزدیک سے تو اسے اپنا آپ بڑا ڈرائونا' خوفناک باعیب نظر آتا ہے جبکہ دوسروں کو وہ آئینہ میں نہیں دیکھتا بلکہ فاصلے سے دیکھتا ہے۔ اس لیے وہ

اسے خوش نما دکھائی دیتے ہیں' وقت ان کے چہرے پر کتنی گرد ڈال کر گیا ہے وہ نظر نہیں آتی۔""

"کیا تم یہ بات اپنے بارے میں کہہ سکتے ہو۔" سکندر نے عجیب بے آرامی کی کیفیت میں استفسار کیا تو ولید نے اس کی طرف غور سے دیکھا پھر سر ہلا دیا۔

"ہاں بالکل اس لیے کہ میں بھی ایک بشر ہوں۔ تمہاری طرح، کمزور اور اسی طاقتور بادشاہ کا ادنیٰ سا بندہ۔ چلو چھوڑو۔ یہ بتائو کہاں چلیں۔"

"ساحل پر... بہت دن ہو گئے ساحل کو دیکھے ہوئے۔" وہ کچھ یوں سانس خارج کرتے ہوئے بولا کہ ولید اسے گھورنے لگا۔ جواباً وہ محظوظ ہو کر ہنس پڑا اور بے ساختہ گنگنایا۔

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی

اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

"اچھا بس بس اپنی یہ بھونڈی آواز کو بند رکھو، اس سے بہتر ہے میں کیسٹ لگا دوں۔" ولید نے جیسے کراہ کر کہا تھا۔

"اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔" وہ بغیر برا منائے ہنستا رہا پھر خود ہی ڈیش بورڈ کھول کر جھانکنے لگا۔

"تمہاری گاڑی میں کیسٹ ہونا گدھے کے سر پر سینگ ڈھونڈنے کے مترادف ہے۔" مایوس ہو کر اس نے ڈیش بورڈ کھٹ سے بند کر دیا۔

"خیر اب اتنا بد ذوق بھی نہیں ہوں۔" اس الزام پر اس نے مصنوعی تڑپ دکھائی اور کیسٹ پلیئر کا بٹن دبا دیا۔ دوسرے پل ایک خوبصورت آواز گونجنے لگی۔

کتنی مخمور ہیں تمہاری آنکھیں

دل کا سرور ہیں تمہاری آنکھیں

تجھ کو میری قسم اب تو آجا

آنکھوں کے ساغر سے آ کے پلا جا

نشے میں چور ہیں تمہاری آنکھیں

دل کا سرور ہیں تمہاری آنکھیں

سکندر کے لیے یہ حیرت اور شدید حیرت کا دھچکا تھا۔ وہ تو ولید کی گاڑی میں کیسٹ کا ہونے پر بھی مجسم حیرت تھا کہ گیت کے الفاظ پر کچھ عجیب سی فضا دل پر چھانے لگی۔

تو جس کو دیکھے وہ تاب نہ لائے

پلک جھپکتے ہی تیرا ہو جائے

جلوہ نور ہیں تمہاری آنکھیں

اس کے ذہن کی سطح پر بے ساختہ دو زندگی سے بھرپور آنکھیں اتر آئیں' اس نے چونک کر ولید کے چہرے کی طرف دیکھا جیسے کچھ کھوجنا چاہ رہا ہو۔ شاید ایک توجہ اور دلچسپی اس کے چہرے پر بھی رقم تھی۔

کسی خوب صورت خیال کا ہالہ۔

کوئی جلوہ نور جیسی آنکھیں اس کے تصور میں بھی جلوہ گر تھیں۔

سکندر کی یکدم اپنے چہرے پر جم جانے والی نگاہوں نے ولید کو کانشسکر دیا پتہ نہیں وہ کیوں جھینپ گیا اور بٹن آف کر دیا۔

بس کبھی کبھار سفر لمبا ہوتا ہے تو ایسی بے کار سی کیسٹ لگا لیتا ہوں۔"

سکندر مسکرا بھی نہ سکا نہ کوئی شگفتہ جملہ کہہ سکا دل عجیب سی اتھاہ میں ڈوب کر کسی خیال سے ٹکرا کر ٹھہرا تھا اس کے تصور میں کئی منظر بن کے مٹے تھے۔

نادیہ کے شرارت بھرے جملے۔

شہرینہ کا ولید کے گاؤں جانے پر ناراض ہو جانا۔

اور نومی کے نکاح والے روز ولید کا شہرینہ کو پکڑ کر مووی بنانے کے سارے منظر۔

تانیہ کا مووی میں وہی پوز بار بار ریوائنڈ کر کے دیکھنا اور محظوظ ہو کر دھیرے دھیرے مسکراتے رہنا۔ جیسے وہ کسی خاص راز سے واقف ہو۔

موتی ہو کہ شیشہ جام ہو کہ در

جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے

جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر

دامن میں چھپائے بیٹھے ہو

آس کے موتی کی لڑی لڑی پروتے ہوئے جب چھوٹ جائے تو ٹوٹ جاتی ہے اور جو ٹوٹ جائے وہ کب بھلا جڑ سکتی ہے۔

چاہے امید کا موتی ہو یا

آس کا جام

خواہش کا شیشہ

" سکندر یاد ہے تمہیں ہم پہلے یہاں کتنا آیا کرتے تھے۔" نسبتاً کم ہجوم ساحل کے سامنے گاڑی روک کر اپنی طرف کا شیشہ اونچا کرتے ہوئے ولید کہہ رہا تھا۔

سکندر نے ایک گہری سانس بھری اور سامنے حد نظر تک پھیلے بے چین و بے قرار سمندر کی طرف دیکھا اور ایک اضمحلال کے ساتھ ہنس دیا۔

مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے۔

خوب صورت مگر خوفناک ٹھنڈا اور وسیع سمندر ان دونوں کا منتظر ہی تھا موجیں ان کے پیروں سے لپٹنے لگیں۔

" میں سوچتا ہوں سکندر! اگر سمندر نہ ہوتا تو کتنے لوگ اپنے درد اور جان لیوا داستانوں کو اپنے اندر ہی اتار کر سینے کھنڈر کرتے رہتے' یہ سمندر کتنے رازوں کا امین ہے' کتنے دکھے ہوئے دلوں کے درد کا مداوا ہے' یہاں لوگ اپنا دکھ اس کے دامن میں پھینکتے ہیں اور اس سے سیراب ہو کر جاتے ہیں' ٹوٹے اور ہمت ہارے ہوئے انسانوں کو یہ حوصلہ دیتا ہے اسے حالات کی بے رحم موجوں سے ٹکرانے کا سبق سکھاتا ہے میں نے بھی اس سے بہت کچھ سیکھا ہے سکندر!"

اپنی ٹرائوزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس نے نظریں جھکا کر پہاڑ بناتی لہروں پر جما دیں' سکندر نے بہت حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا پھر اسی حیرت کے ساتھ ہلکے سے ہنسا۔

" کمال ہے تم بھی ایسی باتیں کرتے ہو۔ یہ تو افتاد سے گھبرائے ہوئے' حالات کے مارے لوگ کرتے ہیں' شاید مجھ جیسے۔"

وہ پیروں سے لپٹا پانی اڑانے لگا۔

" اسی لیے تمہیں یہاں لایا ہوں کہ اپنا درد اپنی پریشانی یہاں بہا دو' اور چٹانوں جیسا' ان تند خو موجوں جیسا حوصلہ لے کر جیو۔" اس نے سکندر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

" سکندر! پریشانیاں' مسائل ہمیں بے حوصلہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ حوصلہ مند بنانے کو آتے ہیں لوہا بھٹی میں پک پک کر کندن بنتا ہے تب اس کی اہمیت ہوتی ہے۔"

I am trying my best life does not sing always

.We have to be patient with the silence of life

سکندر بے بسی سے لب بھینچ کر رہ گیا' اس کا دل چاہ رہا تھا وہ ولید سے لپٹ کر بچوں کی طرح رو دے۔ مگر کتنے ہی آنسو وہ ولید سے شیئر نہیں کر سکتا تھا۔

" شاید ولید ٹھیک ہی کہتا ہے اسے سمندر کو راز داں بنا لینا چاہیے یوں بھی تو اس کے پاس اجتماعی اتنے دکھ تھے کہ اسے انفرادی دکھوں پر رونا نہیں چاہیے۔

X...X...X

ولید اپنے آفس پہنچا تو آمنہ علی کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ وہ آفس کی نشست گاہ میں بیٹھی انگریزی کا ایک میگزین الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ آہٹ پر اپنی مصروفیت ترک کر کے سر اٹھایا اور ولید کو دیکھ کر میگزین کارنر ٹیبل پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

" خیریت تو ہے' آنا تھا تو مجھے فون کر دیتیں' میں تو اس وقت آفس میں بھی نہیں آتا۔ ایسے ہی آیا ہوں' ایک ضروری فائل لینے۔" وہ بجائے اپنی میز کی طرف بڑھنے کے اس کی طرف آ گیا مگر ذرا سا ٹھٹک کر بغور اس کا چہرہ دیکھا' پھر مسکرایا۔

" خیریت تو ہے ایسے خطرناک تیوروں سے کیوں گھورے جا رہی ہو۔"

" سوچ رہی ہوں بولنے کی ابتدا گالیوں سے کروں یا کوسنوں سے۔" وہ ایک ہاتھ سے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کرتے ہوئے تڑخ کر بولی۔

ولید کے لبوں پر پھیلی اس کی دل موہ لینے والی مسکراہٹ یکسر گم ہو گئی۔ اس نے ایک ابرو چڑھا کر آمنہ علی کے تاثرات کا تفصیلی جائزہ لے کر وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

" کس ارادے سے تم نے اتنے جھوٹ بولے ہیں مجھ سے؟ کیا مجھے بے وقوف سمجھا تھا۔ جانتے ہو بابا سائیں تو تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتے۔" وہ سانپ کی طرح پھنکاری۔

"اوہ آئی سی۔" ولید کے لبوں سے ہلکی سی سانس خارج ہو گئی۔ وہ پلٹا اور جیب سے موبائل نکال کر میز پر رکھا۔ سگریٹ کا پیکٹ بھی نکال کر رکھا پھر بالوں پر ہاتھ پھیرتا میز کی دوسری طرف رکھی کرسی پر اطمینان سے پھیل کر بیٹھ گیا جبکہ آمنہ علی اسے بدستور کھا جانے والی نظروں سے گھورتی رہی۔

"پہلی بات تو یہ کہ میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا اور ارادتاً تو کبھی جھوٹ بولتا ہی نہیں ہوں۔ ہاں مصلحتاً کبھی بول گیا ہوں تو اور بات ہے۔"

"تو یہ کیا تھا اپنے پیرنٹس کے بارے میں' مجھے دھوکے میں رکھنا' میں آغا ہاؤس والوں کو ہی تمہارے فیملی ممبر سمجھتی رہی ہوں اور تم۔"

"یہ سراسر تمہاری کم فہمی تھی اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر کندھے اچکا کر کرسی کی پشت سے لگ گیا۔ پھر اس کے بولنے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکتے ہوئے بولا۔

"میرے پیرنٹس کے بارے میں تم نے کبھی کوئی سوال نہیں کیا تھا کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ' میرے ساتھ رہتے ہیں یا کہیں باہر۔ کبھی اس طرح کی کسوٹی نہیں کھیلی ہم نے کہ جھوٹ کی

ضرورت پیش آئے۔ ہاں تم نے پوچھا جب میں نے بتا دیا کہ وہ یہاں نہیں ہیں اور یہ ہے کہ وہ یہاں اس دنیا میں' میرے پاس موجود نہیں ہیں' اب یہ تم دونوں باپ بیٹی نے اخذ کر لیا تھا کہ وہ دوسرے ملک میں ہیں اور جہاں تک آغا ہاؤس کے فیملی ممبرز سے میرے تعلقات کی بات ہے تو وہ تو ہے' وہ میرے محسن ہیں میرے دوست ہیں' میرے عزیز ہیں' میرے لیے محترم ہستیاں ہیں۔"

وہ چپ ہوا تو آمنہ علی استہزائیہ انداز میں ہنسی اور اپنے میٹلک پرس سے دو تصویریں نکال کر اس کے آگے میز پر پھینکنے کے انداز میں رکھیں۔

"اور اس ہستی کے بارے میں کون سے الفاظ استعمال کرو گے۔"

ولید چونکا اور پھر کرسی پر بیٹھے بیٹھے آگے کی طرف جھک کر اس کی پھینکی ہوئی تصویریں اٹھائیں تو اسے اپنا دماغ بھک سے اڑتا ہوا محسوس ہوا۔

یہ نومی کے نکاح والے روز کی تصویریں تھیں جن میں وہ خود اور شہرینہ ساتھ ساتھ تھے۔ جو نادیہ آپی نے اپنے کیمرے سے یقیناً کھینچی تھیں۔ ایک میں شہرینہ کا ہاتھ پکڑے' دوسری اسے ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے۔

اس کے لیے یہ خوف یا خفت کی بات نہیں تھی کہ وہ شہرینہ کے ساتھ تھا' بلکہ اسے حیرت کا جھٹکا تو اس بات پر لگا تھا کہ یہ تصویریں آمنہ علی کے پاس کہاں سے آئیں اور وہ اسی حیرت کے سمندر میں غرق تھا جب اس کی استہزائیہ اور قدرے کڑواہٹ سے بھری آواز ابھری۔

" میرا خیال ہے یہ ان محترم' قابل عزت اور محسن ہستیوں کے احسان چکانے کا کوئی طریقہ ہو گا کہ ان کی بیٹی کے ساتھ۔" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خفگی بھرے طنز سے مسکرانے لگی۔

" نہیں بلکہ میرا خیال ہے یہ تو ان محترم ہستیوں کا مجھ پر ایک اور احسان ہی ہے۔" وہ تصویروں کو لیے گہری سانس لے کر کرسی پر اپنے آپ کو ذرا سا ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھتے ہوئے بولا اور بغور اسے دیکھا۔ اس جملے پر اس کے چہرے کے نقوش مزید تن گئے تھے۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے ولید کو دیکھا۔

" تمہارے پاس یہ تصویریں آئیں کہاں سے۔" اس نے اپنے اعصاب کو اب مکمل طور پر سنبھال لیا تھا گو کہ دھماکا خاصا زوردار تھا مگر اسے بھی سیلف کنٹرول میں خاصا تجربہ تھا۔
تصویریں اس نے میز کی دراز میں ڈال کر لاک دبا دیا پھر مزید خود کو پر اعتماد ظاہر کرنے کے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

لیے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر سگریٹ نکالتے ہوئے اس کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

"تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ یہ میرے پاس کیسے پہنچیں' تم نے تو شاید بہت احتیاط برتی ہو گی۔" وہ ایک گہری سانس بھر کر سگریٹ کا کش لے کر اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

وہ ایک دم ایک بدلی ہوئی لڑکی کے روپ میں اس کے سامنے تھی'

"تم میری بیوی ہر گز نہیں ہو کہ میں تمہیں باز پرس کا یہ حق دوں یا تمہارے سامنے کسی طرح کی وضاحتیں پیش کروں۔" اس کا لہجہ گو کہ دھیما تھا مگر اس میں نرمی نام کو نہ تھی بلکہ سرد سرد سی کیفیت در آئی تھی۔

یہ جملہ آمنہ علی کے دل پر کسی نوکیلے پتھر کی طرح لگا۔ وہ شاید کرسی پر بیٹھنے کے ارادے سے پلٹی تھی۔ کرسی پر بیٹھنے کی بجائے پلٹی اور کسی شیرنی کی طرح دھاڑی۔

"تم' تم تمہاری اوقات کیا ہے ولید حسن چہ جائیکہ میں تمہاری بیوی بننا پسند کروں گی۔ اونہہ محض کسی امیر دولت مند کے گھر میں پل کر تم خود کو گدی نشین سمجھنے لگے ہو۔" وہ میز پر دونوں ہتھیلیاں ٹکا کر آگے جھکی۔

"مسٹر ولید حسن! تم ایک لاوارث' یتیم شخص ہو' جس کے خاندان کا خود تمہیں اتا پتہ نہیں ہے ہونہہ... کسی اونچے کنگرے پر بیٹھنے سے کوا عقاب نہیں بن جاتا۔"

"اویو شٹ اپ۔" ولید کا ہاتھ میز پر رکھے ہوئے مائوس پر تھا جسے اس نے غصے کی اس تند لہر کے ساتھ اٹھا کر پوری طاقت سے واپس پٹخا تھا۔

وہ عمدہ مٹیریل اور ان بریک ایبل ہونے کے باوجود اس زوردار ضرب پر کڑکڑا کر ٹوٹ گیا۔

آمنہ علی نے پہلے ٹوٹنے والے مائوس کو دیکھا پھر ولید کو' جو گہری سانس بھر کر اب اپنے غصے کو کنٹرول کر چکا تھا۔تاہم اس کے چہرے پر سرخی اب بھی موجود تھی۔کمرے میں چند لمحے گہرا سکوت چھایا رہا۔دوسرے پل آمنہ علی مغرور سے انداز میں کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

"سچ برداشت کرنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے ولید حسن اور سچ تو یہ بھی ہے کہ تم نے ہمارے گائوں میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے مجھے سیڑھی کے طور پر استعمال کیا اور توقیر ٹھیک کہتے ہیں چھوٹے لوگ اوپر چڑھنے اور بڑا بننے کے لیے ہمیشہ بڑے لوگوں کا کندھا ڈھونڈتے ہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے اپنے آپ پر شرمندگی ہے کہ میں نے بڑا بننے کی اور اوپر چڑھنے کی کوشش کبھی نہیں کی شاید یہ میری نالائقی ہے۔" وہ استہزائیہ لہجے میں کہتا ہوا کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔وہ اپنے غیر ارادی طور پر امڈ آنے والے غصے کو دبا چکا تھا اب اس کے چہرے کے زاویوں میں صرف طنزیہ مسکراہٹ اور قدرے سنجیدگی رہ گئی تھی۔

اس نے میز سے اپنا موبائل اٹھایا' چابی اٹھائی اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھانے کے بعد گھوم کر اس کی طرف آیا۔

"مجھے اس سے کچھ بھی فرق نہیں پڑتا کہ تم یا تمہارا باپ میرے بارے میں اب کس طرح کے خیالات رکھتے ہیں۔یوں بھی کوئی کسی کے خیالوں کو اپنی مرضی اور منشاء کا لباس نہیں پہنا

سکتا۔ اینی وے۔" وہ ایک گہری سانس بھر کر دروازے کی طرف بڑھا اور گلاس ڈور دھکیل کر پلٹ کر اسے دیکھا وہ دونوں بازو سینے پر باندھے اپنی جگہ تن کر کھڑی تھی۔

"مجھے تمہارے کسی بھی رویے پر حیرت نہیں ہے کہ میں کچھ اسی طرح ایکس پیکٹ کر رہا تھا' ہاں تمہارے باپ کے منع کرنے کے باوجود تمہارا یہاں تک چلے آنا کچھ حیرت کا باعث ضرور ہے میرے لیے۔"

"کیا... کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں تمہاری محبت میں دوڑی چلی آئی ہوں؟" وہ بل کھا کر اس کی جانب مڑی۔

"نہیں میری ایسی اوقات کہاں؟" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "کہ مردان علی شاہ کی لاڈلی بیٹی میری محبت میں دوڑی چلی آئے۔"

وہ تپ گئی بری طرح جھلا کر بالوں کو خفیف سا جھٹک کر اس کی طرف آئی۔

"زیادہ طنز کی ضرورت نہیں ہے' مجھے اپنے باپ کی دولت پر نہیں بلکہ اپنے حسب نسب پر فخر ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ولید کو قابل رحم نظروں سے دیکھا۔

"اچھی بات ہے' ویسے کہتے ہیں حسب نسب پر وہی فخر کرتے ہیں جن کے اپنے پاس فخر کرنے کو اور کچھ نہیں ہوتا۔"

وہ کہتا ہوا گلاس ڈور دھکیل کر باہر نکل گیا۔ وہ پھر اس کے پیچھے لپکی۔

"اور جن کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور حسب نسب بھی نہ ہو وہ۔ وہ کیا کرتے ہیں مسٹر ولید۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہونٹ سکوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"وہ' وہ میری طرح صبر کرتے ہیں شاید۔" وہ ایک سانس بھر کر بولا۔ آمنہ علی اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پھر منہ پھیر کر بولی۔

"میں تمہارے ساتھ اس وقت کہیں بھی نہیں جا سکتی۔"

"میں تمہیں کسی رومینٹک جگہ پر نہیں لے کر جا رہا' بے فکر رہو بلکہ قطعی ان رومینٹک جگہ پر لے کر جا رہا ہوں۔" اب اس کا لہجہ قدرے سرد ہو گیا تھا جیسے ڈھیر ساری برف چبالی ہو۔ شاید بہت زیادہ تحمل سے کام لیتے لیتے اس کے اعصاب چٹخنے لگے تھے' حقیقتاً اسے آمنہ علی کے رویوں سے صدمہ نہیں پہنچا تھا کہ وہ اس سے ایسے نہیں تو کم و بیش اسی طرح کے رد عمل کا منتظر تھا۔

وہ اپنی گاڑی اس کے قریب لے آیا اور فرنٹ ڈور کھول دیا۔ وہ ناچار اس میں بیٹھ گئی۔

"میں، تمہیں اپنے پیرنٹس سے ملوانا چاہ رہا ہوں۔" وہ گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکال کر اسی سرد لہجے میں بولا۔

"اوہ مگر مجھے قبروں کی زیارت کا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ پرس گود میں رکھ کر ہلکے سے ہنسی۔

"تمہیں نہ سہی مجھے تو ہے۔"

"یقیناً تم کوئی غمزدہ سٹوری سنا کر وہاں کے رقت آمیز ماحول سے مجھے جذباتی کر کے اپنی معصومیت اور مظلومیت سے ٹریپ کرنے کی کوشش کرو گے۔" اس نے ایک ابرو اچکا کر اس پر طنزیہ نظر ڈالی۔

ولید کے ہاتھ کا دباؤ سٹیئرنگ پر مزید بڑھ گیا' اس کا دل شدت سے چاہا کہ وہ ایک تھپڑ اس کے منہ پر اتنے زور سے دے کہ وہ الٹ کر گاڑی سے باہر گرے' مگر وہ یونہی دانت پر دانت جمائے اپنے سیلف کنٹرول کے باعث بیٹھا رہا اور گاڑی چلاتا رہا۔

"میں یہاں تمہیں صرف آئینہ دکھانے آئی تھی اور یہ تصویریں تو جاتے وقت اکبر شاہ نے مجھے دکھائیں اور مجھے یقین ہے کہ تم ایک بڑے اداکار ہو۔"

"اداکار یا اداکارہ یہاں کون نہیں ہے' مس مردان علی! ہم سب ہی اداکار ہیں' شیکسپیئر کے قول کے مطابق تو دنیا ایک سٹیج ہے اور ہم سب اداکار۔ ویسے اکبر شاہ کے پاس یہ تصاویر کہاں سے آئیں۔"

وہ بہت تحمل سے استفسار کرنے لگا جبکہ دل کے اندر گویا تجسس اور حیرت کی موجیں سر ٹکرانے لگی تھیں' وہ تصویروں والے معاملے پر بری طرح اپ سیٹ ہوا تھا۔ اس کے ذہن کی رو شہرینہ کی طرف گئی تھی مگر وہ اپنے خیالات کے بہتے دھارے کو وہیں سٹاپ کر چکا تھا مگر اب پھر وہی ذکر شروع ہوا تھا مگر آمنہ علی نے اس کے استفسار کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اچنبھے سے وہ راستوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ کہاں پر جا رہے ہو تم؟"

وہ مانوس راستوں پر گاڑی بھگا رہا تھا کچھ دیر بعد ہی شہر کی حدود ختم ہونے لگیں۔

"تو تم بابا سائیں سے ملنے حویلی جا رہے ہو۔" کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے لہجے میں تمسخر اڑاتی ہنسی تھی۔

"مگر بابا سائیں تمہاری صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کریں گے۔"

"میں جانتا ہوں کہ میں ان کے تصورات اور سوچوں کے برعکس ثابت ہوا ہوں۔" اس نے گاڑی کی سپیڈ تیز کر دی اور ذرا سا اس کی طرف دیکھا۔

"ویسے میں گوٹھ تمہارے باپ کی قدم بوسی کے لیے نہیں جا رہا بلکہ تمہارے ادا توقیر کی بات غلط ثابت کرنے جا رہا ہوں کہ تمہارے توسط سے میں نے گائوں میں قدم مضبوط کیے ہیں۔ میرے قدم تو میری پیدائش سے پہلے ہی سے مضبوط تھے وہاں، وہاں کی ہوائوں میں۔"

اس نے گاڑی ایک کچے راستے پر ڈال دی اور لحظہ بھر چپ ہو کر راستے کا تعین کرنے لگا پھر کچھ دور جا کر گاڑی روک دی۔

یہ گائوں کا مانوس علاقہ تھا اس نے سٹیئرنگ پر ہاتھ مارا اور ونڈ سکرین کے پار دور تک نگاہیں دوڑائیں پھر کسی خیال سے سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

"آئو تمہیں بتائوں کہ میں اس گائوں کو کتنا جانتا ہوں۔ تم سے بھی زیادہ۔ وہاں دیکھو ایک سکول ہوا کرتا تھا جہاں طلب علم کے ننھے ننھے مسافر آتے تھے اور ایک شفیق اور شجر سایہ دار جیسا استاد ہوا کرتا تھا ماسٹر دین محمد۔" اس کی نظریں دور ایک ویرانے پر جمی تھیں۔

"افسوس صد افسوس کہ یہاں کے اثر ورسوخ رکھنے والوں کو اپنے سیاسی، معاشی مفاد عزیز تھے سکول سے دلچسپی تو کیا یہ تربیتی ادارہ ان کی راہ میں کانٹے کی طرح ہی تھا سو اسے ڈھا دیا گیا۔" اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا مگر وہ غیر دلچسپی سے گاڑی میں بیٹھی تھی وہ بھی دوبارہ آ کر بیٹھ گیا اور پھر ایک مسجد کے سامنے گاڑی روک دی۔

"یہ جو مسجد نظر آ رہی ہے۔ یہ پہلے چھوٹی ہوا کرتی تھی۔ اب وسیع کر دی گئی ہے مگر اس میں کمال حویلی والوں کا نہیں ہے بلکہ یہ کام رضاکارانہ طور پر کیا گیا ہے۔ گائوں کے غریب

مسلمانوں نے اپنے پیٹ کاٹ کاٹ کر چندے جمع کر کر کے اس کی توسیع کی ہے اور اسے آراستہ کیا ہے صرف جذبہ مسلمانی کے تحت اور ہاں مسجد کے پاس یہ حجرہ جو ہے یہاں امام نعمت اللہ ہوا کرتے تھے۔ان کے پانچ چھوٹے بچے ہوا کرتے تھے جواب یقینا جوان ہو کر غمِ روزگار میں لگ گئے ہوں گے اور امام صاحب جنت الفردوس کے حسین نظاروں میں مست ہو گئے ہیں۔"

"آخر تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو۔" وہ اس کے ساتھ خود بھی نیچے اتر گئی اور اتنے زور سے دروازہ بند کیا کہ ہلکی پھلکی گاڑی تو یقیناہل کر رہ جاتی مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا بلکہ چلتا ہوا ایک بوسیدہ اور کھنڈر عمارت کے سامنے جا کر رک گیا۔

وہ ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا اس کی طرز بناوٹ سے لگ رہا تھا کہ وہ کبھی ایک خوبصورت مکان رہا ہو گا مگر اب ایک اجاڑ ویران قبرستان دکھائی دے رہا تھا۔وہ ٹوٹی ہوئی اینٹوں کی چھوٹی سی دیوار پھلانگ کر

صحن نما حصے میں کود گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کے چہرے پر موجود سرخی یکلخت بڑھنے لگی۔خاص کر چہرے کے نازک حصے تو یوں لگ رہے تھے جیسے ان سے ابھی خون چھلک آئے گا۔

ٹرائوزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر اس نے ایک گہری سانس بھر کر آمنہ علی کی طرف پلٹ کر دیکھا جو اس مکان کے بجائے ولید کو بگڑے تیوروں سے دیکھ رہی تھی۔

"اسے دیکھو یہ گھر کبھی بہت آباد تھا یہاں بھی زندگی یقینا کھیلتی تھی۔مگر پھر ایک دن اس گھر کو اور اس کے مکینوں کو شعلوں کی نذر کر دیا گیا۔سب کچھ خاک کر دیا گیا۔جھوٹ زندہ رہا اور سچ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا' اس لیے آمنہ مردان علی یہ دنیا اتنی بدصورت ہے کہ یہاں سچ کا گلا گھونٹا جاتا رہا ہے اسے شعلوں کی نذر کر دیا جاتا ہے' اسے پنپنے سے پہلے قبر میں سلا دیا جاتا ہے۔"

اس کی آواز جذبات کی یورش سے بھاری ہو گئی۔

آمنہ علی اپنی جگہ ہکا بکا کبھی اس کھنڈر کو اور کبھی ولید کو تکتی رہ گئی۔تب بہت قریب سے توقیر شاہ کی آواز ابھری۔

"تم یہ سب کیسے جانتے ہو۔" اس کی آواز حیرت بھری سرسراہٹ کے ساتھ گونجی تھی ولید کے ہمراہ آمنہ بھی پلٹی تھی۔

وہ اپنی جیپ کے پاس کھڑا ولید کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت انوکھا عجوبہ ہو۔ یا کم از کم اس دنیا کی مخلوق نہ ہو۔

اس سوال پر ولید کو اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ ایک عجیب اذیت بھرا لمحہ تھا جو بہر حال گزر گیا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھوٹی۔ شاید اس نے اندرونی خلفشار کے بڑھتے طوفان کو دبا لیا تھا' اس کے چہرے پر برہمی یا پریشانی کی ہلکی سی لکیر بھی نظر نہ آنے پائی۔ وہ شام کے سمندر کے مانند دکھائی دینے لگا پرسکون سطح مگر اندر تہ میں طوفان کی شوریدہ سری۔

وہ ٹوٹی ہوئی دیوار پھاند کر باہر آیا' اس کی نظریں توقیر شاہ پر تھیں اور توقیر شاہ کی اس پر نظریں ملیں اور ایک سرد سرد سی لہر توقیر شاہ کے بدن کو چھو گئی۔ وہ پہلو بدل کو وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کبھی فرصت میں بتاؤں گا۔ ابھی تو صرف تم لوگوں کی یہ خوش فہمی' غلط فہمی دور کرنا تھی کہ میں آمنہ کو سیڑھی بنا کر اس گاؤں میں قدم جمانا چاہ رہا ہوں۔ اس کے چپے چپے سے واقف ہو رہا ہوں۔" اس نے توقیر شاہ کے کندھے پر بڑے دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا تھا مگر اس کے دباؤ میں دوستانہ پن ہر گز نہیں تھا۔ توقیر شاہ کے جبڑے بھینچ گئے مگر اس کے کچھ بولنے سے پہلے وہ قدرے اس کی سمت جھک کر بولا۔

"کبھی غور سے سننا' شاید ان ہواؤں میں میرے قدموں کی دھمک تمہیں سنائی دے' ہواؤں میں میری خوشبو محسوس ہو۔"

وہ چونکہ توقیر شاہ سے قد میں خاصا اونچا تھا سو اس کی آنکھوں میں بآسانی جھانک رہا تھا۔ لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی مگر اس مسکراہٹ میں ایک طرح کی سرد مہری تھی پھر وہ یکلخت پلٹا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرے پل اس کی گاڑی کے ٹائر کچی زمین کو روندتے ہوئے فراٹے سے گزر گئے۔

شہر کا راستہ اس نے بہت جلد طے کیا تھا اور ایک پر رونق سڑک کے کنارے گاڑی روک کر بیک سے سر ٹکا کر ڈھیلا چھوڑ دیا اور لمبی گہری سانسوں کے ساتھ ذہن سے اس ناخوشگوار واقعہ

کی ساری تلخی کشیدگی اور بدمزگی خارج کرنے لگا۔ پھر ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور ڈیش بورڈ سے ایک تہ کیا ہوا پرچہ نکالا اس پر ایک پرسوچ نگاہ ڈالی پھر اپنی شرٹ کی اوپری جیب میں رکھ دیا یہ وہ تقریر تھی جو فدا حسین کو نئے جلسے کے لیے دینی تھی سٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر اس نے سر یوں جھٹکا جیسے کسی غیر اہم خیال کو جھٹکا ہو اور گاڑی سٹارٹ کر کے فدا حسین کے بنگلے کے راستوں پر ڈال دی۔

X...X...X

بھابی کی پرزور کوشش سے ہی ہاکس بے کا پروگرام بنا تھا۔ انہوں نے زبردستی سب کو گھسیٹ لیا تھا حتیٰ کہ آغا جی اور جہانگیر احمد کو بھی۔

"ایک چھٹی کا دن آپ لوگ گھر میں سگریٹ پھونکتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے سمندر کو دیکھے ہوئے آپ کو ایک عرصہ ہو چکا ہو گا پھوپھا جان!" وہ جہانگیر احمد سے بولی تو وہ ہنس دیئے۔

"مجھے تو یاد نہیں کہ یہ کبھی اس جگہ گئے ہوں گے۔" مما نے شوہر کی طرف دیکھا۔ ان کا انداز شکایتی تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"بھئی مجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ شرارت سے بیوی کو دزدیدہ نظروں سے دیکھ کر بولے تھے۔ وہ سب بے اختیار ہنس پڑے۔

"کس سے ڈر لگتا ہے پاپا سمندر سے یا مما سے؟" وسیم بھائی کولر ڈکی میں رکھ کر اس طرف آ گئے۔

"دونوں سے ہی عورت اور سمندر میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ہی اشتعال میں آ جائیں تو بیڑا غرق کر دیتے ہیں اور اپنا بیڑہ تو اب ویسے ہی خستہ ہو گیا ہے۔" وہ سگریٹ چھینک کر اس پر پیر رکھ کر گاڑی کھولنے لگے۔ سب ہی بے ساختہ ہنسے تھے۔

"واہ انکل اس عمر میں بھی ایسی شگفتہ اور فلسفیانہ گفتگو۔ بائی دے وے مثال اچھی ہے مگر کہاں سے سنی ہے۔" ولید خاصا محظوظ ہوا تھا۔

"بس رہنے دو سننا کہاں سے ہے اپنی طرف سے ہی سناتے رہتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں عورت خود نہیں البتہ اس کا دل سمندر کی طرح ہوتا ہے' اس کی سوچوں میں سمندر کی گہرائی ہوتی ہے۔"

"اللہ رے۔" وسیم بھائی اور ولید ایک ساتھ ہنسے تھے اور ان کی ہنسی کچھ زیادہ شرارتی ہو گئی تھی۔ پیچھے کھڑے آغا جی نے سٹک باری باری دونوں کے کندھے پر ماری۔

"حد ادب۔ ٹھیک کہہ رہی ہے بہو۔ عورت کا دل سمندر کی طرح وسیع ہوتا ہے' کیسے کیسے غم' کیسے کیسے مزاج کے آدمیوں کو برداشت کرتی ہیں یہ عورتیں۔ اوپر سے چاہے سمندر کی لہروں کی طرح جوش میں آجائیں اندر ان کی گہرائی میں ہر غم سمو لینے کی وسعت ہوتی ہے۔ اب چلو جلدی جلدی گاڑی میں بیٹھو یہیں وقت گزر جائے گا۔

"آغا جی آپ بہو کی سائیڈ نہ لیں تو کون لے گا۔" جہانگیر احمد نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی مما کی طرف دیکھا جن کا چہرہ آغا جی کی حمایت پر گلِ گلزار ہو گیا تھا۔

"عورت سمندر ہو نہ ہو اپنی تعریف پر پھول کر غبارہ ضرور ہو جاتی ہے۔" وہ اگنیشن میں چابی ڈال کر ہلکے سے ہنسے تھے۔ بھابی اور شہرینہ کے آکر پچھلی سیٹ پر بیٹھ جانے پر مما جواباً کچھ کہہ نہ سکیں۔

دوسری گاڑی میں آغا جی کے ہمراہ وسیم بھائی اور ولید مع بچوں کے روانہ ہوئے تھے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سمندر اپنی جولانیوں پر تھا۔ خوب صورت ہٹ میں سامان سیٹ کرنے کے بعد بھابی اور شہرینہ باہر آگئیں۔ وسیم بھائی اور ولید تو سمندر کو دیکھ کر بچوں کی طرح مچل کر کود چکے تھے۔ آغا جی مما اور جہانگیر احمد ساحل پر کین کی کرسیاں رکھ کر بس پیر بھگوئے بیٹھے تھے۔

"دیکھو ذرا کیا ہرجائی ساجن ہے۔ پہلی بیوی اور بچوں کو تو بھول ہی گیا۔" بھابی ایک آہ بھر کر وسیم بھائی کو دیکھنے لگیں۔

شہرینہ نے گھور کر انہیں دیکھا پھر ہنس پڑی۔

"پہلی بیوی... کیا مطلب؟"

"مجھے تو سمندر سوکن ہی لگ رہا ہے۔ وہ بھی نئی نویلی دیکھو کیسے دیوانے ہوئے ہیں کہ میں نظر ہی نہیں آرہی۔"

شہرینہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا پھر وہ تسلی دینے والے انداز میں انہیں تھپکنے لگی۔

"تو اب کفِ افسوس ملنے کی بجائے' مقابلے پر چلی جایئے نا۔ سوکن کو یوں سر چڑھنے کا موقع کیوں دے رہی ہیں۔

تم تیر آزمائو

ہم جگر آزماتے ہیں

بسم اللہ کود جایئے۔"

"ہاں تو میں کوئی ڈرتی تھوڑا ہی ہوں۔ سمندر تو یوں بھی میری کمزوری ہے۔ تم ذرا طوبٰی کو سنبھالو میں طلحہ کو لے جاتی ہوں۔" وہ فوراً دوپٹہ باندھ کر پائنچے آستین چڑھا کر آگے بڑھ گئیں۔

شہرینہ کچھ دیر ساحل پر چہل قدمی کرتی رہی۔ اسے پتہ نہیں کیوں شروع سے ہی سمندر کی ایسی طوفانی موجوں سے خوف آتا تھا۔ وہ تو وسیم بھائی اور ولید کو پانی کے اندر ڈبکیاں لگاتے ہوئے دیکھ کر بھی ڈر رہی تھی۔ رہ رہ کر اس کی نظریں وہاں بھٹک جاتیں۔ وہ یکدم گہرے پانی میں گم ہو جاتے پھر اچانک ان کے سر دکھائی دینے لگے۔

طوبٰی وہیں بیٹھ کر مٹی سے کھیلنے لگی اور وہ ذرا فاصلے پر ایک اونچے پتھر پر جا کر بیٹھ گئی۔ وسیم بھائی' بھابی کی طرف آرہے تھے شاید طلحہ کو لینے یا انہیں مزید آگے لے جانے کو۔ وہ دلچسپی سے دیکھنے لگی یکدم انہوں نے بھابی کو کھینچ لیا تھا اور بھابی مارے خوف کے چیخ رہی تھیں۔ طلحہ

کو انہوں نے کندھے پر بٹھا لیا تھا اور بھابی کا بازو ایک ہاتھ سے پکڑ کر انہیں سخت بے بس کیے ہوئے تھے۔

"سمندر تو بالکل بچہ بنا دیتا ہے سب کو۔" اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے بھابی کی بے بسی مزا دے رہی تھی۔

"تمہاری پانی سے ناراضگی ہے کیا؟ جو یوں روٹھ کر بیٹھی ہو۔" ولید اس کی پشت کی طرف جانے کب سے کھڑا ہوا تھا۔ وہ جو اپنی سوچوں میں غرق تھی اس کی غیر متوقع موجودگی پر اس کے بدن میں خفیف سا ارتعاش ہوا تھا۔ وہ ٹھٹک گئی مگر چہرہ اوپر اٹھا کر یا پلٹ کر اس کی طرف دیکھ نہ پائی۔

وہ اپنی ٹرائوزر کے گیلے پائنچے نیچے کرتا ہوا شرٹ کی فولڈ آستین جھٹک کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"روٹھنا کیا ہے بس یونہی ڈر لگتا ہے۔ سمندر بھی تو اس وقت بہت تیز ہو رہا ہے۔" کچھ تو جواب دینا ہی تھا اور پھر یہی سچ تھا اسے سمندر کی شور کرتی لہروں سے عجیب سا خوف آرہا تھا جیسے وہ اپنے اندر کھینچ لیں گی۔

”کیا آ... ڈر لگتا ہے؟ کمال ہے جہاں تک مجھے یاد ہے تم سمندر کے کنارے گھر بنا کر رہنے کی کبھی خواہش کیا کرتی تھیں اور آج بھی بڑے جوش و خروش سے آئی تھیں۔ تمہیں تو سمندر بہت پسند ہے۔“

وہ خفیف سی حیرت کا اظہار کرنے لگا اس کی حیرت بھی بجا تھی۔ وہ بچپن سے اب تک بڑے شوق سے ہاکس بے کا پروگرام بنایا کرتی تھی۔ ضدیں کر کے وہ آغا جی کے ساتھ کلفٹن جایا کرتی تھی۔

”ہاں پسند ہے... سمندر سے محبت ہے تبھی تو ڈر لگتا ہے۔“ وہ ساحل کی نرم ریت پر انگلیوں سے لکیریں کھینچتے کھینچتے یکدم کسی بے اختیاری کے غلبے میں آ گئی۔

”جن کو پسند کیا جاتا ہے جن سے محبت ہوا نہی سے تو ڈر لگتا ہے کہ وہ اپنی گہرائیوں میں ہمیں ڈبو نہ لیں اور ساری مدافعت، بچاؤ کی تدبیریں دور ہی کھڑی ہنستی رہیں، مذاق اڑاتی رہیں۔ بس اسی گہرائی سے تو ڈر لگتا ہے۔“ ولید نے چونک کر اسے بغور دیکھا۔

سادہ سے سیاہ شلوار سوٹ میں شبنم سے نہائے پھول کی طرح معطر دکھائی دے رہی تھی۔ دھوپ کی براہ راست تمازت اس کے رخساروں پر پڑ رہی تھی۔ وہ اس لمحے کسی خیال میں گم تھی۔ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی ریت پر بنی بے ترتیب لکیروں پر جمی تھیں۔

”ساحل پر کھڑے رہ کر اس کی گہرائی کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“ وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ بے حد اطمینان اور سکون کے ساتھ اور ہمیشہ کی طرح اس کا اطمینان اور سکون غارت کر گیا۔

اس کے لبوں پر دل آویز مسکراہٹ تھی گو کہ بہت دھیمی تھی مگر اس کا تاثر بہت نمایاں تھا شاید اس لیے کہ اس لمحے اس کی آنکھیں بھی اس مسکراہٹ میں شامل تھیں۔

”ساحل سے کیا جان سکو گے دریا کتنا گہرا ہے۔“ وہ اس کی سمت ذرا سا جھکا تھا۔

اور شہرینہ کو اپنی پیشانی انگارے کی طرح دہکتی محسوس ہوئی۔

وہ بے اختیاری کے اس جال سے نکل آئی اور کھڑی ہو کر اڑتے ہوئے بال ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے بولی۔

"گہرائیاں ناپنے کی ضرورت بھی کیا ہے' یوں بھی ہاتھ کیا آنا ہے بے کار جان کا زیاں۔" اس کا لہجہ باوجود کوشش کے افسردگی اور تلخی کی گرفت سے نہ نکل سکا۔

"بالکل بالکل' ہاتھ بھی کیا آنا ہے۔" وہ بھی ہاتھ جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"صرف ایک کتبہ جس پر لکھا ہو "شہرینہ خان" جو سمندر کی گہرائی ناپتے ہوئے شہید ہو گئیں۔" وہ لب بھینچ کر اسے دیکھتی رہ گئی۔

اس کا دل پھر اسی آگ میں دھڑ دھڑ جلنے لگا جسے سمندر سے ٹکرانے والی ہوائیں بھی ٹھنڈا نہیں کر سکتی تھیں۔ ادھر وہ اپنی شریر مسکراہٹ کو قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

پھر اس کی طرف ایک قدم اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ضروری نہیں ہر گہرائی اپنے اندر موت کا پیغام رکھتی ہو۔ کچھ زندگی بھی بخشتی ہے اور زندگی کی حقیقی مسرتیں بھی۔ کبھی ڈوب کر دیکھو ابھرنے کی خواہش خود بخود معدوم ہو جائے گی۔"

وہ بھی شاید کسی بے اختیاری کے سحر میں وقتی طور پر آیا تھا مگر پھر جلدی سنبھل کر ہنس پڑا۔

"میرے ساتھ آئو کم از کم میرے ساتھ سمندر تمہیں اپنے اندر ڈبونے کی جرات نہیں کرے گا۔ کیا خیال ہے میں تمہیں ڈوبنے دوں گا۔"

بلیک جینز اور ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ میں وہ دھیمی مسکراہٹ اور بھاری دھیمے لہجے میں کہتا اس کے دل کو زیروزبر کر گیا۔ اسے یکدم اپنا پورا جسم دل کی طرح دھڑکتا محسوس ہوا۔ دل جیسے رگوں میں خون کی طرح دوڑنے لگا۔

"آزمائش شرط ہے۔" وہ کہہ رہا تھا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا کہ وہ جیسے گیلی لکڑی کی طرح سلگ کر اس کا ہاتھ زور سے جھٹک کر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر کسی کم سن ناراض بچے کی طرح رخ پھیر لیا۔ اسی دم وسیم بھائی اسے دور سے پکارنے لگے۔ وہ شاید بلو باٹلز پر ریسرچ کر رہے تھے ساتھ میں اسے بھی پکار رہے تھے۔ ولید نے پلٹ کر وسیم بھائی کو دیکھا پھر اس پر ایک نظر ڈالی وہ ہنوز رخ موڑے کھڑی تھی۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے سے قاصر رہا۔ پلٹ کر وسیم بھائی کی طرف چل دیا وہ پلٹی اور اسے جاتا دیکھتی رہی۔

اچانک اسے آنکھوں میں جلن سی محسوس ہونے لگی۔ مگر دوسرے پل اس نے پلکیں جھپک کر سر کو خفیف سا جھٹکا دیا اور وہیں ریت کے ٹیلے پر بیٹھ گئی۔

ضروری نہیں ہے

ضروری نہیں ہے جو ساحل کی گیلی خنک ریت پر

ہاتھ میں ہاتھ دے کر

سفر اور تلاطم کے قصے سنائے

جزیروں، ہواؤں اور ان دیکھے موسم

اور آنکھوں سے اوجھل کناروں پہ بکھرے

ہوئے منظروں، ذائقوں اور رنگوں کی باتیں کریں

جو تیرے اور میرے پاؤں کو چومتی ہیں

تلاطم کی بے نام منزل سے گزریں

یہ دیکھیں ہوائیں کسے ڈھونڈتی ہیں

تو چلنے سے پہلے ذرا سوچ لینا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ضروری نہیں ہے جو ان دیکھے رستوں کی خبریں

سنائے

وہ ان راستوں کا شناسا بھی ہو

کہیں یہ نہ ہو جب سمندر میں تم اس کو

ڈھونڈو تو وہ

ساحلوں پر کھڑا مسکراتا رہے!

وہ یکدم ہی حسیات کی زد میں آگئی تھی۔اس کے جملوں کی بازگشت اس کے دل پر نئے سرے سے اثر انداز ہونے لگی۔

بھابی نے اسے پکارا تو وہ ایک ہلکی سی سانس لے کر اپنے ذہن و دل پر اختیار جما کر اس سحر سے نکل آئی جو اسے آہستہ آہستہ جکڑ رہا تھا۔اسے احساس ہوا وہ بے دھیانی میں مستقل ولید کو بھی دیکھے جا رہی تھی جو وسیم بھائی کے ساتھ ساحل پر پاؤں پسار کر بیٹھا کسی بات پر ہنس رہا تھا۔

کیسی آسودگی تھی اس کے اندر

اس کی آنکھوں میں

اس کے لہجے' اس کی مسکراہٹوں میں جبکہ اس کی ساری ناآسودگیوں کا مجرم وہی تھا۔

بھابی ہٹ کے خوب صورت ٹیرس میں دری بچھائے کھانے کے لوازمات سجائے اب گرل سے لگی ان سب کو چیخ چیخ کر بلا رہی تھیں۔اس کے پلٹ کر دیکھنے پر ہاتھ کے اشارے سے اسے بھی بلانے لگیں۔

"وسیم اور ولید کو بھی بلاؤ شیری!" وہ ٹیرس کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تو مما کولر ایک طرف رکھتے ہوئے اس سے بولیں۔ مگر اس نے سنی ان سنی کر دی اور واش روم کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بال بنانے لگی۔

پھر بیسن سے صابن اٹھا کر منہ دھونے لگی۔جب تولیے سے منہ پونچھتی ٹیرس میں آئی تو وہ سب ہی جمع ہو چکے تھے۔

"شیری! دس از ناٹ فیئر۔" وسیم بھائی اسے دیکھتے ہی بولے۔اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"بھئی سمندر پر آکر سمندر سے بیر۔ تم تو بالکل بھی گیلی نہیں ہوئیں یہ سراسر سمندر کی توہین ہے۔"

"میرے بدلے آپ جو اتنا بھیگ گئے۔" وہ کولر کے پاس موجود جگہ پر بیٹھ گئی۔

"قطعی نہیں ہم نے اپنا حق ادا کیا ہے تم پر اپنا ڈیو ہے۔" وہ قریب ہی بیٹھا تھا اطمینان سے بولا۔ "تھوڑا پانی دینا اف شدید پیاس لگی ہے۔ سمندر لاکھ سمندر ہے مگر پیاس نہیں بجھا سکتا۔" اس نے خالی گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا اور اس کی اٹھتی نظروں کو یکلخت گرفت میں لے کر ہلکے سے بولا۔

"یہ کام تم ہی کر دو۔" وہ غیر محسوس طور پر چونک کر پھر جیسے جھینپ گئی۔ پتہ نہیں اس کے جملے کا مفہوم وہی تھا جو اس نے محسوس کیا تھا۔

وہ سرعت سے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر رخ موڑ گئی۔وہ بھی کھانے سے پورا پورا انصاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اس نے پانی بھر کر خاموشی سے گلاس اس کے سامنے دری پر رکھ دیا۔

X...X...X

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں

سر زیرِ بارِ منت درباں کیے ہوئے

جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

کھانے کے بعد وسیم بھائی شعر و سخن کی محفل سجائے بیٹھے تھے۔ شہرینہ کو پہلی بار پتہ چلا کہ وسیم بھائی کا صرف ذوق ہی عمدہ نہیں ہے بلکہ ان کا لب ولہجہ اور آواز بھی خوب صورت دل موہ لینے والی ہے۔

اس نے شرارتی نظروں سے بھابی کو دیکھا جو خود وسیم بھائی کی گاہے بگاہے اٹھنے والی سحر انگیز نظروں کی زد میں تھیں۔ ایک شعر میں مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیلی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے

بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کیے ہوئے

بقول ولید کے وہ تو اس صنف (یعنی شاعری) سے بالکل نابلد ہے تاہم داد دینے میں وہ ضرور سب سے آگے تھا۔ وسیم بھائی کے ہر شعر پر یوں سر دھن رہا تھا جیسے اس سے زیادہ اچھا اور باذوق سامع کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

وہ سب بے حد انجوائے کر رہے تھے۔ غزل کو بھی اور ان کے انداز کو بھی۔ کسی کو خبر ہی نہ تھی کہ دور ایک ہٹ کے ٹیرس میں موجود اکبر شاہ شعلوں میں جل رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی ہٹ کے برآمدے میں رکھی ایزی چیئر پر نیم والیٹا تھا۔ ٹی شرٹ اور نیکر میں۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگائے۔ انناس کے سکوائش کا ٹن لبوں سے لگائے اس کے ساتھ آئے دونوں ملازم اپنی بوریت دور کرنے کے لیے اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھے گئے کھیل رہے تھے کبھی

کبھی اپنے رئیس کو بھی دیکھ لیتے جو آنکھیں موندے سکوائش کی چسکیاں لے رہا تھا کہ یکدم تالیوں کی آواز پر چونکا اور سر اوپر اٹھا کر آواز کی سمت نگاہ دوڑائی تو جھٹکا لگا تھا۔

وہ بلاشبہ شہرینہ تھی اس کے سنہری دراز بال دور ہی سے اپنی طرف متوجہ کرتے نظر آرہے تھے اور ولد حسن جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا اس کے ہمراہ تھل۔ دوسرے لوگوں سے البتہ وہ واقف نہیں تھا۔ نہ اسے دلچسپی تھی۔ اس کی تمام تر توجہ کا مرکز شہرینہ تھی اور ولید حسن' ان لوگوں نے شاید گیت غزلوں کی بزم سجا رکھی تھی۔ ساتھ ساتھ ہنسی مذاق بھی ہو رہا تھا۔ مردوں کے قہقہے یہاں تک سنائی دے رہے تھے البتہ شہرینہ کی مسکراہٹ اسے صرف دکھائی دے رہی تھی اور دل پر آبلے کی طرح تپک رہی تھی۔

اس نے ٹن لبوں سے ہٹا کر ایک طرف پھینکا اور چشمہ پیشانی پر ٹکا کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا سائیں؟ ملازم اس کے تیور سے کچھ سٹپٹا گئے۔ اور اس کی طرف بھاگے آئے۔

"کچھ نہیں' یہ سب لوگ کیا ابھی آئے ہیں؟" اس نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ ملازم نے اس کی نظروں اور انگلی کے تعاقب میں ہٹ کے قریب بیٹھے اس گروپ کو دیکھا پھر بولا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے ہم آئے تو یہ لوگ موجود ہی تھے۔ ہٹ میں بیٹھے اپنا کھانا وانا کھا رہے تھے۔ شاید یہ صبح سے ہی آئے ہوئے ہوں۔ کوئی ہمارے لائق حکم سائیں!"

"ہوں۔" ایک گہری بھنچی بھنچی سانس اکبر شاہ کے باہم جڑے ہوئے ہونٹوں کے درمیان سے خارج ہو گئی۔ نفرت اور غصے کی تیز و تند لہریں اس کے وجود کے اندر سے اٹھیں اور اسے ہی کاٹنے لگیں۔ اس لیے کہ نفرت کا شعلہ جس دل سے اٹھتا ہے پہلے وہ دل جلتا ہے بعد میں دوسروں کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے۔

ادھر وسیم بھائی کے بے حد اسرار پر ولید بھی کچھ سنانے پر راضی ہو گیا تھا۔ انہوں نے ماضی کے حوالے دے دے کر اس کی شاعرانہ رگ بھڑکا ہی دی تھی اور وہ خود بھی کچھ سنانے کے موڈ میں تھا۔

بھابی اور وسیم بھائی نے تالیاں پیٹ کر اس کی پذیرائی کی مگر وہ دونوں ہاتھ گھٹنوں سے لپیٹے ہوئے اس پر ٹھوڑی ٹکائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

تیرے حسن کی ہے جو دلکشی

تیرے لب کے جو یہ گلاب ہیں

میرے خواب ہیں

تالیوں کا شور تھما تو اس کی بھاری خوب صورت آواز گونجنے لگی اور خود بخود اضطراری انداز میں شہرینہ کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں۔

میرے خواب ہیں میری زندگی

میری زندگی میں سراب ہیں

تیرے ساتھ ہیں جو یہ واہمے

کئی وسوسے ہیں عذاب میں

میں جو آرزو کے سفر میں ہوں

نہ نظر میں ہوں نہ خبر میں ہوں

کٹے کس طرح یہ سفر میرا

میں ہوں منزلوں سے پرے کہیں

اس کی شخصیت کی طرح اس کی آواز بھی اتنی ہی مسحور کن تھی اور شاید وہ خود بھی اس سے اچھی طرح آگاہ تھا۔

وسیم بھائی، بھابی اور دور بیٹھی مما کی طرف سے بھی خوب داد مل رہی تھی جسے وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر رہا تھا مگر اس کے چہرے پر بڑی گہری سنجیدگی تھی۔اس لیے شاید وہ خود بھی اپنے الفاظ میں گم تھا یا اس کے لفظ و معنی میں۔

میں ہوں منزلوں سے پرے کہیں

کسی دشت میں کسی درد میں

تیرے راہ کی اڑی گرد میں

مجھے بخش دو وہ کرامتیں

جو ہیں منتظر میرے خواب کی

یہ جو آرزو ہے وصال کی

مجھے اپنے کل کی خبر کہاں

مجھے فکر ہے تیرے حال کی

تیرے حسن کو نہ گہن لگے

یہ دعا ہے دست سوال کی

آغا جی عجیب سے احساس سے دوچار بیٹھے اس کا چہرہ تکتے رہ گئے۔

بظاہر وہ خوش دلی سے محض بزم کو رونق بخش رہا تھا مگر یہ الفاظ اتنے غیر اہم اور نظر انداز کیے جانے کے بھی نہیں تھے۔

اس نے بھلا ایسی ہی نظم کا انتخاب کیوں کیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے اس کی خوب صورت آنکھیں رہ رہ کر شہرینہ پر اٹھ رہی تھیں مگر وہ ان مسکراتی آنکھوں کے پار دھند کی اٹھتی گرد کو محسوس کیے بغیر نہ رہے تھے۔

"پاگل!" آغا جی خفیف سے انداز میں سر جھٹک کر ہلکے سے مسکرا دیئے۔

وسیم بھائی اس کی پیٹھ تھپک کر اسے بے ساختہ داد دے رہے تھے جسے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ وصول کرتے ہوئے بے ساختہ شہرینہ کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا۔ اس کی بھوری آنکھیں بھی اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ تصادم پر سٹپٹا کر پلکوں کا جال گرا لیا مگر اس لمحاتی تصادم نے اس کے اندر کی آگ کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے کئی برقی لہریں اس کی نس نس کو چھو کر گزر گئی ہوں۔ اس کے بے قراری میں اضافہ ہو گیا۔

"اس کا مطلب ہے وسیم نے کچھ غلط نہیں کہا۔ تم تو اچھے خاصے سخن طراز ہو۔"

"کہاں... یہ تو بس کب کی یاد رہ جانے والی ایک نظم تھی یاد آ گئی سنا دی۔ بھئی میرا خیال ہے اب چلنا چاہیئے۔" اس نے ریسٹ واچ پر نظریں ڈالیں۔

"ابھی کہاں ابھی تو ہم نے اپنی زوجہ سے کچھ سنا بھی نہیں۔ ان کے جوہر بھی تو دیکھنے ہیں۔" وسیم بھائی بولے۔ وہ قطعی اٹھنے کو تیار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"نہ بھئی نہ مجھے کوئی شعر ویر یاد نہیں ہے۔" بھابی بھی بوکھلا کر کھڑی ہو گئیں۔

"میرا خیال ہے زوجہ آپ ہی کی ہیں' ان سے پھر کسی وقت سن لیجئے گا۔" ولید کی بات پر وہ سب ہنس پڑے۔

"اس سے اچھا موقع کب مل سکتا تھا خیر۔" وسیم بھائی نے ایک حسرت بھری آہ بھرتے ہوئے مونا بھابی کی طرف دیکھا۔

"سناتی تو یہ ہر وقت ہی رہتی ہیں کچھ نہ کچھ مگر آج کچھ اور سننے کو دل چاہ رہا تھا۔ میں نے سوچا اتنے باذوقوں کی صحبت کا ان پر بھی کچھ اثر ہو گیا ہو گا۔"

"خیر اب اتنی بدذوق بھی نہیں ہوں میں۔ اچھا خاصا ذوق ہے میرا۔" بھابی اس الزام پر تڑپ کر بولیں۔

"کیوں شری! تم نے میری ڈائری تو دیکھی تھی نا۔ کتنے اچھے اچھے شعر تھے اس میں۔"

"تھے' تھے سے کیا مطلب کس کے لیے تھے اور کہاں تھے اب کہاں ہیں۔" وسیم بھائی اب کے ان سے بھی زیادہ تڑپ کر ان کے قریب آئے تھے۔

"اوہو وہ انگیج منٹ پریڈ میں اچھا لگتا تھا نا۔" بھابی جھینپ کر وضاحت کرتیں آگے بڑھنے لگیں کہ وسیم بھائی کا ہاتھ راہ میں حائل ہو گیا۔ وہ ولید کی طرف دیکھ کر جیسے کسی دھچکے کے زیر اثر ہوں اس انداز سے بولے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"مجھ پر ایسا وقت بھی آیا تھا ولید! یہ انگیج منٹ پریڈ۔ کب آیا تھا اور کب گیا وہ بھی اتنا باذوق' سہانا' رومینٹک اف آہا۔"

"بس رہنے دیں ان دنوں آپ ہی بدذوق ہوا کرتے تھے ایک نظر مجھ پر ڈالنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔" بھابی کی بات پر شہرینہ اور ولید دونوں نے ہی بے ساختہ ہنسی کو بمشکل روکا تھا۔

وسیم بھائی کا چہرہ قابل دید تھا۔ کچھ کہتے کہتے سنبھل گئے۔ انہیں شہرینہ کی موجودگی کا یکدم جیسے خیال آگیا۔ بھابی نے بھی کولر اٹھا کر ان کے ہاتھوں میں پھینکنے کے انداز میں دیا تھا۔

"اب جلدی سے گاڑی میں بیٹھئے۔ آغا جی! مما' پاپا کی گاڑی تو دیکھئے روانہ بھی ہو گئی اور آپ لوگوں کو بے کار میں ٹھٹھول سوجھ رہا ہے۔ چلو شیری! ہم تو چلیں۔"

"آہ۔"

"قمر اس قدر ان کو جلدی تھی گھر کی

وہ گھر چل دیئے چاندنی ڈھلتے ڈھلتے"

وہ ولید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خود بھی پیچھے ہو لئے۔ بھابی مسکرائیں اور شہرینہ کی طرف دیکھا پھر دونوں ہی بے اختیار ہنس پڑیں۔

"کمال ہے وسیم بھائی بھی اتنے شگفتہ بندے ہیں میں نے تو کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔" شہرینہ ابھی تک ہنس رہی تھی۔

"تو تمہیں دھیان دینے کی ضرورت بھی کیا ہے جس کو دھیان دینا چاہیے وہ موجود ہیں۔" ولید نے اس کا جملہ سن کر اپنی رفتار آہستہ کر دی وہ قریب آئی تو بولا۔ وہ جھینپ گئی۔

یہ قافلہ اسی طرح ہنستا کھلکھلاتا روانہ ہو گیا اور ادھر اپنی ہٹ کے ٹیرس کی گرل کے پاس جھکا ہوا اکبر شاہ ان کی گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا پھر اس کی نظریں سمندر میں دھیرے

دھیرے ڈوبتے سورج کے نارنجی گولے پر جم کر کسی خیال میں گم ہو گئیں۔

X...X...X

تانیہ اپنی کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہوئی تبھی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس کا خیال شہرینہ کی طرف گیا۔ آج چونکہ وہ جامعہ نہیں آئی تھی مگر دوسری طرف شہرینہ کی بجائے اکبر شاہ کی آواز ابھری۔ اس کا دل اس آواز کے ساتھ ہی نئی ترنگ محسوس کرنے لگا۔ اس نے چور نظروں سے کھلے دروازے سے باہر تک دیکھا۔

نادیہ آپی کچن میں کھٹر پٹر میں مصروف تھیں۔ اماں سر شام ہی دوائی لے کر سو گئی تھیں۔ وہ مطمئن ہو کر کشن سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"آج یونیورسٹی کیوں نہیں آئے تم؟" وہ چھوٹتے ہی شکوہ کرتے ہوئے بولی۔ جواباً اکبر شاہ کا قہقہہ گونجا۔

"اس کا مطلب ہے میری کمی محسوس کی تم نے بس جناب اپنی تھوڑی بہت اہمیت جتانا چاہ رہا تھا۔"

"تمہاری اہمیت تھوڑی نہیں بہت ہے میرے دل میں کبھی جھانک کر دیکھو۔" وہ جذب سے بولی۔

"میں کسی کے دل میں ضرور تھا' اسی بات کا تو غرور ہے۔" وہ تفاخر بھرے... انداز میں گنگنایا۔ تانیہ ہنس پڑی۔

"سچ میں بہت بور ہوئی' آج شیری بھی نہیں آئی تھی نا۔"

"کیوں وہ کیوں نہیں آئی تھی آج۔" وہ یکدم کانشس ہو گیا۔

"کہہ رہی تھی ہاکس بے وغیرہ جانے کا پروگرام تھا ان کی فیملی کا' اب پتہ نہیں وہ لوگ گئے یا نہیں۔"

"گئے تھے جناب گئے تھے وہ لوگ۔" اس کا لہجہ خود بخود سرسراتا ہوا ہو گیا مگر تانیہ محسوس ہی نہ کر سکی اس کے لہجے میں اترتی تلخی کو۔

"اچھا تمہیں کیسے پتہ چلا۔"

"میں نے خود دیکھا تھا اسے۔ وہاں گل چھرے اڑاتے ہوئے۔ اونہہ وہ نام نہاد کزن اس کا۔ کیا نام بتایا تھا تم نے ہاں ولید حسن وہ بھی تھا۔"

"کیا مطلب اکبر شاہ تم' تم جیلس ہو رہے ہو ولید بھائی سے۔"

تانیہ اس کے لب و لہجہ پر دنگ رہ گئی۔ جانے کیوں اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ ولید حسن کا ذکر اس قدر نفرت اور حقارت سے کیوں کر رہا تھا۔ کیا شہرینہ کے کزن سے شہرینہ کی اتنی قربت اس سے برداشت نہیں ہو پا رہی۔

'کوئی رقیبانہ جذبہ تھا۔'

اس کا ننھا سا جذبوں سے پر دل رنجیدگی کی گرفت میں آنے لگا۔

"میں' میں جیلس ہوں گا اس شخص سے... جو خود نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے؟ کون ہے؟ ایک لاوارث۔ ایک ایسا شخص جس کے خاندان کا نام و نشان نہیں۔ اس سے میں جیلس ہوں گا۔ واٹ آ جوک..." وہ حقارت سے ہنسنے لگا۔

تانیہ دم بخود رہ گئی۔

"کیا' کیا کہہ رہے ہو اکبر شاہ! ولید بھائی اوہ میرا خیال ہے تم حد سے زیادہ جیلس ہو گئے ہو ان سے۔" تانیہ کو غصہ آ گیا۔

"شٹ اپ بے وقوف لڑکی! یہ سچ ہے تم نہیں جانتیں کہ ولید حسن، شہرینہ کا کزن وزن نہیں ہے اسے تو شہرینہ کے والد نے یتیم سمجھ کر پالا پوسا ہے اینڈ نتھنگ۔"

تانیہ کے اعصاب پر گویا دھماکہ ہوا تھا۔ وہ کتنے پل تو کچھ بول ہی نہ پائی۔

"خیر چھوڑو۔" ہمیں کیا لینا دینا کسی سے کہ کون کس کا بیٹا ہے اور کون کس کی اولاد۔ ہم اپنی باتیں کرتے ہیں صرف اپنی، تانیہ! اے تانیہ!" اس نے ریسیور پر انگلیاں بجائیں تانیہ چند ثانئے ریسیور کو گھورتی رہ گئی پھر ایک گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ اس نے سوچا یقیناً اکبر شاہ کو غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔

"آج میں گوٹھ چلا گیا تھا اس لیے جامعہ نہ آسکا۔ میں نے اپنی سسٹر سے تمہارا ذکر کیا تو جناب وہ تو تم سے ملنے کو بے چین و بے قرار ہو گئی ہے۔"

"کیا، کیا کہا تم نے ان سے میرے بارے میں۔" وہ شرمگیں لہجے میں پوچھنے لگی۔

"کیا کہنا چاہیے تھا مجھے۔" دھیمے لو دیتے لہجے میں وہ الٹا اس سے استفسار کرنے لگا۔ وہ جھینپ کر بے طرح شرما گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"مجھے کیا پتہ۔"

"پتہ ہے جناب کیا کہا اس سے میں نے۔" اس کا لہجہ پھر آنچ دینے لگا۔ ریسیور کو تھامے تانیہ کی انگلیاں نم ہو گئیں۔ رگ رگ گویا سماعت بن گئی۔

صرف اتنا کہ:

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے

اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو

اف اس کا دل خوشگوار دھڑکنوں کے شور میں ڈوب گیا۔ اس نے شکر کیا اکبر شاہ سامنے موجود نہیں ہے ورنہ وہ مارے شرم کے اس کے سامنے ٹھہر بھی نہ سکتی۔

ہمیشہ اس کے لہجے کی نغمگی اس کی رگوں میں سرور کی نہریں بہا دیا کرتی تھی۔ وہ یکسر سب سے بے نیاز ہو کر اس دنیا میں کھو جاتی جو اکبر شاہ اس کے ارد گرد آباد کر دیا کرتا تھا۔

تانی!... کل میں تمہیں اپنے گھر لے جا رہا ہوں آمنہ سے ملوانے۔" وہ کل کا پروگرام اسے بتانے لگا۔ وہ خوش ہونے کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ کا شکار بھی ہونے لگی۔

"مگر کل تو شہرینہ بھی جامعہ آئے گی پھر میں کیسے۔"

دوسری طرف اکبر شاہ چند لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اپنے اندر سے اُمڈتی کسی تند لہر کو لب بھینچے دبا رہا تھا پھر ایک بھنچی بھنچی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یوں بھی اس کے علم میں یہ بات آ چکی ہے۔ ڈرتے وہ ہیں تانیہ جن کے دل میں کھوٹ ہو۔ تم اور میں' مل کر اپنا کل بنا رہے ہیں اور ظاہر ہے اس کے لیے ہمیں انڈر سٹینڈنگ کی ضرورت ہے۔ اپنی بہن سے ملوانا کوئی جرم نہیں ہے۔ ڈونٹ وری میں سب سنبھال لوں گا۔

وہ اس کے کانپتے خوف بیں گھرے دل میں زندگی کا نیا رس گھولنے لگا۔

"تانیہ! سن رہی ہو نا میری بات؟"

"ہوں ہاں بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے مگر' مگر مجھے ڈر لگتا ہے جانے تمہاری سسٹر مجھ سے مل کر خوش ہوتی ہے یا۔"

"اوہ کم آن تانی! ایک تو تمہارے کومپلیکسز نہ جانے کب ختم ہوں گے! تم اکبر مردان علی شاہ کی پسند ہو۔ اس کی محبت ہو اور یاد رکھو اکبر شاہ نے آج تک کبھی بدصورت' غیر اہم اور بے کار چیزوں کو پسند نہیں کیا۔

پاگل لڑکی تم کیا ہو کوئی مجھ سے پوچھے۔ میرے دل میں جھانک کر دیکھو۔"

اس کا لہجہ گمبھیر مدھم اور لو دیتا ہوا ہو گیا۔

یہ لہجہ تو اس کے مرجھائے ہوئے دل میں خوشبو بن کر اتر جاتا تھا۔

یہی لہجہ تو بے خود کر دیتا تھا۔

یہی لہجہ تو امرت بن کر ٹپکتا تھا سماعت پر اور دل و روح کو سیراب کرتا تھا۔

یہی لہجہ اس کے اعتماد کی گرتی دیواروں کو سہارا دے کر مضبوط کرتا تھا۔

"اوکے تانی! ٹیک کیئر اور سنو۔" وہ ہلکے سے ہنسا پھر ہلکی سی شرارت کر گیا۔ تانیہ کے رخسار تپ اٹھے۔ اس نے شکر ہی کیا یہ شخص فون پر ہی تھا۔

اس نے ریسیور رکھ دیا اور وہیں کشن پر سر رکھ کر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ کتنے خواب اترتے چلے آئے۔

X...X...X

ہاکس بے سے واپسی کا سفر بے حد خوشگوار ہلکی پھلکی باتوں اور چٹکلوں میں کٹا تھا۔ سب کے چہروں پر تھکن تھی مگر صرف جسمانی تھکن، ذہنی طور پر سب بے حد تازہ دم دکھائی دے رہے تھے۔ خود شہرینہ بھی جو جانے کتنے دنوں بعد دل و دماغ کی آمادگی کے ساتھ اتنا ہنسی تھی اتنی مسرور تھی۔

شاید ولید حسن کی قربت، اس کی توجہ، اس کی شرارتوں کا اثر تھا یا ماحول پھر بھابی اور وسیم بھائی کے لطیفوں کی بوچھاڑ کا۔ راستے بھر جانے کہاں کہاں کے لطیفے یاد کر کر کے سناتے رہے، اس پر ولید کے برجستہ لقمے۔

وہ حقیقتاً بڑے دنوں بعد اپنے رنگ میں واپس آئی تھی۔

کتنا دل چاہا۔

وقت تھم جائے، لمحے رک جائیں، گھڑیاں ٹھہر جائیں۔

وہ سامنے بیٹھا رہے وہ اسے دیکھتی رہے، ہنستی رہے، اس کی گاہے گاہے خود پر اٹھنے والی نگاہوں سے یونہی خود میں سمٹتی رہے۔ اس کے ذو معنی جملوں پر خوشگوار دھڑکنوں کو سنبھالتی رہے۔

آہ اے کاش رک جائے کہیں وقت کا دھارا۔

وہ اپنے بستر پر لیٹی تو اس کا خیال تھا تھکن کے باعث فوراً ہی نیند کی آغوش میں جا پہنچے گی مگر بستر پر گری تو نیندیں یوں بھاگ گئی جیسے کوئی چڑیا شکاری کے جال کو دیکھ کر پھر سے اڑ جائے۔

مگر اس کی بھوری شہد رنگ آنکھوں میں تھکن کا شائبہ تک نہ تھا۔

"اف یہ پیاس، شدید پیاس لگی ہے، سمندر لاکھ سمندر رہے مگر پیاس نہیں بجھا سکتا۔ یہ کام تم ہی کر دو۔"

"ضروری نہیں ہر گہرائی اپنے اندر موت کا پیغام رکھتی ہو کچھ زندگی بھی بخشتی ہیں اور زندگی کی حقیقی مسرتیں بھی۔ کبھی ڈوب کر دیکھو۔ ابھرنے کی خواہش خود بخود معدوم ہو جائے گی۔"

اس کی بھاری آواز کتنی دیر ذہن و دل پر دھمک کی طرح گونجتی رہی کچھ دیر تو یونہی اس سحر میں جکڑی رہی پھر یکدم گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور تکیہ دونوں بازوئوں میں بھینچ کر اس پر چہرہ ٹکا لیا۔

صبح بڑی سہانی تھی یا اسے ہی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جامعہ کی تیاری کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ گنگنا بھی رہی تھی۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

جاناں کیے ہوئے

ہو ہو جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"بلے بلے آج تو شہرینہ بی بی سویرے ہی سویرے بڑی ترنگ میں ہیں خیر تو ہے۔" صغریٰ اس کی چادر استری کر کے لے آئی تھی۔

"خیر ہی خیر ہے صغریٰ!" دراز سے جرنل نکال کر مسکرائی اور اس کے ہاتھ سے چادر لی۔

"روز تم راگ الاپتی رہتی ہو آج میں نے گا لیا تو کیا ہو گیا۔" پھر اس کے رخسار پر ہلکی سی چپت مار کر بیگ کی زپ بند کرنے لگی۔

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں

سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

"وہ بی بی! ولید بائو نے کہا ہے کہ وہ آپ کو آج خود... چھوڑنے جائیں گے۔"

وہ چادر اور بیگ بغل میں دبا کر کمرے سے نکلتے نکلتے ٹھٹک کر رکی اور گھوم کر صغریٰ کو دیکھا۔ دل کی حالت معمول سے ہٹ کر ہو گئی۔

"میری گاڑی کوئی لے گیا ہے کیا؟" اسے ولید کی طرف سے دی ہوئی پیش کش کچھ انہونی سی لگی۔

"ناجی اس کے دونوں ٹائر پنچ ہو گئے ہیں۔"

"ہیں کیا ہو گئے ہیں؟"

"وہ' وہ میرا مطبل ہے ہوا نکل گئی ہے۔"

"اومائی گاڈ دونوں ٹائر کیسے ایک ساتھ پنکچر ہو گئے۔"

اس کی پیشانی پر تردد کی لکیر ابھر آئی۔ وہ سانس بھر کر کمرے سے نکل کر ڈائننگ روم میں آئی تو ولید تقریباً تیار ہی تھا۔ چائے کا کپ تھامے آغا جی سے مصروف گفتگو تھا۔ اس پر نگاہ پڑی تو بولا۔

"تم ناشتہ کر لو میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

"آپ ناحق تکلیف کریں گے میں پاپا کی گاڑی میں چلی جاتی ہوں۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی۔

"انکل چلے گئے ہیں ان کی ضروری میٹنگ ہے اور وسیم کو اسلام آباد جانا ہے۔" وہ اسے بس دیکھ کر رہ گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

آج اس شخص کو اس کا اتنا خیال کیونکر ہو رہا تھا۔ اس کی گاڑی کے ٹائر اس نے چیک کر لئے تھے کہ وہ پنکچر ہو گئے ہیں۔ اب بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ ناشتہ کر لے پھر اسے ڈراپ کرے گا جبکہ اس کا راستہ بالکل الگ تھا کہیں سے بھی تو اس کا آفس اس کی یونیورسٹی کی طرف نہیں آتا تھا۔

وہ کی بورڈ سے چابی اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ وہ بھی ناشتہ کرنے کے بجائے صرف چائے پی کر کھڑی ہو گئی۔

اندر خوشگوار دھڑکنوں کا شور تھا۔

دل معمول سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا۔

محبوب کی ذرا سی توجہ' اپنائیت بھرا انداز دل میں کیسے پھول کھلا دیتا ہے۔

گاڑی میں بیٹھی تو وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اس کا منتظر ہی تھا۔ گہرے رنگ کے گلاسز آنکھوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ وہ اس کے تاثرات جان نہ پائی۔

اس کے بیٹھتے ہی اس نے اگنیشن میں لٹکتی چابی گھمادی۔ دوسرے پل گاڑی فراٹے سے پورٹیکو سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی۔ اے سی کی خنک ہوائیں آہستہ آہستہ جسموں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی تھی۔

ولید نے ایک نظر اس پر ڈالی اور ایک لفافہ اس کی گود میں پھینکا۔ اس نے لفافے کو دیکھا پھر ولید کی طرف دیکھنے لگی۔

''یہ کیا ہے۔''

''کھول کر دیکھو اور مجھے جواب دو کہ یہ آمنہ مردان علی کے پاس کیسے پہنچا۔'' لفافے سے برآمد ہونے والی چمکتی تصویریں لحظہ بھر کے لئے اس کی انگلیوں سے پھسل گئیں' اس نے گرفت مضبوط کر کے تصویروں کو بغور دیکھا۔ یہ اس کی اور ولید کی نومی کے نکاح والے روز کی تصاویر تھیں جو نادیہ آپی نے اپنے کیمرے سے کھینچی تھیں۔ وہ بھی پہلی بار دیکھ رہی تھی مگر انہیں دیکھ کر کوئی خوب صورت جذبہ دل میں کھلنے کے بجائے ولید حسن کے استفسار نے اسے حیرت کے جہاں میں دھکیل دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''یہ فوٹو تو غالباً نومی کے نکاح کے روز والے ہیں شاید نادی آپی نے کھینچے تھے مگر۔'' اس نے سر اٹھایا۔ ولید کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اس کے دل کے اندر کوئی انگارہ چٹخا۔

''غالباً نہیں یقیناً مگر ہے نا حیرت کی بات کہ یہ آمنہ نے مجھے دی ہیں۔''

''کیا' آ' کیا مطلب ہے آپ کا۔ یہ میں نے آمنہ علی کو دی ہیں۔ اسے پوسٹ کی ہیں۔''

''تو اور کون پہنچا سکتا ہے اس تک۔'' اس نے گاڑی دائیں طرف موڑتے ہوئے ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھا اور شہرینہ کو لگا جیسے اسے کسی نے جلتے شعلوں میں دھکیل دیا ہو۔

''میں تو خود پہلی بار دیکھ رہی ہوں یہ فوٹو۔''

''اچ اچھا۔'' وہ یوں ہنسا جیسے سراسر مذاق اڑا رہا ہو اور غیر سنجیدہ بات پر ہنسا جاتا ہے۔ وہ جھلس گئی غصے اور توہین کی لہر اس کے تن بدن سے اٹھی' اس نے تصویریں ڈیش بورڈ پر پٹخیں۔

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اس عورت کو یہ پوسٹ کرتی پھروں۔'' اس نے سائیڈ پر رکھا بیگ اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

"ہو سکتا ہے کوئی مفاد ہو تمہارا۔ تم اپنے تئیں اسے مجھ سے بدگمان کرنے کی کوشش..."

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر استہزائیہ انداز میں اسے دیکھا۔

وہ رنج وغصے سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ایک پل کے لئے اسے اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس ہوئے۔

"گاڑی روکیں میں کہہ رہی ہوں گاڑی روک دیں ابھی اور اسی وقت۔" وہ پورے زور سے چلائی۔

"آپ جیسے گھٹیا شخص کے ساتھ میں ایک منٹ بھی نہیں بیٹھ سکتی۔" رنج وغم سے اس کی آواز بھرا گئی۔ولید نے نہایت اطمینان بھرے انداز میں رخ اس کی طرف کر کے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"یہ اتنی پرسنل فوٹو اس تک پہنچنا حیرت کی بات ہے بلکہ تشویش کی بھی۔"

"یہ آپ کا ہیڈک ہے میرا نہیں کہ اس تک یہ کیسے پہنچیں اور کہاں سے پہنچیں۔آپ مجھے بلیم نہیں کر سکتے۔آپ نے اس سے کیوں نہیں پوچھ لیا۔"

"اس تک تو پہنچائی گئی ہیں۔"

"تو میں کیوں' مجھ ہی سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں آپ کوئی اور بھی تو..."

"جہاں تک میرا خیال ہے آمنہ علی سے تمہیں ہی دشمنی ہو سکتی ہے۔" اس کی آنکھوں میں ہلکی طنزیہ مسکراہٹ تھی وہ پوری جان سے سلگ اٹھی۔اسے لگا جیسے اس کا دل کسی سخت چٹان سے ٹکرایا ہو اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر بلک اٹھا ہو اس کے رخساروں پر سرخی امڈ آئی۔یہ خفت کی نہیں دل ٹوٹنے اور لہو ہو جانے کی سرخی تھی۔

اس نے اپنے اندر غصے کا ابال اٹھتا محسوس کرتے ہوئے اسے دیکھا۔وہ ہمیشہ کی طرح تروتازہ مطمئن اور اعتماد کے ساتھ بیٹھا تھا۔اسے رتی بھر اس کے دل کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی پروانہ تھی۔

"گاڑی روکیں میں کہہ رہی ہوں بس یہیں گاڑی روک دیں۔ورنہ میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گی۔" وہ غصے کے اسی ابال کے تحت چیخی تو اس نے استہزائیہ... نظروں سے چہرے کا رخ اس کی طرف کیا پھر ابرو اچکا کر بولا۔

"چھلانگ لگانے سے پہلے اگر یہ بتادو کہ یہ تصویریں واقعی تم نے پوسٹ کی تھیں تو کم از کم میری ایک الجھن تو سلجھے۔"

اس کی اتنی سنگ دلی اور اپنی ذلت پر وہ کٹ کر رہ گئی۔ غم وغصے سے دماغ مائوف ہوتا محسوس ہوا۔ وہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ کر غصے کے اس ابال کو دبانے کی کوشش کرنے لگی۔

یونیورسٹی روڈ پر گاڑی روک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کی حالت کے پیش نظر قدرے ملائمت سے بولا۔

"میرا خیال ہے تمہیں واپس گھر چھوڑ آئوں اس وقت تم۔"

'میرا خیال ہے یہی مہربانی بہت ہے آپ کی کہ یہاں تک لے آئے۔ اب مزید کسی عنایت کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بھنا کر بولی اور بیگ اٹھا کر اس کی طرف دیکھے بنا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

وہ لب دانتوں میں دبیئے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اس کے گم ہو جانے کے بعد ایک گہری سانس بھر کر سیٹ کی پشت سے لگ کر ایک لمحے کے لئے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پتہ نہیں کیوں کبھی نادانستگی میں وہ اس کے ہاتھوں ہرٹ ہو جاتی تھی۔ کبھی وہ کف افسوس ملتا رہتا کبھی ہنس کر انجوائے کر لیتا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اسے اپنے رویے پر افسوس کرنا چاہئے یا اس کی بے وقوفی پر ماتم۔

بہر حال اسے اتنا احساس تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں بری طرح ہرٹ ہوئی ہے۔ ایک بھنچی بھنچی سانس کھینچ کر اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور ریورس کر کے سڑک پر بھگانے لگا۔ اسی دم اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے قطعی بے دلی سے سیاہ رنگ کے اس کھلونے کو دیکھا۔ اس وقت اس کا دل کسی سے بھی بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا تاہم کچھ سوچ کر اس نے ریسو کیا۔ دوسری طرف یوسف تھا۔

"میں یوسف بول رہا ہوں ولید سائیں!" یوسف کی آواز میں بے قراری واضح تھی۔

"ہاں یوسف خیریت تو ہے کل سے میں تم سے مسلسل رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر رابطہ نہیں ہوا تم نے موبائل بند رکھا ہوا تھا' کوئی گڑ بڑ ہے کیا گائوں میں۔" وہ گاڑی سڑک کے کنارے کنارے چلانے لگا تاکہ تسلی سے یوسف سے بات چیت کر سکے۔ نظریں ونڈ سکرین پر تھیں مگر دھیان یوسف کے ساتھ گائوں کی طرف چلا گیا۔

"سائیں کیا خیریت' کل شام رئیس توقیر شاہ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ پورے گوٹھ میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔"

"وہاٹ۔" اس کا پاؤں بے ساختہ بریک پر پڑا۔ لمحہ بھر کے لئے اعصاب منتشر ہوئے۔ دوسرے پل اس نے سنبھل کر ایکسلیٹر پر پاؤں رکھ کر گاڑی دوبارہ دھیمی رفتار سے رواں کر دی۔

"اور تم مجھے آج خبر دے رہے ہو بے وقوف!"

"کیا کرتا سائیں میں نے آپ کا دیا ہوا موبائل چھپا دیا تھا۔ رئیس مردان شاہ کے آدمی کتوں کی طرح دندناتے پھر رہے ہیں گوٹھ میں اور خوب پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔ حویلی میں تو پولیس گاڑیاں قطاروں میں لگی ہیں۔ رئیس مردان شاہ یوں سب پر دھاڑ رہا تھا جیسے سب اس کے پالتو کتے ہوں۔" یوسف کے لہجے میں سارے جہاں کی کڑواہٹ تھی۔

ولید لب بھینچے اس واقعہ کی جزئیات پر غور کرتا رہا۔

"ولید صاحب!" یوسف نے پکارا۔

"ہوں کتنی گولیاں لگی ہیں توقیر شاہ کو اور کہاں کہاں کچھ خبر ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے ایک ہی گولی لگی ہے وہ بھی بازو پر۔ مارنے والا اناڑی تھا شاید۔ حالانکہ وہ اپنے جلسہ گاہ سے پیدل باہر آ رہا تھا۔"

جواباً ولید ہلکے سے مسکرایا۔

"یوسف توقیر شاہ پر حملہ کون کروا سکتا ہے۔" اس کی آواز سرسراتی ہوئی تھی۔ جیسے وہ یوسف کو ٹٹول رہا ہو۔ دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی پھر آواز ابھری۔ ولید سائیں! یہ آپ مجھ سے پوچھ

رہے ہیں آپ خود بھی تو جانتے ہیں کہ..." یوسف ہلکے سے ہنسا ولید نے ایک ہنکارا بھر کر ونڈ سکرین کے سامنے پھیلی تارکول کی سڑک کو دیکھا اور سر ہلایا۔

"ہاں اتنا اناڑی فدا حسین کے علاوہ کون ہو سکتا ہے بھلا۔"

”میرا بھی یہی خیال ہے سائیں کہ گولی اس نے خود چلائی تھی ورنہ اس کے بندے اتنے اناڑی نہیں ہو سکتے یا پھر ہو سکتا ہے وہ محض اسے ڈرا ہی رہا ہو۔“

”او خدا کے بندے یوسف! تم تو ایسی شرک کی باتیں نہ کرو۔ فدا حسین کے بندے کہہ کر۔ ہم انسان صرف خدا کے بندے ہیں وہی بندگی کے لائق ہے۔“ اس نے ٹوکا۔ یوسف شرمندہ ہو گیا۔

”کیا کروں سائیں! بچپن سے ایسے ہی الفاظ کانوں میں پڑتے رہے ہیں یہاں رئیسوں کے سب بندے ہی بنے پھرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہی ہمیں روٹی کھلاتے ہیں' یہ ہی ہمارے داتا والی ہیں' یہ روٹی بند کر دیں گے تو ہم بھوکے مر جائیں گے۔ سوری آئندہ اب احتیاط کروں گا۔“ وہ جذباتی ہو گیا پھر خود ہنس دیا۔

”بات تمہاری بالکل ٹھیک ہے یوسف! خدا سب کو ایسی ہی ستھری اور مثبت سوچ عطا کرے۔ اچھا یہ بتاؤ توقیر شاہ حویلی میں ہے یا ہاسپٹل میں۔“

آج صبح ہی حویلی پہنچا تھا کل تو کراچی کے کسی ہاسپٹل میں تھا بس میں بروقت آپ کو اطلاع نہ کر سکا۔ کہا تھا نا کہ مردان شاہ کے آدمی۔“

”اٹس آل رائٹ' اب توقیر شاہ اتنی اہم شخصیت بھی نہیں ہے کہ میں اس کے زخمی ہونے کا سن کر آنکھوں کے بل پہنچ جاؤں۔ اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ سکول کی اوپننگ کا کیا ہونا ہے۔ اب تو کنسٹرکشن آخری مراحل میں ہے تم نے تیاریاں تو شروع کر دی ہیں نا۔“

”ہاں سائیں آپ اس کی تو فکر ہی نہ کریں۔ اچھا خاصا کام ہو گیا ہے ہاں مگر آپ فیتہ کٹوائیں گے کس سے۔ میرا مطلب ہے مہمان خصوصی کون شخصیت ہو گی۔“

”ہاں۔ یہ تم نے اہم اور بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔“

یوسف کے اس سوال پر اس کے لبوں کی تراش میں بڑی دل آویز مسکراہٹ جھلکی تھی۔

” میرا تو خیال ہے سائیں آپ آغا جی سے کروالیں۔ خیر آگے آپ کی مرضی' یوں بھی مہمان خصوصی تو کوئی بڑی سیاسی' سماجی شخصیت ہی ہوتی ہے عموماً ویسے آپ نے سوچا تو ہو گا اس کے متعلق۔“

”آں سوچا ہے بلکہ ارادہ بھی کر لیا ہے' بس اب تمہارا کام ہے اس شخصیت کو تیار کرنا۔۔“

"میرا؟ کیا مطلب جی!" یوسف کی آواز میں حیرت اتر آئی۔ لائن پر کچھ دیر خاموشی رہی پھر ولید بولا۔

"ہاں بالکل تمہارا کام ہے۔ میں فیتہ ماسٹر دین محمد کے مبارک ہاتھوں سے کٹوانا چاہ رہا ہوں۔ وہ میرے لیے اس گائوں کی سب سے محترم شخصیت ہیں اور نہ صرف وہ فیتہ کاٹیں گے بلکہ وہ اسکول میں بطور استاد اپنے فرائض بھی سرانجام دیں گے یا پھر انہیں جو عہدہ چاہیں وہ دیا جائے گا۔"

ولید کے لب و لہجے میں سارے جہاں کی مٹھاس، حلاوت اور پیار تھا۔

یوسف بیچارہ ہکا بکا رہ گیا۔

بڑی دیر بعد اس کی آواز ابھری۔

"ولید صاحب! آپ کی بابا سے محبت کبھی کبھی مجھے بڑا الجھا دیتی ہے۔" وہ حقیقتاً الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی آواز سے اس کا الجھائو ظاہر تھا۔ ولید ہنس دیا۔

"تو کیوں الجھتے ہو۔ محبتوں پر الجھو گے تو نفرتوں اور دشمنی پر تو مارے ہی جائو گے۔ بے کار میں ذہن کو صاف رکھو۔ میری محبت میں کوئی کھوٹ نظر آرہا ہے کیا جو......۔"

"نہ... نہ سائیں! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" یوسف جلدی سے بولا۔ "بس یونہی کبھی کبھی الجھ جاتا ہوں اور میں کیا بابا خود بھی سوچ بچار کرتے رہتے ہیں۔ اکثر کہتے ہیں کہ ولید سائیں کو جب بھی دیکھتا ہوں ایسا لگتا ہے جیسے میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ کبھی اجنبی نہیں لگا۔ یوں لگتا ہے میں اس سے پہلے بھی کہیں ملتا رہا ہوں۔ مگر کہاں، کب؟ یہ گتھی نہیں سلجھتی۔"

"ہوتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ماسٹر دین محمد کا مسئلہ نفسیاتی ہے۔ ان کے اندر اچانک یہ خیال زور پکڑ گیا ہے کہ وہ مجھ سے پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے مجھ سے ملتا جلتا شخص ان سے ملا ہو کبھی زندگی میں اور اسے بھول کر وہ اس کا عکس مجھ میں دیکھنے لگے ہوں، ایک ہی بات پر روز روز سوچ کر یہ بات تقویت پکڑ گئی ہے اور انہیں اب حقیقت میں ایسا لگنے لگا ہے کہ مجھ سے پہلے بھی مل چکے ہیں یا میں اجنبی نہیں لگا۔ جس طرح ماسٹر دین محمد مجھے بالکل اجنبی نہیں لگے۔"

یوسف اس کی بات پوری سننے کے بعد صرف ہلکی سانس بھر کر رہ گیا۔

"زیادہ الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ الجھاؤ زندگی کو مشکل بناتے ہیں۔ بس وہی دیکھو جو سامنے نظر آرہا ہے' ہر منظر کا پس منظر تلاش کرتے پھرو گے تو صرف پٹخنیاں کھاتے رہ جاؤ گے۔"

یوسف ہنس پڑا۔

"بات تو آپ کی بھی معقول ہے سائیں۔" پھر اچانک حواس باختہ ہو کر بولا۔

"سائیں میں موبائل بند کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے مردان شاہ کے آدمی ادھر ہی آرہے ہیں اور سینے میں کچھ دنوں کے لیے آپ کا دیا ہوا یہ موبائل چھپا کر رکھ رہا ہوں۔ آپ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا جوں ہی مجھے موقع ملا میں کر لوں گا۔ اللہ حافظ۔"

اس نے عجلت بھرے انداز میں کہتے ہوئے رابطہ ختم کر دیا۔

ولید نے بھی اپنا موبائل فرنٹ سیٹ پر پھینکا اور گاڑی ریورس کر کے گھر کی سمت موڑ لی۔

X...X...X

تانیہ کا سارا جوش افسردگی میں ڈھل گیا جب جامعہ آکر اسے پتہ چلا اکبر شاہ نہیں آیا۔ اس کے دوست سے پتہ چلا وہ ایمرجنسی میں گاؤں گیا ہے۔

آج وہ بے حد اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی۔ اسے آج اکبر شاہ اپنی بہن آمنہ علی سے ملوانے لے جا رہا تھا۔

رات بھر وہ خود کو یوں ذہنی طور پر تیار کرتی رہی جیسے کسی بڑے مشن پر روانہ ہونے والا کمانڈو خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرتا ہے۔

وہ خاصی ملول سی ہو گئی اور لائبریری چلی آئی۔ مگر کتاب الٹ پلٹ کرتے کرتے بھی تھک گئی۔ پھر جرنل نکال کر اسے پورا کرنے لگی مگر اس میں بھی دل نہ لگا تو بند کر کے رکھ دیا۔ تبھی اس کی نظریں لائبریری میں داخل ہوتی شہرینہ پر پڑیں اور اسے ایک گونا گوں سکون کا احساس ہوا۔ اس کے قریب آنے پر بولی۔

"شکر ہے خدا کا۔ تمہارا جلوہ تو دکھائی دیا۔ کیسا رہا کس بے کا ٹرپ۔"

مگر وہ جواب دینے کی بجائے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''میرا تو خیال تھا تم آج بھی نہیں آئو گی اور میں بوریت کے مارے سڑ سڑ کر مر جائوں گی۔''

وہ کتاب بند کر کے اس کی طرف دیکھنے لگی پھر یکا یک چونک گئی۔اس کے چہرے پر غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

وہ بے حد سنجیدہ لگ رہی تھی اور آنکھیں ایسی ہو رہی تھیں جیسے بہت سا روئی ہوں یا رونا ضبط کر رہی ہوں۔

'' آر یو او کے شیری! خیریت تو ہے؟'' اس نے تشویش سے اس کے میز پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

شہرینہ نے اپنی گہری ہوتی سنہری آنکھیں اٹھا کر اس کے چہرے پر جما دیں۔پھر پلکیں جھپک کر بے مقصد مسکرا کر ہلکی سانس بھر کر بولی۔

''آئی ایم فائن۔تم یہ بتائو کہ نومی کے نکاح کی سوری منگنی کی تصاویر ڈیولپ ہو کر آ گئیں کیا۔؟''

''ہاں وہ تو کب کی آ گئیں بس تمہیں دکھانے کے لیے بیگ میں لیے لیے پھر رہی ہوں۔تمہاری اور ولید بھائی کی بڑی زبردست آئی ہیں شیری!'' وہ جلدی سے بیگ اٹھا کر میز پر رکھ کر اس کی زپ کھولنے لگی۔

''سب کو ہی بہت پسند آئی ہیں۔اکبر شاہ بھی حیران رہ گیا۔'' وہ بے دھیانی میں بول گئی پھر یکلخت لب دانتوں میں دبا کر چور انداز میں پلکیں اٹھائیں تو شہرینہ کو اپنی طرف گھورتے پایا۔

''اکبر شاہ کو بھی دکھا دیں تم نے۔کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو تانیہ!''

حیرت اور خفگی سے اس کا چہرہ بگڑ گیا۔اس نے اس کے ہاتھ سے لفافہ چھیننے کے انداز میں لیا۔

'' یہ اکبر شاہ تمہارے اور میرے درمیان کیوں آ گیا تانی!''

''آئی ایم سوری شیری! یقین کرو اس روز بے اختیار میرے منہ سے تصویروں کا ذکر نکل آیا تو بس پھر وہ جان کو آ گیا اور دکھانی پڑیں۔تمہاری تصویریں تو اس نے خصوصی توجّہ سے دیکھیں اور دیکھو نا شیری۔''

وہ ایک دم جوش میں سیٹ سے اچھل کر مزید اوپر ہو کر بیٹھتے ہوئے معصومیت سے بولی۔

"اچھا ہے نہ اسے تمہارے اور ولید کے مابین رشتے کا اندازہ ہو جائے اور وہ تمہارا خیال چھوڑ دے۔" وہ نظریں چرا گئی۔ شہرینہ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی وہ سٹپٹا کر انگلیاں مسلنے لگی۔

"محبت وہ تم سے جتا رہا ہے۔ شادی کے خواب وہ تمہیں دکھا رہا ہے اور دل میں میرا خیال ہے۔" وہ تمسخر سے ہنسی۔

" نہ، نن، نہیں تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میرا مطلب تھا کہ میں۔"

" تم احتیاطاً ایسا کر رہی ہو۔" وہ اس کی بات کاٹ کر زور سے ہنسی۔

" تم اس کے دل میں کیسے جھانک سکو گی تانیہ کہ اس کے دل میں بیک وقت کتنی لڑکیوں کا خیال رہتا ہو گا۔ کب تک ایسی جھاڑو پھیرتی رہو گی۔ اس کے دل کی زمین پر بڑا ہی کچرا ہو گا تب تک۔"

"یو آر ناٹ فیئر۔ شیری! یہ بہت غلط بات ہے۔ تم اس طرح کی بکواس کر کے میرا دل مت کچلو۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی۔ وہ میرے معاملے میں بے حد سیریس ہے۔"

وہ دفاعیہ لہجے میں بولی اور قدرے شکایتی نظروں سے شہرینہ کو دیکھا۔

"وہ آج مجھے اپنی بہن آمنہ علی سے بھی ملوانے لے جانے والا تھا۔ بس اچانک اسے گاؤں جانا پڑا۔" وہ بیگ کی زپ کھولتے اور بند کرتے ہوئے کسی روٹھے ہوئے کم سن بچے کی طرح اپنا اور اکبر شاہ کا دفاع کر رہی تھی۔

شہرینہ کے اعصاب پر گویا پتھر پڑے تھے۔

"آمنہ علی۔!"

" یہ آمنہ علی۔ کون ہے آمنہ علی۔"

"اس کی بہن اور کون۔ آمنہ مردان علی شاہ۔ بڑی مشہور دولت مند باپ کی بیٹی ہے۔ بس اس وجہ سے میں اس سے ملنے سے ذرا گھبرا رہی تھی۔ وگرنہ اکبر تو کئی دنوں سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا، اس نے میرا ذکر بھی کر رکھا ہے اس سے۔ چلو چھوڑو تمہیں تو اس پر بھی اعتراض

ہو گا۔ یہ بھی تمہیں ناٹک ہی لگے گا۔ تم تصویریں دیکھو۔ تصویریں دیکھ کر تمہارا غصہ شاید اتر جائے خاص کر ولید بھائی کو دیکھ کر۔"

تانیہ نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لے کر کھولا اور اس سے تصویریں نکال کر اس کے آگے رکھیں۔

دونوں کے درمیان گہری خاموشی چھائی تھی۔ تانیہ بس چپ چاپ تصویریں اس کے آگے رکھ رہی تھی جبکہ شہرینہ کا ذہن ان تصویروں کی بجائے آمنہ علی کے گرد گھوم رہا تھا۔

مردان علی شاہ کی بیٹی۔

تو پھر مردان شاہ کی بیٹی وہ آمنہ علی کون تھی جو ولید کی منظور نظر ہے۔

اوہ۔ ہاں اکبر شاہ مردان شاہ کا بیٹا ہی تو ہے جو ایم پی اے ہے۔ زمیندار ہے اور اس کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

سب کچھ الجھ رہا تھا۔ اور بہت کچھ سلجھ بھی رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

"تانی تم نے اکبر شاہ کو میری اور ولید کی تصویریں دی ہیں کیا۔؟"

"ہیں' تصویریں کیوں میں دینے لگی۔ میں نے تو صرف دکھائی تھیں۔" تانیہ اس غیر متوقع سوال پر بوکھلا گئی۔ پھر تعجب سے بولی۔

"یہ سوال تمہارے ذہن میں کیوں آیا۔"

شہرینہ نے اسے جواب نہیں دیا بلکہ تصویریں اٹھا کر عجلت میں دیکھنے لگی تانیہ بھی الجھ کر ہر فوٹو دیکھنے لگی اور جیسے اس کا دل سینے میں ہلکے سے یوں دبا جیسے کسی نے مسلا ہو۔

وہ دونوں خوبصورت پوز غائب تھے جس پر اس نے اکبر شاہ کے ساتھ مل کر تبصرہ کیا تھا۔

اس نے بوجھل پلکیں اٹھا کر شہرینہ کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ایک ہلکی سی سانس اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔ وہ تصویریں گن کر لائی تھی چھتیس کی بجائے چونتیس تھیں' اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ دونوں تصویریں اکبر نے ہی غائب کی تھیں اور آمنہ علی یعنی اپنی بہن تک پہنچائی تھیں۔ اگر وہ واقعی اس آمنہ علی کا بھائی ہے تو وہ ولید کو یقیناً جانتا تھا اور ولید سے آمنہ علی کے تعلقات سے بے خبر بھی یقیناً نہیں تھا۔

کڑی سے کڑی ملا کر سلجھا رہی تھی اور الجھ بھی رہی تھی۔

''اس کا مطلب ہے اس نے تمہیں دل سے نہیں نکالا۔''

تانیہ کی آواز میں ملال' رنج' محرومی سب ہی کچھ تھا۔اس کی آواز ٹوٹے کانچ کی طرح بکھری ہوئی تھی۔وہ اپنے تئیں تصویریں غائب کرنے کا یہی نتیجہ اخذ کر سکی تھی کہ شہرینہ کی دل آویز تصویریں اکبر شاہ نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چرائی تھیں۔

''کیا بے وقوفی ہے تانیہ!'' وہ اپنے تانوں بانوں سے نکل کر اسے جھڑکنے لگی۔

''اس نے یہ تصویریں اپنے لیے نہیں' آمنہ علی کے لیے چرائی ہیں اور ولید کو آئینہ دکھانے کے لیے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے لگ کر ایک پل کو آنکھیں موند گئی۔سر اس بُری طرح جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے پکڑ کر لوہے کے آہنی جال میں باندھ دیا ہو۔

''ولید کو آئینہ دکھانے کے لیے کیا مطلب؟'' تانیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔مگر وہ جواب دینے کی بجائے آنکھیں موندے پڑی رہی۔اسے لگ رہا تھا آنکھیں کھولے گی تو چکرا کر گر پڑے گی۔

اس قدر غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا ہوا تھا کہ وہ یکسر ماؤف ہو کر رہ گئی تھی۔

''تمہیں اکبر شاہ نے تصویروں کے متعلق کچھ کہا ہے کیا؟'' تانیہ کی سوئی اپنے ہی اندیشوں میں اٹکی ہوئی تھی۔

''میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتی تھی تانی!'' اس نے بہ مشکل آنکھیں کھول کر تانیہ کو ملامتی نظروں سے دیکھا۔ایک کرب تھا جو رگ رگ کو کاٹتا ہوا گزر رہا تھا۔

ولید کا رویّہ دل و روح پر تازہ ہو کر آبلے کی طرح تپکنے لگا۔اس نے میز پر سے بیگ کی زنجیر کھینچی اور گود میں گرنے والے بیگ کو اٹھا کر کندھے پر ڈالتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

''شیری کک کیا ہوا بات تو سنو۔'' تانیہ بھی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"اس وقت میرا کچھ سننے سنانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے تانی پلیز لیو اٹ۔ میں گھر جا رہی ہوں۔ تم مجھے بس رکشہ لا دو۔ مجھ میں بالکل ہمت نہیں ہے سڑک پر دو منٹ بھی کھڑے رہنے کی۔"

"آئی ایم سوری شیری! میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ یقین کرو یوں ہی تصویروں کا ذکر نکل آیا۔"

تانیہ بری طرح شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں اکبر شاہ سے بات کروں گی اس نے ایسی حرکت کیوں کی۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا بس خاموشی سے لائبریری سے باہر نکل آئی۔ اس کا دل تانیہ سے نہیں ولید حسن سے خفا تھا۔

دل تانیہ نے نہیں ولید حسن نے توڑا تھا اور یہ دل جڑا بھی تو اسی شخص سے تھا۔ وہ تانیہ سے کیا کہتی۔

تانیہ اسی حالت کے پیشِ نظر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اسے اس کے گھر تک چھوڑا۔ راستے بھر اس سے معذرت کرتی رہی۔ مگر وہ گم صم سی بیٹھی رہی۔

X...X...X

ولید، یوسف سے بات کرنے کے بعد سیدھا گھر آیا تھا اور بڑی عجلت میں اس نے کپڑے بدلے۔ سفید شلوار قمیض پہنی، موبائل اٹھایا اور پورچ کی طرف دوڑا۔ اسی لمحے آغا جی کی گاڑی پورٹیکو میں آ کر رکی۔ وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ کر ان کی طرف چلا آیا۔

"السلام وعلیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ بہت عجلت میں نظر آ رہے ہو۔ خیریت تو ہے۔"

آغا جی نے گاڑی سے اتر کر اسٹک سنبھالی اور اس کا بغور جائزہ لیا۔

"نہیں ایسی خاص عجلت بھی نہیں ہے۔ دراصل گاؤں جا رہا ہوں میں۔"

آغا جی نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر قدم اٹھاتے ہوئے بولے۔

"تمہارے خیال میں تمہارا استقبال اب سابقہ انداز میں ہوگا وہاں۔" دوسرا قدم اٹھاتے ہوئے انہوں نے اس پر نگاہ ڈالی۔

گاڑی کی چابی ہتھیلی میں ہلکے ہلکے اچھالتے ہوئے وہ مسکرایا۔

"اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو یوں بھی وہاں مہمان بن کر نہیں جارہا بلکہ فارمیلٹی پوری کرنے جارہا ہوں۔ توقیر شاہ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ افسوس کہ وہ زندہ بچ گیا بلکہ خاص زخمی بھی نہیں ہوا۔"

اس نے بات کے اختتام پر متاسفانہ سانس بھری جیسے واقعی اسے توقیر شاہ کے زندہ بچ جانے پر انتہائی افسوس ہوا ہو۔ پھر پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

آغا جی سٹپٹا کر پلٹے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"ولید توقیر شاہ پر قاتلانہ حملہ کس نے کروایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے ولید کو کچھ ایسی مشکوک نظروں سے دیکھا کہ ولید کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ یکلخت کم ہوگئی اور اس نے ابرو چڑھا کر آغا جی کو دیکھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"آپ کے خیال میں حملہ میں نے کروایا ہوگا اس پر۔" اس نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا ایک سانس اس کے لبوں سے آزاد ہوگئی۔

"بڑے افسوس کی بات ہے آغا جی! آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔"

"بات شک کی نہیں ہے۔ وہم کی ہے اور آج کل مجھے جو اندیشے لاحق ہیں اس کے جکڑے ہوئے جال میں میں ازحد وہمی ہو گیا ہوں۔ تم' تم آخر' خیر۔" انہوں نے جیسے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور مضطرب انداز میں اسٹک کے سہارے پلٹ گئے۔

"آغا جی ایمرسن کہتا ہے انسان کی سب سے بڑی خوش قسمتی اور زندگی کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ وہ کسی خاص کام کا رحجان لے کر پیدا ہو جس کے کرنے میں اسے دلچسپی اور مسرت حاصل ہو سکے۔"

اس نے آگے ہو کر آغا جی کا راستہ روکا تھا۔ آغا جی اسے گھور کر دیکھنے لگے تو وہ ہنس کر مزید شرارت سے گویا ہوا۔

"ڈابسن کے مطابق مصیبتیں بیدار کرنے کے لیے آتی ہیں نہ کہ پریشان کرنے کے لیے۔"

"مگر اپنے ہاتھ سے لی ہوئی مصیبتوں میں پریشانیاں ہی ہوتی ہیں۔" آغا جی ڈپٹنے والے انداز میں جواباً بولے۔

"کیا یہ میرے ہاتھ سے لی ہوئی مصیبتیں ہیں۔" اس نے یکلخت بڑی دل گرفتگی سے دھیمے لہجے میں استفسار کیا تو آغا جی سرعت سے نظریں کترا کر دوسری طرف دیکھنے لگے پھر اسٹک اٹھا کر کسی ناراض بچے کی طرح بولے۔

"جاؤ جاؤ لڑکے! میرا دماغ خراب مت کرو۔ مجھے معلوم ہے میرے کہنے پر تم کبھی عمل نہیں کرو گے۔ بہر حال واپس آکر مجھے صورتِ حال سے باخبر ضرور کرنا۔ سارے مفکروں کے قول تمہیں ازبر ہیں۔ تمہارے پاس دلیلیں ہیں۔"

وہ آغا جی کو کم سن ناراض بچے کی طرح روٹھا دیکھ کر محظوظ ہو کر ہنس پڑا۔

"اگر اس وقت جلدی میں نہ ہوتا تو۔ آپ کو مفکروں کے مزید اقوال سناتا۔ اینی وے۔ اللہ حافظ۔"

اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر بے حد رش انداز میں گاڑی پورچ سے نکال لی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

X...X...X

حویلی میں اس کا پہلا ٹکراؤ اکبر شاہ سے ہوا تھا۔ وہ اسے پورٹیکو میں ہی نظر آ گیا۔ ولید حسن کو دیکھ کر اس کے چہرے کے زاویوں میں کھنچاؤ آ گیا۔ ناک کے نتھنے پھول گئے۔ بحالت مجبوری ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیا۔ تاہم اپنی ناگواری نہ چھپا سکا۔

"میرا خیال تھا اب آپ حویلی نہیں آئیں گے۔"

ولید نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا اور مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے قدم اٹھاتا ہوا بولا۔

"کس بنیاد پر تم نے یہ خیال کیا تھا۔"

اکبر شاہ نے سلگ کر اسے دیکھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر ہاکس بے کے کئی مناظر نمایاں ہو گئے' وہ خوب صورت تصاویر یاد آ گئیں اور شہرینہ کے ساتھ اس کا رشتہ بھی۔ خون میں نفرت کا ایک ریلا سا اتر آیا۔ مگر وہ دبا گیا ایک تو وہ آمنہ علی کا دوست تھا اور دوسرا اس کی شخصیت میں کچھ ایسا رعب و دبدبہ تھا کہ وہ اپنی کڑواہٹ نکال نہ سکا۔

''دراصل بہت کچھ روشن ہوگیا ہے ہم پر بس اسی خیال سے کہہ رہا تھا۔'' وہ استہزائیہ ہنسا۔

''ابھی کہاں' ابھی تو بہت کچھ روشن ہونا ہے۔یوں بھی روشنی تو بہر حال اندھیرے میں اچھی چیز ہے چاہے وہ دماغ میں ہو یا آنکھوں کے آگے۔اینی وے۔تو قیر شاہ کی عیادت کے لیے میں آیا ہوں۔''

وہ اکبر شاہ کو وہیں چھوڑ کر اندر بڑھ گیا اور گلاس ڈور کھول کر لابی میں قدم رکھا تو مردان علی شاہ سامنے ہی بیٹھے اپنے موبائل پر کسی سے محو گفتگو تھے۔ولید پر نگاہ پڑی تو گفتگو مختصر کر کے موبائل بند کر دیا اور صوفے سے اٹھ کر اس کی طرف آئے۔

''السلام وعلیکم۔''

اس نے احتراماً سلام کرنے میں پہل کی۔جواب اس کی توقع کے عین مطابق محض رسمی انداز میں سر کی جنبش سے ملا۔

''تمہیں آمنہ نے میرا پیغام نہیں دیا تھا۔'' ایک دو لمحے کے توقف کے بعد مردان شاہ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولے۔ان کی شخصیت میں یہ تبدیلی ولید حسن کے لیے دھچکا ہر گز ثابت نہ ہو رہی تھی۔تاہم اس کے لیے مشکل ضرور پیش آ رہی تھی۔

''کیسا پیغام فی الحال تو مجھے توقیر شاہ پر حملے کا پیغام ملا ہے اور میں عیادت کے لیے حاضر ہو گیا۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''وہاٹ۔کس نے دیا تمہیں یہ پیغام۔''

''اخباروں نے۔'' اس نے اسی اطمینان سے کہا تو مردان شاہ نے اسے یوں دیکھا جیسے کچا کھا جائیں گے پھر پلٹ کر دوبارہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے سر سراتے لہجے میں بولے۔

''مجھے آمنہ سے تمہاری دوستی پسند نہیں ہے' میں نے اسے تم سے ملنے سے روک دیا ہے۔''

''دوستی نہ سہی دشمنی ہی سہی۔یوں بھی ہم اجنبی تو رہے نہیں ہیں ایک دوسرے کے لیے اور جو اجنبی نہیں ہوتے ان کے درمیان کوئی نہ کوئی رشتہ تو ہوتا ہے۔''

''بکواس مت کرو''......اس کا یہ انداز مردان شاہ کو تپا گیا پھر قدرے تمسخرانہ انداز میں بولے۔

''دشمنی بھی ہم برابری کی سطح پر کرتے ہیں' اپنے سے کم تر' کم حیثیت لوگوں سے دشمنی ہمیں جچتی نہیں ہے۔''

"بالکل، بالکل میں بھی آپ سے ہنڈرڈ پرسنٹ متفق ہوں۔" اس نے شگفتگی سے تائید میں زور زور سے سر ہلایا اور ایک اونچی کرسی پر بیٹھ کر اس کے خوش نما نقش والے ہتھے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

"مجھے واقعی افسوس ہوا کہ توقیر شاہ پر یوں دن دھاڑے قاتلانہ حملہ ہوا۔"

مردان شاہ اسے بس دیکھ کر رہ گئے۔ان کے انداز میں کسی طرح کی رواداری نہ تھی۔

وہ بات بے بات کی مسکراہٹیں، گرم جوشی، وہ میٹھے لفظوں کی جادو گری خواب محسوس ہونے لگی تھی۔اب تو ان کی شخصیت میں ہی سرد مہری کا صحرا اتر آیا تھا۔وہ صوفے سے اٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے خود بھی جیسے سلگ رہے تھے۔

"بڑی مہربانی کی تم نے عیادت کی فارمیلٹی نبھانے کی کوشش کی۔اب تم جا سکتے ہو۔یوں بھی مجھے ایک ضروری میٹنگ میں شرکت کے لیے پنڈی جانا ہے۔"

ناگواری کے جذبات مردان علی شاہ کی صورت سے عیاں تھے۔

"آپ نے ایف آئی آر تو درج کروائی ہوگی۔کس پر شک ہے آپ کو۔" وہ گویا ان کا لہجہ ہی نہیں ان کا جملہ بھی نظر انداز کر گیا۔

"دیکھو ولید! یہ ہمارا پرسنل معاملہ ہے۔تمہیں مداخلت کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔" وہ جھنجلا کر بولے۔مگر اس کے اطمینان میں فرق نہ آیا۔البتہ وہ کرسی سے اتر کر ان کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کچھ بہت سے پرسنل افیئرز تو مجھ سے بھی ہیں آپ کے۔"

"میں نے کہا نا۔مجھے آمنہ سے تمہاری دوستی پسند نہیں ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر تند لہجے میں بولے۔

"آپ کی چہیتی بیٹی تو آپ ہی کو مبارک، مردان علی شاہ میں تو کچھ اور پرسنل افیئرز کی بات کر رہا تھا۔رہنے دیں اس وقت تو شاید آپ کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔"

"کون سے پرسنل افیئرز ہیں میرے تم سے۔" وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے پھر یکدم طنز سے ہنسے۔

"چوہے کے ہاتھ ہلدی لگی تو وہ بھی پنساری بن بیٹھا۔"

ولید اس طنز پر ہلکے سے یوں مسکرایا جیسے کسی احمقانہ بات پر مسکراتے ہیں مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت اتر آئی وہ بے حد سرد لگنے لگیں۔

" کہتے ہیں طنز اس عینک کی مانند ہے جس کے ذریعے اسے چہرے کے سوا ہر چیز نظر آتی ہے۔"

"کام کی بات کرو۔ فضول میں مجھے الجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" مردان شاہ تڑخ گئے۔

ولید کی موجودگی ان کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ ان کے وجود میں غصے کا ابال اٹھ رہا تھا اور ایسے میں اس کا اطمینان جلتی پر تیل کا کام کر رہا تھا۔

"خیر میں یہاں آپ سے الجھنے نہیں آیا۔ بلکہ آپ کو اطلاع دینے آیا ہوں کہ بہت جلد اس گاؤں میں سکول کا افتتاح ہونے والا ہے آپ خصوصی طور پر شریک ہوں گے۔ آخر آپ کے گاؤں کا یہ پہلا ہائی سکول ہوگا۔"

مردان شاہ کے سر پر گویا دھماکہ ہی ہوا تھا۔ وہ شاک کی کیفیت میں کتنی ہی دیر اسے دیکھتے رہ گئے۔ یہ انکشاف دھچکا ہی ان کے لیے ثابت ہوا تھا۔ بڑی دیر کے بعد انہوں نے اپنے معطل اعصاب کو سنبھالا اور ایک ھنکارا بھرتے ہوئے بولے۔

"ہوں تو یہ سکول تم تعمیر کروا رہے ہو۔"

جواباً ولید نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

"تو جہانگیر احمد کی پشت پر تم بہت اکڑ رہے ہو۔ میرے گاؤں میں میرے علاقے میں ایسی کوئی بھی عمارت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی مسٹر ولید جس کے کاغذات پر میرے دستخط نہ ہوں۔"

وہ جیسے غرائے۔ ان کی آنکھیں وحشی کی طرح یکدم سرخ ہونے لگیں۔

"نہیں مردان علی شاہ! اس ملک میں آپ اتنی مضبوط شخصیت نہیں ہیں۔ ابھی اور بھی بہت سے اوپر ہیں۔ آپ تو محض ایک وزیر ہیں یعنی عوام کے ادنی سے ملازم۔"

"بکواس بند کرو۔ تم، تم شاید اپنی حیثیت بھول گئے ہو۔ چیونٹی سے زیادہ اہمیت نہیں ہے تمہاری میری نظر میں۔"

"بجا فرمایا آپ نے مگر یاد تھی کو یہ چیونٹی اس وقت بڑی مہنگی پڑتی ہے جب وہ اس کی ناک میں گھس جائے اور ناک سے دماغ میں اور جب دماغ ہی ماؤف ہو جائے تو آدمی پر کٹے پرندے کی طرح ہو جاتا ہے جو نہ......"

"میں کہہ رہا ہوں اپنی بکواس بند کرو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ۔"

وہ غصے میں ہانپ کر رہ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کسی درندے کی طرح تنفس تیز تیز چلنے لگا۔ ولید نے اطمینان سے ان کا جائزہ لے لیا پھر اپنائیت بھرے انداز میں بولا۔

"بی ریلیکس مردان شاہ! اس عمر میں غصہ آپ کے لیے مضر ہے، کہتے ہیں بڑھاپا نہایت ہولناک مرض ہے۔ اس کی زد سے کوئی نہیں بچ سکتا، جتنی خرابیاں ہیں ان کا تدارک ہو سکتا ہے اگر کوئی تدارک نہیں ہو سکتا تو بڑھاپے کا اور بڑھاپے میں چند لمحوں کا غصہ۔ جوانی میں عمر بھر غصے میں جلنے والے خون سے کہیں زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ اس عمر میں

اتنی جلدی ری کور نہیں ہوتا۔ اس لیے ٹھنڈا رکھیے خود کو۔ آپ کا غصہ میرے اعصاب کو قطعی متاثر نہیں کر رہا۔"

مردان شاہ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے قتل کر دینا چاہتے ہوں۔

"بڑی پرانی خواہش تھی یہ میری کہ اس گاؤں میں ایک اسکول تعمیر ہو۔ بلکہ کچھ اور بھی تعمیری کام ہوں۔" ولید نے ٹھہر کر پھر بولنا شروع کیا۔ اس سے قطع نظر کہ مردان شاہ اسے زہریلی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا تنفس اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی سرخی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"بہت پہلے۔ اس گاؤں میں ایک شخص نے بڑے حسین خواب دیکھے تھے، مگر آپ جیسے مفاد پرستوں نے ان کا راستہ ہی نہیں روکا بلکہ انہیں اس دنیا سے ہی جدا کر دیا۔ خیر۔"

اس نے کسی اندرونی خلفشار سے چہرہ پر بڑھتی سرخی پر یکدم ہاتھ پھیرتے ہوئے سر کو جھٹکا۔

"تاریخ ضروری نہیں خود کو دہرائے۔" وہ ان کے قریب آیا اور ان کی طرف ذرا سا جھکا۔

"مجھے امید ہے ماضی کے کسی خوشگوار یارانے کے توسط سے آپ اس تقریب میں ضرور تشریف لائیں گے اور مجھے شکریہ کا موقع دیں گے۔ ویسے میں ماضی بعید کی بات نہیں کر رہا ہوں' اس میں تو قطعی خوشگوار یادیں نہیں ہوں گی نہ آپ کی نہ میری۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔"

وہ سر کو جنبش دے کر یوں بولا جیسے مردان علی شاہ مسلسل اس کی خاطر مدارات کیے جا رہے ہوں اور وہ اب زبردستی اجازت لے رہا ہو۔

اس نے مردان علی شاہ کے چہرے پر تفصیلی نگاہ ڈالی اور ہلکے سے سانس بھر کر ملامت سے بولا۔

"مجھے آپ کے رویوں پر قطعی افسوس نہیں ہوا۔ کیونکہ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق ہی پیش آتا ہے۔ ایک گڑھا اپنی گنجائش سے زیادہ پانی سہار نہیں سکتا۔ ظاہر ہے چھلک ہی جائے گا۔ چلیں اللہ حافظ سی یو اگین۔"

وہ مسکراہٹ اچھالتا' ہاتھ ہلاتا' پلٹ کر گلاس ڈور کھول کر باہر نکل گیا۔

مردان علی شاہ کے اعصاب بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔ اس کا یہ استحقاقی انداز و لب و لہجہ انہیں جانے کیا جتانا اور سمجھانا چاہ رہا تھا۔ وہ حقیقتاً اُلجھ گئے تھے۔ پھر اضطرابی انداز میں سگریٹ تیز تیز پیتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔

X...X...X

تمہاری انگشتری کے نگ میں
مری محبت چمک رہی ہے
اگر کبھی یہ گماں بھی گزرے
کہ میں تمہیں بھولنے لگا ہوں
تو اس نگینے کو دیکھ لینا
مری نگاہوں کی جگمگاہٹ
تمہاری آنکھوں سے

یہ کہے گی

"سنو محبت تو خوش گماں ہے"

اگر کوئی بغض دل کا مارا

فلک سے ٹوٹا ہوا ستارہ

تمہارے سینے میں وسوسوں کے کسیلے خنجر اتارتا ہو

تو، اس سے پہلے کہ رو پڑو تم

تو، اس سے پہلے کہ جل بجھو تم

تو، اس سے پہلے کہ یہ کہو تم

وہ عہد و پیمان سب غلط تھے

سحر کے امکان سب غلط تھے

تم اپنی انگشت ماہ وش پر

گلاب چہرہ جھکا کے کہنا

"سنو وہ سچ مچ ہی بے وفا ہے"

تمہارا روتا سوال بن کر

وہ شوخ رنگ مسکرا پڑے گا

تمہاری پلکوں پہ ہونٹ رکھ کر

تمہارے گالوں کو تھپتھپا کر

حسین انگشتری کہے گی

"سنو محبت تو خوش گماں ہے"

خوبصورت خیالوں کا ایک ریلا سا ذہن ہیں رنگین دھند کے حال کی طرح پھیل گیا۔ ان خیالات کا سلسلہ کئی سالوں سے شروع ہوا تھا۔ جب وہ صرف سیونتھ کلاس میں پڑھتی تھی۔ تب جب صرف تتلیاں پکڑنا، ہر اونچی چیز پر چڑھنا، چھلانگ لگانا، جھولوں میں جھولنا، آغا جی کے کندھے سے لٹک کر انہیں تنگ کرنا پسندیدہ مشغلے ہوا کرتے تھے۔

جب رنگین پُر رونق محفلیں اچھی لگتی تھیں۔ان کے سبب سے ناواقفیت ہونے کے باوجود ایک ایسی ہی محفل میں اسے آغاجی نے ایک خوبصورت انگوٹھی پہنائی تھی اور سامنے بیٹھے ولید حسن کی طرف اشارہ کیا جو جانے کیوں سمٹا سمٹا یا بیٹھا تھا۔

"یہ انگوٹھی تمہیں ولید نے دی ہے اسے اتارنا مت۔ ٹھیک ؟"

یہ کہہ کر آغاجی مسکرائے۔ باقی سب لوگ بھی مسکرانے لگے۔

"اگر اتاروگی تو ولید مارے گا۔" یہ مونا بھابی تھیں جن کی شادی کو ابھی دو ماہ ہی ہوئے تھے مگر کزن ہونے کے ناطے وہ ہمیشہ اس سے بے تکلف تھیں۔

"ارے واہ! کیوں ماریں گے۔ میں تو اتاروں گی بھی' اسکول جاؤں گی تو اتارنا ہی پڑے گی۔ الائو۔۔۔...... تھوڑی ہی ہے جیولری پہننا۔" وہ نخرے سے بولی۔

دل بلیوں اچھل رہا تھا اس انگوٹھی کو دیکھ کر۔اس لیے نہیں کہ ولید کی طرف سے تھی بلکہ اس لیے کہ اس کے نگینے بے حد چمک رہے تھے۔آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

مگر اب

اب یہ نگینے اتنے دھندلے دھندلے کیوں محسوس ہونے لگے تھے۔اپنی چمک کھو رہے تھے۔

یا

اپنی حیثیت

وہ خوش گمانیوں کے اس جال سے باہر آنا چاہتی تھی۔محبت اس کے لیے اب خوش گماں نہیں رہی تھی بلکہ ایک مسلسل عذاب اور اذیت بن کر رہ گئی تھی۔

ولید حسن ایک عجیب ضدی' خودسر اور مغرور سا انسان تھا۔اس کے مقابل اس نے ہمیشہ خود کو بے بس محسوس کیا تھا اور اب یہی بے بسی اندر ہی اندر کاٹ رہی تھی۔ کنکر بن کر رگوں میں چبھ رہی تھی۔

وہ بے بسی کی اس حد پر تھی کہ اندر غم' نفرت' غصے کا سمندر موجیں مار رہا تھا مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔اس شخص سے نفرت بھی نہیں جو اسے اتنی اذیت دے کر بھی ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔

اسے ناآسودگی میں دھکیل کر آسودہ رہتا تھا۔

بس ایک غم تھا جو اسے کھا رہا تھا اور سوچیں تھیں، اندیشے تھے جو اس غم کو اور بھی صیقل کر رہے تھے۔

وہ خود آزاری کی کیفیت سے گزر رہی تھی۔

اسے دکھ یہ نہیں تھا کہ تانیہ نے اکبر شاہ کو تصاویر کیوں دکھا دیں مگر رنج تو اس بات کا تھا کہ ولید نے بلیم کر کے اسے بری طرح مجروح کیا تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اب بھلا ان حالات میں وہ کیسے محض اس انگوٹھی کو پہن کر خوش گمانیوں کے سمندر میں شکستہ ناؤ کی طرح ڈولتی رہے۔

ہاں ولید اس کی منزل ہی نہیں ہے تو وہ کب تک سرابوں میں سفر کرتی رہے۔

تیرے بغیر بھی تو غنیمت ہے زندگی

خود کو گنوا کے کون تیری جستجو کرے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اضمحلال اس قدر بڑھا کہ وہ کمرے سے نکل کر لان میں چلی آئی۔ شام کی خوشگوار ہوائیں پھولوں کی خوشبو بکھیر کر پورے ماحول کو معطر کر رہی تھیں۔

مگر اس کے اندر تو وہی درد کا محشر برپا تھا۔ اس ستم گر کو بھلانا آسان تھا نہ اب اپنی ذات کو یوں مجروح کرنے کا یارا تھا۔

وہ اس کو کھو دینے کی اذیت سے پُر یہ پل صراط شاید پار کر سکتی تھی مگر اپنی انا، خودداری کو مجروح نہیں کر سکتی تھی۔ رد کیے جانے کا کرب نہیں سہہ سکتی تھی۔

درد کی لہر جانے کتنی دیر اس کے دل کو کاٹتی رہی۔ وہ بے چین روح کی طرح ٹہلتی رہی۔ جب آغا جی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ جانے کب سے اسے دیکھ رہے تھے۔

اس کی بے چینی، اس کا اضمحلال جیسے اپنے دل پر محسوس کر رہے تھے۔

"فرنکلین نے شاید بالکل ٹھیک کہا ہے کہ "آپ مسرور ہوں یا مغموم، تکلیف اور مصیبت سے بچنے کا یہی واحد طریقہ ہے کہ آپ کے پاس وقت نہ ہو۔ اور میرا خیال ہے لڑکی تمہارے پاس فالتو وقت بہت زیادہ ہے۔"

آغاجی نے یہ کہہ کر اسٹک اٹھا کر اسے اشارے سے قریب بلایا۔ وہ ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے چلتی ہوئی ان کی طرف آگئی۔

"ادھر بیٹھو۔ دو دن پہلے تو تم بڑی خوش باش تھیں یا پھر وہ میری نظر کا دھوکہ تھا۔" انہوں نے براہِ راست اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ وہ بال سمیٹ کر کین کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں خوش باش ہوں آغاجی!" وہ جیسے زبردستی مسکرائی۔ آغاجی کو اس کی یہ مسکراہٹ قطعی مصنوعی لگی۔

"ہونہیں، تھیں۔" وہ ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئے۔

"اب ایسا لگتا ہے جیسے تم نے چہکنا، ہنسنا سب چھوڑ دیا ہے۔ تمہاری ہنسی میں چہکاریں نہیں ہیں۔ تمہاری مسکراہٹوں میں اجالے نہیں ہیں۔ تم... ہاں مجھے ایسا لگتا ہے تم اندیشے، واہمے پالنے والی ہو۔" وہ اس کی سمت جھکے۔ "ایم آئی رائٹ شیری!"

اس نے سرعت سے سر جھکا لیا تھا۔ دل آزردگی کی لپیٹ میں آگیا۔ اس کی بھوری آنکھوں کی سطح بے اختیار نم ہوتی چلی گئی۔ اسے لگا جیسے آغاجی نے اس کے دل کے درد پر ہلکے سے ہاتھ رکھ دیا ہو اور اپنائیت کی گرمی سے وہ پگھل کر بہہ جانا چاہ رہا ہو۔

"دوربین سے بھی وہ چیز نہیں دیکھی جاسکتی جو آنسوؤں سے عیاں ہو جاتی ہے۔ یہ آنکھیں ہی تو ہمارا سچ ہیں۔"

آغاجی نے نرمی، شفقت سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تو وہ بے اختیار ہو کر ان سے لپٹ کر بچوں کی طرح رو پڑی۔

"ارے رے رے۔" آغاجی سٹپٹا گئے۔ پھر ایک گہری سانس بھر کر اس کا سر سہلانے لگے۔

"چلو رو لو۔ آنسوؤں کو بہا لینا اتنا نقصان دہ نہیں ہے جتنا انہیں اندر اتارنا۔"

وہ اسے تھپک رہے تھے اور وہ بھل بھل آنسو بہاتی رہی۔ جیسے اسے اسی اجازت کا انتظار تھا۔ وہ خود بھی نہ جان پائی کہ یہ اتنے بہت سے آنسو اس کے اندر کب اور کیسے جمع ہو گئے۔ آج بہانے بیٹھی تو خبر ہوئی ایک سمندر رہے جو رکنے کا نام نہیں لے رہا۔

بہت سا رونے کے بعد وہ بمشکل خود کو سنبھال پائی اور دوپٹے کے کنارے سے چہرہ رگڑنے لگی۔ پھر جونہی نظریں آغا جی پر گئیں وہ جھینپ گئی۔ یکدم اسے اپنی حماقت کا شدید حماقت کے سرزد ہونے کا احساس ہونے لگا۔

یہ اس نے کیا کر دیا۔ وہ اتنی کمزور کیوں ہو گئی۔ آخر آغا جی بیچارے کیا سمجھیں گے۔

"اب بتاؤ۔ مسئلہ کیا ہے۔ ولید سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔"

"اُف؟" اس نے شدت کرب سے لب بھینچ کر بھیگی پلکیں جھکا لیں۔

"یہ آپ ہر وقت ولید کو بیچ میں کیوں لے آتے ہیں۔؟"

آغا جی بے اختیار مسکرا دیئے اور اسٹک پر دونوں ہاتھ جما کر اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"آج سے پہلے تم کبھی اس طرح تو نہیں روئیں۔ اچھی بات ہے کہ آنسوؤں کو بہا دینا چاہیئے مگر تشویش کی بات تو ہے نہ کہ یہ آنسو جمع کیوں ہوئے ہیں۔ کیا محرک ہے اس کے پیچھے۔" ان

کا لہجہ ہی نہیں ان کے چہرے سے بھی تشویش جھلک رہی تھی۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔

کھلے گلابوں جیسی ترو تازہ لڑکی کو روز بروز مرجھاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اس کی ہنسی کے چاند بجھ گئے تھے۔ اور ہمہ وقت ہنستی آنکھیں آنسوؤں کی دھند میں رہنے لگی تھیں۔

"مونا گھر میں ہے نہیں کہ میں کہتا مونا سے جھگڑا ہوا ہے۔ اس نے تمہیں ستایا ہے' بچے ہیں نہیں اور میں تو رہا سیدھا سادہ سا بندہ۔ خود ہی کسی سے معرکہ آرائی نہیں کرتا۔"

شہرینہ کے دل کے اندر وہی دردِ محشر برپا ہونے لگا۔ اس نے ایک خفیف سے احساسِ شکست کے ساتھ کرسی کی بیک سے ٹیک لگا لی۔

"میرا کسی سے بھی جھگڑا نہیں ہوا ہے آغا جی! میں کسی سے بھی ناراض نہیں ہوں۔ عرصہ ہوا میں نے چھوٹی موٹی لڑائیاں بھی ترک کر دی ہیں۔ میں لڑنا ہی بھول گئی ہوں۔"

وہ پھر ہلکے سے مسکرائی مگر اس کی مسکراہٹ میں تازگی نہیں تھی۔ افسردگی تھی۔ پھر وہ سنبھل کر مسکراہٹ کو مزید کشادہ کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے مونا بھابی اور طوبٰی بہت یاد آرہے ہیں۔ بس اسی لیے دل بھر آیا۔"

آغاجی اسے دیکھ کر رہ گئے۔ اس لمحے وہ انہیں دنیا کی بے حد معصوم ترین ہستی لگی۔ ان کے دل کے بے حد پاس۔ انہوں نے محبت سے اس کے سر پر چپت ماری۔

"تو بس اس کا آسان سا حل یہ ہے کہ تم فوراً سے پیشتر اسلام آباد چلی جائو۔ تمہارے ماموں' ممانی بہت بلاتے رہتے ہیں تمہیں اور تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔ کچھ آب و ہوا بدلے گی تو۔"

وہ آغاجی کی بات پر چپ سی رہ گئی اور لب بھینچ کر پلکیں جھکا کر اپنی ہتھیلیوں پر نظریں مرکوز کر دیں۔

جگہ بدلنے سے' خیالات اور سوچیں بھی بدل جاتی ہیں کیا۔ دل کی آب و ہوا نہ بدلے تو ہر خطہ' ہر جگہ' ہر مقام ایک سا رہتا ہے۔

جدھر بھی جائوں نظر میں اسی کا پرتو ہے

وہ میرے دھیان کے سب راستوں میں رہتا ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس نے لحظہ بھر کو پلکیں موند کر کھولیں پھر ہولے سے مسکرا دی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے کچھ دنوں کے لیے اسلام آباد چلے جانا چاہئے۔" اس نے نظریں سامنے درخت پر مرکوز کر دیں۔

"پاپا کل اسلام آباد جا رہے ہیں میٹنگ کے سلسلے میں۔ میں ان کے ساتھ ہی چلی جاتی ہوں۔" وہ آغاجی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس کی ہنسی بہت

مصنوعی ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر آغاجی کا مہربان چہرہ دیکھا۔ وہاں تسلی بھری چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ وہ اپنائیت کے تمام تر احساس کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔

اس نے کرسی سے اتر کر عقیدت اور محبت سے گھاس پر بیٹھ کر ان کی گود میں سر ڈال دیا۔

آغاجی کچھ کہنا چاہ رہے تھے مگر پھر سوچ کر لب بھینچ لیے اور محبت میں اس کا سر سہلانے لگے۔ ان کی آنکھوں میں سوچوں کے بھنور گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

X...X...X

اکبر شاہ نے کندھے سے بیگ اتار کر قالین پر ہی پھینکا اور جوتوں سمیت صوفے پر دراز ہو گیا۔

آمنہ علی ریموٹ سے ٹی وی چینل بدلتے ہوئے بیٹھے بیٹھے ہی اس کی سمت گھومی۔

"باباسائیں نہیں آئے تمہارے ساتھ۔ کہہ تو رہے تھے وہ بھی آئیں گے۔"

اس نے ادھر ادھر بکھرے کشنوں سے ایک کشن اٹھا کر گود میں دبا لیا اور صوفے سے ٹیک لگا کر پائوں پھیلا کر بیٹھ گئی۔

"وہ اسلام آباد چلے گئے ہیں اور تمہیں تو پتہ ہے۔ میں ایک دن سے زیادہ گائوں میں نہیں رہ سکتا۔ مائی گاڈ کتنی خشک اور بورنگ لائف ہے گائوں کی۔ مجھ جیسے رنگین شنگین بندے کا تو دم گھٹنے لگتا ہے اور آج کل حویلی میں ٹینشن بھی تو بہت ہے نا۔"

"ہاں ظاہر ہے توقیر بھائی موت کو شکست دے کر زندگی کی طرف لوٹے ہیں۔" اس نے سانس بھر کر ملازم کو آواز دے کر جوس منگوایا پھر بولی۔

"فدا بھائی اچھا نہیں کر رہے ہیں یہ سب کر کے۔ یہ دشمنی دونوں میاں بیوی کو ہی مہنگی پڑے گی۔"

"نہیں نہیں، میں نہیں مانتا کہ فدا بھائی نے توقیر پر فائرنگ کی ہو۔ اٹس ایمپوسیبل۔"

آمنہ نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"باباسائیں اور توقیر بھائی کو شک ہے تو کچھ غلط تو نہ ہو گا۔ یوں بھی فدا بھائی نے اپنی سیاسی پارٹی بنا لی ہے اور برابر اپنے جلسوں میں باباسائیں اور توقیر بھائی کے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے۔ وہ توقیر بھائی کو راستے سے ہٹا کر یہ سیٹ خالی کروا کر خود آنا چاہ رہا ہے۔"

'Barking dogs seldom bite' وہ ہنس پڑی اور ملازم کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لے کر لبوں سے لگا لیا۔ دوسرا گلاس ملازم نے اکبر شاہ کو پیش کر دیا۔

"ہاں چھوڑو۔ یہ بتائو تانیہ کا فون آیا تھا؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سامنے رکھی ہوئی تپائی پر پیر پھیلائے۔

"کون تانیہ!" اس نے بھنویں اچکائیں اور پھر یاد آنے پر منہ بگاڑ کر بولی۔

"وہ۔آچ۔چھا۔وہ لڑکی۔میں نے تو نہیں اللہ بخش نے ہی ریسیو کیا تھا۔شاید اسی کا تھا۔"

پھر استہزائیہ ہنسی کے ساتھ بولی۔

"اسے کیا خواب دکھا رہے ہو تم۔سکندر رضا کی بہن ہی ہے نہ وہ۔"

اس کی آنکھیں بھی تمسخر سے ہنس رہی تھیں۔اکبر شاہ پائن ایپل جوس کا بڑا سا گھونٹ بھر کر ہلکے سے مسکرا دیا۔

"بڑی ٹیڑھی ثابت ہو رہی ہے۔جو ذرا چھو لوں تو بدک جاتی ہے۔ویسے ہے بڑی اٹریکٹو لڑکی۔اس شراب کا بھی اپنا ہی نشہ ہے۔"

"کم آن' اکبر! آخر تمہیں ضرورت کیا ہے دو ٹکے کی لڑکیوں کے پیچھے خوار ہونے کی۔" وہ انتہائی حقارت سے بولی۔

"کم از کم اپنے اسٹینڈرڈ کا تو خیال رکھو۔خاندانی حسب نسب کا۔اپنے وقار کا۔تم نے تو بھنگ اور ہیروئن کا بھی فرق نہیں رکھا۔" ناگواری اس کے چہرے کے زاویوں سے چھلکی پڑ رہی تھی جیسے تانیہ رضا اس کے لیے مکروہ سی شے ہو۔

"تو ڈیئر سسٹر شادی کون کر رہا ہے اس سے۔" اکبر شاہ ہنسنے لگا۔

اس نے کشن ایک طرف ڈالا اور بال سمیٹتے ہوئے اسے گھورا۔

"وہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔یوں بھی شادی تو ظاہر ہے وہیں ہو گی جہاں بابا سائیں چاہیں گے۔ہمارے اسٹینڈرڈ کے مطابق۔تاکہ سوسائٹی میں فخر کے ساتھ تعارف تو کروایا جا سکے۔بائی دی وے۔شہرینہ سے تو شادی کے لیے کچھ کچھ سیریس تھے' تم شاید۔"

"آہ ہا۔ظالم کس کا نام لے لیا تم نے۔" اکبر شاہ کے لبوں سے بے اختیار ٹھنڈی طویل سانس نکل گئی۔اس کی آنکھیں شہرینہ کے تصور سے ہی چمکنے لگیں۔پھر یکلخت چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔پھر یاد آنے پر بولا۔

"ارے ہاں' ولید حسن آیا تھا حویلی میں۔"

اس کی بات پر آمنہ علی اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ کر متعجب سی اس کی طرف پلٹی۔

"ولید حویلی آیا تھا مگر کیوں؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتہ مگر تھا بڑی اکڑ شکڑ میں۔ پتہ نہیں اب کس پر زعم ہے اسے۔ ویسے اندر گیا تھا اور یقیناً بابا سائیں نے اس کی طبیعت صاف کر دی ہو گی۔" وہ جوس کی چسکیاں بھرنے لگا۔ ولید حسن سے نفرت اس کی آنکھوں کی تہوں سے ابھرنے لگی۔

"فراڈی۔" آمنہ پیروں سے کشن اچھال کر کھڑی ہو گئی۔

"ویسے ایسی بات حسب و نسب کی نہ ہوتی تو بندہ ہے بڑا ایٹریکٹو۔ اور شاید اسے ناز بھی اسی پر ہے۔"

"ہاں۔ اس سحر نے تو مجھے جکڑ لیا تھا۔" ایک ٹھنڈی ملول سی سانس جیسے اس کے سینے سے دھوئیں کی صورت نکلی اور لبوں پر دم توڑ گئی۔ پھر حقارت اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ بولی۔

"میں حسب و نسب' اسٹینڈرڈ پر جان دینے والی لڑکی ہوں۔ اپنی حیثیت سے کم تر شخص کے ساتھ تو میں محض وقت بھی رنگین کرنا پسند نہیں کرتی' کجا شادی۔ اچھا ہی ہوا اس نے یہ چولا جلد ہی اتار دیا۔"

وہ بال جھٹک کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ وہ ایک دم غصے اور جھنجھلاہٹ کا شکار دکھائی دینے لگی تھی۔ کچھ بھی تھا ولید حسن کی شخصیت کا سحر اب بھی طاری تھا اس پر۔

"او مائی گاڈ۔" اس کی نظریں وال کلاک پر گئیں تو وہ چونکی۔ "مجھے جمشید کے پیرنٹس کی میرج اینی ورسری میں جانا ہے۔ بالکل بھی یاد نہیں رہا۔"

"کون جمشید؟" اکبر شاہ نے حیرت سے ابرو اچکا کر اسے دیکھا تو وہ دھیرے سے مسکرانے لگی۔

"خان گروپ آف کمپنی کے ڈائریکٹر عارف خان کا اکلوتا بیٹا جمشید خان۔" پھر پلٹ کر گردن کو ذرا سا اس کی طرف موڑ کر بولی۔

"تمہیں پتہ ہے' میں وقت رنگین بھی اپنے برابر کے لوگوں کے ساتھ کرتی ہوں۔ تمہاری طرح دو ٹکے کی بے حیثیت لڑکیوں سے نہیں۔ ہنہ دیسی شراب جیسی لڑکیاں۔" وہ یہ کہہ کر زور سے کھلکھلائی۔ اکبر شاہ اسے مصنوعی پن کے ساتھ گھورتا رہا تھا پھر جلدی سے بولا۔

"اچھا سنو تو۔ کل تمہارا ٹائم چاہیے جناب کا۔ تانیہ کو تم سے ملوانا چاہ رہا ہوں۔"

وہ رک کر پلٹی۔ ایک ناگواری اس کے چہرے کے زاویوں میں اتر آئی تاہم سر ہلا دیا۔

"مگر صرف آدھا گھنٹہ ہی دے پاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ ایڑیوں کے بل گھوم کر لونگ روم سے نکل گئی۔

اکبر شاہ ہنس دیا اور جوس کا گلاس ٹیبل پر پٹخ کر دوبارہ صوفے پر دراز ہو کر اپنے موبائل پر تانیہ کے نمبر پش کرنے لگا۔

"تمہیں کیا پتہ احمق سسٹر! دیسی شراب کا جو مزہ ہوتا ہے وہ ولایتی شراب میں کہاں ملتا ہے' وہ کیف' وہ سرور' وہ...وہ حیاآمیز جھینپا جھینپا' چھپا چھپا ذائقہ' گھونٹ گھونٹ پینے کا اپنا ہی مزہ ہے۔"

وہ دوسری طرف ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ تانیہ کی دھیمی آواز سنائی دی تو وہ سنبھل گیا اور کشن سر کے نیچے اچھی طرح دبا کر اطمینان سے پھیل کر لیٹ گیا۔

"ہیلو جانِ اکبر۔" سارے جہاں کی حلاوت مٹھاس وہ لہجے میں سمو کر جذبوں سے پر آواز میں بولا تھا۔ ساتھ ہی تصور کی آنکھ سے اس نے تانیہ کو جیسے سرتاپا پگھلتا محسوس کیا۔

وہ بھی گویا اکبر شاہ کی ہی منتظر تھی۔ لحظہ بھر کو خفیف خاموشی کے بعد بولی۔

"میں تمہارے فون کا ہی ویٹ کر رہی تھی۔"

"اوہ۔ زہے نصیب۔" وہ کچھ اس انداز سے بولا کہ تانیہ سٹپٹا گئی۔ پھر جلدی سے بولی۔

"ایگزام کی تیاری ہو رہی ہے' یا نہیں۔"

"اوں ہوں۔ یہ بیچ میں ایگزام کہاں سے آ گئے۔" وہ منہ بنا کر بولا اور ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"بس ایک کتابی چہرہ نظر میں ہے ناصر

کسی کتاب سے استفادہ کیا کرتا

ارے ہمیں عشق کے امتحان سے ہی فرصت نہیں ہے تم ہمیں کہاں دوسرے امتحان کی یاد دلا رہی ہو۔"

"سب بکواس ہے۔" تانیہ جیسے تڑخ کر رہ گئی۔

"محبت تمہیں کسی اور سے ہے اور ڈائیلاگز مجھ سے بولتے ہو تم۔"

"ایں ارے رے۔ خیریت تو ہے۔" وہ یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"یہ اتنی ناراضگی کس خوشی میں۔" وہ حقیقتاً حیران تھا یا بن رہا تھا۔ تانیہ لحظہ بھر لب بھینچ کر چپ رہی۔ ایک گہری سانس اس کے سینے کی تہہ سے آزاد ہو گئی۔

"تم نے شہرینہ کے فوٹوز کیوں چرائے۔" اس کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

لائن میں ایک دو پل خاموشی رہی۔ پھر اکبر شاہ کا قہقہہ یکدم گونج اٹھا۔

"تو جناب وہی رقیبانہ جذبہ چیخ رہا ہے۔"

"میں سنجیدہ ہوں، اکبر!" وہ بری طرح مجروح ہوئی تھی۔ ایک کراہ اس کے لہجے میں تھی۔

"آج دریا چڑھا چڑھا سا ہے

کوئی ہم سے خفا خفا سا ہے"

وہ گنگنایا اور پھر قدرے سنجیدگی کے ساتھ بولا۔

"تمہارے خیال میں، میں نے شہرینہ کے فوٹوز اپنے بیڈروم میں آویزاں کر کے صبح شام اس کا دیدار کرنے کے لیے چرائے ہیں۔"

اس کا انداز سخت فہمائشی تھا بلکہ کسی حد تک خفگی بھرا بھی۔

"تو پھر؟" تانیہ نے الجھ کر پوچھا۔

"پہلے یہ بتاؤ تم مجھ سے بدگمان کیوں ہوئیں۔ کیا تمہیں اپنے جذبوں پر بھی اعتبار نہیں ہے۔ تمہاری نظروں میں، میں اب بھی ایک بدکردار، دل پھینک شخص ہوں اور..."

"نہیں نہیں اکبر شاہ! مم، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" تانیہ اس کی خفگی کو محسوس کر کے سٹپٹا گئی۔

"دراصل میں بے حد پریشان ہوئی کہ دونوں تصویریں گم کہاں ہو گئیں۔ پھر تمہاری طرف دھیان گیا تو..."

"تو تم بدگمان ہو گئیں۔" اس نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔ تانیہ چپ سی رہ گئی۔

"کم آن تانیہ! یو آر ناٹ فیئر۔ میری محبت پر شک کر کے تم ظلم کر رہی ہو مجھ پر۔" وہ کراہا تھا۔ تانیہ کا دل پگھل پگھل گیا، وہ مضطرب ہو گئی۔

"نہیں نہیں اکبر شاہ! مجھے غلط مت سمجھو۔ دراصل میں بس یونہی وہمی ہوگئی تھی۔" وہ یکدم رو پڑی۔

" چلو چھوڑو۔ معاف کیا۔اب پلیز رومت۔" اس کے لہجے کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا اور لہجے میں نرمی اور اپنائیت کا رنگ اتر آیا۔

"بس یہ تصاویر میں نے ولید کی وجہ سے لی تھیں۔ولید حسن کا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نہ کہ یہ شخص۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ اب تو بدگمان نہیں ہونا۔"

وہ دھیمے لو دیتے لہجے میں بولا تو تانیہ کچھ دیر تو بول ہی نہ سکی۔اس کا دل پہلو میں سیل شوق سے دھڑکنے لگا۔

بدگمانی کے بادل چھٹ گئے۔اب شرم اس پر غالب آگئی۔

'بولو نا۔ مجھ سے بار بار اظہار سننے کے لیے تم مجھے ستاتی ہونا۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" تانیہ کا انداز جھینپا جھینپا سا تھا۔

" سنو کل جامعہ تو آرہی ہونا۔ اگر ہو سکے تو آج شام تیار رہو میں تمہیں تمہارے گھر کے کچھ فاصلے سے پک کر لیتا ہوں۔ کھائیں گے، پئیں گے، شاپنگ کریں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"آج۔" وہ سراسیمہ ہو گئی۔ پھر جلدی سے بولی۔

"نہیں، نہیں۔آج تو بہت مشکل ہے۔"

"مشکل؟" وہ ہنسا۔

اتنی مشکل بھی نہیں ہے دشت وفا کی تسخیر
سر میں سودا بھی تو ہو، دل میں ارادہ بھی تو ہو

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر بولی۔

"مشکل یہ ہے اکبر کہ میں اس طرح گھر سے نکل نہیں سکتی۔ہزار بہانے تراشنے پڑیں گے اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں چاہتی۔اچھا نہیں لگتا مجھے کھلے بندوں گھومنا پھرنا۔ کسی مستحکم رشتے کے بغیر۔"

اس کی بات کے جواب میں اکبر شاہ ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دل ہی دل ہیں اسے موٹی سی گالی دی اور موبائل بند کر دیا اور قدرے حقارت سے سر جھٹکا۔

"اونہہ۔ مستحکم رشتہ' بڑی آئی کتیا کی بچی۔ تمہیں تو میں کسی مستحکم رشتے کے بغیر ہی اپنے پیروں کی دھول بنائوں گا۔"

اس کے خون تک میں کڑواہٹ گھل گئی۔ وہ تپائی کو جوتوں کی نوک سے دھکیل کر کھڑا ہو کر ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ گیا۔ پیٹ کی بھوک تو بہر حال بجھانی ہی تھی۔

X...X...X

تم خواب زندگی کی تعبیر بن کے آئے

میرے تصوروں کی تصویر بن کے آئے

آہی گئے ہو جب تم

جانا نہیں دوبارہ

تانیہ گنگناتے ہوئے چھپ چھپ کپڑے نچوڑ رہی تھی۔ بڑی ترنگ میں تھی۔

نادیہ آپی نے کچن کی جالی سے اسے دیکھا اور قدرے حیرت کے ساتھ مسکرائیں۔ تانیہ اور اتنے جوش و خروش سے کپڑے دھونا۔ کچھ حیرت اور مسرت کی ہی بات تھی۔

"کیا بات ہے۔ ایک کپڑا دھوتے ہوئے تمہاری جان جاتی ہے۔ منہ سے مجھے کوسنے دیئے جاتے ہیں اور آج تو دھنا دھن دھلائی ہو رہی ہے۔ کیا پرائز بانڈ نکل آیا ہے یا فرسٹ پوزیشن آنے کی امید ہے۔؟"

نادیہ آپی چاول چنتی کچن سے باہر آکر گرل سے لگ کر اسے چھیڑنے لگیں۔ وہ کپڑوں کو نل پر ڈال کر نل بند کر کے ان کی طرف مڑیں۔

"بڑے دنوں بعد مجھے خیال آیا ہے کہ آپ تو پرائی امانت ہیں اور آفٹر آل جانا ہی ہے آپ کو تو ابھی سے پریکٹس کر لوں ان ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہونے کی۔"

نادیہ آپی جھینپ گئیں۔ ان کے چہرے پر شرمیلا رنگ آکر پھیل گیا۔

روز ہی ان کے سسرال سے فون آرہے تھے۔ وہ شادی پر زور دے رہے تھے۔ ادھر نومی کا معاملہ التوا میں پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے امی انہیں ابھی ٹال رہی تھیں۔

دیکھو عجیب کتنے چاہت کے سلسلے ہیں

محسوس ہو رہا ہے پہلے بھی ہم ملے ہیں

دنیا میں پیار کرنے

ہم آگئے دوبارہ

وہ پھر موج میں آکر گانے لگی تھی۔ جب سے اکبر شاہ سے فون پر بات ہوئی تھی اس کے اندر ایک نئی توانائی بھر گئی تھی۔ ایک ترنگ' مستی' جذبے اپنی جولانیوں پر آگئے تھے۔

آہ یہ نشہ کیسا کیف آور ہوتا ہے کہ کوئی ہمیں چاہ رہا ہے۔ ہمارا تمنائی ہے' ہماری ذرا سی توجہ دل میں پھول کھلا دیتی ہے۔

کس نام سے پکاروں

کیا نام...

"اچھا نا...اب بس بھی کرو لڑکی! اف اچھی آواز بھی نہیں ہے اوپر سے پورے والیوم کے ساتھ گا رہی ہو۔ باہر تک آواز جا رہی ہے۔" نادیہ آپی نے اسے ٹوکا پھر چلائیں۔

"تانی! خدا کے لیے یہ نل بند کر دو۔ توبہ کتنا پانی گر رہا ہے مسلسل۔ ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہو گا روزِ محشر۔ احساس ہے کہ نہیں۔ اف۔ مشین کا ڈھکن تو لگاؤ سارا جھاگ باہر نکل کر مشین کی باڈی خراب کر رہا ہے۔ میرے خدا کس قدر پھوہڑ ہو تم تانی!" چاول کی تھالی ایک طرف رکھ کر اس کی طرف چلی آئیں۔

تانیہ کھلکھلا کر بالٹی میں بھرا پانی لے کر ان پر اڑانے لگی۔

"سارا سگھڑ پن تو آپ کے کھاتے میں آگیا ہے' ڈارلنگ آپی۔ بس آپ یہ سگھڑ پن سنبھال کر رکھیے۔ پیا کے گھر کے لیے وہیں قدر ہو گی۔ ڈنکے بھی خوب بجیں گے۔ ساس تو مارے خوشی کے پائوں دھو دھو کر پیئیں گی۔ پھر بھلے سے چاہے بیمار ہو جائیں۔"

"مت سدھر نا تم۔ بس پٹر پٹر زبان چلاتی رہنا۔" انہوں نے ہنستے ہوئے اسے ایک دھپ رسید کی۔

اسی دم اماں سکندر کے ساتھ گھر میں داخل ہوئیں۔ سکندر انہیں آج زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ کئی دنوں سے انہیں کمر کے درد کی شکایت تھی۔ اب تو بیٹھنا بھی دوبھر ہو گیا تھا۔

"سارا صحن گیلا کیا ہوا ہے لڑکی!" اماں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتیں صحن تک آئیں اور چادر اتار کر ایک طرف ڈالی۔

"صرف صحن میں ہی نہیں باہر تک پانی گیا ہے اور تمہاری آواز بھی۔" سکندر نے بائیک اندر لا کر ایک طرف کھڑی کرتے ہوئے تانیہ کو دیکھا۔ اس طرح سے انتباہ کیا تھا ہلکے فہمائشی انداز کے ساتھ کہ تانیہ کھسیا گئی جبکہ نادیہ آپی نے اسے دبی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

"دراصل آج آپ کی سگھڑ، سلیقہ شعار بہن نے نہیں بلکہ پھوہڑ گریجوٹ بہن نے کپڑے دھوئے ہیں۔" وہ مشین کا پلگ بند کر کے... تار لپیٹنے لگی۔

"اوئے ہوئے ابھی کہاں سے گریجوایٹ۔" نادیہ آپی پلٹ کر کچن کی طرف جاتے ہوئے بولیں۔

"ہو ہی جائوں گی اتنی نالائق تو ہوں نہیں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اچھا بس۔ شور مت کرو۔ میرا سر دکھ رہا ہے۔ سکندر! یہ دوائیاں تانیہ کو دے دو۔ یہ اندر رکھ آئے گی۔" اماں تخت پر لیٹ گئیں۔

اسی دم فون کی بیل بجی تو تانیہ کی ساری حسیات گویا بیدار ہو گئیں۔

"میرا فون ہوگا۔ آپ رہنے دیں شاید شہرینہ ہوگی۔" وہ سکندر کو قدم اٹھاتے دیکھ کر جلدی سے بولی اور ان کے ہاتھ سے دوائیوں کا لفافہ لے کر جھپاک سے اندر بھاگ لی۔

شہرینہ کے نام پر سکندر کے دل پر کچھ عجیب سا اثر ہوا۔ ذہن کی طنابیں کھنچنے سی لگیں۔

وہ آستین فولڈ کرتا ہوا بیسن پر جا کر منہ دھونے لگا اور بیسن کے اوپر لگے آئینے میں بے ارادہ اپنا چہرہ دیکھا۔

اب تو یہ آنکھیں خواب دیکھنے سے بھی خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ موہوم سی امید کی لو بھی بجھ گئی تھی۔ کس تمنا پر اب یہ آنکھیں خواب بنتیں۔

وہ خوش فہمیوں میں رہنے والا شخص نہیں تھا۔

اپنی ذات کا دکھ تو وہ اجتماعی دکھوں میں دبا چکا تھا بلکہ اپنی ذات تک کو فراموش کر دیا تھا۔

مگر پھر۔

یہ کسک کیسی تھی۔

آہ۔

دل تھا آخر پہلو میں مچل کر کبھی کبھی اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگتا تھا۔ مدفون جذبوں کی راکھ پر ہوا پڑتی تو اندر سے چنگاری سی سلگتی دکھائی دیتی۔

ایک ہیجان اٹھتا تھا اور وقتی آزردگی کی لپیٹ میں آکر وہ یکسر سب سے غافل ہو جانا چاہتا تھا۔

مگر مسلسل فراموشی وہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا اپنے حالات کے پیشِ نظر۔

" چائے دوں سکندر!" نادیہ آپی کچن کی جالی کا دروازہ کھول کر اس سے مخاطب تھیں۔ وہ یوں چونکا جیسے گہری نیند سے کوئی جھنجھوڑ دے۔ پھر ہلکی سی سانس بھر کر سر ہلا دیا۔

"ہاں خوب اسٹرونگ سی ہونی چاہیے۔" وہ تولیے سے منہ پونچھنے لگا۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی شائستہ سی دستک ہوئی۔

اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ سکندر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو سامنے سید صاحب کھڑے تھے۔

"ارے آیئے آیئے۔ سید صاحب! کھڑے کیوں ہیں آپ ہی کا گھر ہے۔" اس نے دروازہ پورا کھول دیا اور ایک طرف ہٹ کر سید صاحب کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ اماں نے سید صاحب کا سن کر

جلدی سے دوپٹہ اچھی طرح سر پر لے لیا۔ نادیہ آپی بھی کچن کی جالی میں آکر کھڑی ہو گئیں۔

ان کا دل نہ جانے کیوں معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔

اندیشے اور واہمے دل کی زمین پر سر پٹخنے لگے۔ سید صاحب کے چہرے پر پھیلی غیر معمولی سنجیدگی جیسے ان کے اندیشوں کو اور صقیل کرنے لگی تھی۔

ثانیہ فون پر شہرینہ سے بات کرنے کے بعد جب کمرے سے باہر آئی تو کچن کے سنک کے پاس منہ کیے نادیہ آپی اسے ہلکے ہلکے سسکیاں بھرتی ہوئی نظر آئیں۔ چولہے پر رکھی چائے بھاپ بن کر اڑتی جا رہی تھی۔ وہ گھبرا کر اندر آئی۔ چولہا ہلکا کیا اور نادیہ آپی کے قریب آگئی۔

"کیا ہوا آپی؟" اس کی نظریں بے اختیار کچن کی جالی سے باہر صحن میں بیٹھے سید صاحب پر گئیں تو ایک لحظہ اس کا دل سینے کی دیوار میں لرزنے لگا۔

"کیا بات ہے آپی! خدا کے لیے یہ رونا تو بند کر دیں اور مجھے بتائیں تو۔" اس نے جھٹکے سے ان کا رخ اپنی طرف کر لیا تو وہ اور روتے ہوئے اس کے کندھوں سے لگ گئیں۔

"وہی ہوا تانی جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ رشتہ ختم کر دیا ہے۔"

"کیا؟ رشتہ ختم کر دیا ہے۔ عظمیٰ اور نومی کا۔ مگر... مگر کیوں آپی!" تانیہ اس خبر کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھی شاک کی کیفیت میں وہ جالی کے پار سید صاحب کو دیکھتی رہ گئی۔ پھر جھٹکے سے نادیہ آپی کو خود سے الگ کیا اور بولی۔

"میں پوچھتی ہوں انکل سے۔ وہ ایسا ظالم فیصلہ کیوں کرنے چلے ہیں۔ عظمیٰ... عظمیٰ میری بھابی ہی نہیں، بہن بھی ہے۔ اسے ہمارے گھر میں بہت پیار، بہت خوشیاں ملیں گی۔ پاگل ہیں انکل تو۔"

نادیہ آپی نے اسے روکنا چاہا تو وہ ان کا ہاتھ جھٹک کر باہر نکلی۔ مگر اس کے قدم سکندر بھائی کی کرسی کی پشت تک آتے آتے سست پڑ کر رک گئے۔ سید صاحب سر جھکائے کہہ رہے تھے۔

"میں نے بھی بڑی وابستگیوں اور محبتوں سے یہ رشتہ جوڑا تھا سکندر! مگر ہم انسان رشتہ جوڑتے وقت اپنے اللہ کو فراموش کر دیتے ہیں۔ جس نے آسمان پر جوڑے بنا دیئے ہیں۔"

وہ ایک پل رکے اور ہلکی سانس بھر کر بولے۔

"میں نے لوگوں کی باتوں میں آکر یہ فیصلہ نہیں کیا۔ بہت سی باتیں میرے کانوں میں پڑیں مگر میں نے کان نہیں دھرے۔ ہاں بیٹی کا باپ ہونے کے ناطے دل مضطرب ضرور ہو جایا کرتا تھا۔ پھر حد سے زیادہ بے چین ہوا تو استخارہ کر لیا۔ حالانکہ یہ کام مجھے رشتہ آتے ہی کرنا چاہیے تھا مگر آہ۔ ہم انسان..." وہ ایک مضمحل سی سانس بھر کر سکندر کی طرف دیکھنے لگے۔ "تین دن میں نے استخارہ کیا اور تینوں روز ہی مجھے بہتر خواب نہیں آئے۔ تاہم میں نے اپنی تسلی کے لیے مفتی صاحب سے تعبیر بھی معلوم کروائی تو انہوں نے اس رشتہ کو میری بیٹی کے حق میں نامناسب بتایا۔ سکندر! میں نے تو اپنی بیٹی کے لیے خیر اور بھلائی مانگی تھی اور جب یہی میری بیٹی کے لیے نہیں ہے تو پھر۔" وہ چپ ہو گئے۔

اماں نڈھال سی تکیے سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ سکندر بھی چپ سارہ گیا۔ استخارے کا حوالہ ہی اتنا معتبر تھا اور وہ خود بھی جو لوگ نہیں جانتے تھے، جانتا تھا۔ اور جب سید صاحب نے اللہ جیسی

عظیم ہستی سے خیر مانگی' مشورہ مانگا تو وہ تو دلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ وہ تو ستار العیوب ہے۔ سب کے عیبوں سے واقف۔ وہ اپنے بندے کو غلط مشورے کیسے دے سکتا تھا۔ اس کے بندے نے اس سے خیر مانگی تھی اور اس نے خیر کا ہی مشورہ دیا تھا۔ یقیناً عظمیٰ اس قابل تھی کہ اسے ایک شریف' باکردار اور حلال کمانے والا مل سکتا تھا۔

مگر نومی... اسے بھائی سے زیادہ اولاد کی طرح عزیز تھا۔ غم بہر حال بہت بڑا اور صبر آزما تھا۔

" مجھے معاف کر دینا سکندر!" سید صاحب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے اماں کا اترا ہوا چہرہ دیکھا اور نادم سے ہو کر رہ گئے۔

"ارے نہیں سید صاحب۔ معافی کی کیا بات ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ ہم اور آپ جوڑنے اور توڑنے والے کون ہوتے ہیں۔" وہ بھی کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ لوگوں کی عزت میرے دل میں اتنی ہی ہے سکندر! بس یہ بیٹی کا معاملہ تھا۔ سوچ بچار کرنا پڑا۔ نومی مجھے اب بھی بیٹے کی طرح عزیز ہے۔ بھابی کی عزت میرے دل میں آج بھی کئی گنا ہے۔" وہ بیچارے ندامت سے بول رہے تھے۔

"مجھے معاف کر دینا سکندر اور نومی سے کہنا اس بات کو دل پر نہ لے۔" وہ پلٹتے پلٹتے بولے اور سرعت سے دروازے سے نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی اماں کب کے روکے آنسوؤں کے سیلاب کو بہا بیٹھیں۔

سکندر انتہائی اذیت سے دوچار ہو گیا۔

"کیا کر رہی ہیں اماں! اس طرح بچوں کی طرح رونے سے کیا حاصل۔ آپ ہی تو کہتی رہتی تھیں کہ مجھے سید صاحب کی طرف سے دھڑکا لگا ہے۔ وہ اس رشتے کو ختم کر دیں گے۔" وہ نڈھال سا ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"ہزار اندیشے کے باوجود خوش فہمیاں بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ اور جب یہ ٹوٹتی ہیں تو دل بری طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ بس خوش فہمیوں کی دھند کو نہیں چھٹنا چاہئے۔" نادیہ آپی ملول سی بولیں

اور آکر اماں سے لگ کر بیٹھ گئیں۔

"بس کریں اماں۔" وہ انہیں تھپکنے لگیں۔

سکندر نے آنکھیں موند کر کرسی پر سر ٹکا لیا۔ اسے لگ رہا تھا اس کا سر درد سے پھٹنے کو ہے۔

تو جو ہو گیا اسے مان لے جو نہیں ہوا اسے بھول جا

وہ تیرے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں

دل بے خبر میری بات سن، اسے بھول جا اسے بھول جا

ایک مجروح مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر ٹوٹ گئی۔

یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا اسے دیکھ اس پہ یقین نہ کر

نہیں عکس کوئی بھی مستقل، سر آئینہ اسے بھول جا

وہ ڈھیلے انداز میں رانوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم انسان بھی بلا کے خوش فہم ہوتے ہیں۔ سفاک حقیقت سامنے ہوتی ہے مگر خوش فہمی کی رنگین دھند میں رہنا ہی اچھا لگتا ہے۔"

اس نے روتی اماں کو چپ کراتیں نادیہ آپی کو ایک نظر دیکھا اور اندر چلا گیا۔

X...X...X

وہ دونوں تصویریں ولید نے اپنے دراز سے نکال کر تکیے پر رکھ دیں۔ اس وقت اس کے ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ ساری سوچیں، دن بھر کی تلخیاں اور کڑواہٹیں شعوری کوشش سے جھٹک کر اب پر سکون انداز میں بیڈ پر بیٹھا ان تصویروں پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا جن میں وہ اس کے ہمراہ سیاہ کپڑوں میں مہکتی، خفا خفا سی، کھنچی کھنچی مگر اپنی اپنی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں اس کی قربت پر جھنجلاہٹ اس کی شرارتوں، اس کے کسیلے کڑوے جملوں پر اس کے اندر سے امڈتی رہی تھی جس سے وہ خود بھی آشنا تھی۔

وہ دانستہ اسے ستا کر حظ اٹھاتا تھا۔

اس نے دوسری تصویر دیکھی جس میں وہ تانیہ کی کسی بات پر بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ روک رہی تھی۔

اس نے تصویر الٹ دی اور اس پر بال پین چلانے لگا۔

آنکھوں میں اتر آئی ہے تصویر تمہاری
اک پیکر رعنائی ہے تصویر تمہاری
آئینہ در آئینہ رہے گی یوں ہی روشن
شمع شب تنہائی ہے تصویر تمہاری

پھر وہی تصویر اٹھائی جس میں وہ اس کے ہاتھ پکڑ لینے پر جھنجھلاہٹ کے ساتھ ساتھ شرم و حیا سے گلنار ہوئی جا رہی تھی۔ خود میں سمٹی ہوئی وہ بے پناہ دلکش لگ رہی تھی۔ اس نے بے اختیار تصویر کے نیچے ہی لکھنا شروع کر دیا۔

میں تو یونہی چپ چاپ تمہیں دیکھ رہا تھا
کس بات پہ شرمائی ہے تصویر تمہاری
کیوں مجھ کو اس انداز سے وہ دیکھ رہی ہے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کیا میری تمنائی ہے تصویر تمہاری

لکھتے لکھتے وہ خود بھی محظوظ ہو رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب آغا جی اس کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ شاید دبیز قالین ہونے کے باعث ان کی اسٹک کی اور قدموں کی چاپ سنائی نہ دی تھی یا پھر وہ خود ہی ان تصویروں اور خوبصورت تصورات میں اتنا محو تھا کو ان کی آہٹ محسوس ہی نہ کر سکا۔ جب آغا جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کے بدن کو خفیف سا جھٹکا لگا۔

"بہت مصروف ہو کیا؟" آغا جی کی آواز اور ان کی موجودگی نے اسے لحظہ بھر کے لئے سٹپٹا دیا۔ اس نے سرعت سے دونوں تصویریں تکیے کے نیچے رکھ دیں۔

"نہیں تو... آپ... کب آئے؟" اس کا چہرہ یوں سرخ ہو گیا جیسے وہ بالکل بچگانہ سی کوئی حرکت کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ اس نے سنبھل کر آغا جی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہ جانچنا چاہا کہ ان کی نظریں تصویروں پر تو نہیں پڑیں اور اسے اطمینان ہوا کہ وہ اس کے اس شغل سے قطعی بے خبر تھے۔

”تمہارے کمرے میں بتی جلتی دیکھی تو چلا آیا۔ دو بج رہے ہیں۔ ابھی تک جاگ رہے ہو۔“

وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئے۔ ان کی بات پر اس نے چونک کر پہلے آغا جی کو پھر وال کلاک کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔

وقت کے اس تیزی سے گزرنے کا اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔

” اوہ۔ یہ وقت کچھ تیزی سے نہیں دوڑ رہا ہے آغا جی!“ وہ مسکرا دیا اور بیڈ سے اتر کر جگ سے پانی بھرنے لگا۔

” کہاں دوڑ رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے جیسے ٹھہر سا گیا ہے۔“ آغا جی کے لبوں سے ایک ہلکی سی سانس خارج ہو گئی۔

ولید نے گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا وہ کچھ اداس کچھ مضمحل سے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے نظریں چرا لیں۔ وہ اسی کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

” تمہیں تو اپنی بھاگ دوڑ سے فرصت نہیں ہے۔ تمہیں کہاں خبر ہوتی ہے دن رات کی۔ زندگی کو مسلسل جہد بنا لیا ہے تم نے۔“ آغا جی کا انداز شاکی تھا۔

جب سے اس عالم فانی میں ہوئے ہم پیدا

کشورِ دل میں اسی دن سے ہوا غم پیدا

آرام سے ہے کون جہان خراب میں

گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

وہ ہنس دیا۔ آغا جی نے اسے گھور کر دیکھا۔ تاہم اس کے ٹالنے کے انداز پر گھر کا نہیں۔ پھر بولے۔

” تم گئے تھے حویلی۔ کیا رسپانس ملا؟“

وہ اپنی وارڈروب کی طرف بڑھتا ہوا رکا' پھر سر ہلا کر وارڈروب کھولتے ہوئے بولا۔

” ہاں وہی جس کی توقع تھی۔ مجھے بھی اور آپ کو بھی۔“

” توقیر شاہ زیادہ زخمی ہوا ہے؟“

” نہیں بس ایک گولی بازو کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ پروپیگنڈہ کچھ زیادہ ہی کر لیا انہوں نے۔ بہت اناڑی ہے فدا حسین بھی۔“ وہ اپنا نائٹ سوٹ نکال کر وارڈروب بند کر کے پلٹا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ حملہ فدا حسین نے ہی کیا ہے یا کروایا ہے؟" آغا جی نے متعجب ہو کر اسے دیکھا تو اس کے لبوں سمیت چہرے پر بھی ایک مسکراہٹ لہرا کر منجمد ہوگئی۔

"میں کیا خود مردان شاہ بھی جانتے ہیں بلکہ اسی کے خلاف تو ایف آئی آر کٹوائی ہے۔ ارے آغا جی! ہم اپنے دشمنوں کو اس لیے جانتے ہیں کہ ہمارے دل میں بھی ان کے لیے نفرت کا جذبہ ہوتا ہے اور دشمنی جذبہ نفرت سے ہی شروع ہوتی ہے نا۔" اس نے براہِ راست آغا جی کی آنکھوں میں جھانکا۔

آغا جی ہنکارہ بھر کر رہ گئے۔ کچھ کہنا چاہا مگر پھر ارادہ ترک کرتے ہوئے اسے پلٹ کر باتھ روم میں جاتا دیکھتے رہے۔

وہ شب خوابی کا لباس بدل کر باتھ روم سے باہر آیا تو اس کا دل اچھل کر رہ گیا۔ وہ یکدم کالج بوائے کی طرح جھینپ کر رہ گیا۔ آغا جی کے ہاتھوں میں وہ دونوں تصویریں تھیں جو اس نے تکیے کے نیچے رکھ دی تھیں اور جو بلا ارادہ تکیے کی ترتیب درست کرتے ہوئے آغا جی کے ہاتھ میں آگئی تھیں۔

آغا جی کی نظریں تصویر پر جمی تھیں اور لبوں پر تبسم تھا۔

پھر رخ پھیر کر انہوں نے ولید کو دیکھا۔ ان کے لبوں کی مسکراہٹ کچھ اور کشادہ ہوگئی تھی۔

"یہ دراصل۔ تانیہ نے زبردستی کھینچی تھیں، نومی کی منگنی کے دن۔"

اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح کی وضاحت کر کے اپنی پوزیشن کو کلیئر کرے۔

کوئی کتنا ہی بڑا ہو جائے۔ خود کو جتنا ہی میچورڈ، سمجھ دار سمجھے، محبت اسے کبھی کبھی بچہ بنا دیتی ہے، وہ ایسی چھوٹی موٹی چوریاں کر کے ایسے ہی خوفزدہ ہو جاتا ہے جیسے کوئی بچہ شوکیس سے کھلونا نکالتے ہوئے ماں کے آ جانے پر سٹپٹا جاتا ہے۔

آغا جی کے لبوں سے ہلکی سی سانس نکل گئی۔ وہ تصویروں کو بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

"اشعار بھی شاید تانیہ نے ہی لکھے ہوں گے، ماشاءاللہ خاصی باذوق معلوم ہوتی ہے، تم دونوں کے معاملے میں۔"

"کوئی باذوق، واذوق نہیں ہے، خوامخواہ تصویریں گندی کر دی ہیں، یہ ادھر دیجئے۔"

اس نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے تصویریں لے لیں اور سرعت سے دراز میں ڈال کر لاک کو دیا۔ پھر پلٹا تو آغاجی کو معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنی طرف متوجہ پایا۔ اس کی پیشانی گرم ہو گئی۔

پہلی بار اسے پتہ چلا کہ جھینپنا اصل میں کسے کہتے ہیں۔ مارے شرمندگی کے بغلیں جھانکنے کا محاورہ کب فٹ آتا ہے۔ تاہم ان کی مسکراہٹ کی معنی خیزی کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"آپ ابھی تک کیوں جاگ رہے ہیں؟"

"ہوں۔" آغاجی ایک ہنکارا ابھر کر رہ گئے اور بیڈ سے اتر کر اپنی سٹک اس کے کندھے پر ماری۔

"لڑکے! خوشیاں جب ہمارے رستوں میں پھیلی ہوئی ہوں تو ان سے کنارہ کرنا سراسر حماقت ہے۔ ایک پر سکون، من پسند زندگی کی رنگینیاں آپ کی منتظر ہوں اور بجائے انہیں بڑھ کر تھامنے کے نامعلوم راستوں کے پیچ و خم میں الجھنا نادانی نہیں تو کیا ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ولید نے ان کی طرف دیکھا پھر پلٹ کر کھڑکی پر پڑے پردوں کی ڈوریاں کھینچنے لگا۔ پردے ایک طرف ہو گئے اور لان سے ہوائوں کے جھونکے چہرے اور بدن سے ٹکرانے لگے۔

"ولید! میں اس گھر میں کوئی رونق چاہتا ہوں اور خوشگوار تبدیلی، سن رہے ہو تم میری بات، ادھر دیکھو یہاں زندگی بہت خوبصورت اور روشن ہے، وہاں اندھیرے میں کیا رکھا ہے۔"

ولید کے لبوں کی تراش میں مدھم سی مسکراہٹ بکھر آئی جیسے وہ ان کے جملوں کی گہرائی سے اپنے دل میں جھانک کر دل گرفتہ ہو کر ہنسا ہو۔ آغاجی کا ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس کر کے اس نے چہرے کا رخ انکی طرف موڑ دیا۔

"یقیناً اس طرف روشنی ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ میرے پاس روشنی محسوس کرنے والی آنکھیں نہیں ہیں، مگر پتہ نہیں کیوں مسرت، خوشی، کسی خوشگوار منظر کی طرح میرے وجود کے سامنے پھیلی ہوئی ہے مگر میں لبریز ہونے کے باوجود تشنہ ہوں تو صرف اس لیے کہ میں انہیں صرف چھونا ہی نہیں، ان سے وقتی پیاس بجھانا نہیں چاہتا۔ سیراب ہونا چاہتا ہوں

اور سیرابی کیلئے تو آغا جی پہلے زمین کا بنجر پن ختم ہونا ضروری ہے۔اسے زرخیز ہونا پڑے گا۔"

"ولید تم..."

"نہیں آغا جی!"

اس نے آغا جی کو کچھ کہنے سے روک دیا اور کھڑکی کے باہر لان کے ملگجے اندھیرے میں آنکھیں گاڑ دیں۔

اندھیرا فضا میں بھوت کی طرح مسلط تھا۔فضا بے حد سنسان تھی مگر اس کے دل کی فضا اس سے زیادہ سنسان تھی۔ایک ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے اس نے کہا۔

"جب دل میں کہیں کانٹا سا گڑا ہو' ایک ناآسودگی' یخ بستہ اداسی' دل و جاں پر محیط ہو تو ملنے والی خوشیوں کے رنگ بھی سنولا جاتے ہیں۔

اندر بہت گھٹن ہو' بہت حدت ہو' بے پناہ تپش ہو تو باہر کی چھاؤں بھی چھایا نہیں دیتی۔ پہلے اندر کی تپش کو ختم ہونا چاہیے۔اندر کے اندھیرے گھٹنے چاہئیں ورنہ نور کی شعاعیں بھی اداس سی محسوس ہوتی ہیں۔

میں محض کسی دیوار کا سایہ لے کر آنکھیں موند کر چھاؤں کے خیال سے تسکین پانا نہیں چاہتا۔میں کھلی آنکھوں سے چھاؤں دیکھنا اور محسوس کرنا چاہتا ہوں اس کیلئے مجھے وقت کی ضرورت ہے' مہلت چاہئے۔"

آغا جی کا ہاتھ تسلی بھرے انداز میں اس کے کاندھے پر تھا جس کا ہلکا سا دباؤ محسوس کر کے اس کے چہرے کا تناؤ یکدم ڈھیلا ہو گیا۔وہ پلٹ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مسکرایا۔

"زندگی کی حقیقی مسرتوں کی طلب تو مجھے بھی ہے' یہ احساس تو بڑا خوشگوار ہوتا ہے کہ کوئی آپ کا شدتوں سے خیر خواہ ہے۔آپ کی خوشیوں کیلئے دعا گو۔""

"اور آپ کی محبت اور پناہ کا طلب گار۔"اس کا بقیہ جملہ آغا جی نے کسی حد تک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پورا کیا تو وہ بڑی سرعت سے نظریں چرا گیا۔اس کی نظریں کھڑکی سے باہر اندھیرے پر جم گئیں مگر اندر جیسے عجیب سا اجالا اترتا محسوس ہوا۔

آغا جی اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔

”جہانگیر کے ساتھ شہرینہ بھی اسلام آباد جا رہی ہے بلکہ جا کیا رہی ہے اصرار کر کے بھیج رہا ہوں۔“

وہ کھڑکی سے ہٹ کر دراز کھول کر سگریٹ کا پیکٹ تلاش کر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ٹھٹکا اس نے یونہی جھکے سر کے ساتھ چہرے کا رخ موڑ کر آغا جی کی طرف دیکھا۔

”میرا خیال ہے وہ کچھ دنوں کیلئے اسلام آباد ہو آئے تو اچھا ہے۔ علاقے اور آب و ہوا کی تبدیلی سے شاید بہل جائے۔“

بہل جانے کے الفاظ پر وہ چونکا تھا۔ تاہم بولا کچھ نہیں۔ غیر محسوس طور پر اپنی کنپٹیوں پر کوئی نوکیلی سی شے چبھتی محسوس ہوئی۔

”آج کل وہ بہت زیادہ خاموش اور اداس رہنے لگی ہے۔“

آغا جی کے لہجے میں بے پناہ حزن تھا۔ وہ یکلخت بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے مگر دوسرے پل ایک گہری سانس بھر کر سر ہلاتے ہوئے ہلکے سے ہنسے۔ شاید ماحول یا دل پر چھا جانے والی فضا کو کاٹنے کی ہلکی سی سعی تھی۔

”پتہ نہیں وہ ایسی کیوں ہو گئی ہے۔ کہتی ہے اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ اس لیے لڑنا‘ ناچنا‘ کودنا اور آپ کو تنگ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے آپ کو میں عجیب لگنے لگی ہوں۔ اسے کیا کہوں کہ تم اب بھی میرے لیے وہی چھوٹی ننھی منی سی شہرینہ ہو‘ بھلا وہ میرے سامنے کیسے بڑی ہو سکتی ہے۔“

ولید چپ سا رہ گیا۔ اسے تعجب نہیں ہوا کہ وہ یقیناً ردعمل کے طور پر ایسا کر رہی ہے۔ اس نے ٹھیک ٹھاک اسے ہرٹ کیا تھا اور واشگاف لفظوں میں بلیم کیا تھا۔

وہ اندر سے ایک دم مضطرب ہو گیا تاہم اس نے اپنے اضطراب کو ظاہر نہیں کیا اور آغا جی کی موجودگی کا خیال آتے ہی بے خیالی میں اٹھانے والا سگریٹ کا پیکٹ دوبارہ دراز میں ڈال دیا۔

”اچھی بات ہے تبدیلی آب و ہوا تو‘ یہ ہر ایک کیلئے ضروری ہے۔ انسان ایک ہی روٹین سے اکتا جاتا ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر ہلکے سے ہنس دیا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے' اچھا اب تم بھی سونے کی تیاری کرو میں ذرا تہجد پڑھ لوں۔ یہاں تو باتوں میں فجر بھی ہو جائے گی۔" آغا جی کمرے سے چلے گئے۔

وہ لاک کی ناب دبا کر بیڈ پر آنے کے بجائے اضطرابی انداز میں چلتا ہوا کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا اور اندر آتے ہوا کے جھونکوں میں یوں سانس لینے لگا جیسے جبس میں ان جھونکوں کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔

تم ایسی صبحوں

تم ایسی شاموں میں

اپنے گھر سے کبھی نہ نکلو کہ جب ہوائیں

بدلتے موسم کی سازشوں میں

شریک ہو کر

تمہارے جی میں غلط بیانی کا زہر گھولیں

تمہارے بارے میں جھوٹ بولیں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سنو اے پیاری سجیلی لڑکی!

یہی ہوائیں تو آتے جاتے مسافران وفا پر

ہزار تہمت اچھالتی ہیں

محبتوں پر یقین نہ ہو تو

دلوں میں پیہم

ہزار وہموں کو ڈالتی ہیں

تم ایسی صبحوں تم ایسی شاموں میں

اپنے گھر سے کبھی نہ نکلو

اس نے پردے کی ڈوریاں کھینچ لیں اور بیڈ پر دراز ہو کر آنکھوں پر بازو دھر لیا۔

X...X...X

نومی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہر چیز تہس نہس کر دے اور کسی حد تک وہ چیزوں پر ستم بھی ڈھا رہا تھا۔ بدلحاظی سے اس کی زبان سے مغلظات جاری تھیں۔

"سمجھتے کیا ہیں یہ سید صاحب! بیٹی شوکیس میں سجا کر رکھنے کیلئے پیدا کی ہے؟ ہونہہ جیسے ہیرا ہو، بیٹی ہی ہے نا۔ سڑتی رہے گی دہلیز پر تو سارا غرور جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔ ساری اکڑ دھری کی دھری رہ جائے گی۔ کیا کسی ملک کا شہزادہ آئے گا ان کی بیٹی کو بیاہنے کو۔"

"خدا کے لیے نومی! زبان کو لگام دو۔ تمہارے گھر میں بھی دو بہنیں ہیں۔" اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"ہاں تو ہم ان کی طرح اکڑ نہیں دکھاتے۔" اس نے الماری کھٹاک سے کھولی اور پینٹ اور شرٹ نکالی اور اس دھماکے سے الماری بند کی کہ وہ احتجاجاً چرچرا کر رہ گئی۔

"انہوں نے استخارہ کروایا تھا کہتے ہیں اس میں بہتر نہیں آیا تو اب اس میں ان بے چاروں کا کیا دوش۔ فیصلے تو قسمت..."

"جھوٹ بولتا ہے بڈھا۔" اس نے از حد بداخلاقی اور حقارت سے نتھنے پھلا کر اماں کی بات کاٹ دی۔ پھر کرسی پر بے حد خاموشی سے بیٹھے ہوئے سکندر کی طرف دیکھ کر استہزائیہ انداز میں ہونٹ سکوڑے۔

"جوڑتے وقت اس نے استخارہ نہیں کیا تھا۔ توڑتے وقت یاد آ گیا۔ واہ کیا اللہ والے ہیں اور آپ تو یوں بھی یہی چاہ رہے تھے۔"

"بکومت، نومی!" نادیہ آپی چیخ کر فرش سے کھڑی ہو گئیں۔ انہیں اس کی بدلحاظی سے سخت ناگوار گزری تھی۔ تاہم سکندر نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

"تم چپ کرو، دو روٹی کھلاتا ہے تو سب اس کی حمایت کرتے پھرتے ہیں، میں بھی نوٹوں کی گڈیاں لا کر پھینکتا ہوں اماں کی گود میں۔ اب وہی کفرانِ نعمت کر رہا ہو تو میرا کیا قصور؟ انہیں کیا پتہ صفحے بھی کسی کی عزت کو مٹی میں ملا کر ہی سیاہ ہوتے ہیں۔ مگر..."

نادیہ آپی کا ہاتھ پوری قوت سے اٹھا اور ان کی لانبی لانبی انگلیاں نومی کے چہرے پر ثبت ہو گئیں۔ وہ اس حملے کیلئے قطعی تیار نہیں تھا۔ یہ دھچکا خاصا صبر آزما تھا۔ وہ سرخ نظروں سے نادیہ آپی کو دیکھنے لگا جیسے کچا کھا جائے گا۔ پھر یکدم انہیں ایک طرف دھکا دے کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"میں بھی دیکھ لوں گا سید صاحب کو۔ میرا نام نعمان ہے جس نے آج تک شکست قبول نہیں کی۔ آپ لوگوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا نہیں رہوں گا۔ اس لیے کہ بے عزتی میری ہوئی ہے' آپ کی نہیں۔"

"نومی بات سنو۔" اماں زور سے دھاڑیں' ان کی آواز رنج و خوف سے پھٹ گئی۔ مگر وہ اپنی ٹی شرٹ اور پینٹ وہیں پھینک کر باہر نکل گیا۔ سکندر اپنی جگہ سے اٹھا اور اماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کچھ نہیں کرے گا وہ۔ کیا کر سکتا ہے وہ؟ سوائے چیخ پکار مچانے کے' بس دل کی بھڑاس نکالنی تھی' نکال لی۔

دھواں کہیں تو بہرحال نکلنا ہی ہو گا۔ اچھا ہے ہم پر نکل جائے۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔" اس نے ان کے کندھے پر ہلکے سے دباؤ ڈال کر نادیہ آپی کی طرف دیکھا جو دیوار کے پاس رنج کی کیفیت میں کھڑی ہوئی تھیں۔

"جاؤ! اماں کو پانی پلاؤ اور تانیہ سے کہو اماں کی دوائیاں کہاں رکھی ہیں' انہیں کھلائے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ارے خاک ڈالو دوائیوں پر۔ جب تک یہ لڑکا نہ سدھرے گا میری بیماری کبھی ختم نہیں ہو گی۔ پتہ نہیں یہ میرے کن گناہوں کی سزا ہے۔ کس جرم کی پاداش ہے' کہاں ہو گئی کوتاہی مجھ سے۔" اماں کا واویلا جاری ہو گیا۔

"سکندر کہیں یہ غصے میں کوئی غلط سلط حرکت نہ کر دے۔ ہماری رہی سہی عزت پر خاک ہی نہ مل دے۔ سید صاحب عاجزی و انکساری والے بندے ہیں۔ اس شائستگی سے رشتہ ختم کیا ہے وگرنہ کوئی اور ہوتے تو نومی کی حرکت پر منہ پر طمانچہ مار جاتے۔ اب یہ لڑکا..."

"ارے نہیں امی! ایسا کچھ نہیں کرے گا وہ۔ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ صرف جذباتی ہے۔" وہ اپنے لوہے کی چھوٹی الماری کھول کر ضروری کاغذات نکالنے لگا۔

"جذباتی ہونا کون سی دانشمندی ہے' جذبات کا دھارا منفی رخ پر بہنے لگے تو طوفان آتے ہیں۔ اس کے منفی جذبوں نے ہی تو آج یہ دن دکھائے ہیں۔"

اماں دکھ سے ہنس پڑیں۔ ان کی ہنسی میں ایسی بے بسی' لاچاری اور دلسوزی تھی کہ سکندر کاغذات رول کرتے ہوئے کرب سے ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر رول ریک پر رکھ کر آستین فولڈ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ ناحق خود کو اتنا پریشان کر رہی ہیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب مزید کچھ نہیں ہو گا۔ تانی امی کی میڈیسن کہاں ہیں۔ تم نے انہیں کھلا دی ہیں۔" وہ اندر آتی تانیہ کو دیکھ کر بولا۔

"یہیں دراز میں رکھی ہیں۔" وہ اندر آ کر دراز کھولنے لگی۔

"بس اماں! آپ پر سکون رہیں۔ ذہن پر غیر ضروری بوجھ نہ لیا کریں۔ میں ولید کی طرف جا رہا ہوں۔ کوئی کام ہو تو ولید کے موبائل کا نمبر تو آپ کے پاس ہے ہی۔" وہ دراز سے رسٹ واچ نکال کر کلائی میں ڈالتے ہوئے اماں سے مخاطب ہوا۔ جنہوں نے تانیہ کے ہاتھ سے دوائی لیتے ہوئے سر ہلا دیا۔ پھر رنگ برنگی چند گولیاں منہ میں ڈال کر پانی کا گلاس منہ سے لگا کر دو تین گھونٹ بھرے اور گلاس تانیہ کو تھما کر وہیں سیٹی پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

"چند دنوں میں گاؤں جاؤں گا۔ ولید کے سکول کی افتتاحی تقریب ہونی ہے۔" سیٹی کے کنارے بیٹھ کر اس کے نیچے سے اپنے جوتے باہر نکالے اور موزے نکال کر جھٹکتے ہوئے بولا۔

اماں نے یونہی آنکھیں موندے موندے سر ہلا دیا۔

"ولید بھائی آج کل بڑے عوامی ہونے کی کوشش کر رہے ہیں' کیا بات ہے' انہیں مردان شاہ کے گاؤں سے بہت محبت ہو گئی ہے۔" تانیہ الماری سے لگ کر بولی۔

"ہاں کبھی کبھی میں بھی بڑا حیران ہو جاتا ہوں کہ یہ بیٹھے بیٹھے اسے رفاحی کاموں کی کیا پڑی۔ اس طرح کے کام تو شہر میں بھی ہو سکتے ہیں۔ مردان شاہ کا گاؤں کیوں اس کی ترجیح ہے۔" وہ پیروں میں جوتے پھنساتے ہوئے کھڑا ہوا اور شرٹ جھٹکی۔

"ایک بات پوچھوں سکندر بھائی!" تانیہ اس کے قریب آئی تو اس نے ریک پر رکھے رول کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"ولید بھائی' شہرینہ کے کیا ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ان کا آپس میں خاندانی رشتہ کیا ہے؟"

"کیا مطلب!" سکندر نے عجیب نظروں سے تانیہ کو دیکھا پھر ہلکے سے ہنسا۔

"یہ سوال تمہیں اب یاد آیا۔ شہرینہ سے تمہاری دوستی خاصی پرانی ہے۔ تم نے اس سے نہیں پوچھا۔ ویسے وہ کزن ہے اس کا۔" اس نے رول اٹھا کر ساتھ ہی گلاسز اٹھا کر شرٹ کی جیب میں لگائے۔

"سگے کزن ہیں کیا؟" تانیہ ہلکے سے بولی۔ اس کے دریافت کرنے کے انداز میں ایک کھوج سی تھی۔ تجسس سا تھا۔ سکندر نے اسے باقاعدہ گھورا۔

"دماغ درست ہے تمہارا۔ فضول سوالات کیے جا رہی ہو۔ شہرینہ سے ہی پوچھ لو کہ اس کا ولید سے کیا رشتہ ہے۔"

"اس سے کیا پوچھوں۔ اس کا اور ولید بھائی کا ایک رشتہ تو میرے علم میں ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں کہہ کر ہنسی۔ پھر جلدی سے نچلا لب دانتوں میں دبا کر اماں پر نگاہ ڈالی۔ مگر وہ ہنوز آنکھوں پر بازو دھرے لیٹی تھیں۔ اس نے سکندر کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ گزرتے ہوئے دیکھا ہی نہیں اور دھیمی آواز میں بولی۔

"آپ کے علم میں تو ہو گا ہی۔ ولید بھائی ہیں تو بڑے گھنے مگر میرا خیال ہے کہ وہ آپ سے کچھ نہیں چھپاتے۔ شاید..." اس کے لبوں کی تراش میں دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔

"شیری کی تو ڈائری بھری پڑی ہے ولید بھائی کے قصیدوں سے۔ ذرا ولید بھائی کو بھی تو چیک کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ادھر بھی کچھ ایسی ہی صورتحال ہو۔" وہ سکندر کو پلٹ کر جاتے دیکھ کر بولی تھی۔ "اس طرف تو بڑے ہی..."

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سکندر نے بڑے ضبط کے ساتھ پلٹ کر تانیہ کو دیکھا تھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں خفگی، ناگواری اور فہمائش تھی۔ تانیہ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے جھینپ کر چپ ہو گئی۔

سکندر کو اپنے اندر کوئی تند و تیز نوک دار سی شے اترتی اور رگ رگ کو کاٹتی محسوس ہو رہی تھی۔

تانیہ کتنی انجان اور بے خبر تھی کہ اس نے آن واحد میں اسے اندر سے بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ یوں کہ اسے خود کو سمیٹنا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ دروازے سے باہر نکلا تو لحظہ بھر ٹھٹکا۔ دیوار کے پاس کھڑی نادیہ آپی سے نظریں ملیں۔ ایک تکلیف دہ رنگ اس کے چہرے کو چھو گیا۔ ایک بے چارگی بھرے کرب سے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

سکندر نے نظروں کا زاویہ بدل لیا اور خدا حافظ کہتا صحن کی طرف نکل گیا۔ وہ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ دروازے کو دیکھتی رہ گئیں۔

'میرا خیال ہے سکندر بھائی کے علم میں یہ بات ہے ورنہ وہ چونکتے ضرور۔ ولید بھائی کی کوئی بات بھی سکندر بھائی سے چھپی ہی کب ہے۔'' تانیہ کمرے سے باہر نکلی۔اس کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کسی تصور سے محظوظ ہو رہی ہو۔

نادیہ آپی نے ایک گہری سانس بھر کر نظریں تانیہ کی طرف کیں۔ کوئی چیز ان کا دل مسوسنے لگی تھی۔ ''کیا شیری واقعی ولید بھائی میں انٹرسٹڈ ہے۔'' انہوں نے عجیب بکھرے لہجے میں پوچھا۔

''ایسی ویسی!''تانیہ نے ابرو اچکائے۔

نادیہ آپی نے بے ساختہ لبوں کو دانتوں میں دبا کر چھوڑا تھا اور پلٹ کر کچن میں چلی آئیں۔ سنک کے پاس پوٹ میں گوشت رکھا تھا جسے اٹھا کر نل کے نیچے رکھ کر نل کھول دیا۔ ساتھ ہی ان کی آنکھوں سے پانی بھی جاری ہو گیا۔ تیز سسکاری کو انہوں نے لبوں پر دبا لیا مگر آنکھوں سے امڈنے والے دریا کو نہ روک سکیں۔

سکندر کی آنکھوں کے بکھرتے ٹوٹتے خوابوں کی کرچیاں ان کے اندر تک اتر گئی تھیں۔

دل کے ٹوٹنے کی صدا انہوں نے سنی نہیں مگر دل کا لہو آنکھوں میں جو سرخیاں بھر گیا تھا وہ ان سے مخفی تو نہ رہا تھا۔ وہ سکندر کے جذبوں سے بے خبر نہ تھیں۔ شہرینہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو روشنیاں جلتی بجھتی تھیں لبوں پر مسکراہٹیں رقص کرتی تھیں۔ چہرے پر جو رونق سجتی تھی وہ اس سے آگاہ تھیں مگر تانیہ کے انکشاف نے دل کی ساری رونقیں' چہرے کی ساری تازگی' زندہ رہنے کی ولولہ انگیزی یوں چوس لی جیسے آکاس بیل ہرے بھرے پودے کا پتہ پتہ چوس لیتی ہے۔

''ہائے آپی آپ گوشت دھو رہی ہیں یا پورا بکرا۔ سارا پانی باہر تک آ رہا ہے۔''

تانیہ کی آواز پر انہوں نے روانی سے بہتے آنسوؤں کو قابو کیا اور جلدی سے نل بند کرتے ہوئے اطراف میں پھیلے پانی کو دیکھا تو نادم ہو گئیں۔ پانی سنک کے پائپ سے نکل نکل کر فرش پر پھیل رہا تھا۔ انہوں نے سوچا اچھا ہی ہوا تانیہ کو ان کی آنکھوں سے بہتا پانی دکھائی نہیں دیا۔ کہاں وہ وضاحتوں میں پڑتیں۔

وہ کپڑا اٹھا کر جلدی جلدی پونچھنے لگیں۔

X...X...X

مونا بھابی جہاں شہرینہ کے اپنے میکے اسلام آباد آنے پر خوش ہوئیں وہاں حد سے زیادہ حیران بھی۔

پاپا تو اسے چھوڑ کر فوراً ہوٹل چلے گئے تھے جہاں انہیں میٹنگ میں شرکت کرنی تھی۔ ماموں اور ممانی بھی اس کی آمد پر بہت مسرور ہوئے۔

"میری محبت میں دوڑی آئیں نا۔"

اس نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور سر ہلا دیا۔

"ہاں۔ وسیم بھائی نے کہا میرے پاس تو ٹائم نہیں ہے۔ یہ فرض تم ہی پورا کر آئو۔" یہ کہہ کر وہ بدک کر پیچھے ہٹی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مونا بھابی نے اس کے نرم گداز بازو پر زوردار چٹکی لی تھی۔

"ویسے ہے حیرت کی بات کہ تم نے یہاں آنے کا پروگرام کیسے بنا لیا۔ کہاں تو جناب کی منتیں کر کر کے تھک گئی تو محترمہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔" انہوں نے کشن ایک طرف ہٹایا اور پیر چڑھا کر اس کی طرف رخ کر لیا۔

شہرینہ نے نظروں کا زاویہ بدل کر دیوار پر نظریں جما دیں۔

"رات پھوپی جان کا فون آیا کہ شیری کل اپنے پاپا کے ساتھ اسلام آباد آرہی ہے تو مجھے تو یقین ہی نہیں آیا۔ طوبیٰ اور طلحہ تو مارے خوشی کے ناچنے لگے۔"

"ارے ہاں! وہ دونوں نظر نہیں آرہے ہیں۔ کہاں ہیں۔" وہ ان کی بات سن ان سنی کرتے ہوئے یکدم موضوع بدل کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

"نومی کے ساتھ گئے ہیں سیر سپاٹے کو۔ کہاں پیچھا چھوڑتے ہیں وہ دونوں ہمایوں کا' جب تک آئس کریم نہ کھالیں۔ بس آتے ہی ہوں گے' تم بتائو یہ اچانک اسلام آباد آنے کا پروگرام کیسے بنا ڈالا۔" ان کی سوئی گویا ایک ہی جگہ اٹک گئی تھی۔

" ارے لڑکی تم تو اپنی لے کر بیٹھ گئیں۔ اس بے چاری کو دو گھڑی سکھ کا سانس بھی لینے دو گی یا نہیں۔" ممانی جان کمرے میں آئیں تو مونا کو بولتے دیکھ کر ٹوکا۔

"شیری! اس لڑکی کی زبان تو بس چلتی رہے گی۔ تم اٹھ کر آرام کر لو' تھک گئی ہو گی۔" انہوں نے شہرینہ کو محبت سے دیکھا اور ملائمت سے بولیں۔

"اوئے ہوئے۔" مونا بھابی نے شہرینہ پر ترچھی نظریں ڈالیں اور ہنسیں۔

"محترمہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کر کے آئی ہیں وہ بھی جہاز سے، کون سے انکل اسے گھوڑا گاڑی میں لائے ہیں۔ بس رہنے دیں مما کوئی تھکن وکن نہیں ہے اسے۔"

"ہاں آنٹی تھکن تو واقعی نہیں ہے البتہ بھوک بڑی زور کی لگی ہے۔" وہ گود میں دبا کشن ایک طرف ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

"کھانا تو تیار ہے، تمہارے پاپا کو بھی اتنی جلدی تھی۔ وہ بھی لنچ تک رک جاتے۔ مگر وہ تو جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔"

"پاپا کے کھانے وانے کی تو فکر ہی مت کریں آپ آنٹی۔" وہ ان کے ساتھ لونگ روم سے نکل آئی۔

"میٹنگ کے بعد ان کا کھانا ہی کھانا ہوتا ہے۔ یہاں سے وہاں تک میزیں کھانوں سے بھری ہوتی ہیں۔ ہر قسم کے کھانے، چائنیز، جرمن، انگلش، دیسی جو پسند کریں۔" وہ فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے بولی۔ پھر ہلکے سے ہنسی۔

"دیکھ نہیں رہیں آپ؟" پاپا دن بدن موٹے ہوتے جا رہے ہیں، یہ سب ان کی آئے دن کی میٹنگوں کا ہی نتیجہ ہے۔"

"ارے کہاں جہانگیر تو پہلے سے زیادہ سمارٹ ہو گیا ہے۔ موٹے تو ہم ہوتے جا رہے ہیں بھئی۔" ماموں نے اس کی بات پر اخبار سے نظریں اٹھا کر اپنے سراپے پر نظریں دوڑائیں اور اخبار رول کرتے ہوئے ایک ٹھنڈی طویل سانس بھری اور رشک بھرے انداز میں سر ہلا کر بولے۔

"جہانگیر کیا تمہارے تو آغا جی بھی خیر سے ہم سے زیادہ سمارٹ اور جوان ہیں۔ ماشاءاللہ اس عمر میں بھی کہ میں بھی خود کو ان کے سامنے عمر رسیدہ خیال کرتا ہوں۔ بھئی کیا سمارٹ، ڈیشنگ، سحر انگیز پرسنالٹی ہے۔" وہ رشک کرنے لگے۔ شہرینہ محظوظ ہو کر ہنسنے لگی۔

"بس بس ماموں جان! میرے سمارٹ اینڈ ڈیشنگ آغا جی کو کہیں نظر نہ لگا دیجئے گا۔ اکلوتے ہی تو آغا جی ہیں ہمارے۔" اسکی بات پر ماموں جان اپنا بے ساختہ قہقہہ نہ روک سکے۔

"دیکھنا کیسی چمچی ہے اپنے دادا کی۔" ممانی جان نے فریج سے فروٹ کسٹرڈ کا باؤل نکالتے ہوئے مصنوعی پن سے گھورا تو اس نے کندھے اچکائے۔

"بھئی نظر لگانی ہوتی تو بہت پہلے لگا چکے ہوتے۔ بلکہ لگ گئی ہوتی مگر سنا ہے تمہاری دادی عمر بھر ان کی نظریں اتارتی رہی تھیں۔"

"اچھا۔" وہ خاصی محظوظ ہو کر دلچسپی سے ماموں کو دیکھنے لگی۔

"بس رہنے دو۔ یہ باتیں ہیں ان کی۔" ممانی جان نے ماموں پر ایک نظر ڈال کر سر جھٹکا پھر ڈائننگ ٹیبل کی کرسیاں کھینچنے لگیں۔

"بھئی جھوٹ بولوں تو کوا کاٹے۔" ماموں جان جلدی سے بولے اور اٹھ کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف آ گئے۔

"آں آں کوا نہیں کوی کاٹے۔" ہمایوں اندر داخل ہو کر ان کے جملے کے جواب میں جلدی سے بولا۔ "اس لیے کہ کوی کی آمد ہو چکی ہے' کوا دور دور تک موجود نہیں ہے۔" اس کی نظریں شہرینہ پر تھیں۔

"میں تمہیں کوی نظر آ رہی ہوں۔ آنکھیں ٹیسٹ کراؤ۔" اس نے طوبٰی اور طلحہ کو اپنی طرف مارے خوشی کے بھاگ کر آتے دیکھ کر دونوں بازو پھیلا لیے۔ وہ دونوں اس سے چمٹ گئے۔

"ہاں۔ مگر بس ذرا افارنر کوی ہو۔" وہ یہ کہہ کر چابی کی نوک سے سر کھجاتے ہوئے زور سے ہنس پڑا۔ پھر دونوں بچوں پر ایک نظر ڈال کر مونا بھابی کی طرف دیکھا۔

"دیکھ رہی ہیں' کس قدر طوطا چشم قسم کی اولاد ہے آپ کی' پھوپھو کو دیکھ کر ماموں کو یکسر فراموش کر دیا۔ حالانکہ ابھی ابھی ماموں کی جیب ہلکی کی ہے دونوں چٹوروں نے۔" پھر ایک لمبی سی آہ بھری۔ "جیسی ماں ویسی اولاد۔"

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھا تو مونا بھابی نے اسے ایک ہاتھ جڑ دیا۔

"بھئی آخر خون کا رشتہ ہے۔ تمہارے چار روپوں سے میری محبت ختم تھوڑا ہی ہو جائے گی۔" شہرینہ نے فخر سے گردن اکڑائی اور طوبٰی کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر لاڈ سے بولی۔

"آں۔ ہا۔" اس نے قدرے افسردہ سی سانس بھری تو وہ سب ہنس پڑے۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری آمد بادِ بہاری کا کوئی خاص مقصد؟ عرصہ ہوا تم نے ہم غریبوں کو بھلا رکھا ہے۔ یہ آج نظر کرم کرنے کا خیال کیسے اور کیونکر آ گیا۔"

""اوں ہوں ہومی! اب اس بے چاری کو کھانا بھی شروع کرنے دو گے یا باتوں میں ہی الجھائے رکھو گے۔ شیری! تم ہمایوں کی باتوں پر کان مت دھرو اور کھانا شروع کرو۔" ممانی جان نے اس کے آگے پلیٹ رکھی۔

"اتنا کچھ آپ نے بنا ڈالا۔ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی، ممانی جان!" وہ میز پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر بولی۔

"آں۔ہا۔ خوش فہمی ہے جناب! یہ سب تو ہمارے روز کا معمول ہے۔" ہمایوں پھر بولا تو اس نے پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے اسے گھورا۔

"تبھی تم اس قدر موٹے ہو رہے ہو۔"

"وہاٹ۔" وہ زور سے اچھلا۔ پھر کھسیا کر جلدی سے دوبارہ بیٹھ گیا۔ ماموں جان نے اخبار سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے اچھلنے پر وہ چونکے تھے۔ تب ممانی جان نے ان کے ہاتھ سے اخبار جھپٹ لیا اور بگڑے انداز میں ایک طرف پٹخ دیا۔

"میں تمہیں موٹا لگ رہا ہوں۔" ہمایوں ازحد سنجیدگی سے دھیمی آواز میں بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

شہرینہ نے مونا بھابی کی طرف دیکھا جو مسکراہٹ چھپانے کیلئے سر جھکا گئی تھیں۔

"اور کیا نہیں تو۔ پہلے سے تو کہیں زیادہ اور چہرہ بھی اتنا بھرا بھرا لگ رہا ہے۔"

"کیا! چہرہ بھی!" اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے چہرے پر گیا۔

"مائی گاڈ۔ اس کا مطلب ہے مجھے اب باقاعدگی سے ڈائٹنگ کرنی پڑے گی۔ مونا تم نے تو کچھ بھی نہیں کہا کہ میں موٹا ہو رہا ہوں اور چہرہ بھی بھرا بھرا لگ رہا ہے۔" وہ تشویش سے چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ چمچہ اس نے اپنی پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

"نہیں کوئی خاص موٹے نہیں ہو رہے ہو۔ ان فیکٹ شیری سب کا ولید سے موازنہ کرتی ہے۔ شاید اس سے تمہیں کمپیئر کر رہی ہے۔"

مونا نے یہ کہتے ہوئے شہرینہ کو دیکھا جو ولید کے نام پر جلدی سے نظروں کا زاویہ بدل کر چہرہ جھکا گئی تھی۔

"اوہ۔ یہ بات ہے پھر تو خیر ہے۔" ہمایوں نے سر یوں ہلایا جیسے کوئی نادیدہ بوجھ کندھوں سے سرک گیا ہو۔

"اب ولید بھائی جیسا سمارٹ اور ٹرم فیگر تو میرا ہو نہیں سکتا۔ان کا اور میرا کیا مقابلہ۔" اس نے ایک طویل قسم کی سانس بھری اور اطمینان بھرے انداز میں کباب پلیٹ میں ڈال کر کھانے لگا۔

شہرینہ کے اندر پھر وہی اضطراب کروٹیں لینے لگے۔وہ یہاں آکر اس شخص کو بھول جانا چاہتی تھی۔اس کا ذکر بھی دانستہ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر پھر اسی کا ذکر نکل آیا تھا۔ماموں جان' مونا سے ولید کی باتیں کرنے لگے اور اسے ہر نوالہ اپنے حلق میں اٹکتا محسوس ہوتا رہا۔بہ مشکل کھا کر وہاں سے اٹھ گئی۔

اس شخص کا ذکر لہو میں کھولن پیدا کر گیا تھا۔

X...X...X

سکندر ولید حسن کے آفس پہنچا تو وہ فون پر فدا حسین سے محو گفتگو تھا۔ریوالونگ چیئر ادھر ادھر گھماتے ہوئے اس نے ہاتھ اٹھا کر سکندر کو بیٹھنے کا اشارہ بھی ساتھ دیا۔

سکندر آفس کی نشست گاہ کی طرف آگیا اور شنیل کے نرم و گداز صوفے پر بیٹھ کر میز سے گلاس اٹھا کر جگ سے پانی بھرنے لگا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ارے رے۔فدا صاحب! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔میں تو ایک ادنیٰ حقیر پر تقصیر سا بندہ ہوں۔مجھے کہاں آپ آسمان پر چڑھا رہے ہیں۔بس فرش پر ہی رہنے دیجئے۔"

وہ پیپر ویٹ کو انگلیوں سے گھما رہا تھا۔ساتھ ہی ساتھ فدا حسین کی طرف سے کی گئی اپنی تعریفوں پر کسی نو عمر لڑکے کی طرح شرما بھی رہا تھا۔سکندر نے دیکھا اس کے چہرے پر حقیقی شرمیلا پن سمٹ آیا تھا۔

"بس جی یہ آپ کا حسن نظر ہے ورنہ...اوہ ہاں۔آپ تو مجھے واقعی مغرور کئے دے رہے ہیں۔" گردش کرتا پیپر ویٹ ہتھیلی کے دباؤ سے روکتے ہوئے ہلکے سے ہنسا۔پھر گفتگو کو سمیٹتے ہوئے بولا۔

"چلیں فدا صاحب! پھر باتیں ہوں گی۔اس وقت میرا عزیز ترین دوست میرا منتظر ہے اور ہاں بارہ تاریخ سکول کی اوپننگ کی فکس ہے۔میرا خیال ہے آپ تو میزبان ہیں۔کسی دعوے نامے کی آپ کو تو ضرورت نہ ہو گی۔"

فدا حسین نے جواباً جانے کیا کہا کہ وہ کھل کر ہنس پڑا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ ایک گہری سانس بھر کر سکندر کی طرف دیکھا جو کانچ کے بلوریں گلاس کے عقب سے اسے خاصی مضحکہ خیز نظروں سے گھور رہا تھا۔

”اس طرح کیا گھور رہے ہو۔“ وہ مسکراتا ہوا کرسی دھکیل کر کھڑا ہوا اور فریج سے اورنج جوس کے پیک نکال کر اسی طرف چلا آیا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ ایک طرف تو تم مردان شاہ کی دختر نیک اختر سے دوستی گانٹھ کر مردان شاہ سے مراسم بڑھا رہے ہو۔ دوسری طرف مردان شاہ کے ناپسندیدہ ترین شخص یعنی فدا حسین سے بھی تعلقات ہیں بلکہ عموماً اسے مردان شاہ کیخلاف بولتے دیکھ کر شہ ہی دی ہے۔“ وہ گلاس ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر تقریباً نیم والیٹ گیا تھا اس کی نظریں وہیں پر جمی رہیں۔

اس کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ کشادہ ہو گئی تھی۔

”اس میں اتنا الجھنے اور نا سمجھ میں آنے والی کیا بات ہے۔“ اس نے جوس پیک کھول کر اس میں اسٹرا پھنسایا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ دوسرا خود منہ سے لگا کر ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”مردان علی شاہ سے مراسم رکھنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں ان کی پسند اور ناپسند کے مطابق چلوں۔ ان کے پسندیدہ لوگوں سے ہی میل جول رکھوں۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ میں آج کل خود مردان شاہ ناپسندیدہ ترین شخص بن گیا ہوں۔“

سکندر انتہائی درجے حیرانگی سے اسے دیکھ کر رہ گیا اور جوس کا یخ بستہ گھونٹ بہ مشکل حلق سے اتار کر کچھ کہنا چاہا کہ وہ جلدی سے بولا۔

”اچھا... چلو فوراً سے پیشتر کھڑے ہو جاؤ۔ یہاں استراحت فرمانے کو میں نے تمہیں نہیں بلوایا۔“ پھر جلدی سے ہاتھ اٹھایا۔ باقی باتیں بلکہ ساری باتیں آفس سے نکل کر ہوں گی۔“

اس نے جوس کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور آستین جھٹک کر رسٹ واچ پر نظریں ڈالیں۔

”اوہ!“ یکدم اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔

”میں تم سے کہہ رہا ہوں اٹھو فٹافٹ۔ بس ایک دو ضروری کام نمٹا کر کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں چلیں گے۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں مجھے تم سے۔“ اس نے چٹکی بجائی۔

”سکندر خدا کیلئے اب اٹھ بھی جاؤ۔“ وہ اسے گھورتا ہوا بولا۔

ایڑیوں کے بل پلٹ کر آفس ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ خاصا عجلت میں تھا۔

سکندر جوس کا پیک منہ سے لگائے لگائے اس کے پیچھے لپکا۔

"تمہارے پاس انسانیت ذرا کم ہی ہے۔اب دو گھڑی سکون سے حلق ہی تر کرنے دیتے۔ ایک تو تمہارے آفس کا ماحول ہی اس قدر خواب ناک ہے کہ خوامخواہ نیند آنے لگتی ہے۔ سوچتا ہوں کہ تمہیں یہاں کام کیسے سوجھتا ہے۔ باہر تمہاری عمر رسیدہ سیکرٹری بھی اونگھتی رہتی ہے ہمہ وقت..."

اس نے سکندر کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر کے بھگا دی کہ چلتی گاڑی میں سکندر جلدی سے دروازہ بند کر کے اسے گھورنے لگا۔

" تم گاڑی میں بے شک سو جائو۔ میری گاڑی کا ماحول بھی بڑا خوابناک ہے۔ایک آدھ لوری بھی کہو تو سنا دوں مگر بھائی میرے مجھے بڑی جلدی ہے۔ نصیر صاحب کے آفس پہنچنا ہے۔ وہ بہت پنکچوئل ہیں۔ انہوں نے مجھے جو ٹائم دیا ہے اس میں پانچ منٹ ہی کم رہتے ہیں اور پانچ منٹ میں پہنچنا ضروری ہے۔" اس نے گویا اس کے گھورنے کا جواب دیا۔

" اب کیا خاک سوئوں گا۔ تم جس انداز سے گاڑی چلا رہے ہو نا اس میں سوئے ہو تو کیا' مردے بھی دائمی نیند سے بیدار ہو جائیں۔" سکندر نے جوس کا خالی ٹن کھڑکی سے باہر اچھال دیا اور سیٹ کو پیچھے دھکیل کر لیٹنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

"اب تم نصیر صاحب کے آفس میں آدھا گھنٹہ گزارو گے اور میں گاڑی میں بیٹھا سڑتا رہوں گا۔ خدا کے بند فون پر ہی کہہ دیتے کے فلاں فلاں ریسٹورنٹ میں اتنے بجے پہنچ جائو۔ آج میں تمہیں شاندار لنچ کروا رہا ہوں۔ بالکل خالی ہاتھ و جیب آنا کہ پے منٹ میری طرف سے ہو گی۔" جواباً ولید نے اپنا خالی پیکٹ اس کے منہ پر دے مارا۔

"اخبار کی نوکری نے تو تمہیں بالکل نکما کر دیا ہے۔ کسی کام کے نہیں رہے۔" ولید کے انداز میں فہمائش تھی۔

سکندر نے ایک متاسفانہ سی سانس بھری۔

"کیوں فاروقی صاحب کے اخبار کو بدنام کر رہے ہو' ہمیں تو ہمارے حالات نے نکما کیا ہوا ہے۔" اس نے ایک طویل سانس بھری۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے اے سی بند کرنا پڑے گا۔ تمہاری آہوں سے اچھی خاصی ٹھنڈک ہو گئی ہے۔" اس نے اپنی خوشنما آنکھوں میں مسکراہٹ بھر کر سکندر کو دیکھا۔ مگر وہ اس کی طرف دیکھنے کے بجائے ونڈ شیڈ کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔

عشق نے غالب نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

"اوئے ہوئے۔" ولید کے ہونٹ بے اختیار سیٹی کے انداز میں سکڑے۔ "یہ واردات کب ہوئی؟"

اس نے گاڑی ایک بڑی سی عمارت کے پارکنگ لاٹ میں روک دی۔ اس کا انداز ہنوز مذاق اڑانے والا تھا۔

سکندر جانے کیوں سنبھل گیا۔ مذاق مذاق میں اس کا دل یکدم سنجیدگی کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور ولید کو باقاعدہ گھورا۔

"اس طرح کی واردات کیلئے بہت وقت چاہئے۔ بہت خون چاہئے۔ بہت حوصلہ چاہئے اور ہمیں تو اجتماعی دکھوں سے ہی فرصت نہیں ملتی کہ انفرادی طور پر کسی غم کو دل سے لگائیں۔ بقول فیض

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ولید کا قہقہہ خاصا برجستہ تھا۔ وہ اگنیشن سے چابی کھینچ کر ڈیش بورڈ سے کاغذات کا رول اٹھاتے ہوئے بولا۔ "اتنے خشک زاہد عابد تو لگتے نہیں ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انفرادی طور پر انسان خود سے غافل رہے۔ پہلو میں مچلتا دل اپنی موجودگی کا احساس بن کر کبھی تو دھڑکا ہو گا۔"

سکندر کے چہرے پر ایک سایا سا آکر گزر گیا۔اس نے نظریں جلدی سے کترالیں اور کھلا ہوا ڈیش بورڈ کھٹ سے بند کیا۔

"اب جاؤ بابا! تمہارے پنکچوئل نصیر صاحب تمہارے منتظر ہوں گے اور ہاں سنو' آدھے گھنٹے کے اندر اندر آجانا ورنہ میں تمہیں گاڑی میں بیٹھا ہوا نہیں ملوں گا۔"

اس کی اس دھمکی پر ولید نے گاڑی سے اترتے ہوئے اس پر ایک استہزائیہ نظر ڈالی پھر سر ہلایا۔

"یقیناً بیٹھے ہوئے نہیں سوئے ہوئے ملوگے۔" سکندر کا ہاتھ اٹھتا دیکھ کر جلدی سے نیچے اتر گیا۔

"ویسے میری طرف سے اجازت ہے۔کسی خوبصورت پری پیکر کے خیال میں گم ہو کر وقت رنگین بلکہ سنگین کر سکتے ہو۔" وہ ہنستا ہوا پلٹ گیا۔

سکندر لب بھینچے اسے نظروں سے اوجھل ہوتا دیکھتا رہا۔پھر ایک ہلکی سی افسردہ سی سانس بھر کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سامنے درختوں پر نظریں جمادیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کے پاس کوئی دل آویز' رنگین خیال نہیں تھا جس میں ڈوب کر وہ نہ ابھرنے کی خواہش کرتا۔ہاں سوچنے کو بہت کچھ تھا اور انہی سوچوں کے تانے بانے بنتے ہوئے اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ولید نے آکر جب اس کے آگے گاڑی کی' کی چین لہرائی تو اس کی سوچوں کا تسلسل ایک چھناکے سے ٹوٹا تھا۔

ولید کی معنی خیز مسکراہٹ نے اسے خفیف سا کر دیا۔

"مجھے تو اس موقع پر کوئی شعر بھی یاد نہیں آرہا حالانکہ تمہیں دیکھ کر کوئی شعر کہنے کو یکدم دل چاہ رہا ہے۔" اس نے جیسے متاسفانہ سانس بھری اور اپنی اس نالائقی کو کوسا۔

"منے افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے' شعر میں سنادیتا ہوں حسب حال۔" سکندر نے اسے پچکارا۔ولید اپنا قہقہہ نہ روک سکا۔گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکالتے ہوئے اس کی طرف ہو کر سر خم کیا۔

"ارشاد! مگر حسب حال ہونا چاہئے۔" اس کا انداز قطعی غیر سنجیدگی لیے ہوئے تھے۔

سکندر ایک ہنکارا بھر کر ونڈ شیلڈ کو دیکھنے لگا۔دوسرے پل اس کی مدھم بھاری سی آواز گونجی۔

آنکھ بیدار ہوتی جاتی ہے

ہوش تلوار ہوتی جاتی ہے

پیچ و خم اس قدر زیادہ ہیں

راہ ہموار ہوتی جاتی ہے

جس مسرت پہ جاں چھڑکتا ہوں

وجہ آزار ہوتی جاتی ہیں

زندگی فرط برہمی سے عدم

زلف خمدار ہوتی جاتی ہے

اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے اتنی دھیمی ہو گئی جیسے وہ خود ہی سن کر خود ہی محظوظ ہونا چاہ رہا ہو۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ولید کی طرف رخ کیا۔ اس کی مسکراہٹ میں قطعی پھیکا پن تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ویری گڈ!" ولید نے نظریں سامنے ہی جمائے جمائے داد دی۔ گو کہ سکندر کا لہجہ اس کے اندر ایک بوجھ کی طرح اترا تھا۔ اتنا پھیکا' یاس زدہ لہجہ۔ وہ بھلا کیسے محسوس نہ کرتا۔ مگر وہ یاسیت کی فضا کو سکندر کے دل پر مزید پھیلنے نہیں دینا چاہ رہا تھا۔ دھیان بٹانے کو اس فضا کی گرماہٹ کو چھٹاتے ہوئے شگفتگی سے ہنسا۔

"میرا خیال ہے تمہیں بھوک زیادہ لگ رہی ہے' خالی پیٹ اسی طرح بجتا ہے۔"

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

ولید نے گاڑی ایک فائیو سٹار ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں روکی تھی اور اگنیشن سے چابی نکال کر گلاسز آنکھوں سے اتار کر جیب میں لٹکائے۔

"یہ تم میری عادتیں خراب مت کرو۔ اتنے بڑے ہوٹلوں کے کھانے کھا کر پھر صحافی اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔" سکندر نے ایک طائرانہ نظر ہوٹل کی بلڈنگ پر ڈالی اور گہری سانس بھر کر اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"اگر کسی نے مجھے تمہارے ساتھ اس شاندار ہوٹل میں لنچ کرتے ہوئے دیکھ لیا' پہچان لیا تو کل کلاں اخبار میں میرے متعلق ہی خبر نہ لگ جائے کہ سچا کھرا صحافی سکندر رضا فائیو سٹار ہوٹل میں سیاستدان کے ساتھ رشوت کے طور پر لنچ کر رہا تھا۔"

ولید نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"لنچ تو واقعی میں تمہیں رشوت کے طور پر ہی کروا رہا ہوں۔ اور یہ تم نے مجھے سیاستدان کیوں کہا۔ خدانخواستہ میرے چہرے سے تمہیں کبھی سیاستدان کی جھلک دکھائی دی ہے۔"

"کبھی کبھی مجھے تمہارے اندر ایک سیاستدان چھپا نظر آتا ہے۔" سکندر نے ایک آہ بھری۔

وہ دونوں ڈائننگ ہال میں ایک میز منتخب کر کے بیٹھ گئے۔

"شکر ہے تم نے کرپٹ سیاستدان نہیں کہا۔ آج کل سیاستدان کے ساتھ کرپٹ کا لفظ ضرور ہوتا ہے۔"

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے' کچھ سیاستدان بھی ایسے ہیں جو سیاست کرتے ہیں' کاروبار نہیں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سکندر نے جیسے اس کی تصحیح کی۔

"جیسے کہ میں۔" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"ارے ہاں تم نے رشوت کے طور پر لنچ کھلانے والی کیا بات کہی۔" سکندر کو اچانک خیال آیا۔ ولید نے مینیو کارڈ اٹھاتے ہوئے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"ہاں یہ لنچ رشوت کے طور پر ہی سمجھ لو۔"

"شرم کرو۔ ڈوب مرو۔ ابھی کہہ رہے تھے کہ میں نے تمہارے لیے کرپٹ کا لفظ استعمال نہیں کیا اور ابھی رشوت کی بات کر رہے ہو۔ بچو' بچو اس آگ سے۔ رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں دوزخی ہیں۔" سکندر نے ملامت بھری نظروں سے اسے لتاڑا۔

"تو میں جہنم میں لے جانے والی رشوت کی بات تھوڑا ہی کر رہا ہوں۔"

پھر گھبرانے کے سے انداز میں بولا۔

"بابا اس لنچ کو دوستانہ رشوت سمجھ لو' محبت بڑھانے والی' اف دوزخ کا نام لے کر تو تم نے ڈرا ہی دیا۔"

سکندر اسے ایک ٹک گھورر ہا تھا۔ پھر ایک گہری سانس بھری۔

"آہ' کیا اللہ والے ہیں' خیر سے۔ دوزخ کی بات سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔"

"بالکل۔" اس نے سر خم کیا۔

"دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔ آں آن۔" اس نے سکندر کو پانی کا جگ اٹھاتے دیکھ کر سر جھکا کر ہاتھ اٹھایا۔ "چلو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

"کمینے۔" سکندر نے ہنستے ہوئے جگ واپس ٹیبل پر رکھ دیا اور ویٹر کو مستعدی سے میز پر لوازمات سجاتے دیکھ کر ابرو اچکا کر ولید کی طرف دیکھا۔

"یہ اتنے تکلفات دیکھ کر تو مجھے واقعی رشوت کی بو آرہی ہے۔"

"اب یہ تمہاری ناک کا قصور ہے۔ مجھے تو بڑی اشتہا انگیز خوشبو آرہی ہے۔ اس نے نہایت اطمینان سے نیپکن اٹھا کر اپنے آگے پھیلا لیا۔

"ناک کا تو نہیں چھٹی حس کا ضرور کہہ سکتے ہو۔ خیر اللہ دے اور بندہ لے۔" سکندر بھی کھانے سے انصاف کرنے لگا۔

"سکندر!" چند لمحے توقف سے ولید نے خاصی سنجیدگی سے پکارا۔

"بارہ تاریخ کو تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بارہ تاریخ۔" اس نے ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھا پھر یاد آنے پر سر ہلایا۔

"اچھا ہاں۔ مگر اس میں میرے خیال کا کیا دخل۔ مجھے تو تم نے فیتہ کاٹنے والوں کی فہرست میں بھی خیر سے نہیں رکھا۔" اس نے جیسے آہ بھری۔

ولید نے سوپ کے بائول میں چمچہ گھماتے ہوئے اسے گھورا۔

"فہرست سے کیا مطلب' اوپننگ مجھے صرف ایک شخص سے کروانی ہے۔ پورے قافلے سے نہیں۔"

"اور وہ خوش قسمت' طالع مند کون ہے جسے آپ یہ شرف بخش رہے ہیں۔ مردان شاہ..."

مردان شاہ کا نام لیتے ہوئے سکندر کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ مگر ولید کے چہرے پر سمٹ آنے والی سنجیدگی ہنوز قائم رہی۔

وہ دھیرے سے بولا۔

''نہیں ماسٹر دین محمد۔''

سکندر کا ہاتھ لقمہ منہ میں لے جاتے جاتے ٹھٹک گیا۔ ولید کو غایت درجے حیرانگی سے دیکھا اور کچھ دیر دیکھتا رہا پھر ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

''مجھے کبھی کبھی تم کسی ڈیٹکٹو کہانی کا کردار لگتے ہو۔''

''ہیرو کیوں نہیں؟'' اس نے نظروں کا زاویہ کچھ شکایتی انداز میں کیا تو سکندر مسکرایا۔

''تھوڑا جیلسی جو ہوں۔'' اس کا انداز نہایت اطمینان بھرا تھا ولید کے گھورنے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔

''بس کھائے جاؤ۔'' ولید نے اس کے آگے رکھی پلیٹ اپنی طرف کھسکالی۔

''تمہارا کام بارہ تاریخ سے پہلے شروع ہونا چاہئے' احمق انسان!''

''اوں۔اوہ۔'' سکندر نے بھنویں اچکا کر ترچھی نظر اس پر ڈالی۔

''یعنی تم واقعی مجھے رشوت کا کھانا کھلانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' اس نے مصنوعی پن سے سر دھنا۔

''کھلانے کی کوشش نہیں' کھلا چکا ہوں۔ اب تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ تم اپنے اخبار میں فٹافٹ بارہ تاریخ کی اس عظیم الشان ہونے والی افتتاحی تقریب کی پبلسٹی کرو۔''

''لعنت تم پر۔'' سکندر نے پلیٹ اپنی طرف کر لی اور ادھورا کباب کھانے لگا۔

''سکندر! میں چاہتا ہوں کہ اس سکول سے شہرت مجھے ملے نہ ملے مگر مردان علی شاہ کی ساکھ ضرور متاثر ہو۔''

سکندر نے دیکھا اس کے چہرے کے زاویوں میں سنجیدگی کے ساتھ تہ میں ایک عجیب سی نفرت کی سرخ تمتماہٹ دکھائی دینے لگی تھی۔

اس کی آواز دھیمی تھی اور اس میں سرد سرد سی کیفیت اتر آئی تھی۔ اس کی نظریں سگریٹ کے پیکٹ پر جمی تھیں۔ اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر لبوں کے درمیان پھنسا لیا اور اسے لائٹر کا شعلہ دکھاتے ہوئے وہ مبہم سے انداز میں مسکرایا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے دھواں اپنے آگے پھیلاتا گیا۔ پھر اس دھوئیں کے مرغولوں پر نگاہیں یوں مرکوز کر دیں جیسے کوئی عکس' کوئی ہیولا وہ اس میں دیکھ رہا ہو۔

سکندر نے کچھ کہنے کو لب کھولے کہ اس کی آواز ابھری۔

"ابھی کوئی سوال مت کرنا سکندر! میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں کئی ایک سوال ابھر رہے ہوں گے مگر بس وقت کا انتظار کرو' میری طرح۔" یہ کہتے ہوئے اس نے سکندر کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو دیکھ کر ہلکے سے مسکرا دیا۔

سکندر نیپکن سے ہاتھ پونچھتا ہوا ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"تم سمجھ لو میں سکرین پر ہوں تمہارے سامنے اور مجھے بس ڈیٹکٹو فلم کا کوئی کردار ہی سمجھو۔" اس کا انداز اب کے قدرے شگفتہ تھا۔ اس نے ساتھ ہی مسکراہٹ بھی اچھالی۔ پھر جیب سے والٹ نکالنے لگا۔

جبکہ سکندر نے یہ سوچ کر سر جھٹکا کہ بارہ تاریخ اب اتنی بھی دور نہیں ہے۔ پھر میز پر رکھا اس کا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر سگریٹ نکالنے لگا۔

X...X...X

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"شاید یہ میری خوش فہمی تھی۔ میں آج تک اپنے دل کی آنکھوں سے اپنے ارد گرد کو دیکھتی آرہی تھی مگر جب حقیقت کی نظروں سے دیکھا تو خوش فہمی کی وہ رنگین فضا دھوئیں کے غول کی طرح گم ہو گئی بھابھی۔ خوبصورتی بدصورتی میں بدل کر میرے اندر بڑا زخم لگا گئی ہے۔ میں اس کے سامنے رو بھی نہیں سکتی۔ ایسا کیوں ہوا بھابی؟"

وہ رات ان کے بیڈ پر بیٹھی اپنے دل کا وہ درد بہا بیٹھی جسے لیے لیے پھر رہی تھی۔ اسے کسی ہمدرد' غمگسار کی طلب ہو رہی تھی اور شاید یہی طلب اسے یہاں لے آئی تھی۔

"پتہ نہیں جب میں بہت خوش ہونے لگتی ہوں تو کسی دکھ کا منحوس سایا کہیں سے آکر میری زندگی سے لپٹ جاتا ہے۔

جب کبھی میں مطمئن ہونے لگتی ہوں میرے واہمے اور خدشے بکھرنے اور ٹوٹنے لگتے ہیں کہ اچانک سے ان خدشوں کی ٹوٹتی زنجیر میں کڑیاں... مل کر اسے اور مضبوط بنا جاتی ہیں۔ میرا وہم ہر گزرتے لمحے کے ساتھ یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔ میرے خدشے ہر دن سچ ہوتے جا رہے ہیں۔"

وہ اپنے دل سے اٹھنے والی درد کی لہروں سے نمٹتے ہوئے بری طرح ٹوٹ رہی تھی۔

بھابی کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں جن میں حیرت ہی حیرت تھی۔ پھر یہ حیرت افسردگی، رنج اور بے یقینی میں بدل گئی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شیری! ولید تو..." ایک اذیت سے انہوں نے لب دانتوں میں دبا کر چھوڑے۔ کچھ کہنا چاہا مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہیں۔

وہ اپنا دکھ کھولے بیٹھی تھی جو آج تک ان سے چھپا ہوا تھا۔

ولید کی تمام تر زیادتیاں

آمنہ مردان علی کا انکشاف

اور وہ سب کچھ جو وہ نہیں جانتی تھی۔

انہوں نے یکسر اسے جھٹلانا چاہا مگر انہیں لگا ان کی زبان ٹھٹھر گئی ہو۔

مردان علی شاہ کا گھر آنے پر استقبال۔

ولید کا ان کے آنے پر سکندر کے بھائی نومی کی منگنی سے جلدی واپس آ جانا۔

ہر ہفتہ گائوں کا چکر۔

آمنہ نامی لڑکی کا فون آنا۔

یہ وہ کڑیاں تھیں جو مل کر واقعی خدشے کی زنجیر بنا کر ولید کو گھیر رہی تھیں۔

مگر وہ یقین کرنے کے باوجود بے یقینی کی کیفیت میں تھیں۔ انہیں یہ سب قبول کرنا مشکل لگ رہا تھا، ازحد مشکل۔

"شیری... شیری! بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے نا کہ جو آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں جو دل محسوس کر رہا ہوتا ہے وہ محض ہمارے اندر کے خدشات ہی ہوتے ہیں۔ ہماری محبت کی انتہا جس میں خوف کا نقطہ بھی بڑا سا دھبہ نظر آتا ہے۔" بہت دیر بعد ان کی آواز ابھری۔ انہوں نے شہرینہ کو خود سے لگا لیا۔

"ہو سکتا ہے نا ایسا؟" پتہ نہیں وہ اسے تسلی دے رہی تھیں یا خود کو۔ شہرینہ کے لبوں پر بھیگی بھیگی افسردہ سی مسکراہٹ بکھر آگئی۔

"میں بھی ایسے ہی بہلاوے دیتی رہی خود کو اور سراب کے طوفان میں گھری اس نہج پر آ گئی ہوں جہاں سے واپس پلٹنا بہت مشکل ہو گیا ہے بلکہ ناممکن۔" یکدم اس کی سسکی بلند ہو گئی۔

"بھابی...میں روز جڑنے اور ٹوٹنے کے اس عمل کی اذیت سے تھک گئی ہوں۔ جذبے کھیل تو نہیں ہیں۔ دل کھلونا تو نہیں ہے نا جس کے ٹوٹنے کا غم نہ ہو۔"

بھابی نے نرمی سے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی بھوری آنکھوں کے کانچ پر حزن بکھرا ہوا تھا۔ چہرے پر شکستگی کا دھواں تھا۔

"میں ہار گئی نا بھابی۔" وہ دکھ کے احساس سے جیسے ٹوٹتے ہوئے ہلکے سے ہنسی۔ "ہا۔ آغا جی کہتے تھے کہ جسے ہار کا ڈر ہوتا ہے وہ ضرور ہارتا ہے مگر میں تو جیت کے زعم میں ہار گئی۔"

"نہیں شیری! نہیں۔ میں خود ولید سے بات کروں گی۔" بھابی تڑپ گئیں۔

"تم نے مجھے پہلے کچھ کیوں نہیں بتایا پگلی!" وہ اس کے رخساروں پر بہنے والے بے آواز آنسوئوں کو پوچھنے لگیں۔

"نہیں بھابی! آپ کچھ نہیں کہیں گی اس شخص کو۔" اس نے ان کا ہاتھ اپنے رخساروں سے ہٹا کر ہاتھوں میں تھام لیا۔

بھابی اس کا سرخ تپتا ہوا چہرہ بس دیکھ کر رہ گئیں۔ ان کی رگوں کو کوئی چیز کاٹنے لگی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"شیری!" انہوں نے اس کا ہاتھ ہلکے سے دبایا کہ وہ بے اختیار ہو کر ان کے سینے سے لگ کر بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مجھے اپنی شکست کا واویلا نہیں کرنا بھابی! میں اپنی شکست کو بھی متاع کی طرح اپنے دل میں رکھنا چاہتی ہوں' چھپا کر۔" وہ ان سے الگ ہوئی۔

بھابی نے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے بیڈ سے اتر کر باتھ روم میں جا کر دروازہ بند کر دیا۔

اور وہ اس بند دروازے کو دیکھتی رہ گئیں پھر بیڈ سے اتر کر اضطرابی انداز میں دروازے پر ہاتھ رکھا اور کچھ دیر یونہی کھڑی رہیں پھر ہاتھ پہلو میں سمیٹ لیا اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر ملگجے اندھیرے کو تکنے لگیں۔

تو شہرینہ کی آمد کا یہ مقصد تھا۔ وہ اتنا دکھ اٹھائے آئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے ہنستی مسکراتی شہرینہ کو اتنا اداس' اتنا دکھی دیکھا تھا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی ہنستی مسکراتی زندگی میں کوئی دکھ یوں دبے پائوں چلا آئے گا۔ ہنستے لمحوں سے خوشیاں کشید کرتے ہوئے دکھ یوں جھولی میں آن گرے گا۔

مگر جانے کیوں ان کا دل ولید کی طرف سے بدگمان نہیں ہو پا رہا تھا۔ مگر دوسری طرف شہرینہ کا چہرہ بہت کچھ کھونے کے غم کی تصویر بھی تو تھا۔

’ولید کے رویوں نے ہی اسے بدگمان کیا ہے نا؟‘ یکدم انہیں ولید پر بری طرح غصہ آنے لگا۔ مارے غصے کے ان کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ان کا دل چاہا کہ وہ اڑ کر کراچی پہنچ جائیں اور اس لڑکے کی باز

پرس کریں مگر اس معاملے میں خود کو سخت بے بس محسوس کر کے رہ گئیں۔

وہ باتھ روم سے باہر آئی تو ہاتھ میں تولیہ تھا جس سے وہ منہ پونچھ رہی تھی۔ بھابی ایک گہری سانس لے کر پلٹیں۔

”سوری! میں نے آپ کو پریشان کر دیا نا۔“ وہ بھابی کو دیکھ کر نادم ہو گئی۔ تولیہ واپس باتھ روم کے سٹینڈ پر لٹکا کر باہر آئی۔

”دل چاہتا ہے پکڑ کر اتنا ماروں۔“ بھابی اسے گھور کر دیکھنے لگیں۔ پھر چلتی ہوئی اس کے نزدیک آئی۔ وہ چٹیا کے بل کھول رہی تھی۔ انہوں نے اس کی چٹیا تھامی اور اپنائیت بھرے انداز میں خود بل کھولنے لگیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”تم نے مجھے پہلے یہ سب کیوں نہیں بتایا۔ شاید اعتماد نہیں تھا مجھ پر۔ یا سوچ رہی تھی کہ اعتماد کے قابل ہوں یا نہیں۔

”میرا تو خود اپنے اوپر سے بھی اعتبار اٹھ گیا ہے۔ میں آپ کے بارے میں کیا سوچوں گی اس طرح۔“ وہ پھیکے انداز میں ہنس دی اور آئینے میں ابھرتے بھابی کے عکس کو دیکھا پھر پلکیں جھکا دیں اور قریبی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آپ پر اعتبار نہ ہوتا تو آج بھی کیوں بتاتی۔“

بھابی...اس کے بالوں میں برش پھیرنے لگیں۔

”لیجئے یہاں زلف جاناں سنواری جا رہی ہے اور ادھر آپ کی اولاد نرینہ اور نگینہ رو رو کر آسمان سر پر اٹھا چکی ہیں۔“ ہمایوں نے دروازہ ذرا سا کھول کر اندر جھانکا پھر اندر آ گیا۔

وہ دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں سے نکل کر چونکیں۔

آپ زلف جاناں کے خم سنوارئیے صاحب!

زندگی کی زلفوں کو آپ کیا سنواریں گے

"بکومت... میں زلف جاناں کے خم سنوار رہی ہوں' میرے بچے رو رہے ہیں اور تمہیں توفیق نہیں ہوئی کہ اٹھا کر ادھر لے آتے۔" بھابی نے برش اس کے بازو پر جمایا اور ابرو اچکا کر بولیں۔

"ویسے وہ دونوں اس قدر تمیز دار ہیں کہ اس طرح چیخ و پکار مچا ہی نہیں سکتے۔ تم نے ہی ان دونوں کو ستایا ہو گا۔"

"اف' نیکی کر دریا میں ڈال۔" اس نے ہلکی سی سانس بھر کر تاسف سے بہن کو دیکھا۔ پھر نظریں شہرینہ پر جمادیں جو سر جھکائے بالوں کو لپیٹ رہی تھی۔

"یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں حالانکہ ابھی گھڑی نے بارہ نہیں بجائے۔ کیا ولید بھائی یاد آرہے ہیں۔" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

(اف۔ پھر ولید) اس کے ذکر سے اس کے دل میں درد سا پھیل گیا۔ وہ ایک سانس بھر کر دراز سے ہیئر بینڈ نکال کر بالوں میں لگاتے ہوئے بولی۔

"اتنی فرصت کسے ہے۔ وہی ایک شخص رہ گیا ہے کیا یاد کرنے کو؟"

بھابی نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا تو وہ برش اپنے بالوں میں پھیرتے ہوئے ہنس دی۔

"دراصل ہومی! یاد انہیں کیا جاتا ہے جنہیں بھول جایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے وہ ولید کو بھولی تو نہیں۔" انہوں نے بات مذاق میں اڑا دی۔

"بالکل' بالکل۔ یعنی یہ مجھے یاد کر رہی تھیں۔" اس نے شہرینہ پر طائرانہ نظر ڈالی اور جانے کیلئے پلٹا تو بھابی بولیں۔

"ہومی!' ہمیں آئس کریم پارلر لے جائو نا۔"

"کیا آ... اس وقت۔" وہ ایڑیوں کے بل پلٹا اور قدرے تعجب سے دونوں کو باری باری دیکھا۔ شہرینہ بھی بھابی کی طرف دیکھنے لگی۔ بے وقت ان کی اس خواہش نے اسے بھی چونکا دیا تھا۔

"ہاں۔اب اتنا زیادہ وقت بھی نہیں ہوا۔دس ہی تو بجے ہیں اور تم کون سا صبح صادق اٹھتے ہو۔"

"تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ساری رات آپ کو سڑکوں پر لیے لیے آوارہ گردی کروں۔"

"بکومت' آوارہ گردی کا کون کہہ رہا ہے۔ایک آئس کریم ہی کی تو فرمائش کی ہے۔دراصل شیری دیکھنا چاہ رہی ہے کہ رات کو اسلام آباد کیسا لگتا ہے۔"

شہرینہ بے ساختہ امڈ آنے والی مسکراہٹ نہ روک پائی۔

"بڑا خوفناک اور ڈرائونا لگتا ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے بچے کو پچکار رہا ہو۔

"اچھا فضول مت ہانکو۔چلو شیری! فٹافٹ تیار ہو جائو۔میں بچوں کو ایک نظر دیکھ آئوں۔

"بس ایک نظر ہی دیکھئے گے۔وہ دونوں سوئے ہوئے ہیں بلکہ میں نے ہی سلایا ہے۔"

ہمایوں یہ کہہ کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔بھابی جھٹکے سے پلٹی تھیں پھر اسے گھور کر دیکھا۔ پھر ادھر ادھر نظریں

دوڑائیں کہ کوئی چیز اٹھا کر اسے دے ماریں۔

وہ ہنستا ہوا ان کے قریب آ گیا۔

"آئس کریم کھانی ہے تو پھر یہ آنکھوں سے لیزر بم پھینکنا بند کریں۔" یہ کہہ کر اس نے شہرینہ کی طرف دیکھا جو بھابی کی جھنجلاہٹ اور اس کی شرارت پر مسکرا رہی تھی۔

"شیری! تم انہیں کیسے برداشت کر لیتی ہو۔"

"ہومی کے بچے!" انہوں نے ایک ہاتھ جڑ دیا۔

"یہ سوال تو تم وسیم بھائی سے کرو۔وہی بہتر جواب دیں گے۔" وہ کندھے اچکا کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی پھر بھابی کو دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھنے لگی۔

"اے' اے۔تم بھی اس بد تمیز لڑکے کا ساتھ دے رہی ہو۔" بھابی کے احتجاج پر وہ یکدم ہنس پڑی۔

"ہمیشہ حق کا ساتھ دینا چاہئے۔آپ اسے کیوں خوامخواہ میں اپنا حمایتی بنانا چاہ رہی ہیں۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ نند ہے۔"

"کیا، کیا کہا۔" شہرینہ جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپک گیا تھا پھر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر مسکراتا ہوا اس کی طرف پلٹا۔

"آئس کریم کھانی ہے تو فٹافٹ آجائو۔ ادروائز میں سونے کیلئے کمرے میں چلا جائوں گا۔"

وہ وارننگ دیتا ہوا جھپاک سے باہر نکل گیا۔

بھابی نے شہرینہ کی طرف دیکھا اور دونوں ہی بے اختیار ہنس پڑیں۔

"چلو جلدی کرو۔ کچھ بعید نہیں کہ یہ بدمعاش اپنا بیڈروم لاک کر دے اور ہم کھٹکھٹاتے ہی رہ جائیں۔"

بھابی جلدی جلدی چادر پہننے لگیں۔

X...X...X

نومی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سید صاحب کو گولی سے اڑا دے یا پھانسی پر لٹکا دے۔ کبھی دل چاہتا دھواں بنا کر فضا میں تحلیل کر دے یا جادو کی چھڑی سے گھما کر کوا بنا دے۔

جھنجلاہٹ اور غصے میں وہ بچوں کی مانند سوچنے لگا تھا۔

اس کے پاس بھی الہ دین کا چراغ ہوتا تو وہ جن کو بلا کر سید صاحب کا کام تمام کر دیتا۔

آج اسے دوسرا دن تھا سید صاحب کی گلی اور گھر کے اطراف کے چکر لگاتے ہوئے مگر عظمیٰ کی ایک جھلک بھی دکھائی نہ دی تھی اسے۔ وہ اس سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔

لگتا تھا اس روز کے بعد سے اس نے کالج جانا بھی چھوڑ رکھا تھا۔

سخت مایوس ہو کر اس نے اپنی چمچماتی بائیک سٹارٹ کی اور یاسر کی طرف چلا آیا۔

لونگ روم میں یاسر اور افتخار اسے تاش کی بازی جمائے بیٹھے نظر آئے۔

اس نے جھک کی چابی کانچ کی تپائی پر پھینکی اور نرم و گداز صوفے پر تقریباً دھنس گیا۔

"کیا بات ہے پیارے! یہ منہ کیوں خمیری پیڑے کی طرح ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کوچہ جاناں سے ناکام و نامراد ہو کر آرہے ہو۔" یاسر نے اس کی طرف رخ موڑ کر اسے بغور دیکھا۔

"بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔" افتخار نے ٹکڑا لگایا اور ساتھ قہقہہ بھی۔

نومی نے ایک گہری سانس بھری اور قدرے تلخ انداز میں سر جھٹکا اور جھک کر جوگر کے تسمے کھولنے لگا۔

"پتہ نہیں کہاں جا چھپی ہے۔ایک بار تو اس سے بات کر کے رہوں گا۔اس کا باپ سمجھتا کیا ہے خود کو۔مجھے عظمیٰ کی طرف سے تھوڑی سی حمایت مل جائے پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔"

وہ غصے سے کھول رہا تھا۔افتخار نے خاصی مضحکہ خیز نظروں سے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

"مثلاً کیا کرو گے ؟" پھر ایک ہلکی سی سانس کے ساتھ ہنستے ہوئے بولا۔

"میری مانو تو بچے مسرت نذیر کی بات مانو۔"

ابھی تاروں سے کھیلو چاند کی کرنوں سے اٹھلاؤ

ملے گی اس کے چہرے کی سحر آہستہ آہستہ

اس کا انداز جلانے والا تھا۔نومی نے پیر سے جوتے جھٹک کر دور پھینکے' ساتھ افتخار کو کڑی نظروں سے دیکھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میں سیریس ہوں افتخار! پلیز مجھے تنگ مت کرو۔میرے لئے کچھ کر نہیں سکتے تو کم از کم میری بے بسی کا مذاق تو مت اڑائو۔بات اس کے چہرے کی چاندنی کی نہیں' میری عزت کی ہے۔بے عزتی ہوئی ہے میری۔میں بھی دیکھوں گا کس سے شادی کرتے ہیں وہ عظمیٰ کی۔"

"اوئے۔ہوئے۔" افتخار کا قہقہہ برجستہ تھا جبکہ یاسر نے تاش کے پتے ایک طرف پھینکے اور افتخار کو فہمائشی نظروں سے گھورا پھر اس کے قریب صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔اور اس کا کندھا تھپکنے لگا۔

"تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے مگر یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری انسلٹ ہوئی ہے۔تمہاری جگہ میں بھی ہوتا تو اتنا ہی غصہ میں ہوتا۔مگر غصہ صرف دکھانے تک نہ رہتا۔عملاً ضرور کچھ کرتا۔"

"کیا کروں میں۔تم ہی کچھ بتائو۔مجھے تو اپنا دماغ مائوف لگنے لگا ہے۔"

اس نے یاسر کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا پھر ایک مضمحل سی سانس لے کر صوفے کی پشت سے سر لگا کر پیشانی کو انگوٹھے سے دبانے لگا۔

سوچ سوچ کر اسے اپنی رگیں تنی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی پل کھٹ سے ٹوٹ جائیں گی۔

’’ایک تیر میں دو شکار ہو سکتے ہیں۔‘‘ توقف کے بعد یاسر کی آواز ابھری جس میں مسکراہٹ کے ساتھ ہلکی سی پراسراریت تھی۔ آنکھوں میں مکروہ مسکراہٹ تھرک رہی تھی۔ نومی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکا۔

’’بولو کیا کہتے ہو۔‘‘

’’ارے یہ کیا کہے گا۔ اس کی عقل تو گھاس چرنے گئی ہوئی ہے۔‘‘ افتخار سارے پتے سمیٹ کر دوبارہ قالین پر پھینک کر نزدیک چلا آیا۔ اس کے لہجے میں اب بھی تمسخر تھا۔ مگر نومی نے دھیان نہیں دیا۔ اس کی ساری توجہ یاسر پر تھی۔ پھر میکانکی انداز میں سر ہل گیا۔

’’ہاں‘ ہاں تم بتاؤ تو سہی۔‘‘ وہ بولا تو ہزار بے تابیاں چیخ رہی تھیں۔

نومی اس وقت جذبوں کے تلاطم خیز طوفان میں گھرا ہوا تھا۔ یاسر اس طوفان کا رخ جس طرف بھی چاہتا موڑ سکتا تھا اور یوں بھی اس کے ذہن کی ڈوریاں عموماً یاسر کی انگلیوں سے

لپٹی رہتی تھیں وہ سبز نوٹوں کی ایک ہری بھری فضا اس کی آنکھوں کے گرد تان دیتا اور اس کم عقل کو اپنی عقل کا بنجر پن دکھائی نہ دیتا۔

اس وقت بھی غصے اور جذبات میں گھر کر اس کے ذہن کی حالت اس زمین کی طرح ہو رہی تھی جو سیم و تھور سے بے حال اور بنجر ہو گئی ہو۔ ایسے میں یاسر کی کرامت سے ہی کوئی کونپل پھوٹ سکتی تھی تو پھوٹتی۔

اس کی تمام تر امیدوں کا مرکز یاسر ہی تھا جسے وہ آس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر یاسر اس کے اضطراب کو ہوا دیتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور شوکیس کے چمکتے کانچ کے دروازے کھول کر اس میں سے بوتل نکالی ساتھ ہی دو گلاس اٹھا کر کہنی سے دروازے بند کیے۔

’’یاسر! تم۔‘‘

’’اوہ ہوں۔‘‘ یاسر نے میز پر دونوں چیزیں رکھتے ہوئے اسے کچھ کہنے سے باز رکھا۔ پھر فریج کھول کر آئس کیوبز کے ساتھ سیون اپ کی بوتل نکالی۔ وہ واپس آ کر اطمینان سے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

نومی سخت اضطرابی کیفیت میں اس کی تمام تر کارروائی دیکھ رہا تھا۔ سیون اپ کی بوتل اسے پکڑا کر وہ دونوں گلاسوں میں آئس کیوبز ڈالتا ہوا ہلکے سے مسکرایا۔

”ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا تم سے۔“ اس نے ایک گلاس افتخار کو پکڑا دیا۔ دوسرا اپنے قریب کھینچ کر اس میں بوتل انڈیلنے لگا۔

”وہ...تت... تم کہہ رہے تھے تمہارے پاس اس مسئلے کا حل ہے۔ ایک تیر سے دو شکار وغیرہ کا کچھ کہہ رہے تھے۔“ نومی کا لہجہ انتہائی بے ربط تھا۔ اس کے حواسوں کی طرح۔

افتخار اس پر ایک مسکراتی نظر ڈال کر اپنا گلاس بھر کر ایک طرف گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔ گویا اسے اب کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی تھی جبکہ یاسر اسے قدرے سرگوشیانہ انداز میں سمجھانے لگا۔

”سید صاحب کی بیٹی کو پانا ایسا قطعاً مشکل کام نہیں ہے بلکہ یہ تو بڑا آسان ٹارگٹ ہے۔“

”یہ تمہارا خیال ہے وہ بڑی اونچی ناک والے لوگ ہیں۔ بڑے عزت دار بنے پھرتے ہیں۔ انہیں پیسے سے خریدا نہیں جا سکتا۔“

”تو احمق انہیں پیسے سے خریدنا کیوں ہے۔ جو جس سے مرے اسے اس سے مارو۔ خوامخواہ میں پیسہ اتنا زیادہ بھی نہیں ہے کہ برباد کریں۔“

”پھر جو گڑ سے مرے اسے زہر سے نہیں مارتے مگر جو زہر ہی سے مرنا چاہے اس پر گڑ کیوں ضائع کریں۔“

نومی ہونق بنا اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں یاسر کی لچھے دار باتیں ذرا مشکل سے ہی آتی تھیں۔

”عزت دار لوگوں کو عزت کے خوف سے مارو۔ عظمیٰ کو اغوا کر لیتے ہیں۔ ایک دو دن اسے میری انیکسی میں بند رکھنا پھر باعزت طریقے سے ہم اسے گھر چھوڑ آئیں گے اور یوں عزت ماب سید صاحب کی عزت کی سفید براق چادر پر اتنا بڑا سا دھبا لگ جائے گا۔“ یاسر نے گلاس سے بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے خلا میں بڑا دائرہ بنایا اور بھونڈے انداز میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”سنا ہے ہم نے کہ عزت دار گھرانوں کی بیٹیاں اغوا ہونے کے بعد ماں باپ کیلئے ایسا ناقابل برداشت بوجھ ہو جاتی ہیں کہ جنہیں وہ جلد از جلد کہیں پھینکنے کا سوچتے ہیں اور ایسے میں چندا

نومی! تمہارا پروپوزل وہ اپنی آنکھوں بلکہ ماتھے پر رکھیں گے۔ الٹا تمہارے احسان مند بھی ہوں گے' ہاہاہا۔'' یاسر کی آواز نشے کی وجہ سے لڑکھڑا گئی۔

اس نے خالی گلاس ایک طرف رکھا اور سر جھٹک کر حواس سنبھالے۔ پھر نومی کی ران پر ہاتھ مار کر اسے داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ مگر نومی کو اپنے آگے پیچھے پٹاخے چھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ سوائے ذہن و دل میں دھماد ھم کے کوئی خیال' کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ اس نے لرزیدہ ہاتھوں سے سیون اپ کی بوتل صوفے کے قریب قالین پر رکھ دی۔ اس کے ہاتھوں میں اتنا دم بھی نہیں تھا کہ وہ فاصلے پر رکھی ٹیبل تک ہاتھ بڑھا سکتا۔ نہ ٹانگوں میں اتنا دم کہ صوفے سے اٹھ کر کمرے کے دو تین چکر لگا کر حواس سنبھال لیتا۔

''اغوا کرنا ہمارا کام ہے بے وقوف! تم تو پردے میں رہو گے اور ظاہر بھی یہی کرنا کہ تم اس سارے واقعے سے لاعلم ہو۔ ہاں مجھے اس حسینہ کی تصویر دکھا دینا اور گھر کا پتہ وتا بھی۔ باقی کام میرا اور میرے لڑکوں کا ہو گا۔'' یاسر نے اس کی شکل دیکھ کر اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا کہ وہ اچھل پڑا۔ پھر بے وقوفوں کی طرح زور زور سے سر ہلانے لگا۔

اب بات دل کو لگ رہی تھی۔

اپنا آپ مخفی رہنے کا سن کر اس کے معطل حواس قدرے معمول پر آئے۔

''تصویر کیا' مووی بھی ہے میرے پاس نکاح والے روز کی۔ ہر رنگ و روپ میں بس وہی چھائی ہوئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے نومی نے ایک طویل قسم کی ٹھنڈی سانس کھینچی۔

'' آہا۔ کیا کیا خواب میں نے دیکھے تھے۔'' اس نے یاسر کی طرف دیکھا۔ ''سوتے جاگتے بس وہی تو دکھائی دیتی تھی۔

اس کے بعد محفلیں سجائی نہ گئیں

آہ مگر...''

اس نے ایک اور سانس بھری۔

''میرا خیال ہے اے سی بند کرنا پڑے گا۔ اپنے نومی کی آہیں خاصی ٹھنڈک پیدا کر رہی ہیں۔'' افتخار نے قہقہہ لگایا تو وہ جھینپ کر ہنس دیا۔

''پھر کب دے رہے ہو مووی؟'' یاسر نے خاصی سنجیدگی سے سوال کیا۔

آج شام ورنہ کل صبح ضرور۔''وہ اب قدرے پر سکون نظر آ رہا تھا۔

X...X...X

اب دلوں کے علاوہ پڑھنا کیا

اپنا کاغذ قلم سے رشتہ کیا

اک مہک جیسے رات کی رانی

کیا بتائوں کہ میں نے سوچا کیا

تانیہ اضطراب کی کیفیت سے دوچار تھی۔سامنے بیٹھا اکبر شاہ پتہ نہیں اس کے اضطراب سے ناآشنا تھا یا انجان بن رہا تھا۔شاید اسے ستا کر حظ اٹھا رہا تھا۔

اس نے کچھ کہنا چاہا کہ اس نے آنکھوں کو جنبش دے کر اسے بولنے سے روک دیا پھر اپنی انگلی اس کے ہونٹوں پر رکھ دی۔

جب بھی دیکھو اسی طرف نظریں

چاند بھی ہے کسی کا چہرہ کیا

"اکبر!"

تم میری زندگی ہو یہ سچ ہے

زندگی کا مگر بھروسہ کیا

اس نے اس کی میز کی سطح پر رکھے ہاتھ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ محجوب سی ہو کر رہ گئی۔

"ہاں کہو نا۔" وہ اس کی اٹھتی گرتی پلکوں کا کھیل دلچسپی سے دیکھنے لگا تھا۔

اس نے مارے حیا کے پلکوں کی باڑھ جھکا کر اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے کھینچ لیا۔

"میں جانتی ہوں تمہیں سارے شاعروں کے مجموعے ازبر ہیں۔" وہ اس پر ایک شکوہ کناں نگاہ ڈال کر پلکیں جھکا گئی۔اکبر شاہ کا قہقہہ برجستہ تھا۔

"کیا بات ہے آج کچھ خفا خفا سی لگ رہی ہو۔ ویسے یہ خفگی تمہیں سوٹ کر رہی ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ تم اس حسین موسم کا ناس مار دو۔ کم آن تانی زندگی کو انجوائے کرو ہنسی خوشی۔"

وہ آئس کریم کھانے لگا۔

"کب تک ہم ہوٹلوں اور پارکوں میں بیٹھ کر موسم کو انجوائے کرتے رہیں گے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو میں روز روز اس طرح تمہارے ساتھ اس طرح کی جگہوں پر نہیں آسکتی۔ بہت مشکل ہوتا ہے میرے لیے گھر سے نکلنا۔ پھر ڈر ڈر کر راستوں سے گزرنا۔ تم نہیں جانتے اکبر میں جس کلاس سے تعلق رکھتی ہوں وہاں یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"ہوں۔" اکبر شاہ نے ایک گہری سانس بھر کر پر سوچ انداز میں سر کو جنبش دی اور میز کی سطح پر ہلکے ہلکے انگلیاں مارنے لگا۔

"میں گھر میں بھی مشکوک ہوتی جارہی ہوں۔ نادیہ آپی میرے لمبے لمبے فون پر چونکنے لگی ہیں۔ میرے بے وقت باہر نکلنے پر اور بہانے بازیوں کو آہستہ آہستہ سمجھنے لگی ہیں اور آج کل تو شہرینہ بھی نہیں ہے ورنہ اسی کی طرف جانے کا بہانہ کرلیا کرتی تھی۔" وہ خاصی دل

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

گرفتگی کا شکار ہو رہی تھی۔ بے دلی سے آئس کریم پر چمچہ مار رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر نادیہ آپی کی نگاہیں یاد آرہی تھیں جب وہ اکبر شاہ سے ملنے آج آرہی تھی اور وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی تھیں۔

"یہ اس وقت تم کہاں جارہی ہو تانی؟"

"لائبریری جانا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں ایگزام بھی سر پر کسی تلوار کی طرح کھڑے ہیں۔"

گو کہ اس کا دل اس سوال پر حلق میں اچھل کر آیا تھا۔ وہ رخ پھیر کر دراز سے اپنی سینڈلیں نکال کر جواب دینے لگی۔ نادیہ آپی کی نظریں اس کے کاٹن کے چمچماتے سوٹ سے ہوتی ہوئی سینڈل پر گئیں۔

"کمال ہی اچھی تیاریاں ہو رہی ہیں ایگزام کی۔ کبھی فون پر کبھی باہر جا کر۔" وہ ہلکے سے ہنسی تھیں اور اپنے کروشیا کے دھاگوں میں الجھ گئیں۔

مگر وہ آئینے میں خود پر پڑنے والی ان کی نگاہوں کو دیکھ چکی تھی اور خفت سے پانی پانی ہو کر سرعت سے کمرے سے نکل گئی۔ مگر سارے راستے عجیب سی آزردگی کی لپیٹ میں رہی کبھی گھر کے حالات سامنے آجاتے۔ نومی کی بگڑی روش' اماں کی بیماری' لاچاری۔

نادیہ آپی کی محبت، دوستی، سکندر بھائی کی صبح و شام روزگار کیلئے جدوجہد۔

یہ سب نگاہوں میں آجاتا تو وہ بے کل ہو جاتی۔ روح پر بے نام سی تھکن اترنے لگی۔ مثبت انداز سے سوچنے پر خود سے بری طرح شرم آتی۔

مگر جو کبھی سوچوں کا سرپٹ گھوڑا منفی رخ پر بھاگنے لگتا تو دل چاہتا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے۔ اپنے لیے صرف اپنے لیے جیے۔ آخر اس کا کیا قصور ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس کی قسمت میں مسائل سے گھرا ہوا گھر لکھا جا چکا ہے۔

آخر زندگی کی مسرتوں، خوشیوں، رنگینیوں پر اس کا بھی حق ہے۔

دو گھڑی اکبر شاہ کی سنگت میں وہ سارے رنج، فکر پریشانیاں بھلا دیتی ہے تو کیا برا کرتی ہے۔

"جانتی ہو آج میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے؟" اکبر شاہ اس کی سمت جھکا پوچھ رہا تھا۔

وہ چونکی جبکہ وہ اس کے بالوں کی لٹ کو اپنی انگلی میں لپیٹنے لگا ساتھ ہی اس کے چہرے پر ہلکی سی پھونک ماری۔ وہ بری طرح مجوب ہو کر پیچھے ہٹی۔ اکبر شاہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ جھینپ کر اپنے پرس کی زپ کو کھولنے اور بند کرنے لگی۔

"آج تمہیں اپنا گھر دکھانے لے جا رہا ہوں۔ وہ گھر جہاں آفٹر آل تمہیں آنا ہے۔" اس کی نظریں تانیہ کے سراپے پر دوڑ رہی تھیں۔

نیلے رنگ کی سفید کڑھائی والا شلوار سوٹ اس پر بے حد کھل رہا تھا۔ سفید اور نیلے رنگ کا کنٹراسٹ کا دوپٹہ دائیں کندھے پر پڑا تھا۔ اس کی شفاف کلائیوں میں نیلے رنگ کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔ چہرے پر ہلکا میک اپ اور کانوں میں نیلے رنگ کے نگوں والے ٹاپس تھے۔

اکبر شاہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ پہلے کبھی اتنے اہتمام سے تیار نہیں ہوتی تھی۔ کبھی خود پر اتنی توجہ نہیں دیتی تھی۔ مگر جب سے اسیر محبت ہوئی تھی اس کا انگ انگ نکھرنے لگا تھا۔

وہ اتنی ہی دل آویز تھی یا ہو گئی تھی اکبر شاہ دیکھ کر حیران رہ جاتا۔

گو کہ اس کی گیدر رنگ میں گڈ لکنگ لڑکیوں کی کمی نہ تھی مگر تانیہ کی اس نوعمری میں بھی ہزار قیامتیں چھپی ہوئی تھیں۔

بے داغ، شفاف، ملائم جلد

متناسب سراپا

خوبصورت نین نقش

وہ ہر گز بھی نظر انداز کیے جانے والی قیامت نہیں تھی۔

اکبر شاہ کے دل پر ہیجان خیز جذبات نے یکدم ہی حملہ کر دیا تھا۔

تانیہ سمجھ نہیں پائی کہ اس نے یہ فیصلہ اچانک کیا تھا یا شروع ہی سے اس کا پروگرام تھا۔ تاہم اس کے دل میں پھلجھڑیاں سی پھوٹ پڑی تھیں۔ وہ عرصے سے متمنی تھی کہ اکبر شاہ اسے اپنا گھر دکھائے' اپنی بہن سے ملوائے۔ آئس کریم ختم کرنے کے بعد وہ دونوں آئس کریم پارلر سے باہر آ گئے۔

X...X...X

"موسٹ ویلکم مسٹر ولید حسن۔" آمنہ علی اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

" تمہارا خیال ہو گا میں تمہارا میسج ملتے ہی تمہاری طرف دوڑی چلی آؤں گی' ہے نا۔" وہ کھلے بالوں میں برش پھیرتے پھیرتے ہلکے سے ہنسی اور بالوں کو ایک ادا سے جھٹکا دے کر

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

صوفے پر گر گئی۔ بڑی بڑی کھڑکیوں کے سلائیڈ کے خوبصورت کانچ سے وہ لان میں گھاس کی کٹائی کا منظر غیر دلچسپی سے دیکھتے ہوئے ایڑیوں کے بل پلٹا۔ اس کے جملے کے جواب میں ٹرائوزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"میری ایسی قسمت کہاں مس وڈیری' اسی لیے تو میں خود چلا آیا۔"

اس نے نگاہوں کو کچھ اس انداز سے جنبش دی کہ اسکے استہزائیہ مسکراہٹ سے سجے ہونٹ سکڑ گئے۔

"زیادہ طنزیہ گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔ پوچھ سکتی ہوں وجہ آمد۔" وہ گویا پھنکاری۔

تاہم ولید حسن کے شاندار سراپے پر نگاہ انداز غلط ڈال کر جلدی سے رخ پھیر لیا۔ اس شخص کے شاندار سراپے کی مقناطیسی کشش بہر حال اپنی جگہ بدرجہ اتم موجود تھی۔

"تمہیں سلام پیش کرنے تشریف لایا ہوں۔" وہ چلتا ہوا اس کے صوفے کی طرف آیا پھر اس پر ہتھیلیاں ٹکا دیں۔

بظاہر اس نے بڑی سادگی سے کہا مگر آمنہ علی کو اس کا لہجہ مذاق اڑاتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بھنا گئی اور بیٹھے بیٹھے رخ پھیر کے چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے کہا نا طنزیہ گفتگو کی ضرورت نہیں ہے‘ جس مقصد کیلئے آئے ہو وہ کہو۔“

”کمال ہے میں تو صاف ستھری طنز سے پاک گفتگو کر رہا ہوں بلکہ تمہیں حقیقتاً سلام پیش کر رہا ہوں۔“ وہ مبہم سے انداز میں مسکرایا اور چلتا ہوا آگے آیا اور ایک کارڈ اس کی گود میں پھینکتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ آمنہ علی نے چونک کر کارڈ پر نظریں ڈالیں۔ سفید اور سلور رنگ کے امتزاج کا یہ کوئی دعوتی کارڈ معلوم ہوتا تھا۔

”ڈرو مت۔ اٹھا کر دیکھو۔ میری شادی کا کارڈ ہرگز نہیں ہے۔“ وہ ہلکی ہنسی کے ساتھ جیسے پچکارا۔ جواباً وہ اس پر کھولتی نظریں ڈال کر کارڈ اٹھا کر دیکھنے لگی۔ دوسرے پل ایک ہنکارا ابھر کر بے ساختہ ہلکے سے ہنسی۔

”کچھ اس طرح کی چیز تم باباسائیں کو بھی دے آئے ہو شاید۔“

اس نے قدرے لاپروا انداز میں کارڈ ایک طرف ڈالا اور صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”شاید نہیں یقیناً۔ اس کارِ خیر میں میرے تمام دوستوں‘ دشمنوں کی شرکت میرے لیے باعث مسرت ہو گی۔ مجھے یقین ہے تمہارے باباسائیں اپنے گائوں میں ہونے والی اس چھوٹی سی ترقی پر مسرور ہوں گے اور اپنے گائوں کے لوگوں کے چہرے پر ٹپکتی خوشی کو دیکھ کر ان سے زیادہ خوش ہوں گے۔ ایم آئی رائٹ۔“

جواباً آمنہ علی اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھتی رہی جیسے اندر جھنجھلاہٹ کو دبا رہی ہو پھر برش ایک طرف ڈال دیا‘ بالوں میں انگلیاں پھنسا کر شوکیس سے پشت ٹکائی اور سینے پر بازو لپیٹتے ہوئی بولی۔

”تو تم وہاں کے لوگوں کے سامنے باباسائیں کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ بائی دی وے۔ اس چھوٹے سے سکول کی تعمیر سے تم کیا پالو گے۔ دولت‘ شہرت یا...“ وہ حقارت سے ہنسی۔

”ہمارے یہاں کا یہی تو المیہ ہے کہ لوگ اچھائی کو اپریشیٹ نہیں کرتے۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے آمنہ علی کو دیکھا پھر گھٹنے پر ہاتھ کا دبائو ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

"اوہ تو تم میرے پاس داد وصول کرنے کیلیئے آئے ہو۔" وہ کھنکتی ہنسی کے ساتھ اسے تمسخرانہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"چلو تم اگر یہی سمجھ کر خوش ہو تو یونہی سہی۔" وہ کندھے اچکا کر یوں مسکرایا جیسے کسی چھوٹے بچے کہ بہلا رہا ہو۔ پھر بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا اس کے قریب آیا۔

"مگر میں یہ داد یہاں نہیں بارہ تاریخ کو افتتاحی تقریب میں ہی وصول کرنا چاہوں گا۔ میرا خیال ہے اس حقیر پر تقصیر کیلیئے تمہیں ایک تالی بجانے میں کوئی عار نہیں ہو گا۔"

اس کی تنی ہوئی بھنویں یکدم ڈھیلی پڑ گئیں یکدم جھلا کر اس نے رخ موڑ لیا تھا۔

کچھ توقف کے بعد بالوں کو جھٹکتی ہوئی بولی۔

"ٹھیک ہے آخر ہم اچھے کولیگ رہے ہیں۔" اس کے لبوں پر احسان کرنے والی مسکراہٹ تھی۔

"تھینک یو۔ میں منتظر ہوں گا۔" وہ آنکھوں کو اپنے مخصوص انداز میں جنبش دے کر ہلکے سے مسکرایا اور پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"میرا خیال ہے تمہاری اس طرح کی دوڑ دھوپ سے تمہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ بابا سائیں کے سامنے تم ابھی بہت کچے ہو۔" اس کی آواز ابھری تو وہ ٹھٹکا۔

"مسٹر ولید حسن! پیروں کے نیچے اینٹیں رکھ کر کوئی اونچا نہیں ہو سکتا' نہ قد بڑھ سکتا ہے' نہ قدر و منزلت نہ حسب نسب۔"

پتہ نہیں اس نے اپنا غصہ نکالا تھا یا جھنجھلاہٹ۔ ولید نے پلٹ کر اسے خاصی ترحم آمیز نظروں سے دیکھا۔

"میرے ساتھ تو مسئلہ یہ ہے آمنہ علی کہ مجھ پر اس طرح کے طنز زیادہ اثر نہیں کرتے یا دوسرے لفظوں میں' میں آدمیوں کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ سوائے بزرگوں' سیانوں اور ذہین لوگوں کے۔"

اس کا لہجہ نہایت ملائم تھا۔ پھر ایک ہلکی سانس بھرتے ہوئے خفیف سے انداز میں کندھا اچکا کر بولا۔

"کہتے ہیں کسی اعلیٰ خاندان سے نسبت فی الحقیقت بڑی چیز ہے لیکن اس سے کسی کی قدر وقیمت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ شرف کی روایات تو آباہی سے وابستہ رہیں گی۔ وہ شخص بھلا ستاروں پر کمند کیسے ڈال سکتا ہے جو اپنے شجرہ نسب کے دام میں پھنسا ہوا ہے۔"

"خیر چھوڑو جا کہاں رہے ہو' ۔بیٹھو' آفٹر آل مہمان ہو تم میرے۔" وہ قدرے کھسیا کر کندھے اچکا کر اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے بولی۔

"مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔" اس نے جھک کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھنٹی کو دبایا۔ دوسرے ہی لمحے ملازم کسی چراغ کے جن کی طرح دروازے سے نمودار ہوا۔ گویا گھنٹی نے چراغ کا ہی کام دیا تھا۔

"سوری آمنہ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ بلکہ اس وقت تو لمحہ لمحہ میرا قیمتی ہے۔"

اس نے رسٹ واچ پر ایک نظر ڈال کر قدرے معذرت خواہانہ نظریں آمنہ علی پر ڈالیں پھر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"تمہاری اس شاہی آفر پر پھر کبھی لطف اٹھاؤں گا۔ ابھی تو تم لوگ مجھے خدمت کا موقع دو۔ میرا بھی کچھ نہ کچھ اس کلچر سے تعلق تو ہے نا۔ کچھ اس طرح کی خوبیاں میرے اندر بھی تو

ہونی چاہئیں نا۔ او کے بائے۔" وہ اس پر ایک بھرپور نظر ڈال کر پلٹا۔ پھر ملازم پر ایک نظر ڈال کر اس کے کندھے کو تھپکا اور دروازہ عبور کر گیا۔

آمنہ علی عجیب سے احساسات میں گھری خالی نظروں سے اس حصے کو دیکھتی رہ گئی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے وہ کھڑا تھا۔

ایک عجیب سی مہک وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ یہی تو شاید اس کی شخصیت کا سحر تھا کہ وہ نہ موجود ہوتے ہوئے بھی موجود رہتا تھا۔ وہ اپنے جانے کے بعد اپنی موجودگی کا احساس چھوڑ دیتا تھا۔

"تم کھڑے میرا منہ کیا تک رہے ہو' دفعہ ہو یہاں سے۔" اچانک اس کی نظر ملازم پر پڑی تو اس کے چہرے کے زاویئے بگڑ گئے۔ ملازم تو سٹپٹا کر الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

"مائی فٹ۔" اس نے سامنے رکھی تپائی پر لات ماری۔ عجیب بے بسی' غصے اور جھنجھلاہٹ نے بیک وقت اس پر حملہ کر دیا تھا۔

"اٹس جسٹ مائی فیلنگز۔ ورنہ... ورنہ اس شخص میں کوئی کمال نہیں ہے۔ اونہہ... میں' آمنہ مردان علی شاہ کی پاؤں کی وہ خاک بھی نہیں۔"

وہ حقارت سے سر جھٹک کر صوفے پر نیم دراز ہو گئی اور اس شخص کی موجودگی کا تاثر ذہن و دل سے جھٹکنے کیلئے موبائل اٹھا کر جمشید خان کے موبائل کے نمبر پش کرنے لگی۔

X...X...X

کبر شاہ کی سفید سوک میں بیٹھتے ہوئے تانیہ کا ذہن و دل اس سے پہلے اکبر شاہ کے گھر پہنچ گیا اور اسے پتہ ہی نہیں چلا راستہ کٹنے کا۔

ایک تو اے سی کی خنک ہوائیں' دوسرا مدھم مدھم بجتا کیسٹ اور اس پر اکبر شاہ کی قربت' گاہے بگاہے اٹھتی اور محبت لٹاتی نظریں اور اس پر خوبصورت دل آویز جملوں کی بوچھاڑ۔

اس کے لہجے میں اسے پانے کی بے تابیاں چیخ رہی تھیں۔ وہ مدہوش کیوں نہ ہوتی۔

اور اس سے زیادہ مدہوش تو وہ اکبر شاہ کے گھر کو دیکھ کر ہو گئی۔ اس نے ایسے خوش نما گھر پہلے شاید کبھی نہیں دیکھے تھے۔ شہرینہ کے گھر سے کہیں زیادہ امارت ٹپک رہی تھی۔ ملازموں کی فوج تھی۔

اکبر شاہ اس کے کندھے پر بازو پھیلائے اس کی ہم قدمی میں چل رہا تھا اور وہ اس بات سے بے گانہ مبہوت سی اپنے اطراف دولت و حسن کے مناظر دیکھ رہی تھی۔

'شاید دولت سے ہی حسن جنم لیتا ہے۔' اسے نے سوچا اور ایک گہری سانس بھری کہ اچانک اسے اکبر شاہ کی اتنی قربت کا احساس ہوا۔

وہ جھٹکے سے اس سے الگ ہوئی۔ اس کی اتنی قربت کی آنچ پر وہ پوری کی پوری جھلس کر رہ گئی۔ مارے حیا کے اس کی سانسیں اتھل پتھل ہو گئیں۔

''کیا ہوا؟'' اکبر شاہ نے اسے تعجب سے دیکھا۔

''کک...کچھ نہیں۔ تمہارا گھر تو بہت پیارا ہے۔'' مارے شرم کے اس سے پلکیں نہ اٹھ پائیں وہ جلدی سے لابی کے ایک گداز صوفے پر بیٹھ گئے۔

''پانی مل جائے گا؟''

''بالکل! کیوں نہیں۔ الٰہی بخش۔ الٰہی بخش۔ اس نے ملازم کو آواز دی۔ دوسری ہی آواز پر ملازم بوتل کے جن کی طرح نمودار ہوا۔

”پانی اور کولڈ ڈرنک لے آئو اور ہاں آج بہت خاص مہمان آئی ہیں میری۔ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنی۔“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا پھر تانیہ کو دل آویز نظروں سے دیکھنے لگا۔

”بی ریلیکس تانی! اتنی نروس کیوں ہو رہی ہو بھئی۔یہ روپیہ پیسہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔اہم جذبے ہوتے ہیں۔ویلیو محبت کی ہے‘ رشتوں کی ہے۔“ وہ اٹھ کر اس کے نزدیک چلا آیا۔

وہ جھینپ گئی حالانکہ وہ خود کو ہر طرح سے پر اعتماد ظاہر کرنے کی کوشش کر رہ تھی۔مگر شاید ناکام ہو رہی تھی۔

تبھی تو وہ اس کے دل کا حال اس کے چہرے پر پڑھ چکا تھا۔اسے خفت ہوئی یہ سوچ کر کہ وہ یہ سمجھ رہا تھا وہ اس کی دولت سے مرعوب ہو رہی ہے۔گو کہ یہی حقیقت تھی مگر وہ کم از اس پر اپنی کم مائیگی کو ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ضروری تو نہیں کہ جس حقیقت سے آپ باخبر ہوں بلکہ اسے پورے اعتماد کے ساتھ قبول بھی کر رہے ہیں‘ اسے دوسروں پر بھی اسی طرح ظاہر بھی کر دیں۔

وہ اب قدرے خود کو سنبھال چکی تھی اور اکبر شاہ کی طرف دیکھا مگر اسے اپنی طرف پوری وارفتگی سے دیکھتا پا کر پلکوں کے ساتھ اس کا سر بھی جھک گیا۔

”یہ بتائو میرا گھر کیسا لگا۔یہاں آنا تمہیں کیسا لگا۔“ وہ اسی صوفے پر آ کر بالکل اس سے جڑ کر بیٹھ گیا۔

ملازم پانی کے ساتھ کولڈ ڈرنک لے کر آیا تھا اور مؤدب ہو کر ایک گلاس اکبر شاہ اور دوسرا تانیہ کو پیش کرتے ہوئے ایک سپاٹ سی نظر اس پر ڈالی اور مشینی انداز میں خالی ٹرے لے کر واپس پلٹ گیا۔

”آئو تانی میں تمہیں اپنا گھر دکھائوں اور اپنا کمرہ بھی۔بھئی آخر تمہیں اس گھر کے چپے چپے سے آگاہی ہونی چاہئے نا۔“ وہ کولڈ ڈرنک کے بڑے بڑے گھونٹ بھر کر گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

”میں گھر دیکھ کر کیا کروں گی۔بس سارے کمرے اتنے خوبصورت ہی ہوں گے نا۔“ وہ لابی کی آرائش‘ زیبائش پر ایک توصیفی نگاہ ڈال کر ہلکے سے بولی۔جواباً اکبر شاہ ہنس پڑا۔

"چلو دوسرے نہ سہی، میرا بیڈ روم تو دیکھو گی نا۔ مجھے اس کی سیٹنگ بدلنی ہے۔ اسی سلسلے میں تم سے کچھ مشورہ بھی لینا ہے۔ سنا ہے لڑکیاں ان کاموں میں خاصی ماہر ہوتی ہیں۔"

"مم... مگر مجھے تو اس چیز کا زیادہ تجربہ نہیں ہے۔" وہ سٹپٹا گئی۔ اس کی نظروں میں اپنا چھوٹا سا گھر گھوم گیا اور شدت سے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا جو تپش بن کر روح پر تپکنے لگا۔

"تمہاری انگلیاں کہتی ہیں تم میں بڑی فنکارانہ صلاحیتیں ہیں۔"

اکبر شاہ کی نگاہیں اس کے شفاف ہاتھوں پر آ کر ٹھہر گئیں۔

"کہتے ہیں لمبی سڈول انگلیوں والے بڑے ذہین اور کری ایٹو مائنڈ ہوتے ہیں۔"

وہ دھک سے رہ گئی اس کی نظریں اکبر شاہ کے ہاتھ پر تھیں جس کی مضبوط انگلیاں اس کی نازک انگلیوں کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھیں۔ وہ حیران رہ گئی کہ اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں کیسے آ گیا۔

اس نے خود دیا یا اس نے ہاتھ بڑھا کر تھام لیا تھا۔

اس کی اتنی قربت، اس کے لمس کی حدت سے اس کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔

دھڑکنیں اسے دل کے بجائے اپنی کنپٹیوں پر سنائی دینے لگیں۔

تو سامنے ہے مگر تشنگی نہیں جاتی

یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

"اکبر وہ..." وہ جھٹکے سے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ صوفے سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے رخسار ان دیکھی آگ میں جھلسنے لگے تھے۔

"کیا ہوا؟" اکبر شاہ نے لبوں کا ایک کونا دبا کر دھیمے تبسم سے اس کے چہرے کو بغور دیا اور خود بھی کھڑا ہو گیا۔

"میرا خیال ہے اب میں گھر جاؤں گی۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"کیا آ... گھر جاؤ گی اور میں جو تم سے کہہ رہا ہوں۔" اس نے پیار بھری خفگی سے اسے گھورا اور اس کے بولنے سے پہلے بول اٹھا۔

"چلو آؤ یار میں کئی دنوں سے پریشان ہوں۔ اس قدر بے ترتیب ہو رہا ہے کمرہ دیکھو گی تو مجھے پھوہڑ، بدسلیقہ، ال مینرڈ اور جانے کیا کیا کہو گی۔ پلیز تانی لیٹس گو۔ صرف مشورے ہی

نوازدو۔میری یہ مشکل تو حل کرو۔'' وہ لجاحت سے کہتا اسے اوپر لے جانے والی براؤن قالین سے سجی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

وہ عجیب بے بسی محسوس کر کے رہ گئی۔تاہم اس کے دل میں بھی اکبر شاہ کا کمرہ دیکھنے کی خواہش تھی۔

جو خود اتنا پیارا تھا' جو اتنا خوبصورت تھا' اتنی میٹھی سحر انگیز باتیں کرتا تھا' اس کا کمرہ بھی کتنا خوبصورت ہو گا۔

''سلام سائیں۔'' کمدار مٹھل کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔وہ ابھی تیسرے زینے تک ہی پہنچے تھے۔

''ارے مٹھل۔تم حویلی سے کب آئے۔'' اکبر شاہ مٹھل کو دیکھ کر چونکا اور ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف گھوم گیا۔

''اچھا ہوا تم آئے ہو مجھے تم سے بڑا ضروری کام تھا۔''

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''حکم سرکار!'' مٹھل نے جلدی سے دونوں ہاتھ آگے جوڑے پھر بولا۔''میں بڑے سائیں کے ساتھ آج صبح ہی ادھر شہر پہنچا ہوں اور انہی کا پیغام دینے کیلئے آپ کو روکا ہے۔معافی چاہتا ہوں سائیں مگر پیغام دینا ضروری ہے۔بڑے سائیں اپنے کمرے میں آپ کے منتظر ہیں۔انہوں نے کہا ہے رئیس اکبر شاہ جونہی آئیں ان کے پاس بھیج دیا جائے۔''

''کیا آ۔باباسائیں آئے ہوئے ہیں۔'' اکبر شاہ کے اعصاب کو جھٹکا لگا تھا۔وہ پل بھر میں اپنی ساری چوکڑی بھول گیا۔

''رئیس توقیر شاہ بھی ہمراہ ہیں سائیں۔''

''مائی گاڈ۔'' اس کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی سانس نکلی تھی۔

''کتنے کام چور اور نکمے انسان ہو تم' مٹھل! میں کب سے آیا ہوا ہوں اور یہ میسج تم اب دے رہے ہو۔الٰہی بخش نے بھی نہیں بتایا۔''

اس نے مٹھل کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔پیشانی پر آڑے ترچھے بل پڑے گئے۔

خوشگوار موڈ یکلخت بدمزگی میں ڈھل گیا۔

"جائو دفع ہو اور سنو باباسائیں سے ابھی کچھ مت کہنا۔ میں خود دس منٹ کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔" اس نے تانیہ کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑا۔

"تانیہ پلیز مائنڈ مت کرنا۔ اس وقت میں تمہیں واپس چھوڑ آتا ہوں۔" وہ بڑی عجلت میں اسے لیے بڑے بڑے قدموں سے پورٹیکو کی طرف بھاگا۔

"باباسائیں کو بھی آج ہی آنا تھا۔" بڑبڑاتے ہوئے اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

"آئی ایم سوری تانیہ ڈیئر!" تانیہ پر نگاہ پڑی تو اس کے چہرے کے تنے ہوئے زاویے ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ مسکرانے لگا مگر تانیہ کو لگا وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"اٹس آل رائٹ، ویسے تمہارے باباسائیں سے میں بھی مل لیتی تو مجھے خوشی ہوتی۔" وہ اندر مچل جانے والی خواہش کا اظہار کر بیٹھی۔

اکبر شاہ نے نظریں ونڈ سکرین پر کر دیں اور کھلے گیٹ سے گاڑی زناٹے سے باہر نکال لی۔

"پھر کبھی سہی، ان فیکٹ ابھی تو مجھے پتہ نہیں ہے کہ وہ کس سلسلے میں اور کس موڈ سے تشریف لائے ہیں۔" وہ ایک سانس بھر کر اسکی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"یوں بھی میں یہ کام اپنی سسٹر آمنہ سے لینا چاہتا ہوں ڈائریکٹ نہیں۔ عموماً بہنیں یہ کام زیادہ عمدگی سے پایہ تکمیل تک پہنچاتی ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

تانیہ شرما کر کھلکھلادی۔ پھر سر ہلا کر سڑک پر نظریں ڈال کر بولی۔

"بس بس، میرا خیال ہے مجھے یہیں اتار دو۔ گھر میں خود چلی جائوں گی۔"

اس کی بات پر اکبر شاہ کا پیر بریک پر پڑا۔

"اوکے بائے۔" وہ نیچے اتر گئی۔

اکبر شاہ اسے جاتے ہوئے یوں دیکھنے لگا جیسے کوئی شکاری اپنے نکل جانے والے شکار کو دیکھتا ہے۔

X...X...X

"ولید حسن کی حیثیت ایک چیونٹی سے زیادہ نہیں ہے باباسائیں اور آپ نے جانے کیوں اسے اتنا متھے پر چڑھا دیا کہ آج وہ ہمارے منہ کو آنے کی جسارت کر رہا ہے۔" توقیر شاہ کے چتون سخت تیکھے

ہو رہے تھے۔

"آخر ہمیں ضرورت کیا ہے اس کی دعوت قبول کرنے کی۔" حقارت سے سر جھٹک کر قدرے الجھ کر اس نے مردان علی شاہ کو دیکھا جو ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے پورے اطمینان سے سگار پی رہے تھے۔

"تمہارے خیال میں بابا توقیر! اس دعوت کے قبول نہ کرنے سے ہمیں کیا فائدے مل سکتے ہیں۔"

"فائدے ہوں نہ ہوں' نقصان البتہ ضرور ہو گا۔" توقیر شاہ کے نتھنے پھول گئے۔ وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا اور دبیز خوش نما قالین پر ارنے بھینسے کی طرح ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا۔

"نقصان! کیسا نقصان بابا؟" مردان شاہ نے بھنویں اچکائیں۔

"کیا ہو گیا ہے بابا سائیں آپ کو۔" توقیر شاہ زچ ہو کر رہ گیا۔ اس کی جھنجھلاہٹ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اس نے مردان شاہ کو تعجب سے دیکھا۔

"اس کی کیا اوقات ہے ایک سکول بنا کر وہ خود کو ہمارے برابر کا سمجھنے لگا ہے۔ ہا۔ اور ہم اس کی اس تقریب میں شرکت کر کے اسے عزت بخشیں۔ نہیں ہر گز نہیں۔" اس نے سر کو نفی کے انداز میں زور زور سے ہلایا۔ پھر اچانک پر خیال انداز میں پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

"آپ اگر کہیں تو میں اس تقریب کا قصہ ہی پاک کر دوں۔ میرے بندے..."

"جذبات سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" مردان شاہ کے چہرے پر تیکھا پن سمٹ آیا اور اسی تیکھے پن سے انہوں نے توقیر شاہ کو دیکھا۔ ایک طرح سے اس کی عقل کو کوسا۔ وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔

"ہر دشمن کو ایک ہی لاٹھی سے مت ہانکا کرو۔ ضروری نہیں جو درخت تمہیں باہر سے کمزور نظر آتا ہو وہ حقیقتاً اتنا ہی کمزور ہو۔ کلہاڑی چلاتے ہوئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہیں وہ درخت ہمارے سر پر ہی نہ آ گرے۔"

"مم... میں سمجھا نہیں۔" توقیر شاہ کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اپنی کم عقلی کا گویا ثبوت دیتے ہوئے نا سمجھ آنے والے انداز میں اس نے باپ کا چہرہ دیکھا۔ مردان شاہ نے ترچھی نظر اس پر ڈالی اور برا سا منہ بنا کر سگار لبوں سے ہٹا کر باقاعدہ اسے گھورا۔

"ولید اتنا کمزور نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ اس کے ہاتھ خاصے لمبے ہیں اور مجھے تو اب احساس ہو رہا ہے کہ اس نے آمنہ سے دوستی بھی کسی خاص مقصد کے تحت کی تھی حویلی میں اس کے آنے جانے کے پیچھے بھی کوئی سربستہ راز ہے۔ وہ...وہ ہرگز بے نام' لاوارث یا بے حقیقت شخص نہیں ہے۔" مردان شاہ یہ کہہ کر سگار کا طویل کش لے کر خاموشی سے سامنے دیوار کو گھورنے لگے۔ ان کی پیشانی پر لکیروں کا جال بچھا ہوا تھا جو ان کے اندرونی خلفشار اور ذہنی تفکرات کی نشان دہی کر رہا تھا۔ توقف کے بعد ان کے اعصاب پر ہلکی سی جنبش ہوئی جیسے وہ کسی سوچ کے حصار سے نکلے تھے اور بولے۔

"فدا حسین خصوصی طور پر اس افتتاحی تقریب میں شرکت کر رہا ہے۔ ہدایت اللہ کو بھی اس نے دعوت نامہ بھجوایا ہے اور بصد اصرار آنے کو کہا ہے۔ وہ دونوں شامل ہو رہے ہیں اس تقریب میں۔ اخباروں میں اس تقریب کی پبلسٹی کی جا رہی ہے۔ سوچو ذرا اس ایک سکول کو اتنی اہمیت دی جا رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں بنتا کہ سکول کو ہی اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس کے پس منظر میں کچھ اور معنی پنہاں ہیں۔

"وہ ہمیں وہاں جا کر اس میں شامل ہو کر ہی پتہ لگ سکے گا کہ..."

"مگر بابا سائیں!" توقیر شاہ نے کچھ کہنا چاہا کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"تم نرے جذباتی اور احمق شخص ہو توقیر شاہ!" انہوں نے ایک کڑی نظر بیٹے پر ڈالی تو وہ پہلو بدل کر رہ گیا تاہم بولا کچھ نہیں۔

"یاد رکھو۔ جب دشمن اپنے بل سے باہر آ رہا ہو تو اس کے پورا باہر آ جانے کا صبر سے انتظار کرو اور پھر اپنی چالیں چلو۔" مردان شاہ کے لبوں پر پراسرار سی مسکراہٹ بکھر آئی۔

"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ اس کھیل سے اس کا کیا مقصد وابستہ ہے۔"

"اونہہ' مجھے تو بس یہ سستی شہرت کمانے کا تماشا لگتا ہے۔" توقیر شاہ نے نخوت سے سر جھٹکا۔ وہ باپ کی باتوں سے متفق نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے انداز میں بلبلاہٹ ہنوز قائم تھی۔

"اس نے محض ہمیں بے عزت کرنے اور نیچا دکھانے کیلئے یہ کھیل رچایا ہے۔ اب دیکھیں آپ وہ اوپننگ ماسٹر دین محمد سے کروا رہا ہے۔ یہ بات کل ہی میرے علم میں آئی ہے۔ میرے آدمیوں نے بتائی ہے۔" اس نے مردان شاہ کی حیرت سے اٹھنے والی نظروں کو دیکھا پھر سر ہلایا۔

"اب بتائیے ہماری موجودگی میں ہمارا ایک مزارع اٹھ کر فیتہ کاٹے اور ہم سب تالیاں بجائیں۔"

"ہوں۔" مردان شاہ ہنکارا بھر کر جلدی جلدی سگار پینے لگے ان کے چہرے کے زاویے ناگواری کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

کمرے میں یکلخت گہری خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ کسی سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ پھر اس سکوت کو ان کی کڑکتی آواز نے ہی توڑا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ بات تو میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ کرتے کا دامن جھٹک کر صوفے سے کھڑے ہو گئے۔ توقیر شاہ بھی کھڑا ہو گیا۔

"اس احمق نادان انسان نے ہامی کیسے بھر لی کیا وہ اپنی اوقات بھول گیا ہے۔"

"بس بابا سائیں عزت کی روٹی انہیں راس نہیں آتی۔ ہم جو دیتے ہیں وہ اس سے بڑے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔" مردان شاہ نے برہم انداز میں سر ہلایا اور توقیر شاہ کو دیکھا۔

"اپنے آدمیوں کو کہو کہ اس نادان، احمق ماسٹر کو اچھی طرح سمجھا دیں اور اس کی اوقات اسے بتلا دیں اور اسے کہیں کہ وہ گائوں کے دوسرے لوگوں کی طرح اس دن اپنے گھر میں بند رکھے خود کو... ورنہ..."

"بالکل بابا سائیں! آپ فکر ہی نہ کریں۔ میرے ایک فون کھڑکانے کی دیر ہے منٹوں میں کام ہو جائے گا۔"

توقیر شاہ کی آنکھیں مکارانہ مسکراہٹ سے چمکنے لگیں۔ اس کے چہرے پر بھیڑیے جیسی مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے فوراً سے پیشتر جیب سے موبائل نکال لیا۔

"اور ہاں کمدار سے کہو کہ اکبر اور آمنہ جونہی آئیں کوٹھی۔ انہیں میرے کمرے میں بھیج دے۔ اس چھورے کی بھی سمجھ نہیں آتی کچھ۔"

"کون، کس کی، اکبر کی۔" توقیر شاہ نمبر پش کرتے ہوئے چونکا۔

"ہاں اور کون ہے میرا دردسر اسے تو نہ زمین داری کے گر آتے ہیں نہ سیاست کی الف ب، سوچ رہا ہوں اسے لاہور بھیج دوں۔ شوگر مل ہی سنبھال لے۔ پڑھائی وڑھائی تو اس کو کرنی نہیں ہے۔ اچھا یاد سے اس چھورے کو میرے کمرے میں بھیج دو۔"

توقیر شاہ کو موبائل پر مصروف دیکھ کر مردان شاہ اپنی گفتگو سمیٹ کر کمرے سے نکل گئے۔

X...X...

ولید فجر کی نماز کے بعد ہی گائوں جانے کیلیئے نکل گیا تھا۔اس نے پہلے ہونے والی تقریب کی ساری تیاریوں کا جائزہ لیا اور ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد مردان شاہ کے بڑے داماد ہدایت اللہ کی طرف چلا آیا۔ہدایت اللہ سے چند ملاقاتوں کے بعد ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ بھی فدا حسین سے کم لالچی نہیں ہے۔تاہم فدا حسین کی طرح جذباتی اور کم عقل نہیں تھا۔ ٹھنڈے دھیمے مزاج کا قدرے شاطر اور عیار شخص تھا۔

فدا حسین کو مردان شاہ کی نظروں سے گرانے میں ہدایت اللہ نے خاصا اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ تو ولید کو اب پتہ چلا تھا۔

بہر حال دولت کی ہوس نے رشتوں کی جڑوں کو اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا۔بظاہر ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھام کر چلنے اور اوپر چڑھنے والے در حقیقت اندر سے بغض، منافرت سے ہو جانے والے سیاہ دلوں کے ساتھ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی تگ و دو

میں تھے۔ہدایت اللہ کی نفرت شو گر کوٹڈ تھی۔بظاہر نظر آنے والی نہیں تھی جبکہ فدا حسین کھلم کھلا زہر افشانی کرتا تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وہ ہدایت اللہ کی کوٹھی سے نکلا تو دھوپ ہر طرف پھیل گئی تھی۔ تاہم دھوپ میں اتنی تیزی اور کاٹ نہیں تھی۔ہوا کے خوشگوار جھونکے دھوپ کی حدت کو کم کر رہے تھے۔

وہ شہر جانے سے پہلے ماسٹر دین محمد کی طرف چلا گیا۔

”سائیں آپ نے زحمت کیوں کی مجھے بلا لیا ہوتا۔“ یوسف اسے دیکھ کر بوکھلا گیا۔

”ایسے تکلف مت کیا کرو یوسف! کیا تم میرے چراغ کے جن ہو کہ میں اسے رگڑ کر تمہیں بلا لیا کروں۔“

اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر شگفتگی سے کہا۔

مگر باوجود کوشش کہ وہ مسکرا نہ سکا۔

اس کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی بلکہ ولید کو دیکھ کر تاثرات کسی حد تک رنجیدگی میں بدل گئے تھے۔

وہ ماسٹر دین محمد کے پاس آ بیٹھا اور سلام دعا کرنے لگا۔

ماسٹر دین بھی کچھ بجھے بجھے سے دکھائی دے رہے تھے اور قدرے مضطرب بھی۔ وہ چارپائی پر پائوں لٹکائے ہاتھ میں تسبیح پکڑے سر جھکائے فرش کو گھور رہے تھے۔

اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو اس نے یوسف کو پھر ماسٹر دین محمد کو بغور دیکھا۔

''کیا بات ہے ماسٹر صاحب! آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔'' اس نے جانچتی نظریں ان پر مرکوز کر دیں۔

یوسف مضطرب سا ہو کر قریب آیا اور موڑھا کھینچ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے یوسف! تم لوگ بتاتے کیوں نہیں ہو۔'' اس نے دونوں باپ بیٹوں کو باری باری دیکھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''کیا بتائوں سائیں! میری تو گردن نہیں اٹھ رہی ہے آپ کے سامنے۔'' ماسٹر دین محمد کی آنسوئوں سے مغلوب آواز بھری۔ اتنی دیر سے وہ شاید آنسو ہی ضبط کر رہے تھے۔

وہ اپنا موڑھا کھینچ کر ماسٹر دین محمد کے قریب چلا آیا اور ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

''یہ کیسی بات کر رہے ہیں آپ... پلیز کھل کر کہیں۔''

یوسف نے باپ کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کر لب کاٹنے لگا۔

''بات یہ ہے سائیں کہ میں آپ سے معذرت خواہ ہوں میں فیتہ نہیں کاٹ سکوں گا۔ دیکھو سائیں میں بڑا مجبور ہوں۔'' وہ یکدم رو پڑے۔

''تم غلط مت سمجھنا۔ بس... بس میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ میں ایک ادنیٰ، حقیر، ذلیل سا شخص اتنی بڑی عزت اور شرف کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''

ولید کے اعصاب کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے نئے سرے سے ماسٹر دین محمد کو دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر انہی نظروں سے یوسف کو دیکھا جو نظریں ملنے پر جلدی سے نظریں چرا گیا۔

"اصل بات کیا ہے۔ماسٹر صاحب! آپ کب میری نظروں میں حقیر ہیں۔بلکہ ہم سب انسان ہی اپنے رب کے سامنے حقیر اور بے توقیر ہیں۔" اس نے بڑی نرمی سے ماسٹر دین محمد کی کمر پر ہاتھ رکھا۔

"آپ خود کو کمتر سمجھنے نہیں لگے ہیں۔یقیناً سمجھائے گئے ہیں۔" اس نے ان کی کمر پر ہلکی سی تھپکی دی۔

"مجھے کھل کر بتایئے کس نے دباؤ ڈالا ہے۔آپ پر۔" اس کا لہجہ نرم مگر بھنچا بھنچا سا تھا۔

ماسٹر دین محمد یکدم سسکنے لگے۔

ان کے نسوئوں میں ایسی بے بسی تھی جو ولید کے دل کے آر پار ہو گئی تھی۔وہ موڑھے سے اٹھ کر یوسف کی طرف آیا اور دیوار پر ہاتھ رکھ کر یوسف کے جھکے سر پر نگاہیں جھکا دیں۔

ماسٹر دین محمد کے چھوٹے سے آنگن میں تین نفوس کی موجودگی کے باوجود ایک مضمحل سا سکوت اتر آیا۔اس سکوت کو وقفے وقفے سے ماسٹر دین محمد کی سسکیاں توڑ رہی تھیں۔پھر شاید ولید کی نگاہوں کی تپش سے گھبرا کر یوسف بول اٹھا۔

"بابا کو توقیر شاہ کے آدمی اٹھا کر لے گئے تھے' پرے نالے کی طرف اور انہیں دھمکی دی تھی کہ وہ آپ کے سکول کے افتتاح کا فیتہ نہ کاٹیں بلکہ اس تقریب میں شامل ہی نہ ہوں اور ساتھ ہی انہیں گندے پانی میں لٹا کر..."

یوسف کرب سے لب دبا کر چپ ہو گیا اس کی آواز جکڑنے لگی۔شاید آنسوئوں اور غصہ نے بیک وقت اس کی رگوں میں طوفان مچانا شروع کر دیا تھا۔مگر اب کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔

ولید کی رگوں میں جلن ہونے لگی۔اسے اپنے سارے جسم میں اینٹھن ہوتی محسوس ہوئی۔

ماسٹر دین محمد کی سسکیاں دم توڑ گئی تھیں شاید ان کے کمزور بدن میں مزید سسکنے کی بھی سکت نہیں تھی۔وہ سر اٹھا کر اپنی ڈبڈباتی آنکھوں کو اپنے کندھے کے رومال سے پونچھنے لگے۔

"ماسٹر صاحب! آپ نے...یوسف تم بھی اتنے بے بس ہو گئے۔" اس نے ماسٹر دین محمد کی طرف بڑھتے بڑھتے یوسف کی طرف انتہائی حیرت اور دکھ سے دیکھا۔

"ہم کب بے بس نہیں ہیں ولید صاحب!" یوسف مجروح انداز میں ہنس کر موڑھے سے کھڑا ہو گیا۔

''ہم تو ان کے باڑے کے مویشی سے بھی گئے گزرے ہیں۔ وہ تو ایک دفعہ ذبح ہوتے ہیں ہم جیسے تو بار بار مرتے ہیں۔''

''مت کرو ایسی کمزوری اور لاچاری سے بھری باتیں۔'' ولید نے اس کی بات کاٹ دی۔

یوسف بے چارگی اور کرب سے لب کاٹنے لگا۔

''جب تک ہم خود کو کمزور سمجھیں گے۔ کمزور رہیں گے۔ کیوں' کیوں آپ لوگوں کو اپنی اہمیت کا احساس نہیں ہے۔ ماسٹر صاحب! چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے اگر اسے دبائو تو۔'' اس نے انتہائی رنج' دکھ اور بے بسی سے اس موڑھے پر لات ماری جس پر کچھ دیر پہلے یوسف بیٹھا تھا۔

''چیونٹی اس لیے کاٹ لیتی ہے کہ وہ آزاد ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں سوائے انسان کے سب آزاد ہیں۔'' ماسٹر دین محمد ناتواں سی آواز میں بولے اور فرش کو گھورنے لگے۔

انہیں اس قدر پژمردہ اور ناتواں دیکھ کر اس کے دل پر ضرب پڑی۔ یہ سچ تھا۔ یہی حقیقت تھی جو ماسٹر دین نے بیان کی تھی۔

یوں تو وہ ان وڈیروں' جاگیرداروں اور ہر بااختیار لوگوں سے ہر طرح کے رویوں' حرکتوں اور سنگدلانہ اقدام کی توقع رکھتا تھا۔ اس طرح کے واقعات سے اخبارات بھرے پڑے تھے۔ لیکن اس واقعہ نے اسے ذہنی طور پر ذہنی صدمہ اور دلی رنج پہنچایا تھا۔ ایک بوڑھے ناتواں کی اس دل آزردگی کو اس کا دل بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

اس کا سارا جوش افسردگی میں ڈھل گیا۔ وہ کتنی دیر افسردگی کے سحر میں جکڑا ماسٹر دین محمد کی طرف دیکھتا رہا' پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا ان کے نزدیک آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔

ماسٹر دین محمد کا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھوں سے اشک بے آواز بہہ رہے تھے۔ جو ان کی سفید داڑھی کو بھگو رہے تھے۔

''جو شخص سب سے بڑا معزز' سب سے بڑا حاکم اور سب سے بڑھ کر دولت مند ہے وہ اس مفلس گمنام آدمی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں' جس نے سب سے زیادہ فرض ہمدردی خلائق ادا کیا۔ آپ کا درجہ بہت بلند ہے ماسٹر صاحب!'' اس نے ماسٹر دین کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر تسلی بھرا دبائو ڈالا۔

"کسی بزرگ کا قول ہے کہ "علم طاقت ہے ایک عالم میں لاکھ جاہلوں کے برابر طاقت ہوتی ہے۔" تو بس آپ کمزور کیسے ہو گئے۔ آپ بہت طاقتور ہیں ماسٹر صاحب! اگر دولت سے طاقت اور بادشاہت قائم رہ سکتی تو فرعون کو موسیٰ کے ہاتھ ایسی ذلت آمیز شکست نہ ملتی' اگر خدا کی نظر میں دولت اور دنیاوی بادشاہت اتنی قابل چیزیں ہوتیں تو یہ فرعون اور نمرود جیسوں کو نہیں ملتیں بلکہ انبیاء علیہم السلام کا ورثاء ہوتیں' مگر انبیاء کا ورثائ' درہم و دینار نہیں صرف علم تھا جو آپ کے پاس ہے۔ آپ کو مردان علی شاہ جیسے جاہلوں پر ایسی فضیلت ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کو تمام تاروں پر۔"

ماسٹر دین محمد نے دھندلائی آنکھوں سے ولید کا تسلی بھرا چہرہ دیکھا اور کندھے پر اپنا کانپتا ہاتھ رکھ کر بے اختیار سسک پڑے۔

مگر اب ان آنسوئوں میں پژمردگی' رنجیدگی' حزن اور دل گرفتگی نہیں تھی بلکہ دنیا کی اس بے ثباتی۔ اپنی کم عقلی پر رونا آرہا تھا۔

ولید ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکنے لگا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اسی طرح ہوتا ہے ماسٹر صاحب! بزرگوں نے فرمایا ہے نا کہ کمینے شخص کو جب دولت مل جاتی ہے تو وہ کمینے طریقوں ہی سے اس کو خرچ بھی کرتا ہے۔ خدا کا خوف یا بندوں کی شرم کی کوئی چیز بھی اس کو اپنی بے راہ روی سے نہیں روک سکتی' کیونکہ پانچ کیل اس کے جسم میں گڑ جاتے ہیں۔ ایک کیل تو اس کی گردن میں گڑتا ہے جس سے وہ ہمیشہ اکڑتا اور گردن فرازی کرتا ہے' دو کیل اس کی آنکھوں میں گڑ جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ بھلائی اور برائی کو نہیں دیکھ سکتا' دو کیل اس کے کانوں میں گڑ جاتے ہیں جس کے باعث وہ کسی کی نصیحت بھی نہیں سنتا اور اندھا دھند جو جی میں آئے کر گزرتا ہے' آخر میں ایک کیل قدرت کی جانب سے اس کی جائے نشست میں ٹھونکا جاتا ہے جس کی سختی سے یہ پانچوں کیل فوراً باہر گر جاتے ہیں پھر اس کی گردن بھی جھک جاتی ہے' آنکھوں کو بھی صحیح طور پر استعمال کر کے راہ راست پر چلتا ہے اور اس کے کان بھی نصیحت پذیر ہو جاتے ہیں مگر یہ بعد از وقت ہوتا ہے۔

آنچہ دانا کند کند ناداں

لیک بعد از خرابی بسیار"

وہ اپنے جملوں اور لہجے کی چھائوں سے ماسٹر دین محمد کے اندر کی حدت اور ان کی دھوپ کو کم کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ چپ ہوا تو صحن میں کچھ لمحے خاموشی طاری رہی ایک سحر سا یوسف اور ماسٹر دین محمد کے دل پر طاری رہا جو ولید کے انداز بیاں کا تھا' اس کی باتوں کا یا پھر اس کی دل آویز شخصیت کا۔

ماسٹر دین محمد دھیرے سے مسکرائے' ان کی مسکراہٹ میں ولید کیلئے اپنائیت' محبت' عقیدت تھی ان کی نظریں ولید پر جمی تھیں پھر آہستہ آہستہ ان کا ذہن کسی اور دھیان میں اڑنے لگا۔

''بالکل ایسی ہی باتیں کرتا تھا وہ۔ ایسا ہی سحر تھا اس میں بھی۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولے جیسے ماضی کی کسی اتھاہ میں جھانک رہے ہوں۔

ولید نے چونک کر ان کی طرف دیکھا' ماسٹر دین محمد نے نظروں کا زاویہ بدل کر جلدی سے سر جھٹکا اور مبہم سے انداز میں مسکرا دیئے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''یونہی کبھی کبھی کچھ یاد آجاتا ہے۔ تمہیں دیکھ کر تو ماضی کی خوبصورت یادیں ذہن اور دل پر سایا کرنے لگتی ہیں۔ خیر چھوڑو تم' پھر مجھے کھو گے کہ میرا کیس نفسیاتی ہے۔ میں پھر تم میں کسی اور کو کھوج رہا ہوں۔''

ولید بے ساختہ مسکرا دیا۔

پھر وہ تینوں شگفتہ ماحول میں چائے پینے لگے۔ یوسف کی والدہ نے پکوڑے اور پوریاں چٹنی کے ساتھ اندر سے بھیجیں۔ وہ کھائیں اور جب جانے لگا تو ماسٹر دین محمد ایک بار پھر غم سے مغلوب ہو کر بولے۔

''مجھے معاف کر دینا سائیں! میں' میں اگر ایک جوان بچی کا باپ نہ ہوتا تو مردان شاہ کے کتوں سے بالکل بھی نہ ڈرتا مگر میں اس تقریب میں شامل ضرور ہوں گا۔''

''ہاں سائیں! شامل ہونے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔'' یوسف بھی عزم سے بولا۔

ولید ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے مسکرا دیا۔

"اس کیلئے بھی میں آپ کو مجبور نہیں کرتا ماسٹر صاحب! اس لیے کہ میں ایک حقیر بندہ ہوں سو یہ دعویٰ کیسے کروں کہ وہ آپ کا بال بھی بیکا نہیں کرے گا اور یہ کہ میں آپ کی حفاظت کی ضمانت لیتا ہوں، نہیں یہ فرعونی دعویٰ ہوگا، میں بندہ بشر یہ تک نہیں جانتا کہ کل میرے ساتھ کیا ہو جائے گا اور یہ تقریب کس طرح اپنے اختتام کو پہنچے گی، مجھے بھلا آپ سے شکوہ کیونکر ہوگا۔"

اس نے ان کے کندھے پر تھپکی دی اور ہلکی سی سانس بھری۔

"اپنی عزت نفس کی حفاظت آپ کا جائزہ حق ہے چلیے دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔" وہ ماسٹر دین محمد کے چھوٹے سے گیٹ سے سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

X...X...X

اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی بیک سے سر لگا کر لمبی گہری سانس بھرتے ہوئے ذہن کی تنی طنابوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اپنے اعصاب کو پر سکون رکھنے کی شعوری کوشش کرنے لگا پھر سر جھٹک کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔ مگر باوجود فاسٹ ڈرائیونگ کے اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا اس کی آنکھوں میں سوچ کا جال بچھا ہوا تھا۔

جیب میں پڑا موبائل بجا تو وہ چونکا اور گاڑی کی سپیڈ آہستہ کرتے ہوئے موبائل نکالا۔ دوسری طرف سکندر تھا۔

"کہاں ہو شہزادے! صبح تمہاری طرف آیا تو پتہ چلا موصوف ارلی مارننگ پکے مسلمان کی طرح تلاش معاش میں نکل گئے ہیں۔ بائی دی وے یہ اتنی صبح کدھر منہ اٹھا کر چل دیئے اور اس وقت کہاں ہو۔" وہ چھوٹتے ہی شروع ہو گیا۔

"اس وقت میں ایک ہری بھری پگڈنڈی سے گزر رہا ہوں۔" اس نے مسکراہٹ دبا کر اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اوئے ہوئے۔ پگڈنڈی۔ گویا فلمی سچویشن سے گزر رہے ہو۔ یقیناً اب سامنے سے ایک مٹیارن سج سج کر خراماں خراماں چلی آ رہی ہو گی اور ٹاکرا یقینی ہے اور تم اسے دیکھ کر بے ساختہ گانے کی کوشش کرو گے یا ہو سکتا ہے میرے رابطہ کرنے سے پہلے گا ہی رہے ہو۔

"پائل جھنکاتی تم آ جاؤ جیون میں۔"

ولید بے ساختہ امڈنے والا قہقہہ نہ روک سکا اور جلدی سے بولا۔

"سوچ سمجھ کر بولو۔ میں گاڑی میں ہوں اور خراماں خراماں آنے والی کا کیا حشر ہو سکتا ہے اس ٹاکرے سے۔"

"اف کبھی تو حقیقت پسندی سے بھی نکل آئو ولید! کس قدر خوبصورت' سحر انگیز اور رومانی تصور کو تم نے کریش کیا ہے۔" اس نے ایک مصنوعی قسم کی افسردہ سانس بھری۔

"زیادہ غیر حقیقت پسند بننے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بتائو اس وقت تم کہاں پر ہو اور صبح صبح کیا افتاد آپڑی کہ میرے غریب خانے بھاگے بھاگے آئے۔"

"آں ہا۔ کیا عاجزی انکساری ہے بندے میں۔" اس کے غریب خانہ کہنے پر سکندر نے ایک اور طویل قسم کی سانس کھینچی۔ پھر بولا۔

"کام تھا تبھی تو تمہارے امیر خانے دوڑ کر آنا پڑا۔ ورنہ صبح صبح میں ایسی شکلیں نہیں دیکھتا۔"

"ہاں بھئی۔"

سبھی اپنی اپنی غرض سے ملتے ہیں فراز

مزا تو جب ہے کوئی بے سبب ملا کرے

ولید نے اس سے بھی طویل قسم کی سانس بھری سکندر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اچھا یہ بتائو۔ شہر کب تک پہنچ رہے ہو' میرا خیال ہے اب تک تو اس رومانی قسم کی پگڈنڈی کو کراس کر چکے ہو یا وہیں سٹے کرنے کا ارادہ ہے۔"

"بہت فضول بکنے لگے ہو سکندر... میرے پاس اس وقت تمہارے لیے بالکل بھی ٹائم نہیں ہے۔" اس نے آستین جھٹک کر کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

"تین بجے اسلام آباد کی فلائٹ ہے وہاں سے واپسی پر ہی تمہاری صورت مبارک کو دیکھوں گا۔ اگر زندہ رہا تو۔ کہتے ہیں نا یار زندہ صحبت باقی۔"

"ایں اسلام آباد... کیوں خیریت؟ یہ اچانک وہاں جانے کی کیا سو جھی پرسوں تو تمہارے سکول کی اوپننگ ہے۔" سکندر ٹھٹکا۔

"رات ہی واپسی بھی ہو جائے گی۔" اس نے گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی اور بولا۔

"میرا خیال ہے ایک وقت میں ایک ہی کام انجام دوں تو زیادہ بہتر ہے۔" اسے ٹوٹی پھوٹی سڑک پر گاڑی چلانا مشکل ہو رہی تھی بار بار توجہ ہٹ رہی تھی۔

"بات سنو' بات سنو... موبائل بند مت کرنا۔" سکندر اس کا ارادہ بھانپ کر زور سے چیخا۔ اس نے جھٹکے سے اسے کان سے ہٹایا پھر یوں گھورا جیسے یہ موبائل نہ ہو خود سکندر ہو۔

"مائی ڈیئر! تم ایک وقت میں دو کام تو آل ریڈی کر ہی رہے ہو اور مجھے پورا یقین ہے تم اس رومانی پگڈنڈی پر ابھی تک ٹھہرے ہوئے ہو۔"

"سکندر یو..."

مگر دوسری طرف سکندر فون رکھ چکا تھا۔ وہ بے اختیار موبائل کو گھورتا ہوا ہنس پڑا اور ایک ہلکی سے سانس بھر کر موبائل برابر کی سیٹ پر ڈال دیا۔

دل پر پھیلے افسردگی کے صحرا پر اس شریر دوست نے اپنی خوشگوار باتوں سے ٹھنڈک سی بھر دی۔ اندر کی تپش پر بوندیں سی گری تھیں۔

اس نے بڑی محبت اور عقیدت سے سکندر کے بارے میں سوچا اور مسکرانے لگا۔

اچانک اس کا ذہن شہرینہ کی طرف چلا گیا۔

پورے تین بجے اس کی اسلام آباد کی فلائٹ تھی۔ اسلام آباد کا پروگرام اسے اچانک بنانا پڑا تھا۔ صرف شہرینہ کی وجہ سے۔ اس کا خیال تھا وہ جہانگیر کے ساتھ ہی واپس آ جائے گی مگر اس کے وہیں رہ جانے بلکہ لمبے ہی پروگرام کا سن کر خاصا کوفت کا شکار ہو گیا۔

"کتنا تنگ کرتی ہو شیری! بالکل بچوں کی طرح۔" اس کے تصور میں اس کا معصوم حسن بکھر آیا۔

"لگتا ہے اب میری قربت ہی تمہیں بڑا کرے گی۔"

اس نے بے ساختہ لب دانتوں میں دبا کر اپنے خیالوں اور سوچوں سے پھیلنے والی مسکراہٹ کو روکا تھا۔

اس کا بگڑا خفا خفا برہم چہرہ اس کے تصور کے پردوں پر لہرا رہا تھا۔

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا

کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

پتھر مجھے کہتا ہے میرا چاہنے والا

میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

ایک خفیف سی سانس اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔اس نے ذرا سا چونک کر اپنے اطراف نگاہیں دوڑائیں تقریباً شہر کی حدود شروع ہو چکی تھی۔

X...X...X

وہ گھر آیا تو آغا جی کو اپنا منتظر پایا۔

"ولید! کل تک تو تمہارا اسلام آباد کا کوئی پروگرام نہیں تھا اور آج اچانک۔" وہ اس کے کمرے میں چلے آئے۔ان کی یہ حیرت بھی بجا تھی۔

"ہاں کل تک وسیم کا ارادہ تھا اسلام آباد جانے کا اور میرا خیال تھا شہرینہ اس کے ہمراہ ہی آجائے گی۔ مگر اب وسیم کا آج جانے کا پروگرام نہیں ہے اور میرا نہیں خیال کہ وہ اس کے ساتھ آئے گی۔وہ شرٹ کے اوپری بٹن کھولتا ہوا اپنی وارڈروب کی طرف بڑھا۔

"کیا۔کیا مطلب تم شیری کو لینے جارہے ہو۔" آغا جی دنگ رہ گئے۔

اس نے بے ساختہ مسکراہٹ کو دبایا اور قدرے سنجیدگی کے ساتھ کپڑے ادھر ادھر کرتے ہوئے اپنی بنیان ڈھونڈتے ہوئے سر ہلادیا۔

"میرے خدا ولید تم اس لڑکی کو کیوں تنگ کرتے ہو۔" آغا جی سر پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئے۔

"کیا مطلب؟ میں تنگ کرتا ہوں اسے؟ آپ کو نہیں پتہ وہ کتنا پریشان کرتی ہے مجھے۔"
اسے نے بنیان کندھے پر ڈالی اور ہینگر میں لٹکتا سیاہ شلوار سوٹ نکال کر وارڈروب بند کر دیا۔

آغا جی سے نظریں ملیں تو اس نے سرعت سے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا اور وارڈروب کا دوسرا ڈور کھول کر تولیہ نکالنے لگا۔

"آخر تم دونوں یہ چوہے بلی کا کھیل کب تک کھیلتے رہو گے۔" آغا جی اٹھ کر اس کے نزدیک چلے آئے۔

"ولید!" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

ولید کو ایک پل کیلئے اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے تو لیے پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ مگر دوسرے پل اس نے ایک گہری سانس بھری اور کندھے اچکا کر سیدھا کھڑا ہو کر وارڈروب کا دروازہ بند کر دیا اور آغا جی کی طرف پلٹا۔

"آخر وہ اس گھر کی فرد ہے آغا جی! اسے میری خوشی میں شامل ہونا چاہیے' کیا آپ شیئر نہیں کر رہے میری اس خوشی کو' انکل نہیں کر رہے پھر وہ کیوں نہیں؟"

"یہ خوشی نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" آغا جی نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

وہ سر ہلا کر ان کی سنجیدگی بلکہ اس رنجیدگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہنس دیا۔

"کیا بات ہے؟ آج مزاج یار برہم بلکہ زیادہ ہی برہم لگ رہا ہے۔ ویسے راز کی بات ہے آپ کی لاڈلی پوتی کا بھی موڈ کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے آج کل۔ بلی کی طرح ادھر ادھر ٹکریں مارتی پھر رہی ہے۔"

اس کا انداز شرارتی تھی۔ آغا جی نے دیکھا وہ ہونٹوں کے گوشوں سے پھسلنے والی مسکراہٹ کو بہ مشکل روک رہا تھا۔

انہوں نے مصنوعی کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے جونہی اپنی سٹک اوپر اٹھائی وہ تیزی سے باتھ روم کی طرف بھاگا۔

"یقین کریں مجھے تو وہاں جاتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے دروازہ بند کرتے کرتے انتہائی خوفزدہ سی شکل بنائی اور جھپاک سے دروازہ بند کر دیا۔

آغا جی بند دروازے کو گھورتے ہوئے بے ساختہ ہنس دیئے۔

X...X...X

بھابی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو وہ رائٹنگ ٹیبل پر سر رکھے نظر آئی۔ ان کے دل پر چوٹ سی پڑی۔

"شیری! میری جان!" ان کا میٹھا ٹھنڈا لمس محسوس کر کے وہ چونک گئی۔

"سوچ سوچ کر خود کو کیوں ہلکان کرتی ہو؟ خوش رہنے کی کوشش کرو شیری! میں نے تمہارے لیے ہی تو پکنک کا یہ پروگرام بنایا ہے اور تم نے ہومی کو منع کر دیا۔" وہ اس کے بالوں کو انگلیوں سے سہلانے لگیں۔

"بس یونہی... کیا کروں گی وہاں جا کر۔

جب دل ہی بجھ گیا ہو تو کس کام کے چراغ۔"

اس نے میز کی سطح پر نظریں جما دیں۔ پھر ہلکی سانس بھر کر دوپٹے کے کنارے سے چہرہ پونچھنا چاہا کہ بھابی نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اونچا کر دیا اور جیسے یکدم یاسیت کی لپیٹ میں آ گئیں۔

"کیا ہو گیا ہے شیری! کیوں ہو گئی ہو ایسی؟ کس کی نظر لگ گئی تمہاری ہنسی کو؟" وہ اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ پونچھنے لگیں۔

"پگلی رو رہی تھیں؟"

"بس اب تو چند خوشگوار لمحوں کی بھاری قیمت ادا کر رہی ہوں۔ تتلی سمجھ کر جسے پکڑا' پھول سمجھ کر چھوا۔ وہ تو سلگتا دہکتا انگارہ نکلا۔ پوری ہستی کو بھسم کر دینے والا انگارہ۔"

وہ ان کا ہاتھ تھام کر زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی مسکراہٹ میں اس کی متورم آنکھیں ساتھ نہ دے سکیں۔

"چلو آئو۔ شاپنگ کر آتے ہیں' مجھے بہت سی چیزیں لینی ہیں۔"

بھابی اس کے بال سہلاتے ہوئے بولیں۔

"وسیم کا فون آیا تھا وہ کل آ رہے ہیں مجھے لینے۔ تمہارا کیا پروگرام ہے۔"

"نہیں' میں ابھی کچھ دن اور رہوں گی یہاں۔ اچھی لگتی ہے یہاں کی خاموشی۔" وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔ بھابی اس کا چہرہ تکنے لگیں۔

اندر کا شور بہت بڑھ جائے تو عموماً باہر کی خاموشی میں پناہ ڈھونڈنے لگتا ہے انسان' انسان کے اندر سناٹے اترے ہوں تو باہر کے شور میں گم ہونا چاہتا ہے۔

"کیوں پریشان کرتی ہو اپنے آپ کو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ محبت سے اس کا ہاتھ تھپکنے لگیں۔

پتہ نہیں ہر اپنے محبت کرنے والے کے پاس ایسی ہی تسلیاں کیوں ہوتی ہیں۔

وہ مضمحل سی سانس بھر کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

ان کے بے حد اصرار پر وہ ان کے ہمراہ شاپنگ سنٹر چلی آئی حالانکہ اسے نہ تو کسی چیز کی ضرورت تھی نہ طلب۔ اب تو پوری ہستی بس ایک طلب بن کر رہ گئی تھی۔

طلب بھی ایسے جیسے

صحرا کو موسلا دھار اور مسلسل بارش کی' پر کٹے مفلوج پرندے کو نرم و نازک پروں کی

خزاں کی زد میں آئی خشک بنجر ٹہنیوں کو ہرا بھرا ہونے کی

وہ بھابی کے محبت بھرے اصرار کو ٹال ہی نہ سکی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے ہر طریقے سے بہلانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں اور وہ اتنی ناقدری ناشکری نہیں تھی کہ محض ایک شخص کیلئے اتنی سچی بے غرض محبتوں سے دامن جھٹک لیتی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس نے تو چند ایک چیزیں ہی لیں جبکہ بھابی کی لسٹ خاصی طویل تھی۔ وہ دونوں سامان سے لدی پھندی لوٹیں۔ بھابی نے شاپرز کامن روم کے صوفے پر ہی پھینکے اور سینڈلوں کو جھٹکے سے اتارا پھر شاپرز کھولنے لگیں۔

"دیکھا شیری تم نے ٹیلر کمبخت نے میرے پرپل سوٹ کا کیسا ناس مارا ہے' دل خاک ہو رہا ہے میرا۔"

شہرینہ چادر اتار کر صوفے پر نیم وا لیٹے لیٹے مسکرائی۔ سوٹ کا واقعی بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا تھا اس نے۔ اسے ہنسی تو بہت آئی مگر ان کا دل خراب نہ ہو اس لئے چھپا گئی۔

"آ گئیں تم دونوں۔" ممانی جان اندر داخل ہوئیں۔

"دیکھیں امی میرا یہ سوٹ۔" بھابی نے اپنی شرٹ کا ڈیزائن ممانی کو دکھانا چاہا مگر وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔

"ولید آیا ہوا ہے میں نے کہا وہ دونوں شاپنگ پر گئی ہیں اب خدا جانے کب واپسی ہو۔ چلو اچھا ہوا تم لوگ جلدی آ گئیں۔"

ولید کی آمد پر دونوں چونکیں۔ بھابی نے بے ساختہ شہرینہ کو دیکھا جو عجیب سے احساس کا شکار نظر آرہی تھی۔ اسی دم ہمایوں کے ہمراہ وہ آتا نظر آیا۔

سیاہ شلوار سوٹ میں بے حد نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔ لمبا قد اور بھی بلند اور نمایاں نظر آرہا تھا۔ پیروں میں لیدر کی چپل تھی۔ جو عموماً وہ ساری ایک ہی ڈیزائن کی استعمال کرتا تھا۔

اسے دیکھ کر وہ جھٹکے سے صوفے سے کھڑی ہوئی۔

”آگئیں آپ لوگ رزق بانٹ کر۔“ اس نے ادھر ادھر بکھرے شاپرز پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر بھابی کو دیکھا۔ پھر ہلکے سے مسکرا کر نگاہیں شہرینہ پر جمادی۔

”سوری... مگر سنا ہے کہ بیوقوف بازار نہ جائیں تو آدھے لوگ بھوکے مر جائیں۔“ اس نے باقاعدہ اس کا جائزہ لیا تو اسے یکدم احساس ہوا اور جلدی سے صوفے پر پڑی چادر اٹھا کر کندھے پر ڈال لی۔

”چلو بیوقوف لوگ کسی کو تو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ زیادہ عقل مند اور ذہین فطین سے تو اچھے ہی رہے۔“

بھابی نے کپڑے ایک طرف ڈال دیئے اور صوفے سے کھڑی ہوگئیں۔

”کیسے آنا ہوا۔ بڑی حیرت ہوئی تمہیں یہاں دیکھ کر۔ کیا اسلام آباد والے بے طرح یاد آگئے۔“ ان کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ ہلکا طنز بھی چھلک آیا تھا۔

وہ محظوظ ہو کر مسکرادیا اور صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔

”اسلام آباد والے تو خیر کیا یاد آئیں گے۔ ہمیں تو اپنے ہی شہر والے یاد آنے لگے تھے۔“ اس کی خوبصورت آنکھیں ترچھی ہو کر شہرینہ کا چہرہ جھلسانے لگیں، وہ شاپرز وہیں رکھ کر کچن میں چلی گئی اور خوامخواہ کیبنٹ کھولنے لگی۔

کیوں آگیا یہ شخص؟ جس کا نام، جس کا چہرہ، جس کا خیال تک بھول جانا چاہتی تھی، وہ سراپا مجسم بن کر چلا آیا، جس آگ کو ٹھنڈا کرنے یہاں آئی تھی۔ وہ تیل لیے پھر چلا آیا۔ ’مجھے دو گھڑی چین سے رہنے بھی دوگے یا نہیں ولید حسن!‘ اس نے گلاس اٹھایا اور طلب نہ ہونے کے باوجود فریج سے بوتل نکال کر پانی بھرا۔

”دراصل میں ارجنٹ آیا ہوں۔ اپنی ایک اہم خوشی میں شہرینہ کو شامل کرنے، آخر اپنے ہی تو خوشیاں شیئر کرتے ہیں نا اپنوں کی۔“

اس کی آواز ابھری اور اس کے دل کی دنیا زیر و زبر ہوگئی۔

ایک چھناکا ہوا' گلاس اس کے ہاتھ سے پھسل کر ماربل کی سلیب سے ٹکرایا اور اس کے قدموں میں گر کر کرچی کرچی ہو گیا۔

وہ کون سی خوشی شیئر کرنے آیا تھا اس کے پاس۔

چھناکا خاصا زوردار تھا۔ سب ہی اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور وہ یوں یکدم سب کی نگاہوں کی زد میں آ کر خفیف سی ہو گئی۔

''وہ' وہ دراصل ہاتھ سے پھسل گیا۔''

''ظاہر ہے سر سے تو پھسلنے سے رہا۔'' ہمایوں اس کی بات پر ہنسا۔ ممانی جان اٹھ کر اس کی طرف چلی آئیں جبکہ مونا بھابی کا دل ایک اتھاہ میں ڈوب گیا' دل گرفتگی کی لپیٹ میں آ کر' بالکل چپ چاپ سا ہو کر رہ گیا۔

''کوئی بات نہیں۔ ہو جاتا ہے ایسا کبھی کبھی۔'' ولید اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور بڑی نرم نظر اس پر ڈال کر ادھر ادھر بکھرے کانچ کو دیکھا اور افسوس سے سر ہلایا۔

''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے' گلاس ہی کو کم از کم اپنے اعصاب قابو میں رکھنے چاہئیں تھے۔''

خفت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

گویا اس کے معطل حواس عریاں ہو گئے تھے۔ بس ایک لمحے کی لغزش سے انسان کس طرح عیاں ہو کر رہ جاتا ہے۔

لمحوں میں بکھرے اعصاب قابو میں آتے ہیں مگر ایک لمحے میں بکھر کر جذبوں کی تشہیر کر دیتے ہیں۔

وہ غصے و غم کو اندر ہی دبائے اس کے قریب سے گزر کر کامن روم سے باہر نکل گئی۔

X...X...X

وہ اعصاب شکن احساس کے ساتھ دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ ولید حسن کے دو لفظوں نے اسے لمحہ بھر میں ہی بکھیر دیا تھا۔ خود کو جو جوڑے بیٹھی تھی۔ یوں لگا نئے سرے سے ٹوٹ گئی ہو۔

وہ اپنی خوشیاں شیئر کرنے آیا تھا اس کے ساتھ اور اس کی کوئی اہمیت' وقعت نہیں تھی اس کی نظر میں۔

اس کا دل چاہا اس کا منہ نوچ لے' کپڑے پھاڑ دے اور یہاں سے دھکے دے کر نکال دے۔

اچانک ہی بہت سے آنسو بند توڑ کر بہہ نکلے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ویری سرپرائزنگ۔ میرا تو خیال تھا تم مجھے یہاں دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگو گی۔'' اس کی آواز اس کے عقب سے ابھری تو اس کے بھل بھل بہتے آنسو ٹھٹھر گئے۔

''افسوس! یہاں تو ماتم ہو رہا ہے۔'' وہ سامنے چلا آیا اور قدرے متاسفانہ سی سانس بھری۔

''جیسے میری موت کی خبر پہنچی ہو۔''

''خدا نہ کرے۔'' وہ روتے روتے دہل کر بولی پھر لب دانتوں میں دبا کر چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

''مجھے آپ کے آنے کی خوشی ہے نہ غم اور نہ میں رو رہی تھی۔'' وہ توقف کے بعد قدرے کھسیاہٹ سے بولی تھی۔

''اوہ تو شاید رونے کی پریکٹس ہو رہی تھی۔'' اس نے بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ دبائی تھی۔ جبکہ خفت کی سرخی اس کے رخساروں پر چمکنے لگی۔

''مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اس طرح کی کسی پریکٹس کی۔'' وہ کھڑکی کا پٹ کھول کر تڑخ کر بولی اور خوامخواہ باہر دیکھنے لگی۔

''چلو یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔'' اس کا انداز دعائیہ تھا پھر ٹرائوزر کی جیب سے کچھ تلاش کرتے ہوئے بولا۔

''تم اپنے سامان وغیرہ کی پیکنگ کر لو۔ رات کی فلائٹ سے ہمیں واپس کراچی جانا ہے۔'' وہ چونک کر پلٹی۔

''یہ دیکھو۔'' اس نے ٹکٹ اس کے آگے لہرائے اور اس کی آنکھوں میں جھلکتی حیرت سے قطعی بے نیاز کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے اب تک تو تمہارے اندر کی آب وہوا پر یہاں کی آب وہوا نے اچھا اثر ڈالا ہو گا۔ اسلام آباد کا موسم تو خاصا رومینٹک اور خوبصورت ہو گیا ہے۔'' اس نے باہر دیکھتے دیکھتے یکدم اس کے چہرے پر نگاہیں جمادیں۔

''میرا دماغ خراب نہیں ہو گیا کہ میں آپ کے ساتھ آج جاؤں گی۔'' وہ اپنی حیرت سے نکل کر چیخ کر بولی۔ وہ بے ساختہ ایک سانس بھر کر رہ گیا۔

''اور آج کیا میرا فی الحال کراچی جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ جب تک دل چاہے گا میں یہی رہوں گی اور آنا بھی ہو گا تو پاپا یا وسیم بھائی کو بلوالوں گی۔ بلکہ ہمایوں ہے نا اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' اس کا لہجہ کڑوا اور زہر میں بجھا ہوا تھا۔

''اوہ ہو۔ تو یہاں رہنے کی اصل وجہ بھی غالباً یہی ہے۔'' وہ کھڑکی سے ہٹ کر اس کے نزدیک چلا آیا۔

''کیا... کون سی؟'' اس کے لہجے اور نگاہوں کے انداز پر وہ قدرے سٹپٹا کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر یکدم اسے اپنی پیشانی جلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دل چاہا اس کا مسکراتا چہرہ نوچ لے۔ اس کی اس گھٹیا سوچ پر اس کو گولی سے اڑا دے۔

''میرے یہاں رہنے کا جو بھی جواز ہے سو ہے۔ بہر حال آپ کے ساتھ میں ہر گز نہیں جا رہی کراچی۔'' وہ کسی قسم کی وضاحت کرنے کے بجائے فیصلہ کن لہجے میں کہہ کر اس پر ایک سلگتی نگاہ ڈال کر پلٹ گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ نیم وا آنکھوں سے نہایت پر سکون انداز میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ دیوار گیر پالش کی بڑی سی الماری کا پٹ کھول رہی تھی اور ہینگ کیے کپڑے ادھر ادھر کرتے ہوئے بولی۔

''میں آغا جی سے کہہ کر آئی ہوں کہ جب تک میرا دل چاہے گا میں اسلام آباد رہوں گی۔''

وہ سینے پر بازو لپیٹے دیوار سے ٹیک لگائے نہایت اطمینان سے اب بھی کھڑا تھا۔

''آغا جی نے تو بصد اصرار تمہیں یہاں بھیجا تھا تبدیلی آب و ہوا کیلئے اور میرا خیال ہے چار پانچ دن بہت ہوتے ہیں کسی بھی تبدیلی کیلئے۔''

وہ اس کی طرف چلا آیا اور الماری کا آدھا کھلا ہوا دروازہ پورا کھول کر اس کا بازو پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا۔

''کتنا عجیب لگے گا ذرا سوچو شیری کہ جب میں زبردستی تمہیں کندھے پر لاد کر ایئر پورٹ پہنچوں گا۔ بالکل پنجابی فلموں والا سین ہو جائے گا۔ آئی تھنک پنجابی فلموں میں کچھ اس طرح کے سین ہوتے ہیں نا؟''

اس کا لہجہ شگفتہ ضرور تھا مگر آنکھوں میں سختی اور وارننگ تھی جو شہرینہ کے تن بدن میں آگ لگا گئی۔

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے کھڑا تھا۔

”آپ ہی دیکھتے ہوں گے پنجابی فلمیں‘ میرا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔“ وہ جھٹکا دے کر اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر پیچھے ہو گئی۔

”تو اس میں اتنا دکھی ہونے کی کیا بات ہے۔ دیکھ لیا کرو۔ تمہیں کوئی منع تھوڑا ہی کرتا ہے۔“ اس نے ملائمت سے کہا۔

کمرے میں داخل ہوتا ہمایوں بے ساختہ قہقہہ نہ روک سکا تھا۔

”بہر حال میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہی۔“ وہ بیڈ کے کنارے جا کر بیٹھ گئی اور اپنا غصہ دبانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی غیر سنجیدگی اور اوپر سے ہمایوں کا چھت پھاڑ قہقہہ اسے تپانے کو کافی تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ولید کے چہرے کے نقوش میں یکدم تناؤ آ گیا۔ اس نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا پھر ہمایوں کے ساتھ کھڑی مونا بھابی پر اچٹتی نظر ڈال کر ہمایوں سے بولا۔

”مجھے تمہاری گاڑی ایک گھنٹے کیلئے مل سکے گی۔ ایک دو کام نمٹا کر آتا ہوں۔ اس دوران شہرینہ اپنے سامان کی پیکنگ کر لے گی۔“

وہ ہمایوں کے نزدیک آیا جس نے فوراً سے پیشتر جیب سے اپنی گاڑی کی چابی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی تھی۔

”تھینک یو۔“ اس نے چابی پکڑ لی۔ ”سوری میں آپ کو نہیں لے جا سکتا۔ چونکہ آپ کے مجازی خدا خود کل بنفس نفیس اپنے سسرال تشریف لا رہے ہیں اب میں ان کا یہ گولڈن چانس کیا مس کرتا۔“ وہ بھابی کو دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا۔ بھابی جواباً کچھ کہتیں‘ اس سے پہلے وہ ہمایوں کے ساتھ ہاتھ ہلاتا دروازے سے نکل گیا۔

”دیکھا آپ نے۔ کیا سمجھتا ہے یہ شخص خود کو۔ میں... میں ہرگز نہیں جا رہی اس کے ساتھ۔ ایویں پیکنگ کر لوں۔“ وہ بھابی کو دیکھ کر اپنا ٹمپر لوز کر گئی۔

"شیری! میرا خیال ہے تم اس کا کہنا مان لو اور اس کے ساتھ چلی جائو۔" بھابی نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیا آ... کیا۔" وہ غم وغصے سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"آپ بھی اسی کی حمایت کر رہی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ..."

اس کی آواز بھرا گئی پھر یکدم بھابی کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

مونا بھابی دل گرفتگی سے سانس بھر کر رہ گئیں۔ وہ اس معاملے میں خود کو بے بس اور کسی حد تک مس فٹ محسوس کر رہی تھیں۔

وہ ولید کے دل کا حال نہیں جانتی تھیں۔ اس کے پل پل کے رویے ان کی سمجھ سے باہر تھے اور ادھر شہرینہ کی دل شکستگی، دل گرفتگی بھی ان کیلئے اذیت ناک تھی مگر وہ کسی ایک کی بھرپور حمایت کر کے نادانستگی میں کسی ایک کے ساتھ ناانصافی کی مرتکب بھی نہیں ہونا چاہتی تھیں اور ولید کے تیوروں سے ظاہر تھا وہ شہرینہ کو لے جائے گا اور یقیناً اسے آغا جی کی طرف سے اس کی حمایت بھی حاصل تھی۔

X...X...X

ولید کوئی گھنٹے کے بعد آیا تو وہ سڑ سڑ کرتی جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں اپنے بیگ میں کپڑے ٹھونس رہی تھی۔

"آغا جی بھی حد کرتے ہیں، ہمیشہ اسی کی حمات کی ہے انہوں نے۔"

وہ بھابی کے ہاتھ سے اپنا تہ شدہ سوٹ جھپٹ کر بری طرح بیگ میں ٹھونسنے لگی۔

"اوہو۔ اس کا مطلب ہے آغا جی سے بات ہو چکی ہے۔" وہ دروازے میں کھڑا تھا، اندر چلا آیا۔ اندر کا ماحول اس کیلئے کسی حد تک اطمینان بخش تھا۔

"آپ بات کریں مجھ سے۔" وہ اسے دیکھ کر گویا کاٹ کھانے کو دوڑی اور بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے کوئی آغاجی کو فون وون نہیں کیا۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ان سے بات کرنے کی۔ بس آپ مجھ سے بالکل بات مت کریں۔"

"اتنا لمبا راستہ خاموشی سے کیسے کٹے گا۔" اس نے رحم طلب نظروں سے بھابی کی طرف دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا موبائل آگے کرتے ہوئے بولا۔

"آغاجی سے بات کرو گی؟"

"کر چکی ہوں ان سے بات۔" وہ تڑخ کر بولی پھر لب دانتوں میں دبا لیے۔ وہ ہنکارا بھر کر رہ گیا تھا اور آنکھوں کو اپنے مخصوص انداز میں جنبش دیکر اس کے چہرے کا نہایت پرسکون انداز میں جائزہ لیتے ہوئے ہلکے سے مسکرایا۔

"کیا کہا پھر انہوں نے؟"

" بات سنیں آپ۔ میں اگر آپ کے ساتھ جا رہی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں آپ کی دھونس دھاندلی سے ڈر کر جا رہی ہوں اور نہ میں آپ کی کوئی خوشی شیئر کرنے جا رہی ہوں۔" اس کا انداز ہنوز زہر میں بجھا اور جلا بھنا تھا جیسے کوئی ناراض کم سن بچہ بلبلا رہا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہو۔ جھنجھلا رہا ہو اور حقیقت یہی تھی کہ وہ اس ضدی اور خود سر آدمی کے مقابل خود کو سخت بے بس محسوس کر رہی تھی۔

بھابی نے بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کیلئے چہرہ الماری کی طرف کر لیا اور اس کی چادر ہینگر سے نکالنے لگیں۔ وہ بیگ وہیں پٹخ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

"ولید!" وہ بھی کمرے سے جانے لگا کہ بھابی نے ہولے سے پکارا۔ وہ ان کی آواز پر رک کر پلٹا۔ وہ شہرینہ کی چادر تھامے اس کی طرف بڑھیں۔

"ایسی کون سی خوشی مل رہی ہے تمہیں جسے اتنا راز رکھ رہے ہو۔ اتنا سسپنس پھیلا رہے ہو۔" وہ اپنے خدشات دبا کر بظاہر شگفتگی سے بولیں۔

"سسپنس... اچھا۔" وہ ان کی بات پر خفیف سی حیرت سے ہنس دیا۔ پھر کندھے اچکائے۔

"سسپنس وسپنس تو خیر میں نہیں پھیلا رہا اور بقول آغاجی کے جسے میں خوشی کہہ رہا ہوں وہ خوشی ہرگز نہیں ہے ان کے لیے۔" یہ کہہ اس نے سرسری نظر ان کے چہرے پر ڈالی۔ اس کی بات پر بھابی کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

(یہ کیسی خوشی تھی کہ آغا جی خوش نہیں تھے۔ تو کیا؟)

ان کا دل مانوس سے خوف اور اندیشوں میں گھر گیا۔

"دعا کیجئے گا راستہ خیر و عافیت سے کٹ جائے۔" وہ ان کے دل کی حالت سے بے خبر قطعی غیر سنجیدگی بلکہ مصنوعی گھبراہٹ کا تاثر چہرے پر سمو کر بولا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مگر وہ مسکرا بھی نہ سکیں۔

X...X...X

سوگوار لوگوں کو، بے قرار لوگوں کو

زندگی میں کوئی بھی، ضابطہ نہیں ملتا

روح کی زمینوں پر اک عجیب عالم ہے

درد اور تمنا میں فاصلہ نہیں ملتا

تانیہ پر ایک عجیب بے کلی طاری تھی۔

جب سے اکبر شاہ کے گھر سے آئی تھی کسی پل قرار نہیں تھا۔

یہ احساس جرم کچوکے لگا رہا تھا کہ اسے اکبر شاہ کے ہمراہ اس کے گھر میں نہیں جانا چاہئے تھا۔

لاکھ وہ اس کی محبت ہے، اس کیلئے مخلص ہے مگر وہ جس ماحول کی پروردہ تھی، جس ماحول اور گود میں آنکھیں کھولی تھیں وہاں کی حدیں اسے اتنی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ یہ تو دل کی کھلی بغاوت تھی اور بغاوت... نہیں بغاوت تو سکون اور اطمینان کی موت ہے۔

بغاوت میں آسودگی، خوشی نہیں

بے چینی، اضطراب اور بے اطمینان ہوتی ہے

وہ چھت پر ٹہل ٹہل کر تھک گئی تو نیچے اتر آئی۔ تخت پر نادیہ آپی اماں کے کرتے کی ترپائی کر رہی تھیں۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اس نے سرعت سے ان کی خاموش نظروں سے نگاہیں چرالیں۔

شاید انہی کی یہ نگاہیں تھیں جو اسے احساس جرم کے پاتال میں دھکیلتی رہتی تھیں۔

اس نے بارہا انہیں نومی سے یہ کہتے سنا کہ...

جو کام چھپ کر کیا جائے وہ گناہ ہے

جو ضمیر پر بوجھ بنے' اس سے دور رہو وہ آگے جا کر مکمل نا آسودگی اور بے سکونی کا موجب بنے گا۔

جس کام کے بعد اضطراب روح پر چٹکیاں لے اس کام کو فوراً سے پیشتر چھوڑنے میں ہی عافیت ہے۔

پتا نہیں ان کی ساری باتیں اسے کیوں یاد آنے لگی تھیں۔

''لائیں میں کر دیتی ہوں۔'' وہ ان کے نزدیک بیٹھ گئی۔شاید ان کی خاموش دہکتی نظروں سے بچنے کیلئے۔

''نہیں تم رہنے دو۔ تمہیں فرصت کہاں ہے اپنی پڑھائی سے۔'' وہ بظاہر نرمی سے کہہ کر ریل سے دھاگا توڑنے لگیں مگر اسے لگا وہ اس کے اندر جھانک کر کہہ رہی ہوں۔وہ نظریں چرانے کے باوجود ان سے نظریں نہ چرا پا رہی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اندر کا خلفشار بڑھنے لگا۔یہ اس کے اندر کا چور تھا ورنہ وہ تو اپنی سادگی سے پوچھ رہی تھیں۔

''اور سناؤ ایگزیم کی تیاری کیسی ہو رہی ہے؟''

''آں...ہاں۔اچھی ٹھیک ٹھاک ہو رہی ہے۔'' وہ چہرہ جھکا کر کلائیوں میں پڑی نیلے رنگ کی کانچ کی چوڑیوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''کچھ آرام بھی کر لیا کرو۔سارا دن کتابوں میں مغز کھپاتی رہتی ہو۔'' وہ چونکی۔ان کا نرم مہربان ہاتھ اس کے کندھے پر تھا۔اس نے بے ارادہ پلکیں اٹھا کر انکے چہرے کی طرف دیکھا جہاں محبت اور شفقت کی مہربان چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔

اس کا دل ندامت کی گرد سے جیسے اٹ کر رہ گیا۔اس نے بہ سرعت پلکوں کی باڑھ جھکالی۔اعصاب کھنچے ہوئے محسوس ہونے لگے۔تاہم وہ زبردستی مسکرانے میں کامیاب ہو گئی۔

''کہاں بس... جیسی تیسی تیاری ہو رہی ہے۔'' وہ گھبرا کر تخت سے اتر کر رسی پر لٹکے سوکھے ہوئے کپڑے اتارنے لگی۔

''تائی! آج میں نے بہت اچھی کتاب پڑھی تھی اس میں کچھ باتیں بڑی اچھی لگیں مجھے۔''

اس کا ہاتھ رسی پر لٹکتے اماں کے دوپٹے پر ٹھٹک گیا۔ وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"اس میں لکھا تھا 'عورت کی مثال فضائوں میں لہراتی پتنگ کی سی ہے جو اوصاف کردار کی ڈور کے سہارے آکاش کی وسعتوں میں جھولتی رہتی ہے۔ جب تک یہ ڈور صحیح و سالم رہتی ہے۔ وہ رفعتوں میں پرواز کرتی رہتی ہے اور جب یہ ڈور ٹوٹ جاتی ہے تو ہوا کے دوش پر پستی کی طرف جانا شروع کر دیتی ہے۔"

وہ یکلخت گم صم کھڑی رہ گئی۔

"کتنا سچ کہا ہے۔ ہاں عورت کا ایک غلط اٹھایا ہوا قدم اسے پستی میں اتار دیتا ہے۔ میرے نزدیک عورت قیمتی پرفیوم کی بوتل کی طرح ہے۔ اگر اس کا ڈھکن بند رہے تو اس کی قیمت اس کی قیمتی خوشبو محفوظ رہتی ہے مگر بے احتیاطی سے ڈھکن کھلا رہ جائے تو خوشبو اڑ جاتی ہے اور پھر وہ خالی بوتل کی طرح ہو جاتی ہے۔ بے کار' بے رنگ' بے خوشبو اور بے قیمت۔"

تانیہ کو یکدم اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے سراسیمہ سی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا مگر وہ سر جھکائے پھر سے ترپائی میں مصروف تھیں مگر اسے لگا ان کی باتیں ہی نہیں ان کا لہجہ

بھی گہرے معنی لیے ہوئے تھا۔ وہ اسے یہ سب کسی خاص وجہ سے سنا رہی تھیں اور "خاص وجہ" خاص مقصد اس کیلئے کسی قسم کی وضاحت طلب نہ تھی۔

بے دھیانی میں اس نے کلپ ہٹائے بغیر دوپٹہ کھینچ لیا۔ نتیجتاً چر کے ساتھ اماں کا نیا نکور سفید شیفون کا دوپٹہ درمیان سے پھٹا اور اس کا منہ چڑانے لگا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"آ... آں... یہ تو پھٹ گیا۔" سخت تاسف سے اس نے دوپٹے کو دیکھا۔

"کیا ہوا؟" نادیہ آپی نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر جو دوپٹے پر نظر گئی تو ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ کرتا ایک طرف رکھ کر تخت سے اتر کر اس کی طرف آئیں۔

وہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔

"کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہوتا تم سے تانی! پتہ نہیں اتنی غیر ذمہ دار کیوں ہوتی جا رہی ہو۔" انہوں نے دوپٹے کی طرف دیکھا اور اس پر ایک ملامت بھری نظر ڈالی۔

وہ لب بھینچ کر اٹھی۔ کپڑوں کا کندھے پر پڑا ڈھیر تخت پر آ کر ڈال دیا۔

"پتہ نہیں اور کتنے نقصان برداشت کرنے پڑیں گے تمہاری اس لاپرواہی کی وجہ سے۔" وہ کمرے کی طرف جاتے جاتے ٹھٹکی۔ان کا جملہ سیدھا دل کو چھیدتا ہوا گزر گیا۔وہ جھپاک سے کمرے میں گھس گئی۔اچانک بہت سے آنسو آنکھوں سے رواں ہو گئے۔

آخر آپی کھل کر پوچھ کیوں نہیں لیتیں۔بلکہ اسے صاف لفظوں میں کہہ کیوں نہیں دیتیں کہ وہ سب جان گئی ہیں کہ اس کی اس تبدیلی کا محرک وہ جان گئی ہیں اور یہ کہ وہ جس سفر پر چل نکلی ہے وہ اس سے خائف ہیں۔ٹھیک ہے بڑی بہن ہونے کے ناتے انہیں حق ہے کہ وہ اس سے باز پرس کریں مگر... مگر محبت کے فلسفے پر انہیں بھی یقین تو ہو گا نا کہ... یہ... یہ تو' دل کی زمین پر خود بخود اگ جانے والا پودا ہوتا ہے۔ تخم گر گیا پھر لاکھ اسے کاٹتے رہو اس کی جڑیں نکلتی رہتی ہیں۔ہر بار کونپل پھوٹ نکلتی ہے۔

وہ گھٹنوں میں سر دیئے آنسو بہا رہی تھی۔نادیہ آپی اس کے پاس چلی آئیں اور اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر تھپکا۔

"پگلی! میرا کہنا برا لگا تمہیں۔میں تو تمہارے بھلے کیلئے ڈانٹتی ہوں۔چلو تمہیں برا لگا تو میں معافی مانگ لیتی ہوں۔ادھر دیکھو تانی! بھئی دیکھو نا میری طرف۔" وہ زبردستی اس کا سر اونچا کرنے لگیں اور کامیاب ہو گئیں۔

آنسوئوں سے بھیگا ہوا چہرہ انہیں بری طرح دکھ دے گیا۔انہوں نے بے اختیار اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

اس کا دل پہلے ہی گداز ہو رہا تھا۔ذرا سی توجہ نے اسے بالکل ہی بکھیر کر رکھ دیا وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مجھے بہت ڈر لگتا ہے تانی! ایسی بازی لڑکیاں ہار جاتی ہیں۔محبت ان کیلئے خوش نما پھول نہیں دہکتا انگارہ بن جاتی ہے۔بظاہر چمکتا ہوا جب تھامتی ہیں تو جھلس کر رہ جاتی ہیں پھر کچھ نہیں بچتا۔راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہیں۔"

نادیہ آپی کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

آنسو یکلخت تانیہ کی آنکھوں میں ٹھٹھر کر جم گئے۔وہ سر اٹھا کر سامنے دیوار کو گھورتی گئی۔ ایک بے عنوان سی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھ نہ پائی۔

''محبت کے نام پر دیئے جانے والے دھوکوں کی کہانیاں تم نے بہت پڑھی اور سنی ہوں گی اور ایسے ہزار مرد محض اپنی ہوس کو محبت کے خوبصورت لبادے میں چھپا کر معصوم اور کمزور نفس لڑکیوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں۔''

''نہیں' نہیں وہ ایسا نہیں ہے آپی!'' وہ بے اختیار بول اٹھی تو انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ایک متاسفانہ سی سانس ان کے لبوں سے نکل گئی۔

''اگر وہ ایسا نہیں ہے تو اسے کہو وہ تمہیں اپنی عزت سمجھے اور یوں ہوٹلوں اور پارکوں میں آنے پر اصرار نہ کرے۔ایک غیر لڑکی ہزار ملاقاتوں کے بعد بھی اس کیلئے غیر اور نامحرم ہی رہتی ہے' آشنائی کا مطلب اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو جانا نہیں ہے۔''

اب کے نادیہ آپی کے لہجے میں ہلکی ناگواری اتری مگر دوسرے پل اس کے پھیکے پڑتے چہرے اور شرمندگی کے بوجھ سے ڈھلکتے کندھوں کو دیکھ کر انہوں نے نرمی سے اسے تھپکی دی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''آگ پر ہاتھ رکھ کر تم یہ کیسے امید رکھ سکتی ہو کہ یہ ہاتھ نہیں جلے گا۔پگلی محبت چاہے سچی ہو یا جھوٹی' عورت کیلئے آگ ہوتی ہے۔اسے گلزار بنانا ہے تو اسے کہو وہ سچے اور سیدھے راستے سے اس گھر پر آئے ہم اسے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔''

باہر دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔نادیہ آپی نے اس کے جھکے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور ایک گہری سانس بھر کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

''خود کو سنبھالو' سکندر یا نومی ہو گا۔ہم پھر بات کریں گے۔'' وہ تیزی سے باہر نکل گئیں مگر وہ یونہی اپنے پتھر جیسے بھاری ہوتے وجود کے ساتھ فرش پر بیٹھی رہی۔

آنسو اس کی آنکھوں سے بے آواز لڑھکتے جا رہے تھے۔پتہ نہیں یہ ندامت کے تھے' بے پناہ شرمندگی کے یا دل پر رکھے نادیدہ بوجھ میں اضافہ ہو جانے سے نکل پڑے تھے۔وہ طشت از بام ہو چکی تھی اور اپنے تئیں وہ رازداری سے جی رہی تھی۔بھلا ایک گھر میں رہتے ہوئے آپی سے وہ کیونکر چھپ سکتی تھی۔وہ ایک چھت تلے اپنائیت اور محبت سے رہتے تھے پھر کیونکر پل پل کے بدلتے رویوں' چہرے کے زاویوں اور دل کی تبدیلی سے بے خبر رہ سکتے تھے۔

اور دل میں جھانک لینے والوں سے تو کوئی نہیں چھپ سکتا کہ لاکھ چہرے اور آنکھوں کے تاثرات کو مخفی رکھنے کے جتن کرلیں وہ آپ کے دل کے گھر کا ہر منظر دیکھ لیتے ہیں۔ کبھی آنکھوں سے، کبھی چہرے سے، کبھی ایک مسکراہٹ سے اور کبھی ایک آنسو سے ہی اور نادیہ آپی تو جانے کب سے اس کے دل میں جھانک رہی تھیں۔

اس نے دیوار پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

نادیہ آپی اچانک الٹے پیروں کمرے میں آئیں، ان پر گھبراہٹ سی تھی۔

"تانی، تانی! جائو دروازہ کھولو میرے سسرال والے آئے ہیں۔" وہ جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔

"آپ کے سسرال والے؟ خیریت؟" 'وہ جھٹ پٹ دوپٹے سے چہرہ رگڑنے لگی پھر بولی۔

"اماں کہاں ہیں؟" اس نے اپنے حلیے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور قمیض کی سلوٹیں کھینچ کر درست کیں۔ دوپٹہ کھول کر کندھوں پر پھیلایا۔

"اماں تو ابھی تک نہا کر نہیں نکلیں۔ پتہ نہیں کتنے دنوں کا ایک ساتھ نہا رہی ہیں۔ تم تو جائو۔" وہ اسے دروازے کی طرف دھکیلنے لگیں۔

"مگر یہ اچانک کیوں آگئیں؟" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے حیرت سے بولی۔

"کہہ رہی تھیں اس روز فون پر اماں سے کہ وہ کسی دن آئیں گی۔ دراصل وہ..." ان کی آواز لحظہ بھر شرم سے کم ہوئی۔ چہرے پر حیا کے ڈھیروں رنگ بکھر آئے۔

"شادی کی تاریخ وغیرہ کے سلسلے میں آنا تھانا۔"

"اوہ۔" تانیہ کا چہرہ اس خبر پر چمک اٹھا۔ لبوں پر مسکراہٹ بکھر آئی۔

"کب کیا تھا فون؟ مجھے تو نہیں خبر۔"

"اوہو! اب دفع بھی ہو۔ سارے سوالات ابھی پوچھ لوگی۔ ایک تو یہ اماں بھی بس۔"

"گھبرائیں نہیں۔ اس چوکھٹ سے وہ واپس ہونے کی نہیں ہیں۔ کچھ انتظار کی کوفت سے تو گزرنے دیں انہیں۔" وہ انہیں چھیڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ مگر دروازہ اماں کھول چکی تھیں

اور انہیں ساتھ لیے بیٹھک میں جا رہی تھیں۔ جاتے جاتے تانیہ کو اشارہ کر گئیں۔ جس کا مطلب تھا اچھی طرح خاطر مدارات کرنی ہے۔

"کیا خاک خاطر مدارات کریں گے۔ نہ گھر میں سکندر رہے نہ نومی۔"

نادیہ آپی از حد بوکھلائی ہوئی تھیں۔ اسے ہنسی آگئی۔

" تم ہنس رہی ہو۔" انہوں نے الماری سے اپنا ہینگ کیا سوٹ نکالتے ہوئے گھورا اور سوٹ اس کی طرف کیا۔

"یہ پہن لوں۔ ٹھیک رہے گا نا؟"

"یہ تو بہت سادہ ہو جائے گا۔" تانیہ نے منہ بنایا۔

"ہٹو۔ تم سے پوچھنا بے کار ہے۔ سادہ ہو جائے گا۔ سادہ نہیں تو شرارہ' غرارہ پہن کر ان کے سامنے جائوں۔"

وہ کپڑے لیے باتھ روم میں گھس گئیں۔

"لو دیکھو تم یہاں گھسی بیٹھی ہو' نادی کدھر ہے؟" اماں نے کمرے میں جھانکا۔

"ایسی ہڑ بونگ میں آئی ہیں میرے تو ہاتھ پائوں پھول رہے ہیں۔ نومی' سکندر کوئی ایک بھی گھر میں نہیں ہے۔ جائو ذرا گلی میں جھانک کر دیکھو۔ صفیہ خالہ کا بیٹا کھیل رہا ہو تو اسے ہی پیسے دے کر کچھ منگوالو۔"

"ہاں میں یہی سوچ رہی تھی آپ تو جائیں بیٹھیں ان کے پاس۔" اماں کو تسلی دے کر الماری کھولنے لگی۔

"نادی کو ذرا جلدی بھیج دینا۔ اس کی نندیں اسی ذرا سی دیر میں دس بار تو اس کا پوچھ چکی ہیں۔" اماں بوکھلائی بوکھلائی سی واپس ہولیں۔ اس نے غسل خانے کا دروازہ بجا کر نادیہ کو اماں کا پیغام دیا اور صحن کی کھڑکی کھول کر پچھلی گلی میں کھیلتے بچوں سے صفیہ خالہ کے بیٹے پپو کو بلا کر تھوڑی بہت منت کر کے چیزوں کی لسٹ اور پیسے تھما دیئے اور خود باورچی خانے میں آکر برتن نکالنے لگی۔ سب سے مہنگی' خوبصورت اور نفیس کراکری نکال کر پونچھنے لگی کہ اچانک ہی ان کا دھیان اکبر شاہ اور اس کے عالیشان محل نما گھر کی طرف چلا گیا۔

ایک گھنٹی پر روبوٹ کی طرح پیش ہونے والا ملازم' امپورٹڈ ٹرالی میں امپورٹڈ برتنوں میں خوشبو اڑاتی چائے' کولڈ ڈرنکس اور دوسرے مشروبات۔

ایک سے ایک اعلیٰ چیز جسے دیکھ کر جنت کا گماں ہو۔ جبکہ اس کا یہ گھر۔ یہ چیزیں۔

اگر اکبر شاہ اپنے گھر والوں کو لے کر اس کے یہاں آئے تو وہ انہیں کہاں بٹھائے گی؟ کیا کھلائے گی؟ یہ فتح خان کے سموسے، دہی بھلے، چھولے، زیادہ سے زیادہ چکن پیٹز، چکن رول اور ان برتنوں میں جو بقول اماں کے بے حد قیمتی ہیں جنہیں وہ سینت سینت کر رکھتی تھیں۔ اس نے برتنوں پر ایک جائزہ لیتی نظر ڈالی تو آنکھوں میں دھواں سا بھرنے لگا۔

ایسے برتن تو شاید ان کے ملازموں کے استعمال میں ہوتے ہوں گے۔

ایک ملول سی سانس سینے کی تہ سے نکل کر آہ بن کر لبوں پر ٹوٹ گئی۔

وہی اضطراب اس کا دل مسوسنے لگا جسے وہ رات بھر تھپکیاں دے کر سلاتی رہی تھی۔

X...X...X

ولید نے انگریزی اخبار کی آڑ سے اپنے برابر کی سیٹ پر بیٹھی شہرینہ کو دیکھا اور بے ساختہ ہنسی لبوں کو باہم دبا کر چھپائی۔ وہ ارتھ کے متعلق دکھائی جانے والی ڈاکومنٹری فلم کو بظاہر اشتیاق سے دیکھ رہی تھی حالانکہ وہ اس سے بخوبی واقف تھا کہ اسے زندگی میں کبھی بھی ڈاکومنٹری

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

فلموں سے شغف نہیں رہا بلکہ یہاں کسی بھی مسافر کو اس دکھائی جانے والی فلم سے دلچسپی نہیں تھی۔ ہر ایک کے چہرے پر بے زاری تھی۔ کوئی مصروف گفتگو تھا کوئی میگزین الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ ایک وہی خود کو اس میں منہمک ظاہر کر رہی تھی۔

"تمہاری ناراضگی کی وجہ، اسلام آباد ہی چھوٹنے کا غم ہے یا اور کچھ چھوٹ جانے کا؟" وہ اخبار رول کر کے ٹھوڑی کے نیچے رکھتے ہوئے اس سے بولا۔ وہ چونکی، نظروں کا زاویہ ذرا سا بدلا پھر دوبارہ سامنے ہی دیکھنے لگی۔

"مجھ سے بات نہیں کریں آپ۔" اس کا لہجہ چٹختا ہوا تھا۔

"چلو نہیں کرتا۔ وہ اگلی سیٹ والی قدرے بہتر اور معقول لگ رہی ہے اس سے کر لیتا ہوں۔ کیا خیال ہے۔ سیٹ بدل لو گی؟" وہ ہلکے سے مسکرایا۔ اس کے زاویوں میں کھنچاؤ سا آیا تھا۔

"خیر بری تو یہ ہرے سوٹ والی بھی نہیں ہے۔ ماڈل واڈل معلوم ہوتی ہے۔ اسے شاید میں نے ٹی وی میں دیکھا ہے۔"

وہ قدرے سنجیدگی سے اب اپنے دائیں طرف کی رو میں بیٹھی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سلگ کر رہ گئی۔ وہ لڑکی ولید کو اپنی طرف دیکھ کر خاص ادا سے مسکرائی تھی۔

''مجھے کیا پتہ آپ زیادہ جانتے ہوں گے اسے۔ آپ کا ہی واسطہ رہتا ہے ایسی ویسوں سے۔''

''نہیں، میرا خیال ہے اسے تو میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

''مگر آپ کو دیکھ کر جس طرح مسکرا رہی ہے اس سے لگ رہا ہے پرانی جان پہچان ہے۔'' وہ طنز سے ہنسی۔

ولید نے رخ پھیر کر اسے دیکھا۔

''اگر ایک خوبصورت شخص کو دیکھ کر کوئی لڑکی مسکرانے لگے تو اس میں بے چارے آدمی کا کیا قصور؟'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''اتنے ہی گلفام ہیں نا آپ؟'' اس کا لہجہ دھیما مگر جلا بھنا سا تھا۔

''کہاں۔ میں تو خود کو بہت عام سا آدمی سمجھتا ہوں۔ یہ تو تم ہی۔ مجھے خوامخواہ میں احساس دلاتی رہتی ہو۔ اب دیکھو میں نے اس لڑکی کو مسکراتے ہوئے ہرگز نہیں دیکھا تھا مگر تم نے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

مجھے بتا کر خوامخواہ میں خوش فہمی میں مبتلا کر دیا۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تو اسے اپنا سر پیٹ لینے کو دل چاہا۔

''چہرے کا کیا ہے۔ انسان کا دل خوبصورت ہونا چاہئے۔ کردار مضبوط ہونا چاہئے۔'' وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''دیکھنے میں تو چاند بھی خوبصورت لگتا ہے مگر اس کی حقیقت کیا ہے؟''

ولید نے ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کو لب کھولے مگر پھر بھینچ لئے۔

''رات بھی حسین ہوتی ہے۔ ستاروں سے جگمگاتی ہوئی۔ مگر اس کا سحر سے کیا مقابلہ۔ اس میں سحر جیسی وسعت اور اجلا پن نہیں ہوتا۔'' یہ کہتے ہوئے ہلکے طنزیہ انداز میں مسکرائی تھی۔

''میرا خیال ہے اسلام آباد چھوٹنے کا غم زیادہ ہی دل پر لگا لیا ہے۔ کراچی پہنچتے پہنچتے خرچ ہی نہ ہو جائو۔'' وہ بے اختیار ہنسا تھا۔ اس کی ہنسی دل جلانے والی تھی یا اسے ہی محسوس ہوئی۔

''اسلام آباد میرے لیے کوئی جنت نہیں ہے جسکے چھوٹنے کا غم منائوں میں۔'' وہ تڑخ کر رہ گئی۔

"اوہ... تھینکس۔ تم نے میرا ایک خدشہ دور کر دیا۔" اس نے اطمینان بھرے انداز میں سر کو جنبش دی۔

شہرینہ کا دل چاہا کہ وہ جہاز سے چھلانگ لگا لے یا اسے دھکا دے دے۔ کسی طرح خود اڑ کر کراچی چلی جائے۔ یہ شخص اسے اپنی حیات کی سب سے بڑی آزمائش لگ رہا تھا۔

دل میں دھواں سا بھرنے لگا۔ آنکھوں کی سطح پر نمی اتر آئی۔ ابھی تو کراچی پہنچ کر جانے اسے کس بری خبر کا سامنا کرنا ہو گا۔ وہ اسے اپنی کس خوشی میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

کتنا خوش دکھائی دے رہا تھا۔

تراوٹ اس کے چہرے پر پھیلی' اسے تروتازہ کر رہی تھی۔

ایک نادیدہ بوجھ سے اس کا دل دکھنے لگا۔ وہ یکدم چپ ہو کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے کبھی جیت نہیں سکے گی۔

کوئی دل کے کھیل دیکھے کہ محبتوں کی بازی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ قدم قدم پہ جیتے' میں قدم قدم پہ ہارا

مما اسے ولید کے ساتھ دیکھ کر خاصی حیران ہوئی تھیں۔

"تمہارا تو پورا مہینہ رہنے کا پروگرام تھا شیری! چند دن میں چلی آئیں۔ دل نہیں لگا کیا؟"

ڈائننگ ٹیبل پر صغریٰ کے ساتھ پلیٹیں رکھتی ہوئیں اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

وہ کچن سے ملحق بیسن میں منہ دھو رہی تھی۔ مما کی بات پر اپنی بے بسی اور بے اختیاری کا احساس پھر سے دل میں دھواں بھرنے لگا۔

"میرا خیال ہے دل ہی نہیں لگا۔ وہاں دل لگنے کا کوئی سامان جو نہیں تھا۔"

وہ آستین فولڈ کرتا ہوا وسیم بھائی کے ساتھ کھانے کی میز پر چلا آیا۔

آغا جی نے کتاب بند کر دی اور چشمہ اتار کر ایک نظر ولید پر پھر تولیہ سے منہ رگڑتی روٹھی روٹھی سی شہرینہ پر ڈالی۔

اس نے انہیں خاصے خراب موڈ میں سلام کیا تھا۔ انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ وہ ولید کے ساتھ آنے پر قطعی راضی نہیں تھیں اور جبراً لائی گئی تھی۔

’’میرا تو بہت دل لگ گیا تھا وہاں۔‘‘ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی تو ولید نے بے ساختہ ہنسی دبائی۔

’’میں گیا تو واقعی یہ بڑے مزے میں تھی آنٹی! مگر مجھے دیکھ کر زار و قطار رونے لگی کہ میں بھی آپ کے ساتھ واپس جائوں گی۔ میں تو اس کے رونے اور ضد کرنے پر پریشان ہو کر رہ گیا۔ مجبوراً اسے ساتھ لانا پڑا۔ کہیں روتے روتے مر ور نہ جائے۔‘‘

اس نے یہ کہتے ہوئے اچٹتی سے نظر اس پر ڈالی جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وسیم بھائی نے بے ساختہ مسکراہٹ دبائی تھی اور خاصے تعجب سے شہرینہ کو دیکھا۔ مما جانے کیوں شرمندہ سی ہونے لگیں۔

’’تم بچی کی بچی رہو گی شیری! کوئی تک ہے اس طرح کی حرکت کرنے کی۔ ادھر بھابی کیا سوچ رہی ہوں گی۔‘‘

’’جھوٹ بول رہے ہیں یہ مما!‘‘ اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں۔

’’اچھا بس۔ تم سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ بچپنا تو تمہارے اندر سے گیا ہی نہیں ہے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں آنٹی! ہو جاتا ہے‘ کبھی کبھی انسان اموشنل ہو جاتا ہے۔‘‘

اس نے نہایت ملائمت سے مما کو مزید ڈانٹ ڈپٹ سے روکا۔

وہ سلگتی ہوئی چمچہ پلیٹ میں رکھ کر اٹھنے لگی تو آغا جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

’’بیٹھو‘ بیٹھو یہ یونہی مذاق کر رہا ہے۔ اس کی عادت سے تو واقف ہو تم۔‘‘ وہ ہونٹ دانتوں میں دبائے ناراض ناراض سی واپس بیٹھ گئی۔

’’میرا آنے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔ یہ زبردستی لائے ہیں مجھے۔‘ ‘ اس نے اپنے تئیں انکشاف کیا تھا۔ مگر میز کے گرد بیٹھے ہوئے کسی بھی چہرے پر کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔

’’تمہارا آنا ضروری بھی تو تھا۔ ولید کی خوشی تم سے الگ تھوڑی ہی ہے۔‘‘

آغا جی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر ولید کو۔ اس نے بے ساختہ نظریں آغا جی کے چہرے پر جما دی۔

"ارے ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی۔ تمہارے سکول کی اوپننگ ہونی ہے ولید۔"

مما کو یکدم یاد آ گیا۔ ولید نے سر ہلا دیا اور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا جو ہکا بکا سی رہ گئی تھی۔

"گائوں میں ولید کے سکول کی افتتاحی تقریب ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم سب شامل ہوں۔ اسی غرض سے تمہیں لے آیا ہے۔" آغا جی بولے تو بے اختیار ایک ہلکی سی سانس اس کے لبوں سے خارج ہو گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ جو بوجھ رات بھر اور یہاں آنے تک اس کے سینے پر دھرا ہوا تھا آہستگی سے اتر گیا عجیب سے احساسات میں وہ گھر گئی۔

" یہ بات تو آپ وہاں بھی بتا سکتے تھے۔" بوجھ اترا تو غصہ بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ جھنجھلاہٹ بھی اتر گئی۔

"سسپنس کیسے رہتا پھر۔" وسیم بھائی نے ہنس کر کہا اور کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے ساتھ بیٹھے ولید کو ایک دھپ رسید کی۔

"یار! مونا کو بھی لے ہی آتے ساتھ۔ اب خوامخواہ میں مجھے جانا پڑے گا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"خوامخواہ میں کیوں۔ اتنا گولڈن چانس مل رہا ہے سسرال میں قدم رنجہ فرمانے کا۔ خاطریں کروانے کا۔" وہ بھی ساتھ ہی اٹھ گیا۔

"اب وہ زمانے لد گئے۔ اب کہاں کی خاطر مداراتیں۔" وہ بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

"چچ... چچ... اتنی جلدی یہ وقت آ گیا تم پر۔" اس نے پر ملال نظریں اس پر ڈالیں۔

"بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔ ایسی نوبت تو دس سال بعد آنا تھی۔ خیر اپنی اپنی پرسنالٹی کی بات بھی تو ہے نا۔ جو جیسا ہو اس کا ویسا..." وہ حفظ ماتقدم کے طور پر پیچھے ہٹ گیا مگر وسیم کا گھونسا اس کے شانے پر پڑ ہی گیا۔

"اس پرسنالٹی پر تو ایک زمانہ مرتا ہے۔"

"نیا انکشاف ہے۔ ہم نے تو مرنے والے نہیں دیکھے۔ بس ایک بے چاری مونا بھابی کو ہی دیکھا ہے جو نکاح کے بندھن میں بندھی مرنے پر مجبور ہیں۔"

وہ لائونج کے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔وسیم بھائی بھی چائے کا آرڈر دے کر اس کی طرف آگئے۔صغریٰ میز صاف کرنے میں لگی ہوئی تھی۔شہرینہ چائے بنانے اٹھ گئی تھی۔اس کا موڈ یکدم بدل گیا تھا۔ایک عجیب سی خوشگواری اس کے دل میں اتر گئی تھی۔چائے بنا کر وہ لائونج میں چلی آئی۔بڑی نفاست سے ٹرے میں سجا کر اس نے سب کو کپ پیش کئے۔ولید کی طرف آئی تو پلکیں اٹھ ہی نہ پائیں۔وہ بہت غور سے اس کے چہرے پر نظر آنے والی تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا۔سی گرین سوٹ میں وہ بہار کا ٹھنڈا میٹھا جھونکا لگ رہی تھی۔صاف ستھرا دھلا دھلا چہرہ اندر کے خلفشار کے دھل جانے کے بعد یوں کھل اٹھا تھا جیسے دھوپ کی تمازت ڈھلتے ہی شام کی مہکتی فضا میں سرخ گلاب چٹخ کر کھل جائے۔

ایک اضطراب جیسے ولید کے دل کو چھو گیا۔کوئی چیز اس کا دل اندر ہی اندر مسوسنے لگی۔

چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا پھر گھبرا کر نظریں کترا کر مگ پر جمادیں۔

سنہری چائے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔اچانک اسے محسوس ہونے لگا جیسے یہ مگ نہ ہو اس کا دل ہو جس سے بھاپ اٹھ رہی ہو۔اور رگ رگ میں اتر کر یہ دھواں اندر گھٹن اور حبس کو بڑھا رہا ہو۔

وہ اپنی اس کیفیت پر حیران رہ گیا۔اور اس سے پہلے کہ اس کیفیت میں شدت آتی سر جھٹک کر اس نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھر لیا اور جیسے ساری تھکن ایک گھونٹ نے چوس لی۔

X...X...X

نومی نے بے حد احتیاط سے تانیہ کی الماری سے اپنی منگنی کی مووی نکالی اور ٹرائوزر کی بیلٹ میں اٹکا کر ٹی شرٹ کھینچ کر نیچے کر دی اور کمرے سے نکلا تو امی سکندر کے پاس بیٹھیں نادیہ آپی کی شادی کے اخراجات کا تخمینہ لگا رہی تھیں۔فکر مندی ان کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

”سب ہو جائے گا اماں! آپ کیوں فکر کرتی ہیں؟“ سکندر اپنا کام کرتے ہوئے انہیں تسلی بھی دے رہا تھا۔

اس کا تو ارادہ سیدھا باہر نکل جانے کو تھا مگر پھر کچھ سوچ کر واپس پلٹا۔

"ابھی کون سی شادی ہونی ہے اماں کہ آپ پریشان ہونے لگیں۔ ہو جائے گا سب کچھ فکر مند بالکل نہ ہوں۔ میں ہوں نا۔" وہ کرسی کھینچ کر اماں کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ سکندر نے یونہی ایک نظر اس پر ڈالی اور دوبارہ سر جھکا کر کاغذ رول کرنے لگا۔

"ہاں۔ کاہے کو فکر ہونے لگی۔ تم جیسا بیٹا جو ہے میرے پاس۔ جس نے ساری ذمہ داریاں اٹھا رکھی ہیں میری۔ ساری فکریں دور کر دی ہیں میری۔ پھر فکر کیسی۔ غم کیسا۔ ایسا ہونہار لائق فائق' فرمانبردار بیٹا اللہ نے دے رکھا ہے۔" اماں سوکھی لکڑی کی طرح چٹخی تھیں۔

"اماں آپ۔"

"کیا اماں۔" اماں نے اسے پر ملال نظروں سے گھورا۔

"جس بیٹے کو یہ تک خبر نہ ہو کہ بہن کی شادی کی تاریخ کون سی ہے' اس گھر میں کیا ہو رہا ہے' کون آرہا ہے' کون جا رہا ہے' اس سے کیا امید رکھی جائے۔' شاباش ہے بیٹا۔ آفرین ہے تم پر۔"

اماں کو شاید اس کی بے خبری پر تاؤ آگیا تھا۔

"یہ تو آپ لوگوں کا قصور ہے نا کہ مجھے کچھ خبر ہی نہیں دیتے۔ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے' مجھے کب بتاتا ہے کوئی۔" وہ الٹا سب کو مورد الزام ٹھہرانے لگا۔

نادیہ آپی تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"ہاں بیٹا۔ ساری کوتاہیاں ہمیں سے ہوئی ہیں تم تو بری الذمہ ہو تمہیں کون الزام دے۔"

وہ کھسیا کر کھڑا ہو گیا۔

"کان کھول کر سن لو نومی! مجھے تمہارا ایک پیسہ بھی نہیں چاہیئے۔ نادیہ کی شادی چاہے جس طرح بھی ہو۔ تمہاری حرام کی ایک پائی بھی خرچ نہیں کروں گی اس کی شادی پر۔"

اسے باہر کی طرف جاتا دیکھ کر اماں بولیں تو وہ ذرا دیر رکا اس کے چہرے کے زاویوں میں کھنچاؤ آگیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"کتنی دفعہ کہا ہے مت الجھا کریں اس سے۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آپ ہی کی صحت خراب ہوتی ہے۔" سکندر اماں کی طرف دیکھ کر اپنے کاغذات سمیٹ کر فائل میں ڈالنے لگا۔

''دیکھا تم نے۔ کیسے بے خبر رہتا ہے گھر سے۔ اسے یہ تک نہیں خبر کہ نادیہ کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔'' اماں گہری یاسیت سے روہانسی ہو گئیں۔

''اس کے باخبر ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا۔'' سکندر نے کہا۔

''اور تو کیا اماں۔ اسے کون سی ذمہ داری اٹھانی ہے۔'' نادیہ لہسن چھیلتے ہوئے آزردگی سے بولیں تو اماں ایک ملول سی سانس بھر کر رہ گئیں۔

شہرینہ نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا تو اسے اندر کا ماحول خاصا آزردہ نظر آیا۔

''السلام علیکم۔'' وہ اماں کی طرف چلی آئی۔ پھر سکندر کو دیکھ کر سلام کیا۔

''آداب سکندر بھائی!''

''جیتی رہو۔'' سکندر نے بڑی سرعت سے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا تھا۔ دونوں فائلیں اٹھا کر کمرے میں چلا گیا۔

''کب آئیں تم اسلام آباد سے؟'' اسے دیکھ کر تانیہ کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ وہ اسے کھینچتی پچھلے برآمدے کی طرف لے گئی۔

''کل ہی آئی ہوں۔ تم نے تو میرے پیچھے بڑے عیش کئے ہوں گے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

''کیا مطلب' کیسے عیش؟'' اس کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔

''میرے بغیر یونیورسٹی میں دل لگ جاتا ہے تمہارا؟'' وہ صاف ستھرے برآمدے میں رکھی کین کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ تانیہ کیاری کے پتھر پر بیٹھ گئی۔

''میں یونیورسٹی کئی دنوں سے جا نہیں رہی۔''

''ایں۔ کیوں؟'' اس نے تانیہ کو بغور دیکھا۔

''بس یونہی۔'' وہ نظریں چرا کر منی پلانٹ کے پتوں کو نوچنے لگی۔

''اکبر شاہ سے ملاقات ہوتی ہے۔''

''شیری!'' اس نے اضطرابی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا پھر سر جھکا لیا۔

پتہ نہیں اس کی آنکھوں اور چہرے میں کیا تھا‘ وہ لب کاٹنے لگی۔ شہرینہ اس کے نزدیک آکر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر ایک کھنچاؤ سا آ گیا تھا۔ کچھ لمحے فضا میں بوجھل خاموشی طاری رہی۔ شہرینہ نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

”تانی میں تمہیں اب کوئی نصیحت نہیں کروں گی۔ اس لئے کہ تمہارے قدم جس تیزی سے اٹھ رہے ہیں وہاں میری نصیحت تمہاری راہ میں چٹان نہیں‘ چھوٹے چھوٹے کنکر ثابت ہو گی جنہیں تم روند کر گزر جاؤ گی۔ یہ تمہارا راستہ نہیں روک سکیں گے‘ میں جانتی ہوں جب ندی کا بہاؤ بہت تیز ہو تو کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔“

اس کے لہجے میں بڑی دل گرفتگی اور پژمردگی تھی۔ تانیہ نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے دو دن سے غمگسار کندھے کی طلب تھی۔ آج وہ قریب تھا تو وہ ضبط توڑ بیٹھی اور بے اختیار اس کے کندھے سے لگ گئی۔

”مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا شیری! کچھ بھی نہیں۔ میں خود کو اپنے دل کے ہاتھوں سخت بے بس‘ لاچار محسوس کر رہی ہوں۔ چاہتے ہوئے بھی قدم نہیں روک پائی۔

تم نہیں جانتیں تنہائی میں‘ میں خود کو ایک قسم کی اذیت میں پاتی ہوں‘ مورد الزام ٹھہراتی ہوں خود کو‘ کبھی کبھی کراہیت آنے لگتی ہے خود سے۔ مگر اسے دیکھتی ہوں‘ وہ سامنے آتا ہے تو جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے‘ اپنا ارد گرد دکھائی نہیں دیتا۔ میری بصارتیں‘ سماعتیں‘ میرا دل‘ میری رگ رگ‘ میرے سارے اعصاب جیسے اپنے اختیار میں نہیں رہتے۔ میں بے بس ہو جاتی ہوں۔ بھول جاتی ہوں اپنا آپ بھی‘ اپنا ماحول اور ساری دوسری باتیں۔“

اس کے آنسو شہرینہ کے کندھے پر گرم گرم سیال کی طرح گر رہے تھے اور اسے یاسیت میں دھکیل گئے۔

”محبت میں جنون‘ دیوانگی کسی طور بھی اچھی بات نہیں ہے تانی!“ وہ گہری سانس بھر کر بولی۔

”ایسی محبت تو اللہ کو بھی اپنے بندے کی اپنے لئے پسند نہیں جس میں وہ تارک الدنیا ہو جائے۔ اپنے پیارے رسولؐ کو بھی اس نے اپنی محبت میں دنیا چھوڑنے کو نہیں کہا۔ اپنے ارد گرد ماحول سے کٹ جانے کا حکم نہیں دیا۔ تارک الدنیا ہونے کا فرمان جاری نہیں کیا۔ نہ اسے اپنی محبت میں صحرا نوردی کا حکم دیا۔ محبت ہوش مندی کا نام ہے‘ بے ہوشی کا نہیں

ہے۔اپنے ارد گرد سے بے نیاز ہو کر محبت کرنے والا آدمی اپنے لئے بھی اور اپنے محبوب کیلئے بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔“

شہرینہ کی باتوں پر اس کے آنسو اور بھی تواتر سے بہنے لگے۔بے بسی اس کا دل چیرنے لگی۔

”تم نے بھی تو محبت کی ہی شیری! تمہیں تو خبر ہو گی یہ کس طرح روح میں اتر کر اپنی جڑیں مضبوط کرتی ہے۔“

اس کی بات پر شہرینہ کی آنکھوں کی سطح پر اترنے والی نمی میں اضافہ ہو گیا۔ایک دل گرفتگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔مگر لمحہ بھر کے بعد ہی وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”ہاں میں جانتی ہوں اس لئے کہ محبت مجھے بھی ہے ولید حسن سے‘ مگر میں محبت میں اپنی انا کو کچل کر ایک قدم نہیں بڑھا سکتی۔انا کو محبت کے قدموں میں جھکا کر نہیں اس کے قدموں میں محبت کا سر رکھتی ہوں۔محبت کسی کے قدموں میں ارزاں ہو جانے‘ دھول بن جانے اور شاخ سے ٹوٹے پتوں کی طرح بکھر جانے کا نام نہیں ہے۔“ وہ دکھ سے مسکرائی پھر پلکوں پر اتر جانے والی نمی کو پونچھتی ہوئی ایک سانس بھر کر بولی۔

”جس دن مجھے ثبوت مل جائے گا کہ ولید حسن کے کردار میں کھوٹ ہے‘ وہ ایک بدکردار اور دل پھینک اور اپنے نفس کی ندی کے بہاؤ میں تنکے کی طرح بہہ رہا ہے‘ اس دن سے میں اسے اپنے دل سے نکال دوں گی۔میرے نزدیک بے اعتبار شخص‘ بدکردار شخص سے محبت کرنا کیچڑ میں لتھڑنے کے برابر ہے جو ہماری روح تک کو آلودہ کر دیتی ہے جبکہ تم اکبر شاہ کے...“

”پلیز شیری پلیز۔آگے کچھ مت کہنا۔“ وہ مارے کرب کے چلائی۔شہرینہ لب بھینچ کر دکھ اور رنج کے گہرے احساس کے ساتھ اس کا کرب آلود چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

اسے بیک وقت اس پر رحم بھی آرہا تھا اور غصہ بھی۔رحم اس کی بے بسی پر آرہا تھا اور غصہ اس کی کم عقلی پر۔

”پہلے ہی میں اپنے کومپلیکسز کے ہاتھوں کم اذیت نہیں سہہ رہی جو تم مزید چرکے لگا رہی ہو۔مجھے خوش ہو لینے دو شیری! شاید کسی خوشی کا ستارہ میری اندھیری مٹھی کو روشن کر دے۔“ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس بھری۔

"کیسا اندھیرا!" وہ تعجب سے تانیہ کی طرف دیکھنے لگی پھر قدرے ملامت بھرے انداز میں بولی۔

"تمہارے ارد گرد تو ہمیشہ روشنی تھی تانی! پیارے رشتوں کی، تمہارے صاف ستھرے کردار کی۔ تم تو سراپا روشنی ہوتانی! اندھیرے میں تو اب گم ہونے جا رہی ہو۔ ایک تاریک جنگل میں دانستہ کھونا چاہ رہی ہو اور دوسری بات تانی یہ کہ تم..." وہ ایک پل رکی پھر نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر تھپکنے لگی۔

"یہی سوچ کر واپس آ جاؤ کہ اکبر شاہ کی سوسائٹی میں تم ہمیشہ مس فٹ رہو گی۔ اس کے لائف سٹائل میں تم کبھی ایڈجسٹ نہیں ہو پاؤ گی۔ میں اکبر شاہ کی ذات کے حوالے سے نہیں کہہ رہی ہوں بلکہ اس کے ماحول کی بابت کہہ رہی ہوں۔"

اس نے تانیہ کی نگاہوں میں مچل جانے والے شکوے پر وضاحت کی۔ تانیہ چپ رہی۔ ایک بے آرامی اس کے خون میں جیسے اتر گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ایک وقت تھا شہرینہ کے خیالات، اس کی باتوں، اس کے نظریات کی اس نے ہمیشہ تائید کی تھی بلکہ اس کی حمایتی رہی تھی مگر آج وہ صرف سن رہی تھی۔ اختلاف کرنے کیلئے اس کے پاس دلائل نہ تھے مگر باوجود اس کے اسے اختلاف تھا۔

اس کے دل کے کان بند تھے یا دانستہ بند رکھے تھے تاہم اس کے الفاظ ضرب کی طرح دل پر لگ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے، میں تم سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ تم اکبر شاہ کو دل سے نکال پھینکو مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ آئندہ تم اس کے ساتھ باہر کہیں نہیں جاؤ گی۔ یاد رکھنا تانیہ عورت کا ایک غلط قدم اسے ہمیشہ کیلئے منزل سے دور کر دیتا ہے۔"

وہ چپ رہی بس سر جھکائے چپل کی پٹی پر انگلی پھیرتی رہی۔

کتنی دیر دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ خاموشی کا یہ وقفہ بڑا بوجھل سا تھا۔ شاید اس کیفیت سے گھبرا کر تانیہ نے سر اٹھایا۔ پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"تمہیں میں نے ایک اچھی سی خبر تو سنائی ہی نہیں، آپی کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے۔"

"وائو۔ویری گڈ۔کب؟" وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔خوشگوار مسکراہٹ خودبخود اس کے ہونٹوں پر بکھر آئی۔

"اتنی اچھی خبر تم اب سنا رہی ہو۔" وہ اسے ایک دھپ مار کر کھڑی ہو گئی۔

"چلو آپی کو ذرا اسی بہانے چھیڑ لیں۔"

"بات سنو شیری!" تانیہ بھی ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

"اگر آپی تم سے اکبر شاہ کے متعلق کچھ پوچھیں تو تم انہیں ٹال دینا۔"

شہرینہ ٹھٹک کر پلٹی اور غایت درجے حیرانی کے ساتھ تانیہ کی طرف دیکھا جس نے جھینپ کر سر جھکا لیا تھا۔

بے اختیار ایک سانس اس کے لبوں سے خارج ہو گئی۔

"چلو انہیں بھی خبر ہو گئی ہے۔ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔"

"کیا مطلب؟" اس نے کچھ خائف ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"بھئی وہ بہت اچھی ناصح جو ہیں۔" اس کا انداز شرارتی تھا۔تانیہ کے گھورنے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ کھلکھلا پڑی اور اندر چلی گئی جبکہ تانیہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔

ایک عجیب سی دل گرفتگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

محبت کسی کے اختیار میں نہیں

اور پھیلتی جا رہی ہے تقسیم ہوتی جا رہی ہے

یہ اور بات ہے

کہ تمہارا حصہ اب بھی زیادہ ہے

دوسروں سے بہت زیادہ

اسے لگا اکبر شاہ کا بھاری محبت آمیز لہجہ اس کی سماعتوں میں سرگوشی کرنے لگا ہو۔اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں پھر وہ لہجہ اس کے دل کو اپنے حصار میں جکڑنے لگا۔

X...X...X

"مانا کہ شیری! تم ہر طرح کے کپڑوں میں اچھی لگتی ہو مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ تم یہ جھڑوس سا سوٹ پہن کر چلی آؤ۔" اس کے ہاتھ سے مونا بھابی نے سوٹ چھینا اور ایک طرف پھینکا۔ اس کے جھڑوس کہنے پر اسے ہنسی آگئی۔

"کبھی وسیم بھائی کو جھڑوس نہ کہہ دیجیئے گا بھولے سے۔ وہ مارے تجسس کے لغت کھنگالنے بیٹھ گئے تو گئیں آپ کام سے۔"

انہیں انتباہ کرتے ہوئے جھک کر بیڈ کے دوسری طرف پھینکا ہوا سوٹ اٹھایا۔

"کوئی لغت وغت نہیں کھولتے' انہیں تو لغت کا مطلب بھی نہیں پتہ ہوگا۔"

"کیا آ... اتنی بری اردو ہے ان کی۔" اسے حقیقی حیرت ہوئی۔ "شاعری تو بڑی فرماتے ہیں۔"

"اتنی بری اردو ہے تمہارے شاعر بھائی کی۔ یہ تو میری ہمت ہے جو ان کے شعر ویر سن لیتی ہوں اور جتنی اردو انہیں آتی ہے سمجھو میری وجہ سے۔"

"اور کیا کیا آگیا ہے انہیں آپ کی وجہ سے؟" وہ شرارت سے مسکرائی تو مونا بھابی نے اسے گھور کر دیکھا اور مسکرائیں۔

"بہت کچھ۔ خیر چھوڑ۔ اور سنو یہ سوٹ تم ہرگز نہیں پہنو گی۔ خدا کی بندی وارڈروب بھری پڑی ہے تمہاری۔ یہی ملا ہے تمہیں اتنی بڑی تقریب میں پہننے کو اور یہ کلر تو ولید کو سخت ناپسند ہے۔' وہ اس کے ہاتھ سے سوٹ دوبارہ لے کر رول کرنے لگیں۔

وہ جھنجھلا گئی۔

"ایسی کوئی اہم تقریب بھی نہیں ہے جس کیلئے میں کپڑوں کی سلیکشن میں خوامخواہ میں وقت ضائع کروں۔" وہ بیڈ سے اتر گئی۔

"کیا بکا؟' بھابی نے آنکھیں پھیلائیں۔

"اہم تقریب نہیں ہے۔ لگاؤں گی نا تمہیں ایک ہاتھ۔ کبھی کسی کا دل بھی رکھ لیا کرو بد تمیز لڑکی۔"

"اوہ دل۔" وہ بالوں سے ہیئر بینڈ نکال کر بال جھٹک کر برش اٹھاتے ہوئے بے ساختہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

گیلے بالوں کے چھینٹے جا بجا چہرے پر بکھر گئے۔

"انہیں مجھ سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے تو ان کی بلا سے۔ میں کیا پہنوں' کون سا رنگ پہنوں کیا دلچسپی ہو گی۔ وہ خوش ہیں تو اس لئے کہ آمنہ مردان علی کے گوٹھ میں سکول تعمیر کروالیا ہے۔ انہیں میرے دل کی کیا پرواہ۔ وہ دل گرفتہ سی ہونے لگی۔"

"شیری! یہ زیادتی ہے۔" بھابی اس کے نزدیک چلی آئیں ان کا انداز احتجاجی تھا۔

"اسے تم سے دلچسپی نہ ہوتی تو تمہیں اپنی خوشی میں شریک کرنے کیلئے یوں اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے اسلام آباد نہ دوڑا آتا۔"

"ہاں احسان کیا ہے مجھ پر۔" وہ جھنجھلا گئی۔

"تم پر نہ سہی ہو سکتا ہے خود پر ہی احسان کیا ہو۔" بھابی کا انداز معنی خیز تھا۔ وہ بے ساختہ نظریں کترا گئی اور چہرے کا رخ موڑ کر وارڈروب کھولنے لگی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اپنی سوچ کو مثبت رخ بھی دے دیا کرو۔ خود بھی خوش رہو گی اور دوسروں کا بھی بھلا ہو گا۔" بھابی کا لہجہ فہمائشی تھا وہ چپ رہی۔ بات دل کو لگی تھی۔ اس کا اسلام آباد صرف اسے لینے جانا' دل کے کسی گوشے میں فخر و انبساط کی فضا تان گیا تھا۔

یہ احساس کتنا مسرت انگیز ہوتا ہے کہ اپنی خوشی میں کوئی آپ کی شمولیت کا طالب ہو۔ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں آپ سے شیئر کرنے کا خواہاں ہو۔

وہ اس احساس کو جھٹلا نہیں سکتی تھی کہ وہ اس کی نظروں میں بہرحال غیر اہم نہیں تھی۔

اس کے رخساروں پر خود بخود ہی ایک خوبصورت رنگ آ کر ٹھہر گیا۔

بھابی نے ہینگ کیا سوٹ اس کے ہاتھوں میں تھمایا تھا وہ کلر ولید کی پسند کا تھا۔

"بات تو محسوس کرنے کی ہے' آپ کسی کے بارے میں اچھا محسوس کریں تو وہ خود بخود آپ کے نزدیک چلا آتا ہے۔ برا سوچیں تو دور چلا جاتا ہے۔"

بھابی نے اس کی دل گرفتگی و دل شکستگی کا جال ایک جملے سے کاٹ ڈالا تھا۔ ایک احساس جگا دیا تھا اپنی اہمیت کا۔ ایک سوچ دی تھی خوش نما مہکتی ہوئی۔

X...X...X

ولید حسن استقبالیے پر خود موجود تھا اس کے ہمراہ مردان علی شاہ کے دونوں داماد بھی تھے۔ فوٹو گرافرز کی موج در موج ایک طرف ہر آنے والے مہمان کو روشنی میں نہلا رہی تھی۔ اس روشنی کی جھما جھم میں مردان علی شاہ اپنی لینڈ کروزر سے اترا تو تقریب کی رنگینی اور امراء سے لے کر غرباء تک کا جم غفیر دیکھ کر اس کے دل پر ضرب پڑی اور ان ضربوں میں اضافہ اپنے دامادوں کو ولید حسن کے دائیں بائیں پہلو بہ پہلو چلتے دیکھ کر ہو رہا تھا۔ فدا حسین تو مردان شاہ کو نظر انداز کرتا ہوا اپنے دوسرے مہمان سے گفت و شنید میں مصروف ہو گیا۔ ہدایت اللہ البتہ اپنے مخصوص رکھ رکھاؤ سے سسر کی خیر خیریت پوچھنے لگا تاہم اس کے انداز میں بھی وہ پہلے سی گرم جوشی اور اپنائیت مفقود تھی۔ وہ انہیں آگے کی رو میں بٹھانے لگا۔

ولید کے چہرے پر تمکنت مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ ہر مہمان سے پرتپاک انداز میں مل رہا تھا۔ جیسے یہی سب سے خصوصی مہمان ہو۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سیاہ شلوار سوٹ اور سیاہ رنگ کی ایمبرائڈری والی واسکٹ میں وہ ادھر ادھر پھرتا بے حد مصروف مگر ہر نظر کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

مردان شاہ ایک زہر خند سی سانس بھر کر رہ گئے۔ وہ یہ سوچ کر اپنے اندر کی نفرت، کڑواہٹ اور جھنجھلاہٹ پر قابو پانے لگے کہ اپنی تیس سالہ سیاسی زندگی میں ایسی چھوٹی موٹی رکاوٹیں، کٹھنائیاں آکر گزر گئی ہیں۔ جمہوریت کے نام پر ووٹ لے کر لوگوں کے حقوق غصب کرنے کے باوجود وہ اپنے علاقے میں اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ لوگ آج بھی ان کے نام سے خوفزدہ تھے۔ وہ اپنی سیاسی رائے کسی طور بدلیں گے نہیں۔ انہیں نے محسوس کیا سادہ سی اور عام سی اس تقریب کو کسی حد تک سیاسی اور سنسنی خیز تقریب کا روپ دیئے جانے کی کوشش کی جا رہی تھی اور کسی حد تک یہ کوشش کامیاب بھی

یہی بات توقیر شاہ کو سلگا رہی تھی۔

"یہ سب آپ کی بے جا نرمی اور تحمل کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں اپنی آنکھوں سے اپنے ہی علاقے میں یہ سب دیکھنا پڑ رہا ہے۔" توقیر شاہ کا لہجہ زہر میں بجھا تھا۔

"ایک کنگال بے حیثیت شخص ہمارے منہ کو آرہا ہے۔ کل کلاں کو وہ ہمیں حویلی سے باہر کر دے گا تو بھی آپ منہ بند کئے بیٹھیں رہیں گے۔"

"ایسے چھوٹے موٹے فتنے اٹھتے رہتے ہیں ان سے ڈرنا نہیں چاہئے۔" مردان علی شاہ دھیمے لہجے میں بولے۔

"کل کلاں یہی بڑے فتنے بن کر آپ کو اور مجھے اس سیٹ سے نکال پھینکیں گے۔ دیکھ نہیں رہے آپ پہلے آپ کا ایک داماد اس کا ہمنوا تھا آج دوسرا بھی اپنی کینچلی بدلا ہوا نظر آرہا ہے۔ یہ سب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا ہے اور آپ..." توقیر شاہ کی نظریں اپنے دونوں بہنوئیوں پر تھیں۔

توقیر شاہ جوان تھا اس کا خون گرم تھا۔ وہ ہر کام پستول کی نوک سے لینا چاہتا تھا مگر مردان علی شاہ صبر و تحمل اور سیاسی تدبر سے کام لینا جانتے تھے۔

"تمہارے خیال میں یہ چھوٹا سا سکول قائم کر کے وہ پرائم منسٹر بن جائے گا۔" ان کے لہجے میں طنز اور خفگی تھی۔ انہوں نے بیٹے کو کوستی نظروں سے گھورا تھا۔

"اب وہ زمانے لد گئے باباسائیں! جب خاندان کے سوا کوئی اور عوامی نمائندہ منتخب ہونے اور اقتدار کا خواب نہ دیکھ سکے۔ اب وقت بہت بدل گیا ہے۔ اب غنڈہ گردی کی سیاست کرنے سے خاندانی وقار پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ شرافت' تدبر گزرے زمانے کی باتیں ہیں۔"

توقیر شاہ بلبلا رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ریوالور اٹھا کر ولید حسن اور فدا حسین کو گولیوں سے اڑا کر یہ قصہ ہی ختم کر دے۔

اطراف کی کرسیاں مہمانوں سے پر ہونے لگیں تو وہ چپ ہو کر بیٹھ گیا۔

سکندر نظر آیا تو ولید بڑی تیزی سے اس کی طرف آیا۔

"اب آرہے ہو تم۔ یہ ہے تمہاری پنکچوئلٹی۔" اس نے رسٹ واچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے گھورا۔

"ماشاءاللہ۔ یہ تقریب تو تمہارے ولیمے کی لگ رہی ہے اور خیر سے تم بھی ولیمے کے دولہا ہی لگ رہے ہو۔" اس کی ڈانٹ ڈپٹ کو خاطر میں نہ لاتا ہوا اطراف میں نگاہیں دوڑانے کے بعد اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے سیٹی بجائی۔

"یہ تم نے فدا حسین کو اوقات سے بڑھ کر اہمیت دے دی ہے آج شاید۔" اس نے نظریں اب فدا حسین کے قدرے معقول قسم کے پوسٹر پر جما دیں۔

"بکواس چھوڑو اپنی۔ یہ بتاؤ آغا جی آ گئے؟"

"انہی کے ہمراہ آ رہا ہوں۔ دیر سے آنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ مجھے سونپ کر چلے آئے اور خود مرغے کے ساتھ نکل گئے۔ میرا مطلب ہے مرغ کی بانگ کے ساتھ۔" اس نے مسکرا کر تصحیح کی۔ اس پل ولید کی نظریں شہرینہ پر پڑیں۔

سیاہ سلک کے سیاہ فرانسیسی لیس سے سجے لباس میں وہ دور ہی سے نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ کچھ جز بز سا ہو کر رہ گیا۔

اس تقریب میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے اور ہر طرح کی نگاہیں تھیں۔ ایسے میں اس کا نمایاں اور کندن کی طرح دمکتا سراپا اس کی غیرت مندی کو چوٹ تو پڑی۔ ناحق اس کے آنے پر اصرار کیا۔ تاہم وہ اس خوشگوار موقع پر بدمزہ ہونا اور اسے کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

اس کی نگاہوں کے تعاقب میں سکندر نے اچٹتی سی نظر شہرینہ پر ڈالی اور سرعت سے نگاہیں بدل کر آگے بڑھ گیا۔

"تقریب تو شاندار معلوم ہو رہی ہے۔ کمال ہے تم اتنے عوامی ہو گئے ہو ہمیں پتہ ہی نہیں چلا۔" مونا بھابی بھی شہرینہ کے ساتھ ادھر ہی آ گئیں۔

وہ سر خم کر کے مسکرایا۔ پھر اس پر نظریں ٹکا کر بولا۔

"سکندر کے بقول یہ تقریب میرے ولیمے کی معلوم ہو رہی ہے اور میں ولیمے کا دولہا نظر آ رہا ہوں اسے آج۔" اس کی خوش نما آنکھوں کی سطح پر چمک سی تھی جو شہرینہ کو پلکیں جھکانے پر مجبور کر گئی۔

"شیری! میرا خیال ہے چلنا چاہئے۔ یہاں تو لوگوں کی نیت بدل رہی ہے۔ خواخواہ میں بے چارے سکندر کے کندھے پر بندوق رکھی جا رہی ہے۔" مونا بھابی کی بات پر وہ بے ساختہ قہقہہ بمشکل روک پا رہا تھا پھر سر کھجاتا ہوا انہیں گھورنے لگا۔

شہرینہ کے رخساروں کی رنگت تیز ہو گئی۔

"ہیلو ولید! میرا خیال ہے ابھی تقریب کا افتتاح نہیں ہوا۔" آمنہ علی کی آواز نے ماحول کے ساتھ دلوں پر چھائے ردھم کو بھی توڑا تھا۔

آمنہ علی کی اچانک مداخلت نے ان تینوں کی توجہ ایک ساتھ کھینچی تھی۔ ولید نے ایک ہلکی سی سانس بھر کر شہرینہ سے نظریں ہٹا کر آمنہ علی کی طرف دوستانہ مسکراہٹ اچھالی۔

"بہت شکریہ اس عزت افزائی کا۔"

وہ فارملٹی نبھا رہا تھا یا واقعی پورے خلوص کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ آمنہ علی نے ایک کھنک دار قہقہہ لگایا۔ "تم نے اتنے اصرار سے بلوایا تھا کیسے نہ آتی۔ بلکہ میرے دولت کدے پر چل کر خود آئے تھے اب اتنا حق تو بنتا ہی ہے نا تمہارا۔" اس کا انداز احسان جتانے والا تھا۔

وہ بلیو جینز اور ڈھیلی ڈھالی جرسی میں ملبوس تھی' اس کے کٹے ہوئے بال شانوں پر پڑے تھے۔ نفاست سے کیا گیا میک اپ اسے اچھا خاصا پرکشش بنا رہا تھا۔ تاہم شہرینہ کو دیکھ کر اس کے اندر حسد کی لہریں اٹھنے لگیں۔

"غالباً تم میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔"

وہ اپنے اندر کی تلخی کو اندر ہی سمیٹتے ہوئے ایک ادا سے ولید حسن کی طرف دیکھ کر بولی۔

"ایکچوئلی میں جمشید خان کے ساتھ ایمبیسی گئی ہوئی تھی بس وہیں لیٹ ہو گئے۔ تمہارا اصرار یاد آیا تو چلی آئی ورنہ ابھی ہمارا ارادہ ایک کنسرٹ میں جانے کا تھا جمی نے ٹکٹ بھی لے رکھے تھے۔

پتہ نہیں وہ اپنی اہمیت جتانا چاہ رہی تھی ولید حسن کے سامنے یا شہرینہ کے سامنے۔

ولید ایک متاسفانہ سانس بھر کر رہ گیا۔

"نوازش ہے کہ آپ نے اس حقیر پر تقصیر کو یہ عزت بخشی۔ بہر حال۔ شہرینہ سے تو تم غالباً مل چکی ہو۔"

اس نے شہرینہ کی طرف دیکھا جو آمنہ علی کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ یکدم اس نے نظروں کا رخ بدلا۔ ولید سے نظریں ملیں تو چہرے کے تاثرات میں صرف ایک پل کیلئے عجیب سا تغیر آیا۔ دوسرے پل وہ بس اس پر ایک نظر ڈال کر پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتی خالی کرسیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے بقیہ تعارفی الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔

"اوکے آمنہ! پلیز تم بیٹھو۔" اس نے سر جھٹک کر آمنہ علی کی طرف دیکھا۔

ایک رسمی مسکراہٹ اب بھی اس کے لبوں پر تھی۔

مونا بھابی بھی شہرینہ کے پیچھے چلی گئی تھیں۔ آمنہ علی ایک ترچھی نظر جاتی شہرینہ پر ڈال کر ہلکے سے ہنسی۔

"میرا خیال ہے تمہاری یہ کزن تھوڑی ڈسٹرب ہو گئی ہے۔"

اس کے لہجے سے ٹپکتا طنز بہت واضح تھا' رسٹ واچ پر نظریں ڈالتے ہوئے ولید نے حیرت کے اظہار کے طور پر ابرو اچکائے۔

"نہیں میرا نہیں خیال۔ وہ تو خود دوسروں کو ڈسٹرب کر دینے والی شے ہے۔" اس نے بظاہر لہجے میں بڑی سادگی اور معصومیت طاری کرتے ہوئے کہا تھا مگر جانے کیوں آمنہ علی کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھر آیا۔ وہ سرعت سے پلٹ کر مردان علی شاہ کی طرف بڑھ گئی۔

" تو یہ ہے آمنہ مردان علی شاہ۔" مونا بھابی نے اس کے برابر کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھری پتہ نہیں ان کی یہ ٹھنڈی سانس کس اظہار کے لیے تھے۔

افسوس

حیرت یا شاک

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کرسی پر بالکل خاموش چپ بیٹھی رہ۔ چہرے پر بلا کا ٹھہراؤ اتر آیا تھا مگر بھابی کو لگا جیسے یہ غصے اور خود آزادی کی کوئی کیفیت ہے۔

یہ غم شاید زہر بن کر رگوں میں اتر گیا تھا۔

انہوں نے آمنہ علی کو پلٹتے اور ولید حسن کو سٹیج کی طرف جاتے دیکھا پھر ہلکے سے بولیں۔

"بالکل سٹر و قسم کی ہے' کچھ بھی تو نہیں ہے اس میں' متاثر کن کوئی بات' کوئی انداز۔" انہوں نے خاصے جلے کٹے انداز میں تبصرہ کیا۔

”ہر شخص کا معیار حسن، پسند ناپسند کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے دل کی آنکھوں سے اپنی پسند کو دیکھتا اور سراہتا ہے ہو سکتا ہے جو ہماری آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا ہو وہ کسی کے دل میں پھول بن کر مہک رہا ہو۔“ وہ ہلکے سے ہنسی تھی۔

بھابی نے ملامتی نظروں سے اسے گھورنا چاہا مگر اس کے چہرے کو دیکھ کر ان کا دل بوجھل ہو گیا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دبایا۔

”کتنی فضول بکواس کرنی آ گئی ہے تمہیں۔ وہم بھی تو ہو سکتا ہے تمہارا، یوں بھی بہت سے وہم و گمان آدمی کی اپنی نظر کا فتور ہوتے ہیں۔ آنکھیں بسا اوقات اپنے اندر کے خلفشار سے مشروط ہوتی

ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ان کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ پھر پلکیں جھپک لیں لب کھینچ کر دوبارہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

دفعتاً ایک عجیب سی تلخی، غصے اور اداسی نے غلبہ پا لیا۔ اسے اپنی رگوں میں دوڑنے والا لہو بھی جیسے کڑوا محسوس ہونے لگا۔ اندر ایک عجیب سی آگ بھڑک اٹھی تھی جو آنکھوں تک

پہنچ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔ مگر باوجود چاہنے کے وہ ایسا نہ کر سکی تھی بلکہ گم سم ہو کر کارروائی دیکھنے لگی۔

فضا میں رنگین غبارے چھوڑے جا چکے تھے۔ ہر طرف تالیاں اور مبارک کا شور تھا۔

اوپننگ ایک بچے سے کرائی جا رہی تھی۔ جو دبلا پتلا مفلوک الحال مگر ذہین اور طلب علم کے شوق سے لبریز دکھائی دے رہا تھا۔ اوپننگ کے وقت اس کی آنکھیں ہیروں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ وہ ماسٹر دین محمد کے سکول کا سب سے ذہین بچہ تھا۔ اس نے اپنے سندھی لب و لہجے میں بس اتنا کہا۔

”اس سکول کے کھلنے سے ہم سب بچے بہت خوش ہیں، اب ہم بھی بہت سا پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن سکیں گے اور اس ملک کو ترقی کی راہ پر لائیں گے، جہالت کا اندھیرا دور کر دیں گے۔“

”اس کے بعد مقامی سکول کے ہی بچوں نے ”لب پہ آتی ہے دعا“ پر ٹیبلو پیش کیا اور حاضرین سے خوب داد وصول کی۔ یہ اس گائوں کی اس طرح کی پہلی تقریب تھی۔ جن میں مزدوروں اور غریب دیہات والوں کے بچوں کو اتنی اہمیت دی جا رہی تھی اور ان کی

صلاحیتوں کو سامنے لایا گیا تھا' پھر ان سب میں گفٹ تقسیم کیے گئے جنہیں تھامتے ہوئے ان کے معصوم چہروں کی چمک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ساتھ میں ان کے والدین کے چہرے بھی قابل دید نظر آ رہے تھے۔

ایک طرف مووی اور کیمروں کی تیز روشنیوں نے رونق لگا رکھی تھی۔ دوسری طرف فدا حسین کے ورکروں نے۔

مختلف مہمان آتے گئے اور روایتی جملوں سے اس کام کو سراہتے گئے۔ مردان علی شاہ کو بھی سٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی مگر انہوں نے گلا خراب ہونے کا بہانہ کرتے ہوئے معذرت کر لی۔

فدا حسین کے بعد ولید حسن آیا تو ورکروں نے کچھ زیادہ ہی تالیاں اور نعرے بازی کر لی کہ اسے ہاتھ کا اشارہ دیکر روکنا پڑا۔

"مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ لوگوں نے ہمارے اس کام کو سراہا اور اس سے زیادہ مسرت انگیز بات یہ ہے کہ آپ لوگوں نے اس تقریب میں شرکت کر کے حوصلہ بخشا۔ میں آپ سب کا ممنون ہوں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس نے ڈائس پر دونوں ہاتھ جما کر حاضرین پر ایک مسکراہٹ بھری نظر ڈالی' اس کی یہ مسکراہٹ بلاشبہ دل موہ لینے والی تھی۔

"دانا کا قول ہے کہ 'جس گھر میں آدمی بیمار رہتا ہے گھر والے سبھی دکھی ہوتے ہیں پس جس ملک کے پچانوے بلکہ ننانوے فیصد باشندے جہالت کے مہلک ترین مرض میں مبتلا ہوں وہ کیسے خوشحال رہ سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے اور بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمارے صاحب اقتدار لوگ محض کرسی نشین ہونے کیلئے تو جتن کرتے ہیں' بہت مشقت اٹھاتے ہیں اور پاپڑ بیلتے ہیں مگر اس معاشرے کے مہلک مرض کے تدارک کیلئے کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ میری اور فدا حسین صاحب کی یہ ادنی سی کوشش ہے کہ اس دبیز اندھیرے میں ایک چھوٹی سی علم کی شمع جلائی جائے' بہت دور تک نہ سہی قریب قریب ہی کچھ اجالا ہو جائے۔ میں کسی بھی صاحبِ اقتدار کو مورد الزام نہیں ٹھہرا رہا۔ اگر وہ از خود غافل ہیں تو ہم تو خود پر عائد کردہ فرائض سے کوتاہی نہ برتیں۔

حدیث نبویؐ ہے کہ 'علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔'

اور کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ ہم اپنے حقوق کیلئے تو لڑتے ہیں‘ مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں‘ اس کیلئے ریلیاں نکالتے ہیں‘ جلسے کرتے ہیں مگر فرائض سے یکسر غافل ہیں‘ اس کی آگہی کیلئے کوئی جلسے نہیں کیے جاتے کوئی آواز نہیں اٹھائی جاتی‘ در حقیقت ہم سب مادہ پرستی کی لپیٹ میں آہستہ آہستہ آتے جا رہے ہیں‘ حکمرانوں سے لے کر نچلے طبقے تک‘ خواص سے عوام تک سب کچھ لینے کی دوڑ میں مصروف ہیں‘ کچھ دینے کی لگن ہمارے اندر سے ختم ہو چکی ہے اور اس نفسا نفسی میں ہم موت‘ آخرت اور حشر کا دن بھول رہے ہیں۔

بنی اسرائیل میں ایک آدمی نے بہت سا مال جمع کیا تھا‘ جب وہ مرنے لگا تو اس نے اپنے بیٹوں سے کہا‘ میرا سب قسم کا مال دکھلائو‘ سب قسم کی قیمتی چیزیں اور زر و جواہر اس کے سامنے لائے گئے جب اس نے ان چیزوں کو دیکھا تو بہت رویا۔ ملک الموت نے جو اس کو روتے دیکھا تو کہا‘ کیوں روتے ہو؟ قسم ہے رب العزت کی کہ میں تیرے جسم سے جان کو نکالے بغیر نہ نکلوں گا۔ اس نے کہا مجھے اتنی مہلت تو دے کہ میں ان چیزوں کو خدا کی راہ میں صدقہ دے دوں۔ ملک الموت نے کہا یہ نہیں ہو گا۔ اب موت کا وقت آ گیا۔ اس وقت سے پیشتر جو اتنی مہلت دراز تجھے حاصل تھی اس میں کیوں نہ دیدیا۔ یہ کہہ کر اس کی روح قبض کر لی۔

ہنستی ہے گویا اہل تکبر کی شان پر

پتلا تو خاک کا ہے‘ دماغ آسمان پر

بس یہی ہے دنیا‘ مال و زر اور اقتدار کی حقیقت۔‘‘ وہ چند لمحوں کیلئے چپ ہو گیا۔

اس کے لفظوں‘ اس کے انداز بیاں کا سحر تھا ماحول پر ایک خوبصورت سی خاموش کیفیت طاری تھی۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ ایک عجیب سی افسردگی سے بولا۔

’’بہت پہلے اس چھوٹے سے گائوں میں ایک ایڈووکیٹ نے یہاں کے سیدھے سادے معصوم لوگوں کو حقوق و فرائض کی آگہی دینے کا عزم اٹھایا تھا۔ ایک پارٹی ’’عوامی اتحاد پارٹی‘‘ کے نام سے تشکیل دی تھی جس نے بہت کم وقت میں بہت شہرت اور محبت حاصل کر لی تھی۔ مگر بدقسمتی کہ انتخابات سے ایک دن پہلے اس پارٹی کے لیڈر کو اس کے سگے خون کے رشتوں نے‘ اسے اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے بڑی بے رحمی سے اس کے پورے گھرانے کو آگ کی نذر کر دیا۔ مگر اس ایڈووکیٹ حسن علی شاہ کا بیٹا اپنی جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اپنے باپ کو اس دہکتی آگ سے تو نہ بچا سکا تاہم اس کے فرمودات کو بچا کر اپنے سینے اور بستے میں دبائے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔‘‘

وہ لحظہ بھر رکا' اسے اپنے اعصاب پر بھاری بوجھ محسوس ہونے لگا۔ کنپٹیوں پر رگوں کے بجائے سخت لوہے کی تاروں کا جال بچھا ہوا محسوس ہونے لگا تاہم وہ لبوں پر کشادہ مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوتے ہوئے بولا۔

" اور آج ایڈووکیٹ حسن علی شاہ کا بیٹا ولید حسن آپ کے سامنے ہے اسی جذبے' اس عزم کے ساتھ جو اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا ہے۔"

وہ ایک طویل گہری سانس بھر کر چپ ہو گیا اور چپ کی اس دہکتی نظروں سے اس نے کئی چہروں کو تحیر کی لپیٹ میں آتے دیکھا جس میں مردان علی شاہ سرفہرست تھا۔

ان کے وجود پر ایک گہرا سکوت اتر گیا تھا۔ وہ پلک جھپکائے بنا ولید کو دیکھ رہے تھے۔ عجیب و غریب وہم انہیں آج کل پریشان کیے رکھتے تھے۔ مگر اس نوبت کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"یہ ایک بہت لمبی کہانی ہے۔ میں فرصت میں آپ لوگوں کو ضرور سناؤں گا۔ اس وقت تو صرف آپ کے اخباروں کیلئے ہیڈ لائن ہی بہت ہے۔"

ولید اب پریس والوں کی طرف متوجہ ہوا اور مسکرا کر ان کے تیزی سے چلتے قلم دیکھنے لگا۔

اس کے اندر ایک جوار بھاٹا تھا مگر وہ بڑی مشکل سے اپنے اعصاب کو نارمل رکھے ہوئے تھا۔

" مردان علی شاہ کے چھوٹے بھائی حسن علی شاہ' ایڈووکیٹ حسن علی شاہ کا بیٹا' ولید حسن... " چہ مگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ مردان علی شاہ کے قریبی جاننے والوں کی نظریں کبھی ولید پر کبھی مردان علی شاہ پر اٹھ رہی تھیں۔

"پلیز! اس کہانی کو ابھی رہنے دیجئے' ناحق میری تقریب متاثر ہو رہی ہے۔" اس نے سٹیج پر ایک پر تجسس رپورٹر کو نرمی اور معذرت کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ پھر ڈائس کو ہلکے سے ہاتھ سے بجا کر بولا۔

"میں یہاں ایک بہت معزز شخصیت کو اوپر آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ جو میرے استاد ہیں' میرے لیے قابل عزت۔" اس نے ایک ورکر کی طرف اشارہ کیا تو ماسٹر دین محمد کو تھام کر اوپر لانے لگا۔

ماسٹر دین محمد کے قدموں میں ہلکا سا لرزہ طاری تھا۔ ذرا سا لڑکھڑائے مگر ولید نے انہیں جلدی سے تھام لیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے۔ 'جس شخص نے مجھے ایک حرف کی بھی تعلیم دی ہے اس نے مجھے اپنا غلام بنالیا۔'

آج میں بھی ماسٹر دین محمد کا غلام ہوں۔ انہوں نے مجھے ایک حرف نہیں بلکہ سال بھر کی کتابیں پڑھائی تھیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ماسٹر دین محمد کا ہاتھ تھاما اور عقیدت سے لبوں سے لگا کر چوما پھر انکی طرف دیکھ کر بولا۔

"یاد ہے نا ماسٹر صاحب! میں حسن علی شاہ کا بیٹا ہوں' بڑا سا بستہ لے کر آپ کے پاس آتا تھا۔ آپ مجھے اکثر ٹوکتے تھے کہ اپنے قد سے بڑا بستہ لے کر آتا ہوں۔"

اس نے جیسے ماضی کے کسی منظر پر پڑے پردے کی ڈوریاں کھینچنی شروع کی تھیں۔

ماسٹر دین محمد کی آنکھوں کی سطح نمی سے چمک رہی تھی۔ پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ کا نپنے لگی۔

"میں... میں تمہیں پہچان گیا۔ بلکہ پہلی بار جب تم میرے سامنے آئے تھے' میں نے تمہیں پہچان لیا تھا مگر صرف تمہارے باپ کی شبیہہ کے باعث' مگر آج... ماضی پورا کا پورا میرے

سامنے کھڑا ہے اور مجھے بالکل صاف دکھائی دے رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے اب بھی تمہاری کمر پر وہی بڑا سا بستہ لٹک رہا ہے۔"

وہ بے ساختہ ہنسا اور ماسٹر دین محمد نے اسے آگے بڑھ کر گلے سے لگالیا۔

اس دم اچانک فائرنگ کی آواز گونج اٹھی جس نے کرسیوں پر بیٹھے لوگوں کو ہراساں کر دیا۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔

اس نے جلدی سے ماسٹر دین محمد کو ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ بے ساختہ اس کی نظریں پہلی رو کی طرف گئیں تو بے اختیار ایک گہری قدرے متاسفانہ سانس اس کے لبوں سے نکل گئی۔

مردان علی شاہ اپنی پوری فیملی سمیت جا چکے تھے۔ وہ شاید درمیان میں ہی بہت چپکے سے وہاں سے چلے گئے تھے۔

ایک بھنچی بھنچی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے سر جھٹکا اور سٹیج سے نیچے اترا۔ کرسیاں کھٹا کھٹ خالی ہونے لگی تھیں۔ لوگ مارے بدحواسی کے داخلی دروازے کی طرف بھاگ رہے تھے۔

"ولید!" فدا حسین حواس باختہ اس کی طرف آیا۔

"اس طرح تو ہونا ہی تھا فدا حسین!" اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر تھپکی دی اور سرعت سے آغا جی کی طرف بڑھا۔

"آپ لوگ اس طرف سے نکل جایئے۔ وہاں گاڑی کھڑی ہے۔"

"ولید! ہم بھی جوابی فائرنگ کر سکتے ہیں اس کتے توقیر شاہ کو میں چھوڑوں گا نہیں۔"

فدا حسین دھاڑتا ہوا اپنے ورکروں کو ہدایت کرنے لگا کہ ولید نے اسے سختی سے روک دیا۔

"نہیں فدا حسین! ہمیں جوابی کارروائی کچھ نہیں کرنی۔ بس کوشش کرو ان کے فائرنگ کرتے کوئی ورکر ہاتھ لگ جائیں۔ باقی ایف آئی آر کٹوائیں گے۔ میں فی الحال کیس کباڑوں میں الجھنا نہیں چاہ رہا۔"

"کیس کباڑے؟ میں تو... میں اب توقیر شاہ کو جھونکوں گا۔ اس نے ابھی میرا دم خم دیکھا نہیں ہے۔" فدا حسین گویا آگ چبا رہا تھا۔ اس کا پورا وجود دہک رہا تھا۔ ولید ہلکے سے مسکرایا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اس انکشاف کے بعد یہ تو ہونا ہی تھا کیا تم اور میں ایسپیکٹ نہیں کر رہے تھے۔"

فدا حسین اسے صرف دیکھ کر رہ گیا اور پلٹ گیا جبکہ وہ آغا جی کی طرف آیا۔

"شہرینہ کہاں ہے۔" اسے پہلا خیال اسی کا آیا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو اسے پچھلی رو میں وہ کرسی پر دھنسی نظر آئی۔ بالکل چپ چپ۔ گم صم جیسے اپنے اطراف ہونے والی اس افراتفری سے بے نیاز ہو۔

وہ بڑے بڑے ڈگ بھرتا اس کی طرف آیا۔

"میں قطعی افسوس کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں کندھے پر لاد کر یہاں سے بھاگ نہیں سکتا کہ اس معاملے میں' میں بالکل اناڑی ہوں۔" وہ اس کی کرسی پر ہاتھ رکھ کر اسے بہ نظر غور دیکھتا اس کی طرف جھکا تھا مگر وہ یونہی بیٹھی رہی' بے حرکت۔

"کم آن شیری!" وہ جھنجھلا گیا۔

"اٹھو جلدی سے۔ دیکھ نہیں رہی ہو کیا حالات ہو گئے ہیں۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کر دیا۔ تب اس نے اس پر ایک خاموش مگر سلگتی نظر ڈالی اور آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر آگے کی کرسی کو دھکیل کر باہر نکل گئی۔

ولید نے متعجب نظروں سے اسے دیکھا۔ آغا جی کا ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس ہوا تو ایک ہلکی سی سانس بھر کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"اسے کیا ہو گیا ہے' شاید میری تقریب خراب ہونے پر دکھی ہو گئی ہے۔" وہ شگفتگی سے ہنسا۔

آغا جی بھی ہلکے سے مسکرائے اور اس کے مضبوط اعصاب کو دل ہی دل میں سراہے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ اس لمحے جس ذہنی کرب اور اس اچانک اُمڈ آنے والی افتاد کا شکار تھا۔ ایسے میں اپنے اعصاب کو کنٹرول کر کے شگفتگی ظاہر کرنا بھی اس کا کمال تھا۔

وہ اسے ہلکے سے تھپکتے ہوئے بولے۔

"اسے بھی وہی ہوا ہے جو مردان شاہ کو ہوا ہے۔ یعنی اس انکشاف پر حیرت یا شاک' اینی وے تم چلو میں اسے لے کر آتا ہوں۔" وہ اپنی سٹک لے کر آگے بڑھ گئے۔ اس نے مونا بھابی کے ساتھ قدم ملا کر جاتی شہرینہ کو خالی نظروں سے دیکھا۔

ایک عجیب سا کھنچاؤ اسے اپنی کنپٹیوں پر محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اپنے اوپر مضبوط خول چڑھائے بیٹھا ہے۔ جو چیخ رہا ہو۔ اس کا دل چاہا وہ یہیں کرسی پر بیٹھ کر کچھ دیر کیلئے اپنے ماضی میں گم ہو جائے' حال سے کٹ جائے اور وہ خاموش ہو کر اپنے دل کے زار و قطار رونے کی آوازیں سنتا رہے۔

"سکندر!" اس نے سکندر کو آواز دے کر پکارا جو غالباً خود بھی اس کا متلاشی تھا۔

"اف! قیامت کا منظر لگ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے۔" وہ ایک ملول سی سانس بھر کر اس کے نزدیک چلا آیا۔

"فائرنگ کی آواز کیا تھی جیسے صور پھونک دیا گیا ہو۔" وہ ہلکے سے ہنسا۔ اسی نے لب بھینچ کر بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ قیامتیں تو اس کے اندر برپا تھیں۔ ایک شور تھا۔ ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ جیسے لہریں سر پٹخ پٹخ کر واویلا مچا رہی ہوں۔ اندر طوفان کی رستہ خیزی تھی۔ بظاہر وہ خود کو

پر سکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا اندرونی خلفشار' اس کے چہرے اور آنکھوں کی سرخیوں سے ظاہر تھا۔ سکندر اس کے چہرے پر پھیلی کیفیت کو دیکھ کر چپ سا ہو گیا۔ پھر یاد آنے پر بولا۔

''ہدایت اللہ وہاں گاڑی میں تمہارا منتظر ہے شاید۔''

''اسے جانے دو۔ تم میرے ساتھ آئو۔ آج مجھے تمہاری ضرورت ہے' سکندر۔''

وہ سکندر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے مسکرایا۔ مگر اس کی مسکراہٹ روح سے خالی تھی۔ بے حد بجھی بجھی اور پھیکی سی۔

''آئو چلیں۔'' وہ قدم اٹھاتا داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

X...X...X

نومی نے مووی لا کر یاسر کو دی تھی اور یاسر نے وہ مووی اپنے وی سی آر میں لگا دی۔

دوسرے پل سکرین پر ایک گھریلو رنگا رنگ تقریب دکھائی دینے لگی۔

رنگ برنگے کپڑے۔

مہکتے دل لبھاتے چہرے اور بیک گرائونڈ میں موقع کی مناسبت سے گانے

یاسر اشتیاق سے دیکھنے لگا۔

نومی سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس نظر آیا تو افتخار نے سیٹی بجائی۔

''واہ بھئی واہ! بڑے ٹائٹ لگ رہے ہو۔ کسی ریاست کے پکے پکے شہزادے لگ رہے ہو۔''

نومی جھینپ گیا۔ مگر دوسرے پل اس کے اندر ایک اداسی تیر گئی۔

اس خوشگوار' پر مسرت تقریب کا انجام اتنا ہی ناخوشگوار ہوا تھا۔

یکدم سکرین پر عظمیٰ دلہن بنی جلوہ گر ہوئی تو اس کی اداسی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ ایک ہوک سی اٹھی۔ کتنی قریب تھی۔ اس کی بنائی جا رہی تھی ہمیشہ کیلئے۔ مگر آہ ہا۔ تقدیر نے کیسا پلٹا کھایا کہ وہ اس سے نہ صرف چھین لی گئی تھی بلکہ شجر ممنوعہ بنا دی گئی۔

یاسر کا ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس کر کے وہ ایک بھنچی بھنچی سانس بھر کر رہ گیا۔

"کیوں فکر کرتے ہو۔ یہ آج بھی تمہاری ہے اور کل بھی تمہاری ہی ہو گی۔ بس ذرا حوصلہ رکھو اور صبر سے وقت کا انتظار کرو۔"

اس نے سکرین پر مہکتی عظمیٰ کو نظروں کے زاویوں میں فٹ رکھتے ہوئے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالی۔

"یہ بتاؤ کالج کتنے بجے آف ہوتا ہے اس کا؟"

"ایک ڈیڑھ بجے تو غالباً لڑکیاں باہر ہی نظر آتی ہیں۔"

"ہوں۔ اسے کوئی گھر سے لینے تو نہیں آتا۔ یا کالج وین وغیرہ میں جاتی تو نہیں ہے۔" یاسر کی نظریں ہنوز سکرین پر عظمیٰ کے سراپے پر جمی تھیں اور اس کا ایک ایک نقش گویا ازبر کر رہی تھیں۔

"نہیں میرا خیال ہے یہ پیدل ہی آتی جاتی ہے۔ ایک سٹاپ کے فاصلے پر تو ہے اس کا کالج۔ کبھی دو لڑکیاں اور بھی ہمراہ ہوتی ہیں اور کبھی وہ اکیلی ہی ہوتی ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"واہ بھئی۔ محبوبہ کی ایک ایک لمحے کی خبر ہے۔ اس کی ایک ایک جنبش پر نگاہ ہے۔ نومی تو سچ مچ کا فرہاد ہے یار!" افتخار نے ابرو اچکا کر نومی کو دیکھا اور زوردار قہقہہ لگایا۔

"ویسے لڑکی چھانٹ کر پسند کی ہے' ابے گائودی تیری چوائس بھی ایسی لش پش ہو گی' مجھے خبر نہ تھی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ لڑکی اچھی معلوم ہوتی ہے۔" یاسر نے بھی افتخار کے تبصرے پر تائیدی انداز میں سر ہلایا تو نومی کا چہرہ یوں کھل اٹھا جیسے یہ عظمیٰ کی نہیں اس کی تعریف کی جا رہی ہو۔ اس کی نگاہیں عظمیٰ پر جم گئیں۔

تم سا کوئی پیارا کوئی معصوم نہیں ہے
کیا چیز ہو تم خود تمہیں معلوم نہیں ہے
لاکھوں ہیں مگر تم سا یہاں کون حسیں ہے
تم جان ہو میری تمہیں معلوم نہیں ہے

مووی کیمرے نے اس کے ایک ایک انگ کو اجاگر کیا ہوا تھا۔ ہر زاویے پر گویا وہ نومی کے دل پر قیامتیں ڈھا رہی تھی۔ اس کے اندر اسے پانے کی جستجو بڑھ گئی۔ دل ہیجان خیز جذبات سے مچلنے لگا۔

جادو تیری نظر، خوشبو تیرا بدن

"ہمارے ایک کھلاڑی نے بھی کینسر ہسپتال بنایا تو کہنے والے اسے شہرت کمانے کا ذریعہ قرار دے کر بدنام کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ حالانکہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے اس ملک کے عوام کو کتنی سہولیات میسر آ گئیں۔ در حقیقت یہ ہمارا بہت بڑا المیہ ہے کہ لوگ نیکی کے پس منظر کو کھنگالنے کی کوشش کر کے اس میں سے بدی نکالنے کے جتن کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں لوگوں کو پتہ نہیں کیوں کسی کے صاف شفاف آئینے جیسے کردار پر دھبا دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ کردار کشی کر کے لوگ جانے کیوں مطمئن اور مسرور ہوتے ہیں۔"

سکندر نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"تم برا مان گئے حالانکہ میرا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا۔ بس صحافی ہونے کے ناتے ایسے الٹے سیدھے جملے منہ سے پھسل جاتے ہیں۔"

"برا تو خیر نہیں مانا تاہم سوچ رہا ہوں صحافت یونہی بدنام نہیں ہے۔" اس نے زیر لب مسکرا کر سکندر کی طرف دیکھا۔

"ہم پر الزام تو ویسے بھی ہے، ایسے ہی سہی۔" سکندر نے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"آں...آ... خیر ایسے ہی، تو نہیں۔" اس نے سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرتے ہوئے ترچھی نظر اس پر ڈالی۔

سکندر نے دیکھا اس ہلکی پھلکی گفتگو سے اس کے چہرے کے تنے زاویے پھر معمول پر آ گئے ہیں تاہم اس کی شگفتگی میں اس کی آنکھیں ابھی بھی ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی گہرائی میں قدرے اداسی تھی مگر ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

"سکندر! میں سوچتا ہوں کہ دنیا میں ٹھیک ہے جنت وجود میں نہیں آ سکتی مگر ہم اپنے خطہ کو اپنے ملک کو خوشگوار بنا سکتے ہیں۔ سچ کہا ہے کسی دانا نے کہ 'وہ شخص اپنی قوم پر تباہی لاتا ہے

جو کبھی بیج نہیں بوتا، نہ کبھی تعمیری اینٹ اٹھا کر اینٹ پر رکھتا ہے اور نہ کوئی کپڑا بنتا ہے، لیکن سیاست کو اپنا پیشہ بنالیتا ہے۔''

تم غور کرو سکندر آج ہمارا ملک اسی طرح کے سیاستدانوں کے نرغے میں نہیں ہے کیا؟

اگر ایک تعمیری کام ہوتا ہے تو اس کے پیچھے کتنی لوٹ مار ہوتی ہے۔ کتنی اندھیر مچی ہوئی ہوتی ہے کہ اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ہمارے سیاستدان بے غرض اور درد مند نہیں ہیں اور یہی ہماری قوم کا سب سے بڑا المیہ ہے۔''

اس کے لہجے میں حقیقی افسردگی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا اس کا دل بھی کراہ رہا ہو۔ سکندر نے متاسفانہ سانس بھری اور تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''اتنا کچھ لکھا جاتا رہا ہے ان کے بارے میں، کیسے کیسے پردے چاک ہوتے رہے ہیں مگر بے سود۔ اور تو اور ولید! غریب ان پڑھ عوام پر ہی کیا الزام دھریں جب شہر کے پڑھے لکھے، باشعور عوام کو بھی میں نے لیڈروں کا حمایتی پایا ہے جب تقریبات میں مجھ سے کوئی سوٹڈ بوٹڈ بحث کرنے چلا آتا ہے کہ آپ نے ہمارے اس فلانے لیڈر کے خلاف اتنی زہر افشانی کر دی اپنے کالم میں، اسے اتنا کچھ کہہ دیا، اپنے قلم کی حرمت باقی نہیں رکھی۔ مجھے تو آپ اس

لیڈر کے دشمن معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے سیاستدان وزیر مشیر تو آپ کو نظر ہی نہیں آتے ہیں وہ تو اس فلانے سے زیادہ لوٹ مار مچا چکے ہیں زیادہ کھا چکے ہیں اور اس وقت میرا دل سچ مچ سر پیٹ لینے کو چاہتا ہے کہ لوگ کالم نگار کے قلم کی برائیاں تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ان کے فیورٹ دل عزیز لیڈر نے یہ اندھیر مچا رکھی ہے۔ اس طرح ان کے اعتماد کا خون کر رہے ہیں۔ اب وہ اس فلانے سے کم بھی کھا رہا ہے تو کھا تو رہا ہے اور کیوں کھا رہا ہے؟ کیا حق رکھتا ہے ایک تنکا بھی کھانے کا؟ اس پر لوگ سوچ بچار نہیں کرتے۔''

وہ طیش میں آ گیا تھا۔

''یہی تو دکھ ہے۔ کل کے قاتل آج کے وزیر ہیں۔''

ولید نے سگریٹ سلگائی اور خود کو صوفے پر ڈھیلا چھوڑتے ہوئے مجروح انداز میں مسکرایا۔ پھر ہونٹوں کے درمیان سے دھواں نکال کر آنکھوں کے گرد پھیلا کر دھوئیں کے اس مرغولے پر نظریں مرکوز کر دیں۔ کچھ دیر بعد وہ اس مرغولے میں جانے کیا کھوجتا رہا۔ کسی احساس سے نکل کر اس نے ایک طویل کش لے کر دھوئیں کے درمیان نیم وا آنکھوں سے سکندر کو دیکھا۔

"میں جانتا ہوں، تمہارے ذہن میں بہت سے سوالات مچل رہے ہیں تقریب کے حوالے سے اور میری تقریر کے حوالے سے بھی۔ اور یہ کہ حسن علی شاہ کون ہے جس کا حوالہ میں نے دیا۔ ہے نا؟" اس نے ایک نظر سکندر پر ڈالی پھر جھک کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر صوفے سے کھڑا ہو گیا اور اضطرابی انداز میں کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا جیسے اچانک ہی اسے کھلی ہوا کی اشد ضرورت محسوس ہونے لگی ہو۔

"ہاں بات تو حیرت کی ہی ہے۔" سکندر صاف گوئی سے بولا اور دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا۔

چند لمحے کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ سکوت کا یہ لمحہ بڑا بوجھل سا تھا مگر مختصر تھا۔

"سکندر! میرے پاس تمہارے اخبار کیلئے بڑی سنسنی خیز سٹوری ہے۔" وہ سکندر کی طرف دیکھنے کے بجائے لان میں پھیلے ملگجے اندھیرے کو گھورتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا پھر یکدم ہنس

نقصان کے بعد بیٹے کے نقصان کا سوچ کر ہی ان کے وجود کی بجھتی لو تیز ہو گئی تھی۔ ان کے ٹھٹھرے وجود میں جیسے دھماکہ ہوا۔ یوں جیسے ساکت پانی کی سطح پر کوئی شہاب ثاقب گرا ہو

اور اندر سینہ زور زور سے دھڑکنے لگا۔ رکا ہوا دل پورے زور و شور سے دھڑکنے لگا اور انگلیوں کے آخری پوروں تک خون پمپ کرنے لگا۔ زخموں سے چور پیروں میں روانی آ گئی۔

جانے وہ کتنا بھاگے تھے کہ اچانک اس نے اپنی ماں کو اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ کھردری سخت زمین پر بکھری کانٹے دار سوکھی ٹہنیوں پر اس کی ماں گرتے ہی سکوت کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

اس کا جسم بھی گویا پتھر ہو گیا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے اوندھے منہ گری ماں کو دیکھا اور جیسے اسے اپنا لہو سرد سرد ہوتا محسوس ہونے لگا۔ آگ کے شعلے اور اس کا چیختا، مدد کیلئے پکارتا باپ، قاتلوں کی سفاک آوازیں سب کچھ اس کے ذہن سے محو ہو گیا۔ صرف اس کی نظروں میں اس کی ماں کا وجود آ ٹھہرا جیسے دنیا سے رابطہ یکدم کٹ گیا ہو اور وہ ایک سنسان ویران جزیرے میں تنہا کھڑا ہو۔ چاروں طرف گہرا سکوت ہو۔ صرف یخ بستہ ہوائیں سنسنا رہی ہوں۔ پھر اسے لگا جیسے آہستہ آہستہ اس کا دل بھی دھڑکنا چھوڑ رہا ہے۔ شاید ایسا ہی تھا۔ اسے خبر نہ تھی کہ وہ سانس لے بھی رہا ہے یا نہیں۔ بس آنکھیں اس کی ماں پر جمی تھیں۔

اس کے بعد اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ شاید وہ بھی اپنی ماں کی طرح سکوت کا ہی حصہ بن گیا تھا مگر گرتے ہوئے اس کی آنکھوں کے آگے روشنی کا جھماکا ہوا تھا جو کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ کا تھا۔

X...X...X

وہ مکمل طور پر بیہوش نہیں تھا مگر باوجود اس کے اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ بس سڑک پر گزرتی گاڑیوں کا شور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہا تھا۔ اس کے ارد گرد جیسے تاریکی کی دلدل پھیلی ہوئی تھی اور اس کا وجود برف کی سل کی طرح اس میں اترا ہوا تھا۔

دفعتاً گاڑی کے پہیوں کی چرچراہٹ اسے بے حد نزدیک سنائی دی جس کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے کچھ زیادہ تھی مگر اب بھی اس کی آنکھیں مکمل طور پر اندھیرے کے حصار میں تھیں۔

"کیا ہوا جہانگیر؟" فرنٹ سیٹ پر بیٹھے پائپ پیتے شخص نے اچانک گاڑی روکنے پر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اپنے بیٹے کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا اس اندھیرے میں اور صحرائی راستے میں گاڑی روکنے کا کیا مقصد تھا۔

"مجھے لگ رہا ہے شاید کچے میں کوئی شخص پڑا ہوا ہے۔"

وہ یہ کہتے ہوئے سرعت سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

"آغا جی!" اس نے ہاتھ ہلا کر انہیں پکارا تو وہ پائپ بجھا کر نیچے اترے۔

"اوہ..." ان کے قدم ٹھٹھک گئے ایک بچہ اور عورت کانٹوں پر بے سدھ پڑے تھے۔

"میرا خیال ہے یہ ابھی صرف بیہوش ہیں۔" بیٹے نے باپ کے چہرے پر جھلکتی پریشانی دیکھ کر کہا اور نرمی سے بچے کو اٹھا کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

"جہانگیر! یہ کون ہو سکتے ہیں اور اس طرح ویرانے میں کیوں پڑے ہیں؟"

"اب تو یہ ان کے ہوش میں آنے پر ہی کچھ پتہ چل سکے گا۔" اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور احتیاط سے بچے کو بٹھا دیا۔

"کپڑوں لتوں سے تو اچھے گھر کے معلوم ہو رہے ہیں۔" آغا جی نے جھک کر عورت کو دیکھا پھر قدرے الجھن بھرے انداز میں سانس بھری۔

"خدا رحم کرے جانے کیا حادثہ پیش آیا ہوگا ان لوگوں کے ساتھ۔" انہوں نے جھک کر احتیاط سے بیٹے کے ساتھ مل کر اسے کندھوں سے تھام کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔

"ماں بیٹا معلوم ہوتے ہیں۔" انہوں نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ایک اچٹتی نظر دونوں پر ڈالی۔

"مگر اس صحرا میں کیسے اور کیونکر آ گئے؟"

"ہو سکتا ہے آغا جی! کسی قریبی گاؤں کے ہوں وہیں سے آئے ہوں' یوں بھی یہاں سے آبادی اتنی زیادہ دور نہیں ہے۔ کچھ بھلا سا نام بھی ہے گاؤں کا مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔"

"ہوں..." آغا جی نے سر ہلایا اور بچے پر نگاہ ڈال کر بولے۔

"کپڑوں سے تو دیہاتی بھی نہیں لگتے بلکہ کسی اچھے گھرانے کے معلوم ہوتے ہیں۔ خیر اب تو یہ ان کے ہوش میں آنے پر ہی معلوم ہو سکے گا۔"

"اوہ..." اچانک جہانگیر نے گاڑی کو بریک لگائے۔

آغا جی نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"مجھے یاد آیا ہم نے جس جگہ سے انہیں اٹھایا ہے وہاں ایک بلیک کلر کا بیگ بھی پڑا ہوا تھا۔"

"اچھا... تو یہ تو ہمیں مس نہیں کرنا چاہیے تھا ہو سکتا ہے وہ بیگ ان کیلئے بہت اہم ہو' لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی بیگ کیلئے وہ بھاگے ہوں یا پھر..."

"یا پھر یہ کہ وہی بیگ چوری کر کے بھاگے ہوں۔" وہ شگفتگی سے ان کی بات کاٹ کر مسکرایا تو آغا جی نے اسے گھورا۔

"اوہ ہوں..." پھر پچھلی سیٹ پر نظر ڈال کر سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولے۔ "چہرے سے تو چور اچکے بالکل نہیں لگتے۔ خیر چلو جلدی سے گاڑی پیچھے لو' یوں بھی اس وقت ہم خاصے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔"

جہانگیر نے جلدی سے گاڑی ریورس کی۔ بیگ اپنی جگہ جوں کا توں مٹی میں اٹا پڑا ہوا تھا۔ اس نے احتیاط سے اٹھا لیا اور واپس گاڑی میں آ بیٹھا۔

"بھئی اسے پہلے جلدی سے کھول کر چیک کر لو کوئی بم شم نہ ہو۔" آغا جی نے کہا تو ان کے گھبرائے ہوئے انداز پر وہ بیگ ان کی گود میں شرارت سے پھینک کر ہنس پڑا۔

”اتنے ڈرپوک تو نہیں ہیں آپ۔ مجھے تو یہ سب ایڈونچر سا لگتا ہے۔“

”تمہارا جوان خون ہے ایسی باتوں پر تم لطف نہیں اٹھاؤ گے تو کون اٹھائے گا۔“

”خیر بوڑھے تو آپ بھی نہیں ہیں باون سال کی عمر تو مردوں کی جوانی کی عمر ہوتی ہے اور آپ تو دیکھنے میں بھی میرے ہم عمر لگتے ہیں۔“ وہ شریر ہو رہا تھا مگر آغا جی نے سنی ان سنی کرتے ہوئے بیگ کی زپ کھول کر اندر دیکھا۔ مگر انہیں کتابیں' ڈائری اور دو عدد جرسیاں اور اسی طرح کی چند اور بے ضرر چیزوں کے علاوہ کوئی ایسی مشکوک شے نظر نہ آئی تو انہوں نے زپ بند کر دی پھر بیگ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولے۔

”بیگ اسی بچے کا معلوم ہو رہا ہے اور اچھا خاصا قیمتی معلوم ہو رہا ہے۔“ پھر ایک ہلکی سی سانس بھر کر بیگ احتیاط سے سیٹ کے نیچے رکھ دیا۔

”پتہ نہیں کیا افتاد آ پڑی ہو گی ان پر 'عورت کی حالت تو خاصی ناساز لگ رہی ہے گھر جا کر تم پہلا کام یہ کرنا کہ ڈاکٹر فرید کو فون کر دینا کہ وہ اپنی مسز ڈاکٹر سلیمہ کو لے کر آ جائے اس وقت تو دونوں گھر پر ہی ہوں گے۔“ انہوں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی پھر کسی خیال کے تحت ہلکے سے مسکرائے۔

”گھر میں سب ہی چونک پڑیں گے کہ باپ بیٹا حیدر آباد سے واپسی پر کسے اٹھا کر لے آئے ہیں۔“ پھر خود ہی سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولے۔ ”شاہینہ تو خیر خوش ہی ہو گی وہ بھی سوشل کاموں میں خاصی دلچسپی رکھتی ہے۔“ ان کا اشارہ اپنی بہو کی طرف تھا۔

”جی ہاں! آپ چچا بھتیجی کے خیالات میں خاصی ہم آہنگی ہے اسی لیے آپ کو یہ بطور بہو بھا گئیں۔“

”کیا مطلب تمہیں نہیں بھائی“ انہوں نے بیٹے کو مصنوعی خفگی سے گھورا تو وہ جھینپ گیا اونچا لمبا شخص شرمایا ہوا کچھ عجیب سا اور خاصا پیارا لگا آغا جی کو۔

”ویسے یہ زیادتی ہے یہ سوال اب پوچھ رہے ہیں شادی کے چودہ سال بعد' آہا... بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔“

”شریر“ آغا جی نے محظوظ ہوتے ہوئے ہلکی ہنسی کے ساتھ ایک چپت اس کے کندھے پر ماری۔

X...X...X

"ہوش تو اسے گاڑی میں ہی آچکا تھا مگر وہ یونہی پڑا رہا۔ اسے اطمینان ہوا تھا کہ اس کی ماں اس کے نزدیک ہی لیٹی ہوئی ہے۔ اگلی سیٹوں پر اسے دو مردوں کے سر نظر آئے۔ ایک نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا بھی تھا وہ دونوں دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے ان کے چہروں اور آوازوں میں سفاکی اور درندگی نہیں تھی وہ چہرے ان قاتلوں کے ہرگز نہیں لگ رہے تھے جو ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے بلکہ وہ صورت سے مہربان اور مہذب نظر آ رہے تھے۔

وہ یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا بھوک اور نقاہت سے اس کا برا حال تھا۔ ذہن بیدار ہو جانے کے باوجود اسے لگ رہا تھا وہ خلا میں ہے۔ کیا خلا جہاں دل دوز تاریکی کے سوا کچھ نہیں ہے ایک خوف اس کی رگوں سے اب بھی لپٹا ہوا تھا اس نے آنکھیں پھر موند لی تھیں۔

گاڑی ایک بڑے سے پورٹیکو میں رک چکی تھی پھر احتیاط سے اسے کسی نے یوں گود میں اٹھا لیا جیسے وہ شیر خوار ہو اور اسے اس کی ماں نے ممتا کی تمام تر نرماہٹوں سے اٹھایا ہو۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میرا خیال ہے اسے ہوش آگیا ہے۔" ایک مہربان آواز اس کی سماعت میں اتری۔

"پھر بھی تم فون تو کر دو ڈاکٹر فرید کو' عورت کی حالت مجھے بے حد خراب لگ رہی ہے۔ مجھے تو ٹھیک سے اس کی نبض بھی دھڑکتی محسوس نہیں ہو رہی ہے۔" دوسری آواز اس سے کہیں زیادہ مشفق معلوم ہوئی۔

اس نے اچانک پوری آنکھیں کھول دیں۔

وہ ایک آرام دہ بستر پر دراز تھا اور اس کے ارد گرد بہت سے اجنبی ناآشنا مگر مہربان چہرے موجود تھے۔

وہ ایک عالیشان کمرہ تھا۔ ریشمی پردے دیوار پر چھت سے نیچے تک لٹک رہے تھے۔ دبیز قالین' ٹک کا جدید طرز کا فرنیچر اور چھت پر لٹکتا فانوس۔ مگر اسے یہ ساری چیزیں اجنبی نہیں لگیں۔ شاید اس

"یادداشت تو اس کی متاثر ہوئی معلوم نہیں ہوتی البتہ کسی واقعہ کا خوف ابھی تک اس کے اعصاب پر سوار ہے۔"

"تو پھر یہ بولتا کیوں نہیں ہے کم از کم اپنا نام ہی بتادے۔" عورت بے تابی سے بولی۔

"کیسی بات کرتی ہو شائستہ' کہہ تو رہے ہیں ڈاکٹر صاحب کہ خوف اس کے اعصاب پر سوار ہے۔اس کے بولنے اور سننے کی صلاحیتوں پر اثر پڑا ہے۔"

"ہاں جہانگیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔اس کے سارے اعصاب متاثر ہوئے ہیں خوف بتدریج کم ہوتا جائے گا وہ خود کو کسی حد تک محفوظ تصور کرے گا تو خود ہی بولے گا۔آپ اس پر دباؤ نہ ڈالیں نہ خود پریشان ہوں' سوائے خوف کے اور کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے اس کے ساتھ کیوں ینگ بوائے ایم آئی رائٹ؟" ڈاکٹر نے نرمی سے اس کے بالوں کو منتشر کر دیا۔

مگر وہ یونہی بے تاثر خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک کے علاوہ سردیوں کی شاموں جیسا سکوت چھایا ہوا تھا۔

اس کے ہاتھ میں ڈرپ لگا دی گئی اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا بس خاموشی سے یونہی پڑا رہا کمرے سے سب باہر چلے گئے مگر وہ عورت اس کے پاس بیٹھی اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی کچھ دیر بعد ایک تیرہ چودہ سال کا لڑکا اندر داخل ہوا۔

"یہ میرا بیٹا ہے وسیم' اس سے دوستی کرو گے تم۔" وہ لڑکے کی طرف دیکھ کر پھر اس سے پیار سے بولی۔

"میرا خیال ہے تمہارا نام بہت پیارا سا ہو گا' جتنے تم پیارے ہو اتنا ہی خوبصورت۔ہے نا؟" شاید انہیں اس کی طرف سے جواب کی اب توقع نہ رہی تھی خود ہی سوال اور جواب کر رہی تھیں۔

"تم سکول یقینا جاتے ہو گے۔اس لیے تم دیکھنے سے بہت ذہین بچے لگتے ہو۔سکول کا نام کیا ہے تمہارے۔"

"اوہو مما' کیوں بے چارے کو پریشان کر رہی ہیں۔" ان کے بیٹے نے ہنس کر ٹوکا تو وہ مسکرانے لگیں۔

"مجھے اچھا لگتا ہے وسی! اس سے باتیں کرنا۔اس میں کچھ عجیب سا سحر ہے میں نے اتنا اٹریکٹو اور ذہانت سے بھری آنکھوں والا بچہ نہیں دیکھا۔یہ چپ ہے مگر لگتا ہے اس کی آنکھیں میرے ہر سوال پر ایکسپریشن دیتی ہیں۔" عورت کا گداز ہاتھ اس کے ریشمی بالوں میں الجھ گیا وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں کو سہلانے لگیں۔آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں

بند ہونے لگیں۔ شاید کسی نیند کے انجکشن کا اثر تھا جب وہ مکمل گہری نیند میں ڈوب گیا تو عورت اٹھ کر کمرے سے چلی گئی۔ جاتے جاتے دروازہ آہستگی سے اچھی طرح بند کر گئی۔

X...X...X

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے بڑے سے بیڈ پر خود کو تنہا پایا۔ اس کی ماں اس کے نزدیک لیٹی ہوئی نہیں تھی۔ پہلے تو سمجھا کہ شاید وہ ہاسٹل کے کمرے میں ہے پھر متوحش سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ کمرہ ہاسٹل کا تو نہیں تھا نہ اس کے گھر کا بیڈ روم تھا۔

”امی...امی...“ وہ یکدم زور زور سے چلانے لگا۔ اس کی یہ حرکت بالکل بے ساختہ تھی۔

”علی نواز!“ اس نے گھر کے ملازم کو پکارا‘ اسی وقت کمرے کا دروازے کھلا اندر آنے والی ایک ملازمہ تھی علی نواز نہیں تھا۔

یہ ملازمہ اس کیلئے قطعی اجنبی تھی۔ اس چہرے والی تو کوئی ملازمہ اس کے گھر میں نہیں تھی۔ پھر یہ کہاں سے آگئی۔

”جاگ گئے۔“ ملازمہ کے پیچھے ایک دوسری عورت اندر داخل ہوئی جسے دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور جیسے اس کے دماغ میں چھنا کا سا ہوا۔ وہ آہستگی سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ کل کا سارا منظر اس کی آنکھوں کی سطح پر لہرانے لگا۔

تو وہ اپنے گھر میں نہیں تھا‘ یہ کمرہ اس کا اپنا نہیں تھا پھر اس کی ماں کیسے یہاں ہوتی مگر اس کی ماں کل تو اس کے ساتھ تھی۔

”امی... میری امی کہاں ہیں۔“ اس کی آواز سن کر عورت کی سنہری جھیل جیسی آنکھوں میں یکلخت چمک سی لہرا گئی۔ اس کا دل شاید بے حد مسرور ہوا تھا۔

”تمہیں نیند تو رات بھر آئی نا۔“ وہ مسکرا کر آگے بڑھی۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

”آئو تمہیں تمہاری ماں کے پاس لے جائوں۔“ وہ اسے لیے کمرے سے نکل آئی۔

”آغا جی! میں اسے ہاسپٹل لے کر جا رہی ہو۔“ وہ اسے ایک بڑے کھلے ہوئے کمرے میں لے آئی۔ یہ ڈائننگ روم تھا جہاں اسے کئی افراد میز کے گرد ناشتا کرتے نظر آئے۔ ان میں کل والے دو مردوں کے علاوہ ایک نوعمر لڑکا اور ایک چھوٹی سی سنہری بالوں والی بچی تھی۔

"مگر پہلے ناشتا تو کرادو اسے۔"

"نہیں آغا جی میرا خیال ہے یہ ناشتا نہیں کرے گا جب تک اپنی ماں سے نہ ملے۔اس نے آنکھ کھلتے ہی اپنی ماں کو پکارا تھا۔" وہ اس پر ایک نظر ڈال کر آغا جی سے بولی تو انہوں نے سر ہلایا اور کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے بولے۔

"بیٹا تمہاری ماں کو ہم نے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کیا ہے یہ بہت ضروری تھا۔اسے کچھ زخم آئے ہیں ناں؟""

(کچھ...کچھ کہاں بہت زخم آئے ہیں اس کی ماں کو)

وہ سر جھکا کر فرش کو گھورنے لگا۔وہ ابھی چھوٹا تھا اس کا دل جو محسوس کر رہا تھا اس کے اظہار کیلئے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔اس کا ذہن اور دل صرف محسوس کر سکتے تھے۔ محسوسات کو لفظوں کا پیرا دھن پہنانے سے قاصر تھے۔

وہ ایک لمبی سی گاڑی میں بیٹھ کر ہاسپٹل آیا تھا۔اس کا دل بے حد مضطرب تھا اپنی ماں سے ملنے کو۔

وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔

وہ ان کے پیچھے اندر آیا۔تب ہی اس کی نظریں دیوار سے لگے ایک بیڈ پر پڑیں، جہاں اس کی ماں لیٹی نظر آئی۔ہاتھوں میں کہیں کہیں سفید پٹی بندھی دکھائی دے رہی تھی آہٹ پر اس نے بھی چہرہ موڑا تھا۔دوسرے پل اٹھنے لگی مگر وہ ان سے پہلے دوڑ کر ان سے لپٹ گیا تھا۔

"ولید میری جان میرے چندا۔"

"اوں ہوں حوصلہ رکھو۔دیکھو تم روگی تو اسے کس طرح تسلی دو گی۔" اس نے دونوں ماں بیٹے کے نزدیک آکر اپنائیت آمیز نرمی سے اس کی ماں کو رونے سے ٹوکا تھا مگر لگ رہا تھا اس کی ماں آنسوؤں کا دریا بہانے کا عزم کیے بیٹھی ہے۔

مگر وہ خود...وہ خود کیوں نہیں رو رہا تھا حالانکہ اس کے اندر ایک عجیب سی آگ بہہ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا ایک سمندر ہے کھولتا ہوا۔سرخ سرخ دہکتا ہوا جو اچھل اچھل کر آنکھوں تک آتا تھا مگر آنکھ کے ساحل پر صرف تپش چھوڑ کر اتر جاتا تھا۔

اس کی ماں کے آنسو اس کے بالوں‘ چہرے اس کے کندھوں کو بھگو رہے تھے پھر اس کی ماں نے اسے خود سے الگ کیا اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کو ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے تکنے لگی۔

”امی‘ آپ پاپا کیلئے رو رہی ہیں نا۔ میں‘ میں تھوڑا سا بڑا ہوتا تو ضرور پاپا کو بچا لیتا۔“ اس نے جیسے مجرمانہ انداز میں اپنی کمزوری کا اعتراف کیا تو اس کی ماں نے اسے خود سے بھینچ لیا۔

”نہ میرے چندا! میرے جانو... میں رو تو نہیں رہی ہوں تم... تم میرے پاس ہو۔ میرے ساتھ ہو۔“ وہ پھر رونے لگیں۔

”آپ فکر مت کریں۔ پاپا بالکل خفا نہیں ہیں ہم سے‘ انہیں خبر ہے کہ ہم انہیں بچا نہیں سکتے تھے۔ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ جانتے تھے میں بھی چھوٹا تھا۔“

وہ مہربان عورت آہستگی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی اور کوریڈور میں آ گئی۔

”ارے بھابی آپ رو رہی ہیں۔“ ڈاکٹر فرید یہاں سے گزرے تو ٹھٹھک کر رک گئے۔

”کم آن بھابی‘ آپ کی مریضہ بالکل ہوش میں ہے انشاءاللہ بہت جلد صحت یاب بھی ہو جائے گی۔“

”ڈاکٹر صاحب! میں نے آج تک اتنا مضبوط باہمت بچہ نہیں دیکھا وہ کس طرح اپنی ماں کو تسلی دے رہا ہے۔“ وہ اپنی چادر کے کنارے سے آنکھوں کے گوشے صاف کرنے لگیں اور ادھ کھلے دروازے پر ایک نظر ڈال کر بولیں۔ ”جانے کن ظالموں نے اس کے باپ کو ان سے جدا کر دیا ہے۔“

”آئیں آپ ادھر آ کر بیٹھیں۔“ ڈاکٹر فرید نے بینچ کی طرف اشارہ کیا۔ ”جہانگیر ساتھ نہیں آیا آپ کے۔“

”نہیں میں بچے کو لے کر آئی ہوں ولید نام ہے شاید اس کا۔ اس نے اٹھتے ہی اپنی ماں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور مجھے لگا وہ اب اپنی ماں سے ملے بغیر ایک سیکنڈ بھی نہیں بیٹھے گا‘ اس کی ماں کو ہوش آ گیا تھا اس لیے میں اسے ملوانے لے آئی۔ میں نے غلط تو نہیں کیا نا؟“ آخری جملہ کہتے ہوئے اس نے ڈاکٹر فرید کی طرف دیکھا۔

جو کسی خیال سے چونک کر سر نفی میں ہلا کر کمرے کی طرف بڑھ گئے' جبکہ وہ بینچ پر بیٹھی رہیں ان کے اندر عجیب سے اداسی اتر رہی تھی۔ پھر وہ آنسو پونچھتی اٹھ کر راہداری کی ریلنگ پر جھک کر نیچے جھانکنے لگیں۔

''میرا نام ولید ہے آپ کا نام کیا ہے میڈم!'' وہ چونک کر مڑیں تو وہ کھڑا انہیں ممنون نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ان کے لب بے ساختہ مسکرائے۔

''آئی ایم تھینک فل ٹو یو آپ نے میری مما کا بہت خیال رکھا' ہم آپ کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ بلکہ یہاں سے جا کر آپ سے ملنے بھی آیا کریں گے۔ آپ کا نام کیا ہے میڈم!'' وہ کسی بڑے آدمی جیسی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ شائستہ نے قدرے حیرت پھر محبت سے اسے دیکھا۔

''اوہوں' میڈم نہیں آنٹی اور آپ ابھی کہیں نہیں جا رہے' ابھی آپ کی مما کے زخم ٹھیک نہیں ہیں۔ انہیں ڈاکٹر صاحب اتنی جلدی چھٹی نہیں دیں گے وہ جب تک مکمل ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔ ہاسپٹل سے جا نہیں سکتیں۔'' پھر وہ ریلنگ سے ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف ذرا جھکیں گو کہ انہیں زیادہ اس لیے نہیں جھکنا پڑا کہ وہ اچھے خاصے قد کا بچہ تھا۔

''تم بہت کیوٹ سے بچے ہو' تمہارا نام بھی بہت پیارا ہے' مجھ سے دوستی کرو گے۔''
انہوں نے نرمی سے اس کے رخسار پر انگلیاں پھیریں تو وہ جھجک کر پیچھے ہٹ کر سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ تو مجھ سے بہت بڑی ہیں۔ آپ سے بھلا کیسے دوستی ہو سکتی ہے اور پھر میں تو لڑکا ہوں اور آپ...'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ اسے لڑکی کہے یا کوئی اور لفظ استعمال ہونا چاہیے۔

اس کے لب بھینچ کر چپ ہو جانے اور رخساروں پر اترنے والی سرخی نے شائستہ کو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

''جس طرح ماں بیٹے کی دوستی ہوتی ہے نا' ماں بچے کی سب سے اچھی دوست ہوتی ہے نا اسی طرح ہماری بھی دوستی ہو سکتی ہے' میں آنٹی ہوں تمہاری۔''

''ہیلو کیا ہو رہا ہے۔'' آغا جی اس طرف چلے آئے وہ پلٹا اور ہلکے سے مسکرایا۔ شاہینہ نے پہلی بار اسے مسکراتے ہوئے دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ بے حد بھلی لگی۔

''کیا حال ہے ینگ بوائے۔'' انہوں نے جھک کر اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

اب کے نہ وہ جھجکا نہ بدکا بلکہ اپنی جگہ اعتماد سے کھڑے سر ہلا دیا۔اسے یہ اونچے لمبے' سرخ سپید رنگ والے آغا جی' جانے کیوں بہت اچھے لگے تھے۔ ہلکے ہلکے براؤن بالوں پر کہیں کہیں سفید بال بھی تھے' جو کنپٹیوں پر کچھ زیادہ نمایاں تھے۔کلف لگے شلوار سوٹ اور واسکٹ میں وہ انہیں کسی بادشاہ' کسی حاکم کی طرح لگے۔

بادشاہوں کی کہانیوں سے اسے ہمیشہ دلچسپی تھی۔اسے حاکموں' بادشاہوں اور مشہور دلیر لوگوں کی کہانیاں قصے ہمیشہ سے پسند تھے۔ٹیپو سلطان' طارق بن زیاد' خالد بن ولید' محمد بن قاسم اور اس طرح کے دوسرے فاتحین کے قصے اس نے اپنے باپ کے منہ سے سنے تھے۔ایک بار نہیں کئی بار اصرار کر کے سنے تھے۔اسے کبھی کبھی اپنا باپ بھی طارق بن زیاد' محمد بن قاسم ہی لگتے۔آغا جی کو دیکھ کر بھی اسے خود بخود وہ سارے نام اور قصے یاد آ گئے۔

''اب کیسی طبیعت ہے اس کی ماں کی۔'' وہ شائستہ سے پوچھ رہے تھے جس نے اس سوال پر ایک ہلکی سی سانس بھری اور اس پر ایک نظر ڈال کر آغا جی کو نظروں ہی نظروں میں کچھ کہا پھر بولی۔

''ہاں اب خاصی بہتر ہے۔'' پھر ولید کی طرف پلٹی۔''گھر چلو گے ؟تم نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔'' اس کی بات پر چاہنے کے باوجود وہ انکار نہ کر سکا۔شاید بھوک کا احساس اس آفر پر شدید ہو گیا تھا وہ خاموشی سے ان کے ہمراہ چلا آیا۔

ملازم نے اس کیلئے کھانے کی میز سجادی تھی اور شائستہ اس کے آگے محبت سے ایک ایک چیز رکھتے ہوئے بولی۔

''تمہارے پاپا کا نام کیا ہے ولید۔''

وہ نوالہ منہ میں لے جاتے ہوئے ذرا سا ٹھٹکا پھر ہلکے سے بولا۔

''حسن علی شاہ۔''

شائستہ نے سر ہلایا اور کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئی۔

وہ خاموشی سے کھاتا رہا پھر کچھ سوچ کر وہ بولی۔

"وہ کون لوگ تھے جو تمہارا پیچھا کر رہے تھے۔ کس کے خوف سے تم اپنی ماں کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ کیا انہی لوگوں نے تمہارے باپ کو نقصان پہنچایا ہے۔ تم جانتے ہو ان لوگوں کو۔"

وہ' پانی کا گلاس منہ سے لگائے لگائے یکدم ساکت ہو گیا۔ پھر آہستگی سے گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔ اچانک ہی وہ گم صم سا ہو کر غیر مرئی نقطے کو گھورنے لگا۔

"مجھے بتاؤ ولید تم جانتے ہو ان لوگوں کو؟ کون تھے وہ اور تمہارے پیچھے کیوں بھاگے تھے۔ کوئی ڈاکو تھے' چور تھے۔"

شاید اس سوال کا جواب اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ اس لیے اس کی گہری خاموشی کیونکر ٹوٹتی اس نے صرف پلکیں اٹھائیں پھر جھپکا دی۔

شائستہ ایک ہلکی سی سانس بھر کر رہ گئی۔ اس کے بعد اس نے اپنا سوال نہیں دہرایا۔

مگر رات آغا جی اور جہانگیر احمد نے اسے اپنے پاس بٹھا کر اسی طرح کے سوالات پوچھنے کی کوشش کی تو وہ بالکل گم صم ہو گیا۔ البتہ اس کے رخساروں پر سرخی سمٹ آئی اور مٹھیاں بھینچ گئیں یوں جیسے وہ کسی غم و غصے کے ابال کو اندر ہی اندر اتار رہا ہو اور کسی بے بسی کی اذیت سے دوچار ہو۔ اس کے چہرے پر پھیلی کیفیت نے دونوں کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھا۔

ان لوگوں کا خیال تھا وہ جانتے بوجھتے کچھ بتانا نہیں چاہتا' یا پھر حد سے زیادہ محتاط تھا۔

بہر حال اس گھر کے مکینوں کا خیال تھا یہ لڑکا جس کا نام ولید تھا ضرور کسی اچھے سکول کا طالبعلم تھا اور اسکے اطوار گواہی دے رہے تھے اس کا تعلق کسی فاقہ کش یا جاہل گھرانے سے نہیں تھا۔ نہ اس کی ماں کسی ایسے گھرانے سے لگتی تھی۔ بہر حال وہ کون تھے۔ ان کو کیا حالات در پیش تھے۔ یہ گتھی تو وہ عورت ہی سلجھا سکتی تھی جو غم و اندوہ کی تصویر بنی چپ چاپ ہاسپٹل کے بیڈ پر پڑی رہتی یا پھر روتی رہتی تھی۔

شائستہ اسے بہت نرمی اپنائیت اور محبت سے سنبھال رہی تھی۔ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت کے پیش نظر اس نے اس سے کسی قسم کے سوال وجواب نہیں کیے تھے۔ مگر ایک ہفتہ گزرنے کے بعد وہ

عورت خود ہی ایک روز بولی۔

"تم لوگوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں کون ہوں' کہاں سے آئی ہوں' میرے ساتھ کیا ہوا۔" اس کے لہجے میں دل گرفتگی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی۔

"اتنی جلدی کیا ہے تمہاری حالت اچھی ہو جائے گی تو یقیناً تم خود ہی بتا دو گی' ابھی تمہارے زخم بھی بھرے نہیں ہے۔"

شائستہ اسی اپنائیت بھری نرمی سے مسکرائی تو وہ عورت ایک دو پل اس کی سنہری آنکھوں کو دیکھتی رہ گئی۔ جہاں اجنبیت نام کو نہیں تھی بلکہ ایسی اپنائیت تھی جو اپنے سگے رشتہ داروں سے ہی ہو سکتی ہے۔

وہ پلکیں جھپک کر لب دانتوں میں دباتے ہوئے سامنے دیوار کو گھورنے لگی۔

"زخم؟ میرے زخم کبھی نہیں بھریں گے۔ ان پر کھرنڈ کبھی نہیں آئے گا۔ یہ زخم لا دوا ہیں۔" وہ بے آواز رونے لگی۔

"یہ جو باہر تمہیں جھلستی جلد دکھائی دے رہی ہے نا اس سے کہیں زیادہ روح زخمی اور جھلسی ہوئی ہے جس پر کوئی مرہم اثر نہیں کرے گا۔"

نہیں ایسے مت کہو' ہر زخم کا علاج وقت کے پاس ہوتا ہے۔ بڑے بڑے گھاؤ بھر جاتے ہیں' وقت ان پر مرہم رکھتا ہے۔" شائستہ نے اس کی بات کاٹی۔

"ہاں گھاؤ بھر جاتے ہیں مگر کسک تو رہ جاتی ہے نا۔" اس نے نم پلکوں کو جھپک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر جیسے اندر سے اٹھی کسی درد کی لہر کو دباتے ہوئے بولی۔

"ہر زخم کا علاج وقت کے پاس کہاں ہوتا ہے' اتنے بڑے نقصان کا ازالہ پھر کہاں ممکن ہے جو کھو چکی ہوں کیا وقت مجھے وہ لا کر دے گا۔ کبھی کبھی وہی وقت تو اپنے پنجوں میں ناقابل تلافی نقصان لے کر آتا ہے۔ ہماری جھولی میں وہ دکھ ڈال جاتا ہے جو کھال کی طرح ہمارے جسم کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اتارے نہیں اتر سکتے۔"

"تم اپنا دکھ بیان کر دو... شاید تمہیں تھوڑا آرام آ جائے۔ میرے پاس تمہارے دکھ کی دوا نہ ہو مگر کم از کم میں تسلی کے پھاہے تو رکھ سکتی ہوں۔"

اس کا کرب آلود چہرہ اسے بری طرح تکلیف دے رہا تھا۔ وہ فطرتاً نرم دل عورت تھی۔ کسی کے آنسو وہ دیکھ نہیں سکتی تھی اور اس کے سامنے بیٹھی عورت تو آنسوؤں کا ہی حصہ لگ رہی تھی۔

اس کے کرب کا اندازہ اس کے آنسوؤں سے اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ اس کے تسلی آمیز لہجے پر وہ ایک ہنکاری بھر کر اسے دیکھنے لگی۔

''حسن علی شاہ کی نرم ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر کبھی سوچا نہیں تھا کہ یہ چھاؤں یوں یکدم چھن جائے گی۔ ایسی کڑی دھوپ آ جائے گی۔ کوئی اس مہربان شخص کو مجھ سے یوں جدا کر دے گا۔ میں میں کیسے جی پاؤں گی؟ خدایا میں زندہ کیسے رہوں گی؟ اس کے بنا میں یہ زندگی کیسے گزار پاؤں گی۔'' وہ یکدم زور شور سے رونے لگی۔

''حوصلہ رکھو' پلیز حوصلہ رکھو۔'' شائستہ کو لگا جیسے یہ گرم گرم آنسو اس کے دل پر آگ کی گولیوں کی طرح گر رہے ہوں۔

''کبھی کبھی انسان کتنا بے بس اور لاچار ہو جاتا ہے۔ رینگنے والے کیڑے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور' چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔'' کچھ دیر رونے کے بعد وہ بھرائی ہوئی

آواز میں بولی اور بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھیں موند کر گہری خاموشی میں اتر گئی۔

اس کی یہ خاموشی جانے کتنی دیر رہی شائستہ نے بھی اس سکوت کو نہیں توڑا تھا۔ وہ اپنے ماضی میں جھانک رہی تھی یا اپنی کیفیت کو قابو کر کے بولنے کا حوصلہ جمع کر رہی تھی۔ کئی لمحے اسی خاموشی کی نذر ہو گئے پھر وہ آنکھیں کھول کر تھکی تھکی سی مضمحل سی سانس بھر کر بولی۔

''میں نے کبھی بڑے اور اونچے خواب نہیں دیکھے تھے اس لیے کہ میں خوابوں میں رہنے والی لڑکی تھی نہیں۔ آئیڈیل ازم پر میں یقین نہیں رکھتی تھی یا پھر شاید فرصت ہی نہیں تھی مجھے ایسی باتوں کو سوچنے کی۔ یوں بھی ایک مڈل کلاس گھرانے میں جہاں صبح و شام معاشی فکریں پڑی ہوں وہاں ان باتوں کا وقت کہاں مل سکتا ہے۔ ابو کی وفات کے بعد تو میرے اندر کی وہ شوخ اور ہنستی مسکراتی لڑکی بھی مر گئی تھی۔ امی کو حالات کی چکی میں پستے دیکھتے دیکھتے میں عمر سے کئی گنا بڑی ہو گئی تھی۔ وکیل بننا میرا خواب یا شوق نہیں تھا بس یونہی بے سوچے سمجھے میں نے یہ فیلڈ منتخب کر لی۔ بہر حال کچھ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی۔''

اس کی آواز بے حد دھیمی تھی کئی منظر اس کی نم آنکھوں کے پار لہرانے لگے تھے شاید۔ وہ ذرا دیر خاموش ہو گئی۔ کالج میں اس کی کم سخنی اور الگ تھلگ رہنے کی عادت کو سب نے ہی محسوس کر لیا تھا خود اسے اس کا احساس نہیں تھا۔ اسے تو بعد میں پتہ چلا کہ وہ اپنے کلاس فیلوز کی نظروں میں ''مغرور'' کہلائی جاتی ہے۔

شروع شروع میں تو سب یہی سمجھے کہ وہ کسی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ کسی سے سیدھے منہ بات کرنا پسند نہیں کرتی وغیرہ وغیرہ۔ مگر جب سال بھر بعد سب کو پتہ چلا کہ وہ ایک مڈل کلاس قسم طبقے سے تعلق رکھتی ہے تو اس کے مزاج پر پھر نئے سرے سے تبصرے ہونے لگے۔ نئے ریمارکس دیئے گئے۔

''اونہہ کچھ ہے نہیں جانے کس بات پر بے چاری اتنا اکڑتی ہے۔''

''شاید کمپلیکس کا شکار ہے۔''

اسے حیرت ہوتی وہ تو اتنی عام سی لڑکی تھی سب نے ہی بلاوجہ اسے خاص بنا دیا تھا آئے دن اس کی ذات کو موضوع گفتگو بنا کر۔ بہر حال اسے ان تبصروں' فقروں اور جملوں سے کوئی سروکار نہیں تھا ہاں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

جب اس کی ذات کے ساتھ فائنل کے حسن علی شاہ کا نام بھی زیر گفتگو آنے لگا تب وہ چونکی۔ بات ہی چونکنے والی تھی۔

حسن علی شاہ کوئی عام سا سٹوڈنٹ نہیں تھا۔ غیر معمولی ذہین اور محفلوں کی جان۔ لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن ہونے کے علاوہ وہ اندرون سندھ کے کسی زمیندار کا بیٹا تھا جو اپنی لمبی سے گاڑی میں آتا' اونچا لمبا خوبصورت سراپے والا۔ جس کے لب کم اور آنکھیں زیادہ مسکراتی تھیں جو شاید بولتا بھی آنکھوں ہی سے تھا اور سب کو اپنے سحر میں جکڑتا بھی اسی طلسم سے تھا۔

پہلے تو اس نے بھی اس لیے دھیان نہیں دیا کہ شاید یہ کسی کی شرارت ہو۔ اس طرح کے ہیرو ٹائپ لڑکوں کے ساتھ تو عموماً لڑکیوں کے نام چسپاں ہوتے ہی رہتے ہیں۔

مگر اس روز اس کے ساتھ ایک انوکھا ہی واقعہ پیش آیا جس نے اسے نہ صرف ٹھٹکا دیا بلکہ کسی حد تک پریشان بھی کر دیا۔

حسن علی شاہ نے اپنے گروپ کے ایک لڑکے وحید رضا جو اس کا اچھا دوست بھی تھا اس کی بری طرح پٹائی کر دی۔ وہ بے چارا اچھا خاصا زخمی ہوا تھا۔ یہ خبر کئی روز سے گردش کر رہی

تھی۔اس نے بھی یہ خبر سنی تھی بلکہ اسے سنائی گئی تھی۔اس خبر کے پس منظر میں بھی اس کی ذات کو موسوم کیا جارہا تھا بلکہ اپنی کلاس فیلو نیلوفر کے منہ سے تو اس نے یہ تک سنا تھا کہ

"اونہہ ایسا کیا ہے عاظمہ میں کہ حسن علی شاہ نے اپنے دوست کو اس بری طرح پیٹ ڈالا۔"

وہ گھبرا کر وہاں سے اٹھ آئی۔ عجیب سے حالات ہو گئے تھے پس پردہ اسے کچھ نہ کچھ سنایا جاتا رہا تھا۔ معنی خیز مسکراہٹ سے واسطہ پڑنے لگا تھا۔

اور اس روز تو حد ہو گئی وہ لان کے ایک گوشے میں بیٹھی اپنا کام کر رہی تھی کہ وہی پٹا وحید رضا اس کے پاس آیا۔

"السلام علیکم مس عاظمہ!" وہ قدرے فاصلے پر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"مجھے وحید رضا کہتے ہیں میں حسن علی شاہ کا بہت اچھا دوست ہوں بلکہ تھا شاید۔" اس کی اٹھتی استفہامیہ نظروں کے جواب میں اس نے اپنا تعارف کرایا۔ساتھ ہی ایک ٹھنڈی آہ بھری۔"حسن نے مجھے مارا ہے یہ خبر آپ تک بھی پہنچ گئی ہو گی۔"

اس نے جلدی سے پلکیں جھپکا دیں اور دوبارہ کتاب پر نظریں جما کر بے پرواہی سے بولی۔

"کون حسن علی شاہ؟"

جواباً اس کا حیرت سے اچھلنا لازمی تھا۔وہ آنکھیں پھاڑے اسے تکنے لگا۔

"حسن... حسن علی شاہ آپ، آپ نہیں جانتیں اسے۔" اس نے بہ غور سے خود اسے دیکھا پھر ہنسنے لگا، اب اتنی معصوم بھی مت بنیے مس عاظمہ کیا کہنے کہ

دل کو خبر نہیں ہے اور درد ہے جگر میں
ہمسایہ سو رہا ہے بے فکر اپنے گھر میں

"مسٹر وحید رضا میں ایسی بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔" اس نے تپ کر کتاب بند کر دی۔

"ارے جائیے، بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔" اس نے اس کے تپنے کا قطعی نوٹس نہیں لیا بلکہ اسے باقاعدہ گھورتے ہوئے بولا۔

"آپ کے مجنوں نے یہ میرا حال کر دیا اور آپ کہتی ہیں کون حسن علی شاہ۔یہ دیکھ رہی ہیں آپ نشان حیدر، تمغہ امتیاز۔" اس نے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا جہاں دائیں آنکھ سے ذرا نیچے جامنی دھبہ نظر آرہا تھا۔وہ ایک نظر ڈال کر جلدی سے نگاہوں کا زاویہ بدل گئی۔

حقیقتاً وہ حیران پریشان ہو رہی تھی۔

"آپ کی اس فضول گوئی کا آخر مقصد کیا ہے۔ آپ میرے پاس کیوں اور کیا بتانے آئے ہیں۔"

"کچھ بتانے نہیں بلکہ آپ کی خدمت لینے آیا ہوں' بات یہ ہے مس عاظمہ صاحبہ کہ وہ جج بنا بیٹھا ہے۔ وکیل صفائی کو موقع بھی نہیں دے رہا ہے میں اپنی معافی اس کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں مگر وائے۔ وہ جتنا نرم ہے اتنا ہی گرم ہے۔ اب یہ عرضی لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ کہ آپ اس حقیر بندے کی خطا کو اپنے اس ظالم مجنوں کے دربار میں معاف کرا دیں۔ میری تو شکل دیکھ کر وہ بارود کی طرح پھٹنے لگتا ہے۔"

"مائی گاڈ' آپ' آپ کیا کہہ رہے ہیں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔" وہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

ایک لفظ بھی تو پلے نہیں پڑا تھا' اس کی آنکھوں میں حقیقی حیرت' پریشانی اور معصومیت تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سبز رنگ کے دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ اس لمحے اتنا معصوم پرنور لگ رہا تھا کہ وحید رضا بے چارا نظریں چرا کر رہ گیا۔ اور ایک ٹھنڈی سی سانس بھری۔

'واقعی حسن علی شاہ کا دل یونہی دیوانہ نہیں ہوا۔'

"دراصل میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ حسن سے کہیے کہ وہ مجھے معاف کر دے میری خطا کو بخش دے آپ کی بات وہ ضرور مان لے گا۔"

"مگر کیوں؟ کیوں میں ایسا کہوں آخر؟ میں تو ان کو ڈھنگ سے جانتی بھی نہیں ہوں' نہ ان سے میری کوئی سلام دعا ہے۔ مائی گاڈ آپ سب لوگ آخر کیا سمجھے رہے ہیں میں تو..." وہ غصے سے پھٹ پڑی۔ آنسو یکایک آنکھوں سے پھوٹ نکلے جنہیں وہ دوپٹے کے کنارے سے جلدی سے پونچھنے لگی۔

"ارے رے' آپ آپ تو رونے لگیں۔" وحید رضا سٹپٹا گیا۔

"چلے جائیں' آپ میرے سامنے سے آئی سے گیٹ آئوٹ۔ خبردار جو آئندہ آپ میرے سامنے بھی آئے۔" وہ زور سے چلائی۔

"آپ ہی کی وجہ سے میں نے یہ مار کھائی ہے۔ آپ کی وجہ سے ہماری دو سالہ دوستی کا یہ حشر ہوا ہے اور آپ... آپ اب بھی میری ہی انسلٹ کر رہی ہیں یو آر ناٹ فیئر۔" وہ برا مان کر کھڑا ہو گیا۔

"جب میں آپ کے اس دوست کو جانتی تک نہیں ہوں تو آپ بار بار میرا اس سے تعلق کیوں جوڑ رہے ہیں۔" وہ بھی برا مان کر اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔

"کیا واقعی آپ سچ کہہ رہی ہیں۔" اس نے جھک کر براہ راست اس کے چہرے کو دیکھا جیسے تمسخر اڑا رہا ہو۔ اس استہزائیہ... مسکراہٹ پر وہ لب بھینچ کر رہ گئی اور کتابیں اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں' واقعی میں سچ کہہ رہی ہوں مگر المیہ یہ ہے کہ یہاں سچ کو پرکھنے والی' سمجھنے والی اور پہچاننے والی سچی نظریں نہیں رہی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ پلٹی مگر قدم اٹھاتے ہی ذرا سی دیر ٹھٹکی۔

حسن علی شاہ کچھ فاصلے پر کھڑا تھا اور تیغ صفت نظروں سے وحید رضا کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ تو تمہیں جاننے تک سے انکاری ہے اور تم..." وحید رضا بھی اسے دیکھ چکا تھا۔ خاصے جلے کٹے انداز میں اس نے عاظمہ پر نظر ڈال کر حسن علی شاہ کو دیکھا تھا۔ مگر وہ اس کی اس بکواس کو سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

"تم اگر یہاں سے دفع ہو جاؤ تو یہ تمہارے حق میں یقیناً بہتر ہو گا۔"

پھر اس نے پلٹ کر جاتی عاظمہ کو جلدی سے پکارا تھا۔

"عاظمہ!" اس کے لہجے میں عجیب سا تحکم تھا نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جی کڑا کر کے رکنے پر مجبور ہو گئی۔

"تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔" وہ وحید رضا کو اپنی جگہ جمے دیکھ کر بگڑا۔

"چلا جاتا ہوں' چلا جاتا ہوں خفا کیوں ہو رہے ہو۔"

کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ایک ٹھنڈی سانس بھرتا دونوں کے قریب آیا پھر قدرے تمسخرانہ انداز میں بھوئوں کو جنبش دیتا عاظمہ پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر حسن علی شاہ کو دیکھا

"کیوں سنے عرض مضطرب مومن

صنم آخر خدا نہیں ہوتا"

وہ کہہ کر سرعت سے پلٹ کر بھاگا تھا ورنہ حسن علی شاہ کا مکا یقیناً اس کا جبڑا توڑ چکا ہوتا۔ وہ غصے سے لب بھینچے اسے دور تک جاتا دیکھتا رہا۔ پھر عاظمہ کی طرف مڑا جو سر جھکائے شاید اپنا غصہ دبا رہی تھی۔ فرط ضبط سے اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اچانک وہ جھٹکے سے پلٹ گئی۔ اس کے غیر معمولی گھنے بال ہیئر بینڈ میں جکڑے اس کی پشت پر لہرا کر پھر ڈھیری کی طرح پھیل گئے۔

"عاظمہ پلیز میری بات سنو۔" وہ سرعت سے اس کے سامنے آگیا اور کچھ اس بے دھیانی سے سامنے آیا کہ اگر وہ جلدی سے رک نہ جاتی تو اس سے ٹکرا جاتی۔

"مسٹر حسن علی میں آپ کو جانتی تک نہیں ہوں، میری آپ سے سلام دعا نہیں، معمولی رسمی بات چیت تک نہیں پھر پھر یہ سب کیا ہے۔ کیوں کر رہے ہیں آپ یہ میرے ساتھ۔ کیوں مجھے بدنام کر رہے ہیں۔" وہ پھٹ پڑی۔

"کیا آ... میں تمہیں بدنام کر رہا ہوں۔" اس کی بات نے اسے حیرت زدہ کر دیا۔ دوسرے پل وہ اپنی حیرت اور رنج کو سمیٹتے ہوئے ہلکے سے دوستانہ انداز میں مسکرایا۔

"بدنام ہونے کا مطلب سمجھتی ہو۔"

"شاید آپ یہی مطلب سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" وہ جھلس ہی تو گئی۔

"تمہاری پاکیزگی پر کوئی حرف آئے میں یہ قطعی گوارہ نہیں کر سکتا، تم سے یقیناً وحید نے الٹی سیدھی بکواس کی ہوگی۔"

"الٹی سیدھی بکواس میں... ایک عرصے سے سنتی آ رہی ہوں۔ بلکہ خاص طور پر مجھے سنائی جاتی ہیں کیوں آخر کیوں؟ میری ذات کے ساتھ آپ کا نام کیوں لیا جا رہا ہے؟ وحید رضا کو اگر آپ نے کسی سبب سے مارا ہے تو اس میں میرا کیا عمل دخل، اس خبر کے ساتھ بھی میرا نام آخر کیوں لیا جا رہا ہے۔"'

حسن علی شاہ کو لگا وہ شاید ابھی رو دے گی۔ اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے تھے۔ وہ شدید حیرانی کا شکار ہو گیا تھا۔

"میری وجہ سے اگر تمہیں واقعی کوئی تکلیف پہنچ رہی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں مگر کیا واقعی تم اتنی ہی بے خبر ہو جتنا ظاہر کر رہی ہو۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ساتھ ہی اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ جہاں کچھ بے چینی پھیلتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے قدرے تعجب، دکھ اور الجھن بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

نظروں کا ہلکا سا تصادم ہوا جو بڑا دھیما سحر انگیز تھا۔ وہ نظریں جھکا گئی۔ اس کی نگاہوں میں جانے کیا تھا۔ ایک عجیب سا احساس ذہن و دل پر ہلکورے لینے لگا۔

"میرے سوال کا جواب دو عاظمہ!" وہ ٹرائوزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر اسے بغور دیکھنے لگا۔

"میں آپ کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔ البتہ آپ یہ ضرور بتایئے کہ آپ میری راہ میں کیوں کھڑے ہونے لگے ہیں؟" اس کا انداز برہمی لیے ہوئے تھا۔ وہ بے ساختہ ہی ایک ہلکی سی سانس بھر کر رہ گیا۔ لب بڑے ہی خوش نما انداز میں وا ہوئے تھے۔

"کوئی کسی کی راہ میں بے سبب تو کھڑا نہیں رہتا نا۔"

"میں یہی سبب تو پوچھ رہی ہوں۔" وہ باوجود ضبط کے چیخ پڑی۔

"کیا یہ جگہ مناسب ہے یہ "سب" بتانے کیلیئے۔" اس کا انداز شرارتی تھا۔

" تو آپ کا خیال ہے میں آپ کا فضول سا سبب سننے کیلیئے کسی ہوٹل، پارک، گلستان، بوستان، چاند تاروں، دھنک پر آئوں گی۔" وہ کچھ اس جلے کٹے انداز میں بولی کہ وہ اپنا بے ساختہ قہقہہ نہ روک سکا تھا۔

"خیر اتنی زحمت تو میں تمہیں نہیں دوں گا بلکہ خود بھی نہیں اٹھائوں گا چونکہ میں حقیرِ پُر تقصیر ہوں بقول شاعر

مرتبہ میرا یہی ہے کہ زمیں زاد ہوں میں

سو وہاں ہوں کہ جہاں تک کوئی جا سکتا ہے

"چلیں یہیں بیٹھ جاتے ہیں" یہ زمین بھی بری نہیں ہے۔"

"پلیز حسن صاحب! میں یہاں کسی بھی قسم کا مذاق افورڈ نہیں کر سکتی۔ آپ کیلئے یہ دل لگی ہو گی محض انٹر ٹینمنٹ اینڈ نتھنگ۔ مگر میری پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ میری پوری ہستی آپ کے اس مذاق کی لپیٹ میں تباہ..."

"عاظمہ پلیز سٹاپ اٹ" وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ گیا۔ اس کے چہرے کے نازک حصوں میں سرخی اڈنے لگی۔ وہ چپ ہو کر قدرے سہم کر اس کی طرف دیکھنے لگی مگر وہ مزید ٹھہرا نہیں بلکہ قدموں میں گرے پیپل کے سوکھے پتوں پر جوتوں کا دباؤ ڈالتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

یہ اس کی پہلی ملاقات تھی حسن علی شاہ سے براہ راست ورنہ ابھی تک تو اس نے آتے' جاتے بس راستوں میں ہی دیکھا تھا۔

الجھ کر رہ گئی تھی۔ قطعی نہ جان سکی کہ یہ نرم گرم طبیعت رکھنے والا شخص کیا کہنا چاہتا تھا اور کس بات پر خفا ہو کر چلا گیا۔

سب کی معنی خیز مسکراہٹیں رنگ برنگے فقرے الگ اس کی جان پر عذاب بنے ہوئے تھے۔

وہ دو دن تک کالج جا ہی نہ سکی۔ رہ رہ کر حسن علی شاہ کی بولتی مسکراتی آنکھیں تصور میں آتی رہیں۔

تیسرے دن اس کے نام کی ڈاک آئی۔ وہ حیران ہو گئی اس کی تو کسی سے ایسی دوستی نہ تھی کہ خط و کتابت کی نوبت پیش آتی۔ نہ کوئی عزیز رشتہ دار تھے اور جو تھے بھی تو باپ کی وفات کے بعد بیگانے ہوئے بیٹھے تھے۔

لفافے پر اس کا نام بے حد خوبصورتی سے لکھا ہوا تھا وہ کتنی دیر ہینڈ رائٹنگ کی دلکشی کو محسوس کرتی رہی۔ پھر لرزتی انگلیوں سے لفافہ چاک کیا تو اندر سے ایک طویل و عریض خط نکلا جو اس کے نام تھا اور "عاظمہ" کر کے ہی شروع کیا گیا تھا۔

"عاظمہ!..."

تمہارے لیے یہ خط یقیناً حیرت کا باعث ہو گا۔ خصوصاً میری ہینڈ رائٹنگ بالکل نئی ہو گی۔

بہرحال زیادہ بے چینی ہو تو اینڈ پر میرا نام لکھا ہوا ہے پڑھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر میرا خیال ہے تم ایسا کرو گی نہیں' اس لیے کہ میرے اندازے اور مشاہدے کے مطابق تم

خاصی صابر، تحمل مزاج لڑکی ہو، خط کا متن پڑھنے کے بعد ہی میرے نام پر نظر ڈالو گی۔اور تب شاید اس کی ضرورت بھی نہ رہی ہو گی۔

عاظمہ! مجھے خط لکھنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے خصوصاً ایسا خط جو کسی لڑکی کو لکھا جاتا ہے۔میں تو یوں بھی صاف، کھرا اور منہ پر کہہ دینے والا بندہ ہوں مگر کچھ باتیں بلکہ جذبے کہنا چاہیے جو یکدم عیاں نہیں ہو پاتے۔لگتا ہے الفاظ کی گرفت میں نہیں آپاتے یا پھر زبان ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور کچھ مقابل ہستی کا بھی پاس ہوتا ہے اور میرا خیال ہے یہی بات ٹھیک ہے جس نے مجھے براہ راست کچھ کہنے سے باز رکھا۔

عاظمہ

I Wish There Was a Window

So my soule that you could

see same of my feelings

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

مگر... مگر یہ کہاں ممکن ہے۔ہمارے مابین جو فاصلے ہیں اجنبیت کے، ناآشنائی کے ایسے میں ابھی یہ کہاں ممکن ہے۔عاظمہ، میں ان فاصلوں کو لفظوں کے پل سے پاٹنے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں، آہ کتنا آسان لگتا ہے کہ قلم چلا کر ابھی لکھ دیتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے یا یہ کہ آئی لو یو ود آل مائی فیلنگز۔وغیرہ وغیرہ مگر یقین کرو مجھے ایسا لگ رہا ہے میرا دل میری انگلیوں میں دھڑکنے لگا ہے دل خون صرف انگلیوں میں پمپ کر رہا ہو۔

بات صرف لکھ دینے اور تم تک پہنچا دینے کی نہیں ہے یہ تو بڑا آسان سا سفر ہے۔مگر بات تمہارے یقین کی ہے جو مجھے حاصل ہونے میں جانے کتنا وقت لگے گا۔کتنا سفر مجھے طے کرنا پڑے گا۔

خط میں اشعار کے ستارے ٹانک دینا کمال نہیں ہے، نہ فتح نہ مسرت بلکہ میرے لیے تقویت کا باعث میری فتح، میری خوشی صرف تمہاری قبولیت میں ہے۔

عاظمہ! کوئی چپکے سے کسی کے دل میں اتر جائے تو دوسرا کیا کرے اس کا تو اختیار چھن جاتا ہے نا۔ وہ تو بے دست پا ہو جاتا ہے نا۔ میں، میں بھی خود کو ناقابل تسخیر سمجھنے والا تسخیر ہو گیا تمہارے ہاتھوں۔

مجھے تو پہلی بار پتہ چلا کہ محبت اتنا پاورفل جذبہ ہے کہ جو اچھے خاصے ہوش مند بندے کو رات کو ستارے گننے پر مجبور اور دن کو لمبی لمبی سڑکوں کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ آدمی کو فنا کر ڈالتا ہے اپنے ہی دل سے اس کا اختیار ختم کر دیتا ہے۔

میں واقعی حیران ہوں کہ تم تک آنچ تک نہیں پہنچی۔ تم اتنی بے خبر نکلیں مجھ سے، شاید تمہاری اس بے خبری، معصومیت اور پاکیزگی نے مجھے اسیر کیا ہو گیا۔

جو دل کی بات ہی سمجھے نہ دل لگی جانے

وہ بے وفا تو نہیں، بے مثال لگتا ہے

تم یقیناً جاننا چاہتی ہوں گی کہ میں نے وحید رضا کی پٹائی کیوں کی۔ بلکہ شاید یہ جاننا چاہتی ہو گی کہ اس خبر میں بھی تمہارا نام کیوں آتا رہا۔ تو واقعہ کچھ یوں ہوا کہ۔

یہ سب میرے اچھے دوست کہلاتے ہیں اور ان سے میرے جذبے چھپے نہ رہ سکے۔ میں ان پر اسی روز عیاں ہو گیا جس روز خود پر ہوا تھا اور ان کی تفتیش پر اعترافِ جرم بھی کر لینا مناسب سمجھا شاید۔ یہاں پر ہی مجھ سے غلطی ہو گئی۔ وہ سب میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ میری جان عذاب کر دی۔

ایک روز وحید رضا نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ

”یار حسن تمہارے لیے عاظمہ جیسی لڑکی کا حصول کیا مشکل ہے۔ تمہارے فیوڈل ازم میں تو ایسا کچھ معیوب بھی نہیں ہے کو جو لڑکی اچھی لگے اسے چند دن کیلئے حاصل کر لو۔ اپنے باپ کے آدمیوں سے کہو اسے اٹھا کر تمہارے شاندار فلیٹ میں لا کر تمہاری خدمت میں پیش کر دیں۔“ اس کے یہ جملے آگ بن کر میری رگ رگ کو چھو گئے، ہتھوڑا بن کر میرے اعصاب کو لگے تھے۔ میں جتنا نرم ہوں اتنا ہی غصیلا اور اس لمحے مجھے اپنے آپ پر کنٹرول نہ رہا، میں اپنی جگہ سے اٹھا اور وحید رضا کو دھن کر رکھ دیا۔ اگر دوسرے لڑکے بیچ بچاؤ نہ

کراتے تو شاید وہ اس وقت میرے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔ میرے سر پر خون سوار تھا‘ یہ مشکل مجھے میرے دوست پکڑ کر وہاں سے لے گئے اور مجھے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

”پاگل ہو گئے ہو حسن! اس نے مذاق میں ایک بات کر دی تم نے تو حد کر دی۔ اس میں ٹمپر لوز کرنے کی کیا بات تھی۔“

”یہ مذاق تھا اتنا تھرڈ کلاس‘ چیپ‘ سستا۔ میں ایسی بیہودہ بکواس اپنی ذات کیلئے بھی برداشت نہ کرتا کجا عاظمہ کیلئے۔“ میں ندیم کا ہاتھ جھٹک کر بیسن کے پاس جا کر منہ دھونے لگا۔ مجھے ٹھنڈے پانی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

دل چاہ رہا تھا ٹھنڈا شاور لے لوں‘ ہر مسام سے گویا آگ پھوٹ رہی تھی۔

”عاظمہ تو تمہارے حواس پر سوار ہو گئی ہے۔ کچھ تو سوچو حسن‘ وحید تمہارا دوست ہے۔ ہمارا اچھا یار ہے اک ذرا سی۔“

”یہ ذرا سی بات نہیں ہے اس نے عاظمہ کے ساتھ ہمارے سسٹم پر بھی کیچڑ اچھالی ہے۔“ میں سٹینڈ سے تولیہ کھینچتے ہوئے غرایا۔

”ہمارے فیوڈل ازم کی خرابیاں برائیاں تو سب کو نظر میں آتی ہیں اس میں کچھ اچھائیاں بھی ہیں وہ بھی دیکھ لے کوئی۔ اور ضروری نہیں اس سسٹم میں پیدا ہونے والا ہر فرد ایک ہی سوچ رکھتا ہو۔ آذر کے گھر ابراہیم پیدا ہوئے تھے۔ فرعون کے محل میں ہی موسیٰ علیہ السلام نے پرورش پائی تھی۔

”اوہو تم تو جنونی ہو رہے ہو۔ اب غصہ تھوک دو میرے یار! چلو یہ ٹھنڈی بوتل پکڑو۔“ ندیم نے فریج سے کوک کی بوتل نکالی۔ اس کا کیپ دانتوں سے نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

”عاظمہ میری نظر میں کوئی کھلونا نہیں ہے کہ جس سے میں دل بہلاؤں نہ وہ خوبصورت شو پیس ہے کہ اسے اپنے فلیٹ میں سجا دوں‘ وہ میرے دل میں اتری ہے مہک بن کر‘ روح میں سمائی ہے زندگی بن کر‘ میری رگوں میں سرایت کر گئی ہے خون بن کر۔ تم لوگ کیا جانو محبت کے الوہی جذبے کو۔ تم لوگوں کی پیاسی نظروں میں تو عورت محض آنکھوں کو سیراب کرنے والی بے موسم کی بارش کی طرح ہے۔ دل پر چھما چھم برس گئی‘ چند گھنٹوں بعد تم پھر

وہی پیاسے کے پیاسے۔" میں نے تاسف اور ملامت آمیز نظروں سے ان سب کو دیکھا جو اس لمحے مجھ سے نظریں چرانے پر مجبور ہوئے۔

"میرا خیال ہے تم آرام کرو' ہم چلتے ہیں۔" ندیم یہ کہہ کر اٹھا تو باقی سب بھی باری باری اٹھ کر میرے فلیٹ سے چلے گئے۔

دوسرے روز میں کالج آیا تو خبر ہوئی کہ یہ خبر تو ایک ایک کی زبان پر ہے۔ یہ بات میرے لیے تشویش کا باعث تھی میں کسی طور نہیں چاہتا تھا کہ تم کسی کی معنی خیز نظروں اور فقروں کا نشانہ بنو' میں نے تمہارے تاثرات جاننے کی سعی کی۔ بار بار تمہارے راستے میں آتا رہا۔ مگر تم یوں انجان اور بے خبر گزر جاتیں جیسے باد نسیم ہولے سے اپنی مہک کا احساس دلا کر گزر جائے۔

وحید رضا نے مجھ سے بہت معافیاں مانگیں' ندیم کے ذریعے بھی مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر شاید تمہیں پتہ نہ ہو میں تھوڑا بہت ضدی ہوں اور اس نے آخری حربہ تم پر آزمایا۔ تمہیں حامی طرفدار بنا کر میرے سامنے لانا چاہتا تھا۔ (ویسے اگر تم اس کی طرفدار بن کر

آتیں تو مجھے اس کمینے کو معاف کرنا ہی پڑتا) مگر تم نے بہت اچھا کیا اس کے ساتھ تمہارا رویہ کم از کم میرے لیے اطمینان کا باعث تھا۔ وہ ایسے ہی رویے کا مستحق تھا۔

خیر... میں اس فضول سے شخص کا ذکر بار بار اپنے خط میں نہیں کرنا چاہتا' غلطی میری ہی ہے کہ میں نے ایسے کم ظرفوں' لچر دوستوں کے سامنے اپنے پاکیزہ جذبے کو عیاں کر دیا۔ عورت کو محض دل بستگی کا سامان سمجھنے والے کیا جانیں اس جذبے کی حرمت' پاکیزگی اور ندرت کو۔ وہ کیا جانیں۔

جسم کتنی بڑی حقیقت ہو
دل کی تسکیں مگر ہوس میں نہیں

محبت تو ایک دوسرے کی روح کی پاکیزگی کو محسوس کر کے اس کی حفاظت کرنے کا نام ہے۔ کسی کو دل میں اتار کر اس کو دل کی گہرائیوں سے سوچنے' محسوس کرنے کا نام ہے۔

مجھے بھی تم سے ایسی ہی محبت ہے عاظمہ! مگر میں اس محبت کو دائمی رفاقت میں بدلنا چاہتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ تم سے پہلے میری زندگی بے رونق پر خار اور ویران تھی۔ اس میں خوشیوں کا گزر ہی نہیں تھا۔ نہیں میرے اطراف میری بہت خوشیاں بکھر رہی ہیں۔ جنہیں میں بڑھ بڑھ کر تھام کر ایک مطمئن اور آسودہ زندگی گزارتا آیا ہوں۔ میں نے زندگی کو کبھی جذباتی طور پر نہیں لیا۔ بلکہ ایک مکمل پریکٹیکل بندہ رہا ہوں' پلاننگ کے ساتھ میں نے زندگی گزاری ہے۔ ہر کام اصول وضوابط سے کیے ہیں۔ ہر دن قرینے اور قاعدے سے گزارا ہے۔ بے شک پیسہ میرے لیے ہاتھ کا میل ہے مگر میں نے اسے کبھی میل نہیں سمجھا اور بے دریغ نہیں لٹایا۔ ایک زمیندار گھرانے کا چشم وچراغ ہونا میرے لیے فخر وانبساط کی بات نہیں ہے' یہ بات شاید مجھ سے زیادہ میرے حلقہ احباب کو متاثر کرتی ہے میں تو ''پلو ٹارک'' کی اس بات سے متفق ہوں کہ ''کسی اعلیٰ خاندان سے نسبت فی الحقیقت بڑی چیز ہے لیکن اس سے کسی کی قدر وقیمت میں اضافہ نہیں ہوتا' شرف کی روایات تو آبا ہی سے وابستہ رہیں گی' وہ شخص بھلا ستاروں پر کمند کیسے ڈال سکتا ہے' جو شجرہ نسب کے دام میں پھنسا ہوا ہے۔''

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں اپنی اس بااصول زندگی سے آج تک مطمئن تھا بس اچانک ہی یہ بے سکونی زندگی میں اتر آئی ہے جیسے کوئی جھیل کی پرسکون سطح پر کنکر مار کر اسے منتشر کر دے۔

محبت ایک مختلف رنگ' انداز سے میرے دل پر حملہ آور ہو گئی ہے۔ آج تک محبتیں سمیٹتے سمیٹتے خیال ہی نہیں آیا کہ مجھے بھی کسی سے ایسی محبت ہو جائے گی۔ جسے پانا میری زندگی کا مقصد بن جائے گا۔ میں نے یہاں بھی بہت غور وخوض کیا' اپنے دل کو پہلے ہزار تاویلوں سے بہلایا۔ شاید یہ جانچنا مقصود تھا کہ آیا میں حقیقتاً تمہیں چاہنے لگا ہوں یا یہ محض میرے اندر کا ہوس پرست مرد بیدار ہو گیا ہے اور محض نگاہوں کو تم اچھی لگی ہو یا یہ کہ یہ محض وقتی جذبہ ہو' جو تند موج کی طرح میرے دل کے سمندر سے اٹھی ہو اور وقت کا ساحل اس کی تندی شوریدگی کو ٹھنڈا کر دے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہر گزرتے سمے تم میرے دل میں اور گہرائی سے اترتی گئیں' میرے خون میں سرایت کر گئیں کہ میں منہ نہ موڑ سکا اور اپنی عدالت میں میں نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ آج تمہارے سامنے بھی کر رہا ہوں۔ کیا تم میری رفاقت کو' محبت کو قبول کرو گی۔

رہی اگر حاصل تیری رفاقت راہ ہستی میں

ہم تپتی دھوپ کو بھی موسم برسات سمجھیں گے

پتہ نہیں آج تو شعر بھی کہاں کہاں سے یاد آرہے ہیں۔اور اتنی روانی تو میرے قلم میں کبھی نہ تھی جو آج میں خود دیکھ رہا ہوں۔

عاظمہ! میرا خط دباؤ نہیں ہے محض اعتراف نامہ ہے چونکہ محبت میں زور و جبر نہیں ہوتا۔یہ ہمارے دل میں تلوار کی نوک یا ریوالور کی گولی سے نہیں اتاری جاتی۔یہ جذبہ تو خود بخود دل کی زمین سے سبزے کی طرح پھوٹتا ہے اور رہی بات اعتبار کی تو یہ بھی مقابل کی اپنی سوچ سے دل میں دھیرے دھیرے اترتا ہے۔جیسے ڈھلتی رات کی مدھم تاریکی میں سورج کی نرم روشن کرنیں دھیرے دھیرے اتر کر تاریکی کا سینہ پھاڑ دیتی ہیں۔یہ روشنی تو وقت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ہاں میں وقت کا انتظار کروں گا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

حرفِ تازہ نئی خوشبو میں لکھا چاہتا ہے

باب اک اور محبت کا کھلا چاہتا ہے

ایک لمحے کی توجہ نہیں حاصل اس کی

اور یہ دل کہ اسے حد سے سوا چاہتا ہے

ریت ہی ریت ہے اس دل میں مسافر میرے

اور صحرا تیرا نقش کف پا چاہتا ہے

تمہاری توجہ کا منتظر

حسن علی شاہ

X...X...X

حسن علی شاہ کا طویل و عریض خط اس کے سامنے تھا مگر اس کا ذہن ہزار خانوں میں بٹا ہوا تھا نظریں بظاہر خط پر جمی ہوئی تھیں مگر ذہن کہیں اور محو پرواز تھا اور الفاظ محض الجھی ہوئی

لکیروں کی مانند دکھائی دے رہے تھے‘ انگلیاں لرز رہی تھیں مگر دل کہیں زیادہ لرز رہا تھا‘ ہزار خوف‘ خدشے اور احساسات کی آماجگاہ بن چکا تھا۔

خط کیا تھا محبت نامہ تھا‘ اعتراف نامہ تھا‘ اپنی شخصیت کو اس نے متعارف کرایا تھا اور اس کے ساتھ کی تمنا ظاہر کی تھی مگر اسے حیرت تھی کہ وہ کیا جانتا تھا اس کے بارے میں؟ محض یہ کہ وہ لڑکی ہے اپنے خول میں بند رہنے والی‘ ایک بند کتاب کی مانند۔ ورق دیکھ کر کتاب پسند کر کے اسے حاصل کرنے کو مچل جانا ایک میچورڈ شخص کی نادانی اور کم عقلی نہیں تو کیا ہو سکتی ہے۔

میں ایک پھول ہوں اجڑی ہوئی بہاروں کا

نہ جانے کیوں میری خاطر مچل گیا کوئی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ ساری رات اپنے اندر حوصلے اکٹھا کرتی رہی تاکہ صبح اس کا اعتماد کے ساتھ سامنا کر سکے‘ صبح کا شاید وہ اس سے کہیں زیادہ منتظر تھا‘ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھا مگر وہ اسے نظر انداز کرتی راہداری عبور کر گئی۔

یہ دھچکا تھا جو حسن علی شاہ کو ٹھیک ٹھاک قسم کا لگا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ بھی اخذ نہ کر سکا۔ چھوٹی سی ہیل پر وہ دراز قد لڑکی کھٹ کھٹ کرتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”عاظمہ‘ عاظمہ! پلیز لسن ٹو می۔“ لائبریری کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ پھر اس کی نگاہوں کی زد میں تھی۔ وہ صبح سے اس کے پیچھے خوار ہوا جا رہا تھا۔ ایک امیر زادے کا یوں ایک عام سی لڑکی کے لئے خوار ہونا شاید بہت سوں کو برا لگا تھا اور خود عاظمہ کو بھی اپنے رویے پر شرم آ رہی تھی مگر اتنی کڑواہٹیں‘ تلخیاں اس کی زندگی میں ہمقدم رہی تھیں کہ کسی قسم کی شیرینی کو زبان قبول کرنے سے خوفزدہ تھی۔

وہ اس کی پکار پر رک تو گئی مگر بالکل اجنبی رہی۔

”مسٹر حسن علی ہم بہت مقدس جگہ کھڑے ہیں اسے درسگاہ کہا جاتا ہے' کم از کم ان گلیوں کا تقدس پامال مت کیجئے یہ صرف علم حاصل کرنے کی جگہ ہے عشق گاہ نہیں ہے۔“

اس کا لہجہ بے حد پر اعتماد تھا' وہ ایک ہلکی سی سانس بھر کر بے ساختہ دھیمے سے مسکرایا۔

”بجا فرمایا! میں تمہاری اس بات سے متفق ہوں مگر کیا تم نے دو سالوں میں مجھے اس مقدس جگہ کی حرمت کو پامال کرتے ہوئے دیکھا ہے؟“

وہ اس کی طرف پلٹی۔ نظریں اٹھائیں پھر جلدی سے جھکا دیں۔

”یو آر ناٹ فیئر عاظمہ!“ وہ جیسے اس الزام پر دکھی ہو گیا۔

”میں تو صرف اس خط کی بابت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں' تم اتنا بڑا الزام تو نہ دھرو مجھ پر کیا تم کہیں اور مجھ سے ملنا پسند کرو گی؟“

”جی؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں' مگر دوسرے پل وہ لب بھینچ کر ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر آخر مجھ میں آپ کو کیا نظر آ گیا ہے' مجھ سے اچھے گھرانوں کی اور اچھی شکلوں کی لڑکیاں تو یہاں بھری پڑی ہیں میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں' میرے لئے مچل جانا تو دیوانہ پن ہی ہوا۔“

”چلیں مجھے دیوانہ خبطی ہی سمجھ لو۔“ وہ دل آویز انداز میں مسکرایا۔

”یہ تو ٹالنے والی بات ہوئی۔“ وہ کچھ برا مان گئی۔

”تم موقع دو عاظمہ! تم کو چاہنے کا سبب بھی بتا دوں گا۔“ وہ اپنی مسکراہٹ سمیٹ کر قدرے سنجیدگی سے بولا اور گزرتے اسٹوڈنٹس کو راستہ دینے کے لئے ایک طرف ہو کر اس کے ساتھ ریلنگ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

”یوں تو کسی کو چاہنے کا سبب نہیں ہوتا مگر تم مصر ہو تو بتانا ہی پڑے گا ورنہ میں خط میں تفصیل لکھ چکا ہوں۔ تم نے خط تو پڑھا تھا نا۔“ اس نے بہ نظر غور اسے دیکھا تو وہ نظریں چرا گئی۔ مگر حسن علی شاہ نے دیکھا اس کے رخساروں پر دبی دبی مہکتی سے آگ دہک اٹھی تھی پھر وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی' مگر اسے لگا اب وہ مزید اس شخص سے کترا نہیں سکے گی۔

ہر گزرتے روز اسے یوں محسوس ہوتا حسن علی شاہ اور اس کے درمیان کوئی نامعلوم سی زنجیر

بنتی جا رہی ہے اور اسے روز بروز کھینچ کر اس کے قریب سے قریب تر لا رہی ہے۔ عجیب سے محسوسات ہو رہے تھے‘ عجب سی خواہش سر اٹھا رہی تھی غم و خوشی شیئر کرنے کی چاہے جانے کی۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ احساس تو ہوتا ہی بڑا خوش کن فخر انگیز ہے کہ کوئی آپ کی پناہ تلاش کر رہا ہو‘ چپکے چپکے چاہ رہا ہو‘ تمنائی ہو آپ کا‘ آپ کی اپنی زندگی میں ضرورت محسوس کر رہا ہو۔

لیکن یہ خواہشات سر اٹھاتی ہیں تو ساتھ ہی خوف‘ وسوسے اندیشے بھی آکٹوپس کی طرح چاروں طرف سے دل کو پکڑ لیتے ہیں کہ کہیں یہ سب ایک مرد کا ایک عورت کو دھوکا نہ ہو۔

اس کی نسوانیت کو نیچا دکھا کر مردانگی کی تسکین نہ ہو یا محض کوئی شرارت کہ وہ اس کے خول کو توڑنا چاہتا ہو۔ پس پردہ کسی سے چیلنج کیا ہو‘ یوں بھی اسے ہیرو ٹائپ لڑکوں سے ہمیشہ خوف آتا تھا۔

اس وقت بھی وہ اسی خدشے کی اسیر تھی‘ گو کہ وہ دل سے یہ سوچنا نہیں چاہتی تھی محض آنکھیں بند کر کے اسی خوبصورت انکشاف پر خوش ہونا‘ مسرور ہونا اور اپنے آپ پر رشک

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کرنا چاہتی تھی مگر یہ سب اختیار سے باہر تھا‘ وہ ہمیشہ احتیاط کا دامن تھا کر چلنے والی لڑکی تھی وہ مسرور ہونے سے زیادہ خوفزدہ‘ پریشان اور ہزار وسوسوں کا شکار ہو گئی تھی۔

X...X...X

”عاظمہ تم میرے اندازے سے زیادہ ضدی اور خودسر معلوم ہوتی ہو۔“ وہ گاڑی سے اتر کر پوری قوت سے دروازہ بند کر کے اس کی طرف آیا تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی فائل کا چھجا بنا کر دوسری طرف گھوم گئی۔

”پلیز بیٹھ جائو‘ دیکھو تماشا مت بنائو۔“ وہ اس کے قریب آ کر نرمی سے کہتا ہوا گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولنے لگا۔

”تماشا تو خود آپ اپنا بنا رہے ہیں۔“ وہ فائل والا ہاتھ جھٹکے سے نیچے کر کے اس کی طرف پلٹی۔

کہاں تک روئوں اس کے خیمے کے نیچے قیامت ہے
میری قسمت میں یارب کیا ہے دیوار پتھر کی

وحید رضا اپنی بائیک اسٹارٹ کرتا ہوا ادھر ہی آ کر رکا تھا اور دوسرے لمحے زوں کے ساتھ حسن علی شاہ کے قریب سے گزر گیا اس کی معنی خیز کھنکار اور بے وقت کی شعر گوئی پر حسن علی نے بڑی مشکل سے اعصاب کنٹرول میں رکھے تھے پھر کچھ ایسی نظروں سے عاطمہ کو دیکھا کہ وہ پلکیں جھکا کر لامحالہ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسے شخص کو لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔“ وہ اپنا غصہ دبا نہ سکی' اس کے بیٹھتے ہی پھٹ پڑی۔

”کیا مطلب کیا مجھ جیسے شخص کو ہزاروں لاکھوں لڑکیوں سے شادی کر لینی چاہیئے؟“ اس نے مصنوعی حیرت سے اسے دیکھا اور وہ کھسیا گئی۔

”میرا مطلب ہے ایک سے ایک لڑکی آپ کی خواہاں ہے۔“

”مگر میرا دل ان ایک سے ایک لڑکی کا خواہاں نہیں ہے پھر۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے قدرے معصومیت سے اسے دیکھا۔اس کی خوشنما آنکھوں میں واضح مسکراہٹ تھرک رہی تھی شاید یہی وہ برقی رو تھی جو اس کی رگ رگ کو متاثر کرتی تھی اس کا دل کھینچ لیتی تھی۔

وہ بالکل چپ ہو گئی' یکدم اسے لگا اس کا بااعتماد وجود اندر ہی اندر ریت کی طرح ڈھیر ہو رہا ہے' وہ اپنی بنیادوں سے ہل رہی ہے۔

وہ اسے ایک ریسٹورنٹ میں لایا تھا' چھتوں پر لٹکتے فانوسوں کی جھلملاتی روشنیاں شیشے کی مانند چمکتے فرش اور شیشوں کے دروازوں کھڑکیوں سے ٹکرا کر عجیب مہکتا خوابیدہ سا ماحول پیدا کر رہی تھیں ایسا لگ رہا تھا ہر شے سے روشنی پھوٹ رہی ہو۔

وہ چپ چاپ اس کی منتخب کی ہوئی میز کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

”آپ اگر مجھے دولت سے اثر و رسوخ سے مرعوب کرنے یہاں لائے ہیں تو یہ آپ کی بے کار کوشش ہو گی۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

حسن علی شاہ نے اسے زخمی نگاہوں سے دیکھا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

”میں تمہیں بھلا ایسی بے حقیقت بے مایا بے مول چیزوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کروں گا تم تو میری تمام تر دولت حیثیت' اثر و رسوخ سے بلند تر ہو' پیسہ محض تن کی ضرورت ہوتا ہے تم میرے من کی ضرورت ہو' کتنا حقیر کر دیا عاطمہ تم نے اپنے جملے سے میرے جذبوں کو' میری تمام تر ریاضتوں کو میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا۔“

اس نے اٹھایا ہوا مینیو کارڈ دوبارہ ٹیبل پر رکھا اور کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا۔

اس کے چہرے پر تھرکتی مہکتی مسکراہٹ افسردگی میں ڈھل گئی تھی' عاظمہ کو افسوس ہونے لگا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی مگر اس سے نظریں ملیں تو چپ ہو کر میز کی چکنی سطح پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

کتنے ہی پل دونوں کے مابین خاموشی رہی' خاموشی کا یہ وقفہ بڑا بوجھل سا تھا یا عاظمہ کو ہی ایسا لگا وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔

"حسن صاحب! سچ تو یہ ہے کہ زندگی کی تلخیوں' دکھوں نے مجھے ہمیشہ حقیقی مسرتوں سے محروم رکھا حالات کی کڑواہٹیں ایک عرصے سے پی ہیں کہ شیرینی کا اصل ذائقہ بھول چکی ہوں' شاید اس ذائقہ کو محسوس کرنے میں وقت لگے۔"

وہ اپنی شفاف ہتھیلیوں پر نظریں جمائے ہوئے بولی۔

حسن علی شاہ نے رخساروں پر لرزتی اس کی گھنی پلکوں کے سائے کو دیکھا' پھر ایک ہلکی سی سانس بھر کر آگے کی طرف جھکا۔

"تم وقت اس لئے مانگ رہی ہو نا کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"

"ہاں۔" وہ سر اثبات میں ہلا گئی۔

"شاید یہی بات سچ ہے اور مجھے اس میں ہچکچانا نہیں چاہئے' میں نے آج تک جھوٹ نہیں بولا۔" وہ اب قدرے اعتماد سے سر اٹھا کر بول رہی تھی۔

اس کے لبوں کی تراش میں بے ساختہ مسکراہٹ جھلکی اس کی بولتی سحر انگیز آنکھوں میں عجیب سی روشنیاں اتر آئیں۔

"تم کہتی ہو تم بہت عام سی لڑکی ہو' تم عام سی لڑکی کہاں ہو؟" اس کا ہاتھ اس کے ٹھنڈے نازک ہاتھ پر آرکا' ایک برقی لہر تھی جو اس کی نس نس کو چھو گئی اس نے نظریں جھکاتے ہوئے اپنا ہاتھ کھینچ کر گود میں رکھ لیا۔

"یہ آپ کا پاگل پن ہے اور کچھ نہیں۔" وہ اس سے نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھی اسے محسوس ہو رہا تھا اس کی یہ فسوں خیز آنکھیں اپنے اندر ایسا طلسم رکھتی ہیں کہ وہ اس سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی' وہی مانوس سا احساس دل و ذہن میں ہلکورے لینے لگا جسے اس نے بڑی مشکل سے تھپکیاں دے کر سلایا تھا۔

"آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں۔" وہ ویٹر کے جانے کے بعد لوازمات پر یونہی ایک نظر ڈال کر ہلکی سانس کھینچ کر دھیرے سے بولی۔

"اتنا ہی جتنا تم اپنے بارے میں جانتی ہو۔" وہ نیپکن کھولتے ہوئے شگفتگی سے بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مجھے اتنا جاننا ہی بہت ہے کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو' مجھے پسند ہو اور اچھی لڑکی خود اپنا ایک حوالہ ہوتی ہے مجھے تمہیں جاننے کے لئے دوسرے حوالوں کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ قدرے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"عاظمہ مجھے یقین ہے' میرا یہ فیصلہ محض قلبی نہیں ہے عقلی طور پر بھی میں نے تمہیں چاہا ہے' میں ذرا مختلف مزاج کا شخص ہوں مجھے لگتا ہے بلکہ سو فیصد یقین ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوشگوار اور آئیڈیل زندگی گزاریں گے۔"

"مگر میں آپ کے فیوڈل ازم میں مس فٹ رہوں گی' آپ جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں میری جگہ۔"

"کم آن عاظمہ! یہ طبقہ' حیثیت' خاندان یہ میری نظر میں کوئی معنی نہیں رکھتے' مجھے تم سے کوئی کاروباری معاشی ڈیلنگ نہیں کرنی' تم سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں' اپنے لئے۔ اپنے خاندان اور طبقے کے لئے نہیں' مجھے تمہارے ساتھ جہیز کے ٹرک نہیں چاہئیں تمہاری سیرت' صورت اور کردار کی روشنیاں چاہئیں اپنے دل اور گھر کو اجالا دینے کے لئے اینڈ نتھنگ۔"

عاظمہ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا پھر ہلکے سے بے ساختہ مسکرا دی۔

"آپ تو وکالت پڑھنے کے باوجود اچھی خاصی شاعرانہ گفتگو کر لیتے ہیں خاصی حیرت کی بات ہے۔"

''کیوں کیا وکیل کے پاس دل' جذبے نہیں ہوتے' مجھے اپنے جذبوں کا اظہار کرنے کے لئے اردو ادب میں ماسٹرز کرنا ضروری ہے۔''

''مجھے تو آپ اردو ادب کے ہی اسٹوڈنٹ لگتے ہیں۔'' وہ ہلکی شرارت سے بولی۔

''ارے تھینکس تم نے مجھے فلمی ہیرو نہیں کہہ دیا' خدانخواستہ تمہیں میری باتوں سے فلمی ڈائیلاگ کی بو محسوس نہیں ہوئی۔'' وہ مصنوعی گھبراہٹ سے جیسے شکر گزار ہوا تھا۔ وہ بے ساختہ اٹھنے والی ہنسی کو نہ روک سکی تھی۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔

ہنستے ہوئے دونوں کی نظریں بے ساختہ ایک دوسرے سے ملیں اور جیسے ایک دوسرے میں جذب ہو گئیں۔

حسن علی شاہ کے چہرے پر محبت کا عجیب سا جادو تھا۔ وہ عاظمہ کو اپنے سحر میں جکڑنے لگا' بس ایک پل تھا اور وہ تسخیر ہو گئی۔

اس کی ہنسی تھم گئی اور جیسے پورے وجود میں سناٹا اتر آیا۔ ایسا سناٹا جس کے اندر تند و تیز طوفان چھپا تھا محبت کا' میٹھی پکار کا۔

اس نے پلکیں یوں جھکا دیں گویا کوئی مجرم اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے جھکا لیتا ہے۔

''عاظمہ!'' اسے حسن علی شاہ کی آواز بہت دور سے سنائی دی' مہکتی' اثرانگیز' جادو جگاتی اور اس کی دھڑکنیں بے ربط ہو گئیں۔

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہئے' امی انتظار کر رہی ہوں گی۔''

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔

حسن علی شاہ نے کچھ کہنے کو لب کھولے پھر کچھ سوچ کر خاموش رہا' تاہم ایک دل آویز مسکراہٹ اس کی آنکھوں اور لبوں پر چاندنی کی طرح چٹکی ہوئی تھی۔

وہ والٹ سے کئی نوٹ نکال کر کھڑا ہو گیا۔

یہ رات عاظمہ کے لئے بے حد کٹھن تھی۔ وہ رات بھر روتی رہی۔

یہ اسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ کیوں اتنی کمزور ہو گئی کہ یوں تسخیر ہو گئی۔ اب بھی ہزار خوف' اندیشے اس کے دل کو گھیرے ہوئے تھے۔ ایک طرف دل حسن علی شاہ کا حمایتی تھا' اس کی سچائی کی گواہی دے رہا تھا' دوسری طرف وساوس میں گھری عورت تھی۔

دوسرے دن وہ کالج نہ جاسکی اس میں ہمت ہی نہ تھی کہ یوں عیاں ہو جانے کے بعد اس شخص کا سامنا کرسکتی مگر شام حسن علی شاہ کا فون آگیا اس کی آواز سنتے ہی بولا۔

”عاظمہ! رات میرے گھر والے تمہارے گھر آرہے ہیں‘ یہ بات میں تمہیں بتانے والا تھا مگر تم آئیں ہی نہیں۔“

وہ چپ کی چپ رہ گئی‘ وہ بولا۔

”اسے میری جلد بازی مت سمجھنا‘ ان فیکٹ میں تمہارا اعتبار چاہتا ہوں۔ بے اعتباری کا ایک پل گزارنا عذاب ہے کجا کہ پورا سال گزارنا‘ جبکہ یہ سال تو میرے فیوچر کے لئے بے حد اہم ہے۔ یونو میں نے تعلیم کو ہمیشہ سنجیدگی سے لیا ہے اور ہر کام میں اپنے وقت‘ اپنے طریقے اور پلاننگ کے ساتھ کرتا ہوں۔ شادی اگزام کے بعد ہوگی‘ دراصل میں تمہاری بھرپور رفاقت چاہتا ہوں‘ عاظمہ! تم سن رہی ہو نا میری بات عاظمہ!“

وہ مارے شرم کے کچھ بول ہی نہ پائی۔

یہ شخص کیا تھا وہ اسے سمجھ ہی نہ پائی تھی لمحوں میں صدیوں کا سفر طے کرلیتا تھا۔

کہاں اتنے فاصلے اجنبیت کے‘ ناآشنائی کے جسے وہ آن واحد میں سمیٹتا چلا جا رہا تھا‘ یوں کہ وہ مدافعت بھی نہ کر پا رہی تھی۔

وہ اسے پکار رہا تھا‘ اس نے نم ہاتھوں سے پھسلتا ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

دور سے بھی یہ شخص جادو جگا رہا تھا اس کی سانس بے ربط ہو رہی تھی۔

یہ سب کچھ اتنا جلدی ہو گیا کہ وہ حیران پریشان رہ گئی۔

کہاں کالج میں اسے طنزیہ‘ معنی خیز نظروں کا سامنا تھا۔ اب اس کی جھولی میں لڑکیوں کی حاسدانہ نگاہیں آرہی تھیں تاہم یہ نظریں اس کے لئے مسرت انگیز تھیں۔

حسن علی شاہ تازہ جھونکے کی طرح اس کی زندگی میں آیا۔ وہ جیسے جی اٹھی‘ اسے لگا سب کچھ زندہ ہو گیا ہو۔ خواہشیں‘ امنگیں جذبے‘ احساسات۔

وہ شان سے حویلی میں حسن علی شاہ کی دلہن بن کر اتری‘ مگر صرف چند دن وہ لوگ حویلی میں رہے۔ اس کے بعد وہ دوسری کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔

”آپ حویلی میں رہنا کیوں پسند نہیں کرتے۔“ ایک روز عاظمہ نے پوچھ ہی لیا۔

"بس یونہی۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا اور جوتے اتار کر بیڈ کی دراز سے سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرنے لگا۔

"حویلی میں آپ کے باباسائیں ہیں۔ مردان بھائی' بھابی اور بچے ہیں پھر بھی آپ نے یہاں اکیلے رہنے کو ترجیح دی۔ کہیں میری وجہ سے تو کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرنا پڑا۔" اس نے کئی روز سے دل میں پلنے والے خدشے کو زبان دی تو وہ بڑے زور سے ہنسا۔

"تمہیں تو میں بیانگ دہل بیاہ کر لایا ہوں' وہ بھی باباسائیں کی اجازت سے۔ انہیں تم سے کوئی بیر یا ناراضگی نہیں ہے نہ مجھ سے۔ البتہ مردان بھائی کو کچھ اعتراضات تھے۔ اینی وے ان کو تو میری ہر بات' ہر کام پر اعتراض ہے۔" وہ سگریٹ کو لائٹر کا شعلہ دکھانے لگا پھر بولا۔

"مجھے حویلی میں وحشت ہوتی ہے' وہاں کے ماحول اور نشست و برخاست کے انداز و اطوار سے' ملازم ہاتھ باندھ کر یوں مالکوں کے سامنے آتے ہیں جیسے ہم انسان نہیں نعوذ باللہ خدا ہوں۔ کمرے سے جاتے وقت ہمارے سامنے پشت نہیں کرتے جیسے ہم حویلی کے مالک نہیں ان کے جسم و جان کے مالک ہوں' یہ سسٹم میرے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اپنے ہی جیسے انسان کو اتنا بے اختیار یا بے بس لاچار اور پستی میں دیکھ کر ٹینس ہو جاتا ہوں۔ اس ماحول میں احساس برتری میں مبتلا ہو کر انسان گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ اندر سے اس زمین پر ایک حقیر کیڑے کی طرح ہی ہے محض دولت کے بل بوتے پر نہ وہ اپنی موت کا مقررہ وقت ٹال سکے گا نہ عمر بھر حکومت کر سکے گا۔ نہ قبر کو اپنے لئے محل بنا سکے گا بس یہی وجہ ہے میری حویلی میں نہ رہنے کی۔"

اس نے بڑی تفصیل سے وضاحت کی۔

عاظمہ کے لئے یہ سب حیرت کے ساتھ مسرت انگیز انکشاف بھی ثابت ہوا۔

"شاید یہی وجہ ہے کہ آپ نے یہاں ملازم بھی کم رکھے ہوئے ہیں مردان بھائی کے بھیجے ہوئے ملازموں کو نہیں رکھا۔" وہ وارڈروب سے اس کے کپڑے نکالتے ہوئے بولی۔

"ان کے ملازم۔" وہ کچھ کہتے کہتے یکدم ہونٹ بھینچ کر رہ گیا پھر سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر بیڈ سے اتر گیا۔

"مجھے ایسے باادب ملازموں سے وحشت ہوتی ہے جو خود کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کے ان داتا ہم ہی ہیں۔"

"کیا کریں بیچارے، ان کی تو نوکری کا سوال ہے۔" وہ وارڈروب بند کر کے اس کے کپڑے باتھ روم کے اسٹینڈ پر لٹکا کر باہر آئی۔ وہ دریچے کے پردوں کی حریری ڈوریاں کھول کر لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔

"ملازم ہوتے اور ملازم ہی سمجھتے تو اور بات تھی۔ یہ خود کو غلام سمجھتے ہیں اور جب تک غلام پیدا نہیں ہوتا آقا جنم نہیں لے سکتے، جس طرح مزدور نہ ہوتے تو سرمایہ دار جاگیر دار جنم نہیں لیتے۔"

"کہیں مردان بھائی آپ کی انہی باتوں پر تو اعتراض نہیں کرتے۔" اس نے پر خیال انداز میں شوہر کو دیکھا جواباً اس نے ایک ہلکی سی سانس بھری اور آسمان پر چمکتے چاند پر نظریں جما دیں۔

" ادھر آئو عاظمہ !" اس نے ایک لمحے توقف کے بعد اسے پکارا۔ وہ چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔

"وہ دیکھو چاند کتنا خوبصورت لگ رہا ہو۔"

عاظمہ نے چاند کی بجائے حسن علی شاہ کے چہرے کو دیکھا جہاں ہلکی ہلکی سرخی اتر رہی تھی۔

"یہ جو اس میں داغ نظر آ رہا ہے نا سمجھو جاگیر دار، سرمایہ دار اس داغ کی طرح ہیں ہمارے ملک کے ماتھے پر۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک کش لیا اور دھواں آنکھوں کے گرد پھیلاتے ہوئے چہرہ موڑا۔

"تمہیں پتہ ہے میں بھی "جارج ہیرن" کی طرح یہ کہتا ہوں کہ میں مظلوم، مزدور، غرباء کے طبقے کے ہمراہ دوزخ میں جانا پسند کروں گا، بہ نسبت اس بہشت کے جس میں سرمایہ دار ظالم اور بے فیض امراء شامل ہیں۔"

میرے نزدیک وہ دوزخ جس میں انصاف ہو مساوات ہو اس جنت سے بہتر ہے جس میں طبقاتی تفریق ہو جہاں درجہ بندی ہو۔" اس کے لہجے میں گرمی، تلخی افسردگی سب کچھ ہی ڈھل گیا۔

"آپ ایک ذہین وکیل تو ہیں ہی مجھے ایک اچھے سیاست دان بھی لگتے ہیں۔" عاظمہ شرارت سے گویا ہوئی۔

"اوہ" اس نے سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکیڑ کر اس کی طرف خاصی دلچسپ نظروں سے دیکھا۔اس کی خوبصورت آنکھوں میں ہلکی سی چمک لہرائی جو دوسرے پل معدوم ہو گئی اس نے مسکراتے لب بھینچ کر ایک گہری سانس بھری۔

"یہی تو المیہ ہے ہمارا کہ سیاست دان بننے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس گفتار کا غازی ہونا چاہئے چند جذباتی جملے بولنے آنے چاہئیں خوب صورت نعرے اور لہجے کے اتار چڑھائو کا فن آنا چاہئے آج کا بہترین سیاست دان کل کا دانا تم نے بھی مجھے اسی لسٹ میں شامل کر دیا ڈیئر وائف۔

ویسے تمہاری اس بات پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا ہے سنائوں۔"

"سنایئے۔" اس نے دلچسپی سے سر ہلایا۔

"بیوی نے شوہر سے پوچھا آخر تم نے کس بات سے اندازہ لگایا کہ ہمارا بیٹا بڑا ہو کر سیاست دان بنے گا۔"

شوہر بولا۔"کیونکہ یہ ایسی باتیں کرتا ہے جو کانوں کو تو بھلی لگتی ہیں مگر غور کرو تو ان کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

یہ کہہ کر وہ ہلکے سے ہنسا اور سگریٹ کا سارا دھواں اس کے خوبصورت چہرے پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

"مجھے تو کچھ یونہی لگتا ہے کہ تم مجھے سیاست دان سمجھ رہی ہو۔"

"نہیں آپ ایسے بالکل نہیں ہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی' حسن علی شاہ نے اسے بغور دیکھا۔

"اچھا تم مجھے بھلا کتنا جانتی ہو۔" اس کے لہجے انداز میں اشتیاق تھا۔

"کسی کو جاننے کے لئے کبھی ایک لمحہ ہی بہت ہوتا ہے۔"

اس نے اسے ایک نظر دیکھا اور چہرے کا رخ موڑ گئی۔

"پھر ساری عمر بیت جاتی ہے اور آگاہی نہیں ہو پاتی' آگاہی کے لئے تو ایک لمحہ ہی بہت ہوتا ہے' میرے ہاتھ میں وہ لمحہ آ چکا ہے جس نے آپ کی ذات کو شخصیت کو میرے سامنے بے نقاب کر دیا ہے' آپ کیا ہیں حسن میں لفظوں میں وضاحت نہیں کر سکتی شاید الفاظ بھی مجھے کمتر اور بے معنی لگتے ہیں۔"

اس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی حسن علی شاہ واقعی حیران ہوا پھر اس کے کندھے کو ہولے سے چھوا۔

"یہ اتنی اچھی باتیں منہ پھیر کر کیوں کر رہی ہو۔ ادھر دیکھ کر کرو نا میری طرف۔" اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی سے اس کا رخ اپنی طرف کر لیا۔ وہ شرما کر چہرہ جھکا گئی پھر اس سے دور ہٹتے ہوئے بولی۔

"کھانے کا کیا پروگرام ہے یہیں کھائیں گے یا حویلی میں چل کر۔ بابا سائیں کا بلاوا بھی تو آیا تھا' صبح آپ شاید بھول گئے ہیں۔" اس نے دانستہ موضوع بدلا تھا۔ اس کی محویت توڑنے کے لئے۔ وہ محظوظ ہو کر ہنس دیا۔

"آؤ چاند دیکھیں۔ دیکھو کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔" اس نے کھڑکی کا پٹ پورا کھول کر چاند پر نظریں جمائیں۔

"جی نہیں اس وقت چاند واند دیکھنے کا ٹائم نہیں۔" وہ دامن بچا گئی۔

"ہاں بھئی تم کیوں دیکھنے لگیں چاند' تم خود چاند ہو وہ کیا کہا ہے شاعر نے کہ:

چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

تمہارا سلسلہ کچھ آسمان سے ملتا جلتا ہے

"حسن اتنے بھونڈے انداز میں تو شعر نہ پڑھیں۔" وہ بے ساختہ کھل کھلانے لگی۔

"میرا خیال ہے آپ شعروں پر ستم نہ ہی ڈھائیں تو اچھا ہے۔"

"کیا کروں پریکٹیکل بندہ ہوں' مگر کبھی کبھی دل مچل جاتا ہے۔ دل ہی تو ہے اس پر کیا اختیار" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"پریکٹیکل بندے کو ڈائیلاگ تو بڑے ازبر رہتے ہیں۔"

"ارے کہاں' وہ تو بس تم سامنے آجاتی ہو تو پتہ نہیں کہاں سے یاد آجاتے ہیں۔"

"او ہو آمد ہوتی ہے۔" وہ زور سے ہنسی اسی دم دروازے پر دستک ہوئی وہ جلدی سے سنبھل کر پلٹی مردان علی شاہ اندر داخل ہوا تھا۔

"آپ ادا اس وقت خیریت تو ہے۔" حسن علی شاہ اسے دیکھ کر متحیر ہوا اور کھڑکی سے ہٹ کر اس کے استقبال کو آگے آیا' عاظمہ نے بھی سر پر دوپٹہ جما کر مردان علی شاہ کو جلدی سے

سلام کیا جس کا جواب اس نے سر کی خفیف سی جنبش سے دیا اور پھر حسن علی شاہ کی طرف دیکھ کر قدرے ناراضگی سے گویا ہوا۔

"ہماری بھی شادی ہوئی تھی، ہم پر بھی یہ دن آئے تھے مگر اس طرح غیر ذمہ دار اور نافرمان نہیں ہوئے تھے۔ ہماری لگامیں ہمارے کنٹرول میں تھیں۔" مردان شاہ کے لہجے میں طنز بہت واضح تھا وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"باباسائیں کا پیغام تمہیں الٰہی دین نے نہیں دیا تھا کیا۔" وہ ابرو چڑھا کر حسن علی شاہ کی طرف دیکھنے لگا تو اس وضاحت کے بعد ایک ہلکی سی سانس بھر کر اس نے اچٹتی سی نظر عاظمہ پر ڈالی جو مردان علی کے انداز اور لہجے پر کچھ خفیف سی ہو رہی تھی۔

"پیغام مجھے مل گیا تھا، میں نے دانستہ انہیں جواب نہیں دیا۔" وہ سینے پر بازو لپیٹ کر کسی کم سن ناراض بچے کی طرح بولا۔

"اوہ تو اب کھلے عام نافرمانی کرنے لگے ہو تم۔" مردان علی کے چہرے کے زاویوں میں تناؤ آ گیا۔ ایک نظر عاظمہ پر ڈال کر خاطے استہزائیہ انداز میں اس طرف دیکھ کر بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اپنی زندگی کا پہلا بڑا فیصلہ ہی تم نے غلط کیا اب تم سے کیا امید رکھی جائے۔"

"مائنڈ اٹ مردان بھائی! میں اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے کسی طرح کا طنز برداشت نہیں کر سکتا، میں نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا اور نہ نافرمانی کا مرتکب ہوا ہوں، باباسائیں نے میرے فیصلے کو سر آنکھوں پر رکھا ہے۔"

"ہاں اور تم اس کا یہ صلہ دے رہے ہو۔" وہ ہنسا اور واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑی سی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"انہوں نے تمہاری بات صرف اس لئے مانی ہے کہ آگے وہ اپنی بات تم سے منوائیں تو تمہیں اعتراض نہ ہو۔ تم بھی ان کے فیصلوں کو کھلے دل سے قبول کرو۔ یہی فرمانبرداری بھی ہے اور احسان شناسی بھی۔ شاید یہ بات تم دونوں میاں بیوی مجھ سے بہتر جانتے ہو کہ چونکہ وکیل ہو۔" ایک ہلکی استہزائیہ مسکراہٹ سے اس نے دونوں کو باری باری دیکھا پھر کچھ یاد آنے پر بولا۔

"اوہ میں تو بھول ہی گیا۔ ایک اطلاع بھی ساتھ لے کر آیا تھا عاظمہ کو دینے کو۔" اس نے عاظمہ کو دیکھا۔

''تمہاری والدہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ شہر میں میرے آدمی ہیں۔ انہوں نے ہی خبر دی ہے اور اسی وقت میں نے حکم دے دیا کہ انہیں شہر کے بڑے ہاسپٹل میں داخل کروادیا جائے اب فکر کی بات نہیں ہے میرے حکم کی تعمیل فوراً ہی ہو گئی ہے وہ بڑے بڑے ڈاکٹرز کی زیر نگرانی ہو نگی۔''

''کیا اور آپ یہ اطلاع اب دے رہے ہیں۔'' حسن علی شاہ نے عاظمہ کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

اس کے شکوے اور شاکی نظروں نے مردان کے چہرے کو ناگواری کا رنگ دے دیا۔ اس کے تیوروں میں کھنچاؤ آ گیا۔

''کہا نا میں نے وہ اس وقت شہر کے سب سے بڑے ہاسپٹل میں ہیں اور کوئی چمار جمعدار قسم کے ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ بڑے ماہر ڈاکٹرز کی زیر نگرانی ہیں' اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہ خبر تمہیں صبح مل جاتی یا ابھی مل رہی ہے مقصد تو انہیں ہاسپٹلائز کرنا تھا تم یا عاظمہ ان کو زندگی تو نہیں دے سکتے۔''

''زندگی تو میں کیا ڈاکٹرز بھی نہیں دے سکتے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کے نزدیک یہ قطعی غیر اہم بات ہے' بہر حال وہ عاظمہ کی ماں ہیں اس کے لئے یہ زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔'' اس نے عاظمہ کو تھام کر صوفے پر بٹھا دیا جو اس خبر پر دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔

''مگر میں نے تو مرتے ہوئے کے ساتھ کسی کو مرتے نہیں دیکھا' خیر تم حویلی اس وقت پہنچو گے یا۔'' اس نے کرسی سے اتر کر اسی اطمینان کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

''ہم اس وقت شہر جا رہے ہیں میں باباسائیں سے موبائل پر بات کر لیتا ہوں۔''

''عاظمہ پلیز خود کو سنبھالو اور چلو شاباش جانے کی تیاری کرو۔'' وہ عاظمہ کو تھپک کر اپنا موبائل اٹھا کر حویلی کا نمبر پش کرنے لگا۔

مردان علی نے خفگی بھرے تیوروں سے اسے دیکھا اور لب بھینچے اسی غصے کے عالم میں پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔

X...X...X

وہ راستہ بھر روتی رہی۔

"اس طرح تو تم خود مریض بن کر پہنچو گی وہاں۔ حوصلہ کرو عاظمہ! یہ اتار چڑھائو تو زندگی میں آتے رہتے ہیں تم تو بہت بہادر ہو۔"

"بہادر تھی اب نہیں رہی۔" وہ ناک پونچھتے ہوئے بولی۔

"کیوں میری قربت نے تمہیں بزدل بنا دیا ہے کیا۔" وہ ذرا سا مسکرایا۔اسے ہنسانا بہلانا مقصود تھا وہ سر ہلانے لگی۔

"ہاں کچھ ایسا ہی لگتا ہے حسن! آپ کی قربت میں اتنی خوشیاں اتنے سکھ برت لئے ہیں کہ اب دل غم زدہ ہوائوں کی آہٹ سے ہی لرزنے لگتا ہے۔ شاید آپ کی قربت نے مجھے حد سے زیادہ خوش فہم بنا دیا ہے۔ میں بے پرواہ' بے نیاز ہو گئی ہوں۔ جیسے اب کوئی غم کوئی دکھ مجھے نہ چھوئے گا' میرے ہاتھ میں ہمیشہ خوشیوں بھرا دامن رہے گا۔"

حسن علی شاہ بہت نرمی اور محبت سے اس کا ہاتھ تھپکنے لگا۔

"کاش مجھے صبح ہی خبر مل جاتی۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ہاں تم شکوہ کرنے میں حق بجانب ہو۔" وہ نادم سا ہو گیا۔

"نہیں حسن میں شکوہ تو نہیں کر رہی ہوں' بس پریشان ہوں۔" وہ جلدی سے بولی پھر اس کا مضبوط ہاتھ اپنے دونوں نم ہاتھوں کے درمیان رکھ کر بے اختیار رو پڑی۔

حسن! اگر امی کو کچھ ہو گیا تو؟ وہ... وہ صبح سے میری منتظر ہوں گی نا۔ان کی نظریں دروازے پر جمی ہونگی' کہ کب عاظمہ آئے گی اف اور اب جانے کیا سوچ رہی ہوں گی کہ عاظمہ اپنی خوشیوں میں مگن ہو گئی ہے انہیں بھلا دیا ہے۔"

حسن علی شاہ نے لب بھینچے گاڑی کی اسپیڈ اور بھی تیز کر دی۔

یوں بھی اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا ان کے پہنچتے ہی کوئی بری خبر استقبال کرے گی۔

"امی کو پتہ ہے ان حالات میں تم لمبا سفر نہیں کرو گی۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہوں گی کوئی غلط فہمی نہیں ہو گی انہیں اور بھلا مائیں بھی اولاد سے بدگمان ہوئی ہیں کبھی۔" اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

ہاسپٹل پہنچے تو مردان علی شاہ کا آدمی میاں بخش ان کا منتظر تھا۔انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف دوڑا اور دونوں ہاتھ آگے کر کے جوڑتے ہوئے بولا۔

"سلام چھوٹے سائیں! اچھا ہوا آپ آگئے سائیں میں تو خود شام سے بڑے سائیں کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔پر انہوں نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔اب میں ڈیڈ باڈی کو لے کر کہاں جاتا سائیں۔"

"ڈیڈ باڈی۔" حسن علی شاہ کے اعصاب پر دھماکا ہوا مگر وہ جلد ہی اپنے اعصاب کو سنبھالتا ہوا عاظمہ کی طرف بڑھا جو بے یقین نظروں سے میاں بخش کو دیکھ رہی تھی۔دوسرے پل وہ لہرائی اور اس کے بازو میں ڈھیر ہو گئی۔

عاظمہ کی ماں کے چھوٹے سے گھر میں آنے والوں کا تانتا بندھا تھا' مردان شاہ بھی پرسہ دینے والوں میں شامل تھا' پھر لوگوں کی بھیڑ کم ہوئی تو وہ حسن علی شاہ کے پاس آیا جو سر سے سفید ٹوپی اتارے ہوئے ایک کرسی پر نڈھال سا آکر بیٹھا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"حسن! سوئم ہماری شہر والی کوٹھی میں ہو تو اچھا ہے کچھ عجیب سا لگتا ہے تمہارے جاننے والے اس چھوٹے سے کوارٹر جیسے گھر کو کہاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک پہنچیں گے۔ کوٹھی میں سب کو آنے میں آسانی رہے گی۔"

وہ لب بھینچ کر رہ گیا' وہ چاہنے کے باوجود انکار نہیں کر سکا کہ یہ حکم باباسائیں کا تھا' جس پر عاظمہ نے بھی سر جھکا لیا تھا اور اسے بھی کسی حجت سے باز رہنے کو کہا۔

اسے حسن علی شاہ یا اس کے رشتہ داروں سے کسی سے بھی شکوہ نہیں تھا۔یہ اس کا اپنا غم تھا جس میں وہ سوائے تقدیر کے کسی کو بھی دوش نہیں دے سکتی تھی اور پھر حسن علی شاہ نے جس طرح اس کے زخموں پر پھاہے رکھے تھے اس کا شریکِ غم رہا تھا۔ شکوے سارے دھل گئے تھے۔الٹا وہ اس کی ممنون اور مشکور ہو گئی تھی۔

چوتھے روز وہ باباسائیں کے حکم پر گائوں لوٹ آئے کچھ دن حویلی میں رہے یہاں بھی پرسہ دینے والے آتے رہے پھر وہ واپس اپنے گھر چلے آئے۔

وہ اپنی حالت سے خود بھی آگاہ تھی' اس کے اندر ایک دوسرا وجود پل رہا تھا۔ایسے میں اسے ذہنی اور جسمانی طور پر پرسکون رہنے کی ضرورت تھی۔وہ کسی طرح بھی اپنے بچے میں کوئی

کمی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ بھی حسن علی شاہ کی محبت کا اعجاز تھا کہ وہ اسے ایک صحت مند بچہ دینا چاہتی تھی جسے پا کر وہ بے پناہ خوش ہو۔

وقت اپنی ڈگر پر چلتا رہا' دھوپ چھائوں آتی رہیں حسن علی اور مردان علی شاہ کے مابین جو سرد مہری تھی روکھا پن تھا وہ اس سے آشنا ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ سے بھی آگاہ تھی کہ اس کے شوہر کے نظریات' اس سرد جنگ کی بنیاد تھے۔

وہ دونوں بھائی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھے۔

وہ باپ کا جانشین تھا سیاست میں اس کے وہی انداز تھے جو اس ملک کے سیاست دانوں کا وطیرہ تھا' مظلوم' معصوم سادہ لوح لوگوں کو پر جوش پر معنی تقریر سے بے وقوف بنا کر ووٹ حاصل کرنا پھر ان کے حقوق غصب کرنا۔

جبکہ حسن علی شاہ نیا خواب دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ افلاطون کی طرح ایک بے مثال اور پر سکون معاشرے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ نظام کو بدلنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ مظلوم عوام کا نمائندہ بن کر روز بروز اپنے قدم جما رہا تھا۔ جس دن اس کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی اس کی نئی پارٹی کا آغاز ہوا۔

''عوام اتحاد پارٹی۔'' جسے گائوں کے کثیر لوگوں کی حمایت حاصل ہوئی۔ وہ بے پناہ خوش تھا' اسے دوہری خوشی ملی تھی۔

''عاظمہ' عاظمہ آئی ایم سو ہیپی اینڈ آئی ایم تھینک فل ٹو یو۔ تم نے مجھے اتنا حسین اتنا قیمتی تحفہ دیا۔'' وہ بیٹے کا خوب صورت چہرہ دیوانہ وار چوم رہا تھا۔ عاظمہ اس کی دیوانگی اور بچگانہ پن پر مسکرائے جا رہی تھی۔

''بولو کیا تحفہ لو گی بدلے میں۔'' وہ بچے کو اس کے پہلو میں لٹا کر اس پر جھکا پوچھ رہا تھا۔

''آپ کی توجہ اور محبت عمر بھر کے لئے۔'' وہ روح میں اتر جانے والی نظروں سے اسے دیکھ کر بولی تو اس نے گویا بحر عقیدت کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا بھاری مضبوط ہاتھ رکھ دیا۔

عاظمہ نے ایک گہری پر سکون سی سانس بھر کر اپنے محبوب کو دیکھا۔

اس کا خیال تھا دنیا میں جنت وجود میں نہیں آسکتی کبھی۔ مگر آج سوچ رہی تھی بے شک دنیا میں جنت وجود میں نہیں آسکتی مگر اس کا دل اس کا گھر ایک خوشگوار جنت کا خطہ تھا' جہاں

محبت کی شفاف شیریں نہریں بہہ رہی تھیں٬ سکھ کا سمندر تھا جس میں وہ ڈبتی جا رہی تھی کبھی نہ ابھرنے کی خواہش لئے۔

ولید کی آمد نے اس خطے کو اور زیادہ دلکش اور پررونق بنا دیا تھا۔

ولید کا نام حسن علی شاہ نے خود رکھا تھا۔جو عربی نام تھا اور اس نے یہ نام خلیفہ ولید بن عبدالملک بن مردان کے نام پر رکھا تھا جو ایک قابل وذہین حکمران رہ چکا تھا۔

یوں تو حسن علی شاہ وکیل تھا مگر اسے تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔اس کے باپ تاریخ پر بہت سی کتابیں تھیں جن کا مطالعہ وہ فارغ وقت میں کیا کرتا تھا اور ولید باپ کو کبھی سیاسی بکھیڑوں میں الجھا دیکھتا٬ کبھی تاریخی کتابوں میں گھرا ہوا۔سو یہ دونوں شوق اس کے اندر بھی اتر گئے تھے وہ عاظمہ سے ضد کرکے باپ کے سیاسی جلسوں میں شریک ہوتا اور باپ سے ضدیں کرکے تاریخی واقعات اور قصے سنتا۔

ابتدائی تعلیم اسے حسن علی شاہ نے ماسٹر دین محمد کے چھوٹے سے صاف ستھرے سکول میں دلوانی چاہی جس پر مردان علی شاہ نے ہنگامہ کھڑا کیا تھا اور آخر کار باباسائیں کو بھی اپنا ہمنوا بنا کر دم لیا۔

''اب ہمارے خاندان کے بچے٬ ایسے گھٹیا سکولوں میں تعلیم حاصل کریں گے؟ایسے ماسٹروں سے؟سمجھ نہیں آتا باباسائیں کیا ہو گیا ہے حسن کو؟غریبوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اب وہ اپنی اولاد ہمارے خون کو بھی اس رنگ میں رنگنے لگا ہے۔اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیں باباسائیں اب اسے نکیل ڈالیں بہت کرلی اس نے اپنی من مانی۔''

کچھ ہی دنوں میں اسے باباسائیں کا حکم ملا کہ ولید کو شہر کے اس سکول میں داخل کرایا جائے جہاں مردان علی کے بچے بھی جاتے ہیں۔

''چند سال اگر وہ یہاں پڑھے گا تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی باباسائیں!'' وہ باباسائیں کا حکم پہنچنے پر حویلی آیا تھا۔

اس کی اسی حجت پر باباسائیں برہم ہو گئے۔

''تمہاری حرکتوں سے میں عاجز آگیا ہوں حسن! بابا کچھ تو عقل پکڑو اچھا تو نہیں لگتا نا ہمارے جیسے لوگوں کی اولادیں کمی کمین کی اولادوں کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں بابا٬ نیچی ذاتوں سے ہمارا کیا واسطہ٬ کیوں خود کو ذلیل کرانے پر تلے ہوئے ہو؟تمہارے یہ ادنی لوگوں کی حمایتوں پر جلسے اور مضامین بھی اب میری برداشت سے باہر ہو چکے ہیں آخر ان کا مقصد کیا ہے۔''

اس نے ایک متاسفانہ سانس بھر کر باپ کا چہرہ دیکھا۔

”حقیر کون ہے باعزت اور بلند کون باباسائیں! یہ یہاں نہیں آخرت کے پلڑے میں تولا جائے گا اور ڈرتا ہوں کہ وہاں ہمارا وزن ہی سب سے کم نہ ہو۔“

”اب خدا کے لئے اپنا واعظ شروع نہ کر دینا۔“ مردان علی نے جلبلا کر اس کی بات کاٹ دی اور فون اٹھا کر نمبر ڈائل کرتے ہوئے بولا۔

”میں آج ہی ولید کے ایڈمشن کا معاملہ نمٹا لیتا ہوں‘ اسے ہاسٹل کی بھی بہترین سہولت مل جائے گی وہ بھی توقیر۔“

”آپ کون ہوتے ہیں میرے ذاتی معاملات میں انٹرفیئر کرنے والے۔“ وہ غصے سے کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

”ولید میرا بیٹا ہے‘ اس پر میرا اختیار ہے آپ کا نہیں۔“ اس کے انداز میں ترشی تھی جو مردان علی کو آگ کی طرح چھو گئی۔

”دیکھ رہے ہیں باباسائیں! آپ! یہ میرے کس طرح منہ کو آ رہا ہے سیاست میں تو اس نے میری مخالفت شروع کر دی ہے۔ اب گھر پر بھی یہ میرا مخالف بن کر کھڑا ہو گیا ہے‘ یہ ہے بڑے بھائی کی عزت و توقیر۔“

”دل نہیں بھرا آپ کا گاؤں کے سادہ لوح لوگوں سے عزت اور توقیر وصول کرتے کرتے‘ پورا گوٹھ آپ کے آگے ہاتھ باندھ کر چلتا ہے پھر بھی خواہش ہے عزت کی۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔

”حسن!“ باباسائیں نے اسے سخت تیوروں سے دیکھا۔

” یہ کمی کمین مزارعے ہمارے نوکر ملازم‘ ہماری روٹی پر پلنے والے جانور ہیں‘ یہ ہاتھ باندھ کر ہمارے سامنے کھڑے نہیں ہوں گے تو کون ہوں گے۔ تمہیں ان لوگوں کو سر پر چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے‘ یہ دم ہلاتے ہیں تو اپنے مطلب کے لئے‘ جاؤ اور جا کر میرے حکم کی تعمیل کرو ولید کو اس کچرا گھر سے باہر نکالو‘ کسی اچھے سکول میں داخل کراؤ جہاں شرفاء کے بچے پڑھتے ہیں۔“

وہ غصہ دباتے لوٹ آیا مگر سارا غصہ گھر پر عاظمہ کے سامنے نکلا وہ اسے ٹھنڈا کرنے لگی۔

"باباسائیں ولید کی محبت میں ہی کہہ رہے ہیں نا' آپ ناحق ان سے الجھتے ہیں' کسی بھی سکول میں تعلیم حاصل کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اولاد پر اثرانداز ماں باپ کی تربیت ہوتی ہے' آپ جو

مثال بن کر اس کے سامنے آئیں گے وہ وہی بنے گا' آپ کے نظریات' آپ کی اچھی سوچ' آپ کی اچھی باتیں ہی اس کے دل میں گھر کریں گی' وگرنہ ماحول محض وقتی خول ہوتا ہے۔ ہمارے نبی ﷺ کا فرمان ہے ناکہ باپ کا کوئی عطیہ بیٹے کے لئے اس سے بڑھ کر نہیں کہ اس کی تعلیم وتربیت اچھی کرے۔

پس حسن بچہ تو صاف شفاف کاغذ کی طرح ہے اس پر میں' آپ جو لکھیں گے وہی نقش ہوگا اور ہوتا رہے گا۔"

وہ چپ چاپ بیڈ پر لیٹ گیا پھر کئی لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔

"مجھے باباسائیں کے حکم سے سرکشی نہیں ہے' بس دکھ اس بات کا ہے عاظمہ کے ہمارے قول وفعل میں کتنا تضاد ہے۔باباسائیں ہوں یا ادامردان' الیکشن کے وقت ان ہی غریب لوگوں کے درمیان آکر ان کو باعزت اور بلند قوم کا خطاب دیتے ہیں جانباز اور محنتی کہتے ان

کی زبان نہیں تھکتی' انہیں کندھوں پر بٹھا لیتے ہیں' ان کو بڑھ کر سینے سے لگاتے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ گھر جاکر وہ کپڑے بدلتے ہیں مہنگے امپورٹڈ صابن سے ہاتھ دھوتے ہیں مگر ان کے سامنے خود کو ان کا خادم کہتے ہیں اور مطلب نکل جانے کے بعد یہی جانور پلے ہوئے کتے اور کمی کمین ہو جاتے ہیں' کھوٹے سکے بن جاتے ہیں جنہیں وہ جیب سے نکال کر اچھال کر قدموں تلے روند ڈالتے ہیں۔"

" یہ تو برسوں سے ہوتا آیا ہے اور شاید ہوتا رہے گا۔" عاظمہ نے دودھ کا گلاس بیڈ کی سائیڈ پر رکھا اور ایک ہلکی سی سانس بھر کر چادر کی شکنیں درست کرنے لگی۔

"کیوں ہوتا آرہا ہے عاظمہ !اس لئے کہ ہم سب نے اسے تقدیر سمجھ لیا ہے' اسے قبول کر لیا ہے' ذلت کو بھی بھلا کوئی قبول کرتا ہے یہ نگلنے کی نہیں اگلنے کی چیز ہے اور میں اب اسی نظام کو بدلنا چاہتا ہوں۔"

"دیوانگی کی بات ہوگی یہ تو۔" عاظمہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم خود بھی کہہ لو' دیوانہ' مجنوں' پاگل' خبطی۔" وہ ہلکے سے ہنسا۔

انہی کے فیض سے بازار عقل روشن ہے

جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

اس نے دودھ کا گلاس اٹھاتے ہوئے فیض احمد فیض کا شعر پڑھا تو عاظمہ مسکرادی پھر دعاگو لہجے میں بولی۔

"خدا آپ کی مراد پوری کرے' بس میری اتنی التجا ہے کہ سیاست کو گھر کے اندر نہ لائیں' مردان بھائی سے نہ الجھیں آپ کے نظریات اپنی جگہ' رشتے ناطے اپنی جگہ۔"

"یہ تمہارا خیال ہے' ورنہ مردان بھائی کے دل میں میرے لئے کوئی پیار بھرا جذبہ نہیں ہے۔" وہ افسردگی سے ہنسا اور دودھ کا گلاس منہ سے لگالیا۔

بہت سی ایسی باتیں جو وہ جانتا تھا محسوس کرتا تھا' محض خون کے اس رشتے کی محبت مروت میں وہ عاظمہ کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا' عاظمہ' رشتے ناتوں کی ڈور کو مضبوط کرنے کے جتن کرتی رہی تھی' وہ ایسی صالح عورت تھی جو نہیں چاہتی تھی کہ اس کا شوہر' باپ کا نافرمان ہو کر جہنم کا نوالہ بنے۔

ولید کو شہر کے سب سے اچھے سکول میں داخل کروادیا گیا تھا' ساتھ ہی ہاسٹل میں رہائش کا انتظام بھی کردیا گیا۔ وہ جب چاہتا تھا گاڑی منگوا کر گائوں چلا آتا تھا۔ حسن علی شاہ یا عاظمہ شہر

میں ہوتے تو وہ ان کے پاس آجاتا مگر اب گائوں میں بڑھتی ہوئی مصروفیات کی وجہ سے حسن علی شاہ کا بہت کم شہر جانا ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ دن کے لئے جانا ہوتا تھا۔

اس کی پارٹی دن بہ دن اپنے قدم مضبوط کررہی تھی' معصوم سادہ لوح کو اس بارے بے وقوف نہیں بنایا جارہا تھا' نہ انہیں کوئی سبز باغ دکھائے جارہے تھے بلکہ انہیں ان کی طاقت کا احساس دلایا جارہا تھا ان کی چھپی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر آمادہ کیا جارہا تھا' اس روز بھی وہ عوام سے مخاطب تھا۔

"کہتے ہیں اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کرنا قدرت کا اٹل قانون ہے۔ جو لوگ سعی و کوشش سے گریز کرتے ہیں ان کی ہستی بالکل مٹ جاتی ہے۔"

گائوں کے سادہ لوح لوگ اسے سننے دیکھنے کو جوق در جوق جمع تھے ان کے خیال میں یہ انوکھا وڈیرہ تھا جو ان میں اٹھتا بیٹھتا تھا ان کی باتیں سنتا' ان کے آنسو پونچھتا تھا' انہیں کمتر نہیں بہت بلند سمجھتا تھا۔ آج بھی وہ سب بڑی عقیدت سے اسے سن رہے تھے۔

"مگر اپنی ہستی قائم دائم رکھنے کے لئے آزادی سب سے اہم چیز ہے۔"

سکندر اعظم نے جب یونان کو فتح کیا تو بہت سی نایاب اور گراں بہا اشیاء دے کر فیثا غورث کو اپنے دام ملازمت میں پھنسانا چاہا' حکیم فیثا غورث نے جواب دیا کہ اگر فی الحقیقت سکندر میری قدر کرتا ہے تو میری آزادی میرے پاس رہنے دے۔''

بات یہ ہے کہ آزادی اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب انسان کا دل اس کا ذہن آزاد ہو' وہ اپنی خودداری ہاتھ سے نہ جانے دے' خود کو ذلیل نہ کرے' کیونکہ گرا ہوا شخص کبھی اعلیٰ رتبہ نہیں پا سکتا نہ اعلیٰ کلام کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا''

تالیوں کا ایک شور تھا جس میں اس کی بھاری' مضبوط آواز ڈوب رہی تھی ابھر رہی تھی۔

''میں کہتا ہوں جس شخص کو اپنی روزی' اپنی دولت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے دوسرے کو خوش رکھنا' اس کی خوشامد کرنا ضروری ہے وہ خود خوش رہ سکتا ہے۔''

ہے آزادی اک ثواب عظیم
غلامی جہاں کا گناہ عظیم

''خدا واحد کو چھوڑ کر حاکموں' جاگیرداروں' سرمایہ داروں' دولت مندوں' بادشاہوں کو حاجت روا سمجھ کر اپنی ادنیٰ ضرورت کے لئے انہی پر نظر رکھنا' انہی سے توقع رکھنا آدمی کو پستی میں گرا دیتا ہے اور پستی میں گر کر وہ کبھی آزادی سے سانس نہیں لے سکتا چاہے وہ ملک آزاد ہی کیوں نہ ہو' وہ ہمیشہ کمزور' ناآسودہ ہی رہے گا۔

صرف اپنی ہمت کو نگاہ میں رکھیے کہ نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں' کوئی حاکم اس وقت تک نہیں آقا بنتا جب تک اس کے نوکر ملازم غلام نہ بنیں' کوئی سرمایہ دار اس وقت تک نہیں بنتا جب تک مزدور طبقہ نہ ہو' اپنی صلاحیتوں کو اپنی طاقت کو خود پہچانیئے'' اس سے خود آپ اپنی راہیں ہموار کریں گے۔ راستے میں پڑا ہوا بھاری پتھر کمزور آدمی کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے لیکن طاقتور انسان اس پر پاؤں رکھ کر دوسری طرف کود جاتا ہے۔

باندھو کمر کہ دوری منزل کا غم نہیں
ہے بادباں درست تو ساحل کا غم نہیں

سر پر خدا ہے پھر کسی مشکل کا غم نہیں

باقی ہے وقت نزع تو حاصل کا غم نہیں

یہ حیرت کی بات نہیں کہ وہ بھی انسان تھے جو ایجاد و تکوین کے مالک بنے' آج تک لوگ ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ افسوس ہم بھی انسان ہیں جنہیں اپنی ذات پر کل کی روٹی حاصل کر لینے تک کا بھی بھروسہ نہیں ہے' وہ سمجھتے ہیں روٹی ان کے حاکم' بادشاہ ہی دینگے۔"

پھر اس نے جلسہ عام کو ایک حکایت سنائی۔

"ایک بادشاہ کسی فقیر کی خدمت میں شاہی کھانا لے کر حاضر ہوا اور کھانے کی درخواست کی۔ فقیر نے ایک آئینہ منگوایا اور شاہی مرغن کھانے میں سے ایک لقمہ اس پر مل دیا' تمام آئینہ دھندلا پڑ گیا' پھر اس پر اپنی جو کی خشک روٹی مل دی تو آئینہ شفاف ہو گیا' اور کہا۔

"آپ کے کھانے آئینہ دل کو سیاہ کرتے ہیں لیکن نان جویں اسے جلا دیتی ہے' مجھے اس سے معاف کیا جائے۔" پھر بادشاہ نے کہا۔ "میرے لائق کوئی کار خدمت ہو تو فرمائیں۔" فقیر نے کہا! مکھیاں اور مچھر مجھے بہت دق کرتے ہیں ان کو حکم دیجئے کہ مجھے نہ ستایا کریں۔"

بادشاہ نے کہا! میرے حکم سے تو منع نہیں ہو سکتے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

فقیر نے کہا۔" جب ایسے حقیر ترین جانور بھی آپ کی اطاعت سے منحرف ہیں اور آپ کو ان کے دفعیہ پر قدرت نہیں تو پھر میں اور کس چیز کے لئے آپ سے امداد طلب کروں۔"

بادشاہ مایوس لوٹ گیا۔

میں آپ سے بھی کہتا ہوں خدارا ہم صرف حویلی کے مالک ہیں۔ آپ لوگوں کی جانوں' مالوں اور زندگی کے نہیں' میں بھی اور مجھ جیسے تمام دولت مند لوگ آپ ہی کی طرح انسان ہیں جن کی سانس کی ڈور ابھی اس عظیم طاقتور کے قبضے میں ہے' اپنی حقیقت کو پہچانئے اپنی طاقت کو پہچانئے' اپنے ووٹ کی قدر و منزلت کو جانیے' اپنے لئے راہیں دشوار نہ بنائیں' میرا ساتھ دیں' اچھے لوگوں کا ملک سے محبت کرنے والوں کا ساتھ دیں۔ اس نظام کو بدلنے میں مجھے قدم قدم آپ لوگوں کا ساتھ' آپ کی طاقت ہمت اور استقلال درکار ہے۔"

وہ چپ ہوا تو تالیوں اور نعروں سے پورا میدان گونج رہا تھا۔

اور ایک طرف بیٹھا ولید اپنے باپ کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جن میں حیرت تھی' تجسس تھا اسے اپنا باپ تاریخی کہانی کا کوئی ہیرو لگ رہا تھا۔

''شاید محمد بن قاسم۔'' اس کے ننھے سے ذہن میں محمد بن قاسم کا خاکہ کچھ اپنے باپ جیسا بن گیا تھا۔

محمد بن قاسم جس کی جرأت' بہادری کی داستاں اس نے اپنے باپ سے بارہا سنی تھی جو محض ایک فاتح ہی نہیں تھا بلکہ ایک نئے نظام حیات کا پیام بر تھا۔اس نے وادی سندھ کو راجہ داہر کے ظلم و ستم اور طبقاتی نظام سے نجات ہی نہیں دی بلکہ اپنی مہمات کے ذریعے جنوبی ایشیا میں ایسی دور رس تبدیلیاں کیں جن کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔اس کا ساتھ اس وقت کی سندھ کی مقامی آبادی نے بھی بڑھ چڑھ کر دیا تھا چونکہ وہ راجہ داہر کے ظلم و ستم اور طبقاتی نظام سے تنگ آئی ہوئی تھی۔

اور آج بھی سندھ کے عوام طبقاتی گروہ' وڈیروں زمینداروں جاگیر داروں' غلط رسموں رواج کے تسلط سے تنگ آئے ہوئے تھے۔آج پھر اس خطہ کو محمد بن قاسم جیسے جرنیل' فاتح اور محسن اسلام کی

ضرورت تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کا چھوٹا سا ذہن عجیب و غریب خیالات' احساسات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا' پھر یکلخت اس کے ذہن نے اس کے باپ کو آئیڈیل بنا لیا۔

اونچا لمبا تانبے جیسی رنگت مضبوط جسمانی ساخت' سڈول جسم' ادھر ادھر بھاگتا پھرتیلا بدن' کشادہ پریشانی پر کھڑی ناک جس پر کبھی سرخی جمی ہوتی تو کبھی اتنی نرماہٹیں اتر آتیں کہ ٹھنڈی چھاؤں کا احساس ہوتا مگر زیاں و زوال کی بات پر چہرہ ایسا پتھر اور زخمی نظر آتا جیسے ٹوٹے ہوئے دل کا سارا لہو یہیں آکر ٹھہر گیا ہو۔

''مما کیا سارے تاریخی ہیرو پاپا جیسے ہی ہوتے ہوں گے۔'' وہ رات عاظمہ سے پوچھنے لگا۔

''میری جان تمہارے پاپا ان جیسے ہیں۔''

''کیا محمد بن قاسم جیسے؟''

''ہاں محمد بن قاسم جیسے۔''

"کیا محمد بن قاسم کی آنکھیں بھی بابا جیسی تھی؟" اس کا فطری تجسس اس کی آنکھوں میں لہریں مار رہا تھا' عاظمہ نے پیار سے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا پھر اس کے بال سہلاتے ہوئے بولی۔

"جانو! یہ جو اسلام سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہمارے نبی ﷺ سے محبت کرتے ہیں آپ ملک سے محبت کرتے ہیں' ان سب کے دل ایک جیسے ہوتے ہیں' ان کے خیالات' احساسات ان کے جذبات' سب ایک سے ہوتے ہیں چاہے وہ کسی بھی نسل' رنگ اور زبان کے ہوں' ایک سا دل' ایک جذبہ' ایک سے خیالات انہیں ایک دوسرے سے قریب لے آتے ہیں' محمد بن قاسم ہو کہ خالد بن ولیدؓ ٹیپو سلطان ہو یا سراج الدولہ' سب کے دل ایک سے تھے' ایسے لوگ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں' روشنی بن کر' اجالا بن کر اور آنے والی نسلوں کی راہوں کو منور کئے رکھتے ہیں۔ منزلوں کے نشان کی طرح راستہ سوجھاتے ہیں' مگر یہ روشنی انہیں دکھائی اور سوجھائی دیتی ہے جو بینائی رکھتے ہیں' دل کی آنکھیں رکھتے ہیں سچائی کی آنکھیں رکتے ہیں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"پاپا بھی مر کر روشنی بن جائیں گے مما!" اس نے پوچھا تو عاظمہ کا دل لحظہ بھر کو کانپ سا گیا اس نے بیٹے کے معصوم چہرے کو نظر بھر کر دیکھا پھر ہلکے سے سانس بھر کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"مرنا تو ایک دن سب کو ہی ہے میری جان! مگر اچھے لوگ مر کر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں دلوں میں اور برے لوگ مر کر اپنا نام ونشان تک گم کر دیتے ہیں۔ جس طرح ان کا جسم مٹی میں دفن ہو جاتا ہے اسی طرح ان کا نام بھی اس مٹی میں دفن ہو جاتا ہے مگر اچھے لوگوں کے نام ان کی یادیں پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں میں دفن رہتی ہیں۔ خوشبو بن کر مہکتی رہتی ہیں۔"

"کیا بات ہے آج تو ماں بیٹے میں بڑی محبت جتائی جا رہی ہے۔"

حسن علی شاہ اپنے بیڈ روم میں آیا تو عاظمہ کو ولید کو لپٹائے باتیں کرتے دیکھ کر شرارت سے چھیڑا پھر جیب سے سگریٹ' موبائل اور لائٹر نکال کر ایک طرف رکھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کا بیٹا تو آپ کا گرویدہ ہو گیا ہے۔" عاظمہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہمارا گرویدہ؟" اس نے ولید کو دیکھا پھر تمام تر محبت سے مسکراتے ہوئے اپنے بازو کھول دیئے وہ بیڈ پر چڑھا ہوا تھا لپک کر آیا اور ان سے لپٹ گیا۔

"یہ گرویدہ کیا ہوتا ہے پاپا۔" وہ اس کے شرٹ کے بٹن کھولتے اور بند کرتے ہوئے معصومیت سے پوچھنے لگا۔

"ایک تو اس لڑکے کے سوالات کبھی ختم نہ ہونگے۔" عاظمہ ہنستی ہوئی بیڈ سے کھڑی ہو گئی اور بکھرے بال سمیٹنے لگی۔

"گرویدہ۔" گرویدہ کسے کہتے ہیں۔" حسن علی شاہ نے عاظمہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا کر بولا۔

"گرویدہ کا مطلب ہے عاشق، فریفتہ، جس طرح ہم آپ کے مما کے گرویدہ ہیں۔" پھر اس نے زوردار قہقہہ لگا کر ولید کو کھینچ کر اور بھی خود سے قریب کر لیا۔

"حسن آپ بھی حد کرتے ہیں۔" عاظمہ نے جھینپ کر تنبیہی نظریں اس پر ڈالیں۔

"اب اس وضاحت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ چلو ولید بہت دیر ہو گئی ہے سونے کی لئے جائیں۔" اس نے فوراً ولید کو وہاں سے ٹالا، مبادا وہ مزید کوئی وضاحت کرنے بیٹھ جائے۔

"کیا کچھ غلط کہا، میں نے تو اس کے سوال کا جواب دیا ہے۔" وہ مسکین سی شکل بنا کر بولا اور کرسی سے اٹھ کر اس کے نزدیک چلا آیا۔

"عملاً تو شروع بھی نہیں کیا، ویسے تم کہو تو گرویدگی و فریفتگی کا عملی مظاہرہ پیش کر سکتا ہوں۔"

"جی نہیں۔" وہ بدک کر پیچھے ہٹی مگر اس کی کلائی اس کی گرفت میں آ گئی۔

"ایک تو آپ کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ۔" اس کی گرفت پر اسے گھور کر دیکھنا چاہا مگر دوسرے پل لرزتی پلکیں رخساروں پر جھک گئیں۔

"ہاں کہو نا کیا مشکل ہے مجھے؟" وہ اس کی طرف جھکا اور دھیمے لہجے میں بولا کچھ دیر تو وہ کچھ بول ہی نہ پائی مگر پھر دھڑکنوں کو سنبھالتی یاد آنے پر بولی۔

"باباسائیں کا دو بار فون آچکا ہے۔" وہ اسے جلدی سے دھکیل کر پیچھے ہٹی اور اس کی محویت توڑنے میں کامیاب ہو گئی۔اس کے چہرے کے تاثرات میں یکلخت تبدیلی آگئی' ایک گہری سانس بھر کر

سر ہلایا۔

"کیا کہہ رہے تھے۔"

"مجھ سے تو کچھ کہا نہیں بس آپ کا ہی پوچھا' ہاں کہہ رہے تھے کہ موبائل کو بھی آپ نے آف کرر کھا ہے' کیا آپ باباسائیں سے بات نہیں کرنا چاہتے۔" اس نے ایک نظر اس کے سگریٹ کے پیکٹ کے ساتھ رکھے موبائل پر نظر ڈالی جو آف تھا' پھر اسے دیکھا وہ یکدم کچھ مضطرب سا دکھائی دینے لگا اس کے چہرے کے خوب صورت نقوش میں خفیف سا کھنچاؤ آ گیا تھا۔

"کھانا لگاؤں آپ کے لئے؟" وہ فوراً بات بدل کر بولی۔

"نہیں' میرا خیال ہے حویلی میں کھالوں بلکہ تم بھی میرے ساتھ ہی چلو اور ہاں ولید کو بھی لے لو' بہت دنوں سے اس کی بھی باباسائیں سے ملاقات نہیں ہوئی۔" وہ سر جھٹک کر

پروگرام بنا کر اسے بھی انفارم کرتا ہوا واش روم کی طرف بڑھ گیا' عاظمہ سر ہلا کر باہر نکل گئی۔

X...X...X

"تو تم سیاست کے میدان میں کود ہی پڑے نہ صرف یہ بلکہ میرے مقابلے پر کھڑے ہو گئے میرے ہی مخالف بن بیٹھے۔"

حویلی آتے ہی اسے مردان علی کی کڑوی' نفرت انگیز نگاہوں اور جملوں کا سامنا کرنا پڑا۔

"سیاست کسی کی جاگیر نہیں ہے اداسائیں! ویسے مجھے کسی کا حریف بننے کا شوق نہیں ہے میں تو صرف پسے ہوئے طبقے کا حامی ہوں۔"

"آخر تمہیں ضرورت کیا تھی سیاست میں آنے کی' میں تو تمہارے لئے کچھ اور سوچ رہا تھا۔" باباسائیں نے کسی حد تک گہرے اور نرم لہجے میں اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔

"آپ کی محبت اور فیصلے سر آنکھوں پر باباسائیں مگر کیا کروں یہ جراثیم تو خون میں سرایت ہو گئے ہیں نا' ورثے میں ملے ہیں۔" وہ ان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور کسی حد تک شگفتگی سے بولا کہ ماحول میں تناؤ کم ہو جائے۔

باباسائیں اس کی بات سن کر کچھ دیر کچھ نہ بولے پھر ایک ہنکارا بھر کر مردان علی کو دیکھا جو اپنے اندر اٹھتے غصے کو دبانے کے لئے تیز تیز سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

"حسن! میں چاہتا ہوں تم سرمایہ کاری کرو' یہ سیاست ویاست مردان کو کرنے دو۔" بابا سائیں کچھ توقف کے بعد قدرے سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

"سرمایہ کاری؟" اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور ہلکے سے ہنس دیا۔

"آپ کے خیال میں پلاٹوں اور پرمٹ کی سیاست۔"

"ہاں یہی سمجھ لو' سبھی کر رہے ہیں ایک ہم اکیلے تو انوکھے ہونے سے رہے۔ جو اس ملک میں ہو رہا ہے' جو سب کر رہے ہیں ہم بھی کریں گے' اسی میں ہماری بقاء ہے سلامتی ہے۔"

مردان علی بگڑے تیوروں کے ساتھ بولا۔

"سلامتی اور بقا۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"حسن میں جانتا ہوں چار کتابوں نے تمہارے دماغ میں فتور بھر دیا ہے۔" مردان علی کو اس کی ہنسی بری طرح چھیڑتی ہوئی گزری تھی۔

"تم کمی کمین لوگوں کی جوتیاں سیدھی کرنے لگے ہو اور سمجھنے لگے ہو ان کے خادم بن کر تم بڑے پائے کی سیاست کر لو گے' میدان مار لو گے۔ ان کے ووٹ حاصل کر لو گے۔" اب کے وہ طنز سے گویا ہوا۔

"نہیں۔" اس نے سر نفی میں ہلا دیا' پھر اپنی جگہ بیٹھے ہوئے اسی اطمینان سے بولا۔

"میدان تو آپ ماریں گے اداسائیں! ووٹ تو آپ ہی حاصل کریں گے پیسہ پھینک کر' اثر ورسوخ استعمال کر کے اور ڈرا دھمکا کر۔"

"تو بس پھر یہ کوشش ترک کر دو نکل آؤ ان فضول کاموں سے اور جو کام تمہیں سوٹ کرتا ہے وہی کرو اسی میں تمہاری بھی بہتری ہے اور۔"

"میری بہتری کس میں ہے یہ میں جانتا ہوں اور میں اپنی کوشش ترک بھی نہیں کر سکتا۔ یوں بھی میں محنت، ذہانت، کوشش اور قسمت پر یقین رکھتا ہوں، ضروری نہیں جو کبھی نہ ہوا ہو وہ کبھی نہ ہو اور جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے وہ اب بھی ہوتا رہے انگریزی کا ایک منقولہ ہے کہ "There is Always A first time"۔

مردان علی خفگی بھری نظروں سے۔ اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بڑے تیکھے پن سے ہنسا۔

"تو تم میرے مخالف بن کر کھڑے ہو گئے ہو۔"

"نہیں، میں نے کہا نا کہ میں اقتدار کا خواہش مند نہیں ہوں میں صرف حق کے لئے آواز اٹھا رہا ہوں۔" اس نے نرمی سے کندھے اچکائے۔

"خوب۔" مردان علی نے سر ہلا کر سگریٹ کو ایش ٹرے میں پورے دباؤ سے مسل ڈالا۔

"تم وکیل ہو سو لفظوں کا گھماؤ پھراؤ خوب آتا ہے۔"

"اس کے باوجود میں آپ جیسی پر فریب، عالمانہ تقریریں نہیں کر سکتا۔" وہ ہنوز اسی اطمینان سے بولا۔

مردان علی تپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بابا سائیں کی طرف مڑا۔

"سن رہے ہیں آپ؟ اپنے لاڈلے سپوت کی زبان درازی یہ فرمانبرداری۔ اور سعادت مندی ہے۔ اسے سمجھائیے بابا سائیں یہ ہماری خاندانی نجابت، شرافت سب کو ڈبونے پر تلا ہوا ہے، پتہ نہیں کس دنیا کے خواب دیکھ رہا ہے اور لوگوں کو دکھا رہا ہے، پیچھے کی طرف بھی پلٹتے ہوئے کبھی کسی کو دیکھا ہے؟ لوگ اوپر چڑھنے کے جتن کرتے ہیں آپ کا یہ لاڈلا نیچے اترنے میں لگا ہوا ہے۔ کتابی باتیں کتابوں میں ہے اچھی لگتی ہیں۔ یہ صرف پڑھنے اور وقت گزاری کے لئے ہوتی ہیں سر پر سوار کرنے کے لئے نہیں۔" وہ بکتا جھکتا بڑے کمرے سے نکل گیا۔

حسن علی شاہ اس کی اس بیمار اور جاہلانہ سوچ پر ایک متاسفانہ سانس بھر کر رہ گیا۔

شاید اسی دن سے دونوں بھائیوں میں باقاعدہ سرد جنگ کا آغاز ہوا تھا، یا پھر مردان علی کے اندر پنپتی نفرت ابل کر باہر آ گئی تھی چونکہ یہ ان کی جدی پشتی سیٹ تھی جس پر آئندہ اسے ہی آنا تھا اور ایسے میں خود اس کا بھائی اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کوئی اور دیوار بن کر آتا تو اسے گرانے میں لمحہ بھی نہ لگتا تھا مگر معاملہ اب سگے بھائی کا تھا،

جس کو گرانے اور ہٹانے کے لئے اب بڑے تدبر' تحمل اور سازش سے کام لینے کی ضرورت تھی' ہر گزرتا دن اس کے خوف و اندیشے کو بڑھا رہا تھا اور یہ اندیشے نفرت کا روپ دھار کر دل میں گھر کر رہے تھے۔ حسن علی شاہ کی گاؤں میں مقبولیت اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ تاہم وہ صبر و تحمل سے کام لے رہا تھا تاکہ صورتحال کچھ وقت گزرنے کے بعد مکمل اس کے ہاتھ میں ہو۔

اس بات سے بے خبر حسن علی شاہ معمول کی طرح حویلی آتا جاتا رہا' الیکشن میں ابھی ایک وقت پڑا تھا' کہ انہی دنوں بابا سائیں کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ انہیں شہر لے جانے کے فوری انتظامات ہونے لگے مگر انہوں نے شہر جانے سے منع کر دیا' شاید موت کی آہٹیں انہیں اپنے قریب سنائی دینے لگی تھیں اور وہ آخری وقت اپنے آبائی گاؤں اور گھر میں گزارنا چاہتے تھے' دونوں بیٹوں کی ضد اصرار کچھ کام نہ آیا' چنانچہ ڈاکٹرز یہیں بلا لئے گئے مگر بڑے بڑے ماہر ڈاکٹرز بھی ان کی زندگی نہ بچا سکے اور وہ ایک دن داغ مفارقت دے گئے۔

کئی دن حویلی کا ماحول سنسان اور غمگیں رہا پھر زندگی اپنے معمول پر آنے لگی مگر بابا سائیں جیسی مضبوط دیوار کیا گری حسن علی شاہ کو محسوس ہونے لگا' اس کے سر پر دھوپ کا عقاب

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

منڈلانے لگا ہے۔ جو بھی تھا بابا سائیں لاکھ اس کے فیصلوں کی مخالفت کرتے تھے مگر اس سے محبت بھی بلا کی کرتے تھے' اسے کوئی نقصان پہنچے یہ انہوں نے کبھی گوارا نہ کیا' مگر اب یہ گرم نرم چھاؤں اس کے اوپر سے اٹھ چکی تھی۔ اسے کئی بار دھوپ کے تھپیڑوں کا احساس ہوا' مگر وہ نظر انداز کر گیا۔ اپنے ذہن اور دل کو مردان علی کی طرف سے حتی الامکان صاف رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کبھی کبھی عاظمہ اپنا اندیشہ ظاہر کرتی۔ اسے سیاست سے باز رہنے کو کہتی مگر وہ ٹال جاتا سنی ان سنی کر جاتا۔

انہی دنوں الیکشن کی مصروفیات شروع ہو چکی تھیں اور اس نے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کروا دیئے تھے۔

اخبارات میں بڑا غلغلہ تھا کہ بھائی بھائی باہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔

پھر دو روز بعد ہی اچانک ہی مردان علی شاہ نے اپنے کاغذات نامزدگی واپس لینے کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی اپنے چھوٹے بھائی حسن علی شاہ کی بھرپور حمایت کا یقین دلایا۔

یہ فراخ دلی' اعلیٰ ظرفی تھی یا کوئی سازش بہرحال حسن علی شاہ اور عاظمہ کے لئے یہ خبر انتہائی حیرت کا باعث بنی۔

X...X...X

مردان علی شاہ کے کاغذات نامزدگی واپس لینے پر اخبارات میں خاصا چرچا ہوا بلکہ مردان علی شاہ کی طرف سے کروایا گیا۔اسے فراخ دل، اعلیٰ ظرف جیسے خطابات سے نوازا گیا۔اس کے چمچے اخبارات نے جس طرح اس خبر کو نمایاں شائع کیا اس سے مردان علی اچھا خاصا پاپولر ہو گیا۔

بہر حال اس کے مقابلے سے ہٹ جانے پر اب حسن علی کو اپنی آبائی سیٹ پر جیتنا کوئی مشکل نہ رہا تھا۔تاہم وہ عجیب سے خلفشار کا شکار تھا اور مردان علی سے ملاقات کرنا چاہتا تھا مردان علی کو خبر ہوئی تو وہ دوسرے روز ہی خود اس کی کوٹھی میں چلا آیا اور نہایت محبت اور اپنائیت سے چھوٹے بھائی کو سینے سے لگا لیا۔

"خدا تمہاری عمر دراز کرے، تم میرے چھوٹے بھائی ہو میں تمہارا خیر خواہ ہوں تمہاری محنت شوق اور جذبے کو دیکھ کر میں نے آگے سے ہٹ جانے کا فیصلہ کیا ہے اسے تم کسی ناراضگی سازش یا میری خفگی مت سمجھنا تم سے بھلا میں خفا ہو سکتا ہوں۔"

اس نے خود ہی وضاحت کر دی۔حسن علی شاہ اس اپنائیت اور محبت پر چپ سا رہ گیا۔وہ خود ہی بولا۔

"بابا سائیں کے بعد میں خود پر ایک بڑی ذمہ داری محسوس کرنے لگا ہوں، پہلی ذمہ داری تعلقات کی ڈور کو مضبوطی سے باندھے رکھنا ہے۔اگر ہم اس طرح ایک دوسرے کے حریف بن گئے تو بالکل

بکھر جائیں گے۔ہم دونوں ہی تنہا ہو جائیں گے اور لوگوں کو اس پھڈے میں پاؤں ڈالنے کا موقع مل جائے گا۔تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟" انہوں نے پھر اسی اپنائیت محبت سے اس کا کاندھا تھپکا اس نے سر ہلا دیا عاظمہ بے حد مسرور ہوئی۔اس کے دل میں پلنے والے اندیشے خدشے اسی وقت ختم ہو گئے۔

"میں چاہتا ہوں تم لوگ حویلی میں ہی شفٹ ہو جاؤ۔یوں بھی حویلی خالی پڑی رہتی ہے میرا بھی زیادہ تر وقت شہر میں ہی گزرتا ہے۔"

"جی میں یہی کہتی ہوں انہیں مگر یہ مانتے ہی نہیں۔" عاظمہ جلدی سے بولی تو حسن علی نے اسے دیکھا پھر قدرے سنجیدگی سے بولا۔

"تم جاؤ کھانا لگواؤ بہت دیر ہو گئی ہے۔" اس کا انداز روکھا سا تھا عاظمہ کچھ محسوس کر کے فوراً ہی کمرے سے چلی گئی۔

"آپ کھانا کھا کر جایئے گا مجھے تو ایک ضروری کام سے جانا ہے ایک دو گھنٹے لگ جائیں گے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں کھانا وانا تو میں نہیں کھاؤں گا مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں اور ایک یہ اخبار والے بھی پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔ ان کو بھی کسی پل چین نہیں ہے ان سے نمٹتے نمٹتے میں تو عاجز آگیا ہوں۔"

مردان علی ریسٹ واچ پر نگاہیں ڈال کر کھڑا ہوتے بولا حسن علی شاہ صرف ھنکارا بھر کر رہ گیا۔

عاظمہ کھانے کی اطلاع دینے آئی تو مردان علی شاہ جا چکا تھا۔

"ارے آپ نے انہیں روکا نہیں۔"

"انہیں ضروری کام تھا۔" "کیا بات ہے آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔" عاظمہ نے اس کے چہرے پر پھیلی گہری خاموشی کو واضح طور پر محسوس کیا۔

"ہوں' آں نہیں' نہیں میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔" اپنے خیالات سے نکل کر سر کو ہلکی سی جنبش دی پھر بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

"کھانا؟" عاظمہ اس کے پیچھے گئی۔

" تم کھالو' مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ تیزی سے باہر نکل گیا' عاظمہ اس کی اس کیفیت پر الجھ سی گئی تاہم سر ہلا کر ڈائننگ روم کی طرف آ گئی اور ملازم سے کہہ کر کھانا اٹھوا دیا۔ حسن علی شاہ بھوکا تھا الجھا ہوا پریشان تھا وہ کیسے کھا سکتی تھی' اس نے تو آج تک ایک نوالا بھی اس کے بنا نہیں توڑا تھا۔ وہ لابی میں آ کر صوفے پر میگزین لے کر بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

X...X...X

"ارے آپ سوئے نہیں ابھی تک؟" عاظمہ نے بیڈ روم میں قدم رکھا تو حسن علی شاہ کو بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیم وا بیٹھے اپنا منتظر پایا۔

"میرا خیال تھا آپ تھکے ہوئے اتنے تھے کہ پڑتے ہی سو گئے ہوں گے۔" وہ بالوں سے ہیئر بینڈ نکال کر سنگھار میز کی طرف بڑھ گئی۔

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی

نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی

وہ اس کی طرف کروٹ کے بل لیٹتے ہوئے گنگنایا۔

گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل

کسی کے وعدہ فردا کی گفتگو ہی سہی

"کیا بات ہے بڑا شاعرانہ موڈ ہو رہا ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر ہلکے سے ہنسی اور بالوں کے دو حصے کر کے دائیں بائیں رکھ کر ان ریشم کے لچھوں پر نرمی سے برش پھیرنے لگی۔

حسن علی شاہ کی نگاہیں اس کے بالوں سے ہوتی اس کے چہرے پر آ کر ٹھہر گئیں پھر ایک ہلکی سی سانس بھر کر قدرے اونچا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ادھر آئو عاظمہ یہاں آ کر بیٹھو۔" اس کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔ نہ خمار آلود نہ حکمیہ' شاید کسی انجانے وسوسوں میں گھرا ہوا۔

عاظمہ تو اس کے لہجے کے ایک ایک رنگ سے واقف تھی۔ چونک کر اس کی طرف دیکھا اور آ کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔

مجھے معجزوں پہ یقین نہیں

مگر آرزو ہے کہ جب قضا

مجھے بزم دہر سے لے چلے

تو پھر ایک بار یہ اذن دے

کہ لحد سے لوٹ کے آ سکوں

تیرے در پہ آ کے صدا کروں

تجھے غمگسار کی ہو طلب تو

تیرے حضور میں آرہوں

یہ نہ ہو تو سوئے رہ عدم

میں پھر ایک بار روانہ رہوں

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ کر چھت پر نظریں جما کر دھیرے دھیرے گنگنایا تھا'

عاظمہ کے اعصاب کو گویا جھٹکا لگا اس نے اپنا ہاتھ کھینچا۔

''یہ کیا' کہہ رہے ہیں؟ خدانہ کرے جو آپ مجھ سے جدا ہو جائیں۔''

جگ سمندر ہے ساحل پہ ہیں ماہی گیر

جال تھامے کوئی' کوئی بھالا لئے

میری باری کب آئے گی کیا جانئے

دن کے بھالے سے مجھ کو کریں گے شکار

رات کے جال میں یا کریں گے اسیر

'' حسن پلیز!'' عاظمہ نے اسے باقاعدہ جھنجھوڑ دیا۔ وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں نے کیا کہا ہے۔'' غایت درجے معصومیت سے چھیڑا تو وہ اس پر ایک ناراض نظر ڈال کر اٹھنے لگی مگر اس نے اٹھنے نہیں دیا۔

''اس طرح کی شاعری پڑھنے اور سنانے کی کیا ضرورت ہے۔''

وہ بال لپیٹنے لگی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال پھر منتشر کر دیئے۔

رات مہکی ہوئی آئی ہے کہیں سے پوچھو

آج بکھرائے ہوئے زلف طرح دار ہے کون

وہ اپنے سر پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔" وہ ایک ٹک اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر مسکرایا مگر وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

"ایسا لگتا ہے آپ اندر سے مضطرب ہیں، کوئی بے کلی ہے، کوئی پریشانی، اضطراب جسے سمیٹے ہوئے ہیں۔"

وہ ذرا حیران ہوا۔ کتنا صحیح تجزیہ کیا تھا اس نے۔ حالانکہ بظاہر وہ مسکرا رہا تھا مگر شاید اس کی مسکراہٹ کا پھیکا پن وہ محسوس کر گئی تھی۔

ہاں بھلا ہم جس کے دل میں رہتے ہیں ان سے چھپ سکتے ہیں کبھی۔

"ہاں عاظمہ! ایک اضطراب ہے، سمجھ نہیں آتا کیوں، جیسے کوئی چیز روح کو مسوس رہی ہے۔ تمہیں، تمہیں نہیں لگتے یہ بام و در اداس، چاندنی بھی کتنی پھیکی پھیکی لگ رہی ہے۔" اس نے کھڑکی پر نظر ڈالی۔

"مگر نہیں شاید، ہر موسم دل کے اندر ہوتا ہے اس کا رنگ باہر کی دنیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ بھلا بام و در، چاندنی، فضا کے پاس دل کہاں ہیں۔ یہ اس جھنجھٹ سے آزاد ہیں۔" وہ خود ہی اپنی بات کی نفی کرتے ہوئے ہنس دیا۔

"کیا آپ کو اپنی جیت کا یقین نہیں ہے؟ مردان بھائی کے فیصلے نے آپ کو ناخوش کیا ہے؟" وہ اس کی کیفیت جانتے ہوئے بولی جواباً اس نے ایک گہری سانس بھر کر سر نفی میں ہلایا۔

"نہ میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا ہوں، نہ گزرے دنوں کو بس یونہی دل خاموش سا ہو گیا ہے۔ ولید...ولید چلا گیا ہاسٹل کیا؟" اسے اچانک ولید کا خیال آ گیا۔

"ہاں کل آ جائے گا سیٹرڈے ہے نا۔" وہ الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھے جا رہی تھی پھر بولی۔

"میں دودھ لے کر آتی ہوں آپ کے لئے۔"

"نہیں طلب نہیں ہے تم بس پاس بیٹھی رہو یونہی میرے سامنے، میں تمہیں یونہی دیکھنا، دیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جانے سے روک دیا۔

"ارے تو مجھے کہاں چلے جانا ہے۔" وہ ہلکے سے ہنسی پھر اس کی نگاہوں کی محویت سے قدرے محجوب سی ہو گئی۔

''عاظمہ !'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور نرمی سے اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دبائو بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تم خوش ہو میرے ساتھ ؟'' اس سوال پر وہ بے ساختہ ایک ہلکی سانس بھر کر مسکرا پڑی جیسے کسی بچے کا معصومانہ سوال سن لیا ہو۔

''یہ پوچھنے کی نوبت کیوں آئی بھلا؟''

''بتائو نا۔'' اس نے اصرار کیا اس کی خوشنما آنکھوں میں ایک عجیب معصومانہ تجسس اور اصرار تھا۔

وہ سر جھکا گئی اس کے عارضوں پر یک بیک شاداب سی سرخی سمٹ آئی۔

''اپنی خوش نصیبی پر تو رشک آتا ہے مجھے ' کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ کائنات کی سب سے زیادہ خوش نصیب لڑکی شاید میں ہی ہوں جسے آپ جیسا شریک سفر ملا ہے۔''

''آ... اچھا ایسا کیا ہے بھلا مجھ میں۔'' اس کی اٹھنے والی خوب صورت آنکھوں میں اس نے اپنی محبت لٹاتی نگاہیں گاڑ دیں۔

''آپ میں ؟'' اس نے کچھ کہنا چاہا پھر یکدم کوئی شرارت سوجھی تو مسکرائی۔

''تو یوں کہیئے آج جناب کو اپنی تعریف سننے کا شوق چرایا ہے۔''

اس کی بات پر وہ سر نفی میں ہلانے لگا' نہیں بلکہ تمہاری بے پناہ محبت سے اپنے دل کو سیراب کرنا چاہتا ہوں۔ اظہار سننا چاہتا ہوں' اس کی خوشبو سے دل کا گلستان مہکانا چاہتا ہوں۔ تم نے سنا نہیں کہ۔

محبت کی طبیعت میں یہ کیسا بچنا قدرت نے رکھا ہے

کہ جتنی بھی پرانی' جتنی بھی مضبوط ہو جائے

اسے تائید تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے

یقیں کی آخری حد تک دلوں میں لہلہاتی ہو

نگاہوں سے ٹپکتی ہو

لہو میں جگمگاتی ہو

ہزاروں طرح کے دلکش حسیں ہالے بناتی ہو

اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے

اس کی آواز بہت خوب صورت تھی اور اس سے کہیں زیادہ اس کا انداز اور ان سب سے بڑھ کر اس کی محبت، جس کا لمحہ لمحہ اتنا قیمتی تھا جسے عاظمہ متاع کی طرح سمیٹ کر اپنے دل میں چھپا لیا کرتی تھی۔

وہ دونوں رات دیر تک جاگتے باتیں کرتے رہے۔ فجر کی اذان ہوئی تو دونوں نے نماز پڑھی پھر وہ عاظمہ کو لئے لان میں چلا آیا نیند تو جیسے اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، ہلکی تھکن کا شائبہ تک نہ تھا مگر وہ ان لمحات کو بے حد انجوائے کر رہا تھا۔

صبح کی تازہ ہوا بے حد مہکی اور گلابوں کی خوشبو سے معطر ہو رہی تھی، جسم سے ٹکراتی تو روح تک میں طراوت کا احساس ہو جاتا۔

وہ گہری گہری سانس بھرنے لگا جیسے اس ساری طراوت اور روشنی کو پھیپھڑوں میں اتار لینا چاہتا ہو۔ پھر اس نے ایک سرخ چمکتا ہوا شبنم کے قطروں سے نہایا گلاب توڑا اور اسے عاظمہ کے ریشم جیسے بالوں کے جوڑے میں اٹکا دیا۔

وہ محجوب سے ہو کر ہنس پڑی۔

"کیا ہو گیا ہے آج آپ کو؟ اتنے رومانٹک تو شادی کے اوائل دنوں میں بھی نہ تھے۔" وہ کین کی کرسیوں کی طرف جانے لگی کہ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر وہیں گھاس پر اپنے نزدیک بٹھا لیا۔

"کہتے ہیں نا کہ محبت میں قربت کی آمیزش ہو تو وہ بلندیوں کو چھو لیتی ہے، بس یہ جناب کی قربت ہے جس نے میری محبت کے درخت کو تناور کر دیا ہے۔ کیا تمہیں چھاؤں کا احساس ہو رہا ہے۔" وہ اس کی سمت جھکا۔

"چھاؤں سی چھاؤں ہے، چھایا سی چھایا ہے۔ ایسا لگتا ہے اس سائبان تلے آکر اب کبھی دھوپ کا ذائقہ نہ چکھوں گی، آپ واقعی میرے لئے ٹھنڈی چھاؤں بھرا درخت ہیں حسن! اور مجھے یقین ہے اس چھاؤں تلے میں کبھی دکھ کی دھوپ نہیں دیکھوں گی۔"

حسن علی شاہ اس کا چہرہ تکتا رہ گیا، یکلخت کوئی چیز اس کی روح پر چٹکیاں لینے لگی، اس کے ٹھنڈے یخ ہاتھوں نے اسے چونکا دیا۔

"آؤ عاظمہ اندر چلیں، ٹھنڈ بہت زیادہ ہے کہیں بیمار ہی نہ پڑ جاؤ تم۔"

وہ دونوں اٹھ کر اندر آ گئے۔

"آج تو میں نے تمہیں تھکا ڈالا ہے نا۔" وہ اسے دیکھ کر ہلکی ندامت کے ساتھ بولا تو وہ سر نفی میں ہلانے لگی۔

"نہیں بالکل بھی تھکی نہیں ہوں۔ البتہ آپ کی فکر ہے' دن بھر کی مصروفیت کے باوجود رات بھر جاگے ہیں اب سو جایئے آپ۔" وہ پردوں کی ڈوریاں کھینچنے لگی کہ اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر روک دیا پھر خود ہی پردے ایک طرف ہٹا دیئے۔

"اب سو کر کیا کرنا ہے میڈم! فرشتوں کی لعنت پڑتی ہے دیر تک سوئے ہوئے انسان پر۔"

"تو پھر کیا خیال ہے ناشتے کا انتظام نہ کیا جائے۔" وہ اس کا ارادہ جان کر بولی تو اس نے سر ہلا دیا۔

ناشتہ دونوں نے ہلکی پھلکی باتوں کے ساتھ ختم کیا' پھر حسن علی شاہ ہاتھ لے کر اپنی فائلیں اٹھا کر کوٹھی سے چلا گیا جبکہ عاظمہ ملازموں سے کام کروانے لگی لنچ تیار کیا اور فارغ ہو کر کچھ دیر کے لئے لیٹ گئی' رات بھر جاگنے کے باعث لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

لنچ کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو حسن علی شاہ بھی آچکا تھا۔

"آج ولید آئے گا نا؟" وہ منہ پونچھتی باتھ روم سے نکلی تو حسن علی شاہ نے پوچھا۔

"ہاں میں نے علی نواز کو بھیج تو دیا ہے اسے لینے مگر وہ شریر لڑکا اسے دو تین گھنٹے بلاوجہ بٹھائے رکھے گا۔ شام سے پہلے آئے گا نہیں' میری ڈانٹ پر مزے سے کہتا ہے۔ دوستوں کو الوداع کرنے میں اتنا ٹائم ہو جاتا ہے۔ الوداع تو یوں ہوتا ہے جیسے سال بھر کے لئے جدا ہو رہے ہیں۔" وہ گیلا تولیہ اور حسن علی شاہ کے استعمال شدہ کپڑے اٹھا کر کمرے سے باہر نکلنے لگی۔

"تم نے علی نواز کو کیوں بھیجا' میں تو اسے فارغ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا میرا مطلب ہے واپس حویلی ہی بھیج دینا چاہ رہا تھا اور نیا کوئی ڈرائیور رکھنے کا سوچ رہا تھا۔"

"ارے تو اس میں کیا ہوا' ہمارا ملازم ہی تو ہے اب مردان بھائی کا ملازم رہا ہے تو اس میں اس بیچارے کا کیا قصور؟"

عاظمہ کو اس کی تشویش پر ہنسی آ گئی مگر اس کی پیشانی پر ابھرنے والی تشویش کی لکیریں ہنوز قائم رہیں۔ اس نے بس عاظمہ پر ایک نظر ڈالی پھر کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے ہونٹ بھینچ کر اپنی وارڈروب کی طرف بڑھ گیا۔

"اگر کوئی بات پریشان کر رہی ہے تو آپ ولید کے سکول فون کر لیں۔" وہ کچھ سوچ کر اس کی طرف آتے ہوئے بولی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے میں پریشان نہیں ہوں۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر تسلی بھرے انداز میں مسکرادیا اور اخبارات کا رول ایک طرف رکھ کر دراز سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے بولا۔

"تم لنچ کر لینا مجھے اس وقت طلب نہیں ہے ولید آئے گا تو اس کے ساتھ ہی میں بھی کھا لوں گا اور پلیز میں ذرا مصروف ہوں کوئی مجھے کمرے میں آ کر ڈسٹرب نہ کرے ٹھیک اور ہاں سنو!" اس نے جاتی عاطمہ کو روکا۔

"ایک کپ چائے کا البتہ ضرور بھجوادو۔" اور عاطمہ سر ہلا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

X...X...X

شام کا سنہرا پن ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا خنک ہوائیں موجزن تھیں مگر عاطمہ کو جانے کیوں عجیب سے اداسی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ آج اسے اپنی ماں شدت سے یاد آنے لگیں۔ اس نے اپنے بیڈ روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھی الیکشن میں دو

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

دن رہتے ہیں اور اس کا شوہر کس قدر مصروف تھا۔ وہ اسے ڈسٹرب کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اپنی ماں کو سوچتے سوچتے ماضی کے کئی تلخ اداس دن بھی یاد آنے لگے۔ اس کے باپ کے انتقال کے بعد کس طرح اس کے عزیز رشتے داروں نے اس کی ماں کو اکیلا چھوڑ دیا تھا اور اس کی ماں نے عین جوانی میں بیوگی کی چادر اوڑھے اپنی عزت اور عصمت کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کی پرورش کی' اسے پڑھایا لکھایا' اسے دنیا کی گرم سرد نظروں سے بچائے رکھا۔

پھر اسے اپنے کالج کا زمانہ اور ساتھ ہی وہ مہکتے دن یاد آ گئے کس طرح حسن علی شاہ اس کا دیوانہ ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار مسکراتی محبت لٹاتی نظریں بند دروازے پر جما دیں در حقیقت وہ تصور میں اپنے محبوب شوہر کو تک رہی تھی۔

اچانک اسے خیال آیا کہ وہ تو دو گھنٹے پہلے صرف چائے کا ایک کپ ہی اسے دے آئی تھی یقیناً اسے چائے کی پھر طلب تو ہو گی۔

"الٰہی بخش!" وہ لابی کے صوفے پر لیٹے لیٹے یکدم اٹھ کر ملازم کو آواز دینے لگی مگر ہر طرف غیر معمولی سناٹا سا محسوس ہوا دوسرے ملازم بھی دکھائی نہ دیئے۔ یوں تو حسن نے یہاں

ملازموں کی فوج نہیں رکھی تھی مگر ضرورت کے تین ملازم تھے۔وہ بھی اس وقت دکھائی نہ دے رہے تھے۔

”الٰہی بخش۔“ اس نے آواز دی پھر اٹھ کر کچن کی طرف گئی کہ اچانک اسے عجیب سی بو کا احساس ہوا جیسے کوئی شے جل رہی ہو۔وہ کچن کی طرف بڑھتے بڑھتے یکدم ٹھٹک گئی۔اسے اپنے بیڈروم کے

پچھلے حصے سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا یہ حصہ پورچ کی طرف اور پچھلے خالی ویران حصے کی طرف پڑتا تھا۔اس طرف کی کھڑکیاں وہ اکثر وہ بیشتر بند ہی رکھتی تھی مگر حسن ہی کھول دیا کرتا تھا۔یہ دھواں وہیں سے اٹھتا محسوس ہو رہا تھا یکدم شعلے بلند ہوتے دکھائی دیئے‘ وہ خوفزدہ ہو کر اپنے بیڈروم کی جانب بھاگی۔

”حسن یہ آگ۔“ کہتی مگر اس کے بقیہ الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔اس نے زور سے چیخنا چاہا مگر کوئی آہنی گولا سا حلق میں پھنس کر رہ گیا تھا‘ آگ اس کے بیڈروم کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی اندر دبیز دھوئیں میں اسے حسن علی شاہ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

”حسن‘ حسن!“ اس نے پورا زور لگا کر کہا۔اب بہت تیزی سے شعلے ناچتے دکھائی دینے لگے جو کمرے کی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔

”حسن! حسن! کہاں ہو یہ آگ؟“ وہ دیوانہ وار کمرے میں ادھر ادھر بھٹکنے لگی کہ کسی نے اسے زور سے دبوچ لیا مگر یہ لمس حسن علی شاہ کا تو نہیں تھا یہ تو کسی اور ہی کے آہنی ہاتھ تھے۔سخت بے مہر‘ ظالم اور کریہہ ہاتھ۔

”عاظمہ‘ عاظمہ! بھاگ جاؤ یہاں سے بھائی جان۔“ اسے حسن علی شاہ کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی پھر اس کا آگ کی لپیٹ میں آیا ہوا وجود دکھائی دیا۔اسے بازو سے پکڑا آدمی دکھائی دیا جس کا چہرہ اس کے لئے انجانا نہیں تھا۔اس نے اسے مردان علی شاہ کے باڈی گارڈ کے روپ میں کئی بار دیکھا تھا۔

عاظمہ‘ عاظمہ!“ حسن علی شاہ کی آواز چیخ میں بدلی پھر یوں چیخ گئی جیسے کوئی کانچ بہت اونچائی سے گرا ہوا اور ایک چھناکے کے بعد سناٹا چھا گیا وہ اپنا بازو چھڑا کر باہر بھاگی تا کہ کسی کو مدد کے لئے پکار سکے‘ کسی طرح اپنے شوہر کو ان ظالموں کے شکنجے سے بچا سکے۔

وہ شور مچاتی باہر نکلی خود اس کے کپڑوں میں آگ لگ چکی تھی مگر اسے ہوش نہیں تھا۔اس کا دھیان اپنے شوہر کی طرف تھا جو اندر شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔

”او مٹھل جلدی کرو، دیکھو وہ عورت بھاگ نہ جائے ورنہ رئیس مردان ہمارا بھرکس نکال دے گا۔“

اسے قاتلوں کی آوازیں سنائی دیں مگر وہ ادھر ادھر مدد کے لئے سب کو پکارتی رہی گھر کے ملازموں کا ایک ایک نام لے کر آوازیں دی تھیں مگر کوئی ہوتا تو سنتا بھی، اچانک کسی نے اس کے اوپر موٹا کپڑا ڈال دیا اور اس سے لپٹ گیا۔

”ولید!“ اسے اپنے اعصاب یکدم ٹھٹھرتے محسوس ہوئے۔

”مما!“

”ولید بھاگ جائو وہ ظالم، وہ ظالم تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔“

وہ یکلخت ہذیانی ہو کر چیخی مگر ولید اسے اپنے ساتھ کھینچنے لگا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ولید، ولی تمہارا باپ اندر، اندر۔“ اسے لگا کہ اس کا دل پھٹ رہا ہو، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں بکھر رہا ہو دھنکی ہوئی اون کی طرح۔

شاید آج ہی قیامت تھی، آج کے دن ہی صور پھونکا گیا تھا۔

اچانک اسے بہت قریب سے انہی سفاک قاتلوں کی آوازیں آئیں۔

”پکڑ لو دونوں ماں بیٹے کو، بھاگنے نہ پائیں اور پوری کوٹھی کو آگ لگا دو کہیں بھی انہیں راستہ نہ ملے کوئی پناہ نہ ملے۔“ الفاظ تھے یا کوئی بم بلاسٹ ہوا تھا اس کے ریت کی طرح ڈھیر ہوتے ہوئے پیروں میں جیسے جسم کی تمام توانائی آ گئی اس نے ولید کا بازو سختی سے تھام لیا۔

اب یہ اس کی آخری متاع تھی وہ اسے کسی طور ان ظالموں کا نوالہ نہیں بنا سکتی تھی، اس کے پیروں میں روانی آتی چلی گئی۔وہ دونوں بھاگتے چلے گئے مگر بہت دور جا کر نہ جانے اچانک کیا ہوا شاید زمین کا آخری کنارا آ گیا تھا عاظمہ کو تو کچھ یونہی لگا جیسے اب خلا ہو اور آگے کوئی کنارہ نہ ہو، اس کی آنکھوں تلے گہری دبیز دھند پھیل گئی اس کے ہاتھ سے ولید کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ وہ اوندھے منہ گری اور فضا پر چھائے جمود کا ہی ایک حصہ بن گئی۔

وہ بولتے بولتے یکدم ایک تیز سسکاری لے کر چپ ہو گئی متورم آنکھوں میں ایسی جلن ہونے لگی تھی جیسے کسی نے ڈھیر سارے انگارے بھر دیئے ہوں۔

وہ اپنی کتاب زندگی کا ورق ورق کھولتے ہوئے جیسے بکھر رہی تھی۔

وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں چراغ رخ ہے نہ شمع وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں
وہ گل سر شاخ جل گئے ہیں' وہ دل تہ دام بجھ گئے ہیں

اس نے تکیے پر سر پٹخا۔

”میں تو خود بھی مر جانا چاہتی تھی مگر زندہ رہ گئی' کیا سوچے گا حسن علی شاہ کہ میں نے اسے تنہا جانے دیا' عمر بھر اس کا ہاتھ تھام کر چلنے کا وعدہ نہ ایفا کر سکی' کسی پل اسے تنہا نہیں چھوڑوں گی اس وعدے پر قائم بھی نہ رہ سکی۔“

اس کا دل رنج کے بوجھ سے پھٹنے لگا تھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے انگارے چٹخنے لگے تھے۔

شائستہ نے نرمی سے اس کے کندھے پر اپنے تسلی بھرے ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو اس نے شدت کرب سے لب دانتوں میں دبا کر آنسوؤں پر بند باندھنے کی کوشش نہ کی۔

آنسو اس کی آنکھوں سے جھرنوں کی طرح پھوٹ نکلے۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ اس نے اسے رونے دیا خود اسے بھی اپنا دل درد کی تپش سے جھلستا محسوس ہو رہا تھا۔

”خود کو سنبھالو عاظمہ! ولید کی خاطر۔ کیا جتنی محبت تم حسن علی شاہ سے کرتی تھیں اتنی محبت تمہیں اپنے بیٹے سے نہیں ہے؟ اس کی خاطر تم خود کو نئے سرے سے جوڑو۔ اسے تمہاری ضرورت ہے۔“

اس کی بات پر وہ ایک ملول سی سانس بھر کر آنکھیں پونچھنے لگی۔

”اس کی خاطر تو خود کو وہاں سے زندہ نکال لائی ہوں۔ وہ ظالم لوگ میرے بیٹے کا بھی نام و نشان مٹا ڈالنا چاہتے تھے تاکہ کل کلاں وہ ان کے مقابل نہ آ جائے۔ میں نے مردان علی شاہ جیسا درندہ صفت آدمی اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا جس نے اپنے سگے بھائی کو محض...“

وہ بولتے بولتے لب بھینچ کر چپ ہو گئی دروازے کے پاس اسے ولید کھڑا نظر آیا۔

اس کی آنکھوں اور چہرے پر عجیب سا سناٹا اترا ہوا تھا۔ وہ شاید کافی دیر سے وہاں کھڑا تھا اور اپنی ماں کے الفاظ اپنے گداز دل پر محسوس کر رہا تھا ان دونوں کے متوجہ ہونے پر وہ کسی ٹرانس سے باہر نکلا اور پلٹ کر وہاں سے چلا گیا۔

عاظمہ نے اسے پکارنا چاہا مگر آواز آنسوئوں کی یورش میں دب کر رہ گئی۔ اس نے تکیے سے اٹھایا ہوا سر دوبارہ تکیے پر پٹخ دیا۔ وہ جس ذہنی آزار سے گزر رہی تھی اس کا اندازہ شائستہ کو بخوبی ہو رہا تھا۔ اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ وہ اس کا سر تھپکنے لگی۔

تجھ کو کس پھول کا کفن دیں ہم

تو جدا ایسے موسموں میں ہوا

جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں

آئینے جس کو ڈھونڈتے تھے خود

ایسا بے مثل عکس گر تھا وہ

سارے کانٹے سمیٹ لیتا تھا

ایسا انمول ہم سفر تھا وہ

اپنے دل میں سنبھال کر اس کو

آج ہاتھوں سے کھو رہے ہیں اسے

ہچکیاں بندھ گئی ہیں لفظوں کی

آئینہ خانے رو رہے ہیں اسے

اس کو کس روشنی میں دفنائیں!

اس کو کس خواب کا بدن ہم دیں

وہ جو خوشبو میں ڈھل گیا یارو!

اس کو کس پھول کا کفن ہم دیں

X...X...X

وہ ہاسپٹل کے باغیچے کے ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے دل کو ان جملوں کے آتشیں بگولوں کی زد میں محسوس کر رہا تھا جو اس کی ماں کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔ وہ تو بالکل لاعلم تھا اس کا

ننھا سا ذہن تو اب تک باپ کی اس اندوہناک موت کو محض اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ابلاوا سمجھ رہا تھا۔ گو کہ موت کا منظر اس کے ذہن کی سطح پر اب بھی دہشت کی طرح بیٹھا تھا مگر اب اس دہشت میں عجیب سی وحشت اور بے قراری بھی بھر رہی تھی۔

اس کے باپ کو قتل کیا گیا تھا' سازش کے تحت اور قاتل اس کے اپنے سگے تھے۔

بھلا محبت کرنے والے لوگ کیسے قاتل ہو سکتے ہیں' اس کے تصور میں اس کے چچا کا مہربان وجود اور وہ اپنائیت بھری مسکراہٹ سے چمکتا چہرہ گھوم گیا' اس کے سر پر شفقت سے پھرتا

ہاتھ مگر دوسرے پل جسم کے اوپر سے وہ چہرہ یکلخت گم ہو گیا اس کی جگہ صرف تاریکی رہ گئی۔ آہستہ آہستہ تاریکی میں ایک خوفناک چہرہ بننے لگا جس کے بڑے بڑے دانتوں سے خون ٹپک رہا تھا' جس کی آنکھوں کی جگہ دو گہرے سوراخ تھے جن سے ہیبت ظاہر تھی۔

نہیں محبت کرنے والے نہیں بلکہ محبت کا وقتی چولا پہننے والے قاتل ہو سکتے ہیں۔

اپنے مفاد کے لئے محبت کا روپ دھارنے والے قاتل ہوتے ہیں' روح کے بھی جسم کے بھی۔

اس کے چچا نے بھی وہ چولا وقتی پہنا ہوا تھا جو اپنے مفاد پر لگنے والی چوٹ سے اتر گیا۔

اس کے ذہن میں عجیب سی آندھی چل رہی تھی۔ اسے وہ مضبوط چوڑا سینہ یاد آنے لگا جس پر وہ سر رکھ کر کہانیاں سنا کرتا تھا۔

اس مضبوط ہاتھ کا لمس ستانے لگا جو اسے اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا کرتا تھا۔

وہ بھاری گمبھیر آواز جو سارے مجمع کو ایک طلسم میں جکڑ لیتی تھی' جس کی آواز کی گونج میں سچائی کھلتی تھی جس کی آنکھوں میں اسی کے باطن کی چمک فروزاں رہتی تھی۔

"مما کیا سارے تاریخی ہیرو پاپا جیسے ہی ہوتے ہیں۔" اسے وہ رات یاد آگئی جب وہ عاظمہ سے لپٹا پوچھ رہا تھا۔

"میری جان تمہارے پاپا ان جیسے ہیں۔"

"کیا محمد بن قاسم جیسے؟"

"ہاں۔"

"کیا محمد بن قاسم کی آنکھیں بھی پاپا جیسی تھیں۔"

"جانو یہ جو اسلام سے محبت کرتے ہیں' اپنے ملک سے' وطن سے محبت کرتے ہیں ان سب کے دل ایک جیسے ہوتے ہیں۔بیٹا ایسے لوگ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں روشنی بن کر' اجالا بن کر' ہماری راہوں کو منور کئے رکھتے ہیں منزلوں کے نشان کی طرح راستہ سوجھاتے ہیں۔"

"پاپا بھی مر کر روشنی بن جائیں گے مما؟۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"مرنا تو ایک دن سب کو ہی ہے میری جان! مگر اچھے لوگ مر کر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں دلوں میں' ان کی یادیں ان کے نام پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں میں دفن رہتے ہیں' ہمیشہ کے لئے خوشبو بن کر۔"

آہ

وہ جو خوشبو میں ڈھل گیا یارو

اس کو کس پھول کا کفن ہم دیں

وہ ہاسپٹل سے آیا' اسے وہاں شدید قسم کی گھٹن اور حبس کا احساس ہو رہا تھا مگر باہر کی فضا میں بھی کوئی تازگی نہ تھی۔ دراصل یہ گھٹن بیرونی نہیں اندرونی تھی۔

وہ سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا۔ پھر واپس چلا آیا۔ گھر آیا تو پتہ چلا سب ہی اس کے یوں اچانک گم ہو جانے پر پریشان تھے۔

"کہاں چلے گئے تھے ولید! میں نے تو تمہیں ہاسپٹل میں چھوڑا تھا۔" جہانگیر احمد اسے دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھے مگر اس سے پہلے شائستہ نے اس کا بازو تھام کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

"تمہاری امی بہت جلد ڈسچارج ہو کر گھر آ جائیں گی تم پریشان ہونا ان کے لئے؟۔" وہ اس کے بالوں کو سہلانے لگی۔

اس نے جواباً بس ایک گم سم سی نظر ان پر ڈالی اور سر جھکا لیا۔ اس پر اکثر ایسی ہی چپ طاری ہو جایا کرتی تھی۔ ایسے میں صرف اس کی آنکھیں ہی بولتی تھیں ان میں سارے رنگ اتر آتے تھے۔

آغا جی چاہتے تھے وہ اپنی عمر کے مطابق ری ایکٹ کرے' تمام بچوں کی طرح تکلیف ہونے پر بلبلائے' روئے۔ کم از کم اپنی ماں سے لپٹ کر ہی رو لے' وہ سارے آنسو بہا دے مگر انہوں نے اسے روتے تو کجا اس کی پلکوں پر بھی کبھی آنسو چمکتے نہیں دیکھے تھے۔ شاید وہ تنہائی میں رونے کا عادی تھا یا پھر اسے اتنی سی عمر سے ہی اپنے احساسات اور اعصاب پر کنٹرول کرنا آ گیا تھا۔ انہوں نے آج تک اتنے مضبوط اعصاب کا بچہ نہیں دیکھا تھا۔

عاظمہ ڈسچارج ہو کر گھر آ گئی تھی مگر اس کی ذہنی حالت اب بھی بہت ابتر تھی۔ وہ سارے اجنبی لوگ اس کے لئے مہربان سایہ دار' سائبان کی طرح تھے مگر اسے لگتا تھا وہ اتنے بہت سے مہربان لوگوں کے درمیان بھی تنہا ہو' ایسی تنہائی اس کے دل کی دیواروں سے لپٹ گئی تھی جسے شاید کوئی بھی شیئر نہیں کر سکتا تھا۔

حسن علی شاہ کی یاد اس کی اندوہناک موت کا لرزہ خیز تصور اب بھی اس کے دل کی دیواروں سے ٹکرا کر لہو بکھیرتا تھا۔

وہ کبھی بیڈ پر چت لیٹی چھت کو تکا کرتی' کبھی کھڑکی میں کھڑی ہو کر پورچ کی طرف گھنٹوں نگاہیں جمائے رکھتی۔ جیسے ابھی حسن علی شاہ کی گاڑی پھسلتی ہوئی وہاں آ کر رکے گی اور وہ اپنے مقناطیسی سراپے کے ہمراہ اس میں سے اترے گا اور شاہانہ چال چلتا ہوا اندر کی طرف بڑھ جائے گا۔

ایسی حالت میں شائستہ اسے زبردستی لان میں لے آتی تاکہ وہ بہل جائے اور ننھی سی شہرینہ کو اس کی گود میں ڈال دیتی کہ اس کا ذہن اس طرف ہو جائے ایسا کرنے میں وہ اکثر کامیاب بھی

ہوتی۔ وہ سنہری آنکھوں اور سنہری بالوں والی اس موھنی سی بچی کی طرف متوجہ ہو جاتی اسے گود میں بھر کر خود سے چمٹا لیتی۔

"بہت پیاری ہے یہ۔ حسن کو بھی بیٹیاں بہت اچھی لگتی تھیں۔ اسے بیٹی کی بہت چاہ تھی مجھ سے اکثر کہتا عاظمہ ہماری ایک بیٹی ہونی چاہیئے بالکل تمہاری جیسی اور میں کہتی نہیں' ہاں ایک بیٹی بھی آپ جیسی ہونی چاہیئے۔

وہ درد بھرے لہجے میں کہتی پھر ماضی کے پاتال میں اتر جاتی۔

"کاش میں حسن کی یہ خواہش پوری کر دیتی۔" اس کا دل پھر سینے میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگتا۔ وہ شہرینہ کو زور سے خود سے بھینچ کر چومنے لگتی۔

"ولید کو یہ چھوٹی سے گڑیا بے حد پسند ہے۔ کہتا ہے مما آنٹی کی یہ گڑیا بہت کیوٹ سی ہے۔ ہم یہاں سے جائیں گے تو اسے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔"

وہ مسکرا کر بتانے لگی پھر یکدم کسی خیال نے جیسے اس کی مسکراہٹ کو نچوڑ لیا۔ وہ شائستہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"مگر ہم جائیں گے کہاں! مردان علی کے بھیڑیے ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ وہ میرے ولید کو مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ میں' میں ولید کو ان درندوں کے حوالے نہیں کروں گی۔ شائستہ! کیا تم لوگ میرے ولید کو تحفظ دو گے نا۔" اس نے شائستہ کا ہاتھ پکڑ لیا' اس کے چہرے پر وحشت اور خوف کی پرچھائیں لرزنے لگیں۔

"ولید کو کوئی نہیں لے سکتا' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا' ہم سب ہیں' وہ ہمارے درمیان ہم سب کی محبت اور شفقت کی چھائوں میں بڑا ہو گا۔ تمہارا سہارا بنے گا تم کیوں فکر کر رہی ہو۔"

وہ اسے تسلیاں دینے لگی' مگر مگر اس پر عجیب سا خوف طاری تھا وہ لرز رہی تھی اس کی حالت کے پیش نظر شائستہ اسے تھام کر اندر لے گئی۔ مگر اس کی حالت بہت زیادہ بگڑنے لگی تو ڈاکٹر کو فون کر کے بلوانا پڑا اس کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا تھا اور زخم بھی ٹیسیں دے رہے تھے۔ مگر شاید اندر کے زخم اسے زیادہ تڑپا رہے تھے۔ اذیت دے رہے تھے ولید رات بھر ماں کے سرہانے بیٹھا رہا۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ عاظمہ نے ولید کو خود سے قریب کرتے ہوئے اپنے گلے سے ایک لاکٹ اتار کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ وہ حیرت سے اس زنجیر کو اور اس میں جھولتے لاکٹ کو تکنے لگا۔

" تمہارے باپ کی نشانی ہے میرے پاس' انہوں نے مجھے خود اپنے ہاتھوں سے یہ پہنایا تھا۔" عاظمہ کی آواز بہت دھیمی تھی جیسے وہ اپنے آپ سے مخاطب ہو۔

"تو آپ اسے اتار کیوں رہی ہیں مما!" اس نے حیرت سے استفسار کیا۔

"پاپا ناراض ہو جائینگے۔"

"نہیں جان! وہ ناراض نہیں ہوں گے بلکہ انہیں پتہ چلے گا کہ وہ لاکٹ تمہارے گلے میں ڈال آئی ہوں تو وہ بہت خوش ہونگے۔" اس نے تکیے پر دوبارہ سر رکھ دیا اور اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا کر چوما۔

"انہیں تم اتنے ہی عزیز تھے جتنی میں بلکہ شاید مجھ سے بھی زیادہ۔ تمہارے آجانے کے بعد ہم دونوں کے پاس اپنی کوئی بات ہی نہ رہی تھی۔ صرف تمہاری باتیں ہوتیں تم سامنے ہوتے تو بھی اور نگاہوں سے دور ہوتے تب بھی' تم ہی تو وہ زنجیر تھے ولید جس نے ہم

دونوں کو ایک دوسرے سے اور قریب کر دیا تھا۔ ولید تم بہت بہادر ہونا بالکل اپنے پاپا جیسے۔"

اس کی آواز میں بے پناہ نقاہت تھی جیسے کوئی بہت تھکا ہارا مسافر کہیں رک کر پیاس سے خشک حلق کو مسوس رہا ہو پھر ایک خشک بنجر سی سانس بھر کر بولنے کے لئے ہمت پیدا کر رہا ہو۔

ولید اپنی ماں کے بال سہلانے لگا۔ اسے اچھا لگا لفظ بہادر اپنے لئے سننا۔ اس نے مسرور ہو کر اپنی ماں کو دیکھا۔ اس کی ماں اسے پاپا سے تشبیہ دے رہی تھیں۔ خوشی سے اس کا چہرہ چمکنے لگا۔

"ہمیشہ بہادر رہنا۔ کسی وقت' کسی موقع پر ہمت مت ہارنا' موت کا ذائقہ ہم سب کو ہی چکھنا ہے۔ یہ انسان کا بے خبر ساتھی ہے نامعلوم کب کس وقت ہلاک کر ڈالے' بس یہ دنیا مزے کی نہیں' آزمائش کی جگہ ہے یہاں کبھی کوئی سرخرو نہیں ہوتا۔ ہاں مگر انسان کے اچھے اعمال' اس کی نیکیاں' اسے آخرت میں ضرور سرخرو کرتے ہیں۔ سو بیٹا دنیا کو دل

لگانے کی جگہ سمجھ کر غافل نہ ہو جانا ہمارے غافل ہونے سے وہ رب تعالیٰ حساب لینے والا‘ روح قبض کرنے والا‘ غافل نہیں ہوتا۔ میں تمہیں ایک تمثیل سناؤں۔“

اس نے اپنے خوب صورت دل موہ لینے والی صورت کے بیٹے کو تکا جو ہمہ تن گوش تھا۔ بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

”دنیا کی مثال ایسی ہے۔ ایک شخص جنگل میں چلا جاتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ میرے پیچھے شیر آ رہا ہے۔ وہ بھاگا جب تھک گیا تو دیکھا کہ آگے ایک گڑھا ہے چاہا کہ گڑھے میں گر کر جان بچائے لیکن اس میں اژدھا نظر آیا اب آگے اژدھے کا خوف اور پیچھے شیر کا ڈر کہ ایک درخت کی ٹہنی پر نظر پڑی اور اس کو ہاتھ ڈال دیا۔ مگر ہاتھ ڈالنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس درخت کی جڑ کو دو سیاہ سفید چوہے کاٹ رہے ہیں۔ بہت خائف ہوا کہ اب تھوڑی دیر میں درخت کی جڑ کٹ جائے گی تو میں گر جاؤں گا اور شیر و اژدھا کا شکار بن جاؤں گا اتفاقاً اس کو اوپر کی طرف شہد کا چھتا نظر آیا یہ اس شہد شیریں کے حاصل کرنے اور پینے میں مصروف ہو گیا کہ نہ شیر کا خوف رہا‘ نہ اندیشہ اژدھا دفعتاً جڑ کٹ گئی اور وہ گر پڑا شیر نے پھاڑ کر گھڑے میں گرا دیا اور اژدھے کے منہ میں جا پھنسا! سو کہنا یہ ہے کہ جنگل سے مراد دنیا ہے اور شیر

موت ہے کہ پیچھے لگی ہوئی ہے گڑھا قبر ہے جو اس کے آگے ہے اور اژدھا اعمال بد ہیں کہ قبر میں ڈسیں گے اور دو چوہے سیاہ و سفید دن اور رات ہیں اور درخت گویا عمر ہے اور شہد کا چھتا دنیائے فانی کی غافل کر دینے والی لذت اور خواہشات ہیں کہ انسان دنیا کی فکر میں موت‘ قبر‘ اعمال بد اور جواب دہی وغیرہ سب کو بھول جاتا ہے اور پھر اچانک موت آ جانے پر بجز حسرت و ندامت کچھ ساتھ نہیں لے جاتا ہے۔“

اس کی آواز پھر دم توڑ گئی‘ وہ گہری گہری سانسیں بھرنے لگی۔

”پانی دوں مما!“ اس نے اپنی ماں کی اکھڑنے والی سانسوں کو اس کی شدید پیاس سمجھا۔

”آں ہاں نہ۔ نہیں۔ میری بات سنو ولید!“ اس نے اس کا ہاتھ پھر اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا مگر گرفت ایسی تھی جیسے کوئی بہت ننھے سے بچے کے ہاتھ میں کسی مضبوط مرد کا ہاتھ۔

”کبھی دولت کو انسانوں پر فوقیت نہ دینا‘ دولت فرعون اور نمرود کا تحفہ ہے اور علم اور اخلاق انبیاء کا ورثہ ہیں۔ پیسہ اچھی چیز ہے۔ اسے حاصل کرنے کے جائز جتن ضرور کرنا کہ یہ زندگی میں آسانیاں پیدا کرتی ہے مگر اسے اس لئے حاصل مت کرنا کہ خود کو امیر کبیر ظاہر کر سکو‘ خود کو دوسروں پر برتر ثابت کر سکو‘ علم حاصل کرنا‘ خوب لگن سے مگر تعلیم یہ سوچ کر

حاصل مت کرنا کہ خود کو تعلیم یافتہ کہلا سکو بلکہ خود کو سنوارنے کے لئے حاصل کرنا۔ ورنہ علم کا مقصد فوت ہو جاتا ہے بیٹا۔ یہ دنیا جتنی بری ہے یہاں لوگ جتنے برے ہیں اتنے ہی اچھے بھی ہیں اور انہی اچھے لوگوں سے دنیا میں خوبصورتی ہے۔ آغاجی‘ شائستہ‘ جہانگیر بھائی بہت اچھے ہیں۔ میں خدا کے بعد تمہیں ان کے حوالے کر کے جاتی ہوں۔“

”آپ کہاں جا رہی ہیں مما!“ اس نے انہماک سے ماں کی باتیں سنتے سنتے گھبرا کر سر اٹھا کر ان کے آخری جملے پر ان کی طرف دیکھا تو ان کے خشک بنجر لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ لہرا کر منجمد ہو گئی۔

”میں اپنے اللہ کے پاس جا رہی ہوں‘ جہاں تمہارے پاپا بھی ہیں۔ ان سے ملے بھی تو بہت دن ہو گئے ہیں نا۔ وہ... وہ وہاں بہت خوش ہیں‘ ہاں اچھے لوگ وہاں خوش ہی ہوں گے مگر پھر بھی‘ پھر بھی تم ان کے لئے دعا کرتے رہنا اور میرے لئے بھی‘ کرو گے نا؟“

انہوں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑنا چاہا۔ وہ یوں ولید کو دیکھ رہی تھیں جیسے آنکھوں میں سمو لینا چاہتی ہوں‘ اس کا نقش دل میں اتار لینا چاہتی ہوں۔

وہ گم سم سا اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کی مما کیسی باتیں کر رہی تھیں اور کس طرح پاپا کے پاس جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا شاید مما بہت تھک گئی ہیں‘ بیماری اور کمزوری نے انہیں ذہنی طور پر تھکا ڈالا ہے‘ نیند آ جائے تو صبح تک ٹھیک ہو جائیں گی‘ وہ ان کا سر سہلانے لگا تاکہ انہیں جلدی نیند آ جائے‘ اس کی مما کی آنکھیں بند ہو گئیں‘ شاید اس کے چھوٹے معصوم ہاتھوں کا نرم لمس انہیں سکون بخش رہا تھا۔

درد اتنا تھا کہ اس رات دل وحشی نے
ہر رگ جاں سے الجھنا چاہا
ہر بن مو سے ٹپکنا چاہا
اور کہیں دور تیرے صحن میں گویا
پتہ پتہ میرے افسردہ لہو میں دھل کر
حسن مہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا‘
میرے ویرانہ تن میں گویا

سارے دکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھل کر

سلسلہ وار پتہ دینے لگیں

رخصت قافلہ شوق کی تیاری کا

اور جب یاد کی بجھتی ہوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں

ایک پل آخری لمحوں تیری دلداری کا

درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا

ہم نے چاہا بھی، مگر دل نے نہ ٹھہرنا چاہا

عاظمہ کی موت سب کے لئے ایک زبردست دھچکا ثابت ہوئی۔ گو کہ وہ اجنبی تھی مگر سب اس کی موت پر یوں افسردہ، ملول تھے گویا کہ ان کا اپنا قریبی برسوں کا بچھڑ گیا ہو۔

"میں اس کی کنڈیشن سے مطمئن نہیں تھا۔" ڈاکٹر فرید متاسفانہ سی سانس بھر کر اس کے منہ پر چادر ڈال کر سیدھے ہوئے پھر آغا جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"زندگی اور موت نہ خود مریض کے ہاتھ میں ہے نہ ڈاکٹر کے، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی منشاء کے خلاف چڑیا کا بچہ بھی نہیں مرتا، بس یہی مشیت ایزدی تھی۔"

"ہاں بالکل۔" آغا جی کے سینے سے ایک گہری افسردہ سی سانس نکل گئی، ان کی نظریں ولید پر تھیں جو اپنی ماں کے خاکی ساکت وجود کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا، ان کا دل سینے میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔

"ہاں موت کا سیاہ بادل ہر شخص کے سر ضرور آتا ہے، یہ دفعتاً نہیں آتی، یہ ہمیشہ اپنے آنے کی خبر دیتی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ میں مروں گا اور مرنے کا کوئی وقت معین نہیں۔" انہوں نے ولید کو خود سے قریب کر لیا۔

"وہ زندہ رہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہاں تک بھی وہ اپنے بیٹے کی خاطر آ گئی تھی ورنہ شاید وہیں خاک ہو جانا چاہتی تھی۔" شائستہ روتے ہوئے بولی، اس کی بات کا کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور جواب بھی کیا دیتے سب کے دل رنج سے بھرے ہوئے تھے آنکھوں کی سطح پر آنسوؤں کی نمی کا جال تھا، پورے گھر میں ایک افسردہ سی فضا پھیلی ہوئی تھی۔

لمحے صدیاں لگ رہے تھے۔ وقت سرکتا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر بہر حال وقت تھا جس کا کام گزر جانا ہے۔ مگر ولید کو لگ رہا تھا زندگی اس کے لئے بالکل ٹھہر گئی ہے' برف کے تودے کی مانند جمی ہوئی' یخ اور ٹھٹھری ہوئی۔

اس کے ذہن میں انتشار کی آندھی چل رہی تھی' ایک بے یقینی تھی جو اس کی ماں کی موت تھی' باپ کی ناگہانی موت کے بعد ماں کی موت اس کے لئے زلزلہ ہی تھا جس نے اس کے اندر کی دنیا کو تہس نہس کر دیا تھا۔

اس کا دل پژمردہ ہو رہا تھا اور مستقبل باد صرصر میں اڑتے تنکے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ آغا جی کے نرم مہربان ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہوئے اس نے گھاس کو نوچنے کا عمل روک کر سر اٹھایا۔

اس کی خاموش سرد سی آنکھوں میں آغا جی کو کرب انگیز نمی نظر آئی۔ وہ اس کے نزدیک بینچ پر ہی بیٹھ گئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ پھیلا کر اسے خود سے قریب کر لیا۔

"دکھ اور پریشانی ہمارے لئے امتحان بن کر آتے ہیں۔ دراصل یہ ہمیں اپنے آپ سے آشنا کراتے ہیں۔ ہمارے اندر کی خوبیوں' خامیوں اور صلاحیتوں سے ہم کو متعارف کراتے ہیں

کہ ہم میں کتنی صلاحیت ہے' وقت سے مقابلہ کرنے کی' حالات کو فیس کرنے کی۔ تم ایک بہادر بچے ہو' تمہیں عملی زندگی میں ابھی آنا ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے زندگی کے نئے رنگ دیکھنا اور پرکھنا ہے۔ مغموم سوچیں ہمیں مغموم اور ملول رکھتی ہیں اور ہماری صلاحیتوں کو زنگ لگا کر انہیں ناکارہ بنا دیتی ہیں۔"

اس نے سر جھکا لیا' اچانک اسے اپنے اندر سے کوئی لہر اٹھتی محسوس ہونے لگی۔ ان الفاظ نے یکایک اس کے بجھتے دل پر ہلکی سے پھونک ماری تھی کہ سوئے ہوئے احساسات بیدار ہو رہے تھے۔

ایک دانا کا قول ہے نا بیٹا کہ "نشاط و انبساط اور اندوہ و کلفت یعنی تکالیف زندگی کی اصلی غرض و غایت نہیں' اس کا منتہائے مقصود تو یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سرگرم عمل رہیں تا کہ ہمارا مستقبل روز بروز بہتر ہو جائے۔ بس بیٹا خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے مایوسی' دکھ' رنج کو دل سے نکال پھینکو اور قوی دل کے ساتھ سرگرم عمل ہو جائو۔"

اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا' پھر جھکا لیا اس کی خوش نما آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اتر آئی اسے اپنے باپ کی وہ باتیں یاد آنے لگیں جو وہ دادا سائیں کی موت کے بعد اس کی ماں سے کہہ رہے تھے۔

"عاظمہ مجھے لگتا ہے بابا سائیں کی موت کے بعد' اب بڑا ہوا ہوں' ایک نرم آغوش سے باہر قدم رکھا ہے اور دنیا دیکھ رہا ہوں پرکھ رہا ہو' ایک سایہ دار پناہ سے نکل کر دھوپ دیکھ رہا ہوں' اس کا ذائقہ چکھ رہا ہوں۔ شاید قدرت ہم سے ایسی پناہ گاہیں اسی لئے چھین لیتی ہے کہ ہم حالات کا دوسرا رخ بھی دیکھیں۔ چھاؤں سے ہٹ کر دھوپ اور سکھ سے ہٹ کر دکھوں کا ذائقہ بھی چکھیں۔ ہاں شاید اس لئے کے چھاؤں میں رہتے رہتے زمین نرم ہو جاتی ہے اور نرم زمین دلدل بن کر بے کار ہو کر رہ جاتی ہے' اس میں کائی اگ جاتی ہے' ٹھہراؤ آجاتا ہے' دھوپ لگنے والی زمین میں شادابی اور سیرابی آتی ہے' یہ فلسفہ اب میری سمجھ میں آیا کہ جتنی چھاؤں کی ضرورت ہوتی ہے دل کی زمین کو شادابی اور سیرابی کے لئے اتنی ہی دھوپ کی بھی' ورنہ یہ چار موسم ہوتے ہی کیوں سردی' گرمی' خزاں' بہار۔"

"ولید!" آغا جی کی آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑا' اس نے بے اختیار اپنا سر آغا جی کی گود میں ڈال دیا جسے انہوں نے کسی متاع کی طرح سمیٹ لیا۔

X...X...X

اس دن اس کی زندگی کا نئے سرے سے آغاز ہوا تھا۔ اس کو شہر کے اچھے سکول میں داخل کروا دیا گیا جہاں بہت جلد اس کی ذہانت' قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا' اساتذہ کو بھی کبھی کبھی حیرت ہوتی اس کی غیر معمولی ذہانت پر۔ وہ بہت جلد ہر دلعزیز سٹوڈنٹ بن گیا' مگر اس کے اندر اب بھی ایک نا ختم ہونے والی خلش تھی' اس نے پوری کوشش سے اس ماحول میں خود کو ڈھال لیا تھا۔ سب کی محبتوں کو نا صرف قبول کیا بلکہ ان سے طمانیت محسوس کرنے لگا۔ مگر کبھی کبھی اندر جیسے گھٹن خلفشار اور اضطراب چٹکیاں لینے لگتا۔

وہ اپنے ذہن کو نامانوس سی خلا میں چکراتا محسوس کرتا۔ کورس کی کتابیں پکڑے پکڑے جانے کہاں گم ہو جاتا' کئی چہرے بنتے اور مٹتے چلے جاتے' کبھی اسے آگ کے شعلے بلند ہوتے محسوس ہوتے' کبھی لگتا ایک صحرا ہے دھوپ سے تپتہ پھر وہ جھٹکا کھا کر بیدار ہوتا' مگر کتنی

دیر اسے اپنے اعصاب پر دباؤ محسوس ہوتا جیسے کوئی منوں ٹنوں وزنی بوجھ اس پر لدا ہوا ہو زندگی کا۔

روز و شب اسی طرح گزرنے لگے' وہ مکمل طور پر اس گھر کا فرد بن گیا تھا اور اس گھر کے مکین بھی اس بات کو بھول گئے تھے کہ وہ ان میں سے نہیں تھا اور کہیں اور سے آیا تھا۔
اجنبیت تو پہلے بھی نہیں تھی مگر اب تو فاصلے اتنے سمٹ گئے تھے کہ احساس تک بھی باقی نہیں رہا تھا۔

وہ کالج آیا تو اس کی مردانہ وجاہت کی مقناطیسیت نے دل پھینک قسم کی لڑکیوں کو تو لوہے کا ٹکڑا ہی بنا ڈالا وہ جہاں جاتا وہ لپک کر آتیں۔

اپنی شخصیت کی اس سحر انگیزی سے وہ خود بھی آگاہ تھا اور اپنی ستائش کو وہ خاصی مغرور مسکراہٹ کے ساتھ قبول کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے اور صنف نازک کے درمیانی فاصلوں کو کبھی پاٹنے کی کوشش نہ کی تھی۔

ان دنوں کالج میں فارن ایڈ اینڈ آور اکانومی پر سیمینار منعقد ہوا تھا جس کا مہمان خصوصی صوبائی اسمبلی کا کوئی ممبر تھا۔ ولید نے اس میں بطور مقرر شرکت کی تھی اور فرسٹ پرائز کا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

حقدار ٹھہرا تھا' مگر جب مہمان خصوصی نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اسے پرائز دیتے ہوئے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا تو اسے لگا اس کے اعصاب پر ایسا اثر ہوا جیسے بم بلاسٹ ہوا ہو اور اس دھماکے سے اس کے اندر کی دنیا تہہ و بالا ہو کر رہ گئی ہو۔ سارے اعصاب چیتھڑوں کی صورت ادھر ادھر بکھر ہو گئے ہوں۔

ماضی کا ایک ہیولا ابھر کر مجسم بن کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

گو کہ خود اس میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ اس نے عمر کے اتنے مراحل طے کر لئے تھے کہ بچپن کا وہ چہرہ بدل چکا تھا مگر اس کے سامنے آنے والا سفید بالوں کے ہالے میں مسکراتا چہرہ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود ویسا ہی تھا۔ اسے لگا ماضی کا وہی مردان علی شاہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ہو۔

''ولید!'' پروفیسر منور نے اس کا کندھا ہلایا تو وہ یوں چونکا جیسے گہری نیند سے کسی نے خوفناک خواب سے اسے باہر نکال ڈالا ہو' اس نے سرعت سے اپنے اعصاب کو سنبھالا اور پرائز پر سختی سے انگلیاں جمائے اسٹیج سے اتر گیا۔

سارے دوست اس کے گرد جمع ہو کر اسے مبارک باد دینے لگے۔ بظاہر وہ مسکرا دیا مگر اسے اپنا ذہن آندھی اور طوفان میں گھرا ہوا الگ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا اٹھ کر یہاں سے بھاگ جائے۔ اس کی ساری گرم جوشی، سرخوشی اور شگفتگی یوں بجھ کر رہ گئی تھی جیسے کسی نے چراغ پر رقص کرتے شعلے کو پھونک مار کر بجھا دیا ہو۔

وہ کرسی پر ساکت بیٹھا اسٹیج پر کھڑے مہمان خصوصی کو ایک ٹک دیکھتا رہا جو اسے انسان کے روپ میں ناگ دکھائی دے رہا تھا۔

وہی چہرہ اس کے جسم پر لگا ہوا نظر آ رہا تھا جو اسے خوابوں میں دکھائی دیا کرتا تھا۔

مکروہ

خوفناک

بدہیت

دوسرے ونر کا نام پکارا گیا اور تالیوں کے شور میں اس کی کلاس فیلو آمنہ علی سہج سہج چل کر اسٹیج پر پہنچی۔

"لیجئے جناب سیکنڈ پرائز تو اب انہیں ہر حال میں دینا تھا آخر مہمان خصوصی کی دختر نیک اختر جو ٹھہریں۔" اس کے قریب بیٹھا فاروق جیسے بدمزا سا ہو گیا۔

"دل تو محترم کا چاہ رہا ہو گا کہ فرسٹ پرائز ہی اپنی اسی نخریلی بٹیا کو نواز دیتے مگر ہائے اب ولید سے کون چھین سکتا ہے فرسٹ پرائز۔"

اس کے اطراف بیٹھے اس کے یار دوستوں کے تبصرے جاری تھے اس نے چونک کر فاروق کی طرف دیکھا پھر اسٹیج سے مسرور چہرے کے ساتھ اترتی آمنہ علی کو۔ ایک عجیب سی لہر اس کے اندر سے اٹھی، آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔

"آمنہ مہمان خصوصی کی بیٹی ہے کیا؟ آئی مین اسی ایم پی اے کی۔"

"لو تمہیں نہیں پتہ محترمہ تب ہی تو کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ ہمارے یہاں چھوٹے موٹے سیاست دان کی بیٹی ہونا بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے اس کا باپ تو ایم پی اے ہے۔"

فاروق اس کی بے خبری پر ذرا حیران بھی ہوا تھا۔

اس نے سر گھما کر ایک بار پھر آمنہ علی کی طرف دیکھا جو اپنی سیٹ پر واپس جا رہی تھی گرین اور بلیو کنٹراسٹ کے جدید تراش خراش کے سوٹ میں بالوں کو شانوں پر پھیلائے وہ خاصی مغرور اور خود پسند محسوس ہوئی۔

"کمال ہے۔" اپنی اس بے خبری پر وہ خود بھی حیران ہیں نہیں متاسف بھی ہوا کچھ دیر تک وہ اسی طرف دیکھتا رہا پھر یکدم ہلکے سے مسکرا دیا لیکن اس کی آنکھوں میں عجیب سے کیفیت اتر آئی تھی وہ بے حد سرد لگ رہی تھیں۔

"ایکسکیوزمی میں ابھی آیا۔" وہ فاروق کو اپنا پرائز پکڑا کر تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔

"مبارک ہو مس آمنہ مردان علی شاہ!"

وہ اپنے پرس کی زپ کھول رہی تھی۔ چونک کر سر اٹھایا اور اپنے سامنے ولید حسن کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشگوار تاثر سمٹ آیا۔

"تھینک یو۔" اس نے تیزی سے زپ واپس بند کر دی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اصولاً تو پہلی مبارک مجھے دینی چاہئے تھی تم کو۔" وہ بالوں کو ایک ادا سے پیچھے جھٹک کر اپنی سیٹ سے کھڑی ہو گئی۔

وہ آپ جناب کی تکلفات سے ہمیشہ آزاد تھی۔

"چلیں یہ نیک کام میں نے ہی کر دیا' اینی وے تم ابھی بھی مجھے اصول کے تحت مبارک باد دے سکتی ہو۔" وہ یہ کہہ کر اپنی تمام تر دلکشی سے مسکرایا اور گویا اس کی اس مسکراہٹ کی مقناطیسی لہریں آمنہ علی کے اندر تک اتر گئیں۔

"آمنہ میرا تو خیال تھا تمہارے پاپا پہلا انعام تمہیں ہی دیں گے۔ وہ کچھ زیادتی نہیں کر گئے تمہارے ساتھ۔" فاروق' رضا اور حمید سبھی ادھر ہی چلے آئے فاروق کا انداز چھیڑنے والا تھا وہ مسکرائی۔

"نہیں انہوں نے بالکل درست حقدار کو دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی پلکوں کو ہلکی سی جنبش دے کر ولید حسن کی طرف دیکھا پھر ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے بولی۔

"میرا تو خیال تھا سیکنڈ اور تھرڈ پرائز بھی انہی کو ملنا چاہئے تھا۔"

"اوہ۔" فاروق کے ہونٹ سیٹی کے انداز میں سکڑ گئے باقی بھی معنی خیز انداز میں مسکرانے لگے۔

"توتم بھی گویا ولید کے جاں نثاروں میں سے ایک ہو۔آں ہاں۔"

اس شہر میں کس سے ملیں، ہم سے تو چھوٹیں محفلیں

ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ تیرا

اس نے ولید کی طرف دیکھ کر آنکھ دبا کر شعر سنایا

"اونو، ایسی کوئی بات نہیں ہے تم غلط معنی پہنا رہے ہو میری بات کو مسٹر فاروق!" وہ یکلخت جھینپ کر رہ گئی اور بیگ کو کندھے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"ایکس کیوزمی، مجھے پاپا سے کچھ ضروری کام ہے وہ جا رہے ہیں۔"

وہ تیزی سے ان سب کے درمیان سے نکل کر اس طرف بھاگی جہاں مردان علی شاہ پروفیسرز کے جلو میں ہال کے داخلی دروازے کی طرف جا رہے تھے۔

ولید ایڑیوں کے بل گھوم کر انہیں دروازے سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا۔

ایک بار پھر اسے اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہونے لگے سکوت اور اعصاب شکن خاموشی دھیرے دھیرے اس کے اندر سرایت ہونے لگی، پھر کسی خیال کے تحت ایک عجیب اذیت انگیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر لہرا کر منجمد ہو گئی۔

X...X...X

کئی برسوں سے اس نے ماضی کا وہ دروازہ اپنی تمام تر شعوری کوشش سے بند کر رکھا تھا کہ حال پر اثر انداز نہ ہو مگر اسے لگا جیسے اچانک زوردار آندھی چلی ہو اور وہ جامد دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا ہو۔

وہ نئے سرے سے اس عذاب ناک لمحات کے تجربے سے گزرنے کی اذیت جھیلنے لگا۔اس کی رگوں میں خون کی بجائے آتشیں سیال گردش کرتا محسوس ہو رہا تھا۔وہی مانوس آگ بھڑک اٹھی جسے بڑی

مشکلوں سے ٹھنڈا کیا تھا۔

سب کچھ یاد آرہا تھا بڑی شدت کے ساتھ۔

وقت کی اتنی مسافت طے کرنے کے باوجود کچھ نہیں مٹا تھا سب اتنا ہی شفاف تھا۔ ہر نقش اتنا واضح تھا۔ ذرا بھی نہیں دھندلایا تھا' آئینے کی طرح چمکتا ہوا جس پر ذرا بھر گرد کی خراش نہ آئی ہو۔

وہ رات اس کے لئے بہت بھاری تھی، مردان علی شاہ اس کا چچا' سفاک قاتل اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ اس کی شریانوں میں کھولتا ہوا لہو مچلنے لگا اور روئیں روئیں سے آگ ابلتی محسوس ہونے لگی بدصورت یادوں کے شعلے' دھوئیں اور سیاہی' اس کے چاروں طرف پھیل کر اسے اپنی گرفت میں لینے لگے۔

دیوار سے پشت لگا کر اس نے ایک گہری سانس بھری' اس کا ذہن بہت تیزی سے ماضی سے نکل کر حال اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ جو برسوں سے سوچوں کے جال بنتا رہا ہے۔ اس پر عمل کرنے کا وقت اب آیا ہے۔ تاہم وہ کوئی جذباتی قدم اٹھانے کے حق میں نہیں تھا۔ اسے یوں بھی متحمل مزاجی' ذہانت' برداشت باپ سے ورثے میں ملے تھے۔ ہاں یہ منتقم المزاجی ماحول اور حالات کی بخشی ہوئی تھی۔

"نہیں ولید تم ایسا نہیں کرو گے کچھ۔" آغاجی کو اس نے بتایا تو وہ شدید خوف میں مبتلا ہو گئے۔

"میرا خیال تھا تم نے سب کچھ بھلا دیا ہو گا اور بدصورت یادوں' تلخ واقعات اور دکھ دینے والے خیالات کو بھلا دینے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔ تم نئے سرے سے اس باب کو کھول کر اسی اذیت کو جھیلو گے۔ یہ سراسر تمہارے حق میں برا ہو گا۔"

وہ مغموم انداز میں ہنس پڑا۔

"بھول جانا شعوری عمل ہوتا تو میں اب تک واقعی بھول چکا ہوتا مگر بدصورت یادوں کے نقوش اس قدر گہرے ہیں آغاجی! کہ مجھے کسی پل حقیقی مسرت سے ہمکاب نہیں ہونے دیا۔ میں نے وہ ساری اذیت ان تلخ واقعات اور دکھ دینے والے خیالات کو متاع کی طرح اپنے اندر دفن کر رکھا ہے۔"

" تو بس انہیں دفن ہی رہنے دو انہیں باہر مت نکالو ورنہ..."

"نہیں آغاجی! میں نے اس وقت کا بہت انتظار کیا ہے' اس عمر کا جب میں صحیح فیصلہ کر سکوں اور اس پر عمل درآمد کر سکوں۔"

"تم نے ہمیشہ درست ہی فیصلے کئے ہیں اپنے بارے میں۔ مجھے تم پر فخر ہے‘ مگر یہاں اس عمر میں آ کر تم جذباتی فیصلہ کر رہے ہو۔" آغا جی نے ملائمت سے اسے سمجھانا چاہا۔

"یہ جذباتیت کی پیداوار نہیں ہے میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس وقت کا انتظار کیا ہے آغا جی! اور شاید تقدیر اسی لئے اسے میرے سامنے لائی ہے کہ اب وقت آ چکا ہے۔"

اس کی آنکھوں کی تہوں میں نفرت کی تمتماہٹ دکھائی دینے لگی‘ اس نے سختی سے لب بھینچ لئے۔ ایک پل آغا جی کو لگا جیسے ابھی ان سے خون ابل پڑے گا‘ وہ شاید اپنے اندر کا غصہ ابال دبا رہا تھا اور وہی اس کی خوبی آغا جی کو پسند تھی کہ اسے اپنے اعصاب پر کنٹرول رہتا تھا۔ اپنے جذبات اور کیفیات کو وہ بڑی اچھی طرح ڈیل کر لیتا تھا۔

"تم اس شخص کا کیا بگاڑ سکو گے ولید! وہ باڈی گارڈز کے جلو میں نکلتا ہے باہر۔ درجنوں پہرے دار اس کی کوٹھی کے باہر ہوتے ہیں‘ تم۔"

"تو آپ کے خیال میں اسے گولی سے اڑا دینا چاہتا ہوں۔" وہ بے اختیار ہنسا تھا۔

"گولی تو بہت آسان موت بن کر جسم میں اتر جاتی ہے آغا جی! اور اس شخص کو آسان موت نہیں دینا چاہتا یوں بھی مجھے اس کی موت سے کوئی ذہنی قلبی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تو پھر‘ پھر تم کیوں اس بات کو کھولنا چاہتے ہو۔" آغا جی نے تشویش کے عالم میں اسے دیکھا اور اس کے کندھے پر اپنا لرزتا ہاتھ رکھ دیا۔

"یار دیکھ ولید! تم میری کمزوری ہو‘ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔"

"آغا جی!" اس نے تمام تر اپنائیت اور محبت سے آغا جی کے گرد اپنا بازو حمائل کر دیا کبھی وہ آغا جی کے مضبوط بازو میں چھپ جاتا تھا۔ آج آغا جی اس کے بازو میں سمٹ آئے تھے۔

"بے غرض محبت کی بھی ایک عجیب ہی تاثیر ہے۔" اس نے ایک طمانیت انگیز سانس سینے کی تہ سے خارج کر دی۔

"یو ڈونٹ وری آغا جی! میں مردان علی شاہ کے غلیظ خون سے اپنے ہاتھ رنگنا پسند نہیں کروں گا‘ نہ میں سولی پر چڑھ کر ایسی رسوا کن موت چاہوں گا۔ میرے لئے زندگی اتنی غیر اہم‘ بے معنی اور بے کار شے نہیں ہے‘ آپ ناحق وسوسوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔"

"اگر اس بات کو بند ہی رہنے دیتے تو اچھا ہوتا۔ بہر حال‘ میں تمہیں نہیں روکوں گا‘ میں تو ساحل پر کھڑے اس شخص کی طرح ہوں جسے بھلا کیا اندازہ ڈوبنے والے کے احساسات‘

محسوسات اور اس کی اذیت کا' دیکھنے والے اور سہنے والے کے محسوسات بہر حال مختلف ہوتے ہیں۔" آغا جی نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

X...X...X

دیکھ ہماری دید کے کارن' کیسا قابل دید ہوا

ایک ستارہ بیٹھے بیٹھے تابش میں خورشید ہوا

اس نے زندگی میں پہلی بار شاید کسی لڑکی کی طرف خود دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا' آمنہ مردان علی شاہ کالج کے خوبرو اور ہیرو کے نام سے جانے' جانے والے اس شخص کی اس پیش قدمی پر خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگی' کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرنے والی امیر زادی نے ولید حسن کے اس بڑھے ہوئے ہاتھ کو تمام تر آمادگی' خوشدلی اور قلبی مسرت سے تھام لیا۔

X...X...X

تمام شب دل وحشی تلاش کرتا ہے

ہر اک صدا میں تیرے حرف ولطف کا آہنگ

ہر ایک صبح ملاتی ہے بار بار نظر

تیرے دہن سے ہر اک لالہ وگلاب کا رنگ

وہ خاموش ہوا تو کمرے کی فضا میں گہرا سکوت چھا گیا لیکن اس سکوت میں ایک اداسی' دل گرفتگی اور بے یقینی کی آمیزش تھی۔ سکندر ایک ٹک ولید کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسکے ذہن کے گوشتے میں شاید کہیں بھی یہ کہانی نہیں تھی۔

حالات سے خوشیاں کشید کرتے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ پر بہار شخص اپنے دل میں ایسا زخم لئے پھر رہا ہے جو ہر لمحہ کسک بن کر پہلو میں چبھتا رہتا ہے۔

وہ کبھی مصنوعی پن سے نہیں ہنستا تھا۔ بناوٹ اور کھوکھلی خوشی اس کے چہرے پر کبھی نہیں دکھائی دی تھی۔ یہ شاید اس کے مضبوط اعصاب کے ہونے کی سب سے بڑی دلیل تھی۔

اسے تذبذب' بے یقینی' دل گرفتگی اور الجھن میں مبتلا دیکھ کر ولید دھیرے سے مسکرایا۔

"یہ اسٹوری تمہارے اخبار میں خاصا تہلکہ مچادے گی۔ مردان علی شاہ ایک بار پھر پاپولر ہو جائے گا۔" اس نے جھک کر سگریٹ راکھ دان میں رکھ دیا۔

"کیا خیال ہے؟۔"

سکندر کے اعصاب کے لئے یہ جملہ خاصا بھاری تھا۔ وہ جواباً افسردگی سے مسکرادیا اور بالوں میں ہاتھ پھنسا کر کھڑا ہو کر اضطرابی انداز میں کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کس طرح تمہاری تسلی تشفی کا معاملہ کروں، مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ میرا اپنا حوصلہ بکھر رہا ہے۔ ولید! ولید آئی ڈونٹ نو کہ میں کس طرح اور کن جملوں میں تمہارے دکھ پر تبصرہ کروں اسے شیئر کروں، شاید دکھ کی گہرائی کا اندازہ ہو تو الفاظ بڑے بے معنی اور کم مایا سے لگتے ہیں۔" وہ افسردگی سے ہنسا اور دریچے کے باہر خالی نظریں جمادیں۔

"کوئی غم، کوئی دکھ انسان کی ہمت حوصلے اور برداشت سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔ ہاں اپنی کم ہمتی کے باعث دکھ، ہمیں زیادہ محسوس ہو یہ الگ بات ہے۔" آغاجی کی آواز نے دونوں کو

چونکا دیا۔ دبیز قالین کے باعث ان کے قدموں اور اسٹک کی آواز نہیں ابھری تھی۔ اس لئے وہ دونوں ان کی آمد سے بے خبر رہے تھے۔

وہ ولید کے پاس آئے اور اس کا کندھا پر غرور انداز میں تھپکتے ہوئے بولے۔

"سکندر یہ کسی عام سے شخص کا بیٹا نہیں ہے۔ یہ ایک بہت عظیم شخص کا بیٹا ہے، اس کی رگوں میں باہمت، جیالے، سرفروش شخص کا خون دوڑ رہا ہے۔"

آغاجی کے لہجے میں فخر تھا، ستائش تھی۔ ولید کے چہرے پر یک بیک سرخی سمٹ آئی۔ اس نے بے حد ممنون اور محبت بھری نظروں سے آغاجی کو دیکھا اور ان کے کندھے پر اپنا ہاتھ پھیلا لیا۔

"بے شک میری رگوں میں دوڑنے والا خون میرے باپ کا ہے مگر میری تربیت آپ کے ہاتھوں میں ہوئی ہے آغاجی!" یہ کہہ کر اس نے ایک تشکرانہ سانس بھری اور سکندر کو دیکھا۔

”سکندر! میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو میں یقیناً پاگل ہو جاتا‘ اپنا ذہنی توازن کھو دیتا‘ کم از کم اپنا آپ گم کر چکا ہوتا۔ یہ جو بے غرض محبت ہوتی ہے نا یہ بھی عجیب ہی ٹانک ہوتی ہے۔ مردہ جسموں میں جان ڈال دیتی ہے۔“

اس کا لہجہ عقیدت میں ڈوبا ہوا تھا سکندر نے دیکھا فانوس کی روشنی میں اس کی خوبصورت آنکھوں کی سطح پر ہلکی نمی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر اس نمی میں ایک جگمگاہٹ سی تھی جو اس کے چہرے پر بے حد بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید حزن کی آمیزش نے اس کے حسن کی تابندگیوں کو اور بھی دو آتشہ کر دیا تھا۔

سکندر نے سوچا کہ صحافی ہونے کے ناطے اس کی زندگی عجیب و غریب ہی نہیں منفرد‘ انوکھے‘ اذیت ناک‘ دل شکن اور مایوس کن واقعات سے بھری پڑی تھی۔ یہ کہانی‘ یہ واقعہ اس کی توقع کے برخلاف نہیں تھا اور براہ راست اس کی ذات سے تعلق نہ ہونے کے باوجود اس کے دل پر اثر انداز ہوا تھا کہ رگ رگ کو کوئی شے کاٹنے لگی تھی۔

عجیب سی اتھاہ میں دل ڈوبتا اور ابھرتا محسوس ہو رہا تھا۔

”سکندر! کبھی کبھی تقدیر کی گردش زندگی کو عجیب افسانوی وماورائی رنگ دے دیتی ہے اور آپ افسانوی کردار بن جاتے ہیں۔ اس میں ہماری منشاء کا دخل نہیں ہوتا بس حالات اور واقعات ہی کچھ ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔

میں نے کبھی خود کو ہیرو سمجھا نہ اس بات پر قلبی طور پر مسرور ہوا۔ لوگوں کو یقیناً میں یا میری زندگی افسانوی لگتی ہو گی مگر حقیقتاً میرے لئے زندگی بے حد تلخ ثابت ہوئی ہے۔ مجھے نہیں پتہ سکندر کہ میں اپنے ارادوں میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہوں اپنے اندر کے بھڑکتے الاؤ کو کتنا ٹھنڈا کر سکتا ہوں اور کر بھی سکتا ہوں کہ نہیں مگر مجھے اللہ سے شکوہ ہے نہ تقدیر سے شکایت۔ بلکہ الٹا میں شکر گزار ہوں۔ اس کے احسانات تلے دبا ہوا ادنیٰ سا گناہ گار بندہ ہوں۔ مگر بس ایک ناآسودگی کا جال ہے جو کٹ نہیں پا رہا۔ مگر اب لگتا ہے کہ اس بھڑکتے الاؤ میں چند چھینٹے آسودگی کے ضرور پڑیں گے۔ مردان علی شاہ آج رات کروٹ کروٹ بدلے گا۔ اس انکشاف کی اذیت آج اس کے لہو میں کھولن پیدا کر رہی ہو گی اسے کسی پل قرار نہیں ہو گا اذیت کا ایک پل بے قراری اور بے سکونی کا صرف ایک پل دن بھر کی طمانیت سے بنا ہوا سارا خون نچوڑ لیتا ہے رگوں سے۔“

وہ اپنے دکھ کے موذی احساس سے نکل کر ہلکے سے ہنسا مگر دوسرے ہی پل کسی احساس نے اس کی ہنسی کو کاٹ دیا۔

وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ کر سیٹ سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں جیسے کسی احساس سے نجات پانے کی کوشش کر رہا ہو۔

سکندر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ایک دل گرفتگی اس کی روح میں اتری جا رہی تھی۔اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اسے لگا اس کی زبان ٹھٹھر کر رہ گئی ہو۔

آدمی کو بسا اوقات بہت سے ایسے الفاظ رٹے ہوئے ہوتے ہیں تسلی اور تشفی کے' ماحول کی اداسی کو دور کرنے کے لئے مگر کبھی کبھی انہیں زبان سے ادا کرنا عجیب حوصلے کا کام معلوم ہوتا ہے۔وہ بھی شاید اپنے اندر یہ حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔

کئی لمحے بوجھل سی خاموشی طاری رہی پھر ولید نے ایک گہری سانس بھر کر آنکھیں کھول دیں۔اب اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا سکون اور ٹھہراؤ اتر آیا تھا۔اس نے بڑی خوبصورتی سے خود کو سنبھال لیا تھا۔وہ سکندر کی طرف دیکھنے لگا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ

رکھ کر بے ساختہ ہنس دیا' مگر سکندر مسکرا بھی نہ سکا بلکہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی اس روشنی کو دیکھ کر' ایک ہلکی سی سانس بھر کر' سر کو خفیف سے انداز میں جھٹکا۔

یہ ہنسی بھی کوئی نقاب ہے جہاں چاہا ہم نے گرا لیا

کبھی اس کا درد چھپا گئے' کبھی اپنا درد چھپا گئے

وہ اٹھا اور بالوں میں ہاتھ پھیر کر ٹیبل سے اپنا چرمی بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا تو ولید نے مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہاری اسٹوری کو بہت جلد منظر عام پر آنا چاہئے۔یقیناً یہ تہلکہ مچا دے گی۔"

"ہاں مگر صرف مردان علی شاہ کی زندگی میں۔" وہ بھی اس کے ہمراہ کھڑا ہو گیا۔

"چلو یوں بھی اصل ٹارگٹ بھی تو وہی ہے نا۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

اب صبح ہی ناشتہ کر کے اطمینان سے جاتے تو زیادہ اچھا ہوتا اب صبح ہونے میں زیادہ وقت رہا بھی نہیں ہے۔" آغا جی محبت بھرے اصرار سے بولے تو وہ ممنون انداز میں سر کو جنبش دے کر مسکرا دیا۔

”اتنے تگڑے ناشتے کے بعد تو اب کسی اور ناشتے کی بالکل بھی طلب نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ولید کی طرف دیکھا اور دائیں آنکھ دبائی تو وہ بھی جواباً مسکرا دیا۔

اس بوجھل سے ماحول میں اس کی اس خفیف مسکراہٹ نے لطیف سا رنگ پیدا کیا تھا۔

X...X...X

”شیری! تمہارے اس طرح رونے اور ملول رہنے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔“

مونا بھابی نے نرمی سے اس کا سر سہلایا اور اس کے بالوں کو اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوئوں کو اپنی انگلیوں سے پونچھنے لگیں جن میں اب روانی نہیں رہی تھی۔ اب وہ موتیوں کی طرح ٹھہر ٹھہر کر آنکھوں کے گوشوں سے لڑھک کر بکھر رہے تھے۔

اس نے آنکھیں زور سے میچ لیں اور ان کی گود میں اپنا سر گھسا لیا۔

بعض حقیقتیں کانٹوں کی طرح آپ سے لپٹ جاتی ہیں۔ انہیں الگ کرنے میں اپنا آپ زخمی ہو جاتا ہے۔ وہ جانتی تھی۔ وہ اس حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتی تھی۔ اسے جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”دکھ اس بات کا ہے بھابی کہ مجھ سے اس حقیقت کو چھپایا گیا جان بوجھ کر اراداتاً۔“

”ہمارے بڑوں نے اس میں بہتری سمجھی ہوگی تب ہی ہم سے چھپائے رکھا' کوئی مصلحت ہوگی۔ تم خود کو ہلکان مت کرو' شیری! اور اس حقیقت کو خندہ پیشانی سے قبول کر لو۔ خونی رشتہ نہ ہو' ولید سے تمہارا دوسرا بھی تو خوبصورت رشتہ ہے وہ تو اپنی جگہ موجود ہے نا' اٹل مضبوط' خوبصورت پیارا سا۔“ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی کو چوما۔

ایک ملول سی سانس اس کے سینے کی تہ سے آزاد ہو گئی۔

”کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کتنا اٹل مضبوط رشتہ ہو گا جس میں ابھی سے دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ آگے جا کر قائم بھی رہتا ہے یا نہیں۔“ وہ بیڈ شیٹ کے پھولوں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

آمنہ مردان علی شاہ کا رشتہ ولید سے اتنا گہرا اور پائیدار نکلے گا وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ یوں آن واحد میں اس کے لئے سب سے بڑی آزمائش اور تلخ حقیقت بن کر آ جائے گی' اس نوبت کا تو اس کے پاس تصور بھی نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

آمنہ مردان علی کی استحقاق بھری نگاہیں' وہ رعونت بھرا اور اپنی اہمیت جتاتا لہجہ ساعت میں گردش کرنے لگا۔ ولید کی وہ بے تکلفی' دوستانہ مخلصانہ انداز اسے تڑپانے لگا۔ وہ خود کو آمنہ شاہ کے سامنے کمتر' کمزور اور ہوا کی زد میں آئی ٹوٹتی شاخ کی مانند محسوس کرنے لگی۔

اس کی جلتی آنکھوں میں ایک بار پھر روانی سے پانی اتر آیا۔

"بس کرو شہرینہ! پاگل ہو جاؤ گی۔ اس طرح تو بے کار کی سوچیں تمہیں گھلائے دے رہی ہیں۔ تم مثبت انداز میں بھی سوچ سکتی ہو۔ دیکھو' اوہ' ہو۔" بھابی ایک مضمحل سی سانس بھر کر رہ گئیں وہ ان کی گود میں سر رکھے بالکل بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

بہت کچھ کھو دینے کا احساس اس کی روح پر کچوکے لگانے لگا تھا۔

"میں ہار گئی بھابی' اس ہار کے ڈر سے ڈرتی رہی اور آج ہار گئی۔" اس نے سر اٹھایا بھابی نے اسے تڑپ کر دیکھا۔

"یہ بزرگوں کے کئے گئے فیصلے تھے تقدیر تو نہیں کہ اٹل ہی ہوں' زمینی فیصلے آسمانی فیصلوں کو زنجیر تو نہیں کر سکتے' ہم کیا سوچتے ہیں تقدیر ہمیں کیا دکھاتی ہے۔" وہ اداسی کے جاں گسل احساس سے ہنس پڑی۔

کوئی چھاؤں ہو

جسے چھاؤں کہنے میں

دوپہر کا گماں نہ ہو

کوئی شام ہو

جسے شام کہنے میں

شب کا کوئی نشاں نہ ہو

کوئی وصل ہو

جسے لکھنے پڑھنے کی چاہ میں

کبھی ایک لمحہ گراں نہ ہو

یہ کہاں ہوا ہے کہ ہم تمہیں

کبھی اپنے دل سے پکارنے کی سعی کریں

وہیں آرزو بے اماں نہ ہو

وہیں موسم غم جاں نہ ہو

X...X...X

تانیہ اس کے لہجے میں سے چھلکتی چاہت کی کشش کی لہروں کو اپنے دل میں اترتا محسوس کرتے کرتے یکلخت جیسے سنبھل کر اس خواب آسا ساعت سے نکل کر بولی۔

”مجھے لگتا ہے اکبر کہ میں ایک باریک دھاگے پر چل رہی ہوں جہاں ہر قدم پر دھاگے کے ٹوٹ جانے کا، کبھی اپنے گر جانے کا خوف طاری رہتا ہے۔ آخر کب تک میں یونہی سفر کرتی رہوں گی، منزل کے ملنے کا امکان بھی تو ہو۔ موہوم سا احساس بھی تو ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے دھند میں لپٹے ہوئے راستے ہیں سبھی، کہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا کبھی یہ دھند رنگین ہو کر دل و جان سے لپٹ کر خوابوں کی دنیا میں لے جاتی ہے اور ہر شے سے بے نیاز کرتی ہے، کبھی یہ خوفناک آندھی بن کر ہر شے، ہر جذبے ہر احساس کو اپنی لپیٹ میں لے کر ادھیڑنے لگتی ہے۔“

آج وہ اپنے سارے اندیشے، خوف اور واہمے نکال بیٹھی، جو اس کے اندر قطرہ قطرہ جمع ہو کر اسے پریشان اور بدحال کرنے لگے تھے۔

اکبر شاہ نے ایک ہنکارا ابھرا پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔

”دراصل یہ تمہارے اپنے اندیشے اور واہمے ہیں جو تمہیں پریشان کر رہے ہیں، تمہیں مجھ پر میری محبت پر اعتماد نہیں ہے۔ ورنہ کوئی خوف کوئی اندیشہ تمہارے اندر نہ اترتا اور تم یوں پریشان نہ ہوتیں۔“

اس کے لہجے میں ہلکا سا کھنچاؤ آ گیا شاید اس طرح کے جواب جملوں اور باتوں کی توقع نہیں تھی اس کے دل پر چھائی رومانیت کی رنگین فضا غارت ہو کر رہ گئی تھی وہ لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھا تھا۔

”تم اعتبار کرو مجھ پر تو یہ سارے خوف اندیشے چٹکی میں پر لگا کر اڑ جائیں گے۔“

”بات اعتبار کی نہیں ہے اکبر شاہ!“ وہ سنبھل کر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کی باتوں پر خفا ہو رہا ہے۔

‘‘تو پھر کیا بات ہے؟ کیوں تم اتنی ڈپریس اور ٹینس رہتی ہو؟ میری محبت کے جواب میں ایسی کڑوی کسیلی بات کرتی ہو پھر میں کیا سمجھوں۔’’

‘‘مجھے تم پر اعتبار نہ ہوتا تو میں اتنا سفر کیسے طے کر لیتی اور یوں اپنے اندر کا خوف اور واہمات باہر نکال کر تمہارے سامنے رکھ دیتی' اگر اعتبار نہ ہوتا تو تمہارے ساتھ تمہارے گھر تک کیسے چلی آتی۔’’ وہ وضاحت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کی خفگی کا خوف سمٹ آیا۔ اب وہ اسے ناراض بھی تو کرنا نہیں چاہتی تھی۔

‘‘اوہ ہاں۔’’ وہ ایک گہری سانس بھر کر مسکرایا پھر جیسے افسوس کرتا ہوا بولا۔

‘‘مجھے تو بہت افسوس ہے تانی! کہ تمہیں اپنا کمرہ تک نہ دکھا سکا۔ جہاں ایک دن تمہیں آنا ہی ہے' میری شدید خواہش ہے کہ اسے تم خود ڈیکوریٹ کرو' اپنے ہاتھوں سے سجاؤ' اپنی مرضی اور خواہش سے رنگ بھرو' تا کہ ان بے مایا حقیر بے جان چیزوں میں زندگی دوڑ جائے گی۔ رنگ مہک اٹھیں اور اس بے آباد کمرے میں زندگی کا کچھ تو احساس ہونے لگے۔’’

‘‘اف۔’’ پھر وہی سحر انگیز جملے' وہی سحر طراز لہجہ اور وہی جان نکال دینے والا انداز۔

وہ ہارتے ہارتے تھک سی گئی اور ریسیور سے کان لگائے لگائے دیوار سے سر ٹکا کر ایک پل کے لئے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔

‘‘تانی!’’

‘‘ہیلو تانیہ!’’ اس کی خاموشی پر اس نے ریسیور پر انگلی بجائی اور اس کی سانسوں کے زیر و بم سے اس کی موجودگی محسوس کر کے بولا۔

‘‘بس کچھ دنوں کی بات ہے تانی' خوفناک دھند چھٹ جائے گی۔ تب سب کچھ خوش نما دکھائی دے گا۔ منزل تمہیں اپنے قدموں میں دکھائی دے گی۔’’ وہ پھر سے رنگین فضا تاننے لگا۔

‘‘میں آج کل شاید بہت زیادہ ڈپریس ہوں۔’’ اس طرح کے فضول وہم پریشان کرتے رہتے ہیں۔ ان فیکٹ نومی کی وجہ سے گھر کا ماحول بھی بہت اپ سیٹ رہنے لگا ہے۔’’ وہ آہستگی سے بولی۔ وہ اپنے گھر کی اپنے دل کی ہر بات اس سے کرنے لگی تھی۔ وہ اسے ایسا ساتھی لگنے لگا تھا جو اس کے دکھوں اور زخموں پر اپنی مسیحا انگلیاں رکھ دے اور سارے زخم مٹتے چلے جاتے۔

شاید یہ اس کی اپنی ہی سوچ تھی کہ وہ اس کے زخموں کو سمیٹ لیتا تھا یا واقعی اکبر شاہ کے اندر مسیحائی کی تاثیر تھی اسے ایسا ہنر آتا تھا۔

"نومی!" وہ چونکا پھر خیال آنے پر بولا۔ اوہ ہاں تم نے ذکر کیا تھا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈونٹ وری' تمہاری سسٹر کی بھی شادی ہونے والی ہے۔ تم نے بتایا تھا۔"

"ہاں۔" ایک افسردہ سی سانس اس کے لبوں سے نکل گئی۔

"وہ بھی چلی جائیں گی تو میں بہت تنہا ہو جاؤں گی۔"

"کیوں کیا میرا خیال تمہارے ساتھ نہیں رہتا۔" وہ مخمور لہجے میں بولا۔ "سنا ہے محبوب کا خیال اس کا تصور ساتھ ہو تو تنہائی کا احساس باقی نہیں رہتا۔ میرے ساتھ تو تمہارا تصور رہتا ہے۔"

تانیہ بے ساختہ جھینپ کر ہنس پڑی مگر شرم مانع رہی سو فوری طور پر کچھ بول نہ سکی۔

"یعنی تم نے میرے خیال سے بھی پیچھا چھڑا لیا ہے۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولا تو وہ سٹپٹا گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"نن نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اکبر شاہ میں تمہیں یاد رکھتے رکھتے خود کو بھی بھول رہی ہوں۔" وہ ہلکے سے بولی پھر خیال آنے پر ہلکی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"پتہ ہے شہرینہ کو بھی مجھ سے شکایت رہنے لگی ہے۔ شاید اس کا شکوہ بھی بجا ہے اپنے ارد گرد سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہوں۔ اس سے بھی دور ہوتی جا رہی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے اتنی تاثیر ہے ہماری محبت میں۔" وہ پر مغرور انداز میں ہنستے ہوئے بولا "یہ بتاؤ شہرینہ تمہیں مجھ سے ملنے پر منع تو نہیں کرتی اب۔"

"میں اسے بتاتی ہی نہیں ہوں کہ میری تم سے ملاقات ہوتی ہے یا فون پر باتیں۔"

"وہ کیوں' کیوں نہیں بتاتیں؟"

"وہ ناراض ہوتی ہے اور پھر اس کے لمبے واعظ سننے پڑتے ہیں۔" وہ بے ساختہ بول گئی پھر جلدی سے بولی۔ "چلو چھوڑو اس کا ذکر۔" وہ نادانستگی میں شہرینہ کا ذکر کر چھیڑ کر پچھتانے لگی تھی اور اس موضوع کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ خلاف توقع اکبر شاہ بھی اس موضوع کو طول دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"ہاں بالکل اپنی باتیں کرتے ہیں ہم' آنے والے دنوں کی مستقبل کی۔" اس کا انداز محبت بھرا تھا مگر جانے کیوں تانیہ کے اندر گھسی ہوئی انی پھر سے چبھن دینے لگی۔ آنے والے دنوں کی باتیں دھوکا اور فریب ہی نہ ہوں اور پھر فریب کی باتیں کیا کروں۔

کون جانتا ہے اس دھند کے پار اس کی قسمت میں کوئی خوش نما منزل ٹھہری ہوئی بھی ہے یا صرف سراب کا نخلستان لہرا رہا ہے۔

مگر وہ اکبر شاہ کو یہ نہیں کہہ سکتی تھی۔ ایک موہوم سی امید تو تھی۔

ایک جلتا ہوا دیا تو تھا ہی' ہوا میں رکھا ہوا ہی سہی اور جب تک امید کا دامن آخری انگلی سے بھی لپٹا رہے جینے کی تمنا کی' آس رہتی ہے۔

ایک خوشی کا احساس باقی رہتا ہے جو گاہے بگاہے اڈتا' جینے کی تمنا کو سیراب کرتا رہتا ہے جیسے اکبر شاہ اس کے اندر جینے کی اس تمنا کو سیراب کر رہا تھا۔

وہ اسے وصی شاہ کی کتاب "آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔" میں سے نظم سنا رہا تھا۔

کاش میں تیرے حسیں ہاتھ کا کنگن ہوتا

تو بڑے پیار سے چائو سے بڑے مان کے ساتھ

اپنی نازک سی کلائی میں چڑھاتی مجھ کو

اور بے تابی سے فرقت کے خزاں لمحوں میں

تو کسی سوچ میں ڈوبی جو گھماتی مجھ کو

میں تیرے ہاتھ کی خوشبو سے مہک سا جاتا

جب کبھی موڈ میں آ کر مجھے چوما کرتی

تیرے ہونٹوں کی میں حدت سے دہک سا جاتا

رات کو جب بھی تو نیندوں کے سفر پر جاتی

مرمریں ہاتھ کا اک تکیہ بنایا کرتی

میں تیرے کان سے لگ کر کئی باتیں کرتا

تیری زلفوں کو تیرے گال کو چوما کرتا

مجھ کو بے تاب سا رکھتا تیری چاہت کا نشہ

میں تیری روح کے گلشن میں مہکتا رہتا

میں تیرے جسم کے آنگن میں کھنکتا رہتا

کچھ نہیں تو یہی بے نام سا بندھن ہوتا

کاش میں تیرے حسین ہاتھ کا کنگن ہوا

اس نے فون رکھا تو اسے لگا جیسے دل کے اندر شادابی اتر آئی ہو۔ جسے روح کسی نئے جہاں کے گلستان کی سیر کو نکل گئی ہو۔ مگر جونہی وہ پلٹی اس سحر کا جال ٹوٹ گیا۔ وہ واپس زمین پر آن گری' نادیہ آپی اسے خشک تیوروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"وہ مم میں نے نہیں اسی نے خود ہی کیا تھا فون۔" وہ سٹپٹا کر وضاحت کرنے لگی۔

"ہاں ظاہر ہے وہی کرے گا۔ اسی کو غرض ہے۔" انہوں نے اسی خشک انداز میں فون پر ایک ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر ہلکی سانس بھری اور بغور اس کے چہرے کو دیکھا جہاں ابھی تک پرفریب جملوں سے امڈنے والی سرخی کے نشان موجود تھے۔

"کیسی غرض؟" وہ ناسمجھ آنے والے انداز میں نادیہ آپی کو دیکھنے لگی۔

"وہی غرض جو مردوں کو عورتوں سے ہوتی ہے۔ کیا اب تمہیں وضاحت سے سمجھاؤں۔"

انہوں نے کچھ ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ نظریں چرا کر اضطرابی انداز میں لب کاٹنے لگی۔

"ہر نامحرم مرد کو نامحرم عورتوں سے ایک ہی غرض ہوتی ہے اور وہ اس غرض کی تسکین کی جدوجہد میں مصروف ہوتا ہے۔ اسی غرض سے ان سے ملتا ہے کبھی یہ غرض انہیں دیکھ کر پوری کرتا ہے' کبھی بات کر کے اور کبھی چھو کر۔"

تانیہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا پھر مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیا۔ نادیہ آپی اسے شکوہ کناں نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"ہوس اور محبت میں بہت تھوڑا فرق ہوتا ہے تانیہ! جو ہر عورت نہیں سمجھ سکتی خصوصاً لڑکیاں۔ اور کبھی مرد بھی اس باریک دھاگے جتنے فاصلے کی سنگینی اور نازکی کو نہیں سمجھ پاتا

اور یوں وہ عورت محبت کے نام پر ہوس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ کبھی دانستہ کبھی نادانستہ' مگر بہر حال بڑا نقصان سراسر عورت کے حصے میں آتا ہے۔"

"آپی' آپی پلیز چپ کریں۔" تانیہ کو اپنے اعصاب کی طنابیں کھنچتی محسوس ہونے لگیں۔ جیسے اب کھٹ سے ٹوٹ جائیں گی۔ وہ بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

نادیہ آپی نے ایک افسردہ سانس بھری اور اس کے نزدیک فرش پر گھٹنے ٹکا کر بیٹھ گئیں پھر نرمی سے اس کے گھٹنے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔

"تم شہرینہ سے اسی لئے دور ہو رہی ہو کہ وہ تمہیں حقیقت کی خوفناکیاں اور بدصورتیاں دکھانے لگی ہے تمہیں دوستی کی روشنی سے راستہ سوجھانے کے جتن کرتی ہے۔ وہ اندھی کھائی تمہیں اس کی موجودگی میں دکھائی دینے لگی ہے جو اس کی ناموجودگی میں کوئی خوشنما وادی نظر آتی ہے' مگر نظر آنے اور ہونے میں بہت فرق ہے تانیہ! خدا کے لئے اس فرق کو سمجھو' تمہیں ہمیشہ آنکھیں بند کر کے تصور کی اس وادی میں نہیں رہنا۔ حقیقت کی دھوپ ایک دن پڑ کر رہے گی اور تب تم اپنے آپ کو اس بدنما کھائی میں پاؤ گی تو نکلنے کے سارے راستے بھی بند پاؤ گی۔"

"چپ ہو جائیں فار گاڈز سیک' چپ ہو جائیں آپی!" وہ ہذیانی انداز میں چیخ کر رو پڑی۔

"تم بہن ہو میری اسی لئے دل جلتا کڑھتا ہے تمہارے لئے پگلی!" انہوں نے بے اختیار اسے خود سے لپٹا لیا۔ وہ بھی اس کے سینے سے لگ کر جیسے پھٹ گئی وہ اس کا سر سہلانے لگیں پھر اس کے بالوں کو چوم کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"ذرا دیکھو آئینے میں خود کو' کیا سے کیا ہو گئی ہو۔ چہرے کی چمک' رونق روشنی کہاں کھو گئی ہے' کتنا پھیکا' ویران اور پختہ چہرہ ہو گیا ہے تمہارا۔ سارا دن سوچتی رہتی ہو سلگتی اور تڑپتی رہتی ہو' ارد گرد سے کٹ کر رہ گئی ہو' تمہاری وہ کھلکھلاہٹیں' ہنسی' وہ خوشیاں کہاں گم ہو گئی ہیں۔

سوچو بھلا محبت ویران کرتی ہے یا آباد' محبت تو بہار کی طرح ہوتی ہے۔ سوکھی' ٹہنیوں پر بھی نکھار لے آتی ہے۔ تم تو خود سر سبز شاخ تھیں پھر کیوں خزاں میں آئی شاخ ہو کر رہ گئی ہو۔" وہ اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر متاسف نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

آنسو اب بھی اس کی آنکھوں سے تواتر سے بہہ رہے تھے مگر پلکیں جھکی ہوئی تھیں سسکیاں بھرتی وہ انہیں خوفزدہ ہرنی کی مانند معصوم اور بے وقوف لگی۔

"یہ محبت نہیں ہے تانی! اذیت ہے' ایسی محبتیں قوس قزح کی مانند ہوتی ہیں چند گھڑی کے لئے حسین و دلکش اور خیرہ کن پھر دل کے آسمان سے یوں گم ہو جاتی ہیں جیسے کبھی تھیں ہی نہیں اور وہ دل اس قوس قزح کو ڈھونڈنے میں دیوانہ ہو جاتا ہے مگر وہ ہاتھ نہیں آتیں پھر نہیں ملتیں۔"

یہ محبت بارش میں اگنے والی کھمبیوں کی طرح ہوتی ہے۔اسے دیکھنے میں خوشنما' مگر زہریلا پھل' اس چکھنے والا عمر بھر تڑپتہ رہتا ہے نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے۔"

"تو پھر یہ محبت کیا ہے؟ کیوں اس کا اتنا چرچا ہے؟ یہ دلوں میں کیسے اور کیونکر گھر کر جاتی ہے' کیوں نکل نہیں جاتی؟ آکٹوپس کی طرح کیوں جکڑ لیتی ہے؟" وہ تڑپ کر ان کے سینے سے ٹکرانے لگی۔

"محبت تو بہت پیارا جذبہ ہے مگر اس کا خوش کن سلسلہ کسی بھی غیر محرم رشتے سے نہیں جڑتا' نامحرم سے ہونے والی محبت بے جڑ اور زمین پر بے موسم اگنے والے پودے کی مانند ہوتی ہے۔کسی بھی تیز آندھی اور مخالف ہوا سے اکھڑ جانے والا پودا۔" انہوں نے اسے نرمی سے سنبھال کر کرسی کی پشت سے لگا کر بٹھا دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تھپکتے ہوئے بولیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"محبت بہت بھرپور ہوتی ہے اور عورت کو اس کے محرم مرد سے ملتی ہے' اپنے بچوں سے ملتی ہے' اور یہی محبت عورت کو مکمل بناتی ہے۔اس کے نسوانی وقار اور پاکیزگی کو قائم رکھتی ہے' اسے آسودہ رکھتی ہے۔یہ راستوں میں آنے والے کچے سائبان ہیں جو کبھی عورت کو تحفظ اور آسودگی نہیں دے سکتے یہاں ٹھہرنا ہی نہیں چاہئے گزر جانا چاہیئے یہ سراب ہے آکٹوپس ہے جو ہر گھر جانے والے کو جکڑ لیتا ہے۔"

"جس طرح مجھے۔" اس کے لب ہولے سے کپکپائے۔نادیہ نے دیکھا وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے مجرمانہ انداز میں سر جھکائے بیٹھی تھی پھر ایک گہری سانس بھر کر اپنی انگلیوں سے رخساروں پر بہنے والا پانی پونچھتے ہوئے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ کی یہی باتیں تو میرے پیروں میں زنجیر ڈال دیتی ہیں ورنہ شاید میں کب کی پستی میں اتر چکی ہوتی۔"

نادیہ آپی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے دبایا۔

”نہیں، یہ میری باتیں نہیں تمہارے اندر کی شفاف و پاکیزہ اور بردبار لڑکی ہے جس نے تمہیں پستی میں نہیں گرنے دیا۔ سچائی کی روشنی تھوڑی بھی ہو تو دبیز سے دبیز اندھیرے کا سینہ پھاڑنے کی طاقت رکھتی ہے۔“

تانیہ نے ان کے کندھے پر سر ٹکا لیا۔

”کبھی بھی اپنے دل کو نفس کے منہ زور سیلاب میں تنکے کی طرح بہنے مت دینا۔ نفس منہ زور بے لگام گھوڑے کی مانند ہوتا ہے۔ دل کے شہسوار کو کہو کہ وہ عقل کی لگامیں تھامے رہے ورنہ یہ منہ زور گھوڑا منہ کے بل گرا دے گا۔“

وہ اس کا سر تھپکنے لگیں، اسے سکون مل رہا تھا، دل کے بھڑکتے الاؤ میں جیسے ٹھنڈے چھینٹے پڑ رہے تھے۔

X...X...X

اس کی آنکھ فجر کے بعد ہی لگی تھی کہ فون کی گھنٹی سے کھلی۔ اس نے ریسیور اٹھانے سے پہلے وال کلاک پر نظر ڈالی جہاں صبح کے نو بج رہے تھے۔ تاہم ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ہی آنکھ لگی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہو۔ اس نے غنودگی کے عالم میں ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف مردان علی شاہ کی سرسراتی آواز سنائی دی۔

”ہیلو بھتیجے، بڑی خوشی ہوئی اس انکشاف سے کہ تم میرا ہی خون نکلے مگر اس میں اتنا ڈرامہ رچانے کی ضرورت کیا تھی؟۔“

اس نے ایک طویل قسم کی سانس بھر کر سر جھٹکا اور ریسیور پر ایک نگاہ ڈال کر ملائمت سے بولا۔

”بہت شکریہ مجھے بھتیجا تسلیم کرنے کا، اور رہی بات ڈرامہ کرنے کی تو، ہم سب یہاں تماشائی ہی نہیں سوانگ رچانے والے بھی ہیں۔ شیکسپیئر کے مطابق تو دنیا ہی ایک اسٹیج ہے، اور ہم سب اداکار، وسو میں تو محض اپنا کردار ادا کر رہا ہوں، اس سٹیج پر، مگر باوجود اس کے میں خود کو آپ جتنا بلند پائے کا ڈرامے باز تسلیم نہیں کرتا، میں تو طفل مکتب ہوں آپ کے سامنے۔“

مردان علی شاہ نے ایک ہنکارا ابھرا، ولید کو محسوس ہوا، وہ اپنے ٹمپر کو جیسے کنٹرول کر رہے ہوں۔

”بہر حال' میرے لئے یہ دھچکا ہے۔ میں کئی دن پہلے سے آنے والے اس خدشے کو محسوس کر چکا تھا۔“ وہ لفظ خدشے' پر قدرے زور دے کر بولے پھر ہلکی تمسخرانہ ہنسی کے ساتھ بولے۔

”تو اب تم اخبارات میں میرے خلاف مہم شروع کرنے کے انتظامات کر رہے ہو۔“

”میرا خیال ہے ٹریلر تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔“ وہ بھی بلا تامل اطمینان سے بولا ”آئندہ کا لائحہ عمل آپ کا رد عمل دیکھ کر طے کرینگے۔“

”کیا مطلب؟“ مردان علی شاہ کی آواز میں ہلکی حیرت کی غراہٹ تھی مگر پھر وہ خود کو مضبوط ظاہر کرنے کے لئے اس حیرت کو سمیٹ کر یکدم ہنس پڑے۔

”تم واقعی طفل مکتب ہی ہو' نہیں جانتے کہ اخبارات اور صحافیوں کو دھونس' دھمکی اور لالچ میں لانے ہیں دیر نہیں لگتی۔“

”یقیناً مگر ابھی بھی اللہ کے فضل سے کچھ اخبارات اور دیانت دار صحافی حضرات موجود ہیں جو اس پیشے کی عزت کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ آپ انہیں اپنے تمام تر مالی وسائل بروئے کار لا کر بھی خرید نہیں سکیں گے۔“

”خیر میرا ایسا کوئی ارادہ ہے بھی نہیں۔“ وہ یکدم بدلے ہوئے لہجے میں بولے۔

”تم میرے اپنے خون ہو' ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر بات چیت کر سکتے ہیں اگر تمہارا مقصد جائیداد کا حصول ہے تو اس پر بھی بات ہو سکتی ہے۔“

ولید کو لحظہ بھر اپنے اعصاب کی طنابیں کھنچتی ہوئی محسوس ہونے لگیں جیسے کوئی لاسٹک کو اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں لپیٹ کر کھینچے پھر کھٹ سے چھوڑ دے' اسے اپنے اعصاب اسی لاسٹک کی طرح جھنجناتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”کہتے ہیں واقعات اہم نہیں ہوتے' یادیں انہیں اہم بنا دیتی ہیں' مگر میرے لئے وہ واقعہ بھی اتنا ہی اہم اور ناقابل فراموش ہے جو دل پر نہیں روح پر بھی نقش ہے۔“ اس کی آواز میں تلخی امڈ آئی' ساتھ ہی اس کے ذہن کے دریچے میں ماضی سے اٹھتے دھوئیں کا ریلا سا امڈ آیا۔ جو دل کے اندر تک بھر گیا۔

”دولت کا حصول میرے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔ دولت اگر میرے باپ کے لئے بھی اہم اور قابل اعتنا چیز ہوتی تو وہ آج بھی دولت کے ڈھیر پر آپ کی طرح سانپ اور بچھو بن کر

بیٹھے ہوتے اور وہ جب مرتے تو ان کے لئے آنسو بہانے والا ایک بھی نہ ہوتا البتہ تالیاں پیٹنے والے ضرور ہوتے۔"

"شٹ اپ۔" مردان علی شاہ بھبک اٹھے۔

وہ ہلکے سے ہنسا۔ "میرا خیال ہے مردان علی شاہ! مجھے خاموش کرنے کے لئے آپ کو ماضی کا وہی طریقہ دہرانا پڑے گا۔"

"بات سنو، تمہیں ماضی کے حوالے سے شدید قسم کی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ جو تخم تمہارے اندر اتارا گیا ہے وہ آج تناور درخت بن گیا ہے بہر حال اس کی جڑیں کھوکھلی ہیں کہ یہ بے بنیاد الزام ہے۔ تم اخبارات کے ذریعے اگر ایسی مہم شروع کرو گے تو خاطر خواہ فوائد حاصل نہیں ہوں گے۔ ہمارے یہاں دوسروں کی عزت کو اتارنے کے لئے یہ طریقہ بہت پرانا ہو چکا ہے اب عوام بھی سمجھنے لگے ہیں۔" مردان علی شاہ یہ کہہ کر ہنسے مگر ان کی ہنسی اپنائیت کی روح سے خالی تھی بالکل کھردری اور سفاک تھی۔

"کاش عوام واقعی سمجھنے لگے ہوتے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "عوام کی سمجھ بوجھ تو معاشی تنگ حالی کی نذر ہو گئی ہے۔ اینی وے میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے بد کو بدنام

کرنے کا۔ یوں بھی ہمارے یہاں کے سیاست دان بدنام ہونے میں بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں اور اس سے نام پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ پاپولر ہونے کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔"

"بے کار کی باتیں چھوڑو، میں تم سے الجھنا نہیں چاہتا صرف یہ پوچھتا ہوں کہ تم آخر چاہتے کیا ہو؟۔" ان کے لہجے سے غصہ چھلک رہا تھا۔

"یہ ایک معمہ اگر حل ہو جائے تو کتنے مسائل پیدا ہی نہ ہوں اور پیدا ہونے والے کتنے حل ہو جائیں۔" اس نے ایک ٹھنڈی طویل سانس بھری۔

"فضول بکواس مت کرو، ڈھنگ سے جواب دو۔" وہ شاید بری طرح تپ گئے تھے۔

"فضول سوال کا فضول جواب ہی ہو سکتا ہے محترم چچا حضور!" وہ ملائمت اور رسانیت سے بولا مگر ادھر گویا مردان علی شاہ کا غصہ نقطہ اشتعال کو پہنچ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے تم اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہو۔" انہوں نے دانت پیستے ہوئے کھٹاک سے ریسیور کریڈل پر پٹخا تھا۔ اس نے ایک بڑی سانس بھری اور اپنے ریسیور کو دیکھا۔

"بات تو میں کبھی بھی آپ سے کرنے کے موڈ میں نہیں ہو سکتا مگر جتنی بات ہوتی ہے اور ہو گی یہ میری مجبوری ہو گی۔"

اس نے ریسیور کریڈل پر ڈھیلے ہاتھ سے پھینکا اور ذہنی کرب سے گزرتے ہوئے تلخ اور سرد قسم کی سانس بھری پھر دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیرا' جیسے اس تلخ کلامی کے اثرات کو زائل کرنا چاہ رہا ہو اور یونہی بیڈ سے اتر کر ٹہلتا ہوا کھڑکی کی طرف آ کر پردے سرکانے لگا' اس کے باوجود یکدم اسے حبس کا احساس ہونے لگا تھا۔ تازہ اور ٹھنڈے جھونکے کی مدد طلب ہونے لگی۔ پردہ سرکا تو خوشگوار جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا' اس سے زیادہ ایک خوش نما منظر دل کی آنکھ پر نور کر گیا۔

شہرینہ اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی اسے اسٹارٹ کرنے کے جتن کر رہی تھی۔

گھرر گھرر کی آوازوں سے پورا پورچ گونج رہا تھا' اس کے چہرے پر جہاں بھر کی بے زاری امڈی ہوئی تھی۔ جس کا مطلب تھا وہ خاصی دیر سے اس ناخوشگوار مہم میں جتی ہوئی تھی اور جس کا کوئی حل اب بھی نکلتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

جہانگیر احمد کی گاڑی مع ڈرائیور موجود نہیں تھی' جس کا مطلب تھا وہ اور آغا جی آفس جا چکے تھے۔ البتہ وسیم کی گاڑی موجود تھی مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا وہ گیارہ بجے سے پہلے پورٹیکو میں جھانکے گا بھی نہیں' چوکیدار بے چارا ذرا فاصلے پر کھڑا شاید اپنے مفید مشوروں سے نواز رہا تھا مگر یہ مشورے یقیناً اس کے لئے محض دردسر ثابت ہو رہے تھے۔ تبھی اس نے دیکھا اس نے چوکیدار کی طرف منہ کر کے کچھ کہا تو وہ فوراً پلٹ گیا اور واپس گیٹ کی طرف چلا گیا۔

بے ساختہ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

ریڈ سوک میں بیٹھی وہ خود بھی اس ریڈ گلاب جیسی ہو رہی تھی جس کی رنگت دھوپ میں کندن جیسی ہو جاتی ہے اس نے اپنا رات اتارا ہوا کرتا ڈھونڈا نہ ملنے پر شرٹ بدن پر ڈالی اور اوپر کے بٹن بند کرتا ہوا کمرے سے نکل کر پورچ میں چلا آیا۔

وہ ابھی تک گھرر گھرر کی آوازوں سے پورچ سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔

"گاڑی چلانا سیکھ لینا قطعی کمال نہیں۔ گاڑی ٹھیک کر لینا کمال کی بات ہے' مگر افسوس کہ یہ کمال تم لڑکیوں کو کبھی نہیں آئے گا۔" وہ اس کی طرف کی کھڑکی میں منہ دے کر بولا پھر ڈور کو کھولتے ہوئے بولا۔

"ہٹو میں دیکھتا ہوں' تم اپنا زور آزما چکیں اب مجھے آزمانے دو۔"

اس نے اگنیشن میں لٹکتی چابی گھما کر گاڑی بند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ مردوں کو ہی سارے کمال آتے ہیں خاص کر عورتوں کو انڈر ایسٹی میٹ کرنا تو۔" اس نے چابی زور سے کھینچ لی گویا سارا غصہ اسی نازک جان پر نکالا تھا۔

"ارے رے میں تمہیں انڈر ایسٹی میٹ تو نہیں کر رہا' میں تو صرف سچائی بیان کر رہا ہوں۔" اس نے بڑھائی ہوئی چابی تھام کر بے ساختہ ہنسی روک لی پھر ہلکی سی سانس بھری۔

"ویسے شکر ہی ہے کہ یہ ایک کام تم عورتوں کو نہیں آتا ورنہ ہم جیسے عورتوں سے اخلاق' مروت برتنے والے' ان کے لئے جذبہ ہمدردی سے خود کو لبریز پانے والے مرد تو نیکی کی اس سعادت سے محروم ہی رہ جائیں نا۔"

وہ پہلے ہی کوئی خوشگوار موڈ میں نہ تھی۔ اس کی باتیں' اس کا انداز مزید طیش دلانے کا ہی سبب بن رہا تھا تاہم وہ کچھ کہہ کر اسے مزید جملہ بازی کا موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ خاموشی سے دوسری سیٹ پر کھسک کر چلی گئی وہ ڈرائیونگ سیٹ پر اطمینان سے پھیل کر بیٹھ گیا۔ وہ اس کی طرف رخ کرنے کی بجائے ونڈ اسکرین پر نظریں جما کر بیٹھ گئی تھی جس پر بے اختیار مسکراہٹ اس کے لبوں میں آئی تھی۔ ہلکے براؤن اور بلیک کنٹراسٹ کے سوٹ میں وہ شاید یونیورسٹی جانے کے لئے تیار ہوئی تھی۔ بلیک اسکارف اس نے سر پر باندھ رکھا تھا' دھلا دھلا صاف ستھرا چہرہ قدرے اداس اور ملول سا دکھائی دے رہا تھا۔ حزن کی ہلکی سی آمیزش اس کی بھوری آنکھوں کے کانچ کی سطح پر اداس اکیلے کنول کی مانند تیر رہی تھی۔

"فرض کرو یہ گاڑی راستے میں کہیں خراب ہو جاتی تو تم کیا کرتیں' کسے بلاتیں' اس نے اگنیشن میں چابی ڈالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا' اس کا انداز سراسر غیر سنجیدہ تھا اور اس کی یہی غیر سنجیدگی درحقیقت اسے بے طرح دکھ دے رہی تھی۔ وہ جس کرب سے گزر رہی تھی وہ اس سے واقف نہیں تھا۔

"کم از کم آپ کو ہر گز نہ بلاتی۔" وہ رکھائی سے بولی۔

”اچھا؟“ اس نے مصنوعی چونکنے کی ایکٹنگ کی۔

”تو پھر کسے بلاتیں؟“

”میکینک کو۔“ وہ رخ موڑ گئی۔

”ویری گڈ پہلی عقل مندی کی بات کی ہے‘ جبکہ کسی حد تک حقیقت پسندانہ بھی۔“ اس نے سراہنے والے انداز میں سر ہلایا۔

شہرینہ نے اس بے رحم شخص کی طرف خاصی شاکی نظروں سے دیکھا۔ پھر ونڈ اسکرین کو گھورتے ہوئے یکدم یاس کی لپیٹ میں آتے ہوئے بولی۔

”وقت بہت بے رحم اور سفاک ہے۔ یہ انسان کو حقیقت پسند بنا دیتا ہے اور میرا خیال ہے حقیقت پسندی ہی میں عافیت ہے۔ یہ انسان کو بہت سے تجربے سے پہلے ہی مضبوط بنا دیتی ہے۔“

ولید نے بھنوئوں کو ہلکی جنبش دے کر خاصی بدلی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے از سر نو اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہیں اب بھی ونڈ اسکرین پر مرکور تھیں ولید نے محسوس کیا وہ دانستہ اس سے نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھی۔

”صبح صبح اتنا گاڑھا فلسفہ صحت کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ اچھی بات ہے کہ تم اچھی کتابیں پڑھنے لگی ہو مگر اس کے اوقات کار چینج کر لو تو زیادہ اچھا ہو گا۔“ یہ کہہ کر اس نے بے ساختہ متاسفانہ سانس بھری۔ وہ لب دانتوں میں دبا کر اسے سخت سلگتی اور خفگی بھری نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

”میں نے پڑھا ہے کہیں کہ جب کوئی خلوص دل سے کسی کو مشورہ دیتا ہے یا سمجھانا چاہتا ہے تو اسے کچھ ایسی ہی حبس آلود گرم نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“ اس نے ایک اور ٹھنڈی سانس بھری۔

”آپ سے اگر گاڑی ٹھیک نہیں ہو سکتی تو برائے مہربانی نیچے اتر جائیے۔“ وہ چڑ کر بولی۔

"گاڑی کا کیا ہے یہ تو اپنے اختیار کی چیز ہے۔ دو منٹ میں ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے چٹکی بجائی ہلکے سے اور اس کی طرف دیکھا۔ "مگر دل کا کیا ہو کہ یہ اپنے اختیار سے باہر ہوتا ہے یہ کیسے اور کس طرح ٹھیک ہو سکتا ہے۔"

وہ قدرے اس کی سمت جھکا اس کے ہونٹوں کی تراش میں بدستور خفیف سی مسکراہٹ موجود تھی۔

لحظہ بھر اسے اپنا دل اچھلتا محسوس ہو۔ اوہ سرعت سے نگاہوں کا زاویہ بدل گئی۔

"میرا خیال ہے بیٹری کے ٹرمینل لوز ہو گئے ہونگے۔" وہ اس کے اطمینان کو غارت کرتا ہوا اطمینان سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا' پھر فرنٹ ہڈ کھول کر چیک کرنے لگا۔ وہ گم صم سی ونڈ اسکرین کے پار اسے تکتی رہ گئی۔ اس کے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی تھی مگر یہ کسی تسکین کی نہیں تھی' شادمانی کی نہیں تھی' اضطراب کی تھی' وحشت کی تھی۔

عجیب امید اور مایوسی کے دریا میں وہ بہہ رہی تھی کبھی اسے اپنا اور ولید کا تعلق وہم کی مانند دھندلا محسوس ہوتا تو کبھی حقیقت کی طرح روشن' گویا ایک لہر اچھالتی تھی تو دوسری یاس کی اتھاہ میں ڈبو لیتی تھی۔

عجیب روشنی اور تاریکی کا یہ کھیل تھا جس سے اس کا دل از خود کھیل رہا تھا یا تقدیر کھلا رہی تھی۔

سر جھٹک کر اس نے ایک ہلکی سی سانس بھری اور اس پر ایک نگاہ ڈالی جو ہڈ پر سر جھکائے شاید بیٹری کے تار جوڑ رہا تھا' بغور دیکھنے پر بے ساختہ ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

وہ ڈھیلی ڈھالی شلوار کے اوپر شرٹ پہنے ہوئے تھا' جس کے اوپر کے دو بٹن بند تھے بقیہ اندر بنیان کی موجودگی کی وجہ سے شاید بند کرنے کی زحمت نہ کی گئی تھی' آستین کے بٹن بھی کھلے ہوئے تھے جس سے دائیں ہاتھ کے کف لٹک رہے تھے بائیں ہاتھ کی آستین البتہ فولڈ کی ہوئی تھی جس سے اس کی مضبوط کلائیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔

وہ ایسے حلیے میں عموماً کم ہی دیکھنے میں آتا تھا۔ تاہم کبھی کبھی وہ ایسی لاپرواہی بھی برت لیتا تھا۔

براہ راست پڑنے والی دھوپ اس کے چہرے پر جمی ہوئی سرخی میں اضافہ کر رہی تھی اس کے ہاتھ کی مضبوط انگلیوں کے جوڑ عموماً سرخ ہی رہتے تھے اور حرکت کے باعث یہ سرخی بڑھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اس نے بالکل اچانک سر اوپر اٹھا کر ونڈ اسکرین کی طرف دیکھا

تھا تو اسے محویت سے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس کی روشن آنکھوں کی تابناکی میں اضافہ ہو گیا گو کہ وہ سرعت سے نظریں جھکا گئی تھی مگر وہ اس کی یہ چوری بہت پہلے ہی پکڑ چکا تھا جس سے وہ انجان تھی تار تو کب کا جڑ چکا تھا۔اب یونہی کھڑا محض اس کی محویت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''تمہاری گاڑی بھی تمہاری طرح ضدی اور خود سر معلوم ہوتی ہے۔خیر جس طرح ضدی اور خود سر بلا کے بے وقوف ہوتے ہیں سو اپنی بے وقوفی کی وجہ سے پکڑے ہی جاتے ہیں میں نے بھی اس کی کمزوری پکڑ لی اور اسے دو منٹ میں ٹھیک کر دیا۔اب ذرا اسٹارٹ کر کے دیکھو۔'' وہ اس کی کھڑکی کی طرف آ کر خفیف سا جھکا۔اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھرک رہی تھی۔

وہ بے عنوان سی شرمندگی محسوس کر کے رہ گئی۔اس کے چہرے پر امڈنے والی سرخی کی لہر بہت واضح تھی وہ اسی طرح پلکیں جھکائے ڈرائیونگ سیٹ پر کھسک گئی۔

''میرا خیال ہے اب یہ تمہیں تنگ نہیں کرے گی اور تمہیں اس مکینک کے علاوہ کسی دوسرے میکینک کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

وہ لب چبا کر رہ گئی اور اگنیشن میں موجود چابی گھمائی تو گاڑی معمول کے مطابق اسٹارٹ ہو گئی۔بے ساختہ ایک طمانیت بھری سانس اس کے لبوں سے خارج ہو گئی۔

اس نے بس ایک پل کے لئے چہرہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔وہ دونوں ہاتھ کھڑکی میں رکھے سر اندر کئے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''ویسے بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم نے مجھے کل کے کامیاب جلسے کی مبارکباد نہیں دی۔'' وہ یکدم یاد آنے پر بولا اور متاسفانہ انداز میں سر ہلا دیا۔

''دیکھا تم نے لوگ جوق در جوق اس جلسے کو کامیاب بنانے چلے آئے تھے اور مجھے مبارک باد دے رہے تھے مگر افسوس کہ تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔'' اس کے انداز میں ملامت تھی۔

''آپ کے پاس مداحوں کی کمی جو نہیں تھی۔اسی جوق در جوق کی مبارک بادیں وصول کرنے کے باوجود دل نہیں بھرا آپ کا؟'' وہ اس کی متاسفانہ سانس پر جل کر رہ گئی تھی۔

ولید کی آنکھوں میں بڑی بھرپور شرارت کا عکس لہرا گیا۔

''وہ کیا ہے کہ:

یہ دل میسر و موجود سے بہلتا نہیں

کوئی تو ہو جو مری دسترس سے باہر ہو

ایک ہلکی سی سانس بھری، پھر یکدم حیرت کے اظہار کے طور پر کندھے اچکائے۔

"کتنی حیرت کی بات ہے کہ مجھے برملا شعر یاد ہونے لگے ہیں شاید سکندر کی صحبت کا اثر ہو گیا ہے۔" وہ اس پر ایک نظر ڈال کر رہ گئی اس کے دل کے اندر کسی قسم کی خوشی کی کوئی کلی نہ پھوٹی تھی۔

ایک عجیب سی بے حسی اور قنوطیت جیسے اس کے دل میں سمٹ آئی تھی۔اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ ڈالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر ہلکے سے مسکرائی۔

"واقعی مجھے تو یاد ہی نہیں رہا، مبارکباد دینی تھی مردان علی شاہ کا آپ کے انکل ہونے اور آمنہ علی کا فرسٹ کزن ہونے پر۔ان سے اتنے قریبی تعلق پر آپ کو میری طرف سے بہت بہت مبارکباد ہو۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

یہ کہہ کر اس نے گاڑی کو جھٹکے سے آگے بڑھا۔ولید سرعت سے پیچھے ہٹ گیا اور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینا چاہا تھا کہ وہ زن سے گاڑی ماربل کے فرش پر بہاتی پورٹیکو سے باہر نکال لے گئی۔

وہ اپنی جگہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔اس کے دل کی کیفیت کچھ ایسی ہوئی جیسے کسی نے اس کے زخمی تاروں پر ہاتھ مار دیا ہو مگر یہ کیفیت چند لمحے ہی رہی۔اس نے ایک گہری سانس بھر کر سر جھٹکا اور چہرے پر ہاتھ پھیر تا پلٹ کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

X...X...X

اس نے سڑک پر گاڑی لاتے ہوئے رفتار آہستہ آہستہ کم کر دی اور سر جھٹک کر اس تکلیف دہ احساس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنے لگی جو اس کے جسم کی کھال بنتا جا رہا تھا۔

ہمیں جنجال ایسا بھی نہیں ہے

یہ دل

پامال ایسا بھی نہیں ہے

کوئی بھی شخص جس کا دل کرے

آئے اٹھائے اور مسل دے

ہمارا حال ایسا بھی نہیں ہے

ہماری سوچیں ہماری خواہشات پر دراصل ہماری آدھی سے زیادہ پریشانیاں ہوتی ہیں۔

خواہشات کو پر نہ دے کر ان کی پرواز کو روک دیا جائے۔

ذہن کو مصروف کر کے تکلیف وہ سوچوں سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔

دکھ ہماری قسمت میں اگر لکھے ہیں تو ان سے دوچار ہونے کی بجائے ان سے چھٹکارا پانے کا اختیار تو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ مگر کمزور اعصاب کے لوگ اس سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد نہیں کر سکتے'

مضبوط اعصاب کے مالک' اس میں پچاس فیصد کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اور اس نے سوچا اسے بھی مضبوط اعصاب کے مالک لوگوں کی فہرست میں شامل ہو ہی جانا چاہئے۔ یوں بھی دانا کہتے ہیں کہ مصیبت اور غم سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ آپ کے پاس وقت نہ ہو۔

اس نے پکا قصد کر لیا کہ وہ یونیورسٹی سے واپسی پر لائبریری میں زیادہ وقت گزارے گی تاکہ امتحانات کی تیاری بھی ہو سکے اور بے کار کے خیالات سے نجات بھی پائی جا سکے۔ اس ارادے کے ساتھ ہی اسے اپنے اندر چھائی وحشت چھٹتی محسوس ہونے لگی۔

تانیہ آج یونیورسٹی نہیں آئی تھی مگر اسے زیادہ اچنبھا نہیں ہوا' نہ غصہ آیا۔ وہ اب اکثر و بیشتر بنا بتائے اور بغیر وجہ کے چھٹیاں کرنے لگی تھی۔

پیریڈ تو اس کے بھی کئی مس ہو چکے تھے۔ وہ راہداری کے ایک نسبتاً خاموش گوشے میں بیٹھ کر اپنا کام مکمل کرنے لگی۔

کاش میں تیرے حسیں ہاتھ کا کنگن ہوتا

تو بڑے پیار سے چائو سے بڑے مان کے ساتھ

اپنی نازک سی کلائی میں چڑھاتی مجھ کو

اور بے تابی سے فرقت کے خزاں لمحوں میں

تو کسی سوچ میں ڈوبی جو گھماتی مجھ کو

میں تیرے ہاتھ کی خوشبو سے مہک سا جاتا

جب کبھی موڈ میں آ کر مجھے چوما کرتی

تیرے ہونٹوں کی میں حدت سے دہک سا جاتا

اکبر شاہ کی آواز اور اس کے چیلوں کی دبی دبی کھلکھلاہٹوں نے اس کے تسلسل کو ایک چھناکے سے توڑا تھا۔ وہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کی گرم گرم نگاہوں کی تپش وہ براہ راست اپنے رخسار پر محسوس کر رہی تھی۔ تاہم اس نے سر اٹھانے کی بجائے خود کو مصروف ہی رکھا اور خفیف سا اٹھایا ہوا سر واپس جھکا کر جرنل پر قلم چلانے لگی۔

ہر ایک پہ نظریں اٹھنی تھیں، ہر ایک پہ جی کو مچلنا تھا

اس شہر میں روپ کا کال نہیں، کچھ اور ہے اپنے ساجن میں

وہ اپنے چیلوں کو بھیج کر خود اس کے مقابل آ کر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ اس کی اس جرات پر چراغ پا ہو گئی اور کتاب پورے زور سے بند کر کے اس پر ایک غصیلی نگاہ ڈالی۔

"چچ چچ۔"

ہم پہ یہ سختی کی نظر ہم ہیں فقیر رہگذر

رستہ کبھی روکا تیرا، دامن کبھی تھاما تیرا

وہ اس کی غصیلی نگاہوں کے جواب میں تمام تر جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرایا اور اسے یوں تکنے لگا جیسے نگاہوں سے دل میں اتار رہا ہو' پھر ایک مخمور سی سانس بھر کر اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"میں جانتی ہوں تم نے شاعری کے مجموعے رٹے ہوئے ہیں مگر تمہاری اس برجستہ اور بے موقع شاعری سے کم از کم میں متاثر نہیں ہو سکتی' یہ سارے حربے تم تانیہ پر ہی آزمائو۔" وہ اس پر ایک چلچلاتی نظر ڈال کر اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔

"آں ہاتانیہ!" تانیہ کے نام پر اس نے ایک ٹھنڈی پر سکون سانس بھری۔

"مس شہرینہ خان! تمہاری دوست جس کی پارسائی پر تمہیں بڑا فخر تھا۔ وہ تو ہم پر مر مٹی ہے اب کیا کہتی ہو تم۔" اس کا انداز سراسر تمسخرانہ تھا۔ اس نے اپنے بیگ کی زپ کھول کر کتاب اندر ڈالتے ہوئے اس پر ایک متاسفانہ نگاہ ڈالی۔

"وہ اب بھی میری نظر میں اتنی ہی پارسا ہے۔ دراصل تم اس کی کمزوری کو پکڑ چکے ہو۔ اس کی محرومیوں پر ضرب لگا رہے ہو' وہ ایک جذباتی' احمق لڑکی ہے۔ اپنے ماحول اور اپنے احساس کمتری سے خوف کھائی ہوئی' تم نے اپنی کمینگی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے گرد ایسی

فضا تان دی ہے جو اس کے اپنے ماحول سے ہٹ کر ہے اور وقتی خوش نما دکھائی دے رہی ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تم اس کے

سامنے وہ ظاہر ہو' جو نہیں ہو' اگر تم اپنی تمام تر ذلالت کے ساتھ اس کے سامنے کھل کر آ جائو تب دیکھوں وہ تمہیں کتنا قبول کرتی ہے' اپنے اندر کی تمام تر گندگی اس پر ظاہر کرو' پھر دیکھو وہ کیسے تمہارے منہ پر تھوکتی ہے۔"

"وائو۔" اس نے اس کی بات پر زوردار قہقہہ لگایا۔

"چچ چچ۔" یہ تو تم محض اس کی دوست ہونے کے ناطے طرف داری کر رہی ہو ورنہ کیا وہ پہلے سے مجھے جانتی نہیں تھی' میں جو ہوں جیسا تھا ہمیشہ اس کے سامنے رہا ہوں اور تم بھی تو اسے میرے خلاف بھڑکاتی رہی ہو' اپنے تہیں میری کمینگی کو ثابت کرتی رہی ہو' پھر' پھر کیوں اس نے کان اور آنکھیں بند کر لی ہیں۔" اس کا لہجہ اس کی مسکراہٹ تضحیک آمیز تھی۔ وہی تحقیر اس کی آنکھوں میں امڈ آئی تھی جو ہمیشہ تانیہ کے لئے اس نے دیکھی تھی' اس کے دل پر ضرب سی پڑی۔

’’شاید یہ عورت کی بہت بڑی خامی ہے یا خوبی کہ وہ اپنے چاہنے والے مرد کی بڑی سے بڑی خطا کو بھی معاف کر دیتی ہے اور مرد عورت کی اس خامی سے ہر دور میں فائدہ اٹھاتا رہا ہے کبھی کھوکھلے لفظوں سے' کبھی جھوٹے حیلوں بہانوں سے اسے ٹریپ کرتا رہا ہے۔‘‘ ایک افسردہ سی سانس اس کے سینے کی تہ سے خارج ہوگئی اس نے دکھ اور نفرت سے اکبر شاہ کا مسکراتا چہرہ دیکھا۔

’’تم پرلے درجے کے کم ظرف' بد باطن اور بد کردار انسان ہو' دیکھ لینا ایک دن تانیہ بھی تمہارے منہ پر تھوکے گی۔‘‘

اس نے اپنے لہجے کی تلخی کو کم کرنے کی قطعی کوشش نہیں کی اور بیگ کندھے پر ڈال کر کھڑی ہوگئی۔

’’چچ چچ... اسی دن کا تو انتظار مجھے بھی ہے مس خان مگر کہاں وہ تو میرے ایک اشارہ جنبش ابرو پر اپنا سب کچھ وار دینے کو تیار ہے۔‘‘ وہ خباثت سے ہونٹ پھیلا کر مسکرایا۔

’’بکواس مت کرو' وہ بے وقوف ضرور ہے بد کردار نہیں ہے۔ اتنا تو شاید تمہیں بھی اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔‘‘ وہ پر یقین لہجے میں بولی۔

’’اچھا تمہاری لغت میں بد کرداری کا مفہوم کیا ہے بھلا۔‘‘ اس نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا' تمسخر اس کے چہرے کے ایک ایک زاویے سے ظاہر تھا۔

’’میری لغت میں اس کا کیا مفہوم ہے تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہئے' تمہاری لغت میں البتہ ایسے الفاظ کا گزر ہی نہیں' تم کیا جانو کردار کیا ہوتا ہے اور اسے ناپنے کا پیمانہ کیا ہوتا ہے' تم سب کو اپنے جیسا ہی سمجھتے ہو' یاد رکھو محبت کرنے والی کسی پر دل وار دینے والی اور طوائف' بازاری عورت میں بہت فرق ہوتا ہے۔

افسوس کہ تم جیسا گندی نظریں اور گندے جذبات رکھنے والا محبت جیسے پاکیزہ جذبے کی حرمت کو صرف داغ دار کر سکتا ہے' سمجھ نہیں سکتا اور افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ تانیہ تم جیسے شخص سے محبت کرنے لگی ہے جس کی نظروں میں محبت ہوس کا دوسرا نام ہے۔‘‘ اس نے یاسیت سے سر ہلا کر ایک افسردہ سانس بھری۔

’’ہوس اور محبت میں بہت فرق ہے اکبر علی شاہ اتنا ہی جتنا تم میں اور تانیہ میں ہے۔

جتنا پستی اور بلندی میں ہے' جتنا تاریکی اور روشنی میں ہے۔

تم دیکھ لینا بہت جلد اسے تمہارے اندر کے میلے پن کا اندازہ ہو جائے گا۔‘‘

اکبر علی شاہ کے چہرے کے نقوش تپ گئے یقیناً یہ زبردست طمانچے تھے جو شہرینہ کھلے عام اس کے منہ پر مار رہی تھی، تاہم وہ اپنے اندر غصے کے ابال کو دباتا ہوا ہنس دیا۔

’’ہو سکتا ہے تب بہت دیر ہو چکی ہو۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ اس کا جملہ چابک کی طرح اس کی سماعت پر پڑا اور اعصاب کو جھنجھوڑ گیا۔

اکبر شاہ نے اس کے چونکنے اور وضاحت طلب نظروں پر خباثت سے مسکراتے ہوئے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

’’دیکھو، دیکھو اکبر!‘‘ وہ اپنے منتشر ہوتے اعصاب سنبھال کر وارننگ دینے والے انداز میں چلائی۔

’’اگر تم نے کسی طرح کے گھٹیا پن کا ثبوت دینے کی کوشش کی تو بہت برا ہو گا تمہارے حق میں، بہت برا ہو گا۔‘‘ اس کی آواز غصے اور انجانے خدشے سے کانپ گئی تھی مگر وہ اطمینان کے ساتھ راہداری کی دیوار سے پشت لگائے کھڑا مسکراتا رہا۔

’’ارے جاؤ یہ شرافت، محبت پر سبق پڑھانے کی بجائے، محبت اور ہوس میں یہ فرق مجھے باور کرانے کی بجائے اپنی اس پارسا نیک نام دوست کو سمجھاؤ جو مجھ سے افلاطونی محبت کر رہی ہے۔ میرے لفظوں پر ایمان لاتی ہے جسے میری آواز پھول کی طرح کھلا دیتی ہے اور میری ذرا سی ناراضگی چراغ کی طرح بجھا دیتی ہے۔ جس کے دل کی دیواروں پر میرا نام یعنی اس کمینے گھٹیا اکبر علی شاہ کا نام لکھا ہوا ہے اکبر علی شاہ کا۔‘‘

اس نے جھک کر اپنے سینے پر انگوٹھا مارا پھر دونوں ہاتھ پہلو میں گرا کر استہزائیہ انداز میں کندھے اچکائے۔

’’محبت، اونہہ وہ محبت کے اس پاکیزہ جذبے کی حرمت کو کون سے چار چاند لگا رہی ہے۔ یہ شرافت کی کون سی قسم ہے، غیر مرد سے گھنٹہ دو گھنٹہ ٹیلی فون پر باتیں کرنا، اس کے محبت بھرے جملے سن کر طمانیت محسوس کرنا، اس کے ساتھ ہوٹلوں اور پارکوں میں ملنا، اس کے گھر تک چلے جانا۔ اس کی یادوں سے راتوں کو آباد کرنا، اونہہ محبت۔‘‘ وہ یوں ہنس رہا تھا گویا تانیہ کا جی بھر کر مذاق اڑا رہا ہو۔

شہرینہ کو اپنے رخساروں پر تپش کا شدید احساس ہونے لگا۔

اس کے رخسار یوں جلنے لگے تھے جیسے وہ تانیہ کا نہیں اس کا تمسخر اڑا رہا ہو۔

اس کی تضحیک کر رہا ہو۔

"اسے میں نے نہیں میری دولت اور میرے اسٹیٹس نے مرعوب کیا ہے' اس کی کمزوریاں ظاہر تھیں تبھی میں نے گرفت کی ہے نا' اسے زبردستی پستول کی زد پر ہوٹل اور پارکوں میں تو نہیں لے جا سکتا' اسے گھر سے اغوا کر کے اپنے جذبوں کی تسکین تو نہیں کر سکتا' وہ از خود آتی ہے تو کون بے وقوف ہو گا جو بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا پسند نہیں کرے گا۔"

اس کے لہجے میں اتنی حقارت اور نفرت تھی کہ شہرینہ کو صدمے اور تاسف نے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رکھا یا پھر اس کے پاس مدافعتی جملے نہیں تھے ایک عجیب سا دکھ اس کے دل کی رگوں سے لپٹنے لگا۔ بات تانیہ کی ہو رہی تھی لیکن مجروح جیسے وہ ہوئی تھی۔

اس نے سوچا کاش کہ اس کے پاس اس وقت ٹیپ ریکارڈر کی سہولت ہوتی تو وہ اس کی یہ نفرت بھری اور کڑوی کسیلی باتیں ٹیپ کر کے تانیہ کو سناتی' اس کا اصل چہرہ دکھاتی۔

"بہر حال تم جیسے شخص کو دیکھ کر یقین ہونے لگتا ہے کہ شرم' مروت' محبت' اخلاق جیسی صفات دنیا سے اٹھ چکی ہیں۔"

وہ متاسفانہ لہجے میں بولی اور اپنا جرنل اٹھا کر بیگ سنبھالا۔ وہ یہاں مزید کھڑی رہ کر تانیہ کی ذات پر اچھلنے والی کیچڑ سے اپنے دل کو زخمی اور آلودہ نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

"تمہارے لئے میرا دل اب بھی اتنا ہی کشادہ ہے آزما کر دیکھ لو۔" وہ اس کے ساتھ ہی قدم اٹھاتا ہوا جلدی سے بولا تو اس نے سر اٹھا کر اسے آنچ دیتی نظروں سے دیکھا' پھر یہ آنچ معدوم ہو کر دوسرے پل استہزائیہ مسکراہٹ میں بدل گئی۔

"تمہارے دل کی کشادگی کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے مگر میرا مشورہ ہے اکبر علی شاہ کہ تم اب یہ کھیل بند کر دو' اپنے نفس کو قابو میں کرنا سیکھ لو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں کسی دن ایسی اندھی گہری کھائی میں گرا دے جہاں صرف پچھتاوے' تاریکی کے سوا کچھ نہ ہو تمہاری سسکیاں بھی سننے والا کوئی نہ ہو۔"

وہ اسی نفرت سے سلگتے لہجے میں بولی اور اس پر ایک تلخ نگاہ ڈال کر تیزی سے راہداری عبور کرنے لگی۔

عجیب سی آگ اندر اٹھتی' دل کو جلاتی محسوس ہو رہی تھی۔ حقارت کا احساس روح پر کچوکے لگا رہا تھا وہ لائبریری چلی آئی۔

اکبر شاہ کا یہ روپ اس کے لئے کوئی انوکھا یا حیرت انگیز نہیں تھا۔ مگر وہ جملے' وہ حقارت جو تانیہ کے لئے اس کے لہجے اور آنکھوں سے جھلکی تھی اس نے اسے گہرے رنج سے دوچار کر دیا تھا۔

کیا وہ یہ ساری باتیں تانیہ کو بتا سکے گی' سارے پتھر تانیہ پر برسا سکے گی جو اکبر شاہ نے پس پردہ اس پر برسائے تھے' نہیں ہرگز نہیں' محبت میں محبوب سے دھوکا کھانے کا احساس بہت ذلت انگیز ہوتا ہے۔ عورت خود اپنی نظروں میں گر جاتی ہے' ٹوٹ جاتی ہے' خفا ہو جاتی ہے اور وہ تانیہ کو ایسے کسی سانحے سے دوچار نہیں کر سکتی تھی۔

ایک ملول سی سانس بھر کر اس نے کرسی سے لگ کر آنکھیں بند کر لیں اور اس اذیت ناک اور دکھ دینے والے واقعے کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگی۔

X...X...X

ولید ابھی اپنے آفس کی چیئر پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ منور نے اسے فدا حسین کی آمد کی اطلاع دی' اس نے اندر بھیجنے کو کہا اور فائلیں ایک طرف رکھ کر کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہلکے ہلکے جھولنے لگا۔

چند لمحے بعد ہی فدا حسین اپنے مخصوص کڑکڑاتے شلوار سوٹ اور واسکٹ میں اندر داخل ہوا اس کے ایک ہاتھ میں رول کیا ہوا اخبار تھا اور چہرے پر عجیب حیرت' تجسس اور کچھ حواس باختگی تھی البتہ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں برقی قمقموں کی طرح چمک رہی تھیں اور ولید سے مصافحہ کرتے ہوئے اس چمک میں اضافہ ہو گیا۔

"بڑے چھپے رستم نکلے سائیں آپ تو ہمارے اتنے قریب کے عزیز رشتے دار نکلے اور ہمیں محسوس تک نہ ہوا۔" اس کے لہجے میں شکوہ نہیں تھا ایک حیرت بھری گرم جوشی تھی۔ جیسے اسے اس انکشاف نے قلبی طور پر مسرور کیا ہو۔

ولید نے ہلکی مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔

اس نے رول کیا اخبار میز پر رکھا اور کرسی بالکل قریب گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے قدرے رازدارانہ انداز میں کہنیاں میز پر ٹکا کر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"مردان علی کا انکشاف کے بعد کیا ردعمل سامنے آیا۔"

پھر ہلکی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"یہ انکشاف تو ان کے سامنے خاصا غیر متوقع اور ناقابل یقین ثابت ہوا ہوگا۔"

ولید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرا کر معدوم ہوگئی۔

فدا حسین کی آنکھوں اور ہونٹوں پر کچھ ایسی مسکراہٹ رقصاں تھی جیسے اس کے اندر پھلجھڑیوں کی بارش ہو رہی ہو۔

وہ ضرورت سے زیادہ ہی خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"انکشاف ہمیشہ ناقابل یقین اور غیر متوقع ہی ہوتے ہیں فدا صاحب!" اس نے ایک ہلکی سی سانس بھر کر کرسی سے ٹیک لگالی۔

"ہاں، ہاں بالکل۔" وہ خفیف سی ہنسی کے ساتھ خود ہی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر رول کیا اخبار کھولتے ہوئے بولا۔

"اس میں جو اسٹوری چھپی ہے، وہ اتنی ہی سچ ہے یا میرا مطلب ہے یہ کہیں ہمارے کسی منصوبے کا کوئی حصہ تو نہیں۔"

"نہیں فدا صاحب! یہ بالکل سچ ہے۔ اتنا ہی سچ، جتنا سحر کا نمودار ہونا، اور رات کا آنا۔"

اس کا لہجہ سنجیدہ اور غیر متزلزل تھا پھر اس نے غیر محسوس طور پر ایک ابرو اچکا کر فدا حسین کو دیکھا اور کرسی سمیت آگے کو جھکا۔

"منصوبہ، منصوبہ کیسا فدا صاحب جہاں تک میرا خیال ہے ہم نے تو کوئی اور کسی طرح کا منصوبہ نہیں بنا رکھا۔"

فدا حسین ایک لمحے تو سٹپٹایا مگر دوسرے پل زور سے ہنس پڑا، اس کی ہنسی میں کھساہٹ واضح تھی۔

"میرا مطلب ہے سائیں! سیاست میں تو اس طرح کی چھوٹی موٹی سازشیں، بیانات چلتے ہی رہتے ہیں سیاسی حریف کو نیچا دکھانے اور اس کے ووٹ توڑنے کے لئے۔"

"ارے نہیں فدا صاحب! میں ایسی گندی اور گھٹیا سیاست کرنے کے حق میں نہیں ہوں، جس میں آدمی کا کردار، بدصورت اور نفرت انگیز ہو کر رہ جائے اور پھر یوں بھی سیاست میرا مشن ہے، نہ منزل، میں سیدھا سادا ایک شہری ہوں۔ سیاست جیسا روگ پالنا اپنے بس کی بات نہیں ہے، فدا صاحب!" وہ فدا حسین کو دیکھ کر مسکرایا۔

"سیاست تو آپ لوگوں کا جدی پشتی پیشہ ہے اور شوق۔" اس کا لہجہ استہزائیہ سا تھا۔ مگر ادھر فدا حسین کی باچھیں کانوں تک پھیل گئیں۔

"ہاں سائیں سیاست تو ہمیں ورثے میں ملی ہے۔" پھر ولید کے چہرے پر نظر ڈال کر سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"اب دیکھیں نا' اس طرح کی سیاست نہ کریں تو مقابل پارٹی تو اوچھے ہتھکنڈوں سے باز نہیں آئے گی نا۔ اب دیکھ لیں ہمارے جلسے کو کس طرح توقیر شاہ کے آدمیوں نے ناکام بنانے کی کوشش کی غنڈہ گردی دکھائی اور سائیں آپ نے جوابی کارروائی کرنے پر روکا تو ہمیں کیا فائدہ ہوا اس کا حلیہ تو بگڑ گیا نا۔"

ولید نے اسے دیکھا' جلسے والے روز کا غصہ ابھی تک دبائے بیٹھا تھا۔ جیسے اجازت کی دیر ہو اور وہ توقیر شاہ پر چڑھ دوڑے۔

"بات یہ ہے فدا صاحب کہ میں خواہ مخواہ کے تصادم میں روپیہ اور توانائی ضائع کرنا نہیں چاہتا' جنگ ہمیشہ عقل کی لگامیں تھام کر جیتی جاتی ہے جذبات میں عقل ہار جاتی ہے۔"

"بجا فرمایا سائیں بجا فرمایا۔" وہ فوراً ہی تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔

"آپ پڑھے لکھے آدمی ہو اور ہم ٹھہرے جاہل۔ کہاں آپ کا اور میرا مقابلہ' آپ عقل والے لوگ ہم جذبات والے۔"

وہ اپنے لہجے میں خوشدلی کا تاثر لانے کی کوشش کرنے لگا مگر خوشدلی سے زیادہ اس کا انداز چاپلوسانہ تھا۔

"جہالت اور سیاست کا تو چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔" اس نے کوشش کی اس کے لہجے میں طنز کی جھلک نہ آنے پائے۔

"تاہم فدا حسین کے سر سے یہ طنز گزر گیا یا وہ نظر انداز کر گیا۔

"لگتا ہے آپ مجھے سیاست دان بنا کر چھوڑیں گے' بار بار سیاست سے منسوب کر کے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"خدا نہ کرے جو میں یہ گناہ کرنے لگا ہوں۔" ولید بے ساختہ بولا تو جواباً فدا حسین نے پہلے سے بڑا قہقہہ لگایا۔

"آپ ہیں حس مزاح کافی ہے۔ماشاءاللہ' خدانے آپ کو مکمل بنایا ہے سائیں! کبھی کبھی تو مجھے آپ کوئی بڑے سیاست دان معلوم ہوتے ہیں تو کبھی فلاسفر اور کبھی..."

"جوکر۔" اس نے شگفتگی سے فدا حسین کا جملہ پورا کیا اور قہقہہ لگایا مگر فدا حسین نے خاصی سنجیدگی سے سر نفی میں ہلایا۔"

"نہ سائیں نہ آپ کے مذاق میں بڑی گہرائی اور شائستگی ہوتی ہے۔یقین کریں اگر میں عورت ہوتا تو آپ پر مرمٹا ہوتا۔

اس کھلی تعریف اور انداز پر ولید بے ساختہ سکول بوائے کی طرح جھینپ کر رہ گیا۔

تاہم ایک پل کے لئے اس نے لرز کر سوچا۔'خیریت ہوئی کہ فدا حسین عورت نہیں تھی ورنہ جو گلے پڑ جاتی تو۔' یہ سوچ ہی بدن کو لرزانے کو کافی تھی۔

"باتیں تو ہوتی رہیں گی' پہلے یہ بتائیے آپ کیا پیئیں گے۔" اس نے انٹر کام کے بزر پر ہاتھ رکھا۔

"نہ سائیں' یہاں کچھ نہیں۔" فدا حسین نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"کھائیں گے بھی پیئیں گے بھی ضرور مگر یہاں نہیں کسی اچھی اور پرسکون جگہ پر اور باتیں بھی بہت سی کرنی ہیں مجھے آپ سے۔" پھر اس کے کچھ بولنے سے پہلے وہ بول اٹھا۔

"نہ سائیں انکار نہیں چلے گا' آج میں بہت سا وقت نکال کر آیا ہوں آپ سے ڈھیر ساری باتیں کرنے اور آپ کو بھی وقت نکالنا ہوگا' ہاں نہیں تو۔" اسکے انداز میں لاڈ سا تھا ولید نے چونک کر اس کا جائزہ لیا پھر کندھے اچکا دیئے۔

"آج تو واقعی آپ ترنگ میں نظر آرہے ہیں خدا خیر کرے۔" پھر چابی اٹھائی اور ساتھ ہی اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے بولا۔

"چلیں پھر آج گپ شپ ہو ہی جائے۔" اسے اٹھتے دیکھ کر فدا حسین بھی جھٹ سے کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا' اس کے چہرے پر ایک انوکھی مسرت تھی۔اسے شاید ولید کے اتنی جلدی راضی ہو جانے اور اس کے ہمراہ چل دینے کی توقع نہیں تھی پھر وہ دروازے سے نکلتے ہی بولا۔

"کہاں جایا جائے' ہمارے غریب خانے یا کسی ہوٹل میں۔"

"اب غریب خانہ تو نہ کہیں' اتنی بڑی کوٹھی کو فدا صاحب۔"

اس نے سرزنش کرنے کے انداز میں فدا حسین کی طرف دیکھا تو اس بات پر اس نے ایک طویل قسم کی ٹھنڈی سانس بھری۔

"چھوڑیں سائیں! یہ آپ کو اتنی بڑی کوٹھی نظر آتی ہے۔ چند ہزار گز پر پھیلی کوٹھی بھی کوئی کوٹھی ہوئی' یہاں تو ہم سے چھوٹے چھوٹے زمیندار بھی چھوٹی موٹی وزارت مل جانے کے بعد ایک چھوڑ دس کوٹھیاں بنا لیتے ہیں ہم نے تو یہاں بھاڑ ہی جھونکے ہیں' چلیں چھوڑیں یہ بتائیں کدھر جایا جائے۔"

"میرا خیال ہے کسی ہوٹل میں زیادہ مناسب رہے گا۔" اس نے یہ کہہ کر گویا فدا حسین کے دل کی بات کر دی' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے' کسی ہوٹل میں زیادہ کھل کر باتیں ہو سکتی ہیں' گھر میں تو بیوی نما چیز ہر وقت سر پر سوار رہتی ہے۔ سو باتیں کرنی ہوں ہمیں' اسے بتانے کی نہ بتانے کی۔"

"کیوں! آپ کی بیگم تو آپ کی مکمل ہمنوا ہے اور اپنے میکے سے بدگمان بھی' پھر آپ کو اس کی طرف سے کیا خطرہ ہے۔"

ولید نے گلاس ڈور کو دھکیلتے ہوئے پہلے اسے باہر نکلنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"بس سائیں! بڑی مشکلوں سے ہمنوا کیا ہے' پھر بھی عورت ذات کا کیا بھروسہ' پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں نہ بتانے کی بات بھی باتوں میں کر جاتی ہیں اور بے ضرر باتیں سنبھالے پھرتی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ بھونڈے انداز میں ہنسنے لگا جبکہ ولید لفٹ کا بٹن پش کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ فدا حسین جتنا احمق نظر آتا ہے بہر حال اتنا تھا نہیں اور وہ یہ بھی اچھی طرح جان گیا تھا کہ فدا حسین کا اس کو کسی ہوٹل میں لے جا کر ہلکی پھلکی باتوں کا مقصد محض اس کے ماضی کے حوالے کی کرید تھی اور اس کے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں جاننا تھا۔

فدا حسین کی غیر معمولی حیرت کا اظہار اس بات کی ترجمانی کر رہا تھا کہ ولید کا ماضی اور اس کی مردان علی شاہ سے ذاتی کشیدگی' مسرت انگیز اور طمانیت انگیز بات تھی۔

X...X...X

نومی نے احتیاط سے اپنے کپڑوں کی الماری سے موبائل نکال کر ٹرائوزر کی جیب میں ڈالا اور کمرے سے نکل کر سب سے نظریں بچا کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا چھت پر آ گیا اور کبوتروں کے پنجرے کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل جیب سے نکال کر یاسر کے نمبر پش کرنے لگا۔

یہ موبائل یاسر کا ہی بخشا ہوا تھا جسے وہ گھر والوں سے چھپا کر رکھتا تھا۔ ماں تو یوں بھی اس کی ہر عیاشی سے چڑنے لگی تھیں موٹر سائیکل پر پہلے ہی وہ برافروختہ ہوئی تھیں ان کے خیال میں یہ ساری حرام کی کمائی کی چیزیں ہیں جو ان کے گھر کے صاف ستھرے ماحول کو آلودہ کرتی ہیں۔

یاسر کی آواز سنائی دی تو وہ سنبھل گیا۔

"میں نومی بول رہا ہوں یاسر!"

"ہاں تو بولو نا' تمہیں بولنے سے کون روک رہا ہے۔" یاسر کے لہجے میں جھاڑ تھی جس کا مطلب تھا وہ بے وقت ڈسٹرب کیا گیا تھا۔ نومی اس کی آواز سے جھلکی بے زاری پر سٹپٹا گیا۔

"سوری میں تمہیں ڈسٹرب کر رہا ہوں۔"

اب تو کر ہی چکے ہو' خیر بولو کیا بات ہے؟ کیا افتاد آ پڑی جو تمہیں بھری دوپہر میں بھی چین نہیں پڑ رہا ہے۔"

"وہ پوچھنا تھا کہ عظمیٰ کا کیا ہوا؟" وہ اس جھاڑ پر دب کر منمنایا۔

"ہاں یاد ہے مجھے وہ کام' مگر دو دن سے وہ کالج ہی نہیں آ رہی ہے۔"

"کالج نہیں آ رہی' مگر کیوں؟۔" وہ بے ساختہ بولا پھر کھسیا کر بولا۔

"میرا مطلب ہے کہ کالج تو کھلے ہوئے ہیں' کہیں کہیں اسے شک تو نہیں ہو گیا کہ تم میرا مطلب ہے کہ ہم۔"

"نومی' نومی!" یاسر نے جیسے چڑ کر گہری سانس بھری۔

"تم پہلے ہی کم گھامڑ اور گھاس چرے تھے' اس عشق نے تو تمہیں بالکل ہی عقل سے پیدل کر کے رکھ دیا ہے۔

ابے مجنوں کی اولاد! فرہاد کے بھتیجے! کیا تم نے جا کر اسے بتا دیا ہے کہ ہم تمہیں اغوا کر رہے ہیں؟ اسے شک تو نہیں ہو گیا۔

بے وقوف کس طرح ہونے لگا شک' اسے کوئی الہام ہوگا' فرشتے آکر یہ خبر دے جائیں گے۔"

"اچھا نا آب مجھے اتناڈی گریڈ تو مت کرو۔" وہ مارے خجالت کے روہانسا ہو گیا۔

"تو کچھ عقل بھی استعمال کر لیا کرو مجھے تو ڈر لگتا ہے کہیں تم سے ہی اسے خبر نہ پہنچ جائے تم ہی کوئی گڑ بڑ نہ کر دو۔"

"خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔اتنا احمق بھی نہیں ہوں۔" وہ کمسن بچے کی طرح بلبلایا اور خفگی سے لب بھینچ کر یاسر کو دل ہی دل میں موٹی سی گالی دی۔

"اچھا سنو! میں نے دو لڑکوں کو اس کام پر لگا رکھا ہے وہ روز ہی کالج کے باہر کھڑے رہتے ہیں اب دیکھو اگر کل وہ آئی تو پھر ہمارے دام سے ہر گز نہیں بچے گی۔"

"کل۔" نومی نے موبائل کو گھورا اسے اپنے بدن میں جھر جھری سی محسوس ہوئی پھر اس نے جیسے تھوک نگلا۔

"دیکھو یاسر! احتیاط کرنا' میرا مطلب ہے میرا کہیں بھی نام نہ آئے اور دوسرا اسے عزت و احترام سے اغواء کرنا۔وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہے۔" وہ ہلکے سے بولا' جواباً یاسر نے ایسا قہقہہ لگایا کہ وہ خواہ مخواہ میں جھینپ گیا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے میں نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا۔"

"اس سے بڑا لطیفہ اور کیا ہو گا نومی شہزادے! کہ اغوا اور وہ بھی عزت و احترام سے' ہاہاہا اغواء کے بعد اس کی عزت اور احترام میں خود بخود اضافہ ہو جائے گا۔تم ناحق پریشان ہو رہے ہو۔" وہ پھر بھونڈے انداز میں قہقہے لگانے لگا' نومی کو اپنے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔

"احمق لڑکے! اس کی عزت اور توقیر پر بٹہ لگے گا۔اس کے باپ کو جھٹکا لگے گا' اٹھی ہوئی گردن مرے ہوئے پرندے کی طرح کھٹ سے ڈھلکے گی۔ تبھی تو تمہاری عشق کی منزل آسان ہو گی' تمہارا یہ گوہر مقصود تمہاری جھولی میں گرے گا۔"

اب کے یاسر اپنے قہقہے اور ہنسی کو سمیٹ کر قدرے سمجھانے والے انداز میں بولا مگر نومی نے کوئی جواب نہیں دیا اسے اپنا دل ایک عجیب سی اتھاہ میں ڈوبتا ابھرتا محسوس ہوا تھا۔

اچانک اسے پڑوس کی چھت پر آہٹ کا احساس ہوا تو اس نے خدا حافظ کہہ کر موبائل بند کر دیا اور جھٹ سے جیب میں اڑس لیا پھر کچھ دیر چھت پر ٹہلتا رہا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ یوں بھری دوپہر میں اس کا چھت پر ٹہلنا خواہ مخواہ میں اسے لوگوں کی نظروں کو مشکوک کر سکتا تھا۔ یوں بھی اس کا دل خوف سے بھرا ہوا تھا۔ خوف کا آکٹوپس اسے جکڑے ہوئے تھا ہر آہٹ پر گمان ہوتا کچھ ہونے والا ہے' کچھ ہو گیا ہے۔ یکدم اس کا ذہن عظمیٰ کی طرف چلا گیا اسکے ساتھ ہی اسے آہو چشم لڑکی کو ایک نظر دیکھنے کو دل مچل اٹھا۔

کتنے دنوں سے وہ اس کی ایک جھلک تک نہ دیکھ سکا تھا اسے لگتا۔ دانستہ وہ اس سے چھپتی پھرتی ہے یا پھر اس کی لگن میں ہی کہیں کوئی کھوٹ رہ گئی ہے۔ اس کا دل اچانک ہی ہجر و فراق کی تپش سے سلگنے لگا اور جب کوئی چیز سلگتی ہے تو بے اندازہ تپش ڈھاتی ہے' اس پر ٹھنڈے چھینٹے مارنے سے ہی آرام ملتا ہے۔ اس نے بھی عظمیٰ کے دیدار کی پھوار سے اس تپش کو کم کرنے کے لئے کوچہ جاناں کی طرف جانے کا سوچا اور اس سوچ کے ساتھ ہی بڑی تیزی سے زینے اترنے لگا۔ سامنے ہی اماں تخت پر بیٹھیں آلو چھیل رہی تھیں۔ اس کا ارادہ تھا نظر بچا کر گزر جائے مگر ان سے نگاہیں چار ہوئیں تو سلام کرتے ہی بولا۔

”میں ذرا جا رہا ہوں اماں!“

”صبح سے تم گھر پر ہو مگر اتنا نہیں ہوا کہ دو گھڑی ماں کے پاس بیٹھ جاتے۔“ اماں نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ادھر آ کر بیٹھو' بہن کی شادی سر پر ہے مگر تمہیں خبر ہے کچھ کتنا عرصہ رہتا ہے۔“

”اوہو اماں! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے سب خبر ہے مجھے۔“ وہ جھنجھلایا سا مارے بندھے موڑھا کھینچ کر بیٹھ گیا۔ دل تھا کہ کبوتر کی طرح سینے کے پنجرے میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ ایک لمبی اڑان کے لئے۔

”چلو اچھی خبر ہے کہ تمہیں بھی خبر ہے۔“ اماں کا انداز ابھی تک خفگی بھرا تھا وہ کچھ کھسیا گیا۔

”کبھی تم سے اتنا نہیں ہوا کہ آ کر اتنا ہی پوچھ لو کہ اماں کچھ کام ہے میرے لائق۔ ایک بیچارا سکندر ہی ادھر ادھر دوڑتا پھرتا ہے تھک کر آتا ہے تو وہ دوسرے بکھرے کام نمٹانے لگتا ہے مگر تم سے ہل کر ایک کام نہیں ہوتا۔“

''بس کریں اماں' اب یہ بھی تھک کر ہی تو آتا ہے۔'' نادیہ آپی کچن سے گوشت بھون کر باہر نکلیں اور اماں کو ٹوکا۔

''تم چپ کرو زیادہ اس کی حمایت نہ کرو' یہ سر پر چڑھا ہوا ہے۔'' اماں کو نادیہ آپی کی مداخلت سخت ناگوار گزری پھر انہوں نے نومی کی طرف دیکھا جو بائیک کی چابی ہتھیلی پر رگڑ رہا تھا۔

''نادیہ کے فرنیچر کا آرڈر دے رکھا ہے جا کر تم ایک نظر ڈال آئو' کام شروع ہو گیا ہے کہ نہیں؟ نادیہ اسے فخر احمد کی دکان کا کارڈ دے دو۔''

''فخر احمد سے بنوا رہی ہیں۔'' وہ چونکا پھر منہ بنا کر بولا۔

''اتنا کھڑاک پالنے کی کیا ضرورت تھی' ریڈی میڈ لیتیں اماں! نرسری میں ایک سے ایک مل جاتے ہیں۔'' پھر نظریں اٹھا کر اماں کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے ہلکے سے بولا۔

''آپ کہیں تو میرے دوست کے باپ کی نرسری میں دکان ہے وہاں سے آپی کے لئے میں فرنیچر بنوا دوں۔''

جواباً اماں نے ایسی ترش نظروں سے گھورا کہ وہ جلدی سے نظریں چرا گیا۔تب اماں نے ایک متاسفانہ سانس بھری۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے نادیہ اپنی پسند کا بنوا رہی ہے اور ہم اپنی بساط کے مطابق ہی بنوائیں گے لاکھوں کے فرنیچر کی نہ ہماری حیثیت ہے نہ خواہش۔نادیہ تمہیں کارڈ لا کر دیتی ہے جا کر پہلا کام یہی کرو۔'' وہ کہہ کر دوبارہ آلو چھیلنے لگیں اور ساتھ ہی بڑبڑانے لگیں۔

''تم سے تو اچھا یہ ولید ہے۔بیسیوں بار فون کر کے پوچھتا رہتا ہے خیر خیریت' تم تو اپنے ہو کر بھی غیر سے زیادہ ہو۔''

آج وہ خلاف عادت اماں کا غصہ شربت کی طرح پی رہا تھا۔ولید کے نام پر اس نے تجسس سے بھنویں اچکا کر ماں کو دیکھا۔

''ولید بھائی بھی آج کل خوب اخبارات کی زینت بن رہے ہیں۔ویسے ان کی زندگی نے کچھ ڈرامائی موڑ نہیں لیا ہے اماں۔''

پھر کمرے سے کارڈ لئے باہر آتی نادیہ کو دیکھ کر مسکرایا۔

"کیوں آپی! ویسے انہوں نے آج تک بھنک نہ پڑنے دی کہ وہ مردان علی شاہ کے بھتیجے ہیں' کماں ہے سکندر بھائی کو بھی کچھ نہیں بتایا کبھی۔"

"ہاں ہے تو حیرت کی بات' اور واقعی ڈرامائی موڑ لیا ہے ان کی زندگی نے' میں تو ان کی اسٹوری پڑھ کر دنگ رہ گئی' اب ولید بھائی ذرا آ کر منہ دکھائیں تو بات ہو گی۔"

"ارے کیوں تمہیں کسی کی ذاتی زندگی میں دخل دینا ہے۔نہ بتانا مناسب سمجھا ہو گا تو نہ بتایا تھا اب بہتر سمجھا تو بتا دیا' تم بھی اخبار والوں کی طرح پوری کھوجی بن جاتی ہو۔" اماں نے نادیہ آپی کو ڈپٹا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"آخر صحافی کی بہن ہوں' کچھ اثر تو آئے گا نا اماں!" انہوں نے نومی کو کارڈ پکڑایا اور تخت سے چھیلے ہوئے آلو اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔

اماں تخت سے اتر کر ہاتھ دھونے چل دیں۔

"اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہونا اور اب ایک سیاستدان' زمیندار کا بھتیجا ہونا کوئی معمولی بات تو نہیں ہے واہ کیا قسمت ہے' کاش ان کی جگہ میں ہوتا۔"

نومی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کھڑا ہو گیا۔پھر اماں کی گرم نظروں سے جلدی سے نظریں جھکا کر کچن کی طرف مسکراتیں نادیہ آپی کو دیکھا اور مسکراہٹ دبا کر آنکھ دبائی اور اماں کی بڑبڑاہٹ دوبارہ شروع ہوئی وہ جھپاک سے باہر نکل گیا۔

X...X...X

وہ بائیک احتیاط سے دھیمی رفتار سے چلاتا ہوا گلی پار کر کے عظمیٰ کے گھر کی پچھلی دیوار کی طرف آ گیا جس کی جانب اس کے گھر کا صحن تھا۔وہ امید کے دریا میں بہتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا کہ "ضرور آج تو دیدار ہو گا۔" اب اس کی لگن سچی تھی یا اتفاق تھا عظمیٰ صحن دھو کر پائپ پکڑے اپنے گھر کی باہر کی دیوار کے ساتھ بنی کیاری میں لگے پودوں میں پانی ڈال رہی تھی۔بڑا سا دوپٹہ شانے پر پھیلائے وہ گلی میں سناٹا ہونے کی وجہ سے کسی حد تک اطمینان اور بے فکری سے اپنا کام کر رہی تھی۔

نومی کے اندر' باہر خوشی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ وہ شوق کی لہر میں بہتا بائیک آگے لے آیا' گویا کہ بظاہر اس کے درمیان مختصر سا فاصلہ تھا لیکن یہ صدیوں کا فاصلہ تھا جسے محض محبت کے زور پر پاٹا نہیں جا سکتا تھا۔ ایک پل کے لئے اس خیال نے اس کے دل پر ضرب ماری اور یہ خواہش ابھاری کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بائیک میں بٹھا کر یہاں سے بھاگ جائے' مگر یہ خواہش لہر کی طرح ابھر کر اندر ہی اندر دم توڑ گئی۔

"تم؟" وہ اسے دیکھ کر یکایک ہلکی سی آہٹ پر بدک جانے والی ہرنی نظر آنے لگی۔

"عظمیٰ!" وہ تھوک نگل کر جلدی سے بیتابانہ لہجے میں بولا۔ مگر اسے اپنی آواز بھنچی بھنچی سی معلوم ہوئی تاہم چہرے اور آنکھوں میں بے تابیاں' وارفتگیاں سمٹ آئیں اور یہی رنگ عظمیٰ کو خوفزدہ کرنے کو کافی تھے۔

"کیا بات ہے آپ کیوں تنگ کرتے ہیں۔" وہ بدک کر گھر کی دہلیز کی ایک زینہ اوپر چڑھ گئی' اس پر گھبراہٹ نے اچانک ہی حملہ کر دیا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اس سے پہلے کبھی تنگ کیا ہے۔" وہ بائیک اور ذرا آگے لے آیا' اور قدرے ناراضگی کے ساتھ بولا۔ مگر اسے اس کی ناراضگی کی رتی بھر پرواہ نہیں تھی' اس نے گلی میں نظریں دوڑا کر پھر اس کی طرف دیکھا۔

"اگر نہیں کیا تو اب کیوں کرنے آگئے ہیں' یہ جانتے ہیں کہ میرا اور آپ کا تعلق کوئی نہیں رہا۔" وہ روانی میں بولی مگر اس کا لہجہ خوف میں لپٹا ہوا تھا۔ کسی کے دیکھ لئے جانے کے خوف کے ہمراہ نومی کی اس حرکت پر بھی وہ خائف تھی۔

نومی نے سوچا کہ وہ اسے دیکھ کر اپنے دل کی تمام بے تابیاں عیاں کر دے گا۔ وہ اسے کتنا چاہنے لگا ہے اور پانے کے لئے کس قدر بے چین ہے بتائے گا' مگر اس کے اس جملے نے اس کے دل پر ایسی ضرب ماری کہ وہ کراہ کر رہ گیا۔

"تمہارا اور میرا تعلق اب بھی ہے' عظمیٰ میں بڑوں کو نہیں مانتا' ہمارا تعلق دل سے ہے اور جب دل فیصلے کر لیتے ہیں تو کوئی دیوار نہیں رہتی۔" اس نے دیکھی ہوئی فلم کے ڈائیلاگ بالکل فلمی ہیرو کی طرح ہی بولے اور بائیک سے نیچے اترا۔

مگر سامنے فلمی ہیروئن نہیں ایک باحیا' شریف گھرانے کی لڑکی کھڑی تھی جو ان جملوں پر حیا سے زیادہ خوف سے کٹ رہی تھی کہ کہیں عزت کے شفاف دامن پر میلا چھینٹا نہ پڑ جائے اور نہ ہی اسے نومی سے کوئی قلبی لگاؤ تھا۔ وہ ماں باپ کے فیصلے پر سر جھکانے والی لڑکی تھی۔

”میرا آپ سے کوئی دلی تعلق نہیں ہے' نعمان صاحب! ہمارا رشتہ بزرگوں نے جوڑا تھا اور انہوں نے ختم بھی کر دیا تو اس میں ہی بہتری ہو گی' برائے مہربانی آپ مجھے یوں تنگ کرنے کی کوشش مت کریں۔“ وہ اپنے اعتماد کو سنبھالتی ہوئی دوٹوک لہجے میں بولی اور گھر کے اندر جا کر دروازہ بند کر دیا۔

وہ پہلے ہکا بکا رہ گیا' وہ تو عظمیٰ کو محبت کا دانہ ڈالنے آیا تھا مگر وہ پر سمیٹ کر اس دانے کو قابل اعتنا نہ جان کر پھر سے اڑ گئی' اس کی شریانوں میں خون ابلنے لگا۔

”تم' تم سمجھتی کیا ہو اور تمہارے بزرگوں کی تو ایسی کی تیسی۔“ اس نے غصے سے بھری نظر بند دروازہ پر ڈالی۔

”دیکھتا ہوں میں بھی کیسے تمہارے بزرگ میرے آگے ناک کان رگڑتے ہیں اور تم' تم کس طرح میری جھولی میں گرتی ہو۔“ وہ سخت غصے کے عالم میں بائیک پر بیٹھا اور عظمیٰ کے بارے میں سخت انداز میں سوچتا ہوا گلی سے نکل آیا۔

اب اسے پانے کی ضد اور شدت سے اس کے اندر بھڑکنے لگی۔ اسے یاد آیا ایک فلم میں اسی طرح ہیرو نے ہیروئن کو اغوا کروایا تھا اور پھر ہیروئن کی آخر اکڑ ٹوٹ گئی تھی اور وہ ہیرو کی محبت کے آگے سر بسجود ہو گئی تھی۔ یقیناً عظمیٰ بھی ایک دن اس کی محبت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گی۔

X...X...X

فدا حسین کی پجیرو پوری شان سے پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی ساتھ ہی اس کا باڈی گارڈ بندوق کندھے پر لٹکائے مستعد کھڑا تھا۔ ولید حسن کے ساتھ فدا حسین کو پارکنگ لاٹ میں آتے دیکھ کر تابعدارانہ انداز میں جھٹ سے فدا حسین کے ساتھ جڑ گیا۔

"میرا خیال ہے فدا صاحب! آپ کی پجیرو کا لطف کسی اور دن اٹھائیں گے' اس وقت میری غریبانہ' شریفانہ سی گاڑی کے مزے لیں آپ بھی۔" ولید نے اپنی گاڑی کی طرف رخ کیا۔

"خوب سائیں! آپ بھی کسر نفسی سے کام لیتے ہیں' ایسی غریبانہ گاڑیاں تو کم کم ہی کسی کے پاس ہوتی ہیں۔"

فدا حسین نے اس کی نئے ماڈل کی لمبی لمبی سی چمکتی گاڑی کو دیکھ کر اس کے جملے پر محفوظ ہو کر قہقہہ لگایا۔

"آپ کی پجیرو کے سامنے تو یہ غریبانہ ہی ہوئی نا۔"

"ارے چھوڑیں سائیں! ہم تو دکھاوے کے امیر رہ گئے ہیں۔" اس نے کچھ اس طرح کہا کہ ولید نے جھک کر گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے بے اختیار ایک متاسفانہ سانس بھری۔

"اس کا مطلب ہے آپ خاصے ناشکرے ہیں فدا صاحب!" اس کی اس سانس اور جملے نے ایک پل کے لئے فدا حسین کو کھسیا ڈالا دوسرے پل وہ زور سے ہنسا۔

"آپ مذاق اچھا کر لیتے ہیں۔"

"مذاق؟" اس نے حیرت سے بھنویں اچکائیں پھر سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں میں مذاق بالکل نہیں کر رہا ہوں۔ہاں نصیحت اچھی کر لیتا ہوں۔"

فدا حسین کی کھسیاہٹ واضح طور پر محسوس کر لی تھی اور دل ہی دل میں لطف بھی اٹھایا تھا۔ اس جملے پر بھی فدا حسین کا چہرہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔شاید اس طرح کے جملے سے اس کا واسطہ پہلی بار پڑا تھا اور اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا کیا ردعمل ہونا چاہئے۔چونکہ اس کے سامنے اس کا کوئی غلام ٹائپ کا ملازم نہیں کھڑا تھا' اس کا لنگوٹیا یار بہرحال وہ اپنی کھسیاہٹ ہلکی ہنسی اور ہلکی کھانسی میں چھپا کر اپنے ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوا جو گاڑی کا دروازہ کھولے اس کی طرف سے حکم کا منتظر تھا۔

"ڈنو' تم ایسا کرو بابا کہ' گاڑی گھر لے جائو' ولید صاحب کے ساتھ جاتا ہوں۔ہاں حق نواز تم ہمارے ساتھ چلو۔" اس نے دوسرا حکم اپنے مسٹنڈے باڈی گارڈ کو سنایا مگر ولید نے اسے باڈی گارڈ کو ساتھ رکھنے سے روک دیا۔

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں بھی مجھے اس طرح کے حفاظتی ٹولوں سے وحشت سی ہوتی ہے' ان لوگوں کی موجودگی میں خود کو بے حد ڈسٹرب اور بے آرام محسوس کرتا ہوں۔"

وہ گاڑی میں بیٹھ گیا جبکہ فدا حسین کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا پھر سر کے اشارے سے اپنے باڈی گارڈ کو واپس جانے کا کہہ کر ولید کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا' مگر اس کی ساری طراری اور شگفتگی گم ہو گئی تھی۔ شاید وہ باڈی گارڈ کے بغیر پہلی بار سفر کر رہا تھا اور خود کو یقیناً غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔

پارکنگ لاٹ سے گاڑی رینگتی ہوئی نکلی تو اس نے پہلو بدل کر ولید کی طرف دیکھا جو طمانیت کے ساتھ ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ تاہم فدا حسین کی طرف سے غافل نہیں تھا جو اضطرابی انداز میں سگریٹ سلگاتے ہوئے کچھ کہنا چاہ رہا تھا' تب بولا۔

"آپ برا مت مانئے گا فدا صاحب! در اصل میں خود کو اس طرح کے بہلاووں سے نہیں بہلا سکتا' یہ بھلا ہم جیسے انسان ہمارا تحفظ کیا کر سکتے ہیں' یہ تو خود اپنی حفاظت کی ضمانت

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

نہیں دے سکتے۔" اس نے ایک نظر فدا حسین پر ڈالی پھر مزید اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے نصیب کی گولی ان کے جسم میں اتر جائے گی' ہماری قسمت کا حادثہ اپنے نصیب میں لکھوالیں گے' خیر۔" اس نے ایک ہلکی سی سانس بھر کر رخ موڑا تو اسے اچھا خاصا ذہنی دھچکا لگا۔ فدا حسین حد سے زیادہ بے آرام دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بالکل گم صم ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ولید کو پہلی بار ادراک ہوا کہ باڈی گارڈ کے جلو میں گھومنے والے کس قدر ذہنی طور پر ہی نہیں جسمانی طور پر کمزور ہو جاتے ہیں کہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کے جسمانی سہارے سے خود کو مضبوط اور محفوظ سمجھتے ہیں۔

"خیر اپنی اپنی سوچ کی بات ہے' میں تو محض اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا۔ تسلی اور تشفی کے لئے انسان اگر کچھ اس طرح کے انتظامات کرے تو یہ کوئی ایسی معیوب بات بھی نہیں ہے۔"

اسے فدا حسین کے چہرے کی طرف دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی مگر وہ ملائمت سے بولا تھا۔ فدا حسین نے اس کی طرف دیکھا اور کھوکھلی ہنسی ہنس دیا۔

”یقیناسائیں! آپ کی باتیں بجاہیں مگر میں عادتاًانہیں لے کر نکلتا ہوں۔اب دیکھیں ناسائیں‘ اس طرح کسی کی روزی بن جاتی ہے تو یہ نیکی کا کام ہوانا۔“

وہ اب واقعی سنبھل چکا تھااور اپنی کمزوری کا جواز پیش کیا‘ ولید زیرلب مسکرادیا۔

”بالکل‘ بالکل آخر انہیں ہمارے سروں پر مسلسل مسلط رہنے کا اجر تو ملنا ہی چاہئے نا۔“ بے ساختہ ہی ایک ہلکی سانس اس کے لبوں سے نکل گئی پھر سر جھٹکتے ہوئے بولا۔

”چھوڑیں یہ بتایئے کہاں جانا چاہئے جہاں آپ مجھ سے ڈھیر ساری باتیں کر سکیں۔“ اس نے گاڑی کو ایک موڑ دے کر شفاف سڑک پر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

وہ اس وقت کلفٹن کے روڈ سے گزر رہے تھے جو دوطرفہ سڑک تھی ایک طرف جانے والا اور دوسری طرف آنے والا ٹریفک رواں تھا۔تاہم ٹریفک یہاں معمول کے مطابق کم تھا‘ فدا حسین اپنے مطلوبہ ریسٹورنٹ کا نام بتا کر اس ریسٹورنٹ کے مالک کے متعلق باتیں کرنے لگا۔جو بقول اس کے اس کا دیرینہ یار تھا‘ وہ سکول میں ساتھ ہی پڑھتے تھے مگر کالج کا ذکر فدا حسین نے نہیں کیا‘ شاید کالج میں وہ اس کا ساتھ نہیں دے سکا تھا۔وہ دلچسپی سے فدا حسین کی باتیں سنتے سنتے یکدم اس کی طرف سے غافل ہو گیا اسے اچانک مگر کسی حد تک

تاخیر سے احساس ہوا کہ اس کی گاڑی کا تعاقب کیا جا رہا تھا وہ ایک موٹر سائیکل تھی جو مسلسل اس کا پیچھا کر رہی تھی یہ موٹر سائیکل اس نے اپنے آفس کے موٹر وے سے نکلتے وقت بھی دیکھی تھی مگر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔پھر وہ شاید ٹریفک کے سیلاب میں گم ہو گئی تھی اور اب پھر نظر آنے لگی تھی۔

اس نے عقب نما آئینے میں بغور دیکھا اور گاڑی دوسری طرف کی سڑک پر لانے کا سوچا۔مگر سڑک سے دوسری طرف گاڑی موڑنے کے لئے کافی دور تک بیچ میں کہیں بھی راستہ نہیں تھا‘ اچانک فدا حسین بولا۔

”ارے رے گاڑی روکئے وہ ریسٹورنٹ تو پیچھے رہ گیا۔“

”اسے پیچھے ہی رہنے دیجئے فدا صاحب!“ وہ ہلکی سراسرتی آواز میں بولا۔

”ہمارا تعاقب ہو رہا ہے موٹر سائیکل پر۔“

”کیا آ۔“ فدا حسین یوں اچھلا جیسے اس کی سیٹ کے نیچے اسپرنگ لگے ہوں اور ولید نے کسی آٹومیٹک بٹن سے دبایا ہو۔

"تت، تعاقب۔" اس نے گردن موڑ کر ادھر ادھر دیکھا اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا' سگریٹ اس کی انگلیوں سے چھوٹ کر اس کی گود میں گرا جسے گھبرا کر اس نے جلدی سے اٹھا کر باہر پھینکا پھر دوبارہ شیشہ چڑھانے لگا مگر ولید کی توجہ فدا حسین کی گھبراہٹ پر نہیں بلکہ تعاقب کرتی موٹر سائیکل پر تھی جس پر دو سوار تھے پیچھے بیٹھا ہوا لڑکا جینز کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔اس گرم موسم میں جیکٹ پہننے کی کوئی تک نہیں تھی' مگر اس نے اس کے اندر یقیناً وہ آتشیں کھلونا چھپا رکھا تھا' اس نے عقبی آئینے میں اسے جیکٹ کی زپ کھولتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"مگر پتہ بھی تو چلے کہ آخر ہمارا تعاقب کیوں ہو رہا ہے' کیا چاہتے ہیں یہ لوگ اور کون کر رہا ہے تعاقب؟" فدا حسین بری طرح لرز رہا تھا۔اس نے بھی موٹر سائیکل سوار دیکھ لئے تھے جو زیادہ دور نہیں تھے اور اس انداز سے موٹر سائیکل بھگا رہے تھے کہ ان کا اور گاڑی کا درمیانی فاصلہ ایک حساب سے محدود رہے' ولید اگر فدا حسین کے اس بے ربط اور بے اندازہ سوالات کے۔جوابات دینے لگتا تو اس کی توجہ بٹ سکتی تھی اور اس معمولی لغزش کا موٹر سائیکل سوار عمدگی سے فائدہ اٹھا لیتے جو کسی صورت ولید کو گوارا نہیں تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ لوگ گاڑی چھیننے یا لوٹنے کی نیت سے نہیں پیچھا کر رہے تھے۔بات اس سے بڑھ کر تھی' اگر یہی مقصد ان کا ہوتا تو آفس کی بلڈنگ کے پارکنگ لاٹ سے نکلتے ہی وہ انہیں گھیر لیتے اور اپنا مقصد باآسانی پورا کر لیتے۔اس نے سائیڈ مرر سے دیکھا موٹر سائیکل اور گاڑی کا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا' ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی بلکہ ولید کو تو ایسے لگا تھا جیسے سڑک یکدم خالی ہو گئی ہو۔

ولید کو ان کے موٹر سائیکل چلانے کے اسٹائل سے لگتا تھا وہ محض چور اچکے نہیں تھے بلکہ اچھے خاصے ماہر قسم کے لڑکے لگ رہے تھے اور ان کے تعاقب کے انداز سے یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ وہ کسی طرح اپنی موٹر سائیکل ولید کی گاڑی سے آگے لا کر عین گاڑی کے دائیں یا بائیں طرف ترچھی کر کے فائر کرنا چاہ رہے تھے تاکہ نشانہ خطا نہ ہو۔

"فدا حسین!" اس نے اچانک خفیف سی چیخ کے انداز میں بس اتنا کہا۔

"اپنا موبائل نکال لئے!" اس نے موٹر سائیکل سوار کو جیکٹ سے گن باہر نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر اپنے حواس کو کسی طور منتشر نہ ہونے دیا۔اس کا خیال تھا اگر حواس ایک لمحے کے لئے بھی معطل ہوئے تو وہ لمحہ اس کی اور فدا حسین کی موت کا لمحہ ثابت ہو گا اور وہ دونوں کار

میں بیٹھے بیٹھے کیڑے مکوڑے کی طرح مارے جائیں گے' یہاں تو ایک سیکنڈ کے فرق سے بازی پلٹ سکتی تھی۔

فدا حسین تو شاید ابھی سے خود کو نیم مردہ کبوتر ہی محسوس کر رہا تھا جو کسی بھی پل آرام سے مارا جانا تھا۔ شاید وہ تصور میں خون میں نہائے ہوئے اپنے جسم کو بھی دیکھ رہا تھا' تاہم ولید کی پکار پر اس نے اپنے لرزیدہ ہاتھوں سے جلدی سے موبائل جیب سے نکالا اس پل اس کا ذہن بھی کام کر گیا اور ولید کو مزید ہدایت دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ ایمرجنسی پولیس کے نمبر پش کرنے لگا جہاں اس کے اپنے بھی اچھے مراسم تھے۔

ولید نے کچھ سوچ کر ایک دم گاڑی بس ایک پل کو روک لی' جس پر موٹر سائیکل سوار لحظہ بھر الجھن میں گرفتار ہوئے' انہیں شاید اس بات کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ ان کی گاڑی کے آگے آنے سے پہلے ہی گاڑی رک جائے گی' لمحہ بھر کی الجھن کا ولید نے فائدہ اٹھانا چاہا اور انہیں تذبذب میں موٹر سائیکل روکتے دیکھ کر اس نے گاڑی کو پہلے ریورس کیا پھر پہلا گیئر لگا کر دائیں طرف موڑ کر تیزی سے نکلنے کی کوشش کی' تب اچانک یکے بعد دیگرے دو تین

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

فائر ہوئے اور اسٹیئرنگ وھیل سے اس کا ہاتھ پھسل گیا' گاڑی دائیں طرف کی بجائے بائیں طرف کے ٹوٹے پھوٹے پھسلن زدہ حصے کی طرف پھسلتی چلی گئی۔

ایک زبردست دھماکہ ہوا جو خالص اس کے اپنے دماغ میں ہوا تھا' دوسرے پل اس نے خود کو گاڑی کے دروازے سے باہر پہلو کے بل گرتے محسوس کیا اور پھر اس کا ذہن گہری تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

X...X...X

سکندر کو حیرت کا خفیف جھٹکا لگا۔ جب ایڈیٹر فاروقی صاحب نے توقیر علی شاہ کی آفس میں آمد کی اطلاع دی اور یہ کہہ کر اسے مزید پریشان کر دیا کہ وہ خصوصی طور پر تم سے ملنے آیا ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اپنی حیرت سمیٹتے ہوئے سر یوں ہلایا جیسے فاروقی صاحب اس کے سامنے بیٹھے ہوں۔

"میں ابھی حاضر ہو جاتا ہوں۔"

"نہیں میرا خیال ہے وہ خود تمہارے کمرے میں آنا چاہ رہے ہیں۔" انہوں نے گویا اسے ورطہ حیرت میں مبتلا کرنا چاہا مگر وہ مکمل طور پر اپنی حیرت سمیٹ چکا تھا۔

"زہے نصیب بھیج دیجئے۔ ویسے میں انہیں وہ پروٹوکول تو نہیں دے سکوں گا تاہم دروازے کے پاس باادب کھڑا ہو جاتا ہوں اور ان کے آنے پر فرشی سلام جھاڑ دوں گا۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

"شریر۔" فاروقی صاحب ہلکے سے صرف اتنا ہی بول پائے۔ یقیناً توقیر شاہ ان کے کمرے میں موجود تھا' وگرنہ وہ اس کے اس جملے پر کوئی شگفتہ جملہ خود بھی اچھالتے' کچھ نہیں تو عادت کے مطابق قہقہہ ضرور لگاتے۔

ادھر سے فون رکھ دیا گیا تو اس نے بھی ریسیور کو ایک نظر دیکھتے ہوئے کندھے اچکائے اور اسے کریڈل پر ڈال دیا' پھر بیٹھے بیٹھے پیٹھ موڑ کر بغلی کھڑکی سے باہر دیکھا تو اسے تاریک شیشوں والی پجیرو کھڑی نظر آئی اور اس کے باہر دو مستعد گن مین دکھائی دیئے جس میں سے ایک منحنی سا شخص بڑی بڑی مونچھیں رکھ کر ہیبت کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ساختہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی' اس نے سوچا اگر اس وقت ولید یہاں ہوتا تو اس باڈی گارڈ پر ضرور ایک آدھ تبصرہ کرتا۔

توقیر شاہ اندر داخل ہوا تو سکندر نے کرسی چھوڑ کر اٹھتے ہوئے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے کر دیا۔

"دیکھ لیجئے ہم آپ کے آفس کو رونق بخشنے خود چلے آئے ہیں۔"

وہ سکندر کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس کی آنکھوں میں براہ راست آنکھیں ڈال کر ہلکے سے مسکرایا۔

"جی ہاں وہ آئے آفس میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔ تشریف رکھیئے' اس رونق افزائی پر میں آپ کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ کہئے کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"جو خدمت کر رہے ہیں آپ میرا خیال ہے وہی بہت ہے سکندر رضا قریشی صاحب! اس سے زیادہ اور کیا خدمت کرینگے۔" ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر چڑھائی' کرتے کا دامن جھٹک کر آگے پھیلا دیا۔

سکندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”بہت دکھ اور افسوس کی بات ہے ہم تو آپ کے کالم بڑے شوق سے پڑھتے تھے کہ آپ ہمیں ایک بڑے سچے اور کھرے صحافی لگتے تھے۔“ اس نے یہ کہہ کر ایک سانس بھری۔

”بڑی نوازش ہے آپ کی کہ آپ بھی مجھے ایک سچا کھرا صحافی مانتے ہیں۔“

”مانتے تھے سائیں!“ اس نے اپنے موبائل کو حرکت دیتے ہوئے تیزی سے اس کے جملے کی تصحیح کی، پھر سکندر کی اٹھنے والی ضاحت طلب نظروں پر ہولے سے مسکرایا مگر اس کی آنکھیں اس مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ”آپ نے تو ہمارے خاندان کو بلا تحقیق روند ڈالا ہے، خوب حق دوستی ادا کر رہے ہیں ولید حسن سے۔ یارانے نبھاتے نبھاتے قلم کی آبرو ہی کھو بیٹھے آپ تو۔“

سکندر کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اطمینان سے اس کی بات سنی اور سر ہلایا۔

”نہ تو میں نے قلم کی آبرو ڈبوئی ہے اور نہ اپنی، نہ کسی قسم کے یارانے نبھائے ہیں، میں نے تو تمام تر ثبوت کے ساتھ وہ اسٹوری لکھی ہے شاید آپ نے اطمینان سے پڑھا نہیں ہے اور

جہاں تک حق دوستی نبھانے کا تعلق ہے تو میں نے قلم، اور دوستی کو الگ الگ خانوں میں رکھا ہے، کبھی اپنی ذاتی کیفیت، انا اور پسند ناپسند کو اپنے قلم میں جگہ نہیں دی تو دوستی کو کیسے دے سکتا ہوں اور خود ولید حسن بھی میری اس خوبی کا معترف ہے۔ یوں بھی، کیا جو کچھ ہوا ہے اور جو کچھ میں لکھا ہے وہ سچ نہیں ہے؟“ اس نے میز کی طرف جھکتے ہوئے توقیر شاہ کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا تو وہ بھی بغیر پلکیں جھپکائے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر سر ہلانے لگا۔

”بالکل سچ ہو گا، ضرور ہو گا سچ، آپ کہتے ہیں تو سچ ہی ہو گا۔“ وہ بظاہر مسکرایا تھا مگر اس کی مسکراہٹ میں تپش تھی جو سکندر کو واضح محسوس ہوئی۔

”آپ صحافی حضرات تو سچ ہی کہتے ہیں اور سچ ہی لکھتے ہیں مگر بدقسمتی سے یہ سارے سچ سیاست دانوں اور ہم جیسے بااثر اور بڑے لوگوں کے بارے میں ہی لکھے جاتے ہیں۔ مگر، مگر سکندر صاحب! اخبار کتنے لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے والوں میں کتنے یقین کرنے والے ہوتے ہیں، یوں بھی اس سے ہماری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔“

وہ بے پرواہی سے ہنسا اور یوں سر کو جنبش دی جیسے کوئی بچے کی بچکانہ بات پر محظوظ ہو کر ہنس رہا ہو۔ سکندر چپ رہا' بس اس کی طرف دیکھتا رہا' تب وہ خود ہی ہاتھ ہلا کر بولا۔"

"سچ یہ ہے کہ ان باتوں اور اس طرح کے کالم سے ہماری صحت پر واقعی کوئی اثر نہیں پڑتا' البتہ آپ صحافی حضرات کو ناحق پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" سکندر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا۔

"دیکھیں سکندر صاحب! باباسائیں آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ ان کے دل میں آپ کی بڑی قدر ہے۔ وہ تو اکثر و بیشتر آپ کو اپنے یہاں مدعو کرنا چاہتے ہیں مگر آپ اپنی مصروفیات کے باعث ہماری دعوتوں کو قابل اعتناء نہیں سمجھتے۔" وہ ایک پل رکا تو سکندر جلدی سے بولا۔

"میں اسی بات پر شکر گزار ہوں ان کا' اور مجھے بھی ان سے نہ ذاتی پرخاش ہے' نہ دشمنی' میں تو عام صحافی ہوں اور اپنے قلم کا حق ادا کرتا ہوں' یہ لکھنا لکھانا میرا پیشہ ہے' اس میں کسی کی ذات' کسی کا ماضی' کسی کا حال گرفت میں آجائے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں'

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہمارا قلم معاشرے کا آئینہ ہے اور جو اس میں نظر آتا ہے وہی معاشرے میں وقوع پذیر ہو چکا ہوتا ہے۔" سکندر نے رسانیت سے وضاحت کی۔

"مگر ہماری تو اتنی سی گزارش ہے صاحب کہ قلم ذرا ہولا رکھا کریں اور یہ گزارش مردان علی شاہ کی طرف سے آئی ہے۔ میں اپنی طرف سے تو یہ بھی نہیں کہہ رہا۔" اب کے توقیر شاہ کے لبوں پر رقص کرنے والی مسکراہٹ گم ہو گئی تھی۔ اس کے لب و لہجے سے ہلکی دھمکی کا تاثر ابھرتا تھا جو سکندر کو بری طرح کھلا۔

"ہولا۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔ "ہولا سے کیا مطلب ہوا سائیں آپ کا؟"

"اب آپ اتنے سیدھے بھی نہیں ہیں کہ "ہولا۔" کی وضاحت کروں۔" توقیر شاہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا' اس نے از سر نو اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ اب آہستہ آہستہ دھمکی آمیز انداز اپنا رہا تھا۔

"معاف کیجئے گا میں ان معاملوں میں کند ذہن واقع ہوا ہوں۔" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں سر ہلایا۔

"کند ذہن ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی سکندر رضا!"

اب کے اس کے لہجے کی ملائمت مفقود ہو کر برہمی میں بدل گئی' تاہم سکندر کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔اس نے کندھے اچکا دیئے' پھر انٹر کام کے بزر پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

”آپ کیا پینا پسند کرینگے ٹھنڈا یا گرم۔“ اور یہ انداز شاید توقیر شاہ کے ضبط پر چوٹ دے گیا۔

”چھوڑو ٹھنڈے اور گرم کو' میں تم سے دو ٹوک بات کرنے آیا ہوں' تمہاری میز بانی کا لطف اٹھانے نہیں آیا۔“

وہ یکدم گویا پھنکارا تھا سکندر ایک پل کے لئے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

اس کے چہرے پر خوشگواری کا جو تاثر تھا اس کی جگہ اب سرد مہری کا صحرا اتر آیا تھا' ایسا لگا جیسے اس کی دم پر پائوں رکھ دیا ہو سکندر نے۔

”مجھے خوشی ہوئی کہ آپ اصل مقصد پر آگئے۔“ سکندر نے انٹر کام کے بزر سے انگلی ہٹالی۔

”یوں بھی محض تمہید اور غیر ضروری باتیں وقت اور دماغ کا زیاں ہوتی ہیں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔

”ہاں میرا خیال ہے میں ہولا کی وضاحت کر ہی دوں۔“ توقیر شاہ کرسی سمیت آگے اس کی طرف جھکتے ہوئے سانپ کی طرح پھنکارا۔

”یوں تو ہم دھونس اور دھاندلی کے حق میں نہیں ہیں مگر ضرورتاً ایسا کر لیتے ہیں کہ اب جیسے تمہیں ہیں نے بڑی نرمی سے باز رہنے کو کہا مگر تم اسے میری خوشامد سمجھنے لگے۔“

”نہیں خوشامد نہیں' آپ کی مروت اور رواداری سمجھ رہا تھا مگر خیر۔“ سکندر نے کندھے اچکا کر ٹھنڈی سانس بھری۔

”اگر آپ نے رواداری' مروت اور اخلاق کا چولا اتار ہی دیا ہے اور اپنا اصل رنگ دکھا رہے ہیں تو میں بھی صاف لفظوں میں کہہ دوں کہ آپ کسی غلط فہمی میں مت رہیے گا۔میں وہ صحافی نہیں ہوں جو دھونس دھمکی میں آکر اپنے قلم میں جھوٹ کی آمیزش کر لوں گا' حقائق پر نقاب چڑھا کر اسے توڑ موڑ کر پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔“

توقیر شاہ بڑے استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا پھر موبائل میز پر رکھ کر اسے ادھر ادھر گھماتے ہوئے بولا۔

”ایسے نہ کہو' صحافی بھی تو ایک انسان ہی ہوتا ہے۔ فرشتہ نہیں اس کے پیچھے شیطان پڑا ہی رہتا ہے اور سنا ہے حق کی تلاش میں نکلنے والوں کے پیچھے شیطان کچھ زیادہ ہی پڑا رہتا ہے۔“

”جی ہاں اس وقت مجھے بھی کچھ کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔“ سکندر نے بے ساختہ تائیدی انداز میں سر ہلایا اور بغور اس کی طرف دیکھنے لگا' مگر اس نے جیسے اس کی بات اور انداز نگاہ کو خاص اہمیت نہ دی' بلکہ سر کو خفیف سی جنبش دے کر بولا۔

”مجھے خبر ہے لالچ میں تو تم آؤ گے نہیں' تاہم یہ بلینک چیک ہے۔“ اس نے اپنی جیب سے ایک تہ کیا ہوا پرچہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”چاہو تو اس میں اپنی مرضی اور منشاء سے رقم بھر لینا' نہ نہ سکندر صاحب!“ اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر سکندر کو کچھ بولنے سے پہلے روک دیا۔

”یوں سمجھ لو یہ ہماری طرف سے تمہاری بہن کی شادی کا پیشگی تحفہ ہے' شادی بیاہ کے دنوں میں رقم کی ضرورت رہتی ہی ہے' اور بیٹی والوں کو تو اپنی عزت کا بھرم رکھنے کے لئے کبھی کبھی تو قرض بھی لینا پڑ جاتا ہے اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینے کے لئے۔“

سکندر نے اپنے غصے کا ابال اٹھتا محسوس کیا' تاہم آہستگی سے چیک اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر اسی آہستگی سے اس کے چار ٹکڑے کر کے میز پر ڈال دیئے۔

”اللہ کے کرم سے ہماری عزت یوں بھی بہت ہے اور بہن کی شادی بھی خیر و عافیت کے ساتھ بغیر قرض کے ہو جائے گی۔“

توقیر شاہ اس چیک کو دیکھنے لگا جو اب کاغذ کے چار ٹکڑوں کی صورت میں میز پر پڑا تھا' پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جیسے لاپرواہی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

”تمہاری مرضی' ہم تو چاہتے تھے معاملہ افہام و تفہیم سے نمٹ جاتا' تمہاری عزت و ناموس پر کوئی حرف لانا نہیں چاہتے تھے مگر شاید تم اس اقدام پر ہمیں خود ہی مجبور کر رہے ہو۔“ بظاہر اس کا لہجہ سادہ ہی تھا مگر اس میں بلا کی تڑخ تھی' وہ کرسی کی پشت سے لگ کر آفس کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”تانیہ غالباً تمہاری چھوٹی بہن ہے' جو جامعہ میں پڑھتی ہے' آں' آں۔“ اس نے سکندر کو کرسی سے اٹھتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے بھنویں اچکا کر ہاتھ اٹھایا۔

"خدانخواستہ ہمارا مقصد اسے کسی طرح کا نقصان پہنچانا نہیں ہے میں تو صرف تصدیق چاہ رہا تھا۔" اس کے لبوں پر عیارانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی، سکندر اسے سخت نظروں سے دیکھنے لگا۔

"بات یہ ہے کہ تانیہ رضا ہمارے چھوٹے، بہت ہی لاڈلے اور پیارے بھائی اکبر شاہ کی محبوبہ ہے۔"

"توقیر شاہ!" سکندر ایک جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا، اچھا۔" توقیر شاہ نے جیسے گھبرانے کی ایکٹنگ کی اور جلدی سے بولا۔

"سوری میں کچھ غیر مہذب جملہ استعمال کر گیا شاید، چلیں یوں کہہ لیتا ہوں کہ، وہ اور اکبر شاہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، محبت کرتے ہیں۔ایک دوسرے سے، وہی محبت جو فلموں اور افسانوں میں ہوتی ہے۔" پھر یکدم قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"پتہ نہیں وہ کیسی ہوتی ہے ویسے میں نے تو آج تک نہیں کی۔"

"بہت افسوس کی بات ہے کہ آپ اپنے انہی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔" سکندر نے غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس پر ایک سلگتی نگاہ ڈالی۔

"کیوں؟ محبت کرنا معیوب بات ہے کیا۔" اس نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائیں، اس لمحے سکندر کا دل چاہا اس کا چہرہ بری طرح نوچ لے۔

"توقیر شاہ! میں اپنی بہن کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں، وہ ایسا قدم اٹھانے سے پہلے مر جانا پسند کرے گی۔"

اس نے میز پر ہتھیلیاں ٹکائیں اور توقیر شاہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔ مگر دوسرے پل جانے کیوں اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا، توقیر شاہ کی آنکھوں میں جانے کیا تھا اسے اپنی کنپٹیوں پر آتش فشاں کی سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔

"ایسا تو نہ کہو سکندر! اب محبت کو جرم تو مت بنائو، ہو جاتی ہے یار! کب، کیسے پتہ نہیں چلتا، محبت کی یہی تو خرابی ہے کہ یہ ذات پات سے بیگانہ ہو جاتی ہے، امیری، غریبی، حیثیت مرتبہ کچھ نہیں دیکھتی اور یوں بھی اس کے جراثیم غریبوں میں تو کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں، خیر اب کوئی ایسی معیوب بات بھی نہیں ہے۔"

اس نے آخر میں جیسے سر ہلا کر تسلی دینی چاہی اور پھر نہایت اطمینان سے جیب سے ایک لفافہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"اس میں ایک کیسٹ ہے جس میں ٹیلی فونک ریکارڈنگ ہے اور کچھ فوٹو گرافس ہیں جو تانیہ نے اکبر شاہ کو دی تھیں۔ عموماً ایسا تبادلہ لڑکے' لڑکی میں ہوتا ہی ہے۔ یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں ہے۔" اس نے لفافہ آہستگی سے سکندر کی طرف کھسکایا۔

سکندر کو اپنے اعصاب پر یہ حملہ بڑا بھاری لگا تھا اس نے خاکی رنگ کے اس لفافے کو یوں دیکھا جیسے وہ سانپ کی پٹاری ہو اور ہاتھ لگاتے ہی اس سے نکلنے والا سانپ اسے ڈس لے گا' وہ میکانکی انداز میں واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

کمرے میں چند لمحوں کے لئے انتہائی مضمحل' کشیدہ سی خاموشی اتر آئی۔

سکوت اور اعصاب شکن خاموشی کے یہ چند لمحات بہت دھیرے دھیرے اور سسک سسک کر گزرتے رہے' سکندر خود کو کرسی کی پشت سے لگاتے ہوئے سامنے دیوار کو گھورنے لگا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

جبکہ توقیر شاہ کی نظریں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں وہ دل ہی دل میں تیر نشانے پر بیٹھنے سے خوش ہو رہا تھا۔ اس کا عامیانہ پن اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا' تاہم نظریں چار ہونے پر وہ اسی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ارے سکندر صاحب! آپ تو پریشان ہو گئے' میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا تو نہیں تھا۔ سائیں آپ کی عزت ہماری عزت ہے' بھلا ہم دوسروں کی بہو بیٹیوں کی عزت اخباروں میں اچھالیں گے۔"

سکندر اس پر ایک خاموش سلگتی سی نظر ڈال کر رہ گیا پھر نظریں چرا کر لفافے پر ایک نظر ڈالی۔

اس کے ذہن کے گوشے میں شاید کہیں بھی یہ بات' ایسی دھمکی نہیں تھی۔

"یہ محض سازش بھی تو ہو سکتی ہے مجھے زیر کرنے کے لئے۔" وہ اعصاب شکن لمحات سے خود کو نکالتے ہوئے بولا اور لفافہ ہاتھ بڑھا کر اٹھالیا۔

توقیر شاہ زیر لب مسکرا دیا۔

"سکندر صاحب! عشق اور مشک بھلا چھپائے چھپے ہیں۔"

"یہ بات آپ کو اکبر شاہ نے ہی بتائی ہی نا' من گھڑت اور بے بنیاد بھی ہو سکتی ہے' محض کلاس فیلو ہونے کے ناتے فرینڈ شپ بھی ہو سکتی ہے۔" وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔

اس کا دل کسی طور یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔اس کی نظروں میں تانیہ کا معصوم کھلکھلاتا پاکیزہ تصور ابھر آیا۔

کہاں اکبر شاہ' اور کہاں تانیہ۔

ایک امیر اوباش نواب زادہ' اور کہاں ایک خوفزدہ ہرنی جیسی معصوم' سادہ ماحول کی پاکیزہ لڑکی۔

اس سوچ نے اسے اندر سے تقویت دی تھی اور مزاحمت کی توانائی پیدا کی۔

اس کی بات پر توقیر شاہ ہلکے سے ہنسا گویا لطف اٹھا رہا ہو۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اتنے ثبوت کے بعد بھی یہ بات بے بنیاد ہو سکتی ہے تو پھر ولید کے ماضی اس کی سچائی اور آپ کے قلم کی سچائی کی کیا ضمانت ہے' ویسے تم تانیہ سے پوچھ لینا' میرا خیال ہے وہ اتنی صفائی سے اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکے گی۔"

"مائنڈ اٹ' توقیر شاہ! مجھے اس سلسلے میں آپ کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے غصے کے عالم میں لفافہ دراز میں پٹخا' تب توقیر شاہ نے آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورا اور کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے تم ٹھنڈے دل و دماغ سے اس لفافے کو کھول کر دیکھ لو اور یہ کیسٹ بھی سن لو۔"

پھر اپنا موبائل اٹھایا اور میز کی سطح پر ہاتھ رکھ کر اس کی سمت جھکتے ہوئے سرسراتے لہجے میں بولا۔

"ایسا ہی ایک دوسرا لفافہ ہمارے پاس بھی ہے' ہمیں بھی اپنے مہرے پٹوانے اچھی طرح آتے ہیں۔" وہ پلٹ کر کڑکڑاتے کرتے کی سرسراہٹ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی سکندر نے دراز کھینچ کر وہ لفافہ باہر نکالا' لفافہ چاک کرتے ہوئے ایک پل کے لئے اس کا ہاتھ لرزا' دل سینے کی دیوار میں پھیلا سکڑا اور رگوں میں خون پوری طاقت سے دوڑنے لگا' اسے لگا جیسے خون اس کی کنپٹیوں کی رگوں سے ٹھوکریں مار کر گزر رہا ہو۔

لفافہ چاک کر کے اس نے میز پر الٹ دیا ایک آڈیو کیسٹ لڑھکتی ہوئی باہر گری' پھر کچھ تصاویر پھسل کر گویا اس کا منہ چڑانے لگیں۔

وہ اعصاب شکن احساس کے ساتھ کتنی دیر ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔

جامعہ کے ایک گوشے میں کھلکھلاتی تانیہ ایک الٹرا ماڈرن اور خوش شکل لڑکے کے ساتھ بیٹھی تھی جو بلاشبہ مردان علی شاہ کا بیٹا اکبر شاہ تھا۔

دوسری تصویر کسی پارک کی تھی جہاں وہ دونوں ایک بینچ پر بیٹھے تھے اور تیسری تصویر میں وہ تانیہ کا ہاتھ پکڑے اسے محبت پاش نظروں سے تکتا ہوا لگ رہا تھا' جبکہ تانیہ کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھرے ہوئے تھے اور کچھ تصاویر اس کی اکیلی کی تھیں جس میں ایک آدھ تو نادیہ آپی کی منگنی کے دن والی معلوم ہو رہی تھیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ایک پل کے لئے سکندر کو اپنے لہو میں کھولن ہوتی محسوس ہوئی جیسے پورا کمرہ اسے کھولتا ہوا اور چھت سے لہو ابلتا محسوس ہونے لگا مگر چند گہری سانسیں لینے کے بعد ایک خفیف سے احساس شکست کے ساتھ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی اور یوں آنکھیں بند کر کے بھینچیں جسے اس سفاک حقیقت سے نظریں چرانا چاہ رہا ہو۔

اس کی زندگی میں شاید اس سے زیادہ ذلت آمیز لمحات نہیں آئے تھے جب وہ اپنی نظروں میں اس طرح ریزہ ریزہ ہوا ہو۔

اس طرح اس کے اندر کے جوش و جذبوں اور ولولوں پر سناٹا اترا ہو' جیسا میدان جنگ کے بعد ہارے ہوئے لشکر پر اترتا ہو۔

وہ گم صم سا خالی پن کے ساتھ کتنی دیر اسی زاویے پر بیٹھا رہا۔

اسے لگ رہا تھا اس کی سوچوں' اس کے احساسات اس کے سارے اعصاب پر یخ بستہ ہوا ٹھہر گئی ہو۔ وہ زندگی کے نرم گرم احساس سے بالکل کٹ گیا ہو۔ کچھ دیر اسی طرح پڑے رہنے کے بعد اس نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں تو گویا تمام لہو سمٹ کر آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

اس نے پلکیں جھپک جھپک کر آنکھوں کو دیکھنے کے قابل بنایا پھر گویا اپنے آپ کو ایک بار پھر یقین دلانے کے لئے ان تصویروں کو اٹھایا مگر یکدم اسے اپنا آپ بہت کمزور سا محسوس ہونے لگا اور یہ تصویریں کوئی بھاری بوجھ لگنے لگیں' تاہم وہ مرتعش انگلیوں سے تصویروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگا۔ کچھ دیر میں باریک باریک ٹکڑوں کی ایک چھوٹی سی ڈھیری اس کے سامنے بن گئی اور ایک دکھ اس کے دل کی رگوں سے لپٹنے لگا۔

یہ ڈھیری نہیں تھی ایک پہاڑ تھا مضبوط چٹان تھی جو توقیر شاہ اس کی راہ میں چھوڑ کر چلا گیا تھا جس کے سامنے وہ خود کو بے حد کمزور' لاچار' بے اختیار محسوس کر رہا تھا۔ وہ اٹھا کمزور ہاتھوں سے اس ڈھیری کو براؤن لفافے میں بھر دیا اور اپنے لائٹر کا شعلہ دکھایا کچھ دیر بعد وہ براؤن لفافے کے کناروں پر شعلوں کا رقص دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ پورا لفافہ اس رقص کی نذر ہو کر راکھ میں تبدیل ہو گیا۔

جسے اس نے ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور کیسٹ جیب میں ڈال کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

یکایک اس کے اندر غصے کی شدید لہریں اٹھنے لگیں۔ وہ اس وقت سیدھا گھر جانا چاہ رہا تھا اس کی نگاہوں میں تانیہ کا چہرہ گھومنے لگا اور کوئی انتہائی قدم اٹھانے کو دل چاہنے لگا۔

اس نے سارے اہم کاغذات رول کر کے دراز میں ڈالے اور لاک لگا کر چابیاں جیب میں ڈالیں کہ میز پر رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی' اس نے سخت بے دلی کے عالم میں ریسیور اٹھا کر پژمردگی سے ہیلو کیا۔

''ہیلو' ہیلو سکندر!'' دوسری جانب وسیم تھا۔

''سکندر' ولید کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور اسے گولی بھی لگی ہے اس کی حالت بہت سیریس ہے تم فوراً پہنچو۔

''وہاٹ؟'' اس نے جلدی سے کرسی کے ہتھے پر ہتھیلی ٹکا کر خود کو سنبھالا۔ ''مگر کب' کیسے' کہاں' کہاں ہے وہ اس وقت میرا مطلب ہے کس ہاسپٹل میں۔''

وسیم اسے جلدی جلدی ہاسپٹل کا نام اور روم نمبر بتانے کے بعد لائن ڈسکنکٹ کر گیا تھا۔

اس نے بھی ریسیور پھینکنے کے انداز میں کریڈل پر ڈالا اور فاروقی صاحب کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ انہیں یہ خبر دے کر اسی تیزی سے وہ بھاگتا ہوا پارکنگ لاٹ میں کھڑی اپنی بائیک کے پاس آیا' دوسرے ہی لمحے اس کی بائیک سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔

X...X...X

ہاسپٹل پہنچتے ہی اس نے بائیک ہاسپٹل کے پارکنگ لاٹ کے بجائے گیٹ پر روک دی اور بھاگتا ہوا اندر آیا' سامنے شفاف ماربل کی لمبی راہداری تھی جس کے دائیں طرف اوپر جانے والی ماربل کی کشادہ سیڑھیاں تھیں جبکہ آگے جا کر کمروں کی قطاریں تھیں۔ وہ بڑے بڑے قدموں سے راہداری سے گزرنے لگا کہ ایک جگہ اسے گہما گہمی دکھائی دی سیاہ وردی والوں کو دیکھ کر وہیں رک گیا۔

اسے آغا جی بھی دکھائی دیئے' اسٹک کے سہارے ادھر ادھر بے قراری سے ٹہلتے ہوئے وہ لپک کر ان کی طرف آیا۔

"یہ' یہ سب کیسے ہو گیا' کس طرح ہوا۔" اس نے چھوٹتے ہی دریافت کیا مگر آغا جی کچھ گم صم سے تھے۔ اسے دیکھ کر ایک چوڑے پلر کے پاس رک گئے تھے۔ اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اسے محسوس ہوا ان کا بدن مرتعش تھا۔ وہ شاید خود کو سنبھالنے کی تگ و دو میں مصروف تھے کچھ کہنے کو لب کھولے مگر آنکھیں جھلملا گئیں۔ سکندر نے انہیں تھاما

اور نزدیکی بینچ پر بٹھا دیا اور خود وسیم کی طرف بڑھ گیا جو ایک کانسٹیبل کے ہمراہ آتا دکھائی دے رہا تھا۔

"اوہ' سکندر!" اسے دیکھ کر بے ساختہ اس نے ایک طمانیت انگیز سانس بھری اور کانسٹیبل کی طرف مڑا۔

"یہ سکندر اخبار "روزنامہ وقت۔" سے منسلک ہیں' بہت مشہور صحافی' قریشی صاحب کے بیٹے ہیں۔"

وہ ایک اے ایس آئی تھا۔ خاصے مودبانہ انداز میں آگے بڑھ کر سکندر سے مصافحہ کیا' اس کی صورت سکندر کے لئے قطعی اجنبی تھی۔ سکندر نے اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اطراف میں نظر دوڑائی' اس وقت اے ایس آئی کے علاوہ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل بھی موجود تھے اور ایک ایس آئی بھی تھا۔

"ولید کہاں ہے؟ اس کی کنڈیشن کیا ہے اب؟" وہ مضطربانہ انداز میں سامنے بنے کمروں کی قطار پر نگاہ دوڑانے لگا۔

"خدا کا شکر ہے خطرے سے باہر ہے' گولی اس کے بازو میں لگی تھی جو کندھے کو چھو کر گزر گئی تھی۔ البتہ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اندرونی و بیرونی چوٹیں آئی ہیں تاہم فوری امداد مل جانے کے باعث خون اتنا نہیں بہا اور یوں حالت خطرے سے باہر ہے' آئو۔" وہ اسے لئے سامنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے اسے اس کمرے میں منتقل کیا گیا ہے' ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ آدھے گھنٹے میں ہوش میں آجائے گا۔"

وہ وسیم کے ساتھ اس کمرے میں آیا جہاں ولید کو منتقل کیا گیا تھا۔ بڑی سی کھڑکی کے نیچے بیڈ پر ولید لیٹا ہوا تھا' سینے تک چادر اوڑھے' ایک ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا جس میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ وہ کتنی دیر دکھ اور صدمے کے احساس سے کھڑا اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا' پھر بے اختیار جھک کر اس کی پیشانی پر لب رکھ دیئے۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ زندگی بچ گئی۔" وسیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ہاں' بہت سی دعائیں جو اس کے گرد حصار کھینچے ہوئی تھیں۔" اس نے ایک ہلکی سی سانس بھری اور آہستہ سے اس کے بدن پر پڑی چادر کو ٹھیک کرتے ہوئے اس کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔

"انکل کدھر ہیں۔" اس نے جہانگیر احمد کے بارے میں پوچھا۔

"ممی کو چھوڑنے گھر گئے ہیں' ضد کر کے آئی تھیں مگر ولید کی حالت دیکھ کر خود ان کی طبیعت بگڑ گئی' اب زبردستی پاپا انہیں لے کر گئے ہیں' وہ تو مصر تھیں کہ یہیں رہیں گی۔"

"ہاں شاک ہی ان کے لئے بہت بڑا ہو گا' آغا جی کی حالت بھی خاصی خراب ہے۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اس حصے میں واپس آگئے جہاں آغا جی تھے۔ وہ ابھی تک اسی بینچ پر دیوار سے ٹیک لگائے گم سم بیٹھے تھے جس طرح سکندر انہیں بٹھا کر گیا تھا۔ وسیم دوبارہ اے ایس آئی سے باتیں کرنے لگا۔

انسپکٹر کے سینے پر اس کا نام احمد غوری لکھا ہوا تھا' وہ ایک بھاری بھرکم' بارعب اور سلجھا ہوا آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ وسیم سے کچھ سوالات کر رہا تھا' کچھ دیر بعد وہ اس سے مصافحہ کر کے چلا گیا اور وسیم دوبارہ آغا جی کی طرف آگیا۔

"کب ہوا یہ واقعہ اور کس جگہ پر۔" سکندر نے اسے بینچ پر بیٹھنے کو جگہ دی اور خود اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"ایکسیڈنٹ تو کلفٹن روڈ پر ہوا تھا' مگر اب پتہ نہیں گولی پہلے ماری گئی تھی یا کار کا ایکسیڈنٹ پہلے ہوا' بہر حال عقل کے کلیے سے تو یہی بات معقول لگتی ہے کہ گولی پہلے ماری گئی تھی جس کی وجہ سے گاڑی بے قابو ہو کر کچے میں اتر گئی۔ فدا حسین بھی ہمراہ تھا' ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس کے آدمی اسے لے گئے ہیں۔"

"فدا حسین؟" سکندر چونکا۔ "وہ بھی ساتھ تھا ولید کے۔"

"ہوں۔" وسیم نے ہنکارا بھرا "مگر اسے گولی نہیں لگی' البتہ گاڑی کے ٹکرانے کی وجہ سے اسے معمولی چوٹیں آئی ہیں۔"

"مگر ایک عجیب سا اتفاق ہوا ہے سکندر!" وسیم نے کہا تو سکندر کے ساتھ آغا جی نے بھی اس کی طرف دیکھا پھر ایک ہلکی سی سانس بھر کر سر جھکا کر دوبارہ دھیرے دھیرے تسبیح کے دانے گھمانے لگے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"فدا حسین اپنی پجیرو کی بجائے ولید کی گاڑی میں تھا اور پجیرو ہمارے آفس کی بلڈنگ کے پارکنگ لاٹ سے واپس شاید اس کی رہائش گاہ پر جا رہی تھی کہ کارساز کی طرف پہنچتے ہی ایک دھماکہ ہوا' یہ دھماکہ پجیرو میں رکھے بم کا ہوا تھا اور چند منٹ کے اندر اندر وہ پجیرو جل کر خاکستر ہو گئی۔ اس کے پرخچے اڑ گئے' اس میں فدا حسین کا ایک ڈرائیور اور ایک باڈی گارڈ تھا۔"

"اوہ مائی گاڈ!" سکندر کی ریڑھ کی ہڈی تک میں سنسناہٹ دوڑ گئی' اسے ایک پل اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔

"دونوں گاڑیوں کو ایک ساتھ ہی نشانہ بنایا جا رہا تھا' مگر یہ اب فدا حسین کی خوش قسمتی سمجھ لو کہ وہ ولید کی گاڑی میں تھا یا ولید کی خوش نصیبی کہ اس نے فدا حسین کی پجیرو کی بجائے اپنی گاڑی میں جانے کو ترجیح دی۔ منور کے مطابق ان دونوں کا ارادہ کسی ریسٹورنٹ میں لنچ کرنے کا تھا اور یہ کہ اس نے فدا حسین کے باڈی گارڈ کو اپنے ساتھ رکھنے سے بھی منع کر دیا تھا۔"

"ہاں وہ اس طرح کی چیزوں کو پسند نہیں کرتا۔" سکندر بے اختیار بولا' اس کے ذہن و دل میں عجیب سا سناٹا اتر گیا تھا۔

"بہر حال جو ہوا بہت برا ہوا ہے۔" آغا جی نے پہلی بار لب کھولے۔ "میں اسی دن سے ڈرتا تھا' میرے اندر کا خوف اور اندیشے مجھے ہر وقت ایسے حالات کے پیش آنے سے ڈراتے رہتے تھے۔" وہ بے حد افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔

کوئی ملاقاتی ٹولہ آیا تو وسیم وہاں سے اٹھ گیا اور ان لوگوں سے نمٹنے لگا۔ اس کے ساتھ یہ سلسلہ شام تک چلتا رہا تھا۔ جس جس کو اطلاع ملی وہ اس واقعہ پر تعزیت اور ولید کی خیر و خبر دریافت کرنے آتا رہا۔ مگر ولید کے ہوش میں آ جانے کے باوجود اس کے کمرے میں کسی کو جانے نہیں دیا جا رہا تھا یہ ڈاکٹر کی سخت ہدایت تھی۔ جس پر وسیم سختی سے عمل پیرا تھا اور یوں ملاقاتیوں کو وہ باہر ہی سے ٹالتا جا رہا تھا۔

پولیس اور سی آئی اے والے بھی آ کر ولید کا بیان لے کر چلے گئے تھے۔

"یہ تو خالص قاتلانہ حملہ ہوا ہے تم پر' بلکہ پلاننگ کے ساتھ تمہیں اور فدا حسین کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔" پولیس والوں کے جانے کے بعد سکندر نے خیال آرائی کی۔

وہ سب ولید کی زبانی اس واقعہ کی تفصیل سن کر اور زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ خصوصاً آغا جی بے حد اپ سیٹ نظر آ رہے تھے' شاید اپنے واہموں کو آج حقیقت کے روپ میں دیکھ کر ان کے اعصاب بری طرح متاثر ہوئے تھے۔

"ہاں ظاہر ہے سراسر یہ قتل کی سازش تھی۔" اس نے نقاہت بھری سانس بھر کر آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن میں گزرے لمحات کسی فلم کی طرح چلنے لگے ایک پل کے لئے اسے جھرجھری آ گئی۔

بس لمحے بھر کا کھیل تھا جس نے بازی الٹ کر ان کے پلڑے میں زندگی کے سکے ڈال دیئے تھے اور اگر یہی بازی الٹ جاتی تو شاید آج اس کے یہ سب عزیز' محبت کرنے والے تشکر آمیز سانس بھرنے کی بجائے اس کی موت پر نوحہ کناں ہوتے۔

اچانک خیال آنے پر اس نے آنکھیں کھول کر جہانگیر احمد کی طرف دیکھا۔

"فدا حسین کی کیا حالت ہے وہ بھی تو میرے ہمراہ تھا۔"

"وہ معجزانہ طور پر بچ گیا ہے' بس چند چوٹیں ہی آئی تھیں' وہ بھی گاڑی کے ٹکرانے کی وجہ سے البتہ اس کی پجیرو' ڈرائیور اور باڈی گارڈ سمیت بم سے اڑا دی گئی ہے۔ یہ حادثہ اس کی

رہائش گاہ سے چند فرلانگ پر ہوا ہے۔" وہ اسے تفصیل بتانے لگے' جس نے ولید کو دم بخود کر دیا۔

وہ تحیر آمیز بے یقینی سے جہانگیر احمد کو تکتا رہ گیا پھر سکندر کی طرف دیکھا۔ جس نے نظریں ملنے پر ایک متاسفانہ سانس بھر کر کندھے اچکا دیئے۔

"اوہ میرے خدا!۔" اس نے حیرت سے سکڑنے والے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ کر ایک متاسفانہ سانس بھری۔اسے فدا حسین کا وہ باڈی گارڈ یاد آگیا جسے فدا حسین اپنی زندگی کی ضمانت سمجھتا تھا اور ساتھ لئے لئے گھومتا رہتا تھا۔بے اختیار ایک مبہم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر کر ٹوٹ گئی۔

"فدا حسین کو خبر ہے اس حادثے کی۔"

"ہاں' اسے تو اطلاع مل ہی جانی تھی' بہت خطرناک تیوروں کے ساتھ ہاسپٹل سے گیا ہے' اس کے خیال میں یہ سب مردان علی شاہ نے کروایا ہے۔"

ولید نے بے اختیار آغا جی کی طرف دیکھا جنہوں نے جہانگیر احمد کے آخری جملے پر--- قدرے ملول سی سانس بھری تھی۔

وہ بے حد اداس' پریشان اور پراگندا دکھائی دے رہے تھے۔ تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے بالکل گم صم بیٹھے تھے' اس کے دل پر ندامت ہلکورے لینے لگی۔

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا آغا جی! آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔مارنے والے سے بچانے والا زیادہ بڑا اور طاقتور ہے اور پھر یہ سب تو زندگی کے ساتھ چلتا ہی رہتا ہے۔اسے زمانے کی گردش کہتے ہیں۔"

آغا جی نے اس کی طرف دیکھا' ولید کو ان کی آنکھوں کی گہرائیوں میں اضمحلال' اداسی کے ساتھ ایک شکوہ بھی تیرتا نظر آیا' وہ نظریں چرا گیا۔

"آپ تو ہمیشہ کہتے ہیں کہ کوئی دکھ' غم انسان کی ہمت' حوصلے اور برداشت سے بڑھ کر نہیں ہوتا' ہاں کم ہمتی کے باعث زیادہ محسوس ہوتا ہے اور آپ بچپن سے میری ہمت بندھاتے آئے ہیں اور یہ سبق پڑھاتے آئے ہیں کہ پریشانیاں دکھ اور مصائب ہمارے لئے امتحان بن کر آتے ہیں۔ہماری صلاحیتوں کو پرکھنے اور ہمیں اپنے آپ سے آشنا کرانے آتے ہیں کہ ہم میں کتنی صلاحیت ہے وقت اور حالات کو فیس کرنے کی۔

آپ نے ہمیشہ مجھے ایک بہادر باپ کا بیٹا کہا ہے مگر میں نے اس سے زیادہ ایک باعمل' بہادر سرپرست کا بیٹا کہلانے میں بھی فخر کیا ہے۔''

اسے آغا جی کی غمزدگی حقیقتاً غمگیں کر رہی تھی وہ جانتا تھا وہ اس سے کتنی بے پایاں محبت کرتے ہیں۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو جاتے تھے۔ اس حادثے نے انہیں اندر سے جیسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ ہمیشہ اسے ماضی فراموش کر دینے کی تلقین کرتے رہتے تھے' شاید وہ اس دن اور اسی طرح کے کسی حادثے کے وہم اور خوف میں مبتلا رہتے تھے اور آج یہ خوف یہ وہم حقیقت بن کر ان کے اعصاب کو متاثر کر گیا تھا۔

''ہاں مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ انسان اپنے لئے مصائب' پریشانیاں ڈھونڈتا رہے۔'' آغا جی کے لہجے میں کمسن بچے جیسی ناراضگی تھی۔ ''یوں بھی کچھ پریشانیاں شوقیہ ہوتی ہیں جو انسان اپنے لئے ڈھونڈ لیتا ہے۔''

''مگر یہ شوقیہ پریشانی نہیں ہے آغا جی! یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔'' اس نے نظریں سامنے دیوار پر جمادیں۔ ایک مغموم مسکراہٹ اس کے لبوں کے درمیان پھڑ پھڑا کر رہ گئی تھی۔

''بہر حال' ہم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہیں گے۔'' جہانگیر احمد یکدم بولے تو ولید نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''ہاں میں خود اس واقعہ کی تحقیقات کراؤں گا اور جو مکروہ ہاتھ اس کے پیچھے کار فرما ہے اسے سامنے لاؤں گا۔''

جہانگیر احمد کے لہجے میں دبا دبا غصہ امڈ آیا جو دل کی گہرائیوں میں کہیں کروٹیں لے رہا تھا اور جسے وہ ابھی تک تھپک تھپک کر سلائے ہوئے تھے۔ ولید نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ اپنا موبائل اٹھا کر اٹھتے ہوئے بولے۔

''تم آرام کرو ولید! خود کو ذہنی طور پر مت تھکاؤ' میرا خیال ہے آغا جی! آپ بھی کچھ دیر ریسٹ کر لیں' وسیم ہے نا اس کے پاس اور سکندر بھی ابھی یہیں موجود ہے' آپ گھر چل

کر آرام کریں۔" پھر انہوں نے اندر داخل ہوتے ڈاکٹر جہانزیب کی طرف دیکھا اور ہنس کر بولے۔

"بھئی جہانزیب! اس لڑکے کو تم نیند میں ہی رکھو' یہ جاگ کر بہت پریشان کر رہا ہے۔"

"انکل!" ولید نے احتجاجی انداز میں اپنے موبائل کو دیکھا جو انکے ہاتھ میں تھا۔

"میرا موبائل تو..."

"نہیں ہرگز نہیں' اسے تو تمہارے پاس ہونا ہی نہیں چاہیئے' جہانزیب! اسے سلا ہی دو تاکہ یہ ذہنی طور پر خرچ نہ ہو جائے۔" وہ ہنستے ہوئے آغا جی کے ہمراہ باہر نکل گئے' ولید نے بڑی بے چارگی سے ڈاکٹر جہانزیب کو دیکھا اور ایک ہلکی سی سانس بھر کر سر تکیے پر ڈال دیا۔

ڈاکٹر جہانزیب نے شرارتی انداز میں اس کا کندھا تھپکا تو وہ مصنوعی خفگی سے انہیں دیکھنے لگا پھر مسکرا دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

جہانزیب اور نرس کے جانے کے بعد وہ سکندر سے ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگا مگر گفتگو کے دوران اس نے محسوس کیا سکندر ذہنی طور پر اپ سیٹ ہے' اس کے سراپے میں اضمحلال اور اداسی کا رنگ تھا جو اسے سکندر کی آنکھوں میں پہلی بار ہی نظر آیا تھا۔

وہ اس حادثے کی وجہ سے پریشان ہوتا تو اس کا اظہار بار بار کر کے اسے ڈپٹتا مگر وہ تو کسی اور ہی الجھن میں دکھائی دے رہا تھا۔

"سکندر!" اس نے لیٹے لیٹے ہی اسے بہ نظر غائر دیکھتے ہوئے پکارا۔

"کیا بات ہے تمہیں چین نہیں ہے اور یہ کیا کر رہے ہو ڈرپ نکل جائے گی اس ہاتھ کو خدا کے لئے سیدھا ہی رہنے دو۔"

سکندر اس کی نگاہوں کی محویت سے کسی حد تک گڑبڑا گیا تھا نظریں چرا کر اس کی توجہ خوامخواہ اس کے ڈرپ لگے ہاتھ پر مبذول کرانی چاہی جبکہ اس کے یوں نظریں چرانے پر ولید کو جھٹکا لگا۔

"کیا بات ہے سکندر! تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ نادیہ کی شادی کی وجہ سے تو کوئی فکرمندی نہیں ہے نا۔" سکندر نے اس کی طرف دیکھا اور ہلکے سے قہقہہ لگایا۔

"تم ہونا اتنی بڑی پریشانی۔"

"کہتے ہیں کہ ہنسی اور قہقہہ اچھی نقابیں ہیں مگر کبھی کبھی یہ نقابیں خود راز عیاں کر دیتی ہیں۔" ولید نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

سکندر کے لب بے اختیار بھینچ گئے' وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر بے مقصد پردے پر ہاتھ پھیرنے لگا پھر یونہی باہر جھانکنے لگا۔

آنکھیں گھر کی بھیدی ہوتی ہیں سکندر! اس نے چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ "بشرطیکہ... کسی کو آنکھیں پڑھنے کا فن آتا ہو۔"

"ہاں اور تمہیں تو یہ فن خوب آتا ہے نا' شاید ورثے میں ملا ہے۔" سکندر نے اسے گھورا تو وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

"ہاں جناب! یہی تو لنکا ڈھاتی ہیں۔"

"بکومت' کوئی میری آنکھیں فضول میں بھید وید نہیں کھول رہی ہیں۔"

"اوں ہوں۔" ولید کے ہونٹ بے اختیار سیٹی کے انداز میں سکڑ گئے۔ اس نے ابرو اچکا کر معنی خیز تبسم کے ساتھ اسے دیکھا۔

"یعنی بھید ہے ضرور' جو تمہاری آنکھوں میں تمہارے بقول نہیں اترا' مگر سوچو ذرا میری چھٹی حس کیوں شارپ ہو رہی ہے کہ تم ڈسٹرب ہو ذہنی طور پر۔"

"نہیں تو' فضول میں ہی ہانکے جا رہے ہو۔" سکندر کے انداز میں بے زاری تھی پھر اس نے پردے سے گرفت ہٹا کر اس پر ایک گھورتی نظر ڈالی۔

"انکل ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ تمہیں سلائے ہی رکھنا چاہئے۔" ولید نے بے اختیار ٹھنڈی... سانس بھر کر اسے گھورا۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح

کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

وہ اپنے ہاتھ میں لگی ڈرپ پر ایک بے چارگی کی نظر ڈال کر رہ گیا۔ سکندر ہنس پڑا اور رسٹ واچ پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر بولا۔

"تم آرام کرو' میں ذرا ہاسپٹل کے ایک دو راؤنڈ لے کر آتا ہوں۔"

"کیوں؟ تم کیوں راؤنڈ لگاؤ گے یہ ڈیوٹی تمہاری کب سے لگ گئی ہے۔"

"کچھ ڈیوٹیاں از خود لگ جاتی ہیں مائی ڈیئر! اس کے لئے اوپر سے احکامات آنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"کہیں کسی حسین دوشیزہ کی عیادت و یادت کی ڈیوٹی تو انجام دینے نہیں جا رہے ہو۔" ولید نے مشکوک نظروں سے گھورا' تو سکندر نے بھی جواباً اسے گھورا۔

"اس نیک کام کے لئے تو تم ہی بہت ہو' یوں بھی' یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا۔" ایک اور ٹھنڈی طویل سانس بھر کر چہرے پر مسکینیت طاری کر لی تو ولید نے تسلی دینے والے انداز میں اسے دیکھا۔

"ایک خوبصورت' ایجوکیٹڈ بندے کو ایسی مایوسی کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں' ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی! ایک ذرا سی کوشش سے تم حسینوں مہ جبینوں کی لائن اپنے پیچھے لگا سکتے ہو۔"

"مائنڈ اٹ' میں ولید حسن نہیں سکندر رضا ہوں' ایک عام سی شکل کا پھٹیچر بائیک رکھنے والا' غریب سچا کھرا صحافی' جو اپنے پیچھے حسینوں کی لائن تو کیا ایک عدد حسینہ کا دل بھی نہیں دھڑکا سکتا۔" سکندر نے بات مذاق میں ہی کہی مگر اس کے لب و لہجے کے اتر چڑھاؤ میں ولید کو ایک چٹخ ایک کاٹ محسوس ہوئی اس نے سکندر کی طرف بغور دیکھا۔

"یہ آج تم پر کچھ زیادہ ہی مایوسانہ اور مغمومانہ دورہ نہیں پڑ گیا۔"

"مایوسانہ دورہ ہو یا مغمومانہ' بات تو سچ ہے نا۔" اس نے ولید کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں سچ ہی ہے بلکہ کڑواہٹ کی حد تک سچ۔"

"سچ کڑوا ہی ہوتا ہے بلکہ بہت کڑوا۔" وہ یکدم سیدھا کھڑا ہو کر ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے کسی خیال میں گم ہو گیا۔

ایک بجھی بجھی افسردہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آکر منجمد ہوگئی پھر یکدم افسردگی سے سر کو جھٹکتے ہوئے مسکرادیا اور بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

"تم آرام کرو میں اپنی ڈیوٹی لگا کر آتا ہوں بقول تمہارے کسی حسینہ مہ جبینہ کی عیادت کی۔" وہ ہنستا ہوا باہر نکل گیا جبکہ ولید کچھ دیر تک دروازے پر لگے دبیز پردے کو دیکھتا رہا پھر آنکھیں بند کر

لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی اسے لگا اس کا ذہن بری طرح نقاہت کا شکار ہے اور جسم اس سے کہیں زیادہ تھکن اور کمزوری کی گرفت میں ہے۔

ہلکی کروٹ بدلنے پر بازو اور کندھے سے شدید ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئیں‘ وہ بہت کچھ سوچنا چاہ رہا تھا مگر باوجود کوشش کے وہ آنکھیں کھولنے پر ناکام ہو رہا تھا‘ اس میں نقاہت سے زیادہ اسی انجکشن کا دخل تھا جو نرس اسے لگا کر گئی تھی۔

X...X...X

گھر کی طرف روانہ ہوتے ہوئے سکندر کے ذہن میں توقیر شاہ کی کہی ہوئی باتیں نئے سرے سے گونجنے لگیں‘ کبھی نگاہوں تلے وہ فوٹو گرافس آجاتیں کبھی جیب میں رکھی کیسٹ کسی بھاری اور ناقابل برداشت بوجھ کی طرح محسوس ہونے لگتی۔ غیر محسوس طور پر اس نے بائیک کی رفتار بڑھادی۔

جوں ہی گھر میں داخل ہوا۔ دروازہ تانیہ نے کھولا تھا۔ وہ شاید ابھی نہا کر نکلی تھی‘ اس کے بے حد سلکی بال اس کے کندھوں پر پھسلتے پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔

شفاف‘ رعنائیوں سے مہکا ہوا چہرہ اور آنکھوں میں مچلتا لاابالی پن‘ سکندر کی نگاہوں کی گرفت میں آکر اس کی روح پر کوڑے کی طرح لگا۔

اس کی آنکھوں کے زیریں کنارہ پر ہلکی سی سرخی اتر آئی۔

یکایک اس کے سر میں دھماد ھم ہونے لگی‘ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کردے۔

اسے بتائے کہ وہ کس ذلت سے دوچار ہو کر گھر آیا ہے۔اماں کہتی ہیں آبرو جگ میں رہے تو بادشاہی جانیے' آہ ان کے گھر کی یہ بادشاہی بھی چھن گئی ہے۔

درد کا ایک سمندر اس کے سینے میں اتر آیا اور اس کی طوفانی موجیں پیہم یلغار کرنے لگیں۔

بائیک کچھ اس انداز میں اس نے اندر لاکر روکی اور تانیہ کو دیکھا کہ ایک پل کے لئے تانیہ سٹپٹا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

سلام کرنے کے لئے کھلنے والے لب یونہی کھلے رہ گئے' وہ اس پر ایک اجنبی نگاہ ڈال کر اندر چلا گیا۔

اس نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھا' کچھ غیر معمولی پن کا احساس سا ہوا۔

"ارے کھانا کیوں نہیں کھا رہا یہ لڑکا۔" وہ اندر آئی تو اماں نادیہ آپا سے کہہ رہی تھیں۔

"پتہ نہیں کہہ رہا ہے بھوک نہیں ہے۔"

"لو بھوک کیوں نہیں ہے' جائو تانیہ دروازہ بجائو اس کا طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی؟" تانیہ نے اماں کی بات پر نادیہ آپی کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر پریشانی دکھائی دے رہی تھی۔

تانیہ اٹھنے لگی کہ وہ بولیں۔"ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔" وہ اٹھ کر سکندر کے کمرے میں چلی آئیں سکندر جوتوں سمیت بیڈ پر دراز تھا اور چھت کو خالی خالی نظروں سے تک رہا تھا۔

"کیا بات ہے سکندر' کوئی مسئلہ ہے کیا۔"

سکندر نے چہرہ ذرا سا موڑ کر انہیں دیکھا اور بے خیالی میں کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا' یکدم اسے اپنی آنکھوں کے گوشوں میں نمی کا احساس ہونے لگا' اس کی فطری... نرم مزاجی نے غم و غصے کو واپس دل میں اتار لینے پر مجبور کر دیا۔

"کیا بات ہے سکندر کچھ بتائو پلیز۔" نادیہ آپی کو تشویش ہونے لگی۔ وہ اس کے نزدیک آکر بیٹھیں تو وہ چونک کر ایک گہری مضمحل سی سانس بھر کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں پریشان ہوں بہت زیادہ' ولید کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" پھر وہ انہیں تفصیل بتانے لگا۔

"اب خطرے والی تو کوئی بات نہیں ہے مگر بہرحال' اگر مردان علی شاہ نے اس پر حملہ کروایا ہے تو پھر خطرے والی بات ہے' وہ ایسی کوشش دوسری بار بھی کر سکتا ہے۔"

"مائی گاڈ! سگے رشتے بھی اتنے ظالم ہو سکتے ہیں۔" نادیہ آپی نے ایک جھرجھری سی لی پھر تشویش کے عالم میں بولیں۔

"آغا جی اور انکل تو بے حد پریشان ہوں گے' وہ ولید کو سمجھاتے کیوں نہیں ہیں کہ وہ ان لوگوں سے دشمنی نہ مول لے' جب وہ اپنے سگے بھائی کو قتل کر سکتے ہیں تو بھتیجے کی ان کی نظر میں کیا اہمیت ہو گی۔"

"آغا جی اور جہانگیر انکل تو ازحد پریشان ہیں' مگر ولید بہت ضدی ہے میرا نہیں خیال کہ وہ اپنے ارادے سے ایک انچ بھی ہلے گا۔" سکندر بیڈ سے اتر گیا اور کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

"کچھ زخم ایسے ہی ہوتے ہیں شاید جو کبھی نہیں بھرتے۔" وہ تولیہ اٹھا کر غسل خانے میں چلا گیا۔

نادیہ آپی نے باہر جا کر ولید حسن کے ایکسیڈنٹ کی خبر اماں کو دی۔

"تب ہی کہوں صبح سے میرا دل کیوں گھبرا رہا تھا' ایک پل قرار نہیں تھا' ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے' میں تو وہم سمجھ کر ٹالتی رہی یا حیی یا قیوم کا ورد کرتی رہی۔ کیا خبر تھی ایسی بری خبر سننے کو ملے گی۔" اماں ملول سی ہو گئیں۔

تانیہ بھی دل گرفتہ سی تخت پر بیٹھ گئی۔

"سکندر کیا کر رہا ہے؟" انہوں نے تکیے کے نیچے سے تسبیح نکالتے ہوئے آزردہ لہجے میں پوچھا۔

"شاید نہا رہا ہے۔" وہ فریج کی طرف بڑھیں "تانیہ نومی کو بھی بلا لو' اس نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔" انہوں نے گم سم بیٹھی تانیہ سے کہا تو وہ اٹھنے لگی تب سکندر کمرے سے باہر نکلا' گیلے بالوں پر تولیہ رگڑتے ہوئے اس کی نظریں تانیہ پر اٹھیں اور جیسے نئے سرے سے رگوں میں وہی سرسراہٹ ہونے لگی۔

"بال باندھ کر رکھا کرو اور سر پر ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھ کر رکھو۔" اس نے بالکل اچانک اسے مخاطب کر کے کچھ ایسی ترخ کے ساتھ کہا تھا تانیہ تو تانیہ نادیہ آپی بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

ہمیشہ نرماہٹ' اپنائیت سے بات کرنے والے کے لہجے میں اتنے کٹیلے پن کا اترنا حیرت کی ہی بات تھی۔اماں نے بھی اس کی طرف دیکھا تو پھر دوسرے پل نرمی سے بولیں۔

"تم کھانا کھالو۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے اماں۔" وہ یکدم ڈھیلے انداز میں کرسی پر ڈھیر ہونے کے انداز میں بیٹھ گیا اور سر کرسی کی پشت سے لگا لیا۔

تانیہ کا جھینپ کر جلدی سے بال لپیٹنا اور پھر سر ڈھک کر سرخ چہرے کے ساتھ نظریں جھکا کر وہاں سے چلے جانا اسے نادم کر گیا۔

(ہو سکتا ہے یہ سب توقیر شاہ کی محض سازش ہو یوں بھی ایسے لوگوں سے کسی بھی طرح کی سازش مکاری کی توقع کی جاسکتی ہے)

ایک اضطراب اس کی روح پر چٹکیاں بھرنے لگا' اماں ایک تشویش سے اسے دیکھ رہی تھیں تب اس نے ہلکی سی سانس بھر کر نادیہ کی طرف دیکھا اور بولیں۔

"کھانا ادھر ہی لگادو' آج ہوا اچھی چل رہی ہے' موسم خاصا بہتر ہو گیا ہے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ہر موسم دل کے اندر رہے موسم سے نظارہ کیوں مانگیں۔"

نومی آستین فولڈ کرتا ہوا گنگناتا ہوا آیا سکندر نے اسے دیکھا اور ہلکے سے مسکرا دیا۔

"کیا بات ہے آج صبح سے گھر پر ہو' گئے نہیں ہو اپنی جاب پر۔"

"ایک شاپ کی ڈیلنگ ہو رہی ہے دعا کریں وہ فروخت ہو جائے بیس لاکھ کی دکان ہے دو فیصد کمیشن ملنے کا امکان ہے۔" اس نے ہمیشہ کی طرح فراٹے سے جھوٹ بولا۔

"مجھے بھی دکھانا وہ ہمارے فاروقی صاحب کو ایک شاپ چاہئے۔ہو سکتا ہے وہ بھی کوئی سودا کر لیں' سکندر نے البتہ سچ بولا۔"کئی دنوں سے فاروقی صاحب کہہ رہے ہیں کوئی اچھی دکان انہیں چاہئے' جو اچھے شاپنگ سنٹر میں ہو مطلب چلتے ہوئے اور فرنٹ کی طرف ہو تو زیادہ اچھا ہے۔"

"جی ضرور لے آیئے گا کسی دن فاروقی صاحب کو' میں دکھادوں گا۔" وہ سکندر سے نظریں چرا کر دستر خوان پر بیٹھ گیا جہاں نادیہ آپی لوازمات سجا رہی تھیں' سکندر بھی خاموشی سے کھانا کھانے لگا' فریج کے پاس تانیہ ٹھنڈا پانی نکالنے آئی تو اس نے کچھ سوچ کر اسے پکارا۔

"تانیہ' تمہاری کلاس میں ولید کا ایک کزن پڑھتا ہے' آئی مین مردان علی شاہ کا بیٹا' اکبر علی شاہ کیا تم اسے جانتی ہو۔"

یہ سوال اس قدر غیر متوقع اور اچانک سا تھا کہ تانیہ کے ہاتھ سے کانچ کی نفیس بوتل پھسلتے پھسلتے بچی' اس کا سانس سینے میں اٹک کر رہ گیا تھا وہ بس سکندر کو دیکھ کر رہ گئی۔

ادھر نادیہ آپا نے بے ساختہ تانیہ کو پھر سکندر کو دیکھا مگر سکندر سے نظریں ملنے پر جلدی سے نگاہیں موڑ لیں جبکہ تانیہ فریج بند کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں' مگر وہ ولید بھائی کا کزن تھا۔ اس کا علم مجھے خود آج کل ہی ہوا ہے۔" اسے خود اپنی آواز چھنسی چھنسی سی محسوس ہوئی' اس کا نظریں چرانا اور نادیہ آپا کا رخ موڑ لینا سکندر کے اندر طوفان لے آیا' اس نے بہ نظر غور تانیہ کو دیکھا۔

"کس ٹائپ کا لڑکا ہے یہ اکبر علی' کچھ جانتی ہو تم۔" اس کا لہجہ بظاہر سادہ سا تھا مگر اس کی نگاہوں میں تانیہ کو اپنے لئے عجیب سی چبھن کا احساس ہوا۔

اسے اچانک ہی یوں لگا جیسے اس کی ذات پر سکندر کو شبہ ہو رہا ہو اور وہ کسی طرح کی تصدیق کے لئے اس سے یہ ذکر چھیڑ بیٹھا ہے مگر دوسرے پل اس نے اپنے اس خوف کو سمیٹ لیا کہ

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

یہ محض اس کا اپنا وہم بھی ہو سکتا ہے' یا پھر اپنے اندر کا چور اسے سراسیمہ کئے دے رہا ہے یونہی خطرے کی گھنٹیاں بجا رہا ہو' یوں بھی اس طرح کی چھپی دس غلافوں میں لپٹی محبت میں ہزار وہم' خوف اور اندیشے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

"بس اتنا... اتنا زیادہ نہیں جانتی۔" کوشش کے باوجود اس کا لہجہ اعتماد سے خالی رہا اور آواز میں مجرمانہ سرگوشی سمٹ آئی تھی مگر اس سے زیادہ اس کے نظریں چرا لینے کے انداز نے سکندر کو چونکایا تھا اور اس کا ذہن توقیر شاہ کی گفتگو کی طرف بھٹک گیا۔

جس انداز اور اعتماد کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے یہ بات کہی تھی اور وہ لفافہ پکڑایا تھا گویا بالکل آگ پر اس نے ہاتھ رکھا تھا۔

"بس جیسے بڑے باپ کے بگڑے اور عیاش لڑکے ہوتے ہیں وہ بھی کچھ ایسا ہی لڑکا ہے۔" نادیہ آپی دستر خوان سے جھوٹے برتن اٹھاتے ہوئے بے ساختہ بول گئیں۔ سکندر نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"آپ کیسے جانتی ہیں اسے؟" ایک عجیب سی اذیت اس کے لہجے میں اتر آئی۔

نادیہ آپی کو شاید اپنی حماقت کا احساس ہو گیا' وہ لاجواب سی ہو کر چند ثانیے تک اس کا منہ تکتی رہ گئیں سکندر کے دماغ میں خلفشار برپا ہو گیا' ساری خوش فہمیاں' ساری امیدیں' پارہ پارہ ہو کر طمانچوں کی طرح اسے اپنے دل کے رخسار پر پڑتی محسوس ہونے لگیں' وہ جارحانہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا' مگر اس سے پہلے نادیہ کچھ کہتی دروازہ پورے زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔

"خدایا خیر!... یہ کون آ گیا اس طرح۔" اماں ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ گئیں ان کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔

نومی نے غیر محسوس طور پر اپنا ہاتھ کھانے سے کھینچ لیا اور وال کلاک کی طرف دیکھا۔

سکندر نے جیسے ہی دروازہ کھولا سید صاحب حواس باختہ سے دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے اور سکندر پر نظریں پڑتے ہی وہیں رک گئے۔

"کیا بات ہے سید صاحب! خیریت تو ہے۔" سکندر نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا' مگر وہ ڈھیلے انداز میں یوں ہی کھڑے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا ابھی فرش پر ڈھے جائیں گے۔

"سید صاحب اندر آئیے۔" سکندر نے نرمی سے انہیں تھاما۔ وہ خستہ لکڑی کی طرح اس کے کندھے سے لگ گئے اور بچوں کی طرح بلک پڑے۔

سکندر دم سادھے رہ گیا' اسے لگا جیسے کوئی مضبوط وزنی دروازہ اکھڑ کر اس کے اوپر آ گرا ہو سید صاحب کا متناسب جسم کسی دکھ کے شدید بوجھ سے لرز رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے اندر کی ساری توانائی ختم ہو گئی ہو۔ وہ مٹی کا ڈھیر ہو کر اس کے اوپر آ گرے ہوں۔

سکندر نے نرمی سے انہیں تھاما اور کرسی پر بٹھانا چاہا کہ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"سکندر! میری بچی صبح کالج گئی تھی مگر ابھی تک نہیں لوٹی' میں نے کالج میں پتہ کرایا تو پتہ چلا کہ وہ کالج پہنچی ہی نہیں تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے سکندر! کیسے ممکن ہے' میری بچی ایسی نہیں کہ خود سے ادھر ادھر جائے' اس کے قدم کبھی غلط راستے پر پڑ ہی نہیں سکتے۔"

یہ کہتے کہتے وہ بلک بلک کر رو پڑے۔

صحن میں یکدم موت کا سناٹا اتر آیا' دراصل یہ سناٹا یہاں موجود سب کے اپنے اپنے سینوں میں اترا تھا اور فضا میں تاریکی جیسی ہیبت بھر گیا۔

سکندر گم صم سا سید صاحب کو تکتا رہ گیا' اسے فوری طور پر سمجھ نہیں آئی کہ اس کا کیا ردعمل ہونا چاہیے شاید وہ بھی سب کی طرح اس خبر کے عفریت کے زیر اثر تھا۔

"آرام سے بیٹھیے سید صاحب! ہو سکتا ہے وہ کسی سہیلی وہیلی کی طرف چلی گئی ہو یوں بھی اس عمر میں لڑکیاں نری لاپرواہ ہوتی ہیں۔" اماں نے سب سے پہلے خود کو سنبھالا تھا۔

"نہیں' وہ ایسی نہیں ہے' وہ بہت سمجھدار ذمہ دار اور حساس لڑکی ہے' وہ تو کالج میں دس منٹ لیٹ ہو جانے پر فون کھڑکا دیتی ہے گھر پر' سکندر کچھ کرو' خدا کے لئے کچھ کرو' ورنہ میں تو جیتے جی مر جائوں گا۔"

سید صاحب کی آہ زاری' سسکیاں پورے صحن میں گونجنے لگیں اور دلوں پر ضرب لگانے لگیں' یہ ضرب نومی بھی اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور سب سے نظریں بچا کر باہر نکل گیا۔

اس کا دل سینے کی چہار دیواری میں کسی دیوانے کی طرح ٹکرانے لگا' ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی سینے کی دیوار پھاڑ کر ابلتے خون کے ساتھ باہر آ گرے گا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تو گویا عظمیٰ یاسر کے آدمیوں کے ہاتھ لگ چکی تھی' اس خیال نے ہی اسے پسینے میں تربتر کر دیا' وہ تیز تیز چلتا ہوا سڑک تک آ گیا اور بجلی کے پول کے نیچے بنے سیمنٹ کے چبوترے پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا' اسے اپنے احساسات اور کیفیات پر اتنا قابو نہیں تھا شاید اسی لئے وہ گھر سے نکل آیا تھا تاکہ کسی کی نظروں میں مشکوک نہ ہو پائے' کتنی دیر وہ یونہی گم سم بیٹھا اس خبر پر یقین کرنے کی کوشش کرتا رہا' سید صاحب کی سسکیاں ان کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے والے لفظوں کے پتھر اسے اپنے دل پر برستے محسوس ہو رہے تھے' اسے اپنی رگوں میں خون چنگھاڑتی لہروں کی طرح دوڑتا بھاگتا محسوس ہو رہا تھا۔

ایک گہری سانس سینے کی تہ سے کھینچتے ہوئے اس نے اپنا گھومتا ہوا سر پول سے ٹکا دیا۔

X...X...X

وہ آنکھیں کھول کر کتنی دیر خالی ذہن چھت کو تکتا رہا۔ اسے بالکل بھی اندازہ بھی نہیں تھا کہ انجکشن کے زیر اثر کتنی دیر سوتا رہا ہے؟ چھت کو تکتے تکتے اپنا ذہن بیدار کرنے لگا' اچانک

اسے احساس ہوا کوئی اس کے دائیں طرف موجود ہے اس نے گردن گھما کر دیکھا تو شہرینہ کو موجود پایا۔ دونوں ہاتھ لپیٹے وہ بالکل ست سے انداز میں بیٹھی تھی، خوبصورت ریشمی بال دوپٹے کے اطراف سے نکل کر چہرے

پر منتشر تھے لیکن اس بے ترتیبی میں بھی حسن تھا، اسے جاگتے اور اپنی طرف انہاک سے دیکھتا پا کر وہ سٹپٹا گئی۔

"آپ کیسے... کیسے ہیں اب۔" اس کی بے تابی، گھبراہٹ، پریشانی دیکھنے کے قابل تھی، شاید وہ اس کے یوں مدہوش پڑے وجود سے ہزار وہموں کا شکار ہو چکی تھی۔

"تم کب آئیں کس کے ساتھ آئی ہو۔" الٹا وہ پوچھنے لگا... حقیقتاً اسے ہاسپٹل کے اس کمرے میں بے رنگ، مضمحل فضا میں دیکھ کر خوشگواریت کا احساس ہوا تھا۔

"میں آغا جی کے ساتھ آئی ہوں، وہ چہل قدمی کرنے کے لئے لان میں گئے ہیں، وسیم بھائی کو انہوں نے زبردستی گھر بھیجا ہے۔"

ارے وسیم یہیں پر تھا ابھی تک۔"

"جی فجر کے وقت گئے ہیں۔"

"تو گویا تم لوگ بھی خاصے وقت سے یہیں ہو۔" اس نے بغور اس کا چہرہ دیکھا جہاں ادھوری نیند کی ٹوٹی ہوئی کرچیاں آنکھوں میں سرخی بھری ہوئی تھی، مگر اس میں ایک عجیب سے اداسی رقم تھی۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" وہ اس کے مستقل دیکھتے رہنے پر خواہ مخواہ ٹیبل پر رکھی دوائوں کی ترتیب درست کرنے لگی۔

"بس کسی کی آہ لگتے لگتے رہ گئی، ورنہ اجل کے فرشتے کو لبیک کہہ چکا ہوتا اب تک۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تو شہرینہ نے ترچھی نظر اس پر ڈالی پھر قدرے متاسفانہ انداز میں بولی۔

"اسکی بددعائیں اور آہیں بھی اس کی دعائوں کی طرح بے اثر ہوں گی شاید۔" پھر رخ اس کی طرف کرتے ہوئے بولی۔ "پھر تو آپ کو گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

ولید نے ذرا سا چونک کر از سر نو اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تم بہت تیزی سے حقیقت پسند اور دانش مند ہوتی جا رہی ہو۔"

"حادثے انسان کو حقیقت پسند بنا دیتے ہیں۔" وہ گھر سے لایا ہوا ٹفن کیریئر کھولنے لگی۔

"حادثے۔" اس نے گردن موڑ کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"ایسے کتنے حادثے تمہیں پیش آچکے ہیں چند مہینوں میں۔"

وہ جھلس گئی تاہم' سنجیدگی بلکہ کسی حد تک افسردگی سے مسکرائی۔

"ضروری نہیں کہ ہر حادثہ آپ کو بستر پر لٹا ہی دے کچھ حادثے بظاہر دکھائی نہیں دیتے' ظاہری طور پر رونما نہیں ہوتے۔" اس کا لہجہ دھیما تھا پھر جلدی سے سر جھٹک کر اس کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔

"امی نے آپ کے لئے ناشتا بھیجا ہے ان کے خیال میں آپ ہاسپٹل کے بدمزہ کھانے کھا کھا کر بے زار ہوگئے ہوں گے۔"

"آہ' ہا... میں تو ہاسپٹل کے بیڈ پر لیٹے لیٹے بھی بے زار ہو گیا ہوں' کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے چپکے سے یہاں سے نکال کر لے جائو۔" اس کا انداز شرارتی تھا۔

مگر اس کی نگاہوں میں جانے کیا تھا' شہرینہ کو یکدم اپنا چہرہ تپتہ ہوا محسوس ہونے لگا اس نے سرعت سے پلکوں کی جھالریں گرادیں۔

(اف یہ شخص اس حالت میں بھی کیسا جاذبوں سے پر لگتا ہے)

"اچھا چھوڑو کم از کم ایک کام تو کر سکتی ہو کہ اگر ڈاکٹر کہیں آس پاس دستیاب ہو تو پلیز اسے بلا کر مجھے اس ڈرپ سے نجات دلا دو' میں یوں مریضوں کی طرح پڑے پڑے عاجز آ گیا ہوں۔ اگر مزید اسی طرح لیٹے لیٹے دیواروں کو بلکہ چھت کر گھورتا رہا تو یا تو فلسفی بن جائوں گا یا پھر نفسیاتی مریض۔"

وہ اس کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑی۔

"ویسے دونوں صورتوں میں ہی آپ کو مینٹل ہاسپٹل منتقل کرنا پڑے گا۔"

"آہ' جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔"

ولید نے اسے دیکھتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھری' وہ مسکراہٹ لبوں میں دباتی اس کے لئے ناشتا ٹرے میں سجانے لگی پھر گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"ارے یہ‘ یہ کیا کر رہے ہیں۔" وہ اسے رگ میں لگی سوئی کو نکالنے کی کوشش کرتا دیکھ کر اس کی طرف لپکی۔

"ڈرپ ہٹا رہا ہوں‘ تاکہ خود کو مزید خستہ حال اور بے یار و مددگار مریض سمجھ سمجھ کر احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں‘ تم لوگ تو جانے مجھ سے کس جنم کا بدلہ لے رہے ہو۔"

کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لگا رہنے دیجیئے اسے‘ بس اب ختم ہونے ہی والی ہے۔" اس نے اس کے ڈرپ لگے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ایک پل کے لئے اس کے لمس کا ٹھنڈا احساس ولید کو اپنی رگوں میں اترتا محسوس ہوا۔

"اس ڈرپ سے اچھی تمہاری مسیحا انگلیاں ہیں۔" یہ فقرہ بے ساختہ اس کے دل سے امڈ کر لبوں تک آیا مگر اس نے جذبوں کی لگامیں بروقت کھینچ کر اس جملے کا گلا گھونٹ ڈالا‘ وہ مہکتے سراپے کے ساتھ اس کے اتنے نزدیک تھی کہ جھکنے پر اس کے دوپٹے کے اندر سے اس کے نکلنے والے بالوں کی خوشگوار مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی اور جیسے حواس تک مہک اٹھے‘ اس نے باقاعدہ ناک قریب لے جا کر سونگھنے کے انداز میں اس مہک کو مکمل اپنے اندر اتارا تو وہ گھبرا کر یکدم پیچھے ہٹی۔

ایک عجیب سے احساس نے اسے خود میں سمٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا یوں یکدم گھبرا کر خود میں سمٹ جانا ولید کے لئے خاصا دلچسپ اور دلفریب تجربہ تھا۔ وہ اسے مسکراتی اور دلچسپ نظروں سے تکنے لگا‘ وہ رخ موڑ کر دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے بولی۔

"ناشتا تو شاید ابھی تک آپ نے کیا نہیں ہو گا۔"

"صبح صبح یہ ڈرپ ناشتے کے طور پر ہی شاید لگا گئی ہے۔" کوئی مہربان نرس‘ مگر اس قطرہ قطرہ ٹپکنے والی خوراک سے میرا ناشتا مکمل تو نہیں ہو گا‘ آنٹی نے کیا بھیجا ہے؟ تم نے اپنے سگھڑاپے کا ثبوت دینے کی کوئی کوشش تو نہیں کی۔"

"اتنا فالتو وقت نہیں تھا میرے پاس۔" وہ اس کے مذاق اڑانے والے انداز پر اسے گھور کر دیکھنے لگی۔

"اچھا ہی ہوا کہ نہیں تھا۔" اس نے ایک طمانیت آمیز سانس بھری پھر تکیہ اونچا کر کے بیٹھ گیا اور کھڑکی کے پردے کی ڈور کھینچ کر پردے ایک طرف ہٹا دیئے مگر یوں بیٹھے بیٹھے سلائڈ کھولنا اس کے لئے مشکل تھا اس نے مدد طلب نظروں سے شہرینہ کو دیکھا۔

”شیری اسے کھولنا تو' پتہ تو چلے صبح صبح اس کمرے کے علاوہ باہر کا موسم بھی کیا اتنا ہی خوبصورت ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے بھرپور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ناشتے کی ٹرے اس کے آگے رکھ کر جلدی سے پلٹ کر سلائیڈ کھولنے لگی اسے لگا کہ اس کی انگلیاں سلائیڈ کی فریم پر مضبوطی سے جم نہیں رہیں اور ان میں ہلکا سا ارتعاش ہے۔

دل الگ سینے کی دیوار میں دیوانے کی طرح ٹکرا رہا تھا۔

'یا اللہ یہ آج کیا ہو گیا تھا ولید حسن کو' اس کی نگاہوں میں یہ کیسی گرمی ہے جو اسے پگھلا رہی ہے۔'

ناشتے کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کی بھوک چمکا دی تھی' وہ ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا اور شہرینہ نے شکر ادا کیا اور وہیں کھڑکی سے لگی باہر دیکھنے لگی۔

”اف یہ ڈرپ۔“ ولید نے تنگ کر آ کر ڈرپ لگے ہاتھ کو گھورا تو وہ مسکرا کر آگے بڑھی اور احتیاط سے اس کے ہاتھ سے ٹیپ اتارنے لگی' پھر سوئی نس سے کھینچ کر اس پر ٹیبل سے

اسپرٹ کا پھایا اٹھا کر اس جگہ پر ملنے لگی' ولید کو اس کی مہارت سے سوئی نکالنے پر اچھی خاصی حیرت ہوئی تھی۔

پھر وہ اٹھ کر اس کے کمرے کی ترتیب درست کرنے لگی۔

”یہ آج تم پر کچھ مختلف قسم کا دورہ نہیں پڑا' مثلاً ہمدردی' عنایت' کرم نوازی وغیرہ وغیرہ قسم کا؟“ وہ ناشتا کرنے کے ساتھ ساتھ اسے دیکھنے لگا۔

”آپ کو اس حال میں دیکھ کر رحم جو آ گیا ہے۔“ وہ دوبدو بولی۔

”دیکھو دیکھو تم مجھے خواہ مخواہ میں احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کر رہی ہو' میں تمہیں قابل رحم نظر آتا ہوں۔“

اس نے ہونٹ دبا کر مسکراہٹ روک کر اس کی طرف دیکھا پھر فریج سے پانی کی بوتل نکال کر ٹھنڈا یخ پانی گلاس میں بھر کر اس بڑی سی کھڑکی کے پاس آ کر باہر جھانکنے لگی۔

”آغا جی پتہ نہیں کدھر رہ گئے ہیں۔“ وہ باہر جھانکتے جھانکتے بری طرح ٹھٹکی اور بالکل چپ ہو گئی اس کی نظریں پارکنگ الاٹ میں رکنے والی لمبی سی گاڑی پر جم گئی تھی۔ اس کے چہرے

کے تاثرات میں یک بیک ہونے والی تبدیلی نے ولید کو پر تجسس کر دیا اور اس نے اس کی نظروں کے تعاقب میں باہر جھانکا تو ایک بے ساختہ گہری سانس اس کے لبوں سے نکل گئی۔

وہ مردان علی شاہ کی ذاتی گاڑی تھی جس میں سے آمنہ علی، اپنے مخصوص حلیے اور انداز سے باہر نکلی تھی۔ جبکہ پچھلی نشست کے دوسرے دروازے سے مردان علی شاہر باہر آرہے تھے۔

اگلی سیٹوں پر ڈرائیور اور ایک باڈی گارڈ ٹائپ آدمی تھا۔ ولید نے نظریں کھڑکی سے ہٹالیں اور ناشتے کی ریوالونگ ٹیبل دھکیل کر اپنے سامنے سے ہٹائی اور شہرینہ پر ایک گہری نظر ڈال کر بولا۔

"شہرینہ تم گھر جاؤ میرے پاس آغا جی ہیں نا۔" اس کا لہجہ تحکم آمیز تھا۔

اس نے تڑک کر جھٹکے سے رخ مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"تمہاری یہاں موجودگی اچھی بات نہیں ہے میرے ملاقاتی آتے رہیں گے یہاں پر۔" وہ نظریں چرا کر تکیے پر سر ڈال کر اسی لہجے میں بولا۔

شہرینہ کا چہرہ یکایک تاریک سا ہو گیا جیسے بہت کچھ کھو دینے کا غم غصے میں بدل کر چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ مگر آہستہ آہستہ وہ خود کو سنبھال کر آہستگی سے پیچھے ہٹی۔ استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ

کر ٹوٹ گئی۔

"ہاں شاید کچھ ملاقاتیوں کو اعتراض ہو اور ناحق غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی ہو جائے اور آپ پہلے ہی کم تکلیف میں نہیں ہیں۔" وہ ہلکے سے ہنسی، ہنسی گویا کسی افسردگی کو چھپانے کا بہانہ تھی اور اپنے شولڈر بیگ سے سیاہ اسکارف نکال کر اوڑھنے لگی۔

"ہیلو ولید!" کمرے میں آمنہ علی کی آواز گونجی اور لمحے بھر کی مضمحل خاموشی میں ارتعاش پیدا کر گئی وہ شہرینہ کو قطعی نظر انداز کرتی تشویش اور اپنائیت کے عالم میں ولید کے بیڈ کی طرف بڑھی۔

ولید نے آنکھیں کھول دیں مگر آمنہ علی کی بجائے اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں، جہاں سے وہ باد نسیم کے جھونکے کی طرح گزر کر جا چکی تھی۔

اس نے ایک ہلکی سی سانس بھری، کسی خیال کو ذہن سے جھٹکا اور آمنہ علی کی طرف دیکھا جو اسے قدرے بہتر حالت میں دیکھ کر ایک طمانیت بھری سانس بھر کر مسکرائی تھی۔

"تھینکس گاڈ کہ تم..."

"زندہ ہوں۔" وہ اس کا جملہ اچک کر بولا اور تکیے کے سہارے بیڈ کے پشتے سے لگتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ شاید سوچ رہے ہوگے کہ میں اپاہج سا بستر پر پڑا ملوں گا اور میری نظریں تم سب کی ہمدردیاں سمیٹنے دروازے پر لگی ہوں گی۔" اس نے استہزائیہ مسکراہٹ اس پر پھینکی۔

"خدا نہ کرے جو میں اس طرح کی باتیں سوچوں۔" وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر سہلانے لگی، ولید نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا دیا، وہ کچھ جھینپ کر قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں ولید تم سے، تم نے مجھ سے کیوں چھپائے رکھا کہ تم میرے فرسٹ کزن ہو، میرا کتنا نزدیکی رشتہ ہے تم سے۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اوہ۔" ولید کے ہونٹ بے ساختہ سیٹی کے انداز میں سکڑ گئے، اس نے ایک ہلکی سی سانس بھر کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

وہ پرس سے رومال نکال کر اس نے اپنی آنکھوں کے کناروں پر رکھ کر ہلکے سے تھپکتے ہوئے انتہائی غمزدگی کا تاثر دے رہی تھی، اب نہ جانے یہ تاثر حقیقی تھا یا وہ غمزدگی کی یہ کیفیت زبردستی پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ویسے تمہارا دوسرا روپ بلکہ اصلی روپ اتنا برا بھی نہیں تھا، تم خواہ مخواہ گلٹی فیل کر رہی ہو، انسان کو ہمیشہ وہی نظر آنا چاہئے جو وہ ہوتا ہے، وہ نہیں جو وہ نہیں ہوتا، اس طرح زندگی آسان گزرتی ہے۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں ولید! میں بہت شرمندہ ہوں۔" اس کا لہجہ اور بھی ملول ہو گیا۔

"بہت اچھی بات ہے شرمندگی کے آنسو اللہ کو بے حد پسند ہیں مگر جب یہ صرف تنہائی میں اللہ کے سامنے ہی بہائے جائیں۔" وہ تائیدی انداز میں سر ہلا کر بولا۔

آمنہ علی کے ہونٹ میکانکی انداز میں آپس میں باہم جڑ گئے وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

مردان علی شاہ اندر داخل ہوئے تو چہرے پر وحشت کے آثار تھے مگر کمرے کے وسط میں رک کر انہوں نے ایک طویل طمانیت انگیز قسم کی سانس بھر کر اس کی طرف تیزی سے بڑھے۔

"رب کا شکر ہے کہ تم خیریت سے ہو' اس حادثے کی خبر نے تو مجھے اندر ہی اندر بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ میں ایک پل چین سے نہیں سویا' دل چاہا اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جائوں مگر میں اسلام آباد میں نہ ہوتا تو یقینا کل ہی آجاتا' یہ سب کیسے ہو گیا بابا' کون ہیں وہ ظالم سفاک لوگ' جو لوگوں کی زندگی سے یوں کھلے عام کھیلتے ہیں۔"

انہوں نے طیش کے عالم میں ایک لمحے کو مٹھیاں بھینچیں پھر دوسرے پل چہرے پر سارے جہاں کی شفقت سجا کر اس کے اوپر یوں جھک آئے جیسے ابھی اس کی پیشانی کا بوسہ لے لیں گے' پھر ہلکے سے اس کے چہروں پر یوں ہاتھ پھیرا جیسے کوئی شفیق قسم کا محبت کا مارا باپ بچھڑے ہوئے بیٹے کو سامنے پا کر اسے سینے سے لگانے کے بعد اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر اس کے زندہ ہونے کا یقین کرتا ہے۔

مگر وہ نہ تو ایسا کوئی محبت کا مارا باپ تھا' نہ شفیق قسم کا انسان اور نہ ہی ولید سے ایسی پدرانہ محبت تھی۔

ولید نے دل ہی دل میں ان کی اس بھرپور ایکٹنگ پر انہیں داد دی اور دھیمے سے مسکرا کر اپنی بے زاری اور غصے کو اندر ہی سمیٹ لیا۔

"اللہ کا کرم ہے کہ آپ کی دعائوں سے زندہ ہوں' موت کسی انسان کے اختیار میں ہوتی تو شاید میں اس وقت قبر میں ہوتا' صد شکر کہ یہ طاقت اور اختیار انسان کو نہیں دیا گیا' تشریف رکھیے ناحق آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت اٹھائی۔"

مردان علی شاہ نے اس کے لہجے اور طنزیہ مسکراہٹ کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے اس کے آخری جملے پر اپنائیت بھرے انداز میں اسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔

"کیسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہو۔" وہ بیڈ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر کچھ اسطرح مسکراتے ہوئے پیار چھلکاتی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے' پھر مسکراتے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"تمہارے اور میرے بیچ اجنبیت کی وہ دیوار تو خیر گر چکی ہے مگر پہلی بار جب آمنہ بچڑی نے مجھے تم سے ملوایا تھا تب ہی تمہیں دیکھ کر میرے دل میں کچھ ایسے جذبات ابھر آئے تھے جیسے تم میرے بچھڑے ہوئے بیٹے ہو اور اب تو تم ہو ہی میرے بیٹے۔"

"بے شک میرا باپ دنیا میں نہیں ہے مگر میں اب بھی اسی باپ کا بیٹا کہلانا اور محسوس کرنا پسند کرتا ہوں، وہ ایک سیدھا سادھا معصوم، حساس اور ایماندار محب وطن شخص تھا، جس نے اپنی محنتی زندگی میں کبھی منافقت کا لبادہ نہیں اوڑھا۔"

ولید نے بڑی سرد نظروں سے مردان علی شاہ کے چہرے کی طرف دیکھا جن کے شفقت سے پھیلے ہوئے ہونٹ آپس میں جڑ گئے، ان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا مگر دوسرے پل وہ ہلکے سے ہنسے اور رومال سے چہرہ پونچھتے ہوئے سر کو ہلکے سے جنبش دی۔

"بے شک، بے شک میرے بھائی میں ایک نہیں لاکھوں خوبیاں تھیں، خدا اسے جنت الفردوس میں جگہ دے، مگر کیا کیا جائے کہ وہ عمر ہی مختصر لایا تھا۔" انہوں نے دکھ بھری سانس کھینچی اور ولید کی طرف پر خیال انداز میں دیکھ کر بولے۔

"تم بھی اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ موت اور زندگی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" کسی کو زندگی دینا یا موت کی نیند سلا دینا انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔"

ولید نے محسوس کیا وہ جتا ہی نہیں رہے تھے بلکہ ایک طرح سے اپنی صفائی میں دلیل پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس نے بڑے تحمل بھرے انداز میں سر ہلایا۔

"ہاں، مگر سبب پر تو بہر حال نگاہ جاتی ہی ہے، قتل کرنے والے کو پھانسی کا حکم دیا گیا ہے، چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے، اگر اس طرح اسی خیال سے ہر قاتل کو، ہر چور کو ہر بے ایمان کو چھوڑ دیا جائے تو یہ دنیا تباہ ہو چکی ہوتی، بلکہ یہ جو اسلام ہے وہ پھیلتا ہی نہیں، امن لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہ ہوتا، بہر حال۔" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر سر تکیے کی پشت سے لگا لیا۔ "میرا باپ اپنی عمر مختصر لکھوا کر لایا تھا مگر اسے زندگی سے محروم کرنے والے نے اپنے اعمال نامے میں ایک قتل لکھوا لیا ہے۔" اس کا لہجہ خود بخود تلخ سا ہو گیا، پھر وہ دائیں طرف گردن موڑ کر مردان علی شاہ کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے بولا۔

"ابھی ہم توکل اور یقین کے اس بلند مینارے پر نہیں چڑھے کہ سبب نظر انداز کر دیں۔"

مردان علی شاہ ہلکے سے مسکرائے۔

"تم یقیناً لفظوں کو استعمال کرنے کے فن سے واقف ہو' اپنے باپ کی طرح انسان کی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہو' مگر زندگی کے بارے میں تمہارا تجربہ ابھی کچا ہے۔ اس لئے کہ عمر میں تم مجھ سے بہت پیچھے ہو اور تجربہ عمر سے حاصل ہوتا ہے کتابوں سے نہیں۔"

"یقیناً مجھے اپنے عمر اور تجربے میں پیچھے ہونے پر کوئی اختلاف نہیں۔" اس نے لقمہ دیا مگر مردان علی شاہ اس کی دخل اندازی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔

"میں ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی کسی مکھی تک کو مارنے کا حکم جاری نہیں کرتا اور نہ ہی میں ایسی باتوں کو انا کا مسئلہ بناتا ہوں۔ جہاں دوسروں کی بہتری اور بقاء کا معاملہ ہو وہاں میں سر جھکانے میں قطعی عار محسوس نہیں کرتا' تمہیں خبر تو ہو گی کہ حسن جب ہماری آبائی سیٹ کے لئے میرے مقابل آیا تو میں اس کی محبت میں خود پیچھے ہٹ گیا' اس کے شوق اور اس کی لگن کو میں بھلا کیسے نظر انداز کر دیتا' اگر چاہتا تو یہ سیٹ اس وقت بھی میرا ہی نصیب

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

بنتی مگر چونکہ وہ میرا بھائی تھا' مجھے بے حد عزیز' وہ کچھ کرنا چاہتا تھا سو میں اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا اور پیچھے ہٹ گیا۔"

"وہ ایک پل کو رکے پھر اسی اپنائیت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

"تم ناحق مجھ سے بدگمان ہو' یاد ہے جب تم اتنے سے تھے تو میری انگلی پکڑ کر حویلی کے باغیچے میں ٹہلا کرتے تھے۔"

انہوں نے انگلی اور انگوٹھے کے درمیان ذرا سا فاصلہ رکھتے ہوئے اشارہ کیا' مگر ولید کو لاکھ کوشش کے باوجود یاد نہ آیا کہ اس نے کب ان کی انگلی پکڑ کر حویلی کے باغیچے کی سیر کی تھی تاہم کسی قسم کی تردید کرنے کی بجائے محض استہزائیہ مسکراہٹ اچھالنے پر اکتفا کیا پھر یاد آنے پر بولا۔

"آپ فدا حسین کی عیادت کو گئے' وہ بھی تو میرے ہمراہ اسی گاڑی میں تھا۔ اسے بھی چوٹیں آئی تھیں۔" اس نے مردان علی شاہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے یہ بات کہی۔

"ہاں ہاں، شاہدہ کا فون آیا تھا، اسی نے یہ اطلاع دی تھی مجھے، خدا کا شکر ہے کہ وہ بچ گیا، میری بچڑی پر مصیبت آتے آتے رہ گئی۔" انہوں نے انجان بننے کا ارادہ یکدم رد کر کے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"فدا حسین کی پجیرو بم سے اڑا دی گئی ہے۔اس کی اطلاع بھی شاید آپ کو مل گئی ہو گی۔"

"نہیں فدا بھائی نے یہ خبر تو نہیں دی ہمیں۔" مردان علی کے بجائے آمنہ علی جلدی سے بولی، دونوں باپ بیٹی یکدم ہی کچھ مضطرب سے دکھائی دینے لگے تھے۔

"عجیب ہی اتفاق تھا کہ دونوں گاڑیوں کو ایک ہی وقت اور ایک ہی دن نشانہ بنایا گیا۔"

"سیاست میں تو یہ سب ہوتا ہی ہے برخودار، میں اسی لئے فدا حسین کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔"

مردان علی شاہ طنز سے ہنس پڑے پھر ولید سے نظریں ملنے پر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بولے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اور اس گھامڑ کے بچے کو تو سیاست کی الف ب بھی نہیں آتی، اس کے پیچھے تو کوئی اور ہی شاطر ہاتھ ہے، وہ تو محض کٹھ پتلی ہے۔" پھر وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر کرسی کی پشت سے لگتے ہوئے جیسے اپنی ہی بات سے محفوظ ہو کر بولے۔

"میرا تو خیال ہے اصل مزہ تو شاید اسی سیاست میں آتا ہو گا جو پردے کے پیچھے رہ کر کی جائے، تمہارا کیا خیال ہے۔" وہ کرسی سمیت اس کی طرف جھکے ولید نے کندھے اچکا دیئے۔

"کیا کہہ سکتا ہوں کوئی تجربہ نہیں ہے اس سلسلے میں۔"

اس کی بات پر مردان علی شاہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔تاہم خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے۔

"فدا حسین جیسا ناقص العقل آدمی سیاست میں آ کر بھی کیا کر سکتا ہے۔" ان کا انداز سراسر تضحیک آمیز تھا۔ولید کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"سوئے ہوئے سانپ کو مردہ سمجھ لینا نادانی ہوتی ہے۔مردان علی شاہ! یہ بے خبری میں ہی نقصان پہنچا جاتا ہے۔"

"میں اچھی طرح جانتا ہوں تم اسے میرے خلاف استعمال کر رہے ہو۔"

مردان علی شاہ کے جبڑے یکدم کھنچ گئے۔ان کے چہرے پر پھیلی خوش خلقی دھوئیں کے غول کی مانند ان کے چہرے سے گم ہو گئی تھی۔

ولید نے بھنویں اچکا کر ان کی طرف دیکھا۔

"مثلاً کیسے؟ کیسے استعمال کر سکتا ہوں۔"

"زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔" وہ کرسی سمیت جھک کر اس کے بیڈ کے کنارے پر ہتھیلیاں جما کر اسے کڑے تیوروں سے گھورنے لگے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ذہنی اور جسمانی دونوں طور پر اسمارٹ ہوں۔یہ گواہی آپ اپنی بیٹی سے بھی لے سکتے ہیں۔" اس نے نگاہوں کا رخ آمنہ علی کی طرف موڑا جو اس کی بات پر اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئی۔مردان علی شاہ ایک دو پل دانت پر دانت جمائے اسے گھورتے رہے پھر جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر اٹھتے ہوئے بولے۔

"فدا حسین جیسے بے عقل، بے لگام گھوڑے اور ایک پریشان حال، مفلوک الحال صحافی سکندر رضا کے بل بوتے پر تم خود کو طرم خان سمجھنے لگے ہو۔یہ سہارے محض کمزور لکڑیوں کی مانند ہیں جو تمہیں ایک دن دھڑام سے نیچے گرا دیں گے۔"

ولید نے ہلکے سے قہقہہ لگایا۔

"بہت بہت شکریہ چچا حضور اس پیشین گوئی کا، مگر ہمارے یہاں نوے فیصد پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں۔، پہلی بات تو یہ ہے کہ فدا حسین جیسا بے عقل، بے لگام گھوڑا در حقیقت مجھے آپ کیخلاف استعمال کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے، اور خواب دیکھنا تو کوئی بری بات نہیں ہے اور دوسری بات، سکندر رضا میرا ہمنوا نہیں ہے وہ سچ لکھنے والا ایک قلم کار ہے، جو معاشرے میں رونما ہوتا ہے وہ وہی قلم بند کرتا ہے۔" اس کی بات کے اختتام پر مردان علی شاہ عجیب سے انداز میں مسکرائے، پھر یہ مسکراہٹ آہستہ آہستہ سکڑ گئی اور ان کی گھنی بھنویں کمان سی بن گئیں، وہ اپنے کرتے کا دامن جھٹک کر ٹھیک کرتے ہوئے بولے۔

"اپنے اس سچ لکھنے والے دوست سے کہنا کہ سچ لکھنے کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے بسا اوقات۔"

ولید نے ایک ہلکی سی سانس بھر کر قدرے بگڑے تیوروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"تو آپ اسے دھمکی اور دھونس سے دبانے کی کوشش کریں گے۔"

"نہ، نہ بابا ہم ایسی سیاست نہیں کرتے۔" وہ جلدی سے بولے۔

"ہمیں کیا ضرورت پڑی کسی کو دھونس دھمکی دینے کی، یہ دو ٹکے کے اخبار بھلا میرا کیا بگاڑ لیں گے، سائیں...اینی وے۔" انہوں نے کندھے اچکائے اور ولید کے چہرے کی طرف دیکھا جو کسی وائلن کے تاروں کی طرف تنا ہوا تھا۔

"میں تو تمہیں بھی سمجھا رہا ہوں، عقل کا راستہ دکھا رہا ہوں اور اسے بھی سمجھانے کو کہہ رہا ہوں، عقل کے ناخن لے لو ورنہ...."

"ورنہ آپ تو ٹریلر بھی دکھا چکے ہیں۔" ولید نے ان کی بات اچک کر اپنے پٹی میں جکڑے بازو کی طرف اشارہ کیا تو مردان علی شاہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر کندھے اچکا دیئے۔

"تم ایسا سمجھتے ہو تو چلو یونہی سہی، میرے پاس یوں بھی فضول وقت نہیں ہے تردید اور وضاحتوں کیلئے۔"

"ارے ہاں ہاں بچڑی آمنہ!" وہ آمنہ کی طرف مڑے جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔

"بابا توقیر شاہ کی شادی کا کارڈ تو دو ناں ولید کو۔ یہ میرا اپنا خون ہے۔ اسے تو اپنے بھائی کی شادی میں نا صرف آنا ہی چاہیے بلکہ جوش و خروش سے ہر رسم میں شامل ہونا چاہیے۔"

ان کے یاد دلانے پر آمنہ علی نے اپنے شولڈر بیگ کی زپ کھول کر اس میں سے دعوتی کارڈ نکال کر ولید کی طرف بڑھا دیا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم اس میں ضرور شرکت کرو گے۔"

ولید نے چپ چاپ کارڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اس پر لکھی تاریخ پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر اسے سرہانے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"وعدہ تو نہیں کرتا، کوشش کروں گا۔"

"ہم نے تو تمہیں دل سے بھتیجا تسلیم کر لیا ہے، آگے تمہاری مرضی۔"

مردان علی شاہ مسکرا کر شفقت سے بولے' پھر آمنہ علی کی طرف دیکھا جو ایک دوسرا کارڈ نکال کر ولید کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"یہ کارڈ شہرینہ کیلئے ہے۔"

اس نے قدرے متعجب ہو کر اس کی طرف دیکھا تو وہ زیر لب مسکرادی۔

"یہ میری طرف سے نہیں ہے بلکہ میرے بھائی اکبر علی شاہ کی طرف سے ہے' دونوں کلاس فیلوز ہی نہیں ہیں بلکہ اچھے فرینڈز بھی ہیں' مے بی یہ بات تمہارے علم میں نہ ہو۔"

اس نے ایک واضح مسکراہٹ اچھالی اور ایک ٹک ولید کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ مردان علی شاہ ان دونوں سے بے نیاز ہونے کی کوشش کرتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گئے تھے۔

"اگر یہ انوی ٹیشن اکبر علی شاہ خود ہی اپنی فرینڈ کو دے دیتا تو زیادہ اچھا رہتا۔" اس نے اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل رکھتے ہوئے کارڈ بے نیازی سے ایک طرف ڈال دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ہاں' یہ دینے کی حد تک تو اسے یہ کام خود ہی کر لینا چاہیے تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ کچھ مرحلے طے کرتے ہوئے اسے یوں بھی میری ہی ضرورت پیش آئے گی اور کچھ بزرگوں کی' اینی وے' مجھے امید ہے کہ تم اپنی کزن کو لے کر اپنے بھائی کی شادی میں ضرور آؤ گے۔"

جواباً ولید نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اسے دیکھا۔

وہ مردان علی شاہ کے پیچھے کمرے سے نکل گئی مگر اسے لگا جیسے وہ اس کی کوئی ایسی رگ چھو گئی ہے جس نے اس کے اندر انتشار برپا کر دیا تھا۔ رگ رگ کو کوئی چیز کاٹتی محسوس ہونے لگی' اس نے کارڈ کو دیکھا جس کے ہلکے سرمئی رنگ کے لفافے پر "مائی شہرینہ خان۔" سنہری رنگ سے چمک رہا تھا اس نے اسے اٹھانے کو ہاتھ بڑھا دیا مگر آغا جی کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر غیر محسوس طور پر ہاتھ کھینچ لیا۔

"چلے گئے تمہارے مہمان۔" وہ کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گئے۔

"میں تو انہیں دیکھ کر احتیاطاً ہی باہر رک گیا تھا۔ از سم تھنگ رونگ؟"

وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"ہوں بہت بڑی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔" اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں، پھر آہستگی سے کھولیں تو آغا جی اس کی شکل دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے خیال سے چونک کر ہنس پڑا۔

"کوئی گڑبڑ وڑبڑ نہیں ہے، آپ بتایئے کہاں رہ گئے تھے۔ شیری بتا رہی تھی آپ باغ کی سیر کو گئے ہیں۔ کس شہر کے کس باغ کی سیر کو چلے گئے تھے۔"

"حد ادب لڑکے! بتا تو رہا ہوں کہ تمہارے چچا حضور کو دیکھ کر حفظ ماتقدم کے طور پر باہر ہی رہ گیا تھا تا کہ کوئی بدمزگی نہ ہو جائے، یہ شیری بچی کہاں ہے دکھائی نہیں دے رہی ہے؟"

انہیں اچانک شہرینہ کا خیال آیا۔ ولید نے لب بے ساختہ بھینچ کر نظریں چرا لیں۔

"اس لڑکی کی سمجھ نہیں آتی، آس پڑوس کے کمروں میں چلی گئی ہو گی عیادت کو۔" آغا جی ہلکے سے ہنسے۔

"اسے میں نے گھر بھیج دیا ہے؟" وہ آہستگی سے بولا۔

"وہاٹ... گھر بھیج دیا۔" آغا جی حیرت سے اچھلے پھر بغور اسے گھور کر دیکھا۔ وہ سامنے دیوار پر نظریں جمائے ہوئے تھا، ذرا سا نگاہوں کا رخ ان کی طرف کیا پھر پیشانی پر انگلیاں رگڑنے لگا۔

"کیوں؟ کیوں گھر بھیج دیا، وہ میرے ساتھ آئی تھی اور میرے ساتھ ہی اسے جانا چاہیے تھا۔" ان کے لہجے میں یکایک ناراضگی، ناگواری اتر آئی جسے انہوں نے قطعی دبانے کی کوشش نہیں کی۔

"تم اس پر ابھی کتنا استحقاق رکھتے ہو۔" وہ اسٹک پر ہاتھ جما کر اس کی آنکھوں میں... خفگی سے جھانکتے ہوئے بولے، تو وہ لب بھینچ کر ایک دو پل ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پھر نظروں کا زاویہ بدل کر ہلکے سے ہنسا۔

"شاید کچھ بھی نہیں۔" اس کی ہنسی میں نہ شگفتگی تھی نہ تازگی ایک عجیب سی افسردگی تھی، اس کی نظریں چمکتے کارڈ پر جم گئیں اور رگ رگ سے آگ کی لپٹیں اٹھنے لگیں، مگر جلد ہی اس نے اپنی کیفیت کو سنبھالا اور آغا جی کی طرف دیکھا۔

"میں جانتا ہوں، میں اس پر ایسا کوئی استحقاق نہیں رکھتا مگر ایز آ فرینڈ میں نے اسے یہ حکم دیا تھا۔"

"ایز آ فرینڈ؟" آغا جی بے ساختہ ہنسنے لگے، وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔

"ہرگز نہیں، تم اس کے کبھی دوست نہیں رہے ہو۔"

"کیا بات ہے آج آپ پر اس بے وقوف لڑکی کی حمایت کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔" اس نے کم سن بچے کی طرح منہ پھلا کر انہیں دیکھا۔

"ہاں اس لیے کہ تمہاری بہت بے جا حمایت کر چکا ہوں اور آج اس کا نتیجہ بھی دیکھ رہا ہوں۔" انہوں نے اسٹک سے اس کے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اسٹک کی نوک اس کے سینے پر رکھتے ہوئے بولے۔

"یہ گولی یہاں بھی لگ سکتی تھی اور تم مجھے اس بڑھاپے میں بقیہ عمر کیلئے پچھتاوئوں میں چھوڑ جاتے، بس بہت ہو گئی تمہاری بے جا حمایت اب میں نے تمہاری جائز حمایت بھی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ اسٹک زمین پر ٹکا کر کھڑے ہو گئے۔ ولید نے بے ساختہ امڈ آنے والی ہنسی کو بہ مشکل دبایا اور جلدی سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اوکے میں آپ کی اس لاڈلی کم عقل پوتی کو ابھی واپس بلا لیتا ہوں، آپ اپنا فیصلہ واپس لے لیجئے۔" آغا جی جھٹکے سے پلٹے تو وہ جلدی سے پیچھے ہو گیا اور ہاتھ آگے کر دیئے۔

"اوکے، اوکے چلیں فیصلہ بھی واپس مت لیجئے مگر اس طرح گھوریں تو مت، میں خوامخواہ میں شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔"

"خوامخواہ میں۔" آغا جی نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا پھر ہلکی سانس بھر کر واپس کرسی پر بیٹھ گئے۔

X...X...X

مونا بھابی نے شہرینہ کے کمرے میں جھانکا تو وہ آنکھوں پر بازو دھرے اپنے بیڈ پر چت لیٹی تھی۔

"خدانخواستہ دشمنوں کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تمہارے اس ولید حسن صاحب کی طرف سے تو خیر خیریت ہی ہے نا۔ یوں تو مجھے بھی اچھی خبر ہی ملی تھی۔"

وہ اندر آ کر اس کے قریب بیڈ پر ہی بیٹھ گئیں، مگر وہ یونہی بغیر جنبش کے پڑی رہی۔

"اے فکر مت کرو بہت جلد وہ بھاگتا دوڑتا گھر آ جائے گا۔"

اس نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر بھابی کی طرف دیکھا پھر نظروں کا زاویہ بدل کر دیوار پر جما دیں۔

"میں اس وقت تانیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ آپ کی طرح مجھے ہر وقت ولید کی فکر نہیں ستاتی۔" اس نے اپنے چہرے سے ظاہر ہونے والی دل گرفتگی کا بروقت جواز ڈھونڈ نکالا۔ اور دل ہی دل میں خود کو داد دی۔

"اصولاً تو تمہیں ہی ستانی چاہیے تھی' خیر تانیہ کا کیا مسئلہ ہے۔"

وہ اس کی طرف دیکھنے لگیں پھر جیسے کسی خیال کے تحت ایک افسردہ سی سانس بھر کر بولیں۔

"بہت دن ہو گئے ہیں تم نے اس بے چاری کی خیر خبر نہیں لی' وہ ایگزام دے بھی رہی ہے یا نہیں۔"

"پتہ نہیں۔" وہ اٹھ کر بال لپیٹنے لگی' ایک مجروح مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر آئی۔

"کتنے فاصلے آ گئے ہیں دلوں کے درمیان' کہاں وہ میرے بناء ایک پیریڈ نہیں لیتی تھی اب کہاں اتنے دنوں سے خبر تک نہیں لی۔ حالانکہ اسے سکندر بھائی کے ذریعے ولید کے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ایکسیڈنٹ کی خبر بھی ہو گئی ہو گی اسی بہانے رابطہ کر لیتی۔ شاید وہ دانستہ مجھ سے گریز کر رہی ہے۔"

"تمہیں اس کے گریز کی وجہ معلوم تو ہے ہی نا' پھر شکوہ کیونکر؟" بھابی نے ملائمت سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

"چلو ہم ہی مل کر آتے ہیں نادیہ کی شادی کے بہانے ہی سہی۔ نادیہ سے تو تمہیں شکوہ نہیں ہے نا کوئی۔ اس بے چاری کی تو کچھ خبر لیں' چلو اٹھو۔"

"اس وقت؟" اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ "میرا مطلب ہے ابھی؟"

"کیوں ابھی کون سا کرفیو لگا ہوا ہے باہر؟" جواباً بھابی نے اسے آنکھیں دکھائیں پھر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ چمکتی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

"ولید سے ملنے پر تو جناب نے کوئی وقت نہیں دیکھا سویرے سویرے مرغ کی بانگ کے ساتھ نکل بھاگیں۔"

اس نے جلدی سے نظروں کا رخ پھیر لیا۔ ولید کے ذکر پر دل کے اندر چبھن سی ہونے لگتی تھی۔ وہ دوسری طرف سے بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

"سنو فٹافٹ تیار ہو کر باہر آ جائو۔ واپسی پر ولید کی خیر خبر بھی لے لیں گی کیا سوچ رہا ہو گا اکلوتی بھابی ہوں مگر خبر تک نہیں لی ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے ہاسپٹل جانے کی۔" وہ باتھ روم کی طرف جاتے جاتے رک کر پلٹی تھی۔

"بس تانیہ کی طرف جائیں گے اور پھر سیدھے گھر۔"

"اوہو۔ لگتا ہے پھر کچھ گڑبڑ کر کے آئی ہو وہاں سے۔"

بھابی اس کی شکل دیکھ کر بے ساختہ ہنسی تھیں مگر وہ رخ پھیر گئی' کوئی جواب نہیں دیا۔

"دراصل' وسیم کے دوست کی والدہ بھی اسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں اور وسیم مجھے کہہ کر گئے تھے کہ تم ان کی عیادت بھی کر لینا' اسی لیے جانا ضروری ہے' چلو دیکھ لیتے ہیں واپسی

پر وقت ہوا اور موڈ بنا تو ٹھیک ورنہ ایسا ضروری بھی نہیں ہے۔" انہوں نے کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر آ گئیں۔

کوئی پندرہ منٹ بعد وہ دونوں تانیہ کی طرف جانے کیلئے نکل رہی تھیں کہ مما نے ولید کیلئے تیار کیا ہوا لنچ انہیں پکڑا دیا۔

"پہلے اسے پہنچا دو۔ بچہ دوپہر سے بھوکا بیٹھا ہے' ہاسپٹل کے کھانے کھا کھا کر بدمزا ہو کر رہ گیا ہو گا میرا بچہ۔"

"مگر ہم تو تانیہ کی طرف جا رہے ہیں مما۔" وہ بری طرح جھلس گئی۔ بھابی بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ کو سر جھکا کر چھپا گئیں۔

"ہاں تو کون سا تم لوگ پیدل جا رہی ہوں' دس منٹ ہی تو زیادہ ہوں گے' اس کا ذرا خیال نہیں ہے تمہیں۔"

مما نے اسے آنکھیں دکھائیں اور لنچ بکس بھابی کو تھما دیا جسے انہوں نے کسی قیمتی متاع کی طرح احتیاط سے تھام لیا۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اسے بری طرح غصہ آ گیا۔ تاہم مما کے سامنے مزید کچھ کہنا گویا ان کے غصے کو للکارنا تھا' وہ کی بورڈ سے چابی اٹھاتی باہر نکل گئی۔

"اصولاً تو یہ کام سارے تمہیں کرنے چاہئیں تھے' اس کی تیمارداری' کھانا وانا بنانا اور پہنچانا' بلکہ کھلانا۔" فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بھابی نے شرارت سے اسے چھیڑا۔

"میرا دماغ ابھی اتنا زیادہ خراب نہیں ہوا ہے کہ ...."

"کہ اس کا دماغ خراب کرتی۔" بھابی نے اس کا جملہ اچک کر پورا کیا اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

وہ ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی پھر لب بھینچ کر گاڑی فل اسپینڈ پر چھوڑ دی۔

اسے میری تیمارداری' خاطرداری کی طلب ہی کب ہے اور رفاقت وہی پائیدار اور خوبصورت ہوتی ہے جو طلب بن کر ابھرے' زبردستی بھی بھلا دل کے تعلق جوڑے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں محبت بڑی شفاف چیز ہے کسی آئینے کی طرح' اس پر ہلکا سا ناگواری کا کوئی میلا چھینٹا بھی فوراً دکھائی دے جاتا ہے اور شاید ہر سچی اور خالص چیز کے ساتھ یہی مسئلہ ہے تھوڑا سا ناخالص احساس بھی یکدم بری طرح محسوس ہونے لگتا ہے۔

وہ بالکل گم سم ہو کر گاڑی چلانے لگی تھی' بھابی کو احساس ہونے لگا کہ بات کس حد تک سیریس ہے' انہیں شہرینہ اس وقت اس معصوم اداس چڑیا کی مانند دکھائی دے رہی تھی جس کا گھونسلہ کسی اونچائی سے گر گیا ہو اور وہ منڈیر پر بیٹھی اسے دل گرفتگی سے تک رہی ہو۔

یونہی اس سوچ پر وہ خود ہی گھبرا اٹھیں۔

ان کا دل لرز گیا۔

خدانہ کرے کہ وہ ایسی چڑیا ہو جس کا گھونسلہ ٹوٹ گیا ہو۔

وہ اپنے دل کو سرزنش کرنے لگیں۔ پھر دل کو بہلانے کیلئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔

ہاسپٹل کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی روک کر شہرینہ نے بھابی کی طرف دیکھا۔

"آپ جا کر دے آئیں' میں یہی بیٹھی ہوں۔"

"کیا مطلب یہیں بیٹھی ہو۔ بالکل ہی گدھی لڑکی ہو تم۔" انہوں نے جواباً سے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔

”اوہو صرف یہی تو دے کر آنا ہے۔“

”نہیں میں کچھ دیر وہاں بیٹھوں گی بھئی۔ بھئی جب آ ہی گئے ہیں تو دس پندرہ منٹوں سے کیا ہو جائے گا اور پھر وسیم کے دوست کی والدہ کی بھی خیر خبر لوں گی۔ پلیز شیری! اس طرح مت کرو' چلو اترو۔“ وہ منت کرنے لگیں' تو مجبوراً اسے اترنا پڑا۔ حالانکہ اس کا دل بالکل بھی اس شخص کی صورت دیکھنے کو نہیں چاہ رہا تھا اور پھر آغا جی بھی وہیں تھے' انہیں پتہ چلتا کہ شہرینہ گاڑی میں بیٹھی ہے تو وہ برہم ہو جاتے' سو وہ لامحالہ ان کے ساتھ چلنے لگی۔

ولید کے کمرے میں اس نے بھابی کے ساتھ قدم رکھا تو وہ کمرے میں بالکل اکیلا کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

”اوہو ہم تو یونہی رحم کھا کر چلے آئے' یہاں تو محترم ہٹے کٹے دکھائی دے رہے ہیں یعنی فل فارم میں ہیں۔“

بھابی نے ٹفن کیریئر اسٹینڈ پر رکھتے ہوئے اس کی طرف بغور دیکھا۔

لگتا ہے ہاسپٹل کی آب و ہوا تمہیں کچھ زیادہ ہی راس آگئی ہے۔ مجھے تو پہلے سے زیادہ سرخ و سپید تازہ دم دکھائی دے رہے ہو۔“

اس نے میگزین رول کیا اور ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے ایک ہلکی سی سانس بھری۔

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

”یونہی سہی۔“ اس نے اچٹتی نظر اس گوشے پر ڈالی جہاں وہ اس طرح کھڑی تھی گویا مارے بندھے چلی آئی ہو۔

”تم کبھی بھی شعر کو ڈھنگ سے مت پڑھنا۔“ بھابی اس کے انداز پر بے ساختہ کھل کھلا دی تھیں۔

”یہ مما نے تمہارے لیے بھیجا ہے بقول ان کے' ان کا بچہ بھوک سے بے حال ہو رہا ہوں گا آہا۔ اگر وہ آ کر دیکھ جاتیں تو شاید ان کی یہ غلط فہمی دور ہو جاتی۔“

"خیر اب ایسی بات بھی نہیں ہے' میں حقیقتاً اس لنچ کا منتظر تھا' بھوک سے بے حال ہی تھا۔ اب آپ میری ظاہری حالت پر مت جائیں' کبھی کبھی دل میں بھی جھانک لینا چاہیے ایسی بھی کیا بے مروتی۔"

"بھئی مجھے تو دل میں جھانکنے کا فن نہیں آتا۔"

"ہاں تو میں آپ کو تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔" اس نے بے ساختہ کہا پھر امڈنے والی مسکراہٹ دبا گیا۔ بھابی معنی خیز نظروں سے اسے گھورنے لگی تھیں۔

"تو جسے کہنا ہے اسے صاف لفظوں میں کہو نا' اتنے سیدھے اور شرمیلے تو تم ہو نہیں۔ خوامخواہ میں ایکٹنگ کر رہے ہو۔"

وہ اس کیلئے لنچ نکالتے ہوئے ڈپٹنے کے انداز میں بولیں اور ایک اچٹتی نظر شہرینہ پر ڈالی جو خود کو اس گفتگو سے بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بھئی تو میں نے کب خود کو شرمیلا گھبریلا ظاہر کیا ہے' اور یہ غلط فہمی آپ کو کیونکر ہونے لگی کہ میں صاف بلکہ بے خوف وخطر کہہ نہیں سکتا' جسے کہنا ہوتا ہے کہہ دیتا ہوں بلکہ کہہ چکا ہوں۔" اس کا انداز کسی حد تک سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ ایک پل کے لئے بھابی کا ہاتھ

پلیٹ اٹھاتے ہوئے لرز گیا' انہوں نے اس کے چہرے پر کھوجتی سی نظر ڈالی' مگر وہاں کمال اطمینان تھا۔ نظریں ملنے پر اس نے کندھے اچکا دیئے۔

ہم ہیں بیمار اور وہ بے زار

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

"اومائی گاڈ۔" بھابی بے ساختہ امڈنے والی ہنسی کو نہ دبا سکیں۔

"پھر غلط شعر' ارے ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار' یوں ہے یہ مصرعہ' اب کسی کی شاعری کی یوں ریڑھ تو مت لگاؤ ولید! سکندر یہاں ہوتا نا تو کھڑے کھڑے دو مکے تو مار ہی دیتا' اس بے چارے سے کسی شاعر کی شاعری کی اتنی انسلٹ برداشت ہی نہیں ہوتی۔"

"کیا کریں' مشتاق تو ہوں نہیں' ہاں بیمار ضرور ہوں۔" اس نے آگے جھک کر بھابی کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی۔

"بھابی پلیز! چلنا نہیں ہے کیا' ویسے ہی ہم لیٹ ہو گئے ہیں۔"

اس کا ضبط شاید چٹخ گیا تھا بگڑ کر بولی تو ان دونوں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا' مگر ولید نے نہایت اطمینان سے نظریں واپس موڑ لیں اور کھانے سے انصاف کرنے لگا۔

''ارے ہاں ولید! عامر کی والدہ یہیں ایڈمٹ ہیں' میں ذرا ان سے مل کر آتی ہوں۔ شیری یہیں پر ہے دیکھو اسے تنگ بالکل مت کرنا۔'' وہ لنچ بکس بند کر کے بڑی سرعت سے کہتی باہر نکل گئیں' شہرینہ انہیں روکنے کیلئے لفظ تلاش کرتی ہی رہ گئی' پھر بے بسی سے دروازے پر ایک نگاہ ڈال کر رہ گئی۔ ان کے جاتے ہی کمرے میں عجیب طرح کا سکوت اتر آیا۔ اس سے زیادہ گہرا سکوت شہرینہ کو اپنے دل پر اترتا محسوس ہوا جس سے گھبرا کر اس نے کرسی کھینچی اور بیٹھ کر اخبار اٹھا کر بے دلی سے اس پر نظریں دوڑانے لگی۔

ولید نے اس پر ایک نظر ڈالی پھر کھانے سے ہاتھ کھینچ کر پلیٹ قریبی تپائی پر رکھ دی۔

''شہرینہ۔'' اس نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اسے پکارا اور دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

اس کے لہجے میں نہ نرمی' اپنائیت تھی نہ تحکم' سپاٹ سا انداز تھا۔

''تمہاری ایک امانت میرے پاس ہے۔''

''میری امانت۔'' اس نے پوری کوشش کی کہ اس کے لہجے سے تجسس نہ جھلکنے پائے مگر کامیاب نہ ہو سکی اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک دعوتی کارڈ دیکھ کر بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

''یہ بطور میرے پاس تمہاری امانت ہی ہے جسے تم تک پہنچانا میرے ذمہ تھا گو کہ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی یہ کام مجھے درمیان سے نکال کر زیادہ خوش اسلوبی سے ہو سکتا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بھرپور تفصیلی نظر اس پر ڈالی پھر ایک ہلکی سی سانس بھری۔

ناحق ہم مجبوروں پہ تہمت ہے مختاری کی۔

''یہ کیا ہے۔''

وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کارڈ پر ایک نظر ڈال کر بولی۔

''نامے کسی بہار شائل سے آئے ہیں۔''

اس نے ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ کہا' ہنسی کیا تھی برچھی تھی جو اس کے دل میں ترازو ہو گئی' اس نے کارڈ اس کے ہاتھ سے چھیننے کے انداز میں لیا پھر لفافہ کھول کر ذرا سا باہر نکال کر اس پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر پھر حیرت سے اس پر نگاہ ڈالی۔

"یہ تو توقیر شاہ کی شادی کا کارڈ ہے۔ مگر میرے نام۔"

اس کے انداز میں حقیقی حیرت تھی۔ جواباً ولید نے صرف کندھے اچکانے پر اکتفا کیا مگر آنکھوں میں سراسر چبھتی کاٹ تھی جو بہت واضح تھی۔

"اوہ تو آمنہ علی شاہ نے۔"

"نہیں بلکہ اکبر علی شاہ کی طرف سے ہے۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا اور بڑی گہری سنجیدگی سے مسکرایا۔ اس کی اس مسکراہٹ میں جانے کیا تھا شہرینہ کو اپنے رخسار آگ میں دہکتے شعلوں کی مانند محسوس ہونے لگے' اس نے ایک بار پھر لفافے پر چمکتے اپنے نام کو دیکھا اور پھر ایک ہلکی سی سانس بھر کر کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

"کلاس فیلو ہونے کے ناتے وہ اپنے بھائی کی شادی میں ہم سب کو ہی انوائٹ کر رہا ہے تو ایسی تعجب خیز بات بھی نہیں ہے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے کارڈ دوبارہ اس کے بیڈ پر پھینکنا چاہا کہ

ولید نے ایک جھٹکے سے اس کی کلائی پکڑ کر یوں کھینچی کہ وہ لہرا کر اس کے نزدیک بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

"یہ کہہ کر تم صرف خود کو مطمئن کر سکتی ہو' وہ سب سے تو اس طرح کے یارانے نہیں نبھا رہا ہے۔"

اس کی مضبوط سخت انگلیاں وہ اپنی گداز کلائی میں کسی آہنی شکنجے کی مانند محسوس کرتے ہوئے کراہ اٹھی۔

"چھوڑیں یہ کیا بدتمیزی ہے' مجھے کیا ضرورت پڑی ہے آپ کو یا اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی۔" وہ اس کی گرفت میں مچلی۔ وہ جس نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا وہ اس کے اندر ایک آتش فشاں کو جنم دے رہی تھیں۔

"ہاں تمہیں کیا ضرورت پڑی ہے اسے دھوکا دینے کی' دوستی کوئی بری بات نہیں ہے۔ مگر اسے چھپا کر رکھنا تو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر سکتا ہے نا۔"

"ولید آپ۔" ایک پل کے لئے اس کے لب کانپ کر کھلے رہ گئے۔

"میری اور آمنہ علی کی فرینڈ شپ تو تمہارے سامنے ہے' مگر اکبر علی شاہ سے تمہاری یہ دوستی اتنے گہرے رازمیں رکھنے کا سبب۔"

"شٹ اپ۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹکے سے ہٹاتے ہوئے چلائی۔

"وہاٹ شٹ اپ۔" جواباً وہ اس سے زیادہ سخت لہجے میں بولا۔ پھر قدرے استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

"میں تمہیں بلیم تو نہیں کر رہا تھا' صرف تمہاری امانت تمہیں دے رہا تھا' وضاحتیں تو تم خود دینے لگیں۔"

دکھ اور غصے کے شدید ترین احساس نے اس کے لبوں سے گویائی جیسے لمحہ بھر کیلئے چھین لی' اس کا دل چاہا وہ اس کا خوبصورت چہرہ نوچ ڈالے' اسے شوٹ کر دے۔

کیسا لہجہ تھا۔

کیسی تحقیر تھی۔

وہ کسی ان دیکھی آگ میں دھڑ دھڑ جلنے لگی۔

یہ حملہ اسے اپنے اعصاب کی بڑی آزمائش ہی لگا۔ تاہم بہت جلد وہ اس اعصاب شکن حملے کی گرفت سے نکل آئی اور اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو ایک ٹک دیکھتے ہوئے یکدم کسی خیال کے تحت عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

"محترم ولید حسن صاحب! میرے اور آپ کے مابین ایسا کوئی تعلق ہی نہیں ہے جس کے زعم میں آپ مجھ سے بازپرس کرتے یا مجھے بلیم کرتے اور میں بھی کتنی بیوقوف ہوں کہ خوامخواہ ہی وضاحتیں صراحتیں دینے لگی' یہاں بھلا مجھے وضاحت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی اور وہ کارڈ اٹھا کر کسی قیمتی متاع کی طرح سنبھال لیا۔

ولید نے نظریں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی' اور مزید گویا ہوئی۔

"بہت بہت شکریہ اس امانت کے پہنچانے کا اور میرا ابھی یہی خیال ہے کہ یہ ذمہ داری ناحق آپ کو دی گئی آپ درمیان میں نہ ہوتے تو شاید زیادہ خوش اسلوبی سے مجھ تک پہنچتا۔"

اس نے یہ جملہ جوابی کارروائی کے طور پر بولا تھا۔

ولید کی نگاہوں میں جھلکتے شک کی تلملاہٹوں نے اسے اس کارکردگی پر اکسایا تھا۔ یکدم ہی اس پر اپنی تذلیل کا احساس غالب آ گیا تھا۔

کشیدگی اور اذیت کا احساس اس کے اندر کروٹیں لینے لگا اور بالکل لاشعوری طور پر وہ اپنی اذیت کا سارا حساب جیسے اس پل لینے لگی تھی۔

ولید کے چہرے کے بگڑے زاویوں نے اس پر ایک سرخوشی کا در وا کر دیا۔

وہ جس اضطراب، بے کلی، اذیت کا پل صراط وقتاً فوقتاً پار کرتی رہی تھی۔ ایسا ہی اضطراب اس پل اس کے چہرے پر بھی تھا۔

اس کی انا پر ایسی زبردست ضرب پڑی تھی کہ اس کے خوبصورت چہرے پر سکون اور طمانیت پل بھر میں رخصت ہو گیا تھا۔

ایسا ہی سکون اس کے اندر سے بھی رخصت ہوا تھا اور بار بار ہوا تھا۔

"اکبر علی شاہ کو تم جانتی ہو وہ کس قماش کا شخص ہے۔" وہ اپنے اوپر پڑی چادر ہٹا کر جھٹکے سے بیڈ سے اتر گیا۔

"ہاں وہ آپ کا کزن ہے، آپ کا خون، اور آمنہ علی کا بھائی ہے۔" اس نے اپنے اطمینان میں فرق نہ آنے دیا۔ ولید نے اسے سخت نظروں سے دیکھا۔

اس پل اس کی سنہری آنکھوں کا سنہرا پن کچھ اور گہرا ہو رہا تھا اور رخساروں کی سرخی میں بھی تیزی آ گئی تھی۔

اس کا شفاف بلور حسن ولید کے سینے میں گویا آگ بن کر دوڑنے لگا۔

اس نے جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اپنی سرخ تپتی آنکھیں گاڑتے ہوئے بولا۔

"وہ صرف میرا کزن یا آمنہ کا بھائی ہی نہیں ہے۔ مردان علی شاہ کا بیٹا ہے۔ ایک عیاش اور اوباش بیٹا۔"

اس کی آنکھوں سے ایسی چنگاریاں نکل رہی تھیں جو شہرینہ کو اپنی رگ رگ سے لپٹتی اور خون کو جماتی محسوس ہوئیں مگر دوسرے پل وہ اس کی گرفت سے نکل کر ایک لمحے توقف کے بعد تحقیرانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”کچھ لوگ منافق ہوتے ہیں۔ اپنا اوباش پن مہذب چادر میں ڈھانپ کر رکھتے ہیں‘ سو چھپے رہتے ہیں اور کچھ نظر آ جاتے ہیں اور رسوا ہو جاتے ہیں‘ شاید اکبر علی شاہ اسی فہرست میں ہو۔“

ولید نے سختی سے لب بھینچ لیے جیسے اپنا غصہ دبانے کی کوشش کی ہو پر کچھ کہنا چاہا مگر وہ سرعت سے پلٹ کر کمرے سے بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

لمبی سی راہداری سنسان پڑی تھی‘ دونوں طرف کے کھلے حصوں سے آتے ہوا کے جھونکے اسے یکدم اپنے تپتے ہوئے رخساروں پر بے حد خنک محسوس ہونے لگے۔

اس نے ہاتھ میں پکڑے اس کارڈ کو دیکھا تو اکبر علی شاہ کیخلاف نفرت کا ایک تیز ریلا اس کے اندر سے اٹھا۔ اس نے کارڈ کے دو ٹکڑے کر دیئے اور ڈسٹ بین میں ڈال کر وہیں ستون سے ٹیک لگا لی۔

یکدم ہی آنسو اس کی تپتی آنکھوں میں دوڑے چلے آئے۔

اپنے اس بے اختیارانہ فعل پر اسے شدت سے رونا آنے لگا وہ خود ہی نہ جان پائی کہ اسے اپنی مدافعت میں یہ سب کرنا چاہیے تھا یہ نہیں اور اس نے جو کچھ کیا ہے وہ درست ہے یا غلط۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ایک مضمحل سی سانس اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

X...X...X

سکندر کو اپنی رگوں میں صدیوں کی تھکن اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

عظمیٰ کی بازیابی کے سلسلے میں ناکامی نے اسے مزید نڈھال اور پریشان کر دیا تھا۔

بہت سی پریشان کن‘ دل گرفتہ سوچیں اسے آکٹوپس کی طرح جکڑے ہوئے تھیں۔

کبھی عظمیٰ کا خیال پورے رنج کے ساتھ اسے گرفت میں لے لیتا تھا تو کبھی تانیہ کا سراپا تصور میں آ کر دل پر آرے چلا رہا تھا۔

ایک بد دلی اور بے زاری نے اس پر حملہ کر دیا وہ کمرے میں بند ہو گیا۔

”چائے پی لو سکندر!“ نادیہ آپی نے کانچ کی تپائی اس کے بیڈ کی طرف کھینچی اور اس پر چائے کا کپ رکھ کر خود بھی وہیں فرش پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئیں۔

وہ بیڈ پر چت لیٹا کھڑکی پر لٹکتے ہلتے پردے کو تک رہا تھا جو پنکھے کی ہوا سے مسلسل مضطرب تھا۔

اسے لگ رہا تھا اس کا دل بھی ایسا ہی پردہ ہو جسے ایک پل قرار نہیں ہو' سکون نہ ہو' ٹھہراؤ نہ ہو پنکھے کی ہوا اسے بھی بے حال کئے ہوئے ہو۔

"کون سوچ سکتا تھا کہ سید صاحب کا ہنستا بستا گھر یوں آندھیوں کی نذر ہو جائے گا' ان کی عزت کی چادر پر درندے یوں حملہ کر ڈالیں گے۔"

نادیہ آپی کی آواز میں سارے جہاں کا سوز تھا' پھر انہوں نے بے جنبش پڑے سکندر کی طرف دیکھا اور اپنا نرم سبک ہاتھ اس کے بازو پر پھیرا۔

"چائے پی لو سکندر!"

"ہاں کون سوچ سکتا ہے کہ کب ہنستا بستا گھر آندھی کی نذر ہو جائے گا اور کب عزت کی چادر پر داغ لگ جائے گا۔"

اس نے ایک گہری ملول سی سانس بھری اور مجروح انداز میں ہنس دیا۔

"عزت اگر کانچ کے گلدان کی صورت ہوتی تو اسے شاید میں بھی بہت احتیاط سے لا کر میں رکھ دیتا ہمیشہ کیلئے اور... مگر۔"

"تم تو یوں بکھر کر بات مت کرو سکندر! تمہارے لب کا ٹوٹا پن ہم سب کو بھی توڑ دیتا ہے' سید صاحب کو بڑا آسرا ہے تمہارا۔" نادیہ آپی جیسے تڑپ گئیں۔ مگر سکندر لب بھینچے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں سرخیاں سی اترنے لگیں' پھر سر جھٹک کر مضمحل سی سانس بھرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کس کس کا ماتم کروں' عظمیٰ کا' اپنا یا پھر تانیہ کا؟"

"تان... تانیہ کا۔" نادیہ آپی کے اعصاب پر گویا جھٹکا لگا۔ انہوں نے قدرے تحیر سے سکندر کی طرف دیکھا مگر دوسرے پل سٹپٹا کر نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں وہ انہیں بڑی شکوہ کناں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"نادیہ تم سے' تم سے تو مجھے یہ امید نہیں تھی' ایسی نادانی کی' اس کم عقلی کی۔ یہ دیکھو میرے ہاتھ۔" اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں کھول کر سامنے کر دیں۔

"یہ بالکل خالی ہو گئے ہیں' بالکل کمزور نحیف' ان میں قلم پکڑنے کی طاقت نہیں رہی اور جانتی ہو یہ طاقت مجھ سے کس نے چھینی۔"

"سکندر!" نادیہ آپی نے کچھ کہنے کی خواہش کی پر لب کانپ کر رہ گئے۔ سکندر اب ان کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا اور جیسے ایک اذیت کا پل صراط پار کرتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

"اکبر علی شاہ کے بھائی' مردان شاہ کے بیٹے توقیر شاہ نے' مجھ سے مجھ سے یہ طاقت چھین لی۔" اس نے اسی کرب سے گزرتے ہوئے نادیہ آپی کو دیکھا جو اسی اعصاب شکن لمحات میں بالکل ہاتھ پیر چھوڑے ڈھیلی ہو کر مٹی کے ڈھیر کی مانند بیٹھی رہ گئی تھیں۔

دکھ اور ندامت کے گہرے احساس نے ان کے اعصاب کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا تھا' یہ بات اس طرح سکندر کے سامنے کھل جائے گی اور اس طور سے کہ وہ جھٹلانے کی بھی ہمت نہ کر پائیں گی۔ بہن اور عورت ہونے کے ناطے تانیہ کی رسوائی پر جتنا کڑھتی کم تھا۔ تاہم مدافعت کیلئے انہوں نے لفظ تلاش کرتے ہوئے سر اٹھا کر سکندر کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تانیہ بہت کم عقل اور بیوقوف لڑکی ہے سکندر! اسے دولت کی چمک اور خوبصورت لفظوں کی طلسم گری نے گھیر لیا تھا ورنہ وہ..." ان کے بقیہ الفاظ منہ میں رہ گئے سکندر کی طنزیہ مجروح ہنسی پر وہ شرمندگی سے لٹ کاٹ کر رہ گئیں۔

"ہم بدی اور برائی کے اسی طرح جواز گھڑ لیتے ہیں۔ یہی تو المیہ ہے' وہ نادان تھی تم تو نادان نہ تھیں' تم تو ان لفظوں اور دولت کی چمک پر اندھی نہیں تھیں پھر' پھر یہ نوبت یہاں تک کیسے پہنچی؟' بولو نادی نوبت یہاں تک کیسے پہنچی۔"

اس نے زخمی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے تکیے کے نیچے سے وہ کیسٹ نکال کر بڑے گھائل انداز میں فرش پر پھینکی اور کھڑا ہو گیا۔

"کوئی غیرت مند بھائی' باپ یا شخص اس ثبوت کے بعد اپنے قدموں پر جم کر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اس لمحے مجھے لگا کہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی گئی ہے اور یہ زمین توقیر شاہ نے نہیں تانیہ

نے کھینچی ہے' میری عزت پر سرعام طمانچے توقیر شاہ نے نہیں تانیہ نے مارے ہیں۔ نادیہ!... تانیہ نے مارے ہیں۔" وہ اضطرابی انداز میں ٹہلتا ہوا کانچ کی طرح ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ جو بہت اونچائی سے کسی پختہ فرش پر گرا ہو اور پور پور سے خون ابل رہا ہو۔

زخم بھی تو بہت گہرا تھا کیسے مندمل ہوتا۔ اپنی عزت کو سینت سینت کر رکھنے والا۔ عزت اور آن پر مر مٹنے والا گھرانہ۔ اس طرح رسوائی کی لپیٹ میں آ جائیگا اس کا تو گمان بھی نہ تھا مکینوں کو۔

نادیہ آپی کا دل سینے کی دیواروں میں زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ سکندر نے کھڑکی کھول کر ایک گہری سانس بھری' اسے اپنے اندر گھٹن کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ مگر یہ گھٹن موسم کی نہیں تھی اس کے اپنے اندر کی تھی۔

بیرونی ٹھنڈے مست جھونکے بھی اندر کی اس حدت کو کم نہیں کر سکتے تھے۔

نادیہ نے فرش پر پڑی کیسٹ کو اپنے مرتعش ہاتھ میں پکڑ کر ایک مضمحل سی سانس بھری اور اپنی جگہ سے اٹھیں۔ ''میں نے تانیہ کو بہت سمجھایا اور وہ کسی حد تک سمجھ بھی گئی مگر اتنا سب کچھ میرے علم میں آنے سے بہت پہلے ہو گیا۔'' انہوں نے کیسٹ پر ایک متاسفانہ نگاہ ڈالی۔

''تاہم میں خود کو اس الزام سے بری نہیں سمجھتی' یقیناً مجھ سے بھی کوتاہی ہو گئی' میں بڑی بہن ہونے کی ذمہ داری ٹھیک سے نباہ نہ سکی۔'' ان کا لہجہ مغموم ہو گیا۔ وہ چپ ہو کر اپنے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگیں مگر ضبط کے باوجود کئی قطرے ان کی لباب بھری آنکھوں کے کناروں سے نکل گئے۔

''ذمہ داری تو میں نہیں نباہ سکا' اس گھر کا سربراہ ہوں مگر...'' سکندر نے ایک تھکی سی نظر ان پر ڈالی اور مجروح انداز میں ہنس دیا۔ ''تم نے تو اس گھر کو سنبھال رکھا ہے کوتاہی تو مجھ سے ہوئی ہے' میں نومی کو ایک بہتر مستقبل نہ دے سکا' اس پر کڑی سخت نگاہ نہ رکھ سکا اور تانیہ کے سلسلے میں بھی میں نے ہی شاید غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ بہت کوتاہیاں ہوئی ہیں مجھ سے۔ مگر کہاں' کب' یہ ضرور سوچنا پڑے گا۔''

وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی پشت سے سر ٹکا کر ایک پل آنکھیں بند کر لیں' جیسے کسی خیال سے نجات پانے کی کوشش کر رہا ہو' مگر یہ خیال یا خواب نہیں تھا حقیقت تھی جو تمام تر سفاکی کے ہمراہ اس کے آگے پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے کچھ سوچ کر آنکھیں کھول کر اس کیسٹ پر ایک نظر ڈالی پھر نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم تانیہ سے کہہ دینا کہ وہ کل سے یونیورسٹی نہیں جائے گی اور نہ اسے امتحانات دینے کی ضرورت ہے' جتنا پڑھ لیا ہے یہی بہت ہے اس کے لئے۔" اس کا لہجہ سخت اور غیر لچکدار ہو گیا۔

نادیہ آپی نے بڑی بے بسی اور لاچاری سے اس کی طرف دیکھا۔

"تعلیم کی ڈگریاں بھی اس زخم کی تلافی نہیں کر سکتیں جو جذباتی عمر کا یہ دور دے جاتا ہے' اسے کہہ دینا کہ وہ کوئی احتجاج نہ کرے' اس میں اس کی اور ہم سب کی عافیت ہے۔"

اس کی آواز میں بے پناہ تھکن تھی۔

X...X...X

نادیہ آپی کمرے میں آئیں تو تانیہ جائے نماز لپیٹ رہی تھی۔ عظمیٰ کی بازیابی کیلئے وہ خصوصی دعائیں مانگ رہی تھی۔اس کی متورم آنکھیں اور مضمحل سراپا دیکھ کر ایک لمحے کو تو انہیں اپنے حوصلے ٹوٹتے محسوس ہوئے' وہ جس ارادے سے آئی تھیں اسی میں دراڑ سی پڑنے لگی۔

عظمیٰ کی گمشدگی نے اس پورے گھر کو ہی بے سکون کر کے رکھ دیا تھا مگر اب جو طوفان اس گھر کی طرف بڑھ رہا تھا' جس کی پہلی موج سکندر کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی' اس کا سدباب بھی ضروری تھا۔

"کیا بات ہے آپی! آپ رک کیوں گئیں اندر تو آیئے۔" وہ انہیں دروازے پر ہی جما دیکھ کر بولی۔

"کون سی نماز پڑھ رہی تھیں۔" وہ ڈھیلے قدموں سے اندر آ گئیں۔

"صلوٰۃ حاجت پڑھ رہی تھی۔ کوئی خاص بات؟ کوئی خبر وغیرہ ملی عظمیٰ کے سلسلے میں؟۔" وہ ان کے چہرے پر نگاہ ڈال کر پر خیال انداز میں بولی۔

"نہیں۔ سید صاحب اس کی ساری سہیلیوں کی طرف معلومات کرانے گئے تو ہیں‘ خدا خیر کی ہی خبر لائے۔" وہ جیسے نڈھال سی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ پیروں میں عجیب سی تھکن لپٹی محسوس ہونے لگی تھی۔

"ہاں خدا اچھی خبر ہی سنائے‘ سید صاحب کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی‘ مجھ سے تو پڑھائی بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔" وہ بیڈ پر بکھری کتابوں کو ایک طرف سمیٹتے ہوئے افسردگی سے بولی۔

"ایگزام سر پر آ گئے ہیں مگر ایک لفظ پڑھا نہیں جا رہا ہے‘ کتاب کھولتی ہوں تو عظمیٰ کا چہرہ گھومتا نظر آتا ہے۔ سوچا ہے کل یونیورسٹی چلی جاؤں‘ لائبریری میں بیٹھ کر شاید کچھ پڑھائی ہو جائے۔" وہ اپنی رو میں تھی اس نے نادیہ آپی کے چہرے پر ایک تکلیف دہ رنگ کو گزرتے نہیں دیکھا۔

وہ جس کرب سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھیں جو غم ان کے سینے پر پتھر کی طرح پڑا تھا اس سے وہ بے خبر تھی۔ مگر نادیہ آپی اسے مزید بے خبر نہیں رکھ سکتی تھیں۔

"تانیہ!" انہوں نے بہت کوشش کی کہ ان کا لہجہ نرم ہی رہے۔ مگر ذلت اور شرمندگی کے جن لمحات کا سامنا کیا تھا اس کی تھکن خود بخود پتھر بن کر ان کے لہجے میں اتر آئی۔

"تم کل یونیورسٹی نہیں جاؤ گی اور نہ ایگزام دو گی‘ جتنا پڑھ لیا ہے بہت ہے۔"

تانیہ نے خفیف سے جھٹکے سے سر اٹھا کر ان کی طرف بہ نظر غائر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تحیر کا آنا فطری تھا۔ مگر نادیہ آپی کے چہرے پر لکھی عبارت نے جیسے اسے سراسیمہ کر کے پلکیں جھپکانے پر مجبور کر دیا۔

" آپ سمجھتی ہیں آپی کہ میں اکبر شاہ سے ملنے کا بہانہ..."

"نہیں میں ایسا کچھ بھی قیاس نہیں کر رہی ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے نزدیک آ کر بیٹھ گئیں۔

"یہ میرا نہیں سکندر کا فیصلہ ہے جسے تم حکم بھی سمجھ لو۔" انہوں نے گویا اس کے اعصاب پر بم ہی بلاسٹ کر دیا تھا۔ وہ کتنے ثانیے تحیر آمیز بے یقینی سے اسی زاویے پر بیٹھی رہ گئی۔ ایک پل کے لئے سانس سینے میں اٹکتی محسوس ہونے لگی۔

"تو' تو آپ نے سکندر بھائی کو یہ... یہ سب کچھ بتا دیا۔"

اس نے تڑپ کر شکوہ کناں نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ایک پل کے لئے نادیہ کو اس کا رنگ برف کی مانند سفید پڑتا دکھائی دیا۔ ایک افسردہ مسکراہٹ ان کے لبوں پر ٹوٹ گئی۔

"کاش میں ہی اسے بتا دیتی تو شاید نوبت یہاں تک نہ آتی۔ زیادہ سے زیادہ تم مجھ سے خفا رہتیں، سکندر تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھاتا' یا اس کا خوف تمہارے پیروں میں زنجیر ڈال دیتا۔ مگر دکھ تو اسی بات کا ہے کہ یہ گرد اڑتی ہوئی اس کے کپڑوں پر لگی ہے پرائی ہوا نے یہ کیچڑ اس پر ملی ہے۔۔"

ایک متاسفانہ سانس ان کے سینے کی تہ سے آزاد ہو کر فضا کو بھی ملول کر گئی۔ تانیہ کا سارا وجود سن ہو گیا تھا۔ وہ یوں ساکت و صامت بیٹھی رہ گئی جیسے دفعتاً کسی نے پھانسی کا پھندہ اس کے گلے میں ڈال دیا ہو۔

"دیا ایک پھونک میں بجھ جاتا ہے تانی! مگر اسے جلانے کیلئے کتنا وقت' کتنا تیل اور کتنی محنت درکار ہوتی ہے یہ بجھانے والا نہیں جان سکتا۔ یہ دیکھو یہ وہ آگ ہے جو تم اپنے چہاروں طرف خود دہکا رہی تھیں اور جس کی لپیٹ میں آج سکندر آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کل میں بھی

آجائوں اور یہ گھر پورا ہی..." انہوں نے بوجھل ہاتھوں سے کیسٹ اس کی گود میں ڈال دی۔

تانیہ سکتے کی کیفیت سے باہر نکل آئی اور ایک نظر کیسٹ پر ڈال کر نادیہ آپی کو دیکھا' اس کے حواس بری طرح ٹوٹ پھوٹ رہے تھے۔

"یہ' یہ کیا ہے آپی!"

جواباً وہ اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"یہ کیا ہے آپی! پلیز کھل کر بتایئے نا یوں پہیلیاں مت بجھوائیں۔" وہ بھی جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔

نادیہ آپی کو اپنا دل غم سے پھٹتا محسوس ہوا۔

"اس میں وہ گفتگو ریکارڈ ہے جو تمہاری اکبر شاہ سے وقتاً فوقتاً فون پر ہوتی رہتی تھی اور کچھ تصاویر تھیں جو سکندر وہیں پھاڑ آیا اور یہ سب اکبر شاہ کا بھائی لے کر آیا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے تانیہ کے چہرے پر ایک کرب آمیز نگاہ ڈالی۔ جس کا سارا سراپا لرز رہا تھا۔ وہ جیسے شعلوں میں گھر گئی تھی۔ یوں وحشت زدہ دکھائی دے رہی تھی' یکدم چلا پڑی۔

"کیوں کیوں آخر اسے کیا ضرورت پڑی؟ نہیں یہ جھوٹ ہے' یہ جھوٹ ہے آپی!" وہ کیسٹ کو خوف بھری آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

"وہ سکندر کے قلم کے سچ کو دبانا چاہتے ہیں' اس کے قلم کی طاقت کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ افسوس' افسوس' تانیہ کہ سکندر کو اس کے اپنوں نے ہی کمزور کر دیا' وہ سب کیلئے سر تو بے دریغ کٹوا سکتا تھا مگر... مگر اب جو کام مردان علی اور توقیر شاہ ان تصاویر اور کیسٹ کے ذریعے کر سکتے ہیں وہ سکندر افورڈ نہیں کر سکتا' بولو۔ کیا ہم افورڈ کر سکتے ہیں وہ سب... نہیں نا۔"

کوئی شاید کند چھری سے بھی ذبح کرتا تو وہ یوں اذیت سے نہ گزرتی جو اس لمحے اس انکشاف کی چھریاں اسے کاٹ رہی تھیں۔

وہ جیسے اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔

یہ حقیقت رسوا کن انداز میں سکندر پر کھل چکی تھی۔ اس کیلئے یہ خیال ہی قیامت خیز تھا اس کا پورا وجود گویا زلزلے کی لپیٹ میں تھا۔

وہ اب کیسے سامنا کر سکے گی اس بھائی کا' جس کی آنکھوں سے اسے محبت' فخر' تحفظ اور عزت ملی تھی۔ جسکی اپنائیت آمیز مسکراہٹ میں اسے طمانیت ملتی تھی۔

اس کے پیر یکدم یوں جلنے لگے جیسے وہ ریت کے تپتے ٹیلے پر ننگے پاؤں اور ننگے سر کھڑی کر دی گئی ہو۔ بیچ بازار اس کے سر سے چادر کھینچ لی گئی ہو اور چادر کھینچنے والا ہاتھ وہ ہاتھ تھا جس کو اس نے دل کی نگہبانی سونپ ڈالی تھی۔ جسے اس نے اپنے دل کی بلند مسند پر بٹھایا تھا اور پوجنا شروع کر دیا تھا۔

وہ کیسے یقین کر لیتی کہ اس کا اعتماد' اس کا اعتبار پارہ پارہ ہو گیا ہے۔

وہ خوابوں کے محل دھڑام سے اس کے پیروں میں ڈھیر ہو گئے ہیں۔

اسکی آنکھوں میں دھند کا غبار چھانے لگا' کچھ کہنا چاہا مگر لب کپکپا کر رہ گئے۔

وہ اپنے آپ کو بامشکل گھسیٹتی بیڈ پر گر سی گئی۔

"اف ایسی رسوائی، ایسی بے اعتباری، اس حد تک نامعتبر ہو جائے گی وہ سب کی نگاہوں میں۔"

اس نے دھند کے اس پار نادیہ آپی کو دیکھا جن کی نظریں دکھ، تاسف اور رنج سے اس پر اٹھیں اسے کسی تلوار کی مانند محسوس ہونے لگیں جو سیدھی دل کے آر پار ہو رہی ہو۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ اپنے قدم واپس موڑلو، یہ محبت کا کھیل جہنم کی آگ کی طرح روح کی کھال سے لپٹ جائے گا، اس میں اتنازیاں ہوتا ہے کہ کچھ پانے کی خوشی بھی بہت کچھ کھو جانے کے ملبے میں دفن ہو جاتی ہے مگر شاید مجھے یہ باتیں تمہیں سمجھانے میں دیر ہو گئی ہے۔ تم اس چڑھتی ندی کی طرح بھاگی جا رہی تھیں۔ جب میں اس راز میں شریک ہوئی تب تک تم بہت دور جا چکی تھیں۔"

وہ پرملال مضمحل سی سانس بھر کر اس پر ایک تھکی تھکی سی نگاہ ڈال کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

باہر صحن میں ان کے اپنے دل میں اترتے سناٹے جیسا سناٹا اور ویرانی چھائی ہوئی تھی، اماں سید صاحب کی طرف سے ابھی لوٹی نہیں تھیں۔

انہوں نے ایک افسردہ سی نظر صحن میں دوڑائی اور تخت پر بیٹھ گئیں۔

کل تک اسی جگہ اور اسی وقت کھلکھلاہٹیں گونج رہی تھیں، تانیہ اور نومی اس کی شادی کے دنوں کا حساب لگاتے ہوئے اپنے اپنے پروگرام بنا رہے تھے، تانیہ کو اپنی شاپنگ اور امتحانات دونوں کی فکر کھائے جا رہی تھی، مگر باوجود اس کے اس کے لبوں پر قہقہے تھے، مگر آج... انہوں نے دل گرفتگی کے ساتھ اس بند دروازے کو دیکھا اور جیسے تھکن رگ رگ کو کاٹنے لگیں۔

کل تک ان کے اندر بھی شادیانے بج رہے تھے۔

احساسات پر مسحور کن نشہ چھایا ہوا تھا۔

ہر شے میں رنگ بھرے محسوس ہوتے تھے۔

اماں کی لائی ہوئی چیزوں میں جاذبیت، حسن اور مہک سی محسوس ہوتی تھی۔ تانیہ لاکھ کیڑے نکالتی، مگر انہیں کوئی شے بری ہی نہیں لگ رہی تھی وہ ایک سرشاری کے عالم میں ان چیزوں کی پیکنگ کر کے جہیز کے سوٹ کیس میں ڈال دیتیں۔ تانیہ کی شرارتوں کا جواب بس شرمگیں مسکراہٹ سے دیتیں اور نومی اوف یہ لڑکا بھی کتنا شرارتی ہو رہا تھا کل۔

گوری کے سر پر سج کے سہرے کے پھول کھلیں گے

تم ملے پیار ملا رے' ہو ہو تم ملے پیار ملا رہے

مل کر تانیہ بھی جو تان لگاتی کہ اماں کا چپل جب تک ان دونوں پر نہ پڑتا چپ نہ ہوتے۔

" یہ زیادتی ہے اماں!"نومی نے کل بڑے زور کا جوتا کھایا تھا۔ایسا تڑپ کر اچھلا تھا پھر اماں کو مصنوعی شاکی نظروں سے گھورا۔

"آخر ایسے دنوں ہی میں تو ہمارے ٹیلنٹ کا پتہ چلتا ہے اور اس کے مظاہرے کا موقع ملتا ہے' کیوں سکندر بھائی!"

اس نے مدد کیلیئے سکندر کی طرف دیکھا جو اماں کے ساتھ تخت پر جڑا بیٹھا تھا' ان دونوں کی شرارتوں پر محظوظ ہو رہا تھا۔

"بالکل... بالکل اماں آخر گھر والے ہی گھر پر موقع فراہم نہیں کریں گے تو ہمارا سنہری مستقبل تو سیاہ گھور ہو کر رہ جائے گا۔"

تانیہ پیش پیش تھی اور اماں گھورتی ہوئی بے ساختہ ہنس دی تھیں۔

"ہاں تو گاؤ بھئی کس نے روکا ہے مگر میرے سر پر بیٹھ کر ہی کیوں گانا ہے۔"

"اچھا تو چلیں ہم آپی کے سر پر بیٹھ کر گا لیتے ہیں۔" وہ دونوں کچن کی طرف دوڑے جہاں نادیہ آپی پناہ کیلیئے بھاگی تھیں۔

دیکھا جو چہرہ تیرا' موسم بھی پیارا لگا

کانوں میں جھمکا تیرے

ہم کو ستارہ لگا

اور پھر جو شروع ہوئے تو انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ صحن میں انہوں نے وہ اودھم مچایا کو پڑوس کی حمیدہ خالہ اپنے وسیع و عریض سراپے کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے دیوار پر چڑھ کر ہمکلام ہوئیں۔

"بچوں نے تو بڑی رونقیں لگا رکھی ہیں۔"

"آپ بھی آجایئے آنٹی! اگر آپ بھی سر سنگیت سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتی ہیں۔" نومی نے کھلی آفر کر دی۔

"اے میاں میں تو اپنے زمانے میں بڑی اچھی گلوکارہ مشہور تھی ایسی تان لگاتی کہ۔"

"کہ تان سین بھی بھاگنے پر مجبور ہو جاتا۔" تانیہ نے لقمہ دیا مگر انہوں نے سنا نہیں یا سنی ان سنی کرتی ماضی کے کسی مدھر خیالوں میں ڈوبتے ہوئے سر دھنتے ہوئے بولیں۔

"آئے ہائے وہ بھی کیا زمانے تھے' شادیوں میں ایسی رونقیں لگتی تھیں۔ حیدر آبادی صندلی ابٹن سے سارا دیوان مہک اٹھتا' اے لڑکی بالی تو مہینہ بھر پہلے سے مایوں بیٹھتی اور ابٹن سے اسے پیلا کیا جاتا رہتا۔"

"یعنی شادی تک دلہن یا دولہا بے چارا پیلیے کا شکار ہو جاتے۔" اب کے نومی نے ٹکڑا لگایا مگر حمیدہ خالہ تو اپنی ہی دھن میں تھیں حیدر آباد دکن کی ساری یادیں گویا ان کے ذہن کے پردے پر دوڑنے لگی تھیں۔

"ہائے ٹھپے اور گوٹے سے جگمگاتے کپڑے' چمپا لگے دوپٹے' گھیرواں کرتا' گلے میں گھنگرو' پائوں میں گھنگرو' ڈھول تاشے' ہائے کیا زمانے تھے اب تو شادیاں بھی ایسی پھیکی باسی لگتی ہیں۔ بس انڈین گانے ٹیپ ریکارڈ پر لگا کر چھوڑ دیئے' بے ہنگم' بے سرے گانے تیسری گلی تک سنائی دیئے جائیں' مگر پھر بھی وہ رونقیں نہ نظر آئیں۔"

اماں ان کی باتیں سن کر ہنس دیں اور اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

" یہ تو ہے حمیدہ اب وہ سنہرے زمانے کہاں رہے ہیں' اے خیر تمہارے حیدر آباد میں تو بڑی رسمیں ہوتی تھیں۔"

"ایسی ویسی۔" حمیدہ خالہ کی آنکھوں میں جگنو چمک اٹھے' پھر وہ لہک کر گانے لگیں۔

ہم تورے بابل! کھونٹے کی گئیاں ہانکو جدھر ہنک جائیں رے

ہم تورے بابل! کھیتوں کی چڑیاں رات رہی اڑ جائیں رے

بھیا کو دیے محلے دو محلے ہم کو دیا پردیس رے

سن لکھی بابل مورے

نومی اور تانیہ نے زور زور سے تالیاں بجائیں تو وہ جھینپ کر ہنس پڑیں۔

"اب تو آواز میں وہ لوچ اور سوز کہاں رہا ہے' خیر سے نادیہ کی مہندی والے روز تم لوگوں کو انگشت بدنداں کروں گی۔" ان کی اس بات پر صحن میں زبردست قہقہہ پڑا تھا ایک مضمحل سی سانس نادیہ آپی کے سینے کی تہ سے آزاد ہو گئی' گزرے کل کی رونقوں سے نکل کر آج

بکھرے سناٹے کو محسوس کیا پھر اس بند دروازے پر ایک نظر ڈالی۔ جہاں تانیہ کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔

محبت مورتی ہے اور کبھی جو دل کے اندر کے مندر میں

کہیں پر ٹوٹ جائے تو

محبت کانچ کی گڑیا

فضائوں میں کسی کے ہاتھ سے گر چھوٹ جائے تو

محبت آبلہ ہے کرب کا

اور پھوٹ جائے تو

محبت روگ ہوتی ہے

محبت رات ہوتی ہے

محبت جھلملاتی آنکھ میں برسات ہوتی ہے

محبت نیند کی رت میں

حسین خوابوں کے رستوں پر

سلگتے، جاں کو آتے، رتجگوں کی گھات ہوتی ہے

محبت مات ہوتی ہے

محبت مات ہوتی ہے

X...X...X

ولید کے اس رویے اور جملوں نے اس سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لی تھیں، اسے رونا آئے جا رہا تھا، غصہ آئے جا رہا تھا۔

وہ کیوں اتنی بے اختیار ہو گئی کہ اس کا منہ نہ نوچ سکی؟

اب اپنی غلطی کو دبانے کیلئے اسے نشانہ بنا رہا ہے، اس کے کردار پر کیچڑ اچھال کر اپنی پارسائی ثابت کرنا چاہ رہا ہے۔

اپنی گرتی ساکھ کو سہارا دینے کیلئے گھنائونی کوشش کر رہا ہے۔

کیا سمجھ کر اس نے ایسی باتیں کیں مجھ سے اور کیوں؟

وہ تھکے ذہن اور اضمحلال کے ساتھ آنسو پونچھنے لگی۔ بھابی اسے اپنی طرف آتی دکھائی دیں تو وہ سنبھل گئی۔

”اتنی دیر لگادی آپ نے تو۔“

”بس کیا کروں، دومنٹ میں اٹھنا تو اچھا نہیں لگتا نا، اور پھر ان کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔ خیر تم باہر کیوں کھڑی ہو؟ ولید نے کمرے سے باہر نکال دیا ہے کیا؟“ وہ شرارت سے مسکرائیں۔

”اب گھر چلتے ہیں تانیہ کی طرف نہیں جانا، میں کل یونیورسٹی میں ہی اس سے مل لوں گی۔“ وہ ان کی شریر مسکراہٹ کو نظر انداز کرتی ہوئی بولی۔

”سر میں بھی شدید درد ہو رہا ہے کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پڑھائی بھی کرنی ہے مجھے۔ خوامخواہ میں وقت ہی ضائع ہو رہا ہے۔“ وہ بڑی تیزی سے راہداری عبور کرکے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئی تھی، بھابی ناچار اس کے پیچھے لپکیں۔

”تانیہ کی طرف ہو آتے تو اچھا رہتا۔“ انہیں رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا۔

وہ دونوں گھر پہنچیں تو مما نے ذرا حیران ہو کر دونوں کو دیکھا۔

”تم تانیہ کی طرف گئیں نہیں، ابھی تانیہ کا فون آیا تھا میں نے کہا وہ تمہاری طرف ہی جانے کو نکلی ہے۔“

وہ تانیہ کے فون کا سن کر ٹھٹکی۔ مگر پھر سر جھٹک کر وہیں لونگ روم کے صوفے پر چپل اتار کر بیٹھ گئی۔

”نکلے تو تانیہ کی طرف جانے کو ہی تھے مما! مگر ان صاحبہ کے سر میں اچانک درد شروع ہو گیا، سو پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔“ بھابی نے فریج میں سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے اس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔

”ولید کی طبیعت کیسی ہے اب؟“ مما کچن سے نکل کر اسی طرف آگئیں، انکی مخاطب شہرینہ تھی۔

”بھابی سے ہی پوچھ لیجئے، کیسے تھے۔“ وہ بے زاری سے بولی تو مما نے چونک کر اسے دیکھے پھر قدرے خشمگیں نگاہوں سے چند لمحے گھورنے کے بعد بھابی کی طرف دیکھا۔

مونا بھابی نے بہ مشکل مسکراہٹ روکی تھی اور گلاس منہ سے لگالیا اور ایک گھونٹ بھرنے کے بعد بولیں۔

"اصولاً تو شیری ہی اس کی کنڈیشن بہتر طور پر بتا سکتی تھی۔ میں نے تو بیچارے کی بس جھلک ہی دیکھی، پھر عامر بھائی کی والدہ کی عیادت کو چلی گئی تھی۔" یہ کہتے ہوئے ان کے لبوں کی تراش میں پھیلی مسکراہٹ کچھ اور پھیل گئی۔ شہرینہ نے ابرو اچکا کر ان کی طرف دیکھا پھر غصہ دبا کر رخ موڑ لیا اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرنے لگی۔

"ٹھیک تو ہے نا۔" مما نے کچھ الجھ کر بھابی کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں ایسا ویسا، لگتا ہی نہیں ہے کہ موصوف بستر مرگ... سوری بستر علالت پر ہیں۔"

"تمہیں بھی وسیم اور ولید کا رنگ چڑھ گیا ہے مونا!" مما زور سے ہنس پڑیں۔

"فارغ انسان ہی ایسی حرکتیں کر سکتا ہے۔" وہ ریموٹ سے چینل بدلتے ہوئے طنز سے ہنسی۔

"ارے واہ فارغ کہاں ہوں، دو دو بچے پال رہی ہوں۔" انہوں نے جواباً اسے آنکھیں دکھائیں۔

"اونہہ، پال کہاں رہی ہیں وہ تو خود ہی پل رہے ہیں۔" وہ انہیں مزید جلانے کو بولی۔

"چلو مما کے بچے کو تو پال ہی رہی ہوں نا۔ کیوں مما؟" ان کا اشارہ وسیم بھائی کی طرف تھا، مما ہنس دیں۔

"کیا بات ہے شیری! یہ تم اتنی ایری ٹیٹ کیوں ہو رہی ہو۔" مما اٹھتے ہوئے اس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈال گئیں۔

بھابی کا قہقہہ بے ساختہ اڈا تھا، مما تو کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں جبکہ بھابی اسکے نزدیک آئیں اور دھپ سے اس کے برابر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔

"میں بھی سوچ رہی ہوں کہ اچانک تم پر جھنجھلاہٹ بے زاری کا دورہ کیوں پڑا ہے، بات کیا ہے۔ لگتا ہے واقعی ولید سے جھگڑا ہو گیا ہے، ویسے سنا ہے کہ۔"

جن سے موانست ہو ہمدم

جھگڑا انہی سے ہوتا ہے

''محبت، موانست۔'' اس کے لب مبہم انداز میں وا ہوئے پھر باہم جڑ گئے، ایک یاسیت بھری سانس اس کے سینے سے نکل گئی۔ وہ اسکرین پر بھاگتے دوڑتے رنگوں کو دیکھنے لگی پھر، آف کا بٹن دبا کر ریموٹ تپائی پر ڈالتے ہوئے بھابی کیطرف دیکھا۔ اس لمحے اس کی آنکھوں کی سطح پر جھنجھلاہٹ، بے زاری کے بجائے اداسی کا جاں گداز رنگ دکھائی دے رہا تھا۔

''محبت کیا ہے بھابی! جو کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے اندر شاید اگنا۔ ہاں محبت ایک دوسرے کے اندر اگنا ہے، پہلے تو ایک بیج کی طرح دوسرے کے اندر فنا ہونا، اپنا آپ مٹا دینا پھر اگنا، جوں جوں محبت بڑھتی ہے اس کی جڑیں گہرائی میں اترتی جاتی ہیں اسے تازہ محسوسات، جذبوں کی حرارت اور سانسوں کی ہوا کی ضرورت رہتی ہے۔

اگر کبھی آپ کو اپنا آپ مرجھاتا ہوا محسوس ہو تو سمجھ لیں کہ دوسرے کے من کی زمین پتھریلی ہو گئی ہے، اور اس نے آپ کے اندر سے اپنی جڑیں بے دردی سے سمیٹ لی ہیں۔''

وہ کرب سے مسکرا دی اور نم نم پلکیں جھپکا کر بھابی کے چہرے کی طرف دیکھا، جو حیرت سے اسے ایک ٹک دیکھتے ہوئے بولیں۔ '' یہ سب کتابی باتیں ہیں مت پڑھا کرو اتنا۔''

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''محبت کسی سمجھوتے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو سالوں، لمحوں اور فاصلوں کو سینے کا عمل ہے، ایک دوسرے کو بننے کا عمل ہے۔ اگر سلائیاں میرے پاس ہوں اور اون آپ خود رکھ لیں اپنے پاس، اور مجھ سے کہیں کہ بن کر دکھاؤ تو جب تک آپ اون مجھے دیں گی نہیں، تو میں کیسے کچھ بن سکوں گی۔ بننے کیلئے صرف سلائی کا ہونا کافی نہیں ہے اون کا ہونا بھی ضروری ہے۔''

''شیری!'' بھابی نے تڑپ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے بس ایک لمحے کو آنکھیں میچ کر کھولیں، بھابی نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکنا چاہا مگر وہ اضطرابی انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

''نہیں شیری! محبت میں تو انا ڈوب جاتی ہے، پھر یہ انا۔''

وہ دھیرے سے ہنس دی اور نرمی سے ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

''ہاں اگر مقابل بھی اس احساس میں مبتلا ہو ایک دوسرے کے اندر اگنے کا عمل ہو، ایک دوسرے کی سانسوں کو محسوس کرنے کا عمل ہو تب انا ختم ہوتی ہے، تب آپ خود کو مٹا دینے کے باوجود مطمئن اور خوش ہوتے ہیں۔''

"شیری... شہرینہ!" بھابی رنج سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

وہ پلٹ کر کمرے میں چلی گئی۔

انا ہے تھوڑی بہت تم میں بھی بتانا اسے

ملے نہ وہ جو تمہیں تم بھی بھول جانا اسے

X...X...X

شہرینہ کمرے میں آکر بھی کتنی دیر خالی ذہن بیٹھی رہی۔ پھر بالکونی میں جا کر شفاف شیشوں سے باہر جھانکنے لگی۔

اسے یہ سوچ کر اب شرمندگی ہو رہی تھی کہ اسے بھابی سے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ مگر جو بے اختیارانہ فعل وہ انجام دے چکی تھی اب اس پر سوائے افسوس کرنے کے کچھ نہ رہا تھا۔

وہ اضطرابی انداز میں شیشے پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

صغریٰ اسکے کمرے کی ایک ایک شے کو رگڑ رگڑ کر چمکا ڈالتی تھی، بالکونی میں کھلنے کے باوجود ان شیشوں پر گرد کا نام و نشان نہ تھا بلکہ ہیروں کی مانند دمک رہے تھے۔

"ولید انکل آ گئے، ولید انکل آ گئے۔" طلحہ اور طوبیٰ کی خوشی سے بھرپور چہکاریں گونجیں تو اس نے ہڑبڑا کر شیشہ پورا کھول کر باہر جھونکا۔

وسیم کی گاڑی سے آغا جی کے ہمراہ ولید اترتا دکھائی دیا۔

"ولید انکل، آخا۔ ولی انکل۔" طلحہ چھلانگیں لگاتا اس کے پیروں سے جا کر لپٹ گیا۔ پیچھے لڑکھڑا کر بھاگتی طوبیٰ تھی جسے وسیم نے جھک کر جلدی سے گود میں اٹھا لیا تھا مگر اس کا منہ بن گیا۔ طلحہ ولید سے لپٹا تھا تو وہ کیسے پیچھے رہتی، اسے بھی اس نے گود میں چڑھنا تھا۔

وہ غیر محسوس طور پر لب باہم بھینچ کر رہ گئی اور بالکونی سے ہٹ گئی۔

اس شہر میں کس سے ملیں، ہم سے تو چھوٹیں محفلیں

ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ ترا

کوچے کو تیرے چھوڑ کر جوگی ہی بن جائیں مگر

جنگل ترے، پربت ترے، بستی تری، صحرا ترا

اس نے آنکھوں میں اترتی نمی کو انگلی کے پور سے چھوا اور گیلی پور کو تکتے ہوئے ہلکے سے ہنس دی۔

"شیری پھوپھو!" طلحہ دروازہ کھول کر اسے پکار رہا تھا۔ وہ جلدی سے بالکونی سے اندر آکر اپنے بیڈ پر پڑا تولیہ اٹھا کر تہہ کرنے لگی۔

"پھوپھو۔ ولید انکل ہاسپٹل سے گھر آگئے ہیں، آپ جلدی سے آیئے، وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بڑی مما کہتی ہیں جلدی سے شیری پھوپھو کو بلا کر لائو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔

"کیوں ان کی بارات جا رہی ہے کہ میرا جانا ضروری ہے۔" وہ چڑ کر بولی مگر اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر دبایا اور پھر چھوڑ دیا۔

"جا کر مما سے کہہ دو شیری پھوپھو اپنے ایگزام کی تیاری کر رہی ہیں اس لئے نہیں آئیں۔"

"جھوٹ بالکل جھوٹ۔ آپ تو خالی خولی کھڑی ہیں کہاں پڑھ رہی ہیں۔"

"طلحہ!" اس نے اسے آنکھیں دکھائیں مگر وہ بضد رہا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میں جا کر بڑی مما سے کہہ دیتا ہوں آپ...."

"بکو مت۔ جو کہا ہے وہی جا کر کہو۔" اس نے چڑ کر اسے ڈپٹ کر کمرے سے بھگا دیا۔ مگر طلحہ نے لونگ روم میں جا کر بلند آواز میں وہی بتایا جو سچ تھا۔ مونا بھابی نے اسے آنکھیں دکھا کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

"بیوقوف! شیری کے ایگزام ہونیوالے ہیں وہ اپنی پڑھائی کر رہی ہیں۔"

"مگر اس وقت وہ پڑھائی نہیں کر رہی تھیں۔ خالی خولی بیٹھی تھیں مما! میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

"اچھا بس چپ۔"

"کیوں بچے کو سچ بولنے سے روکتی ہیں، ایک واحد بچے ہی تو اس کائنات کا سچ ہیں۔ سراپا سچ۔" ولید نے مسکرا کر مونا بھابی کو دیکھا تو وہ کھسیا گئیں۔

"پھوپھو یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ ان کی بارات جا رہی ہے کہ میرا آنا ضروری ہے۔"

بھابی کے مسلسل آنکھیں دکھانے کے باوجود وہ ولید سے لپٹا بولا۔ تو مما اور آغا جی بے ساختہ ہنس دیئے' ولید نے ایک ہلکی سی سانس بھری۔

''اس کا مطلب ہے میری بارات میں وہ ضرور شرکت کرے گی چلو' ایک بوجھ تو اتر گیا۔''

اس نے یوں اطمینان بھری سانس بھری گویا حقیقت میں اسے اپنے کندھے سے کسی بوجھ کے اترنے کا سکون ملا ہو۔

مونا بھابی نے بہ نظر غائر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں سرزنش ہی نہیں ایک اضطراب بھی اتر آیا۔

''ولید۔'' انہوں نے مضطربانہ انداز میں لب کاٹتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر وسیم کے آکر بیٹھنے پر وہ لب دانتوں میں دبا کر رہ گئیں۔

''کیا خیال ہے آغا جی! ولید کی صحت کی خوشی میں آج ڈنر باہر ہی نہ کیا جائے۔'' وہ ولید کے کندھے پر سر ٹکاتے ہوئے بولا۔ تو ولید نے ابرو اچکا کر اسے گھورا۔ پھر اسے ایک طرف دھکیلا۔

''کیا مطلب۔ اس سے پہلے تمہیں میری صحت کی خوشی نہیں تھی۔''

وسیم کا قہقہہ برجستہ تھا۔

''نہیں تب تم اتنے صحت مند نہیں تھے جو ہاسپٹل کے چند دنوں نے ہی تمہیں کر دیا ہے۔''

انہوں نے انگور کا خوشہ اٹھا کر ایک ایک دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

''بس میرے بچے کو اب تم نظر نہ لگا دینا۔ ابھی صحت ہی کہاں پکڑی ہے۔'' مما نے نظروں ہی نظروں میں ولید کے چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے وسیم کو ڈپٹا۔

''اللہ رے۔ ابھی صحت نہیں پکڑی۔ جب اس صوفے پر میرے بیٹھنے کی جگہ نہیں رہے گی تو اسے کہتے ہیں کیا صحت پکڑنا۔''

جواباً ولید نے اسے ایک ہاتھ جڑ دیا۔ اس کی یہ تصویر کشی خاصی لرزا دینے والی تھی۔

''بھائی میرے! صحت پکڑنا تو اسی کو کہتے ہیں اور شاید ممتا کی نظروں میں تو وہ بھی صحت نہ ہو گی۔''

"خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے' ناحق ممتا کو بدنام کرتے ہو تم لوگ۔" مما نے اسے گھورا۔

"چلو بھئی چلو وسیم کی آفر قبول کر کے ڈنر پر چلتے ہیں۔" آغا جی اخبار ایک طرف ڈال کر تپائی سے اپنا چشمہ اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

"آفر سے کیا مطلب ہوا۔" وسیم نے بقیہ انگور ایک ساتھ منہ میں ڈالتے ہوئے آغا جی کو خوفزدہ نظروں سے دیکھا تو انہوں نے کندھے اچکا دیئے۔

"یعنی یہ ڈنر ولید کی صحت کی خوشی میں خالص تمہاری طرف سے۔" انہوں نے اسٹک سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"بالکل بہت دن ہوئے یوں بھی ان کی جیب ہلکی ہوئے۔" مونا بھابی جلدی سے بولیں۔

"یہ تم عورتوں کو مردوں کی جیب کی بڑی فکر رہتی ہے۔" وسیم نے آنکھیں دکھائیں۔

"آپ کو کیا پتہ مشرقی بھابی کہ اس کی جیب کتنی ہی مرتبہ ڈھیلی ہوتی ہے۔ اب یہ اور بات کہ آپ پر نہیں ہوتی۔"

"ولید بکومت۔" وسیم نے اس کا بازو پکڑ کر موڑا۔ "دوسرا بھی پلاسٹر کی زد میں آجائے گا' تمہیں پتہ ہے اس طرح کے مذاق بھی شوہروں کو بڑے مہنگے پڑتے ہیں' دیکھو ذرا دیکھو کیسے بلی کی طرح مجھے گھور رہی ہے۔" اس نے مونا بھابی کی طرف دیکھ کر ڈرنے کی ایکٹنگ کی تو وہ "اونہہ۔" کر کے وہاں سے اٹھ گئیں۔

"شیر ہو کر بلی سے ڈر گئے تف ہے تم پر۔" ولید نے ایک جھٹکا دے کر اسے دھکیل کر اس پر ایک متاسفانہ نگاہ ڈالی۔

"تمہیں پتہ نہیں بلی شیر کی خالہ ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری جواباً ولید کا قہقہہ برجستہ تھا۔

"چہ چہ۔ میں سمجھا تھا بلی' شیر کی بیوی ہے۔"

"اوئے کمینے نہ ہو تو۔" وسیم ہتھیلی کا مکا بنا کر رہ گیا۔

"مجھے لگ رہا ہے وسیم کا ارادہ اب بدل رہا ہے کیوں برخوردار!" آغا جی لونگ روم سے نکلتے نکلتے وسیم کی طرف دیکھ کر ہنسے' تو وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

"ارے... نہیں' اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے' بس پاپا کو آنے دیں۔" اس کا انداز مدافعانہ تھا۔

"وہ تو آچکے ہیں شاور لے رہے ہیں۔" مما نے اطلاع دی۔

"آچھا۔ایک انہیں بھی ولید کی طرح دن میں بیسیوں بار نہانے کا شوق ہے۔بائی دی وے مما۔وہ کس صحرا کی خاک چھان کر آتے ہیں۔"

مما نے ہنستے ہوئے ہاتھ میں پکڑا گلاس اسے جڑ دیا۔

"او بھائی..." وہ کمرے کی طرف بڑھتے ولید کو دیکھ کر التجائیہ انداز میں پکارا۔" اب تم باتھ روم میں بند نہ ہو جانا۔"

"مجبوری ہے۔دو دن سے باتھ روم کی شکل نہیں دیکھی۔" وہ ابرو کو جنبش دے کر مسکرایا۔وہ منہ بنا کر رہ گیا۔

X...X...X

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس کے پاس گھر میں اکیلے یوں رک جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔مارے بندھے اسے بھی ان کے ہمراہ اس ڈنر پر جانا پڑ رہا تھا۔صغریٰ نے اس کیلئے جو سوٹ پریس کر کے رکھا تھا۔وہ پہن کر بالوں کو ربڑ بینڈ میں جکڑ کر کمرے سے باہر آگئی۔

سیاہ اور نیلے رنگ کے کنٹراسٹ کے کڑھائی والے سوٹ میں وہ اپنی تمام تر سادگی کے باوجود بہت نمایاں اور خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔لابی کے صوفے پر بیٹھ کر وہ اپنے سینڈل پہننے لگی۔

اسی دم ولید' وسیم کے کمرے سے گنگناتا ہوا باہر نکلا تھا۔

آپ کو دیکھ کر دیکھتا رہ گیا

کیاں کہوں اور کہنے کو کیا رہ گیا

آپ کو دیکھ کر دیکھتا رہ گیا

وہ بالکل سامنے تھی عجیب سی سچویشن تھی۔اس نے لب باہم جلدی سے بھینچ لیے۔بے اختیارانہ تصادم دونوں کے دل پر عجیب سارنگ چھوڑ گیا۔جس سے دل کے سارے تار جھنجھنا اٹھے۔اس کی پلکیں رخساروں پر جھک گئی تھیں۔وہ سینڈل کی سٹریپ بند کر کے کھڑی ہو گئی۔

ولید کی نگاہیں بے ساختہ بھابی کی طرف گئیں جو لابی کے داخلی دروازے کے پاس طوبیٰ کو لیے کھڑی تھیں' اور بڑے معنی خیز تبسم اور پوری دلچسپی سے ان دونوں کو نگاہوں کے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔

تھیں۔

”گائو رک کیوں گئے' بہت اچھی غزل ہے یہ تو اور بہت مناسب موقع پر بھی گا رہے تھے۔“ وہ آنکھوں میں شرارت کا رنگ لیے اسی طرف چلی آئیں۔

”موقع کا تو مجھے پتہ نہیں' البتہ غزل بہر حال اچھی ہے۔وسیم کے سی ڈی میں بج رہی تھی' بس ایسے ہی میرے منہ میں بھی رہ گئی۔“ وہ اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کیلئے لاپرواہی سے کہتا جیب سے رسٹ واچ نکال کر کلائی پر باندھنے لگا۔ساتھ ہی ایک اچٹتی سی نظر اس گوشے

پر ڈالی جہاں وہ اب رخ پھیر چکی تھی' اس کے بال ہیئر بینڈ میں جکڑے ایک ترتیب سے نیچے تک جا رہے تھے۔

”ایک شعر البتہ اور یاد ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

جھوٹ والے کہیں سے کہیں بڑھ گئے

اور میں تھا کہ سچ بولتا رہ گیا

اس کے لہجے میں نا محسوس طور پر چبھن اتر آئی۔تاہم وہ شہرینہ کے چہرے کے تاثرات دیکھنے سے قاصر رہا اور جیسے سر جھٹکتا ہوا بولا۔

”آپ لوگ جلدی چلیں۔ایسا نہ ہو کہ ڈنر کے بجائے بریک فاسٹ کرنے ہم نکلیں۔“ وہ بڑی سرعت سے باہر کی طرف نکل گیا۔

وہ گم صم سی کھڑی اس کے لہجے کی کاٹ' چبھن اور شعر کے الفاظ کا نشتر اپنے دل پر محسوس کرتی رہی تاہم اس کے لبوں کی تراش میں ایک مسکراہٹ تھی' ایک اذیت آمیز' خود آزار سی مسکراہٹ اسے ایسی تسکین ملی تھی جو کبھی کبھی اپنے آپ کو زخمی کرنے سے ملتی ہے۔

''ایک شعر مجھے بھی آتا ہے سنائوں۔'' بھابی اس کے پیچھے ہو گئی تھیں۔

''کیا ضروری ہے کہ پوری غزل ہی ہو۔''

وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھتا ہوا ذرا سارک کر بولا۔ وہ مسکرانے لگیں' مگر ان کی مسکراہٹ میں ایک اداسی گھلی تھی۔

''ہاں' اس لیے کہ کسی بھی شے میں ادھورا پن اچھا نہیں لگتا' ہر رنگ مکمل ہونا چاہیے۔''

ان کے انداز میں کچھ جتانے والا تاثر تھا۔ گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے ایک پل کے لئے اس کا ہاتھ ساکن رہ گیا۔ اس نے سر اٹھانا چاہا مگر پھر لب دبا کر جھکے ہوئے سر کے ساتھ ہی چابی لاک میں گھما کر کھٹ سے فرنٹ ڈور کھول دیا۔

''چلیے بیٹھیں اور ان محترمہ کو بھی بلا لیجئے۔ جو شاید کھڑے کھڑے ہی کسی اور جہان میں پہنچ چکی ہیں' اسے کہیے' ہمارے ساتھ زہر مار کر آنا تو پڑے گا ہی۔'' وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتا ہوا بولا۔ مگر بھابی کو جانا نہیں پڑا۔ وہ اسی طرف چلی آرہی تھی۔

''ضروری نہیں کہ ہر سفر میں ہم سفر آپ کا پسندیدہ اور خواہش طلب ہی ہو۔'' وہ طنز سے ہنسا۔

شہرینہ نے اس پر ایک نظر ڈالی اور مسکرا کر اپنی طرف سے پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

اس کے تنے تنے چہرے اور بھینچے لبوں کو دیکھ کر وہ اپنے اندر ایک عجیب سی خوشی کو اترتے محسوس کرنے لگی تھی' اس کے چہرے کا تناؤ اور لہجے کا کھنچاؤ اسکے جملوں سے نکلتی آگ کی بھبھک اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ کامیاب جا رہی تھی۔

جس زہر کا وہ قطرہ قطرہ اپنے اندر اتارتی رہی تھی۔ جس اذیت کو لمحہ لمحہ سمیٹتی رہی تھی کچھ اس کی طرف بھی منتقل ہو رہا تھا۔ یہ اس کیلئے خوش آئند بات تھی' اس کے بگڑے زاویوں کو دیکھ کر حقیقتاً اُس کے دل پر ٹھنڈی پھوار ہی پڑ رہی تھی۔

ہوٹل کے خوشگوار سحر انگیز ماحول میں کھانا کھایا گیا۔

ہلکی پھلکی نوک جھونک بھی چلتی رہی جو زیادہ تر وسیم اور مونا بھابی کے درمیان تھی۔ ولید خلاف عادت کچھ چپ چپ تھا جس کو بھابی اور وسیم دونوں نے ہی واضح طور پر محسوس کیا۔ ''تم دونوں خاموشی کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے کے موڈ میں ہو کیا؟'' وسیم سے رہا نہ گیا۔

اس نے شہرینہ کو دیکھا پھر ولید کو گھورنے لگا۔ وہ اپنے کسی دھیان میں تھا چمچہ سوپ میں چلاتے ہوئے چونک کر سر اٹھایا اور ہلکے سے مسکرا دیا۔

”میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور میرا خیال ہے یہ بھی یہ کام تو انجام نہیں دے سکتیں‘ عورت جو ٹھہریں۔“

وسیم کا قہقہہ برجستہ تھا وہ بھرپور تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔

”یہ تو ہے۔“

”تو تم ہی کر لو نا یہ ریکارڈ قائم۔“ بھابی سے رہا نہ گیا وہ جلبلا گئیں۔ ”تم مرد لوگ عورت کو انڈر ایسٹی میٹ کر کے کتنے خوش ہوتے ہو۔“

”بھئی ہم تو صرف سچائی بیان کر رہے ہیں تم دونوں خوامخواہ میں اموشنل ہو رہی ہو۔“ وسیم نے ہنوز ہنستے ہوئے انہیں چھیڑا۔

”بس تم عورتوں میں برداشت کا مادہ نہیں ہوتا‘ سچ سننے اور برداشت کرنے کیلئے حوصلہ چاہیے حوصلہ۔“ انہوں نے مونا بھابی کی طرف ذرا سا جھکتے ہوئے کہا اور ان کی پلیٹ سے فرائیڈ فش کا ٹکڑا اٹھا کر کھانے لگے۔

”کبھی کبھی ایسا حوصلہ مردوں کے اندر سے بھی خارج ہو جاتا ہے وسیم بھائی!“ وہ طنز سے ہنسی۔ ”سچ سننا اور سچ کہنا پہاڑ اٹھانے کے برابر لگنے لگتا ہے۔ وہ کچھ حقیقتوں کو اپنی طاقت کا چیلنج سمجھ کر قبول کرنے کے بجائے مقابلے پر ٹوٹ جاتے ہیں مگر ضروری نہیں ہر حقیقت ان کی طاقت سے دب جائے‘ ہر جگہ طاقت کا زعم نہیں چلتا۔ رشتوں اور دلوں کے مابین تعلقات میں تو خصوصاً۔“

اس کے لہجے کی کاٹ ولید کے دل کے آر پار ہو گئی۔ وہ کوئی نا سمجھ یا کم سن نہیں تھا کہ نہ جان سکتا کہ وہ سراسر اسے ہی سنا رہی تھی‘ اس نے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

وہ استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ولید نیپکن کی گولی سی بنا کر خالی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔“ اس نے رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی اور ساتھ ہی میز کی طرف دیکھا جہاں آغا جی، جہانگیر احمد اور مما مصروف گفتگو تھے وہ بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ چکے تھے۔

”ہاں بھئی اب اٹھنا چاہیے، یہ مرد اور عورت کی بحث تو نہ ختم ہونے والی ہے۔یوں بھی عورت کو سمجھنا ہم جیسے مسکین سیدھے سادے لوگوں کا کام نہیں ہے۔“ وسیم نے یہ کہہ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”اس سادگی پہ کون نہ مر جائے خدا۔“

مونا بھابی ہنسیں۔

انہیں اٹھتے دیکھ کر آغا جی بھی اٹھ گئے، تاہم ان کی باتیں زور وشور سے جاری تھیں۔

” یہ ادھر دینا ذرا۔“ وسیم نے ولید کے ہاتھ سے اچک کر گاڑی کی چابی جھپٹ لی اور اس کے گھورنے پر جواباً گھورتے ہوئے بولا۔

”زیادہ ڈرائیونگ ابھی تمہارے لیے مضر ہے۔“

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”بہت سے مضر کام اس کے مضمرات جاننے کے باوجود بھی ہم انجام دیتے ہیں۔“ اس نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

”تم جو بھی کہو، گاڑی تمہیں ڈرائیو نہیں کرنی۔“ وسیم نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔لامحالہ ولید کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا پڑا۔

پچھلی نشست پر بھابی طوبٰی کو گود میں لیے بیٹھ گئیں اور ساتھ ہی شہرینہ کو بھی خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے کھینچ لیا تھا جو آغا جی کی گاڑی میں جا کر بیٹھنے لگی تھی۔

ولید سے اس کی یہ حرکت مخفی نہ رہی تھی۔وہ عجیب سے احساسات میں گھر کر رہ گیا تھا اور بالکل گم صم ہو گیا تھا۔

آغا جی کی گاڑی گھر کی طرف روانہ ہو گئی جبکہ وسیم نے گاڑی کا رخ سی ویو کی طرف کر دیا تھا۔ اس کا موڈ خاصا چنچل ہو رہا تھا۔ڈرائیونگ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ مسلسل گنگنا بھی رہا تھا۔

کس نام سے پکاروں

کیا نام ہے تمہارا

کیوں تم کو دیکھتے ہی دل کھو گیا ہمارا

”آخر پتہ بھی تو چلے کہ آپ مسلسل کس کیلئے گنگنا رہے ہیں۔“ مونا بھابی سے آخر ضبط نہ ہو سکا۔ گو کہ انہوں نے ازراہ مذاق ہی چھیڑا تھا مگر وسیم نے ویو مرر سے انہیں باقاعدہ گھورا۔

”توبہ بیوی اتنا بڑا الزام۔ ایک پارسا نیک طینت شوہر پر۔ میں بھلا کس کیلئے گا سکتا ہوں۔“

”بھئی مجھے کیا خبر۔ میرے لیے تو کبھی اس طرح نہیں گایا۔“ یہ کہہ کر وہ ہونٹ دبا کر مسکراہٹ روکنے لگیں۔

شہرینہ بھی وسیم کے چہرے پر نظر ڈال کر مسکراہٹ نہ روک سکی۔

وسیم نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ولید کی طرف دیکھا۔

بدنام ہے جہاں میں جس کیلئے ظفر

وہ جانتے نہیں کہ ظفر کس کا نام ہے

اسے کہتے ہیں بے عقل، ناقدر شناس بیوی۔ پھر کچھ کہیں گے تو کہتی ہیں آپ عورتوں کو انڈر ایسٹی میٹ کرتے ہیں۔“

بھابی بے ساختہ کھلکھلا پڑیں۔

”بس یہی تو المیہ ہے کہ اللہ نے ان کو عقل ذرا کم ہی دی ہے مگر وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتیں۔“ ولید کا انداز تائیدی تھا اور قدرے تضحیک اڑانے والا۔

”بس بس۔“ بھابی نے اسے گھورا۔ ”دیکھو شیری! یہ آج دونوں ہمارے کچھ زیادہ ہی دشمن نہیں ہو گئے ہیں۔“

”دوست ہی کب تھے؟“ اس کے لب ہولے سے وا ہوئے گو کہ اس نے بہت مدھم لہجے میں کہا تھا مگر ولید کے بالکل پچھلی نشست پر بیٹھی ہونے کی وجہ سے اس نے بآسانی اس کا جملہ سن لیا۔ ایک متاسفانہ سی سانس بے ساختہ اس کے لبوں سے نکل گئی۔

”دکھ تو اس بات کا ہے کہ لوگ اچھی نظر رکھنے کے باوجود اچھائی کو نہیں پہچان سکتے۔“

وہ خالص اسے ہی سنا رہا تھا مگر وہ یونہی رخ موڑے جلتے بجھتے سائن بورڈ کو دیکھتی رہی۔

سی ویو کا ساحل مصنوعی روشنیوں میں نہایا ہوا بڑا خوش نما نظر آ رہا تھا۔ لہروں اور ہواؤں کا شور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو رہے تھے۔

وسیم، مونا بھابی کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اتر کر پانی کی طرف چل دیئے۔ طوبیٰ کو شہرینہ نے اپنے پاس دیوار پر بٹھا لیا۔

"بھٹا کھاؤ گی۔" وسیم نے سیڑھیاں اترتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔ شہرینہ نے مسکرا کر سر نفی میں ہلا دیا۔ آگ کی چمکتی چنگاریوں پر پنکھا جھلتے ہوئے بھٹے والا بچوں کیلئے بھٹے سینک رہا تھا۔ وہ اس کی اس کارروائی کو دیکھنے لگی۔

یکلخت اس کی توجہ ادھر سے ہٹ گئی۔ اسے اپنے پیچھے مانوس سی مہک کا احساس ہوا جو بہت آہستہ روی سے اس کے گرد پھیل کر حصار کھینچ گئی۔ اس کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔

"تم اکبر شاہ کو قطعاً نہیں جانتیں۔ وہ ایک بدکردار عیاش اور اوباش لڑکا ہے۔ کم از کم تمہارے قابل ہرگز نہیں ہے۔" اس کی آواز میں کاٹ یا چبھن نہیں تھی۔ عجیب سی یاسیت تھی۔ دل گرفتگی تھی۔ ایک اضطراب تھا۔

اس کی انگلیاں طوبیٰ کے ریشمی بالوں میں ہی الجھ کر ساکت ہو گئیں۔ دل کے اندر ایک متلاطم سی لہر اٹھی، اس کا دل چاہا وہ چیخ کر بتائے کہ "اس کا اکبر علی شاہ سے کوئی رشتہ تعلق نہیں ہے۔" مگر دوسرے پل یہ لہر معدوم ہو کر انا کی ریت میں جذب ہو گئی۔

"سب کچھ جاننے کے باوجود کوئی آپ کو اچھا لگتا ہو پھر۔"

اس نے نظریں سمندر پر ٹکائے پر اعتماد لہجے میں کہا تو ولید نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

مگر شہرینہ خان لہروں کو اٹھتے اور پھر سمندر کے وجود میں مدغم ہوتا دیکھتی رہی۔ اس سے کہیں زیادہ اس کے اندر شور بپا تھا۔

سوچوں میں ایک طوفان آ گیا تھا۔

کبھی کبھی آپ جس روشنی کیلئے بہت سے جگنو پیچھے چھوڑ آتے ہیں وہ روشنی تو اندھیرے کا ہی پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ تب آپ بہت اونچائی سے گرتے ہیں، اس خلا میں جہاں دل دوز تاریکی اور ہیبت ناک سناٹے کے سوا کچھ نہیں ہوتا... وہ خود کو بھی ایسے ہی خلا میں گرا محسوس کر رہی تھی۔

اس کا دل لہروں کی مانند سینے کے سمندر میں متلاطم رہا۔ پھر وہ آہستگی سے گرن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''نہ آپ برسوں میں کسی کو پہچان سکتے ہیں نہ لمحوں میں۔ پھر یہ جاننے کا تردد ہی کیوں کیا جائے' آگہی بہر حال دکھ ہی دیتی ہے پھر خود کو کسی اذیت سے دوچار کرنے کا فائدہ۔'' وہ خود کو مکمل پر سکون ظاہر کرنے کیلئے ہلکے سے مسکرائی۔

ولید کو اپنے اعصاب تڑختے محسوس ہونے لگے۔ ایک عجیب سی آگ اس کے اندر بھڑک اٹھی۔ اس نے بے اختیارانہ اس کے کندھوں پر اپنی ہتھیلیاں جما دیں۔

وہ سن سی ہو کر پتھر کی صورت کی طرح دیوار کی کھردری سطح پر گویا گڑی رہ گئی۔

اس کی مضبوط بھاری انگلیوں کا بوجھ اسے اپنے کندھوں کے نرم گوشت میں پیوست ہوتا محسوس ہونے لگا۔

''مرد اور عورت ہر معاملے میں ہر کام میں برابری نہیں کر سکتے۔ عورت کو مرد کی دوستی بہت مہنگی پڑتی ہے' مرد گناہ گار ہوتا ہے جبکہ عورت رسوا بھی ہوتی ہے' اس کا نسوانی وقار اور پاکیزگی مجروح ہوتی ہے اور جب یہی دوست نما مرد اس دوستی کو اغراض کے بستر پر لے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

جاتا ہے تو۔ عورت کو اپنی کل متاع کا نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔'' وہ ہلکے سے ہنسا۔ پھر اس کے چہرے کی طرف جھکتے ہوئے اپنی تپتی آنکھیں گاڑ کر تمسخر سے بولا۔

''یاد رکھو۔ آگہی کا دکھ بہت کچھ کھو دینے کے دکھ سے بہر حال کم ہی ہوتا ہے۔''

آگ سے بھرے یہ جملے' آتشیں گولیوں کی مانند اسے تڑاتڑ اپنے جسم کو چھیدتے محسوس ہوئے۔

اس کی مسکراہٹ' کسی تلوار کی مانند اس کی روح کو کاٹتی ہوئی گزر گئی۔

اس کی قربت' اس کے لمس کی برقی لہریں اور آگ سے بھرے یہ جملے سب نے مل کر اسے سن کر کے رکھ دیا۔ اس کے اعصاب پر ایک سناٹا طاری ہو گیا۔

مگر دوسرے پل مزاحمت کی طاقت عود کر آئی۔ ایک عجیب سی نفرت آمیز آگ اسے اپنے ہر مسام سے پھوٹتی محسوس ہونے لگی۔

وہ جھٹکے سے اٹھنے لگی مگر اس کے ہاتھوں کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ ذرا سا ہل کر دوبارہ اسی کھردری سطح پر بیٹھنے پر مجبور ہو گئی۔

رنج اور کرب سے اس نے چلانا چاہا مگر روح کے اندر اس نے ایسا بھالا مارا تھا کہ اس کی قوت گویائی کو گویا سلب کر لیا تھا۔ وہ دھڑا دھڑ اسی آگ میں جلنے لگی۔

"اکبر شاہ سے دوستی تمہیں اتنی ہی مہنگی پڑے گی جتنی سانپ سے دوستی۔" اس کا لہجہ حد درجہ اہانت آمیز ہو گیا۔

وہ یکلخت ضبط توڑ بیٹھی۔

"میرے کسی بھی معاملے میں آپ کو مداخلت کا حق نہیں ہے مسٹر ولید حسن شاہ! میرا کوئی بھی اقدام کم از کم آپ کو کوئی بھی دکھ اور نقصان نہیں پہنچائے گا۔ آپ کی دنیا کی رنگینی، خوبصورتی، قطعاً مجروح نہیں ہو گی اور دوسروں کیلئے آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر انسان بلکہ بالغ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔"

وہ اپنے لہجے میں تمام تر توانائی سمو کر از حد تلخی سے کہتی، اس کے دونوں ہاتھوں کو جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

وہ سرخ چہرہ لیے کسی اندرونی خلفشار کو دبائے کچھ دیر بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر پلٹا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ غصے اور نفرت کے گہرے احساس کے ساتھ وہیں کھڑی اس تاریک گوشے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر بڑی آہستہ روی سے غصہ دکھ اور رنج میں بدل گیا۔ جیسے کوئی تند لہر اٹھ کر ساحل کی گیلی ریت میں جذب ہو کر بکھر جائے۔

وہ آہستگی سے اسی دیوار پر بیٹھ گئی۔

سارا منظر دھندلا گیا۔ اسے اپنا دل ایسا اجڑا ہوا محسوس ہونے لگا جیسے بہار کی منتظر شام میں یکدم خزاں کے جھکڑ چلنے لگے ہوں۔

X...X...X

یہ رات اس کیلئے اس کی حیات کی سب سے بھاری، اداس اور اذیت ناک رات تھی۔ اس کی آنکھوں کی سطح پر نیند کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ جیسے کوئی ریت بکھری پڑی تھی۔ دل کے اندر

تک ویران سناٹا بکھرا ہوا تھا۔ ایسا سناٹا جو شام ہوتے ہی صحرا میں اتر آتا ہے یا چاند پر ہوتا ہو گا۔

نہ سکون تھا نہ وحشت۔ بے نام سی خاموشی تھی بے نام سا ویرانہ ہے۔

جیسے اب کوئی شعلہ جلے گا ہی نہیں، کوئی چنگاری پھوٹے گی ہی نہیں۔

وہ کھڑکی کھول کر اندھیرے کو گھورنے لگی۔

کیا اسے ایسا رویہ اختیار کرنا چاہیے تھا یا نہیں۔

یہ اس کی اس شخص سے نفرت تھی یا غصہ تھا جو اپنی ہتک پر امڈا تھا یا پھر وہ انا تھی جو اس شخص کی مسلسل بے گانگی، لاتعلقی نے اس کے اندر جگا دی تھی۔ بہر کیف۔ وہ ایسا سب کچھ کر کے مسرور ہرگز نہیں تھی۔ اسے لگ رہا تھا کوئی چیز اس کا دل مسوس رہی ہے۔

غلط فہمی کی جو دیوار کھڑی کر رہی ہے یہ فاصلوں کو اتنا بڑھا دے گی کہ پھر شاید یہ فاصلے کبھی نہ سمٹ پائیں گے۔

ولید حسن کا صدمے سے اس کی طرف دیکھنا پھر غصہ سے پلٹ جانا، اس کے تصور کے پردے پر وہ لمحے گویا ساکت ہو گئے تھے۔

اس نے ایک گہری مضمحل سی سانس بھری۔

اگر وہ یہی سب چاہتی تھی اور یہ سب عین اس کی خواہش کے مطابق ہی ہوا تھا تو پھر وہ خوش کیوں نہیں تھی۔ اسے تو اب بہت گہری اور پر سکون نیند آنی چاہیے تھے۔ مگر اس کی آنکھوں سے نیندیں یوں بھاگی ہوئی تھی گویا پرندہ شکاری کے جال سے بچ کر اس کی پہنچ سے دور جا بیٹھا ہو۔

عجیب موڑ پر ٹھہرا ہے قافلہ دل کا
سکون ڈھونڈنے نکلے تھے وحشتیں بھی گئیں

یہی تو عورت کا المیہ ہے کہ وہ زخم دینے والے کو تکلیف پہنچا کر اسے تکلیف میں دیکھ کر اور زیادہ گھائل ہو جاتی ہے، بہت سی اذیت کا حساب لینے نکلتی تو ہے مگر ایک ذرا معمولی انتقامی کارروائی کر کے خوش ہونے کے باوجود خوش نہیں ہو پاتی۔

دراصل ہم لوگ خود کو دھوکا دینے کیلئے ہنستے ہوئے یہ یقین دلاتے عمر گزار دیتے ہیں کہ ہاں یہی تو ہم چاہتے تھے، یہی تو خوشی تھی، مگر خوش کیوں نہیں ہوتے، ہم پھر بھی خوش نہیں ہوتے ہمارے زخم مندمل ہونے کے بجائے اور اذیت دینے لگتے ہیں۔

وہ بے پناہ افسردگی سے ہنس پڑی اور لائٹ آف کر کے صوفے پر دراز ہو گئی۔اس نے سوچا کل وہ یونیورسٹی چلی جائے گی اور لائبریری میں بیٹھ کر پڑھائی کرے گی شاید ذہن بٹ جائے۔تانیہ سے بھی اسے ملنا تھا۔

اسے یہ سوچ کر شرمندگی ہونے لگی تھی کہ نادیہ آپی کی شادی میں اتنے تھوڑے دن رہ گئے تھے اور وہ یوں غیر بن کر بیٹھی تھی۔ محض تانیہ کیلئے وہ اتنی ساری محبتوں کو کیونکر چھوڑ بیٹھی ہے۔اس نے صبح تانیہ کی طرف جانے کا پکا قصد کر لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر نیند کہاں آنی تھی۔

کبھی یوں بھی ہو تیرے روبرو میں نظر ملا کے یہ کہہ سکوں

میری حسرتوں کو شمار کر میری خواہشوں کا حساب دے

X...X...X

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ناشتے کی میز پر جہانگیر احمد نے ولید کو اس کا موبائل دیا تو اسے کسی قیمتی متاع کی طرح تھامتے ہوئے ممنونیت سے ٹھنڈی سانس بھری۔

"بہت شکریہ۔میں تو سوچ رہا تھا آ... مجھے اس چیز سے تاعمر محروم ہی رکھیں گے۔" اس کا انداز شگفتہ تھا۔

" اور جیسے تم رہ لیتے برخوردار۔" آغاجی نے اخبار ایک طرف ڈال کر آملیٹ کی پلیٹ اپنی طرف کی۔وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر رہ گیا۔

طوبیٰ کو کھلاتے ہوئے مونا بھابی نے بے اختیار ہی ولید کی طرف دیکھا۔

چہرے پر جتنی بھی نقابیں ڈال لی جائیں مگر آنکھیں اپنے اندر کے حبس، اپنے الفاظ کے فشار، خلفشار سے مشروط ہوتی ہیں اور وہ خوبصورت آنکھیں انہیں بجھی بجھی محسوس ہو رہی تھیں۔اس کی مسکراہٹ کا ساتھ بالکل نہیں دے رہی تھیں۔

کل سی ویو پر شہرینہ کو دیوار کے پاس چپ چاپ گم سم اور ولید کو تنہا گاڑی میں بیٹھا دیکھ کر ہی وہ چونکی تھیں۔ان کے دل پر نامانوس سا بوجھ اتر آیا تھا۔

فاصلوں کی دیوار دونوں کے مابین جس تیزی سے تعمیر ہو رہی تھی یہ بات ان کیلئے بہت تشویشناک تھی۔

"تمہاری سیاسی سرگرمیاں سرد پڑی ہوئی ہیں اتنے دنوں سے اور ادھر تمہارا موبائل ہر پانچ منٹ بعد میسج چھوڑتا تھا۔" جہانگیر احمد ناشتہ کرتے ہوئے بولے۔

اس نے موبائل پر ایک نگاہ ڈالی اور اسے جیب میں ڈال کر آستین فولڈ کرتے ہوئے چائے کا مگ اپنی طرف کھینچا۔

"یہ آپ مجھے مسلسل قرض خواہوں کی طرح کیوں گھور رہی ہیں۔۔" وہ چائے کی چسکیاں بھرتا ہوا یکدم بھابی کی چوری پکڑ بیٹھا۔وہ جھینپ گئیں پھر سنبھل کر مسکرانے لگیں۔

"بہت سے قرض جو نکلتے ہیں۔"

"آپ کے قرض۔" اس نے مگ لب سے ہٹا کر ان کی طرف اچنبھے سے دیکھا۔وہ سر جھکا کر سریلیک میں چمچہ چلانے لگیں۔

"میرے نہ سہی' میری نند کے تو ہیں۔" ان کا لہجہ دھیما تھا۔جسے وہ ہی سن سکا۔ایک ہنکارا بھر کر اس نے نگاہیں جھٹکے سے ان کی طرف سے ہٹا لیں۔بھابی اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر عجیب سے یاس بھرے انداز میں مسکرا دیں۔

"میں سوچ رہا ہوں ولید کہ اب اس گھر میں کچھ تبدیلیاں آنی چاہئیں۔" آغا جی نے خالی مگ مما کی طرف بڑھاتے ہوئے اپنی نظریں ولید کے چہرے پر جما دیں۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔کیوں نا لابی اور ڈرائنگ روم کی سیٹنگ تھوڑی چینج کر لیں۔بلکہ میرا تو خیال ہے آپ کے بیڈروم کا کلر بھی بدل دیتے ہیں۔" وہ اطمینان سے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولا۔مما نے آغا جی کے مگ میں چائے بھرتے ہوئے بے ساختہ لب دانتوں میں دبا کر مسکراہٹ روکی تھی۔

"برخوردار میں صرف تمہارے کمرے میں تبدیلی لانا چاہتا ہوں۔تمہارے کمرے کا رنگ چینج کرنا چاہتا ہوں۔تاکہ تمہارے دل و دماغ دونوں پر اچھا اثر پڑے۔"

اب کے آغا جی بھی اسی اطمینان سے بولے۔اس کی بات کو ہنسی میں ٹال دینے پر قطعی برا نہ منایا تھا...بلکہ کچھ کر گزرنے کا عزم ان کے اطمینان میں ہلکورے لے رہا تھا اور یہی بات ولید کے اطمینان کو غارت کرنے لگی۔

وسیم نے بڑی ترحم بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

جبکہ وہ فوری طور پر آغا جی کے حملے کا جواب نہیں دے پایا تھا۔اس کی نظریں خالی کرسی پر گئیں جہاں شہرینہ بیٹھتی تھی مگر آج یہ کرسی خالی تھی وہ چونکا۔

تو وہ یونیورسٹی جا چکی تھی۔اس نے لب سختی سے بھینچ کر نظریں ہٹالیں۔اس کا یونیورسٹی جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔بلکہ یہ معمول کی بات تھی۔

مگر جانے کیوں اس کے دل میں کچھ چبھن سی ہونے لگی۔اس کے تصور میں اس کا صبح کا نکھرا نکھرا تروتازہ سراپا لہرا گیا۔سفید اور سبز رنگ کے کنٹراسٹ کاٹن کے سہٹ ہیں وہ صبح کی تازگی' نوخیزی اور مہک کا حصہ ہی لگ رہی تھی۔

"ہاں تو کیا خیال ہے ولید بچے! اس تبدیلی کے بارے میں۔" آغا جی مسکرائے اور چشمہ اتار کر اسے رومال سے پونچھنے لگے پھر آنکھوں پر دوبارہ چڑھالیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ادھر شہرینہ کے ایگزام ختم ہوتے ہیں۔ادھر اس لڑکی کو گھر داری سونپ دی جائے۔"

'اگر یہ تبدیلی اچھا اثر نہ ڈال سکی پھر۔' اس کے ہونٹوں کے اندر یہ سوال پھڑ پھڑا کر رہ گیا اور چائے کا مگ لبوں سے لگا رہ گیا۔

"عورت کی خاموشی تو رضامندی کے معنی میں آتی ہے مگر مرد کی خاموشی کا مطلب کیا لیا جا سکتا ہے۔" آغا جی کی ہنسی اس کے دل کو اداس کر گئی۔تاہم وہ مگ ٹیبل پر رکھ کر خود بھی ہلکے سے ہنس دیا۔یہ ہنسی ذہن کی کسی ہوئی طنابوں کو ڈھیلا کر کے اداس کرنے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے توقیر شاہ کی شادی بخیر وخوبی ہو جائے پھر سوچا جائے۔یوں بھی وہ بڑے ہیں مجھ سے' پہلے انہیں انجام کو پہنچ جانے دیجئے۔"

"یہ کیا بات ہوئی' توقیر شاہ کی شادی سے تمہاری شادی کا کیا تعلق؟ دیکھو لڑکے' تمہاری ان فضول سرگرمیوں کو توڑنے کیلئے ہی میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔" آغا جی اسے تنبیہی نظروں سے گھورتے ہوئے اٹھ گئے۔

"آپ کے خیال میں شادی مسائل کا حل ہے۔" وہ تمسخر سے ہنسا اور خود بھی کرسی دھکیل کر اٹھ گیا۔

"مسائل نہ سہی بہت سی الجھنوں کا ضرور ہے۔" آغا جی گویا اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔

"کیا خیال ہے وسیم! آغا جی ٹھیک کہہ رہے ہیں؟" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں مسکراہٹ اچھالتے ہوئے وسیم کو دیکھا۔ جواباً وسیم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور گلا کھنکار کر مونا بھابی کی طرف دیکھا۔

"مجھے تو شادی ہی خود ایک الجھن لگتی ہے۔"

"سن لیں آغا جی جواب آپ کو مل گیا۔" اس کا انداز ہنوز غیر سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ پھر آغا جی کو اپنی طرف گھورتے پا کر سر کھجانے لگا۔

"آپ نے سنا نہیں تجربہ' وہ کنگھی ہے جو گنجا ہونے کے بعد ہاتھ میں آتی ہے۔ اب بے چارے وسیم کو دیکھ لیجئے۔" اس نے بیٹھے ہوئے وسیم کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"آپ چاہتے ہیں کہ میں اس کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس جیسا ہی گنجا ہو جائوں۔"

"اے اے۔ مائنڈ اٹ۔ میں قطعی گنجا نہیں ہوں۔" وسیم تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے خوبصورت بالوں بھرے سر کے بارے میں ایسے ریمارکس سن کر اس کا دل لرز اٹھا تھا۔ مونا بھابی محظوظ ہو کر ہنسنے لگیں۔

"میرے دل کی بات کہہ دی ولید تم نے۔" انہیں گویا موقع مل گیا۔

وسیم میز سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھا تو وہ جلدی سے مما کی طرف بھاگ لیں۔

"تم میری بات کو مذاق میں ٹالنا چاہتے ہو۔ مگر میں اس بار پوری سنجیدگی سے اس تبدیلی کا سوچ رہا ہوں۔" آغا جی اسٹک سنبھالے لونگ روم کی طرف بڑھ گئے۔

ولید نے ایک سانس بھری پھر رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"مجھے سکندر کی طرف جانا ہے آغا جی! میرا خیال ہے واپسی پر باتیں ہوں گی۔"

"ولید!"

"بہت ضروری ہے آغا جی! سکندر کی طرف جانا۔" اس نے لجاجت سے کہتے ہوئے مسکین سی صورت بنائی۔

"کچھ میٹر دینا ہے اور کچھ لینا ہے اس سے۔" وہ بڑی سرعت سے کی بورڈ سے چابی اٹھاتا وہاں سے نکل بھاگا۔

X...X...X

ذرا ڈھولکی بجائو گوریو

میرے سنگ گائو گوریو

یہ گھڑی ہے ملن کی' اک سجن سے سجن کی

وہ دبے قدموں سے آکر نادیہ آپی کے گلے میں بازو حمائل کر کے ہنس پڑی۔ وہ چونک کر پلٹیں اور چاول کی تھالی جلدی سے فرش پر رکھ کر ایک مسرت آمیز حیرت سے اسے دیکھا۔

"اتنے دنوں بعد ہماری یاد آگئی تمہیں۔"

"دیر آید درست آید آپی۔" وہ دوسری چوکی کھینچ کر ان کے مقابل بیٹھ گئی۔

"بائی دی وے آپ نے یہ رخصتی جیسا منہ کیوں بنایا ہوا ہے' پریکٹس ہو رہی ہے کیا ابھی سے۔"

نادیہ آپی کی پلکیں رخساروں پر جھک گئیں۔ وہ چاول کی تھالی میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"کیا بات ہے؟ گھر میں اتنا سناٹا کیوں پھیلا ہوا ہے۔ تانی یونیورسٹی تو نہیں چلی گئی۔ میں اسے ہی لینے آئی ہوں۔ آنٹی بھی دکھائی نہیں دے رہیں۔"

"اماں سکندر کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں گئی ہیں انہیں ہائی بلڈ پریشر کی شکایت رہنے لگی ہے نا۔ تانیہ اپنے کمرے میں ہے۔"

"میں تانیہ سے خفا تھی اس لیے نہیں آرہی تھی۔ مگر آپ سے بالکل خفا نہیں ہوں۔" وہ تھالی سے چاول اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"تانیہ سے تو آج کل ہر کوئی خفا ہے' ایک ناآسودہ سی سانس ان کے لبوں سے نکل گئی۔
شہرینہ نے انہیں غور سے دیکھا۔ گھر کے در و دیوار سے جھلکتا ویرانہ نادیہ آپی کے چہرے پر بھی دکھائی دے رہے تھا۔

"کیا بات ہے آپی؟ یہ شادی والا گھر اتنا خاموش اور اداس کیوں ہے؟ چلیں آپ کی اداسی کی وجہ تو سمجھ آتی ہے کہ وداع کی گھڑیاں قریب آ رہی ہیں۔ مگر یہ تانیہ صاحبہ کس خوشی میں سر لپیٹ کر کمرے میں بند ہیں۔ ایسی بھی کیا ایگزام کی تیاریاں' بڑی پوزیشن لے گی۔ میں دیکھتی ہوں اسے۔ کم از کم عظمیٰ اور دوسری لڑکیوں کو بلا کر تھوڑا ہنگامہ ہی کر لیتی۔" وہ چوکی سے اٹھی تو نادیہ آپی نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"تمہیں عظمیٰ کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔ تانی نے بھی نہیں بتایا۔"

اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا ایک انجانے خدشے سے اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ سر نفی میں ہلانے لگی۔

نادیہ کے کھنڈر سلگتے سینے سے ایک غمزدہ سانس نکل گئی۔

"عظمیٰ کالج سے گھر واپس نہیں پہنچی' اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔"

ایسی وحشت ناک' اندوہناک خبر کا تو اس کے پاس تصور بھی نہیں تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح چوکی پر بیٹھ گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کیا آ۔ کیا عظمیٰ اغوا۔ او مائی گاڈز۔" اس کا دل سینے کی دیوار میں جیسے کسی نے مسل ڈالا۔

نادیہ آپی کرب سے لب کاٹنے لگیں' ان کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔

"ایک دکھ ہو تو تم کو بتائوں۔ یہاں تو ایک دکھ کی کوکھ سے دوسرا زخم نکل آتا ہے۔ دکھوں کی گرد سے اٹ چکا ہے یہ گھر۔" انہوں نے چوکی پر بیٹھے بیٹھے دیوار سے پشت ٹکا کر آنکھیں میچ لیں۔

"آپی! سید صاحب نے کوئی کوشش..." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر لب کاٹنے لگی پھر مجروح انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"خیر کوشش تو کی ہی ہو گی انہوں نے۔ مگر... مگر آخر کون ہیں جنہوں نے یہ گھنائونی حرکت کی ہے۔"

"یہاں مجرم کب بے نقاب ہوتے ہیں۔ کتنی بے قصور اور معصوم لڑکیاں ایسی ہی گھنائونی حرکتوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں اور رسوا اور معتوب بھی وہی ٹھہرتی ہیں۔" وہ رنج سے شق دل لیے کتنی دیر چپ چاپ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رہ گئی۔

اسے اپنے اعصاب مفلوج معلوم ہونے لگے تھے۔ اتنی طاقت نہیں تھی کہ اٹھ کر کولر کے پاس جا کر پانی پیے۔

کتنی دیر مضمحل اور اداس فضا ان دونوں کے درمیان چکراتی رہی۔ نادیہ آپی کی آنکھوں کے گوشوں پر آنسوئوں کی جھلملاہٹیں آہستہ آہستہ واضح ہو رہی تھیں۔ پھر انہوں نے آہستگی سے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھیں اور تھالی اٹھا کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

”اب دعا کے سوا کیا ہو سکتا ہے‘ جو گزر چکا ہے کمان سے تیر وہ کب واپس آ سکتا ہے۔ لاکھ عظمیٰ اپنی پاکیزگی سمیت بھی واپس آ جائیگی مگر اسے کون معاف کرے گا۔ لوگوں کی نگاہوں کی گندگی اس کی پاکیزگی اور اجلا دامن کب دیکھ پائیگی۔ تم تانیہ کے پاس جائو اسے تمہاری ضرورت ہے۔ وہ تمہیں پل پل یاد کر رہی ہے۔ کبھی کبھی ہم اپنے ہی دکھوں میں اتنا الجھ جاتے ہیں کہ دوسروں کیلئے رو بھی نہیں سکتے۔ آنسوان کے غم کا حق بھی ادا نہیں کر سکتے۔“

وہ چپ چاپ ان کی طرف دیکھتی رہی۔

”تانیہ امتحانات نہیں دیر ہی ہے۔“ وہ سنک کی طرف بڑھتے ہوئے آہستگی سے بولیں وہ چونکی۔

”کیوں۔“

”اس کیوں کا جواب وہی تمہیں بہتر دے سکتی ہے۔“ وہ نل کھول کر چاول دھونے لگیں۔
اس نے عجیب نظروں سے نادیہ آپی کو دیکھا پھر آہستگی سے چوکی سے اٹھ کر کولر کے پاس آئی۔ نادیہ نے سنک پر رکھا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے دیکھا اور عجیب مجروح انداز میں ہنس کر بولیں۔

”کچھ عظمیٰ جیسی لڑکیاں بلا تقصیر بے موت ماری جاتی ہیں اور کچھ تانیہ جیسی اپنے ہاتھوں مقتل گاہ کی طرف سفر کرتی ہیں۔ اپنے لیے کٹھن راستوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ اسے کہنا شیری کہ اس نے اگر اب بھی اپنے قدموں کو نہ روکا تو ایک ناقابل تلافی نقصان اس کی جھولی میں آ گرے گا‘ پھر وہاں ہماری تسلیاں اور تشفیاں بھی کچھ کام نہ دے سکیں گی۔“

اس سے بہ مشکل دو گھونٹ پانی پیا جا سکا‘ وہ پلٹ کر تانیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

X...X...X

تو بھی بھرم نہ رکھ سکا اپنے خلوص کا

ہم کو تو تجھ پہ خود سے بھی بڑھ کر غرور تھا

وہ بیسن کے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر ہنس پڑی۔ کتنی لاتعداد محرومیوں کا عکس ایک ساتھ اتر آیا تھا۔ کل تک سوچا بھی نہ تھا کہ جن جذبوں کی آبیاری کرتے ہوئے اتنی مسرور ہے' وہی زخم بن کر روح میں اتر جائیں گے۔

ہر جذبہ نشتر بن کر روح میں چبھنے لگا تھا۔

شہرینہ کو اندر آتے دیکھا تو پلٹی پھر مغموم پلکیں جھکا دیں۔

"اتنی خفا تھیں کہ پلٹ کر پوچھا تک نہیں' دیکھا تک نہیں کہ کن حالوں میں ہوں۔" بے اختیار شکوہ لبوں پر مچل گیا۔

اسے دیکھ کر بے اختیار دل چاہا بھاگ کر اس کے کندھے سے لگ جائے اور وہ تمام اشک بہا دے جو قطرہ قطرہ دل کے اندر جمع ہو کر آتش فشاں بن کر کلیجہ کاٹ رہے تھے۔

شہرینہ نادم سی ہو گئی۔

"سب ہی مجھ سے خفا ہیں' میری تقدیر بھی' خوشیاں بھی۔" وہ تولیہ ایک طرف ڈال کر بال لپیٹنے لگی۔

"مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ عظمیٰ پر اتنا بڑا ستم ٹوٹ پڑا اور تم۔"

وہ اسکے قریب چلی آئی۔ اس کے چہرے پر بکھرا حزن ہی نہیں تھا' اتنی ویرانی اور زردی تھی جیسے کسی اجڑے مزار پر ہوتی ہو گی۔

"تانیہ!" اس نے لرز کر بے اختیار اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔" اس کے دل پر حقیقتاً ضرب پڑی تھی۔

تانیہ نے لب دانتوں میں دبا کر چہرہ جھکا لیا۔

تم تو بس ایک ہی دکھ پوچھتے ہو

کون سے دکھ کی بات ذرا یہ تو بتا

موسموں، سرد ہواؤں کی مسیحائی کا دکھ

سنگ کے شہر میں خود، دکھ سے شناسائی کا دکھ

یا کسی بھیگتی برسات میں تنہائی کا دکھ

کون سے دکھ کی کریں بات کریں کہ دل کا دریا

اتنی طغیانی کی زد پر ہے کہ کچھ یاد نہیں

کب ہمیں بھول گیا، کون سے ہرجائی کا دکھ

تم تو بس ایک ہی دکھ پوچھتے ہو

"تانیہ پلیز!" شہرینہ نے تڑپ کر اس کا رخ اپنی طرف کر دیا۔ تب وہ ٹوٹی شاخ کی مانند اپنا توازن نہ رکھ سکی اور اس سے لگ کر اپنے دل کا درد بہا بیٹھی جو اس کے سینے کو کھنڈر کر رہا تھا۔

شہرینہ کیلئے حقیقتاً یہ بہت بڑا دھچکا ثابت ہوا۔ عظمیٰ کی گمشدگی کی خبر نے اس کے اعصاب کو پہلے ہی بری طرح متاثر کیا تھا۔ ادھر تانیہ کی طرف سے کیے گئے اندوہناک انکشاف نے

اسے بالکل ہی چکرا کر رکھ دیا۔ تانیہ کے گرم گرم آنسو اسے اپنے کندھے پر آتش سیال کی مانند محسوس ہونے لگے۔

"جاننا تو صدیوں کا عمل ہے تانی! تم نے یہ لمحوں میں طے کر لیا۔ دھوکا تو ہونا ہی تھا۔" اس نے متاسفانہ نگاہ اس پر ڈالی پھر اسے تھام کر بیڈ پر بٹھا کر پانی پلایا۔

(آہ۔ محبت عزت دار لڑکیوں کو مجروح پرندہ بنا کر رکھ دیتی ہے اڑ سکنے کی خواہش اور نہ اڑ سکنے کی بے بسی تاعمر تڑپاتی رلاتی رہتی ہے۔) اس کے اندر جیسے لہو سا بہنے لگا۔

"دکھ تو اس بات کا ہے تانیہ کہ تم نے دل کا سودا بھی کیا تو اکبر علی شاہ جیسے شخص کے ساتھ جو کبھی بھی اعتبار کے قابل نہیں تھا۔ جس کی سوچوں میں اتنی گندگی تھی کہ باہر تک چھلک آتی تھی۔ تم نے کیسے اندھی محبت کر لی تانیہ کو تمہیں اس کے وجود پر دکھائی دیئے جانے والے بدنام چھینٹے کبھی نظر ہی نہ آئے۔" اس نے بڑے مجروح انداز میں تانیہ کی طرف دیکھا۔

"شاید میں اندھی ہی ہو گئی تھی۔" وہ مغموم لہجے میں بولی۔

"نہیں۔ تمہاری آنکھوں میں خواب اپنا رنگ چھوڑ گئے تھے' خواہش کی روشنیاں اتنی تھیں کہ تم انہی کے عکس میں اس شخص کو بھی دیکھنے لگی تھیں اور وہ لفظوں کی خوشبو کی بوچھاڑ سے تمہیں نہلا کر اپنے باطن کی بدبو چھپا لیا کرتا تھا۔

تانیہ کو اپنا دل اس کے جملوں کی آگ میں جلتا محسوس ہوا۔ تاہم مزاحمت کی اس نے کوئی کوشش نہ کی۔ شاید اس لیے کہ اس کے پاس اپنی مدافعت کیلئے کچھ نہ تھا یا پھر وہ سچ ہی کہہ رہی تھی۔

وہ خالی گلاس کے کنارے پر ناخن کھرچتی رہی۔

"تم نے اکبر شاہ سے پوچھا نہیں کہ اس نے ایسی گھٹیا حرکت کیوں کی' تمہاری تصاویر اور وہ گفتگو ریکارڈ کرنے کی پست اور اوچھی حرکت کرنے کے بعد اسے توقیر شاہ کو کیوں دیا۔"

اس کا لہجہ باوجود ضبط کے کڑوا کسیلا اور طنز آمیز ہو گیا۔ اکبر علی شاہ کیلئے نفرت کا ایک آتش فشاں اس کے اندر گویا دہکنے لگا تھا۔

تانیہ نے جھک کر گلاس فرش پر رکھ دیا اور خود بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر جلتی آنکھیں میچ لیں۔ جیسے اس حقیقت سے فرار چاہ رہی ہو' اسے خواب سمجھ کر دھوئیں کے غول کی مانند فضا میں گم کر دینا چاہتی ہو۔

"پہلے یہ یقین تو آ جائے کہ میں اتنی بڑی مات کھا چکی ہوں جسے پوجنے کی حد تک چاہا۔ اس کے ہاتھوں یوں مجروح ہوئی ہوں۔" اس کی آواز بہت دھیمی تھی جیسے بجھتے چراغ کی دم توڑتی لو۔

"کیا مطلب۔ تمہیں اب بھی یقین نہیں آتا کہ اس نے... تانیہ خدا کے واسطے آنکھیں کھولو اور اس حقیقت کو تسلیم کر لو کہ۔"

"ہاں یہ حقیقت ہے سو فیصد حقیقت ہے۔ میں کب انکار کرتی ہوں۔" وہ کرب سے چلائی اور دونوں ہاتھوں میں سر سنبھال کر گھٹنوں پر جھکا لیا۔

"مگر بہت سی سفاک حقیقتیں کانٹوں کی طرح آپ کے جسم میں پیوست ہو جاتی ہیں' اس کے باوجود نظریں چرا کر امید و بیم' یقین و بے یقینی کے پنڈولم میں جھولنا اچھا لگتا ہے۔"

"یہ سراسر خود فریبی ہے۔"

شہرینہ اٹھ کر اضطرابی انداز میں ٹہلنے لگی۔ ”اور خود فریبی‘ خود فراموشی زیادہ دیر دلکش نہیں رہتی اور نہ دائمی ہوتی ہے۔ اس سے نکل کر حقیقت کو فیس کرنے کی اذیت سہنا ہی پڑتی ہے تو پھر تانیہ... تانی ابھی کیوں نہیں‘ یہ بار بار جڑنے اور ٹوٹنے کا عمل بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بہت اذیت آمیز۔“ اس کی سنہری آنکھوں کی سطح پر کوئی غم بہت ہولے سے دھند کی طرح آکر پھیل گیا۔ اس نے کھڑکی کے قریب ہی دیوار پر ٹیک لگا کر بڑے دکھ کے ساتھ تانیہ کو دیکھا جو گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رہی۔

”کیا سکندر کی یہ بڑائی نہیں کہ اس نے تمہیں کچھ کہا نہیں‘ حالانکہ وہ جس اذیت کے پل صراط سے گزرا ہوگا اس کا اندازہ تمہیں بھی بخوبی ہونا چاہیے کیا تم اتنے لوگوں کی محبت چاہت پر ایک گھٹیا‘ کمینے‘ رزیل شخص کو فوقیت دو گی۔“

”نہیں‘ نہیں بالکل نہیں۔“ تانیہ نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا اور بے بسی سے لب کچلنے لگی۔ پھر اپنے اندر کی کشمکش سے تھک کر بیڈ سے اتر کر اس کے قریب آئی۔

”میں تھک گئی ہوں شیری! مجھے لگ رہا ہے بیچ بازار میرے سر سے چادر کھینچ لی گئی ہے۔ میں ننگے سر اور ننگے پیر تپتی ریت پر کھڑی کر دی گئی ہوں۔ خدا کیلئے شیری مجھے تھام لو مجھے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تھام لو۔“ وہ اس کے دونوں ہاتھ اپنے مرتعش ہاتھوں میں تھام کر کسی خوفزدہ بچے کی طرح بلکنے لگی۔

”مجھے‘ مجھے اس رسوائی سے بچا لو‘ جو مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے‘ خدا کیلئے شیری! مجھے سکندر بھائی کی نظروں میں معتبر کر دو۔“

شہرینہ۔ دکھ کے گہرے احساس کے ساتھ گم صم اسے دیکھتی رہ گئی۔

ولید کو اپنی کنپٹیوں کی رگیں سخت تاروں کی مانند تنی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کے اعصاب پر ایک سناٹا اترا ہوا تھا۔

وہ سکندر سے ملنے آیا تھا۔ شہرینہ کی گاڑی باہر دیکھ کر پہلے ہی ٹھٹکا۔ پھر اندر آیا تو صحن میں بیحد خاموشی تھی۔ مگر تانیہ کے کمرے میں کھڑکی سے آتی سسکیوں کی آواز نے اس کے قدموں کو وہیں روک دیا۔

اکبر علی شاہ کے نام پر اسکی تمام تر حسیات بیدار ہو گئی تھیں اور وہ دانستہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ تانیہ کی سسکیاں اور شہرینہ کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ جن میں اکبر علی شاہ کا نام بار بار آ رہا تھا۔

یہ گفتگو بہت الجھی ہوئی تھی یا اسے ہی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں تو وہ اکثر ہی مختلف واقعات سے دوچار رہتا تھا مگر۔ اس بار اسے اپنی ذات بھی اس زنجیر میں کسی کڑی کی مانند جڑی محسوس ہو رہی تھی، شاید یہی وجہ تھی کہ وہ دانستہ اس نامناسب فعل کا مرتکب ہو رہا تھا۔

''ارے ولید بھائی! آپ کب آئے۔'' نادیہ آپی کی آواز کچھ فاصلے سے ابھری وہ میلے کپڑے واشنگ مشین میں ڈالنے کی غرض سے ادھر آنکلی تھی۔

وہ قدموں کی دھمک سے پہلے ہی سنبھل چکا تھا۔ بے حد اعتماد کے ساتھ اس کی سمت گھوما اور سر کو خفیف سی جنبش دیکر مسکرایا۔

''سکندر سے ملنے آیا تھا۔ اسے تو توفیق نہیں ہوئی کہ مجھ بیمار کا حال ہی پوچھ لیتا۔'' اس کے لہجے میں اس کی ذہنی پریشانی کا شائبہ تک نہ آیا۔

نادیہ ہلکے سے مسکرادی۔

'' اب آپ کی طبعیت کیسی ہے، ہاسپٹل سے کب آئے آپ۔ شہرینہ نے تو کچھ بتایا نہیں۔ خیر مجھے بھی پوچھنا یاد کہاں رہا تھا۔ آیئے اندر تو آیئے۔ صحن میں تو دھوپ اتر آئی ہے۔''

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''نہیں نادیہ سوری۔ مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں، سکندر اپنے آفس میں بھی نہیں ہے۔ نہ گھر پر ہے خیریت تو ہے؟''

''دراصل وہ امی کو ڈاکٹر کی طرف لے کر گئے ہیں۔''

''خیریت۔'' اس نے تشویش سے اس کی طرف دیکھا۔

''انہیں ہائی بلڈ پریشر رہنے لگا ہے، رات بھی طبیعت خراب رہی، خیر اب تو بہتر ہے۔'' وہ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھ کر جلدی سے بولی۔

''آپ چائے پئیں گے یا ٹھنڈا۔''

''ہوں۔'' وہ گہری سوچ میں غرق تھا فوراً ہاتھ اٹھا کر اسے روک کر ایک ہنکارا ابھرا اور انگلیوں میں دبی کی رنگ کو اضطرابی انداز میں ہلاتے ہوئے بولا۔

''اس تکلیف کو چھوڑو۔ سکندر سے تو خیر میں نمٹ لوں گا، مگر تم لوگوں نے بھی رابطہ نہیں کیا، مما اور مونا بھابی کو بڑی فکر ستا رہی تھی تمہاری۔'' پھر وہ اس سے فاصلے پر رک کر اس کے سر پر ہلکے سے ہاتھ رکھ کر فوراً ہی ہٹاتے ہوئے بولا۔

"کوئی کام ہو تو مجھے بلا جھجک حکم دینا۔ میں بھی سکندر کی طرح تمہارا بھائی ہوں اور اس بیوقوف گدھے صحافی سے کہنا کہ ولید خیر و عافیت سے ہاسپٹل کا بستر چھوڑ چکا ہے فوراً سے پیشتر گھر پہنچو۔ آغا جی بھی اسے بہت یاد کر رہے ہیں۔"

نادیہ سر کو اثباتی جنبش دیکر پھر معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

"بائی دی وے آپ واقعی سکندر کیلئے آئے تھے یا اس ریڈ سوک کا پیچھا کرتے ہوئے۔ لگتا ہے خوشبو مل گئی آپ کو کہ یہاں ہے۔" انہوں نے تانیہ کے کمرے کے بند دروازے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔

ولید نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر

ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

یہ کہہ کر اس نے شگفتگی سے قہقہہ لگایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ اپنی گاڑی میں روانہ ہو گیا تو وہ دروازے کو پکڑ کر کتنی دیر اس گرد کو دیکھتی رہیں جو اسکی گاڑی اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھی۔

اس نے گاڑی سگنل پر روکی اور سگریٹ لبوں کے درمیان باہم دباتے ہوئے اسے لائٹر کا شعلہ دکھایا اور ایک لمباسا کش لے کر ترتھ مین کا مہکتا دھواں اپنی آنکھوں کے آگے پھیلا دیا۔

سگنل کی سبز بتی جوں ہی روشن ہوئی۔ ذرا دیر کو رکا ہوا گاڑیوں کا سیلاب تار کول کی سڑکوں پر بہنے لگا۔ اس نے بھی آہستگی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے اس وقت کہاں جانا چاہیے اس کا ذہن بری طرح منتشر تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی آندھی آئی ہو اور ہر سو جھکڑ چلنے لگے ہوں' دھیان کی رو بھی کبھی کہیں اڑ رہی تھی کبھی کہیں۔ کسی سوچ کسی خیال کو ثبات نہیں تھا۔

شہرینہ کے رویوں نے حقیقتاً اُسے الجھا دیا تھا اور یہ الجھاؤ اس کی دوسری سرگرمیوں پر بری طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔

صبح گھر سے نکلتے ہوئے اس نے سوچا تھا وہ سکندر سے مل کر فدا حسین کی طرف جائے گا اور وہیں سے یوسف سے بھی رابطہ کرے گا۔ مگر اب نہ فدا حسین اسے یاد رہا تھا نہ یوسف... بے نام سا اضطراب اسے بے مقصد سڑکوں پر لیے لیے پھرتا رہا۔

یکدم اسے احساس ہوا وہ بالکل کالج بوائے کی سی حرکتیں کرنے لگا ہے۔ کم از کم سڑکوں پر یوں لور لور پھرنا کسی بھی مسئلے کا حل ہے نہ اس الجھاؤ اور انتشار کا توڑ۔ اس نے گاڑی جھٹکے سے روک دی۔ پھر سگریٹ پر نظر ڈالی جس کی ٹوپ پر راکھ کا دبیز... مینار کھڑا ہو گیا تھا۔ گویا کتنی دیر سے اس نے ایک کش بھی نہیں لگایا تھا۔ بے اختیار ایک گہری ٹھنڈی سانس اس کے لبوں سے نکل گئی۔ وہ سر کو خفیف سی جنبش دے کر ہنس دیا۔

" یہ حال ہے ولید حسن شاہ تمہارا۔ ایک کمزور سی لڑکی نے تمہیں اتنا منتشر ذہن' پریشان حال اور نکما بنا دیا ہے۔" وہ خود کو سرزنش کرنے لگا۔

جیب میں رکھے موبائل کی بجنے والی ٹون نے اس کی توجہ اپنی طرف کر لی۔ اس نے گاڑی ریورس کی پھر موڑ لیتے ہوئے موبائل آن کیا' دوسری طرف سکندر تھا۔

"دیکھو... دیکھو آفس پہنچتے ہی تمہیں فون کیا ہے۔" وہ اس کی پہلی گالی پر جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

" تم مجھ سے منہ کیوں چھپائے پھر رہے ہو۔ مجھے تو یاد نہیں پڑ رہا ہے' کہیں تم نے کوئی لمبا سا قرضہ ورضہ تو نہیں لیا مجھ سے۔"

"ہو سکتا ہے لیا ہو' مگر ادا نہیں کر سکوں گا۔" سکندر کا لہجہ دھیما تھا۔ پھر یکدم وہ قہقہہ لگا کر اپنے لہجے میں تمام تر توانائی سموتے ہوئے بولا۔

"قرضوں کا کیا ہے انہیں معاف کرانا اب کوئی مشکل نہیں رہا ہے۔ ویسے ہمیں تو بڑے بڑے قرضوں کی معاف کر دینے کی فوری ضمانت کیساتھ آفرز ہو رہی ہیں۔"

"سکندر!" ولید کے لب غیر محسوس طور پر سکڑ گئے' اس کی روح پر کوئی خیال پتھر کی مانند آن لگا۔ مگر دوسرے پل وہ ہلکی سی سانس بھر کر ہنس دیا۔

''مائنڈاٹ سکندر اعظم۔ انہیں قرضہ نہیں۔ ''دام لگنا۔'' کہتے ہیں۔ بلکہ بکنا۔ تم مجھے ذرا تفصیل سے بتانا کتنے دام لگے ہیں تمہارے۔ ہو سکتا ہے میں ان سے زیادہ قیمت دیکر تمہیں خرید سکوں۔''

''تم آفس آجائو' وہیں میں تمہیں اپنی قیمت بتاتا ہوں بلکہ قدر و قیمت۔'' سکندر نے چبا کر الفاظ ادا کیے اور رابطہ منقطع کر دیا... مگر ولید کے اندر کسی نامعلوم خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

سکندر کا اس سے کترانا' مردان علی شاہ کے ماضی کی داستان یک دم ادھوری چھوڑ دینا۔ اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔ اس نے گاڑی سکندر کے اخبار کے آفس کی جانب کر دی اور اسپیڈ بڑھا دی۔

X...X...X

تم کو احساس ندامت ہو تو بس اتنا کرنا

پھر اس طرح نہ کسی اور کو رسوا کرنا

اس کے تصور کے پردے پر عظمیٰ کا ڈھکا' چھپا' حیا آمیز سراپا بار بار لہرا کر اس کے ضمیر کو مسلسل کچوکے لگا رہا تھا۔ وہ غیر محفوظ آہٹ پر بدک جانے والی ہرنی جیسی لڑکی اس کے خیالوں کی سطح پر آکر اس سے مسلسل احتجاج کر رہی تھی۔

''یہ کیسی محبت ہے نعمان انصار قریشی تمہاری۔ محبت تو تحفظ کا نام ہے جو چاروں طرف اپنا حصار کھینچ کر چاہنے والے کو تحفظ دیتی ہے' اسے سرد گرم سے بچاتی ہے۔

محبت تو جگنو کی روشنی کی مانند راستہ دکھاتی ہے یوں راہ سے بھٹکاتی تو نہیں۔ محبت محبوب کو معتوب و رسوا کرنے کا نام تو نہیں ہے' اس کی پاکیزگی کو مجروح کرنے کا نام تو نہیں۔''

وہ رات بھر دیوانوں کی مانند چھت پر تو کبھی ورانڈے میں اور کبھی کمرے میں جا کر چک پھیریاں کھاتا رہا اور صبح ملگجا اجالا ہوتے ہی چڑیوں کی چہچہاٹ کے ساتھ ہی اسی عالم دیوانگی میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

سڑکوں کے فٹ پاتھ ابھی صاف ستھرے اور سنسان نظر آرہے تھے اکادکا لوگ چل پھر رہے تھے' ابھی سڑکوں کے اطراف کی دکانیں بند تھیں' سڑکوں پر ٹریفک بھی بہت کم تھی۔

رات بھر کا رت جگا' بے قراری اور سوچوں کی یلغار نے اسے بالکل نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ اس پر احساس جرم کی ضربوں نے اتنی تھکن اس کے اندر اتار دی تھی جتنی آج سے پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج تو جیسے پیر بھی جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر رہے تھے۔

وہ ایک بڑی شاپ کے باہر اونچی سطح پر بیٹھ گیا۔ یکایک ہی اسے اپنے سامنے کی ہر شے دھندلی دکھائی دینے لگی تھی۔ سب کچھ جیسے پانیوں میں چکر کھا رہا تھا۔ وہ اچانک بچوں کی طرح لبالب بھری آنکھوں پر ہاتھ دھر کر رو دیا۔

سید صاحب کی سسکیاں ان کے جھریوں بھرے چہرے کی ہر جھری سے ٹپکتی' بے بسی' مایوسی اور وحشت ناکی اس کی رگ رگ کو کاٹنے لگی۔ تانیہ اور نادیہ کے چہرے کے اوپر کبھی عظمیٰ کا چہرہ اور کبھی عظمیٰ کے چہرے پر نادیہ تانیہ کا چہرہ بنتا اور مٹتا گیا۔ جوان بیٹی کی گمشدگی نے سید صاحب کے گھر صف ماتم بچھائی ہو گی۔

نومی کو اپنے دل پر ایسی ماتمی صف بچھی محسوس ہو رہی تھی کہ کسی پل قرار نہیں تھا اور اب یہ قرار عظمیٰ کی بازیابی پر ہی آسکتا تھا۔

"ہاں اسے اب ایک پل کی تاخیر نہیں کرنی چاہیے اسے یاسر سے کہہ دینا چاہیے کہ وہ عظمیٰ کو بحفاظت گھر چھوڑ جائے' اس سے پہلے کہ اس کی گمشدگی ہر ایک زبان پر آکر اس کیلئے زہریلا نشتر بن جائے۔ وہ عظمیٰ کو گھر پہنچا دے۔ اسے ایسا سودا کسی طور منظور نہ تھا جس میں احساس جرم کا نشتر عمر بھر روح میں گڑا رہے۔

"کیا ہوا بیٹے؟" کسی نے جھک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے سر اٹھا کر دھندلائی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا جس کے ایک ہاتھ میں اسٹک تھی اور ڈبل روٹی بھی۔ وہ شاید اتنے بڑے لڑکے کو ایک بند دکان کے شٹر کے نیچے روتا دیکھ کر متحیر تھا۔

مگر وہ کہاں اس بوڑھے کے اس تحیر کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ تو اپنے ہی احساس جرم کے حصار میں بددل' ملول اور مضمحل بیٹھا تھا۔ بس آنکھیں میچ کر میکانکی انداز میں مسکرا کر کھڑا ہو گیا اور ایک طرف چلنے لگا۔ بوڑھا بھی اسے پاگل سمجھ کر سر جھٹک کر اپنی راہ لگ گیا۔

وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے چپکے سے گھر میں داخل ہوا اور دبے پاؤں اپنے کمرے میں آ کر الماری سے موبائل نکالا۔

اس نے یاسر کی تاکید کو یکسر فراموش کر دیا اور اس کے نمبر پش کرنے لگ۔

اتنی صبح یاسر جیسا شخص رات بھر کی مہ نوشی کے بعد نیند کے آکٹوپس میں بری طرح جکڑا ہوا ہی ہو سکتا تھا' تاہم اس نے مسلسل بیل جانے دی۔ کوئی چھٹی گھنٹی پر اسے یاسر کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ مگر نیند سے زیادہ وہ شاید اس ام الخبائث کے زیر اثر تھا۔

"یاسر! یاسر میں نومی بول رہا ہوں۔" وہ سرگوشیانہ انداز میں بولا۔

"کک۔ کون نومی' بہت سارے نومی بولتے رہتے ہیں اوہ... اچھا تم؟ ہاں تم بہت اچھے ہو نومی بہت اچھے۔"

"یاسر! عظمیٰ کہاں ہے پلیز ہوش میں آؤ اور مجھے کچھ بتاؤ۔"

"وہ ٹھیک تو ہے نا۔" وہ بہت آہستگی سے بول رہا تھا حالانکہ دل چاہ رہا تھا موبائل جا کر اسکے سر پر مار کر اسے ہوش میں لے آئے۔

آپ دل کی انجمن میں حسن بن کے آ گئے

اک نشہ سا چھا گیا ہم بن پئے لہرا گئے

"یاسر! یاسر! ہوش میں آؤ کیا زیادہ ہی چڑھا لی ہے۔" وہ دبے دبے لہجے میں سختی سموتے ہوئے بولا۔

"شراب۔ ہا۔ ہاہا۔ عمر ساقیا آج تیری ضرورت نہیں بن پیے بن پلائے خمار آ گیا۔" نومی نے مارے جھنجھلاہٹ کے موبائل کو گھورا۔

"یاسر! فار گاڈ سیک۔ یہ بتاؤ عظمیٰ کہاں ہے۔" اس کی وحشت اور جھنجھلاہٹ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

"عظمیٰ۔ آں۔ عظمیٰ۔ وائو وہ میرے پہلو سے اٹھا آخر شب..." وہ نومی کی جھنجلاہٹ سے بے پرواہ اسی مدہوش کیفیت میں تھا۔

"نومی...نومی تم نے کیا کمال کی چیز پسند کی ہے۔ شراب سے بھی زیادہ نشہ آور۔ چاند سے بھی زیادہ چمکیلی، صبح سے بھی زیادہ اجلی۔"

اس کا لہجہ نشہ سے ہی نہیں بلکہ ہر انداز سے لڑکھڑایا، ہوا خمار آلود محسوس کر کے نومی کو ایک پل اپنا دل کسی اتھاہ میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

"عظمیٰ کہاں ہے یاسر!" اس کے لہجے میں غیر محسوس طور پر کھنچاؤ آ گیا، اسے لگا اس کا دل زور سے پھیلا اور سکڑا ہو اور خون رگوں میں طوفان کی مانند دوڑ گیا ہو۔

"عظ۔ماں۔آں ہاں۔"

"ہاں۔ عظمیٰ جسے تمہارے آدمیوں نے کالج سے اٹھوایا تھا اور جسے تم نے انیکسی میں رکھا ہے۔" وہ لفظ چبا چبا کر بولا۔

"اوہ۔ہاں ہاں وہ۔وہ وہیں پر ہے مگر۔ مگر نومی مجھ سے... مجھ سے ایک خوبصورت خطا ہو گئی۔ ایک حسین غلطی کر بیٹھا۔"

"یاسر!" نومی کو اپنا دل ایک تاریک غار میں ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔ اس کے لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

"وہ بہت حسین لگ رہی تھی یا شاید اس وقت میں نے بہت زیادہ چڑھا لی تھی۔ میں تو اسے صرف دیکھنے گیا تھا۔ تمہاری پسند کو سراہنے گیا تھا کہ ذرا دیکھوں تو سہی اس گاؤدی کی چوائس کیسی ہے، وہ کیسی ہے جس کیلئے یہ دیوانہ ہوا ہے۔ پھر پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ شراب دماغ پر چڑھ گئی، اسے صرف ہلکے سے چھو کر دیکھنا ہی تو چاہا تھا مگر..."

یاسر کے حواس قدرے بحال ہو چکے تھے وہ جھینپا جھینپا وضاحتیں دے رہا تھا۔ مگر نومی کے حواس معطل ہو گئے تھے۔ اسے کچھ سنائی، دکھائی، نہیں دے رہا تھا۔

خون کی گردش اس کی شریانوں میں سمندر کی موجوں سے بھی زیادہ تیز ہو کر اس کے دماغ پر ٹھوکریں مارنے لگی تھی۔

"یاسر!" اس کے جبڑے آپس میں سختی سے بھینچ گئے اور رگوں میں دوڑنے والا لہو اس کی آنکھوں کی سطح پر یکا یک اڈنے لگا۔

X...X...X

نعمان کتنی دیر اعصاب شکن احساس کے ساتھ اپنی جگہ ساکت رہا۔ غیر محسوس طور پر اس کے ہاتھ کی گرفت موبائل پر سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی' اچانک کڑک کی آواز آئی اور جیسے شریانوں میں خون رواں ہو گیا۔ اس نے چیختے ہوئے موبائل پر ایک خالی نظر ڈالی پھر اسے ایک طرف پھینک کر اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔

یہ خوفناک حقیقت اس پر عیاں ہو چکی تھی کہ پا لینے کی اس خواہش کے گرداب میں پھنس کر اس نے سب کچھ کھو دیا۔ نا صرف اپنی بلکہ عظمیٰ کی زندگی کو بھی جہنم بنا دیا تھا۔

''نہیں یاسر! نہیں یہ ہمارے پروگرام کا حصہ قطعی نہیں تھا۔'' اس نے اپنے وارڈروب کی نچلی دراز سے سیاہ چمکتا ریوالور نکال کر اسے ٹراؤزر کی بیلٹ میں چھپایا۔ اور وارڈروب اسی طرح کھلی چھوڑ کر بھاگتا ہوا باہر گلی میں کھڑی اپنی بائیک پر جا بیٹھا۔

یاسر کی اس گھناؤنی حرکت نے اس کے سر پر خون سوار کر دیا تھا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحتیں ماؤف ہو رہی تھیں۔ اس کی نگاہوں تلے صرف عظمیٰ کا حیا آمیز سراپا تھا۔

''تم نے اچھا نہیں کیا یاسر! اب تمہاری ہوس ناکی کا انجام میرے ہاتھوں ہو گا' تم نے نعمان کی امانت میں خیانت کی ہے درندے' آئی ول کل یو' آئی ول کل یو۔''

یاسر کی کوٹھی کے سامنے بائیک رکی تو۔ اس نے شریانوں میں خون کو ابلتا محسوس کیا۔

X...X...X

''میرا خیال ہے تم خود کو مصروف ظاہر کرنے کی خوامخواہ کوشش کر رہے ہو۔'' ولید نے میز پر انگلیاں بجانے کا کھیل بند کر کے ذرا سا جھک کر اس کے آگے رکھے کاغذ کو کھینچ لیا جس پر سکندر کی نظریں مرکوز تھیں۔

سکندر نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس کے طرف دیکھا۔

''اس گریز کی وجہ...'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"یہ محض تمہاری کم فہمی ہے۔ اچھا یہ تو ادھر دو۔ بہت اہم کاغذ ہے۔" اس نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور اسے فائل میں پن اپ کرنے لگا۔

"مردان علی شاہ کے سلسلے میں تم نے مجھ سے بقیہ میٹر نہیں مانگا۔" اس نے پیپر ویٹ کو انگلی سے گھماتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

سکندر نظریں چراتا کرسی دھکیل کر اٹھ کر اپنے عقب کی الماری میں وہ فائل رکھنے لگا۔

اس کی یہ خاموشی ولید کو کسی حد تک پراسرار اور قدرے بوجھل سی محسوس ہوئی۔ اس نے پیپر ویٹ کو زور سے گردش دے کر اس پر ہتھیلی رکھ کر اسے بہ نظر غائر دیکھا۔

"وہ کون سی پیش کش ہے جو تمہیں اس گریز پر مجبور کر رہی ہے۔" اس کا انداز طنزیہ ہو گیا۔

سکندر نے اس کی طرف دیکھا پھر دوبارہ کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

"بات یہ ہے کہ ولید کہ... مردان علی کا دباؤ ہمارے ایڈیٹر صاحب پر بیٹھ گیا ہے۔" وہ بڑے تحمل سے سر ہلا کر گویا ہوا۔

"وہ بہت بڑے لوگ ہیں اور ان کا دباؤ کوئی معمولی دباؤ نہیں ہوتا۔"

"تم اپنی بات کرو سکندر..." ولید نے اس کی بات کاٹ دی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

"یہ دباؤ تم پر کس قسم کا ہے' اور کتنا ہے۔"

سکندر لب بھینچ کر رہ گیا۔

"یہ بات تو ہم دونوں ہی جانتے تھے اور توقع کر رہے تھے کہ توقیر شاہ یا مردان شاہ کی طرف سے کس قسم کی مزاحمتی کارروائی ہو گی۔"

سکندر نے لب بھینچے کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ اس کے جسم میں دوڑتے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اپنی بے بسی کا احساس روح پر کوڑے کی مانند لگ رہا تھا۔ تاہم اس نے آنکھیں کھول کر اپنی طرف ایک ٹک دیکھتے ولید کو دیکھا جو جواب طلب انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"اس کے باوجود میں مجبور ہوں۔" اس کے لبوں سے نکلنے والا جملہ ولید کے اعصاب پر چابک کی طرح پڑا۔

"وہاٹ..." فوری رد عمل کے طور پر وہ صرف اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ تحیر آمیز بے یقینی نے اس کی پلکوں کو کچھ دیر جھپکنے سے باز رکھا۔ پھر جیسے میز کی سطح پر ہاتھ پھیرتا ہوا زور سے ہنس پڑا۔ یہ ہنسی دراصل اس حیرت اور صدمے کی ترجمان تھی جو اسے پہنچا تھا۔

سکندر دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے سر جھکا کر میز کے کنارے پر اضطرابی انداز میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

"آئی کانٹ بلیواٹ... سکندر آئی کانٹ بلیواٹ' تم مجبوری کی بے کھنک زنجیر سے بندھ بھی سکتے ہو۔" وہ تحیر سے زیادہ اب صدمے سے دوچار تھا۔

"کس بات نے تمہیں پابہ زنجیر کیا ہے۔ سکندر مجھے سچ سچ بتاؤ۔"

وہ اسے کھوجتی نظروں سے دیکھنے لگا۔ سکندر ریوالونگ چیئر سمیت دوسری سمت گھوم گیا۔ اسے اپنی کنپٹیوں پر آگ دہکتی محسوس ہو رہی تھی۔ رگیں یوں تن رہی تھیں جیسے یہاں رگوں کا نہیں سخت تاروں کا جال بچھا ہوا ہو۔

سکندر کے نظریں چرا کر رخ پھیر لینے سے ولید کو دھچکا سا لگا۔

"سکندر..."

"ہا' پیسہ میری جان پیسہ..." وہ کرسی کا رخ ذرا سا اس کی سمت کرتے ہوئے بولا اور زور سے ہنس پڑا۔

"ہن برسے تو کیوں ترسیں... بس یہ بات ہے۔ یوں بھی میں جس قسم کے مسائل سے دوچار ہوں وہاں میرے لیے ان کی آفر گھپ اندھیرے میں روشنی کا ٹمٹماتا چراغ محسوس ہوئی ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ گرداب مصائب سے دولت کی کشتی میں ہی بیٹھ کر پار اترا جا سکتا ہے۔" ولید کا حیرت' دکھ اور صدمے سے برا حال ہو گیا۔ وہ کرسی سے جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے اس طرح جھٹکے سے اٹھنے پر کرسی پیچھے کی سمت الٹ گئی۔ اس کی نظریں سکندر پر یوں جمی تھیں جیسے وہ کوئی انوکھا کردار ہو۔ اور وہ اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ واچ کر رہا ہو۔

"جس دولت میں اطمینان خاطر نہیں اس سے وہ فاقہ مستی ہزار درجہ بہتر ہے۔ جس میں سکون قلب ہو۔ یاد ہے یہ بات؟ تم خود ہی یہ قول سنایا کرتے تھے۔ تم بکنے والے تو نہیں تھے سکندر..." وہ اب بھی عالم حیرانی میں تھا۔

"تب مسائل بھی مجھے یوں درپیش نہ تھے۔ مجھ پر دو بہنوں کا بوجھ ہے۔" وہ نظریں چرا کر سامنے دیوار کو گھورنے لگا۔

"بہت خوب... یہ دو بہنیں کوئی نئی اگ آئی ہیں کیا؟۔" وہ صدمے کے ساتھ طنز سے ہنس پڑا۔اور ایک کرب سے گزرتے ہوئے میز کی سطح پر ہتھیلیاں جما کر اس کی جانب جھکا۔

"کتنے پیسے کی ضرورت تھی تمہیں۔ تم مجھے بتاتے۔ میں دے دیتا تمہیں۔"

"تم..." سکندر نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔"تم مجھے قرض دیتے یا پھر خیرات۔"

"ہاں تو مردان علی شاہ نے تمہیں کیا دیا ہے۔" وہ کڑے تیوروں سے اسے گھورتا ہوا بولا۔

"معاوضہ' مائی فرینڈ معاوضہ..." وہ زور سے ہنسا' مگر کوشش کے باوجود اس کی ہنسی بے کھنک رہی۔اور شاید اپنی ہنسی کا کھوکھلا پن اس نے خود ہی محسوس کر کے لب بھینچ کر نظریں پھیر لیں۔

"معاوضہ' چہ خوب سچ اور نیکی تو اپنا معاوضہ آپ خود ہوتی ہے۔ سکندر صاحب! تم سچ اور نیکی کا معاوضہ ان سے لینے چلے ہو جو سچ کو دبانے کے لیے اس کی قیمت گھٹانے کے لیے

جھوٹ کی بڑی سے بڑی قیمت لگاتے ہیں۔" وہ افسردگی سے ہنس پڑا پھر سیدھے ہوتے ہوئے ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر اس پر ایک متاسفانہ نظر ڈالی۔

"تم یہ ڈیلنگ مجھ سے بھی کر سکتے تھے۔ بلکہ اب بھی کر سکتے ہو۔ جو قیمت مردان علی شاہ نے تمہارے قلم کی لگائی ہے۔ تمہاری عمر بھر کی نیک نامی کی لگائی ہے۔ میں اس سے زیادہ دوں گا۔

اسے تم میری طرف سے آفر سمجھ لو' اور اس پر سوچ کر جواب ضرور دینا تب تک کے لیے اللہ حافظ۔"

ولید ایڑیوں کے بل پلٹا اور اس کے آفس سے باہر نکل گیا۔

سکندر نے دکھتے ہوئے دل اور جلتی آنکھوں سے دروازے کو دیکھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دباتا کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

X...X...X

وہ سکندر کے آفس سے نکل کر اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کی بیک سے سر ٹکائے اپنے بوجھل ذہن کو سہارا دینے کے لیے آنکھیں موندے پڑا رہا۔

اس کے اعصاب یوں منتشر ہو کر بکھر گئے تھے جیسے وجود کے اندر کہیں بم بلاسٹ ہوا ہو۔ اور اس دھماکے بعد ہر شے بکھری بکھری نظر آئے۔

اس نے آنکھیں کھول کر ویران سنسان فضا پر ایک نظر ڈالی اور دفتر کی عمارت کو دیکھا۔

"ہم کیا سوچتے ہیں اور تقدیر ہمیں کیا دکھاتی ہے۔ ہاں خدا کی طاقت کو جاننے پہچاننے کیلئے ہمارے ارادوں کا ٹوٹنا ضروری ہے۔" اس نے ایک افسردہ سی سانس بھری۔ پھر مجروح انداز میں ہنس دیا۔

کہاں گیا وہ پرجوش صحافی جو مقامی آقاؤں کی غلامی سے اپنے عوام کو آزاد کرانے کیلئے سرگرم عمل تھا۔ جو ہوس، استحصال، اجارہ داری کے بڑے بڑے مضبوط پہاڑوں کے سامنے انصاف، مساوات، خوش حالی کے پودے اگا کر انہیں تناور درخت بنانے کے جتن کر رہا تھا۔

"کیا وہ سب عزائم تند موجوں میں بہہ جانے والا تنکا ثابت ہوئے۔"

دفعتاً ایک عجیب سی تلخی، غصے اور اداسی نے اس پر غلبہ پالیا۔ اسے اپنی رگوں میں دوڑتا ہوا لہو بھی کڑوا محسوس ہونے لگا۔

وہ مسلسل دو دن سے ایک ذہنی آزار سے گزر رہا تھا، پژمردہ تجربات سے دوچار تھا۔ اسے لگ رہا تھا ایک الجھاؤ ہے، ایک آزار ہے۔ ایک دکھ کے نیچے دوسرا صدمہ رقم ہے۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی بیک سے سر ٹکائے ٹکائے لمبی گہری سانسوں کے ساتھ خود کو اس اعصابی کشیدگی سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ پھر ڈھیلے ہاتھ سے اگنیشن میں چابی ڈال کر گھمائی۔

یکایک اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے دل و دماغ کے سب ہی راستے بند ہو گئے ہیں۔ کوئی سوچ، کوئی خیال نہیں ابھرے گا، کوئی نقش نہیں ٹھہرے گا۔ یہ شاید اس کی دل گرفتگی، پژمردگی اور بددلی کی آخری اسٹیج تھی۔

اس نے گاڑی کا رخ گوٹھ جانے والے راستے کی طرف کر دیا۔

نہ فکر فردا نہ یاد ماضی

نہ چین دل کو نہ بے قراری

نہ وصل کی لرزشیں نظر میں

نہ بے بسی ہجر کے سمے کی

نہ حد سے گزرا ہوا جنوں وہ

نہ بے کلی ہے وہ پہلے جیسی

بس اک اداسی ہے دھیمی دھیمی

بس اک خموشی ہے بیکراں سی

بس ایک بے نام سی جلن ہے

بس ایک بے درد سی تھکن ہے

جو زندگی کے ادھورے پن کو

حدوں سے آگے بڑھا رہی ہے

ماسٹر دین محمد اتنے دنوں بعد ولید حسن کو اپنے دروازے پر دیکھ کر حیرت آمیز مسرت سے مغلوب ہو گئے۔

''بسم اللہ سائیں، بسم اللہ! میں تو سمجھا آپ گوٹھ کا راستہ ہی بھلا بیٹھے ہیں۔'' انہوں نے دروازے پر موٹی کنڈے کی زنجیر کو ہٹا کر دروازہ پورا ہی کھول دیا۔

''کوئی اپنے ماضی سے بھی کٹ سکتا ہے ماسٹر صاحب...'' وہ جھک کر اندر آ گیا۔

ماسٹر دین محمد دروازہ ہلکا سا بھیڑ کر اسے ایک ٹک دیکھنے لگے۔ ان کی بوڑھی آنکھوں کی سطح یکایک ہی چمکنے لگی۔

''وہی چہرہ، وہی قد، وہی انداز۔'' وہ ماضی کے خیالوں میں کھو سے گئے۔

''ایسا ہی تناور چھتنار درخت تھا۔ بولتا تو لفظوں کی مہک دور تک جاتی۔ سچے اور مخلص لوگ جب بات کرتے ہیں نا توان کی تاثیر اس مہک جیسی ہوتی ہے جو پہلی بوند پڑنے پر شفاف مٹی سے اٹھتی ہے۔ خالص سچی لاثانی مہک۔''

''آپ نے تو انہیں قریب سے دیکھا تھا نا ماسٹر صاحب!''

ولید چار پائی پر ڈھیلے انداز میں بیٹھ گیا۔اس کے دل کے مضراب پر ماسٹر دین نے گویا ہاتھ ہی مار دیا تھا۔ مگر اسے اچھا لگ رہا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر وہ یہی ذکر سننے یہاں تک آیا تھا۔ اسے اپنا سینہ انوکھی خوشبو سے مہکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"ہاں سائیں! میں نے صرف دیکھا ہی نہیں اسے محسوس بھی کیا ہے۔" ماسٹر دین محمد ایک گہری سانس بھر کر چار پائی کے قریب رکھے موڑھے پر بیٹھ گئے۔ پھر جیسے بحر عقیدت میں ڈوب کر بولے۔

"سائیں! اب ہر کسی کو تو انسان محسوس نہیں کرتا نا۔"

"محسوسات کی تو ایک الگ ہی دنیا ہے' ہزاروں میں کوئی ایک بلکہ کبھی لاکھوں اربوں میں کوئی ایک آپ کی روح کے تار کو چھیڑ جاتا ہے' آپ کو اپنی دھڑکنوں میں سنائی دیتا ہے۔اور آپ اپنے دل کے بیحد قریب اسے پا کر اسے سوچنے' محسوس کرنے لگتے ہیں۔یہ عمل کسی شعوری کوشش کے تحت نہیں ہوتا بلکہ خود بخود ہونے لگتا ہے۔پھر وہ اس کے سامنے ہو نہ ہو مگر اس کی موجودگی کا احساس رہتا ہے۔

جس طرح کسی کی محبت کو آپ جبراً اپنے دل میں نہیں اتار سکتے' سائیں! اسی طرح کسی کی محبت کو آپ لاکھ آزاد پنچھی کی طرح فضا میں کھلا چھوڑ دیں' وہ آپ کے دل کے پنجرے سے نہیں نکلتی۔

حسن علی شاہ کی محبت چاہت بھی گوٹھ والوں کے دلوں میں اسی طرح رچی بسی ہے' زور و جبر سے' بیرونی زمین پر تسلط قائم کیا جا سکتا ہے۔پر دل کی زمین کو کسی بھی استبداد سے حاصل نہیں کیا جا سکتا سائیں۔"

ماسٹر دین محمد کی آواز ولید کو اپنے دل پر لگتی محسوس ہو رہی تھی۔اس کے دھیان کی رو میں شوریدہ سی لہریں سر پٹخنے لگیں اور کوئی شے دل کو مسوسنے لگی۔اس نے چار پائی پر رکھے تکیے پر سر ٹکا لیا۔ مگر آنکھیں بند کرتے ہی جیسے ایک نامانوس سا درد سارے جسم میں پھیلتا ہوا محسوس ہوا۔اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔

یوسف' ولید کی آواز سن کر باہر آ گیا تھا' مگر دونوں کے درمیان کسی قسم کی مداخلت نہ کرتے ہوئے بے حد خاموشی سے بے آواز انداز میں موڑھا کھینچ کر ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔

"اور سناؤ یوسف!... بڑے دنوں سے کوئی خیر خبر نہیں آئی تمہاری۔" ولید کی نظریں اس پر پڑیں تو وہ ایک گہری سانس کھینچ کر سیدھا بیٹھ گیا۔

"سائیں خبر تو آپ نے بھی نہیں لی' میں تو کئی دنوں سے موبائل پر کنٹیکٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب سے آپ کے حادثے کی اطلاع ملی' مجھے اور بابا کو بڑی تشویش لاحق ہو گئی۔ پھر فدا حسین سے آپ کی خیر خبر کی اطلاع ملتی رہی۔ آپ نے موبائل بند رکھا ہوا تھا۔"

"ہوں..." اس نے ایک ہنکارا بھرا اور ماسٹر دین محمد کو دیکھا جو اپنے کندھے کے رومال سے اپنی آنکھوں کی گیلی سطح پونچھ رہے تھے۔

"ماسٹر صاحب کی خوبصورت باتوں سے دل پر چھائی اداسی دور کرنے آیا ہوں یوسف... یہاں آکر ایسا لگتا ہے میں کسی گھنیری چھاؤں میں آگیا ہوں۔

استاد بھی موسم بہار کی طرح ہوتے ہیں یوسف... روح کی ساری خزاں رسیدہ ڈالیوں کو ترو تازہ کر دیتے ہیں۔" اس نے ایک عقیدت مندانہ نظر ماسٹر دین محمد پر ڈالی۔

"ہم تو بڑے چھوٹے لوگ ہیں سائیں..." یوسف آہستہ سے بولا۔

"نہیں یوسف... تم تو کم از کم ایسی جاہلانہ بات مت کرو۔" اس نے اسے ناراض نظروں سے دیکھا۔

"تم تو خوش نصیب ہو کر تمہیں ایک گھر ہی نہیں ملا' بلکہ ایک بہترین درسگاہ ملی ہے' تمہیں پتہ ہے سکندر اعظم اپنے استاد کو باپ پر ترجیح کیوں دیا کرتا تھا۔"

یوسف نے دلچسپی سے موڑھا اس کی طرف کھینچ کر بیٹھتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔

"ایک بار کسی نے سکندر اعظم سے پوچھا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو' تو اس نے جواب دیا کہ اس لیے کہ باپ مجھے آسمان سے زمین پر لایا' اور میرا استاد ارسطو مجھے زمین سے آسمان پر لے گیا باپ سبب حیات فانی' اور استاد موجب حیات جاودانی ہے۔ باپ میرے جسم کی پرورش کرتا ہے اور استاد میری جان کی۔"

یوسف نے سر جھکا لیا۔

"تم تو خود اس عظیم رتبے پر فائز ہو چلے ہو یوسف... تم خود کو کمتر سمجھ کر در حقیقت اس علم کی توہین کرتے ہو جو تمہارے سینے میں اترا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ علم کی قیمت ہے اس لیے قیمت لیے بغیر علم کسی کو نہ دیا کرو' اس پر لوگوں نے سوال

کیا کہ بھلا علم کی قیمت کیا ہے ؟آپ نے فرمایا اس کا ایسے شخص کے پاس رکھنا جو خوبی کے ساتھ اس کا بار اٹھائے اور حفاظت رکھے اس کو ضائع نہ کرے..."

"خیر..."

اس نے یوسف کے چہرے پر اترنے والی خفت اور ندامت کی سرخی دیکھی تو ایک گہری سانس کھینچی اور ہلکے سے مسکرا کر موضوع بدل دیا۔

"یہ بتائو تمہاری درس گاہ کا کیا حال ہے ؟۔" اس کا اشارہ سکول کی طرف تھا ماسٹر دین محمد اس کیلئے کھانے پینے کا انتظام کرنے اٹھ کر اندر چلے گئے۔

"کوئی خاص نہیں' مردان علی کے آدمی اسکول بند تو نہیں کرا سکے۔تاہم لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان کے بچوں کو داخل ہونے سے روکنے کی مہم میں مصروف ہیں۔پھر بھی قریب قریب کے گوٹھ کے بچے آرہے ہیں۔اور اس گوٹھ سے بھی کئی والدین ہیں جو اپنے بچوں کو داخل کرانا چاہتے ہیں۔"

"ہوں... اور کوئی نئی تازہ خبر..." وہ چارپائی سے اتر کر ٹہلنے لگا۔

"نئی خبر تو رئیس توقیر شاہ کی شادی ہی ہے۔" یوسف نے یہ کہہ کر اس کی طرف دیکھا۔"آپ کے علم میں تو ہو گا ہی...۔"

"ہاں... گوٹھ میں تو بڑی رونق ہو گی آج کل۔" اس نے دیوار پر کہنی لگا کر پوچھا؟

"کوئی خاص نہیں' ہاں حویلی کے اندر ضرور ہے' بڑے لوگ ہیں سائیں !ان کی ساری رونقیں حویلی کے اندر ہی ہوتی ہیں۔گوٹھ کے کمی کمین کے ساتھ ان کی خوشیوں کا کیا میل۔"

"بڑے نہیں امیر لوگ...۔" اس نے مسکرا کر تصحیح کی تو یوسف فرش کو گھورتے ہوئے افسردگی سے ہنس دیا۔پھر اچانک خیال آنے پر بولا۔

"اب آپ کے ہاتھ کا کیا حال ہے ؟۔"

"ارے نہیں کوئی بڑا حادثہ نہیں تھا۔سب ٹھیک ہے یہ ماسٹر صاحب کہاں چلے گئے۔"

"فدا حسین کہہ رہا تھا کہ آپ لوگوں پر قاتلانہ حملہ مردان علی شاہ نے کروایا ہے۔"

ولید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔پھر ہلکے سے مسکرا دیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟۔"

"میرا... مم... میرا کیا خیال سائیں؟۔" وہ سٹپٹا کر رہ گیا پھر فرش کو گھورتے ہوئے بولا۔

"لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔ فدا حسین تو زخمی شیر کی طرح بلبلا رہا ہے سائیں! مجھے لگتا ہے وہ جوابی کارروائی کیے بنا چین سے نہیں بیٹھے گا۔" پھر موڑھے سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"آپ اندر ہی چلیں سائیں! یہاں بڑی دھوپ اتر آئی ہے۔ تپش بھی بڑھ گئی ہے۔ بابا بھی شاید اندر ہی گئے ہیں۔" اس نے کسی گہری سوچ سے نکل کر سر کو نفی میں ہلایا اور چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔

"مجھے تو یہاں بالکل بھی دھوپ نہیں لگ رہی ہے۔ نہ تپش کا احساس ہو رہا ہے۔" اس نے صحن میں بکھری دھوپ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔

"کبھی کبھی اپنے اندر اس سے زیادہ دھوپ اتری ہو۔ حبس اور تپش ہو تو بیرونی دھوپ کوئی معنی نہیں رکھتی۔"

ماسٹر دین محمد صحن میں داخل ہوتے ہوئے بولے اور ولید پر ایک گہری نظر ڈال کر چھاچھ اور گلگلے ایک موڑھے پر رکھ کر وہ موڑھا ولید کے آگے کر دیا۔

ولید ان کی بات پر اسی زاویے سے بیٹھا رہ گیا۔ یکلخت اس کے اندر کا ٹھہراؤ دم توڑ گیا۔ سکوت ایک بار پھر رخصت ہو گیا۔ اسے لگا ماسٹر دین محمد نے کوئی پتھر اٹھا کر اس کے ل لکی جھیل کی بوجھل سطح پر مار دیا ہو اور پانی میں تلاطم برپا ہو گیا ہے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ زبان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی پھسل کر اندر کہیں گم ہو گئے۔ وہ ایک گہری سانس بھر کر ہنس دیا۔

"اس موسم میں اسی مشروب کی ہی ضرورت تھی۔" اس نے تمام تر رغبت کے ساتھ چھاچھ کا بڑا سا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

جبکہ ماسٹر دین محمد کی نظریں اسی پر جمی تھیں اور ان کے تصور میں حسن علی شاہ پورا کا پورا زندہ ہو گیا۔

X...X...X

آمنہ علی سیڑھیاں اترتی لابی میں آئی تو اکبر علی شاہ کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ صوفے پر اوندھا لیٹا فون پر مسلسل کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم اس دو ٹکے کی فضول سی لڑکی تانیہ کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔" اس نے اپنا موبائل اور گلاسز کانچ کی تپائی پر رکھ کر اسکے آگے سے فون سیٹ کھینچ لیا۔ اکبر شاہ نے لیٹے لیٹے ہی منہ اونچا کر کے اسے دیکھا پھر ہنس دیا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو فی الحال میں تانیہ سے کنٹیکٹ کرنے کی قطعی فضول کوشش نہیں کر رہا ہوں۔"

"بات سنو... شہرینہ سے کوئی معاملہ سلجھا پایا نہیں...۔" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"ارے دفع کرو اسے وہ تو پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی، تم معاملہ سلجھنے کی بات کر رہی ہو۔" وہ بدمزہ سا ہو کر چت لیٹ گیا۔ اس کے سینے سے ایک ٹھنڈی سانس دھوئیں کی طرح نکلی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اس دو ٹکے کی تانیہ کے پیچھے خوار ہونے سے باز آئو گے تو عقل بھی کہیں اور استعمال ہو گی نا۔"

"اس کے معاملے میں مجھے عقل کی نہیں برداشت کی ضرورت ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آمنہ علی اس پر ایک جلتی نظر ڈال کر رہ گئی۔ پھر ایک ہلکی سی سانس بھر کر تپائی پر رکھا ہیئر برش اٹھا کر بالوں میں پھیرتے ہوئے بولی۔

" گوٹھ جانے کا کیا پروگرام ہے تمہارا؟"

"مجھے تو بابا سائیں اور توقیر بھائی کی سمجھ نہیں آتی، شادی کو بھی سیاسی کھیل بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔ ایک طرف گوٹھ میں رسمیں ہوں گی تو دوسری طرف ولیمہ شہر میں ہو گا۔ اور رت جگے توقیر بھائی کے اسی کوٹھی میں ہوں گے۔ میں تو کہتا ہوں گوٹھ کو گولی ماریں۔ یہیں ساری رسمیں بھی ہونی چاہئیں۔"

"گوٹھ میں ہمارے اتنے ریلیٹوز ہیں اور پھر وہاں کی رسموں کا بھی اپنا ہی حسن ہے، مامی میراں کے اپنے رشتے دار بھی تو گوٹھ میں ہی ہیں۔ تم مت آنا تم توقیر بھائی کے ساتھ کوٹھی میں ہی رت جگے

منالینا۔یار دوستوں کے ساتھ...۔'' وہ بے پرواہی سے برش چلاتے ہوئے بولی۔

''وہ تو خیر بڑے اچھے پروگرام بنائے ہیں میں نے۔ مگر ایک کمی رہ جائے گی۔'' اس نے خمار آلودہ سانس نما آہ بھری۔آمنہ نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

''تانیہ کی...۔''

وہ بے ساختہ دل مسوس کر رہ گیا۔

''ہاں...۔''

''اونہہ...۔'' آمنہ حقارت سے منہ پھیر گئی۔

'' تم کچھ بھی کہو' مگر یہ حقیقت ہے کہ اس میں ایسا کچھ ضرور ہے کہ وہ پاس ہوتی ہے تو میں بے خود ہو جاتا ہوں۔وہ دور ہوتی ہے تو طلب ہونے لگتی ہے۔''

''یہ تو تمہاری پرانی بیماری ہے۔'' آمنہ علی نے جیسے اس کا مذاق اڑایا۔مگر وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اسی سحر میں گم بولا۔

''وہ اس شراب کی بوتل جیسی ہے جسے جب تک منہ لگا کر خالی نہ کر دیا جائے طلب بڑھتی جاتی ہے۔''

''تمہاری انہی عادتوں کی وجہ سے باباسائیں پریشان ہیں۔تم ان کی سیاسی ساکھ کو کمزور کرتے ہو۔'' اس نے اسے ٹوک دیا۔

''کمزور۔میں نے کمزور کی ہے یا مستحکم۔'' اس نے بھنویں اچکا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا اس کیسٹ اور تصاویر نے اس دو ٹکے کے صحافی کا منہ بند نہیں کر دیا۔کچھ سیاسی سمجھ بوجھ تو میں بھی رکھتا ہوں' بس ذرا لاپرواہ ہوں۔میدان عمل میں آنے دو میرے جوہر کھلتے چلے جائیں گے۔''

''اوہو...۔'' آمنہ برش ایک طرف ڈال کر ہنسی پھر اٹھنے لگی کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔اکبر علی نے آگے جھک کر موبائل اٹھا کر آن کیا۔دوسری طرف جمشید خان تھا وہ اس سے ہیلو ہائے کرنے لگا۔

آمنہ علی ایک دو لمحے لب بھینچے اسے دیکھتی رہی پھر جلدی سے ہاتھ کے اشارے سے اپنے یہاں موجود نہ ہونے کا اشارہ کیا۔ اکبر علی نے قدرے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر پھر سے جمشید خان کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"بس ابھی ہی نکلی ہے وہ... میرا خیال ہے اپنا موبائل وہ یہیں بھول گئی ہے۔ خیر اس سے کنٹیکٹ ہو گا تو میں اسے آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔" دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا' تو اکبر علی نے موبائل بند کرتے ہوئے اس کی طرف استفہامیہ نگاہ ڈالی۔

"خیریت... جمشید سے بات کیوں نہیں کرنی۔ جھگڑا وگڑا ہو گیا ہے یا...۔" اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی آمنہ علی نے اپنا موبائل اس کے ہاتھ سے لیا اور کوئی جواب دیئے بنا وہاں سے چلی گئی۔ وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ پھر اسی پوزیشن میں لیٹ کر فون سیٹ اپنے قریب رکھ کر تانیہ کا نمبر پش کرنے لگا۔ کوئی تیسری بیل پر ایک نرم و ملائم آواز سنائی دی۔ جو تانیہ کی بہر حال نہیں تھی اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ پھر چت لیٹ کر تانیہ سے کسی اور طریقے سے رابطہ کرنے کی ترکیب سوچنے لگا۔

X...X...X

وہ ایک ان دیکھی آگ میں دھڑا دھڑ جلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ یاسر کے بنگلے کے سیاہ گیٹ کے سامنے بائیک روکی تو اسے اپنی شریانوں میں آگ دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ وہ سیدھا یاسر کی خوابگاہ میں ہی آیا۔ کسی نوکر نے بھی اسے دیکھ کر روکنے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ نومی سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اس گھر میں بلا روک ٹوک آتا جاتا تھا۔ خوابگاہ کی گہری خامشی اور خالی پن نے اسے غصے سے گویا پاگل کر دیا۔ اس نے باتھ روم میں جھانکا۔ بالکنی دیکھی۔ مگر وہاں بھی سکوت تھا۔ وہ اسی کھولن کے ساتھ باہر نکلا۔

"یاسر کہاں ہے عزیز...!" اس نے راہداری میں اس کے ملازم کو روک لیا۔

"چھوٹے صاحب تو انیکسی میں ہیں۔" ملازم نے یہ کہتے ہوئے جانے کیوں نظریں چرا لیں اور جلدی سے بولا۔

"آپ بیٹھئے میں انہیں آپ کے آنے کی اطلاع کرتا ہوں۔"

"نہیں رہنے دو..." اس نے اسے روکا اور اپنے اندر کے بھڑکتے الائو سے نبرد آزما ہوتے ہوئے بہ مشکل لہجے کو سنبھال کر بولا۔

"اس نے مجھے بلایا ہے۔ کوئی ضروری کام ہے۔ میں خود چلا جاتا ہوں انیکسی میں۔ تم جائو۔"

وہ خنجر کی دھار بنا سیدھا انیکسی کی طرف آیا۔

انیکسی کا پالش شدہ دروازہ اس نے پائوں کی ٹھوکر سے کھولا مگر سامنے سنسان لابی تھی۔ جہاں کچھ ابتری دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک کمرے کی جانب بڑھا جہاں اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

اس کا ہاتھ جیب میں رکھے ریوالور کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ نیم وا تھا۔ اندر سے نسوانی ہلکی ہلکی سسکیوں کے ہمراہ یاسر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"دیکھو اب اس طرح رونے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا جو ہو چکا ہے اسے خواب سمجھ کر بھول جائو۔ اور کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے' اس سے الٹا تمہیں ہی نقصان اٹھانا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پڑے گا۔" اس کی آواز میں بے نام سی وحشت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا تاہم آواز دھیمی تھی۔

"تمہیں میرے آدمی تمہارے گھر بہ حفاظت چھوڑ آئیں گے ہمارا پروگرام بس اتنا ہی تھا اور پھر...۔"

"نہیں یاسر ہمارا پروگرام یہ ہرگز نہیں تھا۔"

نومی ٹوٹے ہوئے نوکیلے کانچ کی طرح چٹختا ہوا اندر چلا آیا۔ اس کی خون آشام نگاہیں یاسر پر جمی تھیں۔ یاسر کو دیکھ کر اس کے ہاتھ پیروں میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔

"ہمارا پروگرام عظمیٰ کو صرف ایک رات باعزت طریقے سے انیکسی میں رکھنا تھا اور بس...۔"

اس کے چہرے پر آگ دہکنے لگی تھی۔ یاسر اس کی اچانک آمد پر بوکھلا کر بیڈ سے یوں اچھل کر کھڑا ہوا تھا جیسے وہیں کسی نے بم رکھ دیا ہو۔

عظمیٰ کا بے حال متورم' لٹاپٹا وجود نومی کو یہاں دیکھ کر سکتے کی سی کیفیت میں چلا گیا۔اس کی آنکھیں بے یقینی کے عالم میں پھیل کر نومی پر مرکوز ہو گئیں۔تو گویا یہ ساری آگ نومی کی دہکائی ہوئی تھی جس سے اس کا رواں رواں جل رہا تھا۔اس کا وجود شعلوں میں گھر کر رہ گیا تھا۔یکدم اسے پورا کمرہ کھولتا ہوا سمندر لگنے لگا تھا۔اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

نومی نے اس کی طرف دیکھا تو اس کا دل اسے تڑپا گیا۔جیسے دل کو تیز خنجر کے لبوں نے چھو لیا ہوا۔اس کے ہر مسام سے پسینہ کے ساتھ ساتھ جیسے خون ابلنے لگا۔

”یاسر! تم نے... تم نے اچھا نہیں کیا... اچھا نہیں کیا تم نے' میری امانت میں خیانت کی ہے...“ وہ جیب سے ریوالور نکال کر یاسر پر یکدم تان بیٹھا۔

اور اس کی سزا ضرور موت ہے۔“

”نومی! نومی بیوقوف! پاگل ہو گئے ہو۔“ یاسر کی پتلیاں ریوالور کو دیکھ کر جیسے ہلنا بھول گئیں۔نومی کے چہرے کے خطرناک تیور نے اس کی رگوں میں خوف بھر دیا وہ مارے دہشت کے پیچھے کی طرف ہٹنے لگا۔

”تم... تم مجھے قتل کر دو گے صرف اس لیے کہ میں نے...“

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”صرف... صرف...“ نومی پاگلوں کی طرح آگے بڑھا اور اس کی گردن دبوچ لی۔

” یہ صرف ہے کتے یہ صرف ہے' تم تو سانپ ہو جس پر میں اعتماد کر بیٹھا۔سانپ دودھ پر بھی ڈستا ہے' اس کا کام ڈسنا ہے۔“

یاسر کو اپنا حلق بند ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔اپنی بقا کیلئے اس نے بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے زور لگا کر نومی کو دھکا دیا اور دروازے کی طرف لپکا۔مگر نومی کا ریوالور والا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔آتشیں گولیاں تڑتڑا نکلیں اور یاسر کے وجود میں پیوست ہو گئیں۔

”نومی... ی... ی...“ عظمیٰ کی دلخراش چیخ اس سے بھی کہیں زیادہ تھی۔جیسے روح کی تمام ترکراہیں اس میں سمٹ آئی ہوں۔وہ فرش سے بامشکل خود کو گھسیٹتی اٹھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی جانب بڑھی جو یاسر کے جسم سے ابلتے خون کو ساکت نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”یہ... کیا کر دیا نومی تم نے...“ اس کی کانپتی لرزتی آواز ابھری اور دم توڑ گئی۔ایک زوردار چکر نے اس کی ساری ہستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔وہ دیوار کا سہارا لینے کیلئے بڑھی مگر

آنکھوں کے سامنے زمین گھوم گئی۔پے در پے صدمے نے اس کی ساری توانائیاں چوس لی تھیں۔اس کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ گئے تھے وہ فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

X...X...X

سانوں نہر والے پل تے بلا کے

چن ماہی کتھے رہ گیا

"صغریٰ تمہاری یہ بے وقت کی راگنی سے میں بہت عاجز ہوں۔" کب سے کہہ رہی ہوں تمہیں۔" ممانے فریج بند کر کے ڈائننگ ٹیبل پر زور زور سے کپڑا مارتی صغریٰ کو گھورا۔

"سن لیا بی بی! اور جواب بھی تو دے دیا ہے کہ ولید بائو منع کر رہے ہیں انہیں بھوک نہیں لگی اور اب کی جائوں گی تو اللہ قسم بہت زور کی پھٹکار پڑے گی۔" وہ گنگنانا چھوڑ کر جلدی سے بولی تو مونا بھابی چائے کا کپ بھرتے ہوئے ٹھٹک گئیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ولید گھر پر ہی ہے کیا؟۔" انہیں ذرا حیرت ہوئی۔

"ہاں جی' اب آپ آپے ہی جائو۔انہیں بلانے مجھے تو بڑا ڈر لگتا ہے۔" صغریٰ نے حفظ ماتقدم کے طور پر معذرت کر لی اور کچن میں جا کر بیسن پر کانچ کے برتن دھونے لگی اور دوبارہ اسی رفتار میں لہک لہک کر گنگنانے لگی۔

"دیکھو تو ذرا اس لڑکی کو۔کان کھا گئی ہے۔" ممانے ماتھا پیٹا۔بھابی نے صغریٰ پر ایک نظر ڈالی اور ہنستی ہوئی بولیں۔

"خیریت ہے صغریٰ بی بی! نہر والا پل بڑا ہی یاد آرہا ہے۔ہفتہ بھر رہ کر آئی ہو۔کیا خوب ملاقاتیں ہوئی ہیں شیر بائو سے۔"

"ہائے ربا...۔" صغریٰ کی گنگناہٹ یکلخت بند ہو گئی۔

اس کے گندمی چہرے پر شرم کی لالی بکھر آئی۔

عورت جس طبقے کی بھی ہو اس کی حیا کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے ایک ہی مذہب' ایک ہی زبان' ایک ہی لباس' آنکھوں کو خیرہ کرنے والا دل کو لبھا جانے والا۔

"بابا میری پگی نہ دبادیں جو میں ملاقات کرنے جائوں' نہ جی ہمارے علاقے میں ہماری بڑی عجت ہے۔" وہ جھینپی جھینپی وضاحت دینے لگی۔اس کا یہ انداز ممی اور مونا بھابی کو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر گیا۔

"پر دل تو چاہتا ہو گا تیرا۔اس سے چھپ چھپ کر ملنے کو۔" بھابی نے اسے شرارت سے کریدا۔

"دیکھیں نا بی بی! بھابی کو۔ایویں' چھیڑ رہی ہیں۔" وہ مونا بھابی کی نظروں سے نظریں چرا کر مما کو مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

"بھلا میرا دل کوئی جھلا ہے کہ اپنی ہی چیز سے چھپ چھپ کر ملنے کو چاہے گا۔" وہ ہاتھ پونچھتی ہوئی کچن سے نکلتے ہوئے ایک بڑی سمجھدار عورت کی طرح بولی تو بھابی نے اسے توصیفی انداز میں بھنویں اچکا کر دیکھا۔

ادھر اپنی کلائی سے رسٹ واچ اتار کر ٹیبل پر رکھتا ہوا ولید صغریٰ کا یہ جملہ سن کر کتنی دیر اس جملے کے حصار میں رہا۔

بظاہر بہت عام سا جملہ تھا مگر وہ شدت سے اس کی گہرائی میں اتر گیا۔پھر سر جھٹک کر عجیب سے انداز میں ہنس دیا۔اور سگریٹ پیکٹ سے نکال کر اسے لبوں کے درمیان پھنسائی اور لائٹر کا شعلہ دکھایا۔دوسرے ہی پل ننھا سا بے ضرر شعلہ سگریٹ کی ٹوپ پر چمکنے لگا۔وہ صوفے پر دراز ہو گیا اور ہاتھ کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ دیا۔

اس کے وجود کے اندر گہرا سناٹا اترا ہوا تھا۔وہ اچانک ہی اپنے آپ کو بہت تنہا خالی اور اداس سا محسوس کرنے لگا۔جیسے یکدم ہی دنیا میں اب کرنے کو کچھ رہا نہ ہو۔کوئی مصروفیت نہ رہی ہو۔وہ ایک بے ضرر سا عضو ہو کر رہ گیا ہو۔

اس کی یہ کیفیت اس پے درپے صدمے کی وجہ سے تھی جو اسے صبح سے پہنچے تھے۔شہرینہ کی کج ادائی' تانیہ اور اس کی مبہم گفتگو۔سکندر کا اچانک بدلنے والا روپ۔اس کو اندر سے توڑ پھوڑ رہا تھا۔اسے لگ رہا تھا کہ بھاگتی دوڑتی زندگی کے ساتھ بھاگتے بھاگتے اچانک اسے ٹھوکر لگی ہو۔اس کے ارادے اس کی توقعات۔اس کے امبیشن پر ایک زبردست ضرب پڑی ہو۔

کوئی ایسا بڑا طوفان آکر گزر گیا ہو جس سے وہ اب تک بے خبر تھا مگر اب اس کی بہت بڑی تباہی اور نقصان اس کے آگے پھیلا ہوا ہوا اور وہ حیران پریشان اجڑا سا اس نقصان کا اندازہ کر رہا تھا۔

وہ مبہم انداز میں ایک گہری سانس بھر کر سگریٹ کو تکنے لگا۔ جس کی ٹوپ پر چمکتے شعلے کے اوپر راکھ کا انبار جمع ہو گیا تھا۔

اسے اپنا دل بھی ایسا ہی شعلہ محسوس ہونے لگا جس کے اوپر راکھ آہستہ آہستہ جمع ہو رہی ہو۔ اس نے سوچا اگر یہ راکھ بروقت نہ جھاڑی تو شاید یہ شعلہ اس کے تلے دب کر ہمیشہ کیلئے بجھ جائے گا۔

نہیں وہ بجھنا نہیں چاہتا تھا۔

بجھنا تو موت ہے

روحانی موت

باطنی موت

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ اپنے اندر کی سوچوں اور خلفشار سے گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر دوسری سلگائی اور اس کے دھیرے دھیرے کش لیتا کھڑکی کی طرف چلا آیا اور سلائیڈ کھول کر باہر جھانکنے لگا۔

کہیں بھی چھائوں کا احساس نہیں تھا۔ ہر شے پر دھوپ کا سنہرا پن بکھرا ہوا تھا۔ نہ کہیں تازگی کا احساس تھا نہ طراوت یا کسی چھائوں کا اتنے غور سے اس نے کبھی موسموں کا معائنہ نہیں کیا تھا۔ شاید موسم کو شعوری طور پر تو محکمہ موسمیات ہی واچ کرتا ہو گا۔ وگرنہ تو اندر کی کیفیت اک عام آدمی کو موسم سے قریب کرتی ہے۔

اس وقت اسے تنہائی، خامشی اور دھوپ بھی شاید فیسی نیٹ کر رہی تھی۔ وہ کوئی تیسری سگریٹ سلگا رہا تھا جب بھابی نے اس کے کمرے کو ہلکا سا بجا کر اندر جھانکا۔ پھر آہستگی سے اندر آ گئیں۔

"میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آ سکی کہ لوگ اچھی بھلی سیدھی سادی زندگی کو خوامخواہ میں پیچیدہ کیوں بنا ڈالتے ہیں۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی قسم کی سانس بھر کر کمرے کا سرسری جائزہ لای۔

"خیریت...وسیم نے دوسری شادی کا پروگرام تو نہیں بناڈالا؟"

ولید نے ان کے لہجے کی معنی خیزی کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے لائٹر بند کر کے میز پر رکھا جواباً انہوں نے اسے گھور کر دیکھا پھر دبیز دھوئیں کو ہاتھ سے ادھر ادھر منتشر کرتی ہوئی بولیں۔

"اللہ کا شکر ہے ایسی کوئی خوشخبری تمہارے لیے نہیں ہے۔" پھر کھڑکی کی طرف بڑھ کر پردے کھولتے ہوئے بولیں۔

"کمرے کو مکمل جہنم کا روپ دے رکھا ہے کھڑکیاں اور دروازے تو کھول دیا کرو جب اسموکنگ کا شوق ہو' کم از کم یہ دھواں تو باہر نکلے۔"

"اچھا مجھے تو دھواں نظر نہیں آرہا ہے۔" اس نے سلگائی ہوئی سگریٹ ان کی آمد کے باعث بجھادی تھی اور اسے ایش ٹرے میں ڈال دیا۔اور بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا جو پردے کی ڈوری کھینچتے ہوئے اسے چونک کر دیکھنے لگی تھیں پھر ہنس دیں۔

"ہاں تمہارے اپنے اندر اس سے بھی زیادہ دھواں ہو گا تب ہی تمہیں یہ بیرونی دھواں محسوس نہیں ہو رہا ہے۔"

ولید کے مسکراتے لب یکدم سکڑ گئے۔

ماسٹر دین محمد کا کہا ہوا کچھ ایسا ہی جملہ اس کے ذہن کے کسی گوشے سے نکل کر اس کے دل پر ضرب مارنے لگا۔(کبھی کبھی آدمی کے اپنے اندر اتنی زیادہ دھوپ' حبس اور تپش ہو تو بیرونی دھوپ تپش کوئی معنی نہیں رکھتی اس کے لیے)

"شاید...شاید ایسا ہی ہو۔" ایک ہلکی سی سانس اس کے لبوں سے خارج ہو گئی۔اس نے رخ پھیر کر کھڑکی کے باہر نگاہیں جمادیں۔

"یوں بھی بیرونی موسم سے زیادہ اندر کا موسم ہی ہم پر اثر انداز ہوتا ہے۔اینی وے۔"

وہ جیسے کسی خیال کے حصار سے نکل کر سر کو خفیف سی جنبش دیکر اپنی وارڈروب کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"میں شاور لے کر لنچ کروں گا۔"

"میں تمہیں لنچ کا بلاوا دینے تو نہیں آئی۔" بھابی ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولیں تو اس نے وارڈروب کا پٹ کھولتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"میں تو یہ دیکھنے آئی تھی کہ تم جیسا تھرلنگ' پارہ صفت بندہ آج گھر میں بلکہ کمرے میں گھس کر کیوں بیٹھا ہوا ہے۔"

"اوہ...۔" وہ بے ساختہ ہلکی سانس بھر کر رہ گیا پھر ابرو اچکا کر مسکرا دیا۔

"تو یوں کہیں آپ جاسوسہ بن کر میرے کمرے میں اتری ہیں۔"

"تمہارا نالج بہت کمزور ہے جاسوسہ اترتی نہیں اترنا تو صرف پریوں اور حوروں کا کام ہے جاسوسہ نازل ہوتی ہے۔"

"اوہ ہاں جاسوسہ تو نازل ہوتی ہے اور پھر مسلط ہو جاتی ہے۔"اس نے پرزور انداز میں تائید میں سر ہلایا۔

"اچھا خیر' اب اتنی تائید کی بھی ضرورت نہیں میں کوئی جاسوسہ واسوسہ بن کر نہیں آئی ہوں۔بلکہ میں تو...۔" وہ ذرا اسرار کیں لب دانتوں میں دبا کر مسکراہٹ اچھالتے ہوئے بولیں۔

"ناصح بن کر آئی ہوں۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ناصح...۔" اس کے ہونٹ بے اختیار سیٹی کے انداز میں سکڑنے لگے۔اس نے خاصے تمسخرانہ انداز میں ان کو دیکھا مگر مونا بھابی کے چہرے پر یکدم سنجیدگی اتر آئی تھی۔

"ہاں...ناصح" انہوں نے قدرے زور دے کر کہا اور اس کے بیڈ کے کنارے بیٹھ گئیں۔

"خدا خیر کرے..." اس نے بے ساختہ ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"یہ ایبلیٹی بھی آپ میں ہے؟" اس کا انداز سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔

"اس میں ایبلیٹی کی کیا بات ہے' جہاں نصیحت کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ہر کوئی ناصح بن سکتا ہے۔" انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ ہنس پڑا۔

"چہ خوب یعنی جہاں کسی کی عقل کا سوئچ آف ہوا وہاں اپنی جگنو جتنی عقل لے کر میدان میں اتر آئے۔بائی داوے سسٹر آپ کو کس غیب دان نے یہ مشورہ دیا ہے کہ یہاں آپ کی نصیحت کی ضرورت ہے۔آپ جا کر ناصح کا رول پلے کریں۔"

"صرف نصیحت ہی نہیں مفید مشورے کی بھی ضرورت ہے۔" وہ اسی اطمینان سے جواباً بولیں تو وہ بھنویں اچکا کر ہنس دیا۔

"ویسے آپ کے ان مفید مشوروں اور نصیحتوں پر وسیم نے کتنا عمل کیا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے انہیں کبھی نصیحت کرنے اور مشورہ دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی' وہ زندگی کو سیدھے سادے طریقے سے گزارنے والے بندے ہیں۔ تمہاری طرح پیچیدگیاں اور پریشانیاں ڈھونڈ کر ان میں الجھنے والے نہیں۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے اس کے خوش نما چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا جہاں ایک پل کے لئے ایک کھنچاؤ سا آگیا تھا مگر وہ جلدی نارمل ہوتے ہوئے بولا۔

"اوہ۔ تو آپ اندر داخل ہوتے ہی وہ طنز مجھ پر فرما رہی تھیں۔"

"شکر ہے کہ تمہیں سمجھ تو آئی۔ دیر آید درست آید۔" انہوں نے بے ساختہ ایک ٹھنڈی اور تشکر آمیز سانس بھری تو وہ انہیں گھورنے لگا پھر اپنا شلوار سوٹ کندھے پر ڈال کر باتھ روم کی طرف بڑھا۔

"ولید! میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آئی ہوں۔' ' وہ قدرے سنجیدگی سے بولیں تو اس نے قدم روک کر ان کی طرف ترچھی نظر ڈالی۔

"یہ سب مذاق کی باتیں تھیں اور سنجیدہ باتیں مذاق کے پیرائے میں بہر حال نہیں ہو سکتیں۔" ان کا لہجہ گہری سنجیدگی اوڑھ چکا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے شلوار سوٹ کندھے سے ہٹا کر بیڈ پر ڈال دیا۔ گویا ان کی بات سننے کیلئے آمادگی ظاہر کی۔ مونا بھابی ایک ثانیے کیلئے کچھ سوچنے لگیں جیسے جو کہنا چاہ رہی ہوں اس کیلئے مناسب الفاظ تلاش کر رہی ہوں یا بات شروع کرنے کیلئے کوئی سرا۔ پھر ایک ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔

"ولید! میں سوچ رہی ہوں کہ تمہارے اور شہرینہ کے مابین جو فاصلے پیدا ہو رہے ہیں یہ محض غلط فہمیوں کے باعث ہیں یا ان کی کوئی ٹھوس وجہ بھی ہے۔" پھر قدرے دوستانہ پن سے بولیں۔

"دیکھو ولید! محض سر جھکا کر چلتے جانے سے منزل کبھی نہیں آتی۔ منزل کیلئے ارد گرد نظر رکھنا اور راستوں کا تعین بھی ضروری ہے۔"

"اور جسے آپ منزل سمجھ کر چل رہے ہوں وہ منزل آپ کی نہ ہو تو۔" وہ قدرے ترش روی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا تو مونا بھابی نے ان کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"کیا مطلب؟"

"اگر میں یہ کہوں کہ ان فاصلوں کی ایک ٹھوس وجہ میری سمجھ میں خود اب آئی ہے تو؟"

اس نے براہ راست بھابی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا مگر اس کی آنکھوں میں اترنے والی سرد مہری اس مسکراہٹ کے باوجود ہنوز قائم رہی۔

بھابی کا دل لحظہ بھر سینے کی دیوار میں لرز سا گیا۔ انہوں نے ولید کو کچھ ایسی خوفزدہ نظروں سے دیکھا جیسے وہ ابھی کوئی بم بلاسٹ کرنے والا ہو۔

"ہاں اور یہ ٹھوس وجہ۔ جانتی ہیں کیا ہے۔" اس کا انداز ہنوز ویسا ہی تھا۔ بھابی کوئی جواب دینے کے بجائے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہیں تب اس نے لب بھینچ کر نظریں ان کے چہرے سے ہٹالیں اور سامنے دیوار پر جما کر ایک متاسفانہ سانس بھری۔

"وہ وجہ اکبر علی شاہ ہے۔ اس کا کلاس فیلو۔ جس کیلئے وہ بہت اچھے جذبات رکھتی ہے۔ اپنی وے میں نہیں جانتا کہ یہ سلسلہ کب سے شروع ہوا ہے اور کہاں تک جا پہنچا ہے۔"

"کیا آ۔ اکبر علی شاہ؟" بھابی کو حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ انہوں نے ولید کی طرف یوں دیکھا گویا اس کی دماغی حالت پر شک گزرا ہو۔ پھر قدرے ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"کتنے دکھ کی بات ہے کہ تم نے شہرینہ جیسی لڑکی کو انوالو بھی کیا تو اکبر علی شاہ جیسے آدمی کے ساتھ۔ جس سے وہ شدید نفرت کرتی آئی ہے۔"

ولید کے تیوروں میں کھنچاؤ سا آ گیا۔ مگر اس کے کچھ بولنے سے پہلے بھابی بولیں۔

"ولید کچھ لوگ ہمارے ارد گرد رہتے ہیں۔ ہمارا ان سے روز ملنا یا انہیں دیکھنا ہوتا ہے مگر ہم ان سے ذہنی اور دلی طور پر لاتعلق ہی رہتے ہیں۔ مگر کچھ لوگوں سے لاتعلق بھی نہیں رہ سکتے۔ ان سے خود بخود کوئی نہ کوئی تعلق رشتہ استوار ہو جاتا ہے اور اکبر علی شاہ سے جانتے ہو شیری کا کیا رشتہ ہے؟ کون سا تعلق ہے؟۔"

"مجھ سے پہیلیاں مت بجھوائیے۔" وہ چڑ سا گیا۔ مگر بھابی اس کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے ٹھنڈے لہجے میں بولیں۔

"ان کا رشتہ نفرت کا ہے۔ شیری اس سے شدید ترین نفرت کرتی ہے۔"

"کیوں؟ اس نفرت کی وجہ۔" اس نے ابرو اچکا کر کہا۔ تاہم بھابی کے چہرے کے تاثرات اسے اضطراب میں دھکیلنے لگے۔

”اس کیوں کا جواب تو بہتر طور پر شیری ہی دے سکتی ہے ہاں مختصراً یہ کہ...اس کا کردار' اس کے رویے' شہرینہ کے دل میں اس کیلئے نفرت پیدا کرنے کے باعث ہوئے ہیں۔ کسی راہ چلتے آوارہ بدقماش سے تو کوئی نفرت کرنے نہیں بیٹھ جاتا نا۔ جب تک کہ اسی آوارہ کی آوارگی' اس کی بدنظری اور اس کے کردار کا منفی تاثر اس پر اثر انداز نہ ہو' اسے تکلیف نہ پہنچائے۔“

ولید کیلئے یہ جملہ خاصا بھاری تھا۔ وہ بھابی کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اسے کوئی انوکھی کہانی سنا رہی ہوں۔ نا سمجھ میں آنے والی زبان میں...

اس کے ذہن میں شہرینہ کے جملے گونجنے لگے۔ پھر یکایک سکندر کے گھر میں تانیہ اور شہرینہ کی مبہم سی گفتگو کے الفاظ یاد آنے لگے... اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور صوفے پر ڈھیلے انداز میں بیٹھ گیا۔

”تو اس نے اپنے اور میرے درمیان اکبر علی شاہ کو اس کردار میں پیش کیوں کیا۔“ اس کے لہجے میں نا چاہنے کے باوجود چبھن در آئی۔

”ہاں سوچنے کی بات ہے کہ یہ نوبت آئی کیونکر؟“ بھابی بے ساختہ ہنس پڑیں۔ پھر معنی خیز انداز میں بھنویں اچکا کر اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”مجھے نہیں پتہ کہ تمہارے اور اس کے مابین یہ اکبر علی شاہ کب اور کیسے آگیا۔ شاید جس طرح آمنہ علی شاہ داخل ہوئی اسی طرح۔“

ولید نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کی لکیریں ابھر آئیں۔

”آپ کے خیال میں۔ میں آمنہ علی میں انوالو ہوں۔ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی کمٹ منٹ۔“

”یہ میں نہیں شہرینہ سمجھتی آرہی ہے۔' بھابی فوراً بولیں۔

”تم شاید نہیں جانتے کہ غلط فہمی کھردری جھاڑی کی مانند ہوتی ہے اسے اگتے ہی نہ کاٹ ڈالا جائے تو یہ بہت تیزی سے بڑھ کر راستوں کو مسدود کر دیتی ہے۔ اس کی جڑیں دور تک پھیل کر دل کی زمین کو بنجر کرنے لگتی ہیں۔“

"آپ کا کیا خیال ہے۔ میں اس کی غلط فہمیاں دور کرتا پھروں اسے وضاحتیں دیتا پھروں کہ۔" وہ جھٹکے سے صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

"نہیں ولید! عورت کب وضاحت مانگتی ہے بھلا۔ یہ تو تم مردوں کا وطیرہ ہے۔" وہ چبھتے ہوئے انداز میں ہنس دیں۔

"عورت تو اپنے محبوب کے دل میں اپنے ہونے کا صرف یقین مانگتی ہے۔ ذرا سی توجہ' ایک محبت بھری نگاہ' ایک میٹھی مسکراہٹ' چند پر خلوص جملوں پر وہ تو اپنا آپ وار دیتی ہے۔ اور یوں بھی وضاحت کی ضرورت وہاں محسوس ہوتی ہے جب دلوں ہیں خلوص نہ ہو' جھوٹ اور بدی ہو' سچ کبھی وضاحت نہیں مانگتا یہ تو از خود رویوں اور نگاہوں سے عیاں ہو جاتا ہے۔۔"

ولید آہستگی سے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسے اپنی کنپٹیوں پر سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بھونچال سا اس کے ذہن و دل میں مچ گیا تھا۔

تانیہ اور شہرینہ کی وہ مبہم سی گفتگو یاد آ کر گویا ذہن پر ہتھوڑے کی مانند لگنے گی۔

اسے گمان ہوا کہ وہ گفتگو اس کی سمجھ میں نہ آنے کے باوجود اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ تانیہ کی سسکیاں شہرینہ کا نفرت انگیز لہجے میں اکبر شاہ کا ذکر کرنا' تانیہ کا گڑگڑانا۔ عجیب اعصاب شکن الجھاؤ تھا جو کسی ریشم کے تھان کی مانند لمحوں کی انگلیوں سے دھیرے دھیرے سلجھنا چاہ رہا تھا۔

'اتنا شدید ردعمل ہو گا اس دیوانی لڑکی کا۔ محض انا میں آ کر وہ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا بیٹھی۔' ایک بوجھل سی سانس اس کے سینے سے خارج ہو گئی۔

'کتنی بیوقوف ہو شیری! تمہاری محبت تمہارا وجود تو میرے لیے وہ گھر ہے جس میں آ کر میری روح طمانیت محسوس کرے گی۔ جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر گھر پہنچ کر آسودہ نیند لے۔'

شہرینہ کے رویوں نے اسے پراگندہ ذہن کر کے رکھ دیا۔ تاہم کئی دنوں کا ٹینشن کسی تنے ہوئے تار کی طرح ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ "مرد کی محبت اک سمندر ہے جو دنیا کی نگاہوں کے سامنے موجزن رہتی ہے لیکن عورت کی محبت ایک زمین دوز ندی ہے جو زمین کا سینہ چھید کر نیچے ہی نیچے بہتی رہتی ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے بھابی کی طرف دیکھا جو اس کے ذہنی انتشار کو کسی حد تک محسوس کر رہی تھیں۔

"تم دونوں کے مابین فاصلوں کی کوئی بھی ٹھوس وجہ نہیں ہے بلکہ تم دونوں ہی محبت کے غلط نظریہ پر کاربند ہو۔ جس میں تمہاری انا بھی شامل ہو چکی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ فاصلے کوئی تیسرا شخص نہیں سمیٹ سکتا۔ یہ تمہیں خود ہی سمیٹنے ہوں گے اور اس میں بڑا کردار مرد کا ہوتا ہے۔ عورت اگر اپنی انا کا بھرم رکھتی ہے اس کا پاس کرتی ہے تو یہ اس کی خودسری نہیں ہوتی اس کی حیا اور شرم ہوتی ہے اور اسے برقرار رہنا چاہیے۔ یہی تو عورت کا حسن ہے۔"

ولید نے سر جھکایا اور قالین پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے ایک پل کے لئے اپنے اعصاب کے تنے ہوئے تاروں کو ڈھیلا کرنے کی سعی کی۔

بھابی کے الفاظ کمان سے نکلے ہوئے تیروں کی طرح اس کے دل پر لگ رہے تھے۔

"ولید لڑکیاں نازک حسین پروں والی تتلیاں ہوتی ہیں۔ انہیں آزمائش' صبر اور بے مروتی کی تیز آنچ پر نہیں رہنے دینا چاہیے ان کے پر جل جاتے ہیں' وہ راکھ ہو جاتی ہیں اور پھر راکھ کے اس ڈھیر میں تم جیسے انا پرست مرد تاعمر چنگاری ڈھونڈتے رہ جاتے ہو۔" بھابی کے لہجے

میں اضطرابی دباؤ تھا۔ دفعتاً ولید بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا صوفے سے یکدم کھڑا ہو گیا۔ اس کے اعصاب کا وہ تنا ہوا جال ٹوٹ گیا تھا وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر کے ہلکے سے مسکرا دیا۔

"وسیم کی صحبت نے آپ کو تو اچھا خاصا عقل مند بنا دیا ہے۔" اس کی ہنسی اور اس لطیف جملے نے ماحول پر چھائے سکوت کو ایک چھناکے سے توڑ ڈالا۔ ایک پل کے لئے بھابی اس کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔ پھر دل ہی دل میں اس کے مضبوط اعصاب کو سراہے بغیر نہ رہ سکیں۔

"یہ تم مردوں کو ہر وقت سہرا پہننے کا شوق کیوں ہوتا ہے خوامخواہ میں۔ وسیم کی صحبت میں عقل مند ہوئی ہوں۔" وہ اسے مصنوعی رعب سے گھورنے لگیں۔

"سر جو ہے۔"

"ہاں بس۔ اسی کام کے لیے رہ گیا ہے۔ جناب عورتیں زیادہ عقل مند ہوتی ہیں۔ بہ نسبت مردوں کے۔"

انہوں نے کہا تو وہ حیرت کے اظہار کے طور پر ابرو اچکا کر رہ گیا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

""ایسی ہی عقل مند جس کا مظاہرہ شہرینہ صاحبہ کر رہی ہیں۔""

اس کے اس جملے پر بھابی محظوظ ہو کر بے ساختہ امڈنے والا قہقہہ نہ روک سکیں۔تاہم جلد ہی یہ ہنسی سمیٹتے ہوئے اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

""تو تم نے کون سا عقل مندی کا ثبوت دیا ہے' فوراً ہی اپنی مردانہ سرشت دکھادی' شک کرنے لگے۔""

""اس نے جال ہی کچھ ایسا پھیلایا تھا۔"" وہ جھینپ کر بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

""یہ جال نہیں ردعمل تھا۔"" بھابی نے فوراً تصحیح کی۔""ایک پتھر مارنے والا دو پتھر تو کھائے گا ہی۔حالانکہ اس بے چاری نے تو مارا ایک ہی ہے یہ اور بات کہ تمہیں لگا کچھ زیادہ۔""

وہ محظوظ سا ہو کر ہنس دیا۔

سچ ہی تھا یہ پتھر اسے کچھ زیادہ ہی زخمی کر گیا تھا۔اپنی اس قلبی کیفیت پر وہ خود حیران رہ گیا تھا۔

شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ محبت اپنی گہرائی سے ناواقف رہتی ہے۔

جس طرح سوکھی مٹی کی مہک اس کے سینے میں چھپی اپنی اس مہک سے ناواقف رہتی ہے جب تک بارش کا قطرہ اس کے سینے پر نہ گرے۔

اسے یہ احساس شدت سے ہوا کہ یہ محض اس کی خوش فہمی تھی کہ ہم جدھر چاہیں محبت کا رخ پھیر سکتے ہیں نہیں بلکہ محبت کی رہنمائی کے تو ہم خود محتاج ہوتے ہیں۔

X...X...X

ولید کے آفس سے نکل جانے کے بعد سکندر یونہی خالی ذہن بیٹھا رہا اور اپنے سامنے پھیلے کاغذات کو تکتا رہا۔ان پر موجود الفاظ اسے محض آڑھی ترچھی بے معنی لکیروں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ایک دل گرفتگی سے وہ بجھ کر رہ گیا تھا۔

اس نے سوچا اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا ایسا کوئی پردہ نہیں تھا جسے گرا کر وہ اپنے گھر کی عزت کی چہار دیواری پر ڈال سکتا۔

مجرم نہ ہونے کے باوجود خود کو ایسے کٹہرے میں کھڑا محسوس کر رہا تھا جہاں اس پر فردِ جرم عائد ہو رہی ہو اور اس کے پاس اپنے بچاؤ کیلئے کوئی مدافعتی الفاظ نہ ہوں۔ کوئی گواہی نہ ہو۔

سگریٹ کا آخری ٹکڑا اس نے ایش ٹرے میں دبایا اور آفس سے باہر نکل آیا۔ یہ لنچ کا ٹائم تھا مگر وہ آفس کے باہر عمارت کے احاطے میں ٹہلنے لگا۔ شاید اتنا ہی اس کے بس میں تھا۔ یا پھر وہ اپنی ذہنی ابتری سے نجات پانا چاہ رہا تھا۔ پراگندہ خیالات کے ہجوم سے چھٹکارا چاہ رہا تھا... مگر خیالات کوئی پوشاک نہیں تھے کہ وہ اتار دیتا۔ بدل لیتا۔ یہ تو جسم سے لپٹی کھال کی مانند ہوتے ہیں۔

"سکندر بائو ادھر کدھر آپ ٹہلے رہے ہیں۔ اس ویلے تو یہاں بڑی دھوپ ہوتی ہے۔ آپ ادھر آجایئے۔ نیم کی چھایا ہے۔ بڑی ٹھنڈ ہے۔"

مالی فضل بابا نے اسے جنگلے کے باہر ٹہلتے دیکھ کر پانی کا پائپ ایک طرف رکھ کر اسے پکارا۔

وہ رک گیا اور ٹرائوزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے چلتا ہوا سخت تاروں سے بنے اس جنگلے کی طرف چلا آیا۔

"تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں بابا! مگر مجھے تو کہیں بھی ٹھنڈ کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔" اس نے یکسر بے کیف انداز میں سانس بھری۔ "جب دھوپ کا وقت ہوتا ہے نا فضل دین تو کہیں بھی چھائوں نہیں ملتی۔ بس دھوپ ہی دھوپ ہوتی ہے، کڑکتی، چبھتی، دھوپ۔"

"نہ جی پر نیم تلے تو اس ویلے بھی بڑی چھایا ہوتی ہے آپ ادھر بیٹھ کر تو دیکھیں۔" وہ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔

سکندر ایک ہلکی سی سانس بھر کر مسکرا دیا۔

فضل بابا اپنے طور پر سچ ہی کہہ رہے تھے۔ اس لیے کہ ان کے اندر وہ دھوپ نہ ٹھہری تھی جس سے وہ خود نبرد آزما تھا۔

وہ آگ ان کی رگوں میں نہیں دوڑ رہی تھی جو اسے جھلسا رہی تھی۔

ہر موسم کو ہر کوئی اپنی قلبی کیفیت کے تناظر میں ہی تو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔

کسی کے لیے برستی رم جھم برسات بھی دکھ کا سندیسہ ہوتی ہے کوئی خزاں رسیدہ موسم میں بھی خوشیاں سمیٹتے ہوئے بہار کی آہٹیں محسوس کر رہا ہوتا ہے۔

دل کے کھلنے اور مرجھانے کا تو کوئی موسم نہیں ہوتا نا۔ وہ سر کو جنبش دیکر مسکراہٹ اچھالتا ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا جب آفس میں داخل ہوا تو ٹیبل پر رکھے فون کی بجنے والی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"ہیلو۔ روزنامہ دریچہ۔ سکندر اسپیکنگ۔" وہ ریسیور اٹھانے کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سکندر رضا قریشی! میں انسپکٹر عزیز گل بات کر رہا ہوں اپنے تھانے سے۔" دوسری طرف انسپکٹر کی بھاری بھر کم آواز گونجی۔

"نعمان رضا قریشی۔ آپ کا غالباً چھوٹا بھائی ہے۔"

"غالباً نہیں یقیناً۔ خیریت۔" اس کی آواز میں انجانا سا خوف اتر آیا۔

"ہم جب کسی کو فون کرتے ہیں تو کب خیریت کی اطلاع دیتے ہیں سکندر صاحب!" انسپکٹر ہلکے سے ہنسا مگر پھر جلد ہی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھتے ہوئے بولا۔

"اس نے نقوی صاحب کے بیٹے یاسر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔"

"کیا؟ آ... کیا کہہ رہے ہیں سر!" سکندر جھٹکے سے کھڑا ہو گیا مگر یکلخت اس کا دل گویا ڈوب سا گیا۔

"یہ حادثہ نقوی صاحب کی کوٹھی کی انیکسی میں پیش آیا ہے۔۔" انسپکٹر اسے مختصراً تفصیل بتانے لگا پھر بولا۔

"آپ تھانے پہنچ رہے ہیں نا۔"

"ہیلو سکندر صاحب!"

"ج ج۔ جی۔ جی ابھی آ رہا ہوں۔" وہ جیسے کسی گہری اندھی کھائی میں اترتا ہوا بولا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور ڈھیلے ہاتھوں سے کریڈل پر رکھ دیا۔

اس خبر کو اس کا دل سچ تسلیم کرنے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کے دل اور ذہن کا ایک گوشہ اسے جھوٹ یا غلط فہمی کہہ رہا تھا۔

مگر نومی کی سرگرمیاں' اس کا یاسر سے تعلق اور جائے واردات پر اس کی ریوالور کے ساتھ موجودگی... اس خبر کی صداقت کی تصدیق کر رہی تھیں۔

اس نے آہستگی سے خود کو کرسی پر گرالیا۔اندوہناک خبر نے اس کے محسوسات کی دنیا تہ و بالا کردی تھی۔کچھ دیر ہاتھوں میں سر کو تھامے رہنے کے بعد اس نے کمزور سے ہاتھوں سے فون اپنی طرف کھینچا اور ریسیور اٹھا کر ولید حسن کے نمبر پش کرنے لگا۔

X...X...X

میری زندگی میں بس اک کتاب ہے

اک چراغ ہے

اک خواب ہے اور تم ہو

یہ کتاب و خواب کے درمیاں جو منزلیں ہیں

میں چاہتا تھا

تمہارے ساتھ بسر کروں

یہی کل اثاثہ زندگی ہے اس کو زاد سفر کروں

میرے دل جادہ خوش پہ بجز تمہارے

کبھی کسی کا گزر نہ ہو

مگر اس طرح کہ تمہیں بھی خبر نہ ہو

بہت دنوں بعد اس نے اپنی سیاہ جلد والی یہ ڈائری نکالی تھی جس میں جا بجا اس کے اولین جذبوں کے مہکتے گلاب رقم تھے...وہ صفحے پلٹتی گئی۔ہر صفحے پر۔اس کے نوخیز پاک جذبوں کے لعل و گہر لفظوں کی صورت بکھرے ہوئے تھے۔

کوئی تو بات ہے اس میں فیض

ہر خوشی جس پر لٹادی ہم نے

اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔اس نے کئی صفحات آہستگی سے موڑ دیئے۔پھر قلم اٹھایا اور ڈائری گھٹنوں پر رکھ کر لکھنے لگی۔

محبتوں میں

ایسا مقام بھی آتا ہے

کہ جب یہ دل

ہر خسارہ ہر شکست

بہ خوشی مان لیتا ہے

پھر قلم ڈائری کے اندر رکھ کر ڈائری بند کر کے اس پر ٹھوڑی ٹکا کر جلتی آنکھیں بند کر لیں۔

دروازے کو ہلکے سے دھکیل کر ولید اندر داخل ہوا مگر وہ اپنے ہی دھیان کی رو میں ڈوبی ارد گرد سے بے دھیان سی بیٹھی تھی۔ سنہری بالوں کا آبشار خوش نما رومال کے بندھن میں جکڑا ہوا اس کی پشت پر ہوا کے ساتھ اپنی خوشبو بکھیر رہا تھا۔

ولید ایک لمحے تذبذب کا شکار ہو گیا۔

بیڈ پر بکھری کورس کی کتابیں اور گھٹنوں پر دھری ڈائری جس پر سر جھکائے وہ ایک اداس گمبھیر سا پورٹریٹ لگ رہی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

بڑا نامانوس سا نظارہ تھا۔ مگر ولید کے دل میں مانوس سا شور سر اٹھانے لگا۔ جس سے گھبرا کر اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور اسے متوجہ کرنے کے لئے دروازے کو انگلیوں سے بجا کر اندر چلا آیا۔ وہ یوں چونکی جیسے کسی نے اسے گہری نیند سے یکدم جھنجوڑ دیا ہو۔ جھٹکے سے سر اٹھایا تو ڈائری پھسل کر بیڈ پر دھپ سے گری۔

"کہتے ہیں کہ ایک افسردگی خود ساختہ ہوتی ہے جسے لوگ ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں اور ایک افسردگی آپ کے اندر سے اٹھتی ہے جو وجود کے گرد حصار کھینچ لیتی ہے اور ایک افسردگی کسی کے رویوں کی بخشی ہوئی ہوتی ہے۔ تم کس افسردگی کی لپیٹ میں ہو؟"

وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ تو اس نے پلکیں جھپک کر جھکا لیں اور کسی کم سن ناراض بچے کی طرح رخ پھیر لیا۔ اسے روبرو دیکھ کر رگ رگ میں وہی وحشت اترنے لگی تھی جو مضبوط رہنے کا سارا عمل بکھیر کر رکھ دیتی تھی۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ اب اس کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بار بار بکھرنے اور جڑنے کے عمل سے تھک گئی تھی۔ مگر یہ شخص تو شاید اس کی حیات کی سب سے بڑی آزمائش بن کر رہ گیا تھا۔

"ویسے یاسیت پسندی بھی ایک ادا ہے۔ رومانیت آمیز یاسیت تو خاص کر بڑی اٹریکٹو ہوتی ہے۔" وہ ہلکے سے ہنسا اور جھک کر اس کی سیاہ جلد والی ڈائری اٹھانی چاہی کہ وہ لپک کر جلدی سے اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس کی یہ کوشش ناکام بناتے ہوئے بولی۔

"میں قطعی افسردہ نہیں ہوں' نہ کسی طرح کی یاسیت کا شکار ہوں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

اس نے ایک ہلکی سی سانس کھینچی اور ڈائری کی جانب دیکھا' جہاں اس کا سبک نرم ہاتھ ڈائری کے بجائے اس کے مضبوط ہاتھ پر بے خیالی میں رکھا ہوا تھا۔ یکدم اس کی نگاہوں میں چھلکتی مسکراہٹ اور نظروں کے تعاقب میں نگاہیں دوڑاتے ہوئے چونکی اور سٹپٹا کر اپنا ہاتھ جلدی سے کھینچ لیا جیسے غلطی سے وہ دہکتی آگ پر جا پڑا ہوا۔

"کسی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس کی اجازت لینا ضروری ہوتا ہے۔" وہ خفت اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گئی جبکہ وہ نہایت اطمینان سے اس کا اطمینان سکون غارت کرتا ہوا جھک کر ڈائری اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک پل کے لئے جھانکتے ہوئے بولا۔

"اور دل میں داخل ہونے کے لیے بھی کیا؟"

پھر جلدی سے ڈائری اٹھا کر سیدھا ہو گیا' ڈائری پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر ایک طویل قسم کی ٹھنڈی سانس بھری۔

"تنہائی' گہری بوجھل قسم کی خاموشی' سوچوں کا ہجوم' غم زدہ شاعری وغیرہ وغیرہ کیا یاسیت کی نشانیاں نہیں ہیں۔ بلکہ رومانی قسم کی یاسیت کی۔" وہ کمزور اعصاب کی نہ بھی ہوتی تب بھی اس کے رویوں پر چیخ ہی جاتی۔

وہ اس کا چہرہ دیکھ کر یکدم ہلکے سے ہنس پڑا اور ڈائری آہستگی سے ریک کے اوپر رکھتے ہوئے بولا۔

"میں ایسی زنانہ قسم کی چیزیں نہیں پڑھتا' ویسے بھی اسے پڑھے بغیر بتا سکتا ہوں کہ اس میں کیا ہے۔"

"بڑی مہربانی' عنایت' کرم آپ کا کہ آپ پڑھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔" وہ لپک کر آئی ڈائری اٹھا کر اسے جلدی سے ریک کے دراز میں ڈالنے لگی۔

"یوں بھی آپ جو سمجھ رہے ہیں اس میں وہ کچھ نہیں ہے۔ کم از کم آپ کے لیے تو کچھ بھی نہیں۔" اس کا انداز زہر میں بجھا ہوا تھا۔

"تو اکبر علی شاہ کے لیے ہے۔" اس نے اپنی مسکراتی آنکھیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

اس کا چہرہ یکلخت احساس توہین سے سرخ ہو گیا۔ وہ رخ پلٹتے ہوئے بولی۔

"اگر میں کہوں کہ ہاں۔ پھر؟" وہ خود کو پھر اسی امتحان سے گزرتا محسوس کرنے لگی جس میں صرف دل کا لہو ہوتا تھا۔

"تو میں کہوں گا یہ بالکل جھوٹ ہے۔"

وہ بے اختیارانہ پلٹی اور کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی مگر زیادہ دیر تک نہ دیکھ پائی... وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اس کا اعتماد پارہ پارہ کرتا ہوا اس سے دو قدم کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ اس کے لبوں کے گوشے میں مچلتی مسکراہٹ گو کہ سکڑ گئی تھی مگر اس کی خوش نما آنکھوں میں ایک استہزائیہ مسکراہٹ اب بھی جھلک رہی تھی۔

"تم کیا سمجھ کر یہ ڈرامہ رچا رہی ہو کہ میں مارے رقابت کے جل جل کر راکھ ہو جاؤں گا اور تم یہ راکھ کسی ندی نالے بلکہ ندی نالے ڈھونڈنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرو گی اور فلش میں ہی بہا کر اپنے جلتے کڑھتے دل کو تسکین پہنچاؤ گی۔ آہا افسوس صد افسوس کہ تمہاری یہ خواہش ناتمام رہ گئی۔"

اس نے ایک ٹھنڈی قدرے متاسفانہ سانس بھر کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ دم سادھے رہ گئی تھی۔ منہ تھوڑا سا کھلا رہ گیا تھا جیسے کچھ کہنے کی طلب میں ہونٹ صرف پھڑ پھڑا کر رہ گئے ہوں۔ آنکھیں حیرت سے کھلی تھیں مگر اس کے یوں ٹھنڈی سانس بھرنے کے انداز پر وہ خفت کے احساس سے پلکیں جھکانے پر مجبور ہو گئی۔

"میں نے کوئی ڈرامہ ورامہ نہیں رچایا۔ یہ محض آپ کی ذہنی کم فہمی ہے آپ کی مردانہ سرشت کہ آپ کو رائی بھی پہاڑ نظر آنے لگی تھی۔"

یوں جھوٹ کھل جانے پر اسے لگا اپنی انا کا وہ تھوڑا سا بھرم بھی ٹوٹ گیا ہو۔ اس کا دل بری طرح بکھرنے لگا تھا سینے کے اندر...

"ہاں تو تم نے مرد کی مردانگی کو چھیڑا بھی تو تھا' تمہیں ابھی پتہ نہیں ہے نا کہ مرد کی کمزور رگ کو پکڑنا چھیڑنا عورت کو کتنا مہنگا پڑتا ہے۔ شکر کرو بات کھل گئی ورنہ۔"

"ورنہ۔ ورنہ کیا کر لیتے آپ؟" وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی تھی۔

"اور سن لیں میں کوئی آپ کو جلانا کڑھانا نہیں چاہتی تھی۔"

ولید کا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں لہرا کر پہلو میں گر گیا۔ اس نے یہی ہاتھ دیوار پر ٹکا کر گویا اس کے آگے ہٹنے کی راہ مسدود کر دی۔

”ظاہر ہے جو خود مثل پتنگا جل رہا ہو۔ وہ دوسروں کو جلا بھی کیسے سکتا ہے۔“

”میں کوئی جل ول نہیں رہی۔ آخر مجھے ضرورت ہی کیا ہے کڑھنے اور جلنے کی۔“

”تو پھر تم چاہتی کیا ہو۔“ اس نے یکدم اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے اس کی سنہری آنکوں کی سطح پر جھانکا۔ اس کے شفاف چہرے پر اسکی نگاہوں نے گویا کسی ہیٹر کا کام دیا۔ اس کی لرزتی دراز پلکیں آنکھوں پر جھک گئیں۔ ایک عجیب سی بے اختیاری نے جیسے اس پر حملہ کر دیا۔

”مجھے خود نہیں معلوم۔ میں کیا چاہتی ہوں۔“ اس کی آواز بے حد کمزور... تھی۔ جیسے کوئی جال میں جکڑا ہوا بے بس پرندہ۔

ولید نے بے اختیار ایک بوجھل سی سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس کے سر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

یہ عہد ترک محبت ہے کس لیے آخر

سکون قلب ادھر بھی نہیں ادھر بھی نہیں

ولید نے اس کی پلکوں کا گھنیرا جال تکتے ہوئے بے ساختہ ایک خوبصورت مسکراہٹ اچھالی۔ وہ براہ راست اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ وہ کتنے پل پلکیں نہ جھپک سکی، جیسے ان دو طلسمی آنکھوں کے اندر مچلتے اعتماد اور جذبوں نے سحر ساطاری کر دیا ہو۔

لمحے بڑی آہستہ روی سے گزرنے لگے کہ اچانک موبائل کی بجنے والی گھنٹی نے گویا سحر کا سارا طلسم توڑ کر رکھ دیا۔ ولید کے اعصاب پر ہلکا سا ارتعاش ہوا۔ اس نے قدرے ناگواری سے جیب میں پڑے اس چھوٹے سے موبائل کو دیکھا تھا۔

موبائل کی بجنے والی گھنٹی نے فضا پر چھائے جمود کو ایک چھناکے سے توڑا تھا۔ ولید نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جیب سے پاکٹ سائز موبائل نکالا۔

”کبھی تم رقیب روسیاہ کو درمیان میں لے آتی ہو کبھی میں۔“

وہ ہلکے سے بڑبڑایا اور موبائل آن کیا دوسری طرف سکندر تھا۔

وہ ایک معذرت خواہانہ سی نگاہ شہرینہ پر ڈال کر درازے سے باہر نکل گیا۔

”خیریت؟ کیا میری آفر پر غور کر لیا ہے۔“ وہ ہلکے طنز سے ہنسا مگر دوسری طرف سکندر نے اس کا جملہ سنا ہی نہیں یا سنی ان سنی کرتا ہوا بکھرے لہجے میں بولا۔

”ولید... ولید! مجھے اس وقت تمہارے سہارے کی اشد ضرورت ہے۔“

اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی جیسے آنسوئوں کا بڑا سا گولا حلق میں اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ولید! نومی سے ایک قتل ہو گیا ہے۔“ ایک پل کے توقف کے بعد اس کی آواز دوبارہ ابھری۔

”وہاٹ؟“ ولید کے اعصاب پر گویا بم بلاسٹ ہوا تھا۔

”میں اپنے آفس میں ہی تمہارا انتظار کروں گا تم جتنی جلد ہو سکے پہنچو۔“

”کیا کہہ رہے ہو سکندر؟“ اس نے دروازے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور اپنے آپ کو یقین دلانے کے لیے ایک بار پھر پوچھا مگر سکندر رابطہ منقطع کر چکا تھا۔

اس نے سر کو خفیف سی جنبش دے کر اس دھچکے کے اثر سے خود کو نکالا اور موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے بے ارادہ ایک نگاہ نیم وادروازے پر ڈالی۔

اس اعصاب شکن خبر نے اس کے دل کی ساری خوشی کو بجھا کر رکھ دیا تھا۔

تمہارے حسن سے رہتی ہے ہم کنار نظر
تمہاری یاد سے دل ہم کلام رہتا ہے
رہی فراغت ہجراں تو ہو رہے گا طے
تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

ایک بوجھل سانس بھر کر اس نے نگاہوں کا رخ موڑ لیا اور اس ناگہانی آفت پر سوچتا ہوا تیزی سے پورچ کی طرف نکل گیا۔

X...X...X

نومی کی جائے واردات پر موجودگی، عظمیٰ کی بازیابی اور حمید نقوی کے بیٹے یاسر کا قتل، ان سب نے ولید کو بھی چکرا کر رکھ دیا تھا... عظمیٰ کو ہاسپٹل ایڈمٹ کر دیا گیا تھا وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔

نومی پر صرف قتل کا نہیں، عظمیٰ کے اغوا کا بھی کیس بن سکتا تھا۔ بلکہ مخالف پارٹی نے تو عظمیٰ کے ریپ کا الزام بھی نومی پر ڈال دیا تھا۔

اس کھیل میں کس نے کیا پایا، کیا کھویا۔ ایک سوالیہ نشان بنا سب کے چہروں پر رقم تھا۔

سکندر کا دل چاہ رہا تھا وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھاگ جائے اور کسی گوشے میں منہ چھپا کر بیٹھ جائے۔ جب تک اس کی موت کا لمحہ نہ آ جائے مگر ایسا وہ کر نہیں سکتا تھا اور یہی ذہنی پراگندگی اسے دل گرفتہ اور نڈھال کیے ہوئے تھی۔

بہن کی شادی میں بہت تھوڑے دن رہ گئے تھے اور بھائی قتل کے الزام میں سلاخوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ کیس چلا بھی تو ایک عرصہ نکل جانا تھا اور اس کے بعد کون کہہ سکتا تھا کہ نومی ان سلاخوں کے باہر آ بھی سکے گا یا نہیں۔ ادھر سید صاحب کی دل گرفتہ حالت دیکھی نہ جا رہی تھی اور وہ تو ان سے نظریں ملانے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ عظمیٰ کی بربادی کا ذمہ دار وہ صرف نومی کو نہیں اپنے پورے گھرانے کو ہی سمجھ رہا تھا۔

"آج تم جہاں اور جس جگہ کھڑے ہو، یہی منزل تھی جس کا تعین تم نے اپنے سفر کے پہلے قدم پر کیا تھا۔ بے شک تم نے اسے... خوش نما تصورات سے آراستہ کر لیا تھا، مگر تصورات بہتے پانی کی طرح ہوتے ہیں اور بہتے پانی پر منزل نہیں ملتی۔ منزل کا تعین خواہشات پر نہیں عقل اور دل کی کھلی آنکھوں سے کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس کہ زندگی کا یہ فلسفہ تمہاری سمجھ میں کبھی آیا ہی نہیں۔"

ولید دکھ اور ملال کے احساس کے ساتھ نومی کو دیکھ رہا تھا جو سلاخوں کے پیچھے بالکل گم صم کھڑا تھا۔اس کی نظریں فرش پر جمی تھیں جو احساس ندامت یا خوف و دہشت کے بوجھ سے اٹھ نہ پا رہی تھیں۔

''خواہشات کے جس منہ زور گھوڑے پر تم سوار تھے' اس کو آخر کار اسی کھائی میں گرنا تھا مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ تم اکیلے نہیں گرے' کئی بے گناہ' بے قصور تمہارے ساتھ اس جہنم میں جلنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔''

اس نے یہ کہتے ہوئے سکندر کی طرف دیکھا جو تھانے کے بیچ کی کھردری سطح پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔شاید اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ اٹھ کر نومی کا چہرہ تھپڑوں سے دہکا سکتا۔

''میں نے... میں نے ایسا تو نہیں چاہا تھا۔''

نومی پہلی بار بھیگی آواز میں بولا تو ولید متاسف سانس بھر کر رہ گیا۔پھر قدرے ملائمت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم کیا سمجھتے ہو یہاں جو کوئی چاہتا ہے پالیتا ہے اور جو چاہے گا پالے گا۔اگر ایسا ہوتا تو ہر کوئی ہی اپنی خواہشات کے منہ زور گھوڑوں کو بھگائے پھرتا اور اس دنیا کو تباہ و برباد کر دیتا۔شکر ہے کہ سب کی لگامیں ایک بڑی طاقت کے ہاتھ میں ہیں' جسے وہ وقتاً فوقتاً کھینچتا رہتا ہے۔''

''یہ سب تمہاری ایک ناجائز خواہش کا ہی شاخسانہ ہے نومی؟'' سکندر غصے سے اپنی جگہ سے اٹھا۔''اندھی خواہشات نے تمہیں بری صحبت عطا کی اور اس بری صحبت نے تمہیں مجرمانہ کاموں اور نفسانی خواہشات کی طرف راغب کیا۔تمہیں ان گندی فلموں کی طرف راغب کیا جو صرف اور صرف تباہی پھیلاتی ہیں۔آوارہ گردی' اخلاق باختگی اور مقدس رشتوں کی پامالی کو محبت کا نام دے کر نوجوانوں کے جذبات میں ہیجان پیدا کرتی ہیں اور جذبات کے اس طوفان میں تم نے نہ صرف ایک عزت کو پامال کیا بلکہ قتل کے بھی مرتکب ہوئے۔بتاؤ بتاؤ نومی کہ تم نے کیا پایا... اور اگر پایا بھی ہے تو اس کھونے سے زیادہ تو نہیں۔''

اس کی آواز غصے کی شدت سے پھٹ گئی۔ولید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک طرف ہٹایا اور نومی کو دیکھا جو سر جھکائے ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔اس کی آنکھوں سے

اشک بے آواز گر رہے تھے پھر یکدم اس کا بدن لرزا اور وہ سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر رو پڑا۔

”مجھے معاف کر دیجئے سکندر بھائی! مجھے بچا لیجئے۔ خدا کے لیے مجھے بچا لیجئے ولید بھائی؟“

اس کی آواز میں خوف کی پرچھائیں لرز رہی تھیں۔ سکندر نے لب بھینچ کر چہرے کا رخ موڑ لیا۔

ایسا ہی ہوتا ہے جہاں جوش، جنون کا طوفان تھمتا ہے تو وہیں سے سود و زیاں کا احساس شروع ہو جاتا ہے اور اگر اس طوفان میں صرف کھویا ہی کھویا ہو تو ایسی ہی وحشت خوف بن کر چمٹ جاتی ہے اور یہاں تو جاں کے زیاں کا سوال تھا۔

موت کا خوف جو موت سے پہلے کئی بار مار دیتا ہے۔ سانس بند ہونے سے پہلے کئی بار سانسیں بند ہوتی ہیں یہ ایک اذیت کا پل صراط ہوتا ہے اور نومی خود کو ایسے پل صراط سے گزرتا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور وحشت نے سرخی بھر دی تھی۔ احساس جرم سے زیادہ موت کے خوف نے اس کی حالت ناگفتہ بہ کی ہوئی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”حوصلہ رکھو، سب بہتر ہو جائے گا۔“ ولید نے اس پر ترحم بھری نگاہ ڈالی اور کمزور ہاتھ سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”کیا... کیا بہتر ہو جائے گا۔“ سکندر نے اسے مجروح انداز میں دیکھا۔

”کیا نقوی صاحب کو ان کا بیٹا مل جائے گا، عظمیٰ کو اس کی نسوانیت کا غرور مل جائے گا۔ ہماری عزت، ہمارا اعتبار... وہ واپس مل جائے گا۔ ہاں فقط اسے زندگی مل سکتی ہے مگر ایسی زندگی پر تف ہے اس سے ہزار درجہ موت بہتر ہے۔“

وہ غصے اور نفرت سے پر نظر نومی پر ڈال کر باہر چلا گیا۔ نومی کا چہرہ حسرت و یاس اور غم کی تصویر بن گیا، اس کے آنسو تواتر سے بہنے لگے، اس نے ولید کو بے چارگی اور کرب کے ساتھ دیکھا۔

”یہ کوئی معمولی صدمہ تو نہیں ہے نا۔ یہ ردعمل اس کا بالکل فطری ہے نومی! وہ اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ اسے جڑنے اور سنبھلنے کے لیے وقت چاہیے۔“

وہ دل گرفتگی سے بولا اور پلٹنے لگا کہ نومی نے پیچھے سے اس کی شرٹ مٹھی میں جکڑ لی۔

"ولید بھائی! مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے مجھے پھانسی دے دیں گے پلیز۔"

"نومی... اس طرح پھانسی نہیں ملتی۔ ابھی ہم وکیل کریں گے کیس چلے گا۔" اس نے نومی کی گرفت سے اپنی شرٹ چھڑائی۔

"نہیں نہیں آپ نہیں جانتے یہ بڑے ظالم لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ٹارچر کرتے ہیں، مجھے بھی ٹارچر کریں گے۔ میں نے بہت داستانیں سنی ہیں ان کے مظالم کی۔"

ولید کا دل چاہا کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کرے اور اسے یاد دلائے کہ جو ظلم اس نے سید صاحب پر کیا ہے اس کا انجام بہت ہیبت ناک ہی ہونا چاہیے، مگر نومی کے چہرے پر بکھری وحشت نے اسے کچھ کہنے سے روک دیا وہ صرف ایک متاسفانہ نظر ڈال کر ڈھیلے قدموں سے تھانے سے باہر آ گیا۔

گاڑی کی فرنٹ سیٹ سے ٹیک لگائے سکندر کو دیکھ کر اس کے دل پر رنج کی فضا گہری ہو گئی۔ گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے اس نے تسلی آمیز انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا مگر باوجود

کوشش کے کچھ کہہ نہ پایا۔ اسے لگا جیسے اس کے پاس اسے دینے کو تسلی کے کوئی الفاظ ہی نہ رہے ہوں یا پھر وہ ان کو ادا کرنے کا خود میں حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔

"ولید!... نادیہ کی شادی تک یہ بات راز ہی رکھنا پڑے گی۔" اس نے گاڑی سٹارٹ کی تو سکندر کی دھیمی بکھری آواز ابھری۔ "سب سے یہی کہنا ہے کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔"

"کیا گھر والوں سے بھی۔ یہی کہو گے۔" ولید نے کچھ تشویش اور پریشانی سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ونڈ سکرین کو گھورتے ہوئے اپنی کنپٹیاں ہلکے سے دبائیں اور اس کی طرف رخ کیا۔

"ان سے تو خیر نہیں چھپ سکتی یہ بات۔ تاہم موقع دیکھ کر بات کر لوں گا۔"

"اور سید صاحب۔" ولید نے یہ کہتے ہوئے خود کو بڑے کرب سے گزرتا محسوس کیا۔ سکندر نے بھی ایک اذیت کے عالم میں آنکھیں میچ لی تھیں اور نظریں جھکا دیں۔

"مجھ میں تو اتنا حوصلہ بھی نہیں ہے کہ ان کا سامنا کر سکوں۔ ولید میرا دل چاہتا ہے میں نومی کو اپنے ہاتھوں سے پھانسی دے دوں، اسے سرعام کوڑے ماروں، یہ شرعی سزائیں کتنی

صحیح ہیں ولید! جو لوگ ان سزائوں کا سن کر ہول کھاتے ہیں مغرب کے مردود ذہنوں کی طرح ان پر انگلیاں اٹھا کر تبصرہ کرتے ہیں' ان سزائوں کو جہالت کہتے ہیں وہ خود سب سے بڑے جاہل ہیں' وہ اس جرم اور اس بڑے گناہ کی ہولناکیوں' اس کی بدصورتیوں اور تباہیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں' مظلوم کی اذیت کا ادراک نہیں کرتے جس کی پوری زندگی آگ کا سمندر ہو کر رہ جاتی ہے۔"

ولید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا۔

"نومی صرف یاسر کے جسم کا قاتل نہیں ہے' عظمیٰ کی روح کا قاتل ہے اور روح کے قاتل کو سزا کیا ہونی چاہیے ولید!"

اس کی آواز رندھ گئی۔ ولید کو لگا وہ ابھی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دے گا۔

"حوصلہ کرو سکندر حوصلہ۔ تمہیں ہمت نہیں ہارنی' تمہیں تو یہ سب بہت حوصلے سے فیس کرنا ہے۔ دکھ اور مصیبت ہمیں توڑنے کے لیے نہیں مضبوط بنانے کے لیے آتی ہیں۔ فی الحال نادیہ کی شادی خیر و عافیت سے ہو جانے دو۔ اس کے بعد ہم کوئی اچھا سا وکیل کرتے ہیں۔"

"وکیل... کیوں... وکیل کریں۔ اس قاتل' ظالم' درندے کو بچانے کے لیے' جس نے عزتوں کو پامال کیا ہے؟۔"

سکندر چلا پڑا۔ پھر بے چارگی آمیز کرب سے لب کاٹتے ہوئے ڈیش بورڈ پر سر رکھ دیا۔

"مجھے اماں کا خیال نہ ہوتا تو میں اس سے ہر تعلق توڑ لیتا' اس کا منہ کبھی نہ دیکھتا۔" اس کا دل دوز لہجہ بہت بکھرا ہوا تھا۔ ولید نے گاڑی سی ویو کی جانب کر دی۔ اس وقت وہ اسے شہر کے ہنگاموں سے باہر لے جا کر اس کی تسلی و تشفی کا معاملہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اس حال میں وہ اسے گھر نہیں لے جانا چاہتا تھا۔

X...X...X

سید صاحب بڑی خاموشی سے محلہ چھوڑ کر چلے گئے تھے' محلے والوں کو عظمیٰ کی گمشدگی اور پھر بازیابی کی کچھ سن گن مل چکی تھی مگر ابھی وہ حقائق سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو پائے

تھے کہ سید صاحب محلہ ہی چھوڑ گئے۔اور محلے والوں کو تو ابھی سکندر کے گھر میں جو ماتم بپا تھا اس کا علم بھی نہ تھا۔عزت کی تار تار چادر کو سنبھالے' چھپائے اماں تو بستر سے جا لگی تھیں۔

نادیہ کو لگ رہا تھا وہ مسلسل ایک پل صراط سے گزر رہی ہے۔ایک ایسے باریک دھاگے پر چل رہی ہے جس سے گرنا ناگزیر تھا۔

غم' دکھ اور صدمے سے لاچار دل آنے والے دنوں کے خوف سے سہما ہوا تھا۔حالات ایسا رخ اختیار کر لیں گے اس نوبت کا تو ان کے پاس تصور بھی نہ تھا۔انہیں لگ رہا تھا ہر دکھ پہلے سے بڑھ کر اذیت آمیز اور ناقابل برداشت تھا۔اماں کا بستر سے لگ جانا۔

تانیہ کا گہری چپ کا لبادہ اوڑھ لینا اور سکندر پر ذمہ داریوں کے بوجھ سے نڈھال اور جھکے ہوئے کندھے... ان سے جینے کی ساری امنگیں چھین رہے تھے۔

ولید کی تسلیاں بھی ان کے لیے بے فیض تھیں' ان کا دل چاہ رہا تھا وہ اس شادی سے انکار کر دیں۔یوں بھی وہ اپنے حالات سے لڑتے لڑتے اتنی ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں کہ اب شادی کے بعد کے حالات سے نمٹنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔انہوں نے اپنا مدعا ولید کے سامنے پیش

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کیا اور اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ سکندر کو سمجھائے کہ وہ یہ شادی ختم کر دے یا پھر تاخیر کر دے۔

"نادیہ! کم از کم تم سے اس قدر احمقانہ اور غیر دانش مندانہ باتوں کی امید نہیں تھی۔" ولید نے انہیں خاصی ناراض نظروں سے دیکھا۔

"مگر آپ خود سوچیے کہ ان حالات میں یہ سب ممکن ہے کیا۔شادیاں یوں بھی ہوتی ہیں بھلا۔" ان کی آواز بھرا گئی' پلکوں پر آئے آنسوئوں کو وہ ٹشو سے پونچھنے لگیں۔

"آپ نہیں جانتے' میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے ولید بھائی! میرا دل ایک بھٹی میں جیسے دن رات جل رہا ہے۔میرے پاس آنے والے دنوں کے لیے کوئی خوشگواریت نہیں ہے' کوئی آسودہ اور پرسکون سوچیں نہیں ہیں' میرے اندر سے جینے کی امنگ چھن چکی ہے۔ہم لوگ جس ذہنی آزار سے گزر رہے ہیں وہاں میں سکندر کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔"

ضبط کے باوجود وہ رو پڑیں۔

ولید کرسی چھوڑ کر ٹہلنے لگا پھر ان کے نزدیک آیا اور ان کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"پاگل وہ تنہا نہیں ہے۔اس کے ساتھ اللہ کی بہت بڑی طاقت اور پھر میں ہوں نا۔"

انہوں نے آنسوئوں سے بھیگی پلکیں جھپک کر ولید کو دیکھا۔

"آپ نہیں جانتے سکندر اندر سے بالکل ٹوٹ چکا ہے۔اسے جب پہلی چوٹ لگی تھی تب سے لے کر اب تک میں نے اسے بظاہر مضبوط ہی دیکھا۔کھوکھلی ہنسی کبھی اس کے لبوں سے جدا نہیں ہوئی' مگر اب تو لگتا ہے وہ جھوٹی مصنوعی ہنسی بھی کبھی نہ ہنس پائے گا۔" وہ پلکیں جھکا گئیں۔

"آپ سے سکندر نے جھوٹ بولا تھا کہ اس نے مردان علی کی کسی مالی آفر کو قبول کر لیا ہے' ان فیکٹ اس پر توقیر شاہ نے بہت گھٹیا قسم کا دبائو ڈالا ہوا ہے۔" وہ یہ کہہ کر اضطرابی انداز میں لب کاٹنے لگیں

پھر یاس بھرے لہجے میں بولیں۔

"آپ نہیں جانتے ہمارے گھر کا شیرازہ بکھر چکا ہے' ہم تنکا تنکا بکھر چکے ہیں کچھ بھی سلامت نہیں رہا' ہمارا پندار' ہماری عزت' ہماری انائیں۔"

ولید کے اعصاب بری طرح متاثر ہو رہے تھے تاہم اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے انہیں ٹھنڈا پانی پلایا اور نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

"حالات انسان کے اپنے پیدا کردہ نہیں ہوتے اس لیے وہ ہمیشہ غیر متوقع ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارے اعصاب کو متاثر کرتے ہیں مگر ہمت' استقلال اور صبر ہمیں اپنے اندر سے پیدا کرنا ہوتا ہے' یہ صفات ہر انسان کے اندر ہوتی ہیں۔کوئی اپنی وحشت اور خوف کو مسلط کر کے ان کا گلا گھونٹ دیتا ہے کوئی سمجھداری سے کام لے کر ان صفات کو خود پر حاوی کر کے حالات کا مقابلہ ڈٹ کر کرنے لگتا ہے۔زندگی روتے ہوئے بھی گزرے گی اور حالات کو صبر واستقامت کے ساتھ فیس کرتے ہوئے بھی' اور جب ہمیں ان حالات سے گزرنا ہی ہے تو پھر واویلا کرتے' روتے اور خوف سے سہم کر کیوں؟اللہ کے بھرپور توکل اور بھروسے کے ساتھ ڈٹ کر کیوں نہ گزاری جائے۔"

نادیہ نے کچھ کہنا چاہا تو وہ جلدی سے بولا۔

"میں مانتا ہوں یہ سب کہنا اور اس طرح کے لیکچر دینا آسان کام ہے' جب آدمی پر گزرتی ہے تو اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں' بددلی' بیزاری'

نفرت انگیز اور منفی سوچیں اسے چاروں طرف سے جکڑ لیتی ہیں' ہوا تھا میرے ساتھ بھی ایسا ہی۔ مگر وہ فقط لمحے ہوتے ہیں کمزور لمحے' اس کی گرفت سے خود کو نکال لیا جائے تو اچھے حالات ایک دن ضرور ہمارا استقبال کرتے ہیں۔

سکندر جن حالات سے نبرد آزما ہے میں جانتا ہوں۔''

پھر کچھ یاد آنے پر چونکتے ہوئے اس نے نادیہ کی طرف دیکھا۔

''تم نے بتایا نہیں کہ توقیر شاہ کا دبائو کس قسم کا ہے سکندر پر۔'' اس کے اس استفسار پر نادیہ آپی کی پلکیں لرز کر جھک گئیں۔ ایک غمزدہ مضمحل ہی سانس ان کے سینے کی تہ سے نکل گئی۔

ولید نے ایک دو پل ان کے چہرے پر نگاہیں جمائیں پھر نظروں کا رخ موڑ لیا اور چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''تم اطمینان سے گھر جائو اور ایسی فضول سی سوچوں کو ذہن پر سوار مت کرو' تمہاری شادی اماں اور سکندر کا اہم فریضہ ہے۔ کم از کم انہیں ایک فرض کی ادائیگی سے تو بری الذمہ ہونے دو' تمہاری اس طرح کی حماقتیں انہیں مزید دکھی ہی کر سکتی ہیں خوش نہیں۔''

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اس نے کسی کرید اور استفسار کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ نادیہ کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ بتانے سے گریزاں تھی۔

وہ کرسی دھکیل کر اٹھنے لگیں کہ ولید بولا۔ ''پہلی بار میرے آفس آئی ہو تم اور میں کیسا لاپرواہ انسان ہوں بہن کی تواضع بھی نہیں کی۔ بیٹھو میں چائے منگواتا ہوں۔

خوش رہنے کی کوشش کرو نادیہ! ہمیں انہی حالات سے خوشیاں کشید کرنا پڑتی ہیں۔ تم نہیں دیکھتیں کشمیر کے حالات' وہاں لوگ مسلسل ایک ہی اذیت کے حصار میں ہیں۔ مگر اسی کرب اور آہوں کے درمیان مسکراہٹ کے لمحے چراتے ہیں' خوشیاں کشید کرتے ہیں' فلسطین کے حالات دیکھو اور اب افغانستان کے حالات دیکھو کفار کی سازشوں نے انہیں ناقابل تلافی نقصانات دیئے ہیں' کیا ان کے لٹے پٹے حالات سے ہم اب بھی بہتر حالات میں سانس نہیں لے رہے ہیں۔ شاباش خود کو کمپوز کرو' جینے کے لیے انسان جواز پیدا کرتا ہے اور کرنا پڑتا ہے۔''

نادیہ نے ولید کو ممنون نظروں سے دیکھا ایک پھیکی مسکراہٹ ان کے لبوں کو چھو گئی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں جینے کے لیے جواز ڈھونڈنے ہی پڑتے ہیں۔" پھر ایک ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔

"سکندر کو مت بتائیے گا کہ میں یہاں آئی تھی۔"

ولید نے سر ہلا دیا اور ان کے انکار کے باوجود خود گھر چھوڑ آیا۔ پھر کچھ سوچ کر دوبارہ آفس آنے کی بجائے سیدھا گھر آیا اور شہرینہ کو تلاش کرنے لگا۔ وہ اسے اوپر کے ٹیرس میں چائے پیتی ہوئی مل گئی، اس نے شکر ادا کیا۔ وہ اکیلی تھی۔ شاید ابھی نہا کر شام کی خنکی اور طراوت کا مزہ لینے ٹیرس میں آ کر بیٹھی تھی۔ یوں بھی آج صبح سے ہی موسم ابر آلود تھا۔ رہ رہ کر ہوا کے ساتھ گرنے والی بوندوں کی طراوت اور تازگی بہت بھرپور تھی۔

سفید کپڑے وہ بہت کم پہنتی تھی مگر اس وقت ملتانی کڑھائی کے سفید سوٹ میں اس کا سراپا خاصا منفرد اور خیرہ کن لگ رہا تھا۔ ولید کا ذہن اتنی پراگندہ سوچوں میں نہ جکڑا ہوا ہوتا تو وہ شاید خود کو کسی خوبصورت جملے کے اظہار سے قطعی باز نہ رکھ سکتا۔ تاہم موسم کا اثر اور اس کا خیرہ کن وجود، تنہائی کی خوبصورت ساعت، اس کے دل پر بھرپور طریقے سے اثر انداز

ہوئی تھی۔ وہ کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ وہ آسمان پر اڑتے کبوتروں کے غول کو دیکھتے دیکھتے چونکی اور اس کی جانب دیکھا۔

کرسی کی پشت سے نیچے تک جاتے اس کے بھورے بالوں کا مہکتا آبشار۔ اس کی پشت پر ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں کا ہی حصہ لگ رہا تھا۔ اسے لگا سورج ڈوبنے کا یہ دلکش لمحہ اس کی سنہری آنکھوں کے پار بھی اتر آیا ہو مگر وہ یہ منظر صرف لمحہ بھر دیکھ پایا وہ نظریں ملنے پر پلکیں جھکا گئی۔

"موسم سے لطف اندوز ہو رہی ہو یا موسم کو فیسی نیٹ کر رہی ہو۔" وہ کرسی کچھ اور نزدیک لے آیا۔ اس نے اس کی جانب نہیں دیکھا۔

"چائے پئیں گے۔"

شاید اس نے رسمی طور پر پوچھا تھا۔

"ہاں اگر چاہ کے ساتھ ملے تو۔" وہ ہنوز اس پر نگاہیں جمائے ہوئے بولا۔ اسے الجھن ہونے لگی۔

"میں صغریٰ سے کہتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی کہ اس نے روک دیا۔

"چائے کو چھوڑو چاہ پر بھی گزارا ہو سکتا ہے۔" وہ ایک ہلکی سانس بھر کر مسکرایا۔ تو وہ اس کی طرف قدرے ناراض نظروں سے دیکھنے لگی۔

"بیٹھو مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" وہ بھی قدرے سنبھل کر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھتے ہوئے بولا۔

شہرینہ کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔

"کیا... کیا بات؟"

ولید نے ایک نظر اس پر ڈالی اور ایک دو لمحے توقف کیا۔ گویا اپنی بات شروع کرنے سے پہلے کسی سرے کو تلاش کرنا چاہا کہ بات کہاں سے شروع کی جائے پھر دھیرے سے بولا۔

"تانیہ کا اکبر شاہ سے کیا تعلق ہے۔ آں۔ آں دیکھو۔" وہ اسے مضطربانہ انداز میں پہلو بدل کر نظریں چرانے پر جلدی سے ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"مجھ سے کچھ مت چھپاؤ شیری! یہ بہت ضروری ہے' میں براہ راست سکندر سے پوچھ کر اسے ہرٹ نہیں کرنا چاہتا' پہلے ہی وہ بہت ڈپریسڈ ہے۔" اس کا لہجہ لجاجت آمیز تھا۔

ایک بے عنون سی شرمندگی محسوس کرکے وہ لب کاٹنے لگی۔ اس کی پلکیں اس سوچ پر بھاری ہو کر جھک گئیں کہ سب کچھ اس پر کھل چکا تھا۔ حتیٰ کہ تانیہ اور اکبر شاہ کے تعلق کی کوئی کڑی یقیناً اسے ملی تھی اور یوں اب کچھ چھپانا عبث ہی تھا۔ وہ جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے مغموم سی ہو کر بولی۔

"تانیہ اور اکبر شاہ کا تعلق بظاہر بہت غیر یقینی سا ہے مگر شاید تانیہ اس نہج پر آگئی ہے جہاں واپس پلٹنا ناممکن تو نہیں مگر مشکل ضرور ہے یا شاید ناممکن ہی ہو۔"

ولید کا اٹھا ہوا سر اسی زاویے پر کتنی دیر رہ گیا۔ وہ اس سے نظریں ملانے سے گریز کرتے ہوئے ٹیرس کے شفاف ماربل کو تکتے ہوئے بولی۔

"میں نے اسے بہت سمجھایا مگر میرے سمجھانے پر وہ برا مان جاتی تھی اور چڑ کر مجھ سے دور ہوتی چلی گئی۔ وہ... وہ تو اپنے سود وزیاں سے بھی بے نیاز ہو چکی ہے۔"

اس دھچکے نے ولید کو کتنی دیر کسی بھی رد عمل کے اظہار سے باز رکھا۔ وہ نظریں اس کے چہرے سے ہٹا کر اضطراری انداز میں اٹھ کر ریلنگ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ جیسے اپنے منتشر ذہن کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں پھر کچھ سوچ کر چہرے کا رخ موڑ کر بولا۔

"اکبر علی کا کیا رسپانس ہے میرا مطلب ہے وہ تانیہ کے لیے کس حد تک سنجیدہ ہے۔"

"سنجیدہ؟" شہرینہ کے دل سے ایک کراہ چھیدتی ہوئی نکل گئی' وہ افسردگی سے ہنس پڑی۔

"وہ تانیہ کو محض دھوکا دے رہا ہے مگر یہ بات تانیہ کی سمجھ میں نہیں آئی' پتہ نہیں اکبر علی شاہ نے کیا جادو کر دیا ہے یا پھر محبت نام ہی خوش فہمی کا ہے۔" وہ اسی مغموم ہنسی کے ساتھ بولی اور خود بھی ریلنگ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

"عورت اپنی خوش فہمی کو مرد کی محبت سمجھ کر خوش ہوتی رہتی ہے اور مرد اس کی اس خود فریبی سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔"

ولید نے اس کی طرف دیکھا۔ ریلنگ پر ہاتھ رکھے وہ آسمان پر بکھرے سیاہ بادلوں کو گھور رہی تھی۔ اس کے ریشمی بھورے بالوں کی ایک شریر لٹ اس کے رخسار پر پڑی تھی' ایک

عجیب سی افسردگی سے وہ گویا بجھ کر رہ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ بھی عجیب خود آزار قسم کی تھی۔ وہ اس کے نزدیک چلا آیا۔

"ہر مرد اکبر علی شاہ نہیں ہوتا' اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں محبت کا وجود نہ ہوتا۔ اس کی طلب کسی کو نہیں ہوتی' اس سے آسودہ ہونے والے دکھائی ہی نہ دیتے' یہ دنیا بہت بد صورت اور مکروہ قسم کی شے ہوتی۔"

اس نے بڑی نرمی سے اس کے رخسار پر جھولتی اس لٹ کو اپنی انگلی سے ہلکے سے منتشر کر دیا۔

"محبت فریب نہیں حقیقت ہے' محبت ہماری سانس ہے جس طرح کوئی اپنی سانسوں کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح محبت کو بھی ملتوی نہیں کیا جا سکتا' محبت ایک دوسرے کے اندر جذب ہو کر ایک دوسرے کی سانسوں میں مسلسل جاگتے رہنا ہی تو ہے۔" کب کی پڑھی ہوئی یہ خوبصورت بات براہ راست اس کی بھوری آنکھوں میں جھانک کر کہہ رہا تھا۔ وہ گم صم سی رہ گئی تھی تب وہ یکدم کسی جنبش سے بیدار ہو کر پیچھے ہٹا اور اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہلکی سی سانس بھر کر بولا۔

"زندگی میں الجھنیں نہ ہوں تو آدمی اس سیدھی سڑک پر بھاگتے بھاگتے بے زار ہو جائے یا تھک ضرور جائے' یہ اونچ نیچ یہ پیچیدگیاں الجھنیں تو اسے توانا رکھتی ہیں۔ ہمارے جذبوں' امنگوں کو بیدار کرتی

رہتی ہیں... ہے نا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر دلفریب انداز میں مسکرایا تو وہ رخ موڑ کر اپنے کھلے بالوں کو پکڑ کر لپیٹتے ہوئے چبھتی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"چاہے وہ الجھنیں کسی کی جان ہی لے لیں۔"

ولید کے ہونٹوں کے گوشوں میں پھیلی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ اس کے دل میں بے ساختہ ہی خواہش جاگی کہ وہ اس کے ان سبک ہاتھوں کی اس حرکت کو روک دے اور ان ریشم کے لچھوں کو ہلکے سے چھو کر دوبارہ بکھیر دے اور کہے کہ "یہ الجھنیں اگر ان ریشم جیسے بالوں جیسی ہوں تو انہیں سلجھاتے ہوئے تو دو دل قریب آ جاتے ہیں کہ احساس تک نہیں ہوتا۔" مگر یک بیک اس نے اپنے سرکش جذبوں کی لگام کو تھامتے ہوئے ایک ہلکی سی افسردہ سی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تانیہ سے اس قدر بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔ کیا سکندر کے علم میں ہے یہ بات؟"
وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

"ہاں۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"مگر یہ بات تانیہ سے نہیں بلکہ اکبر علی کے بھائی توقیر شاہ کے ذریعے انہیں ملی تھی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ولید کی طرف غیر ارادی طور پر دیکھا جس کا لائٹر والا ہاتھ اٹھا ہوا ہی رہ گیا پھر جھٹکے سے اس نے لائٹر بند کیا اور کرسی سمیت اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا۔ اسی کڑی کی تو اسے تلاش تھی۔ یہی سرا تو وہ تلاش کر رہا تھا۔

"کچھ تفصیل سے وضاحت کرو گی۔"

شہرینہ کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ تاہم اس نے آہستہ آہستہ پوری تفصیل اس کے گوش گزار کر دی۔ یوں بھی اس کے خیال میں پانی سر سے گزر چکا تھا اور اب چھپانا بے کار تھا بلکہ ایک موہوم سی امید رکھی جا سکتی تھی کہ ولید اس معاملے میں کوئی رہنمائی کرتا۔

وہ خاموش ہو کر اضطرابی انداز میں انگلیاں مسلنے لگی۔ ولید کی نظریں ملامت آمیز انداز میں اس پر جمی تھیں۔

”جانتی ہو تمہاری یہی رازداری اسے زیادہ غیر محفوظ کر گئی ہے۔“ اس نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

’مجھے یہ کہتے ہوئے بالکل عار نہیں کہ عورت کی اس طرح کی احتیاط ہی مرد کو نڈر بناتی ہے اور عورت کو غیر محفوظ کر دیتی ہے۔ ہر فریب دینے والا مرد یہی چاہتا ہے کہ اس کی طرف آنے والی عورت اپنی تمام تر کشتیاں جلا کر اپنے تمام پہلے نشان مٹا کر اس کی جانب بڑھے تا کہ وہ بآسانی اسے...“

وہ جملے میں مزید کوئی ٹکڑا لگاتے لگاتے چپ ہو گیا اور اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بوجھل انداز میں سگریٹ کا دھواں لبوں سے نکال کر اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلا لیا۔

”میں کیا کرتی‘ اس نے مجھ پر اعتماد کیا تھا۔“ وہ پست آواز میں بولی۔

”یہ اعتماد نہیں تھا یہ صرف اس کا خوف تھا جس میں اس نے تمہیں بھی شامل کر لیا۔ محض اس لیے کہ اس کے لرزتے قدموں کو ذرا حوصلہ ملے۔ اس کے اندر کا بوجھ کم ہو تو وہ مزید آگے راستہ عبور کر سکے۔“

”مگر میں نے اس کی حمایت قطعاً نہیں کی ہے۔“ وہ اس کے لہجے کی ترشی پر برامان کر بولی۔

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے ہلکے سے ہنس دیا۔

”مگر اس کے قدم روکنے کی بھی تو کوشش نہیں کی نا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اکبر علی شاہ کس قماش کا آدمی ہے۔“

”آپ کو کیا پتہ میں نے اسے کتنا سمجھایا حتیٰ کہ اس سے بات چیت تک بند کر دی مگر....“

”نہیں یہ کوئی اقدام نہیں تھا۔ اگر تم اس کی سچی خیر خواہ ہوتیں تو نادیہ یا سکندر کو ضرور آگاہ کرتیں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا میں اس کی خیر خواہی نہیں چاہتی تھی۔“

وہ اس کی مسلسل ضربوں پر طیش میں آ گئی۔ پھر قدرے رنجیدگی سے بولی۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اکبر شاہ اتنا گر جائے گا۔"

ولید نے سگریٹ لبوں سے ہٹا کر تمسخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

"ابھی اتنا کہاں گرا ہے' آخری حدود تمہیں معلوم ہے کیا ہوتی ہے۔"

شہرینہ کی اس کی جانب اٹھتی نظریں لرز کر جھک گئیں اس کے رخسار تپ سے گئے۔ ایک بے عنوان سی شرم محسوس کرتے ہوئے وہ اضطرابی انداز میں کرسی کے ہتھے پر انگلی کھرچنے لگی۔

"نامحرم مردوں سے فرشتے پن کی امید رکھنا سراسر نادانی یا پھر خود فریبی ہے۔" وہ اس کی کرسی پر ہاتھ رکھ کر قدرے اس کی طرف جھکا۔ "محبت میں مرد اور شیطان کے مابین صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ ہوتا

ہے' کبھی یہ فاصلہ کچے پل کی طرح ٹوٹ سکتا ہے۔ تم عورتیں سمجھتی ہو' محبت مرد کی طرف سے پیش کیا جانے والا پھول ہے جسے تھام کر اپنی زندگی معطر کر لو گی یا کوئی شفاف پگڈنڈی جس پر اگر مرد پھول اور آنکھیں بچھا کر تمہاری راہ میں آ کر کھڑا ہو کر تمہاری طرف

ہاتھ بڑھائے تو تم اسے تھام کر چلنے لگو کہ یہی تمہاری منزل ہے۔ یہی تمہاری زندگی میں سکھ کے پھول سجادے گا۔"

شہرینہ کے گال تمتمانے لگے تھے۔

"ہاں محبت اگر یوں راہ چلتے لوگوں سے ملنے لگتی تو دنیا میں نہ فریب کار درندہ صفت مرد دکھائی دیتے نہ فریب کھائی عورتیں۔ یہ بہت شفاف جذبہ ہے اسے کسی بھی نامحرم کی آنکھوں میں تلاش نہیں کرنا چاہیے' یہ قدرت کی طرف سے تحفے کے طور پر خود اپنے وقت پر ملتی ہے۔"

وہ پہلو بدل کر جھٹکے سے کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ نظریں ملیں تو وہ پلکیں جھکا کر ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

"آپ کا فلسفہ اپنی جگہ مگر ہر عورت راہ چلتے مرد کو اپنی منزل نہیں سمجھتی' ہر عورت ایسی سطحی محبت کی طلب نہیں کرتی۔ نہ وہ مرد کی نگاہوں سے پگھل کر بہنے لگتی ہے۔ کچھ عورتوں کو اپنی عزت نفس اور انا اپنی محبت کے مقابلے میں بھی بہت زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ چاہ کی طلب ایک فطری تقاضا ہے مگر وہ اس کی روانی میں تنکے کی طرح نہیں بہہ جاتیں۔"

وہ یہ کہہ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا اور خاصی توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر ہلکے سے مسکرایا۔

”مگر سچی اور خالص محبت کی تندی کے درمیان خود بخود انا بہہ جاتی ہے۔ دراصل خالص محبت اور انا ایک ساتھ رہ ہی نہیں سکتیں۔“

”ہاں اگر خالص محبت ہو تب نا۔“ وہ بھنویں اچکا کر طنز سے ہنسی۔ جواباً وہ بڑے دلفریب انداز میں مسکرایا۔

”تم نے ابھی مرد کی خالص محبت کو برتا ہی کب ہے۔“ اس نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور شہرینہ کو لگا جیسے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا ہو' اسے اپنے رخسار دہکتے محسوس ہونے لگے۔

”مجھے ضرورت بھی کیا پڑی ہے۔“ وہ اپنے اندر سے اٹھتی مانوس وحشت سے وحشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹی پھر قدرے بھنا کر بولی۔

”اگر آپ کے سامنے اکبر علی شاہ کا معاملہ کھل چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں آپ کی کسی سازش کا نوالہ بن جاؤں گی۔“

”کیسی سازش... کیا سازش۔“ وہ گھور کر اسے دیکھنے لگا مگر وہ چپ سی رہ گئی۔ بے اختیاری میں جو منہ سے نکل گیا تھا وہ واپس نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اس کے تپتے چہرے سے نگاہ چرا گئی اور قدرے ناآسودگی سے بولی۔

”میں جانتی ہوں بھابی نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”ہاں اس میں کوئی شک نہیں اور یہی نہیں انہوں نے تو مجھے اور بھی بہت کچھ بتایا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ معنی خیزی سے مسکرایا تھا۔

”وہ سب غلط ہے۔“ وہ تڑپ کر غصے سے بولی۔

”اوہ۔“ وہ بے اختیار کھل کر ہنس پڑا اور سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

”اگر غلط ہے تو پھر اس انگوٹھی کا کیا جواز رہ جاتا ہے' میری طرف سے تو تم بدگمان ہو ہی اپنی طرف سے بھی بات کلیئر کر کے وہ انگوٹھی آغا جی کو واپس کیوں نہیں کر دیتیں۔“

ہزار پتھر تھے جو شہرینہ کو اپنے اعصاب اور دل پر لگتے محسوس ہونے لگے۔ شدید ترین احساس تذلیل کا ابال اٹھا۔ اس کی انگلی میں وہ انگوٹھی تھی نہیں ورنہ وہ یقیناً اسی وقت اتار کر اس کے منہ پر مار دیتی۔

وہ بڑے اطمینان سے اپنے کہے ہوئے لفظوں کا ردعمل اس کے چہرے پر جانچ رہا تھا۔

اس نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر لب دانتوں میں دبا گئی اور ناآسودگی کے اس ابال کو دبا گئی یکدم پلٹی اور ماربل کی شفاف سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

ولید کے لبوں سے بے اختیار ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا ریلنگ کے پاس آگیا پھر بے اختیار ہنس دیا۔

”میری محبت حوض کا مقید پانی نہیں ہے بلکہ ایک رواں پرجوش دریا ہے اور دیکھتا ہوں اس رواں دریا میں تمہاری انا کیسے نہیں ڈوبتی۔“

اس نے سگریٹ سلگا کر خاصے مسرور انداز میں ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا کے سپرد کیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

X...X...X

محلے کی جان پہچان والی عورتوں کے جانے کے بعد تانیہ نے نادیہ آپی کے جہیز کے سارے کپڑے سوٹ کیس میں بھرتے ہوئے اماں کو دیکھا جو تخت پر لیٹیں چھت کو تک رہی تھیں۔

ساری رسمیں نبھانی پڑتی ہیں۔ دکھاوے کو ہنسنا پڑتا ہے۔ چاہے دل میں کتنے ہی گھاؤ ہوں۔

اب یہ بھی ضروری ہی تھا کہ صفیہ آپا اور دوسری عورتیں نادیہ کا جہیز دیکھنے کی خواہش میں چلی آئی تھیں اور

اماں کو اپنے زخم چھپا کر خوش دلانہ انداز میں انہیں خوش آمدید کہنا پڑا تھا' چائے پانی کے بعد گھنٹہ بھر بیٹھ کر ان کی ادھر ادھر کی باتیں بھی سننا پڑی تھیں' جن میں سرفہرست ذکر سید صاحب پر گزرا حادثہ ہی تھا۔ ہمدردی کے نقاب میں محض سید صاحب کے گھرانے کی عزت کی دھجیاں اڑانا ہی مقصود تھا۔ کسی کو بھی سید صاحب پر ٹوٹنے والے غم کا اتنا غم نہ تھا۔ بس زبان کے چٹخارے لے رہی تھیں مگر ان سب کو کیا خبر کہ اماں کے دل پر کیسے آرے چل

رہے تھے۔احساس جرم کے پاتال میں اترتے ان کے اعصاب کس قدر مجروح ہورہے تھے۔ان کے جانے کے بعد ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا۔اس نے جلدی سے انہیں دوا دی اور تب سے وہ لیٹی تھیں۔

وہ سوٹ کیس ان کے تخت کے نیچے گھسیڑ کر کمرے میں آئی تو فون کی بیل بج اٹھی۔اس کا دل خوف سے دھڑک اٹھا۔اس نے فون ریسیو کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔اسے تو اس مانوس گھنٹی کے بجنے سے ہی وحشت ہونے لگتی تھی' اسے لگتا جیسے گھنٹی نہ ہو بچھو کے ڈنک ہوں جو اسے مسلسل لگ رہے ہوں۔

نادیہ آپی گھر میں موجود نہ تھیں۔اس نے بے بسی اور وحشت آمیز نظروں سے فون سیٹ کو دیکھا۔اسے یوں لگنے لگا جیسے سیاہ کلر کا یہ پلاسٹک کا کوئی پیس نہ ہو بلکہ وزنی بم ہو جو اس کے چھوتے ہی بلاسٹ ہو جائے گا۔اس نے لرزتے ہاتھ سے ریسیور اٹھایا دوسری طرف اکبر علی شاہ کی آواز اس کے سارے زخموں کے ٹانکے کھول گئی۔

اس نے اس کی آواز سن کر جلدی سے ریسیور رکھنا چاہا مگر وہ چلایا۔

''تانیہ پلیز! پلیز فار گاڈ سیک میری بات سن لو صرف ایک بار۔''

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ نومی کے جس صدمے سے دوچار تھی اب وہاں اپنے ہر خیال احساس کو اندر ہی دفن کر کے بھول جانا چاہتی تھی۔

''کیوں... کیوں کیا ہے تم نے مجھے فون۔میرا تمہارا تعلق کچا دھاگہ تھا جو ٹوٹ گیا ہے۔''

''یہ تمہارا خیال ہے' میرا نہیں۔'' وہ بولا تانیہ کا دل چاہا وہ سامنے آجائے تو وہ اس کے منہ پر تھوک دے۔

''ہاں تو تم اب بھی گنگا نہائے ہوئے ہو۔'' وہ طنز سے ہنسی۔''اتنی پستی میں اترنے کے بعد بھی فون کرنے کی جرات کر لی' آفرین ہے تم پر۔تمہاری بے حسی اور بے غیرتی پر تحسین ہے۔''

''تانیہ یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو مجھ سے۔اتنی روڈ کیوں ہو رہی ہو' فون کیوں نہیں اٹھاتیں' جامعہ بھی نہیں آرہی ہو اور مجھ پر الزامات کی بھرمار کر رہی ہو۔آخر میرا قصور تو بتاؤ۔میرا جرم تو مجھ پر ظاہر ہو۔''

وہ لہجے میں سارے جہاں کی بے تابی' اضطراب سمو کر بولا۔

مارے غصے کے تانیہ کو اپنی گردن کی رگیں تنتی محسوس ہونے لگیں' شریانوں میں خون کھولنے لگا مگر پھر یکلخت ہی اسے لگا جیسے اس کا دل دکھ اور اضمحلال کی اتھاہ میں ڈوبنے لگا ہو۔

وہ آنسوئوں کی روانی میں بہتی چلی گئی ہو۔

"کتنے معصوم اور پارسا بن رہے ہو۔ مجھے سرعام رسوا کر کے اتنے انجان بن رہے ہو۔ اذیت کے ایک پل صراط سے گزر رہی ہوں۔ صرف اور صرف تم سے محبت کرنے کے جرم میں اور یہ اذیت تمہاری بخشی ہوئی ہے اور تم کہہ رہے ہو تمہارا قصور بتائوں' اپنے گریبان میں جھانکو' تمہیں تمہارا جرم واضح دکھائی دے گا۔"

"اگر تم توقیر بھائی کے رویوں کے بارے میں کہہ رہی ہو تو میں وضاحت کر دوں کہ وہ فوٹو گرافس توقیر بھائی نے میرے کمرے کی چھان بین کر کے حاصل کی ہیں' اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔"

"اور وہ ٹیلی فونک گفتگو وہ بھی شاید توقیر بھائی نے ہی ریکارڈ کی تھی ہے نا۔" وہ مجروح انداز میں ہنس پڑی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ہاں بالکل۔" وہ نہایت معصومیت سے بولا تو تانیہ دکھ اور غم سے لب دانتوں میں دبا کر رہ گئی۔ یہ غم اس کا دل کاٹنے لگا کہ اس نے کتنے فریبی' مکار اور کمینے شخص پر اپنی محبت کے لعل و گہر برباد کیے۔ غم و غصے کا ایک تیز ریلا اس کے اندر سے اٹھا۔

"تم تو شہرینہ کے اندازے سے بھی کہیں زیادہ پست' اور ذلیل انسان نکلے اکبر شاہ! میں تو عقل کی اندھی ہو گئی تھی سو تمہیں پہچان کر بھی نہ پہچان پائی۔ تم نے مجھے سرعام رسوا کر دیا' مجھے لگ رہا ہے جیسے میں بیچ سڑک ننگے سر کھڑی ہوں اور لوگ مجھ پر قہقہے بکھیرتے جا رہے ہوں۔ تم نے میرا سارا مان توڑ دیا۔" وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

اکبر شاہ کچھ دیر چپ رہا جیسے حالات کے اس رخ پر غور کر رہا ہوں یا پھر تانیہ کے الفاظ کے نشتر پر اپنے غصے کو کنٹرول کر رہا ہو۔

"کتنی بے وقوف تھی میں کہ جانتے بوجھتے کھائی کی طرف بڑھتی رہی۔"

"بے وقوف تو تم اب بھی ہو' جو اتنی ایموشنل ہو رہی ہو۔" وہ ایک ہنکارا بھر کر بولا۔

"خواہ مخواہ میں تم اس طرح سوچتی ہو' محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے تانی ڈیئر! دراصل یہ تمہارا اڈل کلاس طبقہ ہے نا اس نے اسے جرم بنا ڈالا ہے۔"

"ہاں محبت کرنا جرم نہیں ہے مگر تم جیسے گھٹیا شخص سے محبت کرنا ضرور جرم ہے اور یہ جرم میرے دل کی عدالت بھی مجھے معاف نہیں کرے گی۔" وہ تلخی سے بولی۔

"تانیہ!" اکبر علی شاہ کی برداشت جیسے جواب دے گئی۔

"اپنی اوقات میں رہو' میں کب سے تمہارے نخرے برداشت کر رہا ہوں۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم جو جی چاہے بکواس کرتی جائو۔تم جیسی لڑکیوں کی میرے پاس اتنی اہمیت نہیں ہے کہ اپنا قیمتی وقت ضائع کرتا پھروں۔"

"ہاں تو مت کرو' کس نے کہا ہے فون کرنے کو۔" وہ بھی پھٹ پڑی۔

"اوہو بہت چڑھی ندی ہو رہی ہو۔" وہ طنز سے ہنسا پھر لہجے کو بدلتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

"نہ کرتا فون' مگر کیا کروں تمہاری بھلائی کا خیال آ گیا۔تمہارا بھلا چاہتا ہوں نا۔اس لیے فون کرنا ہی پڑا۔"

"کیا بھلائی' تم جیسے انسان سے کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔تم دھوکے باز' فریبی' کمینے انسان۔تم کیا بھلائی کر سکتے ہو میرے لیے۔" غصے' دکھ اور رنج سے تانیہ جیسے اپنے حواس کھونے لگی۔

"ٹیک اٹ ایزی ڈیئر! ٹیک اٹ ایزی' خواہ مخواہ میں ہی خرچ ہو رہی ہو۔" وہ ہلکے سے ہنسا اور ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"میں حقیقتاً تم سے ایک بھلائی کرنا چاہتا ہوں' تمہاری ساری تصاویر بمعہ نگیٹو کے اور وہ ریکارڈ گفتگو کیسٹ تمہیں دینا چاہتا ہوں۔میں لاکھ برا انسان ہوں مگر دل کے ایک گوشے میں تمہارے لیے درد ہے' تمہیں میں اب بھی محسوس کرتا ہوں' تم مجھے جتنا مرضی چاہے بلیم کرو' مجھ سے نفرت کرو۔میں اب بھی تمہارے لیے اچھے جذبات رکھتا ہوں۔"

تانیہ کے اعصاب پر کچھ دیر سناٹا سا چھایا رہا۔وہ اس کے لہجے کے رنگ اور لفظوں پر غور کرنے لگی کہ اس میں صداقت ہے یا محض یہ بھی کوئی رنگین دھوکا ہے۔

"تانی بیلیو می۔ دیکھو مجھ پر اعتبار کرو۔ اچھا تم ایسا کرو کہ میری کوٹھی میں آجاؤ میں یہ ساری چیزیں ایک لفافے میں پیک کر کے رکھتا ہوں اور جب تمہیں دوں گا تو تمہیں خود ہی یقین آ جائے گا۔"

"تو اس کے لیے تمہاری کوٹھی میں آنا ہی کیوں ضروری ہے تم یہ احساس مجھ پر جامعہ میں بھی کر سکتے ہو' مجھے یہ سب پوسٹ بھی کر سکتے ہو۔" وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"نہیں' یہ تو بے اعتباری والی بات ہو گی تمہاری طرف سے۔ تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا ہو گا۔ دیکھو نا آخر اتنا حق تو میرا بنتا ہی ہے نا۔" وہ یہ کہہ کر ہلکے سے ہنسا۔

"کیا حق۔" وہ قطعی نہ سمجھ پائی۔

"میرا مطلب ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو تو آخر مجھے تمہیں منانا بھی تو ہے نا۔ اچھی میزبانی کے ذریعے اور میں جانتا ہوں تم اب مجھ سے کبھی نہیں ملو گی' اس بہانے شاید ملنے چلی آؤ۔ بس اس آخری ملاقات کو بہت عزت اور محبت کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ ان لمحات کو امر کر لینا چاہتا ہوں۔"

وہ پیار کے دریا بہانے لگا اور تانیہ اس کی روانی میں نا محسوس طور پر بہتے بہتے یکدم چونک اٹھی جیسے اچانک چٹان آ گئی ہو۔

"نہیں اکبر شاہ یہ ناممکن ہے۔" اس کا لہجہ اٹل تھا قطعی بے لچک۔ اکبر شاہ چند لمحے چپ رہ گیا۔

" تمہیں اندازہ نہیں ہے میں کس اذیت سے گزری رہی ہوں کن حالات سے دوچار ہوں' اب میں کوئی نیاز خم کھانا نہیں چاہتی اور نہ اپنے گھر والوں کو دینا چاہتی ہوں۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہیں' تمہیں نہیں پتہ کہ....۔"

"ہاں مجھے پتہ ہے کہ تمہارا بھائی نعمان قتل کے جرم میں جیل میں ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا تو تانیہ خوف سے دنگ رہ گئی۔

"تت... تمہیں کیسے پتہ چلا۔" وہ اسی خوف سے بولی تو اس کی ہنسی مائوتھ پیس میں گونج کر رہ گئی' اس ہنس میں ایک عجیب سے درشتگی سی تھی' جو تانیہ کو اپنے رگ وپے میں اترتی محسوس ہونے لگی۔

’’مائی لو تانیہ! نقوی صاحب سے ہمارے فیملی ٹرمز ہیں اینی وے نہ بھی ہوتے تب بھی یہ بات چھپنے والی تو نہیں ہے۔ قتل کوئی چھوٹا موٹا جرم تو نہیں ہے۔ آہ۔‘‘ اس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

’’ناحق ہم پر بدکرداری کا الزام ہے‘ تمہارا گھرانہ تو خیر سے بڑا نیک نام کہلاتا ہے‘ جس پر تمہیں فخر تھا۔ یہ نیک نام خاندان میں ایسا بدنام کیسے پیدا ہو گیا۔‘‘ پھر اپنی طنزیہ ہنسی سمیٹتے ہوئے جلدی سے بولا۔

’’خیر خیر میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں ہے‘ ہو جاتا ہے محبت چیز ہی ایسی ہے۔ یونہی دیوانہ‘ جنونی بنا ڈالتی ہے۔ ہم نے تو ابھی اپنے جنوں پر گرفت کر رکھی ہے‘ وگرنہ محبت تو ہم نے بھی بلا کی جنون خیز کی ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طویل سرد قسم کی سانس کھینچی پھر ایک لمحے توقف کے بعد بولا تو اس کے لہجے میں ملائمت نام کو نہ تھی بلکہ ایک عجیب سا بھاری پن تھا۔

’’تانیہ کیا تم چاہو گی کہ تمہاری اس اذیت ناکی میں مزید اضافہ ہو جائے‘ نادیہ کی شادی میں کوئی مشکل پیش آ جائے‘ نومی پھانسی کے پھندے پر چڑھ جائے اور... اور لوگ تم پر انگلیاں اٹھائیں میرے نام کا طعنہ دیں۔‘‘

اس کا انداز یکسر بدلا ہوا تھا اس کی ساری ملائمت اور منافقانہ شائستگی سرد مہری میں بدل چکی تھی۔

’’ہیلو تانیہ تم سن رہی ہو نا میری بات‘ دیکھو اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ اب آئو اور اپنی امانت لے جائو‘ میرا مطالبہ ایسا ناجائز بھی نہیں ہے دو گھڑی ملنا ہی تو چاہتا ہوں۔‘‘

تانیہ کو اپنے چاروں طرف شعلے بلند ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا اس کا وجود آتشیں بگولوں کی زد میں آ گیا ہو جیسے اسے کسی نے جلتے ہوئے شعلوں میں دھکیل دیا ہو۔ وہ جس روپ میں اس کے سامنے آیا تھا اس کے اعصاب بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔

’’میرا خیال ہے تم عقل مندی کا ثبوت دو گی اور اپنے گھر کو اس آگ سے دور رکھنے کی کوشش ضرور کرو گی۔ یوں بھی ڈیئر! شادی والے گھر میں ہلکا سا پٹاخہ بھی پھوٹ جائے تو لوگ...‘‘

"پلیز چپ ہو جائو۔" وہ یکدم چلا پڑی۔

"ارے میں تو تمہیں دوست بن کر سمجھا رہا ہوں یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔"

تانیہ نے بے جان ہاتھوں سے ریسیور رکھ دیا‘ اسے اپنے حواس ریشمی دھاگے کی مانند محسوس ہو رہے تھے جو ہوا میں تیرتے پھر رہے ہوں۔

اس نے بہت پہلے کہیں پڑھا تھا کہ بچھو کی دم میں‘ سانپ کے دانت میں‘ مچھر کے سر میں زہر ہوتا ہے لیکن برے انسان کے سارے وجود میں زہر ہوتا ہے۔

وہ لرزتے کانپتے وجود کو گھسیٹ کر دیوار کا سہارا لے کر فرش پر بیٹھ گئی۔

محبت کے نام پر ہوس کی بھینٹ چڑھنا کسے کہتے ہیں۔

عشق کے دھوکے میں لٹنا‘ کیا ہوتا ہے اس کی سمجھ میں اب آیا تھا۔

دہکتے شعلوں کو پھول سمجھ کر پکڑ لینے کی اذیت اب پوری طرح اس کی رگوں میں اتر رہی تھی۔

اسے پورا کمرہ ہی کھولتا ہوا سمندر محسوس ہونے لگا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

X...X...X

بڑی سی سیاہ چادر میں خود کو ڈھانپے نادیہ آپی نومی سے ملنے چلی آئی تھیں اور اسے دیکھ کر ان کے ضبط کے سارے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ اذیت کے عالم میں انہوں نے ایک پل کے لئے آنکھیں میچ لیں۔

ہمیشہ بن سنور کر رہنے والا‘ پرفیوم میں مہکا‘ چہرے پر سب کچھ پالینے کا عزم سجائے‘ بائیک کو اڑائے اڑائے پھرنے والا یہ نعمان تو نہیں لگ رہا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی خستہ حال وحشت زدہ‘ خوف کی پرچھائیوں سے بھری آنکھوں والا شخص لگ رہا تھا۔

"ایسے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی آپی!" نومی کی بوجھل آواز ابھری۔

انہوں نے اپنی آنسوئوں سے بھری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر سلاخوں کو پکڑ کر اس پر پیشانی ٹکا کر بے آواز رو دیں۔

"یہ تم نے کیا کر دیا نومی! جیتے جی مار ڈالا ہم سب کو۔ تمہیں اماں کا بھی خیال نہیں آیا۔ میرا بھی نہیں سوچا۔ اپنے خاندان کی عزت کا بھی خیال نہ آیا۔"

اس نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیا اور مضطربانہ انداز میں اپنی انگلیاں مسلنے لگا۔ پھر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ نادیہ آپی کے سر پر رکھا۔

"میں تو ہمیشہ سے ہی ایسا تھا۔ اماں کو کبھی سکھ نہیں دیا بلکہ انہیں ہمیشہ ستایا ہی ہے' دکھ ہی دیا ہے' ایک مفاد پرست' مطلبی شخص' لالچی انسان کسی کو سکھ دے بھی کیا سکتا ہے۔ میں تو نفرت کے قابل ہوں' میں نے آپ سب کو سوائے دکھوں اور رسوائی کے دیا ہی کیا ہے؟ آپ سب لوگ مجھ سے نفرت کریں' سکندر بھائی بھی مجھ سے نفرت کرتے ہیں آپ بھی کیجیے۔"

وہ فرش پر بیٹھ گیا جیسے پیروں میں جان نہ رہی ہو۔ نادیہ آپی نے کرب سے گزرتے ہوئے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا پھر خود بھی دوزانو بیٹھ کر اس کے سوکھے بنجر بے رونق بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"تم جن حالات سے دوچار ہو وہاں چاہتے ہوئے بھی ہم تم سے نفرت نہیں کر سکتے' جس اذیت سے تم دوچار ہو ہم بھی اس اذیت کا شکار ہیں۔ پگلے! سکندر بھائی ہے تمہارا' اس نے کبھی تمہارا برا نہیں چاہا' اب بھی تمہاری رہائی کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔"

"میں رہا نہیں ہوں گا کبھی نادیہ آپی!" اس نے آپی کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر ہاتھوں میں جکڑ لیا جیسے کوئی خوفزدہ بچہ رات کی تاریکی میں اپنی ماں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔

"ہاں مجھے پتہ ہے میں رہا نہیں ہوں گا' میں نے اب تک جو بھی چھوٹے بڑے جرم کیے ہیں ان کی تفتیش بھی ہو رہی ہے میرا جس پارٹی سے تعلق ہے اس کے ورکروں کی پہلے ہی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔"

نادیہ آپی کی آنکھوں میں دکھ کی کائی دبیز ہو گئی۔ نومی نے ایک اداس غمزدہ سی سانس بھر کر ان کا ہاتھ ہولے سے تھپک کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں آنسو بے آواز بکھر رہے تھے' وہ بڑی نرمی سے ان کا چہرہ صاف کرنے لگا۔

"ایسا مت کرو آپی! یوں خود کو ہلکان مت کرو' ابھی تو تمہیں اپنی نئی زندگی شروع کرنی ہے' میرے لیے اتنی پریشان مت ہوا کرو۔ اماں کو بھی تسلی دو کہ وہ آپی... آپی پلیز۔" وہ

کرب سے لب دانتوں میں دبا کر رہ گیا۔نادیہ آپی کی سسکیاں اس کے دل پر زخم ڈالنے لگیں۔

کچھ دیر بعد سکندر بھی آیا تو اسے دیکھ کر نومی کو بھی اپنا ضبط کا خول ٹوٹتا محسوس ہونے لگا۔

اسے اپنا یہ بھائی دبیز تاریکی میں روشنی کا دیا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

جو دھوپ اس کے سر پر پڑی ہے اس میں ایک سائے کا یہی احساس باقی بچا تھا۔

اس نے سکندر کو حوصلہ طلب نظروں سے دیکھا۔

"سب بہتر ہو جائے گا حوصلہ رکھو۔" اس نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"اور سنو تم ان لوگوں سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش مت کرنا۔سب کچھ سچ سچ بتا دینا۔ میری انسپکٹر عزیز گل سے اسی سلسلے میں بات ہو رہی ہے۔دیکھو شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔"

سکندر نے بالوں پر ہاتھ پھیر کر ایک گہری سانس بھری پھر نادیہ کو تھانے سے باہر جا کر اس کا انتظار کرنے کو کہا۔

"یہ بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے سکندر بھائی! آپ نہیں جانتے پارٹی سے غداری کی سزا موت ہے۔" نومی نادیہ کے جانے کے بعد بہت دل گرفتگی سے دوبارہ فرش پر بچھی بے رنگ دری پر بیٹھ گیا۔

"مجھے تو ابھی سے دھمکیاں ملنا شروع ہو چکی ہیں' آپ نہیں جانتے یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔"

"کون آیا تھا تمہارے پاس دھمکی لے کر۔" سکندر بھی سلاخوں کے اس پار اس کے بالکل مقابل گھٹنے زمین پر ٹکا کر بیٹھ گیا۔نومی سر نفی میں ہلانے لگا۔

"نومی اس طرح تو بہت مشکل ہو جائے گی۔" سکندر بے چارگی آمیز کرب سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"میری مجبوری ہے یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔" نومی کے لہجے میں بڑی بے بسی تھی' اس کی شفاف کشادہ آنکھوں میں پانی تیرنے لگا تھا۔

"مجھے لگتا ہے سکندر بھائی! میرے آگے ایک تاریک اور اندھی کھائی ہے' اگر اس سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹتا ہوں تو ایک خونی اژدھا ہے جو منہ پھاڑے میرا منتظر ہے۔"

سکندر نے سلاخوں پر رکھے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت سخت کر دی۔

"یہ حالات میرے اپنے پیدا کردہ ہیں اس میں نہ تقدیر کو دوش دینا جائز ہے نہ کسی اور کو۔"

"تم مجھے ایک بار ان لوگوں کے نام تو بتاؤ' پتے بتادو میں اپنی طرف سے کچھ کوشش کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں ہر گز نہیں۔" نومی نے خوفزدہ ہو کر ان کی بات کاٹ دی۔ سکندر کو اس کی آنکھوں میں خوف کی زرد پرچھائیاں لرزتی دکھائی دینے لگیں۔

"آپ کو نہیں خبر وہ کتنے ظالم' سفاک اور خطرناک لوگ ہیں۔ مجھے وہ لوگ جیل کے اندر بھی قتل کرا سکتے ہیں' آپ لوگوں کو نقصان پہنچائیں گے' ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں' ان کے پاس ہزاروں مجھ جیسے دولت کی ہوس میں اندھے لڑکے ہیں جو ان کا ہر ناجائز کام منٹوں میں انجام دے سکتے ہیں۔"

سکندر ایک افسردہ سانس بھر کر رہ گیا' وہ اس وقت اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس سے کچھ بھی اگلوانا یا اسے قائل کرنا تقریباً ناممکن ہی تھا۔

ایک امید کی کرن پھوٹی تھی وہ بھی اب معدوم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھپک کر تھانے سے باہر نکل گیا۔

X...X...X

رات بھر جاگ کر سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے اپنے اور گھر والوں کی عزت کی بقا کے لیے یہ جنگ بہر حال لڑنا پڑے گی' چاہے نتیجہ جیت کی صورت میں نکلے یا ہار کی۔ اسے اکبر علی شاہ سے ملنے کوٹھی جانا پڑے گا۔

اس کی عالیشان کوٹھی میں قدم رکھتے ہی ایک پل کے لئے تو اسے اپنی سانسیں یوں رکتی محسوس ہونے لگیں جیسے دل کو کوئی مٹھی میں لے کر دبا رہا ہو۔

لابی کے دبیز قالین پر کھڑے کھڑے ہی اس پر اذیت ناک بے بسی کا غلبہ شدت سے طاری ہو گیا اور دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا۔

وہ یہاں نہیں آنا چاہتی تھی مگر اب آچکی تھی اور باوجود خواہش کے پلٹ کر نہیں جاسکتی تھی، ہزار اندیشے اور واہموں کا ایک تند سیلاب بھی اس کے ہمراہ تھا جس میں ڈوب کر ہی اسے پار اترنا تھا۔

''آخاہ... وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔'' اکبر شاہ سامنے کی شفاف ماربل کی سیڑھیوں سے اترتا ہوا بولا۔

اسے دیکھ کر ترنگ بھرے انداز میں سیٹی بجائی۔اس کے جسم پر سفید گاؤن تھا وہ اپنے بے تکلفانہ حلئے میں پہلی بار اسے دکھائی دیا تھا۔

لابی کے خنک ماحول میں بھی سیاہ چادر میں اس کا جسم پسینے سے بھیگنے لگا۔وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلی تھی۔وہ خود ہی پر شوق نگاہوں سے اسے تکتا ہوا اس کے نزدیک چلا آیا۔

''یہ اعتبار بخشنے کا شکریہ۔'' اس کی گرم گرم سرگوشی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح تانیہ کی سماعت سے رگ وپے میں اتر گئی۔اس نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹکا اور قدرے فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''میں اپنے وعدے کے مطابق یہاں تک آگئی ہوں، اب تم اپنا وعدہ پورا کرو اور میری اذیت مجھے واپس کر دو۔'' اس نے اپنے لہجے کو حتی الامکان مضبوط بنانے کی کوشش کی۔

وہ آنکھوں میں شوق لیے اسے دیکھ رہا تھا۔اس کی بات پر بھرپور انداز میں مسکرایا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے اتنے دنوں بعد ملے ہیں ابھی تو تمہیں دیکھا بھی نہیں ہے جی بھر کر، آئو اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔''

اس نے ہاتھ بڑھایا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

''نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں، تم اپنا وعدہ پورا کرو اکبر شاہ!'' اس کا انداز خشک تھا۔

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اکبر شاہ کو دیکھ کر اس کے اندر کسی بھی مانوس جذبے کی چاپ نہ جاگی تھی۔بلکہ اسے تو لگا کہ اس کے دل میں ان شعلوں کو بجھے ایک زمانہ ہو گیا ہو۔اب کوئی چنگاری باقی بچی ہی نہ تھی جو شعلہ بنتی۔

آج اس کی آنکھوں میں شرم کی لالی نہیں بلکہ ایک وحشت ناک سناٹا بکھرا ہوا تھا، اسے اپنے سامنے کھڑا اکبر علی شاہ ایک بہروپیا دکھائی دے رہا تھا۔

"ایسی بھی کیا بے اعتباری تانیہ! ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی تو نہیں ہیں' شاید تم بہت زیادہ ناراض ہو۔" وہ پھر اس کے نزدیک چلا آیا۔

"تمہاری ناراضگی بجا مگر مجھے موقع تو دو کہ میں تمہاری ناراضگی' خفگی دور کر سکوں۔" وہ اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ پھیلا کر سرگوشیانہ انداز میں اس کے کانوں کے پاس جھکا۔

"ناراضگیاں اس طرح تو یہاں کھڑے کھڑے دور نہیں کی جاسکتیں نا۔ اس کے لیے تو خلوت چاہیے آئو۔ آئو تانیہ آج ہم رت جگا کریں گے' آج یہاں توقیر شاہ کی شادی کی خوشی میں جشن ہو گا۔ میرے سارے یار دوست جمع ہوں گے' بس ایک تمہاری کمی تھی' کیا تم میری خوشی کو میرے ساتھ شیئر نہیں کرو گی۔ کم آن تانی۔ پر اور پرواز رکھنے کے باوجود خود کو پنجرے میں مقید کیوں رکھنا چاہتی ہو' میرے ساتھ ساتھ پرواز کرو گی تو زندگی کا صحیح لطف اٹھائو گی۔ کم آن۔"

تانیہ کے وجود پر اکبر شاہ کی بھوکی نگاہوں اور جملوں نے ایک سناٹا بھر دیا۔ وہ وحشت بھری نظروں سے اکبر شاہ کو تکنے لگی۔

اس بے راہ رو' گمراہ' بے دین شخص پر اپنے قیمتی جذبوں کے لعل و گہر نچھاور کرتے رہنے پر اسے اب جتنا بھی دکھ اور پچھتاوا ہوتا کم تھا۔

ہوس' محبت کو اس طرح خاکستر کر دیتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو اور ایک بد فطرت شخص سے محبت کرنا دراصل محبت کے نام پر خود کو بھی دھوکا دینا ہے اور یہ دھوکا تانیہ رضا قریشی ایک عرصے سے خود کو دیتی آئی تھی۔

پتہ نہیں اسے ہی محبت کہتے ہیں یا چاہے جانے کی فطری خواہش کے سیلاب میں وہ تنکے کی طرح بہتی رہی تھی اب تک اور اس نہج پر آ پہنچی تھی۔

اس نے کرب سے گزرتے ہوئے اکبر شاہ کو نفرت آمیز نظروں سے دیکھا اور اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے جھٹکا مگر اس کا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں کانپ کر رہ گیا۔

"چھوڑو مجھے میں یہاں تمہاری ہوس ناکی کو پورا کرنے نہیں آئی ہوں بلکہ۔"

"بلکہ باوضو ہو کر نماز پڑھنے آئی ہو' ہے نا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر تمسخرانہ انداز میں ہنسنے لگا اور اپنی مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے عجیب سرد سرد لہجے میں بولا۔

"وعدے اس طرح پورے نہیں کیے جاتے تانیہ رضا! تمہاری امانت میں اس طرح تو نہیں دے دوں گا۔"

"تم... تم چیٹ کر رہے ہو اکبر شاہ!" مارے خوف اور دہشت کے وہ چلائی۔ اسے اپنا ہاتھ ایک آہنی شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اسے لگا جیسے وہ اکبر شاہ کی انگلیاں نہ ہوں لوہے کی سلاخیں ہوں۔ جو اس کی کلائی میں گھسی جا رہی ہوں۔

"میں چیٹ نہیں کر رہا تم ہی انجان بن رہی ہو یہ اور بات ہے۔" وہ ہلکے سے غرایا۔

"کیا تم اتنی معصوم نا سمجھ ہو کہ اتنا نہ جان پائیں کہ میں نے تمہارے کوٹھی میں آنے کی یہ شرط کیوں رکھی تھی۔ ظاہر ہے تہجد پڑھانے کے لیے تو نہیں بلایا۔ اب پارسائی کا یہ ناٹک بند کرو تانیہ ڈیئر! تمہاری شرافت کا پول تو اسی روز کھل گیا تھا جب تم نے شہرینہ خان کے سمجھانے کے باوجود میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ میرے ساتھ ہوٹلنگ کی اور ایک غیر نا محرم مرد کے ساتھ تصویریں بنوائیں۔"

وہ ہنس رہا تھا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس چادر کا جو وہ آج اپنے بدن پر لپیٹ کر آئی تھی۔

"ہاں میں اپنے خدا کے حضور بہت شرمسار ہوں اور تاعمر مجھے یہ پچھتاوا رہے گا۔" وہ اس کے لفظوں کے تیروں سے بری طرح مجروح ہو رہی تھی۔

"ہا یہ تم شریف لوگوں کی اچھی شرافت ہے کہ کچھ بھی کر لو پھر رو دھو کر اللہ کے آگے شرمسار ہو جائو۔" وہ اس کے نزدیک آیا پھر تمسخر سے اس کے چہرے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"شرمسار ہونے کی نوبت اسی وقت ہی کیوں پیش آتی ہے جب انسان مایوس ہو جائے جب توقعات ٹوٹ جائیں اور جب خالی ہاتھ ہو جائو خیر۔" اس نے ایک ہلکی سانس بھری۔

"ہوگی یہ بھی شرافت کی کوئی قسم۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں ہلکے کھٹکے پر لابی کے دروازے پر اٹھیں تو لحظہ بھر کے لئے جھپکنا بھول گئیں۔ ولید دروازے پر کھڑا تھا۔ جانے کب سے کھڑا تھا یا ابھی داخل ہوا تھا۔ اسے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ لابی کا مضبوط نقش والا دروازہ بند کر کے لاک کرتا ہوا اندر چلا آیا۔ ابھی اکبر شاہ کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ اس کے ہاتھ کا زوردار گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ یہ حملہ اتنا بھرپور اور اچانک تھا کہ اکبر شاہ اپنے پیچھے صوفے پر الٹ گیا' اس کے جبڑے سے خون ابل پڑا۔ مگر دوسرے پل وہ موٹی سی گالی

دیتا ہوا بلبلا اٹھا مگر ولید نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے دیوار پر دھکیل دیا۔ اور وہ کسی پلاسٹک کے گڈے کی طرح دھپ سے دیوار سے جا لگا۔

"تم جیسے اوباش' عیاش امیر زادوں کے مزاج کی رنگینی کو مجھے اتارنا خوب آتا ہے' عزتوں کو پامال کرنے کو محبت کا نام دیتے ہو۔"

اس نے پوری طاقت سے اس کے سر کو دیوار سے ٹکرایا تو کتنی ہی دیر اکبر شاہ کو اپنی آنکھوں کے آگے تارے چمکتے دکھائی دیتے رہے۔

"یہ تمہارے کسی مزارعے کی بیٹی بہن نہیں ہے کہ تم اس پر ہاتھ صاف کر کے اڑنچھو ہو جاؤ۔ نہ یہ تمہاری جاگیر ہے۔ یہاں پر اپنی رنگینی کو اپنے حلقے تک ہی محدود رکھو سمجھے۔"

اس نے لگاتار دو تین جھٹکے اور دیئے پھر تانیہ کی طرف دیکھا جو حیرت اور صدمے سے گم صم کھڑی تھی۔

"یہی ملا تھا تمہیں سارے جہاں میں بااعتبار اور محبت کے قابل شخص؟"

ندامت کے بوجھ سے تانیہ کو اپنا وجود کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا دل چاہا اسی لمحے زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے یا اس پر لابی کی چھت آ گرے اور وہ اس ذلت آمیز حالت سے بے نیاز ہو جائے۔

اکبر شاہ نے اپنا خون آلود جبڑا سہلاتے ہوئے پہلے تو ادھر ادھر مدد کے لیے کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر لابی کا داخلی دروازہ ولید بند کر چکا تھا اور اندر کے دروازے میں سے کسی ملازم کا لابی میں اس وقت داخل ہونے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ یہ خود اس کی تاکید تھی... سو وہ مایوس ہو کر ولید کی طرف خود ہی جھپٹا۔ اس کے حواس کسی حد تک بحال ہو چکے تھے۔

"تمہیں ہمت کیسے ہوئی اس کوٹھی میں قدم رکھنے کی اور تانیہ اپنی مرضی سے آئی ہے میرے پاس' میں نے اسے جبر سے نہیں بلوایا بلکہ آج تک وہ اپنی خواہش اور مرضی ہی سے ملتی رہی ہے مجھ سے۔"

"مرضی سے نہیں تم نے اسے بلیک میل کر کے بلوایا ہے۔" اس نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے گریبان تک پہنچنے سے پہلے ہی جھٹک کر اس کے پہلو میں دبا دیئے اور پھر ان پر مزید دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔

"اگر تانیہ تم سے ماضی میں محبت کرنے کی غلطی کر ہی چکی ہے تو اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ تم اسے یا سکندر کو بلیک میل کرنے لگو۔ خبر دار جو تم نے دوبارہ تانیہ سے ملنے کی مکروہ کوشش کی تو... تمہارا وہ حشر کروں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔"

"اپنی حد میں رہو ولید تم شاید نہیں جانتے کہ تم مردان علی شاہ کی کوٹھی میں کھڑے ہو اور اس کے بیٹے کو دھمکی دے رہے ہو۔"

اکبر شاہ اس کی گرفت میں بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے چلایا۔

"صرف دھمکی ہی نہیں پٹائی بھی کر رہا ہوں۔" وہ ملائمت سے ہنسا۔ پھر اس کا سر بالوں سے پکڑ کر اونچا کر کے اس کی آنکھوں میں اپنی غصے سے سرخ ہوتی آنکھیں گاڑتے ہوئے بولا۔

"آیا تو میں تمہارے باپ کی صوبائی اسمبلیاں ٹوٹنے پر پرسہ دینے تھا مگر میرا خیال ہے تمہارے باپ کے لیے اسمبلیوں کے ٹوٹنے کا صدمہ تو قابل برداشت ہو گا مگر جب تمہاری ہڈیاں ٹوٹیں گی وہ صدمہ یقیناً قابل برداشت نہ ہو گا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"نہیں نہیں پلیز ولید!" اکبر شاہ مارے دہشت کے زور سے چلایا۔ ولید کا اٹھا ہوا ہاتھ اس کے کندھے سے چند انچ کے فاصلے پر رک گیا۔ ولید کے ارادے جان کر اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ رہی تھیں۔

"یاد رکھنا ہم لوگ اپنی عزت کے معاملے میں بہت خرانٹ اور روایت پرست ہیں۔ آئندہ تم نے تانیہ سے یا شہرینہ سے کسی قسم کی بدتمیزی کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ یوں بھی میرے پاس تمہارے باپ کو عدالت میں گھسیٹنے کے لیے بہت میٹر ہے اور یہ میٹر مجھے اخباروں میں چھپوانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمہارا باپ کوئی ایسا عزت دار آدمی تو ہے نہیں کہ مجھے اس کی عزت اتروانے کے لیے اتنا تردد کرنا پڑے۔"

"چلو تانیہ!"

وہ تانیہ کی طرف مڑا جو احساس ندامت سے چور چور کھڑی تھی۔ اس میں ایک قدم ہلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ اس نے آہستگی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لابی سے باہر لے گیا۔

اکبر شاہ کا ایک ملازم شاید اکبر شاہ کی درگت دیکھ چکا تھا۔ بھاگ کے اس طرف آیا اور اپنی گن نکال کر ولید پر تاننی چاہی مگر اکبر شاہ نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

وہ تانیہ کے لیے بہر حال بڑا ہنگامہ مچانا نہیں چاہتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ مردان علی شاہ کے کانوں تک یہ بات پہنچے۔ یوں بھی اس کا بدن ان جھٹکوں اور ضربوں سے دکھ رہا تھا اس وقت وہ سیدھا اپنے بیڈ پر لیٹنا چاہتا تھا۔ اپنی ذلت کی ساری جھنجھلاہٹ اس نے اسی گن مین پر نکالی پھر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

X...X...X

ذلت، خوف اور بے بسی کا احساس تانیہ کو بری طرح مجروح کر رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر بلک پڑی۔

"اگر تم عورتوں کو ناقص العقل کہا گیا ہے تو بالکل ٹھیک ہی کہا گیا ہے۔ کیا یہ حماقت نہیں ہے کہ ایک جال کو کاٹنے کے لیے دوسرے جال میں پھنس جایا جائے، تمہارا کیا خیال ہے اکبر شاہ نے تمہیں کوٹھی کسی جذبہ ہمدردی کے تحت بلوایا تھا۔"

اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روکتے ہوئے اس کی سمت رخ موڑا۔

احساس شرمندگی سے وہ کٹ کر رہ گئی۔

"میں کسی بھی حال میں نادیہ آپی کے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتی تھی، میں صرف اور صرف اس گھر کی خوشیاں چاہتی ہوں۔"

"ہاں چاہے وہ خود کو برباد کر کے حاصل ہوتیں۔" ولید نے اسے خائف نظروں سے دیکھا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔"

اور جواباً ولید کا دل چاہا کوئی وزنی شے اٹھا کر اس کی عقل سے خالی کھوپڑی پر دے مارے۔

"ہاں۔" وہ اسے گھورنے لگا۔

"جیسے تمہاری بربادی پہ سکندر اور نادیہ مل کر جشن منائیں گے۔ کیا تمہاری کھوپڑی واقعی خالی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا تو اس کی آنکھیں اور تواتر سے بہنے لگیں۔

" اچھا بس آئندہ تم اس طرح کی کوئی حماقت نہیں کرو گی۔ اور اپنی عقل پر بالکل نہیں چلو گی۔" ولید نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر دی۔

" اگر اس نے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو... یا کوئی نقصان پہنچایا تو۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ہزار خدشے اس کے ایک لہجے میں کانپ رہے تھے۔

اس نے اسے بیک ویو مرر سے گھورا تو اس نے جلدی سے پلکوں کے ساتھ سر بھی جھکا لیا۔ یوں بھی ولید سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی' جس ذلت کا سامنا اسے ہوا تھا اور جو سبکی کا احساس وہ اٹھا رہی تھی اس کی تپش سے اس کا سارا وجود خاکستر ہو رہا تھا۔ یہ ایک اسی غلطی کا خمیازہ تھا جو وہ ادا کر رہی تھی۔

" وہ کچھ نہیں کرے گا' اسے میں نے جو سبق سکھایا ہے کافی ہے اس کے لیے۔ ہاں اگر اس نے باوجود اس کے کچھ کرنے کی کوشش کی تو تم مجھ کو فوراً مطلع کرو گی۔ دیکھو تانیہ!۔" اس نے سگنل کی سرخ بتی پر گاڑی روکتے ہوئے اس کی طرف چہرہ موڑا پھر سمجھانے والے انداز میں بولا۔

" تم لڑکیوں کا المیہ یہ ہے کہ تم لوگ ایک غلطی کو چھپانے کے لیے اس سے بڑی اور خطرناک غلطیاں کرتی چلی جاتی ہو۔ خوف اور اندیشے یوں بھی عورت کو زیادہ لاحق رہتے ہیں اور اسی سے ایسے مرد فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ خوفزدہ لڑکیوں کے خوف کے دائرے کو تنگ کرتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ مرنے کے سوا ان کو کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے' کسی کو اعتماد میں لے کر اس خوف سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے۔ ایک بڑی ذلت اور خواری کے مقابلے میں ایک نسبتاً کم سبکی قبول کر لینی چاہیے' جس طرح کینسر جیسی موذی بیماری کو ختم کرنے کے لیے اس کے علاج کی چھوٹی موٹی اذیتیں سہنا پڑتی ہیں۔"

اس نے ایک ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے اس کے چہرے سے نگاہ ہٹا دی۔ شرمندگی کے بوجھ سے اس کی گردن پہلے ہی جھکی ہوئی تھی۔ گلی میں گاڑی داخل ہوئی تو اس کی حالت قابل رحم ہو گئی اس نے اضطراری انداز میں ولید کی طرف دیکھا۔

" آپ پلیز۔ اس کا ذکر سکندر بھائی سے مت کیجیے گا ورنہ میں مر جاؤں گی۔ پلیز ولید بھائی!" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر رو پڑی۔

ولید نے دل گرفتگی سے اسے دیکھتے ہوئے ملائمت سے جڑے اس کے دونوں ہاتھ الگ کیے۔

" بے وقوف لڑکی تم سکندر کی ہی نہیں میری بھی بہن ہو اور بھائی' بہنوں کی عزت و عصمت کے رکھوالے ہوتے ہیں۔" پھر نرمی سے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔

" تم بھی اسے ڈرائونا خواب سمجھ کر بھول جائو' بلکہ ان گزرے تمام ایام کو بھی بھلا دو۔ غلطی کرنا تو انسان ہونے کی دلیل ہے اور غلطی پر توبہ کرنا ایمان کی علامت ہے' پاگل لڑکی! یہاں کون بھلا غلطی پروف ہے۔ہاں ویسے تم نے ایک اور بھی حماقت کی ہے۔"

اس نے گاڑی دروازے پر روکتے ہوئے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ ابرو اچکائے۔

" رازداں بنایا بھی تو اپنے جیسی کم عقل خاتون کو... ۔" تانیہ فوری طور پر نہ سمجھ سکی کہ اس کا اشارہ شہرینہ کی طرف ہے۔ پھر اس کی دھیمی مسکراہٹ اور ذرا سی سوچ بچار پر اس کی سمجھ میں آیا تو بے ساختہ

لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

" نہیں وہ مجھ جیسی احمق اور کم عقل نہیں ہے' وہ تو بہت سمجھ دار ہے' اگر کم عقل ہوتی تو آج میری طرح وہ یہ ذلت اٹھا رہی ہوتی۔" وہ دوپٹے کا کنارا اٹھا کر آنکھیں پونچھنے لگی۔

" اوہ۔ہو۔شیری اور عقل مند؟" ولید بے ساختہ ہنسا تھا۔اس کی یہ ہنسی سراسر حیرت آمیز تھی پھر ہلکے سے مزاحیہ انداز میں اپنی خوش نما آنکھوں کو جنبش دے کر بولا۔

" چلو تم پہلی انسان ہو جس نے اسے بھی عقل مندوں کی فہرست میں شامل کر دیا۔"

ماحول پر چھائی رنجیدگی کا طلسم ہلکے سے ٹوٹا تھا۔تانیہ دھیرے سے مسکرائی۔

" اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔آپ تو خواہ مخواہ اس بیچاری کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔"

وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی پھر ایک دم ولید کی طرف اسی اضطراب سے دیکھنے لگی۔آنکھوں میں دھند چھانے لگی' پھر ممنونیت سے بولی۔

" آپ کا احسان میں عمر بھر نہیں بھولوں گی ولید بھائی! آپ نہ آتے تو جانے کیا ہو جاتا۔"

" اوہ ہو بھول جائو اب اس واقعہ کو تانیہ!" اس نے ہلکے سے ڈانٹا۔

" اور سمجھو کہ یہ باب تمہاری زندگی سے نکل گیا ہے۔"

جوابا وہ ایک گہری سانس بھر کر اپنی طرف کا دروازہ بند کر کے پیچھے ہٹ گئی اور اس وقت تک کھڑی رہی جب تک گاڑی گلی سے نکل کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

X...X...X

آفس آکر بھی یہ واقعہ ولید کے اعصاب پر سوار رہا۔ اسے اکبر شاہ پر جتنا غصہ آرہا تھا اتنا ہی تانیہ کی حماقت پر دکھ ہو رہا تھا۔

"اگر اس کوٹھی میں اتفاقی طور پر نہ جاتا تو؟" اور اس کے آگے کا سوچ کر ہی اسے جھرجھری آگئی۔

صوبائی اسمبلی ٹوٹنے کی خبر سن کر اس نے سوچا مردان علی شاہ کو روبرو جا کر پرسہ دے آئے' اور آمنہ علی سے اس کے باپ کے اس عہدے سے برخاست ہو جانے پر تعزیت کرے۔ مگر وہاں پیش آنے والے اس واقعے نے اسے چکرا کر رکھ دیا اور اب وہ مسلسل اس واقعے کا خیال

ذہن سے جھٹکنے کے لیے خود کو فائلوں میں الجھانے کی کوشش کرنے لگا مگر ایک عجیب سی اداسی روح پر چٹکیاں بھر رہی تھی۔ سکندر کے گھر کے تمام حالات کسی فلم کی طرح اس کے ذہن میں تواتر سے چلنے لگے' تھک کر اس نے فائل بند کر کے ایک طرف کھسکا دی اور اپنا موبائل اور کی چین اٹھا کر آفس سے نکل آیا۔ وہ اپنا اعصابی دباؤ کم کرنے کے لیے کتنی دیر سڑکوں پر گاڑی بھگاتا رہا۔

اسمبلی ٹوٹنے کی خبر اسے یوسف نے دی تھی گو کہ اس کے لیے خوش آئند خبر تھی مگر اسے ایسی خاص خوشی بھی نہیں تھی جس پر وہ سارا دن مسرور رہتا۔ شاید فدا حسین ضرورت سے زیادہ خوش تھا تاہم اس نے فدا حسین سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی' اس وقت اس کا دل ایک عجیب سی خاموشی میں اترا ہوا تھا' ایسی خاموشی جو سمندر کی تہ میں ڈھلتی شام کے وقت چھا جاتی ہے' اوپر سے سمندر میں شور اودھم خیزی اور اندر مہیب سناٹا۔

ان خاموش لمحوں میں بڑے چپکے سے شہرینہ کا خیال ہلکی ہلکی دستک دینے لگا۔

وہ سر جھٹک کر ہنس دیا۔ پھر اپنی مخصوص شاپ پر رک کر سگریٹ لینے لگا جہاں پر موجود گاہکوں کے درمیان ملکی سیاست موضوع گفتگو تھی یکدم موضوع بدلا اور ایک بوڑھا اس گفتگو کو نیا رنگ دیتے ہوئے بولا۔

" بس میاں اب تو ہمارے بھی وارے نیارے ہونے والے ہیں ہم بھی ڈالروں میں کھیلیں گے' اوڑھنا بچھونا ڈالر ہوں گے۔"

" وہ کیسے ؟" متین بھائی اس بوڑھے کا طنز قطعی نہ سمجھ پایا۔ ابرو اچکا کر وضاحت طلب نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ ولید مسکراتا ہوا ادھر رکھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا

"وہ ایسے میاں! کہ ہم نے ایمان کا سودا کیا ہے' اسلام کا سودا کیا ہے' دین کا سودا کیا ہے' مجاہدوں کا سودا کیا ہے' کیا اس کے بدلے میں ہمیں اتنا بھی نہیں ملے گا۔"

جواباً متین بھائی ایک افسردہ سی سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئے اور مہارت سے پان پر کتھا لگانے لگے۔

" ارے کہاں ڈالر' ہمیں تو وہی دو وقت کی روٹی مشقتوں کے بعد ملتی ہے' ہمارے تو وہی بکھیڑے ہیں۔" ایک اور شخص نے منہ بنا کر اس بزرگ کی بات کی نفی کی یا شاید افسوس کا اظہار کیا۔

" شبیر بھائی شکر کریں کہ ہم دو وقت کی روٹی بھی کھا رہے ہیں اور جو کھا رہے ہیں یہ بھی نیک لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے' ان کی دعائوں کی وجہ سے۔ ان بھلے مانس لوگوں کی وجہ سے مسجدیں آباد ہیں' یہی اس ملک کی بقاء کے لیے دن رات دعائیں مانگتے رہتے ہیں' ورنہ یہ حکمران بھائی تو نوالے بھی چھین لینے کے درپے ہیں یہ کالی وردی میں بھیڑیں جگہ جگہ پھیلا دی ہیں جو چین سے کمانے بھی نہیں دیتیں۔" متین بھائی نے اس گفتگو میں مزید چونا کتھا لگایا۔

" دراصل ہمارے اندر سے اچھی صفات اور خوبیاں رخصت ہو چکی ہیں اور جب کسی رعایا کے اندر اچھی خوبیاں کوچ کر جاتی ہیں تو پھر انہیں حاکم بھی ویسے ہی ملتے ہیں جس کی وہ مستحق ہوتی ہے کہتے ہیں کہ حکمران عوام کا آئینہ ہوتے ہیں۔" ولید نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

" کہتے ہیں دنیا آٹھ چیزوں سے قائم ہے (۱) خدائے رحیم کی رحمت سے (۲) رسول کریم ﷺ کی رسالت سے (۳) حکماء کی عقل و حکمت سے (۴) عابدوں کی عبادت سے (۵) عالموں کی پند و موعظت سے (۶) بادشاہوں کی سیاست و عدالت سے (۷) بہادروں کی شجاعت و شہادت سے (۸) کریموں کی سخاوت سے۔"

" مگر یہ بھی تو ہے کہ اچھا حاکم آئے تو ہم سب سدھر جائیں گے۔" ایک لڑکا بدلحاظی سے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولا۔

ولید نے اس پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی۔ کندھے سے نیچے بالوں کے لچھے' سرخ جرسی' جس کے کھلے گریبان سے جھانکتی سونے کی موٹی زنجیر' کلائی میں زنجیر نما بریسلٹ کئی دوسرے بیٹھے لوگوں میں چند ایک نے اس پر ناگوار سی نظر ڈال کر رخ پھیر لیا تھا۔ شاید بزرگوں کے درمیان اس کی بدلحاظی کو سب ہی نے ناپسند کیا تھا۔

" یہی تو ہمارا المیہ ہے کہ ہم سب " اس ڈنڈے۔" کے منتظر ہیں جو ہمیں سدھار دے' ہم از خود سنورنا نہیں چاہتے' یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ

دار ہے۔" ولید نے یہ کہتے ہوئے اس پر ایک مسکراتی نگاہ ڈالی اور پھر رخ برابر بیٹھے باریش بوڑھے کی طرف کر لیا جو اس کی بات پر تائیدی انداز میں زور زور سے سر ہلا رہا تھا۔

" میاں پوری سولہ آنے سچی بات کہی ہے۔" پھر ایک ٹھنڈی پر ملال سانس بھرتے ہوئے تاسف سے سر ہلایا۔

" مگر ہم نے قرآن کو جزدان میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے' یا پھر اسے مدرسوں تک محدود کر دیا ہے' لوگ سمجھتے ہیں اسلام کا نام لینا صرف مولویوں اور علماء دین کا کام ہے' ہم تو دنیاوی مسائل میں گرفتار ہیں' غم روزگار میں پھنسے ہیں' اس نعرے سے ہمیں کیا کام' مگر غور کرو' ہمارے دین کی تو شان ہی یہی ہے کہ یہ ضابطہ حیات ہے' یہ انسان کو تزکیہ نفس بھی سکھاتا ہے اور تدبیر عمل کا ماہر بھی بناتا ہے۔ ایک مسلمان مذہب سے ہٹ کر دنیا گزار ہی کیسے سکتا ہے اور جب گزارتا ہے تو یہی حالات ہوں گے جو ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ حلال حرام کی تمیز نہیں ہے' قتل و غارت گری' بدکاری' بد نظری' چوری اور یہاں تک کہ پڑوسی بھی پڑوسی کے ہاتھ اور زبان سے محفوظ نہیں۔ بس میاں پھر تو یہ سب ہوگا' جب اسلام صرف مولویوں' علماء کے پاس رہ جائے گا' لوگ کسی

عالم کی صحبت میں بیٹھنے کو وقت کا ضیاع خیال کریں گے اور کیبل کے آگے دس دس گھنٹے گزار دیں گے۔"

اس بزرگ کی آنکھوں میں یہ سب کہتے ہوئے پانی اتر آیا' ماحول پر چند لمحے کے لیے مضمحل سی خاموشی چھا گئی' شاید ان کی باتیں دل پر اثر کر گئی تھیں' چند لمحوں کے بعد گفتگو کا یہ سلسلہ دوبارہ چل پڑا، موضوع مختلف رنگ بدلتا رہا۔ ولید وہاں سے اٹھا تو اس کے ذہن پر چھائی پراگندگی کسی حد تک زائل ہو چکی تھی' اس کا ذہن اپنی سوچوں سے آزاد ہو چکا تھا۔

وہ گھر آیا تو آغا جی نے اسے لونگ روم میں ہی گھیر لیا۔" برخوردار ذرا ادھر آکر بیٹھو۔" انہوں نے اسٹک سے اپنے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

مونا بھابی وہیں قالین پر بیٹھیں طوبیٰ کو دلیہ کھلا رہی تھیں اسے مارے بندھے آغا جی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتا دیکھ کر بے ساختہ ہنسی کو نہ روک سکیں' تاہم ہنسی کو زیادہ پھیلنے نہیں دیا۔

" تم نے مجھے جواب نہیں دیا ابھی تک۔" آغا جی نے چشمہ اتار کر میگزین کے اوپر رکھتے ہوئے اسے بہ نظر غائر دیکھا۔

" آپ نے سوال ہی کب پوچھا ہے محترم!" وہ کچھ اس احترام سے بولا مگر آغا جی کے گھورنے پر سر کھجانے لگا۔

" میں شیری کے امتحانات ختم ہوتے ہی تمہاری اور اس کی شادی کر دینا چاہتا ہوں۔"

" اوہ۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے چھت کی طرف سر اٹھایا پھر گردن ڈھلکانے کے انداز میں جھکاتے ہوئے بولا۔

" یعنی آپ چاہتے ہیں کہ اس کے امتحان ختم ہوتے ہی میرا امتحان شروع ہو جائے... اچھا۔ اچھا۔" جلدی سے آغا جی کی اسٹک کا سرا پکڑ لیا جو اس کی جانب بڑھی تھی اور قدرے ان کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

" بائی دی وے آپ نے اپنی لاڈلی پوتی کی رضامندی بھی لے رکھی ہے یا نہیں' سنا ہے وہ تو میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔"

" ہاں تو ٹھیک ہی تو ہے تمہاری شکل ہے بھی ایسی۔" بھابی جلدی سے بولیں تو اس نے گھور کر دیکھا۔

"کیا مطلب! کیسی شکل ہے۔"

"یہ تو تمہیں خود سمجھ لینی چاہیے' اگر اچھی ہوتی تو وہ کیوں منہ موڑتی۔"

"اف۔ یہ وسیم ایسے خاص موقعوں پر کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ جب اس کی بے زبان بیوی کی زبان پھول برساتی ہے۔" اس نے ایک طویل قسم کی آہ نما سانس کھینچی۔

"تم جل جل کر مر جائو' وہ مجھے بے زبان کہتے ہیں تو۔" بھابی زور سے ہنسیں۔

"کیا کرے بے چارا' رہنا بھی تو آخر اسے آپ ہی کے ساتھ ہے۔"

"دیکھیں دیکھیں آغا جی اسے۔" بھابی جھینپ کر چلائیں۔ وہ ہنسنے لگا۔

"تم مذاق میں میری بات اڑانے کی کوشش کر رہے ہو ولید!" آغا جی خفگی سے اسے دیکھنے لگے۔

"اگر آپ کہیں تو میں سنجیدگی سے آپ کی بات اڑا دوں۔"

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا پھر یکدم ہنس پڑا اور کرسی کے ہتھے پر دبائو ڈالتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"مجھے ایک دو ضروری فون کرنے ہیں' بس ذرا اس سے نمٹ لوں پھر آتا ہوں' وہ کیا کہتے ہیں کہ

"چلو شکر ہے کہ تمہارے منہ سے شہرینہ کے لیے حوروں کی تشبیہ تو نکلی۔" بھابی نے مسکرا کر چوٹ کی تو اس نے آغا جی کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے جواباً انہیں صرف گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں آیا تو اس کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت غزل محو رقص تھی۔

اس نے سب سے پہلے نہانے کا پروگرام مرتب کرتے ہوئے ٹرائوزر کی جیب سے والٹ اور کی چین نکال کر میز پر ڈالی اور جونہی موبائل اٹھایا اس کی بیپ بج اٹھی۔

وہ شرٹ کے اوپری بٹن کھولتے ہوئے رک گیا۔ "ہیلو!۔"

دوسری طرف آمنہ علی تھی اس کی آواز سنتے ہی اس نے تشکرانہ قسم کی سانس کھینچی تھی۔

"خیریت۔ میں بندہ ناچیز کیسے یاد آگیا تمہیں پھر سے۔"

اس نے "پھر سے۔" پر قدرے زور دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

" تم نے ہی ہمیں بھلا دیا ہے ہم نے تو نہیں بھلایا تمہیں۔" وہ ایک ادا سے بولی۔

" اللہ رے۔" ولید کو بے ساختہ قہقہہ لگانے کو دل چاہا۔

" یہ خاص نئی خبر ہے۔" وہ طنز کیے بنا نہ رہ سکا۔

"خیر تم بن رہے ہو، میں توقیر بھائی کی شادی کا انوی ٹیشن کارڈ خود تمہیں دینے آئی تھی جبکہ تم اتنے بے مروت ہو کہ پلٹ کر پوچھا تک نہیں، آخر ہمارا خونی تعلق بھی تو ہے نا۔" وہ ماضی کی وہی آمنہ علی لگ رہی تھی، استحقاق بھرا انداز، دوستانا پن لہجے میں جھلک رہا تھا گویا ان کے مابین کوئی تلخ لمحات آئے ہی نہ ہوں۔

ولید نے ایک گہری سانس بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سر باہر لٹکاتے ہوئے گردن کو اس طرح آرام دیتے ہوئے بولا۔

" چلو یاد کرنے کا شکریہ اور یاد دلانے کا بھی کہ تم لوگوں سے میرا خونی رشتہ ہے۔"

" زیادہ ہی خفا معلوم ہوتے ہو۔"

" نہیں خیر... میں دراصل خود تمہیں کنٹیکٹ کرنے والا تھا۔"

" آخاہ۔ زہے نصیب۔" اس کی آواز میں کھنک سی اتر آئی جو ولید محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

"ہم نے تو سنا تھا کہ " بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے۔" وہ اسی لب و لہجے میں بولی۔

" ہاں اور یہ بھی سنا ہو گا کہ انہیں" دل لگانے کی کوشش نہ کرنا۔"

جواباً وہ بولا تو آمنہ علی ایک خمار آلود قسم کی سانس بھرتے ہوئے فوراً بولی۔

" دل کا کیا ہے یہ تو جب کسی پر آجائے، کہتے ہیں کہ یہ تو اتنا پاگل ہوتا ہے کہ گدھے پر بھی آ جائے تو تعجب نہیں۔"

" اوہ ہاں... اچھا ہوا کہ تم نے جمشید خان سے دل لگا لیا، واقعی۔

دل کی کیا بات کریں، دل تو ہے پاگل جاناں۔" اس نے نیم استہزائیہ سانس بھری تو ایک پل کے لئے آمنہ علی چپ سی رہ گئی، شاید یہ جملہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

تاہم جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پا کر ہنسی یہ ہنسی سراسر کھسیانی سی تھی۔

" یہ جمشید خان کا ذکر کہاں سے آگیا' وہ میرا فرینڈ ضرور ہے مگر کم از کم اس سے دل لگانے کی حماقت میں نہیں کر سکتی' اب دل اتنا بھی پاگل نہیں ہوا کہ ... ۔"

" کہ حقیقتاً گدھے پر ہی آجائے۔" وہ اس کی بات اچک کر تائیدی انداز میں بولا تو آمنہ علی نے زبردست قہقہہ لگایا' مگر ولید اپنی اس بات پر قطعی مسکرایا تک نہیں بلکہ قدرے سنجیدگی کے ساتھ بولا۔

"بہت افسوس کی بات ہے' اینی وے۔ یہ تمہارا پرسنل افیئر ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

" کیا مطلب۔ کس بات کا افسوس ہے۔" اس نے چونک کر پوچھا مگر وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

" میں دراصل تمہیں پرسہ دینے کے لیے فون کرنے والا تھا۔ اسمبلیاں ٹوٹنے کا غم کوئی ہلکا غم تو نہیں ہوگا چچا حضور کے لئے۔"

یہ کہہ کر وہ دل ہی دل میں مسکرایا تھا۔ دوسری طرف مکمل خاموشی چھاگئی' مگر خاموشی کا یہ وقفہ مختصر رہا وہ اس دھچکے سے نکل کر ہلکی سی سانس بھر کر بے پروائی سے بولی۔

" سیاست میں ایسے اتار چڑھائو آتے رہتے ہیں۔ میرے لیے یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے' مے بی پاپا کو دکھ ہوا ہو' اینی وے توقیر شاہ کی شادی کے پروگرام میں کوئی چینج نہیں ہے تم آ رہے ہو یا مجھے ہی آکر تمہیں پکڑ کر لے جانا پڑے گا۔" وہ بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل کر اپنائیت بھری خفگی کے ساتھ بولی۔ ولید دل ہی دل میں اس کو سراہے بغیر نہ رہ سکا' آخر کو وہ سیاست دان کی بیٹی تھی۔

" بڑے بے مروت ہوتے جا رہے ہو ولید حسن شاہ۔" وہ مزید گویا ہوئی۔

"آہ۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تو جواباً آمنہ علی کی کھنک دار ہنسی مائوتھ پیس میں گونج کر رہ گئی۔

" بڑا شاعرانہ موڈ ہو رہا ہے۔"

" ہوں۔" ابھی تمہارے فون آنے سے پہلے میں بہت اچھی غزل گنگنا رہا تھا۔"

" ویری امیزنگ۔" اس نے گویا حیرت کا بھرپور اظہار کیا۔

" بائی دے وا تمہیں شاعری سے دلچسپی کب سے ہوگئی اور شعر یاد بھی رہنے لگے۔" اس کی حیرت حقیقی تھی۔

ولید کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹ بکھر آئی۔

" جذبہ محبت آپ کو خود بخود شاعری سے قریب کر دیتا ہے میرا خیال ہے عشق اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یا نہیں۔"

" ہاں۔ مگر یہ بات تمہاری سمجھ میں بڑی دیر سے آئی۔ بائی داوے وہ خوش نصیب کون ہے جس نے تمہیں اس مقام تک پہنچایا۔"

اس کا انداز استحقاق بھرا تھا جیسے وہ ابھی اسی کا نام لے دے گا۔

ولید نے ذرا سا توقف کیا پھر ہلکے سے ہنکارا بھرتے ہوئے بولا۔

" شہرینہ۔ جس سے تم مل چکی ہو' جہانگیر احمد خان کی بیٹی میری منگیتر۔ اور میری پہلی چوائس۔" اس کے انداز میں اعتماد تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ادھر آمنہ علی کے لیے یہ دھچکا یقیناً اعصاب شکن ثابت ہوا تھا وہ ولید کے سامنے موجود نہ تھی مگر اس کی سانسوں کے اتار چڑھائو سے وہ اس کے اشتعال کو محسوس کر رہا تھا۔

اچانک وہ پھنکار سے مشابہ لہجے میں بولی۔

" تو تم نے مجھے اتنا عرصہ دھوکے میں رکھا چیٹر انسان!"

" کیسا دھوکا۔"

" تم نے میرے ساتھ رہتے ہوئے مجھے کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میں تمہاری پسند نہیں ہوں' تمہاری محبت نہیں ہوں' یو آر چیٹر ولید حسن یو آر..... ۔"

" جسٹ اے منٹ آمنہ علی شاہ۔" وہ جلدی سے بولا۔

" میں نے کبھی تم سے عہد وپیماں نہیں کیے' نا تمہیں یہ احساس دلایا کہ تم میری پسند ہو یا محبت' یہ محض تمہاری خوش فہمیاں اور غرور ہے کہ تم جس پر ہاتھ رکھ دو' جس پر نظر ڈال لو وہ شے تمہاری ہو جائے' نہیں۔ کسی سے ملتے رہنے یا دوستی نبھانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ

ہمیں اس سے محبت بھی ہو' اس طرح تو مجھے سینکڑوں لوگوں سے ایسی ہی محبت ہونی چاہیے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے ایک ہلکی سی سانس بھری۔

"اور ہمارے درمیان تو وہ نام نہاد دوستی بھی اس روز مسخ ہو چکی تھی جب تم نے مجھے ایک غریب غربا' لاوارث' یتیم' یسیر شخص سمجھ کر رویہ بدل لیا تھا۔"

" وہ محض غلط فہمی تھی اور ایسے حالات بھی تم نے ہی پیدا کیے تھے۔" وہ اسی برہمی سے گویا ہوئی۔

" بے شک۔ میں نے اپنے حالات تم پر واضح نہیں کیے مگر اس کے پیچھے تمہیں آزمانا مقصود نہیں تھا۔ وہ تو اتفاقاً تم ہی وقت اور حالات کے آگے کھل گئیں' اینی وے ہماری رشتہ داری میں تو اب بھی کوئی شک نہیں ہے تم سے اب بھی میرا خونی رشتہ قائم ہے۔"

" پتہ نہیں ہمارا خون تمہارے خون میں کیسے شامل ہو گیا۔" وہ طنز سے پھنکاری پھر تضحیک آمیز انداز میں ہنس کر بولی۔

" تمہاری ماں کا گندا خون تو آخر کو ملنا ہی تھا ناں ہمیں' کیسے تمہارے اندر خاندانی خون پنپ سکتا ہے۔"

جواباً ولید نے موبائل کو یوں ترحم بھری نظروں سے دیکھا گویا وہ آمنہ علی ہی ہو۔

" کہتے ہیں کہ غصے میں انسان اس پر کٹے کبوتر کی طرح ہو جاتا ہے' نہ اڑ سکتا ہے نہ اڑنے کی سوچ سکتا ہے' پھر اس کا سارا غصہ نظروں اور جملوں پر نکلتا ہے' وہ سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتا ہے مگر پھر لفظ بھی بے دم وہ کر گر پڑتے ہیں۔"

اس کا ٹھنڈا لہجہ پچکارنے والا تھا' مزید اسی پر سکون لہجے میں گویا ہوا۔

" میری ماں پر کیچڑ اچھالنے سے مجھے اس لیے تکلیف نہیں ہو گی کہ ناحق شناس لوگ انہیں بھلا جان بھی کیسے سکتے ہیں' میرا باپ جوہر شناس حق شناس شخص تھا اور جب اس نے میری ماں کو اپنایا تو یقیناً اس میں کچھ دیکھا ہی ہو گا' وہ پتھر اور ہیرے میں تمیز کرنے والی آنکھ رکھتا تھا۔"

دوسری طرف سے آمنہ علی نے لائن ڈس کنکٹ کر دی۔ وہ ہلکے سے ہنس دیا اور ایک ہنکارا بھر کر موبائل آف کیا اور اس پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر اسے تپائی پر ڈال دیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دباتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اسے آمنہ علی پر غصہ نہیں ترس آرہا تھا' وہ اس کی ماں پر کیچڑ اچھال کر اسے گدلا نہیں کر رہی تھی بلکہ چاند پر تھوکنے کی کوشش کر رہی تھی جس کی روشنی اس کی اونچی حویلی اور کوٹھی کی بند دیواروں سے پہلو بچا کر کھلے دالان میں اتر گئی تھی۔

اس کی ماں کیا تھی' کوئی اس کے دل میں جھانک کر دیکھتا' اس کے باپ کی آنکھوں میں پڑھتا۔

یکدم اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔

انسان جتنا بھی بڑا ہو جائے ماں کا تصور۔اسے ویسا ہی بچہ بناڈالتا ہے۔

بسورنے والا بچہ۔

ماں کو چھونے' اس کی گود میں سر رکھ کر نخرے دکھانے والا بچہ' دنیا جہاں کے جھمیلوں سے تھک کر اس کی نرم آغوش میں آنکھیں بند کر کے پر سکون ہو جانے والا بچہ۔

وہ آنکھیں یونہی موندے موندے غنی خان کی نظم" مورے۔" یعنی" ماں۔" گنگنانے لگا۔

کر چہ خاورو کنبے دے پت وجود ستا مورے

ماتہ یار دی ھخہ شان ستاسترہ کے تورے

مورے ستالا سونہ مانہ دی ھیر

چہ تکلیف کبن بہ زمانہ ئوچا پیر

زما ھر وئی تہ بہ تاکاوہ کریان!

(اے ماں اگرچہ اب تمہارا جسم مٹی کے اندر دفن ہے لیکن مجھے وہ تمہاری کالی آنکھیں یاد ہیں اور تمہارے ہاتھ جو ہر تکلیف میں میرے گرد لپٹے ہوئے تھے' میں ابھی تک نہیں بھولا اور جب میں" ماں۔" پکارتا تو تم کہتی تھیں کہ میں تجھ پر قربان اور جب میری آہ نکلتی تو زیادہ" درد۔" تمہیں ہی پہنچتا)

فون کی مسلسل بجنے والی گھنٹی نے اس کے خیالات تصورات کے تسلسل کو ایک چھناکے سے توڑا۔

اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اٹھ کر ریسیور اٹھایا دوسری طرف سکندر تھا۔

" ولید کیا تم فارغ ہو اس وقت۔" وہ اس کی آواز سنتے ہی بولا۔

" اس وقت۔" اس نے آستین جھٹک کر رسٹ واچ پر ایک نگاہ ڈالی پھر سر ہلایا۔

" ہوں کوئی خاص کام تو نہیں ہے فارغ ہی سمجھو۔"

" تو بس گھر چلے آئو اور سنو شہرینہ کو بھی ساتھ لیتے آنا۔"

"شہرینہ کو۔ خیریت تو ہے۔" وہ متعجب ہوا۔

" ہاں خیریت ہی ہے۔" ایک ہلکی سانس بھرتے ہوئے سکندر نے لائن کاٹ دی۔

ولید نے قدرے تشویش کے عالم میں ریسیور کریڈل پر ڈالا۔

اس کی چھٹی حس اسے خبردار کرنے لگی کہ معاملہ تانیہ کے ہی متعلق ہے' صبح کا واقعہ پوری طرح ذہن میں تازہ ہو گیا۔ یکدم اسے سکندر کی ذہنی حالت سے خوف آنے لگا۔

" اس نے کہیں کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا لیا ہو۔" خوف کی لہر اس کے تن بدن سے اٹھی۔ یوں بھی وہ جن حالات سے نبرد آزما تھا۔ وہاں کہیں اور کسی وقت بھی ذہن انتہا پسند ہو کر کوئی بھی فیصلہ کر سکتا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اسے تانیہ کی سسکیاں اور بے وقوفیاں یاد آنے لگیں۔ اس نے جھک کر تپائی سے گاڑی کی چابی اور موبائل اٹھایا اور کمرے سے باہر آگیا۔

X...X...X

شہرینہ اپنی وارڈروب تقریباً خالی کیے سارے کپڑے بیڈ پر پھیلا چکی تھی مگر بھابی کا خیال تھا اس میں کوئی جوڑا ایسا نہیں جو وہ کل نادیہ کی رسم حنا میں پہن سکے۔

" آپ کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے' یہ دیکھئے کتنا مناسب سوٹ ہے کل کے لیے۔"

"اسے رکھو ایک طرف اور میری بات صرف اتنی سی ہے کہ اگر تم دو جوڑے نئے لے لو گی تو کیا تمہیں مالیخولیا ہو جائے گا۔" بھابی نے ہینگر کیا سوٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر ایک طرف ڈالا اور باقاعدہ گھورا۔

" ایک کیا دس جوڑے نئے خرید لیتی مگر...۔" وہ ایک مضمحل سی سانس کھینچ کر بالوں کو لپیٹ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

" مگر کیا۔"

"اس وقت سکندر بھائی کے گھر کے حالات وہ نہیں جو ہونے چاہئیں' کسی بھی خوشی کا وہاں نام ونشان نہیں ہے۔ نومی بن بتائے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ آنٹی کی طبیعت خراب ہے۔ نادیہ آپی اتنی اداس ہیں۔ تانیہ کا اپنا غم ہے۔ اس پر عظمیٰ کا اغوا اور خود بتایئے کہ ان حالات میں خوشی سے کس طرح سلیبریٹ کیا جائے اور جب اپنا دل بھی اداس ہو۔"

آخری جملہ اس نے آہستگی سے کہا اور پلکیں جھکا لیں۔

" تمہارے دل کا علاج تو خیر ولید کرلے گا اور ایسا کرلے گا کہ تم..." بھابی کوئی شرارتی جملہ کہتے کہتے رک گئیں پھر ایک دم ہنس پڑیں۔

" آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔" وہ ناراض بچے کی طرح انہیں گھورنے لگی۔

" دیکھو شیری! تم کیا سمجھتی ہو' سکندر کے گھریلو حالات سے میں واقف نہیں ہوں' مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم سب ماتمی لباس پہن کر شادی کی رسموں کو ماتمی رنگ دیں اور جا کر نوحہ پڑھنے بیٹھ جائیں' تمہیں اس گھر میں مزید اداسیاں بھرنے کی بجائے سب کا

دل بہلانا چاہئے' تانیہ کو پکڑو اور اسے شاپنگ پر لے جاؤ۔ وہ جو منہ لپیٹ کر پڑی ہے نا اسے کم از کم اس تاریک قبر سے نکالو بجائے تم منہ بسور کر بیٹھ جاتی ہو۔"

بھابی کی اتنی لمبی تقریر کا اسے اثر تو ہوا' اس نے سوچتی نظران پر ڈالی پھر کسی خیال کے تحت سر ہلایا۔

" خیر۔ کل کے لیے تو یہ سوٹ مناسب رہے گا البتہ بارات کے لیے نیا خرید لوں گی۔ اور پرسوں ان کے سسرال میں مہندی لے کر جانا ہے اس میں میرا خیال ہے یہ اچھا رہے گا۔"

اس نے نیلے رنگ کا سفید کڑھائی والا سوٹ اٹھایا مگر بھابی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر جھنجھلائی۔ پھر زور سے ہنس دی۔

" چلیں آپ کی خوشی کے لیے ابو کی جیب ہلکی کر ڈالتی ہوں۔"

"ابو کی کیوں؟ ولید کی بھی کبھی کر ڈالو' بڑی فکر ہے اس کی جیب کی تمہیں۔" وہ شرارت سے بولیں۔

" کیوں بھئی یہ میری جیب نے کیا گناہ کیا ہے جس کے پیچھے آپ ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہیں۔" ولید نے اندر جھانکا' بھابی کا جملہ اس کے کانوں میں پڑا تھا۔

" کبھی تو اسے شاپنگ کرا دو' دو روپے کی ایک چیز لا کر نہیں دی آج تک۔اور ہو وڈیرے کے بیٹے۔" بھابی نے چوٹ کی۔

" کبھی کیوں؟ یہ حکم کرے تو روز ہی شاپنگ کروادوں بلکہ ایک شاپنگ سنٹر اس کے نام لکھوا دوں۔"

" اللہ رے۔" بھابی بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور خاصے تمسخرانہ انداز میں سر کو جنبش دے کر شہرینہ کی طرف دیکھا۔

" سنا تم نے یہ موصوف کیا کہہ رہے ہیں؟لوہا گرم ہے چوٹ لگا دو ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔"

"ماشااللہ۔پورے پانچ سال کا تجربہ بول رہا ہے۔" ولید نے پھر جوابا چوٹ کی وہ کھسیا سی گئیں۔

" وہ کہاں تم سے کم ہیں' پانچ سال میں پانچ بار ہی مشکل سے شاپنگ پر لے گئے ہوں گے۔"

"پانچ بار۔ تعجب ہے میرا خیال ہے وسیم اتنا احمق تو نہیں ہو سکتا' اسے تو ایک بار ہی لے جانے کے بعد توبہ کر لینی چاہیے' خاصا مضبوط اعصاب کا بندہ ہے۔"

اس نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔پھر بھابی کے چہرے پر نگاہ ڈال کر یکدم ہنس دیا۔پھر یکدم خیال آنے پر شہرینہ کی طرف دیکھا جو ان دونوں کی اس گفتگو سے خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کے لیے وارڈروب میں کپڑے رکھ رہی تھی۔اس نے وارڈروب کا نیم وا دروازہ اپنی طرف پورا کھول دیا۔

" شیری!' میرے ساتھ چلو۔بہت ضروری کام ہے۔"

" اے اے کیا مطلب ہے؟" بھابی پوری طرح چوکنی ہو گئیں۔

" کس بات کا مطلب۔" اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔

" اس کو ساتھ لے جانے کا۔"

"کیوں؟آپ اس کی باڈی گارڈ لگی ہیں کہ آپ کو بتائے بنا میں اسے کہیں لے جا نہیں سکتا۔"

"تمہارا کوئی بھروسہ بھی تو نہیں ہے' کیا کر ڈالو۔" بھابی اسے چڑانے کو بولیں۔

"کاش۔کچھ ایسا کر سکتا۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی نظریں ملنے پر سٹپٹا کر ہینگر کیے سوٹ کی سلوٹ ٹھیک کرنے لگی۔

"مثلاً کیا نہیں کر سکتے؟" بھابی مسکراہٹ دبا کر بڑی سنجیدہ بن کر بولیں اور جواباً ولید کا دل چاہا ان کا سر پیٹ لے۔نہیں تو کم از کم اپنا ضرور پیٹ لے۔

"مثلاً یہ کہ اسے کسی اونچے پہاڑ پر لے جا کر دھکا نہیں دے سکتا' بیچ سمندر میں ڈبو نہیں سکتا' اس کا چرغا بنا کر کھا نہیں سکتا' اس کا جوس بنا کر پی نہیں سکتا۔" وہ کچھ اس انداز سے چڑ کر بولا کہ بھابی اپنا بے ساختہ قہقہہ نہ روک سکیں۔

"دیکھ لیجئے کتنی نیک خواہشات ہیں ان کی۔"شہرینہ جھلس ہی تو گئی۔(یہ شخص مروتاً بھی دل خوش کر دینے والے جملے نہیں بول سکتا تھا۔)

"اس سے بھی زیادہ نیک خواہشات اور خیالات ہیں یہ کسی اور دن بتائوں گا۔فی الحال تو میرے ساتھ چلنے کی تیاری کرو' بلکہ ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہی ہو' اسی طرح چلی آئو۔" اس نے اپنا موبائل جیب میں ڈال کر اس کی کلائی پکڑ کر اس کے ہاتھ سے سوٹ لے کر بیڈ پر ڈال دیا۔

"مگر مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ کہیں بھی۔"وہ جھنجلا گئی۔

"میں تمہیں اغوا کر کے نہیں لے جا رہا ایک بہت ضروری کام ہے۔"اب کے اس نے خاسی سنجیدگی سے کہا۔

"کوئی ضروری کام وام نہیں ہے یوں کہو کہ بہانے سے لے جا رہے ہو۔"بھابی اب بھی اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"بہت دیر بعد کوئی بات آپ کی سمجھ میں آتی ہے چلیں دیر آید درست آید۔" اس نے بھنویں اچکا کر ہلکی مسکراہٹ اچھالی اور شہرینہ کا ہاتھ پکڑے دروازے سے نکل گیا۔

"ولید تم۔" بھابی پیچھے لپکیں' مگر وہ جاتے جاتے دروازہ بند کر گیا۔وہ بند دروازے کو گھورتی رہ گئیں۔

X...X...X

شہرینہ گاڑی میں بیٹھ کر مضطرب انداز میں اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"آخر مقصد کیا ہے آپ کا' اس طرح کہاں لے جا رہے ہیں مجھے"

" افق کے اس پار' ندیا کنارے' خوشیوں کے دیس میں۔" ادھر اطمینان سے جواب آیا۔

"میں آپ کی واہیات گفتگو سننے نہیں بیٹھی گاڑی میں۔" اس کی پیشانی تپ گئی۔

"حیرت ہے۔ حالانکہ یہ تو نہایت شائستہ انداز ہے گفتگو کا۔" اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا' پھر اس کے مسلسل خفگی بھرے انداز میں گھورنے پر وہ اس کی طرف ذرا سا جھکا۔

مدھم سی سرگوشی کسی مضراب کی طرح اس کے نازک دل کے تاروں پر جا لگی۔ اس کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔ وہ سرعت سے نظروں کا زاویہ بدل گئی اور ونڈ اسکرین پر نگاہیں جما کر اپنے سامنے گاڑیوں کے جم غفیر کو دیکھنے لگی۔ وہ مسکراہٹ دباتا اس کی طرف کچھ دیر دیکھتا رہا۔

"آپ حد سے زیادہ بدتمیز انسان ہیں۔" وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے دبے دبے غصے کے ساتھ بولی۔

"اللہ گواہ ہے میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی میں نے تو صرف... اچھا... اچھا۔" وہ اپنی مسکراہٹ سمیٹ کر جلدی سے ہاتھ اٹھاتا بولا۔ پھر قدرے سنجیدگی کے ساتھ بولا۔

"میں دراصل اپنا ذہن ریلیکس کرنا چاہ رہا تھا' بہت ٹینشن میں ہوں' سکندر کا فون آیا تھا اس نے مجھے بلایا ہے۔" گاڑی سگنل پر روکتے ہوئے اس نے یہ کہہ کر گاڑیوں کے بہتے ریلے کو دیکھا۔

" اس نے یہ بھی کہا کہ شہرینہ کو بھی ساتھ لیتے آنا۔"

"کک۔ کیوں بلایا ہے انہوں نے۔" اس کی ساری حسیات گویا بیدار ہو گئیں۔" تت تانیہ تو ٹھیک ہے نا۔"

"خدا کرے ٹھیک ہی ہو۔" ایک دبی دبی سانس اس کے سینے سے نکل گئی۔ سگنل کھلتے ہی اس نے رش انداز میں گاڑی آگے بڑھا دی۔

"آپ نے پوچھا نہیں سکندر بھائی سے کہ کیا مسئلہ ہے۔"

"اب جا ہی تو رہے ہیں پتہ چل جائے گا۔"

وہ ولید کو دیکھ کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور پیشانی پر ابھری لکیریں اس اے اندرونی خلفشار کی ترجمانی کر رہی تھی۔ شہرینہ کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہونے لگا' اسے لگا کوئی ایسی بات ہے ضرور جو ولید اس سے چھپا رہا ہے سکندر کے گھر کے سامنے اس نے گاڑی روکی تو وہ مضطربانہ انداز میں بولی۔

"آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔۔ ہے نا۔۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔ مگر ولید سنی ان سنی کرتا ہوا اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ پھر ایک دبی دبی سانس خارج کرتے ہوئے خود بھی نیچے اتر گئی' اسے اتنا تو پتہ تھا کہ یہ شخص جتنی بات کرنے یا بتانے کی ہو گی اتنی ہی بتائے گا۔ چاہے وہ لاکھ ناراض ہو۔

وہ دھڑکتے دل میں ہزار وسوسے لیے اندر آئی تو سکندر صحن میں بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر گہرا سکوت بکھرا ہوا تھا جو کسی استقامت یا طمانیت کا ہرگز نہیں لگ رہا تھا بلکہ غصے او رخود آزاری کی سی کوئی کیفیت تھی جس سے اس لمحے وہ نبرد آزما تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کوئی ایسا غم تھا جو زہر بن کر اس کی رگوں میں خون کے ساتھ دوڑ رہا تھا جس کی غمازی اس کا سرخ چہرہ کر رہا تھا۔

وہ اماں کے تخت کے پاس ہی رک گئی جبکہ ولید اس کی طرف چلا گیا۔

ان دونوں کو دیکھ کر سکندر کے چہرے کی سرخی کچھ اور دبیز ہو گئی۔ وہ کرسی سے اٹھا' ولید پر اس کی نظریں یوں مرکوز تھیں جیسے کوئی ملال' کوئی تاسف اسے دیکھ کر اور بڑھ گیا ہو۔ پھر ایک اچٹتی سی نظر اس نے شہرینہ پر بھی ڈالی اور بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا ولید کے نزدیک چلا گیا۔

"آؤ بیٹھو۔" اس نے بڑے بوجھل سے انداز میں تخت کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا مطلب تھا وہ وہیں بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔

"کیا بات ہے سکندر! تم ٹھیک نہیں لگ رہے ہو مجھے۔"

ولید نے اس کے کندھے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو اسے لگا سکندر کا مضبوط بدن خفیف ارتعاش کا شکار ہوا ہو یونہی جیسے کوئی سمندر کی اندرونی پرجوش لہر اوپری ساکن سطح کو ہولے سے چھو جائے۔

"تم فیاض کو تو جانتے ہو نا۔ میرے ہی آفس میں جو کام کرتا ہے۔۔" وہ اس کی بات نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

"فیاض!" ولید نے ذہن پر زور دیا اور یاد آنے پر سر کو اثباتی جنبش دی۔

"اوہ ہاں بڑا شریف اور اچھا لڑکا ہے۔"

"ہاں شریف ہے' پڑھا لکھا ہے' بس غریب ہے مگر میرا خیال ہے کہ اس کی شرافت اس کی غربت پر حاوی ہے۔ مگر خیر اتنا غریب بھی نہیں ہے اچھا خاصا کما لیتا ہے' عزت سے گھر چلا رہا ہے اپنا۔ اس کی ایک بوڑھی ماں ہی ہے نا۔۔"

ولید کو لگا سکندر بات سے پہلے کوئی تمہید باندھ رہا تھا اور فیاض کا ذکر اس وقت کیا معنی رکھ سکتا تھا۔ وہ سکندر کے چہرے پر پھیلے اس ٹھہراؤ اور سکوت کا از سر نو جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

" تمہیں یہ اس وقت فیاض..."

" دراصل میں اسی فیاض سے تانیہ کی شادی کر رہا ہوں۔"

اس نے بہت ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا جیسے کوئی معمول کی بات کر رہا ہو۔

"کل نادیہ کی مہندی والے روز اس کا نکاح ہے اور نادیہ کی رخصتی کے ہمراہ اس کی بھی رخصتی ہے۔ فیاض کے اپنے کوئی عزیز رشتہ دار زیادہ ہیں نہیں اور جو ہیں وہ سب دوسرے شہر میں ہیں۔ خود اس کی والدہ بھی دوسرے شہر سے آئی ہیں' بس یہ سب سادگی سے ہو گا۔"

اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ کہہ کر اس نے شہرینہ کی طرف دیکھا۔

"میں چاہتا ہوں تم تانیہ کو آنے والے وقت کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لو' جو کام ایک دن ہونا ہی ہے تو پھر کل ہی کیوں نہیں۔"

" مگر سکندر یہ جلد بازی نہیں ہو گی کیا۔" ولید مضطربانہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ سکندر دھیرے سے ہنسا اور بولا۔

" میرا تو خیال ہے کہ میں نے دیر کر دی۔ یہ کام تو مجھے اس روز کر لینا چاہیے تھا جب میرے علم میں ساری بات آچکی تھی' اس رسوا کن مرحلے کا میں نے انتظار ہی کیوں کیا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ولید کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جن میں ملامت تھی' شکوہ تھا۔ ولید نظریں چرا گیا۔ اس کا مطلب تھا بات ساری سکندر پر کھل چکی تھی۔ ولید کو ندامت کے ساتھ

حیرت بھی ہوئی۔تاہم اس نے ان غیر ضروری سوالات سے اجتناب کرتے ہوئے بس ندامت سے اتنا کہا۔

"آئی ایم سوری سکندر! مجھے تمہیں بتادینا چاہیے تھا' میں حقیقتاً شرمندہ ہوں یقیناً یہ بات تمہیں ہرٹ کر رہی ہے۔"

"نہیں خیر۔" سکندر نے جلدی سے سر نفی میں ہلایا اور پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"میں تو تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری عزت کی آخری دیوار کو سنبھال لیا' جو اندر سے تو خستہ ہو چکی ہے مگر بظاہر دنیا والوں کے سامنے سلامت دکھائی دے رہی ہے۔"

اس کا لہجہ سراسر اپنی ہنسی اڑانے والا' خود آزار قسم کا تھا۔ولید نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تمہارے اس فیصلے کی مجھے تائید کرنی چاہیے یا مذمت۔میں تو ساحل پر کھڑے اس شخص کی مانند ہوں جو سمندر کی لہروں سے نبرد آزما شخص کی کیفیات کو نہ سمجھ سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ یاس بھرا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"شہرینہ پلیز!" سکندر نے ایک تھکی تھکی سانس خارج کرتے ہوئے شہرینہ کو دیکھا جو صدمے اور رنج سے گم صم کھڑی تھی۔

وہ بھی ولید کی طرح دو طرفہ احساسات میں گھری ہوئی تھی۔ایک یہ کہ سکندر کا یہ فیصلہ اسے ایک انتہا پسند اور سخت بے مہر شخص کا انتہائی ظالمانہ فیصلہ لگ رہا تھا جبکہ ایک طرف عقل سوچ رہی تھی کہ سر دست اس سے بہتر فیصلہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا چونکہ سکندر اس گھر کا سربراہ تھا اور جس طرح گھر حالات کی گردش میں تھا وہاں آنے والے لمحے کا کوئی بھی سخت جھونکا اس آشیانہ کی بنیادوں تک کو ہلا سکتا تھا' یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا مگر بہر طور طوفان سے بچاؤ کی تدابیر ہر کوئی ہی کرتا ہے اور یہی عقل مندی کا تقاضا ہے۔خاص کر عزت کو سینت سینت کر رکھنے والا' عزت کو ہی پہننا اوڑھنا سمجھنے والے خاندان کا سربراہ ایسے حالات ہیں اس سے بھی سخت اقدام کرے تو تعجب خیز یا ظالمانہ بات نہیں ہوتی۔

تاہم ایک دل گرفتگی سی اس کی روح کو کاٹ گئی۔اس نے سکندر کے تنے ہوئے چہرے پر ایک متاسفانہ نگاہ ڈالی۔بہت کچھ کہنے کی خواہش اندر ہی اندر پھڑ پھڑا گئی۔وہ سر جھکا کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

X...X...X

ساتھ اتنا سہی کوئی دے لے

کوئی میری صلیب خوں گشتہ

اپنے کندھوں پہ دو گھڑی لے لے

تانیہ کے وجود پر ایسا سناٹا بکھرا ہوا تھا جیسے میدان جنگ میں ہارے ہوئے لشکر پر ہوتا ہے۔

احساس جرم

احساس محرومی

اس انتہا کی ذلت کا خیال روح پر بھاپ کی طرح پڑ رہا تھا۔

اسے لگ رہا تھا کہ وہ یکدم خالی خالی ہو گئی ہو' اندر باہر ہر طرف سے وہ کھل کر رونا چاہ رہی تھی مگر آنکھیں خشک اور بنجر ہو رہی تھی۔

شہرینہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اسے لگا دل کے جنگل کے بجھتے شعلوں میں ذرا سی جان پڑ گئی ہو اور گویا تڑاتڑ ہر چیز اس آگ کی نذر ہوئی جا رہی ہو اور وہ بھی جانتی تھی کہ یہ آخری آگ ہے اس کے بعد کچھ بھی نہ ہو گا۔

سب سنسان ویران اڑتی راکھ کا میدان رہ جائے گا۔

وہ کتنی دیر چپ کی دہکتی بھٹی میں سلگتی رہی تب شہرینہ اس کی ذہنی حالت سے گھبرا کر ہلکے سے رو دی۔

" تانی! تم نے مجھے کیوں کچھ نہیں بتایا۔ میں سکندر بھائی کو روک لیتی ایسا کرنے سے۔"

" کس برتے پر۔" وہ ہلکے سے ہنسی۔ اس ہنسی میں ملال اور محرومی چیخ رہی تھی۔ شہرینہ کو اپنا دل اندر ہی اندر پھٹتا محسوس ہوا۔

" تم خوش جو نہیں ہو۔ یہ زیادتی ہے تمہارے ساتھ۔ بے شک وہ اس گھر کے سربراہ ہیں مگر ایسا فیصلہ کرتے ہوئے انہیں تمہارے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔"

"کون سے جذبات۔ میرے سارے خواب تو اکبر شاہ نے نوچ لیے۔ اب اس دل میں سوائے شرمندگی کے بوجھ کے کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے دیوار پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

" ان کا یہ فیصلہ میرے لیے اب کوئی معنی نہیں رکھتا۔" اس کی بند آنکھوں کے اندر سے پانی تیرتا ہوا باہر نکل آیا۔ شاید کوئی سوتا اب بھی باقی رہ گیا تھا یا پھر ان زمینوں میں شہرینہ جیسی غمگسار دوست کی تسلی آمیز انگلیوں نے پھر سیرابی بھر دی تھی۔

نادیہ آپی جانے کب بے آواز کمرے میں آئی تھیں، کچھ دیر کھڑی رہیں پھر ڈھیلے قدموں سے چلتیں بیڈ کے کنارے پر ٹک گئیں۔

" سکندر کا یہ فیصلہ انتہا پسندی پر مبنی ہے نہ جذبات پر۔ وہ زمانہ شناس ہے، اس نے ساری عمر کاغذ صرف سیاہ ہی نہیں کیے، حالات کی سختیوں، سیاہیوں کو قریب سے دیکھا اور برتا ہے۔ کبھی کبھی وقت خود ہی فیصلہ بن کر ہمارے پاس آتا ہے، اگر ہم بڑھ کر اسے قبول نہ کریں تو یقینی نقصان ہماری جھولی میں آگرتا ہے، جس طرح ریلوے لائن عبور کرنے میں ایک لمحے کا زیاں آپ کی باقی ماندہ زندگی کو نہیں بچا سکتا۔"

نادیہ آپی کی آواز میں وہی ٹھہراؤ تھا جو ہمیشہ ان کی ذات کا خاصہ رہا تھا، پھر ایک ہلکی سی افسردہ سی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔

" عظمیٰ کے ساتھ جو کچھ ہوا کیا وہ ہمارے سامنے نہیں ہے؟ حالانکہ عظمیٰ تو سراسر بے قصور تھی۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے دانستہ تانیہ کی طرف دیکھنے سے گریز کیا مگر تانیہ نظریں چرا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ پھر اٹھ کر کھڑکی میں کھڑی ہو کر باہر جھانکنے لگی۔

کمرے میں کچھ دیر مضمحل سی خاموشی طاری رہی پھر نادیہ آپی ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولیں۔

" کبھی نرمی سے وہ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو سختی کی صورت میں دور ہو سکتی تھیں۔"

تانیہ نے بے ساختہ تڑپ کر ان کی طرف دیکھا تھا اور روہانسی ہو کر ان کے قریب آکر بیٹھ گئی ۔

"آپی! میں سکندر بھائی کے اس فیصلے سے انکاری نہیں ہوں، مجھے تو صرف اپنی ذلت کا دکھ کھا رہا ہے میں اس گھر میں سر اٹھا کر جینے کے قابل نہیں ہوں، میں تو سکندر بھائی کے سامنے نظریں نہیں اٹھا سکتی۔ ان فیصلے کے خلاف کیا آواز اٹھاؤں گی۔ میں تو کہتی ہوں وہ مجھے ایک بار ہی مار ڈالیں، میرا گلہ اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیں میں اف نہیں کروں گی۔"

اس کی آنکھیں شدت غم سے دہکنے لگی تھیں۔ نادیہ آپی نے تڑپ کر اس کی کمر کے گرد بازو مائل کر دیے، وہ جس کرب سے گزر رہی تھی نادیہ اور شہرینہ انجان نہ تھیں۔ اس کا غم زدہ لہجہ اس کی ضبط کی حدوں کو چھوتا ان دونوں کو بے طرح دکھی کر گیا۔

"آنے والے لمحات ہو سکتا ہے ہمارے لیے نا قابل تلافی نقصان لے آئیں، ہمیں موجودہ حالات سے سمجھوتا کر لینا چاہیے۔ تانی! اسے اپنے لیے، اس گھر کے لیے بہتری سمجھو، بھائی سے زیادہ باپ ہے وہ تمہارا اور باپ کبھی اولاد سے نفرت نہیں کر سکتے، ان کے لیے برا نہیں سوچ سکتے۔ دراصل نومی نے انہیں بری طرح توڑ ڈالا ہے، تم جانتی ہو ہم کن حالات سے دوچار ہیں اور پھر عظمیٰ کے ساتھ ہونے والے حادثے سے وہ بری طرح خوفزدہ ہو چکا ہے، اسے غلط مت سمجھو، میں فیاض کی فیملی کو بھی جانتی ہوں۔ بہت اچھے لوگ ہیں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اور فیاض، سکندر کے آفس کا پرانا ساتھی ہے، بے شک اس کے پاس دولت کی چمک دمک نہیں ہے مگر کردار کی روشنی ضرور ہے اور کردار کی روشنی ہی دائمی ہوتی ہے۔

تانیہ مرد کا کردار اچھا ہو تو عورت کی پوری زندگی پر سکون، مطمئن اور بے خوف گزرتی ہے ایک شریف مرد ایسی ٹھنڈی گھنی چھاؤں ہوتا ہے جس میں عورت آنکھیں موند کر بے فکر ہو جاتی ہے۔"

شہرینہ نے تانیہ کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں تانیہ! آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم اب بھی ہمارے لیے وہی تانیہ ہو، اس گھر کی رونق، میری اچھی دوست! تمہاری خوشیوں کے لیے ہم اسی طرح دعا گو ہیں۔" وہ فرط محبت سے اس کا ہاتھ دبانے لگی۔ تانیہ محض اس کی دل داری کے لیے ہلکے سے مسکرا دی۔

"تمہاری مسکراہٹ، خوشی اس گھر کی عزت اور خوشی ہے۔، پگلی! تم یہی چاہتی تھیں نا اس گھر پر اس کی عزت پر آنچ نہ آئے تو بس اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کر لو اور کھل کر مسکراؤ۔ کیا میرے لیے اتنا بھی نہیں کرو گی۔"

نادیہ آپی نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا تو وہ بے اختیار ہو گئی اور پناہ کی تلاش میں سر گرداں متوحش بچے کی طرح ان کے مہربان سینے میں سما گئی۔

نادیہ آپی نے اسے خود میں سموتے ہوئے نم پلکیں جھپک کر شہرینہ کو دیکھا۔

" بس کرو لڑکی! تمہیں پتہ ہے مونا بھابی کیا کہہ رہی تھیں؟" شہرینہ اس بوجھل کیفیت سے نکل کر لہجے میں شگفتگی کا تاثر لاتے ہوئے بولی اور اسے کھینچ کر سیدھا کیا۔

" وہ کہہ رہی تھیں کہ تانیہ کو پکڑ کر شاپنگ پر لے جاؤ اور اسے اس تاریک قبر سے نکالو۔ تو چلو فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔"

اس نے چٹکی بجائی اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ کھڑکی کی جانب کرتے ہوئے بولی۔

"وہاں دیکھو زندگی کھیل رہی ہے' اجالا پھیل رہا ہے' روشنی کی طرح دیکھنے سے اندر کے اندھیرے بھی دم توڑنے لگتے ہیں۔"

تانیہ بس خالی خالی نظروں سے کھڑکی کے پار دیکھتی رہی پھر ہلکی سی سانس بھر کر باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"بھلا مجھے کیا شاپنگ کرنی ہے؟"

" کیا مطلب؟ نادیہ آپی کی شادی کے لیے تم نے کون سے کپڑے بنوائے ہیں' تمہارے پاس ڈھنگ کے تین ہی تو جوڑے ہیں۔ پھر کل تو تمہارے سسرال سے بڑا قیمتی لشکارے مارتا جوڑا آجائے گا' مگر پرسوں نادیہ آپی کے سسرال میں مہندی لے کر جانی ہے وہاں کیا پہنو گی۔"

وہ چپ سی رہ گئی' یوں ہی بے ارادہ نادیہ کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر سر کو ہلکی سی جنبش دے کر بولیں۔

" ہاں یہ تو ہے' بلکہ مجھے بھی چلنا ہے بازار۔ کچھ چیزیں میری بھی رہتی ہیں اور اس لڑکی کے لیے ٹھیک ٹھاک شاپنگ کرنی ہے۔"

وہ بھی بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولیں تو تانیہ نے کچھ کہنا چاہا مگر ان دونوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ خاص کہ شہرینہ نے ... وہ بادل نخواستہ جانے پر رضامند ہو گئی۔

وہ تینوں صحن میں نکلیں تو سکندر اور ولید ابھی تک تخت پر سر جوڑے بیٹھے دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔

ان تینوں کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کر چونکے۔ سکندر نے قدرے حیران ہو کر تانیہ کو دیکھا تھا مگر پھر کسی خیال کے تحت نظریں ہٹا لیں۔

تانیہ کا چہرہ اس کے اندرونی خلفشار کی غمازی کر رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اور چہرے کے نازک حصوں میں پھیلی سرخی جو ولید اور سکندر کو دیکھ کر کچھ اور تیز ہو گئی تھی پلکوں پر بوجھ سا آ گرا تھا۔

" خیریت! یہ آپ لوگوں کی سواری باد بہاری کہاں جانے کو تیار ہے۔" ولید نے باری باری تینوں کو دیکھا اور نظریں شہرینہ پر جما دیں' اسے یقین تھا جواب یہیں سے آئے گا۔

" ہم شاپنگ پر جا رہے ہیں اور اس کے لیے ہمیں آپ کی گاڑی کی ضرورت ہے۔" وہ خلاف توقع شائستگی سے بولی۔

" صرف گاڑی کی۔" ولید نے ابرو اچکائے اور سر ہلا کر تخت پر اٹھتے ہوئے جیب سے کی چین نکال کر اس کی طرف بڑھا دیں۔ شہرینہ جھینپ کر بولی۔

"میرا مطلب ہے آپ کی بھی ضرورت ہے۔"

"اوہ۔" ولید نے بے ساختہ ٹھنڈی سانس بھری۔

" زندگی میں پہلی بار تم نے دل خوش کرنے والا جملہ ادا کیا ہے۔" اس کے اس طرح سانس بھرنے پر شہرینہ کے رخساروں کی رنگت تپ گئی۔

نادیہ اور تانیہ بے ساختہ مسکرائی تھیں۔

" سکندر بھائی! کیا آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔" اس نے جھلس کر سکندر کر مخاطب کیا۔

"نہیں تم لوگ ولید کے ساتھ ہی چلی جائو تو بہتر ہے۔"

وہ اپنے کسی خیال سے نکلتے ہوئے سنجیدگی کے ساتھ بولا اور اٹھ کر اندر چلا گیا۔

"مجبوری ہے۔" نادیہ آپی نے کنکھیوں سے شہرینہ کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر ولید کو دیکھا اور مسکراہٹ دبائی۔

" مجبوری سی مجبوری۔" ولید نے جواباً ان سے بھی گہری سانس بھر کر قدم باہر کی جانب اٹھا دیے۔

وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

X...X...X

"کیسے کیسے فضول گانے لگا رکھے ہیں صبح سے۔" شہرینہ اندر آئی اور ڈیک آف کرتے ہوئے تانیہ کو گھورا جو اپنی وارڈروب میں منہ دیے جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

"کوئی ڈھنگ کی کیسٹ نہیں ملی۔ تمہیں آج کے دن کے لیے' باہر لڑکیاں تمہیں خوب کوس رہی ہیں۔" وہ اسے ڈانٹتے ہوئے کیسٹوں کے ڈھیر سے خود ہی کوئی کیسٹ ڈھونڈنے لگی۔ گھر میں افراتفری کا عالم تھا' آج نادیہ آپی کی رسم حنا تھی۔ اور تانیہ کا نکاح تھا۔ تانیہ کی اچانک ہونے والی شادی پر خاندان والوں اور محلے والوں نے حیرت اور خوشی کا ملا جلا اظہار کیا تھا' اماں ہی سب کے سامنے جواب دہ تھیں۔ وہ ناپا تلا جواب ہر ایک کو دے رہی تھیں۔

شہرینہ لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی نادیہ آپی کے سسرال والوں کے استقبال کے لیے اسٹک پر پھولوں کی لڑیاں لگوا رہی تھی۔ اس نے ایک کیسٹ لگائی اور ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔

دوسرے لمحے ایک خوب صورت گیت گونج اٹھا۔

زندگی کی حسیں رہ گزر

ڈھونڈتی ہے کوئی ہم سفر

جس کو پانے کی ہے آرزو

آ ملے گا کس موڑ پر

زندگی کی حسیں رہ گزر

اس نے ایک مسکراتی نگاہ تانیہ پر ڈالی تو تانیہ نے لب بھینچ کر نگاہیں موڑ لیں۔ اس نے شرارت سے آواز کچھ اور تیز کر دی اور پھولوں کی لڑیاں اٹھا کر کمرے سے باہر آ گئی۔ مگر راہداری سے گزرتے ہوئے ٹھٹھک گئی۔

ولید بڑی تیزی سے سامنے سے آ رہا تھا۔ سفید شلوار سوٹ' پیروں میں لیدر کی سادی چپل اور ہاتھ میں کی رنگ تھی' اس کا رخ سکندر کے کمرے کی طرف تھا مگر اسے دیکھ کر وہ رک گیا تھا۔

تم سے وابستگی کی خوشی

دل کو ایسے اچانک ملی

جیسے آنگن ہیں نکلے کوئی

اور ہر سو ہوں کلیاں کھلیں

تم نے مہکائی شام و سحر

زندگی کی حسیں رہ گزر

تانیہ کے کمرے سے آتی آواز اور سامنے وہ چہرہ جو دل کے پر سکون ساحل میں ہلچل مچا دیا کرتا تھا۔

وہ سر جھکا کر گزرنے کی کوشش کرنے لگی مگر تنگ سی راہداری میں اس کے یوں پھیل کر کھڑا ہونے کے بعد اتنا راستہ نہیں رہ جاتا تھا۔

" یہ میرے گلے میں ڈالنے کے لیے لے جا رہی تھیں۔" وہ اس ماحول کے طلسم میں ایک پل خود بھی جکڑا تھا مگر دوسرے پل اپنے مخصوص انداز میں بولا اور سر کو ہلکے سے خم دیا۔

" حاضر ہوں۔ ویسے تمہیں اس زحمت کی ضرورت نہیں تھی ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔"

اس کی چشم خوش اس کے تپتے تپتے چہرے پر یوں جمی تھی گویا ساری نوخیز ندیوں کا یہی ایک راستہ ہو گزرنے کے لیے اس سمندر میں غرق ہونے کا۔

مگر اسے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی فرصت ہی کب تھی۔ اس کے جملے اور انداز نے حسب عادت تپا دیا۔

"یہ نری خوش فہمی ہے آپ کی۔ یہ لڑیاں میں اسٹک پر لگانے کو لے جا رہی تھی۔"

" اسٹک پر۔" اس نے اچنبھے سے ابرو اچکائے۔ پھر بے ساختہ ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"کیا قسمت پائی ہے' کاش میں ولید حسن کی بجائے ایک عدد اسٹک ہی ہوتا۔" جواباً وہ دل گرفتگی سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اور نظریں چرا کر بولی۔

"آپ مونا بھابی کو ساتھ نہیں لائے۔"

"انہیں ہی میرے ساتھ گوارا نہیں تھا' یوں بھی ان کی تیاری مکمل نہیں تھی جو مجھے تو کم از کم آج کی تاریخ میں مکمل ہوتی دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی' ہو سکتا ہے وسیم کے آنے تک مکمل ہو بھی جائے۔"

وہ اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا کر رہ گئی' تاہم مزید کچھ کہہ کر اسے کوئی موقع دینے کی بجائے ایک طرف ہو کر آگے جانے لگی کہ اس نے بڑی تیزی سے اس طرف ہو کر اس کا راستہ روک لیا۔ مگر اس کے سر اٹھا کر کچھ کہنے سے پہلے بولا۔

"یہ پکڑو اور گاڑی میں ایک شاپر پڑا ہے وہ جا کر لے لو۔" ساتھ ہی اس نے گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھائی۔

"کیسا شاپر۔" اس نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ہر بات کی وضاحت ضروری ہے۔" اس کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے اس نے بڑے دھیمے لہجے میں صرف اتنا کہا اور ایک طرف ہو گیا۔ اس دھیمے لہجے اور کچھ دیر اس پر ٹھہرنے والی اس نگاہ نے اس کے دل کو دھڑکایا تھا' تاہم وہ جلدی سے نظریں جھکا کر چابی لے کر آگے بڑھ گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ولید نے چہرے کا رخ موڑ کر پوری شدت سے اسے دیکھا پھر ایک گہری سانس بھر کر تانیہ کے کمرے کی طرف دیکھا جہاں سے آتی آواز کے ساتھ اس کا دل ہم آہنگ ہو کر دھڑکنے لگا۔

ہم سفر کا اگر ساتھ ہو
راہ آسان ہو جائے گی
مل کے دھڑکیں گے دل جس گھڑی
جگمگانے لگے گی ڈگر
زندگی کی حسین رہ گزر
ڈھونڈتی ہے کوئی ہم سفر
جس کو پانے کی ہے آرزو
آ ملے گا کسی موڑ پر

X...X...X

اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ولید کی گاڑی سے جو شاپر وہ لینے آئی تھی اس میں اس کے لئے ایک بے حد قیمتی سوٹ ہو گا' شاپر کے اوپر مار کر سے لکھا تھا "شہرینہ۔"

اس کا دل یکبارگی دھڑکا' اس نے شاپر کے اندر موجود سوٹ کو تحیر آمیز بے یقینی سے دیکھا۔

یہ حقیقت ہے کوئی جوک تو نہیں' کوئی دھوکا تو نہیں' یکدم اسے بھابی کی شرارتی' جملے بازی یاد آگئی۔

مگر نہیں' وہ اتنا تابعدار قسم کا شخص کب تھا کہ کسی کے کہنے پر کچھ کرتا' وہ تو اپنی مرضی کا مالک تھا' ایک گہری سانس اس کے سینے کی تہہ سے خارج ہو گئی۔

وہ محبت کے احساس میں مبتلا ہی نہیں تھی فنا بھی ہو گئی تھی۔ یہ انا کا خول تو اپنی نسوانیت کے وقار کو قائم رکھنے کے لئے ڈھال کے طور پر چڑھا رکھا تھا یہ اور بات کہ اس شخص کی غیر موجودگی میں یہ بارہا چٹخا تھا لہو رلایا تھا' دل کو پگھلا کر بہہ جانے پر اکسایا تھا۔

اس وقت بھی یہ خول چٹخنا چاہ رہا تھا' ایک مسرور انگیز خیال' جاں فزا احساس روح کو سرشار کر رہا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

چاہے جانے کا احساس ہی تو انسان کو زندہ رکھتا ہے۔

اسے لگا ولید حسن نے اسے یکدم وہی روایتی' دیوانی عورت بنا دیا ہے جو اپنے محبوب کے ذرا سے التفات سے جی اٹھتی ہے۔ چاہے جانے کے احساس پر مر مٹتی ہے۔

اور سچ تو یہ تھا کہ ولید کی محبت حوض کا ٹھہرا پانی نہ تھی تند رواں دریا تھی جس میں وہ ہر بار بہہ جاتی' اور یہ بہاؤ رلاتا بھی تھا۔ جی جلا بھی تھا مگر اچھا بھی لگتا تھا اس نے پلکیں جھپکیں جن میں نمی اتر آئی تھی اور شاپر اٹھا کر ایک ڈولتی سی کیفیت میں اندر بڑھ گئی۔

X...X...X

یہ رات تانیہ کے لئے بڑی بھاری تھی' کل اس کی رخصتی تھی۔ اسی گھر سے جہاں اس کی زندگی کے اکیس سال مختلف موسموں' مختلف کیفیات کے ساتھ بیتے تھے' اب آن واحد میں ہی ایک اجنبی کے نام کر دی گئی تھی جس کو وہ جانتی تک نہ تھی' جس سے ملی تھی نہ دیکھا تھا اور نہ دیکھنے کی ملنے کی سمجھنے کی یا پرکھنے کی خواہش باقی تھی۔

نادیہ آپی کا کہنا تھا کہ "نکاح وہ ڈور ہے جو دو اجنبیوں کو یکجا کرتی ہے اس طرح کہ اجنبیت کا شائبہ تک نہیں رہتا۔"

پتہ نہیں ان کی تسلی تھی یا حقیقت جب کہ وہ کسی بھی اجنبی کے آشنا بن جانے کے احساس سے ہی خوفزدہ تھی' آنے والے لمحات کی آہٹیں کسی خوفناک دھمک کی طرح اپنے دل پر محسوس کر رہی تھی۔

حالات مختلف ہوتے تو وہ بھی شاید ہر البیلی لڑکی کی طرح آنے والے دنوں کے خوش آئند تصورات سے محظوظ ہوتی' ملن رُت کا احساس مسرت بھری شرم بن کر گدگداتا رہتا مگر یہاں تو دل راکھ کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔

کیا بچا ہے جو اس اجنبی محرم کے نام کرتی' اسے دان کرتی۔

"میرے پاس تو اپنے لئے بھی کچھ نہیں بچا' نہ فخر' نہ مان نہ بہلنے کو کوئی تصور' نہ جینے کے لئے خواہشوں کا سہارا۔"

اس کی بے چین کروٹیں شہرینہ سے مخفی نہ تھیں۔دن بھر کی تھکن کے باوجود نینداس کی آنکھوں سے بھی دور تھی۔اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ایک گہری سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر اس نے تانیہ کی طرف کروٹ لی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"جب احتجاج کا حوصلہ ہی نہیں تھا تو اب اس طرح جان جلانے کا فائدہ۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور ہاتھ بڑھا کر لیمپ روشن کیا' ملگجی سی روشنی نے کمرے کا احاطہ کر لیا' جس میں تانیہ کا متوحش چہرہ نمایاں ہو گیا' اس نے روشنی سے بچنے کے لئے چہرے پر ہاتھ رکھ لیا' سلگتے آنسوئوں سے بھری آنکھوں میں آتی روشنی بھی کانٹے کی طرح چبھی تھی۔

"خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ کر مطمئن کیوں نہیں ہو جاتیں؟" شہرینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دھیرے سے ہٹا دیا۔

"میری روح میں پچھتائوں کے اتنے آبلے ہیں کہ میں گن نہیں سکتی' ایسا لگتا ہے میں کسی اونچائی سے گری ہوں۔ایک ایسے خلا میں جہاں سوائے غیر یقینی کی دل دوز تاریکی کے کچھ نہیں۔"

شکستگی کا عذاب موت سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔پچھتاوے انگارے بن بن کر روح کو سلگائے رکھتے ہیں۔

"فارگاڈ سیک تانیہ اس گھٹیا شخص کے لئے تم نے پہلے ہی اتنے دکھ اٹھائے ہیں۔اب زندگی کو اس پچھتاوے کی نذر کر دینا سراسر حماقت ہے۔" اسے تانیہ کی غمزدگی' ضرب کی طرح

لگ رہی تھی نکاح کے بعد تو وہ بالکل ہی نڈھال اور اجاڑ محسوس ہو رہی تھی‘ جیسے کسی اجڑے مزار کا بجھا ہوا چراغ جسے تیز ہوا نے آن واحد میں بجھا دیا ہو۔ اب صرف دھواں اٹھ رہا تھا ماتم کرتا ہوا۔

”تم جانتی ہو سکندر بھائی نے یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا ہے۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پلکیں جھکا کر اذیت کی اتھاہ میں ڈوبتے ہوئے بولی۔

”اکبر شاہ نے اس آخری ملاقات میں اپنی نام نہاد محبت کو ہوس کا چولا پہنا دیا تھا‘ یا یوں سمجھو کہ اپنی محبت کا وہ خول اتار دیا تھا اور اسی چولے میں سامنے آ گیا جو اس کا اصل تھا‘ میں تو آج تک اسے اپنی ہی نگاہوں سے دیکھتی آ رہی تھی مگر اس دن اسے اس کی نظروں سے دیکھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے کتنا بڑا فریب کھایا ہے‘ کتنا بڑا نقصان کیا ہے دل کا‘ کتنی کم قیمت لگائی اپنی‘ اپنے دل اور جذبوں کی‘ اک ایسے شخص کو وہ لعل و گہر لٹاتی رہی جو ان کی قدر و قیمت سے آگاہ ہی نہیں تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اسے محسوس کرنے والے جذبوں کی نہیں رنگین ملبوس میں دکھائی دینے والے جسم کی خواہش تھی اور میں نے کتنی پستی میں اتار لیا خود کو‘ کتنا ارزاں کر لیا خود کو اور اگر اس وقت ولید بھائی اتفاقاً نہ آ جاتے تو میں کٹی پتنگ کی طرح ڈول جاتی جو...“

اس کی آواز آنسوؤں کی یورش سے بند ہو گئی‘ اس نے شہرینہ کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے اپنے حنائی ہاتھوں کی طرف دیکھا اور جیسے اذیت کے عالم میں آنکھیں میچ لیں۔

اس انکشاف نے شہرینہ کو گنگ سا کر کے رکھ دیا۔

”نادیہ آپی کتنا ٹھیک کہتی ہیں کہ دل بازار نہیں ہے گھر ہے ایک پاکیزہ گھر۔ جس کا دروازہ اسی دستک پر کھلنا چاہئے جو اس کا جائز حقدار ہے جسے ہم نہیں تقدیر ہمارے لئے چنتی ہے۔

یہ تو پاکیزہ جذبوں اور اچھوتے احساسات کا ایک معبد خانہ ہے جہاں درست عقیدہ والا ہی اس کا احترام کر سکتا ہے۔ یہ مسافر خانہ بن جائے تو اجڑ جاتا ہے پھر بسائے نہیں بستا سجائے نہیں سجتا۔

آہ‘ یہی پچھتاوا آگ بن کر جھلسا رہا ہے مجھے کہ میں نے یہ دروازہ ایک بددیانت شخص کے لئے کھول دیا‘ اجڑنا تو تھا ہی بکھرنا تو تھا ہی۔“

شہرینہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیارد عمل اختیار کرے' اکبر شاہ کی ہوس کی بھینٹ چڑھتے چڑھتے جس طرح وہ بچی تھی اس کے بعد سکندر کا یہ اقدام اسے کسی طرح بھی غلط اور جذباتی نہیں لگا' اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بھی وہ ممکن تھا ایسا ہی کوئی فیصلہ کرتا۔

اس نے خوف اور وحشت کے ساتھ تانیہ کی طرف دیکھا جو نظریں چرا کر اپنی کلائی میں کل کے بندھے گہنے کو ہلکے ہلکے نوچنے لگی' اب بھی اس کی آنکھوں میں رک رک کر آنسو ٹپک رہے تھے جیسے کوئی موم ہولے ہولے پگھل رہا ہو۔

اس نے بے اختیار اس کے ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔

''اتنا کچھ ہو گیا تم نے مجھے بتایا تک نہیں' یہ خوف اور اندیشہ تو میرے خون میں آگ بن کر دوڑتا رہتا تھا۔ میں نے کتنی دعائیں مانگی ہیں تمہارے لئے تانیہ! اس خوف سے کہ تم سنبھل جائو' اکبر شاہ کے شر سے محفوظ رہو۔ اس کی مکروہ آنکھوں کا تصور کر کے میں تنہائی میں بھی خوفزدہ ہو جاتی تھی۔''

تانیہ کا چہرہ لال ہو گیا' اس نے نظریں جھکالیں پھر بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر خود کو ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں موند لیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''کوئی مرد کسی عورت کو اتنی آسانی سے برباد نہیں کر سکتا' جب تک وہ خود اسے موقع نہ دے۔ میں اکبر شاہ کو کیا الزام دوں مجھے تو خود میرے ہی خوابوں نے لوٹا ہے۔ میری نفس پرستی نے مجھے ڈسا ہے اس کے اعتماد پر کیا کہوں۔ میں نے تو خود اپنے گھر والوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ فریب دینے والے تو جا بجا ہیں مگر المیہ تو یہ ہے کہ ان ہوس پرستوں کو نادان' کم عقل اور نفس کی ماریاں تر نوالے کی طرح مل جاتی ہیں' کتنا ماتم کروں شہرینہ کتنا ماتم کروں پھر بھی کم ہے کہ' میں بھی... میں بھی ایسی ہی کہانی کا رلتا ہوا کردار بن گئی۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

شہرینہ نے اسے رونے دیا' تاکہ وہ جی کا غبار نکال کر پر سکون ہو سکے' ان آنسوئوں میں اپنے پچھتاوے بہا کر نکال دے۔

کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔

''شیری' تمہاری ہی دعائیں قبول ہوئی ہیں کہ میں بچ گئی۔ ایک دعا اور کرو گی؟'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی' جس میں خود آزادی کی سی کیفیت تھی' شہرینہ نے ایک گہری سانس کھینچ کر اس کا حنائی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے دبایا۔

”ایک نہیں بہت سی دعائیں کروں گی کہ تمہارے دل کو سکون مل جائے‘ فیاض تمہارے لئے روشنی کا وہ مینار ثابت ہو‘ جس کے سائے میں پہنچ کر تمہارے سارے اندھیرے دم توڑ جائیں‘ تمہارا دل حقیقی خوشیوں‘ مسرتوں کی آماجگاہ بن جائے تمہارے لب سچی مسکراہٹوں سے سج جائیں۔“

تانیہ کے لب کپکپا گئے‘ اس کی پلکوں کی نم آلود باڑھ جھک گئی۔

”اور مجھے یقین ہے تانی کہ میری یہ دعائیں ضرور قبول ہونگی‘ اس لئے کہ جائز دعاؤں اور دل سے نکلی دعاؤں کے قبول ہونے میں کوئی شے رکاوٹ نہیں بنتی۔“

تانیہ کا دل سینے کی دیوار میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگا اس نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ کہاں قابل تھی اس انعام کے‘ اس ڈھیر ساری محبت کے‘ اس خلوص اور ان جذبوں کے وہ پلکوں کو جھپک کر لبالب بھری آنکھوں کا سیلاب روکتے ہوئے ہولے سے مسکرا دی۔

X...X...X

ساڈا چڑیاں دا چمبا وے

بابل! اساں اڈ جاناں

صفیہ خالہ کی بیٹی ہاجرہ صبح سے اس طرح کے گانے لگا کر ماحول کو روایتی بنانے کی کوشش میں مصروف تھی‘ شام کو مونا بھابی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا‘ جب اونچی آواز میں یہ گانا شروع ہوا۔

میں تو چلی رے سکھیو! بدیسوا

اپنی سہیلیوں سے دور

بابل کی گلیوں سے دور

”یہ لڑکی سب کو رلا کر دم لے گی؟“ انہوں نے نیل پالش اٹھا کر قالین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”مگر آپ بھی ڈھیٹ ہیں رو کر نہیں دے رہیں۔ ایک آنسو تک نہیں ٹپکا سکیں۔“ وہ گیلے بالوں پر ڈرائر پھیرتے ہوئے بولی تو زیورات کے ڈبوں میں منہ دیئے نادیہ آپی بے ساختہ ہنسی تھیں۔

"یہ دیکھو..." بھابی اس کی مترنم ہنسی پر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"یہ دیکھو دلہیہیوں ہنس رہی ہیں تو میں کس خوشی میں اشک بہاتی پھروں، ویسے تانیہ کے ساتھ تم نے تو کل ٹھیک ٹھاک برسات کر دی تھی مجھے تو ڈر لگا تھا کہ کہیں تانیہ سمیت تم بہہ ہی نہ جائو۔"

شہرینہ نے انہیں گھور کر دیکھا۔

"میرا تو بالکل نارمل ری ایکشن تھا آخر نارمل لڑکی ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے وہاں اور جتنے لوگ موجود تھے وہ سب ابنارمل تھے۔" تانیہ کی چچازاد نائمہ نے برجستہ کہا تو زبردست قہقہہ پڑا۔

سچ تھا تانیہ کے نکاح کے وقت وہ ضبط کا دامن ہی چھوڑ بیٹھی تھی۔ وہ تانیہ سے لگ کر یوں ٹوٹ کر روئی تھی کہ اب کبھی نہ روئے گی، وہ سارے آنسو بہاڈالے جو قطرہ قطرہ اس کے اندر جمع ہو کر دریا بن گیا تھا۔

"ہاجرہ! اگر تمہارے پاس باذوق لوگوں کے سننے جیسے گانے نہیں ہیں تو پلیز یہ بند ہی کر دو، اسے رخصتی کے وقت کے لئے رہنے دو۔" ہاجرہ جونہی کمرے میں داخل ہوئی بھابی کچھ اس طرح لجاجت سے بولیں کہ وہ بے چاری جھینپ کر رہ گئی۔

"شادی بیاہوں میں تو ایسے گانے سنے جاتے ہیں، کیوں تانیہ آپا۔" اس نے اپنے پیچھے داخل ہوتی تانیہ سے جیسے تائید چاہی، تانیہ اپنے ہی کسی خیال میں گم تھی بے خیالی میں سر ہلا دیا جس پر سب محظوظ ہو کر ہنس دیں۔

"کیا ہوا؟" وہ ان کی اس مشترکہ ہنسی پر بوکھلا گئی۔

"تم ایسا کرنا ہاجرہ سے یہ کیسٹ لے لینا اور فیاض صاحب کے ساتھ سنتی رہنا، ہمیں کیوں رلانے پر تل گئی ہو؟"

"اوہو بھابی آپ تو بس۔" اس کے سنجیدہ سے چہرے پر شرم کی اڈنے والی سرخی بڑی دلفریب تھی۔ وہ چادر اتار کر گیلے بالوں میں برش اٹھا کر پھیرنے لگی۔

"کیوں کچھ غلط کہہ دیا؟" بھابی اٹھ کر اس کی پشت پر آئیں اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر آئینے میں اس کا بھیگا بھیگا سراپا دیکھا۔

"اب فیاض پر اتنا ستم بھی مت توڑو‘ پہلے ہی رو دھو کر خوب نکھر آئی ہو۔" انہوں نے بے ساختہ کہا تھا۔ وہ سر جھکا گئی اور ایک ہلکی سی سانس بھر کر دراز سے ہیئر بینڈ تلاش کرنے لگی۔

"کتنے بجے پارلر جانا ہے تم لوگوں کو۔" بھابی یکدم موضوع بدلتے ہوئے سنجیدگی سے بولیں۔

"بس ابھی پندرہ منٹ میں جا رہے ہیں۔" شہرینہ نے جواب دیتے ہوئے تانیہ پر اچٹتی نگاہ ڈالی ہیئر بینڈ سے بال جکڑتے ہوئے اس نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا تھا۔

"شیری! یہ اماں کے کمرے کی جو بڑی والی الماری ہے نا اس میں رکھ آئو۔" نادیہ آپی‘ کچھ ڈبے دے کر شہرینہ سے کہہ رہی تھیں۔ وہ ان کے ہاتھ سے زیورات کے ڈبے اٹھا کر خاموشی سے کمرے سے چلی گئی۔

X...X...X

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

شام ڈھلتے ہی گھر میں ایک افرا تفری کا عالم تھا‘ اماں کی جلدی میرج ہال پہنچنے کی تاکید پر لڑکیوں میں ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔

شہرینہ‘ نادیہ آپی کو لئے پارلر سے لوٹی تو شامیانے کے برقی قمقمے جھلمل کرتے ماحول کو دلفریب بنا رہے تھے‘ یہ چھوٹا سا شامیانہ عزیز رشتہ داروں کی سہولت کے لئے لگایا تھا‘ چونکہ گھر میں گہما گہمی کے باعث جگہ کی کمی تھی اور سب تیار ہو کر وہیں جمع ہو کر میرج ہال کی طرف روانہ ہونے والی تھیں کچھ بڑی بوڑھی عورتیں ایک کونے میں بیٹھیں گفت وشنید میں مصروف تھیں‘ کرسیاں تقریباً خالی دیکھ کر نادیہ آپی نے شکر کا سانس لیا اور گھبرا کر اندر کی طرف بھاگیں‘ انہیں فکر تھی کوئی مرد نہ دیکھ لے‘ ان کے اس طرح بھاگنے پر شہرینہ کو بڑے زور کی ہنسی آئی تھی۔

"سنبھل کر آپی گر نہ جایئے گا‘ یہاں تو دور دور تک دلہا بھائی بھی نہیں ہیں۔"

"بدتمیز لڑکی! انسان بن جائو اور سنو بوکے اور گہنے تم گاڑی میں ہی بھول آئی ہو۔" وہ جاتے ہوئے اسے یاد دلا گئیں تو وہ پلٹ کر گاڑی کی طرف دوڑی۔

ولید اپنی گاڑی سے اترتے ہوئے ٹھٹکا تھا‘ اس کا دل بے اختیار اس کالج بوائے کی طرح دھڑکا اور مسرت سے ہمکنار ہوا۔ جس طرح اپنی پہلی پہلی محبت کو الھڑ جذبوں کی روانی میں دیکھ کر دھڑکتا ہے‘ تاہم اس نے جلدی سے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنی غیر معمولی دھڑکن کو سنبھال لیا۔

اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اس کا دیا ہوا لباس پہنے گی کچھ تو اس کی بچکانہ اور کچھ سرکش فطرت سے وہ آگاہ تھا اور کسی حد تک اس کی انا پرستی سے بھی واقف تھا‘ مگر اس پل اس کی نگاہوں میں جو‘ تحیر آمیز بے یقینی جھلکی تھی وہ اپنی گاڑی کا دروازہ لاک کرتی ہوئی شہرینہ کی نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکی‘ نظریں ملنے پر اس کی دراز پلکوں کی گھنی باڑھ بے اختیار ہی جھک گئی۔ وہ اس کی حیرت کا پس منظر جان گئی تھی۔

فان اور میرون کلر کے پشواز میں اس کا سراپا حیران کن لگ رہا تھا مگر ولید کے لئے خوشی کی بات یہ تھی کہ اس کی انا کا خول چٹخا تھا‘ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے تو اس کے جسم کی ساری خوبصورتیاں خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں لیکن ناپسندیدہ مردوں کے لئے عورت اپنی ساری جسمانی خوبصورتیاں کسی کچھوے کی طرح اپنے اندر

سمیٹ لیتی ہے۔ وہ ایسا کسی شعوری کوشش کے تحت نہیں کرتی بلکہ خود بخود ہو جاتا ہے اور آج اس کی ساری خوبصورتیاں اس لباس کے ساتھ اجاگر ہو رہی تھیں۔ اس نے سوچا لباس اتنا خوبصورت تھا یا اس کے بدن پر آکر دلکش لگ رہا تھا۔ وہ عجیب سی بے اختیاری کی لپیٹ میں اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

اتنے اہتمام سے وہ کم ہی تیار ہوتی تھی اور یوں بھی سج سنور کر وہ ولید کے سامنے آنے سے حتی الامکان گریز ہی کرتی تھی۔ ولید نے سوچا اچھا ہی کرتی ہے پہلی بار اس کا دل شدت سے چاہا کہ اس کے مومی وجود کو ہولے سے چھوئے۔

بہت ہی سرکش لہر تھی‘ بنیادوں تک کو ہلا ڈالنے کی خواہش مند۔

حسن تو دو ہی طرح کا خوب لگتا ہے سفیر

آگ میں جلتا ہوا یا برف میں سویا ہوا

اور اسے لگ رہا تھا آگ اور برف کی تپش مل گئی ہو‘ اسے جلا کر بھسم کر ڈالنے والی تپش

اس نے ایک سانس سینے کی تہ تک کھینچتے ہوئے اپنی بشری کمزوری کو قابو کیا۔

سرکش، منہ زور، فطری جذبوں کی لگامیں کھینچنا یوں تو آسان نہیں مگر ولید حسن جیسا مضبوط اعصاب کا شخص ان دشوار لمحوں میں ثابت قدم رہا۔ یہ بڑا انوکھا تجربہ تھا خود اس کے لئے بھی۔

اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے گاڑی کی فرنٹ کے ہڈ پر ایک ہاتھ ٹکا کر بے حد اطمینان سے اس کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لیا۔

"کمال ہے میری چوائس اتنی زبردست ہے، مجھے تو آج تک پتہ ہی نہیں تھا۔" اس نے بظاہر لباس پر تبصرہ کیا مگر اس کا ذومعنی لہجہ اور نگاہوں کی وارفتانہ چمک نے شہرینہ کی پلکوں کو جھکانے پر مجبور کر دیا۔

"بس آپ کا دل رکھنے کو پہن لیا۔" وہ اپنا بکھرتا اعتماد سنبھالتے ہوئے بولی۔

"اوہ..." اس کی بات پر وہ ابرو اچکا کر رہ گیا، پھر ایک ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

"دل رکھنے کا مطلب سمجھتی ہو؟۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"نہیں آپ سمجھا دیجئے۔" وہ جھلس گئی پرسکون جھیل کی ساکن سطح پر پتھر پھینک کر تماشا دیکھنا شاید اس کی پرانی عادت تھی اور تماشا بن جانا شاید اس کی کمزوری۔

"سمجھادوں گا اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ ہلکے سے ہنس کر رہ گیا پھر ہلکے ہلکے رنگ سے سجیں اس کی خوش نما آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے بولا۔

"اتنے میک اپ کی ضرورت کیا تھی تم تو یوں بھی اچھی لگتی ہو۔" اس کا لہجہ یوں دھیما ہو گیا جیسے کوئی خواب آسا ساعت دھیرے سے دل کا دروازہ بجانے لگے۔

شہرینہ کو یکدم ہی یہاں کھڑا رہنا دوبھر ہو گیا، وہ پہلے ہی اپنے اندر کے طوفان سے وحشت زدہ ہو رہی تھی اس پر اس شخص کا پل پل بدلنے والا انداز۔

اس نے اپنے بکھرتے اعتماد کو ایک بار پھر سنبھالا اور پیچھے کی طرف ہونا چاہا مگر پشت پر گاڑی تھی۔

"ویسے سوچنے کی بات ہے یہ پارلر والیاں اگر اتنے روپے لیتی ہیں تو ٹھیک ہی لیتی ہیں کیسے کیسے چہروں کو کس کس طرح بدل ڈالتی ہیں۔" وہ یکدم اپنی جون میں آ گیا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ہلکے سے ہنسا۔

"اب دیکھو کتنی بدل کر آ گئیں تم اپنی صورت۔"

"شکر کیجئے میں نے صورت بدلی ہے وہ بھی محض کچے رنگوں سے' لوگ تو کیسی کیسی نقابیں چڑھائے ہوئے ہیں چہروں پر۔" وہ طنز سے ہنس پڑی۔

"نقابوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کی ہے؟" وہ اس کی طرف بڑے بے ساختہ پن سے جھکا تھا اور دوسرا ہاتھ گاڑی کی اوپری سطح پر ٹکا دیا یوں کہ وہ مکمل اس کے گھیرے میں آ گئی' یہ سچویشن خاصی سٹپٹا دینے والی تھی اس کے لئے۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اس تاک جھانک کی؟"

"ہاں تمہیں کیا ضرورت پڑی۔" اس نے سانس کھینچتے ہوئے اس کے ہاتھ میں موجود کاغذ کے شاپر سے مہکتا ہوا گجرا اٹھا لیا پھر اسے ناک پر لے جا کر زور سے سونگھا۔ گویا اس کی ساری مہک ناک کے ذریعے روح تک میں اتار لینا چاہتا ہو۔

"کیا کر رہے ہیں یہ تانیہ اور نادیہ آپی کے لئے ہیں۔" اس نے اس کے ہاتھ سے گجرا لینا چاہا۔

"تو میں کب کہہ رہا ہوں یہ میرے اور تمہارے لئے ہیں۔" اس نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا' اس برجستہ جواب پر وہ بری طرح جھینپ گئی' اور پلکوں کی باڑھ بہ سرعت جھکا گئی۔ رخسار انوکھی حدت سے تپ اٹھے۔

شرم و حیا کا یہ دلچسپ انداز ولید نے بڑی توجہ سے دیکھا تھا اور اس کی سبک کلائی پکڑ کر وہ گجرا اس میں باندھنے لگا۔

کہنے والے نے ٹھیک ہی کہا ہے حسن میں شرمیلا پن اور حیا کے رنگ مل جائیں تو حسن لامحدود ہو جاتا ہے۔ دل کی دیواروں میں سمٹے نہیں سمٹتا' بس پھیلتا چلا جاتا ہے اس کی کشش کی لہریں رگ رگ میں اتر کر خون کے ساتھ دوڑنے لگتی ہیں۔ ایسے ہی ایک گدگدانے والے تجربے سے ولید حسن دوچار تھا۔

اس پل وہ خود کو ایک خوش نصیب تصور کر رہا تھا جس کے لئے تقدیر نے ایسا ہیرا چنا تھا جو اپنی مثال آپ تھا۔

"دانا کہتے ہیں آنکھیں روح کی کھڑکیاں ہوتی ہیں ان میں جھانکنا سیکھیے دھوکے سے محفوظ رہیں گے۔" وہ سر جھکا کر براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا' پھر یکدم اپنے ہی

جذبوں کی شدت سے گھبرا کر ایک ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے سیدھا ہوا اور پلٹ کر شامیانے کے داخلی دروازے سے اندر چلا گیا۔

مگر شہرینہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔اس کے لئے یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا اور انوکھا تھا اسے لگا وہ اسے یخ پانی میں دھکیل گیا ہو۔اسے اپنی دھڑکنیں رکتی محسوس ہونے لگیں۔ دل پر ساکن جھیل سا سکوت اتر آیا مگر یہ کیفیت چند لمحے رہی یا اس سے بھی کم' اس کے لہجے کی گونج' اس کے ہاتھوں کا لمس اور آنکھوں کی وارفتگی اس کے خون میں طوفان بن کر دوڑنے لگی۔

اس نے اس انوکھی حیرت اور مسرت کی کیفیت سے گزرتے ہوئے اپنی کلائی کو دیکھا۔

نہ تو غم کی دھوپ جلا سکی' نہ تو موسموں کا اثر ہوا

وہ میری وفا کا ہی پھول ہے' جو ابھی تلک ہے کھلا ہوا

میری بات اور ہے چھوڑیے' میں اسیر جذبہ عشق ہوں

ذرا اپنے قلب کو دیکھئے' یہ بتایئے اسے کیا ہوا

کچھ لمحے اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ بساط دل الٹ کر رکھ دیتے ہیں سارے عہد' ارادے بھربھری مٹی کی طرح بکھرنے لگتے ہیں۔

اس نے جھک کر گجرے کو سونگھا اور سانس کھینچتے ہوئے اس کے لمس کی مہک کو اپنے پھیپھڑوں میں اتارتے ہوئے ایک انوکھی مسرت سے ہمکنار ہونے لگی۔

X...X...X

وہ تھوڑی سی خود غرض ہوئی تھی' یا ولید حسن کے رویوں نے اسے اپنے ارد گرد سے یکسر کاٹ کر رکھ دیا تھا' عجیب سی خوشی کے حصار میں تھی۔پتہ نہیں کس کس نے اس کے چہرے کے اس اجالے کو محسوس کیا تھا۔تانیہ بھی چونکی تھی اور بھابی تو اچھی خاصی حیرت میں مبتلا ہو گئی تھیں۔اس کے لہجے کی کھنک اس کی ہنسی کی جھنکار رہ رہ کر انہیں حیرت اور تجسس

میں مبتلا کر رہی تھی، آخر کار ان کا ضبط جواب دے گیا جب وہ میرج ہال کے داخلی دروازے پر مہمانوں کے استقبال کو کھڑی تھی۔

"شیری، یہ اتنی زبردست شاپنگ تم نے کب کر ڈالی؟ اپنی روایت تمہیں کیسے یاد آ گئی؟" انہوں نے اس کے پشواز پر تفصیلی نگاہ ڈالی۔

"اور جناب یہ مسکراہٹ کس کی محبت کا اعجاز ہے، کہاں تم کل تک اداسی اور بے زاری کا جان گسل اشتہار قسم کی شے لگ رہی تھیں اور کہاں اب۔" ان کے انداز میں شرارت اور معنی خیزیت تھی، وہ دھک سے رہ گئی۔

جس طرح آنکھیں اپنے اندر کے خلفشار سے مشروط ہوتی ہیں اسی طرح خوشی اور مسرت سے بھی مشروط ہوتی ہیں۔

اسے بالکل بھی خبر نہ تھی کہ اس کی قلبی کیفیت اس کے چہرے سے آشکار ہو رہی ہے۔ اس نے گھبرا کر اپنی مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر آنکھوں کے فطری سنہرے پن میں تو کچھ اور سنہرا پن آ گیا تھا۔

"فارمیلٹی بھی تو پوری کرنا ہے نا بھابی۔" اس نے جھوٹ بولتے ہوئے نظریں چرا لیں، جہاں مہمانوں کی آمد رک رک کر ہو رہی تھی، وہ ایک مسکراہٹ اچھال کر ویلکم کر دیتی۔

"خیر یہ فارمیلٹی والی مسکراہٹ تو نہیں دکھ رہی۔" بھابی ایک بزرگ خاتون کے گزر جانے کے بعد شرارت سے بولیں، پھر میرج ہال کے دالان میں کھڑے ولید کو دیکھ کر مسکرائیں۔

"یہ سب اسی کا کرشمہ لگ رہا ہے، مجھے تو آج یہ بھی کچھ زیادہ ہی اسمارٹ لگ رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے ہنس دیں۔

ولید کی نگاہ بھابی پر اٹھی جو اسے دیکھ کر شہرینہ کے کان میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ بات اسی کی ہو رہی ہے موقع دیکھ کر وہ سیڑھیاں چڑھتا اوپر آیا۔

"لو ابھی شیطان کا ذکر کیا تھا اور ابھی وارد ہو گیا۔" مونا بھابی نے اسے دیکھ کر ایک گہری سانس کھینچی۔

"کہاں' کہاں ہے وسیم! مجھے تو نظر نہیں آیا۔" اس نے نہایت معصومیت کے ساتھ ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ جس پر شہرینہ بے ساختہ امڈنے والی ہنسی چھپانے کو منہ جھکا گئی۔ بھابی جھینپ کر ولید کو گھورنے لگیں۔

"آپ کو دکھائی دے رہا ہے تو پھر ضرور ادھر ہی ہوگا۔" اس نے یہ کہہ کر ہونٹ دبا کر مسکراہٹ روکی۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے ادھر ہی کیوں دکھائی دے رہے ہو۔" وہ جل کر بولیں۔

"میں نے سوچا آپ ناحق غیبت جیسے مکروہ فعل کی مرتکب ہو رہی ہیں' میری برائیاں پیٹھ پیچھے کرنے کی بجائے میرے منہ پر کرلیں' بھڑاس بھی نکل جائے گی اور گناہ سے بھی بچ جائیں گی۔"

"خاطر جمع رکھو اتنے اہم نہیں ہو کہ ہر وقت تمہارا ہی ذکر رہے' میں تو شیری کی تعریف کر رہی تھی' یہ آج کچھ زیادہ ہی حسین لگ رہی ہے مجھے' پتہ نہیں کیا وجہ ہے؟" بھابی نے یہ کہتے ہوئے شہرینہ پر شرارتی نظر ڈالی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اتنی حسین لگنے کے لئے کسی کا خلوص سے دیا گیا لباس پہننا ضروری ہے۔" وہ ذرا سا پیچھے ہٹ کر آہستگی سے بولا تھا کہ وہ ضرور سن لے۔

بھابی نے اسے گھورا تو اس نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑے مستطیل طرز کے دو مخملیں کیس ان کی طرف بڑھا دیئے۔

"یہ تانیہ اور نادیہ کے لئے ہیں۔ دراصل مجھے سمجھ نہیں آئی کہ تحفہ کیا اور کیسا دینا چاہئے۔" پھر ایک ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"یوں بھی آپ کو تو پتہ ہے میں اس معاملے میں قطعاً اناڑی ہوں' بقول آپ کے آج تک دو روپے کی چیز تک خرید کر نہیں دی کسی کو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اچٹتی نگاہ شہرینہ کے خوش نما چہرے پر ڈالی جہاں ہلکا تغیر رونما ہو رہا تھا۔

"خیر کسی کو تو میں نے نہیں کہا تھا۔" بھابی نے ابرو اچکائے اور معنی خیز مسکراہٹ اچھالتے ہوئے بولیں۔

"ویسے زنانہ شاپنگ نہ صرف تم اچھی خاصی کر لیتے ہو بلکہ دینے کے فن سے بھی آگاہ ہو' ناحق تم دونوں مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔" انہوں نے باری باری دونوں کو گھورا' تو

دونوں بیک وقت چونکے، شہرینہ نے نگاہوں کو جلدی سے دوسری طرف کر لیا جب کہ ولید اپنا اعتماد سنبھال کر ہنس دیا۔

"حالانکہ اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی، یہ کام آل ریڈی ہوا ہوا ہے۔" پھر ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے انہیں توصیفی انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"ماشاءاللہ سے آپ کی جاسوسانہ سرگرمیاں تو خاصی تیز ہیں، اگر یہی حال رہا تو میں تو ناحق مارا جائوں گا۔"

"زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جیسے چالاک آدمی کے سامنے میری ساری محنت صفر ہی ہو گی۔"

انہوں نے آنکھیں دکھائیں پھر مخملیں کیس کھول کر دیکھنے لگیں۔

دونوں بکس میں ایک سے گولڈ کے لاکٹ تھے جو بے حد خوش نما تھے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ویسے گفٹ دینے کے معاملے میں تم تھوڑے سے بدسلیقہ تو ضرور ہو، اب کم از کم ان کی پیکنگ ہی کر دیتے تو تھوڑی دیر تجسس تو رہتا نا کہ اندر کیا ہے؟" انہوں نے کیس بند کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لیجئے، کتنا، سچا، کھرا اور صاف بندہ ہوں، جو چیز دینی ہوتی ہے بغیر لیپا پوتی کے دے دیتا ہوں۔ چاہے تحفہ ہو یا دل۔" اس نے ایک ہلکی سانس بھرتے ہوئے براہ راست اس کے چہرے کا احاطہ کیا تھا جس کے حسن میں اس لمحے عجیب سی تابندگیاں جھلملا کر رہ گئیں، ایک پل نظریں ملیں تو ایسا لگا جیسے شعاع مہر سے تمازت مل گئی ہو۔

مرا صاف سادہ مزاج تھا مجھے حسن و عشق کی کیا خبر

تیرے اک تبسم ناز نے میرا سارا ذوق بدل دیا

اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"اللہ رے اس سادگی پہ کون نہ مر جائے۔" بھابی بے ساختہ ہنسیں۔

"وہ ذرا سا جھینپ گیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے یہ شریفوں کا طریقہ ہرگز نہیں ہے' انٹرنس پر کھڑے ہو کر گفت و شنید کی جائے وہ بھی ایک خوبصورت سے مرد کے ساتھ' ناحق آپ لوگوں کا سکینڈل بن جائے گا۔" وہ دامن بچا کر فوراً سے پیشتر پلٹ کر نیچے اتر کر مردانہ حصے میں چلا گیا۔

"دیکھو ذرا' شرافت تو گویا اس پارسا گنگا نہائے پر ہی ختم ہوتی ہے۔ ایویں ہی اس خوبرو کے ساتھ اسکینڈل بن جائے گا۔" بھابی نے دانت کچکچا کر اسے دور تک جاتے دیکھا پھر یکدم ہنس پڑیں۔

"واقعی سکینڈل بن ہی جاتا' عورتیں کیسی گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں۔" انہوں نے شہرینہ کی طرف رخ کیا جو گم صم سی کھڑی تھی' سوچ رہی تھی کہ یہ شخص ایسا مہربان بھی ہو سکتا ہے یہ اس کا رویہ تو اس کی جان ہی لے لے گا۔

بھابی کی نگاہوں کی تپش محسوس کرتے ہوئے وہ چونکی اور انہیں اپنی طرف دیکھتے پا کر جھینپ کر بے مقصد مسکرانے کی کوشش کی اور پلٹنے لگی۔

"شیری! مجھے حیرت اس پر نہیں ہوئی کہ ولید نے تمہیں گفٹ دیا بلکہ حیرت اور خوشی اس پر ہو رہی ہے کہ تم نے اس کا گفٹ قبول کر لیا ہے۔"

وہ مہمانوں کی رو کی طرف جانے کی بجائے خالی کرسیوں کی طرف چلنے لگیں۔

"یقین کرو میرا دل چاہ رہا ہے کہ مارے خوشی کے تم سے یہیں لپٹ جائوں۔"

"ارے رے سنبھل کر کہیں سچ مچ اس پر عمل نہ کر دیجئے گا۔" وہ ان کی جذباتی کیفیت پر ہنس پڑی۔

بھابی نے اس کو ہنستے ہوئے دیکھا' پھر ایک سانس کھینچتے ہوئے بولیں۔

"چلو دیر آید درست آید' عقل تو یوں بھی عورت کو دیر سے ہی آتی ہے۔ تمہیں کچھ زیادہ ہی دیر سے آئی۔"

انہوں نے اس کا کندھا مسرت سے تھپکا پھر قریب آتی نادیہ آپی کی نند کی طرف متوجہ ہو گئیں جب کہ شہرینہ ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی اور اس کی پشت سے سر ٹکا لیا۔

دل کا شور کانوں تک میں سنائی دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا دل کی رگ رگ سے الجھا ہوا ہو۔

اس نے کہیں پڑھا تھا کہ ''عورت ایک ایسا پھول ہے جو اعتماد کے سائے میں اپنی خوشبو پھیلاتا ہے۔''

تو کیا یہ ولید حسن کا اعتماد ہے جس نے اس کے دل کی زمین سے سارے واہموں خدشوں کو آن واحد میں اکھاڑ کر پھینک دیا ہے اور اس کے وجود کو اندر باہر سے مہکا دیا ہے۔

محبوب کی ایک سچی پر خلوص جذبوں سے گندھی ہوئی نگاہ ہی عورت کی عمر بھر کی ریاضت کا صلہ ہوتی ہے۔یہی وہ اعتماد بخشتی ہے جب وہ اپنی انا کے خول سے باہر آجاتی ہے سیپ سے نکلے آبدار موتی کی طرح۔

آغا جی نے اسے کچھ روز پہلے ہی کہا تھا کہ تمہاری اور ولید کی شادی کی تاریخ میں جلد ہی رکھنے والا ہوں مگر اس میں تمہاری رضا بہر حال ضروری ہے' یہ میرا اخلاقی اور شرعی فرض بھی ہے' اور تمہارا حق بھی' تم مجھے جلد از جلد جواب دے دو' اور اس وقت اس کے اندر کتنے کانٹے گڑ گئے تھے' اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا' وہ یقین اور بے یقینی کے حصار میں پنڈولم کی طرح جھول رہی تھی۔اس شاخ کی مانند خود کو محسوس کر رہی تھی وہ جیسے دو طرفہ ہوا کی زد میں آئی ہو۔

مگر اب یکا یک خود ہی فیصلہ ہو گیا۔

یوں بھی اب اس میں بھی اپنی انا کا دم بھرنے کی سکت نہ رہی تھی ٹوٹ تو وہ چکی ہی تھی۔اب تو اپنے بچاؤ کے ہتھیار بھی اس شخص کے قدموں میں رکھ دینے کو دل چاہ رہا تھا بلکہ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اپنی ساری وحشت' سارا اضطراب سارے واہمے اور خدشے اس کے قدموں میں رکھ دے اور اسے کہہ دے کہ وہ اسے سمیٹ لے وہ تھک گئی ہے اس کی ساری تھکن اپنی مسیحائی سے اتار پھینکے۔

اچانک لڑکیوں کی ہنسی کی چہکار پر وہ اپنے خیالات سے نکل آئی۔تانیہ کے سسرال والے بھی آچکے تھے وہ اٹھ کر ان کے استقبال کو بڑھ گئی آج اس کے ذہن کی سطح پر ایک ٹھہراؤ تھا ایسا ٹھہراؤ جو طمانیت کی علامت ہوتا ہے۔

اس شادی میں نومی کے وکیل رفیق شیرانی بھی شامل تھے جو سکندر کے بے حد اصرار پر اپنا قیمتی وقت نکال کر شریک ہوئے تھے' وہ جہانگیر احمد کے اچھے دوستوں میں شامل تھے' یوں ولید سے ان کی اچھی خاصی علیک سلیک بھی تھی' کھانے کا دور چلا تو وہ ولید کو ایک کونے والی میز پر لے آئے۔

"خیرت تو ہے رفیق صاحب!۔" ولید نے کوڈ ڈرنک کی بوتل میز پر رکھی اور کرسی کھینچ کر پہلے ان کے بیٹھنے کا انتظار کیا پھر خود بیٹھ کر تشویش سے ان کا چہرہ دیکھا۔

وہ پچاس پچپن سال کے لگ بھگ کے بھرے بھرے جسم کے مالک تھے‘ رنگ بے حد گورا چٹا‘ کشادہ پیشانی اور ذہین آنکھیں ان کی ذہانت کی چغلی کھاتی نظر آتیں‘ اس وقت ان کی شفاف پیشانی پر الجھنوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔

"تمہاری یا سکندر کی آج نومی سے ملاقات ہوئی تھی۔" انہوں نے آنکھوں سے چشمہ اتار کر کرتے کی اوپری جیب سے رومال نکال کر چشمے کے شیشے پونچھے‘ پھر چشمہ آنکھوں پر لگا کر جیبیں ٹٹول کر غالباً سگریٹ تلاش کرنے لگے۔

"نہیں‘ اور میرا خیال ہے سکندر بھی بے پناہ مصروفیت کے باعث جا نہیں سکا۔" ولید نے احتراماً اپنی سائڈ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ... بات یہ ہے کہ نومی اپنے جرم کا اعتراف کر لینا چاہتا ہے۔" انہوں نے بلا تمہید بات شروع کی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"وہاٹ..." ولید کو اعصاب پر گویا پتھر پڑتا محسوس ہوا‘ وہ کرسی سمیت بے اختیار ان کی طرف جھک آیا۔

"نہیں‘ نہیں شیرانی صاحب‘ اسے ایسا مت کرنے دیجئے گا‘ اس کی والدہ یہ دکھ سہہ نہ پائیں گی۔"

"دراصل ولید! وہ ایک ذہنی آزار سے گزرتے گزرتے یاس کی آخری سٹیج پر پہنچ چکا ہے۔" انہوں نے سگریٹ کا پیکٹ کھول کر اس سے ایک سگریٹ نکالتے ہوئے بات شروع کی۔

"یاس کی آخری سٹیج سمجھتے ہو نا۔" ذرا رک کر انہوں نے ولید کی طرف دیکھا پھر ایک ہنکارا بھر کر سگریٹ کا ہلکا سا کش لگاتے ہوئے بولے۔

"عموماً جذبات کا طوفان تھمتا ہے تو انسان لاشعوری طور پر اپنے سود و زیاں کا حساب لگانے لگتا ہے اور ایسے میں جب خسارہ ہی خسارہ ہو‘ محرومیوں‘ ناکامیوں کا دل دوز اندھیرا پھیلا ہوا دکھائی دے رہا ہو‘ تلافی کا امکان بھی گزر چکا ہو یا کم از کم اس کو اب ایسی کوئی امید نہ رہی ہو یعنی ناامیدی کا دل شکستہ جال دل کو جکڑ لے تو زندگی بے معنی محسوس ہونے لگتی ہے بلکہ بوجھ کی طرح سینے پر آ گرتی ہے‘ اور یہی اعصاب شکن سوچوں کا مسلسل دباؤ‘ ضمیر کی

خلش اس کے دل و دماغ کے بھی راستوں کو بند کر دیتی ہے۔ یہ ہوتی ہے شاید یاس کی آخری سٹیج جب انسان صرف موت کی تمنا کرتا ہے کہ اس کے خیال میں فرار کا وہی آخری راستہ رہ جاتا ہے۔“

انہوں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور بڑی بے کیفی سے دھواں نتھنوں اور ہونٹوں کے گوشوں سے خارج کرتے ہوئے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے مزید بات کو جاری رکھتے ہوئے بولے۔

”دراصل کچھ لوگ دنیا کو عشرت کدہ کی صورت دیکھنا چاہتے ہیں مگر جب یہ ماتم کدے کی صورت ان کے سامنے آتی ہے تو ان کے اعصاب بری طرح مجروح ہوتے ہیں۔ ہر انسان پر مصیبتوں اور پریشانیوں کا اثر مختلف پڑتا ہے کسی پر اتنا گہرا کہ دل شق ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ دل گرفتگی اور پچھتاوئوں کی آگ میں جل جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

تم نے اخباروں میں خودکشی کی خبریں پڑھی ہوں گی‘ کہ فلاں عورت یا فلاں شخص نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی‘ یا فلاں چیز سے مایوس ہو کر ریل کی پٹڑی پر لیٹ کر خود کو ختم کر ڈالا‘ حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ یہ ستم ظریف ہی زمانے کے ستائے ہوئے تھے بلکہ اور بھی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہیں جو زندہ رہتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ بد ترین حالات کو فیس کرتے ہیں محض اپنے مضبوط اعصاب کے باعث۔“

”ہاں نومی بہت کمزور اعصاب کا رہا ہے۔“ ولید نے افسردہ سی سانس کھینچی۔

”آپ نے اسے اپنے طور پر سمجھایا تو ہو گا۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ نومی کی اس ارادے کی خبر نے اسے اندر باہر سے حقیقتاً ہلا کر رکھ دیا تھا۔

”ہاں مگر میرا خیال ہے وہ آئے دن کی پیشیوں سے تنگ آ گیا ہے یا پھر ضمیر کی خلش اسے بے چین کر رہی ہے۔“ رفیق صاحب افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”دراصل اچھے اور شریف گھرانے کے لڑکے غلط صحبت میں پڑ کر اس طرح کے گھنائونے راستوں پر چل تو پڑتے ہیں مگر زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ان کا ضمیر ضرور انہیں جھنجھوڑتا ہے‘ ایک بے سکونی انہیں ناجائز طریقوں سے حاصل ہونے والی خوشی پر خوش نہیں ہونے دیتی‘ ان میں اکثر ایک ٹھوکر پر سنبھل جاتے ہیں مگر ٹھوکر بہت گہری ہو‘ تلافی کا وقت گزر چکا ہو تو ایسے نوجوان نومی ہی بن جاتے ہیں جلد از جلد موت کو گلے لگا کر زندگی اور مسلسل اضطراب سے فرار ہونے کے متمنی۔“

ان کے لہجے میں نومی کے لئے حقیقی غم جھلک رہا تھا۔ وہ شاید اس کی ذہنی حالت سے بہت زیادہ مایوس سے تھے اور یہی بات ولید کو تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

''سکندر سے آپ کی بات ہوئی؟'' اس نے خود کو کرسی پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''نہیں' سکندر بے چارہ اتنا مصروف ہے اسے تو سر اٹھانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ آج تو کم از کم اس سے بات نہیں ہو سکتی۔'' انہوں نے دور تک نگاہ دوڑائی جہاں سکندر مہمانوں میں گھرا دکھائی دے رہا تھا۔

ولید نے بھی ان کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے خوش باش چہرے کو دیکھا پھر کچھ سوچ کر بولا۔

آپ ابھی سکندر سے کچھ مت کہیے گا' میرا خیال ہے کل نومی سے خود ملتا ہوں اسے اپنے طور پر ریلیکس کرتا ہوں اب اگلی پیشی کب ہے؟۔''

''اٹھارہ تاریخ کو۔'' شیرانی صاحب بولے۔

اس نے رسٹ واچ پر نظریں ڈال کر آج کی تاریخ دیکھی ابھی درمیان میں کئی دن تھے' اسے حوصلہ سا ہوا۔

''ہاں تم اسے ضرور ملو' اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرو۔'' رفیق شیرانی نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ لڑکا اعصابی طور پر اس قدر کمزور ثابت ہو گا۔'' ولید نے متاسفانہ سانس بھری۔

''کمزور اعصاب کا نہ ہوتا تو ان حالات کا شکار ہی کیونکر ہوتا۔'' وہ ہلکے سے مسکرائے پھر قدرے متاسفانہ انداز میں بولے۔

''دراصل تعلیم حاصل کر کے فوراً سے پیشتر اعلیٰ افسر بن جانے کی تمنا' جلد از جلد غربت سے چھٹکارا پانے کی خواہش' بلند سوسائٹی میں مدغم ہونے کے خواب' کمزور اعصاب کے لوگوں کو آکٹوپس کی طرح جکڑ لیتی ہے اور اسی منزل تک لے آتی ہے۔''

''ہاں مگر میرا خیال ہے کہ اس میں مذہب سے دوری کا بڑا دخل ہے۔'' ولید نے پر خیال انداز میں رفیق شیرانی کی طرف دیکھا۔

"خدا پر اعتماد کی کمی کا بھی کم و بیش یہی نتیجہ نکلتا ہے' معاشرے میں پھیلی بے راہ روی' گمراہی' ٹینشن' فرسٹریشن یہ ساری بیماریاں مذہب سے دور ہو جانے کے باعث ہمارے اندر پیدا ہو گئی ہیں۔"

"بالکل... بالکل...۔" رفیق شیرانی نے تائیدی انداز میں سر زور زور سے ہلایا۔

"یہ مذہب سے دوری نے ہی تو سارے بگاڑ کو جنم دیا ہے۔ دراصل بدقسمتی سے ہمارے یہاں بھی مغربت کی طرح مادہ پرستی عام ہوتی جا رہی ہے' یہ خواص سے عوام تک میں پھیل گئی ہے اب دیکھو' مغرب میں ذہنی مریضوں کی تعداد کیوں زیادہ ہے' وہاں اچھے مکان' اچھے لباس' بلند سوسائٹی کی فکر لوگوں کو کھائے جاتی ہے اور جب بہت کچھ پانے کی خواہش کی دوڑ میں کچھ نہ پاسکنے کی شکستگی ہو تو اعصابی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ مایوسی' بے زاری' بددلی کا لوگ شکار ہو جاتے ہیں اور معاشرہ شکستہ دلوں کا ایک ہاسپٹل بن کر رہ جاتا ہے۔"

انہوں نے کچھ لمحے کے توقف کے بعد افسوس سے سر ہلاتے ہوئے مزید کہا۔

"پرانے زمانے کے لوگ روحانی تربیت کا اہتمام کرتے تھے۔ وہ خود اولاد کے لئے مثال بھی تھے' ان کے اندر ٹھہراؤ' صبر' شکر' قناعت تھی مگر اب ان عادتوں کو لوگ محض

دیندار طبقے کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔ اب عام لوگوں کے اندر لالچ' حرص' مادہ پرستی' فیشن پرستی عام ہو گئی ہے' لوگ زندگی کو محض زیب و زینت سمجھ بیٹھے ہیں۔ مقصد حیات' زر اور زمین ہو گیا ہے یقین کرو ولید! میں اس وقت شدید دل گرفتگی کا شکار ہو جاتا ہوں جب میرے پاس ایسے ایسے کیس آتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ یہ والدین اس وقت تک کیا کر رہے تھے کس نیند میں تھے جب پانی سر سے گزر جاتا ہے تو بولائے بولائے گھبرائے سے ہمارے پاس چلے آتے ہیں قانونی مشورے لینے' کوئی راستہ ڈھونڈنے۔

اس وقت میں ان سے کہتا ہوں کہ دور طفولیت میں آپ نے انہیں مٹی کے کھلونوں سے واقفیت کرانے کی بجائے آتش گیر کھلونوں سے واقفیت کرائی' انہیں شفاف دودھ پلانے کی بجائے الیکٹرانک میڈیا کا زہر پلایا' انہیں علمائے دین' اکابرین اور سلاطین کے قصے کہانیوں کی بجائے جیمز بونڈ' ٹوم کروز اور شاہ رخ کے کرداروں سے آشنا کرایا۔ انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ انگلش میڈیم سکول میں پانچ گھنٹے گزارنے بھیج دیا۔ اس کے بعد دو گھنٹے مزید ٹیوشن کے لئے۔

مگر قرآن پاک کے لئے بامشکل دس منٹ' زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ۔

اور انگلش تعلیم کے لئے تین تین اور پانچ ہزار روپے فیس دینے میں تامل نہیں ہوتا مگر قاری صاحب کو دو سو روپے دینے میں خفقان ہونے لگتا ہے' اور کہیں تو جواب یہ ہو گا کہ لو جی دس منٹ ہی تو پڑھانا ہے۔ ارے یہ تو آپ کی اولاد کو جنت کے راستے پر چلا رہا ہے دس منٹ کیا ایک منٹ بھی ان کے انگلش سکول کے دس گھنٹوں پر بھاری ہے۔

بس جب انگریزی تعلیم پر بے دریغ روپیہ خرچ ہو گا' بے جا خواہشات کے پورا کرنے میں صرف ہو گا تو اولاد تو ایسی ہی ہو گی مغرب زدہ' بے حس' لالچی اور سیلفش' انگریزوں جیسی تہذیب یافتہ' جس کی

قدریں بس تھری پیس سوٹ پہننے' ٹائی باندھنے اور ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹوں سے کھانے تک محدود ہے۔ جتنے وہ بد تہذیب ہیں ناشائستہ اور اخلاق باختہ ہیں اتنے تو پتھر کے زمانے کے لوگ بھی نہ تھے۔

''خیر...'' وہ یکدم افسردگی کے سحر سے نکلتے ہوئے سر جھٹک کر ایک گہری سانس بھر کر چپ ہو گئے۔ پھر ولید کی طرف جھکتے ہوئے خود آزار سی کیفیت میں مسکراتے ہوئے بولے۔

''میں اس طرح کی باتیں اپنی دھاک بٹھانے کو نہیں کرتا۔ نہ یہ بتانے کو کہ میں بھی معاشرے کی تباہ حالی پر ہمہ وقت افسردہ رہنے والوں میں سے ہوں' نہیں میں تو عموماً والدین کو محض یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ جو شخص جو بوتا ہے وہ کاٹتا ہے' تو کیوں نہ آپ لوگ نیک اعمال بوئیں' اوصاف حمیدہ بوئیں' پاکیزگی' قناعت' شکر اور مذہب سے وابستگی بوئیے' دیکھئے چند سالوں میں لہلہاتی خوشبودار فصل آپ کے سامنے ہو گی جو آپ کے مرنے کے بعد بھی آپ کے لئے مغفرت' بخشش کا ذریعہ اور ثواب جاریہ ہو گی۔''

ولید ایک عالم افسوں میں ان کو دیکھتا رہا' سنتا رہا پھر عقیدت مند نظروں سے انہیں دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا۔

''حیرت ہے میں تو آپ کو محض ایک منجھا ہوا وکیل ہی سمجھتا آرہا تھا آپ تو ایک بہترین انسان ہیں۔'' اس نے بڑی بے ساختگی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ رفیق شیرانی اس بے ساختہ تعریف پر بالکل بچوں کی طرح شرما گئے اور سر نفی میں ہلانے لگے۔

''نہیں نہیں یہ کوئی دھاک بٹھانے والی بات نہیں ہے' بس کبھی کبھی دل بھر آتا ہے' اور خاص کر جب سامنے کوئی باشعور' مذہب سے واقف اور مذہب کو اہمیت دینے والا شخص ہو

توزبان چل پڑتی ہے خیر میں نے تمہارا بہت سا وقت ضائع کر دیا۔ تم تو خاص میز بان ہو آج کے' لوگ یقیناً تمہاری کمی محسوس کر رہے ہوں گے۔" وہ چشمہ اتار کر اسے اپنے رومال سے پونچھنے لگے۔

"یہ وقت تو آپ نے میرا امر کر دیا ہے رفیق صاحب! یہ بتایئے آپ نے بلا تکلف کھانا وانا کھایا۔" اسے یکدم اپنی میز بانی کا خیال آ گیا۔

جواباً رفیق شیرانی نے اس کی طرف شرارتی نظروں سے دیکھا تو وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر رہ گیا پھر سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "کیا کریں' آپ نے یاد دلا دیا کہ میں میز بان ہوں۔"

"نہیں خیر تم نا صرف میز بان ہو بلکہ اچھے میز بان ہو۔" انہوں نے آگے ہو کر اس کے کندھے کو شفقت سے تھپکا۔

"آ... چھا آپ کہتے ہیں تو مان لیتا ہوں۔" اس نے شرارت سے ایک ٹھنڈی سانس بھری تو رفیق شیرانی محظوظ ہو کر ہنس پڑے پھر اٹھتے ہوئے بولے۔

"میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہئے' سکندر کو میری طرف سے خدا حافظ کہہ دینا۔ وہ بچارا تو سسرالی لوگوں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہلکے سے ہنس دیئے۔

ولید انہیں داخلی دروازے تک چھوڑنے گیا۔"

میرج ہال تقریباً خالی ہو چکا تھا' کھانا کھانے کے بعد تقریباً سب مہمان جا چکے تھے بس سسرال والے ہی رہ گئے تھے جو رخصتی کے مراحل سے گزر رہے تھے' خوشگوار مسکراتا ماحول یکدم آب دیدہ ہو کر رہ گیا تھا۔

سکندر نے سارے وقت بہت ضبط اور حوصلہ کا مظاہرہ کیا۔ ولید اس کی قلبی کیفیت سے آگاہ تھا۔ وہ ایک باپ کی طرح ان دونوں کو رخصت کر رہا تھا۔ تانیہ کو اس نے خصوصی گلے لگا کر پیار کیا۔ تانیہ نے بھی اس لمحے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا تھا پتہ نہیں اس میں اتنا حوصلہ اور ضبط آ گیا تھا وہ جانتی تھی کہ اگر ایک بار ضبط کھو بیٹھے گی تو بکھر جائے گی اور سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔

نادیہ تو تھی ہی صبر و استقلال کا پیکر' گو کہ وداع ہونے کا احساس اسے برف کی طرح اندر ہی اندر پگھلا رہا تھا مگر محض اماں اور سکندر کی خاطر وہ اس مرحلے سے ایک حوصلہ مند لڑکی کی طرح گزری۔

ان دونوں کے جانے کے بعد ماحول پر ویرانہ سا اتر آیا' ایسی ہی ویرانی دلوں میں بھی آکر ٹھہر گئی۔ہال سے گھر تک کا فاصلہ اماں نے آنسو بہاتے گزارا' جب کہ سکندر بہت گم صم تھا۔ ولید نے اس کے کندھے پر تسلی آمیز تھپکی دی تو وہ نم نم پلکوں کو جھپک کر بے اختیار مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ اس خوشی کی تھی جو اسے فرض کی ادائیگی کے بعد حاصل ہوئی تھی۔

”یہ مائیں بھی عجیب ہوتی ہیں جب بیٹیوں کا فرض ادا نہیں ہو تو تب بھی روتی ہیں اور جب بیٹیوں کو وداع کر کے فرض سے سبکدوش ہو جاتی ہیں تب بھی روتی ہیں۔“ شہرینہ اماں کو روتے دیکھ کر سوچ رہی تھی پھر صحن میں چلی آئی۔

صاف ستھرا صحن چاند کی مدھم روشنی سے نہایا ہوا بڑا خوش نما دکھائی دے رہا تھا۔پتوں کی سرسراہٹ اس خامشی میں موسیقی کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

بہت آہستگی سے اس کی آنکھیں پانیوں سے جھلملا گئیں مگر یہ آنسو رنج یا غم کے نہیں تھے وہ آج دلی طور پر بے حد مسرور تھی۔تانیہ کے شوہر فیاض کو دیکھ کر اسے بڑی طمانیت محسوس ہوئی تھی۔سارے اندیشے' واہمے اور خوف زائل ہو گئے تھے۔عام سی شکل و صورت کا وہ شخص اپنے کردار کی روشنی سے بہت خاص دکھائی دے رہا تھا۔اس نے نیم کے اس درخت پر

نظریں جمادیں جو صحن کے آخری کنارے پر اپنی خوش نما گھنی شاخوں کے ساتھ پھیلا ہوا ٹھنڈک کا احساس بھر رہا تھا۔

اس نے سوچا۔”بعض انسان بھی درختوں کی مانند ہوتے ہیں۔گہری گھنیری چھائوں رکھتے ہیں جن کے سائے میں آکر ساری تپش ساری حدت دم توڑ دیتی ہے' یہ اپنے رویوں کی مضبوط شاخوں سے غموں کی دھوپ کو کاٹ دیتے ہیں۔“ فیاض بھی اسے ایسا ہی درخت محسوس ہوا تھا اور اسے یقین تھا اس کی ٹھنڈی چھایا میں جا کر تانیہ کے اندر کی ساری تپش دم توڑ دے گی۔

”شہرینہ! ولید گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ سکندر کی آواز پر وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔

”سب چلے گئے کیا؟۔“ اس نے دوپٹہ کا کونا اٹھا کر جلدی سے آنکھوں کے گوشوں پر رگڑا۔

”سب کون؟۔“ سکندر نے اس کی طرف دیکھا پھر نظریں یک بیک دیوار پر جمادیں اور ایک گہری سانس بھر کر بولا۔

"ہاں... اب تم بھی جائو' بہت دیر ہو گئی ہے' اماں کے پاس پھوپھو اور چچی جان ہیں۔"

اس نے پشاور سے آئے اپنے رشتہ داروں کی بابت کہا تو وہ سر ہلا کر اپنے کپڑوں کا بیگ اٹھانے اندر چلی گئی اور جب باہر نکلی تو سکندر ہنوز صحن میں دیوار سے پشت لگائے کھڑا تھا۔ اسے گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھ کر مضطربانہ انداز میں بولا۔

"کیا تانیہ مجھ سے خفا تھی شیری!"

وہ رک گئی اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگی' نظروں ملنے پر اس نے اپنی سرخ ہوتی آنکھوں کو جھکا لیا اور چپل کی نوک سے فرش پر لکیریں کھینچنے لگا۔

"اسے میں نے بہت دکھ دیا ہے' پتہ نہیں مجھے ایسا سب کچھ کرنا چاہیئے تھا یا نہیں' میں نے اس کے ساتھ جو کیا وہ درست ہے یا غلط۔" پھر افسردگی سے بولا۔

"وہ سمجھ رہی ہوگی کہ میں نے یہ سب اسے سزا دینے کے طور پر کیا ہے' ہے نا۔"

"نہیں سکندر بھائی! وہ نہ آپ سے خفا تھی' نہ اس فیصلے پر برہم۔ وہ تو خود کو مجرم سمجھ رہی تھی خود کو سزا کا مستحق سمجھ رہی تھی۔"

"مگر میں نے اسے سزا نہیں دی شہرینہ!" سکندر نے تڑپ کر کہا پھر لب بھینچ کر رخ پھیرتے ہوئے آزردگی سے بولا۔ "کیا اس نے میرا یہ فیصلہ سزا کے طور پر قبول کیا تھا۔"

شہرینہ ان کے لہجے کی اداسی محسوس کرتے ہوئے جلدی سے تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

"نہیں بالکل بھی نہیں' بلکہ اس کا خیال تھا کہ وہ اس انعام کے قابل نہیں تھی۔"

سکندر نے اک گہری سانس کھینچی۔

"آپ کا یہ فیصلہ مجھے تو کیا کسی کو بھی غلط نہیں لگا۔ یہ ایک دانشمندانہ اور بروقت اقدام تھا۔ فیاض بھائی کو دیکھ کر مجھے یقین کریں اطمینان ہو گیا۔ وہ تانیہ کے لئے اس درخت کی طرح بہت گھنی چھائوں ثابت ہونگے۔"

اس نے ہلکی سانس بھرتے ہوئے نیم کے درخت کی وسعت کو تکا' سکندر نے ایک خوشی کے ساتھ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ حوصلہ افزا انداز میں مسکرا دی۔

"آئی ہوپ' تانیہ آپ کے اس فیصلے پر نا صرف خوش رہے گی بلکہ مشکور بھی۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" وہ بے ساختہ بولا پھر یکدم ہنس دیا۔

شہرینہ کو اس کی ہنسی بہت سادہ اور معصوم لگی جیسے کوئی بچہ ماں کے بہلانے' سہلانے پر روتے روتے ہنس پڑے۔

وہ سکندر کو اماں کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

ولید کو گاڑی کے بیک ڈور سے ٹیک لگائے دیکھ کر اس کا دل جانے کیوں یک بارگی دھڑکا۔

X...X...X

اسے باہر آتے دیکھ کر ولید نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور فرنٹ سیٹ سے اپنی براؤن واسکٹ اٹھا کر پچھلی سیٹ پر پھینک دی۔

"اوں ہوں' آگے آ کر بیٹھو۔" اسے بیک ڈور کھولتے دیکھ کر جلدی سے بولا۔

"تم چاہتی ہو میں خود کو تمہارا ڈرائیور محسوس کروں۔" بائیں طرف جھک کر اس نے فرنٹ ڈور کھولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تو محسوس نہ کیجئے کوئی زبردستی تو آپ کو محسوس نہیں کروائے گا۔" وہ آہستگی سے بولی اور ناچار فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟ ایک خوبصورت لڑکی پچھلی سیٹ پر تنہا بیٹھی ہو تو مجھ جیسا گبھرو شخص اگلی سیٹ پر یک و تنہا ڈرائیونگ کر رہا ہو تو لوگ اسے ایک ناآسودہ اور تشنہ ڈرائیور ہی سمجھیں گے نا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹھنڈی سانس کھینچی تھی۔

شہرینہ کو اپنی پیشانی جلتی محسوس ہوئی۔

یہ شخص کبھی تھکتا بھی تھا کہ نہیں' ہر وقت جذبوں سے پر رہتا ہے۔ کس قدر مضبوط اعصاب کا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور انتہائی بے بسی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

'اب انسان کو اتنا مضبوط اعصاب کا بھی نہیں ہونا چاہئے جو دوسروں کے اعصاب کو جب چاہے منتشر کر کے رکھ دے۔'

اس کے چہرے پر تھکن اور نیند کا ہلکا سا خمار تھا۔ آنکھوں کے کنارے تیز سرخ ہو رہے تھے مگر ایسا کوئی تاثر اس کے لہجے سے ظاہر نہیں تھا۔

"پتہ ہے تمہاری جگہ آمنہ علی ہوتی تو میری اس آفر پر کیا کہتی؟"

اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے خوشگوار انداز میں کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

وہ جلدی سے پلکیں جھکا کر رخ موڑ گئی' اس کا دل عجیب سی اتھاہ میں ڈوبا۔

"کیا کہتی؟۔" اس کی آواز اتنی پست ہو کر نکلی جیسے چلتے چلتے پیر پر ہلکی سی ٹھوکر لگی ہو اور ایک تکلیف کا احساس پیر سے جسم میں سرائیت ہونے لگا ہو۔

"کہ ایسے حسین ڈرائیور کو میں ساری عمر ڈرائیونگ پر بخوشی رکھ سکتی ہوں۔" وہ بولا اور اسے لگا اس کا دل کسی ٹوٹے کانچ سے ٹکرا گیا ہو ایک ٹیس سی اٹھی اس نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا تھا جیسے کچھ کھوجنا چاہا ہو مگر وہ ونڈ سکرین پر نظریں جمائے اپنے گداز ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ سجائے ہمیشہ کی طرح اپنے مکمل اعتماد سے اس کا اعتماد پارہ پارہ کر رہا تھا۔

"تو کر لیجئے سودا بری بھی نہیں ہے۔" وہ سر جھکا کر ہلکے سے ہنسی' مگر یہ ہنسی بڑی کھوکھلی اور اعتماد سے خالی تھی۔

ولید نے ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھا' بے ساختہ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کیا میں تمہاری اجازت کا منتظر ہوں۔" اس نے اسٹیئرنگ سے ہاتھ اٹھا کر اس کے نیم منتشر بالوں کو ہلکے سے منتشر کیا۔

ایک پل کے لئے یہ سنسنی خیز لمحہ ساری کائنات پر محیط ہو گیا' دوسرے پل وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے آہستگی سے بڑبڑائی۔

"شاید۔"

ولید کے جیب میں رکھے موبائل کی بیپ ہوئی تو اس نے شہرینہ کی طرف نظریں اٹھا کر موبائل نکالتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ آہستہ کر دی۔ دوسری طرف یوسف تھا۔ وہ سخت بوکھلایا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آواز میں واضح کپکپاہٹ تھی۔

"ولید سائیں! ولید سائیں! آپ کہاں تھے میں تو آپ کا موبائل ملا ملا کر پاگل ہو رہا تھا' آپ نے موبائل بند بھی نہیں رکھا تھا مگر ریسیو بھی نہیں کر رہے تھے۔" وہ ہانپ بھی رہا تھا۔

"ہاں میرا موبائل دو تین گھنٹوں کے لئے میری گاڑی میں ہی رہ گیا تھا' خیر تم سناؤ ایسی کیا افتاد آ پڑی کہ تم اس وقت مجھے تنگ کرنے چلے آئے۔"

"خبر بہت دھانسو ہے' میرا مطلب ہے میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے بری کہوں یا..."

"کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہو یوسف! کھل کر بتاؤ۔" اس نے ملائمت سے ڈپٹا۔

"ولید سائیں آج رئیس توقیر شاہ کا قتل ہو گیا ہے۔"

وہ بغیر سانس لئے جلدی سے بولا جیسے رکی ہوئی گاڑی کو دھکا لگا ہو۔

"کیا آ..." ولید کو اپنا دماغ بھک سے اڑتا محسوس ہوا۔اس کی آواز چیخ سے مشابہہ تھی' شہرینہ نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا تھا' وہ جھٹکے سے گاڑی بیچ سڑک پر روک چکا تھا۔

"کب؟ کیسے؟ کس نے کیا؟" وہ حیرت اور صدمے سے بولا۔

"آج رئیس توقیر شاہ کی شادی تھی۔وہ حویلی کی طرف جا رہا تھا۔چار پانچ بجے کا وقت تھا اس کے ہمراہ ہدایت اللہ اور باقی اس کے خاص آدمی تھے کہ اچانک گاڑی کا پچھلا ٹائر نکل گیا اور گاڑی ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئی' اس دم عقب سے فائرنگ شروع ہو گئی اور رئیس توقیر شاہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا جبکہ ہدایت اللہ بہت زخمی ہے آئی سی یو میں ہے۔

دو آدمی بچ گئے ہیں ان میں سے بھی ایک کی حالت نازک ہے اور سنا ہے کہ ہدایت اللہ بھی مشکل سے ہی بچ سکے گا۔" یوسف نے اسے پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔

وہ دم سادھے تفصیل سنتا رہا تھا' اس کے دماغ کی رگیں ماؤف سی ہو رہی تھیں۔

"فائرنگ کرنے والے کون تھے۔" اس کی آواز میں عجیب سرسراہٹ سی اتر آئی۔یوسف ایک پل کے لئے گڑبڑایا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"سننے میں آرہا ہے کہ فدا حسین کے خاص آدمی تھے۔"

"ہوں... وہ سب کوٹھی میں ہیں یا حویلی میں۔" اس نے ہنکارا بھرتے ہوئے پوچھا۔

"شہر میں ہی ہیں ظاہر ہے۔" یوسف کا جواب سن کر اس نے ڈھیلے ہاتھ سے موبائل آف کر دیا۔

شہرینہ اس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھی۔اس کے چہرے کے تغیر اور گفتگو سے وہ اتنا اخذ کر چکی تھی کہ کوئی بڑے حادثہ کی اطلاع ملی ہے۔تاہم اس نے کچھ پوچھنے کی بجائے اس کے بولنے کا انتظار کیا۔

"توقیر شاہ قتل ہو گیا ہے۔" ولید نے ایک افسردہ سی سانس سینے کی تہ سے کھینچتے ہوئے اس کی طرف دیکھا' اس کا دل اس خبر کو تسلیم کرنے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔ کچھ بھی تھا وہ لاکھ اس کا دشمن تھا اس کے باپ کے قاتل خاندان سے تھا' مگر توقیر شاہ کی عبرت ناک موت نے اسے صدمہ پہنچایا تھا۔ شہرینہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس خبر پر کیا ردعمل ظاہر کرے' ایک انسان ہونے کے ناتے اس خبر پر اس کا دل افسردگی میں ڈھل گیا تھا اور ولید کے ناتے وہ اس کے غم میں برابر کی شریک ہونا چاہتی تھی مگر اسے سمجھ نہیں آرہا تھا وہ کن الفاظ کا سہارا لے۔

"میرا خیال ہے میں تمہیں گھر ڈراپ کر آئوں پھر مردان ہائوس جائوں۔" اس نے ایک گہری سانس بھر کر بالوں اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر اپنے اعصاب کو سنبھالا اور گاڑی سٹارٹ کر دی' شہرینہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا اور آہستگی سے بولی۔

"کیا میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں۔"

ولید نے غائب دماغی سے اس کی طرف دیکھا اور کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا۔ شاید اس وقت وہ کسی بھی درست یا غلط پہلو پر غور نہیں کر سکا کہ اسے اس موقع پر شہرینہ کو اپنے ساتھ لے جانا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سود مند ہو گا یا نہیں؟ اس کے سنسناتے ذہن میں یوسف کی آواز ہی گونج رہی تھی۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے سر ہلایا اور گاڑی کا رخ بدلتے ہوئے ڈیفنس کی طرف کر دیا۔

X...X...X

مردان شاہ کی بڑی سی کوٹھی کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی روکتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ واقعی یہاں بڑا حادثہ رونما ہو چکا ہے۔ مستعد ملازموں کے علاوہ کئی بہت سے لوگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے کچھ لان کے حصے میں جمگھٹے کی صورت میں کھڑے تھے۔ حادثہ چونکہ شام کو پیش آیا تھا اور اب رات ہو چکی تھی اس لئے اندر سے عورتوں کی چیخ وپکار سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید سب رو رو کر نڈھال ہو چکی تھیں۔

ولید' شہرینہ کا ہاتھ پکڑے تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ملازموں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لابی میں آ کر وہ رک گیا' اکبر شاہ وہیں غم سے نڈھال چند آدمیوں کے گھیرے میں تھا جبکہ مردان علی شاہ کا تھرکتا متحرک سراپا اس وقت مٹی کے ڈھیر کی طرح گداز صوفے میں پڑا تھا' وہ بس آتے جاتے لوگوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

ولید کو اس پل وہ اس غبارے کی مانند لگے جس کی ہوا موافق حالات کی سوئی نے نکال کر رکھ دی ہو۔ بہر حال انہیں اس عظیم صدمے سے دوچار دیکھ کر اس کا دل بری طرح افسردہ ہو گیا۔ اسے توقیر شاہ کی حادثاتی موت پر بے حد رنج تھا' وہ مردان علی شاہ کے پاس آ کر چپ چاپ کھڑا رہا' ایسے مواقع پر تسلی یا دلاسے کے الفاظ عموماً بہت ادنیٰ' حقیر اور بے معنی سے معلوم ہونے لگتے ہیں مگر وہ بھی ایک آدمی تھا تو کوئی ایسے ہی بے معنی حقیر سے الفاظ تلاش کرنے لگا۔

مردان علی نے اس کی طرف دیکھا پھر حزن آمیز سانس کھینچ کر سر جھکا لیا اور رومال سے آنکھیں رگڑنے لگے۔ جس میں وقفے وقفے سے پانی اتر رہا تھا' یہ غم کوئی معمولی تو نہیں تھا۔ ان کا جواں سال بیٹا ان کا دایاں بازو ان کا جانشین' ان کا' ارمانوں کا مان' ٹوٹ گیا تھا۔ ان سے بچھڑ گیا تھا۔ توقیر شاہ تو ان کا سیاسی کیریئر تھا وہ سیاست میں بھی یکلخت بے سہارا ہو کر رہ گئے تھے۔ خود کو کبھی نہ ٹوٹنے والا جھکنے والا خیال کرنے والے کس طرح آن واحد میں ٹوٹ گیا تھا' بڑا روح فرسا مشاہدہ تھا ولید حسن کا... اسے توقیر شاہ کی فخر سے تنی گردن یاد آ گئی۔

اس نے متاسف انداز میں سانس کھینچی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

سچ ہی ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے تو نہ ایک ساعت پیچھے ہوتا ہے نہ ایک ساعت آگے۔ موت کسی کو نہیں دیکھتی چاہے وہ دولت میں قارون ہو' تکبر میں نمرود اور فرعون ہو' شہ زوری میں رستم' خوبصورتی میں یوسف علیہ السلام صبر میں ایوبؑ' درازی عمر میں نوح علیہ السلام' عدل و سیاست میں عمر رضی اللہ عنہ' ملک گیری میں سکندر' عدل و انصاف میں نوشیرواں' حکمت میں لقمان' سخاوت میں حاتم' موسیقی میں تان سین' جہالت میں ابو جہل' فلسفہ اسلام میں امام غزالیؒ سیاحت میں ابن بطوطہ یا رتبہ شہادت میں امام حسین رضی اللہ عنہ ہی کیوں نہ ہوں موت سے کسی کو رستگاری نہیں۔

انسان اپنی غفلت میں اگر موت کو بھول جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ موت بھی اسے بھول جاتی ہے' موت کا فتویٰ اٹل ہے۔

اسے بے اختیار شیخ سعدیؒ کا وہ شعر یاد آ گیا جو آغا جی اکثر سنایا کرتے تھے

(یعنی عاقبت کی رہگذر میں دنیا ایک پل کی مانند ہے کوئی عقل مند پل بھر کے لئے اپنا گھر نہیں بناتا)

اس نے مردان علی شاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز تھپکی دی تو انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا‘ کچھ کہنا چاہا مگر لب کپکپائے‘ انہوں نے سر دوبارہ جھکا لیا اور نڈھال سے انداز میں صوفے کی پشت سے لگ کر خود کو ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دوسرے لوگ بھی آکر ان کے ارد گرد بیٹھ گئے تھے‘ عجیب فارمیلٹی نبھائی جا رہی تھی‘ ہر کوئی بڑھ چڑھ کر تعزیتی جملے ادا کرنے کی تگ ودو میں تھا‘ ولید وہاں سے ہٹ کر شہرینہ کی طرف آیا جو ایک طرف کھڑی تھی۔لابی میں مرد ہی مرد بھرے پڑے تھے اس نے کچھ سوچ کر اسے ساتھ لیا اور ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں عورتوں کی موجودگی کا گمان تھا مگر اسی پل دروازے سے آمنہ علی باہر نکلتی نظر آئی۔

سیاہ رنگ کے سادے سے سوٹ میں ملبوس تھی‘ منتشر بالوں پر ہاتھ پھیرتی غم سے نڈھال دکھائی دے رہی تھی‘ جیسے ہی اس کی نظریں ولید پر اٹھیں‘ بے تابانہ اس کی طرف بڑھی۔ دوسرے ہی پل ٹوٹی شاخ کی طرح اس کے سینے سے آلگی۔

ولید کے لئے یہ خاصا اعصاب شکن حملہ ثابت ہوا۔یوں اس کا اتنے لوگوں کے سامنے سینے سے آلگنا‘ اس کے رگ وپے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔اسے اپنی سانس سینے میں اٹکتی

محسوس ہوئی تاہم اس کی غمزدگی اور رنجیدگی کو محسوس کر کے اس کا دل گداز ہو گیا۔اس نے نرمی سے اس کا بازو تھام کر اسے خود سے الگ کیا اور قریبی سنگل صوفے پر بٹھا دیا۔

”ولید فدا بھائی نے ادا توقیر کو قتل کر دیا۔ تمہیں پتہ چلا کہ میرا اکڑیل بھائی رخصت ہو گیا‘ آج تو اس کی شادی تھی آج تو اسے دولہا بننا تھا۔“ وہ زار و زار رونے لگی۔

”ہاں مجھے ابھی ہی اطلاع ملی ہے اس حادثے کی۔“ اس نے تاسف سے کہا۔

”دیکھ رہے ہو تم یہ ہنستا بستا گھر کیسے اجڑ گیا‘ کل تک یہاں قہقہے گونج رہے تھے‘ نغمے بکھر رہے تھے۔“ وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی‘ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے بولی۔

”تم اس کی شادی میں نہیں آنے والے تھے دیکھو اس کی مرگ میں چلے آئے۔“ پھر اس کے ہاتھ پر چہرہ ٹکا کر سسکنے لگی۔

ولید نے بے حد آہستگی سے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک غمزدہ سانس کھینچی۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہے' وہ صرف تمہارا ہی نہیں میرا بھائی بھی تھا۔" اس کے لہجے میں غم کا حقیقی تاثر تھا اور جونہی نگاہ شہرینہ پر پڑی جو بڑی خاموشی سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ولید سے نظر ملتے ہی اس نے سر جھکا لیا' اس کا چہرہ بے حد سپاٹ تھا۔

"ولید کیا یہ سفاکی اور درندگی کی انتہا نہیں ہے کسی کے ہنستے بستے گھر کو آن واحد میں اجاڑ دینا' باپ سے اس کا کڑیل بیٹا چھین لینا' بہنوں سے اس کا سائبان جیسا بھائی اٹھا لینا' کیا ان ظالموں کے دل ایک پل کے لئے بھی لرزے نہ تھے اسے مارتے ہوئے۔" آمنہ اٹھ کر اس کے نزدیک چلی آئی' اس کی بات پر ولید کی آنکھوں میں عجیب سی سرخیاں اترنے لگیں۔ اس نے بے اختیار ذرا سا رخ موڑ کر مردان علی شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح متوجہ تھے نظریں ملنے پر مضطربانہ انداز میں نگاہوں کے ساتھ چہرہ موڑ لیا۔

ولید کا دل افسردگی کی لپیٹ میں آ کر رہ گیا کئی منظر دل کی دیواروں پر لہو بن کر کھولنے لگے۔

'یہ تو مکافات عمل ہے۔' اس نے کہنا چاہا مگر ایک سوگوار سی سانس بھر کر رہ گیا اور روتی ہوئی آمنہ علی کو دلاسا دینے لگا۔ بہرکیف وہ اس پل اس کی ہمدردی اور تسلی کی ضرورت مند تھی۔

شہرینہ چپکے سے وہاں سے جا کر لابی کے اندر آخری حصہ میں گرل کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی' جہاں کچھ عورتیں تھیں وہ ہر ممکن کوشش کر رہی تھی کہ اس کے چہرے پر سوائے رنجیدگی کے کچھ ظاہر نہ ہو اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی تھی' کچھ سوچ کر وہ ولید کے نزدیک آ کر بولی۔

"آپ مجھے اپنی گاڑی کی چابی دے دیں میرا خیال ہے میرا یہاں زیادہ دیر ٹھہرا رہنا کچھ مناسب نہیں ہے۔"

"ہوں۔" ولید چونکا اور اس کی طرف سر اٹھایا اور کچھ دیر اسے یونہی خالی نظروں سے دیکھتا رہا' وہ شاید اس لمحے اس کی موجودگی کو فراموش کر بیٹھا تھا پھر چونکتے ہوئے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں اور سر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے مگر اتنی رات تمہارا تنہا جانا مناسب نہیں ہے چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔" پھر اس نے آمنہ علی کی طرف رخ کیا جو صوفے پر بیٹھ کر سسکیاں بھر رہی تھی۔

"کچھ خبر ہے مرحوم کو آخری آرام گاہ تک کب تک لے جانے کا پروگرام ہے۔"

"بابا سائیں کے کچھ واقف کار آجائیں پھر ہی یہ رسم ہوگی' میرا خیال ہے فجر تک ہوگا۔" یہ بتا کر وہ شدت کرب سے رونے لگی۔

شہرینہ نے اضطرابی انداز میں ولید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ رہنے دیں میں خود چلی جاتی ہوں آپ کا یہیں رہنا ابھی بہتر ہے۔" اس نے ایک اچٹتی افسردہ سی نظر آمنہ علی پر ڈالی اور عجیب سے لہجے میں بولی مگر ولید اس کے لہجے کو محسوس نہ کر سکا' تذبذب کے عالم میں جیب سے چابی نکالنے لگا اور کچھ کہنا چاہا کہ وہ تسلی آمیز انداز میں خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ہاتھ سے چابی لے کر بولی۔

"آپ فکر نہ کریں میں پہنچتے ہی آپ کو موبائل پر اطلاع دے دوں گی۔" وہ یہ کہہ کر رکی نہیں اور سرعت سے لابی کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

X...X...X

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کمرے کا جائزہ لیا' درمیانی سائز کا کمرہ تھا' جس میں اس کے جہیز کا سامان بہت قرینے سے آ گیا تھا۔ کمرے کو زیادہ تر تازہ پھولوں سے سجایا گیا تھا' خصوصاً گلاب سے' جس کی خوشبو پورے کمرے کو معطر کر رہی تھی۔

اس نے بیڈ پر جا بجا ٹانکے گلاب کو دیکھا اور ایک نشتر سا اترتا محسوس کیا۔

اسے اپنی نہیں اس شخص کی قسمت پر بھر بھر کر رونا آیا جو جانے کس جرم کی پاداش میں تانیہ قریشی کو پا رہا تھا۔ ایک ناقدر شناس' ناشکری' منافق لڑکی کو جو چاند کو پانے کی خواہش میں پستی میں اتر گئی تھی' اس نے دکھتی کمر بیڈ کی پشت سے ٹکا دی اور سر بھی لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ایسا لگ رہا تھا گردن کی شریانیں کسی بھی لمحے پھٹ جائیں گی۔

متورم آنکھوں میں ایسی جلن ہو رہی تھی جیسے کسی نے ڈھیر سارے انگارے بھر دیئے ہوں' بے بسی' خوف نے اس کے اعصاب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا' وہ خود نہیں جانتی تھی کہ آنے والے کا استقبال وہ کس طرح کرے گی اور آنے والا اس کا خیر مقدم بھی کرتا ہے یا نہیں' اس کے دل پر ایسا رنج تھا جس کا سبب اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی بہت سا

رونا مگر کیوں؟ اسے پتہ نہیں تھا دروازہ کھلنے کی آہٹ پر اس نے آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور جلدی سے سیدھی ہو کر سر جھکا لیا‘ اسے اپنا دل خوف کی دلدلی زمین میں دھنستا محسوس ہونے لگا۔

اسے اپنے سارے کردہ ناکردہ گناہ یکبارگی آنکھوں تلے لہرانے لگے۔ اس کی روح یوں کانپنے لگی جیسے یہ محشر کا دن ہو صور پھونکے جانے کے بعد کے لمحات ہوں۔

ابھی وہ کھینچ کر کٹہرے میں لائی جائے گی مگر سامنے تخت پر خدائے حقیقی نہیں مجازی خدا کو بیٹھنا تھا جس سے رحم کی بھیک ملنے کی امید تقریباً ناپید تھی۔

وہ قریب آیا تو تانیہ کو لگا اس کا دل پھٹ جائے گا اور جوں ہی اس نے اس کا ہاتھ تھاما تو ضبط کی چٹان کے نیچے دبا ہوا سیلاب بہ نکلا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنے والا سٹپٹا کر رہ گیا۔

”یہ کیا کر رہی ہیں تانیہ! پلیز ٹیک اٹ ایزی۔“ اس کی نرم آواز نے اس کے بھل بھل بہتے آنسوئوں کی روانی کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔

اس نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا جہاں چاند جیسی مہربان اور نرم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ اس کا ہاتھ اپنائیت اور نرمی سے سہلانے لگا پھر پانی بھر کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ آنسو اگر کسی پچھتاوے کے ہیں تو انہیں بہا ہی دیجئے‘ ہاں اگر کسی خوف اور بے یقینی کے ہیں تو مجھے دان کر دیجئے‘ میں انہیں سمیٹ لوں گا۔“ وہ آہستگی سے بولا تو گلاس اس کے ہاتھ میں کانپ گیا‘ پانی چھلک کر کپڑوں پہ گرا‘ اس نے لرزیدہ دل‘ کو سنبھالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر نظریں چرا کر بہ مشکل ایک گھونٹ بھر کر گلاس کارنر ٹیبل پر رکھنا چاہا کہ اس نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

”کچھ کہنا چاہتی ہیں شاید آپ۔“ وہ اس کی کانپتی پلکوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

شہرینہ کے جملے ذہن کی سطح پر ٹکرانے لگے۔

”تم ایک ٹھنڈی چھائوں میں جا رہی ہو تانیہ! اینڈ آئی ہوپ تم اس چھائوں میں بیٹھ کر اپنے وہموں‘ وسوسوں اور خوف کو بآسانی اپنے دل سے نکال سکو گی‘ مجھے چہرہ شناسی کا دعویٰ نہیں ہے مگر کچھ چہرے از خود اپنے کردار کا آئینہ دار ہوتے ہیں‘ انہیں ایک نظر دیکھنے والا انہیں اندر تک جان لیتا ہے اور ایسے لوگ بہت رحم دل اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔“

اس نے ایک مضمحل سانس کھینچتے ہوئے ہلکے سے سر ہلا دیا۔

"ہاں میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔" اسے اپنا اعتماد بہر حال خود ہی بحال کرنا تھا' اس نے سوچا ایسے شخص سے کچھ بھی نہ کہہ کر اسے دھوکا دینا گناہ کبیرہ ہوگا اور وہ اپنے گناہوں کے بوجھ میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ ایک مسلسل ذہنی آزار کی کیفیت سے گزر رہی تھی اس سے بے حد تھک گئی تھی' اب ٹھنڈی چھاؤں نہ سہی ٹیک لگانے کو سوکھا درخت ہی مل جاتا وہ اس سے ٹیک لگانا چاہتی تھی۔

"آں' آں ایک منٹ۔" اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکا تھا اور اپنی جیب سے ایک خوبصورت لاکٹ نکالتے ہوئے بولا۔

"آپ نے منہ دکھائی میں تو مجھے آنسو ہی دے دیئے' مگر میں آپ کو یہ دے رہا ہوں۔" اس کا انداز شگفتہ سا تھا مگر تانیہ کو کسی تیر کی طرح اپنے دل میں ترازو ہوتا محسوس ہوا اس نے اس کے بڑھے ہوئے دونوں ہاتھوں کو ایک کرب سے گزرتے ہوئے روک دیا۔

"فیاض صاحب!"

اس کے ہاتھ ٹھٹھر گئے' دوسرے پل وہ گہری سنجیدگی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

"میں آپ کو یہ آنسو نہیں دینا چاہتی تھی' میں جانتی ہوں کہ آپ کی پہلی توقع بلکہ حق میری مسکراہٹ ہونی چاہئے تھی' آپ جیسے خالص انسان کے لئے خالص شفاف مسکراہٹ' مگر میں آپ کی توقع پر پوری نہ اتر سکی' اس کا انعام یہ تو نہیں ہونا چاہئے۔" اس نے بے چارگی سے اس کے ہاتھ میں جھولتے لالٹ کو دیکھا۔

"تو اس کا انعام کیا ہونا چاہئے۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا مگر اس کے ہونٹوں کی تراش میں مدھم مسکراہٹ جھلکی تھی۔

"کم از کم یہ نہیں۔" وہ چہرہ جھکا گئی اور اضطرابی انداز میں انگلیوں میں موجود چھلے کو گھماتے ہوئے بولی۔

"آپ شاید میری بات کو سننا نہیں چاہتے یا پھر سمجھنا نہیں۔"

"ہاں یہی سمجھ لیجئے۔" وہ یکدم گہری سنجیدگی کی لپیٹ میں آتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟۔" وہ بری طرح بکھرنے لگی۔

"اس لئے کہ میں وہ سب جانتا ہوں جو تم مجھے بتانا' سنانا چاہتی ہو۔" اس نے ایک گہری سانس کھینچ کر لاکٹ کو دیکھا' اسے انگلیوں سے لپیٹتے ہوئے ایک دو پل کا توقف کرتے ہوئے تانیہ کا چہرہ دیکھا پھر سادہ سے انداز میں بولا۔

"سکندر نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا' میں سکندر کو ایک عرصے سے جانتا ہوں' اس کی سرشت سے واقف ہوں' اس کے قلم میں محض سچائی نہیں ہے' اس کی روح' اس کے باطن میں بھی سچائی ہے۔اس نے میرے ساتھ کوئی دھوکا دہی نہیں کی۔ یار یہ بتاؤ کیا تم اس شادی سے خوش ہو؟" اس نے یہ کہتے ہوئے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا جو تحیر آمیز بے یقینی سے اس کی جانب اٹھی ہوئی تھی' وہ پلکیں جھکا گئی اور ایک ہلکی سی سانس کھینچتے ہوئے سر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔"

فیاض کے چہرے پر تاریک سا سایہ لہرا گیا۔

"کیوں؟۔" اس کی آواز پست سی ہو گئی۔

"اس لئے کہ میں آپ جیسے بلند اور عظیم انسان کے قابل نہیں تھی' میں خود کو اس انعام کی مستحق نہیں سمجھتی تھی' میں اپنے خوابوں کی' اپنی نادانیوں کی تھوڑی سے سزا بھگتنا چاہتی تھی' یہ عام معافی میری روح پر کچوکے کی طرح لگ رہی ہے۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

فیاض کے چہرے کے تنے ہوئے زاویے یکدم ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ بے ساختہ مسکرانے لگا۔

"بس اتنی سی بات۔" پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"مجھے یقین تھا سکندر کی بہن اس جیسی ہی خالص اور سچی ہو گی' مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی طرف سے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کی' یہ تمہاری پاک دامنی کی دلیل ہے اور تانیہ! میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو عورت کو شو پیس سمجھ کر اس کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں کہ کہیں کوئی عیب تو نہیں ہے اس میں' نہیں عورت تو لباس ہوتی ہے اور مرد اس کا لباس' اور لباس سجانے کو نہیں ایک دوسرے کے عیوب ڈھانپنے کو پہنا جاتا ہے۔"

وہ سانس روکے بیٹھی رہ گئی' وہ مزید کہہ رہا تھا۔

"گھر ہوس سے نہیں باہمی اعتماد اور محبت سے بنتے ہیں' آخر ہوس اور محبت میں فرق ہی کیا رہ جائے کہ ہم جس سے محبت کرتے ہوں اسے اس کی تمام بشری کمزوریوں اور خوبیوں کے

ساتھ نہ چاہیں‘ محبت کی خوشی باہمی اعتماد‘ خلوص اور ایک دوسرے کی خامیوں کو نظر انداز کرنے سے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔“

اس نے لاکٹ تانیہ کے گلے میں ڈال دیا اور اعتماد بخشنے والے انداز میں مسکرایا۔

تانیہ کو لگا جیسے دکھ کے صحرا میں خوشی‘ راحت اور طمانیت کی بوند ٹپکی ہو۔

تھکے ہوئے ذہن کو آسودگی میسر آگئی ہو۔

X...X...X

صبح اس کی آنکھ کھلی مگر وہ یونہی بستر پر کسلمندی سے پڑی رہی‘ صغریٰ اسے جاگتے پا کر اس کے کمرے میں چلی آئی۔

”سویرے تانیہ بی بی کا فون آیا تھا آپ سو رہی تھیں میں نے جگایا نہیں۔“ وہ کھڑکی کے پردے کی ڈوری کھینچتے ہوئے بولی تو وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تو بے وقوف مجھے اٹھانا چاہئے تھا۔“

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

میں نے سوچا آپ رات اتنی دیر سے تو لوٹی تھیں اور فیر ساری رات تو کتابوں میں سر کھپاتی رہی ہیں‘ سویرے کیسے اٹھاتی۔“

”تمہیں کس نے کہا میں ساری رات کتابوں میں سر کھپاتی رہی ہوں۔“ اس نے صغریٰ کو دیکھا۔

”لیں جی‘ رات بھر تو بتی جلتی رہی تھی آپ کے کمرے کی‘ امتحانات سر پر ہیں پڑھائی ہی کرتی رہی ہوں گی نا۔“ صغریٰ نے کہا تو اس نے نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹا لیں‘ اور بال لپیٹتے ہوئے بیڈ

سے اتر گئی۔

مسلسل جاگتے رہنے کے باعث اس کی آنکھوں کے زیریں کنارے بے حد سرخ ہو رہے تھے‘ سر بھاری بھاری سا ہو رہا تھا‘ وہ منہ دھو کر ناشتے کی میز پر آئی۔

”رات تم اکیلی ہی آئی تھیں۔“ بھابی نے ناشتے کے لوازمات اٹھا کر میز کی صفائی کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"میں دیر تک جاگتی تمہارا انتظار کر رہی تھی جب ولید کا فون آیا کہ تم گھر پہنچیں یا نہیں' یہ سن کر مجھے اتنی حیرت ہوئی بلکہ شاک لگا کہ اس نے اتنی رات تمہیں تنہا کیسے آنے دیا۔اس قدر غیر ذمہ دار تو وہ بالکل نہیں تھا۔" بھابی حیرت کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔

"انہیں میں نے ہی روک دیا تھا ہمراہ آنے سے' وہ مجھے اکیلا بھیجنے کے حق میں نہیں تھے۔" وہ مگ میں چائے انڈیل کر سیدھی ہوئی تو بھابی سے نظریں ملیں' اس نے باسرعت پلکوں کا جال گرا دیا۔

"مجبوری تھی۔" وہ آہستگی سے بولی اور ڈائننگ روم کی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی اور گلاس وال سے لان کا وہ خوبصورت حصہ دیکھنے لگی جہاں دھیرے دھیرے اپنے قدم جما رہی تھی۔

اس کے ذہن کے ایوانوں میں بہت شور برپا تھا مگر اس کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ تھا جو سکون کا نہیں خود آزادی کا تھا مگر بہت سی آنکھوں کی طرح بھابی کی آنکھ بھی بہر حال اتنی باریک بین نہیں تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کتنی احمق لڑکی ہو تم' ذرا بھی عقل نہیں ہے' یہ تو اچھا ہوا وسیم یا آغا جی کسی کو بھی پتہ نہیں چلا۔" بھابی اس کے نزدیک چلی آئیں اور اسے غصے سے گھورنے لگیں۔

"گاڑی کا ہارن سن کر وسیم نے پوچھا تھا کہ شیری کس کے ساتھ آئی ہے' میں نے جھوٹ بول دیا کہ ولید چھوڑ گیا ہے' دل تو چاہ رہا تھا اسی وقت تمہاری خبر لے لوں مگر بس صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔"

"شکریہ اس عنایت کا۔" وہ رخ موڑ کر شرارت سے مسکرائی۔

"بکومت کسی دن پٹ جاؤ گی میرے ہاتھوں۔" انہوں نے اسے جھڑکا پھر حیرت آمیز قسم کی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔

"مجھے تو ولید کی غیر ذمہ دارانہ حرکت پر حیرت ہو رہی ہے۔"

"میں نے کہا نا' وہ تو مجھے بالکل بھیجنے پر تیار ہی نہ تھے میں نے ہی زبردستی انہیں روک دیا تھا۔"

اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ بھابی بے ساختہ اس کے چہرے کا از سر نو جائزہ لینے پر مجبور ہو گئیں۔

"بلے بلے' آج تو بڑی سائیڈ لے رہی ہو ولید کی' خیر تو ہے خیر تم گھبراؤ مت میں اس سے باز پرس نہیں کرونگی۔" اس کے انداز میں شرارت تھی۔

"جب قصور ان کا ہے ہی نہیں تو آپ کیوں ان سے باز پرس کریں گی۔" وہ کھڑکی سے ہٹ گئی اور چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے رخ موڑ گئی اور سنگل صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

"وہاں حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ ان کی موجودگی وہاں ضروری تھی۔" وہ آہستگی سے بولی پھر ایک ہلکی سی سانس کھینچ کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"کبھی کبھی اچانک ہی پیروں میں نادیدہ سی بیڑیاں آپڑتی ہیں قدم کہاں اٹھانے ہوتے ہیں اور کہاں جا پڑتے ہیں۔" پھر مجروح انداز میں ہنس کر مگ کی سطح سے اٹھنے والی بھاپ پر نگاہیں جمادیں اسے لگا یہ بھاپ چائے کے مگ سے نہیں اس کے دل سے اٹھ رہی ہو۔

"اس کی وہاں بہت ضرورت تھی' مجھ سے بھی زیادہ اس کی شاید کسی اور کو ضرورت ہے۔" اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا تھا مگر بھابی' صغریٰ کی طرف متوجہ تھیں جو ان کے سر پر سوار ہو گئی تھی۔

"آج کھانے میں کیا بنانا ہے' بڑی بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں بھابی سے پوچھ لو۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میرا سر کاٹ کر پکالو اگر پکا سکو تو۔" وہ صغریٰ کے یکلخت نازل ہونے پر جھنجھلا گئی تھیں۔

"چچ چچ کیوں ہم معصوم جانوں کو بھوکا مارنے کا ارادہ ہے' سر تو خالی ہے تمہارا' سوائے سوپ کے اس کا کچھ نہیں بن سکتا۔" وسیم بھائی گھڑی کی اسٹریپ باندھتے ہوئے ادھر چلے آئے' بھابی کا جملہ ان کے کانوں میں پڑا تھا اور ان کی زبان میں کھجلی نہ ہو یہ کیسے ممکن تھا۔

"آپ کو تو موقع چاہئے بس ہم عورتوں کو ناقص العقل ہونے کا طعنہ دینے کا۔" بھابی نے انہیں منہ بنا کر دیکھا صغریٰ دانت نکال کر ہنسنے لگی جواباً اسے بھابی کی تیز نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔

"تم چلو' سر پر سوار مت ہو میں آرہی ہوں۔" انہوں نے چلتا کیا۔

وسیم بھائی نے جاتی صغریٰ کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر رخ دوبارہ بھابی کی طرف کیا اور بے ساختہ ہنس پڑے' پھر جلدی سے بولے۔

"میرا سگریٹ کا پیکٹ دکھائی دے رہا ہے نہ میری پرفیوم' میں تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔" انہوں نے ادھر آنے کا گویا مدعا بیان کیا' شہرینہ ان کی عادت سے واقف تھی'

انہیں اکثر و بیشتر سامنے کی چیزیں بھی دکھائی نہیں دیتی تھیں، جب تک مونا بھابی اٹھا کر نہ دیتیں۔

"سگریٹ کا پیکٹ آپ رات بھر میں پھونک چکے ہیں، ایک پیکٹ میں بیس سگریٹیں ہوتی ہیں بیس ہزار نہیں اور پرفیوم کی خالی بوتل میں کل ڈسٹ بین میں پھینک چکی ہوں۔""

انہوں نے یہ کہہ کر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"آں، ہا، دیکھ لو یہ حشر ہوتا جا رہا ہے تمہاری صحبت کا، اب یادداشت بھی کام نہیں کر رہی ہے۔" انہوں نے شہرینہ کی طرف دیکھ کر شرارت سے آنکھ دبائی پھر مونا بھابی کے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔

وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ ان دونوں کو جاتا دیکھتی رہی۔ وہ اب بھابی کو کتنا ستائیں گے تپائیں گے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

اچانک اس کی مسکراہٹ دم توڑ گئی، اس نے چائے کا مگ کانچ کی تپائی پر رکھ دیا اور اٹھ کر دوبارہ گلاس وال سے باہر جھانکنے لگی۔

رات کے منظر ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے جاوداں ہو گئے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ایک عجیب سی بے کلی روح میں چٹکیاں بھرنے لگی۔

"محبت زنجیر نہیں ہوتی کہ آپ کسی کے پیروں میں ڈال کر اسے ہمیشہ کے لئے باندھ لیں، ہاں کچھ لوگوں کو باندھا بھی جا سکتا ہے، مگر پھر وہاں محبت کی اجلی صورت نہیں رہتی بلکہ محبت کی مسخ شدہ صورت رہ جاتی ہے۔

جبر، زور، زبردستی سے محبت کے پودے کو کیڑا لگ جاتا ہے وہ وقت کے ساتھ سوکھنے لگتا ہے اور اس کی ٹنڈ منڈ شاخیں چھاؤں کی بجائے دھوپ کے احساس کو بڑھا دیتی ہیں۔"

اس نے گلاس وال سے آسمان کی وسعتوں میں اڑتے کبوتروں کے غول کو دیکھا، اسے اپنی ڈائری میں لکھا ہوا ایک پیرا گراف یاد آنے لگا۔

"جب تم کسی سے محبت کرتے ہو تو اسے آزاد چھوڑ دو اگر وہ لوٹ آئے تو اس کی پرستش کرو اور اگر واپس نہ آئے تو سمجھو کہ وہ کبھی تمہارا ہوا ہی نہ تھا۔"

وہ گلاس وال کے پاس سے ہٹ گئی اور بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک ہلکی سی سانس بھری اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

X...X...X

ولید' نومی کی ذہنی حالت سے سخت پریشان ہو گیا تھا۔اس نے اسے ہر ممکن طریقے سے سمجھایا مگر نومی تو گویا ہر شے سے بے نیاز ہو چکا تھا' ہر آواز پر ہر تاویل پر کان بند کر چکا تھا' ایسا لگتا تھا اس کے سامنے دنیا کی حقیقت کھل چکی ہو' اس کی نگاہوں میں اس بزرگ کی بینائی منتقل ہو گئی ہو جس کی نگاہ میں دنیا درس عبرت کے سوا کچھ نہ ہو۔

''نومی! تم جانتے ہو تمہاری جلد بازی سے آنٹی اور سکندر پر کیا گزرے گی۔'' ولید نے بڑی بے چارگی سے اور کرب سے اسے دیکھا۔

جواباً وہ مجروح انداز میں ہنس دیا۔

''میں زندہ تھا تب کون سا ان کے لئے راحت اور سکون کا باعث رہا ہوں' ہمیشہ ان کے لئے مسائل ہی کری ایٹ کئے ہیں' شاید میرے مرنے کے بعد انہیں راحت نصیب ہو جائے۔''

''یہ تمہارا خیال ہے اور بالکل غلط۔'' ولید نے اس کی بات کاٹ دی۔

''آنٹی کی نگاہیں تمہاری رہائی کی منتظر ہیں' سکندر پاگلوں کی طرح تمہاری رہائی کی کوشش میں لگا ہوا ہے' کیا تمہارا یہ اقدام ان سب پر قیامت بن کر نہیں ٹوٹے گا۔''

نومی نے چہرہ جھکا لیا اور شدت کرب سے لب کاٹنے لگا پھر چند لمحے توقف کے بعد سر اٹھایا تو آنکھوں میں سرخیاں اترتی دکھائی دے رہی تھیں' پھر آہستہ آہستہ ان میں پانی اتر آیا۔

''ولید بھائی! میں بے قصور نہیں ہوں' میں نے بہت گناہ کئے ہیں میرا دامن آلودہ ہے۔ میں نے اللہ کے ہی نہیں بندوں کے بھی حقوق غصب کئے ہیں اور سب سے بڑا گناہ قتل کا کیا ہے ایک مسلمان کا قتل' جس کی سزا دنیا میں نہیں تو آخرت میں مل کر رہنی ہے' آپ خود سوچیں ایک مجرم کو اس کے جرم سے بچانا از خود جرم نہیں ہو گا اور بالفرض میں آزاد بھی ہو گیا تو میرے اندر کی عدالت مجھے عمر بھر کچوکے لگائے گی' مجھے ضمیر کی خلش چین نہیں لینے دے گی۔

ولید بھائی! میں نے جب سے ہوش سنبھالا' ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ خود کو مسرور کر سکوں' لیکن مجھے کبھی سچی خوشی حاصل نہ ہو پائی اس لئے کہ میں نے دوسروں کی خوشیاں چھین کر اپنی آرزو پوری کرنے کی کوشش کی' میں نے صرف اپنے لئے جینا چاہا۔"

اس کی آواز بھرا گئی' اس نے ولید کے دونوں ہاتھ اپنے لرزیدہ ہاتھوں میں جکڑ لئے اور آنسوئوں کا گولا حلق سے اتارتے ہوئے بولا۔

"میں نے معمولی جرم نہیں کیا ہے گناہ کبیرہ میں ملوث رہا ہوں' میں اعتراف جرم کر کے اس مسلسل اذیت سے نجات پانا چاہتا ہوں' آپ یا کوئی اور مجھے سولی سے تو بچا لے گا' مگر کیا روز محشر بچانے آئے گا جب عظمیٰ یاسر اور دوسرے بے گناہ لوگ مجھ سے حساب مانگیں گے میرا گریبان پکڑیں گے' بتایئے اس وقت کون ہو گا جو میری مدد کرے گا مجھے پل صراط سے بآسانی گزار دے گا۔"

"نومی...." ولید نے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"نہیں ولید بھائی! میں روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں' اس آلودہ روح کے ساتھ زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔ ہاں مرنا شاید اس سے زیادہ مشکل مگر یہ اذیت ایک بار جھیلنی ہے بار بار تو نہیں نا۔"

"اچھا کیس چلنے دو چند ماہ کی تو بات ہے۔" ولید نے نرمی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"چند مہینے۔" وہ سلاخوں پر سر ٹکا کر ہنس دیا۔

"یہاں تو چند لمحے گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔" پھر یکدم سر اٹھا کر اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ولید کو دیکھنا چاہا مگر اسے لگا سارا منظر پانیوں میں لہرا گیا ہو اس نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔

"نومی!" ولید نے ہاتھ بڑھا کر جلدی سے اسے تھاما وہ چکرا کر لہرا گیا تھا۔

"نومی آر یو اوکے؟" اس نے مضبوطی سے اس کے دونوں بازو پکڑ کر اسے کھڑا رکھنے کی کوشش کی۔

دبلا پتلا نومی اس کی مضبوط گرفت میں گرنے سے بچ تو گیا مگر پنڈولم کی طرح اس کی گردن لہرانے لگی، آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور ایک گہری سانس کھینچ کر فرش پر بیٹھنے لگا۔

”خود کو کمپوز کرو نومی! تم تو بہت بہادر لڑکے ہو دیکھو یہی زندگی ہے یہی اس کے تجربات مرد اس کا نام ہے جو ان تجربات سے سلامت گزر جائے، یہ تلخیاں ہمیں مضبوط کرتی ہیں کمزور نہیں۔“ ولید اسے دھیرے دھیرے تھپکنے لگا تب وہ یکدم سسکنے لگا تھا۔

”میں اماں سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں ولید بھائی!“

”ہاں ضرور، ضرور ملنا، اگلی پیشی میں، میں خود انہیں لے کر آئوں گا۔“

”نہیں، نہیں، انہیں اس دن مت لے کر آیئے گا، میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔“

”اچھا کل لے کر آئوں گا۔ بس؟“ وہ اسے پچکارنے لگا۔

نومی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور آستین سے منہ پونچھتے ہوئے ایک متاسفانہ سی سانس بھری اور ہلکے سے ہنس دیا۔

یہ ہنسی پر ملال اور محرومی سے بھری تھی کہ ولید کے دل پر چھائی رنجیدگی میں اضافہ ہو گیا۔

”سکندر بھائی کو کچھ مت بتایئے گا، وکیل صاحب سے آپ کی جو باتیں ہوئی ہیں وہ بھی اور جو مجھ سے ہوئی ہیں وہ بھی، میں نے انہیں کبھی کوئی خوشی نہیں دی، ان کی محبت شفقت کہ ہمیشہ جبر سمجھا، مگر یہ فلسفہ سمجھ میں اب آیا کہ چھوٹوں کے لئے جبر ضروری ہے ان کا جبر اصلاح ہے، وہ غصہ اور خفگی میری بہتری کے لئے تھی، وہ نفرت نہیں تھی محبت کی شدت تھی۔“ اس کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”انہیں کہیئے گا ولید بھائی وہ مجھے معاف کر دیں اور اماں سے بھی کہیئے گا اپنے ناخلف بیٹے کو معاف کر دیں۔“ اس نے یہ کہہ کر نگاہیں جھکا لیں۔

ولید کو لگا اس کا دل اندر ہی اندر پھٹ کر ٹکڑے ہو جائے گا۔

”نومی! تم ایسا کوئی بھی جذباتی قدم نہیں اٹھائو گے، وعدہ کرو، دیکھو تمہیں ہم سب کی تھوڑی سی خوشی اگر منظور ہے تو تم کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے ہم سب کی محبتوں کو مد نظر

رکھو گے اور وکیل صاحب سے مشورہ ضرور کرو گے۔" اس نے بے حد تھکے لہجے میں نومی کے جھکے سر کو دیکھا تھا۔

اس کے چہرے پر خوف کی بجائے ایک عجیب سا ٹھہراؤ تھا ایسا ٹھہراؤ جسے کم از کم زندگی کی علامت نہیں کہا جا سکتا تھا اور یہی بات ولید کو تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

دو راتوں کے مسلسل رتجگے نے اسے پہلے ہی جسمانی طور پر تھکا دیا تھا اور اب نومی کی ذہنی حالت نے اسے بھی ذہنی طور پر نڈھال کر دیا' اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بے طرح اذیت کے احساس سے گزرتے ہوئے نومی کو دیکھا اور جانے کیوں اسے اپنا دل ایک عجیب سی اتھاہ میں ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔ ایک نادیدہ خوف رگ رگ کو آکٹوپس کی طرح جکڑ رہا تھا ایسی کیفیت بس ایک بار ہوئی تھی۔ جب اس نے اپنی ماں کو ان ظالموں کے خوف سے بھاگتے اور پھر خار زار میدان میں گرتے دیکھا تھا اور ایک بار اس وقت ہوئی تھی جب ہاسپٹل کے بیڈ پر اس کی ماں کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

دل میں ایسا یخ بستہ سکوت اتر گیا تھا جیسے ہر شے برف زار کا روپ دھار گئی ہو۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ باہر آ گیا اور اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا کر خود کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کے ذہن کی سطح پر نومی کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"آپ یا کوئی اور مجھے روز محشر بچانے آئے گا؟ عظمیٰ' یاسر اور کئی بے گناہ لوگ مجھ سے حساب مانگیں گے' میرا گریبان پکڑیں گے' بتائیے اس وقت کون ہو گا جو میری مدد کرے گا' مجھے پل صراط سے بآسانی گزار دے گا۔"

اس نے بے جان ہاتھوں سے گاڑی اسٹارٹ کی اور سنٹرل جیل کے پارکنگ لاٹ سے باہر نکل گیا۔

X...X...X

تانیہ کو یونیورسٹی میں دیکھ کر شہرینہ کو حیرت اور خوشی نے گنگ کر دیا۔

"تانی! تم... تم سمسٹر دے رہی ہو؟" دوسرے پل وہ مارے خوشی کے لپٹ گئی تھی۔

اسے اس کا شوہر فیاض چھوڑنے آیا تھا۔ وہ مہکتی ہوئی خوش باش دلہن لگ رہی تھی۔ نیلے رنگ کے ملتانی کڑھائی والے سوٹ میں ملبوس تھی' ہاتھوں میں سنہری چوڑیاں جھلملا رہی تھیں اور ہتھیلیوں میں مہندی کسی حد تک چھوٹ چکی تھی مگر اب بھی اس کے نشانات تھے۔

وہ یکدم ہی لڑکیوں کے نرغے میں پھنس گئی تھی' ٹینا لوگ کے گروپ نے سب سے پہلے اسے فیاض کے ساتھ بائیک سے اترتے تاڑ لیا تھا۔ پھر وہ سب ہی دوڑی آئیں اور اسے یوں چھپ چھپاتے شادی کرنے پر خوب سنانے لگیں۔ تانیہ شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ سب کی ڈانٹ ڈپٹ سنتی رہی۔ شہرینہ نے دیکھا اس کی آنکھوں کے پار ایک سکون اور طمانیت رچی ہوئی تھی' اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ میں بڑا حقیقی پن تھا۔ وہ اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہ رہی تھی مگر لڑکیوں کے جمگھٹے نے موقع ہی نہ دیا' پھر پیپر دینے کے بعد وہ اسے پکڑ کر ایک گوشتے میں لے آئی' جہاں سیمنٹ کے بینچ بنے ہوئے تھے۔

''تانی! یہ تبدیلی تمہارے اندر سے اٹھی ہے یا فیاض بھائی کی مرہون منت ہے۔'' اس نے ایک سرخوشی سے اس کا چہرہ ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

تانیہ نے ایک گہری سانس کھینچی اور سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

''ہاں یہ سب فیاض کی کرشمہ سازی ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ میں کتنی جلدی ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیتی ہوں' مجھے یہ سب بہت مشکل لگ رہا تھا' ناممکن بھی' مگر پتہ نہیں انہوں نے کس طرح میرے اندر نئی روح پھونک دی؟ شیری! میں تو حیران ہوں کہ یہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے' یہ خواب ہے یا حقیقت' شاید... شاید خواب ہی ہو۔''

اس نے سیمنٹ کی کھردری سطح سے ٹیک لگا کر آنکھیں زور سے میچ کر کھولیں پھر ہلکے سے ہنس دی۔

''نہیں شاید حقیقت' شفاف خوبصورت حقیقت۔''

''ہاں بالکل یہ حقیقت ہے۔'' شہرینہ نے اس کی سنہری چوڑیوں کو ہلکے سے چھیڑا تو وہ آپس میں ٹکرا گئیں' ان کی مدھم جھنکار نے ماحول پر ہی نہیں دونوں کے دلوں پر بھی بیک وقت خوبصورت تاثر چھوڑا۔

ایک موسم ہوتا ہے بہار کا جو صرف بیرونی ماحول پر ہی نہیں دل کی بستی میں بھی آتا ہے جب خزاں دم توڑتی ہے' جذبوں کی ٹنڈ منڈ شاخیں پھر سے جی اٹھتی ہیں ان پر زندگی ہمکنے لگتی ہے۔ خزاں کی ساری اداسی' دل گرفتگی' شکستگی گزرے وقتوں کی بات ہو کر رہ جاتی ہے'

ایسا قدرت کی طرف سے ہوتا ہے' اگر ایسا نہ ہوتا تو پہلے ہی دکھ پر انسان ٹوٹ کر بکھر چکا ہوتا' یہ دنیا آباد دکھائی نہ دیتی۔

شہرینہ نے فرط مسرت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

جانے وہ دونوں کتنی دیر ایک دوسرے میں گم باتیں کرتی رہیں فیاض آیا تو ان کا تسلسل ٹوٹا تھا۔

شہرینہ نے فیاض کو دیکھ کر معنی خیز تبسم سے کھنکار کر تانیہ کی طرف دیکھا۔

”تمہارے میاں کچھ زیادہ ہی بے تاب نہیں ہیں۔“

”بدتمیز! بے تاب نہیں پنکچوئل ہیں۔انہیں پتہ ہے تین گھنٹے کا پیپر ہوتا ہے بلکہ ان کا تو خیال ہو گا میں پیپر ادھورا چھوڑ کر دو گھنٹے میں ہی فارغ ہو گئی ہوں گے۔“

”چلو پنکچوئل ہی سہی۔“ شہرینہ نے ایک طویل ٹھنڈی سانس بھری تو تانیہ کھسیا کر ہنس پڑی اور اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

”تم بھی اب ڈھونڈ لو ایسا پنکچوئل سہارا۔“

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

شہرینہ کے لبوں پر رقصاں مسکراہٹ یکلخت گم ہو گئی اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔

”بائی دی وے ولید بھائی کب یہ ذمہ داری اٹھا رہے ہیں۔“

”میں ایسے عارضی سہارے پر تکیہ نہیں کرتی۔“ اس نے اپنی گاڑی کی چابی اچھالی۔

”کیا مطلب عارضی سہارا؟“ تانیہ نے آنکھیں دکھائیں۔

”بھئی دنیا میں تو ہر انسان عارضی سہارا ہی ہے نا۔“ وہ بات ٹال گئی۔

”اوہو اب جاؤ بھی' اپنے پنکچوئل سہارے کو انتظار کی اذیت سے دوچار مت کرو۔“ وہ اس کے گھورنے پر اسے آگے دھکیلتے ہوئے بولی۔

فیاض بائیک نزدیک لے آیا تو مجبوراً تانیہ کو اسے خدا حافظ کہنا پڑا۔

گھر آ کر اس نے سب سے پہلے یہ خوشخبری بھابی کو سنائی کہ تانیہ بھی سمسٹر دے رہی ہے اور یہ کہ وہ فیاض کے ہمراہ قدرے مطمئن ہے۔

”اب ہم بھی تمہیں جلد دھکا دینے والے ہیں' مما اور پاپا کے ساتھ آغا جی کی میٹنگ فائنل ہو گئی' تمہاری شادی کی تاریخ رکھ دی گئی ہے' بس ادھر تمہارا سمسٹر ختم ہوا ادھر ہم نے

ڈھولکی رکھ لی‘ جواباً بھابی اسے نئی خبر دینے لگیں۔ صغریٰ بھی کپڑے جھاڑتے ہوئے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”ہاں جی‘ میں نے تو فیر آپ کو چھوڑنا نہیں ہے‘ ایسے ایسے چھیڑنا ہے‘ کیوں بھابی۔“
اس کی باچھیں کانوں تک پہنچی ہوئی تھیں‘ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ ابھی سے بھنگڑا ڈال لے۔

چوٹی کے بل کھولتے ہوئے شہرینہ کی انگلیاں ٹھٹھر گئیں‘ اس نے آئینے میں بھابی کے عکس کو دیکھا جو اس کے بیڈ پر بیٹھیں صغریٰ کو چھیڑ رہی تھیں۔

”تمہیں بڑا شوق ہے نا اپنی آواز کا جادو جگانے کا؟“

”لیں جی‘ کبھی کبھی تو ایسے مواقع آتے ہیں‘ میں تو رج کر گاؤں گی۔“ وہ پراندہ جھلاتے ہوئے بل کھاتی حسینہ کی طرح بولی۔

”ہاں اور رج کر ہمارے دماغ کھاؤ گی۔ ویسے شیری!“ بھابی نے ہنستے ہنستے اس کی طرف رخ کیا۔“ اس گھر میں یہ آخری شادی ہو گی‘ تو ہمیں تو اپنے سارے ہی ارمان نکالنے ہیں تم دونوں کی اکٹھی جو ہو رہی ہے۔“

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”ہلا‘ تو کیا الگ الگ ہو گی۔“ صغریٰ منہ پر ہاتھ رکھ کر کھی کھی کرنے لگی۔

ان کی باتیں ہنسی شہرینہ کو اپنے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔

”آغا جی نے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔“ وہ ذرا سا رخ موڑ کر بے حد آہستگی سے بولی۔

”کیا مطلب؟ اب اپنی شادی کی تاریخ تم خود بتاتیں‘ ویسے سنا ہے کہ عورت کی خاموشی اس کی رضامندی ہی ہوتی ہے۔“ بھابی نے معنی خیز تبسم سے اس کو دیکھا وہ سر جھکا گئی۔

”اور ولید سے پوچھا؟“

”اسی نے تو سب کچھ آغا جی پر چھوڑ رکھا ہے‘ میرا تو خیال ہے اس کا دل تو چاہ رہا ہو گا کہ کل کی ہوتی آج ہو جائے۔“ بھابی یہ کہہ کر ہنسنے لگیں‘ مگر وہ مسکرا بھی نہ سکی‘ اس کے سینے سے ایک گہری سانس نکل گئی۔

X...X...X

جس روز توقیر شاہ کا سوئم تھا اسی روز ہدایت اللہ کا انتقال ہوا' وہ دو روز مسلسل آئی سی یو میں رہنے کے باوجود جانبر نہ ہو سکا تھا۔

مردان علی شاہ پر ٹوٹنے والے اس غم نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ان پر فالج کا اٹیک ہوا اور وہ بستر سے جا لگے۔کڑیل جوان بیٹے کے دکھ سے ابھی نکلنے نہ پائے تھے کہ بیٹی بیوہ ہو گئی' ایک بیٹی تو پہلے ہی ان سے لاتعلق تھی' ایک داماد فوت ہو گیا ایک داماد ان کا دشمن بنا بیٹھا تھا۔

اس عمر میں یہ چرکے بڑے ناقابل برداشت تھے۔جو امیدیں اور توقعات انہیں توقیر شاہ سے تھیں وہ اکبر شاہ پوری نہیں کر سکتا تھا۔توقیر شاہ اور ہدایت اللہ ان کے دائیں بائیں بازو تھے' جو یکلخت قدرت نے توڑ کر رکھ دیئے تھے۔

ولید انہیں ہاسپٹل کے پرائیویٹ روم میں ناچار حالت میں دیکھ کر سخت متاسف ہوا... اسے خدا کی طاقت کا شدت سے پہلی بار اندازہ ہوا کہ اپنے انتقامی ارادے اسے بہت حقیر اور ادنی سے محسوس ہونے لگے۔یہ پچھتاوا اس کی روح کو کاٹنے لگا کہ اس نے اپنی نوجوانی سے جوانی تک کا دور' ایک احساس انتقام میں جھلستے ہوئے گزار دیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتلوں کو کس

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

طرح گزند پہنچا سکتا ہے' حالانکہ آغا جی اسے سمجھایا کرتے تھے' اسے شدید مایوسی میں دیکھ کر بزرگوں کی باتیں سنا کر تھپکتے رہتے۔

''انتقام استسقائے روح ہے کہ اس سلسلہ میں ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس سے خود ہم ہی کو زیادہ تکلیف پہنچتی ہے۔جو شخص انتقام لیتا ہے وہ برائی کرنے والے سے زیادہ برا ہوتا ہے۔ اس جذبہ انتقام کی بدولت سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں' خاندان برباد ہو جاتے ہیں۔زندگی کے تمام پروگرام زیر زبر ہو جاتے ہیں' لہٰذا انسان کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اپنے دل ودماغ سے انتقام اور کینے کے تمام کمینے خیالات کو نکال کر پھینک دے۔انتقام لینا ایک شیطانی حرکت ہے' جو شیطان نے آدمؑ سے کی' لہٰذا انسان سے شیطان کے کام کرانے والا انتقام سے زیادہ اور کام کوئی نہیں۔

ولید تم بھی اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دو' اس لئے کہ انتقام کا کام قدرت الٰہی کا ہے اور قدرت انتقام اس وقت اپنے ذمہ لے لیتی ہے' جب انسان صبر وضبط کے ساتھ معاملات' عدالت خداوندی میں دے دیتا ہے۔''

مگر وہ کیا کرتا کہ انتقام تو بشریت کی کمزوری ہے۔ وہ دن رات اس احساس سے سلگتا رہا۔ اپنے زخموں کو ہرا رکھتا رہا مگر یہ ضرور تھا کہ اس کے ارادوں میں کبھی آغا جی کی باتیں زنجیریں ڈال دیتی تھیں کبھی ضمیر کی آواز بیڑیاں ڈال دیتی ہے اور شاید آغا جی اور جہانگیر احمد کی اس روک تھام کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اب تک کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھا سکا تھا۔ مگر فدا حسین اپنی بشری کمزوری پر قابو نہ رکھ سکا جو آگ اس کے اندر ایک عرصے سے لگی ہوئی تھی وہ اس کو بجھانے کی بجائے مسلسل اپنی منفی سوچوں سے تیل ڈالتا رہا تھا' انتقام اور لالچ کا جن اس کے حواس کو معطل کر چکا تھا۔

"بارگاہ الٰہی کا آئین ہے کہ بدی کی سزا بدی جتنی اور نیکی کی جزا دس گنا زیادہ دی جاتی ہے لیکن انسانی فطرت کا قانون اس کے برعکس ہے ایک انسان نیکی کا بدلہ اگر دیتا ہے تو نیکی کے بقدر لیکن بدی کا بدلہ وہ دس گنا زیادہ لینا چاہتا ہے۔" آغا جی ایک متاسفانہ سانس بھرتے ہوئے بولے اور نرمی سے ولید کے سر میں انگلیاں پھیرنے لگے۔

"اس سے زیادہ اب اور کچھ بھی تم چاہتے ہو؟"

وہ ان کی گود میں سر رکھے چھت کو تک رہا تھا ایک افسردگی سے ہنس دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"اس شخص سے اب کیا انتقام لیا جا سکتا ہے آغا جی! جس کو خود پچھتاوے اور پشیمانیاں ڈس رہی ہیں جو اپنے مسائل میں الجھ کر بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہو۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آغا جی کہ میں چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ کر سکا جو کرنا چاہتا تھا۔" اس نے آنکھیں میچ لیں' اس کے تصور میں آمنہ علی لہرا گئی' جو ایک آسان ٹارگٹ تھی اس کے لئے۔ وہ چاہتا تو اس کے ذریعے مردان علی شاہ پر کوئی بھی وار کر سکتا تھا' فدا حسین کے شیطانی دماغ نے کس کس طرح کی تاویلیں دے کر اسے اکسایا تھا اور خود کئی بار اس کے نفس نے بھی بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ مگر شاید یہ خون کا اثر تھا یا پھر تربیت کا' وہ ہر بار پستی میں اترنے کے خوف سے پہلو بچا جاتا۔ فدا حسین کی باتوں پر کان نہیں دھرتا تھا دل سے اٹھنے والے غصے کے ابال کو دبا لیتا تھا۔

اس نے سوچا اگر وہ فدا حسین جیسی گھناؤنی حرکت کر ڈالتا تو عمر بھر پچھتاوے اس کا پیچھا نہ چھوڑتے' شاید اس اذیت سے کہیں زیادہ وہ اذیت ہوتی جو ضمیر اسے دیتا رہتا۔ ٹھیک کہتے ہیں دانا کہ

"انتقام میں اپنے ہی مزاج کا زہریلا مادہ اپنے اوپر اثر کرتا ہے' اگر تم پورا انتقام نہیں لے سکتے تو فی الحال رنج و تکلیف میں مبتلا رہو گے اور اگر پورا عوض لے سکتے ہو تو آئندہ خود سخت ترین رنج اٹھاؤ گے۔"

انتقام دراصل غصے کی سب قسموں سے زیادہ سخت قسم ہے۔ جو شخص کسی کو ضرر پہنچاتا ہے وہ برائی شروع کرتا ہے مگر جو اس برائی کا انتقام لیتا ہے وہ اس کو بے انتہا بڑھاتا ہے اور مستقل بے آرامی خریدتا ہے' لہٰذا اپنے ہی فائدے کو مد نظر رکھتے ہوئے چاہیئے کہ جو شخص ہمیں ضرر پہنچائے ہم اس کی مثل بلکہ اس سے بدتر نہ بنیں۔

اس کے سامنے بہت سی ایسی مثالوں کے ساتھ نومی کی مثال تھی اور اب فدا حسین کی جو اپنے بچاؤ کی تدابیر میں وحشت زدہ ہو رہا تھا۔

"تم آرام کرو ولید بہت تھک گئے ہو۔" آغا جی نے اس کے سر کے نیچے کشن رکھ دیا اور اٹھ کر کھڑکیوں کے پردے کی ڈوریاں کھینچنے لگے' دوسرے پل کمرہ ملگجے اندھیرے میں ڈوب گیا۔

"ہاں شاید میں بہت تھک گیا ہوں' اب یہ تھکن پر سکون مقام ڈھونڈ رہی ہے جہاں میں ٹھہر کر یہ سب تھکن اتار کر پر سکون ہو سکوں۔" اس نے لیٹے لیٹے آغا جی کو کمرے سے باہر بے آواز قدموں سے جاتے دیکھا۔

حالات کی سنگلاخ راہوں پر چلتے چلتے وہ حقیقتاً تھک چکا تھا' پہلی بار ایسا ہوا کہ اسے شدت سے ایسے غمگسار ساتھی کی طلب ہونے لگی جو اس کا محرم ہو' جس کے ساتھ وہ زندگی کی انہی سفاک حقیقتوں میں اپنے لئے خوشیاں کشید کر سکے۔

ہر معتدل آدمی کی طرح اسے بھی محبت کی طلب ہونے لگی۔ اس محبت کی جو نرم' سبک' دھیمی دھیمی بہتی ندی کی طرح دل کے خارزاروں کو سیراب کرتی بہتی رہتی ہے۔

آغا جی شاید اس کی بند آنکھوں کو دیکھ کر یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ غنودگی میں چلا گیا۔

وہ اپنے پیچھے بے آواز دروازہ بند کر گئے۔

X...X...X

چاہنے اور چاہے جانے کے احساس سے عورت کبھی نہیں نکل سکتی۔ چاہنے کا فطری جذبہ اسے بے کل رکھتا ہے مگر چاہے جانے کا احساس اسے طمانیت بخشتا ہے اور شہرینہ کو بھی ایسی ہی طمانیت حاصل ہوئی تھی جس کی صدیوں سے اس کی روح متلاشی تھی۔

ولید حسن کی آنکھوں میں اسے اپنا ہی عکس دیکھ کر اتنی خوشی حاصل ہوئی تھی کہ وہ اس خوشی کے عوض ہفت اقلیم کی دولت بھی وار سکتی تھی۔

کبھی ایک لمحہ ہی تو پوری کائنات ہوتا ہے' عمر بھر کی ریاضت کا صلہ۔

اور اس صلہ کے بعد وہ ایسی امیر خود کو محسوس کر رہی تھی کہ سب کچھ لٹا دینے پر تل گئی تھی۔

اس نے ولید حسن کے نام ایک مختصر سا خط لکھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کس جذبے کے تحت کرنے جا رہی ہے' جبکہ کوئی بے اعتباری بھی درمیان میں نہ رہی تھی۔

شاید وہ لاشعوری طور پر ولید کو کسی ایسے اضطراب ایسی آزمائش سے نکالنا چاہ رہی تھی جو اس کے خیال میں اسے بے کل کئے ہوئے تھی۔ اس نے سوچا کہ کہنے والے ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ

''ضروری تو نہیں کہ ہم محبتوں کو پرندوں کی طرح پنجروں میں بند رکھیں یا قید کر لیں' محبتیں قید ہو ہی نہیں سکتیں۔ محبت کو رہنا ہو گا تو پرواز کی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود کہیں اور نہیں جائے گی اور نہیں رہنا ہو گا تو پنجرے بھی بڑے کمزور ہو جاتے ہیں۔''

یہ فلسفہ بھی اس کی سمجھ میں اب آیا کہ پا لینے کا نام محبت نہیں ہے۔ یہ تو بہت عام سی بات ہے کہ جسے چاہا جائے اسے پا لیا جائے۔ نہیں یہ محبت کی تکمیل نہیں ہے یہ تو محض وجود کی تکمیل ہے' شوریدہ جذبات کی تسکین ہے اور یہ محبت کی مسخ شدہ صورت ہے۔

جبکہ اسے اجلی محبت کی خواہش تھی' مقابل کے دل کے تمام تر خالص پن کی' اس کی ذہنی' قلبی' آمادگی کی خواہش تھی۔

جس طرح محبت ایک دوسرے کو سینے کا عمل ہے مگر اس میں سوئی اور دھاگہ کا ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس مکمل جذبہ کا ہونا ضروری ہے جو آپ کو اس عمل کے لئے اکساتا ہے سینے اور بننے کے لئے آمادہ کرتا ہے' اسے پہلی بار خود پر نہیں آمنہ علی پر ترس آیا تھا اس نے اس خط میں لکھا تھا۔

"میں تمہیں آزاد کر رہی ہوں ولید حسن! اپنی محبت سے اور اس رشتے سے جو ہمارے مابین بزرگوں نے قائم رکھا ہے، تم اسے اپنے پیروں کی زنجیر مت سمجھنا۔

تم ایک سایہ دار چھاؤں کی مانند ہو ولید حسن! سو ہو سکتا ہے تمہاری چھاؤں کا کوئی اور بھی طلب گار ہو اور اسے اس چھاؤں کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہو اور ہو سکتا ہے میری طرح اس نے بھی اس چھاؤں کے لئے بہت طویل سفر طے کیا ہو اور کتنے درخت پیچھے چھوڑ آئی ہو۔"

ایک گہری سانس بھر کر اس نے خود کو کرسی پر ڈھیلا چھوڑ دیا اور اپنے دل و دماغ کی تمام آوازوں پر کان بند کر لئے اور آنکھیں موند کر تمام خیالات سے نجات پانے کی کوشش کرنے لگی۔

X...X...X

یہ کچھ دن ہیں کہ اس کو یاد ہر اک شام کرنا ہے

پھر اپنے دل کی بستی میں اسے گمنام کرنا ہے

یہ کچھ دن ہیں کہ اس کی یاد جسم و جاں تھکائے گی

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

پھر اس کے بعد ہم کو دیر تک آرام کرنا ہے

یونیورسٹی سے نکل کر وہ گھر آنے کی بجائے بے مقصد سڑکوں پر گاڑی بھگاتی رہی، جانے اسے مختلف سڑکوں پر یہ کھیل کھیلتے ہوئے کتنی دیر گزر گئی مگر دھیان کی رو جہاں تھی وہیں رکی ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب تک وہ خط ولید کی نظروں میں آ چکا ہو گا، ناشتے کے بعد عموماً وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر آتا تھا اور کچھ فائلیں لے کر وہیں بیٹھ کر کام نمٹاتا تھا، یا پھر اپنی رسٹ واچ، موبائل اور سگریٹ کا پیکٹ وہ اسی ٹیبل سے اٹھانے آتا تھا۔

وہ اس کے رد عمل کے بارے میں کوئی حتمی خیال نہیں کر سکتی تھی۔ اسے آغا جی کی طرف سے کسی طرح کی بھی باز پرس کا یقین تھا اور اس کا خیال تھا اب تک یہ بات گھر بھر میں پھیل چکی ہو گی، اسے گھر جا کر سب کی ناراض نظروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ کچھ دن ہیں کہ تیور آسمان کے ناموافق ہیں

گلابی موسموں کو آ کے پھر انعام کرنا ہے

یہ کچھ دن ہیں کہ ننگے پاؤں جلتی ریت کاٹیں گے

پھر اک دن بادلوں کو ہم نے ہی نیلام کرنا ہے

یہ کچھ دن ہیں کہ بنجر دل ترا بے فیض لگتا ہے

پھر اپنے آنسوؤں سے اس زمین کو رام کرنا ہے

وہ گھر پہنچی تو حالات حسب معمول تھے، مما اور مونا بھابی شاپنگ پر گئی ہوئیں تھیں۔ آغا جی اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر حسب عادت اس کے سمسٹر کے بارے میں پوچھا۔

کسی بھی ناگواری یا برہمی کا تاثر ان کے چہرے یا لہجے میں نہ تھا۔ اس کے دل کی خلش کچھ اور بڑھ گئی، اس کا مطلب تھا ولید نے اس خط کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا تھا۔

وہ کمرے میں آئی اور شولڈر بیگ کندھے سے اتار کر یوں صوفے پر پھینکا جیسے کندھے پر رکھا یہ کوئی وزنی بوجھ ہو۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

آج تو اس کا آخری سمسٹر تھا تھکن اتر جانی چاہیے تھی مگر اسے لگ رہا تھا وہ زندگی میں پہلی بار اس قدر تھکی ہونڈھال ہوئی ہو۔

اسے مما یا بھابی کسی سے بھی شکوہ نہیں تھا۔ یہ تو ان کی آرزوئیں ارمان تھے جنہیں پورا ہوتے دیکھ کر وہ خوش ہو رہی تھیں۔ صغریٰ کی معصومانہ محبتیں تھیں جو وہ اس گھر میں رونق کی خواہاں تھی۔ وہ کسی کو بھی خوشی کے اظہار سے روک ٹوک نہیں سکتی تھی، ہاں بس خود منہ لپیٹ کر لیٹ گئی۔

اسے شکوہ تھا تو صرف ولید حسن سے جس نے چپ اختیار کر لی تھی اور یہی چپ اسے گراں گزر رہی تھی۔

X...X...X

ولید صبح سویرے گوٹھ چلا آیا۔ وہ بڑے عرصہ بعد گوٹھ آیا تھا، سب سے پہلے اس نے یوسف کے ساتھ جا کر اپنے باپ اور پھر دوسرے بزرگوں کی قبر پر فاتحہ پڑھی، پھر اس کے ہمراہ ماسٹر دین محمد کے گھر چلا آیا۔ ماسٹر دین کا چھوٹا سا صاف ستھرا صحن پانی کے چھڑکاؤ کے باعث سوندھی سوندھی مٹی سے مہک رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس کھینچ کر یہ ساری مہک گویا اپنے پھیپھڑوں میں اتاری تو اسے لگا اس کے پھیپھڑوں میں روشنی سی بھر گئی ہو۔

"اور سنایئے ماسٹر صاحب! گوٹھ کے کیا حالات ہیں؟۔" وہ موڑھا کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بس سائیں، رئیس توقیر شاہ کے گزر جانے کے بعد گوٹھ میں بڑی اداسی پھیلی ہوئی ہے خود میرا جی بھی اندر سے کچھ اچھا نہیں ہے، جو بھی تھا پر تھے تو وہ ہمارے حاکم ہی نا۔"

"ہاں۔ حاکم۔" ولید نے ان کی بات پر ہلکی سی سانس بھری اور خود استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

"دنیاوی حاکم کو تو گزر ہی جانا تھا ماسٹر صاحب! کسی کی حاکمیت بادشاہت کو بقا نہیں ہے، ہر ذی روح کے نام فنا لکھ دی گئی ہے۔ خلیفہ واثق باللہ نے مرتے وقت کہا تھا کہ

"موت میں سب برابر کے شریک ہیں، نہ بازاری لوگ بچیں گے نہ بادشاہ ہی زندہ رہیں گے، غریبوں کو ان کی قبر میں غربت نے نقصان نہیں پہنچایا۔ امیروں کو ان کی امیری بھی کوئی نفع نہ پہنچائے گی۔" پھر اس نے فرش پر اپنے رخسار رکھ کر چلا کر کہا کہ " اے وہ جس کی بادشاہی لازوال ہے۔ اس پر رحم کر جس کی بادشاہی ختم ہو گئی۔"

تو بس ماسٹر صاحب جب ساری حاکمیت، بادشاہت کو فنا ہے تو چند سالوں کی حاکمیت کا کیا مزا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" ماسٹر دین محمد نے سر اثبات میں ہلایا۔ "وہ کسی بزرگ نے کیا خوب کہا ہے نا کہ

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ

ہم اس جہاں میں آئے تھے کیا آئے کیا چلے

اس کے باوجود انسان بڑا غافل ہے۔" انہوں نے افسوس سے گردن جھٹکی۔ پھر دھیان آنے پر جلدی سے بولے۔

"چھاچھ پیو گے۔"

"بالکل ماسٹر صاحب! چھاچھ نہ پیوں یہ کیسے ممکن ہے اس کی تو بڑی طلب ہو رہی ہے۔" وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ پھر ماسٹر صاحب کے اٹھ کر اندر چلے جانے کے بعد اس نے موڑھے سمیت اپنا رخ یوسف کی طرف کیا جو ایک طرف خاموش سا بیٹھا تھا۔ وہ عموماً ولید اور ماسٹر صاحب کی گفتگو کے درمیان خاموش ہی رہتا تھا۔

"یوسف! حویلی میں اکبر شاہ کا آنا جانا تو رہتا ہو گا۔"

"ہاں، اس کی گاڑی آتی جاتی تو دکھائی تو دیتی ہے پر میرا خیال ہے وہ حویلی میں ٹھہرتا نہیں ہے۔" یوسف نے بھی اپنا موڑھا کچھ آگے کھینچ لیا۔

"ہوں... اور کوئی نئی خبر۔" اس نے ہنکارا بھر کر خود کو موڑھے کی بے آرام پشت پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"کہاں نئی خبر سائیں! اب تو لگتا ہے ساری خبریں ہی دم توڑ گئی ہیں، نہ کچھ سننے کو رہا ہے نہ کچھ سنانے کو۔"

یوسف نے گہری بوجھل سی سانس کھینچی۔

ولید اس کی طرف نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ہلکے سے مسکرا دیا۔

"نہیں یوسف! ایسا نہیں ہوتا، یہ بس چند دنوں، مہینوں کی کیفیت ہوتی ہے، ایسی کیفیت دائمی ہوتی تو دنیا بڑے مختلف انداز میں ہمارے سامنے ہوتی۔ کم از کم ہمارے ملک کے حالات یکسر مختلف ہوتے۔ ہم ایسے ظالم حکمرانوں کا تختہ مشق نہ بنے ہوتے۔ خیر۔" اس نے موڑھے کی بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"صد شکر کہ کوئی بھی کیفیت دائمی نہیں ہوتی۔" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

ماسٹر دین محمد چھاچھ کا جگ بھر کر لے آئے اور چھوٹی سی تپائی کھینچ کر اس پر یہ جگ اور گلاس رکھ دیا ساتھ میں میٹھی پکوڑیاں بھی تھیں۔

"بابا! ولید سائیں کی شادی ہو رہی ہے آپ کو انہوں نے نہیں بتایا نا۔" یوسف یکدم شرارتی انداز میں بولا اور ولید کو دیکھا۔

"اچھا۔" ماسٹر صاحب کے چہرے پر چمک عود کر آئی۔ "سدا سکھی رہو، کب ہو رہی ہے۔" وہ فرط مسرت سے بولے۔

ولید چھاچھ کا گلاس اپنے لبوں تک لے جاتے ہوئے یوسف کو گھورتے ہوئے بولا۔

"اسی سے پوچھ لیجیئے۔"

"بہت جلد بابا!" یوسف ہنس دیا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے، کس سے ہو رہی ہے؟ میرا مطلب ہے کوئی جان پہچان والوں میں ہی رشتہ جڑا ہے۔" ان کے اس سوال پر ولید کے لبوں کی تراش میں بے ساختہ ایک دھیمی مسکراہٹ پھیل کر رہ گئی۔

"ہاں ہے ایک سر پھری لڑکی۔" وہ ہلکے سے بڑبڑا کر رہ گیا۔

"وہ جہانگیر احمد ہیں نا۔ ان کی بیٹی سے ہو رہی ہے۔" یوسف انہیں تفصیل بتانے لگا۔

"بڑے اچھے لوگ ہیں۔ بابا بہت ہی اچھے۔"

وہ خاموشی سے چھاچھ کے ہلکے ہلکے سپ لیتا رہا۔ یوسف خاموش ہوا تو وہ بولا۔

"آپ ضرور آیئے گا ماسٹر صاحب، آپ کے آنے سے مجھے ایک انوکھی مسرت ہو گی، مجھے لگے گا میرے اپنے خاندان کا کوئی فرد میرا اپنا اس خوشی میں شامل ہوا ہے۔" اس نے چھاچھ کا گلاس تپائی پر رکھ دیا اور ماسٹر صاحب کو بے حد عقیدت مند نظروں سے دیکھنے لگا۔

ماسٹر دین محمد کے چہرے کی جھریوں میں ایک پل تاریکی سی اتر آئی، دوسرے پل انہوں نے اپنا لرزیدہ ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا جسے ولید نے بحر عقیدت میں ڈوب کر اپنے ہاتھ میں تھام کر چوم لیا۔

"مجھے آپ کے قرب سے اپنے باپ کی خوشبو آتی ہے۔ میرے دل کے اندر کہیں ایک صحرا سا ہے ماسٹر صاحب! اس صحرا میں آپ کے قرب سے چھینٹے سے پڑ جاتے ہیں، ایک مہک اڑنے لگتی ہے، سچ جانیے میں تو کئی دنوں تک اس مہک سے مہکا مہکا رہتا ہوں۔" اس کا لہجہ

دھیما اور مغموم تھا ایک عجیب سی محرومی چٹخنے لگی پھر یکدم وہ سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دے کر ہنسا۔

"ہم نفیس لباس پر چاہے جتنی بھی مہنگی خوشبو لگا لیں، مگر جو مہک دل سے اٹھتی ہے نا اس کا کوئی بدل نہیں ہے، یہ خوشبو لاکھوں، کروڑوں روپے دے کر بھی خریدی نہیں جا سکتی، یہ تو تقدیر کی عنایت سے ملتی ہے۔"

ماسٹر دین محمد کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں کانپنے لگا۔ ان کی آنکھیں نم ہو کر جھلملانے لگیں، انہیں یہ لمبا چوڑا لڑکا اس وقت ایک معصوم سا بچہ دکھائی دینے لگا تھا۔

"خدا تمہیں سدا سکھی رکھے، شاد آباد رکھے۔" وہ دل کی گہرائیوں سے اسے دعائیں دینے لگے۔

"آمین!" اس نے پورے جذب سے آمین کہا پھر یکدم ہنس دیا اور اپنی کیفیت کو سنبھال کر ان کا ہاتھ فرط محبت! حقیقتاً اُسے اپنے دل کے صحرا میں کوئی ٹھنڈا میٹھا چشمہ ابلتا محسوس ہو رہا تھا۔

چاہے جتنی بھی تھکن ہو، آزردگی ہو، ایک پل کے لئے پر خلوص سایا میسر آجائے تو ساری حدت دم توڑ دیتی ہے۔

ایک گہری سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس نے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ پھر وہ یوسف کے ساتھ باہر نکل آیا۔ یوسف کو بھی شہر ہی جانا تھا وہ دونوں گاڑی میں آبیٹھے۔

حویلی کے راستوں سے گزرتے ہوئے ولید نے گاڑی روک دی اور بغور حویلی کو دیکھنے لگا۔

"اس حویلی پر تو آپ کا بھی حق ہے سائیں! آپ کیوں دست بردار ہو رہے ہیں اس سے۔" یوسف اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

"کیا کرنا ہے یوسف ان اونچی اونچی حویلیوں میں رہ کر۔" اس نے رخ موڑ کر یوسف کو دیکھا۔ "یہ تو جی کا جنجال ہیں۔ میرا باپ اس سے از خود دست بردار ہو گیا تو مجھے کیا کرنا ہے یہ سب لے کر، بس آخرت کا حساب ہی لمبا ہو گا۔"

"مگر سائیں! حق تو حق ہوتا ہے نا۔"

وہ مجروح انداز میں ہنس دیا۔

"کچھ حق آخرت میں حاصل کر لیں گے، اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ سارا کچھ دنیا ہی میں پا لیں گے کیا۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"یہ دنیا عارضی ٹھکانہ ہے یوسف! کوئی کتنا زندہ رہ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے، اپنے اس حق کو حاصل کرنے کی جدوجہد ہی میں مر جاؤں پھر۔"

یوسف نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا اور سر ہلا کر پگڈنڈی کو تکنے لگا۔

"آپ بہت خوش نصیب ہیں ولید سائیں کہ آپ کو لالچ حرص نہیں ہے ورنہ یہ مرض تو کسی کو لگ جائے تو قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

"کوئی مرض لاعلاج نہیں ہوتا، ہر مرض کا علاج ہے۔ کیا قرآن، حدیثیں، فقہ کی کتابیں، بزرگوں کے اقوال علاج نہیں ہیں، ہاں کوئی اپنا علاج کرنا ہی نہ چاہے اس مرض سے چھٹکارہ پانا ہی نہ چاہے تو یہ الگ بات ہے۔"

اس نے گاڑی شہر جانے والی سڑک پر ڈال دی۔

یوسف کو اس کی مطلوبہ جگہ اتار کر اس کا ارادہ تھا وہ نومی کی طرف جائے گا، نومی کے خیال کے ساتھ ہی اس نے موبائل جیب سے نکال کر وکیل رفیق شیرانی کا نمبر ڈائل کیا مگر ادھر بڑی خوفناک روح فرسا

خبر گویا اس کی منتظر تھی۔

نومی کو پراسرار طور پر جیل کے اندر قتل کر دیا گیا تھا۔

جیل کے عملے کا کہنا تھا کہ یہ قتل صبح سویرے ہوا ہے۔ کچھ اجنبی لڑکے نومی سے ملاقات کے لیے آئے تھے جو خود کو نومی کے دوست بتا رہے تھے، پھر ان کے جانے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد نومی مردہ حالت میں جیل کے فرش پر پایا گیا۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق اس کی موت کسی زہر سے ہوئی ہے۔

کل صبح نومی کی عدالت میں پیشی تھی اور وکیل شیرانی صاحب کے مطابق وہ قتل کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دوسرے جرائم کا بھی اعتراف کرنے والا تھا اور ایک سیاہ ڈائری وکیل کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ سیاہ جلد والی ڈائری بھی غائب تھی۔

اس خبر نے اس کا دماغ بالکل سن کر کے رکھ دیا۔ اسے اپنے آگے پیچھے ہر طرف دھند پھیلتی محسوس ہونے لگی۔ مگر راستوں پر دھند نہ تھی۔ یہ دھند اس کی آنکھوں میں جمع ہو رہی تھی اور سارا کچھ پانوں میں چکر کھاتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے گاڑی سڑک کے ایک طرف روک دی اور اسٹیرنگ وہیل پر سر جھکا لیا۔

X...X...X

جیون کھیل میں ہارے لوگو!

بچھڑے لوگو پیارے لوگو!

برکھا کی لمبی راتوں میں

کمرے کی خاموش فضا میں

پچھلے پہر کے سناٹے میں

روتے روتے جاگنے والے

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہم لوگوں کو سو لینے دو

اور سویرا ہو لینے دو

سکندر کے گھر میں صف ماتم بچھی تھی، اس جواں مرگ پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔

"کیا ملا مجھے آج تک صفحے سیاہ کرتے ہوئے، ان ظالموں کی نقابیں اتارتے ہوئے، کون سی ان کو سزائیں مل گئیں، کون انہیں زک پہنچا سکا۔" سکندر' آغاجی کی گود میں سر رکھے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

وجود میں غم، تلخی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو اور آدمی کچھ نہ کر سکے تو بے بسی اسے اندر ہی اندر جھلسانے لگتی ہے' کاٹنے لگتی ہے' وہ بھی جھلس رہا تھا، اس کا سینہ غم کے بوجھ سے پھٹنے کو ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ اس مکروہ دنیا سے دور نکل جائے، کہیں کسی گوشے میں پناہ لے لے، سارے انسانوں سے دور بھاگ جائے، کسی ویرانے میں چھپ جائے۔

نومی کا جواں مسکراتا وجود اس کی نگاہوں سے کیسے مٹ سکتا تھا۔ بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کا زمانہ۔ اف اتنی بہت سی یادیں۔

وہ کن کن منظروں سے منہ چھپائے گا۔

اسے اپنے اعصاب دھنکی ہوئی اون کی طرح بکھرے محسوس ہو رہے تھے۔

''ہم انسان نفع نقصان دینے یا عدل و انصاف، جزا سزا دینے اس دنیا میں نہیں آئے ہیں سکندر بچے! یہ کام قدرت کا ہے میرا یا تمہارا نہیں۔'' آغا جی اسے تھپکنے لگے۔

''تم توقیر شاہ کو اس کے گھٹیا پن اور کمینگی پر زیادہ سے زیادہ کیا سزا دے سکتے تھے بتاؤ اور ولید مردان علی کو کیا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ آج دیکھو توقیر شاہ زمین کے اندر ہے اور مردان علی شاہ بے دست و پا بستر پر۔ بتاؤ کیا تم اور ولید چاہتے ہوئے بھی انہیں اس حال تک پہنچا سکتے تھے؟ ہم تو بساط کے مہرے ہیں سکندر! اس طاقت کے ہاتھوں میں۔ ہمارا کام اس کی رضا میں راضی رہنا ہے اس کی طاقت کے نیچے سرنگوں رہنا ہے۔''

وہ نرمی سے اس کے سر کو سہلانے لگے۔ اس کا ذہنی آزار ان کے لیے بھی اذیت کا باعث بن رہا تھا۔

نومی کو اس کی آخری آرام گاہ پہنچانے کے بعد سکندر کی حالت بے حد خستہ ہو رہی تھی، ولید اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

''مجھے اگر اماں کا خیال نہ ہوتا ناولید تو میں ہمیشہ کے لیے اس ملک کو چھوڑ کر چلا جاتا، جہاں ہوس، استحصال اور اجارہ داری کی بڑی بڑی مضبوط چٹانوں کے سامنے، انصاف، برابری، اجتماعی خوش حالی

کے ننھے ننھے پودے کبھی نمو نہیں پاسکیں گے۔ جہاں بینائی رکھنے کے باوجود لوگ اندھوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ جہاں لوگ ظلم سہتے ہوئے بھی آواز اٹھانے کے حق سے محروم کر دیئے گئے ہیں، جہاں پیسہ انصاف اور قانون کی مضبوط سلاخوں کو پگھلا دیتا ہے۔''

وہ بے آواز بہنے والے آنسوؤں کو آستین سے پونچھنے لگا۔

''یہ محض ہمارا خیال ہے۔ دنیا کا کوئی خطہ خوش حالی کی ضمانت نہیں بنتا۔ ہر قصبے' ہر خطے کے لوگ ناآسودہ و پریشان حال ہیں، ہم یا کوئی شہ زور بھی دنیا کو نہیں سدھار سکتا۔'' ولید نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔

''کیا برسوں انسان نے کوشش نہیں کی، بڑے بڑے ہاسپٹل تعمیر ہوتے رہے مگر بیماریاں اور اموات بڑھتی گئیں۔ نت نئے اسکول اور کالجز کھل رہے ہیں مگر جہالت، بدکاریاں اسی طرح جاری ہیں، عدالت اور قانون بنائے گئے ہیں ان پر سخت سے سخت قانون بنائے جارہے

ہیں مگر جرم، قتل وغارت، جبر واستبداد جاری وساری ہے، کتنی قومیں فنا ہو گئیں، کتنے ملک اجڑ گئے اور کتنے آباد ہوئے۔ نہیں سکندر! اس دنیا کو نہ ہم فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ ہاں اس نیرنگی زمانہ سے عبرت اور نصیحت ضرور حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی زندگی سدھاری جا سکتی ہے ورنہ یہ سب تو تا قیامت چلتا رہے گا، کس کس غم پر آنسو بہاؤ گے سکندر! کس خطے میں جبر اور ظلم نہیں ہے کس خطے میں بیمار دل نہیں ہیں کس جگہ صرف مسکراہٹیں اور خوش حالیاں ہیں۔"

"شاید موت میں ہی آسودگی ہے؟" سکندر نے یکسر بے کیف لہجے میں کہہ کر ولید کی طرف دیکھا۔

ولید کے چہرے کو ایک تکلیف وہ رنگ چھو گیا۔ اس نے نرمی سے اس کے کندھے کو تھپکا۔ اس کے دل کی رگوں کو سکندر کی بے بسی لاچاری کا دکھ کاٹ رہا تھا۔

بہت کچھ کرنے کی خواہش اور کچھ نہ کر سکنے کی لاچاری اسی طرح رلاتی ہے۔

موت سے زیادہ شکستگی کا عذاب اذیت دیتا ہے۔ یہ ولید سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔ وہ سکندر کے دل کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اسے سکندر سے زیادہ اماں کی فکر تھی جو بستر سے جا لگی تھیں۔ ان کے تو آنکھوں کے سوتے بھی دن رات روتے روتے خشک ہو گئے تھے۔

" مشیت ایزدی ہے سکندر! نومی کو ہم نے اس کے حقیقی مالک کو ہی سونپا ہے، جو سب سے زیادہ مہربان ہے، جس کے سائے میں کوئی رنج، کوئی تکلیف نہیں ہے، آسودگی ہی آسودگی ہے، اس کی کریمی پر کوئی شک نہیں ہے، اس کی معافی بے لوث ہے۔ کیا ہمیں یہ سوچ کر قرار نہیں ملتا کہ وہ پیدا کرنے والا اسے اپنی آغوش میں زیادہ آسودہ رکھے گا۔"

وہ اپنے لہجے کی، جملوں کی چھاؤں سے اس کی تھکن کی دھوپ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سکندر نے جلتی آنکھیں بند کر لیں آہستہ آہستہ ان میں بہت سا پانی اتر آیا۔

X...X...X

نومی کی موت ایک ایسا سانحہ تھی جس نے ہر ایک کو افسردہ کیا تھا۔ مگر کہتے ہیں نا کہ وقت ہر گھاؤ کو بھر دیتا ہے، کوئی کیفیت دائمی نہیں رہتی، ہر کیفیت کو فنا ہے۔

نومی کا سوئم ہو چکا تھا۔ شہرینہ وہیں سے لوٹی تھی اور بے حد آزردگی سے آغا جی کی گود میں سر رکھے سسکیاں بھر رہی تھی۔

پتہ نہیں آج اسے اتنا بہت سارونا کیوں آرہا تھا، شاید ولید حسن کی مسلسل بے گانگی کے باعث۔ بہر حال اس کا خیال تھا وہ نومی کے لیے رو رہی ہے، تانیہ اور نادیہ کا غم، سکندر بھائی اور اماں کے نڈھال وجود اسے رلا رہے ہیں۔

یوں بھی مسلسل اضمحلال، رنجیدگی سے بھی دل گداز ہو جاتے ہیں معمولی بات بھی آنسو بہانے کا سبب بن جاتی ہے، یہ تو پھر بڑا واقعہ تھا۔ آغا جی کی شفیق گود، ان کی اپنائیت سے بھری ٹھنڈی چھاؤں جیسا وجود دل کو اور بھی گداز کر رہا تھا۔ وہ اس طرح رو رہی تھی جیسے اپنا سارا غم آنسوؤں میں بہا کر ہلکی پھلکی ہو جانا چاہتی ہو۔

ولید نے اندر قدم رکھا تو اسے سسکیاں بھرتے دیکھ کر لحظہ بھر کے لئے ٹھٹکا بے اختیار ایک بھنچی بھنچی سانس اس کے سینے کی تہ سے آزاد ہو گئی۔

اس نے کچھ ایسی بے رحم نظروں سے اسے دیکھا تھا جیسے اسے قتل کر دینا چاہ رہا ہو۔

"میرا خیال ہے تمہارے آنسو بہانے سے نومی واپس نہیں آجائے گا۔ اتنی عقل تو تانیہ کو بھی آگئی ہے۔" وہ جیب سے موبائل نکال کر تپائی پر ڈالتے ہوئے تلخی سے بولا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا، اس نے سر اٹھانا چاہا مگر محض لیدر کی سیاہ چپل میں مقید اس کے مضبوط پیروں پر نظریں جم کر رہ گئیں۔

"ہاں شیری بیٹا! ولید ٹھیک کہہ رہا ہے، اس طرح رونے سے غم بڑھتا ہی ہے، دعا کرو اس کے گھر والوں کو خدا صبر جمیل عطا کرے۔"

آغا جی نہ ولید کے لہجے میں چھپی چبھن محسوس کر پائے نہ اس کے آنسوؤں کی روانی کا اصل سبب جان پائے تھے۔ بہت نرمی اور محبت سے اسے تھپکنے لگے۔

"مرنے والوں پر کون اتنے بہت سے آنسو بہاتا ہے آغا جی!" وہ ہلکے سے بڑبڑایا تھا اور عجیب تضحیک آمیز انداز میں ہنکارا بھرا تھا پھر آغا جی کے کمرے کی بڑی سی کھڑکی کے گلاس وال کے پاس جا کھڑا ہوا اور باہر جھانکنے لگا

"آنٹی بہت بیمار ہیں آغا جی! ان سب کے لیے یہ دکھ نا قابل تلافی ہے اور ظاہر ہے میرا ان سے قلبی تعلق ہے میں کیسے آنسو نہ بہاؤں۔" اس نے جیسے اپنا دفاع کیا اور ایک مغموم سی سانس بھر کر آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"انسان کیا سوچتا ہے اور تقدیر اسے کیا دکھاتی ہے، جس چھاؤں کو وہ اپنے لیے چھاؤں تصور کرتا ہے، ایک دھوکے میں زندگی گزار دیتا ہے قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ اتنی سی چھاؤں کے لیے اتنا طویل سفر طے کیا، وہ چھاؤں تو شاید ہمارے لیے تھی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو منقسم۔"

ولید تڑپ کر پلٹا تھا۔ وہ اب بھی رخ موڑے آغا جی کے گھٹنے پر ایک ہاتھ رکھے افسردہ سی بیٹھی تھی، وہ اسے دیکھ کر ایک متاسفانہ سی سانس کھینچ کر رہ گیا۔

"تم بہت زیادہ اداس ہو بیٹا! جتنا سوچو گی اتنا ہی غم بڑھتا رہے گا۔" آغا جی نرمی سے اس کے بال سہلانے لگے۔ وہ لب کاٹنے لگی پھر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بے حد آزردگی سے بولی۔

"آغا جی! یہ حادثہ میرے لیے بہت بڑا ہے۔ میں شاید ایک عرصے تک خود کو ذہنی طور پر کسی بھی ذاتی خوشی کے لیے تیار نہ کر پاؤں گی، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میری شادی کی تاریخ آپ کچھ اور بڑھا دیں، میں بہت اپ سیٹ ہوں۔ آغا جی!" اس کی آواز بھرا گئی۔

"شیری! کیا کہہ رہی ہو بیٹا؟" آغا جی! نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"اسے میری التجا سمجھ لیجئے۔"

"پاگل، ابھی تو بہت وقت ہے تمہاری شادی میں، سنبھل جاؤ گی وقت خود ہر غم کا علاج ہے۔" انہوں نے نرمی سے اسے سرزنش کی۔

ولید کو اپنے اندر سے غم وغصے کی لپٹیں اٹھتی محسوس ہونے لگیں، احساس توہین سے اس کا رواں رواں سلگنے لگا۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے شہرینہ کو دیکھا تھا۔

خط کا سارا متن اس کی آنکھوں کے آگے ایک بار پھر پھرنے لگا۔ جس آگ کو اس نے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا تھا وہ ایک بار پھر رگ رگ میں بھڑکنے لگی۔ "تمہارا کیا خیال ہے اس حادثے نے ہم سب کو انتہائی مسرور کیا ہے۔ ہم سب بہت خوش ہیں، نومی کی موت کا کوئی دکھ ہمیں نہیں ہوا، ہمارے لیے یہ روز کا معمول ہے۔"

وہ دل سے اٹھنے والے غصے کے ابال کو دبا نہ سکا ایک سلگتی نگاہ ڈال کر تلخی سے بولا تھا پھر آغا جی کی طرف رخ کرتے ہوئے تڑختے لہجے میں کہا۔

”اسے کہہ دیجئے آغا جی! شادی اسی تاریخ پر ہو گی جس پر فکس ہے، ایک دن نہ آگے نہ پیچھے، سارے پروگرام جوں کے توں رہیں گے۔“

شہرینہ نے اس کے لہجے سے اٹھتی چنگاریوں کو اپنے دل پر گرتا محسوس کر کے سر اٹھایا۔ مگر دوسرے پل اس کی تپتی لال آنکھوں سے نظریں ملیں تو متوحش سی ہو کر پلکوں کی باڑھ جھکا دی۔ اسے لگا یہ آگ براہ راست اس کی روح میں اترتی جا رہی ہو۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی تک میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

”ماتم کرنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔ شادی کے بعد جی بھر کر کرتی رہنا، کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔“

اس نے غصے کے عالم میں جھک کر اپنا موبائل اٹھایا۔ اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے راہ میں آئی نازک بلوریں تپائی پر ایک زوردار ٹھوکر ماری اور دروازہ دھاڑ سے بند کرتا ہوا چلا گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ٹھوکر اس قدر شدید تھی کہ تپائی دیوار سے ٹکرائی اور اس کا نازک شیشہ ٹکڑوں کی صورت قالین پر بکھر گیا، لحظہ بھر فضا میں ارتعاش ہوا پھر گویا وحشت ناک سکوت اتر آیا۔

اس نے بے حد خوفزدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا اور ان بکھرے کانچ کے ٹکڑوں کو... اسے لگا جیسے یہ اس شیشے کے نہیں اس کے دل کے ٹکڑے ہوں۔

ایک وحشت اس کی رگ رگ کو چھیدنے لگی۔

”بہت بری بات ہے شیری بیٹا!“ آغا جی اسے متاسفانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

”خوشیوں کے راستوں پر رکاوٹیں کھڑی کرنا سراسر نادانی ہے۔ خوشیاں ہمیں طشتری میں سجا کر نہیں ملتیں، انہیں حالات سے کشید کرنا پڑتا ہے۔“

”آغا جی!“ اس نے تڑپ کر ان کو دیکھا اور کچھ کہنا چاہا مگر سارا حوصلہ بکھرتا محسوس ہونے لگا۔

وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

"اس قدر تلخ، سفاک رویے کی اسے امید نہیں تھی اس شخص سے اسے۔ اپنے لکھے ہوئے خط کا خیال آیا، یہ اس خط کا رد عمل تھا مگر اس طرح کے رد عمل کا بہر حال اس کے ذہن میں کہیں بھی تصور نہ تھا، یہ اس کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔

تو کیا وہ اب اپنی انانیت کے زعم میں اسے اپنا رہا ہے۔ ایک عجیب سی وحشت محسوس ہونے لگی۔

یہ اضطراب اس کے دل پر چٹکیاں بھرنے لگا کہ وہ اسے اپنی کیفیات سے صحیح طور پر آگاہ کرنے میں ناکام رہی ہے۔

میں اپنی انا کے ہاتھوں عجیب بے بس ہوں یارو

میں اس کا ہو نہیں سکتا، اسے ہونے نہیں دیتا

"لیں آپ ادھر بیٹھی ہیں میں نے آپ کو پوری کوٹھی میں ڈھونڈ ڈھانڈ لیا۔" صغریٰ کی آواز قریب سے آئی۔ وہ باغیچے کے بنچ پر یونہی پاؤں لٹکائے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"شیری بی بی!" صغریٰ اسے بالکل گم صم دیکھ کر اس کے قریب گھاس پر ہی بیٹھ گئی۔

"ہوں کیا بات ہے۔" اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور پلکیں جھپک کر نمی کو چھپا گئی۔

"اللہ تیرا شکر۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔" صغریٰ نے ایک پر سکون سانس بھری۔

"کس بات سے ڈر گئی تھیں کہ کہیں میں بیٹھے بیٹھے فوت ہو گئی ہوں۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"خدانہ کرے بی بی! رب آپ کو حیاتی دے۔ میرا مطبل یہ نہیں تھا۔" صغریٰ نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا پھر کچھ کھسک کر اس کے نزدیک آتے ہوئے بولی۔

"آپ اتنی اداس کیوں ہیں بی بی!" وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی پھر یکدم بچوں کی طرح اس کے گھٹنے پر اپنا سر رکھ دیا۔

"شیری بی بی! آپ جس وقت اداس ہوتی ہیں نا تو پوری کوٹھی مجھے اجاڑ ویران دکھائی دیتی ہے، آپ ہنستی رہا کرو۔ آپ ہنستی اچھی لگتی ہو، گھر کی ساری دیواریں، چھتیں اور ایک ایک چیز ہنسنے لگتی ہے، بس آپ چپ چاپ نہ رہا کرو اور خیر کون سا آپ نے کہیں اور جانا ہے۔ شادی کے بعد ولید باؤ کے ساتھ یہیں تو رہنا ہے۔"

صغریٰ کی باتیں اس کے دل پر زخم لگانے لگیں۔

”ہنسنا اور رونا اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے صغریٰ! یہ تو دل سے مشروط ہوتی ہیں، روتے دل کے ساتھ ہنستی آنکھیں بہت بڑا دھوکا ہوتا ہے۔“

”بس مجھے نہیں پتہ آپ ہنستی رہا کریں، یہ سارے دکھ، اداسی ایک کونے میں اٹھا کر پھینک دیں بلکہ مجھے دے دیں۔ میں اسے اپنے پنڈ کی نہر میں پھینک آؤں گی۔“ صغریٰ مچل کر بولی۔

”ارے تمہارے پنڈ کی نہر نے بھلا کیا قصور کیا ہے کہ اس میں یہ سارا کوڑا کرکٹ ڈالو گی۔“ وہ نم نم پلکوں کو جھپک کر بے اختیار ہنس پڑی۔ صغریٰ بدن ہلاتی کھی کھی کرنے لگی۔

”بس جب میں بہت اداس یا غصے میں ہوتی ہوں۔ تو اماں کہتی ہیں جا دفعان ہو اور اپنا سارا غصہ اور منہ کا سوجا پن نہر میں پھینک آ۔ چلیں اب اٹھیں۔ یہ کلے کلے اکیلے اکیلے باغوں میں آپ نہ بیٹھا کریں آپ دلہن ہیں اور اماں کہتی ہیں دلہنوں پر پریاں عاشق ہو جاتی ہیں۔“ صغریٰ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی پھر اس کے سبک ہاتھوں پر اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

”شیری بی بی! آپ تو خود کسی پری سے کم نہیں ہیں۔ ایویں کہیں کوئی دیو ہی عاشق نہ ہو جائے۔“ پھر اپنی ہی بات پر دہل کر جلدی سے بولی۔

”ہائے خدا نہ کرے۔ اٹھیں۔ اٹھیں نا شیری بی بی! اس ویلے بلائیں چھوٹتی ہیں۔“

”بہت فضول بولتی ہو صغریٰ تم، کچھ نہیں ہوتا نہ میں پری ہوں نہ دیو ہوا کے دوش پر پھرتے رہتے ہیں۔“

وہ اس کی باتوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ صغریٰ کی معصوم خالص سچی محبت سے گندھے رویے اس کے دل پر چھائی افسردگی کو مٹانے میں کامیاب ہوئے تھے وہ اس کے ہمراہ اندر چلی آئی۔

X...X...X

چٹا ککڑ بنیرے تے

کاسنی دوپٹے والیے منڈا صدقے تیرے تے

کاسنی دوپٹے والیے منڈا صدقے تیرے تے

ولید کو دیکھ کر مونا بھابی بھی شرارت سے کچھ اور زور و شور سے گنگنانے لگیں۔

وہ فریج سے سوفٹ ڈرنک کا ٹن نکال کر اس کی ٹوپ کھولتے ہوئے محظوظ ہو کر مسکرانے لگا۔

"آگے بھی آتا ہے یا اتنا ہی ہے بس۔" اس نے ٹن منہ سے لگایا اور بڑا سا گھونٹ بھر کر ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"اوئے ہوئے دل میں لڈو پھوٹنے لگے ہیں، خاطر جمع رکھو، تمہارے لیے نہیں گا رہی ہوں۔" وہ سلاد بناتے ہوئے زور سے ہنس پڑیں۔

"اوہ ماضی کی یادیں تازہ کر رہی ہیں۔" اس نے ابرو اچکا کر ہلکی سانس بھری۔

بھابی بدستور مسکراتی رہیں پھر جیسے احسان کرنے والے انداز میں گویا ہوئیں۔

"خیر تمہارے لیے ہی گا رہی ہوں۔ خوش ہو جاؤ کہ کوئی تو ہے جو تمہارے دل کی ترجمانی کر رہا ہے۔"

چاند کی سیج پہ تاروں سے سجا کے سہرا

پیار لایا ہے بہاروں میں بسا کے سہرا

ہم نے آنکھوں سے چنی ہیں یہ خوشی کی کلیاں

دل کے ٹکڑوں سے بنائی ہیں یہ نازک لڑیاں

دھڑکنیں پیار کی سن دل سے لگا کے سہرا

چاند کی سیج پہ تاروں سے سجا کے سہرا

وہ چھری کی نوک پلیٹ پر بجانے لگیں۔

"یہ اتنا احسان مجھ پر ہی کیوں، صرف میرے ہی دل کی ترجمانی کیوں، کچھ اس پر بھی احسان فرما لیجئے جس پر آپ کا خاصا حق بنتا ہے یہ تو فاؤل ہوا۔" وہ کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا، اس کی نگاہیں باورچی خانے کی طرف جاتی شہرینہ پر تھیں، جو بے دھیانی میں ادھر آنکلی تھی اب پچھتانے لگی تھی، اس کا خیال تھا وہ گھر پر موجود نہیں ہوگا، چائے کی شدید طلب پر وہ ادھر آگئی تھی۔

"اس کے لیے رخصتی کے دن پر ہی اکھٹے گاؤں گی، کیوں صغریٰ وہ کیا گانا تھا۔"

انہوں نے کٹی ہوئی سلاد کے پوٹ پر چھری رکھ کر صغریٰ کو پکارا جو ڈائننگ روم کے فرنیچر پر کپڑا پھیر رہی تھی۔ بھابی کی پکار پر لبیک کہتی چھم سے اس طرف چلی آئی اور لہک کر گانے لگی۔

میں تو چلی سکھیو، بدیسوا

اپنی سہیلیوں سے دور

بابل کی گلیوں سے دور

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ہو ہو

"بس۔ باس اب اتنا سوز پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ اسے رخصتی کے دن کے لیے ہی اٹھا رکھو۔" ولید نے مصنوعی کراہ کے ساتھ کہا تو صغریٰ کی آواز پٹ سے بند ہو گئی جیسے کسی نے کھڑاک سے نغمہ ساز کا گلا دبا دیا ہو۔

بھابی اپنی بے تحاشا ہنسی کو بہ مشکل روک پا رہی تھیں، ولید کے چہرے کے تاثرات کچھ ایسے تھے کہ انہیں ہنسی آئے جا رہی تھی۔

ولید نے ابرو اچکا کر انہیں گھورا۔

"کچھ اور بھی تیاریاں ہو رہی ہیں یا بس اسی پر ساری توانائیاں خرچ ہو رہی ہیں۔"

"مثلاً۔" بھابی چہک کر بولیں اور خاصی معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا تو وہ خوامخواہ سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا نگاہوں کا زاویہ بدل گیا۔

"فکر مت کرو۔ دوسری ساری تیاریاں بھی جاری و ساری ہیں دیکھتے نہیں ہو، میں اور مما دن بھر بازاروں کے دھکے کھا کھا کر سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں اور تم دونوں کو رتی بھر احساس

نہیں ہے۔ کھا پی کر جان بنا رہے ہو جیسے شادی میں نہیں کسی اکھاڑے میں شرکت کرنی ہے۔"

بھابی نے کرسی کھسکا کر اٹھتے اٹھتے اسے شرمندہ کرنے کی پوری کوشش کی اور اس کے ہاتھ سے ٹن کھینچ لیا۔

"صبح سے تین چڑھا چکے ہو یہ چوتھا ہے کیا دماغ میں زیادہ ہی گرمی چڑھ گئی ہے۔"

ولید ان کی بات پر حیران رہ گیا۔ اسے تو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ آج مسلسل سوفٹ ڈرنک کے ٹن پر ٹن خالی کر رہا ہے۔

"اگر اندر کی گرمی ان چیزوں سے ختم ہو جانے والی ہوتی تو دنیا کے آدھے قتل وغارت، فتنے فساد ختم نہ ہو جاتے۔" اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور کرسی کی بیک سے سر ٹکا کر باورچی خانے کے دروازے پر نگاہیں جما دیں۔

'یہ آگ اس پانی سے بجھنے والی نہیں ہے۔' اس کے دل میں چبھن ہونے لگی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تمہیں کچھ خبر ہے ولید! مما شہرینہ کو شادی سے کچھ دن پہلے مکمل پردے میں بٹھانے کا ارادہ رکھتی ہیں تاکہ اس پر بری نظریں نہ پڑیں۔" بھابی شہرینہ کے پاس آکر مخاطب ولید سے تھیں پھر شرارت بھری نظروں سے شہرینہ کو دیکھا۔

شہرینہ کا دل یکبارگی معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔ بے ارادہ اس کی نگاہیں ولید پر اٹھیں پھر جھک گئیں اور رخ پھیر کر وہ چائے کی چسکیاں بھرنے لگی۔

"شادی سے "کچھ۔" دن پہلے کیوں، ابھی سے بٹھا دیں یہاں کون دیدار کے لیے تڑپ رہا ہے۔" وہ کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے طنز سے ہنسا تھا، مگر بھابی اس کے طنز کو شرارت اور چھیڑ سمجھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔

ایک آگ تھی جو شہرینہ کو اپنے وجود کے گرد دہکتی محسوس ہونے لگی۔

وہ ڈائننگ روم سے نکل کر لابی میں چلا گیا تھا جبکہ بھابی فون کی بجنے والی بیل کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

اور وہ دل گرفتہ سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

کسی سلگتی سوختہ لکڑی کی طرح اس کا دل تڑخا تھا اور روح میں کرچیاں اتر گئی تھیں۔

X...X...X

جمے گی کیسے بساط یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں

سجے گی کیسے شب نگاراں کہ دل سر شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں چراغ رخ ہے نہ شمع وعدہ

کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشن رنگ و نغمہ

وہ گل سر شاخ جل گئے ہیں وہ دل تہ دام بجھ گئے ہیں

نومی کی موت کے بعد سکندر کو لگ رہا تھا زندگی ٹھہر سی گئی ہے امیدیں دم توڑ جائیں‘ ولولے، امنگیں باقی نہ رہیں تو زندہ رہنا ایک بے کار شغل معلوم ہونے لگتا ہے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ اندر سے اس طرح خالی خالی خود کو محسوس کر رہا تھا کہ نہ جینے کی خواہش تھی نہ موت کی تمنا۔ جیسے خلا میں کوئی تیرتا ہوا بے حیثیت ذرہ۔ جہاں ہوا لے جائے وہاں جائے۔

شاید ایسے ہی سکوت کو دل کی موت کہتے ہوں گے۔

ایک بند دکان کے شٹر کے نیچے بیٹھے وہ بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کا کھیل غیر دلچسپی سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ کبھی اس کے اندر بھی ایسی ہی روانی تھی، جیسے دل میں نئے چمکتے ٹائر لگ گئے ہوں، جو زندگی کی شفاف سڑک پر یوں بھاگتے دوڑتے جا رہے ہوں گویا کسی ندی کا بندھ ٹوٹ گیا ہو اب ٹھہریں گے ہی نہیں مگر۔

آہستہ آہستہ یہ پرانے ہوتے چلے گئے تھے یا پھر سڑکوں کی ٹوٹ پھوٹ سے عمر سے پہلے انہوں نے زندگی کھو دی۔ عجیب و غریب انداز میں وہ سوچنے لگا تھا پھر سر جھٹک کر کھڑا ہو گیا اور ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے فٹ پاتھ کے ایک طرف چلنے لگا۔

سڑکوں پر گھنٹوں بے مقصد ٹہلنا اس کا شغل ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنا استعفیٰ فاروقی صاحب کی میز پر رکھ آیا تھا۔ ادھر ولید اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا مگر وہ اس سے دانستہ کتراتا پھر رہا تھا اور ولید

سے ہی کیا آج کل تو وہ خود سے بھی اپنے خیالوں سے، اپنی ذہنی حالت سے بھی کتراتا پھر رہا تھا۔

جانے وہ کون سی شاہراہ تھی ایک طرف گلیاں تھیں، نامانوس اجنبی گلیاں۔ جہاں گندے پانی میں کئی بچے اچھل کود کر رہے تھے۔

زندگی کی تلخیوں اور مسائل سے بے پرواہ ان بچوں کی آنکھوں میں زندگی ہمک رہی تھی، ایسے ہی ایک صحت مند سرخ و سپید بچے کو دیکھتے ہوئے اس کے تصور میں نومی کا چہرہ بننے لگا۔

ایسا ہی زندگی سے ہمکتا چہرہ

بہت کچھ پا لینے کی خواہشات سے چمکتی آنکھیں

ابو لائے موٹر کار

اس کے نیچے پہیے چار

چابی سے یہ چلتی ہے

پوں پوں پوں کرتی ہے

اپنی چھوٹی سی ڈنکی کار کو وہ پورے صحن میں بھگاتا پھر رہا تھا۔ گاڑیاں اس کے بچپن کا شوق تھا۔

"سکندر بھائی! میں بڑا ہو جاؤں گا تو ابو میرے لیے بڑی سی گاڑی لے کر آئیں گے نا۔۔" وہ اسے یکسوئی سے پڑھنے نہیں دے رہا تھا۔ بار بار اس کے پاس چلا آتا۔

"گاڑی! ابو کیوں تم بڑے ہو کر خود خرید لینا۔ جب بہت سا پڑھ لکھ لو گے اور اچھی سی نوکری کرو گے تو خوب پیسے ملیں گے اس سے اپنے لیے گاڑی خرید لینا۔" وہ اپنی کتاب بند کر کے اسے چھیڑتا۔

پتہ نہیں اس وقت نومی کے ننھے سے دل نے اس جملے کو کیا معنی پہنائے تھے۔ وہ سر ہلا کر جیسے مطمئن ہو کر دوبارہ اپنے اسی شغل میں مصروف ہو گیا۔

یکلخت اس کے اندر گھٹن بڑھنے لگی' چہرے پر ہاتھ پھیر کر اس نے نومی کا تصور جھٹکا اور ڈھیلے قدموں سے دوبارہ چلنے لگا کہ اچانک اس کے قدم یوں ٹھٹک کر رک گئے۔ جیسے پیر میں ٹھوکر لگی ہو... اس کی آنکھیں حیرت سے جھپکنا بھول گئیں۔

اس کے دل کے آس پاس وہی مانوس پشیمانی' ندامت کا درد امڈنے لگا جس کو وہ بھلا بیٹھا تھا۔ مگر نہیں وہ کب بھلا پایا تھا۔ دو بھیگی آنکھیں اس کے دل پر نقش تھیں۔ بلاشبہ وہ عظمیٰ تھی۔

سید صاحب کی ستم رسیدہ، گھائل بیٹی۔ وہ بس سے اتری تھی۔ نیلے رنگ کے سوٹ پر سیاہ چادر اوڑھے، نڈھال قدموں سے سڑک کراس کر رہی تھی۔ پھر سر جھکا کر فٹ پاتھ کے ایک طرف چلنے لگی تھی۔

"عظمیٰ!" وہ ابھی زیادہ دور نہ تھی اس نے دو چار قدم میں اسے جالیا۔

شاید وہ اپنی سوچ میں غلطاں تھی یا پھر اندر سے اس قدر ڈری سہمی کہ اس آواز پر کانپ کر پلٹی تھی۔

"آپ...." سکندر کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کے لب حیرت سے کھلے، مگر دوسرے پل وہ اضطرابی انداز میں ہونٹ بھینچ گئی۔

"شکر ہے تم نے مجھے پہچان تو لیا۔" اس کی آنکھوں میں اضطراب اور شناسائی کے رنگ دیکھ کر اس کا اعتماد بحال ہوا۔ "آپ تو میرے محسن ہیں آپ کو نہیں پہچانوں گی۔" وہ بڑی بے اختیاری میں شاید طنز کر گئی تھی جب ہی خفیف سی ہو کر نظریں جھکا لیں۔

سکندر افسردگی سے مسکرا دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"نہیں تم طنز کرنے، بلکہ گالیاں دینے کا بھی پورا حق رکھتی ہو۔ یہ تمہارا احسان ہے کہ تم میری آواز پر رک گئیں۔ اگر پہچان کر بھی اجنبی کی طرح گزر جاتیں تب بھی میں شکایت نہ کرتا، چونکہ ہم تمہارے بڑے مقروض ہیں اور مقروض شرمسار ہوتے ہیں شکوہ کناں نہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہاں رہتے ہو تم لوگ؟" ایک افسردہ سی سانس اس کے سینے کی تہ سے نکل گئی۔

"سید صاحب سینے پر ایک بوجھ لے کر خاموشی سے چلے گئے، کم از کم زبانی معافی کا موقع ہی دے دیتے۔"

"وہ تو ہمارے سینے پر بھی بھاری بوجھ چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔" عظمیٰ پلٹ کر قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔

"کیاآ؟ کہاں چلے گئے؟" سکندر کو جھٹکا سا لگا وہ وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ان کا انتقال ہو گیا ہے۔" وہ چہرہ اٹھا کر درد سے ڈوبی آواز میں بولی۔

سکندر کیلئے یہ خبر کسی ذہنی آزار سے کم نہ تھی۔اس کی نگاہیں شرمندگی کے احساس سے جھک گئیں‘ وہ زیادہ دیر اس کی طرف نہ دیکھ سکا‘ اس کے چہرے پر پھیلا حزن جس میں ماتمی دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا‘ آنکھوں کے راستے دل میں اترتا محسوس ہونے لگا۔

عظمیٰ دل سے اٹھنے والے درد کو دباتے ہوئے مرتعش آواز میں بولی۔

”وہ شاید عمر ہی اتنی لائے تھے مگر دکھ اس بات کا ہے کہ موت کا جو سبب بنا وہ موت سے زیادہ اذیت ناک تھا۔میں نے انہیں موت سے پہلے مرتے دیکھ لیا تھا‘ اب تو کہیں جا کر وہ آسودہ ہوئے ہیں‘ اب تو رحمت میں چلے گئے ہیں۔“

وہ چہرہ جھکا گئی‘ وہ معصوم الہڑ عظمیٰ کے بجائے ایک دکھوں کی ماری اجڑی عورت دکھائی دے رہی تھی۔اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں ایسی ویرانیاں تھیں کہ سکندر کے دل پر پشیمانی ہلکورے لینے لگی۔

”کہاں رہتے ہو تم لوگ‘ میرا مطلب ہے گھر کہاں ہے؟“

”گھر۔گھر تو انسانوں سے بنتے ہیں سکندر صاحب اور ہمارے گھر میں رہا ہی کون ہے‘ ابا اپنے مالک حقیقی سے جا ملے‘ سلیم بھائی اپنی جاب کی وجہ سے خیر پور میں جا بسے‘ بیمار اماں

میری وجہ سے زندہ رہنے پر مجبور ہیں۔“ وہ پلٹ کر ڈھیلے قدموں سے چلنے لگی پھر یکدم رک کر بولی۔

”میں آپ کو گھر کا پتہ نہیں بتا سکتی‘ آپ کو دیکھ کر اماں کے سارے زخم ہرے ہو جائیں گے‘ بڑی مشکل سے سنبھلے ہیں ہم لوگ۔“ باوجود ضبط کے اس کا لہجہ چیخ سا گیا تھا۔

”برائے مہربانی میرا پیچھا نہ کیجئے گا ہمیں اب چین سے رہنے دیں‘ اس باب کو بند ہی رہنے دیں۔“ وہ یہ کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی۔

سکندر باوجود چاہنے کے اسے نہ روک سکا۔ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا۔وہ نامانوس سی کسی گلی میں مڑ کر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی مگر اس کا اداس سا چہرہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہونے کے باوجود اوجھل نہ ہو پایا۔

X...X...X

یہ اضطراب مسلسل عذاب ہے امجد

مرا نہیں تو کسی اور ہی کا ہو جائے

اسے آمنہ مردان علی کے ٹیلی فون نمبر ڈھونڈنے میں مشکل پیش نہیں آئی' ولید کی ٹیلیفون انڈیکس میں دوسرے صفحے پر ہی اس کی کوٹھی کے تین نمبر زدرج تھے۔

اس کی ذہنی حالت اس قدر ابتر ہو چکی تھی کہ وہ اپنے اس اقدام کے نتیجے سے قطعاً بے پرواہ ہو گئی تھی۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف کسی ملازم کی آواز ابھری تھی۔

"ہیلو! مجھے آمنہ علی شاہ سے بات کرنی ہے۔" وہ گلا کھنکار کر شائستگی سے بولی' مگر دوسری طرف پہلا سوال "کون ہو۔" پوچھا گیا۔

"میں شہرینہ خان ہوں' ولید حسن کی کزن۔"

"معاف کیجئے گا سائنٹرن آمنہ بی بی تو ادھر ہیں نہیں وہ تو سائیں جمشید خان کے ساتھ دوبئی گئی ہوئی ہیں۔" ادھر سے سندھی لب و لہجے میں جواب آیا۔

"جمشید خان۔ یہ جمشید خان کون ہیں۔" اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"سائیں وہ تو آمنہ بی بی کے منگیتر ہوتے ہیں نا۔ وہ دوبئی میں اپنی کمپنی کے اشتہار کیلئے گئے ہیں۔ آمنہ بی بی بھی ان کے ہمراہ ہی گئی ہیں خدا جانے اب کب لوٹیں۔" وہ اسے پوری تفصیل دیتے ہوئے پھر پوچھنے لگا۔

"وہ آئیں گی تو میں ان کو آپ کا پیغام دے دوں گا اور کوئی حکم۔"

"آمنہ علی کا منگیتر۔" اس کے اعصاب پر ضرب سی لگی تھی وہ کھنچتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

اس انکشاف کی زد نے اس سے ملنے جلنے کی سکت بھی چھین لی تھی' اس نے کہنا چاہا۔ "نہیں اور کوئی حکم نہیں' تم نے تو اتنا ہی تا کر میرے اعصاب چھین لیے ہیں۔"

یہ کایا کیسے پلٹ گئی' کب وہ ولید حسن کی زندگی سے نکل گئی یا پھر اس کی زندگی میں آئی ہی نہیں تھی' اس کا نقش ولید کے دل پر پانی کے بلبلے کی طرح تھا یا پھر تھا ہی نہیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ خوشی سے چیخے یا غم سے پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ یا اپنی کم فہمی پر ماتم کرے اس کے وجود پر صحرا جیسا سناٹا بکھر آیا۔ معاً کسی نے اس کے ہاتھ سے ریسیور چھیننے کے انداز میں لیا تھا۔ وہ سٹپٹا کر پلٹی تو ولید کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

”ہو گئی تسلی‘ کر لیا اپنے دل کو مطمئن‘ مل گیا ایک ملازم کی زبان سے اعتبار؟“

وہ ریسیور کریڈل پر پھینکتے ہوئے غصے‘ طنز اور ملامت کے مشترکہ احساس سے اسے دیکھنے لگا۔

اس کی آمد اس قدر غیر متوقع ثابت ہوئی کہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے مجرم کی طرح خجالت‘ بے بسی اور ذلت کے احساس سے کٹ کر رہ گئی۔ ابھی تو اس انکشاف کی زد سے نہ نکلی تھی کہ وہ کسی بم کی طرح اس کے قریب بلاسٹ ہوا تھا اور اسے اپنے اعصاب بکھرتے محسوس ہونے لگے۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اب تک بداعتمادی کی فضا میں سانس لے رہی ہو‘ میرے جذبوں کی آنچ تم تک پہنچی ہی نہیں ہے۔“ وہ غصے کی شدت سے پھنکارا۔

وہ تڑپ کر کرسی سے اٹھی۔

”آ۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں میرا یہ مقصد نہیں تھا۔“ مارے خجالت اور شرمندگی کے اس کی پیشانی یوں جلنے لگی جیسے اس پر انگارہ رکھ دیا گیا ہو۔

”شٹ اپ... تمہارا مقصد میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں‘ کیا میں تمہاری ملکیت ہوں کہ تم مجھے آمنہ علی کو خیرات کرنے نکلی تھیں۔ بولو۔ کیا سوچ کر تم نے وہ گھٹیا خط لکھا میرے نام۔“

اس نے اس کی آنکھوں میں اپنی تپتی آنکھیں گاڑ دیں۔ شہرینہ کو اپنے پہلو سے آنچ اٹھتی محسوس ہونے لگی۔ ”کیا مجھے تمہاری اجازت درکار تھی۔ کیا میں آمنہ علی کو اپنا نہیں سکتا تھا۔ میں چاہوں تو ایسی دس آمنہ مردان علی کو پا سکتا ہوں... مگر افسوس۔ صد افسوس کہ تم نے مجھے سمجھا ہی نہیں۔“ اس نے انتہائی ملامت سے اسے دیکھا اور متاسفانہ سانس کھینچی۔

”ولید...!“ اس نے تڑپ کر کچھ کہنا چاہا مگر وہ اس پر ایسی سلگتی نظریں ڈال کر رہ گیا کہ اس کی آواز سینے میں گھٹ کر رہ گئی... آنسوؤں کا ایک تیز ریلا آیا۔

”مجھے پتہ نہیں تھا تم ایک سطحی لڑکی ہو‘ تمہیں اظہار کے لفظوں کے ٹوکروں کی ضرورت ہے۔“ وہ استہزائیہ ہنسا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ غلط ہے میں کسی بھی بداعتمادی کا شکار نہیں ہوں۔" وہ کرب سے چلائی۔

اس ذلت کا تو تصور بھی نہ تھا اس کے پاس۔ مگر ادھر وہ اپنی اس ہتک اور تذلیل پر دہکا ہوا تندور ہو رہا تھا۔ آمنہ علی سے اس نے جس ارادے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی' کسی نشتر کی طرح یہ بات اس کی روح کو کاٹ گئی تھی' وہ تو اس کا خط پڑھ کر پہلے ہی ہتک کے احساس سے سلگ رہا تھا' اس نے تو گویا آج تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر اسے غصے اور تذلیل کے احساس سے پاگل کر دیا۔

"گیٹ آؤٹ' آئی سے گیٹ آؤٹ' مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننا' اب ہمارے درمیان ساری باتیں' شادی...۔" وہ کچھ کہتے کہتے لب بھینچ کر رہ گیا پھر جارحانہ انداز میں اس کا بازو پکڑ کر اسے کمرے سے باہر دھکیل کر دروازہ پوری طاقت سے بند کر دیا۔

اتنی سفاکی' سنگدلی اور اپنی ذلت کے احساس پر وہ بری طرح بکھر گئی اپنی پوزیشن پر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا جھرنا پھوٹ نکلا۔

وہ خوف اور حیرانی اور بے یقینی سے جھر جھر بہتی آنکھوں کے ساتھ بند دروازے کو تکتی رہ گئی۔

یہ سب کیا ہو گیا' اس طرح تو اس نے سوچا تک نہیں تھا۔ وہ تو اس کی خیر اخواہی چاہ رہی تھی' اس کیلئے فیصلے کی راہیں آسان کرنا چاہ رہی تھیں' اپنے تئیں ایک ہمدرد رفیق ثابت ہونا چاہ رہی تھی۔

مگر سب کچھ الٹا ہو گیا۔

اس کی ہمدردیاں درحقیقت اس کی غلط فہمیوں کا ہی نتیجہ تھیں اور اب وہ اس پر جتنا ملال کرتی جتنا ماتم کرتی کم تھا۔

X...X...X

اسے جارحانہ انداز میں کمرے سے نکال کر ولید نے غصے سے دروازہ بند کیا تھا اور ٹیبل پر پڑی رسٹ واچ اٹھا کر دیوار پر دے ماری۔ بیڈ کا تکیہ اٹھا کر نیچے پٹخا۔

اس قدر بے اعتبار ہونے کا تصور اس کیلئے بے حد ذلت آمیز تھا جس کی اذیت وہ اپنی رگ رگ میں اترتی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اس کی محبت کے شفاف حوض کو کتنا گدلا کر گئی تھی۔

وہ اسے ایک کم عقل ہی نہیں ایک ظالم لڑکی محسوس ہونے لگی' اس نے سگریٹ سلگائی اور گہرے گہرے کش لگا کر دھواں آنکھوں کے گرد پھیلا لیا...اور کتنی دیر سگریٹ پھونکتا رہا' اس آگ سے دل میں دہکنے والی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا رہا' پورا کمرہ سرمئی دھوئیں سے بھر گیا مگر سوچوں کی طنابیں تنی پڑی تھیں۔آگ تو ایک ایک مسام سے پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔

"اب تمہیں تھوڑا سا سبق نہ چکھایا تو میرا نام ولید حسن شاہ نہیں۔"

یکدم اس کے چہرے کا تناؤ ڈھیلا ہو گیا۔اس نے جلتی سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی اور ریک سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

X...X...X

وہ دانستہ اسے کوئی دکھ رنج پہنچانا نہیں چاہ رہی تھی مگر ہر بار یہ شخص اس کی بے بسی' لاچاری اور ذہنی پراگندگی کے ہاتھوں زخم کھاتا تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

آج رہ رہ کر اسے ساری کوتاہیاں رلا رہی تھیں اسے ہر طرف اپنا ہی قصور دکھائی دے رہا تھا۔

کہتے ہیں غلطیوں کی کھڑکی کھلنے کے بعد ہی احساس کا دریچہ وا ہوتا ہے۔اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔اسے ایک ایک کر کے اپنی ساری غلطیاں یاد آنے لگیں۔

وہ دل گرفتہ سی کمرے میں بے قرار روح کی طرح چکر کاٹنے لگی۔پھر تھک کر بیڈ کے سرہانے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئی۔

اس کی ساری انا' سرکشی' ضدی پن بہہ کر رہ گئی تھی۔وہ خود کو ایک ایسا نقطہ محسوس کر رہی تھی جو ایک مدار کے گرد چکر کھانے لگا ہو۔اور وہ مدار ولید حسن تھا۔

اس نے شدت کرب سے لب دانتوں میں دبا کر گھٹنوں میں سر جھکا لیا۔

اب ملن کے تمام خوش کن لمحات شعلوں کی نذر ہونے تھے۔

یہ احساس...رگوں میں خوف بن کر دوڑنے لگا۔

X...X...X

گھر میں مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ ممانی جان بھی آچکی تھیں۔ ہمایوں کی آمد سے اچھی خاصی رونق لگ گئی تھی وہ وسیم بھائی کے ساتھ مل کر ولید کو خوب تنگ کر رہا تھا اور ایسے میں مونا بھابی ولید کا خوب ساتھ دیتیں۔

"تم تھالی کا بینگن بنتی جا رہی ہو بیگم!" وسیم بھائی اس دن انہیں ولید کی بڑھ چڑھ کر حمایت کرتے دیکھ کر چڑ کر بولے۔

"نیگ جو چاہیے تگڑا سا۔" ہمایوں نے کہا تو زبردست قہقہہ پڑا۔ بھابی جھینپ کر رہ گئیں۔

" میں بھی کہوں یہ میری محبت یکلخت کیسے جوش مارنے لگی' آپ کے اندر۔" ولید نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"بدتمیز لڑکے اگر نیگ لوں گی تو یہ کوئی جرم نہیں ہے' یہ تو یوں بھی میرا حق بنتا ہے' میں چند ہزار کیلئے تھالی کا بینگن بنوں گی۔" انہوں نے کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔

"خیر خیر یہ ریمارکس میں نے نہیں دیئے۔ آپ کے شوہر نامدار کی طرف سے ہی آیا ہے جنہیں آپ بیگم سے زیادہ بینگن میں بدلتی نظر آ رہی ہیں۔"

"اونہہ' ان کی تو رہنے ہی دو۔ یہ تو چاہتے ہیں بس عورت گاجر مولی نظر آئے۔"

"بہر حال' کم از کم بینگن نظر نہیں آنا چاہیے۔"

وسیم بھائی کی بات پر ولید اور ہمایوں ہنسنے لگے جبکہ بھابی احتجاجاً وہاں سے ہٹ گئیں اور مما کی طرف چلی گئیں جو ممانی جان کو شہرینہ کے زیورات دکھا رہی تھیں۔

"وائو یہ تو زبردست ہیں مما!" ایک خوبصورت سیٹ دیکھ کر مونا بھابی کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ انہوں نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔

"اچھا ہے نا۔ کل ہی ولید لے کر آیا ہے۔" مما نے مسکرا کر بتایا۔

"زبردست...۔" انہوں نے توصیفی انداز میں اسے دیکھا پھر مضحکہ خیز اندار میں کھنکار کر اونچی آواز میں بولیں۔

"یہ ولید کی پسند روز بروز نکھرتی نہیں جا رہی ہے مما!"

ولید کی انگلیاں سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکالتے ہوئے ایک پل کو رکیں مگر دوسرے پل وہ بے پرواہی سے سگریٹ لبوں میں باہم دبا کر اسے لائٹر کا شعلہ دکھانے لگا۔

''لو اس کی پسند بری کب تھی۔ اچھا تم ایسا کرو یہ شیری کو دکھا آؤ اس کے بندے کچھ بڑے ہیں۔ اگر چھوٹے کروانے ہیں تو ابھی بتا دے۔ بعد میں شور نہ مچاتی پھرے کہ میں نہیں پہن سکتی۔ بارات والے دن ہی پہننا ہے اسے۔''

ممانے سیٹ دوبارہ مخملیں بکس میں رکھ کر بھابی کو پکڑا دیا اور ممانی سے بولیں۔

''اس لڑکی کے بھی ہزار نخرے ہیں۔ کہاں تو کدکڑ لگاتی پھرتی تھی اور کہاں منہ لپیٹ کر پڑی ہے۔''

''سوئٹ پھوپھی جان اگر لڑکیاں ایسے نخرے نہ دکھائیں گی تو پتہ کیسے چلے گا کہ ان کی شادی ہو رہی ہے۔'' ہمایوں نزدیک آ کر چھوٹی تپائی پر بیٹھ گیا۔

'' تم تو چپکے ہی رہو۔ کوئی نخرے وخرے نہیں دکھاتیں لڑکیاں۔ تم ان کے احساسات جذبات کو کیا سمجھو۔'' بھابی نے سیٹ کا بکس ہمایوں کے سر پر ہلکے سے مارا۔

''آہ جذبات' احساسات۔'' ہمایوں نے لمبی سانس کھینچی۔

''سن رہے ہیں ولید بھائی! زور کس پر ہوا جذبات اور احساسات پر۔''

''ہاں بھئی ملکہ جذبات تو یہی عورتیں ہیں۔ ان کے خیال میں مرد تو سیمنٹ گارے کے بنے ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات جتنا چاہیں مجروح کر لیں۔''

اس نے سگریٹ کا کش لے کر متاسفانہ انداز میں سانس بھری اور لابی سے گزرتی شہرینہ کو دیکھا جو ایک پل کو ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ پھر تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

ایک تیر پیوست ہو گیا تھا اس کے دل پر۔ وہ مجروح پرندے کی طرح پھڑ پھڑ کر رہ گئی تھی۔

''یہ شخص کوئی موقع بھی تو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا نشتر زنی کرنے کا۔''

اسکے صبح سے بلند بانگ قہقہے وہ سن سن کر گیلی لکڑی کی طرح سلگتی جا رہی تھی۔ سب کیلئے کیسا ٹھنڈا میٹھا چشمہ بنا ہوا تھا۔ ایک اسی کیلئے کڑکتی دھوپ تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ گھر کی اس ساری رونق کو آگ لگا دے۔

آنے والے لمحات' خوف' وحشت بن کر اس کے دل پر دھمک دے رہے تھے۔

مونا بھابی وہ سیٹ اٹھائے چلی آئیں' وہ باتھ روم کے بیسن کا نل کھولے منہ پر پانی کے چھپاکے مارے جا رہی تھی' ساتھ ساتھ آنکھوں سے بے آواز بہنے والا پانی بھی بہا رہی تھی۔

"شیری! یہ دکھو۔ کتنا زبردست سیٹ لایا ہے ولید! تمہارے لیے۔" وہ بکس کھول کر اسے دکھانے لگیں۔

"پہن کر دیکھ لو بندے بھی چیک کر لو، تمہیں ہیوی تو نہیں لگ رہے ہیں۔ بقول مما کے پھر شادی والے دن شور مت مچانا کہ کان دکھ رہے ہیں۔"

اس نے نل بند کیا اور تولیے سے منہ رگڑ کر باہر آئی اور بے دلی سے جگمگاتے سیٹ پر نظر ڈالی آنکھیں خیرہ ہو گئیں مگر دل کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔

اسے اس ستم گر کی اس اداکاری پر بھر بھر کر رونا آیا۔

"اچھا ہے۔" وہ یکسر بے کیفیت لہجے میں کہتی نظریں ہٹا کر چوٹی کے بل کھولنے لگی۔

"صرف اچھا نہیں جناب! بہت اچھا ہے چلو یہ بندے پہن کر دیکھ لو۔" بھابی نے بندے اس کی طرف بڑھائے۔

"میرا خیال ہے ٹھیک ہی ہیں۔" اس نے جلدی سے ان کا ہاتھ روک دیا۔ اس کے لہجے کی بے زاری اور اکتاہٹ محسوس کر کے بھابی نے اسے غور سے دیکھا۔

جب کہ وہ چہرہ جھکا گئی تھی۔ وہ حتی الامکان اپنے چہرے کی پژمردگی ان سے چھپانا چاہتی تھی، تاکہ دل کا غبار آنکھوں کے راستے نہ بہہ جائے۔

اپنی حماقتوں کا ذکر کر کے وہ مزید شرمندہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ سو تنہا جھیلنے پر مجبور تھی۔

"تمہیں تو ٹمپریچر لگ رہا ہے شیری!" بھابی نے اس کا ہاتھ پکڑا جو گرم ہو رہا تھا پھر انہوں نے اس کی پیشانی کو ہلکے سے چھوا۔

"بیوقوف لڑکی، کیا حالت بنا رکھی ہے۔" انہوں نے اس کا چہرہ دیکھا وہ انہیں بے حد سست اور تھکی تھکی دکھائی دی۔ انہوں نے سیٹ کا بکس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا اور اس کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"کوئی میڈیسن تو لی نہیں ہو گی ہے نا۔ ٹھہرو میں ہومی کو بلاتی ہوں وہ تمہیں چیک کرے گا۔" بھابی کو بے حد تشویش ہونے لگی۔

"ارے نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں اس نیم حکیم خطرہ جان کو تو رہنے ہی دیجئے۔" وہ لہجے میں زبردستی خوش دلی کا تاثر سموتے ہوئے ہنس پڑی۔

”کون نیم حکیم ہے بھلا۔“ ہمایوں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور بھنویں اچکا کر اسے گھورنے لگا۔ ”میڈیکل کے فائنل میں ہوں، تم میری انسلٹ کر رہی ہوں نیم حکیم کہہ کر۔“

”نہ صرف نیم حکیم بلکہ خطرہ جان بھی کہا ہے۔“ بھابی نے اسے چڑایا۔

”آہ... یہ کانٹا جو ہمیں چبھا ہے کاش تجھے بھی چبھتا چاند!“

ہمایوں کے لبوں سے ایک کراہتی سانس نکل گئی۔ اس نے سر اٹھا کر جیسے دہائی دی۔

”کس چاند سے مخاطب ہو۔ اس وقت تو نہ آسمان کا چاند نکلا ہے نہ زمین کا چاند۔“ بھابی بے ساختہ ہنسی تھیں۔

”ارے چھوڑیں آسمان کے چاند کو، چاند میں سچ مچ کا نور کہاں چاند تو اک ویرانہ ہے۔ ادھر تو بقول شاعر

اپنے سینے کے مطلع پر جو چمکا وہ چاند ہوا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

”اوئے ہوئے تم مستقبل کے ڈاکٹر کم شاعر زیادہ نظر آ رہے ہو مجھے۔ تب ہی شیری نے تمہیں خطرہ جان کہا تھا۔“ بھابی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ ہمایوں نے جھینپ کر بھابی کو گھورا پھر کندھے اچکا کر شہرینہ کی طرف مڑا۔

”یہ بتاؤ کہ تم یوں منہ لپیٹ لپٹا کر کمرے میں بند ہو کر کون سا ماحول کری ایٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ یوں بھی تمہیں کوئی رخصت ہو کر سات سمندر پار تو جانا نہیں ہے، یہیں رہنا ہے ہمارے سروں پر مسلط۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے بڑی افسوناک شکل بنائی۔

”شاید اسی بات کا غم تو نہیں منا رہی ہو۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بے ساختہ ہنس پڑا۔

”چلو باہر نکلو محفل کو رونق بخشو، اب دیوداس کا زمانہ نہیں رہا ہے۔“ وہ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اسے زبردستی گھسیٹتا لونگ روم میں لے آیا۔

”ہومی پلیز میں بہت تھک گئی ہوں۔“ وہ ملتجی ہو کر بولی۔

وہ سامنے ہی تو بیٹھا تھا۔ اس کا سارا اعتماد بکھرنے لگا۔

شہرینہ یکدم اب اٹھ کر جا بھی نہیں سکتی تھی۔ ہمایوں بھی پھیل کر اس کے قریب کھڑا تھا۔

وہ اندر ہی اندر اذیت کے احساس سے دوچار ہونے لگی۔

اب ایک شخص کی بے اعتنائی پر اتنی بہت سی محبتوں سے منہ موڑ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ سخت ٹینشن کا شکار ہونے لگی جبکہ وہاں بھرپور شدتوں کے ساتھ جائزہ لیتی آنکھیں بڑی پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔

" کتنے پہاڑ کھودے ہیں، کتنی نہریں نکالی ہیں کہ تھک گئی ہو؟" ہمایوں نے ہنس کر کہا۔

"سالے میاں نہر شیریں نے نہیں فرہاد نے نکالی تھیں۔" وسیم بھائی نے جلدی سے گویا تصحیح کی۔

"بھئی میں نے سوچا اب لڑکیاں بھی مردانہ کام کرنے لگی ہیں، ہو سکتا ہے یہ کام بھی کرنے لگی ہوں۔" اس نے شرارت سے کندھے اچکائے اور شہرینہ کی طرف مسکراہٹ دباتے ہوئے دیکھا۔

"مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا۔

"ہومی! مت تنگ کرو، اسے بخار ہے۔" بھابی کا دل شہرینہ کا چہرہ دیکھ کر پسیج گیا۔ بخار اور خفت کی سرخی سے عجب تپا تپا اور قابل رحم نظر آ رہا تھا۔

"بخار ہے تو ابھی میڈیسن دے دیتا ہوں۔ ویسے بائی داوے یہ بخار کس سلسلے کا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں کھنکار کر اس کی طرف جھکا۔

"میرا خیال ہے عشق کا ہوگا۔" ولید سگریٹ کی ٹوپ سے راکھ جھاڑتا ہوا بڑے برجستہ انداز میں بولا تھا۔ ہمایوں بڑے زور کا قہقہہ لگا کر رہ گیا۔

"بلے بلے یہ خوش فہمی۔"

بیچارگی و کرب سے گزرتے ہوئے اس نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بڑے غور سے اس کی طرف ہی متوجہ تھا بلکہ اپنی بات کا ردعمل اس کے چہرے پر دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے سگریٹ کے کش لیتا ہوا، ہمایوں کی شرارتوں پر محظوظ ہو کر مسکراتا۔ شہرینہ کے دل کا درد بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا تروتازہ، ہشاش بشاش سراپا اس کی ذہنی پراگندگی میں اضافہ کا باعث بن رہا تھا۔

اس کا سکون غارت کر کے وہ کس قدر پر سکون دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بخار میں پھنک رہی تھی اور ادھر آنچ تک نہ آئی تھی۔ وہ کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی اور ادھر وہ پھولوں کی طرح مہکا ہوا تھا۔ اس کی دل گرفتگی بڑھنے لگی۔

"بھلا عشق کا بخار اتارنے کیلئے کون سی میڈیسن ہوتی ہے۔" ہمایوں نے مونا بھابی کی طرف رخ کیا۔

"یہ تو تم ولید ہی سے پوچھو۔"

"کوئی بخار وخار نہیں ہے مجھے سمجھے تم۔" وہ یکدم بھبھک کر اپنی جگہ سے اٹھی۔

"کیوں ستا رہے ہو بچی کو۔ ادھر آ جاؤ شیری! یہاں آؤ میرے پاس۔" ممانی جان نے ہمایوں کو ڈپٹا اور اپنے قریب شہرینہ کیلئے جگہ بنائی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا وہ یہاں سے بھاگ جائے' ان سب کی شرارتوں کا گھیرا توڑ ڈالے۔

کوئی اور وقت ہوتا' دل کا نگر آباد ہوتا تو وہ ان جھنکاروں میں خود بھی شامل ہوتی۔ ہمایوں کی شرارتوں پر شرماتی حظ اٹھاتی' مگر اب تو یہ سب ضرب کی طرح اس کے دل پر لگ رہی تھیں۔

"دیکھو ذرا پھول جیسا چہرہ کیسے کمہلا کر رہ گیا ہے۔"

ممانی جان اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں اور اس کا چہرہ اٹھا کر پیشانی پر بوسا دیا۔

"ہم نے تو سنا تھا شادی کی خوشی میں لڑکیوں کے پھیکے شلجم جیسے چہرے بھی گلاب بن جاتے ہیں۔"

"ہومی اب مار کھاؤ گے میرے ہاتھ کی۔" ممانی نے اپنے چپل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ایک آدھ جڑ ہی دیجیے ممانی جان! ناحق دل پر جبر کر رہی ہیں۔" وسیم بھائی یہ کہتے ہوئے اٹھے اور ہنستے ہوئے ہمایوں کی گردن دبوچ کر اسے ممانی جان کے قریب کر دیا۔

"ولید بھائی! دیکھ لیں دیکھ لیں' آپ کے یہ حقوق محفوظ ہیں وسیم بھائی کی پوزیشن بھی بطور سالے یہی ہونی چاہیے۔"

ہمایوں جھکے سر کے ساتھ احتجاجاً چلانے لگا تو اس کی اس بات پر زبردست ہنسی امڈی۔ ہومی کی یہ درگت دیکھ کر شہرینہ بھی بے اختیار امڈنے والی مسکراہٹ نہ روک سکی تھی۔

"اوئے بہت بڑھ بڑھ کر بولنے لگے ہو۔" وسیم بھائی نے کھسیا کر اس کی جھکی گردن کو ہلکے سے دبا کر چھوڑ دیا۔

"تسلی رکھو ہومی! گن گن کر تمہارے سارے بدلے چکاؤں گا۔"

ولید نے تسلی دینے والے انداز میں اس کی پیٹھ تھپکی پھر ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

"بس چند دن فقط میری جان چند دن' سارے حساب بے باق ہو جائیں گے۔" بظاہر اس نے بڑی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں اترنے والی سرد سی ایک لہر شہرینہ کی آنکھوں سے دل میں اتر کر اسے وحشت زدہ کر گئی۔

اسے اپنی رگوں میں بھاگنے والا خون یکلخت جمتا محسوس ہونے لگا۔

"میں تانیہ کو فون کر کے ابھی آئی۔" وہ تڑپ کر اضطرابی انداز میں اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر بڑی سرعت سے لونگ روم سے نکل گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ولید کے لبوں کی تراش میں جھلکنے والی مسکراہٹ بڑی بے رحم سی تھی۔

X...X...X

گر مجھے اس کا یقین ہو مرے ہمدم! مرے دوست!
گر مجھے اس کا یقین ہو کہ
ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اداسی' ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی' مرے پیار سے مٹ جائے گی
گر میرا حرف تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ

تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے

گر مجھے اس کا یقین ہو مرے ہمدم!

مرے دوست!

روز و شب، شام و سحر

میں تجھے بہلاتا رہوں

میں تجھے گیت سناتا رہوں، ہلکے شیریں

آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گت

آمد صبح کے، مہتاب کے، تاروں کے گیت

یونہی گاتا رہوں، گاتا رہوں تیری خاطر

گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں تیری خاطر

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ آج پھر اسی راہ گزر پر آ گیا تھا، وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، اسکے قدم خود بخود اس اجنبی جگہ، اس مانوس لڑکی کی طرف کیوں اٹھنے لگے تھے، وہ رات رات بھر اپنے دل کو ٹٹولتا۔

کیا ہے یہ

جذبہ ہمدردی

جذبہ ایثار

تلافی یا ازالہ کی لاشعوری کوشش

مگر نہیں۔ ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ بس ایک بے نام سا نا آشنا سا احساس تھا جو کسی دھند میں لپٹا دکھائی دیتا تھا جو عظمیٰ کو دیکھ کر رگوں میں لہو بن کر دوڑنے لگتا تھا۔

وہ معمول کے مطابق بس سے اترتی اور سر جھکا کر اپنا راستہ ناپنے لگتی۔ مگر ہر قدم میں لرزش بہت واضح ہوتی۔

شاید وہ اسے دیکھ کر انجان بن کر گزر جانے پر راستہ بھر خود کو ملامت کرتی جاتی تھی۔

آج اسے گھر کی دہلیز پر کھڑا دیکھ کر وہ بے چارگی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"کیا اندر نہیں آنے دو گی۔" وہ بڑی آس سے پوچھنے لگا۔ وہ بے بسی سے لب کچل کر رہ گئی پھر سر جھکا کر دروازے کے اک طرف ہو کر اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

"آپ ہمارے زخموں کو کیوں ہرا کرنے چلے آتے ہیں سکندر بھائی۔ اماں بڑی مشکل سے سنبھلی ہیں' آپ اسی اذیت سے دوچار کرنا چاہتے ہیں ہمیں۔" وہ جیسے کراہی تھی۔

چھوٹے سے صاف ستھرے صحن میں داخل ہوتے ہوئے وہ بڑی مجروح نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"میں خالہ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ گو کہ میری معافی آپ لوگوں کے کسی بھی دکھ کا ازالہ نہیں بنے گی مگر شاید میرے ہی درد کی روانی میں کچھ کمی آجائے۔"

"مگر اماں تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں' ڈاکٹر کی طرف گئی ہیں۔ خیر... آپ بیٹھئے وہ آتی ہی ہوں گی۔" اس کی آواز پست تھی۔ اسے لامحالہ اخلاق مروت برتنا پڑی۔ پھر ایک موڑھا اٹھا کر اسے دیتے ہوئے بولی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تانیہ اور نادیہ آپی کیسی ہیں۔"

"ان دونوں کی شادی ہو گئی ہے۔" اس نے موڑھا اس کے ہاتھ سے لے لیا مگر اس پر بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہی رہا۔

عظمٰی نے قدرے مسرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے' کب ہوئی مجھے تو خبر..." پھر یکدم چپ ہو کر ایک ہلکی سی سانس بھری اور سر ہلاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"بہت مبارک ہو۔"

"عظمٰی! کیا تم نے خالہ جان کو بتایا تھا کہ میں ان سے ملنا چاہتا تھا۔" ایک دو لمحے توقف کے بعد سکندر نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹا کر دیوار پر جماتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! بتایا تھا۔" ایک افسردہ سانس عظمٰی کے سینے سے نکل گئی۔

''اماں آپ کی اب بھی بڑی عزت کرتی ہیں' انہوں نے مجھے ڈانٹا کہ میں نے آپ کو برا بھلا کیوں کہا اور یہ کہ آپ کو اپنے گھر آنے سے کیوں منع کر دیا۔'' وہ دل گرفتگی سے ہنس پڑی۔

اس کی یہ ہنسی ندامت کی اذیت بن کر سکندر کے دل پر ضرب کی طرح لگی۔

''کیا تم نومی کو معاف کر سکتی ہو عظمیٰ!'' وہ چلتا ہوا اس سے ذرا فاصلے پر رک گیا۔

عظمیٰ نے تڑپ کر نظریں اٹھائیں جن میں درد کی پرچھائیں لرز رہی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں دہکنے لگیں۔

''اسے معاف کر دو عظمیٰ! میں تم سے اس کی معافی کی بھیک مانگتا ہوں' صرف ایک بار اسے دل سے معاف کر دو تا کہ اس کی روح قبر میں سکون پا سکے۔'' اس کی آواز میں بے پناہ کرب تھا' وہ دھک سے رہ گئی۔ اسے لگا اس کا دل رکنے سا لگا ہے۔

''نومی...! ۔''اس نے پوچھنا چاہا مگر اس کی آواز کانپ کر بکھر گئی۔

''ہاں نومی اب ہمارے درمیان نہیں رہا ہے مگر مرنے سے پہلے وہ اپنے ضمیر کی خلش سے سو بار مرا تھا' موت سے پہلے زندگی سے منہ موڑ چکا تھا۔''

وہ تحیر آمیز بے یقینی سے سکندر کو دیکھتی رہ گئی۔ یکلخت اس کا بدن کانپا اس نے جلدی سے دیوار کا سہارا لیا اور اس کے سہارے فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔

''نومی مر گیا۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر یکدم رو پڑی۔

سکندر شدت کرب سے لب دانتوں میں دبائے اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کتنی دیر اس کی سسکیاں چھوٹے سے صحن میں گونجتی رہیں۔

وہ خود بھی نہ جان پائی کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔

وہ جو اس کی روح کا قاتل تھا۔

اس کے ہاتھوں دل لٹا تھا' دنیا لٹی تھی۔

گھر کی جنت لٹ گئی تھی۔

جس نے اسے معاشرے میں سر اٹھا کر جینے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔اس کیلئے آنسو بہانا چہ معنی۔

(شاید دکھا ہوا دل ہر کسی کے دکھ پر یونہی رو اٹھتا ہوگا۔)

بہت سا رونے کے بعد اس نے سر اٹھا کر سکندر کو دیکھا۔

''میں نے تو اسے کبھی بددعا نہیں دی تھی سکندر بھائی! پھر وہ کیسے مر گیا۔'' اس کی آواز میں دکھ' حیرت اور بے بسی چیخ رہی تھی' سکندر نے خود کو موڑھے پر گرالیا اور اس کی بے آرام پشت سے لگ کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

کتنے لمحے بے آواز سرکنے لگے۔ایک مضمحل خاموشی صحن پر طاری رہی۔ایسا لگ رہا تھا ساری فضا اس کی غلافی آنکھوں سے نکلے آنسوئوں سے بھیگ بھیگ رہی ہو۔

بہت دیر بعد اس مضمحل خاموشی میں سکندر کی آواز ابھری۔

''عظمیٰ! کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟'' اس نے دھیمی آواز میں گویا پٹاخہ چھوڑا تھا۔

''میں یہ بات خالہ کے بجائے تم سے اس لئے کر رہا ہوں کہ میں جانتا ہوں حالات کی سختی نے تمہیں عمر سے پہلے بڑا کر دیا ہے۔'' اس نے ذرا سا چہرہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا پھر دوبارہ نگاہیں دیوار پر جما دیں۔

عظمیٰ کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں بے یقینی اور تحیر رقم تھا' پھر آہستہ آہستہ ان میں سرخیاں سی اترنے لگیں جیسے دل لہو ہو کر آنکھوں میں سمٹ آیا ہو۔

''سکندر بھائی!۔'' اس نے چلانا چاہا مگر آواز اندر ہی دم توڑ گئی۔اس کا سارا وجود ڈول کر رہ گیا تھا۔وہ اگر بیٹھی نہ ہوتی تو یقیناً حیرت اور دکھ سے لڑکھڑا جاتی۔

سکندر نے کچھ کہنے کے بجائے اس کے جواب کا انتظار کیا' وہ تو خود اپنی اس کیفیت پر حیران تھا کہ اس نے یکا یک ایسا فیصلہ کیسے کر لیا۔شاید اندر کے گھپ اندھیرے' تاریکیوں کو کاٹنے کیلئے کسی روشنی کی کرن کی طلب ہونے لگی تھی اور عظمیٰ سی اسے کرن محسوس ہوئی تھی۔

''تو آپ تلافی کرنا چاہتے ہیں' مرہم رکھنا چاہتے ہیں اپنے بھائی کے لگائے ہوئے زخموں پر۔''

وہ بے حد ملال سے سکندر کو دیکھنے لگی۔اس کی بھیگی پلکوں سے دو قطرے لڑھک کر اس کے رخسار پر ٹوٹ گئے۔

”میں آپ کی عظمت کو سلام کرتی ہوں سکندر صاحب! اس ہمدردی اور جذبہ ایثار کی تہ دل سے مشکور ہوں‘ قدر کرتی ہوں آپ کی بڑائی کی مگر خدا کیلئے اس طرح چر کے لگا کر مجھے میری ہی نظروں میں ذلیل تو نہ کریں۔۔“

”عظمیٰ! نہ یہ تلافی ہے نہ ہمدردی۔“ سکندر تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔

وہ سر جھکا کر اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔سکندر کی سمجھ میں فوری طور پر نہیں آیا کہ وہ اپنی بات کی وضاحت کس طرح کرے۔اس کے آنسوؤں کے سامنے اسے اپنا وجود ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔

”آئی ایم سوری عظمیٰ! اگر میری بات نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے مگر بخدا میرا مقصد یہ نہیں تھا جو تم سمجھ رہی ہو۔میں تو خود بہت گناہگار‘ بے حقیر سا آدمی ہوں۔“

ایک مضمحل سی سانس کھینچتے ہوئے اس نے اس کے جھکے ہوئے سر پر نگاہیں جما دیں۔

”تمہارے زخموں پر وہ شخص کیا مرہم رکھ سکتا ہے جو خود اندر سے ٹوٹا ہوا‘ بکھرا ہوا ہو۔جو مسلسل اندھیرے کا سفر کر رہا ہو‘ دور دور تک جس کیلئے روشنی کا آسرا تک نہ ہو‘ وہ کب کسی کیلئے تلافی اور ازالہ کا سبب بن سکتا ہے‘ روشنی کا کام کر سکتا ہے‘ کسی کے اندھیرے کو کاٹ سکتا ہے۔‘

”آپ کیلئے اچھی اور اجلی لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہے پھر میں ہی کیوں؟۔“ وہ دل گرفتگی سے بولی۔

”ہاں! کسی کا بھی ہاتھ تھام لیا جائے تو جذبات کی تسکین تو کی جاسکتی ہے زندگی گزاری جاسکتی ہے مگر جو دل میں طلب بن کر ابھریں‘ ان کے پالینے کی آسودگی اور ہی ہوتی ہے۔“

عظمیٰ کی پلکیں کانپ کر رخساروں پر جھک گئیں۔اس کا سارا اعتماد بکھرنے لگا۔

”عظمیٰ! یہ تلافی یا مداوا نہیں ہے‘ یہ میرے دل میں ابھرنے والی ایک ایسی خواہش ہے جس کی خود مجھے بھی کل تک خبر نہ تھی‘ میں جھوٹ نہیں بولوں گا کہ میں تمہاری طلب میں تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔نہیں بلکہ مجھے میرا اضطراب‘ میرے اندر کی وحشتیں سکون کی تلاش میں سرگرداں رکھے ہوئے تھیں۔تمہیں دیکھا تو لگا دھوپ کی تمازت

ہارنے سی لگی ہے۔ایک ٹھنڈی نرم چھاؤں کا احساس خود بخود امڈنے لگا اور چھاؤں کی یہی خواہش طلب بن گئی۔'' وہ ایک لمحے توقف کرتے ہوئے بولا۔

''بے شک ہر زخم مرہم سے ہی ٹھیک ہوتا ہے' وقت تو صرف ٹیسوں کو کم کرتا ہے' اس کی کسک نہیں بھرتا اور کسک کسی نہ کسی تلافی سے ہی مٹتی ہے' ہر دکھ کی اذیت کا جال مداوے اور مسیحائی سے ہی کٹتا ہے' کیا میں کوئی امید رکھوں۔''

اس کا لہجہ بہت آس لئے ہوئے تھا۔جیسے کوئی ڈوبنے والا ساحل پر کھڑے شخص سے التجا کر رہا ہو جبکہ عظمیٰ کا خیال تھا وہ تو خود سمندر کی تند موجوں سے نبرد آزما ہے' اس کا ہاتھ کس طرح پکڑ سکتی تھی۔

وہ ساحل کا متمنی تھا اور خود ساحل کی تو اسے بھی تمنا تھی مگر ہر طرف لہریں امڈ رہی تھیں' بپھری ہوئی موجوں کی پیہم یلغار تھی' اسے کچھ سوجھائی نہ دے رہا تھا' اسے بس اپنا دماغ مفلوج ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

''جو خود فنا کے سفر میں ہو وہ کسی کیلئے بقا کی نوید کیا بن سکتا ہے۔آپ نے بھی ڈوبنے والے سے سہارا مانگا ہے سکندر بھائی!۔'' وہ مجروح انداز میں ہنس پڑی اور افسردگی سے دیوار سے خود کو لگا لیا۔

ایسا لگ رہا تھا نڈھال روح کا سارا بوجھ بدن پر اتر آیا ہو۔

''ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر ساحل پر پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔'' سکندر آہستگی سے بولا۔ اس نے تڑپ کر اسے دیکھا پھر تکلیف سے رو دی۔

''خدا کیلئے آپ اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دیں' چلے جائیں یہاں سے۔''

''عظمیٰ!۔''

''پلیز سکندر بھائی!'' اس کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔

''اوکے! میں اس وقت جا رہا ہوں مگر میں پھر آئوں گا اور بار بار آئوں گا اس لئے کہ میرا ہر راستہ یہیں سے ہو کر گزرتا ہے۔'' سکندر نے ایک گہری سانس کھینچ کر اس پر ایک نظر ڈالی اور پلٹ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

X...X...X

ولید کو سکندر کے گھر آکر پھر مایوسی ہوئی تھی۔ وہ کئی دنوں سے مسلسل آرہا تھا مگر سکندر اسے نہ گھر پر ملتا نہ دفتر میں۔ فاروقی صاحب بھی اسے فون کر کے روز سکندر کا پوچھتے کہ اسے میرا پیغام دو کہ فاروقی صاحب نے اس کا استعفیٰ ایکسیپٹ نہیں کیا وہ فوراً دفتر آنا شروع کر دے۔

”جانے کہاں کہاں مارا پھرتا رہتا ہے‘ رات جانے کس پہر گھر آتا ہے اور ساری رات سگریٹیں پھونک کر گزار دیتا ہے‘ نہ دن کی خبر ہے نہ رات کی اسے۔ میں تو بالکل تہی داماں ہو کر رہ گئی ہوں ولید!

میرے بچے کو روگ کھا گئے‘ اسے غم نچوڑ گئے ہیں‘ میں جانتی ہوں اسے میرا خیال نہ ہوتا تو وہ شاید گھر بھی نہ آتا‘ شاید زندہ ہی نہیں رہتا۔۔“

اماں کے آنسو ولید کے درد میں اضافہ کر رہے تھے مگر اس کے پاس سوائے تسلی دلاسوں کے کیا تھا‘ سکندر ایک بار اسے مل جاتا تو وہ اچھی طرح اس کی خبر لیتا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

آفس آکر بھی اس کے ذہن پر ایک بوجھ کا دباؤ رہا‘ کسی کام میں دل نہیں لگا‘ وہ اٹھ کر گھر چلا آیا۔

روش سے تیزی سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹھک گیا‘ وہ بانس سے بنے خوبصورت تختے پر ملول سی جانے کن سوچوں میں گھری بیٹھی تھی۔

وہ دور ہو تو بجا ترک دوستی کا خیال

وہ سامنے ہو تو کب اختیار اپنا ہے

فراز راحت جاں بھی وہی ہے کیا کیجئے

وہ جس کے ہاتھ سے سینہ فگار اپنا ہے

وہ بے اختیار ایک گہری سانس کھینچ کر رہ گیا اور چلتا ہوا اس طرف چلا آیا۔

”اب اس طرح ماتمی شکل بنا کر بیٹھے رہنے کا کیا فائدہ۔ اتنی ہی اس شادی پر غمزدہ ہو تو انکار کر دو‘ میرے کندھے پر بندوق رکھ کر اپنا دفاع کیوں کرنا چاہتی ہو۔“

اس کے غیر متوقع سامنے آجانے پر وہ سٹپٹا گئی اور سر اٹھایا' ایک پل کیلئے اس کے سرخ چہرے اور متورم آنکھوں نے ولید کے دل پر ضرب سی لگائی' عجیب پگھلا دینے والی صورتحال تھی مگر دوسرے پل وہ اپنی بشری کمزوری کی گرفت سے نکل آیا' ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی جیسے اس کی اس کیفیت سے محظوظ ہوا ہو۔

''یوں بھی بندھن دلوں سے مشروط ہوتے ہیں' یہ کوئی رسم کی ڈور نہیں ہے کہ اسے تھام کر نبھا دی جائے' یہ تو عمر بھر کا سودا ہے' اس میں باہمی ربط' دل کی آمادگی ضروری ہے' رفاقت میں آدمی ہمہ جاں شامل نہ ہو تو وہ سراب ہے' سراسر دھوکہ۔''

''آپ زیادتی کر رہے ہیں میرے ساتھ؟'' وہ چیخ کر کھڑی ہو گئی' اس کی پلکوں پر اٹکے آنسو لڑھک کر رخساروں پر بکھرنے لگے مگر مارے خجالت کے وہ دوپٹہ کا کونا اٹھا کر انہیں پونچھ نہ سکی۔

''میں زیادتی کر رہا ہوں تمہارے ساتھ۔'' اس نے خفگی بھری نظروں سے اسے گھورا اور قدرے بے رحمی سے ہنس دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''یہ زیادتی نہیں ہے یہ تو محض رد عمل ہے' رد عمل۔'' اس کے بھیگے تمتماتے چہرے پر اپنی نگاہیں جماتے ہوئے ایک پل اس کی بے بسی کا تماشہ بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔

''اس کیلئے تو تمہیں ذہنی طور پر پہلے ہی تیار رہنا چاہیے تھا' جن الزامات کی بھرمار تم مجھ پر کرتی رہی ہو' میرے جذبوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہو' میرے اعتبار کو ایک بے اعتبار شخص کے تناظر میں تولتی رہی ہو' اس پر مجھے تو تمہارا ممنون و مشکور ہونا چاہیے' تمہاری راہ میں آنکھیں بچھانی چاہئیں' دل فرش راہ کئے بیٹھا رہنا چاہیے۔''

''میں اپنے کئے پر نادم ہوں۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے شکستہ آواز میں بولی۔

''اونہہ نادم! کیا تمہاری اس ندامت سے تلافی ہو جائے گی۔''

''اتنے برسوں تک تم مجھے ایک چیٹر شخص کے روپ میں ٹٹولتی رہیں۔ مجھ سے ایک فاصلے پر محض اس لئے رہیں کہ تمہیں میرے کردار پر شک تھا اور میں کتنا نادان کہ اسے میں تمہاری شرم و حیا سمجھتا رہا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم میری بے لوث محبت کی تذلیل کرتی رہی ہو۔''

""پلیز... پلیز ولید! آپ سمجھنے کی کوشش کریں، میں اپنے رویوں پر پشیمان ہوں، میں نے...."" اس کی آواز دکھ و کرب سے بھرا گئی، اس کی یہ بیگانگی، یہ سفاکی اس سے برداشت نہ ہو پا رہی تھی۔

اس نے کہنا چاہا۔

"مجھے یوں بے موت مت مارو، میں تو تمہارے اور اپنے بیچ اپنا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتی ہوں۔ یہ میری محبت کی انتہا تھی۔" مگر اس کے غصے اور سفاک رویئے نے اس کے سارے حوصلے بکھیر کر رکھ دیئے تھے۔

""تمہاری پشیمانی، ندامت میرے زخموں کا مرہم نہیں بن سکتی۔"" وہ اسکے نزدیک آیا۔

""افسوس کہ تمہیں اتنا طویل سفر طے کرنے کے بعد احساس ہوا کہ شاید یہ چھائوں تمہیں چھائوں نہیں دے پائے گی۔ چلو اب برت کر بھی دیکھ لینا کہ چھائوں کس طرح دھوپ بنتی ہے اور جھلساتی ہے۔"" وہ ہلکے سے ہنسا۔ روح تک کو گھائل کرنے والی ہنسی تھی۔

اس نے تڑپ کر سر اٹھایا مگر وہ پلٹ کر جا رہا تھا۔ اس کے جملوں کی چبھن اور ہنسی کی یہ کاٹ وہ اپنے دل پر محسوس کرنے لگی۔ خوف سے اسے اپنی رگوں میں دوڑتا لہو جمتا محسوس ہونے لگا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

""تو کیا وہ یہ شادی محض انتقاماً کر رہا تھا اس سے۔"" یہ خیال ہی اس کیلئے موت سے کم نہ تھا۔

وہ بھاگ کی اس کی راہ میں آ گئی۔ وحشت اس کی رگ رگ کو نچوڑنے لگی۔

""اگر آپ مجھ سے انتقاماً شادی کر رہے ہیں تو میں ایسا ہر گز نہیں ہونے دوں گی۔""

""کیا نہیں ہونے دو گی۔"" اس کے سامنے آ جانے پر اسے لامحالہ رکنا پڑا۔

""میرے اختیار میں ابھی بھی بہت کچھ ہے، سمجھے آپ؟"" اس کے پہلو سے گویا ایک تلاطم کی لہر اٹھی تھی مگر پھر اندر ہی کہیں دم توڑ گئی۔

اس کی ہنسی بڑی دل جلانے والی تھی۔

""ہاں تمہیں ہی سارے اختیار حاصل ہیں، ہم مجبوروں پر تو ناحق تہمت ہے مختاری کی۔""

ایک ٹھنڈی سانس اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

""آپ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس شادی کو ہونے سے نہیں روک سکتی اور آپ کے انتقام کا نوالہ بن جائوں گی تو یہ آپ کی بھول ہے، میں اس شادی سے پہلے مر جانا پسند کروں گی، میں خودکشی کر لوں گی۔"" وہ جلال میں آ گئی مگر وہاں اتھاہ سکون تھا۔

"آئیڈیا برا نہیں ہے یوں میرے ہاتھ بھی تمہارے خون سے رنگنے سے بچ جائیں گے مگر ہاں یہ نیک کام اگر تم عین بارات والے دن کرو گی تو مشہور ہونے کے زیادہ چانسز ہیں۔" وہ دھیمی مگر زہر میں بجھی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

اور شہرینہ دکھ' احساس توہین اور رنج کے مشترکہ احساس کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس قدر سفاکی کی اسے امید نہ تھی۔

تو کیا وہ اس سے اتنی شدید نفرت کرتا تھا کہ اسے قتل کر دینے کے درپے تھا' اس کے وجود کو مٹا دینا چاہتا تھا' دکھ کی لہر اس کے دل کو کاٹتی گزر گئی۔

"آپ' آپ اتنے ظالم' سفاک ہوں گے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں' میں ہر گز آپ سے شادی نہیں کروں گی۔"

مارے صدمے کے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں' اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے سامنے کھڑا یہ ہی ولید حسن ہے جس کی آنکھوں میں اس نے اپنے لئے وارفتگی کی چمک دیکھی تھی۔ جو خواب بن کر عمر بھر اس کی آنکھوں میں بسا رہا تھا' جسے وہ اپنی عمر بھر کی ریاضت کا

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

صلہ سمجھتی آرہی تھی۔ وہ یکدم پلٹی اور بھاگتی ہوئی لان کے اس حصے سے چلی گئی۔ وہ ہونٹ بھینچے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

ایک لحظہ دل نے چاہا اسے آگے بڑھ کر روک لے' تھام لے مگر اس نے دل کے نرم گوشے سے امڈنے والی اس خواہش کو دبالیا اور کین کی رکھی کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

'اتنا ستایا ہے تم نے کہ اب یہ رویہ میرا حق بنتا ہے' اتنا تنگ کرنا رلانا تو جائز ہے میرے لئے۔'

وہ گہرا کش لے کر دھوئیں کے غول کو نیم وا آنکھوں سے تکنے لگا۔

"یہاں وابستگی' واں برہمی' کیا جانئے کیوں ہے۔"

ہمایوں کی آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونکا۔

"بائی داوے! یہ اس خبطی لڑکی کو کیا ہو گیا ہے ذرا سا چھیڑنے پر کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔" ہمایوں کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کا اشارہ شہرینہ کی طرف تھا۔

"تو تمہیں کسی بھی شریف لڑکی کو چھیڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" اس نے سگریٹ کی ٹوپ پر جمی راکھ کو جھاڑ کر ہمایوں کو گھورا۔ "لگتا ہے اسلام آباد شہر نے تمہاری عادتیں بہت بگاڑ دی ہیں۔"

"جیسے...آپ کے شہر میں تو زاہد عابد ہی بستے ہیں۔" ہمایوں نے برا سا منہ بنایا۔ تیر سیدھا کلیجے میں کھب گیا تھا۔ ولید بے اختیار ہنس پڑا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ زاہد عابد بھی بستے ہیں۔"

"ہاں آپ کو دیکھ کر تو کچھ کچھ یقین آنے لگا ہے۔" اس نے طنز سے ابرو اچکائے۔

"میرا خیال ہے سڑنے جلنے کے بجائے تم اپنی صحت پر توجہ دو۔" ولید نے اسے جیسے پچکارا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

"تو تم یہاں استراحت فرما رہے ہو۔ میں تمہیں آفس میں 10 فون کر چکا ہوں۔ تمہارا کہیں اتا پتہ نہیں۔"

وسیم بھائی گاڑی سے اتر کر ولید کو دیکھ کر سیدھے لان میں چلے آئے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تو تمہیں کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ تم 10 فون کرو' ایک سے یقین نہیں آ گیا تھا کیا۔"

"بکومت' موبائل کہاں ہے تمہارا؟ اس وقت میرے دماغ میں بری طرح گرمی چڑھی ہوئی ہے۔" وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کرسی پر گر سا گیا۔

"ہوں وجہ سمجھ آ رہی ہے۔" ولید گاڑی سے اترتی لدی پھندی مونا بھابی کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرایا تھا۔ وسیم نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں مونا بھابی کو دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے گاڑی کی چابی درمیانی میز پر پھینکی۔

"دانا سچ کہتے ہیں کہ ایک ہزار قابل انسانوں کے مر جانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ایک بے وقوف کے صاحب اختیار ہو جانے سے ہوتا ہے۔"

"دانا تو یہ بھی کہتے ہیں کہ خوش قسمتی سے آپ کو اچھی بیوی مل گئی تو زندگی پر لطف ہو جائے گی' اگر بیوی اچھی نہ ملی تو آپ فلاسفر بن جائیں گے۔"

ولید کا قہقہہ برجستہ تھا' ساتھ میں ہمایوں کی ہنسی بھی۔

"ویسے یہ اختیار والی بات کچھ سمجھ نہیں آتی۔" اس نے وسیم کو دیکھا' جواباً وہ اسے گھورنے لگا۔

"خوار ہو رہا ہوں صبح سے' تم نے اپنی بھابی کو بااختیار بنا کر میرے حق میں بہت برا کیا ہے بلکہ میرے ساتھ سراسر دشمنی کی ہے۔"

"اوہ!۔" وہ بات کی تہ تک پہنچ کر بے ساختہ مسکراہٹ نہ روک سکا۔

"دراصل مجھے لیڈیز کی شاپنگ کا تجربہ جو نہیں ہے۔" اس نے مسکین سی صورت بنا کر جلدی سے وضاحت کی۔

"جیسے مجھے تو بڑا ہی تجربہ ہے' عورتوں کو مارکیٹ میں لے لے کر خوار ہونے کا۔" وسیم سلگ کر رہ گیا۔

"خیر عورتوں کو لے لے کر گھومنے کا تجربہ تو برا نہیں ہو سکتا۔ہاں بیوی کو لے کر خوار ہونے کا تلخ تجربہ ضرور ہے۔" اس کی ہنسی نے وسیم کو راکھ کر ڈالا۔

"میرا خیال ہے تم ٹھنڈا پانی پیو۔ جائو ہومی اپنے اکلوتے بہنوئی کو سوفٹ ڈرنک دو۔اے سی میں بٹھائو' آخر تمہاری بہن کو بھگت کر آ رہا ہو۔" اس نے ہمایوں کی طرف دیکھ کر ہلکے سے آنکھ دبائی۔ "تمہیں تو میں بعد میں دیکھ لوں گا۔" وسیم اسے آنکھیں دکھاتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

☆...☆...☆

مہندی سے ایک روز پہلے شہرینہ کی خالہ واجدہ آنٹی جدہ سے اپنی دونوں بیٹیوں اور بیٹے سلطان اور بہو کے ساتھ آ گئی تھیں اور یوں گھر میں چھائی گہما گہمی میں یکلخت اضافہ ہو گیا تھا۔ ہمایوں کی شرارتیں عروج پر تھیں تو ایک طرف وسیم کے چٹکلے اور سلطان کی گل افشانیوں نے ماحول میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ رات گئے تک ولید اور وسیم کے دوست ولید کے کمرے میں رونق جمائے رکھتے' ہمایوں نے بڑی خوبصورت دھمال ڈالی ساتھ میں ولید کو بھی گھسیٹنا چاہا مگر وہ دامن بچا گیا۔

"جب تک دولہا خود دھمال نہ ڈالے وہ آدھا دولہا ہوتا ہے' اس پر رنگ نہیں چڑھتا۔" اس نے ولید کو گویا ڈرانا چاہا۔

"تب ہی کہوں کہ میں دولہا بنا تھا تو وہ رنگ مجھ پر کیوں نہیں چڑھا ہے۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" وسیم بھائی نے ہمایوں کو آنکھیں دکھائیں۔

"اس میں اتنا غمگیں ہونے کی ضرورت نہیں ہے' یہ کمی تو اب بھی دھمال ڈال کر پوری کر سکتے ہو۔" ولید نے اس کی پیٹھ تھپک کر اسے تسلی دی۔

"بالکل! دولہا تو آپ ہیں ہی مونا آپی کے۔ ویسے دھمال ڈالنے میں نئے اور پرانے کی قید نہیں ہے۔" ہمایوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ بھی جوش میں آ گئے اور اچھا خاصا بھنگڑا ڈالا۔

"ادھر صغریٰ بی بی نے کھڑکی سے لگ کر یہ منظر دیکھا اور جا کر خواتین میں خبر نشر کر دی کہ وسیم صاحب ہمایوں کے ساتھ ناچ رہے ہیں۔"

"تو کیا ہوا پانچ سال سے مونا نچاتی رہی ہے' اب تھوڑا سا سالے میاں نے نچا لیا تو کیا ہو گیا۔" واجدہ خالہ کی بیٹی تہمینہ شرارت سے بولی۔

"ارے ہمیں نچانا آتا اور شوہروں کو تو رونا کس بات کا تھا۔"

مونا بھابی نے اپنے دوپٹے کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے گھنگرو ٹانکتے ہوئے ٹھنڈی سانس کھینچی جس پر سب کا قہقہہ پڑا تھا۔

"لڑکیو مہندی والی آئی بیٹھی ہے' تم لوگ اپنے چھوٹے موٹے کام بعد میں نمٹاتی رہنا پہلے اس بیچاری کو تو فارغ کر دو۔" ممانی جان اندر آ کر ان سب سے بولیں۔

"پھوپھی جان مہندی لگا کر پھر گانے نہیں گا سکتے نا۔" صبا اپنے ناخنوں پر ریمور سے بھیگا کاٹن رگڑتے ہوئے بولی۔

"کیوں تم کیا ہاتھ پیروں سے گانا گاتی ہو لڑکی!" ممانی جان کو ہنسی آ گئی' وہ سب بھی ہنسنے لگیں۔

"میرا مطلب ہے ڈھول اور تالیاں نہیں بجا سکتے نا۔" وہ جھینپ کر وضاحت دینے لگی۔

"چلو مہندی سوکھ جائے تو بجا لینا' اب وہ آئی بیٹھی ہے تو پہلے اسے فارغ کر ڈالو اور ہاں مونا تمہیں شائستہ بھابی بلا رہی ہیں' ولید کو شاید شہرینہ کے شرارے کا کلر پسند نہیں آیا ہے۔"

"ہیں! کیا کیا۔" مونا بھابی کی ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔ ان کے متحرک ہاتھ ساکت ہو گئے۔

"کیوں؟ کیا پسند نہیں آیا۔" انہوں نے دوپٹہ ایک طرف رکھا۔

"کہہ رہا تھا کلر بہت گہرا ہے حالانکہ مجھے تو ایسا کوئی زیادہ تیز نہیں لگا' خیر ہمارا کیا ہے اس کی پسند کی ہی اولیت دینی ہے۔"

"ایویں اس کی پسند کو اولیت دینی ہے۔" بھابی کو اچھا خاصا صدمہ پہنچا۔

وہ اس شرارے کیلئے جتنی خوار ہوئی تھیں اور ساتھ میں وسیم کو بھی کیا تھا وہ پورا دن ان کے تصور میں زندہ ہو گیا۔

مما کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کے ہاتھ میں شرارے کا بھاری بکس تھا' بھابی نے صوفے سے اتر کر ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"دیکھیں تو واجدہ خالہ کتنا پیارا کلر ہے اور کام کیا ہوا ہے اس میں بھلا کوئی ناپسند آنے والی چیز ہے۔" وہ مما کے ہمراہ داخل ہوتیں واجدہ خالہ کو شرارہ کھول کر دکھانے لگیں' ساری

لڑکیاں بھی ان کے ارد گرد جمع ہو کر شرارہ دیکھنے لگیں۔ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں' اس قدر خوبصورت شرارہ تھا۔

"ماشاءاللہ! خیر سے اللہ پہننا نصیب کرے' مگر پتہ تو چلے کہ اس میں اسے کیا ناپسند ہے۔" واجدہ خالہ کو بھی حیرت ہوئی۔

"ایویں ہی نخرے ہیں اس کے۔" وہ شرارہ دوبارہ تہ کرنے لگیں۔

"لیڈیز! اچھی سی چائے مل جائے گی۔" ولید اتفاق سے اس وقت لونگ روم میں داخل ہوا جب شرارے پر تبصرے جاری تھے اور بھابی کا غصہ نقطہ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔

سرمئی شلوار سوٹ میں وہ بے حد نکھرا نکھرا اور تازہ دم دکھائی دے رہا تھا البتہ آنکھوں کے کناروں پر سجی سرخی رات بھر جاگنے کی غمازی کر رہی تھی۔

"نہ صرف چائے بلکہ کچھ پیٹ پوجا کیلئے بھی سامان ہونا چاہیے۔"

ہمایوں اس کے پیچھے داخل ہوا اور اندر آ کر صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

"ناچ ناچ کر تھک گئے ہو کیا۔" صبا نے اسے دیکھتے ہی چھیڑا۔

"نہیں بلکہ نچا نچا کر' بائی داوے یہ اطلاع آپ لوگوں تک کیسے پہنچی۔" اس نے چونک کر صبا کو گھورا۔

"یہاں تک کی زمین جو ہل رہی تھی' ہم پہلے سمجھے زلزلہ آگیا ہے خدانخواستہ پھر صغریٰ نے بتایا' زلزلہ نہیں ہے یہ۔ یہ تو تم لوگ ناچ رہے ہو۔"

"یقیناً زلزلہ ہی محسوس ہوا ہوگا' وسیم بھائی کو جو نچایا تھا۔" ہمایوں بے اختیار ہنسا اور ولید کو دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے مونا آپی سے بولا۔

"آپی! آپ کے شوہر کو تو خاصا تجربہ معلوم ہوتا ہے ناچنے کا۔"

"پورے پانچ سال کا۔" ولید جلدی سے بولا۔

ادھر مونا کا بھی موڈ پہلے ہی آف تھا' انہوں نے شرارے کا ڈبہ بند کر کے اسے اٹھا کر ولید کے قریبی سنگل صوفے پر پٹخ دیا۔

"اب جا کر خود اپنی پسند کا لے آنا' ناحق میں نے اپنی ٹانگوں کا پٹرول ختم کیا' تمہارے لئے۔"

ولید نے چونک کر شرارے کے اس بکس کو دیکھا پھر ان کی طرف دیکھا۔

"تم نے کہا تھا شیری کی پسند کا لیجئے گا اور یہ کلر شیری کا فیورٹ ہے۔" وہ ایسے تیکھے چتون سے گھورنے لگیں۔

"تب ہی تو ناپسند ہے۔" وہ ہلکے سے بڑبڑایا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اتنی خواری کے بعد بھی اتنی فضول چیز پسند آئی' سوچئے ذرا اگر خوار نہ ہوتیں تو کیا اٹھا کر لے آتیں۔" اس نے ان کے غصے میں تیل ہی چھڑکا تھا۔

"اب اسی پر گزارا کر لو ولید! اچھا خاصا تو ہے۔" واجدہ خالہ اپنے طور پر اسے سمجھانے لگیں۔

"یوں بھی پہننا تمہیں تو ہے نہیں۔"

"مگر دیکھنا تو اسی کو ہے نا پھوپھی جان!۔" ہمایوں جلدی سے بولا۔

"تو نہ دیکھے' آنکھیں بند کر لے۔" مونا بھابی بھی سلگ کر بولیں۔ بے اختیار سب ہی کی ہنسی بکھر گئی۔

"ہائیں تو کیا وسیم بھائی نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔" ہمایوں نے کچھ اس طرح بے ساختہ کہا کہ مونا بھابی جھینپ کر رہ گئیں اور ایک ہاتھ اسے جڑ کر بولیں۔

"خدا کا شکر ہے کہ ان کی اتنی مین میخ نکالنے کی عادت نہیں ہے۔"

"اچھا ہی ہے تب ہی گزر رہی ہے آپ کے ساتھ۔" ولید نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"کیوں تنگ کر رہے ہو ولید! ایک تو اس بیچاری نے جہیز ہی نہیں بری بھی تیار کی ہے اور بجائے تم اس کی شکر گزاری اور حوصلہ افزائی کے اسے تنگ کر رہے ہو۔" واجدہ خالہ کا دل پسیج گیا۔

مونا بھابی وہاں سے واک آئوٹ کر گئیں۔

X...X...X

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

شہرینہ نے مہندی والی لڑکی کو اپنے کمرے سے بری طرح جھاڑ کر نکال دیا تھا جس پر صغریٰ مونا بھابی کے پاس دوڑی آئی۔

"شیری بی بی نے مہندی لگانے سے انکار کر دیا ہے بھابی! انہوں نے جی بڑا شور مچار کھا ہے' کہتی ہیں اگر اب مہندی والی کو اس کے کمرے میں بھیجا گیا تو وہ اس کا سر پھاڑ دے گی۔"

صغریٰ کی زبانی یہ سن کر مونا بھابی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا' وہ الٹے پیروں شہرینہ کے کمرے میں دوڑ گئیں۔

"کوئی میرے دل سے بھی تو پوچھے' میری بھی کوئی حیثیت مرضی ہے یا نہیں۔ میں کوئی گائے بکری ہوں کہ جہاں چاہا باندھ دیا' کوئی جس طرح چاہے ذبح کر دے۔" وہ کمرے کی ہر شے تہس نہس کر کے آخر میں قالین پر' گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گئی۔

"شیری! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" مونا بھابی کو حیرت کا شدید دھچکا لگا' وہ اس کے نزدیک آ کر بیٹھ گئیں اور اس کا سر اونچا کرتے ہوئے بولیں۔

"میری طرف دیکھو شیری! یہ سب' یہ سب تو تمہاری اپنی بھی خواہش تھی' خواب تھا تمہارا اور جب تعبیر پا رہی ہو تو کس بات کا غم منا رہی ہو۔"

"تعبیر... اس بھیانک تعبیر کا تو تصور بھی نہ تھا میرے پاس۔" وہ افسردگی سے ہنس پڑی۔

"کیا ولید سے جھگڑا ہو گیا ہے؟ اس نے کچھ کہہ دیا ہے' پلیز شیری میری جان! کچھ تو بتائو۔" بھابی نے دھڑکتے دل کے ساتھ نرمی سے اس کا چہرہ تھاما اور اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں دل کا لہو سرخیاں بکھیر رہا تھا۔ ان کا ٹھنڈا غمگسار لہجہ اس کے دل کو گداز کر گیا۔ اسے یکدم کسی غمگسار کی طلب ہونے لگی جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دے۔

اسے آنے والے لمحات خوفناک دھمک کی طرح سنائی دے رہے تھے۔ اس نے بے اختیار بھابی کے کندھے پر سر ڈال دیا اور روتے ہوئے سب کچھ بتانے لگی' کچھ بھی نہ چھپایا' اپنی حماقت میں لکھا ہوا خط اور آمنہ علی کو فون کرنے والی حرکت بھی بتا دی۔

بھابی کیلئے یہ سب کسی شاک سے کم نہ تھا' وہ ہکا بکا رہ گئیں۔

"میں نے اس طرح تو نہیں چاہا تھا' میرا مقصد یہ سب نہیں تھا' انہوں نے اسے غلط رنگ میں لیا ہے' میں بھلا ان کی محبت پر شک کیسے کر سکتی ہوں۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"شک نہیں کرتی رہیں تو پھر یہ وسوسے' خوف' یہ اندیشے سب کیا تھے؟ بداعتمادی ہی تو تھی جو تمہیں آج تک خوش ہونے کے باوجود خوش ہونے سے روکتی رہی' بلکہ ابھی تک...۔" انہوں نے ملامت بھری نظروں سے اس کو دیکھا۔

"بدگمانی دراصل ہمارے اپنے ہی باطن کی کمزوری ہوتی ہے شیری! بداعتمادی کی فضا میں سانس لینے والا کبھی بھی زندگی کی حقیقی مسرتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا' کیا تم درد کرتے پھوڑے کے ساتھ پر سکون رہ سکتی ہو؟ نہیں نا۔ بس یہ اعتمادی' بدگمانی بھی ایسے پھوڑے ہیں جو روح میں پیدا ہو جائیں تو پھر چین سے نہیں بیٹھنے دیتے' اذیت دیتے رہتے ہیں' تکلیف میں مبتلا رکھتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ناسور بن جاتے ہیں۔ محبت کو بہت گاڑھا اور مضبوط ہونا چاہیے کہ محبوب کے عیب اس میں ظاہر نہ ہو سکیں' وہ بھی ڈھک جائیں۔"

بھابی کی باتیں اسے ندامت کی ریت میں دھنسانے لگیں۔ وہ اور زور و شور سے رونے لگی۔

"مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جائوں گی' میرے اعصاب ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں بکھر جائیں گے۔"

"پاگل تو تم ہو ہی چکی ہو اور باقی سب کو بھی کرنے کا پورا ارادہ کر لیا ہے تم نے۔"

"بھابی! یقین کریں میں نے ایسا کچھ نہیں چاہا تھا' پتہ نہیں مجھ سے ہر بار غلطی کیوں ہو جاتی ہے۔" وہ دل گرفتگی سے سر اٹھا کر ٹشو سے ناک پونچھنے لگی۔

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے۔" بھابی کے سینے سے ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی۔

"چلو میں ولید سے بات کرتی ہوں' مجھے تو کچھ پتہ نہیں' ادھر وہ ہیرو بنا گھوم رہا ہے اس قدر گھنا لڑکا ہے مجال ہے جو ذرا بھی بھنک پڑنے دی ہو۔" بھابی کو اس پر بھی تاؤ آنے لگا۔

"وہ بہت غصے میں ہیں' آپ ان سے کچھ مت کہیے گا بھابی!" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں روکنے لگی۔

"وہ تو میرے قتل عمد پر تیار ہیں۔"

"تمہیں قتل کر کے اسے کیا ملنا ہے' عمر بھر کا روگ؟" بھابی بے ساختہ ہنس دیں۔

"میں ایک مسلسل عذاب سے دوچار ہوں بھابی!" ان کی ہنسی برچھی کی طرح اس کے سینے میں اتر گئی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں' وہ بہت ظالم ہے' وہ مجھے قتل کرنے سے دریغ نہیں کریگا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ظالم ضرور ہو گا' قاتل بہر حال نہیں ہے' تم پہلے یہ آنسو پونچھو اور پانی پیو' میں کچھ کرتی ہوں۔" انہوں نے پانی بھر کر اسے دیا۔

"آپ صرف یہ کیجئے کہ کسی طرح یہ شادی رکوا دیجئے۔" وہ ان کے ہاتھ سے گلاس تھامتے ہوئے لجاجت سے بولی۔ جواباً بھابی نے اسے سخت فہمائشی نظروں سے گھورا تھا۔

"اب اگر تم نے شادی رکوانے کا نام بھی لیا تو یقیناً ولید تمہیں قتل کر ہی دے گا اور میں بھی اسے نہیں رکوں گی اس اقدام سے' اس لئے کہ یہ اس کا اقدام جائز ہو گا۔"

"کیا میرا قتل جائز ہے اس پر؟۔" وہ انہیں شکوہ کناں نظروں سے دیکھنے لگی۔

"شیری' شیری! فار گاڈ سیک' اتنی حماقتوں کے بعد بھی تمہیں عقل نہیں آئی۔"

"میں اپنی غلطی مان تو رہی ہوں۔" وہ کھسیا کر سر جھکا گئی۔ "اپنے کیے کی اس سے معافی مانگنے کی بارہا کوشش کی مگر وہ تو میری شکل دیکھنے تک کو تیار نہیں ہیں' ان سے زیادہ کیا کروں' ان کے قدموں میں گر جاؤں' گر بھی جاؤں اگر انہیں اعتبار آ جائے تو۔" وہ بے حد شکستہ آواز میں بولی اور پانی کا گلاس ایک طرف رکھ کر پھر رو پڑی۔

”بے وقوف لڑکی! اب تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے معافی شافی مانگنے کی۔اس کا دماغ تو اب میں درست کروں گی۔ چلو شاباش رونا بند کرو اور دل جلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم دیکھتی جائو میں کس طرح اس اللہ کے بندے کو لائن پر لاتی ہوں۔“

بھابی یہ کہتے ہوئے ہلکے سے ہنس پڑی تھیں۔

X...X...X

کوئی ابر اڑے کسی قلزم سے

اور برسے مرے ویرانے پر

کوئی کڑھتا ہو‘ کوئی جلتا ہو

میرے دیر سے واپس آنے پر

کوئی بیٹھے میرے پہلو میں

کوئی ہاتھ دھرے مرے شانے پر

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کوئی دبے دبے لہجے میں کہے

تم نے اب تک بڑے درد سہے

چلو تنہا چلنا کھیل نہیں

چلو ساتھ تمہارے چلتے ہیں

وہ آج پھر ذہن و دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسی دہلیز پر کھڑا تھا‘ یہ خواہش طلب بن کر ابھرتی ہے تو آدمی کو تنکے کی طرح بہا کر لے جاتی ہے۔وہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک میچورڈ مرد‘ ذمہ دار صحافی تھا‘ تحمل ہمیشہ اس کے مزاج کا خاصا رہا تھا‘ انا اور خودداری اس کا اوڑھنا بچھونا رہا تھا۔

مگر اس وقت وہ خود کو ایسا کالج بوائے محسوس کر رہا تھا جس کے آگے یہ ساری کیفیات بے معنی ہوں‘ پہلی ترجیح دل اور دل سے امڈنے والے جذبات ہو کر رہ گئے ہوں۔

”میں یہ نہیں کہتا عظمیٰ! کہ مجھے تم سے محبت ہے‘ اتنی شدید کہ میں ایک پل تمہارے بنا نہیں کاٹ سکتا۔ہاں مگر مجھے تمہاری ضرورت ہے‘ بہت شدید ضرورت ہے۔ جیسے ڈوبنے

والے کو ساحل پر کھڑے شخص کی ہوتی ہے۔ جیسے صحرا میں گم ہو جانے والے پیاسے کو پانی دکھائی دے تو اس کی طلب جاگ اٹھتی ہے۔ محبت میرے نزدیک بہت بے معنی شے ہو کر رہ گئی ہے۔ شاید اس لئے کہ یہ مجھے بھی حاصل نہیں ہوئی‘ میں نے اس کا ذائقہ نہیں چکھا۔ مگر طلب بھی تو زندگی کی ایک حقیقت ہے نا۔ جو کسی کے دل میں‘ کسی کیلئے بھی جاگ سکتی ہے۔“

”ایک طلب تن آسودگی کیلئے بھی تو ہوتی ہے۔“ عظمیٰ کا لہجہ دھیما اور ہوا میں رکھے چراغ کی روشنی کی طرح مرتعش تھا۔

وہ بھی کئی راتوں سے سوئی نہ تھی۔ اس کی غلافی آنکھوں میں تیرتی سرخی رت جگوں کی چغلی کھا رہی تھی۔

”میں نے کہا تھا نا کہ تن آسودگی کیلئے کسی کا بھی ہاتھ تھاما جا سکتا ہے مگر رفاقتیں وہی اچھی اور پائیدار ہوتی ہیں عظمیٰ جو دل میں طلب بن کر ابھریں۔“ اس نے دیوار پر اگے گل عباسی کے پودے کے سائے سے نظریں ہٹا لیں۔

اس کے ذہن میں بہت شور برپا تھا۔ پھر وہ عظمیٰ کو یوں دیکھنے لگا جیسے صحرا میں پچھاڑیں کھاتا کوئی پیاسا کسی فاصلے پر موجود کنویں کو دیکھتا ہے۔

”ہو سکتا ہے آپ کا یہ فیصلہ محض آپ کی جذباتیت ہو‘ وقت گزرنے کے ساتھ میں آپ کی طلب بھی نہ رہوں۔“ وہ دیوار سے لگ کر افسردگی سے ہنسی۔

”ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ طلب محبت میں ڈھلتی جائے‘ رفاقتیں محبت کو بڑھانے کا سبب بھی تو بنتی ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولا تو عظمیٰ نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا مگر

زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکی‘ اس کی پلکیں رخساروں پر یوں جھک گئیں جیسے کسی چشمے پر بید مجنوں کی شاخیں۔

”آخر ہم منفی سوچ ہی کیوں رکھیں‘ روشن پہلو کی طرف کیوں نہ دیکھیں۔“ سکندر ہلکے سے مسکرایا اور اس کے نزدیک چلا آیا۔

"عظمیٰ! میں نے اماں کو تمہارے بارے میں بتایا تو وہ تمہارے پاس آنے کو مچل گئی ہیں مگر میں نے انہیں روک رکھا ہے' کیا اب میں انہیں لے آئوں۔" وہ اس کی جھکی کانپتی پلکوں کو دیکھنے لگا۔

اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔

"کل ولید اور شہرینہ کی شادی ہے' ولید مجھ سے بہت خفا ہے' بے حد خفا۔ مگر میں کیا کرتا' میں تو ان دنوں خود زمانے بھر سے خفا تھا' ہر کسی سے بلکہ اپنے آپ سے بھی مگر صد شکر کہ کوئی کیفیت دائمی نہیں ہوتی۔" اس نے ایک گہری سانس کھینچی پھر ہلکے سے ہنس دیا۔

"انسان بہت ناشکرا ہے' وہ تقدیر کی ڈور کو اپنی انگلیوں میں لپیٹنا چاہتا ہے تا کہ اپنے من چاہے فیصلے پر گرہ لگا سکے مگر جب وہ ایسا نہیں کر سکتا تو روٹھ جاتا ہے۔ قدرت سے بگڑنے لگتا ہے جس طرح ایک بچہ اپنی پسندیدہ شے کو نہ پا کر روٹھ جاتا ہے حالانکہ اس کی ماں اس سے زیادہ جانتی ہے کہ یہ چیز اس کے بچے کیلئے بہتر ہے یا نہیں اور انسان کتنا نادان ہے کہ اس سچ پر بھی یقین نہیں کرتا کہ ستر مائوں جتنی محبت اس کے مالک حقیقی نے اپنے اندر اپنے بندوں

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

کیلئے رکھی ہے' پھر وہ کیسے آگ کا انگارہ اس ضدی بالک جیسے بندے کو کھیلنے کو دے دے جس کی نگاہ میں وہ کوئی چمکتی شے ہے۔ وہ اس کیلئے بہتر اور اچھی شے رکھتا ہے۔"

سکندر کی آواز عظمیٰ کے دل کے ساز پر ہاتھ مارنے لگی تھی۔ وہ بھی تو ایسی ہی بگڑی روٹھی بچی بنی ہوئی تھی قدرت سے۔

اس کی آنکھوں سے نکلنے والے قطرے اس کے رخساروں پر بکھر گئے مگر نیچے گرنے سے پہلے سکندر کی انگلیوں کی مہربان پوروں نے انہیں کسی قیمتی متاع کی طرح سمیٹ لیا۔

نہ کوئی موسم ہمارے مابین بشارتوں کا

نہ اظہار ذہن و دل کی تہوں میں رہتی

رفاقتوں کی کہانیوں کا

نہ احساس قربتوں کا

نہ ایک بارش میں بھیگے ہم تم کہیں سے گزرے

نہ جسم و جاں کی مہک نے قدموں کو ڈگمگایا

نہ کوئی بھونچال خواہشوں کے بدن میں آیا

نہ ہم نے اک دوسرے کی آنکھوں میں خواب دیکھے

نہ ہاتھ تھامے ہوئے وفا کے سفر پہ نکلے

نہ یاد رکھا' نہ راہ بھولے

نہ ہم نے اک دوسرے کی عمروں کو ایک سطح پر لا کر

مثال حرف غلط مٹایا

نہ دل میں ایسے کسی بھی احساس کو جگایا

مگر یہ ظالم ہوا نے کیسی فضا بنا دی

کہ اب یہی راستہ ہے

اور اب اسی پہ چلنے سے پائوں چھلنی ہیں

لہو رستے ہیں تو ہونٹ سی لیں

جو خواب دیکھے نہیں تھے ہم نے

انہی کے ہونے کا زہر پی لیں

X...X...X

شادی کی صبح سے ایک افرا تفری مچی ہوئی تھی' لڑکیوں کو آخر دموں تک اپنی تیاریاں نامکمل ہی محسوس ہوتی رہی تھیں۔

''اے تہمینہ بیٹی! مونا کو ذرا میرے کمرے میں بھیج دینا' میں تو اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ہلکان ہو گئی ہوں۔ایسی ہڑبونگ مچی ہوئی ہے کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔'' ممانے شہرینہ کے کمرے میں جھانکا تو تہمینہ بالوں کی چوٹی کھول کر نہانے کی نیت سے باتھ روم کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی۔

''آپ ناحق ہلکان ہو رہی ہیں پھوپھی جان! وہ گھر میں ہوتیں تو دکھائی دیتیں نا آپ کو۔''

''ایں! کدھر گئی ہے وہ خیریت؟''

"ولید بھائی کے ساتھ کوئی گھنٹہ بھر پہلے کی نکلی ہوئی ہیں' شرارے کا مسئلہ تھا جس کا کلر انہیں پسند نہیں تھا شاید۔"

تہمینہ کی بات پر بیڈ پر بیٹھی شہرینہ کی پلکیں عجیب سے احساس سے خود بخود جھک گئیں۔

"اچھا خاصا کلر تھا پتہ نہیں اس لڑکے کو کیوں پسند نہیں آیا۔ اچھا سنو مونا آجائے تو اسے آغا جی کے کمرے میں بھیج دینا میں وہیں پر ہوں۔ اس لڑکی نے بھی ساری ذمہ داریاں اپنے سر اٹھا رکھی ہیں۔ خدا اسے سدا شاد آباد رکھے۔" مما آخر میں پلٹتے ہوئے مونا بھابی کو دعائیں دیتی چلی گئیں۔ انہوں نے شہرینہ کی طرف دانستہ دیکھنے سے گریز کیا تھا' زرد رنگ کے ہلکے کام والے سوٹ اور ہم رنگ دوپٹے میں وہ کندن کی طرح دمک رہی تھی' اس کا حزن آمیز سراپا بے حد خیرہ کن لگ رہا تھا۔ انہیں اپنی ہی نظر لگ جانے کا خوف سا آگیا تھا۔ حالانکہ دل کر رہا تھا اس کے پاس بیٹھ کر اس کا یہ موہنا روپ جی بھر کر آنکھوں میں اتار لیں۔ اسے جی بھر کر پیار کریں' دل آج صبح ہی سے خود بخود بھیگا جا رہا تھا۔ یہ تو مونا کا انہیں بڑا سہارا تھا ورنہ ان سے تو آج کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہ ہو پا رہا تھا بس رونا آئے جا رہا تھا' گو کہ بیٹی ان کی آنکھوں سے دور نہیں جا رہی تھی مگر اس کے پرائے ہو جانے کا احساس ہی ان کا دل

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

گداز کر رہا تھا' امانت دار کو آج اس کی امانت سونپنے کا احساس مسرور بھی کر رہا تھا اور مغموم بھی۔

وہ اپنے بیڈروم میں چلی آئیں اور بیڈ پر لیٹ کر آنکھوں پر بازو رکھ لئے۔

بہت سے آنسو بے حد آہستگی سے ان کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر بہنے لگے۔

"ہاں بھئی تو تم لیڈیز کا کتنے بجے تک ہوٹل پہنچنے کا پروگرام ہے؟۔"

پاپا (جہانگیر احمد) اپنے بیڈروم میں داخل ہو کر مما سے مخاطب ہوئے۔ رسٹ واچ میز پر ڈال کر شرٹ کے اوپری بٹن کھولتے ہوئے وہ بڑی عجلت میں دکھائی دے رہے تھے۔

"میں اور آغا جی رجسٹریشن آفس جا رہے ہیں تم لوگ اپنا پروگرام وسیم کو بتا دینا۔"

"مونا کو ہی خبر ہے کیا پروگرام ہے؟" مما نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر انہیں جواب دیا۔

"کمال ہے سارا بوجھ تم نے اس بچی پر ڈال رکھا ہے۔" پاپا وارڈروب سے ہینگر کیا شلوار سوٹ نکال کر پلٹے مگر مما کے متورم چہرے کو دیکھ کر کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"میں کیا بوجھ ڈالوں گی' اس نے تو میرا سارا بوجھ از خود اٹھا لیا ہے۔" وہ نڈھال سے انداز میں اٹھ کر بیٹھ گئیں اور بقیہ آنسو بہانے لگیں۔

"کم آن شائستہ! یہ تو خوشی کا موقع ہے' تمہیں پتہ ہے آج میں بے حد خوش ہوں۔ زندگی میں شاید اتنا مسرور میں کبھی نہیں ہوا' ایسی بے پایاں مسرت دل نے کبھی محسوس نہیں کی جیسی آج کر رہا ہے۔" وہ نرمی اور محبت سے مما کا کندھا تھپکنے لگے۔

"خوش تو خیر میں بھی ہوں' پتہ ہے جہانگیر آج شیری بہت پیاری لگ رہی ہے۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولیں تو پاپا ہنس دیئے۔

"وہ کب پیاری نہیں لگتی۔" انہوں نے ٹاول اٹھا کر کندھے پر رکھا پھر پلٹے اور مسکراتے ہوئے بولے۔

"آج ولید بھی بہت پیارا لگ رہا ہے۔" ان کے انداز میں ہلکی شرارت تھی۔

"ولیں' وہ کب پیارا نہیں لگتا۔" جواباً مما بے ساختہ بولیں پھر یکدم ہنس پڑیں۔

X...X...X

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تونے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ

زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

تم پر اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں

تم کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہوٹل کے استقبالیے پر کھڑا ولید اپنے تمام مہمانوں کو خود اٹینڈ کر رہا تھا' گرے کلر کے شلوار سوٹ اور کڑھائی والی گرے واسکٹ پہنے خوشبو میں بسا وہ ہمیشہ کی طرح سب سے منفرد دکھائی دے رہا تھا۔

آج تو اس کی آنکھوں میں سب کچھ پا لینے کا نشہ بھی ہلکورے لے رہا تھا۔

سکندر جب ہوٹل کے انٹرینس سے داخل ہوا تو ولید نے اسے حیرت اور مسرت کے بے پناہ احساس سے دیکھا اور بھینچ لیا۔

"کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے' مجھے یقین تھا۔ تم ضرور آؤ گے۔"

"ہاں! خود فراموشی دلفریب ضرور ہے مگر صد شکر کہ دائمی نہیں ہوتی۔" جواباً سکندر نے ہلکے سے سانس کھینچی پھر اپنے پیچھے کھڑی عظمیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اس سے ملو ولید! یہ عظمیٰ ہے میری منگیتر۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہوں میں عجیب سی جگمگاہٹ اتر آئی تھی جو عظمیٰ کے چہرے پر گلاب بن کر بکھرنے لگی۔ یہ تو نادیہ آپی ساتھ تھیں جنہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کے اعتماد کو سنبھال رکھا تھا۔

ولید کی نگاہیں عظمیٰ پر کچھ دیر کیلئے ٹھہر سی گئیں مگر دوسرے پل اس نے جلدی سے دونوں خواتین کو اندر جانے کا راستہ دے کر سکندر کو دیکھا اور ایک بار پھر اسے خود سے لگا لیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا سکندر کہ میں اپنی اس خوشی کا اظہار کس طرح کروں۔ یو آر گریٹ سکندر۔ گریٹ۔"

"کوئی گریٹ وریٹ نہیں ہوں۔ مجھ جیسے گنہگار کو تم ناحق شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔" سکندر نے ایک سکول بوائے کی طرح جھینپ کر اسے ایک گھونسا رسید کر دیا۔ پھر ہاتھ میں پکڑا ہوا بوکے اس کی طرف بڑھا دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"تو تم اس گوہر نایاب کی تلاش میں ہم سے کٹے ہوئے تھے۔" ولید نے بوکے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے دور جاتی عظمیٰ پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔

"ارے نہیں... اسے تو بس قدرت نے مجھ سے ملوایا ہے۔ میں تو ان دنوں اپنے آپ سے بھی کٹا ہوا تھا۔" سکندر نے ایک گہری سانس کھینچی اور بالوں پر ہاتھ پھیر کر خفیف سے انداز میں سر جھٹکا۔

"میرا خیال ہے تمہاری اب وہاں ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔"

اس نے انگلی سے اس حصے کی طرف اشارہ کیا جو دولہا' دلہن کیلئے مخصوص کیا گیا تھا۔ شہرینہ کو لا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ ولید نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ بے ساختہ ایک ہلکی بھنچی بھنچی سانس اس کے لبوں سے نکل گئی۔

گولڈن اور فان کلر کے کنٹراسٹ شرارہ سوٹ میں وہ رنگ و بو کا سیلاب سمیٹے تمام خواتین کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

مگر اسے سوائے جھلملاتے دوپٹے کے اور کچھ نظر نہیں آیا کیونکہ اس کا سر بے حد جھکا ہوا تھا تاہم اس کے وجود کا اپنی بالکل جائز ملکیت ہو جانے کا احساس ہی اس کے دل پر یوں انگلیاں مار رہا تھا جیسے کوئی وائلن کے تاروں کو چھیڑ کر خوبصورت دھن بکھیر رہا ہو۔

”تعجب ہے مردان علی شاہ کی طرف سے کوئی شریک نہیں ہوا تمہاری شادی میں۔۔“ سکندر اس کے ہمراہ چلتے ہوئے حیرت سے بولا۔

”اتنے حسین تعلقات ہی کب رہے تھے ہمارے۔“ اس نے ابرو اچکا کر سکندر کو دیکھا۔

”اتنے برے بھی تو نہیں رہے تھے۔“ سکندر کا جملہ اور قہقہہ دونوں ہی برجستہ تھے۔ وہ اسے گھور کر رہ گیا پھر خفیف سے انداز میں شانے اچکاتے ہوئے بولا۔

”میں نے دعوت نامے تو پہنچا دیئے ہیں۔ان کی مرضی۔ ویسے وہ خود ان دنوں بستر علالت پر ہیں اور میری ساری ہمدردیاں ان کیلئے ہیں۔۔“

”ولید بھائی خدارا! اب اپنی سواری باد بہاری ادھر بھی لے آیئے۔“ ہمایوں اسے دور سے دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔

”آپ تو دولہانہ ہوئے عید کا چاند ہو رہے ہیں‘ لوگوں کو ڈھونڈنے کیلئے اپنی آنکھوں پر دوربینیں فٹ کرانی پڑ رہی ہیں۔۔“

اس نے اسے پکڑ کر شہرینہ کے پہلو میں لا کر بٹھا دیا‘ اس کے بیٹھتے ہی مووی میکر بھی ایکٹو ہو گئے‘ وہ دونوں ہی یکدم روشنی میں نہا گئے۔

اس نے ایک استحقاق بھری نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی اور ایک گہری سانس کھینچ کر آہستگی سے بولا۔

”میرا تو خیال تھا تم یہاں تک پہنچنے سے پہلے اپنے ارادے پر عمل کر چکی ہو گی۔“ اس کا اشارہ اس کی خودکشی کی دھمکی پر تھا۔

طنز اور فتح سے سرشار یہ آواز کسی سرسراتے تیر کی طرح شہرینہ کے دل میں ترازو ہو گئی۔

بہر کیف اس موقع پر اس لہجے اور اس جملے کا اس کے پاس تصور بھی نہ تھا۔اس کا دل سینے میں کٹ کر رہ گیا۔

"یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے۔" تانیہ نے اس کی چوری پکڑ لی۔ اس کے ہاتھ میں گہنے تھے جو وہ شہرینہ کی کلائی میں باندھنے لگی۔

ہے دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر

ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

ہمایوں کی بے ساختہ شعر گوئی پر ہنسی بکھر گئی۔

"اپنی ملکیت ہو گئی ہے۔ آنکھوں کو بند کر کے کیوں دیکھیں؟" وہ بے حد اطمینان سے گویا ہوا اور صوفے کی گداز بیک سے ٹیک لگالی۔

آج تو یوں بھی اس کا اعتماد قابل دید تھا۔

"ہاں جیسے اب تک تو تم آنکھیں بند کر کے ہی دیکھتے آئے تھے۔" مونا بھابی کی بات پر زبردست قہقہہ پڑا۔

"تب عقل کی آنکھوں سے دیکھتا تھا' اب دل کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے بچہ۔" واجدہ خالہ کا بیٹا سلطان اس کی پشت کی طرف ہی کھڑا تھا' پھر اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

"دیکھو جی بھر کر دیکھو۔ ان چڑیلوں کی باتوں سے بالکل مت گھبرائو۔ یہ تو نیگ کے چکر میں ہیں۔ ان کا بس چلے تو آدھی جائیداد اپنے نام لکھوا کر دولہا کو دلہن کے دیدار سے فیض یاب کریں۔"

"کچھ خدا کا خوف کریں سلطان بھائی! بھلا آپ نے کب آدھی جائیداد ہمارے نام لکھوادی تھی' ہم نے تو محض 10 ہزار میں آپ کو جاذبہ بھابی کا دیدار کرا دیا تھا۔" مونا بھابی اس الزام پر تڑپ کر بولیں۔

"بہر حال میں تو بالکل غریب سا بندہ ہوں' میرے پاس تو دینے کیلئے کچھ نہیں۔ بالکل خالی جیب۔" اس نے جلدی سے ایک ہاتھ اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے جیب کو تھپتھپایا تھا پھر ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"اور بالکل خالی دل۔" یہ جملہ اس نے آہستگی سے صرف شہرینہ کو سنانے کو کہا تھا۔

ادھر سب ایک شور مچا رہی تھیں اس کی خالی جیب والی بات کسی کو ہضم نہیں ہو رہی تھی اور وہ نہایت سکون کے ساتھ سب سے نمٹ رہا تھا' اس کا سکون درہم برہم کر کے۔ شکستگی' دل گرفتگی اس کے دل پر چٹکیاں بھر رہی تھی' اس کا دل چاہا وہ یکلخت یہاں سے اٹھ کر

بھاگ جائے، اس شور ہنگاموں، ہاؤ ہو، قہقہوں سے دور اور جا کر کسی گوشے میں بیٹھ کر اتنا روئے اتنا روئے کہ دل رک جائے، سانس تھم جائے۔

اس کی بھاری گمبھیر ہنسی اس کے دل پر کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ بھابی کی کسی بات پر اس نے محظوظ ہو کر بڑا سا قہقہہ لگایا تھا، ادھر وہ تذلیل کے احساس سے چور چور ہو گئی، اسے لگا وہ اس پر ہنس رہا ہو، اس کی شکست پر قہقہے لگا رہا ہو۔

پھر وہی کشیدگی، رنجیدگی اس کے دل سے امڈنے لگی۔ مگر اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا، وہ سارا وقت سب کی نگاہوں کا مرکز بنی رہی۔ اس کے رویوں کی کاٹ سے سوائے خود کو سلگانے کے کچھ نہ کر سکی۔

☆...☆...☆

ولید نے اپنے کمرے کو بے حد خوبصورتی سے ڈیکوریٹ کیا تھا، ہر شے سے نفاست اور عمدگی جھلک رہی تھی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

تازہ گلاب کی مہک چہار سو بکھری ہوئی تھی۔

میں قائلِ خود رائی الفت سہی لیکن

آدابِ محبت سے تو بیگانہ نہیں ہوں

وہ ساری رسمیں نمٹا کر کسی فاتح جرنیل کی طرح کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اسے یقین تھا وہ شکست کھائے ہارے ہوئے سپاہی کی طرح سر جھکائے بیٹھی خوف سے کانپتے دل کے ساتھ اس کے آنے کا ایک ایک لمحہ گن رہی ہو گی۔

اس کا دل آویز سراپا نگاہوں تلے بار بار آ رہا تھا، وہ اندر آیا تو اسے شدید قسم کا ذہنی جھٹکا لگا، اس کا گلابوں سے مہکتا بیڈ خالی تھی بلکہ پورا کمرہ ہی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ بیڈ پر پڑی ایک چٹ اور سلیپنگ پلز کی خالی بوتل دیکھ کر اسے اپنا دماغ بھک سے اڑتا محسوس ہوا، سارا نشہ ہرن ہو گیا، اسے جلاتے ستانے کا سارا پلان ہی دماغ میں بکھر کر رہ گیا۔

بس ایک عجیب سی وحشت نے دل کو جکڑ لیا۔

اس نے پرچہ پر ایک نظر ڈالی پھر اسے وہیں پھینک کر حواس باختہ کھڑکی کی طرف آیا جو چوپٹ کھلی ہوئی تھی۔

یہ لان کا پچھلا حصہ تھا جو آج روشنی سے نہایا ہوا تھا' اس کی بھٹکتی متوحس نظریں یکدم شہرینہ پر جا پڑیں جو کھڑکی سے ذرا فاصلے پر کیاری کے پاس پڑی تھی' اس کا دمکتا دوپٹہ بیدردی سے کیاری میں پڑا تھا جبکہ ایک کونا سر سے ڈھلک کر کندھے پر اٹکا ہوا تھا۔اس کی ڈھلکی ہوئی گردن نے اس کے حواس گھما ڈالے۔اس کا دل سینے میں پھیلا سکڑا مگر لہور گوں میں رک رک کر دوڑنے لگا۔

"شیری' شیری! آر یو آل رائٹ۔" وہ اسے جھنجوڑنے لگا۔

اس کے جھنجھوڑنے پر وہ ذرا سا کسمسائی' پلکیں بمشکل کھول پائی' ولید کو اس کی سنہری آنکھوں میں موت کا خمار ڈولتا دکھائی دینے لگا۔

اس کی نظروں میں سلیپنگ پلز کی خالی بوتل گھومنے لگی۔

"کیا کر آئی ہو بیوقوف لڑکی! کتنی پلز لی ہیں؟" اس نے اسے شانوں سے تھام کر سیدھا کیا۔

زندگی میں پہلی بار اسے اپنا سارا اعتماد' ساری طراری دھوئیں کے غول کی طرح ہوا میں تحلیل ہوتی محسوس ہونے لگی۔

"میں آپ کی نفرت کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی۔" وہ سسکی بھر کر بے حد پست آواز میں بولی جیسے اتنا بولنا بھی اس کیلئے شدید مشکل ہو رہا ہو۔

"تو کون تم سے نفرت کرتا ہے شیری! تم سے بھلا میں نفرت کر سکتا ہوں؟ مائی گاڈ! وہ تو صرف مذاق تھا۔"

وہ خوف اور وحشت سے اسے دیکھنے لگا۔

اس نوبت کا تو اس کے پاس تصور بھی نہ تھا' وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنا شدید ردعمل ہو گا اس دیوانی لڑکی کا۔اسے لگا بھابی کی آواز کہیں سے کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اس کے ذہن پر کھٹ کھٹ لگ رہی ہو۔

(لڑکیاں نازک حساس پروں والی تتلیوں کی مانند ہوتی ہیں ولید! انہیں آزمائش' بیگانگی کی تیز آنچ پر نہیں رہنے دینا چاہیے' ان کے پر جل جاتے ہیں۔وہ راکھ ہو جاتی ہیں اور پھر راکھ کے اس ڈھیر میں تم جیسے مرد تاعمر چنگاری ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں۔)

"شیری! یو آر مائی لائف۔ بھلا اپنی زندگی سے' اپنی روح سے کوئی نفرت کر سکتا ہے' وہ تو محض غصہ تھا۔" وہ اسے نرمی سے تھامتے ہوئے بولا۔

"اٹھو! شاباش۔۔" مگر وہ اس کا ہاتھ دھکیلتے ہوئے رو دی۔

"آپ تو مجھے قتل کر دینا چاہتے تھے' میں نے سوچا میں خود ہی اپنی زندگی ختم کر لوں تاکہ میرے لگائے ہوئے زخموں کی تلافی ہو جائے اور آپ کی گردن پر ناحق خون نہ آئے میرا۔"

"پاگل ہو تم۔" وہ ندامت اور رنج سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپے سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کا سجا سنورا روپ آنسوئوں سے بھیگا جا رہا تھا۔

"شیری! آئی ایم سوری۔ اگر تم میرے مذاق سے ہرٹ ہوئی ہو۔ میرا مقصد تمہیں نیچا دکھانا' شکست سے دوچار کر کے لطف اٹھانا نہیں تھا۔ پاگل لڑکی تمہاری محبت تو میرے لئے تازہ ہوا کی طرح ہے جس میں میں زندہ ہوں' جس سے میری روح کی بقا ہے۔"

وہ اس کے چہرے سے اس کے مشک بار بالوں کی جھالروں کو ہٹاتے ہوئے اس کے خوبصورت چہرے میں ایک پل کے لئے کھو گیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ بے ساختہ پلکوں کی باڑھ جھکا گئی تھی۔

"کتنی پلز کھالی ہیں بوتل تو پوری خالی ہے۔" اچانک اسے حادثے کی سنگینی کے احساس نے جکڑ لیا۔

"بتائو۔ کتنی پلز کھائی ہیں' مائی گاڈ! تمہیں اندازہ ہے تم کیا کر چکی ہو۔" اس کا سرسراتا لہجہ واہموں' اندیشوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

اور شہرینہ کا دل چاہا وہ یونہی آنکھیں بند کئے اسے اپنے لئے پریشان' متوحش دیکھتی رہے' اس کے خوبصورت جملوں سے اپنے دل کی سوکھی دھرتی نم کرتی رہے۔

سارے تپتے ہوئے لمحوں کا حساب بس ایک پل میں ہو گیا تھا جیسے سوکھی زمین پر ابر کا ٹکڑا برس کر برسوں کی پیاس آن واحد میں مٹا جائے۔

یوں کہ کوئی گوشہ' کوئی کونہ سوکھا نہ رہے۔

اس کے دل میں قوس قزح کی طرح عجیب سی تابندگیاں جھلملانے لگیں۔

اس نے آنکھیں کھول دیں اور ساتھ ہی آگے ہاتھ کر کے وہ مٹھی بھی کھول دی جس میں اس نے ساری سیلپنگ پلز چھپا رکھی تھیں۔

ولید کو ایک بار پھر اعصابی جھٹکا لگا تھا۔

وہ اپنی شریر مسکراہٹ کو قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی مگر مسکراہٹ اسکے ہونٹوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"مائی گاڈ... یہ سب!۔" وہ پہلے ان پلز کو پھر اسے گھورنے لگا۔

"یہ میرا نہیں بھابی کا ڈرامہ تھا سچ مچ۔" وہ اس کے گھورنے پر معصوم سی شکل بنا کر جلدی سے بولی اور جھٹکے سے کھڑی ہو گئی مگر وہ بھی پوری طرح اپنے اعصاب سنبھال چکا تھا' اس کے بھاگنے کی راہیں مسدود کرتے ہوئے اس کی کلائی پکڑ لی۔ دل میں چھپا خوف کا سکوت ایک چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ اطمینان کی ایک خفیف سی لہر اس کے اعصاب سے گزر گئی تھی' اس کے ہونٹوں پر ایک طویل اذیت کے بعد کشادہ مسکراہٹ پھوٹی تاہم وہ بظاہر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"ڈرامہ بھابی کا تھا مگر پلے تو تم کر رہی تھیں نا۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اتنی اچھی ایکٹنگ کرو۔" اس نے ہلکا سا جھٹکا دیا تو وہ دیوار سے جا لگی۔

"آئی ایم سوری ولید!۔" وہ منمنائی۔

"کیا سوری۔ کتنے دنوں کی ریہرسل تھی۔" وہ دیوار سے ایک ہاتھ ٹکا کر اس پر جھکا اور اسے ہنوز گھورتا ہوا بولا۔ اس کی نگاہوں کے پار استحقاق کی وارفتہ چمک تھی' جس نے شہرینہ کی پلکوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ خود کو ان نگاہوں سے پگھلتا محسوس کرنے لگی۔

"کوئی ریہرسل نہیں تھی۔" وہ اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"اوہ... تو یہ پانچ سال کا تجربہ تھا جو تم پر انڈیلا گیا ہے۔"

بھابی اور تانیہ کو ایک درخت کی آڑ سے یکدم کھلکھلا کر نکلتے دیکھ کر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

"کہو مان گئے نا عورت کی صلاحیتوں کو۔" بھابی نے ابرو اچکا کر جیسے اسے چڑایا۔ "ساری ہوا نکل گئی ہے نا۔ کیسے گڑگڑا کر معافیاں مانگی جا رہی تھیں' کیسے اظہار ہو رہا تھا۔"

وہ کچھ دیر پہلے کے لمحات کا تصور کر کے جیسے محظوظ ہو کر ہنس رہی تھیں۔

"ظاہر ہے بندہ بشر ہوں' کسی کو مرتے دیکھ کر ہمدردی کا جذبہ تو بیدار ہو ہی جاتا ہے۔"

اس کا اعتماد لوٹ رہا تھا' وہ یکدم خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

دل ہی دل میں اس پلان کو بھی سراہے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

"آگے کی بھی پلاننگ کی ہے یا یہ مجھے کرنا ہوگا۔" وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا شگفتگی سے شہرینہ پر ایک نظر ڈال کر بولا۔

نظر کیا تھی شوق کا ایک پورا جہان آباد تھا ان نگاہوں میں' وہ مارے شرم کے کٹ کر رہ گئی۔

"تم اگر کہو تو آگے کی بھی پلاننگ ہم کر دیتے ہیں۔" بھابی شرارت سے لبوں کا کونا دانتوں میں دبا کر آگے بڑھنے لگیں تو اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ان کا راستہ روک دیا۔

"میرا خیال ہے آپ نے اپنی چھوٹی سی عقل کا پہلے ہی ضرورت سے زیادہ استعمال کر لیا ہے۔ اب آپ دونوں سیدھے سیدھے سدھاریئے۔ یہ وسیم ہمیشہ ہی غلط موقعوں پر آپ کی نکیل چھوڑ دیتا ہے۔" اس نے گویا ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے وسیم کی عقل پر ماتم کیا تھا۔

"احسان مانو میرا' یہ تو سچ مچ شیری پلز کھا چکی ہوتی اور تم صحرا میں پچھاڑیں کھانے کیلئے رہ جاتے۔" بھابی نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا۔

"افسوس کہ اس احسان پر میں آپ کو کوئی بدل نہیں دے سکتا' میری جیب پہلے ہی آپ خالی کروا چکی ہیں۔" تانیہ اور بھابی دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔

"البتہ تمہارا انعام کیا ہونا چاہیے اس بہترین ایکٹنگ پر۔" وہ شہرینہ کی طرف بڑھا۔

اس کی پر شوق نگاہوں میں رنگ ہی رنگ تھے' وہ رنگ جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہوتے۔

"تمغہ محبت۔" جاتے جاتے تانیہ نے شرارت سے لقمہ دیا تھا۔ ولید کا قہقہہ برجستہ تھا' پھر وہ ہلکی سانس بھرتے ہوئے بولا۔

قمر دل کیا ہے میں تو ان کی خاطر جان بھی دے دوں

مری قسمت اگر ان کو نہ پھر بھی اعتبار آئے

بھابی اور تانیہ بے ساختہ ہنستی ہوئی گئی تھیں۔

شہرینہ نے اسے دیکھا تو اس نے دل آویز تبسم کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس کے ہاتھ کی محبت بھری گرمی نے یکلخت اس کی خوش نما پلکوں کو شرم وحیا سے جھکا ڈالا۔

صدیوں کے فاصلے لمحوں میں پاٹے جا سکتے ہیں' اگر آپ کے ہاتھ میں اعتبار کا سوئی دھاگہ ہو۔ بس آپ ٹانکا لگاتے چلے جائیں' محبت کی خوش نما چادر خود بخود بنتی چلی جائے گی' ہاں خیال رکھیں کہ آپ کا ہر ٹانکا متوازن ہو۔ دراصل ہر جذبے کی بقا' اعتدال اور توازن میں ہے بلکہ دنیا کا پورا نظام ہی اعتدال پر قائم ہے' اس کی بقا توازن پر ہے جس طرح مسلسل بھاگنے والے گر جاتے ہیں جبکہ سست قدموں والے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں مگر درمیانی رفتار والے اپنا سفر بغیر ہانپے کر جاتے ہیں۔

جذبات' احساس اور کیفیات میں توازن قائم ہو تو زندگی نہ صرف حسین ہو جاتی ہے بلکہ آسان بھی لگنے لگتی ہے۔ بندھن دلوں سے مشروط ہوتے ہیں۔ انہیں رویوں میں تلاش نہیں کرنا چاہیے' رویئے تو حالات' واقعات کے تابع ہوتے ہیں۔ ان کی کیفیات بدلتی رہتی ہیں مگر ان کا اثر بندھن اور محبت پر اس وقت پڑتا ہے جب آپ ان کے تابع ہو جاتے ہیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

